خزینۂ معارف

اُردو ترجمہ

ابریز

از

ڈاکٹر پیر محمد حسن صاحب

ناشران قرآن لمیٹڈ

اردو بازار لاہور پاکستان
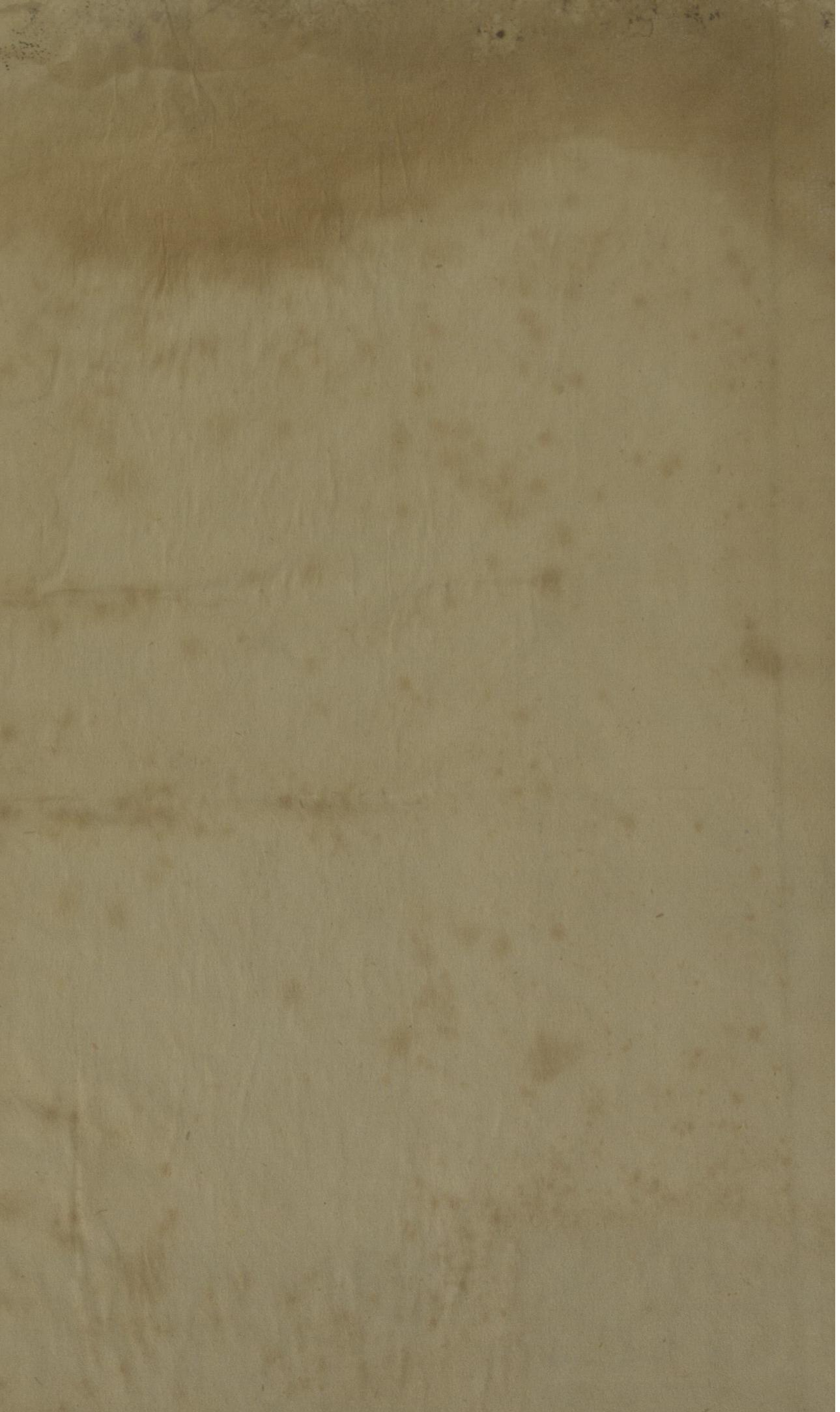
معرفت اور علمِ لدُنّی کی لاجواب کتاب

خزینۂ معارف

اردو ترجمہ

ابریز

معہ حواشی و پیش لفظ از مترجم

جس میں حضرت العلامہ احمد بن مبارک سلجماسی رح نے غوثِ زماں حضرت سید عبد العزیز دباغ مغربی کے مختصر حالاتِ زندگی متعدد آیاتِ قرآنی، احادیثِ نبوی کی بے نظیر تشریحات اور علم و عرفان کی نادر باتیں جمع کی ہیں

مترجم

ڈاکٹر پیر محمد حسن ایم۔ اے۔ پی ایچ۔ ڈی۔ راولپنڈی

ناشرانِ قرآن لمیٹڈ

اُردو بازار — لاہور — پاکستان

کتاب : ——— خزینہ معارف

تالیف : ——— ڈاکٹر پیر محمد حسن

مطبع : ——— پرنٹنگس دربار مارکیٹ لاہور

ناشر : ——— ناشران قرآن لمیٹڈ ، لاہور

فہرست مضامین

حصہ اوّل

حصہ دوم

پیش لفظ

مجھ سے پہلے ابریز کا ترجمہ مولوی عاشق الٰہی صاحب میرٹھی کر چکے ہیں اور درحقیقت انہوں نے بہت اچھا ترجمہ کیا ہے۔ عیوب سے پاک ذاتِ باری تعالیٰ ہے، اس لیے مجھے کسی کے عیوب کا تذکرہ کرنا منظور نہیں ہے۔ میں نے مولوی عاشق الٰہی صاحب کے ترجمہ سے بہت مدد لی ہے۔ اس لیے میرے ترجمہ کی اگر تعریف ہوگی تو اسے انہی کی تعریف سمجھا جانا چاہیئے۔ پھر اَلْفَضْلُ لِلْمُتَقَدِّمْ کے اعتبار سے بھی وہ مجھ پر فوقیت رکھتے ہیں۔

میں نے اس ترجمہ میں تقلید نہیں کی بلکہ مستقل طور پر ترجمہ کیا ہے اور چھوٹے چھوٹے عنوانات قائم کر دیئے ہیں پھر الگ الگ پیرے بنا کر قارئین کی سہولت کے لیے کتاب کو جدید طرز میں پیش کیا ہے۔ جن علماء، صحابہ اور دیگر بزرگوں کا کتاب میں ذکر آیا ہے اُن کے متعلق مختصر حواشی دے دیئے ہیں تاکہ پڑھنے والوں کو اُن کے متعلق کسی قدر معلومات حاصل ہو جائیں۔

مولوی عاشق الٰہی صاحب نے حضرت عبدالعزیز دبّاغؒ کے بیان سے دو جگہ اختلاف کیا ہے، مگر میرے خیال میں حق حضرت دباغ کے ساتھ ہے۔ مولوی صاحب اپنے عقیدہ کے مطابق بات کر رہے ہیں اور حضرت دباغ اپنے عقیدہ اور مرتبہ کے مطابق۔ نیز انہوں نے چند مقامات کا ترجمہ نہیں کیا مگر میں نے تمام کتاب کا ترجمہ کیا ہے۔

آخر میں یہ سراسر ناانصافی ہوگی اگر میں اپنے محترم دوست میجر عبدالعزیز صاحب اے۔ ایم۔ سی، او۔ سی ہیلتھ سینٹر راولپنڈی کا شکریہ نہ ادا کروں۔ انہوں نے اپنے قیمتی کتب خانہ سے مجھے فتح الباری، تذکرۃ الحفاظ، اصابہ، اخبار الاخیار، لسان المیزان، کشف الظنون، کتاب الانساب اور فہرست ابن الندیم وغیرہ عاریۃً دیں جن کی مدد سے میں حواشی لکھنے کے قابل بنا۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ ان کی مدد کے بغیر میں اپنے کام کو کامیابی سے نہ کر سکتا تھا۔

محمد حسن

عرضِ حال

از ناشر

اللہ کے ولیوں نے طریقِ حق کے متلاشیوں کی رہنمائی کے لیے متعدد کتابیں لکھی ہیں جن سے اب تک خلقِ خدا روحانی فیوض و برکات حاصل کرتی رہی ہے۔ یہ کتاب بھی اسی سلسلہ کی ایک کڑی ہے جو ابریز کے نام سے مشہور ہے۔ اس کتاب میں حضرت علامہ احمد بن مبارک سلجماسی (شہر فاس، الجزائر، افریقہ) نے اپنے مرشدِ کامل غوثِ زماں حضرت سید عبدالعزیز دباغ مغربیؒ، جو اُمّی محض تھے، کے مختصر حالاتِ زندگی اور کرامات لکھنے کے بعد آپ کی بیان کردہ بعض احادیثِ نبوی اور آیاتِ قرآنی (جن کو وہ خود متبحر عالمِ دین ہونے کے باوجود سمجھنے سے قاصر رہے تھے) کی تشریحات اور باطنی علوم اور احوال سے متعلق بے شمار استفسارات کے عمدہ اور صحیح جوابات درج کئے ہیں۔ اس میں چونکہ نادر و نایاب مسائل کا ایک گراں قدر مجموعہ موجود ہے، جو طالبانِ حق کے لیے رُوحانی تسکین کا موجب ہے۔ اس لیے اس کتاب کا درجہ بہت ہی بلند ہے۔ بعض امور ایسے بھی بیان کئے گئے ہیں جو مرید کے استفسار پر براہِ راست آنحضور صلی اللہ علیہ وسلّم سے دریافت کرکے بتائے گئے۔

پچیس تیس سال پہلے اس کتاب کا اُردو ترجمہ "تبریز" کے نام سے مولینا عاشق الٰہی میرٹھیؒ نے دہلی سے شائع کرایا تھا، جس کے کچھ نسخے منگوا کر اپنے دوستوں کو دیئے تھے۔ کتاب چونکہ نایاب ہو گئی تھی، اللہ تعالیٰ نے احقر کو توفیق بخشی کہ باوجود مالی بے بضاعتی کے اسے دوبارہ طبع کرانے کا عزم کروں۔ مولینا عاشق الٰہی صاحب مرحوم کا ترجمہ بہت عمدہ ہے مگر زبان ذرا پرانی ہے۔ اس میں عبارت مسلسل چلی جاتی ہے، کہیں کوئی سُرخی نہیں آتی اور بعض جدت پسند طبائع اسے پسند نہیں کرتیں۔ نیز ایک باب بھی چھوڑ دیا گیا ہے اس لیے مجھے اس کتاب کا دوبارہ ترجمہ کرانے کی ضرورت محسوس ہوئی۔ جناب ڈاکٹر عبداللہ چغتائی صاحب سے ایک دفعہ اتفاقاً تذکرہ ہو گیا۔ انہوں نے فرمایا کہ ایک صاحب سے ملاقات کرا دوں گا۔ اگر وہ مان گئے تو تمہارا کام بن جائے گا۔ چنانچہ انھوں نے چند روز بعد جناب ڈاکٹر پیر محمد حسن صاحب ایم۔ اے، پی ایچ، ڈی، پرنسپل گورنمنٹ ہایر سکینڈری سکول راولپنڈی سے تعارف کرایا۔ مَیں نے کتاب کا اُن سے تذکرہ کیا اور ساتھ ہی یہ گذارش بھی کی کہ ترجمہ کا کام معاوضہ کے تصور سے بے نیاز ہو کر کیا جائے چنانچہ انہوں نے بڑے شوق اور محنت سے اس کام کو اتمام تک

پہنچایا۔ ایک بڑا کارنامہ جو سرانجام دیا ہے وہ یہ ہے کہ کتاب کے شروع میں اپنی طرف سے ایک مبسوط دیباچہ لکھا ہے جس میں بزرگانِ سلف کی کتابوں سے اقتباسات درج کر کے یہ ثابت کیا ہے کہ صوفیائے کرام کا مسلک کتاب و سنت کے عین مطابق رہا ہے۔ نیز جن لوگوں نے ان مقدس ہستیوں پر الزامات عائد کئے ہیں انہوں نے جلدبازی سے کام لیا ہے اور اصل معاملہ کی تہ تک پہنچنے کی کوشش نہیں کی وغیرہ وغیرہ۔ نیز تمام کتاب میں عنوانات قائم کر دیئے ہیں اور مختلف بزرگوں کا جہاں کہیں ذکر آگیا ہے، حواشی میں اُن کا مختصر تعارف کرا دیا ہے۔ اس کارِ خیر میں اُن کے ذاتی دوست میجر عبدالعزیز صاحب (راولپنڈی) کا بھی حصہ ہے جنہوں نے اپنی گراں بہا لائبریری میں سے وہ تمام کتابیں انہیں مہیا فرمائیں جن کی انہیں ضرورت پڑتی رہی۔ اللہ تعالےٰ ان دونوں حضرات کو جزائے خیر دے۔ آمین ؛

احقر العباد

سردار محمد

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

دیباچہ

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ عَلٰی آلَآئِہٖ۔ وَالصَّلٰوۃُ وَالسَّلَامُ عَلٰی اَنْبِیَآئِہٖ لَاسِیَّمَا مُحَمَّدٍ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ وَاٰلِہٖ وَاَتْبَاعِہٖ وَالرَّحْمَۃُ وَالْمَغْفِرَۃُ عَلٰی اَوْلِیَآئِہٖ۔

دُنیا میں حق و باطل، ظُلمت و نُور، سچ اور جھوٹ میں قدیم سے جنگ چلی آتی ہے۔ باطل کی ہمیشہ یہی کوشش رہی کہ حق یا تو بالکل ہی مٹ جائے یا کم از کم چھپا رہے وَاللّٰہُ مُتِمُّ نُوْرِہٖ وَلَوْ کَرِہَ الْکَافِرُوْنَ یہی حال اللہ والوں کا رہا کہ باطل پرست ہر زمانہ میں اُن کے مخالف رہے۔ چنانچہ موسیٰ علیہ السلام کو اِنَّہٗ لَکَبِیْرُکُمُ الَّذِیْ عَلَّمَکُمُ السِّحْرَ کہا گیا اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو نعوذ باللہ، شاعر، کاہن اور مجنون تک کہا گیا۔

قِیْلَ اِنَّ الْاِلٰہَ ذُوْ وَلَدٍ قِیْلَ اِنَّ الرَّسُوْلَ قَدْ کَہَنَا

(کہا گیا کہ اللہ کی اولاد ہے اور رسول اللہ کاہن ہیں) مگر اللہ والے ان باتوں سے متاثر ہو کر اپنا اصلی مقصد ترک نہیں کر دیتے۔ ان کا مقصد لوگوں کو راہ حق دکھانا ہوتا ہے اور اس فرض کی ادائیگی میں وہ کسی قسم کی ملامت یا طعن و تشنیع کی پروا نہیں کرتے۔ انبیاء علیہم الصلوات والتسلیمات کی اتباع میں اولیاء کرام بھی اسی راہ پر گامزن رہے۔ لوگوں نے ان پر طرح طرح کی الزام تراشیاں کیں، مگر آواز سگاں کی پروا نہ کرتے ہوئے قافلہ بدستور چلتا رہا۔ مزے کی بات یہ ہے کہ جو لوگ ان بزرگوں پر زبان طعن دراز کرتے ہیں اور انہیں ہدف سہام ملام بناتے ہیں وہ یہ کام "اصلاح" کی آڑ لے کر کرتے ہیں:۔

وَاِذَا قِیْلَ لَھُمْ لَا تُفْسِدُوْا فِی الْاَرْضِ قَالُوْا اِنَّمَا نَحْنُ مُصْلِحُوْنَ o اَلَآ اِنَّھُمْ ھُمُ الْمُفْسِدُوْنَ وَلٰکِنْ لَّا یَشْعُرُوْنَ o

(جب انہیں کہا جاتا ہے کہ دُنیا میں فساد بپا مت کرو تو کہتے ہیں کہ ہم تو اصلاح کرنے والے ہیں یاد رکھو ایسے لوگ مفسدہ پرداز ہیں، لیکن نہیں سمجھتے) لوگ اولیاء اللہ کو طعن و تشنیع کا نشانہ بناتے اور اولیاء اللہ خندہ پیشانی

سے اسے برداشت کرتے ہیں اور بحکم اَللّٰھُمَّ اھْدِ قَوْمِیْ فَاِنَّھُمْ لَا یَعْلَمُوْنَ (خدایا! میری قوم کو ہدایت کر ناکیونکہ انہیں معلوم نہیں کہ میں کون ہوں) یہ ان کے لیے دعاء خیر ہی کرتے ہیں۔

سب سے زیادہ اور سخت جرح محی الدین ابن العربی معروف بہ شیخ اکبر پر ہوئی۔ انہیں مشرک تک قرار دیا گیا اور یار لوگ توحید کے پرچار کی آڑ لیتے لیتے اپنا ایمان بھی کھو بیٹھے۔ ابن عربی پر ردو قدح کی سب سے بڑی وجہ ان کی عبارتوں کا نہ سمجھنا ہے اور ان لوگوں نے اپنی کج فہمی کو بنیاد قرار دیتے ہوئے ایک عمارت کھڑی کر ڈالی اور ابن العربی کو اس کج فہمی کی بنا پر کافر اور کیا کچھ کہہ ڈالا۔

خشتِ اول چوں نہد معمار کج　　　تا ثریا می رود دیوار کج

حقیقت کو ظاہر کرنے کے لیے بزرگوں نے کتابیں لکھیں۔ چنانچہ شیخ الاسلام قاضی القضاۃ مجد الدین محمد بن یعقوب متوفی ۸۱۷ھ ۔ ۱۴۱۴ء مصنف قاموس اور حافظ ابن حجرؒ کے استاد جلال الدین سیوطیؒ متوفی ۹۱۱ھ ۱۵۰۵ء اور امام عبدالوہاب شعرانی متوفی ۹۷۲ھ ۔ ۱۵۶۵ء نے اس سلسلہ میں تصانیف کیں، موجودہ دور میں مولانا اشرف علی صاحب تھانوی متوفی ۱۳۶۲ھ ۔ ۱۹۴۲ء نے بھی ابن عربی کی برئیت میں ایک کتاب لکھی ہے

اس میں کوئی شک نہیں کہ جعلی اور بناوٹی صوفی حقیقی اولیاء اللہ اور صوفیاء کے بھیس میں لوگوں کے سامنے آکر اُن کی جیبوں پر ڈاکہ ڈالتے اور طرح طرح کی چالوں سے عوام کو دھوکہ دیتے ہیں جس سے حقیقی صوفی اور اہلِ طریقت بدنام ہو جاتے ہیں اور لوگ ان سے بھی بدظن ہو جاتے ہیں۔ انہی صوفی نما لوگوں کے متعلق مولانا رومؒ فرماتے ہیں:۔

حرفِ درویشاں بدزدیدہ بسے　　　تا گماں آید کہ ہست او خود کسے

خردہ گیرد در سخن بر بایزیدؒ　　　ننگ دارد از درونِ او یزید

ہر کہ داند مر را چوں بایزیدؒ　　　روزِ محشر حشر گردد بایزید[1]

(یہ صوفی نما لوگ صوفیوں کے الفاظ یاد کر لیتے ہیں تاکہ لوگوں کو ان کے متعلق بھی صوفی ہونے کا گمان ہو، یہ لوگ اپنی تقریروں میں حضرت بایزید بسطامیؒ پر بھی نکتہ چینی کر جاتے ہیں۔ حالانکہ ان کا باطن اس قدر سیاہ ہوتا ہے کہ اسے دیکھ کر یزید کو بھی شرم آجاتے۔ لہٰذا جو شخص ایسے آدمی کو بایزید بسطامیؒ رحمۃ اللہ جیسا سمجھے گا اس کا حشر یزید کے ساتھ ہوگا)

نیز فرماتے ہیں:۔

اے بسا ابلیس آدم روی ہست　　　پس بہر دستے نباید داد دست

[1] مثنوی معنوی دفتر اول صفحہ ۴۹۔

(بہت سے شیطان انسانی شکل میں پھر رہے ہیں لہٰذا تمہیں ہر کسی کے ہاتھ میں اپنا ہاتھ نہیں دینا چاہیئے)

درحقیقت اس قسم کے لوگوں نے اسلام کو بہت نقصان پہنچایا ہے اور انہی غلط کار اور صوفی نما لوگوں کو دیکھکر بعض لوگوں نے تمام صوفیاء پر بلا امتیاز بدعتی اور مُشرک ہونے کا فتویٰ لگانا شروع کر دیا ہے۔

قرونِ اولیٰ سے لیکر آج تک جتنے بھی حقیقی صوفی اور اولیاء اللہ گزرے ہیں، سب کے سب خالص توحید اور اتباع سنت پر کاربند رہے ہیں اور انہوں نے سرِ مُو اس سے انحراف نہیں کیا اور انہوں نے اسی کی تلقین میں عمریں گذار دیں۔ اگر ان تمام اقوال کو جمع کیا جائے جن میں ان بزرگوں نے توحید اور اتباع سنت پر زور دیا ہے تو ایک مستقل کتاب ہو جائے۔ میں یہاں چیدہ چیدہ بزرگوں کے چند اقوال پیش کرتا ہوں تاکہ قارئین کرام کو معلوم ہو جائے کہ یہ لوگ کس حد تک توحید پر قائم اور سنت نبوی کے مُتبع رہے ہیں۔ ان سے یہ بھی معلوم ہو جائے گا کہ ظالموں نے ان بزرگوں پر کس قدر غلط اور بے جا الزامات لگا رکھے ہیں۔

۱- ابو سُلیمانؒ دارانی کا قول

ابو سلیمانؒ عبدالرحمٰن بن احمد بن عطیہ العنسی متوفیٰ ۲۱۵ھ احمد بن ابی الحواری کے استاد تھے۔ احمد بن ابی الحواری کا تمام خاندان زاہدوں کا خاندان تھا اور ان کی وفات ۲۳۰ھ میں ہوئی۔ ابو سلیمان فرماتے ہیں: رُبَمَا یَقَعُ فِیْ قَلْبِی النُّکْتَةُ مِنْ نُکَتِ الْقَوْمِ اَیَّامًا فَلَا اَقْبَلُ مِنْهُ اِلَّا بِشَاهِدَیْنِ عَادِلَیْنِ اَلْکِتَابِ وَالسُّنَّةِ [۱]

(بسا اوقات ایسا ہوتا ہے کہ میرے دل پر صوفیاء کے نکاتِ معرفت وارد ہوتے ہیں اور کئی دنوں تک رہتے ہیں مگر جب تک کتاب و سنت کے دو گواہ اس کی تائید نہیں کرتے میں انہیں قبول نہیں کرتا۔)

صوفیاء پر اعتراض کرنیوالے انصاف سے کام لیتے ہوئے ذرا غور کریں اور بتائیں کہ کوئی مُتبع سنت اس سے بڑھکر اتباع سُنّت کا دعویٰ کر سکتا ہے؟

۲- المحاسبیؒ کا قول

ابو عبداللہ الحارثؒ بن اسد المحاسبی عُلوم ظاہر اور باطن دونوں کے حامل تھے، اور انہوں نے بہت سی تصانیف بھی کی ہیں۔ ان کی وفات امام احمد بن حنبلؒ کی وفات کے دو سال بعد ۲۴۳ھ میں بغداد میں ہوئی، فرماتے ہیں: مَنْ صَحَّحَ بَاطِنَهٗ بِالْمُرَاقَبَةِ وَالْاِخْلَاصِ زَیَّنَ اللّٰهُ ظَاهِرَهٗ بِالْمُجَاهَدَةِ وَاتِّبَاعِ السُّنَّةِ۔ [۲]

جس نے مراقبہ اور اخلاص کے ذریعہ سے اپنا باطن درست کر لیا۔ اللہ اس کے ظاہر کو مجاہدہ اور اتباع سُنّت سے مزین کر دیتا ہے۔

---

[۱] رسالہ قشیریہ: ۱۶ اور نفحات الانس: ۱۴۔ نفحات الانس میں یہ قول یوں دیا ہے رُبَمَا ینکت الحقیقة قلبی اَرْبَعِیْنَ یَوْمًا فَلَا اٰذَنُ لَهَا اَنْ تَدْخُلَ قَلْبِیْ اِلَّا بِشَاهِدَیْنِ اَلْکِتَابِ وَالسُّنَّةِ [۲] لوائح الانوار: ۱: ۶۶

۳۔ سہل تستریؒ کا قول

ابو محمد سہل بن عبداللہ تستری ائمہ صوفیاء میں سے ہوئے ہیں۔ پرہیز گاری میں یکتائے روزگار اور صاحب کرامات تھے۔ شیطان سے اُن کا مناظرہ مشہور ہے۔ ذوالنون مصریؒ سے اُن کی ملاقات مکہ میں ہوئی۔ جب کہ یہ وہاں حج کے لیے آئے ہوئے تھے انہوں نے ۲۸۳ھ میں وفات پائی فرماتے ہیں،

اُصُوْلُنَا سَبْعَةُ اَشْيَاءَ :- اَلتَّمَسُّكُ بِكِتَابِ اللهِ وَالْاِقْتِدَاءُ بِسُنَّةِ رَسُوْلِ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَاٰلِهٖ وَسَلَّمَ وَاَكْلُ الْحَلَالِ وَكَفُّ الْاَذٰى وَاجْتِنَابُ الْمَعَاصِىْ وَالتَّوْبَةُ وَاَدَاءُ الْحَقِّ [۱]

(ہمارے سات اصول ہیں: قرآن پر پابند رہنا، سنتِ نبوی کی اقتداء، اکل حلال، کسی کو دکھ نہ دینا، گناہوں سے پرہیز، توبہ اور ادائے حق۔)

۴۔ جُنید بغدادیؒ کا قول

سید الطائفہ حضرت ابوالقاسم جُنید بن محمدؒ بغدادی متوفی ۲۹۷ھ مشہور و معروف اولیاء کبار میں سے ہوتے ہیں، شیخ شبلی رحمۃ اللہ متوفی ۳۳۴ھ نے انہی سے تربیت حاصل کی، فرماتے ہیں :-

(الف) اَلطُّرُقُ كُلُّهَا مَسْدُوْدَةٌ عَلَى الْخَلْقِ اِلَّا مَنِ اقْتَفٰى اَثَرَ الرَّسُوْلِ عَلَيْهِ السَّلَامُ [۲]

(رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے نقشِ قدم پر چلنے والوں کے سوا تمام لوگوں کے لیے قرب الٰہی کے راستے بند ہیں۔)

(ب) مَنْ لَّمْ يَحْفَظِ الْقُرْاٰنَ وَلَمْ يَكْتُبِ الْحَدِيْثَ لَا يُقْتَدٰى بِهٖ فِىْ هٰذَا الْاَمْرِ لِاَنَّ عِلْمَنَا هٰذَا مُقَيَّدٌ بِالْكِتَابِ وَالسُّنَّةِ۔

(جس شخص نے نہ قرآن مجید یاد کیا ہو اور نہ حدیث لکھی ہو۔ طریقت میں اس شخص کی پیروی نہیں کی جا سکتی۔ اس لیے کہ ہمارے اس علم طریقت میں کتاب و سنت کی قید پائی جاتی ہے۔)

(ج) عِلْمُنَا هٰذَا مُقَيَّدٌ بِحَدِيْثِ رَسُوْلِ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَاٰلِهٖ وَسَلَّمَ [۳]

(ہمارا علم طریقت حدیث رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے مضبوط ہوتا ہے۔)

(د) مَذْهَبُنَا هٰذَا مُقَيَّدٌ بِاُصُوْلِ الْكِتَابِ وَالسُّنَّةِ۔

(ہمارا مذہب اصول کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ سے مقید ہے۔)

---

[۱] لواقح الانوار: ۱: ۶۶ [۲] رسالہ قشیریہ: ۲۰ [۳] رسالہ قشیریہ ۲۶

۵- ابوحمزہ بغدادیؒ کا قول

ابوحمزہ محمد ابراہیمؒ بغدادی علیٰ بن آبان کی اولاد میں سے تھے قرآن مجید کی قراءتوں اور فقہ کے عالم تھے۔ ابوبکر کتانی متوفیٰ ۳۲۲ھ اور خیر نساجؒ متوفیٰ ۳۲۲ھ وغیرہ نے ان سے حدیث کی روایت کی ہے۔ یہ وہی بزرگ ہیں جن سے امام احمد بن حنبلؒ متوفیٰ ۲۴۱ھ مسائل حل کرانے کے لیے آیا کرتے تھے۔ ان کی وفات ۲۹۸ھ میں ہوئی۔ ان کی وفات کا واقعہ یوں بیان کیا جاتا ہے کہ جمعہ کے دن اپنی مجلس میں تقریر فرما رہے تھے کہ یکایک ان کی حالت بدل گئی اور وہیں منبر پر گر پڑے۔ آئندہ جمعہ تک یہی حالت رہی اور انتقال کر گئے۔ فرماتے ہیں:-

مَنْ عَلِمَ طَرِيْقَ الْحَقِّ سَهُلَ عَلَيْهِ سُلُوْكُهٗ وَلَا دَلِيْلَ عَلَى الطَّرِيْقِ إِلَى اللّٰهِ إِلَّا مُتَابَعَةُ الرَّسُوْلِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَاٰلِهٖ وَسَلَّمَ فِيْ أَحْوَالِهٖ وَأَفْعَالِهٖ وَأَقْوَالِهٖ [۱]

(جس نے حق تعالیٰ کا راستہ معلوم کر لیا اُس کے لیے اس پر چلنا بھی آسان ہو جاتا ہے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے احوال، افعال اور اقوال میں تابعداری کئے بغیر اس راہ کی طرف کوئی رہنمائی بھی نہیں ہو سکتی۔)

۶- ابنِ عطاء آدمیؒ کا قول

ابوالعباس احمد بن محمد بن سہل بن عطاء الآدمیؒ صوفیا کے کبار مشائخ میں سے تھے۔ انہوں نے تصوف کے رنگ میں قرآن مجید کی تفسیر بھی لکھی ہے جب القاہر باللہ کے وزیر نے منصور حلاجؒ کو قتل کیا تو اُن سے پوچھا کہ تم منصور حلاجؒ کے بارے میں کیا کہتے ہو؟ انہوں نے جواب بدل کر کہا۔ خود تمہارے پاس لوگوں کا مال پڑا ہے اسے واپس کیوں نہیں کرتے؟ وزیر نے کہا: کہ تم بات ٹال رہے ہو اور حکم دیا کہ ایک ایک کر کے ان کے تمام دانت نکال دیئے جائیں اور انکے سر میں گاڑ دیئے جائیں۔ اسی سے ان کی وفات ہوئی۔ یہ واقعہ ذوالقعدہ ۳۰۵ھ کا ہے۔ فرماتے ہیں [۲]:-

مَنْ أَلْزَمَ نَفْسَهٗ آدَابَ الشَّرِيْعَةِ نَوَّرَ اللّٰهُ قَلْبَهٗ بِنُوْرِ الْمَعْرِفَةِ وَلَا مَقَامَ أَشْرَفُ مِنْ مَقَامِ مُتَابَعَةِ الْحَبِيْبِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَاٰلِهٖ وَسَلَّمَ فِيْ أَوَامِرِهٖ وَأَفْعَالِهٖ وَأَخْلَاقِهٖ [۱]

(جس نے اپنے نفس پر آدابِ شریعت کا لحاظ رکھنا لازم قرار دیا اللہ اس کے دل کو نورِ معرفت سے منور فرمائیں گے۔ پیارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے اوامر، افعال اور اخلاق کی تابعداری سے بڑھ کر کوئی مقام نہیں ہو سکتا۔)

۷- عبداللہ بن منازلؒ کا قول

ابومحمد عبداللہ بن منازلؒ یگانۂ روزگار ملامتیہ [۳] کے شیخ اور عالم تھے انہوں نے کثرت سے احادیث لکھیں، ان کی وفات ۳۲۹ھ یا ۳۳۰ھ میں نیشاپور میں ہوئی، فرماتے ہیں:-

---

[۱] نفحات الانس: ۱۴۱-۱۴۲ نفحات میں القاہر باللہ کا نام دیا ہے حالانکہ قاہر باللہ کا عہد خلافت ۳۲۰ھ تا ۳۲۲ھ ہے اور ابن عطاء کا قتل قاہر کے باپ المقتدر باللہ کے عہد میں ہوا ہے۔ مقتدر کا عہد خلافت ۲۹۵ھ تا ۳۲۰ھ ہے۔ [۲] رسالہ قشیرہ: ۲۵

(بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر)

لَمْ یُضَیِّعْ اَحَدٌ فَرِیْضَۃً مِّنَ الْفَرَآئِضِ اِلَّا ابْتَلَاہُ اللّٰہُ تَعَالٰی بِتَضْیِیْعِ السُّنَنِ وَلَمْ یُبْلَ اَحَدٌ بِتَضْیِیْعِ السُّنَنِ اِلَّا اَوْشَمَکَ اَنْ یُّبْتَلٰی بِالْبِدَعِ [۱]

(جس کسی نے ایک فرض بھی ترک کیا وہ سنتوں کے ترک کرنے میں مبتلا ہوگا اور جو سنتوں کے ترک کرنے میں مبتلا ہوا وہ عنقریب بدعتوں کے ارتکاب میں مبتلا ہوگا۔)

۸۔ ابوبکر طمستانی کا قول

ابوبکر طمستانیؒ کو صوفیاء کے پانچویں طبقہ میں شمار کیا جاتا ہے علم وحال کے اعتبار سے یگانۂ روزگار تھے، شیخ شبلی متوفی ۳۳۴ھ اور ابراہیم دباغ کے شاگرد تھے۔ ان کی وفات ۳۴۰ھ کے بعد ہوئی فرماتے ہیں:

(الف) مَنِ اتَّبَعَ الْکِتَابَ وَالسُّنَّۃَ وَھَاجَرَ اِلَی اللّٰہِ بِقَلْبِہٖ وَاتَّبَعَ اٰثَارَ الصَّحَابَۃِ لَمْ تَسْبِقْہُ الصَّحَابَۃُ رضی اللہ عنہم اِلَّا بِکَوْنِہِمْ رَاَوْا رَسُوْلَ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَاٰلِہٖ وَسَلَّمَ [۲]

(جس نے کتاب وسنت کی پیروی کی دل سے اللہ کی طرف ہجرت کی اور صحابہؓ کے نقش قدم پر چلا تو صحابہؓ اس سے صرف اس لیے افضل ہوں گے کہ انھوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا ہے۔)

(ب) اَلطَّرِیْقُ وَاضِحٌ وَالْکِتَابُ وَالسُّنَّۃُ قَائِمٌ بَیْنَ اَظْہُرِنَا وَفَضْلُ الصَّحَابَۃِ مَعْلُوْمٌ لِسَبْقِہِمْ اِلَی الْھِجْرَۃِ وَبِصُحْبَتِہِمْ فَمَنْ صَحِبَ مِنَّا الْکِتٰبَ وَالسُّنَّۃَ وَتَغَرَّبَ عَنْ نَفْسِہٖ وَالْخَلْقِ وَھَاجَرَ بِقَلْبِہٖ اِلَی اللّٰہِ وَھُوَ الصَّادِقُ الْمُصِیْبُ [۳]

(ہمارا طریقہ واضح ہے اور کتاب وسنت ہمارے درمیان قائم ہے اور ہجرت اور صحبت نبویؐ کی وجہ سے صحابہؓ کا افضل ہونا بھی معلوم ہے لہٰذا ہم میں سے جو شخص کتاب وسنت کا ساتھ دے اور اپنے نفس اور مخلوق سے دور ہو جائے اور دل سے اللہ کی طرف ہجرت کرے تو وہ سچا ہے اور صحیح راہ پر ہے۔)

۹۔ ابوالقاسم قشیری کا قول

ابوالقاسم عبدالکریم بن ہوازن قشیریؒ۔ رسالہ قشیریہ اور تفسیر لطائف الاشارات کے مصنف ہیں انھوں نے ان دو کتابوں کے علاوہ اور بھی بہت سی تصانیف کی ہیں یہ ابوعلی دقاقؒ متوفی ۴۰۳ھ کے مرید اور ابوعلی فارمدیؒ کے استاد تھے، سید علی بن عثمان بن ابوعلی الجلابی الغزنویؒ متوفی ۴۶۵ھ۔ ۱۰۷۲ء سید علی ہجویری اور داتا گنج بخش کے نام سے مشہور ہیں ان کے ہمعصر تھے، ہندوستان آنے سے پہلے داتا صاحب کی ان سے اکثر ملاقات رہتی تھی۔ داتا صاحب

(بقیہ حاشیہ صفحہ سابقہ) [۳] ملامتیہ صوفیاء کا ایک فرقہ ہے جو اخلاق کا مجسمہ ہوتے ہیں اور ان لوگوں کی کوشش یہ ہوتی ہے کہ ان کے نیک اعمال لوگوں پر ظاہر نہ ہوں اور وہ اپنی برائیوں کو نہیں چھپاتے (عوارف المعارف ج ۱: ۳۵۹)

[۱] رسالہ قشیریہ: ۲۸، [۲] لواقح الانوار: ۱: ۱۰۴ [۳] رسالہ قشیریہ: ۳۱

فرماتے ہیں کہ میں نے ان سے دریافت کیا کہ طریقۂ فکر میں آپ کی ابتدا کس طرح ہوئی جواب دیا کہ مجھے ایک بار گھر کی کھڑکی کے لیے پتھر درکار تھا جس پتھر کو اٹھاتا گوہر بن جاتا۔ لہٰذا میں اسے پھینک دیتا۔ سید علی ہجویریؒ فرماتے ہیں کہ اس کی وجہ یہ تھی کہ ان کے نزدیک گوہر اور پتھر برابر تھے، بلکہ ان کے نزدیک گوہر پتھر سے کم تھا اس لیے کہ انہیں پتھر کی ضرورت تھی گوھر کی ضرورت نہ تھی۔[۱] قشیری کی وفات ۴۶۵ھ میں ہوئی فرماتے ہیں:۔

اِعْلَمُوْا رَحِمَکُمُ اللّٰہُ اَنَّ شُیُوْخَ ھٰذِہِ الطَّآئِفَۃِ بَنَوْا قَوَاعِدَ اَمْرِھِمْ عَلٰی اُصُوْلٍ صَحِیْحَۃٍ فِی التَّوْحِیْدِ صَانُوْا بِھَا عَقَائِدَھُمْ عَنِ الْبِدَعِ وَدَانُوْا بِمَا وَجَدُوْا عَلَیْہِ السَّلَفَ وَاَھْلَ السُّنَّۃِ مِنْ تَوْحِیْدٍ لَیْسَ فِیْہِ تَمْثِیْلٌ وَّلَا تَعْطِیْلٌ وَّعَرَفُوْا مَا ھُوَ حَقُّ الْقِدَمِ۔[۲]

(یاد رکھو! خدا تم پر رحم کرے کہ اس جماعت کے جس قدر شیوخ گذرے ہیں انہوں نے تصوف کی بنیاد توحید کے صحیح اصولوں پر رکھی ہے اور انہوں نے اپنے عقائد کو بدعتوں سے بچائے رکھا ہے اور انہی امور کی پیروی کی ہے جن پر انہوں نے سلف صالحین اور اہل سنت کو پایا ہے۔ یعنی ایسی توحید جس میں نہ (فرقۂ ممثلہ کی) تمثیل اور نہ (فرقۂ معطلہ کی) تعطیل پائی جاتی ہے اور انہوں نے خدائے لم یزل ولا یزال کے حق کو پہچانا ہے۔)

پھر کبار صوفیاء کے حالات لکھ چکنے کے بعد امام قشیریؒ فرماتے ہیں:۔

ھٰذَا ھُوَ ذِکْرُ جَمَاعَۃٍ مِنْ شُیُوْخِ ھٰذِہِ الطَّائِفَۃِ کَانَ الْغَرْضُ مِنْ ذِکْرِھِمْ فِیْ ھٰذَا الْمَوْضِعِ التَّنْبِیْہُ عَلٰی اَنَّھُمْ مُجْمِعُوْنَ عَلٰی تَعْظِیْمِ الشَّرِیْعَۃِ مُتَّصِفُوْنَ بِسُلُوْکِ طُرُقِ الرِّیَاضَۃِ مُقِیْمُوْنَ عَلٰی مُتَابَعَۃِ السُّنَّۃِ[۳]

(صوفیاء کے شیوخ کی ایک جماعت کا ہم نے ذکر کر دیا ہے۔ ان کا ذکر کرنے سے ہماری غرض یہ ہے کہ لوگوں کو آگاہ کر دیا جائے کہ تمام کے تمام صوفیاء اس بات پر متفق ہیں کہ شریعت کی تعظیم کی جائے۔ یہ لوگ طرح طرح کی ریاضتیں کرتے ہیں اور اتباع سنت پر کاربند رہتے ہیں۔)

۱۰۔ شیخ بقاء بن بطو کا قول

شیخ بقاء بن بطو متوفی ۵۵۲ھ شیخ عبدالقادر جیلانی متوفی ۵۶۱ھ کے ہمعصر اور صاحب کرامات تھے۔ ان کے متعلق شیخ عبدالقادر جیلانی فرمایا کرتے تھے:۔

"اکثر مشایخ کو اللہ تعالیٰ نے ناپ تول کر معرفت عطا کی ہے مگر انہیں بغیر اندازے کے ہی عطا کر دی گئی ہے"

[۱] نفحات الانس: ۲۸۸ [۲] رسالہ قشیریہ: ۳ [۳] رسالہ قشیریہ: ۳۳

انہوں نے سید عبدالقادر جیلانیؒ کے طریقہ کے متعلق یوں رائے ظاہر کی ہے۔

كَانَ طَرِيقُ الشَّيْخِ عَبْدِ الْقَادِرِ جِيلَانِيِّ ...... وَمُوَافَقَةُ الْكِتَابِ وَالسُّنَّةِ فِي كُلِّ نَفَسٍ وَخَطْرَةٍ [1]

(شیخ عبدالقادر جیلانیؒ کا طریقہ ہر دم اور ہر لحظہ کتاب و سنت کی موافقت کرنا تھا۔)

۱۱۔ ابن حجرؒ کی رائے

شیخ الاسلام علامہ ابن حجر عسقلانی شارح صحیح بخاری سے کسی نے سوال کیا کہ یہ سماع جسے بعض فقراء نے دفوف و آلات کے ساتھ اختیار کر رکھا ہے کیا شیخ عبدالقادرؒ بھی اس سماع میں حاضر ہوا کرتے تھے یا کسی کو حاضر ہونے کا حکم دیتے تھے یا اس کے جواز یا حرمت کا حکم دیتے تھے یا نہیں؟

جواب:۔ علامہ ابن حجرؒ نے جواب دیا، شیخ عبدالقادرؒ کے متعلق جو صحیح اطلاع ہمیں ملی ہے وہ یہ ہے کہ وہ ایک فقیہ، زاہد اور عابد تھے وعظ فرماتے تو زہد اور توبہ کی ترغیب دیتے اور گناہ پر سزا ملنے کا خوف دلاتے۔ چنانچہ لاتعداد مخلوق نے ان کے ہاتھوں پر توبہ کی۔ جتنی کرامات ان کی مشہور ہیں اتنی نہ ان کے زمانہ اور نہ ان کے بعد ہم نے کسی سے ظاہر ہوتی ہوئی نہیں سنیں [2]

۱۲۔ امام نوویؒ کی رائے

شیخ الاسلام محی الدین نووی شارح صحیح مسلم اپنی کتاب بستان العارفین میں لکھتے ہیں [3]، "معتبر روایات سے جس قدر کرامات ہم تک شیخ عبدالقادر کے متعلق پہنچی ہیں اس قدر کسی اور کے متعلق نہیں پہنچیں۔ یہ بغداد میں اپنے زمانہ کے شافعیہ اور حنبلیہ کے رئیس تھے اور علم کے اعتبار سے بھی انہیں رئیس مانا جاتا تھا۔ متعدد اکابر نے ان کی صحبت سے فیضان حاصل کیا اور عراق کے بڑے بڑے شیوخ کو انہی سے نسبت ہے۔ ان کے لاتعداد مرید تھے اور تمام مشائخ اور علماء کا ان کی تعظیم و تکریم کرنے پر اتفاق ہے، ہر جہت اور ہر ملک سے لوگ اُن کی زیارت کے لیے اور مرادیں لے کر آتے۔ ہر طرف سے اہل سلوک کھچے چلے آتے تھے۔ یہ اچھی صفات، شریف اخلاق، کامل ادب اور مروت والے تھے، نہایت متواضع خندہ پیشانی، وافر علم اور عقل کے مالک تھے۔ کلام شرع اور احکام شرع کی شدت سے پیروی کرتے۔ اہل علم کی تعظیم کرتے۔ دیندار اور متبع سُنّت کی قدر کرتے۔ اہل بدعت اور اہل ہوا کو بُرا جانتے۔ مختصر یہ کہ ان کے زمانہ میں اُن جیسا کوئی شخص نہ تھا۔

---

[1] قلائد الجواہر: ۱۰۵ لواقح الانوار: ۱: ۱۱۰ شیخ بقا بن بطو کے مزید حالات کے لیے ملاحظہ ہوں، لواقح الانوار: ۱: ۱۲۶ نفحات الانس: ۴۹۶ اور قلائد الجواہر: ۱۰۵ [2] قلائد الجواہر ۱۳۵ [3] قلائد الجواہر ۱۳۷

۱۳۔ سید عبدالقادرؒ اور شیطان

سید عبدالقادرؒ کے بیٹے سید موسیٰؒ (۵۳۹ھ تا ۶۱۸ھ) بیان کرتے ہیں کہ مَیں نے اپنے باپ سے سُنا کہ میں ایک مرتبہ جنگل میں نکل گیا اور کئی دنوں تک مجھے پانی نہ ملا اور مجھے سخت پیاس لگی۔ اس پر بادل آئے اُن سے کچھ نمی ہوئی اور مجھے قدرے تسکین ہوگئی اس کے بعد مَیں نے ایک نور دیکھا جس سے تمام افق روشن ہوگیا اور اس میں سے ایک صورت نمودار ہوئی جس نے مجھے پکار کر کہا: اے عبدالقادر میں تمہارا رب ہوں، مَیں نے تمہارے لیے تمام محرمات جائز کر دیئے ہیں مَیں نے فوراً اَعُوْذُ بِاللهِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ پڑھا اور کہا: اے ملعون دُور ہو جا۔ بس پھر کیا تھا تمام نور ظلمت میں بدل گیا اور وہ صورت دھواں بن گئی۔ اس نے پھر مجھے مخاطب کر کے کہا: اے عبدالقادر اپنے علم اور منزلت کی وجہ سے مجھ سے بچ گئے۔ میں نے اس طرح ستّر صوفیاء کو گمراہ کیا ہے۔ مَیں نے جواب میں کہا: یہ اللہ کا فضل اور احسان ہے۔" اس کے بعد کسی نے حضرت سے دریافت کیا کہ آپ کو کیسے معلوم ہوا کہ یہ شیطان ہے، تو آپ نے فرمایا، اس کا یہ کہنا کہ مَیں نے تمام محرمات تمہارے لیے حلال کر دیئے ہیں، میرے لیے اُس کے شیطان ہونے کا کافی ثبوت تھا کیونکہ اللہ تعالیٰ تو بُری باتوں کا حکم نہیں کرتے[۱]

۱۴۔ سُہروردیؒ کا قول

شیخ شہاب الدین ابوحفص عمر بن محمد بن عبداللہ السُہروردیؒ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی اولاد میں سے تھے۔ اسی لیے انہیں "البکری" کہا جاتا ہے انہوں نے راہ طریقت اپنے چچا شیخ ضیاء الدین ابوالجیب عبدالقادر سہروردیؒ متوفیٰ ۵۶۳ھ سے حاصل کی اور سید عبدالقادر جیلانیؒ اور دیگر مشائخ کی صحبت پائی۔ اُن کی متعدد تصانیف ہیں جن میں سے عوارف المعارف، رشف النصائح، اعلام الھُدیٰ اور عقیدۃ ارباب التقیٰ زیادہ مشہور ہیں، ایک مرتبہ ایک شخص نے انہیں لکھا کہ "اگر مَیں عمل کرنا چھوڑ دیتا ہوں تو باطل کی طرف لگ جاتا ہوں اور اگر عمل کرتا ہوں تو مجھ میں غرور پیدا ہو جاتا ہے۔" آپ نے جواب میں لکھا "عمل کئے جاؤ اور غرور سے اللہ سے معافی مانگو۔"[۲]

شیخ سعد الدین حمویؒ متوفیٰ ۶۵۰ھ سے کسی نے پوچھا کہ محی الدین ابن عربیؒ کو آپ نے کیسا پایا؟ جواب دیا: وہ ایک ایسا موجزن سمندر ہے جس کی کوئی انتہا نہ ہو۔ پھر پوچھا شیخ شہاب الدین سہروردی کو کیسا پایا تو جواب دیا:-

نُوْرُ مُتَابَعَةِ النَّبِيِّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَآلِهٖ وَسَلَّمَ فِيْ جَبِيْنِ السُّهْرَوَرْدِيِّ شَيْئٌ اٰخَرُ۔[۳]

(سُہروردیؒ کی پیشانی میں اطاعت الرسول کا نور کچھ اور ہی دکھائی دیتا ہے۔)

سُہروردی کی ولادت ۵۳۹ھ میں اور وفات ۶۳۲ھ میں ہوئی۔

---

[۱] قلائد الجواہر: ۲۰؛ [۲] نفحات الانس: ۲۱۰؛ [۳] عوارف المعارف

سہروردی عوارف المعارف کے خطبہ میں فرماتے ہیں[1]

ثُمَّ اِنَّ اِیْثَارِیْ لِهَدْیِ هٰؤُلَآءِ الْقَوْمِ وَمَحَبَّتِیْ لَهُمْ عِلْمًا بِشَرَفِ حَالِهِمْ وَصِحَّةِ طَرِیْقَتِهِمُ الْمَبْنِیَّةِ عَلَی الْکِتَابِ وَالسُّنَّةِ الْمُحَقَّقِ بِهِمَا مِنَ اللّٰهِ الْکَرِیْمِ الْفَضْلُ وَالْمِنَّةُ حَدَانِیْ اَنْ اَذُبَّ عَنْ هٰذِهِ الْعِصَابَةِ بِهٰذِهِ الصُّبَابَةِ وَاُؤَلِّفَ اَبْوَابًا فِی الْحَقَائِقِ وَالْاٰدَابِ مُعْرِبَةً عَنْ وَجْهِ الصَّوَابِ فِیْمَا اعْتَمَدُوْهُ مُشْعِرَةً بِشَهَادَةِ صَرِیْحِ الْعِلْمِ لَهُمْ فِیْمَا اعْتَقَدُوْهُ حَیْثُ کَثُرَ الْمُتَشَبِّهُوْنَ وَاخْتَلَفَتْ اَحْوَالُهُمْ وَتَسَتَّرَ بِهِمُ الْمُتَسَتِّرُوْنَ وَفَسَدَتْ اَعْمَالُهُمْ وَسَبَقَ اِلٰی قَلْبِ مَنْ لَا یَعْرِفُ اُصُوْلَ سَلَفِهِمْ سُوْءُ ظَنٍّ وَکَادَ لَا یَسْلَمُ مِنْ وَقِیْعَةٍ فِیْهِمْ وَطَعَنَ ظَنًّا مِنْهُ اَنَّ حَاصِلَهُمْ رَاجِعٌ اِلٰی مُجَرَّدِ رَسْمٍ وَتَخَصُّصَهُمْ عَائِدٌ اِلٰی مُطْلَقِ اِسْمٍ۔

پھر چونکہ مجھے اُن کے حال کی بزرگی کا علم تھا اور میں یہ بھی جانتا تھا کہ ان کا طریقہ صحیح ہے اور اس کی بنیاد کتاب وسنت پر ہے اور انہیں دو کی بدولت اللہ کی طرف سے فضل اور احسان ہوتا ہے اس لیے میں ان کے طریقہ کو اپنا[؟] اور ان سے محبت کرتا تھا اور اسی بات نے مجھے مجبور کیا کہ میں اس مختصر سی کتاب کے ذریعہ سے ان لوگوں کی حمایت کروں اور حقائق وآداب کے متعلق چند ابواب تالیف کروں تاکہ جن امور میں لوگوں نے بے اعتدالی کی ہے ان میں انہیں صحیح راہ کا پتہ چل جائے اور انہیں یہ بھی معلوم ہو جائے کہ ان کے جو عقائد ہیں اُن کے متعلق اُن کے پاس صریح علم کی شہادت موجود ہے۔ اس لیے کہ کثرت سے ایسے لوگ پائے جاتے ہیں جنہوں نے صوفیاء کا سارا طریقہ اختیار کر رکھا ہے مگر درحقیقت اُن کے حالات صوفیاء سے مختلف ہیں اور کچھ لوگ صوفیاء کے لباس میں لوگوں کے سامنے آ رہے ہیں، حالانکہ یہ لوگ بداعمال ہیں جس کی وجہ سے ان لوگوں کے دلوں میں جو صوفیاء کے اسلاف کے اصولوں سے ناواقف ہیں، بدگمانی پیدا ہو جاتی ہے جس کی وجہ سے وہ صوفیاء کو بُرا کہنے لگ جاتے ہیں اور وہ یہ گمان کر بیٹھتے ہیں کہ تصوّف محض ایک رسم ہے اور صوفی محض نام جس کی کوئی حقیقت نہیں۔

۱۵- ابن العربیؒ

محی الدین محمد بن علی ابن العربیؒ مرسیہ (اندلس) میں ۱۷ رمضان ۵۶۰ھ- جولائی ۱۱۶۵ء میں پیدا ہوئے۔ ۵۶۹ھ - ۱۱۷۳ء سے لیکر ۵۹۹ھ - ۱۲۰۲ء تک اشبیلیہ میں رہے اور پھر مشرق کی طرف سیاحت کے لیے نکل گئے۔ یہ مصر سے ہوتے ہوتے حجاز پہنچے اور وہاں ایک مدت تک قیام پذیر رہنے کے بعد بغداد، موصل اور ایشیائے کوچک کا سفر کیا اور بالآخر دمشق پہنچ کر سکونت اختیار

[1] اصل کتاب میں "اَذُبَّ" کی بجائے "اذہب" چھپا ہے جو غلط ہے میں نے اس کی تصحیح کر دی ہے۔

کرلی اور وہیں ۶۳۸ھ ۱۲۴۰ء میں وفات پائی۔ اُن کی پانچ صد ۵۰۰ سے زائد تصانیف ہیں، انہوں نے اپنے ایک مرید کی درخواست پر خود ایک رسالہ لکھا ہے، جس میں انہوں نے اپنی دوسو پچاس ۲۵۰ سے زائد تصانیف کا ذکر کیا ہے۔ اُن کی بیشتر تصانیف تصوّف میں ہیں، اسی رسالہ کے خطبہ میں فرماتے ہیں کہ دیگر اشخاص کی طرح ان تصانیف سے میرا مقصد محض مؤلّف بننا نہیں، بلکہ بعض تصانیف کا سبب تو یہ ہوا کہ حق سبحانہ کی طرف سے مجھ پر معانی کا وُرُود ہوتا تھا اور اگر ان کا اظہار نہ کرتا تو مجھے جل جانے کا اندیشہ تھا اور بعض تصانیف کے متعلق مجھے خواب یا مکاشفہ میں حکم دیا گیا۔[1]

ابن العربیؒ کے متعلق سہروردیؒ کی رائے

امام عفیف الدین عبداللہ بن اسعد یافعی متوفی بعد از ۷۵۰ھ مرآۃ الجنان و عبرۃ الیقظان فی معرفۃ حوادث الزمان میں تحریر فرماتے ہیں کہ شیخ شہاب الدین سہروردیؒ سے ابن العربیؒ کی ملاقات ہوئی۔ دونوں کچھ دیر تک ایک دوسرے کو دیکھتے رہے اور پھر کسی قسم کی گفتگو کئے بغیر ایک دوسرے سے جُدا ہو گئے۔ اس کے بعد کسی نے ابن عربی سے شہاب الدین سہروردیؒ کے متعلق دریافت کیا تو فرمایا:

فَصْلٌ مَمْلُوٌّ مِنْ قَرْنِهٖ اِلٰی قَدَمِهٖ مِنَ السُّنَّةِ

یہ شخص سَر سے پاؤں تک سنت سے لبریز ہے

اور جب سہروردی سے ابن العربیؒ کے متعلق دریافت کیا گیا تو کہا ھُوَ بَحْرُ الْحَقَائِقِ یہ شخص حقائق کا سمندر ہے ابن العربیؒ کی تصانیف میں سے زیادہ تر لے دے ان کی دو تصانیف پر ہوئی۔ ایک فصوص الحکم پر اور دوسرے فتوحات مکیّہ پر۔ فتوحاتِ مکیۃ بڑی ضخیم کتاب ہے جو پانچ سَو ساٹھ ۵۶۰ ابواب پر مشتمل ہے۔ اس کے مقابلہ میں فصوص الحکم ایک مختصر سی کتاب ہے جو ستائیس ابواب پر مشتمل ہے۔

مولانا جامیؒ کی رائے

مولانا عبدالرحمٰن جامیؒ متوفی ۸۹۸ھ ۱۴۹۲ء ابن العربیؒ پر طعن کرنے کا سبب بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں:۔

"واعظم اسبابِ طعن طاعناں در وے کتاب فُصُوصُ الحکم است وہمانا کہ منشاء طعن طاعناں یا تقلید و تعصب است یا عدمِ اطلاع بر اصطلاحات وے یا غموض معانی وحقائق کہ در مصنفات خود درج کردہ است و آں قدر حقائق ومعارف کہ در مصنفات وے بہ تخصیص در فُصُوص و فتوحات اندراج یافتہ است در ہیچ کتاب یافت نمی شود واز ہیچ کس ازیں طائفہ ظاہر نہ شدہ است واین فقیر از خدمت خواجہ برہان الدین ابو نصر پارسا قدس سرہ چنیں استماع دارد کہ می گفت کہ والدِ ما می فرمود فصوص جان است و فتوحات دل۔"[2]

---

[1] نفحات الانس: ۴۹۶ [2] ایضاً ۴۹۶۔ ۴۹۷

"ان پر طعن کرنیوالوں کے لیے سب سے بڑا سبب کتاب فصوص الحکم ہے جس کی وجہ یا تقلید اور تعصب ہے یا اُن کی اصطلاحات سے نا واقفی یا ان معانی اور حقائق کا دقیق ہونا جو انہوں نے اپنی تصانیف میں درج کیے ہیں اور جس قدر حقائق و معارف انہوں نے اپنی تصانیف میں درج کیے ہیں بالخصوص فصوص اور فتوحات میں اس قدر کسی اور کتاب میں پائے نہیں جاتے اور نہ ہی اس قدر کسی اور بزرگ سے ظاہر ہوتے ہیں، میں نے خواجہ برہان الدین ابو نصر پارسا قدس سرہ سے سنا ہے کہ ان کے والدؒ نے فرمایا کہ فصوص جان ہے اور فتوحات دل"۔

امام شعرانیؒ کی رائے

امام شعرانی اُن پر طعن کرنے کا سبب بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

وَمَا اَنْکَرَ مَنْ اَنْکَرَ عَلَیْہِ اِلَّا لِدِقَّۃِ کَلَامِہٖ۔

"جنہوں نے اُن کا انکار کیا ہے۔ انہوں نے صرف ان کے کلام کے دقیق ہونے کی وجہ سے کیا ہے"۔

علماء وصوفیا نے ان کے کلام کی دِقّت کو مدّنظر رکھتے ہوئے ان کی کتابوں کی شرح لکھی ہیں چنانچہ عزّ بن جماعہ۔ عبدالرزاق کاشانی، جاؔمی اور آفندی بالی نے فصوص الحکم کی شرح لکھیں اور موجودہ دَور میں مولانا اشرف علی تھانوی صاحبؒ متوفی ۱۳۶۲ھ ۱۹۴۲ء نے اردو میں فصوص الحکم کے بعض مشکل مقامات کو حل کیا ہے اور کتاب کا نام خُصُوْصُ الْکَلِمِ فِیْ حَلِّ فُصُوْصِ الْحِکَمِ رکھا ہے اور جب بعض لوگوں نے اپنی کم مائگی اور جہالت کی وجہ سے ابن عربی کے کلام کو نہ سمجھا اور ان پر نکتہ چینی شروع کر دی تو متعدد علماء نے ابن العربی کی طرفداری میں کتابیں لکھیں چنانچہ عبدالغنی نابلسیؒ نے اَلرَّدُّ الْمَتِیْنُ عَلٰی مُنْتَقِصِ الْعَارِفِ مُحْیِ الدِّیْنِ لکھی، علامہ جلال الدین سیوطیؒ نے تَنْبِیْہُ الْغَبِیْ فِیْ تَنْزِیْہِ ابْنِ الْعَرَبِیْ لکھی اور عبدالوہاب شعرانی نے تَنْبِیْہُ الْاَغْنِیَآءِ عَلٰی قَطْرَۃٍ مِّنْ بَحْرِ عُلُوْمِ الْاَوْلِیَآءِ لکھی۔ اس کے علاوہ سراج الدین مخزومیؒ اور حافظ ابن حجرؒ کے استاد مجدالدین فیروز آبادیؒ مصنف قاموس نے بھی ان کی تائید میں کتابیں لکھیں، موجودہ دور میں مولانا اشرف علی تھانوی نے ابن عربی کی طرفداری میں اَلتَّنْبِیْہُ الطَّرَبِیُّ مِنْ تَنْزِیْہِ ابْنِ الْعَرَبِیْ لکھی ہے۔ تھانوی صاحب نے کتاب کے خاتمہ پر ابن العربیؒ کے متعلق اپنا عقیدہ اور ان کی مشکل عبارات کے متعلق اپنا مسلک بھی بیان کر دیا ہے، نیز فرمایا ہے کہ مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ نے جہاں کہیں ابن العربی پر تنقید کی ہے یہ انہی کا حق ہے ہمارا حق نہیں۔ اب میں یہاں ابن عربیؒ کی فتوحاتِ مکیہ میں سے عبارتیں پیش کرتا ہوں جن میں انہوں نے شریعت اور کتاب و سنّت کی پابندی پر زور دیا ہے۔

۱۔ پہلی عبارت

مولانا جامی فرماتے ہیں:۔ وہم وے آوردہ است حکایت از حال خود:۔

وَلَقَدْ اٰمَنَّا بِاللّٰہِ وَبِرَسُوْلِہٖ وَمَا جَآءَ بِہٖ مُجْمَلًا وَّمُفَصَّلًا مِمَّا

ل لوائح الانوار ۱: ۱۶۳

وَصَلَ اِلَیْنَا مِنْ تَفْصِیْلِهٖ وَمَا لَمْ یَصِلْ اِلَیْنَا اَوْلَمْ یَثْبُتْ عِنْدَنَا فَنَحْنُ مُؤْمِنُوْنَ بِکُلِّ مَا جَآءَ بِهٖ فِیْ نَفْسِ الْاَمْرِ [۱]

ابن عربی اپنی کیفیت بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں: ہم اللہ اور اس کے رسول پر ایمان لاتے ہیں اور ان امور پر ایمان لاتے ہیں جو ہمارے پاس مجمل یا مفصل طور پر پہنچے خواہ ان کی تفصیل ہم تک پہنچی ہے یا نہیں پہنچی یا ہمارے نزدیک ثابت نہیں ہوئی۔ ہم اُن تمام امور پر ایمان لائے ہیں جنہیں درحقیقت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم لے کر آئے۔

۲۔ دوسری عبارت

ابن عربیؒ نے فتوحاتِ مکیہ کے آخری باب (باب ۵۶۰) میں تقریباً دو سو ۲۰۰ وصیتیں دی ہیں۔ یہ وصیتیں اگرچہ تمام کی تمام نہایت قابلِ قدر ہیں، مگر یہاں پر صرف ایک دی جاتی ہے: عَلَیْكَ بِالْاِقْتِدَآءِ بِرَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَاٰلِهٖ وَسَلَّمَ فِیْ اَحْوَالِهٖ وَاَقْوَالِهٖ وَاَفْعَالِهٖ اِلَّا مَانُصَّ عَلَیْهِ مِنْهُ مُخْتَصٌّ بِهٖ مِمَّا لَا یَجُوْزُ لَنَا اَنْ نَفْعَلَهٗ [۲]

---

[۱] نفحات الانس ۴۹۷۔ فتوحات کا جو قلمی نسخہ مجھے دستیاب ہوا ہے وہ ناقص ہے اسی لیے نفحات کا حوالہ دیا ہے۔

[۲] فتوحاتِ مکیہ قلمی نسخہ ۹۴۹۔ ب۔ میں یہاں پر اس نسخہ کا تعارف کرا دینا چاہتا ہوں، یہ قلمی نسخہ میرے مکرم دوست میجر عبدالعزیز اے۔ ایم۔ سی کی ملکیت میں ہے۔ محترم میجر صاحب پاکستان میں عظیم القدر ہستیوں میں سے ایک ہیں جن کی ذاتی لائبریری میں پچیس ہزار سے زائد کتابیں ہیں مجھ پر ان کی خاص عنایت ہے جتنی چاہوں مطالعہ کے لیے کتابیں لے آتا ہوں ان میں سے ایک فتوحاتِ مکیہ کا نایاب نسخہ ہے۔ یہ نسخہ نہایت خوشخط اور بڑی تقطیع کے عمدہ کاغذ پر لکھا ہوا ہے اس کا حاشیہ اور ابواب کی تمام سرخیاں سنہرے حروف میں لکھی ہوئی ہیں اور یہ نسخہ ۸۷۹ھ کا لکھا ہوا ہے، کتاب کے خاتمہ پر کاتب نے یہ عبارت لکھی ہے جس میں اس نے اپنا نام بھی لکھ دیا ہے۔

تُرَابُ الْقَدَمِ اَقَلُّ الْخَدَمِ یُوْسُفُ بْنُ اَحْمَدَ بْنِ مُحَمَّدٍ عَفَا اللّٰهُ عَنْهُ الزَّلَّاتِ وَاَزَالَ عَنْهُ حُبَّ الْغَفَلَاتِ اَللّٰهُمَّ اِنَّا نَسْئَلُكَ اَنْ تُزِیْحَ عَنَّا شَتَّاتَ الْقَوَاطِعِ وَتَجْتَبِنَا اِلَیْكَ وَتُمِدَّنَا بِالسِّرِّ الْجَامِعِ الْمَانِعِ وَتُحَلِّنَا مَقَالًا؟ الْجَمْعِیَّةِ الْحَقِیْقِیَّةِ وَتُمِدَّنَا بِفُیُوْضِ فُتُوْحَاتِكَ الْغَیْبِیَّةِ الْحَقِیَّةِ وَاَنْ تَجْعَلَنَا مِنْ خَاصَّةِ الْاَخْیَارِ وَصَفْوَةِ الْعَبِیْدِ یَا حَیُّ یَا عَلِیْمُ یَا قَدِیْرُ وَصَلَّی اللّٰهُ عَلٰی مُحَمَّدٍ وَاٰلِهٖ وَاَصْحَابِهِ الطَّیِّبِیْنَ الطَّاهِرِیْنَ وَکَانَ ذَالِكَ الْاِتْمَامُ فِیْ سَابِعِ عِشْرِیْنَ ثَالِثَ تَاسِعِ ثَامِنَ تَاسِعَةِ هِجْرِیَّةٍ نَبَوِیَّةٍ

اور حاشیہ پر اسی کے دستخطوں میں لکھا ہے اغنی ۲۷، ربیع الاول ۸۷۹ھ اس کے بعد کاتب نے فتوحاتِ مکیہ اور ابن العربی کی تعریف میں عربی میں کچھ اشعار دیئے ہیں جن سے بظاہر یوں معلوم ہوتا ہے یہ اشعار کاتب کے اپنے ہیں، مگر

(بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر)

تم پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے احوال، اقوال اور افعال میں اقتدار کرنی لازم ہے۔ سوائے ان امور کے جن کے متعلق آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے صریح طور پر فرما دیا ہے کہ وہ آپ کی خصوصیات میں سے تھے اور جن کا ذکر کرنا ہمارے لیے جائز نہیں۔

۳۔ تیسری عبارت

ابن عربی باب ۱۶۴ فی مَعْرِفَۃِ مَقَامِ التَّصَوُّفِ میں لکھتے ہیں:۔
قَالَ اَھْلُ الطَّرِیْقِ اللّٰہِ التَّصَوُّفُ خُلُقٌ فَمَنْ زَادَ عَلَیْکَ فِی الْخُلُقِ زَادَ عَلَیْکَ فِی التَّصَوُّفِ وَسُئِلَتْ عَائِشَۃُ اُمُّ الْمُؤْمِنِیْنَ عَنْ خُلُقِ رَسُوْلِ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَاٰلِہٖ وَسَلَّمَ فَقَالَتْ خُلُقُہُ الْقُرْاٰنُ وَاِنَّ اللّٰہَ اَثْنٰی عَلَیْہِ بِمَا اَعْطَاہُ مِنْ ذَالِکَ فَقَالَ "وَاِنَّکَ لَعَلٰی خُلُقٍ عَظِیْمٍ" وَمِنْ شَرْطِ الْمَنْعُوْتِ بِالتَّصَوُّفِ اَنْ یَّکُوْنَ حَکِیْمًا ذَا حِکْمَۃٍ فَاِنْ لَّمْ یَکُنْ فَلَا حَظَّ لَہٗ فِیْ ھٰذَا اللَّقَبِ فَاِنَّہٗ حِکْمَۃٌ کُلُّہٗ فَاِنَّہٗ اَخْلَاقٌ وَھِیَ تَحْتَاجُ اِلٰی مَعْرِفَۃٍ تَامَّۃٍ وَعَقْلٍ رَاجِحٍ وَّحُضُوْرٍ وَّتَمَکُّنٍ قَوِیٍّ مِّنْ نَّفْسِہٖ حَتّٰی لَا یَحْکُمَ عَلَیْہِ الْاَغْرَاضُ النَّفْسِیَّۃُ وَلْیَجْعَلِ الْقُرْاٰنَ اَمَامَہٗ صَاحِبُ ھٰذَا الْمَقَامِ ط

اہل طریقت کہتے ہیں کہ تصوف ہمہ تن خُلق ہے۔ جس کے اخلاق تم سے بہتر ہوں گے وہ تم سے بہتر صوفی ہوگا اُمّ المومنین حضرت عائشہ رضی سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے خُلق کے متعلق دریافت کیا گیا تو فرمایا: قرآن آپ کا خُلق تھا۔ نیز جو اخلاق اللہ تعالیٰ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو عطا کئے ہیں ان کی تعریف یوں فرمائی ہے "آپ کے اخلاق بہت بلند ہیں" اور جو شخص تصوف کی صفت سے موصوف ہو اس کے لیے دانا ہونا بھی ضروری ہے اگر ایسا نہیں تو صوفی کا لقب اسے نہیں دیا جا سکتا۔ اس لیے کہ تصوف ہمہ تن حکمت ہے کیونکہ اس میں اخلاق پائے جاتے ہیں اور اخلاق کے لیے معرفت تامہ عقل راجح وحاضر اور اپنے نفس پر پورا قابو ہونا ضروری ہے تاکہ خواہشاتِ نفسانیہ اس پر قابو نہ پالیں۔ مقام تصوف والے انسان کو چاہیئے کہ وہ قرآن مجید کو اپنی نگاہ میں رکھے۔

۴۔ چوتھی عبارت

باب ۴۱۹۔ فِیْ مَعْرِفَۃِ حَالِ قُطْبٍ کَانَ مَنْزِلُہٗ اسْتَجِیْبُوْا لِلّٰہِ وَلِلرَّسُوْلِ اِذَا دَعَاکُمْ لِمَا یُحْیِیْکُمْ اِعْلَمْ اَیَّدَنَا اللّٰہُ وَاِیَّاکَ

(بقیہ حاشیہ صفحہ سابقہ)

کتابت کی اغلاط کی وجہ سے اس میں شک پیدا ہو جاتا ہے افسوس اس بات کا ہے کہ یہ نسخہ ناقص ہے ابتدائی حصہ کسی اور کا لکھا ہوا ہے جس کا خط اس قدر خراب ہے کہ اس کے پڑھنے میں سخت دقت پیش آتی ہے، درمیان میں کچھ اوراق خالی پڑے ہیں جن کی وجہ سے کتاب ناقص رہ گئی ہے آخری ورق پر ورق کا نمبر ۴۸۹ دیا ہے کتاب پر چند جگہوں پر مغلیہ سلاطین کی مہریں بھی ثبت ہیں ایک مہر پر احمد شاہ بادشاہ لکھا ہے اور ۱۱۶۱ھ دیا ہے میں نے جو حوالے دیئے ہیں وہ اسی نسخہ کے ہیں۔

انه ما في القرآن دليل ادل على ان الانسان الكامل مخلوق على الصورة من هذا الذكر لدخول اللام في قوله وللرسول وفي امره تعالى لمن ايه[۱] من المؤمنين بالاجابة لدعوة الله ورسوله ولدعوة الرسول فان الله ورسوله ما يدعونا الا لما يحيينا فليكن منا الاجابة على كل حال اذا دعانا فانه ما يكون في حال الا منه فلا بد ان نجيبه اذا دعانا فانه الذي يقيمنا في احوالنا وانما فصل هنا بين دعوة الله ودعوة الرسول ليتحقق من ذالك صورة الحق التي رسول الله صلى الله عليه وآله وسلم عليها وهو الداعي في الحالتين ايانا فاذا دعانا بالقرآن كان مبلغا وترجمانا وكان الدعاء دعاء الله فليكن اجابتنا لله والاسماع للرسول واذا دعانا بغير القرآن كان الدعاء دعاء الرسول صلى الله عليه وآله وسلم فليكن اجابتنا للرسول صلى الله عليه وآله وسلم ولا فرق في دعائين في اجابتنا وان تميز كل دعاء بتميز الداعي الخ

یاد رکھیں! خدا تمہاری بھی اور ہماری بھی مدد کرے کہ قرآن مجید میں اس آیت سے بڑھ کر کوئی دلیل نہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم انسان کامل کی صورت میں مخلوق ہوئے اس لیے کہ "الرسول" پر الف اور لام داخل ہوا ہے اور اللہ تعالیٰ نے ان لوگوں کو جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لاتے ہیں۔ دعوتِ الٰہی اور دعوتِ رسول کی اطاعت کا حکم دیا ہے اس لیے کہ خدا اور اس کا رسول ہمیں صرف اُنہی امور کی دعوت دیتے ہیں جو ہمیں زندگی بخشتے ہیں لہٰذا جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہمیں کسی امر کی طرف بلائیں تو ہمیں ہر حالت میں سرِ تسلیم خم کرنا ہوگا۔ اس لیے کہ ہر حالت میں دعوت تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے ہوگی۔ لہٰذا ہمیں ان کے بلانے کا جواب دینا ضروری ہے کیونکہ وہی ہمارے حالات کی اصلاح کرنے والے ہیں۔ یہاں پر دعوت خداوندی اور دعوت نبوی میں امتیاز اس لیے کیا ہے تاکہ وہ صحیح صورت جس پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ہیں لوگوں کو معلوم ہو جائے۔ کیونکہ ہر دو صورت میں داعی تو وہی ہیں۔ لہٰذا جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم قرآن کے الفاظ میں دعوت دیں تو اس صورت میں آپ مبلغ اور ترجمان ہوں گے اور دعوت اللہ کی طرف سے ہوگی۔ لہٰذا ہمیں اللہ کی اطاعت کرنی چاہیئے اور رسولؐ کی بات پر کان لگانا چاہیئے اور جب قرآن کے علاوہ کسی اور الفاظ میں بلائیں تو یہ دعوت رسولؐ کی طرف سے ہوگی۔ لہٰذا ہمیں رسولؐ کی بات بھی ماننی چاہیئے۔ جہاں تک اجابت کا تعلق ہے ہمارے لیے دونوں دعوتوں میں کوئی فرق نہیں۔ حالانکہ داعی کے لحاظ سے دعوتوں میں فرق ہے۔

---

[۱] اصل کتاب میں اسی طرح دیا ہے میرے خیال میں یہ لفظ لمن آمن بہ ہے اور میں نے اسی طرح ترجمہ کیا ہے۔

اس کے بعد ابنِ عربی نے حُجیّتِ حدیث اور اُس کے واجبُ العمل ہونے پر بحث کی۔ اہل ذوق تفصیل وہاں سے ملاحظہ فرمائیں۔

۵۔ پانچویں عبارت

باب ۵۶۰ کی ابتدا میں ابن العربیؒ لکھتے ہیں:۔

نَهْدِیْ اَحْمَدُ عَیْنُ الْهُدٰیِ اَجْمَعُهٗ وَ مِلَّةُ الْمُصْطَفٰی مِنَ اَلْوَادِ الْمِلَلِ۔

حقیقی راستہ وہی ہے جو آنحضرت صلّی اللہ علیہ وسلّم کا راستہ ہے اور تمام ملتوں سے زیادہ روشن ملت بھی انہی کی ملت ہے۔

۶۔ چھٹی عبارت

اسی باب میں فرماتے ہیں:۔

عَلَیْكَ بِمُلَازَمَةِ مَا افْتَرَضَهُ اللهُ عَلَیْكَ عَلَى الْوَجْهِ الَّذِیْ اَمَرَكَ اَنْ تَقُوْمَ فِیْهِ فَاِذَا اَكْمَلْتَ نَشْاَةَ فَرَائِضِكَ وَكَمَالَهَا فَرْضٌ حِیْنَئِذٍ عَلَیْكَ رَاَنْ) تَتَفَرَّغَ مَا بَیْنَ الْفَرْضَیْنِ لِنَوَافِلِ الْخَیْرَاتِ كَانَتْ مَا كَانَتْ [1]

جو امور اللہ تعالیٰ نے تم پر فرض کئے ہیں۔ انہیں اسی طرح ادا کرو جس طرح اللہ تعالیٰ نے ادا کرنے کا حکم دیا ہے۔ جب تم فرائض کو پورا کر چکو تو دو فرضوں کے درمیان نوافل کی طرف توجہ دو خواہ وہ کسی کے ہوں۔

۷۔ ساتویں عبارت

نیز اسی باب میں فرماتے ہیں:۔

وَعَلَیْكَ بِالصَّلٰوةِ الْمَكْتُوْبَةِ حَیْثُ یُنَادٰی بِهَا مَعَ الْجَمَاعَةِ فَاِنَّ الْمَسَاجِدَ مَا اتُّخِذَتْ اِلَّا لِاِقَامَةِ الصَّلٰوةِ الْمَكْتُوْبَةِ فِیْهَا وَمَا یُنَادٰی اِلَّا اِلَى الْاِتْیَانِ اِلَیْهَا فَاِنَّ ذٰلِكَ سُنَّةُ رَسُوْلِ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَیْهِ وَاٰلِهٖ وَسَلَّمَ وَالْمُرَادُ بِذٰلِكَ الْاِجْتِمَاعُ عَلٰى اِقَامَةِ الدِّیْنِ وَاَنْ لَّا نَتَفَرَّقَ فِیْهِ لِهٰذَا اخْتَلَفَ النَّاسُ فِیْ صَلٰوةِ الْفَهَا لِمَكْتُوْبَةِ اِذَا قَدَرَ عَلَى الْجَمَاعَةِ هَلْ یُجْزِیْهِ اَمْ لَا. وَمَنْ تَرَكَ سُنَّةَ رَسُوْلِ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَیْهِ وَاٰلِهٖ وَسَلَّمَ ضَلَّ بِلَا شَكٍّ۔ [2]

جب اذان ہو تو فرض نماز کو جماعت کے ساتھ ادا کیا کرو۔ اس لیے کہ مسجدیں فرض نمازوں کو ادا کرنے کے لیے ہی بنائی گئی ہیں اور اذان جو دی جاتی ہے تو صرف اس لیے کہ ہم نماز با جماعت ادا کرنے کے لیے آئیں کیونکہ یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت ہے اور اس کا مقصد یہ ہے کہ ہم دین کو قائم کرنے کے لیے

---

[1] فتوحات مکیہ ۹۱۴ الف [2] فتوحات مکیہ ۹۲۳ ب

اکٹھے ہوں تاکہ آپس میں تفرقہ نہ پڑے۔ اسی لیے علماء کا اس میں اختلاف ہے کہ اگر کوئی شخص فرض نماز اکیلے ادا کرے حالانکہ وہ جماعت کے ساتھ ادا کرنے پر قادر ہے آیا یہ نماز ہو جائے گی یا نہیں اور جس نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت کو ترک کیا وہ یقیناً گمراہ ہوا۔

ابن العربی کی کتابوں میں سے ہم بے شمار مثالیں پیش کر سکتے ہیں جن سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ وہ کتاب و سنت کے متبع تھے اور دوسروں کو بھی اس کی تلقین کرتے تھے۔ حق پسند اور منصف مزاج حضرات پر یہ بات واضح ہو گئی ہو گی کہ ابن العربیؒ پر کتاب و سنت کی مخالفت کا الزام بے بنیاد اور محض افتراء ہے میں نے بمقابلہ دوسرے صوفیاء کے ان کے متعلق ذرا زیادہ وضاحت سے کام لیا ہے اس لیے کہ طاعنین نے انہیں بدنام کرنے کی بہت کوشش کی ہے جن بزرگوں کو حق بات معلوم کرنے کے لیے مزید وضاحت کی ضرورت ہو وہ مولانا اشرف علی تھانوی کی التنبیہُ الطربی کا مطالعہ کریں۔

۱۶۔ شیخ احمد ملثمؒ کا قول

شیخ ابو العباس احمد ملثمؒ مصر کے جلیل القدر مشائخ میں سے ہوئے ہیں، ان کے والد ممالک مشرق میں بادشاہ تھے، مگر انہوں نے سب کچھ چھوڑ کر طریق فقر اختیار کر لیا تھا، انہوں نے بڑی لمبی عمر پائی ہے۔ شیخ عبد الغفار قوصی جن کی وفات تقریباً ۷۶۰ھ میں ہوئی، فرماتے ہیں کہ میں نے ان سے ان کی عمر کے متعلق دریافت کیا تو فرمایا کہ اس وقت میری عمر تقریباً چار سو سال ہے ان کی وفات ۶۷۰ھ کے قریب ہوئی علماء ظاہر اکثر اُن کے مخالف رہتے، لیکن اُن کا اپنا قول ہے:-

لَمْ يَكُنِ الْاَقْطَابُ اَقْطَابًا وَّالْاَوْتَادُ اَوْتَادًا وَّالْاَوْلِيَاءُ اَوْلِيَاءَ اِلَّا بِتَعْظِيْمِهِمْ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَاٰلِهٖ وَسَلَّمَ وَمَعْرِفَتِهِمْ بِهٖ وَاِجْلَالِهِمْ لِشَرِيْعَتِهٖ وَقِيَامِهِمْ بِاٰدَابِهٖ [۱]

نہ کوئی قطب قطب بن سکا ہے، نہ اوتاد اوتاد اور نہ ولی ولی جب تک کہ اس نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تعظیم نہیں کی اور اسے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی معرفت حاصل نہیں ہوئی اور جب تک اس نے آپؐ کی شریعت کی تعظیم نہیں کی اور اس کے آداب بجا نہیں لاتے۔

۱۷۔ شیخ عبد الغفار قوصیؒ اور اتباعِ سنّت

شیخ عبد القادر قوصیؒ متوفی ۷۶۰ھ (تقریباً) کا اتباع سنت میں یہ حال تھا کہ ایک مرتبہ اپنے بیٹے کے ساتھ بیٹھ کر کھانا کھا رہے تھے۔ کھانے میں کدو بھی تھا، فرمایا: بیٹا! نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو کدو بہت پسند تھا۔ بیٹے کی زبان سے نکل گیا کہ یہ تو ایک گندی چیز ہے۔ ان سے یہ الفاظ برداشت نہ ہو سکے اس لیے کہ ان میں شانِ نبوی

---

[۱] لواقح الانوار ۱: ۱۳۶

کے بارے میں تحقیر پائی جاتی تھی اور اسی وقت تلوار سے اپنے بیٹے کی گردن اُڑا دی اور نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی پسند کو اپنے بیٹے کی جان سے بھی عزیز جانا[1]

۱۸- ابراہیم وسوقیؒ

سید ابراہیم بن ابی المجد قرشی وسوقیؒ جلیل القدر صوفی اور صاحب کرامات بزرگ گزرے ہیں۔ انہیں فارسی، عربی، سریانی، زنگی اور تمام پرندوں اور وحشی جانوروں کی بولیاں آتی تھیں۔ ان کی وفات تینتالیس ۴۳ سال کی عمر میں ۶۷۶ھ میں ہوئی، فرماتے ہیں: اَلشَّرِیْعَۃُ اَصْلٌ وَّالْحَقِیْقَۃُ فَرْعٌ فَالشَّرِیْعَۃُ جَامِعَۃٌ بِکُلِّ مَشْرُوْعٍ وَالْحَقِیْقَۃُ جَامِعَۃٌ لِکُلِّ عِلْمٍ خَفِیٍّ[2]

شریعت اصل ہے اور طریقت اس کی فرع۔ شریعت میں تمام مشروع باتیں آ جاتی ہیں اور حقیقت میں تمام مخفی علوم۔

حضرت وسوقیؒ جب کسی مرید سے عہد لیتے تو ان الفاظ میں لیتے۔

یَا فُلَانُ اُسْلُکْ طَرِیْقَ النُّسُکِ عَلٰی کِتَابِ اللّٰہِ وَسُنَّۃِ نَبِیِّہٖ وَاِقَامِ الصَّلٰوۃِ وَاِیْتَاءِ الزَّکٰوۃِ وَصَوْمِ رَمَضَانَ وَالْحَجِّ اِلٰی بَیْتِ الْحَرَامِ وَاِتِّبَاعِ جَمِیْعِ الْاَوَامِرِ الْمَشْرُوْعَۃِ وَالْاَخْبَارِ الْمَرْضِیَّۃِ وَالْاِشْتِغَالِ بِطَاعَۃِ اللّٰہِ قَوْلًا وَّفِعْلًا وَّاعْتِقَادًا وَلَا تَنْظُرْ یَا وَلَدِیْ اِلٰی زَخَارِفِ الدُّنْیَا وَمَطَایَاھَا وَمَلَابِسِھَا وَنِمَاشِھَا وَرِیَاشِھَا وَحُظُوْظِھَا وَاتَّبِعْ نَبِیَّکَ مُحَمَّدًا صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَاٰلِہٖ وَسَلَّمَ فِیْ اَخْلَاقِہٖ فَاِنْ لَّمْ تَسْتَطِعْ فَاتَّبِعْ خُلُقَ شَیْخِکَ فَاِنْ نَزَلْتَ عَنْ ذٰلِکَ ھَلَکْتَ یَا وَلَدِیْ[3]

اے فلاں! عبادت کے طریقہ میں کتاب اللہ اور اس کے نبی کی سنت پر چلنا، نماز پڑھتے رہنا، زکوٰۃ ادا کیا کرنا روزے رکھا کرنا، بیت اللہ کا حج کرنا اور تمام شرعی اوامر اور احادیث مرضیہ کی تابعداری کرنا، قولاً، فعلاً اور اعتقاداً ہر طرح سے اللہ کی اطاعت میں لگے رہنا! بیٹا دنیاوی زخارف، سواریوں، لباس، زیب وزینت اور حظوظ کی طرف دھیان نہ کرنا۔ اپنے نبی محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اخلاق کی پیروی کرنا اگر اتنا نہ کر سکو تو کم از کم اپنے پیر کے اخلاق کی ہی پیروی[4] کر لینا اور اگر کہیں اس سے بھی نیچے گر گئے تو ہلاک ہو جاؤ گے۔

ذرا غور فرمائیں کس قدر واضح الفاظ میں کتاب وسنت کی پیروی کرنے کا عہد لیا جا رہا ہے ان امور کی پابندی کے باوجود اگر کسی سے بظاہر کوئی خلاف شریعت امر دکھائی دے تو اس کے متعلق فرماتے ہیں:۔

---

[1] لواقح الانوار ۱: ۱۳۹ [2] لواقح الانوار ۱: ۱۴۴ [3] لواقح الانوار ۱: ۱۵۱

[4] یہ اس لیے فرمایا کہ پیر نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے نقش قدم پر چلتا ہے۔

وَلَا يُقْدَحُ فِي صَاحِبِ الْخِرْقَةِ إِلَّا إِنْ خَالَفَ صَرِيْحَ الْكِتَابِ وَالسُّنَّةِ إِخْتِيَارًا [۱]

صاحب خرقہ پر صرف اُس وقت عیب جوئی کی جاسکتی ہے جب وہ کتاب وسنّت کے صریح احکام کی خلاف ورزی کرے۔

۱۹۔ شیخ ابوالحسن شاذلی کا بیان

شیخ ابوالحسن علی بن عبداللہ بن عبدالجبار شاذلیؒ افریقہ میں شاذلہ کے رہنے والے اور حسینی سادات میں سے تھے، یہ نابینا تھے۔ انہی نے سلسلہ شاذلیہ کی بنیاد ڈالی ہے۔ کبار اولیاء کی کثیر تعداد ان سے فیضیاب ہوئی، جب یہ حج کے لیے مکہ کو جارہے تھے تو راستہ میں ایک صحرا میں ۶۵۶ھ[۲] میں وفات پائی۔ تقی الدین ابن دقیق العیدؒ فرماتے ہیں کہ میں نے ابوالحسن شاذلیؒ سے بڑھکر کسی کو عارف باللہ نہیں دیکھا۔ حزب البحر انہی کی طرف منسوب ہے، حضرت شاذلی اکثر فرمایا کرتے تھے۔

إِذَا عَارَضَ كَشْفُكَ الْكِتَابَ وَالسُّنَّةَ فَتَمَسَّكْ بِالْكِتَابِ وَالسُّنَّةِ وَدَعِ الْكَشْفَ [۳]

جب تمہارا کشف کتاب وسنت کے خلاف ہو تو کتاب وسنت پر پابند رہو اور کشف کو چھوڑ دو۔

پھر فرماتے ہیں:

مَا ثَمَّ كَرَامَةٌ أَعْظَمُ مِنْ كَرَامَةِ الْإِيْمَانِ وَمُتَابَعَةِ السُّنَّةِ فَمَنْ أُعْطِيَهَا وَجَعَلَ يَشْتَاقُ إِلَى غَيْرِهِ مَا فَهُوَ مُفْتَرٍ كَذَّابٌ أَوْ ذُوْ خَطَأٍ فِي الْعِلْمِ بِالصَّوَابِ كَمَنْ أُكْرِمَ بِشُهُوْدِ الْمَلِكِ فَاشْتَاقَ إِلَى سِيَاسَةِ الدَّوَابِّ [۴]

ایمان اور اتباع سنّت سے بڑھکر کوئی کرامت نہیں جسے دونوں باتیں حاصل ہو جائیں اور پھر وہ کسی اور چیز کا مشتاق ہو تو وہ شخص مفتری اور کذاب ہے یا اسے اپنے علم میں صحیح بات معلوم کرنے میں غلطی لگی ہے۔ اس کی مثال ایسی ہے۔ جیسے ایک شخص کو بادشاہ کے دربار میں حضوری کا شرف حاصل ہو مگر وہ جانوروں کا داروغہ بننا چاہے۔

۲۰۔ علی بن شہابؒ کا قول

شیخ علی بن شہابؒ امام عبدالوہابؒ شعرانی کے دادا تھے، نہایت متّقی اور پرہیزگار تھے، انہوں نے ستاسی سال کی عمر میں ۸۹۱ھ میں وفات پائی۔ ایک مرتبہ شیخ عبدالرحمٰن بن شیخ وہیب سطوحی جو اس وقت کے احمدیہ فرقہ کے رئیس تھے ان کے شہر میں آئے ہوے تھے تو علی بن شہاب نے انہیں کہلا بھیجا۔

---

[۱] لواقح الانوار: ۱: ۱۵۰ [۲] جامی رحمۃ اللہ نے نفحات الانس میں ان کی تاریخ وفات ۶۵۴ھ دی ہے

[۳] لواقح الانوار: ۲: ۴ [۴] لواقح الانوار: ۲: ۶

- يَاشَيْخُ عَبْدَ الرَّحْمٰنِ إِنْ كُنْتَ تَطْلَعُ بَلَدَنَا فَاطْلَعْهَا بِالْكِتَابِ وَالسُّنَّةِ وَإِلَّا فَأَنْتَ مُهْجَرًا ۔ [1]

اے شیخ عبدالرحمن اگر تو ہمارے شہر میں آنا چاہتا ہے تو کتاب و سنت کے ساتھ آنا ورنہ ہمارے اور تمہارے درمیان جدائی ہوگی ۔

۲۱- محمد عنانؒ کا فرمان

شیخ محمد عنانؒ اپنے زمانے کے بہت بڑے عابد اور زاہد تھے ان کی کرامات مشہور ہیں انہوں نے ایک سو دس برس کی عمر میں ۹۲۲ھ میں وفات پائی،

ان کے پاس اگر کوئی راہ طریقت کی تلاش میں آتا تو فرماتے :

"یہ لوگ راہ حق سے مذاق کرتے ہیں"

اور کسی کو ذکر کی تلقین نہ کرتے۔ شیخ احمد بنجاریؒ قرآن مجید لے کر ان کے پاس آئے اور کہا تمہیں اس خدا کی قسم جس کا یہ کلام ہے کہ مجھے ضرور ذکر کی تلقین کریں۔ شیخ محمد عنان نے جب اللہ کی قسم کا لفظ سنا تو بیہوش ہو کر گر پڑے پھر اٹھ کر فرمایا:

يَا وَلَدِي الطَّرِيقُ مَا هِيَ بِهٰذَا ۔ إِنَّمَا هِيَ بِاِتِّبَاعِ الْكِتَابِ وَالسُّنَّةِ [2]

بیٹا ! راہ طریقت یہ نہیں۔ کتاب اللہ اور سنتِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تابعداری ہی کا نام طریقت ہے۔

۲۲- ابوبکر حدیدیؒ اور اتباعِ سنت

شیخ ابوبکر حدیدیؒ کبار صوفیہ میں سے تھے اور امام عبدالوہاب شعرانیؒ کے پیر تھے انہوں نے مدینہ میں ۹۲۵ھ میں وفات پائی اور بقیع میں دفن ہوئے، ایک مرتبہ انہوں نے شیخ محمد العدلؒ کو دیکھا کہ وہ کسی بیمار عورت کا پیٹ ٹٹول رہے ہیں اس پر انہوں نے بلند آواز سے کہا:

اے محمد ! ہائے دین۔ اے عدل خدائی بزرگ تمہارے اوپر ہے۔

محمد عدل نے جواب دیا : میں نے کوئی بری نیت سے تو نہیں ٹٹولا۔

فرمایا : کیا تو معصوم ہے ؟ ہم تو سنت کے ظاہری حکم کو جانتے ہیں [3]

۲۳- ابن داؤد منزلاویؒ اور اتباعِ سنت

امام شعرانی ابن داؤدؒ کے متعلق لکھتے ہیں:-

كَانَ سَيِّدِي مُحَمَّدُ بْنُ دَاؤدَ يُضْرَبُ بِهِ الْمَثَلُ فِي اتِّبَاعِ الْكِتٰبِ وَالسُّنَّةِ وَوَلَدُهُ الشَّيْخُ شِهَابُ الدِّيْنِ كَانَ يُضْرَبُ

---

[1] لواقح الانوار : ۲ : ۱۰۳ [2] لواقح الانوار : ۲ : ۱۰۹ [3] لواقح الانوار : ۲ : ۱۱۹

بِهِ الْمَثَلُ فِی اِتِّبَاعِ الْکِتَابِ وَالسُّنَّةِ وَمَا رَأَیْتُ فِی عَصْرِی هٰذَا اَضْبَطَ مِنْهُ لِلسُّنَّةِ۔ ؎۱

سیدی محمد بن داؤدؒ اتباع کتاب وسنت میں ضرب المثل ہے۔۔۔۔ اسی طرح ان کے بیٹے شیخ شہاب الدین بھی کتاب وسنت کی اتباع میں ضرب المثل تھے میں نے اپنے زمانہ میں اُن سے بڑھ کر کسی کو سنت پر کاربند نہیں دیکھا۔

پھر آگے چل کر شہاب الدینؒ کے متعلق لکھتے ہیں :۔

کَانَ رَضِیَ اللّٰهُ عَنْهُ مُلَازِمًا لِلْکِتَابِ وَالسُّنَّةِ مَا رَأَتْ عَیْنِی بَعْدَ الشَّیْخِ مُحَمَّدِ بْنِ عِنَانٍ اَضْبَطَ لِلسُّنَّةِ مِنْهُ ؎۲

یہ ہمیشہ کتاب وسنت پر کاربند رہتے۔ میں نے شیخ محمد بن عنانؒ کے بعد ان سے زیادہ محافظ سنت نہیں دیکھا۔

اس کے بعد شعرانیؒ لکھتے ہیں کہ چالیس سال تک میں ان کی صحبت میں رہا مگر میں نے انہیں کبھی بھی مسنون طریقہ سے منحرف ہوتا نہیں پایا۔ خود منزلاوی فرماتے ہیں :

مَنْ اَرَادَ حِفْظَ السُّنَّةِ فَلْیَعْمَلْ بِهَا فَاِنَّهَا تَتَقَیَّدُ عِنْدَهٗ وَلَا یَنْسَاهَا۔

جو شخص سنت کی محافظت کرنا چاہے وہ اس پر عمل کرے کیونکہ اس طرح سنت محفوظ ہو جاتی ہے اور بھولتی نہیں۔

۲۴۔ امام شعرانیؒ کا قول

امام عبدالوہاب بن احمد بن علی شعرانیؒ متوفی ۹۷۳ھ ۱۵۶۵ء بہت بڑے عالم اور صوفی ہوئے ہیں ان کی متعدد تصانیف ہیں فرماتے ہیں :

(الف) وَاعْلَمْ اَنَّ طَرِیْقَ الْقَوْمِ عَلٰی وَفْقِ الْکِتَابِ وَالسُّنَّةِ فَمَنْ خَالَفَهَا خَرَجَ عَنِ الصِّرَاطِ الْمُسْتَقِیْمِ۔ ؎۳

یاد رکھو کہ صوفیاء کا طریقہ کتاب وسنت کے عین مطابق ہے جس نے کتاب وسنت کے خلاف کیا وہ راہ مستقیم سے بھٹک گیا۔

(ب) نَرْحَمُ اللّٰهُ اِمْرَءً رَاٰی فِیْهَا شَیْئًا یُّخَالِفُ ظَاهِرَ الْکِتَابِ وَالسُّنَّةِ وَاَصْلَحَهٗ وَلٰکِنْ بِشَرْطِ اَنْ یَّکُوْنَ عَلٰی یَقِیْنٍ وَّمَعْرِفَةٍ لَیْسَ فِیْهِ شَکٌّ ؎۴

خدا اس شخص پر رحم کرے جس نے اس کتاب میں کتاب وسنت کے خلاف کوئی بات پائی اور اس نے اس کی

؎۱ لواقح الانوار : ۲ : ۱۱۴ ؎۲ لواقح الانوار ۲ : ۱۶۹ ؎۳ الانوار القدسیہ : ۱ : ۱۸

؎۴ الانوار القدسیہ : ۱ : ۱۸

اصلاح کردی بشرطیکہ اسے اِس قدر یقین اور معرفت حاصل ہو کہ اسے کسی قسم کا شک وشبہ نہ ہو کہ یہ امر کتاب و سنت کے خلاف ہے۔

(ج) فَیَنْبَغِیْ لِسَالِكِ طَرِیْقِ الْعَارِفِیْنَ اَنْ یَّتُوْبَ مِنْ تَرْكِ السُّنَّةِ كَمَا یَتُوْبُ مِنْ تَرْكِ الْوَاجِبِ [1]

عارفین کے طریقہ پر چلنے والے کے لیے ضروری ہے کہ جس طرح وہ ترکِ واجب سے توبہ کرتا ہے اسی طرح سنت کے ترک کرنے سے بھی توبہ کرے۔

(د) وَالَّا غَلَوْ رَاَیْنَا الصُّوْفِیَّ یَتَرَبَّعُ فِی الْهَوَآءِ لَا نَعْبَأُ بِهٖ اِلَّا اَنْ اِمْتَثَلَ اَمْرَ اللّٰهِ تَعَالٰی وَاجْتَنَبَ نَهْیَهٗ فِی الْمُحَرَّمَاتِ الْوَارِدَةِ فِی السُّنَّةِ مُخَاطِبًا كُلَّ الْخَلْقِ الْمُكَلَّفِیْنَ لَا یَخْرُجُ عَنْ ذَالِكَ اَحَدٌ مِّنْهُمْ وَمَنْ اِدَّعٰی اَنَّ بَیْنَهٗ وَبَیْنَ اللّٰهِ تَعَالٰی حَالَةٌ اَسْقَطَتْ عَنْهُ التَّكَالِیْفَ الشَّرْعِیَّةِ مِنْ غَیْرِ ظُهُوْرِ اَمَارَةٍ تُصَدِّقُهٗ عَلٰی دَعْوَاهُ فَهُوَ كَاذِبٌ [2]

ورنہ اگر ہم صوفی کو ہوا پر چوکڑی لگائے بیٹھے ہوتے بھی کیوں نہ دیکھیں تب بھی اُس کا کچھ اعتبار نہ کرینگے البتہ اگر وہ محرمات کے ترک کرنے کا حکم کرتا ہو اور سنتِ نبویؐ میں جن محرمات سے منع کیا گیا ہے ان سے پرہیز کرتا ہو اور تمام مخلوق خدا کو محرمات کے ترک کرنے کا حکم کرتا ہو تب مان جائیں گے۔ اس لیے کہ کوئی شخص بھی احکام سے مستثنیٰ نہیں ہے اور اگر کوئی شخص یہ دعویٰ کرے کہ اللہ اور اس کے درمیان ایک حالت ہے جس کی وجہ سے تمام احکام شرعیہ اس سے ساقط ہو چکے ہیں اور اُس کے پاس اس دعویٰ کی تصدیق میں کوئی ظاہری علامت بھی نہ پائی جاتی ہو تو وہ شخص کاذب ہے۔

(ھ) وَظُهُوْرُ الْكَرَامَةِ لَیْسَتْ بِشَرْطٍ لِّلْوَلَایَةِ۔ اِنَّمَا یُشْتَرَطُ اِمْتِثَالُ اَوَامِرِ اللّٰهِ وَاِجْتِنَابُ نَوَاهِیْهِ فَیَكُوْنُ اَمْرُهٗ مَضْبُوْطًا عَلَی الْكِتَابِ وَالسُّنَّةِ فَمَنْ كَانَ كَذٰلِكَ فَالْقُرْاٰنُ شَاهِدٌ بِوَلَایَتِهٖ۔

ولی کے لیے کرامت کا ظاہر ہونا شرط نہیں۔ اگر شرط ہے تو یہ کہ وہ احکامِ خداوندی کی تابعداری کرے اور نواہی سے پرہیز کرے تاکہ اس کی حالت کتاب وسنت سے مطابقت کی وجہ سے پختہ ہو لہٰذا جس شخص کا یہ حال ہو گا تو اس کی ولایت پر قرآن گواہ ہے۔

مذکورہ بالا اقوال پر بے شمار اقوال کا اضافہ کیا جا سکتا ہے مگر میں نے اتنے پر اکتفا کی ہے ان سے

---

[1] الانوار القدسیہ: ۱: ۳۲ [2] الانوار القدسیہ: ۱: ۳۸

قارئین بخوبی اندازہ لگا سکتے ہیں کہ یہ لوگ کس طرح خود بھی کتاب وسنت پر کاربند رہے اور دوسروں کو بھی اسی کی تلقین کرتے رہے۔ ان پر کتاب وسنت کی مخالفت کا الزام محض افتراء ہے جس سے ان کا دامن کلیتہً پاک ہے مگر اس کے باوجود بعض اہلِ ظاہر نے ان پر زبانِ طعن دراز کی اور ان پر ناروا الزامات لگائے۔ چنانچہ ذوالنون مصری (م ۲۴۵ھ) جنید بغدادی (م ۲۹۷ھ) سہل تستری (م ۲۸۳ھ) ابوالحسن شاذلی (م ۶۵۶ھ) ابن العربی (م ۶۳۸ھ) اور سید احمد بن ابی الحسن الرفاعی (م ۵۷۸ھ) پر قسم قسم کے الزامات تراش کر انہیں بدنام کرنے کی کوشش کی گئی۔ بعض طاعنین نے کتاب وسنت کی آڑ لے کر انہیں قتل تک کرانے کی کوشش کی، یہ وہ لوگ تھے جن کا تعلق محض علمِ ظاہر سے تھا اور علمِ باطن سے سراسر کورے تھے، ان کا علم بھی اسی قسم کا تھا۔ جس کے متعلق مولانا روم فرماتے ہیں۔

علم را بر دِل زنی یارے بود	علم را بر گِل زنی مارے بود!
علمِ تقلیدی وبالِ جانِ ماست	عاریہ است و ما نشستہ کانِ ماست
زیں خرد جاہل ہمی باید شدن	دست در دیوانگی باید زدن
علمِ تقلیدی بُود بہرِ فروخت	چوں بیابد مُشتری خوش بر فروخت
مشتریٔ علمِ تحقیقی حق است	دائماً بازارِ اُو بارونق است

ہم خدا کے پاس ایسے علم سے پناہ لیتے ہیں جو بجائے فائدہ پہنچانے کے "مار" کا کام کرے۔ آمین:

اکابر علماء کا صوفیاء اور اولیاء اللہ کی تعظیم کرنا

اکابر علماء کو چونکہ یقینی طور پر معلوم تھا کہ صوفیاء متبع کتاب وسنت ہیں اور ان کے باطن نور سے معمور ہیں اس لیے وہ ان کی تعظیم کرتے اور ان کے ذکر کو باعثِ رحمت سمجھتے ہم ذیل میں اس کی چند مثالیں پیش ہیں:۔

۱۔ عبداللہ بن مبارک کا قول

حضرت عبداللہ بن مبارکؒ بڑے پایہ کے محدث اور عالم تھے اور اپنے زہد و تقویٰ کی وجہ سے مشہور تھے۔ ان کی وفات ۱۸۱ھ میں ہوئی فرماتے ہیں:۔

اِنَّ الرَّحْمَۃَ تَنْزِلُ عِنْدَ ذِکْرِ الصَّالِحِیْنَ

جب صالحین کا ذکر کیا جائے تو رحمتِ خداوندی کا نزول ہوتا ہے۔

۲۔ ابو ہاشمؒ اور سفیانِ ثوریؒ

ابو ہاشم شام کے مشہور شیخ تھے، یہ دراصل کوفہ کے رہنے والے اور حضرت سفیان ثوریؒ متوفی ۱۶۱ھ کے ہم عصر تھے ان کی صحیح تاریخ

---

[۱] لواقح الانوار: ۱: ۵۱

وفات معلوم نہیں۔ نکلسن نے لکھا ہے کہ ان کی وفات ۱۸۰ھ سے پہلے ہوئی۔ اگرچہ ابو ہاشم سے پہلے بھی بہت سے بزرگ گزر چکے تھے جو اپنے زہد و ورع، حسن معاملت، طریق توکل اور طریق محبت کے اعتبار سے مشہور تھے، مگر سب سے پہلے بزرگ جنہیں صوفی کا لقب دیا گیا وہ ابو ہاشمؒ تھے۔ انہی نے صوفیاء کے لیے سب سے پہلی خانقاہ بنوائی[1]۔ اس کے بنوانے کا سبب یہ ہوا کہ ایک عیسائی رئیس شکار کے لیے نکلا ہوا تھا، راستہ میں اس نے دو شخصوں کو نہایت محبت سے آپس میں ملتے اور ہم آغوش ہوتے دیکھا۔ اس کے بعد انہوں نے باہم مل کر کھانا کھایا۔ عیسائی رئیس کو ان کا طرز معاشرت بہت پسند آیا، اس نے ان میں سے ایک کو بلا کر پوچھا کہ یہ دوسرا شخص کون ہے اس نے جواب دیا کہ میں نہ اسے جانتا ہوں اور نہ میرا کوئی اس سے تعلق ہے اور نہ ہی مجھے معلوم ہے کہ یہ کہاں کا رہنے والا ہے۔ اس پر عیسائی رئیس نے دریافت کیا کہ پھر یہ آپس میں محبت کیسی ہے درویش نے جواب دیا کہ یہ تو ہمارا طریقہ ہے۔ پھر رئیس نے پوچھا کیا تمہارے پاس کوئی جگہ ہے جہاں تم مل کر بیٹھ سکو۔ جواب دیا نہیں۔ اس پر رئیس نے رملہ (فلسطین) میں پہلی خانقاہ بنوا دی[3]۔

حضرت سفیان ثوریؒ، جو مشہور محدث اور عالم ہوئے ہیں انہی ابو ہاشمؒ کے متعلق فرماتے ہیں:

الف۔ لَوْلَا اَبُوْهَاشِمِ الصُّوْفِيُّ مَا عَرَفْتُ دَوَاَقِّيَ الرِّيَاءِ

اگر ابو ہاشمؒ صوفی نہ ہوتے تو میں ریاء کی باریکیاں نہ جان سکتا۔

(ب) جب تک میں نے ابو ہاشم کو نہ دیکھا تھا مجھے معلوم نہ تھا کہ صوفی کسے کہتے ہیں[4]۔

۳۔ امام احمد بن حنبلؒ اور ابو حمزہ بغدادیؒ

امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ اتباع سنت اور اجتناب بدعت میں ضرب المثل تھے انہوں نے ستتر برس کی عمر میں ۲۴۱ھ میں دفات پائی۔ علم حدیث اور دیگر علوم میں ان کا مرتبہ کسی پر مخفی نہیں۔ انہیں جب کسی مسئلہ میں دقت پیش آتی تو ابو حمزہ بغدادیؒ متوفی ۲۸۹ھ سے دریافت کیا کرتے اور جب ان کی مجلس میں صوفیاء کے اقوال کا ذکر ہوتا تب بھی انہی کی رائے دریافت کیا کرتے[5]۔

شیخ قطب الدینؒ بن امین بیان کرتے ہیں کہ امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ اپنے بیٹے کو صوفیاء کی مجلس میں جانے کی ترغیب دیا کرتے اور فرمایا کرتے کہ لوگ اخلاق میں اس درجہ تک پہنچے ہوتے ہیں کہ ہم وہاں تک نہیں پہنچ سکتے[6]۔

۴۔ امام احمدؒ اور شیبان راعیؒ

ایک مرتبہ امام احمد بن حنبلؒ امام شافعیؒ کے پاس بیٹھے تھے کہ شیبان راعیؒ ادھر آنکلے۔ امام احمدؒ نے امام شافعیؒ سے کہا اے ابو عبداللہ میں

---

[1] لٹریری ہسٹری آف دی عربز: ۲۲۹ [2] نفحات الانس ۳۱ اور اے لٹریری ہسٹری آف دی عربز: ۲۲۹
[3] نفحات الانس: ۳۲ [4] ایضاً ۳۱ [5] لواقح الانوار ۱: ۴ [6] رسالہ قشیریہ: ۲۶ [7] لواقح الانوار ۱: ۴

اسے اس کی جہالت پر متنبہ کرنا چاہتا ہوں تاکہ یہ کچھ علم سیکھنے کی طرف توجہ دے، امام شافعی نے انہیں اس سے روکا مگر یہ باز نہ آئے اور شیبانؒ سے کہا:

ایک شخص رات اور دن میں ایک نماز پڑھنی بھول گیا ہے اور اسے یہ بھی یاد نہیں کہ اس نے کون سی نماز نہیں پڑھی اب اسے کیا کرنا چاہیئے؟"

یہ سن کر حضرت شیبانؒ پر خاص کیفیت طاری ہوگئی اور فرمایا: اے احمد آپ ایسے شخص کا ذکر کر رہے ہیں جس کا دل اللہ سے غافل ہو چکا ہے لہٰذا اسے سزا دینی چاہیئے تاکہ آئندہ اللہ سے غافل نہ ہو۔ یہ جواب سنکر احمد بیہوش ہوگئے۔ جب ہوش میں آئے تو امام شافعیؒ نے فرمایا: کیا مَیں نے تجھے اسے چھیڑنے سے منع نہ کیا تھا؟[1]

اس واقعہ کے لکھنے کے بعد امام قشیریؒ فرماتے ہیں: یہ شیبان راعیؒ کا حال ہے جو اُمّی محض تھے جب اُمّی صوفیوں کا یہ حال ہو تو پھر ان کے آئمہ کا کیا حال ہوگا۔

۵۔ ابوالعباسؒ بن سُریجؒ اور جُنیدؒ بغدادی

ابوالعباسؒ بن سُریج متوفی ۳۰۶ھ ۹۹۸ء امام شافعیؒ رحمۃ اللہ کے شاگردوں میں سے تھے انہیں امام شافعیؒ کے تمام شاگردوں یہاں تک کہ مُزانیؒ سے بھی افضل سمجھا جاتا ہے۔ جب یہ حضرت جُنید بغدادی متوفی ۲۹۷ھ ۹۰۹ء کے پاس آئے اور ان کا کلام سنا تو کسی نے آپ سے پوچھا کہ آپ کا اس کلام کے متعلق کیا خیال ہے تو فرمایا:۔

لَآ اَدْرِیْ مَایَقُوْلُ وَلٰکِنِّیْ اَرٰی لِھٰذَا الْکَلَامِ صَوْلَةً لَیْسَتْ بِصَوْلَةِ مُبْطِلٍ[2]

جو کچھ یہ فرما رہے ہیں مَیں اسے نہیں جانتا مگر اس کلام میں اس قدر دبدبہ پایا جاتا ہے کہ ایک باطل شخص کے کلام میں نہیں ہو سکتا۔

۶۔ عبداللہ بن سعیدؒ اور جُنیدؒ

عبداللہ بن سعید بن کلاب ہر شخص کی باتوں پر نکتہ چینی کیا کرتے تھے ایک مرتبہ لوگوں نے انہیں کہا کہ آپ ہر کسی کی بات پر اعتراض کرتے ہیں یہاں جنید نامی ایک شخص ہے۔ ذرا اس کی باتیں بھی سنیں۔ پھر دیکھیں کیا آپ ان پر اعتراض کر سکتے ہیں یا نہیں۔ چنانچہ عبداللہ جُنید کے حلقہ میں آئے اور اُن سے توحید کے بارے میں سوال کیا۔ حضرت جُنید نے ایسا جواب دیا کہ عبداللہ حیران رہ گئے اور کلام کو دوبارہ دہرانے کی درخواست کی۔ حضرت جُنیدؒ نے بالکل مختلف الفاظ میں وہی بات دہرا دی۔ عبداللہؒ نے کہا یہ تو کچھ اور ہی بات ہے جسے میں یاد نہیں رکھ سکتا

---

[1] رسالہ قشیریہ: ۱۹۸ [2] لواقح الانوار: ۱: ۸۴ اور رسالہ قشیریہ ۱۹۸

اور ایک بار پھر دہرانے کی درخواست کی۔ انہوں نے پھر ایک نئے طرز میں وہی بات دہرا دی۔ عبداللہ نے کہا: اس طرح تو یہ کلام مجھے یاد نہیں رہ سکتا۔ آپ مجھے یہ لکھا دیں اور حضرت جنیدؒ کی فضیلت اور علوِ مرتبہ کا معترف ہو گیا۔[1]

۷۔ ابو عمرانؒ اور شیخ شبلیؒ

ابو عمرانؒ ایک فقیہ تھے۔ جامع منصور میں اُن کا حلقۂ درس اور شیخ ابو بکر دُلفؒ بن جحدر شبلیؒ جنہوں نے ستاسی سال کی عمر میں ۳۳۴ھ۔ ۹۴۵ء میں وفات پائی، کا حلقۂ درس ساتھ ساتھ تھا۔ ابو عمران درس دے رہے ہوتے اور جب شبلیؒ کلام شروع کرتے تو ان کا حلقہ درہم برہم ہو جاتا اور لوگ اُٹھ کر شبلیؒ کے پاس چلے جاتے۔ یہ دیکھ کر ابو عمرانؒ سخت برافروختہ ہوتے۔ ایک دن انہوں نے چاہا کہ شبلیؒ کے مبلغِ علم کا راز فاش کریں اور ان کے ایک شاگرد سے شبلیؒ سے مسئلہ حیض کے متعلق سوال کیا۔ شبلیؒ نے تقریر کی جس میں انہوں نے علماء کے اقوال اور اختلافات کا ذکر کیا۔ ابو عمرانؒ تقریر سن کر ششدر سے رہ گئے اور اُٹھ کر شبلی کے سر پر بوسہ دیا اور کہا اے شبلی اس مسئلہ میں مجھے آپ سے دس ایسے اقوال معلوم ہوئے ہیں جن کا مجھے پہلے علم نہ تھا اور جتنے اقوال آپ نے بیان فرماتے ہیں ان میں سے مجھے صرف تین اقوال آتے تھے۔[2]

اسی باطنی اور حقیقی علم کی وجہ سے شیخ شبلیؒ فرمایا کرتے تھے۔

مَاظَنُّكَ بِعِلْمٍ عِلْمُ الْعُلَمَآءِ فِيهِ تُهْمَةٌ[3]

ایسے علم کے متعلق تمہارا کیا خیال ہے جس کے مقابلہ میں علماء کا علم تہمت کے برابر ہو۔

مولانا جلال الدین رومیؒ متوفی ۶۷۲ھ علمِ ظاہر اور علمِ باطن کا مقابلہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں:۔

علم ہائے اہل دل حمّالِشاں ؎ علم ہائے اہل تن احمالِ شاں

اہل دل کو اپنا علم اٹھانے کی ضرورت نہیں ہوتی بلکہ ان کا علم انہیں اُٹھائے ہوتا ہے برخلاف اس کے اہلِ تن کا علم ان کے لیے بار ہوتا ہے۔

علم چوں بر دل زند یاری شود ؎ علم چوں بر تن زند ماری شود

علم اگر دل پر اثر کرے تو وہ مددگار ہوتا ہے اور اگر تن پر اثر کرے تو بار ہو جاتا ہے۔

گفت ایزد یَحمِلُ اَسفَارَہٗ ؎ بار باشد علم کاں نبود زہُو!

جو علم اللہ کی طرف سے نہ ہو وہ بار ہوتا ہے اور اسی کے متعلق اللہ تعالیٰ نے یَحمِلُ اَسفَارَہٗ کے الفاظ استعمال کئے ہیں۔

---

[1] رسالہ قشیریہ: ۱۹۸ [2] ایضاً اور لواقح الانوار ۱: ۸۴ [3] لواقح الانوار: ۱: ۸۹

علم کاں بنود زِ ہُو بے واسطہ　　آن نپاید ہمچو رنگ ماشطہ

جو علم بلا واسطہ اللہ سے حاصل کیا ہوا وہ ماشطہ کے ظاہری بناؤ سنگھار کی طرح پائیدار نہیں ہوتا۔

لیک چوں ایں بار رانیکو کشی　　بار برگیرند وبخشندت خوشی

لیکن اگر تو اس علم کو اچھی طرح سے اُٹھائے تو تجھے اس بار کے عوض خوشی عطا کی جائے گی۔

ہیں بکش بہر ہوا آں بارِ علم　　تا شوی راکب تو بر رہوارِ علم

خبردار اپنی خواہشات کی خاطر علم حاصل نہ کرنا تاکہ تو علم کے گھوڑے پر سوار ہو سکے۔

ہیں بکش بہر خدا ایں بارِ علم　　تا ببینی در دروں انبارِ علم

اللہ کی خاطر علم حاصل کرو تاکہ تمہارے اندر علم کے انبار دکھائی دیں۔

تاکہ بر رہوارِ علم آئی سوار　　آنگہاں اُفتد ترا از دوش بار

جب تو علم کے گھوڑے پر سوار ہو گیا تب تیرے کندھوں سے بوجھ بھی اُتر جائے گا۔

از ہُوا ہا کے رہی بے جامِ ہو　　اے زہُو قانع شدہ بانامِ ہو[1]

اے اللہ کو چھوڑ کر محض اسم اللہ پر قناعت کرنے والے اللہ کی معرفت کا پیالہ پیئے بغیر تو اپنی خواہشات سے رہائی نہیں پا سکتا۔

ایک اور مقام پر فرماتے ہیں:

علم ہائے اہلِ حس شد پوز بند　　تا نگیرد شیر ازاں علم بلند

جب تک اہلِ حس علم بلند باطن سے خوراک حاصل کرتے ان کا علم منہ تک محدود رہتا ہے (دل میں نہیں اُترتا)

قطرۂ دل رایکے گوہر فتاد　　کاں بگردونہا و دریا ہاں نداد

علم کا جو گوہر دل میں آ پڑتا ہے وہ سمندروں کو حاصل ہوتا ہے نہ آسمانوں کو۔

چند صورت آخر اے صورت پرست　　جانِ بے معنیت از صورت نرست

اے صورت پرست تو کب تک صورت کے پیچھے لگا رہے گا جو صورت سے آزاد نہیں ہوتا اس کی جان بے روح ہوتی ہے۔

گر بصورت آدمی انساں بدے　　احمد و بوجہل خود یکساں بدے

اگر محض صورت سے آدمی انسان کہلاتا تو پھر احمد مصطفی صلی اللہ علیہ وسلم اور ابوجہل یکساں ہوتے۔

---

[1] مثنوی معنوی: دفتر اول: ۶۸

احمد و بوجہل در بُت خانہ رفت   زیں شدن تا آں شدن فرقیست زفت

احمد اور ابُوجہل دونوں بت خانہ میں جاتے ہیں (مگر غور کرو) اُن کے وہاں جانے اور ابوجہل کے جانے میں کس قدر فرق ہے۔

ایں در آید سر نہند آں را بتاں   واں در آید سر نہد چوں اُمتاں

احمد تشریف لاتے ہیں تو بُت سرنگوں ہو جاتے ہیں، لیکن ابُوجہل آکر اُمتیوں کی طرح ان کے سامنے سر جھکاتا ہے۔

نقش بر دیوار مثلِ آدم است   بنگر از صورت چہ چیز اُو راکم است

دیوار پر جو تصویر کھچی ہوتی ہے وہ ہُوبہو آدمی کی طرح ہوتی ہے۔ ذرا غور کرو کہ اس میں کس چیز کی کمی ہے؟

جاں کم است آں صورت بتیاب را   رَو بجُو آں گوہر کمیاب را ![1]

اس بے رونق صورت میں جان کی کمی ہے، لہٰذا تو اسی کمیاب گوہر کی تلاش کر۔

۸۔ امام نوَوِیؒ اور پیر مُراکشیؒ امام محی الدین یحییٰ بن شرف نووی متوفی ۶۳۱ھ، ۱۲۳۳ء اپنے عصر کے بہت بڑے محدث اور امام تھے ان کے شیخ پیر مراکشیؒ دمشق کے بیرونجات میں رہتے تھے، امام نوویؒ کو جب کبھی کسی ایسے مسئلہ میں دقت پیش آتی جسے وہ اپنی تصنیف میں درج کرنا چاہتے تو پیر مراکشیؒ کی طرف رجوع کرتے اور ان سے تحقیق کر لینے کے بعد درج کرتے۔[2]

۹۔ عز بن عبد السلام اور صوفیاء عزالدین عبدالعزیز بن عبدالسلام السُلمی الشافعی بہت بڑے عالم اور صاحب تصانیف گزرے ہیں یہاں تک کہ انہیں سُلطان العلماء کا خطاب دیا گیا۔ یہ پہلے صوفیاء کے مخالف تھے مگر بعد میں جب انہوں نے ابوالحسن شاذلیؒ کی بیعت کر لی تو ان کی فضیلت اور کمال کے معترف ہو گئے تھے۔ خود بھی صاحب کرامات تھے ان کی وفات ۶۶۶ھ میں ہوئی۔ فرماتے ہیں:

مِمَّا يَدُلُّكَ عَلٰى صِحَّةِ مَذْهَبِ الْفُقَرَآءِ كَثْرَةُ كَرَامَاتِهِمْ وَمَا رَأَيْنَا اَحَدًا مِنَ الْفُقَهَآءِ وَقَعَ عَلٰى يَدَيْهِ كَرَامَةٌ اِلَّا اِنْ سَلَكَ مِنْهَاجَهُمْ وَمَنْ لَمْ يُؤْمِنْ بِكَرَامَاتِهِمْ حُرِمَ بَرَكَتَهُمْ۔ وَقَدْ شَاهَدْنَا كُلَّ مَنْ اَنْكَرَ

[1] مثنوی معنوی دفتر اول: ۲۳   [2] الانوار القدسیہ ۱: ۴۶

عَلَى الْفُقَرَآءِ مِنْ غَيْرِ دُخُوْلٍ فِي طَرِيْقِهِمْ بَصِيْرٌ عَلَى وَجْهِهِ كَآبَةٌ وَّ عَلَامَةٌ عَلَى الطَّرْدِ وَالْمَقْتِ لَا تَخْفَى عَلَى ذِي بَصِيْرَةٍ وَّلَا يَنْفَعُ اللّٰهُ بِعِلْمِهِ اَحَدًا بِخِلَافِ اَهْلِ الْاِعْتِقَادِ فِيْهِمْ [1]

فقراء کے طریقہ کے صحیح ہونے کی دلیل یہ ہے کہ ان سے کثرت سے کرامات کا ظہور ہوا ہے برخلاف اس کے ہم نے کسی فقیہ سے کوئی کرامت ظاہر ہوتی نہیں دیکھی۔ البتہ اگر وہ بھی فقراء کے طریقہ پر چلے تو ظاہر ہو سکتی ہے جو لوگ فقراء کی کرامت کے منکر ہیں وہ اُن کی برکت سے بھی محروم رہتے ہیں، ہم نے ان لوگوں کو دیکھا ہے جو ان کے طریقہ کو جانے بغیر ان پر اعتراض کرتے رہتے ہیں کہ ان کے چہرے بے رونق ہوتے ہیں اور اُن پر غضب خداوندی اور رانده ہونے کی علامت پائی جاتی ہے جو اہلِ بصیرت سے پوشیدہ نہیں ہوتی اور ایسے لوگوں کے علم سے کسی کو نفع بھی نہیں پہنچتا۔ برخلاف ان لوگوں کے جو فقراء کے معتقد ہوتے ہیں (کہ ان کے علم سے عوام کو فائدہ پہنچتا ہے)

۱۰۔ ابنِ حجرؒ اور محمد بن فرغلؒ

شیخ الاسلام قاضی القضاۃ حافظ ابوالفضل شہاب الدین احمدؒ بن علی بن حجر عسقلانی متوفی ۸۵۳ھ، ۱۴۴۹ء اپنے زہد و تقویٰ اور علمی تبحر کی وجہ سے مشہور تھے۔ محمد بن احمد فرغلؒ متوفی ۸۵۰ھ (تقریباً) بھی اسی زمانہ میں ایک صاحب کرامات ولی مگر اُمّی تھے۔ محمد بن احمد فرغلؒ عمرؒ کی اولاد کی سفارش کے لیے مصر گئے تو علامہ ابن حجرؒ کا ان پر گزر ہوا۔ ابن حجرؒ نے انہیں دیکھکر اپنے دل میں کہا: اللہ تعالیٰ کسی جاہل کو اپنا ولی نہیں بناتے اور اگر بنائیں تو اسے علم بھی عطا کر دیتے ہیں۔ یہ خیال کر کے ابن حجرؒ نے دل ہی دل میں ان کی ولایت کا انکار کیا اس پر ابنِ فرغلؒ نے کہا "اے قاضی ذرا ٹھہر جاؤ" پھر پکڑ کر انہیں دھپڑ مارتے گئے اور کہتے گئے:

بَلِ اتَّخَذَنِيْ وَعَلَّمَنِيْ [2]

بلکہ مجھے اللہ نے اپنا ولی بنایا ہے اور علم بھی دیا ہے۔ ابن حجرؒ نے یہ سب کچھ خاموشی سے برداشت کیا اور ایک کلمہ بھی منہ سے نہ نکالا۔

ان مثالوں سے یہ بات واضح ہو گئی ہو گی کہ اہلِ طریقت کا علم کس قدر واضح اور صحیح ہوتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہوتی ہے کہ لوگ براہِ راست سرچشمۂ حقیقی سے علم حاصل کرتے ہیں اور درمیان میں کوئی واسطہ نہیں ہوتا کہ غلطی کا احتمال پیدا ہو۔ ان پر نکتہ چینی کا حق صرف انہی بزرگوں کو حاصل ہے جو بحرِ عرفان

---

[1] الانوار القدسیہ ۱: ۴۶ [2] لواقح الانوار ۲: ۹۵

کے شناور ہوں۔ گندی نالیوں میں غوطہ کھانے والوں کو کیسے حق حاصل ہو سکتا ہے کہ وہ ان پر حرف گیری کریں۔ چنانچہ جب حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی رضی اللہ عنہ سے حلاجؒ کے متعلق دریافت کیا گیا تو فرمایا: یہ ایک باز وتھا جس نے لمبا دعویٰ کیا لہٰذا اس پر شریعت کی قینچی چلائی گئی، پھر ایک اور مرتبہ حلاج کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا: حسین حلاجؒ پھسل گیا۔ اس کے عہد میں کوئی اس کا ہاتھ پکڑنے والا نہ تھا، اگر میں اُس زمانہ میں ہوتا تو اس کا ہاتھ پکڑ لیتا۔[1]

علی الخواصؒ اور علمِ لدُنّی

عبدالوہاب شعرانیؒ کے پیر علی الخواصؒ بڑسی اُمّیؒ تھے نہ لکھنا جانتے تھے نہ پڑھنا اس کے باوجود جب قرآن مجید اور حدیث نبویؐ کے معانی پر گفتگو کرتے تو بڑے بڑے علماء بھی انگشت بدنداں رہ جاتے۔ عبدالوہاب شعرانیؒ نے انکے اقوال کو اپنی کتاب الجواہرُ وَالدُّرَرُ میں جمع کر دیا ہے۔ علی فرماتے ہیں:

لَا یُسَمّٰی عِنْدَنَا عَالِمًا اِلَّا مَنْ کَانَ عِلْمُہٗ غَیْرُ مُسْتَفَادٍ مِنْ نَقْلٍ اَوْ صَدْرٍ بِاَنْ یَکُوْنَ خِضْرِیَّ الْمَقَامِ وَاَمَّا غَیْرُہٗ فَاِنَّمَا ھُوَ حَاکٍ بِعِلْمِ غَیْرِہٖ فَلَہٗ اَجْرُ مَنْ حَمَلَ الْعِلْمَ حَتّٰی اَدَّمَہٗ لَا اَجْرُ الْعَالِمِ وَاللّٰہُ لَا یُضِیْعُ اَجْرَ الْمُحْسِنِیْنَ[2]

ہمارے نزدیک وہی شخص عالم کہلا سکتا ہے جس نے علم نہ کسی نقل اور نہ صدر سے حاصل کیا ہو۔ یعنی یہ کہ وہ خضری مرتبہ رکھتا ہو۔ دوسرے لوگ تو اوروں کے علم کی صرف حکایت کرنے والے ہوتے ہیں لہٰذا انہیں عالم کا اجر نہ ملے گا بلکہ اس شخص کا اجر ملے گا جس نے علم اٹھایا اور دوسروں تک پہنچا دیا، اور اللہ تعالیٰ اچھے کام کرنے والوں کا اجر ضائع نہیں کرتے۔

یہاں سے معلوم ہو گیا ہو گا کہ علماء کو حاملین علم کا اجر تو ملے گا، مگر اُن کا علم نہ حقیقی کہلا سکتا ہے اور نہ یہ اس قدر یقینی ہوتا ہے جس قدر کہ اہل باطن کا علم۔ علم ظاہر میں ذہول ونسیان واقع ہو سکتا ہے مگر علم باطن میں اس قسم کے حوادث طاری نہیں ہوتے۔ یہی وجہ ہے کہ علم باطن میں عمل علم کے مطابق ہوتا ہے۔ اس کے برعکس علمِ ظاہر میں ضروری نہیں کہ علم وعمل میں مطابقت پائی جائے۔ چنانچہ ہم بالعموم دیکھتے ہیں کہ علماء ظاہر کے علم وعمل میں سخت تفاوت پایا جاتا ہے، لیکن اگر علم باطن میں عمل علم کے مطابق نہ ہو تو علم کے سلب ہو جانے کا اندیشہ ہوتا ہے انہی حقائق کو مدنظر رکھتے ہوئے علی خواص فرماتے ہیں۔

---

[1] قلائد الجواہر: ۱۷ [2] لواقح الانوار ۲: ۱۳۷

لَا يَكْمُلُ الْفَقِيْرُ فِيْ بَابِ الْاِتِّبَاعِ لِرَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَاٰلِهٖ وَسَلَّمَ حَتّٰى يَصِيْرَ مَشْهُوْدًا لَّهٗ فِيْ كُلِّ عَمَلٍ مَشْرُوْعٍ وَّيَسْتَاذِنُهٗ فِيْ جَمِيْعِ اُمُوْرِهٖ مِنْ اَكْلٍ وَّلُبْسٍ وَّجِمَاعٍ وَّدُخُوْلٍ وَّخُرُوْجٍ فَمَنْ فَعَلَ ذٰلِكَ شَارَكَ الصَّحَابَةَ فِيْ مَعْنَى الصُّحْبَةِ [۱]

کوئی فقیر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اتباع میں اس وقت تک کامل نہیں ہو سکتا جب تک ہر مشروع عمل میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اس کی نگاہ میں نہ ہوں اور اپنے تمام امور میں مثلاً کھانا، لباس، جماع اور دخول وخروج میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے اِذن حاصل نہ کرے۔ پس جس نے ایسا کرلیا وہ صُحبتِ نبویؐ میں صحابہؓ کا شریک ہوگیا۔

جس صوفی کا یہ حال ہو کہ وہ بھی صحابہؓ کی طرح آسمانِ شریعت کا ستارہ بن چکا ہو جس کی اقتدار عینِ ہدایت اور عینِ نجات ہو اس لیے کہ جب ہر فعل میں خواہ ادنیٰ ہو خواہ اعلیٰ اس کی نظر سنتِ نبوی پر ٹھہری اور وہاں سے اجازت حاصل کرنے کے بعد عمل کیا گیا تو وہاں غلطی کا احتمال کہاں رہا۔ لہٰذا ان بزرگوں کے ظاہری اقوال والفاظ کو لیکر ان پر فتویٰ لگانا کہاں تک مناسب و روا ہے۔ افسوس اُن بزرگوں پر آتا ہے جو علم بیان میں حقیقت و مجاز کی بحث کرتے ہوئے یہ تسلیم کرلیتے ہیں کہ اگر کوئی مسلمان یہ کہے کہ فلاں ستارہ کی وجہ سے بارش ہوئی تو یہ مجاز ہوگا حقیقت نہ ہوگی اس لیے کہ کہنے والا مسلمان ہے مگر اگر کوئی عارف باللہ کوئی بات کہہ دے حالانکہ جیسا کہ ہم دیکھ چکے ہیں ان کے طریقہ کی بنیاد کتاب وسنّت پر ہے تو یہی لوگ بغیر سوچے اور بغیر اس کے کہ ان کے معانی کو سمجھیں اُن پر فتویٰ لگانے پر اُتر آتے ہیں۔ مثال کے طور پر اسی کتاب کے اندر اولیاء اللہ کے بعض اقوال پر بحث کی گئی ہے جن میں سے ایک قول یہ ہے:۔

خُضْنَا بُحُوْرًا وَّقَفَتِ الْاَنْبِيَآءُ عَلٰى سَوَاحِلِهَا

اگر ہم اس قول کے ظاہری الفاظ کو لیں تو معنی جو درحقیقت غلط معنی ہیں یوں ہوں گے۔

ہم ایسے سمندر میں گھسے کہ انبیاء ان کے سواحل پر ہی کھڑے رہے۔

ان ظاہری معانی میں کفر پایا جاتا ہے اس لیے کہ ان معانی کے مطابق یہ لوگ (نعوذ باللہ) انبیاء سے بھی افضل ٹھہرتے ہیں حالانکہ بڑے سے بڑا ولی بھی انبیاء تو کجا کسی ادنیٰ ترین صحابی کے درجہ تک نہیں پہنچ سکتا لہٰذا ہمیں اس قول کے معانی میں غور کرنا پڑے گا اور ایسے معانی نکالنے پڑیں گے کہ یہ قول

---

[۱] لواقح الانوار : ۲: ۱۴۷

شریعت کے منافی نہ ہو حضرت عبدالعزیز دباغ رحمۃ اللہ کی تشریح تو آپ اس کتاب میں دیکھ لیں گے میں یہاں دو اور بزرگوں کی تشریحیں پیش کرتا ہوں۔

شاذلیؒ کی تشریح

پہلی تشریح ابوالحسن شاذلیؒ کی ہے وہ فرماتے ہیں کہ اس قول میں بایزید بسطامیؒ (م ۲۶۱ھ) اس بات کی شکایت کر رہے ہیں کہ وہ انبیاء کے درجہ تک پہنچنے سے قاصر ہیں اس لیے کہ انبیاء علیہم السلام تو توحید کے سمندر میں گھس کر پار نکل گئے اور دوسری جانب جا کر کھڑے ہو گئے اور پھر وہاں کھڑے ہو کر مخلوق کو توحید کے سمندر میں داخل ہونے کی دعوت دے رہے ہیں۔ مطلب یہ کہ اگر میں بھی کامل ہوتا تو وہاں کھڑا ہوتا جہاں انبیاء کھڑے ہیں۔ ابن عطاؒ کہتے ہیں کہ اس قول کی جو تشریح شیخ شاذلیؒ نے کی ہے وہی ابویزید بسطامیؒ کے مقام و مرتبہ کے مناسب ہے اس لیے کہ بایزیدؒ خود فرماتے ہیں کہ انبیاء کے مرتبہ کے مقابلہ میں اولیاء اللہ نے جو کچھ حاصل کیا ہے اس کی مثال ایسی ہے کہ شہد سے بھرا ہوا ایک مشکیزہ ہو جس کے تھوڑے سے چھینٹے اِدھر اُدھر پڑ جائیں اب جو کچھ مشکیزہ کے اندر ہے وہ تو انبیاء کے علم اور مرتبہ کی مثال ہے اور چھینٹے مثال ہیں۔ اولیاء اللہ کے علم اور مرتبہ کی مزید برآں ابویزیدؒ سے انبیاء کی تعظیم اور اُن کا کمال ادب ہی منقول ہے[1]

علی دلدہؒ کی تشریح

دوسری تشریح علی دلدہ (۷۶۱ھ، ۱۳۵۹ء تا ۸۰۱ھ، ۱۳۹۸ء) کی ہے۔ فرماتے ہیں کہ اس قول کا مطلب یہ ہے کہ انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام بحرِ تکلیف کو عبور کر چکے ہیں اور اب سلامتی کے ساحل پر کھڑے ان لوگوں کو اپنے سایۂ عاطفت میں لے رہے ہیں جو سلامتی سے وہاں پہنچ جائیں۔ انہیں یہی حکم ملا ہے اور اسی کے لیے انہیں بھیجا گیا ہے۔ کیونکہ کشتی تو اسی دن ٹوٹ گئی تھی جس دن حضرت آدم علیہ السلام نے درخت کا پھل کھایا تھا۔[2]

اولیاء اللہ کے اقوال میں جہاں کہیں کوئی بات ہمیں ظاہر شریعت کے مخالف نظر آئے اُس کی اسی طرح تاویل کر کے اسے شریعت کے مطابق سمجھنا اور بنانا چاہیئے اور ان کا انکار کرنے اور فتویٰ لگانے میں جلد بازی سے کام نہیں لینا چاہیئے ہمارا یہ رویہ ہر اس ولی کے قول سے ہونا چاہیئے جو پختہ کار اور کامل ہو البتہ خام کار اور غیر کاملین کے اقوال میں اگر کوئی غیر مشروع بات نظر آئے تو اس قول کو ترک کر دینا چاہیئے لیکن نہ انہیں بُرا کہنا چاہیئے اور نہ فتویٰ لگانا چاہیئے۔

---

[1] لواقح الانوار: ۲: ۱۵ (۲) لواقح الانوار ۲: ۲۶، اس تشریح کے مطابق مطلب یہ نکلا کہ میں بھی اسی سمندر میں گھستا ہوں خدا کرے کامیابی سے پار نکل کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں پہنچ جاؤں۔

مُہمل فتویٰ باز

ہم دیکھتے ہیں کہ بعض لوگ افتاء کا باب کھولنے میں نہایت عُجلت اور بے احتیاطی سے کام لیتے ہیں اور ان میں سے بعض کے فتوے تو نہایت بیہودہ ہوتے ہیں۔

چنانچہ عبدالوہاب شعرانیؒ لکھتے ہیں کہ میری موجودگی میں ایک شخص نے ایک عالم سے پوچھا کہ جو لوگ رات بھر بلند آواز سے قرآن مجید پڑھتے رہتے ہیں ان کے متعلق کیا حکم ہے۔ اُس عالم نے بغیر سوچے سمجھے فوراً کہہ دیا کہ یہ حرام ہے اس لیے کہ اللہ تعالیٰ نے رات کو آرام و راحت کا سبب بنایا ہے (جَعَلَ اللَّیْلَ سَکَنًا) اور یہ لوگ اس حکم کی خلاف ورزی کرتے ہیں لہٰذا رات کے وقت بلند آواز سے قرآن مجید پڑھنا حرام ہے[1]۔

اسی طرح ایک اور شخص نے اُن لوگوں کے متعلق دریافت کیا جو جمعہ کی رات ذکر الٰہی کرنے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر درود بھیجنے میں گزار دیتے ہیں۔ اُس کے جواب میں فقیہ صاحب نے فرمایا کہ یہ بیہودہ لوگوں کا کام ہے اور بدعت ہے[2]۔

آج کل صوفیاء پر اعتراض کرنے والوں کا بالعموم یہی حال ہے کہ بلا امتیاز اور بغیر سوچے سمجھے بدعت اور کفر کے فتوے لگاتے جاتے ہیں۔ اللہ انہیں ہدایت کرے۔

اَللّٰھُمَّ اَرِنَا الْحَقَّ حَقًّا وَّارْزُقْنَا اِتِّبَاعَہٗ وَاَرِنَا الْبَاطِلَ بَاطِلًا وَّارْزُقْنَا اِجْتِنَابَہٗ۔

لَا مُشَاحَۃَ فِی الْاِصْطِلَاحِ کا مقولہ عام مشہور ہے لہٰذا ہر شخص کو اپنی اصطلاح قائم کرنے کا حق حاصل ہے۔ چنانچہ صوفیاء نے بھی اصطلاحات قائم کیں اور مخالفین نے ان بزرگوں کی اصطلاحات سے ناواقف ہوتے ہوتے ان کے الفاظ میں اپنے معانی گھسیڑ دیئے اور ان بزرگوں پر الزام تراشی شروع کر دی۔ اسی لیے تو شیخ محی الدین ابن العربی فرماتے ہیں کہ جو لوگ ہمارے مقام اور اصطلاح کو نہیں سمجھتے اُن پر ہماری کتابوں کا مطالعہ کرنا حرام ہے[3]۔

مولانا عبدالرحمٰن جامی متوفیٰ ۸۹۸ھ = ۱۴۹۲ء نفحات الانس میں شیخ سعدالدین حمویؒ متوفیٰ ۶۵۰ھ کے متعلق لکھتے ہیں:

"در مصنفات وے سخنان مرموز کلمات مشکل و ارقام و اشکال و دوائر کہ نظرِ عقل و فکر از کشف و حل آں عاجز است بسیار است وہمانا کہ تا دیدۂ بصیرت بنور کشف منفتح نشود ادراکِ آں متعذر است"[4]۔

---

[1] الانوار القدسیہ: ۱: ۱۱۲ [2] ایضاً [3] ایضاً ۲: ۴۴، ۴ [4] نفحات الانس: ۳۸۴

ان کی تصانیف میں بہت سے رموز، مشکل کلمات، ارقام، اشکال و دوائر آتے ہیں جنہیں عقل و فکر حل کرنے سے عاجز ہے اور جب تک دیدۂ بصیرت نورِ کشف کے ساتھ روشن نہ ہوا ہو ان رموز کا سمجھنا مشکل ہے۔

امام الحرمین کا قول

قزوینی نے سراج العقول میں نقل کیا ہے کہ کسی نے امام الحرمین ابو المعالی جُوَینیؒ (م ۴۷۸ھ ، ۱۰۸۵ء) سے عالی صوفیاء کے کلام کے متعلق جن میں بظاہر کفریہ کلمات پائے جاتے ہیں دریافت کیا تو فرمایا:

ان کا کلام سخت مشکل ہے جس کا سمجھنا ہر کس و ناکس کے بس کی بات نہیں۔ یہ لوگ تو توحید کے سمندر سے گھونٹ بھرتے ہیں۔[1]

تقی الدین سبکیؒ کا قول

علامہ تقی الدین سبکیؒ سے کسی نے غالی مبتدعہ پر حکم کفر لگانے کے متعلق دریافت کیا تو فرمایا: جس شخص کے دل میں اللہ کا خوف ہو گا وہ لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ کہنے والوں کو کافر کہنے سے ڈرے گا اس لیے کہ مومن کو کافر کہنا بہت خطرناک چیز ہے۔[2]

شیخ عبدالحقؒ کا قول

شیخ عبدالحق محدث دہلوی فرماتے ہیں:

لَا نُکَفِّرُ اَحَدًا مِّنْ اَھْلِ الْقِبْلَۃِ۔ اہلِ قبلہ را یعنی آنہا کہ نماز بجانبِ قبلۂ مسلماناں کنند و بہ کتاب و سنّت تمسک نمایند و تلفظ بشہادتین کنند کافر نباید گفت اگر از بعضے کلماتِ ایشاں کفر لازم آید ولیکن مادام کہ التزامِ آن نکنند یا لزوم در غایت درجۂ ظہور نبود تکفیر نباید کرد تا ممکن است توجیہ و اصلاحِ حال مسلمانان باید کرد و مبادرت بہ تکفیر و تغلیظ نباید کرد و در حدیث آمدہ است کہ ہر کہ دیگرے را کافر گوید اگر وے در نفس الامر کافر نبود قائل بالفعل کافر گردد و حکم لعن ہمچنیں آمدہ است اگر آنکس مستحقِ لعنت نبود لعن او بقائل عاید گردد پس احتیاط در ترکِ لعن و تکفیر باشد واللہ اعلم۔[3]

ہم اہلِ قبلہ میں سے کسی کو کافر قرار نہیں دیتے۔ یعنی وہ لوگ جو مسلمانوں کے قبلہ کی طرف منہ کر کے نماز پڑھتے ہیں اور وہ کتاب و سنت پر کاربند ہیں اور کلمۂ شہادت پڑھتے ہیں، اگر ان کے کسی کلمہ سے کفر لازم آئے تو انہیں کافر نہیں کہنا چاہیئے اور جب تک وہ ان کفریہ کلمات پر مُصر نہ رہیں یا جب تک اُن کا ان کلمات پر ڈٹے رہنا بالکل ہی واضح نہ ہو انہیں کافر نہ کہنا چاہیئے بلکہ جہاں تک ممکن ہو سکے اس کی

---

[1] لواقح الانوار: ۱: ۱۱ [2] ایضاً [3] تکمیل الایمان: ۷۰، مطبع مجتبائی

کوئی نہ کوئی وجہ نکالنی چاہیئے اور مسلمانوں کے حال کی اصلاح کرنی چاہیئے۔ حدیث میں آیا ہے کہ جو شخص دوسرے کو کافر کہے گا اور وہ درحقیقت کافر نہ ہو تو کہنے والا خود کافر ہو جاتا ہے۔ کسی پر لعنت کرنے کا بھی یہی حکم ہے۔ اگر وہ شخص لعنت کا مستحق نہ ہوگا تو لعنت لعنت کنندہ پر لوٹ آئے گی لہٰذا احتیاط اسی میں ہے کہ نہ کسی کو لعنت کی جائے اور نہ کافر کہا جائے۔ واللہ اعلم۔

لہٰذا جو لوگ ان بزرگوں پر اتہام لگاتے اور ان کو بدعتی یا مشرک قرار دیتے ہیں انہیں چاہیئے کہ ان پر فتویٰ لگانے سے پہلے ان کے کلمات کے معانی کی وضاحت کرالیں۔ اگر وہ کلمات کسی خام بزرگ کے ہیں تو انہیں یک قلم ترک کر دیں اور تاویل کی زحمت نہ اٹھائیں مگر اگر کسی پختہ کار کے کلمات ہوں تو تاویل کی ضرورت پڑے گی۔ مگر پھر بھی یاد رہے کہ شریعت کی بنیاد کتاب و سنت پر ہے لہٰذا اگر کسی کو ان کے بعض کلمات سمجھ میں نہ آتے ہوں تو بہتر یہی ہے کہ وہ اس بارے میں خاموشی اختیار کرے۔

آخر میں ہم یہ بھی بیان کر دیں کہ جہاں ایک طرف اولیاء اللہ اور بزرگانِ دین کی تعظیم و تکریم کرنا ضروری ہے وہاں یہ بھی خیال رکھنا ضروری ہے کہ ہم ان کی تعظیم میں حد سے تجاوز نہ کر جائیں۔

ع گر فرقِ مراتب نہ کنی زندیقی

اولیاء اللہ کی کرامات حق ہیں۔ چنانچہ لوگ عہدِ صحابہؓ سے لے کر آج تک اولیاء اللہ کی کرامات دیکھتے چلے آئے ہیں مگر ہمیں ان کی کرامات کی طرف توجہ دینے سے زیادہ ان کے اعمال اور ان کی زندگی کی طرف توجہ دینی چاہیئے اور ان کے نقشِ قدم پر چلنے کی کوشش کرنی چاہیئے۔ اسی لیے حضرت عبدالعزیز دباغؒ نے خود اسی کتاب میں فرمادیا ہے:

"اولیاء اللہ کے سوانح نگاروں نے بہت نقصان پہنچایا ہے ع اس لیے کہ انہوں نے زیادہ تر ان کی کرامات کا ذکر کرنے پر زور دیا ہے اور ان کے اقوال و اعمال کا کم تذکرہ کیا ہے۔"

ولی معصوم نہیں ہوتا

مزید برآں ایک ولی کے متعلق ہمیں یہ بھی عقیدہ رکھنا چاہیئے کہ وہ ایک انسان ہے کوئی فوق البشر شخصیت نہیں اور یہ کہ

لہ رسالہ قشیریہ: ۸۵ اور خزینہ معارف: ۱۴۴ ع ملاحظہ ہو صفحہ ۱۴۴

ضروری نہیں کہ وہ ایک نبی کی طرح معصوم ہو۔ مگر ہو سکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ اسے گناہ سے بچائے رکھے اور اگر اس سے کوئی لغزش وغیرہ بھی ہو جائے تو وہ فوراً سنبھل جائے۔ چنانچہ حضرت جنیدؒ سے کسی نے پوچھا: کیا عارف گناہ کا مرتکب ہو سکتا ہے؟ تو صرف اسی قدر فرمایا:

وَكَانَ اَمْرُ اللّٰهِ قَدَرًا مَّقْدُوْرًا — اللہ کا حکم مقدر ہو چکا ہے۔

اب میں اس بحث کو بخاری کی ایک حدیث پر ختم کرتا ہوں جس میں حضرت ابو ہریرہؓ فرماتے ہیں

حَفِظْتُ مِنْ رَّسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَاٰلِهٖ وَسَلَّمَ وِعَائَيْنِ فَاَمَّا اَحَدُهُمَا فَبَثَثْتُهُ وَاَمَّا الْاٰخَرُ قُطِعَ هٰذَا الْبُلْعُوْمُ ؕ

میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم سے دو قسم کے علموں کے خزانے حاصل کئے ان میں سے ایک کو تو میں نے تم میں ظاہر کر دیا ہے لیکن دوسرے کو ظاہر کروں تو گلا کٹتا ہے۔

وَاٰخِرُ دَعْوٰنَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ؕ

کتابیات

مَیں نے اس کتاب کے حواشی اور دیباچہ لکھنے میں مندرجۂ ذیل کتابوں سے مدد لی ہے

۱۔ فتوحاتِ مکیہ:۔ قلمی نسخہ مملوکہ میجر عبدالعزیز صاحب۔ مَیں نے اس کا دیباچہ میں ذکر بیان کر دیا ہے اس نسخہ پر متعدد بادشاہوں کی مہریں ہیں اور بڑا نایاب نسخہ ہے۔

۲۔ تکمیل الایمان (فارسی) از شیخ عبدالحق محدث دہلوی مطبوعہ مجتبائی دہلی ۱۳۲۰ھ

۳۔ قلائد الجواہر فی مناقب عبدالقادرؒ: از علامہ محمد بن یحییٰ التاذفی الحلبی متوفی ۹۶۳ھ طبع مصر۔

۴۔ لواقح الانوار فی طبقات الاخیار جو بالعموم طبقات کبریٰ کے نام سے مشہور ہے: از امام عبدالوہاب شعرانیؒ مطبوعہ مصر۔

۵۔ الانوار القدسیہ فی بیان آداب العبودیہ از شعرانیؒ برحاشیہ لواقح الانوار

۶۔ رسالہ قشیریہ: از امام ابوالقاسم عبدالکریمؒ بن ہوازن۔ طبع مصر ۱۹۴۰ء

۷۔ التنبیہ الطربی فی تنزیہ ابن العربی: از مولانا اشرف علی تھانویؒ۔ مطبع اشرف المطابع تھانہ بھون۔

۸۔ نفحات الانس: از مولانا عبدالرحمٰن جامیؒ مطبع نول کشور۔

۹۔ ALITERARY HISTORY OF THE ARABS BY NICH-OLSON ۱۹۵۳ء

۱۰۔ عوارف المعارف: از شہاب الدین سہروردیؒ برحاشیہ احیاء العلوم طبع مصر (مطبع مصطفےٰ بابی ۱۳۳۹ھ)

۱۱۔ مثنوی معنوی: از مولانا رومؒ۔ طبع تہران از سال ۱۳۱۵ھ تا ۱۳۱۹ھ

۱۲۔ معالم التنزیل: از ابو محمد الحسین الفراء البغوی متوفی ۵۱۶ھ

۱۳- فتح الباری: از علامہ ابنِ حجرؒ العسقلانی۔ طبع مصر۔
۱۴- الشفا بتعریف حقوق المصطفیٰؐ: از قاضی عیاض متوفی ۵۲۴ھ
۱۵- نسیم الریاض شرح الشفا: از شہاب الدین خفاجی
۱۶- استیعاب: از ابنِ عبدالبرؒ
۱۷- الاصابہ: از ابنِ حجر
۱۸- وفیات الاعیان: از ابن خلکان
۱۹- کشف الظنون: از حاجی خلیفہ
۲۰- تہذیب التہذیب: از ابن حجرؒ
۲۱- درمختار: از محمد علاؤ الدین الحصکفی
۲۲- مشکوٰۃ المصابیح: طبع مجتبائی
۲۳- موطا امام مالکؒ: طبع مصر
۲۴- تنویر الحوالک شرح موطا امام مالکؒ: از جلال الدین سیوطیؒ
۲۵- شرح الصدور: از جلال الدین سیوطیؒ
۲۶- تذکرۃ الحفاظ: ذہبیؒ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

خطبہ

شکر ہے اُس خدا کا جس نے اپنے اولیاء کے لیے وسائل کے طریقے کھول دیے اور اُن کے کریم ہاتھوں پر قسم قسم کے فضائل جاری کئے، لہٰذا جس کسی نے اُن کی اقتدا کی وہ غالب آیا اور اس نے راہِ راست پائی اور جو اُن کے راستہ سے منحرف ہوا وہ سرنگوں اور ہلاک ہوا جس نے اُن کا دامن پکڑا وہ کامیاب ہوا اور نجات پا گیا جس نے اُن پر نکتہ چینی کی وہ منقطع اور ہلاک ہوا۔

مَیں خدا کی حمد اس شخص کی طرح بیان کرتا ہوں جسے یقین ہے کہ خُدا کے پاس جانے کے سوا کوئی جائے پناہ نہیں اور اس شخص کی طرح خدا کا شکریہ ادا کرتا ہوں جسے یہ ثابت ہو چکا ہے کہ دنیا اور آخرت کی بھلائی خدا ہی کے پاس ہے اور مَیں خدا سے اس طرح مدد چاہتا ہوں جس طرح کہ وہ شخص مدد چاہتا ہے جو اپنے معاملات میں سوائے اس کے کسی پر اعتماد نہیں کرتا اور مَیں سیّدنا محمدؐ اور آپ کی آل پر اس قدر درود و سلام بھیجتا ہوں جس قدر کہ اللہ کریم کی مخلوقات اور انعامات ہیں۔

اَمّا بَعد جب اللہ تعالیٰ نے مجھ پر یہ احسان کیا، جس کے لیے میں اُس کی تعریف کرتا ہوں اور شکریہ ادا کرتا ہوں کہ میں نے وَلیٔ کامل، غوث حافل، صوفیٔ باہر اور عرفان کے درخشندہ ستارے، صاحب اشاراتِ عالیہ اور صاحب عباداتِ سنیّہ، صاحب حقائقِ قدسیّہ و انوارِ محمّدیّہ اور صاحب اسرارِ ربّانیہ و ہمم عرشیہ، موجدِ معالمِ طریقت بعد ازاں کہ اس کے آثار پوشیدہ ہو چکے تھے اور علُوم و حقائق کے پیدا کرنیوالے کو بعد ازاں کہ اُس کے آثار پوشیدہ ہو چکے تھے اور علوم و حقائق کے پیدا کرنے والے کو بعد ازاں کہ اس کے انوار بجھ چکے تھے پہچان لیا۔ یعنی شریف، وجیہ، حسب و نسب والا جو جسمانی اور روحانی دونوں طرح کی پاکیزہ نسبتوں کا مالک ہے وَالوِلایتین اُلکَریمتین الملکیۃ وَالملکوتیۃ المحمّدی العلوی الحسنی قطب السّالکین وَحَامِلُ لِوَاءِ العَارِفِین ہ

نسب نامہ حضرت عبدالعزیز دبّاغ رح

شیخنا و سیّدنا و مولانا عبدالعزیز بن مسعود بن احمدؒ بن محمدؒ بن محمدؒ بن احمد بن عبدالرحمٰن بن قاسم بن محمدؒ بن احمدؒ بن قاسم بن محمدؒ بن ابراہیم بن عمر بن عبدالرحیم بن عبدالعزیز بن ہارون بن قنون بن علوش بن مندیل بن علی بن عبدالرحمٰن بن عیسیٰ بن احمد بن محمدؒ بن

عیسٰی بن ادریس بن ادریس بن عبداللہ الکامل بن الحسن المثنیٰ بن الحسنؓ السبط بن علیؓ رضی اللہ عنہم اجمعین، خدا ہمیں ان کی برکتوں سے مستفیض کرے آمین!

چنانچہ میں نے اُن کے اس قدر علوم و معارف اور شمائل و لطائف کا مشاہدہ کیا کہ میرے ہوش جاتے رہے اور انہوں نے مجھے ہمہ تن مسحور و مقید کر لیا۔ میں نے ان کی زبان سے سید الوجود علم الشہود حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی قدر و منزلت کے متعلق وہ کچھ سنا جو میں نے کبھی بھی نہ کسی انسان سے سنا تھا اور نہ ہی کسی کتاب میں دیکھا تھا۔ چنانچہ آپ اس کتاب کے دوران میں انشاءاللہ خود دیکھ لیں گے اور جو شخص آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو سب سے زیادہ پہچانتا ہے وہ قیامت کے دن آپ سے سب سے قریب ہوگا۔

اسی طرح میں نے اُن سے اللہ تعالیٰ اس کی بلند صفات اور عظیم اسماء کے متعلق وہ کچھ سنا جس کی کیفیت بیان نہیں کی جا سکتی اور نہ ہی کوئی اس کی طاقت رکھ سکتا ہے اور ان باتوں کا اِدراک خدائے خلاق کی عنایت کے بغیر نہیں ہو سکتا۔

اسی طرح میں نے اُن سے اللہ کے انبیاء اور رسولوں کی معرفت کے متعلق وہ کچھ سنا جس سے یہ گمان پیدا ہوتا ہے کہ وہ ہر نبی کے ساتھ اُس کے زمانہ میں ہوئے ہیں گویا کہ وہ اُن کے معاصرین میں سے تھے۔

اسی طرح میں نے اُن کی زبان سے ملائکہ کرام، ان کی مختلف جنسوں اور اُن کے تفاوتِ مراتب کے متعلق وہ وہ معرفت کی باتیں سنیں جن سے خیال پیدا ہو کہ آیا بشر بھی اس قدر علم جان سکتے ہیں اور کیا وہ اس حد تک پہنچ سکتے ہیں!

اسی طرح میں نے اُن سے کتبِ سماویہ اور گذشتہ انبیاء کی شریعتوں کے متعلق وہ معرفت کی باتیں سنیں جن سے سننے والا یہ قطعی فیصلہ کرے کہ یہ شخص سید العارفین اور اپنے زمانہ کے اولیاء کا امام ہے۔

اسی طرح میں نے اُن سے یومِ آخرت، حشر و نشر، صراط اور میزان کے متعلق وہ معرفت کی باتیں سنیں جن سے یہ معلوم ہوتا تھا کہ وہ مشاہدہ سے بات کر رہے ہیں اور تحقیق اور عرفان سے بات کہہ رہے ہیں تب جا کر مجھے ان کی ولایتِ عظمٰی کا یقین ہو گیا اور میں اُن کی ذات سے وابستہ ہو گیا اور میں نے کہا اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ هَدٰنَا لِهٰذَا وَمَا كُنَّا لِنَهْتَدِیَ لَوْلَاۤ اَنْ هَدٰنَا اللّٰهُ (شکر ہے خدا کا کہ اس نے ہمیں اس طرف کی راہ دکھا دی اور اگر خدا راستہ نہ دکھاتا تو ہم یہاں پہنچ نہ سکتے تھے) کیونکہ ہر مومن کی خواہش ہوتی ہے کہ وہ گذشتہ امور کے متعلق معلومات حاصل کرے اور اسی سے اس کا سودا سود مند ہو سکتا ہے۔

جبرئیل کا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے حقیقت ایمان کے متعلق سوال کرنا

ہم دیکھتے ہیں کہ جبرئیل علیہ الصلوٰۃ والسلام نے سیدنا و مولانا محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے حقیقت ایمان کے متعلق سوال کیا تو آنحضرت نے فرمایا: حقیقتِ ایمان یہ ہے کہ اللہ اور اس کے فرشتوں، اس کی کتابوں، اس کے پیغمبروں، روزِ قیامت اور تقدیر پر ایمان کہ بھلی یا بُری سب اللہ کی طرف سے ہے۔ اس سے یہ نتیجہ نکلا کہ جو ان امور میں سب سے زیادہ واقف ہوگا وہی ان سب سے بہتر ایمان والا اور زیادہ کاملِ عرفان والا ہوگا۔ لہٰذا خدا تجھے توفیق دے، یہی روشن راہ ہے۔

جامعِ کتاب کی حضرت دباغؒ سے پہلی ملاقات

میری اور اُن کی ملاقات رجب ۱۱۲۵ھ میں ہوئی۔ اس کے بعد آپ کی صحبت میں اور آپ کی محبت کے جھنڈے تلے رہا۔ ان سے بیشمار معارف سنتا، لیکن میں نے کسی بات کو قلمبند نہ کیا، لیکن سب کچھ سنتا اور سمجھتا تھا اور میں اپنے دوستوں اور خاص ساتھیوں سے اس کا ذکر کرتا جو کوئی سنتا، تعجب کرتا اور کہتا کہ ایسے بے مثل حقائق و معارف ہمارے کانوں میں کبھی نہیں پڑے۔

زیادہ تعجب کی بات یہ تھی کہ حضرت ممدوح اُمّیِ محض تھے اور کبھی ظاہری علم سے لگاؤ نہ ہوا تھا اور وہ ان لوگوں میں سے تھے جنہوں نے بظاہر علم سے انتہا درجہ کا اعراض کیا ہو اور جو کوئی بھی کچھ باتیں سُن پاتا وہ اُن کی لذت ایک یا دو دن تک محسوس کرتا اور بعض ایک جمعہ سے دوسرے جمعہ تک محسوس کرتے رہتے۔ جب میں اُن سے ملتا یا وہ مجھے ملنے آتے تو وہ مجھ سے دریافت کرتے کہ کیا تم نے ان معارف میں سے کچھ سُنا ہے؟ جس قدر ہو سکتا میں انہیں بیان کرتا اور ان کا تعجب اور محبت اور بڑھ جاتی، بخوفِ طوالت میں ان حضرات کے نام نہیں گنواتا جو مجھ سے اُن کا کلام سنتے اور محظوظ ہوتے کیونکہ جو شخص ان لوگوں کے ناموں سے واقف ہوگا وہ ہمارے شیخ کی قدر و منزلت کو سمجھ جائے گا اس لیے کہ یہ لوگ عوام میں اپنی ولایت کی وجہ سے مشہور ہیں اور لوگ اُن کی انتہا درجہ کی تعظیم کرتے ہیں اور وہ اکثر صالحین اور اولیاء کی صحبت میں رہنے والے لوگ ہیں اور اُن کے فیضان سے بہرہ ور ہو چکے ہیں۔ چنانچہ انہیں اسرارِ ولایت اور عارفوں کی علامات اور صادقین کے اوصاف کا علم ہے اور وہ ہادی اور مُہتدی کے حالات سے واقف ہیں۔ اسکے علاوہ وہ اکابر علماء و فقہا میں سے ہیں۔ جب وہ مجھ سے ہمارے شیخ (عبدالعزیز دباغؒ) کی باتیں سنتے تو مجھے کہتے کہ دیکھنا کہیں اس شخص کی محبت کا دامن نہ چھوڑنا۔ یہ تو واللہ ولی کامل اور عارفِ واصل ہے مختصر یہ کہ جو کوئی بھی ان کا کلام سنتا وہ اُن کو فوراً قبول کر لیتا جیسا کہ تمہیں کتاب سے معلوم ہو جائیگا

عہ مشکوٰۃ کتاب الایمان ص۱۱، صوفیہ اس سے یہ استدلال کرتے ہیں کہ جبرئیل یہاں پر بطور اُستاد کے آتے تھے تاکہ آدابِ شاگردی سکھائیں۔

انشاء اللہ تعالیٰ بمنہٖ وکرمہٖ

ابتدائے تالیفِ کتاب در ۱۱۲۹ھ

جب رجب ۱۱۲۹ھ ہوا تو اللہ نے میرے دل میں خیال ڈالا کہ ان کے بعض فوائد کو قلمبند کروں تاکہ ان کا فائدہ عام لوگوں کو ہو۔ چنانچہ میں نے رجب شعبان، رمضان، شوال اور ذی قعدہ میں جو کچھ سنا تھا جمع کیا اور یہ ۱۵ جُز کے قریب بن گئے۔ خیال ہوا کہ اگر میں اُن باتوں کو بھی قلمبند کرتا جو میں نے گذشتہ چار سالوں میں سنی تھیں تو یہ دو سو جُز سے بھی زیادہ ہو جاتا۔ علم کی آفت اس کے قلمبند نہ کرنے سے ہوتی ہے۔

یاد رکھیں میں نے جو کچھ لکھا ہے وہ آپ کے بحرِ زخّار میں سے محض چند قطرے ہیں، لیکن جو علوم شیخ رضی اللہ عنہ کے سینے میں تھے انہیں اللہ کے سوا کوئی نہیں جانتا۔

اس کے بعد میں کہتا ہوں کہ اس مبارک مجموعہ سے مقصود صرف ان بعض باتوں کا جمع کرنا ہے جو ہم نے اُن سے سنیں۔ اس لیے ضروری ہے کہ پہلے ہم ایک مقدمہ میں اس شیخِ کریم کے شمائل کا ذکر کریں اور بتائیں کہ ان کی ابتدا کیسے ہوئی۔ ان کے لیے فتح بابِ علم کیسے ہوا؛ کس نے انہیں ذکر کی تلقین کی؛ وہ ظاہری اور باطنی شیوخ میں سے کن کن سے ملے وغیرہ۔ ان تمام باتوں کا ذکر تین فصلوں میں کیا جائے گا۔

فصل اوّل

ولادت سے پہلے کے حالات

العربی الفشتالی کا مُبارک بن علیؒ کی بیعت کرنا

مَیں نے انہیں یہ کہتے سنا کہ میرے آقا العربی الفشتالیؒ اولیاء اللہ میں سے تھے پہلے علم باطن محمد بن ناصرؒ وادِ زرعہ والے سے حاصل کیا۔ پھر مبارک بن علیؒ سے۔ مبارک بن علی قصابوں کی خدمت کیا کرتے تھے۔ واقعہ یوں ہوا کہ عربی فشتالیؒ نے حضرت مبارک بن علیؒ کو فاس میں قرویین کی جامع مسجد میں دیکھا اور اپنی فراست سے ان میں خیر و صلاح کے آثار دیکھے تو کہا: اے میرے آقا مجھے بتائیں کہ اربابِ سِرّ کو سِرّ کیسے حاصل ہوتا ہے؟ اس پر شیخ مبارک نے فرمایا "اچھا چھینکو" فشتالی نے کہا: چھینک تو اس وقت مجھے نہیں آ رہی۔ فرمایا اسی طرح مجھے بھی خیال نہیں آ رہا کہ تمہیں بتادوں کہ اربابِ سِرّ کو سِرّ کیسے حاصل ہوتا ہے؟ (یعنی یہ میرے اختیار کی بات نہیں ہے)

عبدالعزیز دباغ کے والد مسعود دباغؒ کا العربی الفشتالیؒ کی بھانجی فارحہ کیساتھ نکاح

عبدالعزیز دباغؒ کہتے ہیں کہ العربی الفشتالیؒ کی ایک بہن تھی جس کی ایک بیٹی تھی۔ ان کے بہنوئی کا نام علال القمارشی تھا جو بڑا مالدار آدمی تھا۔ علال القمارشی مرگیا اور ان کی بہن سے علال کے بعد مکناستہ الزیتون کے ایک شخص نے شادی کرلی، لیکن بچی العربیؒ کے پاس ہی رہی۔ انہوں نے اس کی تربیت کی اور بڑی محبت سے پالا اور اس پر خوب روپیہ خرچ کیا اور العربیؒ ولی ہونے کے علاوہ فقیہ اور قاری بھی تھے، چنانچہ وہ علم کا درس دیتے۔ طالب علم اپنی تختیاں ان سے درست کرواتے اور ان سے علم تجوید سیکھتے۔ میرا باپ مسعود بھی ان کے شاگردوں میں سے تھا۔

ایک دن ایسا ہوا کہ مجلسِ علم ختم ہونے پر العربیؒ نے میرے والد کو بلا کر کہا کہ میں اپنی بھانجی کی شادی تم سے کرنا چاہتا ہوں۔ ان کی بہن کا نام راضیہ اور بھانجی کا نام فارحہ تھا۔ میرے والد نے جواب دیا اگر آپ دیتے ہیں تو مجھے قبول ہے۔ العربیؒ نے کہا میں نے اپنی بھانجی کو تمہیں دے دیا۔ میرے باپ مسعود نے کہا میں نے قبول کیا۔ اس کے بعد العربیؒ نے کہا کہ مہر اور جہیز سب میرے ذمہ ہے تم کو کسی قسم کا فکر کرنے کی ضرورت نہیں۔ اس پر میرے باپ کو انتہائی خوشی ہوئی۔ اس سے پہلے بھی العربی ان سے بہت محبت کرتے تھے اور جب کبھی ان سے ملتے جو کچھ حاضر ہوتا دیتے۔ جب عقد نکاح ہوچکا تو العربی نے اپنی بھانجی کو تیار کرکے میرے والد کے ہاں بھیج دیا۔ اس کے بعد والد صاحب سے ملے اور کہا میری دکان پر آیا کرو۔ ان کی دوکان محلہ سماط عدول میں تھی۔ میرے والد ہر روز عصر کے بعد ان کے پاس آتے اور العربی انہیں ہر روز دو موزونہ[1] دیا کرتے۔

میں نے اپنے آقا محمدؒ بن عبدالرحمٰن سے سُنا کہ میں اپنی تختی دکھا رہا ہوتا کہ تمہارے (عبدالعزیز دباغؒ کے) والد مسعود دباغ آتے اور العربی الفشتالیؒ جو کچھ بھی دکان سے حاصل کیا ہوتا۔ انہیں دے دیتے زَوَاغہ میں ان کی بھانجی کی بہت سی زرعی زمین تھی جو اُسے اپنے والد علال القمارشی سے وراثت میں ملی تھی۔ ایک دن العربیؒ نے میرے والد مسعود سے کہا تمہاری بیوی بڑی نیک ہے وہ تمہیں ان تمام اراضی کے بیع کرنے کے لیے اپنا وکیل بناتی ہے جو زواغہ میں ہیں۔ جاؤ اور سب کو بیچ ڈالو میرے والد

---

[1] اسے اُوجہ بھی کہتے ہیں۔ یہ چاندی کا ایک سکہ ہے جو مراکش میں اٹھارویں اور انیسویں صدی عیسوی میں شریفوں نے رائج کیا۔ یہ سب سے چھوٹا چاندی کا سکہ تھا جو ۲۴ فلوس کے برابر تھا۔ انسائیکلوپیڈیا آف اسلام۔

میری والدہ کے پاس گئے۔ والدہ نے انہیں وکیل بنا دیا۔ میری والدہ کی ایک علّاتی بہن[1] تھی۔ ان کے پاس میرے والد گئے تاکہ وہ بھی انہیں ساری زمین کے فروخت کرنے پر وکیل بنادے، لیکن میری خالہ نے انکار کر دیا۔ میرے والد نے میری والدہ کا حصّہ فروخت کر دیا اور میری خالہ اپنے حصّہ کے محاصل تقریباً ۲۰ سال تک وصول کرتی رہیں۔ اس کے بعد ظالم وَدِّیَہ فرقہ آیا۔ انہوں نے زواغہ کی تمام اراضی غضب کر لیں جن میں میری خالہ کی زمین بھی تھی۔ اس دن سے انہیں وہاں سے ایک حبہ بھی وصول نہ ہوا۔ اس سے لوگوں کو علم ہوا کہ یہ العربی کا کشف تھا۔

العربیؒ کی مسعود دبّاغؒ سے محبّت

العربی میرے والد سے اُلفت سے پیش آتے رہے اور عجیب وغریب کھانے لاتے، یہاں تک کہ مَیں نے والدہ سے سُنا فرماتی تھیں ماموں صاحب کی وفات کے بعد ہم نے طنجیہ ہی نہیں کھایا (ایک قسم کا حلوہ ہے) ماموں صاحب روزانہ اُس کو ہمارے لیے تیار کرواتے، اپنی مسجد میں عشاء کی جماعت کرا چکنے کے بعد آتے اور دستک دیتے۔ ہم نکلتے طنجیہ دیتے۔ مرتے دم تک ان کا یہی معمول رہا۔

عبدالعزیز دبّاغؒ کی ولایت کی پیشین گوئی

ماموں صاحب فرمایا کرتے: تمہارے ایک لڑکا ہوگا جس کا نام عبدالعزیز ہوگا۔ ولایت میں بڑی شان والا ہوگا دبّاغ کہتے ہیں کہ میں نے والدہ کو کہتے سنا کہ ان کے ماموں العربی الفشتالیؒ نے انہیں بتایا کہ انہوں نے خواب میں نبی صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کو دیکھا کہ مجھ سے فرمارہے ہیں۔ تمہاری بھانجی کے ہاں ایک ولی کبیر پیدا ہوگا۔ مَیں نے عرض کیا یا رسول اللہ اس کا باپ کون ہوگا؟ تو حضورؐ نے فرمایا: مسعود دبّاغؒ۔ یہی وجہ تھی کہ عربی فشتالیؒ نے میرے والد مسعود کا رشتہ کے لیے انتخاب کیا۔

العربیؒ کی وفات ۱۰۹۰ھ

العربی کی تمنا تھی کہ عبدالعزیز کی ولادت اُن کی زندگی میں ہو۔ لیکن ۱۰۹۰ھ میں وبا آئی، اس میں وہ انتقال کر گئے۔ جب وفات کا وقت قریب آیا تو میرے والد مسعود کو بلا بھیجا۔ پوچھا، تمہاری بیوی کہاں ہے؟ اسے بھی بلا بھیجو۔ جب دونوں آئے تو العربی نے کہا، یہ اللہ کی امانت تمہیں دیتا ہوں جب عبدالعزیز پیدا ہو تو یہ امانت اسے دیدینا، امانت میں ململ کا ایک ٹکڑا اور سیاہ رنگ کا بچوں کا جوتا تھا۔

[1] سوتیلی بہن

عبدالعزیزؒ کی ولادت

اس زمانے میں یہی کچھ پہنا جاتا تھا۔ چنانچہ میری والدہ نے امانت لے لی اور اسے بڑی حفاظت سے رکھا، لیکن اس حمل سے ایک بیٹی پیدا ہوئی، پھر کچھ عرصہ بعد دوسرے حمل سے میں پیدا ہوا۔ جب میں بڑا ہوا اور رمضان کے روزے رکھے تو والدہ کو اللہ تعالیٰ نے امانت یاد دلا دی۔ وہ امانت لے آئیں اور فرمایا: بیٹا العربی الفشتالیؒ نے یہ امانت تمہیں دینے کی وصیت کی تھی، عبدالعزیز کہتے ہیں کہ میں نے امانت لے لی۔ شاشیہ سر پر رکھ لی، جوتا پاؤں میں پہن لیا اس سے مجھے بہت سخت گرمی محسوس ہوئی یہاں تک کہ میری آنکھوں میں آنسو آ گئے، جو کچھ العربیؒ نے میرے متعلق کہا تھا میں نے سمجھ لیا اور ان کا اشارہ معلوم کر لیا۔ وَالْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ یہ ۱۱۰۹ھ کی بات ہے۔

الفشتالیؒ کا مرتبہ

احمد بن مبارک کہتا ہے کہ میں نے عبدالعزیزؒ کی زبانی العربی الفشتالیؒ کے متعلق سنا تھا میں نے ان کا زمانہ نہیں پایا کیونکہ میں تو اس وقت ابھی تقریباً چھ ماہ کا بچہ تھا، لیکن میں نے لوگوں سے اُن کی تعریف ہی سُنی ہے۔ لوگ کہتے ہیں کہ وہ صاحب ورع صاحب زہد اور قائم اللیل تھے۔ میں نے ثقہ لوگوں سے سنا کہ احمد بن عبداللہ جو ایک ولیِ کبیر اور مشہور عارف ہوئے ہیں اور اَلْمُنْتَخِبَۃُ کے مصنف ہیں، وہ فشتالی کی بہت تعریف کیا کرتے کہ وہ اکابر اولیاء میں سے تھے۔ مجھے خود احمد بن عبداللہؒ کی ایمانداری کا علم ہے لوگوں کا ان کی ولایت، کشف اور نورِ بصیرت پر اتفاق ہے۔

میں نے عبدالقادر احماموش سے سنا اور وہ شہر صفر کے رہنے والے تھے اور احمد بن عبداللہؒ کے مریدوں میں سے تھے کہ العربی الفشتالیؒ اکابر اولیاء میں سے تھے اور اگر ان کی وفات نہ ہو چکی ہوتی تو میں ان کے حالات قطعاً تمہیں نہ بتاتا۔ وہ کہتے ہیں کہ میں العربیؒ کے شاگردوں میں سے تھا۔ مجھے خود احمد بن عبداللہؒ کی ایمانداری کا علم ہے لوگوں کا ان کی ولایت، کشف اور نورِ بصیرت پر اتفاق ہے۔

فشتالیؒ کے کشف کی ایک اور مثال

احمد بن عبداللہ کہتے ہیں کہ میں سالِس میں تھا کہ العربی نے مجھے کہا، ایک بڑا حادثہ پیش آ گیا ہے میں نے عرض کیا: وہ کیا ہے، فرمایا: محمد بن ناصر رحمۃ اللہ ابھی فوت ہوئے ہیں۔ میں نے عرض کی، آپ کو کیسے معلوم ہوا؟ فرمایا: اس کی وفات میں تو کوئی شک نہیں ہے۔ مجھے تعجب ہوا، پھر فرمایا: یہ شخص جو سامنے سے آ رہا ہے اسے دیکھو۔ وہ محمد بن ناصرؒ کی وفات کی خبر لا رہا ہے اور وہ شخص بہت

دور دھندلا سا خیال دکھائی دے رہا تھا۔ پھر ہم اُس شخص کی طرف چلتے گئے یہاں تک کہ ہم اسے آملے۔ ہم نے پوچھا کیا خبر ہے؟ اس نے کہا محمدؒ بن ناصرؒ فوت ہو گئے ہیں۔

کشف کی تیسری مثال

احمد بن عبداللہؒ فرماتے ہیں ایک دن میں قرد بین میں تھا کہ العربیؒ سے ملاقات ہوئی۔ میرا شادی کرنے کا کوئی ارادہ نہ تھا۔ مجھے دیکھکر فرمایا۔ "وہ عورت بڑی مبارک ہے"! میں نے عرض کیا کونسی عورت؟ فرمایا: جس سے تمہاری شادی ہو گی"۔ میں نے عرض کیا "میرا تو ارادہ نہیں ہے"۔ فرمایا "تیری اس سے شادی ہو گی"۔ ابھی ایک ہفتہ ہی گذرا تھا کہ میرے دل میں شادی کی خواہش پیدا ہوئی، چنانچہ میں نے شادی کر لی۔

(احمد بن المبارک راوی کتاب کہتا ہے) اسی قسم کی ایک حکایت میں نے احمد بن عبداللہؒ سے سنی، لیکن اس میں انہوں نے خبر دہندہ (یعنی فشتالیؒ) کا نام نہیں دیا۔

احمد بن عبداللہ کہتے ہیں العربی الفشتالیؒ کے ساتھ اولیاء کے بارے میں گفتگو ہو رہی تھی، میں نے کئی ایک کا ذکر کیا۔ فرمایا، میں تم سے اکابر کے متعلق بات کر رہا ہوں، میں تو یہاں سے بازغہ تک (جو فاس سے ایک مرحلہ پر واقع ہے) کے تقریباً ۴۰۰ چھوٹے اولیاء کو جانتا ہوں۔

فشتالی کا اپنے احوال کو چھپانا

احمد بن عبداللہؒ کہتے ہیں کہ الفشتالیؒ اپنے حالات کو چھپا کر رکھتے تھے۔ ایک روز اپنے چند شاگردوں سے کہنے لگے کیا تم سمجھتے ہو کہ کشف بھی کوئی چیز ہے؟ یہ تو محض چالاکی اور سرعتِ فہم ہے اگر تمہیں شک ہو تو میری طرف دیکھو۔ تم مجھے اور میرے تمام حالات جانتے ہو۔ تمہیں معلوم ہے کہ میں تو کوئی ولی نہیں ہوں۔ سب نے کہا جی ہاں، ہمیں خوب معلوم ہے کہ آپ ولی نہیں ہیں، اس کے بعد آپ نے ایک طالبعلم کی طرف توجہ فرمائی اور کہا "کیا فلاں وقت تمہارا فلاں کام کرنے کا ارادہ نہیں ہے؟ طالب علم نے عرض کیا ہاں۔ فشتالیؒ نے فرمایا: یہی تو ہے جو میں نے بتایا کہ کشف محض چالاکی ہے سب کو یقین آگیا کہ ہاں ٹھیک ہے اور پھر فشتالیؒ ان سے غافل ہو گئے۔

عمر بن الفارضؒ کے ایک شعر کا الفشتالیؒ پر اثر

احمد بن عبداللہ کہتے ہیں کہ ایک دن قرد بین کی مسجد میں گیا، وہاں العربی الفشتالیؒ بھی تھے۔ ان کا رنگ بدلا ہوا اور زرد ہو رہا تھا کہا "اس وقت میں تم سے یا کسی اور سے کوئی بات نہیں کر سکتا"۔ میں نے عرض کیا آخر کیا سبب ہے؟ فرمایا: میں نے عمر بن الفارضؒ[۱] کے تائیہ قصیدہ کا شعر پڑھا ہے۔

---

[۱] عمر بن الفارض: ابو حفص عمر بن علی المعروف بابن الفارض۔ قاہرہ میں ۵۷۶ھ / ۱۱۸۱ء میں ان کی پیدائش ہوئی۔

(بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر)

فَلَوْ خَطَرَتْ لِیْ سِوَاکَ اِرَادَۃٌ عَلٰی خَاطِرِیْ سَھْوًا قَضَیْتُ بِرِدَّتِیْ

ترجمہ: "(اے خدا) اگر تیرے سوا کسی اور کا خیال بھول کر بھی میرے دل پر گزرے تو
مَیں اپنے مُرتد ہونے کا حکم لگا دوں۔"

دیکھا تو میرے دل میں کسی اور کا خیال آیا ہوا تھا، لہٰذا میں نے اپنے آپ کو مُرتد سمجھ لیا۔ اَب مَیں
گیا گذرا ہو گیا۔ یہ کہتے ہی ان کا رنگ اُڑ گیا۔ مَیں نے کہا یہ تو غلبہ حال تھا جو ابن فارض پر طاری ہوا اور
پھر جاتا رہا۔ بس اتنا کہنا تھا کہ فشتالیؒ کو سکون ہو گیا اور فرمایا: اللہ تمہیں جزائے خیر دے تمہارے
ان لفظوں سے میرا غم دور ہو گیا۔

اخفائے حال کی ایک اور شہادت

مولانا العربیؒ القادری صوفیاء کے طریقہ پر چلتے تھے اور اولیاء اللہ کے کچھ انوار ان پر ظاہر بھی ہوتے تھے
ان کی العربی الفشتالیؒ سے جان پہچان تھی۔ وہ انھیں ولی نہ سمجھتے بلکہ صرف عالم سمجھتے تھے۔ جب العربی
الفشتالیؒ کی قادری سے ملاقات ہوتی تو بہت خوش ہوتے اور ان کی بڑی آؤ بھگت کرتے۔ ایک
دن فشتالی احمد بن عبداللہؒ کے پاس بیٹھے علوم عالیہ اور معرفت کی باتیں کر رہے تھے کہ القادری
آ گئے۔ محمد دریج النطاونی کو کہنے لگے کیا فشتالیؒ احمد بن عبداللہؒ سے اس سے پہلے بھی اس طرح
کی معرفت کی باتیں کیا کہتے ہیں یا صرف آج ہی ایسی باتیں کر رہے ہیں؟ محمد دُریج نے جواب دیا:
وہ تو ہمیشہ ایسی باتیں کرتے ہیں۔ سید عبدالقادر مشد کہتے ہیں اس دن القادری کو الفشتالیؒ کی
ولایت کا علم ہوا۔ جب فشتالیؒ کو علم ہوا کہ القادری کو اس کا پتہ چل گیا ہے تو اس دن سے جب انہیں
دیکھتے، چھپ جاتے اور پہلی سی خوشی اور آؤ بھگت کرنا سب چھوڑ دیا، کیونکہ وہ تو اپنے آپ کو
چھپانا چاہتے تھے۔

کشف کی ایک اور مثال

احمد بن عبداللہ کہتے ہیں کہ جب زیدان نے فاس کا محاصرہ کیا تو مَیں وہیں تھا۔ محاصرہ نے طول پکڑا اور فاس والوں کو بہت
تکلیف کا سامنا ہوا۔ احمد بن عبداللہؒ کہتے ہیں کہ فشتالیؒ یہی کہتے رہے اُویر ہو یا سویر سلطان اسمٰعیل
کے بغیر چارہ نہیں۔ باغیوں کو اس کا پتہ چلا تو کہنے لگے کہ فشتالیؒ اپنے آپ کو اسمٰعیل سمجھتا ہے ابھی
چند دن ہی گذرے تھے کہ العربیؒ کی سچائی ظاہر ہو گئی۔ باغیوں نے ہتھیار ڈال دیئے اور امان کی

(بقیہ حاشیہ صفحہ سابقہ) فقہ، لغت اور ادب میں مہارت حاصل کی۔ پھر طریقت کی راہ پر چلے اور مقاماتِ مقدسہ کی زیارت کی
۶۳۲ھ بمطابق ۱۲۳۴ء میں وفات پائی۔ یہ عربی زبان کے واحد صوفی شاعر ہیں۔

درخواست کی اور صلح ہوگئی۔ وَالحمدُ لِلّٰہِ رَبِّ العٰلمین۔

قیام اللیل میں فشتالیؒ کی حالت

فشتالیؒ کے پڑوسی بیان کرتے ہیں کہ فشتالی رات کا اکثر حصّہ نماز اور تلاوت میں گذارتے رات کے پہلے حصّے میں تو ان کی قرارت کی آواز سنائی دیتی لیکن جب ان پر حالت اور واردات الٰہیہ کا نزول ہوتا تو سوائے حرکت، اضطراب اور زمین پر رینگنے کے کچھ سنائی نہ دیتا۔

کشف کی مثال

احمد بن عبداللہ کہتے ہیں کہ میں فشتالیؒ کے ساتھ سُوق الخمیس میں تھا اور یہ سلطان رشید کے عہد کی بات ہے۔ سطان رشید کے عروج کا زمانہ تھا، بڑے آرام کی زندگی گزرتی، نہ کہیں فتنہ تھا اور نہ فساد۔ فشتالیؒ کے ساتھ سُوق الخمیس میں جارہا تھا کہ یکایک کہنے لگے "مجھے تو رشید کے ماتم کی آواز آرہی ہے، حالانکہ رشید کی موت مراکش میں واقع ہوئی تھی میں نے کہا یہ کیسے ہوسکتا ہے؛ لیکن ابھی یہ بات کر ہی رہے تھے کہ رشید کی وفات کی خبر آ پہنچی۔

آداب شرع کا پاس

احمد بن عبداللہ کہتے ہیں کہ فشتالیؒ ظاہر شریعت کا پورا پورا خیال رکھتے تھے۔ ایک دن اُن کے ساتھ قروین کی مسجد میں بیٹھا باتیں کررہا تھا کہ مؤذن نے اذان دی۔ العربی مسجد سے نکل کر تھوڑی دیر غائب رہے اور پھر واپس آگئے، میں نے کہا کیا بات تھی؛ نہ تو آپ کسی کام کے لیے گئے کہ کہہ سکیں کام تھا اور نہ ہی جماعت کا وقت ہے لہٰذا آپ کیوں باہر تشریف لے گئے تھے، لیکن آپ خاموش رہے میں نے اصرار کیا۔ کہنے لگے تو بہت کُرید کُرید کر باتیں پوچھتا ہے۔ میں اس لیے نکلا تھا تاکہ خانۂ خدا کی طرف میرا چلنا نماز کے لیے ہو جائے۔ کیونکہ پہلے میں نے جو قدم اُٹھائے تھے وہ تمہارے پاس بیٹھنے کے لیے اٹھائے تھے۔

فشتالیؒ کا صبر و تحمل

احمد بن عبداللہ کہتے ہیں کہ فشتالیؒ بڑے اچھے اخلاق والے اور صبر و تحمل والے تھے اور عُدولؒ[1] لوگوں میں سے تھے۔ ایک دن انہوں نے ایک شخص کے خلاف سچّی گواہی دی تھی۔ اس شخص نے ناراض ہو کر فشتالی کو بہت سی گالیاں دیں جب وہ گالیاں دے چکا تو صرف اتنا کہا: میری شہادت کی شرعی وجہ یوں ہے۔ گالی دینے والا اُن کے حسنِ خلق کو دیکھکر بہت نادم ہوا اور توبہ کی۔

ہمسایوں سے برتاؤ

ممدوح کے پڑوسیوں کا بیان ہے کہ حضرت فشتالیؒ جب اپنے گھر کے لیے گوشت خریدا کرتے تو ہمسایوں کے لیے بھی ضرور خریدتے فرماتے یہ کیسے

---

[1] عادل

ہو سکتا ہے کہ میں تو گوشت کھاؤں اور میرے پڑوسی بغیر گوشت کے رہیں۔

کشف و کرامت کی ایک اور مثال

بہت سے ثقہ لوگوں کا بیان ہے کہ مسجد کا بڑا دروازہ کھلنے سے پہلے فشتالی المخفیہ کے زاویہ (خانقاہ) میں آتے تو جہاں اب مسجد کا بڑا دروازہ ہے، اس کی طرف نظر اٹھا کر فرمانے لگے: یہاں سے ایک دروازہ کھلے گا جس سے لوگ مسجد میں جایا کریں گے۔ یہ الفاظ بہت سے لوگوں نے سنے جن میں المہدی الفاسیؒ، شارح دلائل الخیرات بھی تھے۔ تھوڑے عرصہ کے بعد اسی جگہ پر دروازہ کھولا گیا یہیں سے لوگ وضو کے محل کو جاتے ہیں۔

ایک واقعہ

محمد بن سودہ کہتے ہیں کہ ایک شخص فشتالیؒ کے گھر گیا۔ وہ اس وقت اپنے آپ کو پنکھا کر رہے تھے اور بے تکی باتیں کر رہے تھے۔ پوچھا کیا بات ہے؟ فرمایا فَضْلُ اللّٰهِ يُؤْتِيهِ مَنْ يَشَآءُ (اللہ کی دین ہے، جسے چاہے دے)

کشف کی مثال

شامی کا بیان ہے کہ وہ فشتالی سے باتیں کر رہے تھے اور گذشتہ حکام مثلاً ابن صالح وغیرہ کی مذمت کرتے اور موجودہ حاکموں کی تعریف کر رہے تھے۔ اس پر فشتالیؒ نے آئندہ آنے والے حاکموں کے احوال بیان کرنے شروع کر دیے۔

فشتالی کا شاہد عادل ہونا

متعدد لوگوں کا بیان ہے کہ فشتالیؒ شاہدِ عادل تھے لیکن شہادت دینے سے اکثر پرہیز کرتے۔ صرف انہیں امور میں شہادت دیتے جو روزِ روشن کی طرح ہوں، کوئی زیادہ اُجرت دیتا تو رد کر دیتے۔ ایک شخص سے گواہی کا وعدہ کر لیتے تو دوسرے کو انکار کر دیتے۔

الغرض یہ کہ ممدوح کے کشف و کرامات بہت زیادہ ہیں اور لوگوں میں مشہور ہیں، آپ کی جلالتِ شان اور فخر و مباہات کے لیے تو صرف یہی رابطہ کافی ہے جو آپ کے اور غوث الزمان حضرت عبدالعزیز قدس سرہٗ کے درمیان قائم ہوا۔

فصلِ ثانی

حضرت عبدالعزیز دباغ کا مدارجِ سلوک طے کرنا یہاں تک کہ آپ پر اسرار کا انکشاف ہو گیا اور ان عارفین کا بیان جن سے آپ کو ظاہری اور باطنی وراثت ملی۔

عبدالعزیز دبّاغ کی خضر سے ملاقات

حضرت دباغ فرماتے تھے، جب سے مَیں نے العربی الفشتالیؒ کی امانت کو پہنا اور جو کچھ اس میں مجھے کہا گیا تھا میں سمجھ گیا تو اللہ نے میرے دل میں خالص عبودیت کا شوق ڈال دیا۔ لہٰذا میں لوگوں سے اس کے متعلق دریافت کرتا رہتا۔ جس بزرگ کا ذکر سُنتا اس کے پاس جا کر اسے اپنا پیر بنا لیتا۔ ان کے فرمانے کے مطابق اَوراد پڑھتا، لیکن کچھ مدت گذرنے کے بعد جب ان کے پاس مزید ترقی نہ پاتا تو انہیں چھوڑ کر کسی اور کے پاس چلا جاتا۔ اسی طرح جب اُس کے پاس بھی مزید معرفت نہ پاتا تو اسے بھی چھوڑ دیتا۔ اسی طرح میں ۱۱۰۹ھ سے لیکر ۱۱۲۱ھ تک حیران و پریشان پھرتا رہا۔ ہر جمعہ کی رات علی بن حرزہمؒ کے مزار پر لوگوں کے ساتھ مل کر قصیدہ بُردہ[1] ختم کیا کرتا۔ ایک جمعہ کی رات حسبِ دستور بُردہ ختم کر کے روضہ سے باہر نکل ہی رہا تھا کہ ایک شخص کو اُس بیری کے درخت کے نیچے جو روضہ کے دروازے کے پاس تھی، بیٹھا ہوا دیکھا۔ اُس نے مجھ سے میرے ہی دل کی بتانی شروع کر دیں جس سے میں سمجھ گیا کہ یہ شخص اولیاء عارفین میں سے ہے۔ مَیں نے عرض کیا مجھے کوئی وِرد عطا کریں اور ذکر کی تلقین کریں۔ اس نے بات ٹالنی چاہی اور اِدھر اُدھر کی باتیں شروع کر دیں۔ میں اصرار کرتا جاتا اور آپ ٹالتے جاتے ان کا مقصد میرے صحیح عزم کو معلوم کرنا تھا تاکہ میں ان سے جو بات سنوں اُسے پھر ترک نہ کر دوں۔ مَیں اسی طرح چمٹا رہا، یہاں تک کہ صبح ہو گئی اور خانقاہ میں گردسی دکھائی دی تو کہنے لگا جب تک تو اللہ کا عہد نہیں دے گا کہ وِرد نہ چھوڑونگا اور میرا خیال تھا کہ وہ مجھے ان بزرگوں کی طرح کا کوئی وِرد بتائیں گے جن کی پہلے بیعت کر چکا ہوں، لیکن انہوں

---

[1] آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی مدح میں علامہ بوصیریؒ نے عربی میں ایک قصیدہ کہا ہے جسے قصیدہ بردہ کہا جاتا ہے۔ صوفیاء کے ہاں خاص طریقہ پر اس کا ورد کیا جاتا ہے اور اس کے ورد کرنے میں بہت سے فوائد مضمر ہیں ناظم قصیدہ علامہ بوصیریؒ کو اس قصیدہ کی بدولت فالج سے شفا ملی تھی، علامہ بوصیریؒ ۶۰۹ھ ۱۲۱۲ء میں مصر میں پیدا ہوئے اور ۶۹۶ھ ۱۲۹۶ء میں وفات پائی۔

نے فرمایا: ہر روز سات ہزار بار یہ ذکر کیا کرو۔ اَللّٰھُمَّ یَارَبِّ بِجَاہِ سَیِّدِنَا مُحَمَّدِ بْنِ عَبْدِ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَاٰلِہٖ وَسَلَّمَ اِجْمَعْ بَیْنِیْ وَبَیْنَ سَیِّدِنَا مُحَمَّدِ بْنِ عَبْدِ اللّٰہِ فِی الدُّنْیَا قَبْلَ الْاٰخِرَۃِ (یا اللہ سیدنا محمد بن عبداللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی طفیل مجھے دنیا میں انہیں ملادے) پھر ہم اُٹھے اور عمر بن محمد الہواریؒ کے روضہ کے متولی آ گئے اس شخص نے انہیں کہا: تمہیں اس سے نیک بڑا ذکر کی نصیحت کرتا ہوں۔ عمر بن محمد کہنے لگے یہ تو ہمارا سردار ہے۔ عمر بن محمد نے مرتے وقت مجھ سے پوچھا: تمہیں معلوم ہے کہ بیری کے درخت کے نیچے کس نے تمہیں ذکر کی تلقین کی تھی۔ مَیں نے کہا نہیں۔ فرمایا وہ خضر علیہ السلام تھے۔

عمر بن محمد ہواریؒ کی وفات ۱۱۲۵ھ

دباغ فرماتے ہیں کہ جب اللہ نے میرا سینہ کھول دیا تو جو کچھ عمرؒ نے فرمایا تھا مجھے سمجھ میں آ گیا۔ اب میں نے یہ ذکر شروع کر دیا، لیکن پہلے اس قدر بوجھل معلوم ہوا کہ رات ہونے تک بھی مکمل نہ ہوا۔ پھر کچھ کچھ ہلکا معلوم ہونے لگا اور مجھے اس سے اُنس ہونے لگا تو زوال تک مکمل کر لیتا۔ پھر ہلکے ہونے میں ترقی ہوئی حتیٰ کہ اشراق کے وقت پورا ہونے لگا۔ پھر ثقل میں اور کمی ہوئی حتیٰ کہ طلوعِ آفتاب تک پورا پڑھ لیا کرتا تھا۔ اُس زمانے میں حضرت عمر بن محمد ہواریؒ کے پاس بیٹھتا اٹھتا رہا اور وہ بھی میرے ساتھ خاص محبت فرماتے رہے۔ حتیٰ کہ ۱۱۲۵ھ میں اُن کی وفات ہو گئی۔ بوقتِ وفات میں ان کے پاس بیٹھا ہوا تھا کہ فرمانے لگے، جانتے بھی ہو میرے پیر کون تھے؟ مَیں نے کہا مجھے تو معلوم نہیں۔ فرمایا: سید فشتالی قدس سرہٗ اور یہ بات دنیا سے رخصت ہونے وقت ہی بتائی۔ الحمد للہ کہ حضرت فشتالیؒ کے تمام اسرار وکیفیات بواسطۂ سید عمرؒ مجھے حاصل ہوئے اور اس کا مشاہدہ مجھے شرح صدر کے بعد ہوا۔ حالانکہ سید عمرؒ بھی حضرت فشتالیؒ کے تمامی اسرار کے حامل نہ تھے، بلکہ چند ہی کے حامل تھے مگر مجھے حق تعالیٰ نے اپنے فضل وکرم سے ان کے تمامی اسرار عطا فرمائے بلکہ اُن سے بھی زیادہ اور اتنے زیادہ کہ میں اپنے مولیٰ کریم کا شکر ادا نہیں کر سکتا۔

ایک دن فرمایا کہ حضرت فشتالیؒ عارف باللہ اور اپنی زندگی میں دیوانؔ الصالحین کے حاضر ہونے والوں میں سے تھے۔ میں نے عرض کیا اور بعد وفات؟ فرمایا نہیں اور ایسا ہی سیدنا منصورؒ کی بابت فرمایا کہ وہ اقطاب میں سے تھے اور صرف بحالتِ حیات اہل دیوان میں سے تھے۔ انتقال کے بعد اس مجلس میں حاضر نہیں ہوتے اور اس کا ایک خاص سبب بیان فرمایا جس کا ذکر انشاء اللہ کتاب میں آئے گا۔

لہ وہ مجلس جس میں اقطاب عالم واغواث کا اجتماع ہوا کرتا ہے۔ کتاب کے آخر میں اسکا تفصیلی بیان آئے گا۔

حضرت عبدالعزیز دباغؒ کا شرح صدر
جمعرات ۸ رجب ۱۱۲۵ھ

حضرتؒ نے فرمایا کہ سیّد عمرؒ کی وفات کے تین دن بعد مجھے شرح صدر ہوا اور ہم نے حقیقتِ نفس سے اللہ کو پہچانا۔ فَلَہُ الْحَمْدُ وَلَہُ الشُّکْرُ بروز پنج شنبہ ۸ رجب ۱۱۲۵ھ کا واقعہ ہے کہ مَیں گھر سے نکلا تو حق تعالیٰ نے ایک صاحبِ خیر کے ہاتھ سے مجھے چار مُوزونے دلائے۔ چنانچہ مَیں نے مچھلی خریدی اور اس کو لے کر گھر آیا۔ میری بیوی نے کہا۔ علی بن حرزہمؒ کے پاس جاؤ اور مچھلی تلنے کے لیے تیل لے آؤ۔ چنانچہ میں گیا اور ابھی باب الفتوح تک ہی پہنچا تھا کہ بدن میں رعشہ سا پیدا ہوا۔ پھر زور کی کپکپی طاری ہوئی۔ اس کے بعد گوشت میں بکثرت چیونٹیاں سی چلتی ہوئی محسوس ہوتیں، مگر میں چلتا گیا، مگر حالت اور خراب ہوتی گئی حتیٰ کہ سیّد یحییٰ بن علال کے مزار تک پہنچا اور یہ علی بن حرزہمؒ کے راستہ ہی میں آتا ہے۔ حالت نے اور شدت پکڑی اور میرا سینہ سخت مضطرب ہونے لگا یہاں تک کہ داڑھی چنبر گردن سے ٹکراتی تھی، مَیں نے سمجھا کہ یقیناً موت کا وقت آگیا ہے پھر میرے جسم سے دھوئیں کی طرح کی ایک چیز نکلی۔ پھر میرا جسم ہوتا ہوتا بہت ہی لمبا ہوگیا اور دنیا کی چیزیں منکشف ہو کر میری نظروں کے سامنے آنے لگیں۔ تمام شہر، قصبے اور دیہات جو کچھ بھی زمین پر ہے۔ مَیں نے سب کو دیکھا۔ مَیں نے دیکھا کہ عیسائیت[1] اپنے بچے کو گود میں لیے دودھ پلا رہی ہے۔ مَیں نے تمام سمندر دیکھے جو کچھ بھی سات زمینوں میں جانور اور مخلوقات ہے سب دیکھی۔ میں نے دیکھا کہ گویا آسمان کے اوپر بیٹھا ہوں اور اس کے اندر کی تمام اشیاء کو دیکھ رہا ہوں۔ اچانک ہر طرف سے کوندنے والی بجلی کی طرح نورِ عظیم آتا ہوا دکھائی دیا۔ یہ نور میرے اوپر سے بھی، نیچے سے بھی، داہنے سے بھی، بائیں جانب سے بھی اور آگے بھی، پیچھے سے بھی، سب طرف سے آیا اور اُس سے مجھے سخت سردی لگی، یہاں تک کہ میں نے سمجھا کہ مرنے لگا ہوں۔ میں جلدی سے منہ کے بل لیٹ گیا تاکہ اُس نور کو نہ دیکھ سکوں، لیکن پھر بھی یوں معلوم ہو رہا تھا کہ میرا تمام وجود آنکھیں بن گیا ہے۔ آنکھ دیکھتی ہے، سر دیکھ رہا ہے، پاؤں دیکھ رہے ہیں اور تمام اعضاء دیکھ رہے ہیں۔ مَیں نے اپنے پہنے ہوئے کپڑوں پر نظر ڈالی تو دیکھا کہ وہ اس نظر کو نہیں روک سکتے جو میری ذات میں سرایت کر چکی ہے۔ مجھے یقین ہوگیا کہ اوندھا لیٹنا اور کھڑا رہنا دونوں برابر ہیں۔ کچھ دیر تک یہی حالت رہی مگر پھر جاتی رہی اور میں اپنی پہلی حالت پر آگیا۔ اُس وقت میں گھر واپس آیا اور علی بن حرزہمؒ کے پاس نہ پہنچ سکا۔ مجھے اپنی جان کا خطرہ ہوا اور میں رونے لگا۔ اس کے بعد تھوڑی دیر کے لیے پھر وہی حالت طاری ہوئی اور پھر جاتی

---

[1] نصرانیت کے غلبہ کی طرف اشارہ ہے۔

رہی - اسی طرح کبھی یہ حالت ہو جاتی اور کبھی ہٹ جاتی - اس کے بعد دائمی ہوگئی ، اللہ نے مجھ پر رحم فرمایا کہ اپنے اولیاء میں سے ایک عارف سے مجھے ملا دیا جس کی صورت یوں ہوئی کہ فتح کے اگلے روز میں مولائی ادریسؒ کی زیارت کے لیے چلا - ابھی سماطِ عُدول کے محلہ تک پہنچا تھا کہ فقیہ الحاج احمد جرندیؒ سے ملاقات ہوئی - احمد جرندیؒ مولائی ادریسؒ کے امام تھے - مَیں نے جو کچھ دیکھا تھا اُس کا اُن سے ذکر کیا - فرمایا - میرے ساتھ میرے گھر چلو - مَیں اُن کے ساتھ اُن کے گھر گیا جو اس سقایہ[1] کے قریب تھا جو اُن غسّالین[2] کے پاس ہے جو صفارین[3] میں رہتے ہیں ، میں اُن کے ساتھ مکان میں داخل ہوا اور وہ اندر ایک چبوترے پر بیٹھ گئے اور مَیں بھی اُن کے ساتھ بیٹھ گیا - پھر فرمانے لگے جو کچھ تم نے دیکھا ہے پھر سے بیان کرو - مَیں نے سارا واقعہ دہرایا ، مگر ان پر جو میری نظر پڑی تو دیکھا کہ وہ رو رہے ہیں واقعہ سن کر فرمایا لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ چار سو سال گذر چکے ہیں کہ ایسا واقعہ بیان کرنے والا ہم نے کوئی نہیں سنا - اس کے بعد مجھے بہت سارا روپیہ دیا ایک بار فرمایا کہ مجھے پانچ مثقال[4] دیے اور کہا کہ ان کو اپنی ضروریات میں خرچ کرو اور جب ختم ہو جائیں تو کسی اور کے پاس نہ جانا - میرے ہی پاس آنا کہ جو ضرورت ہوگی میں تم کو دوں گا اور میں تمہیں سید عبداللہ التاودیؒ کے پاس جانے کی تاکید کرتا ہوں - انشاء اللہ خیر نصیب ہوگی - غرض میں اُن سے رُخصت ہوا اور اس دن کے بعد پھر مجھے سید احمد جراوندیؒ کی ملاقات نصیب نہ ہوئی کیونکہ اُن کو دفعتہً مرض الموت لاحق ہوا اور وہ انتقال کر گئے -

عبداللہ تاودیؒ سے ملاقات

مگر میں نے اُن کی وصیت پر عمل کیا اور سیّد عبداللہ تاودیؒ کی جانب چل پڑا - جب باب الجلیسہ پر پہنچا تو کیا دیکھتا ہوں کہ دروازے سے باہر ایک سیاہ فام شخص اس بڑے پتھر کے پاس کھڑا ہے جس کے قریب مجدیؒ بیٹھا کرتے تھے - اس نے مجھے غور سے دیکھنا شروع کیا - مَیں نے دل میں کہا آخر اس کا کیا ارادہ ہے ؟ جب قریب پہنچا تو میرا ہاتھ پکڑ لیا اور سلام کیا - جس کا میں نے جواب دیا - پھر کہنے لگے ، میں چاہتا ہوں کہ جامع مسجد تک میرے ساتھ چلو ، وہاں بیٹھ کر کچھ دیر باتیں کریں - میں نے کہا بڑی خوشی سے - چنانچہ ہم مسجد میں پہنچ کر بیٹھ گئے - مجھ سے فرمانے لگے مجھے فلاں فلاں مرض ہے اور میں نے ایسا ایسا واقعہ دیکھا ہے اور مجھے یہ یہ پیش آیا ہے - الغرض تمام وہ باتیں جو مجھے پیش آتی تھیں از خود ذکر کر دیں -

---

[1] حوض [2] غسل دینے والوں [3] محلہ کا نام

[4] آج کل کے حساب سے ایک مثقال تقریباً ۴½ ماشہ کا ہوتا ہے پانچ مثقال تقریباً ۲ تولے بنے یعنی اس قدر سونا دیا -

ان کی اس گفتگو سے میرا بوجھ اُتر گیا اور میں سمجھ گیا کہ یہ شخص اولیاء عارفین میں سے ہے خود ہی بتایا کہ میرا نام عبداللہ برناوی اور میں برنو کا باشندہ ہوں اور یہاں شہر فاس میں صرف تمہارے لیے آیا ہوں۔ مجھے بڑی خوشی ہوئی اور اس وقت میں نے سید احمد جرندیؒ کے کلام کی برکت کو سمجھا کہ مرحوم اہل خیر و صلاح میں سے تھے۔ غرض سید عبداللہ برناویؒ میرے ساتھ رہے، میری رہبری فرماتے، مجھے کجی و بدراہی سے بچاتے۔ قلب کو قوت پہنچاتے اور میرے دل سے وہ خوف مٹاتے رہتے تھے جو بقیہ رجب اور تمام شعبان و رمضان و شوال و ذی قعدہ اور ذی الحجہ کی دسویں تاریخ تک مجھے پیش آتے رہے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت

جب عید الاضحیٰ کا تیسرا دن ہوا تو مجھے سید الوجود حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت نصیب ہوئی۔ اُس وقت عبداللہ برناوی نے فرمایا: اے عبدالعزیز اب تک تو مجھے تمہارے متعلق اندیشہ تھا مگر آج چونکہ اللہ تعالیٰ نے تمہیں اپنی رحمتِ کاملہ یعنی سید الوجود حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے ملا دیا ہے، اس لیے میرا دل مطمئن ہو گیا ہے اب میں تمہیں اللہ کے حوالے کر کے جاتا ہوں۔ چنانچہ مجھے چھوڑ کر وہ اپنے وطن چلے گئے۔ دراصل اُن کا میرے ساتھ رہنے سے یہ مقصد تھا کہ جو مشاہدات مجھے پیش آرہے تھے، اُن میں ظلمت کا دخل ہونے سے مجھے بچائے رکھیں، حتیٰ کہ مشاہدۂ محمدیہ نصیب ہو جائے، کیونکہ صاحبِ فتح پر اس کے بعد کوئی اندیشہ نہیں رہتا جو کچھ اندیشہ و خطرات ہوتے ہیں وہ اُس مشاہدے سے پہلے ہی ہوتے ہیں۔

حضرت عبداللہ برناویؒ کے ساتھ مجھے بہت قصّے پیش آئے۔ جن میں عجیب ترین یہ ہے کہ ایک دن انہوں نے عورت کی صورت میں آکر مجھے بہت کچھ پھسلایا اور اصرار سے اپنی طرف مائل کرنا چاہا۔

عبداللہ برناویؒ کا دباغ کے سامنے عورت کی صورت میں آنا

واقعہ یوں ہوا کہ میں جزائر ابن عامر میں تھا کہ ایک عورت چادر اوڑھے منہ پر نقاب ڈالے خوشبو میں مہکی ہوئی، صاف ستھری، نہایت خوبصورت، میرے پاس آئی اور کہنے لگی: میں تنہائی میں آپ سے بات کرنا چاہتی ہوں۔ میں پورے زور سے اس سے بھاگا حتیٰ کہ میں نے کہا کہ اب تو میں اس سے بھاگ کر لوگوں میں آگیا ہوں، مگر جب رصیف میں پہنچا تو کیا دیکھتا ہوں کہ میرے پاس کھڑی ہے اور مجھے پھسلا رہی ہے میں پھر بھاگا اور شراطین پہنچ کر

دَم لیا اور سمجھا کہ اب اس کی امید منقطع ہو چکی ہے۔ پھر میری چال بھاری ہو گئی اور دیکھا کہ وہ پھر میرے پاس کھڑی ہے اور پھسلا رہی ہے۔ میں پھر بھاگا اور ایک بار پھر شماعین پہنچا مگر دیکھتا کیا ہوں کہ میرے پاس کھڑی ہے۔ میں پھر بھاگا اور مسجد قرو یین کی شرقی جانب پہنچا اور مسجد میں داخل ہو گیا اور سمجھا کہ بس اب نجات مل گئی، مگر دیکھا کہ وہ میرے پاس کھڑی ہے۔ میں پھر بھاگا حتی کہ صفارین تک پہنچا اور سمجھا کہ بس اب بچ گیا، مگر دیکھتا ہوں کہ وہ پاس کھڑی ہے۔ میں پھر بھاگا اور دوبارہ شماعین تک پہنچا اور سمجھا کہ اب چھٹکارا مل گیا مگر دیکھتا ہوں کہ وہ پاس کھڑی ہے۔ میں پھر بھاگ کر مسجد قرو یین میں جا گھسا اور سمجھا کہ اب نجات مل گئی، لیکن جب بڑے شمعدان تک پہنچا تو دیکھا کہ وہ میرے پاس کھڑی ہے۔ اس وقت مجھ پر حال کا غلبہ ہوا اور ابھی چلانے کو ہی تھا تاکہ لوگ جمع ہو جائیں کہ دفعتہً وہ عورت عبداللہ البرناوی بن گئی اور فرمایا یہ کارنامہ تو میرا تھا اور تم کو آزمانے کے لیے کیا تھا کیونکہ مجھے معلوم ہے کہ سادات کا میلانِ طبع عورتوں کی طرف زیادہ ہے۔ سو الحمد للہ تم کو ایسا ہی پایا جیسا میں چاہتا تھا اور بہت خوش ہوئے۔

عبداللہ برناویؒ کی وفات ۱۱۲۶ھ

حضرت برناویؒ کے بعض معارف کے فوائد اثنائے کتاب میں آئیں گے۔ دبّاغ کہتے ہیں کہ ان کی وفات ۱۱۲۶ھ میں ہوئی۔

صالحین خواہ ایکدوسرے سے دُور رہتے ہوں لیکن اُن کے درمیان بُعد نہیں ہوتا

حضرت برناویؒ کے اپنے وطن کو چلے جانے کے بعد میں نے حضرت دباغ کو کہتے ہوئے سنا "آج میں عبداللہ برناویؒ کے ساتھ تھا انہوں نے مجھ سے یہ فرمایا اور میں نے یوں کہا اور ہم نے یہ یہ کام کیا، حالانکہ اس زمانہ میں میں ہر وقت اُن کے ساتھ آتا جاتا۔ چنانچہ ہم شاید ہی کبھی جُدا ہوتے۔ جب اُن سے ایسی بات سنتا تو عرض کرتا گیا عبداللہ اپنے وطن کو نہیں چلے گئے۔ فرمایا صالحین کے وطن خواہ کتنے دور ہی کیوں نہ ہوں ان کے درمیان بُعد نہیں ہوتا۔ چنانچہ مغرب کا اللہ کا بندہ سوڈان یا بصرہ وغیرہ کے دوسرے اللہ کے بندے سے باتیں کر سکتا ہے بعینہٖ اسی طرح جس طرح کہ پاس کے آدمی سے باتیں کی جاتی ہیں اور جب کوئی تیسرا اللہ والا اُن سے باتیں کرنا چاہتا ہے تو وہ بھی کر لیتا ہے اور اسی طرح چوتھا۔ حتیٰ کہ صالحین کی ایک جماعت جو مختلف علاقوں میں بکھرے ہوتے ہیں وہ اس طرح آپس میں باتیں کر لیتے ہیں جیسے کہ ایک جگہ پر جمع ہو جانے والے لوگ کرتے ہیں۔

دباغ نے برناوی سے اسرار ورثہ میں لیے

فرمایا سید عبداللہ برناوی کی وفات پر ان کے تمام اسرار کا میں وارث بنا وَالْحَمْدُ لِلّٰہِ۔

قطب زمان منصور بن احمد سے ملاقات

نیز فرمایا منجملہ ان بزرگوں کے جن کی مجھے ملاقات نصیب ہوئی۔ حضرت منصور احمد ہیں جو قطب وقت تھے اور میرا اُن سے ملنا سورج گرہن سے ایک ماہ قبل ہوا۔

ملنے کی صورت یہ ہوئی کہ حضرت منصور ایک جولاہے کے پاس سُوت بٹنے کا کام کرتے تھے۔ میں اپنے بھائی عُلّال کو لے کر اس غرض سے گیا کہ کوئی اسے بننے کا کام سکھاوے۔ چنانچہ میں ایک طراز[1] (کشیدہ کاری کا کارخانہ) میں ٹھہر گیا۔ خادموں کو آلات کے ساتھ کام کرتے ہوئے دیکھتا رہا۔ ایک شخص کو دیکھا جس سے میری بات ٹھہر گئی۔ جب فارغ ہوا اور باہر آنے لگا تو ایک ناواقف شخص نے مجھے آواز دی اور کہا کہ میں تم سے کچھ باتیں کرنا چاہتا ہوں۔ میں اس کے پاس آیا تو اس نے پوچھا: آپ کون ہیں؟ میں نے کہا: سید ہوں۔ کہا ماشاءاللہ! اچھے پاک اور نیک لوگوں کی اولاد ہو۔ پھر نام پوچھا: میں نے عبدالعزیز بتایا۔ کہا کس قدر پیارا اور بزرگ نام ہے۔ پھر پوچھا کیا آپ کے ماں باپ حیات ہیں؟ میں نے کہا نہیں دونوں کا انتقال ہو چکا ہے۔ کہنے لگے میں معلوم کرنا چاہتا ہوں کہ آپ کے بیوی بچے ہیں؟ میں نے کہا ہاں۔ کہنے لگے کچھ روپیہ پیسہ بھی پاس ہے؟ میں نے کہا نہیں، کہنے لگے یہ مُوزُونے لے لو۔ دیکھا تو تیس ۳۰ مُوزُونے تھے۔ اُن سے جان پہچان اس طرح ہوئی۔ پھر اُن کے ساتھ مجھے عجیب وغریب واقعات پیش آئے جن میں چند کا تذکرہ اس کتاب میں انشاءاللہ آئے گا۔

منصور بن احمد کی وفات ۱۱۲۹ھ

غرض اللہ ورسول کی محبت میں میرا اُن کا ساتھ رہا، حتیٰ کہ ۱۱۲۹ھ میں ان کی وفات ہوگئی، (احمد بن مبارک) کہتے ہیں کہ سورج گرہن ۱۱۱۸ھ کی ابتدا میں ۲۹ محرم کو ہوا۔ لہٰذا تقریباً بارہ سال ان کی صحبت رہی۔

---

[1] کپڑے کے اوپر منقش یا کشیدہ کاری کرنے کو طراز کہتے ہیں اور بنانے والے کو طراز۔ اس زمانے میں الجزائر، مصر وغیرہ میں طراز کے کارخانے پائے جاتے تھے۔ طراز کے معنی طراز کے کارخانہ کے بھی ہیں چنانچہ یہاں یہی مراد ہیں۔ ۱۲

سیّد عبداللہ برناویؒ منصور بن احمدؒ سے بڑے تھے

میں نے حضرت ممدوح سے پوچھا کہ دونوں میں بڑا کون تھا، عبداللہ برناویؒ یا منصور بن احمد؟ فرمایا حضرت عبداللہ برناویؒ بڑے تھے اگرچہ یہ دونوں قطب تھے نیز فرمایا کہ جب حضرت منصورؒ کا انتقال ہوا تو اُن کے اسرار کا بھی میں ہی وارث ہوا۔ والحمد للہ۔

محمد لہواجؒ سے ملاقات

حضرت ممدوح نے فرمایا کہ منجملہ ان مشائخ کے جن کی ملاقات و صحبت مجھے نصیب ہوئی۔ حضرت محمد لہواجؒ ہیں۔ جن کا وطن تطاون کے قریب تھا جیسا کہ جبل حصتب میں شہر فحص حضرت منصور کا وطن تھا۔

اُن سے ملنے کی صورت یہ ہوئی کہ جب میرے والد بزرگوار کا انتقال ہو گیا تو میرے چچا مجھے اور میرے بھائی العربی کو لے کر ایک طراز خانہ میں گئے جہاں ململ پر کام کیا جاتا تھا۔ کارخانے کا ایک کاریگر حضرت محمد لہواجؒ کا رشتہ دار تھا اور حضرت ممدوح جب بھی اس رشتہ دار کو ملنے آتے تو میرے پاس بھی آکر بیٹھ جایا کرتے اور باتیں کرتے رہتے، یہاں تک میرے اور اُن کے درمیان مکمل جان پہچان ہو گئی اور میرے اور اُن کے درمیان عجیب وغریب حکایات وکرامات پیش آئیں، جن میں سے بعض کا ذکر اثنا۔ کتاب میں آئے گا۔

میری ان سے ملاقات حضرت منصورؒ سے پہلے ہوئی تھی کیونکہ اُن سے میری ملاقات ۱۱۱۲ھ میں ہوئی، لیکن ان کی وفات حضرت منصورؒ کی وفات کے چند دن بعد ہوئی، اُن کی وفات پر ان کے اسرار کا وارث بھی میں ہی بنا والحمد للہ۔

یہ وہ لوگ ہیں جن کی صحبت مجھے حاصل ہوئی:۔

۱۔ شیخ الشیوخ سیدنا خضر علیہ السلام۔

۲۔ عمر بن محمد ہواریؒ خادم روضۂ علی بن حرزہم، بوصیت خضر علیہ السلام۔

۳۔ عبداللہ برناویؒ۔ ان سے میری ملاقات شرح صدر یا فتح سے دوسرے دن ہوئی۔

۴۔ منصور بن احمدؒ۔

۵۔ محمد اللہواجؒ۔ رحمہ اللہ علیہم اجمعین

کتمانِ سِرّ کی تاکید

مؤلف کتاب احمد بن المبارک کہتا ہے لیکن حضرت دباغ کو دیگر اولیاء کاملین کی بھی ملاقات وصحبت نصیب ہوئی اور حضرت ممدوح اُن کے اسرار باطنیہ کے وارث ہوئے، ان بزرگوں کا ذکر اثنا۔ کتاب میں آئے گا۔ انشاء اللہ تعالیٰ، منجملہ اُن کے

غوثِ وقت حضرت احمد بن عبداللہ مصریؒ ہیں، چنانچہ مَیں نے حضرت ممدوح کو یہ فرماتے سنا کہ جس روز میں دیوان (مجلس اقطاب و اغواث) میں داخل ہوا ہوں اس دن مجھ سے احمد بن عبداللہ اور اسی طرح دیگر اہل دیوان نے بجز اس کے کوئی بات ہی نہیں کی کہ مجھے کتمانِ سِر کی تاکید کرتے رہے۔ حتیٰ کہ احمد بن عبداللہ نے تمامی اہلِ دیوان کو حکم فرمایا کہ اس بارے میں ایک ایک واقعہ مجھے سنائیں۔ چنانچہ ان حضرات نے تقریباً ۲۰۰ (دوسو) واقعات مجھے سنائے، ان میں آٹھ واقعات مَیں نے حضرت ممدوح سے سنے تھے لیکن یہاں صرف پانچ درج کئے جاتے ہیں۔

کتمانِ سِرّ کے بارے میں پہلی حکایت

پہلی حکایت احمد بن عبداللہ غوث کی ہے۔ فرمایا۔ میرا ایک مرید تھا اور اس کے ساتھ بڑی محبت تھی۔ ایک دن میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی عظمتِ شان اس کو سنانے لگا کہ بیٹا اگر سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا نور نہ ہوتا تو زمین کے اسرار میں سے ایک سِر بھی ظاہر نہ ہوتا۔ وہ نورِ معظم نہ ہوتا تو نہ کوئی چشمہ اُبلتا نہ کوئی دریا بہتا۔ بیٹا! آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا نور مبارک مارچ کے مہینے (شروع موسم بہار) میں تین مرتبہ تمام بیجوں پر مہکتا ہے جس کی برکت سے اُن میں پھل آتا ہے۔ اگر نورِ محمدیؐ نہ ہوتا تو کوئی تخم بھی پھل نہ لاتا۔ بیٹا! سب سے کم درجہ کا ایمان اس شخص کا ایمان ہے جو اپنے ایمان کو پہاڑ بلکہ پہاڑ سے بھی بڑا سمجھے اور وہ اپنے آپ کو اَوروں سے زیادہ حق دار سمجھے، لیکن ذاتِ انسانی بسا اوقات ایمان کے بوجھ کو اٹھانے سے عاجز آکر اُسے پھینک دینے کا ارادہ کرتی ہے کہ دفعتاً نورِ محمدی مہکتا ہے اور بارِ ایمان کے اٹھانے میں مددگار ہوتا ہے جس کی وجہ سے مومن کو ایمان شیریں اور پاکیزہ معلوم ہونے لگتا ہے (اور وہ تباہ ہونے سے بچ جاتا ہے)

جب میں اس طرح آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی عظمت کا ذکر کر رہا تھا اور اُن برکات کا ذکر کر رہا تھا جو آپ سے حاصل ہوئیں، یہاں تک کہ مَیں ذاتِ محمدیؐ میں محو ہو گیا۔ مرید نے جب میری یہ حالت دیکھی تو کہا: اے میرے آقا! اسی نبی محترم کی جاہ کا واسطہ مجھے سِر عطا فرما دیجئے۔ مَیں نے باز رہنا چاہا مگر جب بڑی ذات کے جاہ کا واسطہ نظر کے سامنے آیا تو میں نے اس کی بات مان لی اور اسے راز دیدیا۔ مگر چند ہی دن گزرے تھے کہ لوگوں نے اس پر کُفر کی گواہیاں دیں اور اسے قتل کر دیا گیا یہ شخص خوز عربوں میں سے تھا اور مصر کے ایک شہر میں محلہ کے ایک گوشہ میں رہتا تھا۔ مجھ سے سِرِّ الٰہی لے کر وطن چلا گیا، لوگ اس کے پاس آئے اور یہ ان کو اسرار الٰہیہ سنانے لگا جو ان کی عقلوں سے بالا تھے اس پر اُنہوں نے اس کے خلاف اُن باتوں کی شہادتیں دیکر جو اُس سے سُنی تھیں اسے قتل کروا دیا۔

دوسری حکایت

ایک نے فرمایا میرا ایک مرید تھا جس نے ۱۲ سال میری خدمت کی اور مجھے اس سے بہت محبت تھی، حتیٰ کہ میرا ارادہ تھا کہ اپنی لڑکی کی شادی اس سے کر دوں۔ مَیں ہر ہفتے میں تین دن کے لیے بستی چھوڑ کر ساحلِ سمندر پر جا بیٹھتا، ایسا اتفاق ہوا کہ ان غائب رہنے کے دنوں کے اندر عید آگئی۔ میرے چھ لڑکے اور تین لڑکیاں اور ایک خادم تھا جب میں گھر آیا تو دیکھا کہ اس نے سب کے لیے کپڑے سلوائے اور جس جس چیز کی ضرورت تھی وہ بھی خرید دی۔ یہ دیکھ کر مجھے بڑی خوشی ہوئی۔ جب وہ میرے سامنے آیا تو محبت و عقیدت سے ملا اور درخواست کی کہ اسے سِرِّ الٰہی عطا کر دوں اور اس پر بڑا اصرار کیا۔ چنانچہ میں نے اسے بادلِ ناخواستہ سِرِّ الٰہی دیدیا۔ ابھی چالیس دن ہی گزرے تھے کہ لوگوں نے اُس سے ایسی راز کی باتیں سُنیں جنہیں عوام کی عقلیں باور نہیں کر سکتی تھیں، ان کی شہادتیں بہم پہنچائیں اور اسے پھانسی دیدی گئی۔

تیسری حکایت

ایک صاحب نے فرمایا: میرا ایک مُرید تھا جس نے ۹ سال میری خدمت کی۔ اس کی خدمت اور حسنِ معاشرت کی وجہ سے مجھے اُس سے بہت محبّت تھی۔ وہ میرا ہم محلہ اور ہمسایہ بھی تھا۔ میری بیوی اکثر بیمار رہا کرتی، وہ اپنی خوبصورت بیوی کو میرے گھر لے آیا کرتا تھا۔ جو کام میری بیوی نہ کر سکتی اس کو وہ انجام دیا کرتی۔ غرض دونوں میاں بیوی ہماری خدمت میں لگے رہتے۔ اسی وجہ سے مجھے اس سے بڑی محبّت تھی۔ ایک دن میں ایک جگہ کھڑا تھا کہ وہ اپنی چھوٹی سی بچی کو لیکر آیا جس کے ہاتھ میں قرآن مجید تھا۔ مجھے پتہ بھی نہ چلا کہ یکایک کیا دیکھتا ہوں کہ بچی میرے پاؤں پر پڑی ہے اور قرآن مجید اس کے ہاتھ میں ہے۔ مَیں نے پیچھے ہٹ کر کہا: اے شخص آخر تو کیا چاہتا ہے؟ تو یہ بہت بڑا واسطہ لایا ہے۔ بولا "مجھے آپ سِرِّ الٰہی عطا فرما دیں۔" مَیں نے کہا" ارے تجھ میں اس کی برداشت کی طاقت نہیں۔ سِرِّ الٰہی تو ایک بڑی چیز ہے۔ صرف وہی اس کے اُٹھانے کی طاقت رکھ سکتا ہے جسے اللہ تعالیٰ قوت دے اور اس کے حامل کو دو تہائی آدمی واہ واہ کہتے ہیں اور اسی میں اس کی ہلاکت و موت ہوتی ہے۔ اُس نے کہا آپ عطا فرما دیں میں ضرور برداشت کر لوں گا۔ غرض اس کی اور اس کی بیوی کی خدمتوں پر اور اُن تعلقات و حقوق پر جو اس کے میرے ساتھ قائم تھے۔ نیز معصوم بچی اور کلام اللہ کا واسطہ لانے پر نظر کرتے ہوتے مَیں نے ہاں کر لی اور اسے سِرِّ الٰہی دے دیا (شیخ فرماتے ہیں) اس نے سِرِّ الٰہی بغیر ذات کے لیا تھا اور جس کو بھی سِرِّ الٰہی بغیر ذات کے ملا کرتا ہے وہ اس کو تباہ کر دیتا ہے۔ مَیں نے عرض کیا ذات سے کیا مراد ہے؟ فرمایا کہ پیر کی ذات اور اس کے اسرار اور یہ پیر کی وفات کے بعد ہی مرید کی طرف منتقل

ہوتے ہیں۔ پھر فرمایا کہ ولی سِرّ تو دے سکتا ہے، لیکن ذات نہیں دے سکتا۔ ذات صرف خدا ہی دے سکتا ہے۔ الحاصل اس نے سِرّ لیا اور چلا گیا اور تین دن تک اپنے پیر سے غائب رہا ابھی تین دن نہ گذرے تھے کہ اپنے پیر کی شان میں بکواس کرنے لگا۔ کسی نے آکر پیر کو اطلاع دے دی کہ آپ کا فلاں مُرید آپ کی شان میں گستاخی کرتا ہے۔ پیر نے تغافل برتا، لیکن اس پر آزمائش کا وقت آتا رہا۔ چنانچہ اسی گمراہی اور تاریکی میں اُس نے کچھ عرصہ گذارا کہ ایک قافلہ آیا اور یہ اُس کے ساتھ بحری سفر میں چلا گیا۔ وہاں جاکر قید ہوگیا، پھر عیسائی ہوگیا (خدا بچائے) یہ بدبختی اُسے اس لیے حاصل ہوئی کہ اس نے سِرّ کو قبل از وقت لینا چاہا جس کے عتاب میں وہ اسلام سے بھی محروم ہوگیا۔ ہم اللہ سے سلامتی چاہتے ہیں۔

چوتھی حکایت

ایک صاحب نے فرمایا: مَیں اور ایک اَور آدمی دینی بھائی تھے، ایک مرتبہ ہم نے یہ طے کیا کہ سفر کو نکلیں اور کسی اللہ کے ولی کی تلاش کریں جو ہمارا ہاتھ پکڑلے اور ہمیں اللہ سبحانہٗ کے راستہ پر چلائے۔ چنانچہ ہم سیاحت کرتے رہے تا آنکہ اللہ نے ہماری ملاقات اپنے ایک ولی سے کرادی۔ یہ بزرگ ثرید (ایک قسم کا کھانا) کی دکان کرتے تھے چنانچہ ہم میں سے ایک آگ جلایا کرتا اور دوسرا ثرید تول کر گاہکوں کو دیا کرتا اور شیخ ثرید پکایا کرتے، ہم مدت تک یہی کرتے رہے۔ پھر شیخ کی موت کا وقت قریب آگیا اور ایک بار تو اُن کے حواس بھی جاتے رہے۔ دینی بھائی نے آکر شیخ سے درخواست کی کہ مجھے سِرّ عطا فرمائیں۔ شیخ نے فرمایا تو ابھی اس کی طاقت نہیں رکھتا، پھر کہا آپ کو ضرور دینا ہوگا۔ شیخ نے میری طرف دیکھا اور کہا کیا تو راضی ہے[1]؟ مَیں نے عرض کیا حضرت اگر آپ کی مرضی ہے تو مَیں بھی راضی ہوں۔ فرمایا تو راضی ہو جا، خدا تجھے اس کا بدلہ اپنے پاس سے دیگا۔ چنانچہ میں راضی ہوگیا اور اس نے سِرّ لے لیا۔ دو دن کے بعد شیخ کی وفات ہوگئی اور میرا دینی بھائی اپنے وطن چلا گیا اور میں شیخ کی دکان پر خدمت کرتا رہا۔ جو کچھ کماتا اُسے شیخ کے گھر والوں پر صرف کرتا، اُن کی ایک بیوی، تین لڑکیاں اور ایک لڑکا تھا۔ مَیں دکان پر بارہ سال کام کرتا رہا اور مجھ میں اب بھی شیخ کی پہلی کی سی محبت تھی۔ اس میں ذرہ بھر بھی کمی واقع نہ ہوئی تھی، جب بارہ برس گذر گئے تو شیخ کی بیٹیوں کی شادیاں ہوگئیں اور وہ اپنے اپنے گھر چلی گئیں۔ شیخ کا بیٹا مغرب کو چلا گیا اور شیخ کے بھائی نے اُن کی بیوی سے نکاح کرلیا۔ جن سے تعلق تھا کوئی بھی نہ رہا، میں کچھ تنگ دل سا ہوا اور اپنے وطن واپس آنے کا ارادہ کیا جو کچھ میرے پاس تھا مَیں نے بیچ ڈالا اور سامانِ

---

[1] مقصد یہ تھا کہ اصل حقدار اور اہل تو تُو ہے لیکن تیرا مطالبہ نہیں اس لیے اگر تو راضی ہو تو اُسے دیا جائے۔

سفر تیار کر لیا۔ اب صرف شیخ کی قبر کی زیارت کرنی رہ گئی تھی جب میں شیخ کی قبر کی زیارت کیلئے گیا اور یہ آبادی سے دُور ایک وحشت ناک جگہ پر تھی۔ زیارت کرنے کے بعد واپس آنے لگا تو میرے دل نے کہا: افسوس کیا تو ہمیشہ کے لیے اپنے شیخ کی قبر کو چھوڑ کر جا رہا ہے؟ میرے دل میں شیخ کے لیے ولولہ پیدا ہوا۔ چنانچہ میں واپس آگیا اور کچھ دیر اور وہاں رہا۔ پھر واپس آنے لگا تو دوبارہ مجھ پر دہشت طاری ہوئی پھر واپس آیا اور زوال تک وہاں رہا۔ پھر لوٹنے کا ارادہ کیا تو وہی پہلی کی سی حالت ہوئی۔ اس پر میں رات ہونے تک وہاں رہا، میں شیخ کی محبت کی وجہ سے رو رہا تھا۔ پھر میں نے قبر پر ہی رات گذاری اور میری بے چینی اور شیخ کی محبت بڑھتی گئی، یہاں تک کہ فجر ہو گئی اُس وقت حضرت خضر تشریف لائے اور مجھے ذکر تلقین فرمایا اور اللہ نے فتح (شرح صدر) نصیب کی اور میں اپنے وطن کو روانہ ہوا۔ راستہ میں اپنے دینی بھائی کے وطن سے گذر ہوا۔ جب میں اس شہر میں پہنچا تو دیکھا کہ لوگ ایک شخص کو جلانے کے لیے ایندھن جمع کر رہے ہیں۔ میں اُس شخص کو دیکھنے کے لیے گیا، دیکھا تو وہی میرا دینی بھائی تھا۔ میں نے ایندھن جمع کرنے والوں سے پوچھا کہ اس نے کیا قصور کیا ہے؟ کہنے لگے یہ ایسا ایسا کہتا ہے، یعنی اسرارِ الٰہیہ میں سے ایک راز کا اس نے افشاء کیا ہے جس کی عقولِ عامہ متحمل نہ ہو سکیں۔ انہوں نے عُلماء سے استفتاء کیا اور علماء نے اس کے جلانے کا فتویٰ دیا۔ میں اپنے بھائی کی طرف آگے بڑھا۔ میں نے تو اُسے پہچان لیا تھا، لیکن وہ اپنی مصیبت کی وجہ سے مجھے نہ پہچان سکا۔ میں نے اُس سے پوچھا، تجھے کس لیے جلا رہے ہیں؟ کہا انہوں نے مجھے ایسا ایسا کہتے سنا ہے اور میں نے تو سچی بات کہی ہے۔ میں نے کہا کیا تو نے اس کے علاوہ بھی کچھ کہا ہے؟ کہنے لگا نہیں اور کچھ بھی نہیں کہا۔ اب میں نے مجمع کی طرف منہ کر کے کہا: جب تک میں سلطان کے پاس سے واپس نہ آجاؤں اس وقت تک تم ہاتھ روکے رکھنا۔ میں سُلطان کے پاس اس کے متعلق بات کرنے جا رہا ہوں۔ میں سلطان سے عرض کروں گا کہ اس شخص پر قتل کا حکم صحیح نہیں۔ لہٰذا تم میرے آنے تک صبر کرو اور اگر کسی نے کوئی کارروائی کی تو اس کی اپنی جان کی خیر نہیں کیونکہ مجھے امید ہے کہ جب میں سلطان سے بات کروں گا تو وہ ضرور اپنا حکم واپس لے لیں گے۔ سب نے کہا بہتر۔ جب تک آپ واپس نہ آئیں گے ہم کچھ نہ کریں گے۔ چنانچہ میں سلطان کے پاس پہنچا، دیکھا کہ علماء اس کے پاس ہیں اور اسی شخص کا تذکرہ ہو رہا ہے اور اس کو اس کے قتل پر ابھار رہے ہیں۔ میں نے عرض کی: والا جاہ! خدا آپ کا ناصر و مددگار ہو اور ہر معاملے میں آپ کو اپنے محبوب و پسندیدہ راستہ پر چلاتا رہے دیکھیے ہر انسان پر تین سو چھیاسٹھ فرشتے تعینات ہیں جو شخص کسی ایک ذات کو بھی ناحق قتل کریگا

تو مقتول کی ذات کے فرشتوں کی اتنی کثیر تعداد کا اس کے سوا کوئی مشغلہ نہیں ہوتا کہ قاتل پر لعنت کرتے رہیں کہ اس نے ذات کو قتل کر کے اُن کو بلا وجہ باہر نکالا ہے اور ظاہر ہے کہ فرشتوں کی دُعا مقبول و مستجاب ہے لہٰذا والا جاہ کو اس بد دعا سے بچنا چاہیئے۔ مزید برآں ہر ذات پر سات بزرگ فرشتے بغرضِ محافظت و کتابتِ اعمال تعینات ہیں۔ پس جب کوئی ذات بلا وجہ قتل کی جائے تو ان فرشتوں کا اب صرف یہی کام ہوتا ہے کہ مقتول کے اعمال نامے سے اس کی خطاؤں کو منتقل کر کے قاتل کے اعمال نامے میں لکھ دیں اور قاتل نے جو بھی عمل نیک کیا ہو وہ اس کے اعمال نامے سے منتقل کر کے مقتول کے اعمال نامے میں درج کریں۔ قاتل کے مرتے دم تک اُن کا یہی شغل رہتا ہے پھر اُس کے مرنے کے بعد اس کی بدیوں کا ذکر کرتے رہتے ہیں اور فرشتوں کا ذکر بارش کا حکم رکھتا ہے۔ ہر ذکر کے ساتھ خیر نازل ہوتی ہے، لیکن اگر کسی کا بدی سے نام لیں تو اس پر بُرائی نازل ہوتی ہے لہٰذا مقتول کا تذکرہ بھلائی کے ساتھ کرتے ہیں اور اس پر خیر و برکت کا نزول ہوتا رہتا ہے اور قاتل کا تذکرہ برائی کے ساتھ کرتے رہتے ہیں اور اس پر آفات برستی رہتی ہیں۔ اے بادشاہ کیا آپ اس سے نہیں ڈرتے؟ بادشاہ نے جواب دیا کہ ان علماء نے اس کے قتل کا فتویٰ دیا ہے۔ میں نے عرض کیا کہ انہوں نے قتل کا فتویٰ دینے میں جلدی کی ہے۔ انہیں چاہیئے تھا کہ اسکے لفظ اور نیت دونوں پر غور کر لیتے۔ اگر الفاظ اس کے قتل کا تقاضا کرتے ہوں تو اس کی نیت و مراد معلوم کی جاتی ہے۔ اگر اس کی نیت صحیح ہوئی تو اس پر قتل کا حکم نہیں لگ سکتا ہے لہٰذا کسی کو بھیج کر اُس شخص کو بلوا لیا جائے اور اس کی نیت معلوم کر لی جائے علماء نے کہا ہاں بالکل ٹھیک ہے! اور ہمیں اس پر ضرور عمل کرنا چاہیئے۔ چنانچہ اُسے بلایا گیا اور اس سے پوچھا گیا کہ تمہاری اس سے کیا مراد تھی؟ دیکھا تو اس کی مراد درست تھی جس سے اس پر قتل کا حکم نہ دیا جا سکتا تھا لہٰذا اسے رہا کر دیا گیا۔

میں نے حضرت دباغ ؒ سے دریافت کیا کہ رہا ہونے کے بعد کیا ہوا؟ فرمایا جس بھائی نے اسے رہا کرایا تھا اسی نے اس کا سِر سلب کر دیا اور اسے منجملہ عوام کے بنا دیا اور تمام وہ سِر جو شیخ نے اسے عطا گیا تھا، اُس سے لے لیا۔

میں نے عرض کیا کہ پہلے اور دوسرے قصے والوں کا قتل ہونے کے بعد کیا انجام ہوا۔ فرمایا: اُن کی موت ولایت پر ہوئی مگر تیسری حکایت والا کفر پر مرا۔

پانچویں حکایت ایک نے کہا، میرا ایک مُرید تھا جو بارہ برس سے میری خدمت کر رہا تھا

مُریدسخی اور صاحب کرم بھی تھا اس نے مجھ پر اور اپنے غریب برادرانِ طریقت پر ایک بھاری رقم خرچ کر دی تھی۔ میرا ایک بھائی شاہی ملازم تھا۔ ایک مرتبہ سُلطان اس پر ناراض ہو گیا اور اُسے اس قدر بھاری جرمانہ کر دیا جس کے ادا کرنے کی اس میں طاقت نہ تھی۔ چونکہ عام لوگ میری تعظیم و تکریم کرتے تھے اس لیے حکومت؎ مجھے کوئی نقصان نہ پہنچا سکی۔ مرید نے اس موقعہ کو غنیمت سمجھ کر کہا کہ حضرت یا تو مجھے سِرّ عطا کر دیجئے یا جو رقم کثیر میں نے آپ پر اور آپ کے ساتھی فقیروں پر خرچ کی ہے وہ سب ادا کیجئے ورنہ تمہیں حکومت میں بلا لیں گے ان تینوں میں سے جو بات پسند ہو اختیار کر لیں، میں نے کہا: ارے اللہ سے ڈر۔ اللہ تعالیٰ تجھے عنقریب سِرّ عطا کر دے گا، جیسا کہ تو چاہتا ہے بلکہ تیری توقع سے بھی زیادہ۔ اگر تجھے میرے کلام میں شک ہو تو میں اللہ کا عہد و میثاق دیتا ہوں مگر میری ایذا رسانی پر برانگیختگی اور بھی زیادہ ہو گئی اور کہنے لگا: خدا کی قسم جب تک تمام وہ رقم جو میں نے تم پر خرچ کی ہے نہ دو گے، نہیں چھوڑوں گا ورنہ تمہیں حکومت میں بلا لوں گا اور اگر حکومت کو پتہ چل جاتا تو مجھے نہ چھوڑتے۔ اس نے بطریق سابق مجھ سے کلام کیا اور وہی الفاظ دہراتا گیا، پھر مَیں نے سربسجود ہو کر اس کے لیے سِرّ کی دعا کی۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے اسے سِرّ عطا فرما دیا، ابھی تھوڑے دن ہی گزرے تھے کہ اسے ایک چیز دکھائی دی جس کو اللہ نے تمام بندوں کی عقلوں سے مخفی رکھا تھا۔ کیونکہ وہ اسے برداشت نہیں کر سکتے ہیں۔ یہ شخص راز کی باتیں لوگوں سے بیان کرنے لگا لوگوں نے اس سے یہ باتیں سُنکر اس کے خلاف شہادتیں دیں اور اسی وقت اسے قتل کرا دیا اور اگر وہ صبر کرتا یہاں تک کہ اسے سِرّ ذات حاصل ہوتا جس سے سِرّ ولایت ہمیشہ ساتھ رہتا ہے تو اللہ تعالیٰ اسے توفیق بخشتا اور اسرارِ ولایت کا کہیں تذکرہ نہ کرتا لیکن جب اس نے عجلت کی تو اللہ نے اسے سزا دی اس پر میں نے حضرت شیخ سے پوچھا یہ شخص کس حال پر مرا، فرمایا۔ ولایت ہی پر مرا اس پر مَیں نے اللہ کا شکریہ ادا کیا۔

جو اسرار اُن لوگوں کی موت کا سبب بنے ہیں نے اپنے شیخ سے سب سنے تھے مگر ان کو اس لیے تحریر نہیں کیا کہ یہ وہ اسرار الٰہیہ ہیں جو قابل بیان نہیں ہیں۔

اللہ تعالیٰ ہمیں ان باتوں کے کرنے کی توفیق دے جنہیں وہ پسند کرتا ہے ہمارے شیخ کی برکت سے اور اس کی پاک نسب کی برکت سے۔ آمین

ہم اتنی ہی حکایات پر اکتفا کرتے ہیں تاکہ لوگ اُکتا نہ جائیں۔ خدا توفیق دینے والا ہے۔

؎ اصل کتاب میں مخزن کا لفظ ہے جو مراکشی زبان میں حکومت (GOVERNMENT) کے معنوں میں مستعمل ہے۔

(انسائیکلو پیڈیا آف اسلام۔ مقالہ مخزن)

تیسری فصل

شیخ کی بعض کرامات کا بیان

یاد رکھیں کہ ہمارے شیخ عجیب وغریب ہستی تھے اور ایسے انسان کو کرامت کی ضرورت نہیں ہوتی کیونکہ آپ تو مجسّم کرامت تھے کیونکہ بوجہ اُمّی محض ہونے کے کہ قرآن تک بھی حفظ نہ تھا چہ جائیکہ کوئی علم پڑھا ہو اور باوجودیکہ بچپن سے لے کر بڑھاپے تک کسی مجلس درس میں آپ کو دیکھا نہ گیا تھا پھر بھی ایسے عُلوم پر بحث کرتے تھے جن پر بحث کرنے سے بڑے بڑے فاضل بھی قاصر ہوں اور جو کچھ بھی فرماتے معقول ومنقول کے مطابق ہوتا۔

کرامتِ اوّل سلامتِ عقیدہ

سب سے پہلے ہم اس کرامت کا ذکر کرتے ہیں جس سے بڑھکر کوئی کرامت نہیں اور وہ صحیح العقیدہ ہونا ہے۔ جب مجھے آپ کی صحبت نصیب ہوئی تو میں نے آپ سے توحید کے متعلق آپ کا عقیدہ دریافت کیا۔ آپ نے اہل سنّت والجماعت کا عقیدہ بیان فرمایا اور اس میں سے ایک بات بھی نہ چھوڑی۔ ایک بار فرمایا کسی بندہ کو فتح (کشفِ صدر) نصیب ہی تب ہوتی ہے کہ وہ اہل السنت والجماعت کے عقیدے پر ہو اور اللہ کا کوئی ولی بھی کسی دوسرے عقیدے کا نہیں ہوا۔ اور اگر فتح سے پہلے کسی دوسرے عقیدے پر تھا بھی تو فتح کے بعد اس کے لیے اُس عقیدے سے توبہ کرنا اور اہل السنت کے عقیدے پر آنا ضروری ہے۔ میں (احمد بن المبارک) کہتا ہوں کہ بدر الدین[1] زرکشی نے تاج الدین[2] السبکی کی کتاب جمع الجوامع کی شرح میں ایسا ہی ذکر کیا ہے۔

مَیں نے حضرت ممدوح کو ہمیشہ اہل سنت کی تعریف کرتے ہوئے سُنا۔ فرماتے تھے کہ مجھے اہلسنت

---

[1] بدر الدین زرکشی: بدر الدین محمد بن عبد اللہ الزرکشی شافعی بزرگ ہیں ان کی وفات ۷۹۴ھ ؍ ۱۳۹۱ء میں ہوئی انھوں نے تاج الدین سبکی کی کتاب جمع الجوامع کی شرح لکھی ہے جس کا نام تشنیف المسامع رکھا (کشف الظنون ۳۰۵/۱)

[2] ابو نصر عبد الوہاب بن علی تاج الدین سبکی ۷۲۷ھ ؍ ۱۳۲۵ء میں پیدا ہوئے اور ۷۷۱ھ ؍ ۱۳۷۰ء میں وفات پائی، یہ شافعی بزرگ تھے اور انھوں نے بہت سی تصانیف کیں۔ ان کی جمع الجوامع اصول فقہ کی کتاب ہے۔

سے بہت زیادہ محبت ہے اور اللہ سے دعا مانگا کرتا ہوں کہ ان ہی کے عقیدے پر وفات ہو۔

پھر میں ان سے دیگر مذہب والوں کے شبہات پیش کرتا۔ آپ ان شبہوں کو بڑی اچھی طرح سے سمجھ لیتے اور پھر اس طرح ان کا جواب دیتے گویا کہ کوئی اپنی آنکھوں سے تمام امور کو دیکھ رہا ہو چنانچہ ہم نے امرِ ربوبیت اور سرِّ الوہیت کی وہ وہ باتیں ان سے سنیں جو نہ کبھی آنکھوں نے دیکھیں نہ کانوں نے سنیں اور نہ کبھی ہماری عقلوں پر اُن کا گذر ہوا۔ حالانکہ معقول و منقول کے حاصل کرنے میں اس قدر زور لگایا تھا، یہاں تک کہ اگر کسی کو اللہ تعالیٰ توفیق بخشتا اور وہ ان باتوں کا آپ سے مذاکرہ کرتا اور اہل ہوا فرقوں کے شبہوں کے جواب سُنتا تو اسے قوتِ ایمان حاصل ہو جاتی اور وہ اس قابل ہو جاتا کہ بہتّر فرقوں کے شبہات کو حل کر سکتا۔

ایک مرتبہ کشف و عیان کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا: ہم تو انہی باتوں پر ایمان لائے ہیں جنہیں ہم نے اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا ہے۔ کیا بے دیکھی چیز پر بھی کوئی ایمان لا سکتا ہے؟ اس لیے کہ وسواس تو بغیر دیکھے دور نہیں ہو سکتے۔

احادیثِ صفات کے متعلق سوال

پھر مَیں نے آپ سے احادیثِ صفات[1] کے متعلق دریافت کیا کہ سلف کے طریقے کے مطابق ان میں "تفویض" واجب ہے یا "تاویل" جیسا کہ متاخرین کا طریقہ ہے؛ فرمایا "تفویض" ہی ضروری ہے، شانِ خداوندی اس قدر عظیم ہے کہ اس کا اندازہ نہیں لگا سکتے اور نہ ہی اس کی کسی ایک بات کی حقیقت

---

[1] احادیث الصفات وہ احادیث ہیں جن میں اللہ کے ہاتھ، پاؤں، آنکھ، انگلی وغیرہ کا ذکر آیا ہے مسلمانوں کے عقیدے کے مطابق خدا کا کوئی جسم نہیں کہ اس کے ہاتھ پاؤں وغیرہ ہوں، لیکن اس کے باوجود خود قرآن مجید میں بھی اور احادیث میں بھی اللہ کی طرف ہاتھ پاؤں وغیرہ منسوب کئے گئے ہیں۔ اس بارے میں محدثین کے دو گروہ ہو گئے۔ ایک متقدمین کا اور دوسرا متاخرین کا۔ متقدمین نے معاملہ خدا اور رسولؐ پر چھوڑا اور کہہ دیا کہ ہمیں علم نہیں۔ ہم تو اسی طرح مانتے ہیں جیسا کہ ان احادیث میں آیا ہے۔ ان کی حقیقی کیفیت کا علم خدا کو ہی ہے۔ اسے "تفویض" کہتے ہیں یعنی "معاملہ کو خدا کے سپرد کر دینا" متاخرین ان احادیث کی تاویل کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ہاتھ سے مراد قوت ہے۔ سننے سے مراد علم ہے وغیرہ اور یہ دونوں طریقے اہلسنت کے ہیں۔ حضرت سے یہی پوچھا گیا تھا کہ ان میں سے بہتر کون سا طریقہ ہے۔ یاد رکھنا چاہیئے کہ یہ سوال کون شخص کر رہا ہے۔ سوال کرنیوالا ایک عالم ہے اور پھر ہے بھی اہل باطن میں سے، جواب دینے والا غوثِ زمان ہے لہٰذا ان کا جواب اہل دل کے لیے زیادہ موزوں ہے اب رہے عوام اور اہل ظاہر تو ان کے لیے "تاویل" کا طریقہ زیادہ مناسب ہے۔ ۱۲

تک پہنچ سکتے ہیں۔

احادیثِ صفات کے متعلق مؤلف کی تشریح

میں کہتا ہوں کہ تفویض ہی مذہب ہے، امام مالکؒ[1]، سفیان عُیینہؒ[2]، سفیانؒ[3] ثوریؒ، حماد بن زیدؒ[4]، حماد بن[5] سلمہؒ، شعبہ[6]ؒ، شریکؒ[7]، ابو عوانہؒ[8]، ربیعہ[9]ؒ،

---

(۱) امام مالکؒ : اہل سنت کے دوسرے امام : مالک بن مالک بن انسؓ۔ امام مالکؒ مدینہ میں سنہ ۹۳ھ ۷۱۱ء میں پیدا ہوئے۔ تمام لوگوں کا اتفاق ہے کہ وہ حدیث کے امام ہیں۔ انہوں نے مدینہ ہی میں قیام کیا اور وہاں سے کسی دوسرے شہر میں نہیں گئے۔ ان کی وفات ۱۷۹ھ ۷۹۵ء میں ہوئی۔

(۲) سُفیان عیینہؒ : ابو محمد سفیان بن عیینہ کوفہ میں ۱۰۷ھ ۷۲۵ء میں پیدا ہوتے انہوں نے چار برس کی عمر میں قرآن حفظ کیا اور سات برس کی عمر میں حدیث لکھی۔ ان کا شمار کبار محدثین میں ہوتا ہے ۱۹۸ھ ۸۱۲ء میں اکانوے برس کی عمر میں مکہ میں وفات پائی۔

(۳) سُفیان ثوریؒ : سفیان بن سعید ثوری۔ انہیں حدیث کا امیر المومنین کہا جاتا ہے ۹۷ھ ۷۱۴ء میں پیدا ہوتے۔ ۱۸ھ ۷۷ء میں کوفہ سے بصرہ چلے گئے اور وہیں ۱۶۱ھ ۷۷۶ء میں وفات پائی نہایت ہی عابد وزاہد تھے۔

(۴) حماد بن زید : مشہور ثقہ راوی اور عالم تھے انہوں نے ثابت بنانیؒ وغیرہ سے روایت حدیث کی اور ان سے عبداللہ بن مبارکؒ اور دیگر محدثین نے۔ یہ نابینا تھے۔ ۱۹۹ھ ۸۱۳ء میں وفات پائی۔

(۵) حماد بن سلمہؒ : حماد بن سلمہ بن دینار۔ مشہور بصرہ کے عالم حمید الطویل کے بھانجے تھے انہوں نے بکثرت روایت حدیث کی۔ ان کی وفات ۱۶۷ھ ۷۸۳ء میں ہوئی۔

(۶) شعبہؒ : شعبہ بن حجاج انہیں امیر المومنین فی الحدیث والروایۃ کہا جاتا تھا۔ نہایت عابد وزاہد تھے انکے اقوال مشہور ہیں ۱۶۰ھ ۷۷۶ء میں ستانوے برس کی عمر میں وفات پائی۔

(۷) شریکؒ : شریک بن شہاب۔ ان کا شمار تابعین میں ہوتا ہے مگر یہ زیادہ مشہور نہیں ہیں۔ ۱۴۰ھ ۷۵۷ء میں وفات پائی۔

(۸) ابو عوانہؒ : ابو عوانہ وضاح بن خالد البزاز حافظِ حدیث اور ثقہ تھے۔ انہوں نے حسن بصریؒ اور ابن سیرینؒ سے ملاقات کی، امام احمد بن حنبلؒ فرماتے ہیں ان کی لکھی ہوئی حدیثیں صحیح ہیں مگر جب حافظہ سے حدیث بیان کرتے ہیں تو انہیں وہم پیدا ہو جاتا ہے ۱۷۶ھ ۷۹۲ء میں بصرہ میں ان کی وفات ہوئی۔ محدثین میں ایک اور حافظ حدیث ابو عوانہ ہیں جن کا نام یعقوب بن اسحاق اسفرائنیؒ ہے انہوں نے ایک صحیح احادیث کی مسند مسلم

(بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر)

الاوزاعیؒ[1]، ابوحنیفہؒ[2]، شافعیؒ[3]، احمد بن حنبلؒ[4]، ولید بن مسلمؒ[5]، بخاریؒ[6]، ترمذیؒ[7]، ابن المبارکؒ[8]، ابن ابی حاتمؒ[9] اور یونسؒ[10] بن عبدالاعلیٰ کا۔

(بقیہ حاشیہ صفحہ سابقہ)

صحیح کے طرز پر لکھی ہے۔ ان کی وفات ۳۱۶ھ ۹۲۸ء میں ہوئی۔

(۹) ربیعہؒ: ربیعہ بن ابی عبدالرحمٰنؒ مدینہ کے فقہاء میں سے تھے۔ ان سے امام مالکؒ نے روایت کی ہے ۱۳۶ھ مطابق ۷۵۳ء میں وفات پائی۔

(حواشی صفحہ ہذا)

(۱) الاوزاعیؒ: عبدالرحمٰنؒ بن عمرو الاوزاعی ۸۸ھ ۷۰۵ء میں پیدا ہوئے اور ۱۵۷ھ ۷۷۴ء میں وفات پائی۔ ان کی وفات اس طرح ہوئی کہ یہ بیروت میں حمام میں گئے اور حمام والا دروازہ بند کرکے چلا گیا۔ واپس آیا تو یہ مرے پڑے تھے۔ خلفاء ان کی بہت تعظیم کرتے تھے۔

(۲) ابوحنیفہؒ: ابوحنیفہ نعمانؒ بن ثابتؒ: ان کی پیدائش ۸۰ھ ۶۹۹ء میں ہوئی اور ۱۵۰ھ ۷۶۷ء میں وفات پائی۔ اہل سُنت کے پہلے امام ہیں اور ان کا شمار تابعین میں ہوتا ہے زہد و تقویٰ میں بے نظیر تھے

(۳) شافعیؒ: محمد بن ادریس شافعیؒ: اہل سنت کے تیسرے امام ہیں ۱۵۰ھ ۷۶۷ء میں پیدا ہوئے اور ۲۰۴ھ ۸۱۹ء میں وفات پائی۔ اتباعِ حدیث پر سختی سے کاربند تھے۔ ان کے مناقب بے شمار ہیں۔

(۴) احمد بن حنبلؒ: ابوعبداللہ احمد بن حنبل: اہل سنت کے چوتھے امام ہیں۔ امام شافعیؒ کے شاگرد تھے علم و تقویٰ میں اپنے زمانے میں نظیر نہ رکھتے تھے۔ ۱۶۴ھ ۷۷۹ء میں بغداد میں پیدا ہوئے اور ۲۴۱ھ ۸۵۵ء میں وفات پائی۔

(۵) ولید بن مسلمؒ: امام اور حافظِ حدیث تھے۔ ان کی پیدائش ۱۱۹ھ ۷۳۷ء میں ہوئی امام احمد بن حنبلؒ اسحاق وغیرہ نے ان سے روایت کی۔ ذہبی تذکرۃ الحفاظ میں فرماتے ہیں کہ ان کے علم اور حافظہ میں کوئی کلام نہیں مگر یہ تدلیس کرتے ہیں۔ اسی لیے جب تک صراحتہً سماع کا ذکر نہ کریں ان کی حدیث کو دلیل نہ سمجھنا چاہیئے۔ ۱۹۵ھ ۸۱۰ء میں ان کی وفات ہوئی۔

(۶) بخاریؒ: ابوعبداللہ محمد بن اسمٰعیل بخاریؒ ۱۹۴ھ ۸۰۸ء میں پیدا ہوئے اور ۲۵۶ھ ۸۶۸ء میں وفات پائی۔ ان کی کتاب صحیح بخاری کا شمار صحاح ستہ میں ہوتا ہے۔ بڑے متقی اور زاہد و عالم تھے۔

(۷) ترمذیؒ: محمد بن عیسیٰ ترمذی ۲۰۹ھ ۸۲۴ء میں پیدا ہوئے اور ۲۷۹ھ ۸۹۲ء میں ستر برس کی عمر میں وفات پائی۔ ان کی کتاب جامع ترمذی صحاح ستہ میں شمار کی جاتی ہے۔

(بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر)

اور یہی قرونِ ثلاثہ کے لوگوں کا قول ہے جو بہترین و افضل لوگ ہیں۔ یہاں تک کہ امام ابو حنیفہؒ کے شاگرد امام محمد[۱] بن الحسن الشیبانیؒ فرماتے ہیں۔ مشرق سے لیکر مغرب تک تمام فقہار کا رب کی صفات کے بارے میں قرآنی آیات پر نیز اُن احادیث پر جنہیں ثقہ لوگوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم سے روایت کیا ہے بلا تشبیہ[ع] و تفسیر ایمان ہے۔

امام الحرمین[۲] رسالہ نظامیہ میں کہتے ہیں۔ ان ظواہر کے متعلق علمار کے مسلک مختلف ہیں۔ بعض کی رائے یہ ہے کہ ان کی تفسیر کی جائے اور انہوں نے قرآن کی آیات اور صحیح حدیثوں میں اسی کا التزام کیا ہے لیکن آئمہ سلف کی یہ رائے ہے کہ ان کی تاویل سے باز رہیں اور ان کے معانی اللہ کے سپرد کریں۔ ہمارے نزدیک پسندیدہ رائے اور جو کچھ بھی اللہ کے متعلق ہمارا عقیدہ ہے وہ یہی ہے کہ آئمہ سلف کی تابعداری کی جائے کیونکہ اجماعِ امت کا حجت ہونا قطعی طور پر ثابت ہو چکا ہے اور اگر ان ظواہر کی تاویل کرنا ضروری ہوتا

(بقیہ حاشیہ صفحہ سابقہ)

(۸) ابن المبارک: عبداللہ بن المبارکؒ، علمار ربانیین میں سے تھے۔ ان کی پیدائش ۱۱۸ھ ۷۳۶ء میں ہوئی اور وفات ۱۸۱ھ ۷۹۷ء میں۔

(۹) ابن ابی حاتمؒ: ابو محمد عبدالرحمٰنؒ بن ابی حاتم۔ علوم اور معرفتِ رجال میں انہیں سمندر سمجھا جاتا تھا۔ زاہد تھے اور ان کا شمار ابدال میں ہوتا ہے۔ ان کی وفات ۳۲۷ھ ۹۳۸ء میں ہوئی۔

(۱۰) یونس بن عبدالاعلی: عالم مصر تھے۔ ۱۷۰ھ ۷۸۶ء میں ان کی پیدائش ہوئی۔ انہوں نے ورشؒ وغیرہ سے قرآن پڑھا اور سفیان بن عیینہؒ، ولید بن مسلمؒ وغیرہ سے حدیث سنی ان کی وفات ۲۶۴ھ ۸۷۷ء میں ہوئی۔

(حاشیہ صفحہ ہذا)

(۱) محمد بن حسن شیبانیؒ: واسط میں ۱۳۲ھ ۷۴۹ء میں پیدا ہوئے اور کوفہ میں نشو و نما پائی امام ابو حنیفہؒ کے مشہور شاگرد ہیں۔ انہوں نے بہت سی کتابیں لکھیں ۱۸۹ھ ۸۰۳ء میں مقام رے میں وفات پائی۔

(۲) امام الحرمینؒ: ابو المعالی عبدالملک بن عبداللہ الجوینی المعروف بامام الحرمین۔ اپنے والد سے فقہ کی تعلیم حاصل کی اور فقہ، اصول اور کلام میں نیشاپور بلکہ کل مشرق کے امام ہو گئے، مکہ میں چار سال تک مجاورت کی اور وہیں سے امام الحرمین کا لقب حاصل کیا ان کی تصنیفات میں فقہ کی ایک کتاب نہایہ ہے۔ ان کی وفات ۴۷۸ھ ۱۰۸۵ء میں ہوئی۔

ع بلا تشبیہ و تفسیر سے مراد یہ ہے کہ وہ خدا کی ان صفات کی انسان یا غیر کے اعضاء سے تشبیہ نہیں دیتے اور نہ ہی دینی چاہیئے کیونکہ اللہ انسان کی طرح تو نہیں ہے اور نہ ہی اس کی تشریح کرتے ہیں۔

تو یقیناً ان کو ان ظواہر کا فروعِ شریعت سے زیادہ اہتمام ہوتا ۔ لہٰذا جب صحابہؓ اور تابعینؒ کا زمانہ اسی بات پر گذرا کہ وہ تاویل کرنے سے گریز کریں تو ہمارے لیے بھی یہی قابلِ اتباع طریقہ ہے ۔

حافظ ابن حجر[1] فرماتے ہیں کہ قرون ثلاثہ کے لوگوں کا قول نقل ہو چکا اور وہ مثلاً یہ لوگ : الثوریؒ ، الاوزاعیؒ ، مالکؒ ، لیثؒ[2] اور ان کے ہمعصر لوگ اور ان کے شاگردوں کا بھی یہی مسلک ہے ۔ لہٰذا جس بات پر قرونِ ثلاثہ[3] کے لوگ متفق ہوں اور وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے فرمان کے مطابق تمام قرنوں سے بہتر و افضل ہیں تو اس پر اعتماد کیسے نہ کیا جاتا ۔ لہٰذا ہمارے شیخ کا عقیدہ وہی قرون ثلثہ کے لوگوں کا عقیدہ ہے اور یہی سب سے بڑی کرامت ہے ۔ حافظ ابن حجرؒ فرماتے ہیں کہ ناصرالدین ابن المنیر[4] کا قول ہے : صحیح عقیدہ[5] پر استقامت ہی حتمی طور پر کرامت ہوتی ہے ، برخلاف دیگر خوارق کے کیونکہ وہ کبھی رحمت ہوتے ہیں اور کبھی فتنہ ۔

ان باتوں کے سننے کے بعد یاد رکھو کہ جس قدر کہ ہم نے حضرت شیخ کی کرامات اور کشف دیکھے ہیں وہ احاطہ سے باہر ہیں لہٰذا ہم بیان کچھ تھوڑے سے ذکر کرتے ہیں ۔

دوسری کرامت

شیخ سے ابھی میری ابتداءِ معرفت ہی تھی کہ میرا ایک بیٹا مر گیا اس کی والدہ کو اس کا بہت غم ہوا ۔ اس سے پہلے ایک اور بیٹا مر چکا تھا میں نے اسے تسلی دینی شروع کی اور کہا میں نے خانقاہ مخفیہ کے بزرگ احمد بن عبداللہ کو کہتے ہوتے سنا کہ جب میں بچوں کو

---

[1] ابن حجرؒ : ابن حجر عسقلانیؒ صحیح بخاری کے مشہور شارح ہیں ۔ شرح کا نام فتح الباری ہے جس کا ذکر کئی بار اس کتاب میں آیا ہے انہوں نے بہت سی کتابیں لکھیں جن میں سے ایک اصابہ فی تمیز الصحابہؓ ہے ۔ ۸۵۳ھ : ۱۴۴۹ء میں وفات پائی ۔

[3] قرون ثلاثہ سے مراد صحابہ و تابعین اور تبع تابعین کا زمانہ ہے ۔

[2] لیثؒ : لیث بن سعد ابو الحارثؒ ۔ یہ اہلِ مصر کے فقیہ تھے ۔ ۹۴ھ : ۷۱۱ء میں مصر میں پیدا ہوئے ۔ بہت سی مخلوق نے ان سے روایتِ حدیث کی ۔ بہت بڑے مالدار تھے مگر کبھی زکوٰۃ فرض نہیں ہونے دی یعنی سب کچھ صدقہ و خیرات میں دے دیتے ۔ ۱۵۷ھ : ۷۷۲ء میں وفات پائی ۔

[4] امام ناصرالدین علی بن محمد بن المنیر اسکندرانی انہوں نے دس ضخیم جلدوں میں بخاری کی شرح لکھی ہے اور ابن بطال کی شرح پر حواشی لکھے ہیں ان کی ایک اور کتاب انتصاف ہے ۔

[5] ابوالحسن شاذلی فرماتے ہیں ایمان اور اتباعِ سنت سے بڑھ کر کوئی کرامت نہیں ہو سکتی جسے یہ حاصل ہو جائے اور پھر وہ کسی اور چیز کے پیچھے پھرنے لگے تو وہ مغتری اور کذاب ہے (لواقح الانوار فی طبقات الاخیار ج ۲ : ۶)

دیکھتا ہوں اور ان پر آئندہ اُترنے والی مصیبتوں کو دیکھتا ہوں تو ان پر مجھے رحم آتا ہے، لیکن جو بچے مر جاتے ہیں وہ ان مصائب سے بچ جاتے ہیں اور تمہارا بچہ بھی مر گیا ہے لہٰذا وہ آئندہ کی مصیبتوں سے بچ گیا) یا اسی طرح کی اور باتیں کہیں جن سے اسے تسلی ہو جاتے اور اسے صبر آجاتے۔ دوسرے دن صبح کے وقت میں حضرت کی خدمت میں گیا۔ فرمایا:

تم نے کل رات اپنی بیوی سے ایسی ایسی بات کہی اور جو قول میں نے احمد بن عبداللہ کا نقل کیا تھا وہی دہرایا، میں سمجھ گیا کہ جو بات گھر کے اندر مجھ سے واقع ہوئی اسے انہوں نے کشف سے معلوم کر لیا ہے۔

تیسری کرامت

حضرت ممدوح سینے کی کسی تکلیف کے سبب لونگ کھایا کرتے تھے، لہٰذا ان سے لونگ کی خوشبو آیا کرتی تھی جب میں ان کے پاس دن کے وقت ہوتا تو اسے اکثر سونگھا کرتا جب آپ سانس لیتے تو لونگ کی خوشبو سانس کے ساتھ بھی آیا کرتی، پھر جب میں رات کو اپنے گھر میں ہوتا تو یہی خوشبو مجھے رات کو بھی آتی رہتی حالانکہ دروازے بند ہوتے اور حضرت ممدوح راس الجنان کے محلہ میں ہوتے اور میرا مکان بکر نقر کے محلہ میں تھا اور یہ خوشبو کئی بار ہمیں آتی۔ میں نے اس پر غور کیا اور اپنی بیوی سے اس کا ذکر کیا۔ اسے بھی حضرت سے بڑی محبت تھی اور اسی طرح حضرت کو بھی اس سے بڑی محبت تھی۔ ایک مدت دراز تک یہ خوشبو آتی رہی۔ ایک دن میں نے حضرت سے ذکر کیا کہ آپ کی خوشبو رات کے وقت ہمیں آتی ہے اور ہم اکثر اُسے سونگھتے رہتے ہیں۔ کیا آپ ہمارے پاس ہوتے ہیں؟ فرمایا "ہاں" میں نے ہنسی کے طور پر کہا کہ میں خوشبو کو پکڑنے کے بہانے آپ کو پکڑ لیا کروں گا۔ انہوں نے بھی ہنسی میں جواب دیا میں گھر کے کسی اور گوشہ میں ہوں گا۔ ایک بار پھر میں نے خوشبو کا ذکر کیا؛ تو فرمایا یہ تو سونگھتا ہوا، شوق کہاں ہے۔

ایک مرتبہ مجھے فرمایا۔ میں نہ دن کو نہ رات کو تم سے جُدا ہوتا ہوں۔

ایک اور بار فرمایا: اگر ایک گھنٹے میں پانچ سو مرتبہ تمہارا خیال نہ کرتا ہوں تو تم مجھے خُدا کے ہاں پکڑ لینا۔

ایک بار میں نے عرض کیا اے میرے آقا میں نے خواب میں اپنے آپ کو اور آپ کو ایک ہی کپڑے میں دیکھا ہے۔ فرمایا یہ تو سچا خواب ہے۔ آپ کا اشارہ اس بات کی طرف تھا کہ وہ کبھی بھی نہ دن میں نہ رات مجھ سے جُدا نہیں ہوتے۔

ایک بار فرمایا: آج رات تمہارے پاس آؤں گا، ذرا دھیان رکھنا۔ جب رات کا آخیر ہوا

اور مَیں کچھ سو رہا تھا، کچھ جاگ رہا تھا، تو آپ آ گئے۔ جب آپ قریب آئے تو مَیں نے آپ کا ہاتھ پکڑ لیا اور بوسہ دینے کا ارادہ کیا۔ جب میں نے آپ کے ہاتھ اور سر کو بوسہ دیا تو آپ غائب ہو گئے۔

چوتھی کرامت ایک بار سُلطان نے فرمان جاری کیا اور دو قاصد بھی ساتھ بھیجے تاکہ میں مکناسہ جا کر الریاض کی جامع مسجد میں امامت کراؤں۔ اس سے مجھے اس قدر پریشانی ہوئی جس کا علم صرف اللہ ہی کو ہے۔ حضرت کو اس کا علم ہوا، تو فرمایا۔ ڈرو نہیں، جب تم مکناسہ جاؤ گے تو میں بھی تمہارے ساتھ جاؤں گا، لیکن ڈرنے کی کوئی بات نہیں، جو بات سُلطان چاہتا ہے وہ نہ ہوگی میں ان دونوں قاصدوں کے ساتھ مکناسہ گیا۔ اللہ کی مرضی سے معاملہ خیر سے گذر گیا اور اسی طرح ہوا جس طرح کہ شیخ نے فرمایا تھا، میں فاس (فیض) میں اپنے گھر واپس آ گیا۔ جب میرے خُسر فقیہ محمد بن عمر نے میری آمد کا سنا تو مجھے لکھا: تم مکناسہ گئے اور سُلطان سے نہ ملے اور نہ باقاعدہ استعفا دیا، معلوم نہیں تم پر کیا عتاب نازل ہو۔ مناسب ہے کہ فوراً مکناسہ واپس جاؤ اور سلطان سے ملو۔ اور مسجد مذکور کی امامت پر رضامندی کا اظہار کرو۔ اس کے سوا کسی اور راستے پر عمل نہ کرنا۔ مَیں خط لے کر شیخ کے پاس آیا۔ فرمایا: اپنے گھر بیٹھے رہو۔ کسی قسم کا خطرہ نہیں اور ایسا ہی ہوا جیسا کہ شیخ نے فرمایا تھا۔

یہ ایک عجیب و غریب کرامت ہے۔ اگر میں حکایت کو کھول کر بیان کر دوں تو اس کا انوکھا پن ظاہر ہو جائے۔ یہاں تک کہ مَیں نے ایک قریبی دوست کو کہتے سنا کہ ہم نے اس سے عجیب تر بات نہیں دیکھی۔ سُلطان نے تمہیں بلا بھیجا اور تاکید بھی کی اور اپنے دو قاصد بھی بھیجے جو تمہیں لے کر آئے۔ پھر تم نے اُس سے ملاقات بھی نہیں کی اور سلطان کی پروا کئے بغیر فاس واپس چلے گئے۔ یہ عجیب بات ہے اور یہ سب حضرت کی برکت تھی۔

پانچویں کرامت میری بیوی حاملہ تھی۔ حضرت نے فرمایا: لڑکا ہوگا۔ جب نواں مہینہ ہوا اور اس کی عادت نویں مہینہ کی ابتدا میں بچہ جننے کی تھی۔ اسے درد اُٹھا ہم نے سمجھا کہ دردِ زہ ہے۔ حضرت نے فرمایا کہ یہ درد تو کسی اور مرض کا درد ہے۔ ولادت تو ابھی دور ہے۔ چنانچہ جیسا حضرت نے فرمایا تھا ویسا ہی ہوا۔

چھٹی کرامت ایک دفعہ مولانا محمد مَیّارہ سے میری ملاقات ہوئی اور انہوں نے حضرت شیخ کے لیے چار مُوزونے دیے۔ اس کے بعد مجھے حضرت نے فرمایا محمد میّارہ بڑی چیز ہیں جیب میں ہاتھ ڈالا تو بُرے مُوزُونے نکلے لہٰذا ان کو لوٹا کر دوبارہ اچھے مُوزُونے نکالے اور ہمیں دیئے۔

میں مولانا محمد میارہ سے ملا تو حضرت کا فرمان بیان کیا۔ کہا بالکل ٹھیک ہے پہلے کھوٹے موزو نے نکلے تھے میں نے ان کو لوٹا دیا اور پھر کھرے نکال کر پیش کئے۔

فقیہ مذکور سے ایک روز باتیں ہو رہی تھیں کہ ایک شخص کا ذکر ہوا جس کے بارے میں فقیہ مذکور اچھی رائے رکھتے تھے۔ ان کے متعلق جو میں جانتا تھا وہ میں نے ذکر کر دیا۔ شیخ نے فرمایا جب تو نے اس شخص کے متعلق باتیں بیان کیں تو فقیہ مذکور کی انتڑیاں بھی پیٹ میں نیک نیتی کی وجہ سے لرزنے لگ گئی تھیں۔ جب میری ملاقات فقیہ مذکور سے ہوئی تو حضرت کا قول نقل کیا۔ کہا آپ نے سچ فرمایا ہے ایسا ہی ہوا تھا۔

ساتویں کرامت

حضرت کا صاحبزادہ ادریسؒ سخت بیمار پڑ گیا، جس سے ان کی والدہ سخت فکرمند ہوئیں۔ ایک دن میں مغرب کے بعد گیا تو دیکھا کہ مرض کی شدت کی وجہ سے وہ کلام بھی نہ کر سکتا تھا۔ مجھے بھی فکر دامن گیر ہوئی۔ جب نکلا تو حضرت نے فرمایا کہ یہ اس مرض سے نہیں مرے گا اور یہ عنقریب صحت یاب ہو گا۔ جیسا حضرت نے فرمایا تھا ویسا ہی ہوا۔

اسی طرح کا واقعہ اُن کی بیٹی فاطمہ سے پیش آیا وہ بیمار پڑ گئی اور بیماری نے طول پکڑا حضرت نے مجھ سے فرمایا یہ مرے گی نہیں، عنقریب صحت یاب ہو گی اور ایسا ہی ہوا۔

اسی طرح میں حضرت کے ساتھ محمد میارہ کے بیٹے کی عیادت کے لیے گیا اور وہ سخت بیمار تھا حضرت نے فرمایا وہ اس مرض سے نہیں مرے گا اور ایسا ہی ہوا۔

اسی طرح حاجی محمد بن علی بن عبدالعزیز بن علی المرابطی السجلماسیؒ کا بیٹا بیمار پڑ گیا اور باپ بیٹے کی حیات سے مایوس ہو گیا۔ میں نے اس کا ذکر حضرت سے کیا جب کہ ہم جامع اندلس میں سے جمعہ کی نماز پڑھ کر نکل رہے تھے اور باب الفتوح کی طرف جا رہے تھے۔ حضرت نے فرمایا: کوئی بات نہیں۔ اس کی والدہ تو نہیں چاہتی کہ اس کا بیٹا مرے، اگر مر گیا تو ماں پر پہاڑ ٹوٹ پڑے گا۔ لہٰذا یہ نہیں مرے گا۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ یہ سب لوگ آج تک زندہ ہیں اور آج ۲۲ ربیع الاول ۱۱۳۰ھ ہے۔

آٹھویں کرامت

ایک مرتبہ ہم قطب زماں عبدالسلام[۱]ؒ بن مشیش کی زیارت کے لیے گئے ہم حضرت کے پاس ظہر کی نماز کے وقت پہنچے۔ ہمارا خیال تھا کہ آپ ہمیں اپنے پاس ٹھہرائیں گے، لیکن آپ نے فرمایا: سواریوں سے نہ اترنا۔ ہم شیخ کی زیارت کر کے ابھی واپس آتے ہیں۔ میں

---

[۱] عبدالسلام بن مشیشؒ: ابوالحسن شاذلیؒ کے پیر تھے۔ ابوالطواجن نے بلاد مغرب میں انہیں قتل کر دیا تھا۔ (شعرانی: ۲:۶)

آپ کے ساتھ پہاڑ پر چڑھ کر شیخ عبدالسلام کے مزار کی زیارت کے لیے گیا۔ کہنے لگے کیسی زیارت رہی اور کیا دعا مانگی۔ میں نے عرض کیا کہ اس بار تو میں محض آپ کے لیے دعا مانگتا رہا۔ جب سے زیارت کیلئے بیٹھا ہوں میں آپ ہی کے لیے دعاء خیر کر رہا ہوں اور میں نے کہا اوروں کا تو ذکر ہی کیا، اپنے لیے بھی دعا نہیں مانگی، حضرت نے فرمایا اسی طرح میں نے صرف تمہارے لیے دعا کی ہے کسی اور کے لیے نہیں کی۔ مجھے اس سے انتہائی خوشی ہوئی۔ وَلِلّٰہِ الْحَمْدُ۔

پھر ہم پہاڑ سے اترے تو ہمیں شہر تطاون جانے کا حکم فرمایا۔ میں نے عرض کیا شہر تو دُور ہے ہم وہاں تک نہ پہنچ سکیں گے، لیکن جو آپ فرمائیں وہی کیا جائے گا۔ آپ نے اصرار سے کہا تو ہم سمجھ گئے کہ آپ صحیح بات ہی فرماتے ہیں۔ ہم سواریوں پر سوار ہوئے اور صبح طلوع ہونے تک چلتے رہے اور شہر تطاون میں داخل ہوئے۔ بس شہر میں گھسنا تھا کہ آسمان نے پکھالیں کھول دیں اور اس قدر زور کی بارش ہوئی کہ الٰہی پناہ۔ دو دن تک بارش جاری رہی۔ حضرت مجھے لے کر اس گھر کی چھت پر گئے جہاں ہم ٹھہرے ہوئے تھے۔ ابھی بارش ہو رہی تھی، فرمانے لگے کیا دیکھ رہے ہو، کس قدر زور کی بارش ہو رہی ہے۔ میں نے عرض کیا جی ہاں۔ فرمایا اسی لیے تو میں نے تمہیں رات بھر چلایا تھا کیونکہ جب میں عبدالسلام کے مزار پر پہنچا تھا تو میں نے اُسے دیکھ لیا تھا اگر ان سیڑھیوں میں یہ بارش آ کر ہمیں گھیر لیتی تو ہمارا کیا حشر ہوتا۔ نہ ہمارے کھانے کے لیے کچھ ہمارے پاس تھا نہ جانوروں کے کھانے کے لیے اور یہ بارش متواتر رہتی۔ میں نے عرض کیا پھر تو اگر موت سے بچ جاتے تو ہر طرح کی مشقت اٹھانی پڑتی۔ اس کے بعد میں نے آپ کا ہاتھ چوما اور عرض کیا اللہ آپ کو جزاء خیر دے۔ جب دو دن کے بعد ہم تطاون سے نکلے تو ابھی بارش انتہائی زور کی ہو رہی تھی۔ میں نے عرض کیا کہ ہم بارش سے ہی بھاگے تھے اور پھر اُسی کی طرف لوٹ رہے ہیں لیکن آپ خاموش رہے پھر ہم نکلے اور جانوروں کے لیے جَو خریدنے کا ارادہ کیا حضرت نے منع فرما دیا۔ آخر اسی زور کی بارش میں ہم نکل پڑے۔ ابھی ایک دو میل ہی چلے ہوں گے کہ بادل پھٹ گئے، ہوا ٹھہر گئی اور سورج نکل آیا اور موسم اچھا ہو گیا۔ ہمیں اس پر بڑا تعجب ہوا۔ پھر جب عصر کا آدھا وقت گزر گیا تو ہم نے عرض کیا کہ حضرت سواریوں کا چارہ کہاں ہے؟ آپ نے رفقاء سے پوچھا کہ آبادی کتنی دور ہے، معلوم ہوا کہ اس قدر دور ہے کہ آدھی رات سے پہلے وہاں نہیں پہنچ سکتے لیکن آپ خاموش رہے اور ہم بھی ہر بات پر آپ کو لبیک کہتے تھے۔ جب مغرب ہوئی تو فرمایا دائیں طرف مڑ چلو۔ چنانچہ ہم راستہ چھوڑ کر دائیں طرف کو ہو لیے۔ ابھی تھوڑی دُور ہی گئے تھے کہ غلہ کے

کھلیان نظر آئے جنہیں ابھی رَوندا نہ گیا تھا اور پاس ہی ایک پانی کا چشمہ بھی تھا۔ فرمایا یہاں اُتر جاؤ۔ خدا نے جانوروں کو چارہ بھیج دیا ہے۔ ہم نے ضرورت کے مطابق کھلیان میں سے لے لیا اور بڑے آرام سے رات گزاری۔ جب عشا کا وقت قریب آیا تو کھلیان کا مالک آیا اور ہمیں دیکھ کر نہایت خوش ہوا۔ شیخ نے جس قدر کہ جانوروں نے کھایا تھا اس سے زیادہ قیمت ادا کر دی۔ اس پر کھلیان کا مالک بہت ہی زیادہ مسرور ہوا اور رات بھر ہمارے پاس رہا اور ہمارے ساتھ ہی کھانا کھایا اور ایسا بن گیا گویا ہمارا ساتھی ہے۔

اسی طرح کا واقعہ ایک بار اور پیش آیا۔ ہم شیخ عبدالسلامؒ مذکور کی قبر کی زیارت کے لیے جا رہے تھے اور ابھی وہاں پہنچے نہ تھے جب بنی زکار کی گھاٹی کو عبور کر لیا تو عصر کا وقت نکل چکا تھا۔ جو لوگ ہم سے پہلے اس گھاٹی کو عبور کر چکے تھے وہ پڑاؤ ڈال چکے تھے۔ ہم نے عرض کیا کہ حضرت جو لوگ ہم سے پہلے آئے تھے وہ تو پڑاؤ ڈال چکے ہیں۔ فرمایا چلتے جاؤ۔ ہم نے پھر عرض کیا حضرت چلیں کیسے ؟ نہ ہمیں راستہ معلوم، نہ کوئی راستہ بتانے والا ہمارے ساتھ، فرمایا پھر بھی چلے چلو۔ چنانچہ ہم چلتے گئے اور اُن لوگوں کو جو پڑاؤ ڈال چکے تھے، وہیں چھوڑ بغیر کسی راہنما کے چل پڑے، ہم چلتے رہے اور اللہ تعالیٰ ہمارے دل میں ڈال دیتا کہ اس راستہ پر چلو، یہاں تک کہ پانی کے ایک چشمے پر پہنچے جس کے پاس ہی غلّے کے کھلیان تھے۔ ہم کھلیانوں کے مالک سے ملے اس نے ہمیں وہاں ٹھہرنے کے لیے کہا اور ہم نے بڑے آرام سے رات گذاری، ہمارے جانور رات بھر بھوسہ کھاتے رہے اور جو قافلہ ہم سے پہلے گھاٹی پر اُترا تھا ان کے جانوروں کو رات بھر بھوسہ نہ ملا۔

اس سفر میں حضرت کی زبان مبارک سے بڑے بڑے دقائق و حقائق سُننے میں آئے، اُن میں سے اکثر کا ذکر ہم نے اس کتاب میں کر دیا ہے۔ حضرت ممدوح جب شہروں کا ذکر فرماتے تو ناواقف آدمی یوں سمجھتا کہ حضرت نے ان مقامات کا ضرور سفر کیا ہے حالانکہ وہ محض کشف ہوتا۔ اکثر آپ دُور دُور کے مقامات کا سفر بغیر رہبر کے کرتے اور ایسے چھوٹے راستوں پر چلتے جن کا اکثر لوگوں کو علم نہیں۔

ایک دن فقیہ علی بن عبداللہ الصباغی رحمۃ اللہ سے جن کا گھر شہر فاس سے چار منزل پر موضع صباغات میں تھا، فرمایا کہ ایک بار میں گھوڑ سواروں کی جماعت کے ساتھ نکلا اور فلاں فلاں موضع پر پہنچے۔ حضرت نے اس جگہ کا نام بھی بتایا اور اُس کی صورت و کیفیت بھی بتائی اور میں تمہارے مرشد کے پاس بھی گیا۔ پھر ان کا حُلیہ اور ان کے گھر کی ایسی کیفیت بیان کی جیسے کہ وہ ان کی

نظروں کے سامنے ہے اور گھوڑوں پر سوار ہونے کا ذکر محض کشف کو چھپانے کے لیے کیا تھا۔ شیخ علی فرماتے ہیں کہ حضرت نے بغیر کم و کاست اس طرح بیان کیا گویا یہ اُن کی آنکھوں کے سامنے ہے۔ پھر فرمایا: جہاں تم گھوڑے باندھتے ہو، وہاں ایک ولی کبیر کی قبر ہے، وہاں گھوڑے مت باندھا کرو۔ اس کے بعد انھوں نے تحقیق کی تو اسے سچ پایا اور اس جگہ مزار بنا دیا گیا۔

مَیں نے حضرت کو یہ بھی فرماتے ہوئے سنا کہ وہ ولی ہمارے آباء میں سے ہیں یعنی غوث تھے اور یہ بات واضح طور پر فرمائی۔

ایک روز میں آپ کے پاس بیٹھا ہوا تھا کہ ایک شخص زا سے آیا جو ایک مشہور بستی ہے آپ نے پوچھا کہاں سے آئے ہو؟ جواب دیا کہ زا سے۔ حضرت اس بستی کا حلیہ اور اس کے مقامات و علامات بیان فرمانے لگے اور وہ شخص آپ کی تصدیق کرتا اور یوں سمجھتا رہا کہ حضرت وہاں جا چکے ہیں۔ جب وہ شخص اُٹھ گیا تو میری طرف متوجہ ہو کر فرمایا کہ لوگ کشف کو پسند کرتے ہیں حالانکہ اس میں خود ولی کے لیے اور طالبِ کشف کے لیے بھی بڑی مُضرّت ہے۔ ولی کے لیے ضرر تو اس لیے ہے کہ اس میں ولی مشاہدۂ حق کو چھوڑ کر مشاہدۂ خلق کی طرف آتا ہے اور یہ چوٹی سے نیچے اُترنے کی مثال ہے کشف چاہنے والے کے لیے اس لیے کہ کشف و کرامت کا طالب وہی ہوتا ہے جس کی محبت سرسری ہوتی ہے اور جب ولی نے اس کا ساتھ دیا تو گویا اُسے اسی اندھے پن پر رہنے دیا۔ ان دونوں باتوں کی تشریح انشاء اللہ آئندہ کتاب میں آئے گی۔

نویں کرامت

سادات میں سے ایک شخص مجھ سے علوم دقیقہ میں سے کوئی علم پڑھا کرتا تھا اور میں اپنی بساط کے مطابق اس کی تشریح کر دیا کرتا اور اسے بہت پسند آتی اور کہتا کہ کوئی فقیہ آپ جیسی تشریح نہیں کر سکتا۔ ایک بار میں اس کتاب کی تشریح کر رہا تھا کہ ایسا مسئلہ آ گیا جس میں مصنف نے اسرارِ الٰہیہ میں سے کسی ایک سِرّ کی بحث کی تھی اس سید نے مجھ سے اس کا مطلب پوچھا۔ مَیں نے لاعلمی ظاہر کی کیونکہ افشاءِ سِرّ سے ڈر لگتا تھا، لیکن اس کا شوق بڑھتا رہا اور میں نے کہا: اللہ کی قسم جب تک تو یہ وعدہ نہ کرے کہ جو کچھ تو مجھ سے سنے گا، اس کا کہیں بھی ذکر نہ کرے گا نہ اپنے سے، نہ بیگانے سے، تب تک تشریح نہ کروں گا۔ اس نے وعدہ کیا اور میں نے مطلب بیان کر دیا اور تمام اعتراضات جو پیدا ہوتے تھے اُن کا بھی جواب دے دیا۔ یہاں تک کہ مسئلہ آفتاب کی طرح واضح ہو گیا۔ اس پر وہ بہت خوش ہوا۔ مَیں نے اُسے کہا دیکھو اگر ہمارے حضرت سے ملنے کا اتفاق ہو اور پھر اس مسئلہ کا ذکر چھڑ جائے اور وہ تشریح فرمانے لگیں

توتم لاعلمی ظاہر کرنا اور ایسا بھولا بننا کہ گویا تم نے یہ مسئلہ کبھی سنا ہی نہیں، اُس نے یہ بھی وعدہ کر لیا پھر اتفاق سے اسی دن حضرت سے ملاقات ہوگئی تو سب سے پہلی بات آپ نے یہی کی کہ فلاں سیّد سے تم نے یہ گفتگو کی اور وہ مسئلہ بھی ذکر فرما دیا میں نے عرض کیا ہاں، لیکن میری نیّت نیک ہی تھی اس کے بعد میں حضرت کے خاطرِ مبارک کو ٹٹولتا رہا کہ کہیں ناراض تو نہیں ہیں مگر الحمدللہ آپ کی خاطرِ مبارک کو دودھ کی طرح صاف پایا۔

حضرت کے کشف لاتعداد ہیں۔ ان کی کرامات کا ذکر کرنے کو تو ایک مستقلِ تالیف کی ضرورت ہے اور حق بات یہ ہے کہ جو کچھ اس کتاب میں ہے وہ انہی کی کرامات ہیں۔

دسویں کرامت

یہ بھی آپ کی کرامت تھی کہ آپ کے کلام کا لوگوں کے دلوں پر اثر ہوتا تھا۔ ایک دن ایک فقیہ آپ کے پاس آیا اور آپ سے درخواست کی کہ حضور دُعا فرمائیں کہ میرے دل میں وسوسے نہ آیا کریں۔ فرمایا وسواس تو اُسی وقت ہوتا ہے جب راستہ سے بے خبری ہو۔ اگر کوئی شخص کسی شہر کا راستہ نہ جانتا ہو اور اس شہر کا سفر اختیار کرے تو وسوسے تو ضرور آئیں گے۔ کبھی خیال آتے گا کہ راستہ اِدھر کو ہے اور وہ اِدھر چل پڑے گا، پھر خیال آئے گا کہ نہیں راستہ اُدھر کو ہے اور وہ حیران و پریشان رہ جائے گا کہ کدھر کو جاوٴں اور جو شخص راستہ کو جانتا ہو وہ راستہ پر بغیر تردّد کے چلا جائے گا۔ پس دنیا و آخرت کا راستہ چونکہ ذاتِ حق ہے اس لیے جس نے اس راستہ کو معلوم کر لیا، اس نے دنیا و آخرت کی بھلائی حاصل کر لی، خدا اسے عمدہ زندگی عطا کرے گا اور جو اس سے ناواقف ہوگا وہ اس کے برعکس ہوگا آپ سے یہ الفاظ سن کر میری یہ کیفیت ہوگئی کہ جب طبیعت کسی ضرورت کے پورا کرنے میں غیراللہ کی طرف جاتی تو ایک اندرونی کشش اُسے پھیر کر اللہ کی طرف لے آتی۔ اللہ سے دعا ہے کہ معرفت کو اتمام تک پہنچائے۔

آپ نے ایک مرتبہ فرمایا "مومن جب سوتا ہے تو اللہ ہی کے دھیان میں سوتا ہے اور جب جاگتا ہے تو اللہ ہی کے دھیان میں جاگتا ہے۔ یہ بات سنکر اُس کا مفہوم میرے قلب میں اُتر گیا اور الحمدللہ کہ سوتے وقت بھی اللہ میرے دل میں ہوتا ہے۔

ایک مرتبہ فرمایا کہ بندہ کا خیال جب غیراللہ کی طرف جاتا ہے تو اللہ جَلَّ جَلَالُہٗ سے بے تعلق بن جاتا ہے، پھر فرمایا کہ بعض لوگ ایسے ہیں کہ ایک دن میں اللہ کی طرف لوٹ آتے ہیں کوئی دوپہر بعد اور کوئی اس سے بھی کم وقت میں اور کوئی اس سے زیادہ وقت میں۔ لہٰذا بندے کو دیکھنا چاہیئے کہ اُس کے دل کا تعلق اللہ کے ساتھ کیسا ہے"۔

آپ کے ان الفاظ نے میرے دل کے لیے لگام کا کام کیا۔ جب کبھی میرا دل غفلت کے سمندر میں آزاد پھرنا چاہتا تو یہ کلام اُسے کھینچ لیتا۔

اللہ کی معرفت سے پہلے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلّم کی معرفت ضروری ہے

ایک بار آپ نے فرمایا کہ جب تک سیّد الوجود صلعم کی معرفت حاصل نہ ہو اُس وقت تک اللہ کی معرفت حاصل نہیں ہوسکتی اور شیخ کی معرفت کے بغیر سیّد الوجود صلّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم کی معرفت حاصل نہیں ہوتی اور شیخ کی معرفت اس وقت تک حاصل نہیں ہوسکتی جب تک تمام مخلوقات مرید کی نگاہ میں فنا نہ ہوجاوے۔ نہ کسی پر نظر جاتے نہ خیال۔ لہٰذا سب کو مُردہ سمجھے اور سب کی طرف سے تمام توقعات کو منقطع کرلے۔

آپ کے اس کلام سے اللہ نے مجھ پر بڑا کرم کیا۔ ہر قسم کی خیر و خوبی نصیب ہونے کا یہی وسیلہ بنا۔

اس کلام کی تشریح بڑی لمبی ہے اگر اس کے پیچھے پڑیں تو بڑی دور نکل جائیں۔ اس لیے جتنا ذکر کردیا اتنا ہی کافی ہے۔

میں نے اپنے برادرانِ طریقت سے درخواست کی تھی کہ حضرت ممدوح کی کچھ کرامات جو انہوں نے دیکھی ہوں مجھے لکھ بھیجیں۔ چنانچہ ان تحریروں میں ایک تحریر محمد بن احمد بن حنین الزیراری کی بھی تھی انہیں میں نے حضرت کو پیش کیا۔ آپ نے اُن کی تصدیق فرمائی۔

وہ کرامات و کشوف جو محمد بن زیراری سے دربیش آئیں

اللہ کے احسانات میں سے ایک فضل یہ ہے کہ جب میری ملاقات غوث زماں عبدالعزیز بن مسعود سے ہوئی۔ اس وقت میرا دل تجارت، زراعت وغیرہ دُنیوی امور میں لگا ہوا تھا، چنانچہ اس کے لیے مجھے بہت کاوش کرنی پڑی۔ دھیان دُنیا کی طرف لگا رہتا اور آخرت کا خیال محض ایک خواب تھا۔ مجھے اللہ تعالیٰ نے کچھ علم بھی عطا کیا تھا میں نے ارادہ کرلیا کہ محکمہ شہادت کی افسری اختیار کرلوں یا قاضی کا عہدہ حاصل کرنے کی کوشش کروں۔ والعیاذ باللہ، لیکن خدا نے مجھ پر رحم کیا اور اُن سے ملاقات کرادی اور اللہ نے میرا دل پاک کردیا۔ یہ آپ ہی کی برکت اور حسنِ سیاست کی وجہ سے تھا کیونکہ جب اُن سے ملا ہوں اور اُن سے بیعت ہوا اور جو مرض مہلک مجھے لگا ہوا تھا اُسے آپ نے دریافت کرلیا تو مجھے حکم ہوا کہ کھیتی باڑی کے تمام بیل بیچ ڈالوں اور اُس سے فلاں فلاں

کام کروں اور انہوں نے وہ کام کرنے کو کہا جو دُنیوی اسباب کے منافی نہ تھا اور درحقیقت اُنکا مقصد اسباب دنیا کو میرے دل سے مٹانا تھا، اس امام کے حُسنِ سیاست کے قربان جائیں کہ جس حالتِ خبیثہ سے مجھے نکالنا چاہتے تھے تو ایسے نکالتے کہ مجھے خبر بھی نہ ہوتی اور میں اپنے آپ کو پہلی حالت سے زیادہ عُمدہ اور احسن حالت میں پاتا اور پہلی حالت کا خُبث اور تاریکی نمایاں طور پر ظاہر ہو جاتی - اس امام عظیم کا میرے ساتھ اور دیگر برادرانِ طریقت کے ساتھ یہی دستور رہا ہے - چنانچہ اگر کوئی قبیح بات آپ میں دیکھیں گے تو صراحتہً یہ نہ فرمائیں گے کہ اسے چھوڑ دو - یا یہ کہ اس پر تجھے بُرا بھلا کہیں یا یہ کہ اگر تو اس کام کو نہ چھوڑے تو تجھ سے بیزاری ظاہر کریں کیونکہ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ انسان کا نفس ان باتوں سے اِبا کرتا ہے اور پھر یہ مخالفت کا سبب بن جاتا ہے، بلکہ تجھ سے مہربانی سے پیش آئیں گے اور تیرے کام کی کسی حد تک تعریف بھی کر دیں گے، پھر آہستہ آہستہ تجھے اپنے ساتھ چلاتے یہاں تک کہ تو اپنے نفس کو ایسی حالت میں پاتا جس پر تو پہلے نہ تھا اور پہلی حالت کو قبیح سمجھتا اور اُس کے ساتھ تیرا سینہ کھل جاتا اور تجھے خوشی محسوس ہوتی - بیلوں کو بیچے ابھی چند دن ہی گزرے تھے کہ کھیتی کی محبت میرے دل سے نکل گئی بلکہ میں اُسے بُرا سمجھنے لگ گیا، پھر آپ نے تمام کتابوں کو بیچ دینے کا حکم دیا اور کہا کہ انہیں بیچ کر ایسا کام کروں جسے میرا دل چاہتا ہے اور جس سے مجھے خوشی ہوتی ہے - پھر اس کے بعد لوگوں سے مال کی طمع اور حرص نے میرا دامن پکڑا کہ اہلِ ثروت کی طرف نظر جاتی اور ان کے مال و دولت کو لالچ بھری نگاہوں سے دیکھتا، لیکن حضرت مجھے اس سے اور اُونچا لے گئے یہاں تک کہ طمع کا تو ذکر ہی کیا مجھے نہ لوگوں سے کچھ نفع نظر آتا نہ نقصان -

حضرت کا ایک کشف

ابھی ابتداءِ ملاقات ہی تھی کہ ایک دن مجھ سے پوچھا گیا تمہارے پاس کچھ گھی ہے ؟ میں نے عرض کیا ہاں بہت ہے ، فرمایا تھوڑا سا لے آنا - میں نے عرض کیا اچھا - میرے ایک پیر بھائی نے کہا : شاید کہ باقی ماندہ گھی ارزانی کے موسم تک نہ چل سکے ، میں نے کہا ، ہاں یہ صحیح ہے - حضرت نے فرمایا کیا باقی ماندہ گھی فلاں وقت تک چل جائے گا ؟ میں نے عرض کیا ہاں - فرمایا جتنا اس سے زائد ہو ، وہ لے آنا - چنانچہ میں لے آیا اور جب وہ وقت آیا تو ایک شخص جس کا مجھے وہم و گمان بھی نہ تھا مجھے لوجہ اللہ گھی دے گیا اور یہ گھی مجھے ارزانی کے موسم تک کافی ہو گیا -

دوسرا کشف

میں اپنی غلّے کی فصل کی فروخت میں آپ سے مشورہ کر لیا کرتا تھا تو ایک بار

فرمایا فلاں مہینہ کی پانچ تاریخ کو جو کچھ بیچنا ہے۔ بیچ دینا۔ جب وہ مہینہ آیا تو اس ماہ کی پانچویں اور چھٹی تاریخ کو غلے کی خوب فروخت ہوئی۔ لیکن جب ساتویں تاریخ ہوئی تو خوب بارش ہوئی جس سے غلہ سستا ہو گیا۔ والحمدللہ۔

تیسرا کشف ایک مرتبہ میری ایک بیوی حاملہ تھی۔ حضرت کی خدمت میں حاضر ہوا اور حمل کا ذکر کیا، فرمایا لڑکا ہوگا جس کا نام احمد ہوگا۔ میں نے آکر بیوی سے ذکر کیا اور ایسا ہی ہوا۔

پھر میری دوسری بیوی کو غیرت آئی کہ سوکن نے لڑکا جنا ہے اور ابھی اس کی گود میں ایک شیر خوار لڑکی تھی۔ جسے اُس نے قبل از وقت دودھ چھڑا دیا۔ اس امید پر کہ شاید حمل ہو جائے۔ میں نے اس پر اُسے ملامت بھی کی۔ کہنے لگی میں حاملہ ہوں اور مجھے بچی کا خطرہ تھا اور اس نے اس بات پر قسم بھی کھائی۔ جب حضرت کی خدمت میں پہنچا تو یہ قصہ بیان کیا۔ فرمایا جھوٹ کہتی ہے، حمل تو کچھ بھی نہیں ہے۔ میں نے واپس آکر کرید کی تو ایسا ہی پایا جیسا کہ حضرت نے فرمایا تھا۔ تین ماہ گذر جانے کے بعد پھر حاضر ہوا تو فرمایا کہو بیوی کو حمل ہے؟ میں نے عرض کیا حضرت مجھے تو علم نہیں ہے۔ فرمایا پندرہ دن سے حمل قرار پا چکا ہے اور انشاء اللہ لڑکا ہوگا، اس کا نام میرے نام پر عبدالعزیز رکھنا اور اس کی شکل بھی انشاء اللہ میری جیسی ہوگی۔ میں نے واپس آکر بیوی کو خبر دی۔ وہ خوش ہوئی۔ چنانچہ لڑکا پیدا ہوا اور اس کا چہرہ حضرت سے مشابہ تھا۔

چوتھا کشف میری پہلی بیوی کو پھر حمل ہوا۔ میں نے حضرت سے حمل کی نسبت سوال کیا۔ فرمایا بیٹی ہوگی اس کا نام میری والدہ کے نام پر (فارحہ) رکھنا اور ایسا ہی ہوا۔ ہمارے ہاں ایک اور لڑکی آگئی اور اس کا نام حضرت کی والدہ کے نام پر فارحہ رکھا۔

پانچواں کشف ایک روز میں آپ کے پاس بیٹھا تھا اور مجھ سے خوش طبعی کر رہے تھے فرمایا کیا تم نے فلاں کام کیا اور وہ ایک معصیت کا کام تھا۔ میں نے عرض کیا کہ میں نے نہیں کیا۔ دوسری بار کہا، پھر تیسری بار کہا، لیکن جب چوتھی بار کہنے لگا اور سوچا تو معلوم ہوا کہ پندرہ سال گذرے ایک دُور دراز کے علاقہ میں جو فاس سے سات منزل پر ہے میں نے وہ کام کیا تھا۔ مجھے شرم آگئی اور آپ سمجھ گئے۔ فرمایا اب بھی قسم کھا کر کہو گے؟ میں نے عرض کیا نہیں اور آپ کے ہاتھ پر بوسہ دیا اور عرض کی حضرت آپ کو کیسے اس کا علم ہو گیا؟ فرمایا کیا کوئی چیز اللہ سے مخفی ہو سکتی ہے اور یہی حال ان لوگوں کا ہے جنہیں اللہ اپنے اسرار پر مطلع کر دے۔ پھر آپ نے چند

ایسی باتیں بتلائیں جو اس کام سے پہلے اور بعد کی تھیں۔ اس پر مَیں نے آپ کے ہاتھ پر نیک نیتی سے توبہ کی۔ والحمد للّٰہ۔

چھٹا کشف ایک روز آپ کے سامنے کے رُخ پر بیٹھا تھا اور آپ اپنے داہنے ہاتھ پر ٹیک لگائے خواب و بیداری کے درمیان لیٹے ہوئے تھے کہ میرے دل میں ایک بُرا خیال آیا۔ والعیاذ باللہ۔ فوراً آپ نے آنکھیں کھولیں اور فرمایا کیا کہا؟ میں نے عرض کیا حضرت میں نے تو کچھ نہیں کہا۔ فرمایا اپنے دل میں تم نے کیا کہا؟ مجھے بڑی شرم آئی اور مَیں نے توبہ کی۔

ساتواں کشف ایک رات خلوت میں اپنی بیوی کے ساتھ محبّت کر رہا تھا اور وہ چت لیٹی ہوئی تھی کہ اس کی شرمگاہ پر مَیں نے قصداً نظر ڈالی، جب اُن کی زیارت کے لیے آیا اور حالانکہ میرے اور ان کے درمیان دو منزل کا فاصلہ تھا، مزاح کے طور پر فرمانے لگے: اے علماء دین عورت کی شرمگاہ کی طرف دیکھنا کیسا ہے؟ مَیں نے علماء کا قول نقل کر دیا (کہ مکروہ ہے) فرمایا کیا تم ایسا کرتے ہو؟ میں نے عرض کیا نہیں، اس لیے کہ میں اپنا واقعہ بھول گیا تھا۔ فرمایا حتیٰ کہ فلاں رات بھی نہیں کیا؟ مجھے اپنا فعل یاد آگیا اور مجھے شرم آگئی۔ فرمایا پھر ایسا نہ کرنا۔ اپنی نظر کعبہ کی طرف لگائے رکھو۔ انشاء اللہ

آٹھواں کشف ایک مرتبہ کسی عُذر کی بنا پر دونوں بیویاں اپنے اپنے گھر میں نہ سو سکیں اور انہیں میں نے ایک ہی گھر میں ایک رات جمع کیا، دونوں الگ الگ بستر پر سو گئیں اور میں الگ بستر پر سو گیا۔ اور ایک چوتھا بستر خالی رہا جس پر کوئی نہ سویا۔ رات کو جماع کی خواہش ہوئی اور یہ خیال کر کے کہ دوسری سو رہی ہے۔ ایک سے جماع کیا پھر جب آپ کی زیارت کیلئے آیا اور باوجود بُعد مسافت کے میں اکثر آپ کے پاس آیا کرتا تھا۔ آپ نے مجھ سے مزاحاً فرمایا کہ لوگوں کی اس مسئلہ میں کیا رائے ہے کہ ایک شخص دو بیویوں کو ایک ہی مکان میں جمع کر کے ایک سے جماع کرے، مَیں سمجھ گیا کہ آپ کا اشارہ میرے فعل کی طرف ہے میں نے عرض کیا کہ حضرت آپ کو اس کا کیسے علم ہوا فرمایا اور چوتھے بستر پر کون سو رہا تھا؟ مَیں نے عرض کیا کہ حضرت میں نے سمجھا کہ وہ سو رہی ہے، فرمایا نہ پہلی سوئی ہوئی تھی نہ دوسری۔ اس کے علاوہ خواہ وہ سو بھی رہی ہو۔ تب بھی مناسب نہیں۔ میں نے عرض کیا کہ علماء کا یہی فتویٰ ہے اور مَیں اس[1] سے توبہ کرتا ہوں۔

---

[1] چونکہ شیخ کا کام مریدوں کی اصلاح کرنا اور اُن کو ہر مکروہ بات سے طریق ہدایت کی طرف لانا مقصود ہوتا ہے اس لیے ان باتوں کا ذکر کیا کہ اگرچہ یہ اُمور کبائر میں سے نہ تھے لیکن پھر بھی انؐ منع کر دیا (بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر)

نواں کشف

ایک مرتبہ برادرانِ طریقت کے ساتھ آپ کے پاس بیٹھا ہوا تھا اور حضرت کی زوجہ محترمہ گھر میں نہ تھیں۔ ہم میں سے ایک کو رفع حاجت کی ضرورت ہوئی بیت الخلا نیچے تھا اور اس کا دروازہ گھر کے دروازہ کے عین بالمقابل تھا اور گھر میں داخل ہونے والے کی نظر بیت الخلا میں بیٹھے ہوتے شخص پر پڑ سکتی تھی، یکایک آپ اٹھے اور بڑی تیزی سے اوپر گئے اور گھر کا دروازہ بند کر دیا اور پھر جلدی سے اُتر آئے۔ ہم نہ سمجھ سکے کہ آپ نے یہ کیوں کیا اور ہم حیران تھے کہ اچانک اُن کی زوجہ محترمہ تشریف لے آئیں ہم سمجھ گئے کہ آپ نے دروازہ انہی کے لیے بند کیا تھا۔

کرامت

ایک بار آپ کی زیارت کے لیے حاضر ہوا۔ آپ میرے ساتھ گھر کے ایک کمرے میں بیٹھے تھے یہاں تک کہ سونے وقت آگیا۔ آپ نے فرمایا سو جاؤ اور خود اُٹھ گئے۔ میں کپڑے اتار کر لیٹ گیا دیکھتا کیا ہوں کہ ایک ہاتھ مجھے گدگدی کر رہا ہے میں مجبور ہو کر ہنس پڑا اور آپ بھی ہنس پڑے حالانکہ آپ گھر کے نچلے حصہ میں اپنی خوابگاہ میں تھے۔ میں جان گیا کہ آپ نے گدگدی کی تھی۔

دسواں کشف

ایک مرتبہ برادرانِ طریقت کی ایک جماعت کے ساتھ آپ کی زیارت کے لیے گیا۔ جب آپ کے پاس سے واپس لوٹے اور ہمارے پاس نہ کوئی ہتھیار تھا نہ کوئی اور ایسی چیز تھی جس سے چوروں کا دفعیہ کر سکیں، ہم آبادی کا راستہ بھول گئے اور ایک چٹیل اور خطرے کی جگہ پر جہاں چوروں کا گھر تھا، رات گذارنی پڑی، ہمارے ساتھی سو گئے اور میں اور ایک اور ساتھی رہ گیا دیکھا تو قریب ہی شیر کھڑا ہے۔ میں نے ساتھی سے کہا باقی ساتھیوں کو جگانا نہیں تاکہ کہیں وہ اچانک شیر کو دیکھ کر گھبرا نہ جائیں اور ان میں ایسے لوگ بھی تھے جنہیں معاملات کا تجربہ نہ تھا ہو سکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ خود ہی اسے ہم سے دُور کر دے جب صبح قریب ہوئی اور ہم چلنے لگے تو پاس ہی ایک خرگوش دیکھا، یوں معلوم ہوتا تھا کہ وہ ابھی مرا ہے۔

پھر جب دوبارہ برادرانِ طریقت کے ساتھ آپ کی زیارت کے لیے آیا تو میں نہ سویا اور جانوروں پر پہرہ دیتا رہا۔ جب آپ کے پاس آئے تو عرض کیا حضرت میں سونا چاہتا ہوں کیونکہ میں

(بقیہ حاشیہ صفحہ سابقہ) تاکہ اصلاح نفس ہو۔ مُرید نے ان مکروہ چیزوں کا ذکر کر دیا ہے۔ حالانکہ وہ خود ان کا مرتکب ہوا تھا، لیکن چونکہ مسئلہ آخر مسئلہ ہی ہے اس لیے دوسروں کی ہدایت کے لیے مولف کتاب نے یہاں یہ بات ذکر کر دی ہے۔

کل رات نہیں سویا۔ پوچھا کیوں؟ میں نے عرض کیا کہ میں جانوروں کی پاسبانی کرتا رہا۔ فرمایا تمہاری پاسبانی سے کیا ہوتا ہے اور رات کے وقت کوئی درندہ آجائے تو، اور آپ نے شیر والی رات کی طرف اشارہ کیا۔ میں نے عرض کیا حضرت وہ کیسے؟ فرمایا جب فلاں وادی میں پہنچے تھے کیا تمہارے پاس تین آدمی نہیں آئے تھے؟ میں نے کہا ہاں۔ فرمایا: جب وہ پہاڑ پر پہنچے تو وہاں انہیں چار اور آدمی ملے جو قافلوں کے منتظر تھے تاکہ اُن پر ڈاکہ ڈالیں۔ جب ان کے پاس پہنچے تو انہیں تمہاری خبر دی اور ساتوں مل کر تمہارے پیچھے پیچھے ہو لیئے تاکہ دیکھیں کہ تم کہاں رات گذارتے ہو، جب تم رات گذارنے کے لیے ٹھہرے تو وہ تمہارے سو جانے کا انتظار کرتے رہے جب انہوں نے خیال کر لیا کہ اب سو گئے ہوں گے۔ تم پر ڈاکہ ڈالنے کے لیے آئے لیکن تمہارے قریب ایک شیر کو پایا۔ وہ آپس میں مشورہ کرنے لگے کہ کیا کریں۔ اگر شیر سے لڑتے ہیں تو لوگ بیدار ہو جاتے ہیں اور اگر ان کی طرف جاتے ہیں تو شیر ہمیں روکتا ہے لہٰذا وہ تمہیں چھوڑ کر دوسرے قافلے کی طرف چلے گئے۔ لیکن جب وہاں بھی کچھ نہ ملا تو دوسری طرف سے تمہاری طرف آئے وہاں بھی شیر نے راستہ روکا اور اُسے ایک دوسرا شیر خیال کیا، اُن میں ایک کہنے لگا کیا بات ہے کہ فلاں جہت سے آتے ہیں، تب بھی شیر نے اُن کی حفاظت کی ہے، پھر دوسری جہت سے آتے ہیں تب بھی شیر نے اُن کی حفاظت کی ہے، انہوں نے اس معاملہ کو سمجھنا چاہا، لیکن اللہ نے اُنکے دلوں پر مہر لگا دی۔ پھر میں نے خرگوش کے متعلق سوال کیا۔ فرمایا شیر میں انسانوں کی طرح نخوت ہوتی ہے۔ جیسے کہ انسان کے چہرہ پر مکھی بیٹھتی ہے تو وہ اُسے اُڑا دیتا ہے۔ یہی حال شیر کا ہے جب وہ بیٹھا ہوا تھا تو کیا دیکھتا ہے کہ اُس کے پاس ہی ایک خرگوش ہے اور خرگوش نے شیر کو نہ دیکھا تھا لہٰذا شیر نے اُسے مار ڈالا۔

گیارھواں کشف

میں نے زیراری عورت سے شادی کرنا چاہی۔ مجھے اس کی صفات معلوم نہ تھیں۔ آپ نے اس کی صفات بیان کیں جنہیں نکاح کے بعد میں نے ویسا ہی پایا اور اس کے بارے میں کچھ ایسے اُمور کا بھی ذکر کیا جن کا اللہ کے سوا کسی اور کو علم نہ تھا۔ پھر جب شب زفاف آئی، فرمایا آج رات میں تمہارے پاس ہوں گا میں نے عرض کیا مجھے اس کا کیسے علم ہوگا فرمایا میں کوئی ایسا فعل کروں گا جس میں اس کی علامت پائی جائے۔ پھر جب میں بیوی کے پاس گیا اور ابھی کچھ باتیں کی تھیں کہ کیا دیکھتا ہوں کہ اس کی ناک میں سے خون بہ رہا ہے میں نے سبب دریافت کیا کہنے لگی کہ آپ نے ہی تو ناک پر مارا ہے

اس پر میں چُپ رہا اور سمجھ گیا کہ یہ حضرت کا کام ہے۔ پھر جب میں آپ کی زیارت کے لیے گیا۔ اور ان سے قِصّہ بیان کیا فرمایا: ہاں اگر یہ خون اس کی ناک سے نہ اُترتا تو وہ بیمار پڑ جاتی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ دُور سے آئی تھی اور دن ٹھنڈا تھا جس سے ناک میں خون جم گیا تھا۔

بارھواں کشف

ایک مرتبہ میں آپ کے ساتھ آپ کے گھر میں تھا آپ نیچے کچھ کام کر رہے تھے اور میں اوپر اپنے سامنے کے مکان کی چھت کی طرف دیکھ رہا تھا کہ ایک عورت اُوپر چڑھی، میں نے اس کے چہرے میں سرخی دیکھی، میں نے غور سے دیکھا کہ یہ سرخی خون کی ہے یا رنگ کی۔ ابھی دیکھا ہی تھا کہ نیچے سے میری طرف نظر کر کے کہنے لگے: اللہ سے ڈرو یہ بدنظر اور میرے سامنے؟ اور ہنسنے لگے۔

تیرھواں کشف

ایک بار آپ کی زیارت کے لیے خچر پر سوار ہو کر روانہ ہوا۔ جب ایک دشوار گذار مقام پر پہنچا تو میں خچر پر سے اُتر گیا اور وہ خود چلتی رہی۔ جب وہ مقام گذر گیا اور میں نے پھر خچر پر سوار ہونا چاہا تو وہ خچر بھاگ گئی۔ میں نے زور زور سے پکارنا شروع کر دیا یا سیّدی مولائی عبدالعزیز۔ اللہ نے کچھ لوگ پیدا کر دیئے جنہوں نے خچر کو پکڑ لیا۔ جب آپ کے پاس پہنچا تو مسکرانے لگے اور فرمایا عبدالعزیز کیا کر سکتا ہے؟ تو فلاں جگہ پر تھا اور میں اس جگہ پر۔ ہاں اگر تمہارے پاس ہوتا تو ضرور تمہاری مدد کرتا۔ میں نے عرض کیا حضرت آپ کے لیے ایک ہی بات ہے۔ خواہ آپ دُور ہوں، خواہ نزدیک۔

کرامت

ایک دن عبدالقادر فاسیؒ کی خانقاہ میں قبلہ کی دیوار سے تکیہ لگائے ہوئے بیٹھا تھا اور میرے سامنے ستون تھا جس کے ساتھ کوئی شخص نہ بیٹھا تھا اور نہ ہی میرے اور ستون کے درمیان کوئی اور شخص تھا اور میں ذکر الٰہی میں مشغول تھا کچھ دیر کے بعد میں حضرت کے گھر کی طرف آنے کے لیے اُٹھا۔ ابھی تھوڑے قدم ہی چلا ہوں گا کہ مجھے یاد آ گیا کہ میں کوئی چیز بھول آیا ہوں پھر واپس آیا تو دیکھا کہ حضرت ستون کے ساتھ کھڑے ہیں۔ حالانکہ مجھے یقین ہے کہ وہاں کوئی نہ تھا۔ میں نے عرض کیا حضور آپ کب سے یہاں ہیں؟ اور کب یہاں تشریف لائے ہیں؟ فرمایا جب سے تُو فلاں ذکر کر رہا تھا۔ حالانکہ میں یہ ذکر دل میں کر رہا تھا اور میرے ساتھ والا آدمی بھی اُسے سُن نہ سکتا تھا، میں سمجھ گیا کہ وہ ایسی حالت میں تھے جس میں وہ آنکھوں سے اوجھل تھے۔

چودھواں کشف

ایک بار ایک اجنبی عورت سے میں نے ایسی بات کی جسے شریعت پسند نہیں کرتی، لیکن وہ معمولی سی بات تھی ایک روز آپ کے پاس بیٹھا تھا

اور عورتوں کا ذکر ہو رہا تھا اور اُس عورت کا بھی ذکر آ گیا۔ مجھے معلوم نہیں اس کا ذکر کیسے چھڑ گیا آپ نے فوراً فرمایا: میں تمہارے اور اس عورت کے درمیان نیلا دھاگہ دیکھتا ہوں اور یہ کیوں ہے؟ مجھے وہ واقعہ یاد آ گیا اور میں شرما گیا اور اس واقعہ کو پانچ سال گذر چکے تھے۔

پندرھواں کشف

ایک مرتبہ آپ سے خورد و نوش کا غلّہ وغیرہ خریدنے میں مشورہ لیا فرمایا جتنا تمہارے پاس ہے کافی ہے البتہ گھی خرید لو کیونکہ تمہارے پاس اتنا نہیں کہ موسم تک چل سکے۔ میں نے عرض کیا: ہاں مگر میرے پاس فلاں عورت کا گھی امانت کے طور پر رکھا ہے۔ ایک دن اس عورت کی موجودگی میں میں نے گھی کی کمی کا ذکر کیا۔ کہنے لگی گھی تو میرے پاس بہت ہے جتنا ضرورت ہو لے لینا۔ میں نہ سمجھ سکا کہ آیا وہ لوجہ اللہ مجھے عطیہ کے طور پر دے رہی یا اُدھار دے رہی ہے اور میں سمجھ رہا تھا کہ وہ سچ کہتی ہے۔ حضرت نے تھوڑی دیر خاموش رہ کر فرمایا گھی خرید لو اور اُسے دوسری اور تیسری مرتبہ دہرایا، میں سمجھ گیا کہ جو کچھ عورت نے زبانی کہا ہے وہ اُسے پورا نہ کرے گی۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا، جب فروخت کا وقت آیا وہ آئی اور میرے گھر میں بیٹھ کر گھی فروخت کر دیا۔ حالانکہ اُسے میری حالت معلوم تھی کہ میرے پاس کچھ نہیں ہے اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے شیخ کی برکت سے مجھے توقع سے زیادہ فراخی عطا فرمائی۔

ایک اور کرامت

ایک مرتبہ ایک شخص نے کچھ رقم مجھے قرض دی اور بقیہ میرے پاس امانت رکھ گیا، کچھ عرصہ بعد اپنی امانت اور قرض دونوں وصول کرنے کے لیے آیا مگر میرے پاس اُس وقت کچھ نہ تھا کہ دیدوں، نہ کوئی ایسی چیز تھی کہ بیچ کر قرض ادا کر دوں۔ میرا خیال تھا کہ کہیں دیر کے بعد اُسے ضرورت پڑے گی۔ میں نے اس کی امانت تو اسے نکال کر دیدی اور دل میں حضرت شیخ کو یاد کرنے لگا کہ یہ قرض کا مطالبہ نہ کرے وہ خاموش رہا۔ اور اب تک بھی کہ چھ مہینے گذر چکے ہیں اُس نے قرض کا مطالبہ نہیں کیا حالانکہ وہ آیا ہی اسی نیّت سے تھا کہ دونوں رقمیں لے کر جائے۔ فَالْحَمْدُ لِلّٰهِ عَلٰى ذَالِكَ۔

یہاں پر محمد بن احمد بن حنین کی بیان کردہ کرامات و کشوف ختم ہوتے ہیں۔

فقیہ علی بن عبداللہ الصباغیؒ کی بیان کردہ کرامات

فقیہ علی بن عبداللہ الصباغیؒ نے بھی جو کرامات دیکھیں وہ مجھے لکھ بھیجیں، میں نے انہیں ایک ایک

نیلا دھاگہ ظلمت اور معصیت کی علامت ہے۔

حرف کرکے شیخ کو پیش کیا - آپ نے اقرار فرمایا اور تصدیق کی کیونکہ میرا ارادہ اس مجموعہ میں صرف ان کرامات کے ذکر کرنے کا ہے جو میں نے خود دیکھی ہوں یا میں نے حضرت سے خود سُنی ہوں۔

فقیہ علی بن عبداللہ کی عبارت یوں ہے اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ وَحْدَہٗ یہ تحریر ان کرامات کے متعلق ہے جو میں نے اپنے شیخ الامام الاستاد الاکبر الغوث الاشہر سیدی و مولای عبدالعزیز ابن مولای مسعود جو فاس کے سادات میں سے ہیں اور جن کا نسب دباغ کے نام سے مشہور ہے سے دیکھیں

علی بن عبداللہ کی بیان کردہ پہلی کرامت

جب پہلی بار آپ کی زیارت ہوئی اور آپ کی صحبت میں بیٹھا اور بیعت کی تو گھر آنے کے دس دن بعد یہ واقعہ پیش آیا کہ کسی ایک رشتہ دار کے ہاں ایک سخت معاملہ پیش آیا - کچھ لوگوں کو اس کا علم ہو گیا اور کچھ لوگ اس واقعہ پر موجود تھے جن کی تعداد چھوٹے بڑے اور مرد و عورت ملا کر تقریباً بیس ہو گی اور یہ ایک ایسا معاملہ تھا کہ اگر حکومت کو اس کا علم ہو جاتا تو تمام قبیلہ تباہ ہو جاتا - میں نے کھلے میدان میں جا کر بلند آواز سے تین مرتبہ پکارا "حضرت اس قبیلہ کی پردہ پوشی کریں اور اس معاملہ کی آگ سے بچائیں"۔ اور ایسا ہوا جیسا کہ اس معاملہ پر پہاڑ گر گیا ہے یا اُسے سمندر میں پھینک دیا گیا ہے اور تمام وہ لوگ جنہیں اس بات کا علم تھا خاموش ہو گئے اور ایسے خاموش ہو گئے جیسے انہیں اس کا علم ہی نہیں ہے اور اگر کوئی پوشیدہ طور پر اس کا ذکر بھی کر بیٹھتا تو لوگ اس کو جھوٹا قرار دیتے اور اللہ نے قبیلے کو اور اس فعل کے کرنے والوں کو شیخ کی برکت سے بچا لیا۔

دوسری کرامت

جب دوسری بار آپ کی خدمت میں آیا اور میں نے آپ کے مکاشفات دیکھے اور مشورہ کرنے والوں کو اچھی طرح جواب دیتے ہوئے سُنا تو عرض کیا جو لوگ آپ کے قریب ہیں وہ کامیاب اور سعادت مند ہیں - کیونکہ جب کوئی معاملہ پیش آیا، آپ انکے پاس موجود ہیں - لہٰذا وہ آپ سے مشورہ کر لیتے ہیں میں آپ سے چار دن کی مسافت پر ہوں، میں کیا کروں؟ اور کس سے مشورہ کروں؟ حضرت نے فرمایا جب کوئی معاملہ درپیش ہو اور تمہیں سمجھ نہ آئے کہ تم کیا کرو - تو جنگل میں چلے جاؤ اور وہاں دو رکعت نماز ادا کرو، ہر رکعت میں گیارہ مرتبہ سورۃ اخلاص پڑھو اور سلام پھیرنے کے بعد تین بار مجھے پکارو اور یہ اعتقاد رکھو کہ میں تمہارے پاس ہوں اور مجھ سے اس معاملہ میں مشورہ کرو - تمہیں جواب مل جائے گا۔

اس کے بعد ایک مہم پیش آ گئی اور مجھے اس کی سخت فکر ہوئی - چنانچہ میں نے جنگل میں جا کر

اسی طرح کیا جس طرح حضرت نے فرمایا تھا۔ تو آپ کی برکت سے معاملہ حل ہو گیا، اس وقت برادرانِ طریقت شیخ کے پاس تھے اور میں آپ سے چار دن کی مسافت پر تھا اس کے بعد جب میں ان برادرانِ طریقت سے ملا تو انہوں نے کہا فلاں فلاں دن تم نے ایسا کیا؟ میں نے کہا ہاں۔ کہنے لگے ہم شیخ کے پاس تھے کہ آپ ہنسے اور فرمایا "مسکین علی بن عبداللہ کی یہ نیت ہے اور جنگل میں مجھے پکار رہا ہے اور میں کہاں اور وہ کہاں؟" جب آپ سے ملاقات ہوئی تو فرمایا آئندہ کبھی بھی کسی بات کا غم نہ کرنا خواہ ضرورت کس قدر بھی سخت کیوں نہ ہو، اُن کے ان کلمات سے میرا تمام غم جاتا رہا، چنانچہ جب کبھی کسی معاملہ میں مجھے لاحق ہونے لگتا تو غم سے پہلے ہی خدا اُسے آپ کی برکت سے آسان کر دیتا۔

میں نے عرض کیا دو رکعتوں کا مسئلہ خاص میرے لیے ہے یا ہر کسی کے لیے۔ فرمایا جو کوئی بھی ایسا کرنا چاہے، اسے اجازت ہے اس پر میں نے اللہ کا شکریہ ادا کیا۔

تیسری کرامت

جب پہلی بار آیا اور آپ سے رخصت ہونے لگا اور اُس وقت رمضان کا آخر تھا فرمایا بقرعید کے لیے ہمارے واسطے ایک مینڈھا لانا۔ میں نے عرض کیا اچھا جب عید قریب آئی تو میں نے دو مینڈھے خریدے۔ اس وقت آپ کے پاس میرا ایک پیر بھائی موجود تھا اور میرے اور اس بھائی کے درمیان دو دن کی مسافت تھی، یعنی شیخ کی مسافت سے نصف۔ حضرت نے اسے کہا کہ فلاں شخص دو مینڈھے لے کر تمہارے پاس آئے گا۔ ایک کو تم قربانی کے لیے رکھ لینا اور دوسرا میرے پاس لے آنا۔ جب میں اُس کے پاس آیا تو شیخ کا فرمان مجھے دیا۔ مجھے اس میں شک بھی نہ گذرا کیونکہ مجھے معلوم تھا کہ حضرت اس کی بڑی قدر کرتے تھے، میں نے اُسے کہا ان میں سے جو چاہیں آپ لے لیں۔ کہا ہم ادنیٰ لیں گے اور عمدہ کو شیخ کی خدمت میں لے جائینگے ہم نے ادنیٰ کو وہیں چھوڑا اور جو بظاہر عمدہ تھا اُسے لے کر حضرت کے پاس آئے۔ جب حضرت نے مینڈھے کا سنا، فرمایا فلاں نے تم سے دھوکا کیا اس نے عمدہ تو لے لیا اور تو ادنیٰ کو میرے لیے لایا ہے۔ میں نے عرض کیا ہمیں تو یہی عمدہ اور موٹا دکھائی دیا تھا۔ ارشاد فرمایا اس کی تو صرف اوجھ میں چربی ہے، حالانکہ آپ نے مینڈھے کو ابھی دیکھا بھی نہ تھا۔ عید میں قربانی ہونے پر دونوں مینڈھے ایسے ہی نکلے جیسے حضرت نے فرمایا تھا۔

اور جب ہم ایک مینڈھے کو چھوڑ کر دوسرے کو لے کر روانہ ہونے لگے تو فکر ہوئی کہ دوسرے کو لے کر کیسے چلیں اور یہ ہمارے ساتھ کیسے چل سکے گا، حالانکہ ہم سوار ہیں۔ اللہ نے یہ بات بھی آسان

کردی کہ بکریوں کا ایک گلّہ فاس کو جانے والا مِل گیا۔ ہم میں سے صرف میرا علاتی بھائی پیادہ چل رہا تھا۔لہٰذا اسی کو مینڈھے کیساتھ چھوڑا تاکہ گلے کیساتھ مینڈھے کو بکرا آئے اور وہ دو دن بعد پہنچا۔ شیخ نے اُسے دیکھ کر فرمایا تو ہمارے لیے مینڈھا لے کر آیا ہے، ہم نے تجھ کو لڑکا دیا۔ میں نے عرض کیا حضرت یہی تو اس کی خواہش تھی۔ میرے بھائی کو اولاد کی بڑی خواہش تھی۔ اس کی بیوی چھوٹی عمر کی تھی اور پندرہ برس شادی کو گذر چکے تھے، لیکن کوئی اولاد نہ ہوئی تھی اور وہ اولاد سے مایوس ہو چکی تھی اور وہ خاوند کو بانجھ ہونے کا الزام دیتی تھی۔ جب ہم مینڈھے کو ایک جگہ پر باندھ دیا اور شیخ ہمیں لے کر گھر کی طرف روانہ ہوئے اور یہ رات کا وقت تھا۔ جب چراغ کی روشنی میں میرے بھائی کو دیکھا، فرمایا میرے قریب آؤ۔ وہ قریب گیا اور اس کی پیشانی کھول کر تین مرتبہ کچھ کلمات پڑھے اور کہا: ارے فلاں یہ کوئی ہیجڑا تو نہیں ہے۔ یہ الفاظ تین بار فرمائے اور پھر اُسے کہا لڑکے کا کیا نام رکھوگے؟ عرض کیا آپ ہی رکھ دیں۔ پھر تھوڑی دیر خاموش رہ کر فرمایا اس کا نام رَحّال رکھنا۔ یہ نام نہ ہمارے قبیلے میں تھا اور نہ ہمارے اجداد میں سے کسی کا یہ نام تھا، جو برادرانِ طریقت حاضر تھے ان میں سے ایک نے عرض کیا یہ انوکھا نام آپ کو کہاں سے مل گیا؟ آپ نے مسکرا کر فرمایا مجھے تو یہی دکھائی دیا ہے۔ جب واپس آئے تو دیکھا کہ بھائی کی بیوی کو حمل قرار پا چکا تھا اور اس سے پہلے اس کا کسی کو علم نہ تھا۔ چنانچہ بچہ ہوا اور اس کا نام شیخ کے فرمانے کے مطابق رَحّال رکھا گیا۔ لوگ اس نام سے تعجب کرتے۔ آپ نے تو اس کا نام رحّال اس بات کی طرف اشارہ کرنے کی غرض سے رکھا تھا کہ یہ جلدی کوچ کر جائے گا اور ایسا ہی ہوا۔ کیونکہ وہ صرف تین سال زندہ رہنے کے بعد مر گیا۔ اس نام میں بھی آپ کی ایک اور کرامت پائی جاتی ہے۔

مَیں نے شیخ کو اُس شخص سے فرماتے ہوئے سنا کہ پہلی بار تو ہم نے تجھے رَحّال دیا تھا اور اب ہم تجھے ایسا لڑکا دیں گے جو تمہارے پاس رہے گا اور کوچ نہیں کرے گا۔

چوتھی کرامت

ایک روز ایک دوست کے ساتھ شکار کو گیا اور مجھے شکار کا بہت شوق تھا ہم نے اپنے گھر میں علی الصبح ناشتہ کر لیا اور کھانا ساتھ لیے بغیر نکل گئے کیونکہ ہمیں خیال تھا کہ دیر نہ لگے گی۔ ہمیں پہاڑ کے دامن میں ہی کچھ ہرن دکھائی دیئے جنہیں ہمارے ملک میں جلیذ کہتے ہیں اور اس علاقے میں بہت سے ہرن تھے، لیکن شکار کرتے کرتے دیر ہو گئی اور شام ہوتے تک ہمیں خوب بھوک لگ گئی۔ ہمیں کھانا ساتھ نہ لینے پر ندامت ہوئی اس کے بعد جب حضرت کی خدمت میں حاضر ہوا۔ فرمایا بدھ کے روز شکار کے لیے بغیر کھانا ساتھ لیے

کیوں گئے تھے؟ تمہیں ایک آدمی ملا۔ اس نے تمہیں ٹٹولا مگر تمہارے پاس کھانے کو کچھ نہ پایا۔ پھر تمہیں پہاڑ کے دامن میں ایک ہڑیال مل گیا اور اُس تمام شکار کا حال بیان کر دیا اور پہاڑ کا حال بھی بیان کیا اور فرمایا اس پہاڑ کی چوٹی پر پیالے جتنا پانی کا ایک چھوٹا سا چشمہ ہے نہ تو خشک ہوتا ہے اور نہ اپنی جگہ سے باہر نکل کر بہتا ہے نہ کم ہوتا ہے اور نہ زیادہ اور مجھے اس چشمہ کا علم ہی نہ تھا اور شکاری بھی بہت کم ہی پہاڑ کی چوٹی پر جاتے ہیں۔ جب حضرت کے پاس سے واپس آیا تو اس چشمہ کے متعلق لوگوں سے دریافت کیا۔ جو لوگ اس سے واقف تھے انہوں نے ایسا ہی بیان کیا جیسا کہ حضرت نے فرمایا تھا۔

(مولّفِ کتاب کہتا ہے) کہ جو شخص اُسے ملا تھا اور اس نے ان کا سامان ٹٹولا تھا وہ شیخ خود تھے میں نے حضرت سے اس شخص کی نسبت سوال کیا تھا اور حضرت نے مجھے اس کی تشریح کر دی تھی۔ میں نے حضرت کو یہ فرماتے ہوئے سنا کہ لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ کئی بار میں نے اور سیّدی منصور نے اس چشمہ کے پاس نماز پڑھی ہے جو پہاڑ کی چوٹی پر ہے اور یہ جگہ اپنی بلندی کی وجہ سے ہمیں بہت پسند تھی۔

علی کہتے ہیں ایک بار انہوں نے میرے تمام علاقہ کی اور ہمارے گھر کی ہُو بہُو صفت بیان کی اور حالانکہ آپ نے اسے کبھی دیکھا نہ تھا اور آپ چار دن کی مسافت پر تھے اور حقیقت بعینہٖ اسی طرح تھی جس طرح آپ نے بیان کی۔

پانچویں کرامت

ایک بار پھر آپ کی خدمت میں حاضر ہوا اور آپ نے ہمارے گھر کا حال بیان کرنا شروع کر دیا اور کہا تم فلاں جگہ پر گھوڑے کیوں باندھتے ہو؟ وہاں تمہارے گھوڑوں کے پاؤں کے پاس ایک ولی مدفون ہیں اور ہم نے کبھی قبر کا کوئی نشان نہ دیکھا اور وہاں سے قبرستان بھی نصف میل دُور تھا۔ پھر فرمایا تمہارے جانور باندھنے کی جگہ میں سات قبریں ہیں اور وہاں جانور باندھنے سے کوئی حرج نہیں سوائے اس قبر کے جو تمہارے گھوڑوں کے پاؤں کے پاس ہے۔ لہٰذا تم گھوڑوں کو وہاں سے ہٹا لو اور اس قبر کی تعظیم و توقیر کرو۔ وہاں کوئی جنگلہ بنا دو۔ جس سے گھوڑے اُسے ایذا نہ پہنچا سکیں۔ برادرانِ طریقت میں سے ایک نے سوال کیا حضرت وہ صاحبِ قبر کن میں سے ہے۔ فرمایا وَجدہ اور تلمسان کے درمیان رہنے والے عربوں میں سے ہے۔ جو صباغات میں رہا کرتا تھا اور وہ اسے ایک طالب علم سمجھتے تھے اور کسی کو ان کے ولی ہونے کی خبر نہ تھی اور جب مرا تو وہیں دفن ہو گیا پھر ہم نے وَجدہ اور تلمسان کے درمیان

جو عرب قومیں رہتی ہیں اُن کے نام لینے شروع کیئے اور آپ نہ نہ فرماتے گئے یہاں تک کہ جب آل رباح کا نام لیا تو فرمایا ہاں انہی میں سے ہے۔ حالانکہ نہ کبھی آپ وہاں گئے اور نہ انہیں کبھی دیکھا۔ پھر فرمایا اگر تحقیق کرنا چاہتے ہو تو کدال لے کر دیکھ لو۔ تحقیق ہو جائے گی۔ میں نے عرض کیا کہ جانوروں کے باندھنے کی جگہ میں وہ قبر کہاں پر ہے؟ فرمایا تمہارے بیٹے کے گھر کے غربی جانب اس تہ خانہ کے بالمقابل جو جانوروں کی جگہ کے دروازے کی طرف سے آتا ہے۔ ہمارے وہاں تین تہ خانے تھے۔ جب گھر واپس آیا تو گھر والوں سے اس بات کا ذکر کیا اور کُدال لے کر اس جگہ کو کھودا جو آپ نے بتلائی تھی تو بالکل حضرت کے ارشاد کے مطابق پایا اور لوگوں کو تعجب ہوا۔

میں نے حضرت سے عرض کیا کہ باقی قبروں کو چھوڑ کر صرف اسی وَلی کی قبر میں کیا خصوصیت ہے کہ اس کا تو احترام کیا جائے اور ان کا نہ کیا جائے۔ فرمایا کہ اس وَلی کی روح آزاد ہے اور باقیوں کی روحیں برزخ میں مقید ہیں اور ان پر زمانہ بھی تقریباً تین سو سال کا گذر چکا ہے۔ میرا شُبہ رفع ہو گیا۔ وَالْحَمْدُ لِلّٰہِ عَلٰی ذَالِكَ۔

چھٹی کرامت

ایک مرتبہ حضرت کی زیارت کے لیے میرا چچازاد بھائی عُلّال میرے ساتھ آیا جو کہ میرا نسبتی بھائی بھی ہوتا تھا۔ ہم آپ کے پاس آتے اور میرے چچازاد بھائی کی بیوی حاملہ تھی۔ اس کی نیت یہ تھی کہ حضرت سے تنگ دستی کی شکایت کرے اور یہ اس کی پہلی ملاقات تھی۔ حضرت نے دیکھتے ہی فرمایا کیا تمہاری بیوی حاملہ ہے؟ عرض کیا: جی حضرت نے فرمایا کیا تم پسند کرتے ہو کہ تم کو لڑکی عطا ہو اور وہ رزق لے کر آوے۔ اس نے عرض کیا حضرت بڑی خوشی سے۔ ہم یہی تو چاہتے ہیں اور آپ نے اس میں دو باتیں جمع کر دیں۔ لڑکی کی پیدائش کی خبر اور رزق کی فراخی کی جو اس کی خواہش تھی۔ گھر پہنچے تو دیکھا کہ بیوی نے لڑکی جنی ہے اور وضع حمل کو سات دن گذر چکے تھے اور گھر والے سوچ رہے تھے کہ اس کا کیا نام رکھیں۔ حضرت شیخ نے اسے فرمایا تھا جب لڑکی پیدا ہو گی تو اس کا کیا نام رکھو گے؟ عرض کیا جیسے آپ کی مرضی ہو۔ حضرت نے اس کا نام خدیجہ رکھا تھا اور ہمارے ہاں اس نام کا قطعاً رواج نہ تھا۔ لوگوں کو اس نام سے تعجب ہونے لگا۔ میں نے حضرت سے سوال کیا آپ نے اس کا نام خدیجہ کیسے رکھا؟ فرمایا کہ جس خوش نصیب کو بھی حق تعالیٰ نے فتح کبیر عطا فرمائی اور اس نے نکاح کرنے کا قصد کیا تو ایسی عورت کی جستجو کی جس کا نام خدیجہ ہو کیونکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اُمّ المومنین سیدہ خدیجہ رضی اللہ عنہا سے بڑی راحت حاصل ہوئی اور ان ہی کے پاس ہر قسم کی دنیوی اور دینی خوبیاں آپ کو

عطا ہوئیں۔ اگر میرے ہاں ایک اور لڑکی پیدا ہو تو میں اس کا نام خدیجہ ہی رکھوں گا۔

ساتواں کشف ایک مرتبہ آپ نے میری بیوی کے سر سے پاؤں تک کے ایک ایک عضو کے خواہ ظاہری ہوں خواہ پوشیدہ بیان کر دیئے اور وہ بیان بالکل درست تھا، یہاں تک کہ اگر میں بھی بیان کرنا چاہتا تو حضرت کی طرح بیان نہ کر سکتا اور اگر وہ خود بھی حضرت کے سامنے آتی تو آپ کے علم میں کوئی اضافہ نہ ہوتا۔ وہ آپ سے چار دن کی مسافت پر تھی اور آپ نے اسے کبھی دیکھا بھی نہ تھا۔

آٹھواں کشف و کرامت مجھے نیند بہت آیا کرتی تھی کبھی طلوعِ فجر کے وقت آنکھ کھل جاتی تو اس وقت بیوی سے مجامعت کرتا اور کبھی سوتے سوتے ہی فجر ہو جاتی۔ جب آپ کی خدمت میں حاضر ہوا تو حضرت نے حاضرین سے فرمایا "فلاں شخص کے پاس جب بھی ہم گئے تو یا اس کو سوتا ہوا پایا یا وہ اس وقت بیوی سے مجامعت کر رہا ہوتا۔ کسی نے عرض کیا حضرت اس وقت میں سونا بہتر ہے یا مجامعت۔ فرمایا اُس وقت مجامعت سونے سے افضل ہے۔ لیکن اوقاتِ صلوٰۃ میں مجامعت سے اگر حمل قرار پا جائے تو جو اولاد ہوگی وہ ماں باپ کی نافرمان ہوگی۔ میں نے اسی دن سے توبہ کی اور پھر ایسا نہیں کیا اور نہ ہی پھر اُس وقت کبھی سویا۔

(مؤلف کتاب کہتا ہے) کہ حضرت کا یہ فرمانا کہ اُس وقت جو بچہ پیدا ہوگا عاق[1] ہوگا، اس میں بھی حضرت کی ایک اور کرامت پائی جاتی ہے کیونکہ علی بن عبداللہ ہمیشہ اپنی اولاد کے نافرمان ہونے کی شکایت کرتے رہتے تھے اور ہم نے خود دیکھا ہے کہ اُن کی اولاد ان سے بڑی بُری حرکتیں کرتی رہتی۔

نواں کشف میں اپنی بیوی سے بہت چہل بازی کیا کرتا تھا اور اسے کئی طرح کرتا، میں نے اس کا ذکر اپنے ایک پیر بھائی سے کر دیا اور اس نے شکایت کے طور پر اس کا ذکر حضرت سے کر دیا۔ آپ سنکر مسکرائے اور فرمایا اس نے تو تھوڑا سا ذکر کیا ہے وہ تو اور کچھ بھی کرتا ہے وہ تو ایسا ایسا بھی کرتا ہے اور جو کچھ میں کیا کرتا تھا سب ذکر کر دیا اور میں سن رہا تھا اور یہ ایسی باتیں تھیں جن کا ذکر کوئی شخص کسی سے نہیں کر سکتا اور ان کا علم اللہ کے سوا کسی کو نہ تھا۔ پھر فرمایا یہی سُنّت ہے اور ایسا کرنے والے کو نیکیاں ملیں گی۔ مجھے یہ سنکر خوشی ہوئی۔ وَالْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ۔

---

[1] نافرمان

تحریر کے وقت ہمیں اتنی ہی یاد تھیں۔ حضرت کی کرامات تو بیشمار ہیں۔ خدا ہمیں حضرت کے وُجُود سے نفع پہنچائے اور آپ کی محبت میں ہماری موت ہو اور انہی کی جماعت میں ہمارا حشر ہو بوسیلہ سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم۔

(مؤلف کہتا ہے) خدا نے اُن کی دُعا قبول کی کیونکہ جب اُن کی وفات کا وقت قریب آیا تو دل میں خیال پیدا ہوا کہ اب مرنے کا وقت قریب آیا ہے وہ بیوی سے کہہ کر کہ میں حضرت کی خدمت میں فاس جاتا ہوں تاکہ وہیں وفات پاؤں صباغات چھوڑ کر اور اہلِ وطن سے رخصت ہو کر آستانۂ شیخ پر آپڑے اور بیمار پڑ گئے۔ شیخ نے وصیت کرنے کا اور اللہ کی ملاقات کی تیاری کا حکم دیا۔ انہوں نے ایسا ہی کیا۔ حضرت نے اپنے گھر رکھ کر اُن کی تیمار داری کی۔ آپ کی زوجۂ محترمہ اور اُن کے متعلقین مریض کی ضروریات تیار کر دیتے۔ آخر جب وقت اخیر آگیا۔ حضرت نیچے اپنے گھر میں تشریف فرما تھے اور علی بن عبداللہ بالاخانہ میں تھے۔ حضرت نے فرمایا ابھی علی کو نبی صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم اور ابوبکرؓ کی زیارت ہوئی ہے۔ یہ سنکر وہ لوگ بالاخانہ میں علی کے پاس آئے تاکہ یہ دریافت کریں۔ دیکھا تو اُن کی زبان بند ہو چکی تھی۔ پھر بھی لوگوں نے حضرت کا مقولہ ذکر کیا۔ وہ سمجھ گئے اور سر ہلا کر کہا کہ ہاں سچ ہے اور منہ کھولا جیسے کوئی ہنس رہا ہوتا ہے اس کے بعد متواتر مسکراتے رہے یہاں تک کہ روح پرواز ہو گئی۔ اس کے بعد میں نے حضرت کو فرماتے سنا اللہ نے اپنے فضل وکرم سے اس پر رحم کیا اور اگر صباغات میں نوّے سال بھی اور زندہ رہتا" بھی جس حال میں وہ مرا ہے حاصل نہ کر سکتا۔

حضرت کی اُن کرامات کا ذکر جو الفقیہ عبداللہ بن علی التّازیؒ نے بیان کیں

مندرجہ ذیل کرامات عبداللہ بن علی التازی نے لکھ کر بھیجیں۔ یہ ایک صاحب کا عینی مشاہدہ تھا۔ حضرت کے سامنے ان کا ذکر کیا تو آپ نے ان کی تصدیق کی۔

عبداللہ بن علی کی بیان کردہ پہلی کرامت

عبدالرحمٰن تخوخی کا بیان ہے کہ ایک مرتبہ میں شیخ کے ساتھ مولای ادریسؒ کے مزار پر گیا اور وہاں علامہ احمد بن مبارک بھی تھے۔ شیخ نے کسی کام کے لیے مجھے اپنے گھر بھیجا۔ میں بڑی تیزی سے وہاں چلا اور

شیخ کو وہیں چھوڑا۔ گھر پہنچا تو ایک آدمی دیکھا جو دھونے کی غرض سے کپڑے لینے کے لیے حضرت کی تلاش میں دروازہ پر کھڑا ہے۔ ابھی ہم مولائے ادریس کے مزار سے شیخ کی تشریف آوری کے منتظر تھے کہ دیکھتے کیا ہیں کہ آپ اپنے گھر سے ہاتھ میں کپڑے لیے نکلے اور دھوبی کو دیدیئے۔ حالانکہ جب میں نے آپ کو مولائے ادریس کے مزار پر چھوڑا تھا تو آپ راستہ میں کیچڑ اور دلدل کی وجہ سے کھڑاؤں پہن کر آرہے تھے۔ اگر آپ جوتا پہن کر بھی آتے ہوتے اور معمول کے طور پر چلتے تب بھی مجھ سے آگے نہیں نکل سکتے تھے کیونکہ میں تو نہایت تیز چل کر آیا تھا۔

دوسری کرامت

عبدالرحمٰن نے یہ بھی بیان کیا۔ حضرت کی ایک عینک تھی جو گم ہوگئی میں ایک اور عینک الحاج محمد کواش کی دوکان سے لے آیا، لیکن وہ ٹھیک نہ لگی۔ فرمایا پہلی ہی تلاش کرو وہ صاف تھی شاید مل جائے۔ ہم نے جس کتاب میں وہ رکھا کرتے تھے اسے ایک ایک ورق کرکے کئی بار تلاش کیا، لیکن عینک نہ ملی۔ اس پر حضرت کا رنگ بدل گیا میں نے دریافت کیا حضرت کیا بات ہے؟ فرمایا مجھے اس عینک پر غصہ آگیا ہے، پھر جس کتاب کا ورق ورق چھان مارا تھا اُسے اٹھایا اور جو ناقص عینک انہوں نے لگا رکھی تھی، وہ ناک سے گر پڑی اور آپ نے کتاب نیچے رکھ دی۔ دیکھا تو پرانی عینک کتاب کے اوپر پڑی ہے۔ پھر اپنے بیٹے عمر سے فرمایا: جاؤ اپنی والدہ سے کہہ دو اللہ نے میری عینک مجھے واپس دے دی ہے۔

تیسری کرامت

یہی عبدالرحمٰن فرماتے ہیں: سخت جاڑے کے موسم میں ہم شیخ کے پاس بیٹھتے تو آپ کے ماتھے سے بکثرت پسینہ ٹپکتا ہوا دیکھتے۔ مگر پھر یہ حالت نہ رہی، ہم نے اس کا سبب دریافت کیا۔ فرمایا یہ پسینہ مجھے ابتدا میں آتا تھا۔ جب مشاہدہ سامنے آتا اور پھر غائب ہوجاتا۔ جب غائب ہوجاتا تو میں عام لوگوں کی طرح ہوجاتا، لیکن جب پھر مشاہدہ ہوتا تو مجھے انسانی حالت سے باہر نکال دیتا اور پھر غائب ہوجاتا تو میں عام انسانوں کی طرح بن جاتا۔ اس سے مجھے سخت تکلیف ہوتی جب یہ مشاہدہ دائم رہنے لگا اور کسی وقت بھی غائب نہ ہوتا اور میری ذات اُس سے مانوس ہوگئی۔ اس لیے اب مجھ پر اس کا اثر نہیں ہوتا۔

چوتھی کرامت

ایک مرتبہ میں اور میرا بھائی عبدالرحمٰن مذکور مدرسہ عطارین کی چھت پر چڑھ گئے اور ہمیں گھروں کی چھتوں پر عورتیں نظر آئیں۔ کہیں اکٹھی اور کہیں الگ الگ۔ ہم نے اُن کو دیکھنا شروع کیا اور اُن کا ذکر کرکے آپس میں ہنستے۔ حتٰی کہ ہم میں سے

ایک خوش طبعی کے زور میں ہوا میں بڑے زور سے اُچھلا بھی۔ جب ہم شیخ کے مکان پر آئے اور بالاخانہ میں بیٹھے تو آپ خوب ہنسے اور فرمایا وہ شخص بہت ہی اچھا ہے جسے کشف نہ ہوتا ہو۔ اس کے بعد فرمایا سچ بتاؤ، جھوٹ نہ بولنا، تم دونوں کہاں گئے تھے۔ ہم نے واقعہ عرض کر دیا اس پر حضرت نے عورتوں کا قصہ اور جس جس چھت پر وہ تھیں اس طرح بیان کرنا شروع کر دیا گویا وہ ہمارے ساتھ تھے۔ یہاں تک کہ اُچھلنے کا واقعہ جو ہم نے اُن سے چھپایا تھا وہ بھی ذکر کر دیا آپ نے یہ بھی فرمایا کہ آپ اس وقت ملنے والوں کے پاس بیٹھے تھے۔ جب آپ نے عبداللہ اور عبدالرحمٰن کو اچھلتے دیکھا تو آپ قہقہہ لگا کر ہنس پڑے۔ حاضرین نے سمجھا کہ اُن میں سے کسی پر ہنسے ہیں۔

پانچویں کرامت ایک مرتبہ حاضر خدمت ہوا اور میری بیوی حاملہ تھی۔ آپ نے حمل کا تذکرہ کیا۔ حاضرین میں سے ایک نے بطریق تمسخر کہا لڑکی ہوگی، لیکن شیخ نے مجھے فرمایا قریب آؤ۔ جب میں قریب گیا تو کان میں فرمایا لڑکا ہوگا اور ایسا ہی ہوا۔

چھٹی کرامت عبدالرحمٰن کہتا ہے ایک بار پھر حاضر ہوا اور میرا لڑکا بیمار تھا، میں نے عرض کی کہ بچے کی صحت کے لیے دعا فرماویں۔ فرمایا پھر کبھی کہنا تو دعا کروں گا میں سمجھ گیا کہ بچے کی موت کا وقت قریب ہے اور ایسا ہی ہوا۔

ساتویں کرامت ایک بار پھر حاضر ہوا اور بیوی حاملہ تھی۔ فرمایا تمہارے ہاں ایک بیٹی کا اضافہ ہوا ہے اور ایسا ہی ہوا۔

آٹھویں کرامت عبدالرحمٰن کہتے ہیں کہ میں آپ کی زیارت کے لیے فاس روانہ ہوا اور شیخ کے لیے تیس اوقیہ[1] ساتھ لے چلا۔ جب شہر کے قریب پہنچا تو اس میں ایک اُوقیہ نکال لیا۔ جب باقی رقم حضرت کو پیش کی تو فرمایا اپنی کارروائی تم چھوڑتے نہیں؟ جاؤ ایک موزونہ کی کھجو ر تین موزونہ کا پنیر لے کر آؤ اس اُوقیہ کے عوض جو تم نے نکال لیا ہے۔ میں نے کہا حضرت کی عقل و دانش کس قدر خالص ہے۔

نویں کرامت عبدالرحمٰن کہتے ہیں کہ حضرت کی زیارت کے لیے گیا۔ جب آپ کے سامنے بیٹھ گیا تو فرمایا اتوار کی رات کیا کر رہے تھے؟ میں نے عرض کیا حضور کونسی بات؟ فرمایا جب تو اپنی بیوی سے مجامعت کر رہا تھا اور تو نے اپنے بیٹے کو تکیے پر بٹھلایا ہوا تھا کیونکہ

---

[1] اوقیہ۔ ایک اونس

وہ سوتا نہ تھا اور لالٹین بھی صندوق پر پڑی تھی۔ کیا تجھے معلوم نہیں کہ اُس وقت تیرے پاس موجود تھا؟

القصہ شیخ کی کرامات لاتعداد ہیں۔

مؤلف کتاب کہتا ہے کہ اس وقت سے اب تک بے شمار کرامات آپ سے صادر ہوئیں اور ان بزرگوں نے جو کرامات لکھ کر بھیجی تھیں وہ ۱۱۲۸ھ کے اختتام تک کی تھیں۔ انہیں میں نے عاشورہ کے دن دس محرم ۱۱۲۹ھ کو حضرت کو پیش کیا تھا۔

الارضی سیدی العربی الزیاوی کی تحریر کردہ کرامات

اکثر کرامات جو انہوں نے ذکر کی ہیں میں بھی اُس وقت حاضر تھا اور میں نے خود دیکھی ہیں اور جن میں مَیں حاضر نہ تھا اُن کی نسبت میں نے حضرت سے دریافت کر لیا تھا اور آپ نے ان کی تصدیق کی تھی۔

پہلی کرامت میں حکومت کے ایک سیکرٹری کے لیے کتابیں خریدا کرتا تھا۔ میں نے بہت سی کتابیں خرید کر اس کے پاس بھیج دیں۔ اس نے بھی کتابیں پہنچنے سے پہلے ہی مجھے رقم ادا کر دی۔ لیکن جب کتابیں اس کے پاس پہنچیں تو اسے پسند نہ آئیں۔ اس لیے وہ بہت گرجا اور چمکا۔ پھر کتابیں مجھے واپس بھیج دیں اور کہا کہ انہیں مالک کو واپس کر کے قیمت داخل کر دو ورنہ جو ہم سے ہو سکے گا وہ ہم کریں گے۔ یہ سن کر میں گھبرایا اور مغموم و پریشان ہوا اور سیکرٹری سے ڈرا کیونکہ اس کا بڑا دبدبہ تھا۔ چنانچہ میں نے شیخ کے پاس جا کر قصہ سنایا اور عرض کیا کہ مالکوں نے کتابیں واپس لینے سے انکار کر دیا ہے اور میرے پاس اتنی رقم نہیں ہے کہ ادا کر سکوں اور سیکرٹری کا بڑا اقتدار ہے۔ اسی قسم کی اور مشکلات کا ذکر کیا۔ اس پر شیخ نے فرمایا "بیٹا کوئی ڈر کی بات نہیں انشاء اللہ جلدی کوئی سبیل نکل آئے گی۔" ابھی چند ہی دن گذرے تھے کہ سلطان نے اسے قتل کرا دیا اور شیخ کے فرمانے کے مطابق میری مشکل حل ہو گئی۔

دوسری کرامت ایک مرتبہ ہمارے وطن تامسنا میں سخت فساد ہوا اور قاضی شہر میرا دینی بھائی بنا ہوا تھا۔ مجھے اُس کی نسبت ڈر ہوا کہ کہیں اس پر کوئی عتاب نہ آئے۔ میں شیخ سے اس کے لیے دعا کرانے آیا۔ فرمایا سید طاہر کو تو خطرہ نہیں، لیکن میں میر منشی کا ضامن

نہیں ہوں۔ یہ میر منشی بھی میرا اور قاضی دونوں کا دوست تھا، لیکن میں نے اس کا ذکر نہ کیا تھا۔ یہ وہی کتابوں والے صاحب ہیں جن کا اوپر ذکر ہو چکا ہے چنانچہ جیسا شیخ نے فرمایا تھا وہی ہوا۔ قاضی صاحب تو بال بال بچ گئے اور میر منشی قتل کر دیئے گئے۔

تیسری کرامت

نیز جب ہمیں میر منشی کے قتل کی خبر پہنچی اور اس کا ابھی صرف چند لوگوں کو علم تھا کہ میں نے شیخ کے گھر جا کر دستک دی۔ آپ نکلے لیکن ہم نے میر منشی کی موت کا ذکر نہ کیا۔ خود ہی فرمایا۔ میر منشی مر گیا۔ میں نے کہا۔ جی ہاں۔ فرمایا میں نے تو تمہیں پہلے ہی کہہ دیا تھا پھر فرمایا اس کی کتابوں میں سے کوئی کتاب تمہارے پاس ہے؟ میں نے عرض کیا ہاں۔ فرمایا اللہ انجام بخیر کرے۔ آپ کے ان الفاظ سے مجھے ڈر لگا اور گھبراتے ہوئے میں نے حضرت کے ہاتھوں کو جھک کر بوسہ دیا اور عرض کیا مجھے اس میر منشی کی طرف سے بڑا ڈر ہے۔ حاضرین نے میری مدد کی اور شیخ سے دعاء خیر کی درخواست کی۔ فرمایا طلبی تو ضرور ہو گی، لیکن سلامتی سے گذر جائے گی۔ میں اس کا منتظر رہا۔ پھر ان تمام لوگوں کی طلبی و تحقیق و تفتیش ہونے لگی جن کا میر منشی سے میل جول تھا اور جو گرفتار ہوتے انہیں طرح طرح کی سزائیں دی گئیں۔ کسی کی گردن اڑا دی گئی۔ کسی کا مال ضبط کر لیا گیا اور کسی کی ذلت و خواری کی گئی اور مجھے خوف پہ خوف طاری ہوا۔ میں شیخ کی خدمت میں جاتا تو فرماتے موت تو نہیں ہے البتہ تکلیف ضرور ہو گی۔ آپ یہی فرماتے رہے حتیٰ کہ مکناسہ (دارالسلطنت) لے جانے کے لیے میرے پاس بھی قاصد آ گیا۔ میں اسے لیکر شیخ کی خدمت میں آیا۔ آپ اُسے بڑی مسرت و انبساط سے ملے۔ اُس کے لیے دعاء خیر کی اور میرے متعلق بہت کچھ نصیحت کی۔ اس نے عرض کیا بسر و چشم۔ شیخ نے مجھے فرمایا کہ تو صحیح و سلامت واپس آ جائے گا اور اس آدمی کے ہاتھ اُس حاکم کو جو میر منشی کے معاملہ کی تفتیش کر رہا تھا، سلام بھی کہلا بھیجا۔ میں مکناسہ گیا اور میر منشی کی جو کتابیں میرے پاس تھیں، دے دیں اور انہوں نے مجھے چھوڑ دیا۔ اور میں فاس واپس چلا آیا۔ وَالحمدُ لِلّٰہ۔

اس کے بعد چند لوگوں نے جو ظلم پسند حکام میں مقرب بننا چاہتے ہیں۔ افسر تفتیش کو مجھ پر بھڑکایا اور افترا باندھ کر اس کو سنایا کہ فلاں شخص کے پاس ابھی بہت کچھ مال باقی ہے۔ چنانچہ مجھے گھر آئے ابھی ایک جمعہ ہی گذرا تھا کہ قاصد پھر آ موجود ہوا اور مجھ سے دوستی و محبت کا اظہار کیا اور کہا کہ جب تامسنا کے قاضی کو معلوم ہوا کہ تمہارا معاملہ بخیر و خوبی طے پا چکا ہے تو اس نے افسر تفتیش کو لکھا کہ سید عربی کو ہمارے پاس بھیج دو کہ موضع سلا میں ہم سے آ کر ملاقات کرے

اب آپ کی مرضی ہے خواہ چلیں یا نہ چلیں۔ میں اُسے لے کر حضرت کے پاس آیا۔ اس نے وہاں بھی اسی طرح کہا۔ شیخ خاموشی سے سن رہے تھے، پھر مجھے فرمایا کہ میری رائے ہے کہ اس کے ساتھ چلے جاؤ، لیکن تیس اوقیہ ساتھ ضرور لے لو تاکہ افسرِ تفتیش کو دے سکو۔ قاصد نے کہا حضور میری بھی یہی رائے ہے۔ میں نے عرض کیا اگر وہ مجھے قاضی السید الطاہر کی وجہ سے لے جانا چاہتا ہے تو میں اسی کے ساتھ کیوں جاؤں اور اگر جانا ہی ضروری ہے تو تیس اوقیہ لے جانے کی کیا ضرورت ہے؟ حضرت نے فرمایا میری بات مانو میں ہنسی نہیں کر رہا۔ مجھے اس شخص کے خبثِ باطن کا علم نہ تھا اور نہ ہی یہ خبر تھی کہ وہ مجھے اور فریب دے رہا ہے اور میں اپنی نادانی پر جما رہا اس پر شیخ نے وضاحت سے فرما دیا اور وہ شخص سن رہا تھا مگر ہنسی میں ٹال گیا۔ پھر جب ہم شیخ کے پاس سے اٹھ کر آنے لگے تو فرمایا موت کا خطرہ نہیں البتہ قید کئے جاؤ گے۔ چنانچہ میں اس شخص کے ساتھ مکناسہ روانہ ہو گیا مگر تیس اوقیہ جس کا شیخ نے حکم فرمایا تھا، ساتھ نہ لئے۔ جب مکناسہ پہنچے تو افسر مذکور نے میری طرف سے منہ پھیر لیا اور اپنے گھر میں مجھے قید کرنے کا حکم دیا اور فرمایا کہ جب تک میں سلطان سے تمہارے بارے میں مشورہ نہ کر آؤں تم یہاں سے نہ نکلنا۔ مجھ سے پہلے میرے شہر کے چند لوگوں کے متعلق اس نے سلطان سے مشورہ کیا تھا اور انہیں قتل کر ڈالا تھا۔ میں اس قدر ڈرا کہ اللہ ہی جانتا ہے۔ میں نے کہا اب تو قتل ہی باقی رہ گیا ہے۔ یہ افسر مشورے کے لیے روانہ ہوا۔ جب وہاں پہنچا تو اتفاق ایسا ہوا کہ اس وقت میر منشی مذکور کا ایک بھائی ابوالعباس سبتی کا غلاف لے کر آیا تھا، سلطان نے اس غلاف لانے والے کو اور ان لوگوں کو جن کا تعلق میر منشی سے تھا، سب کو شیخ کی برکت سے معاف کر دیا، لیکن مجھے سنخرہ[۱] کے بارے میں گرفتار کر لیا اور سنخرہ کی قیمت تیس اوقیہ تھی۔ اس وقت مجھے شیخ کی بات سمجھ میں آئی کہ تیس اوقیہ ساتھ لے جانا۔ میں بہت بے قرار و پریشان پھرتا رہا، حتیٰ کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل و کرم سے معاملہ آسان کر دیا اور مجھے رہائی نصیب ہوئی، والحمدللہ اور یہ سب شیخ کی برکت سے ہوا۔

چوتھی کرامت ایک مرتبہ میں مغرب کی نماز کے بعد حضرت کے گھر گیا اور دیر تک دروازے پر بیٹھا رہا، مگر دروازہ نہ کھٹکھٹایا۔ آپ بالا خانہ سے اُترے اور میں نے سیڑھیوں سے آپ کے اُترنے کی آواز سنی۔ آپ نے میرا نام لے کر پکارا۔ میں نے عرض کیا

---

[۱] سنخرہ کے معنی معلوم نہ ہو سکے (مترجم)

جی حضور۔ فرمایا کیا تو ایک گھنٹہ سے دروازے پر نہیں بیٹھا رہا۔ میں نے کہا: جی ہاں۔ اور اس وقت تاریکی بھی تھی۔ میں نے دستک بھی نہ کیا تھا اور نہ ہی جب تک آپ نے مجھے پکارا تھا، نہ کسی کو تبلایا تھا کہ میں دروازے پر ہوں۔ پھر آپ نکلے اور میں نے آپ کے دستِ مبارک کو بوسہ دیا۔

پانچویں کرامت ایک رات میں نے گھر سے باہر مدرسے میں گزاری اور صبح کو آپ کے پاس گیا۔ آپ نکلے اور فرمایا: کل رات کہاں گزاری اور گھر میں رات کیوں نہ گزاری۔ میں نے عرض کیا نہیں حضرت میں تو رات گھر میں ہی رہا، ور اس طرح آپ کو دھوکا دینا چاہا۔ فرمایا: کیا فلاں جگہ رات نہیں گزاری؟ میں نے عرض کیا نہیں۔ حضرت فرمانے لگے اگر سچ نہ کہوگے تو جو کچھ تم نے کل رات وہاں کیا ہے سب کچھ بتا دوں گا۔ میں رسوائی سے ڈرا اور آپ کے ہاتھ پر بوسہ دے کر کہا حضور سچ فرماتے ہیں۔

چھٹی کرامت ایک بار میں مدرسے میں ایک جاہل شخص سے جو حضرت کا مرتبہ نہ سمجھتا تھا جھگڑ پڑا۔ اس کے بعد جب آپ کی خدمت میں جانا ہوا تو فرمایا وہ کون شخص تھا جس سے کل رات تو جھگڑ رہا تھا اور تو نے اسے کیا کہا اور اس نے کیا کہا، میں چپ رہا، لیکن آپ نے تمام قصہ کہہ سنایا۔

آپ کی کرامات لاتعداد ہیں۔

مؤلفِ کتاب کہتا ہے کہ

ساتویں کرامت ایک بار آپ سے ایک شخص کے بارے میں باتیں ہو رہی تھیں تو میں نے عرض کیا اُسے آپ سے بڑی محبّت ہے۔ آپ نے فرمایا اُسے مجھ سے محبت نہیں ہے اگر تو اُسے آزمانا چاہے تو اسے یوں ظاہر کرنا کہ تو نے مجھ سے محبّت کرنا چھوڑ دیا ہے پھر دیکھنا وہ کیا کہتا ہے۔ وہ شخص میرے پاس آیا تو میں نے کہا مجھے تو کچھ اور ہی پتہ چلا ہے اور میں نے اس طرح باتیں کیں جن سے یہ ظاہر ہو کہ میرا خیال بدل گیا ہے۔ یہ سنکر کہنے لگا میں نے تو تجھے پہلے ہی کہہ دیا تھا اور اپنا خبثِ باطن ظاہر کر دیا۔ تب میں نے کہا کہ جناب والا میں تو آپ کو آزما رہا تھا سو آپ کی حقیقت کھل گئی۔ اس پر وہ بہت شرمندہ ہوا، پھر میں نے حضرت سے اس کا ذکر کیا آپ نے فرمایا میں نے تو تمہیں پہلے کہہ دیا تھا۔

آٹھویں کرامت ایک بار بالا خانے میں آپ کے ساتھ بیٹھا ہوا تھا اور کچھ باتیں ہو رہی تھیں

کہ یکایک پیرانی صاحبہ کے رونے کی آواز آئی اور شدّتِ غم کی وجہ سے گھر میں گھومنے لگیں کیونکہ انہیں بھائی کے مرنے کی خبر ملی تھی جو پردیس میں تھا۔ حضرت نے اُوپر سے جھانکا اور فرمایا اُس کا انتقال نہیں ہوا۔ اس کی موت کی خبر دینے والے نے جھوٹ کہا ہے اور اس پر قسم بھی کھائی، مگر پھر بھی وہ رونے سے باز نہ آئیں کیونکہ اُنہیں انتہائی غم ہوا تھا۔ اس کے بعد حضرت کے فرمان کے مطابق خبر آئی۔ پیرانی صاحبہ کا بھائی اب تک زندہ ہے۔

نویں کرامت

ایک مرتبہ آپ محلّہ عرصہ کی طرف جارہے تھے کہ آپ سے ایک شخص ملا جس کا ایک اور رشتہ دار عبدالملک بن السلطان کے ساتھ محلہ (جگہ کا نام) میں تھا۔ شیخ اُسے دیکھ چکے تھے کہ وہ ایک ایسے شخص کے پاس بیٹھا تھا جو مدعی ولایت تو تھا لیکن درحقیقت وَلی نہ تھا، لیکن جب اُس کی نظر شیخ پر پڑی تو اُٹھ کر ان کے پاس آگیا اور عرض کی مجھے پردیس (یعنی محلہ میں) گئے ہوئے بھائی کے متعلق تبلائیں، کیا وہ زندہ ہے یا مرگیا۔ کیونکہ فلاں صاجب نے (اُس کی مراد مذکورہ مدّعیِ ولایت سے تھی) مجھے تبلایا ہے کہ وہ زندہ ہے۔ شیخ نے تجاہل برتا، لیکن اُس شخص نے اصرار کیا۔ شیخ نے فرمایا اگر تم ضروری پوچھنا چاہتے ہو تو صحیح خبر یہ ہے۔ خدا غریب الوطن حاجی عبدالکریم السبکی پر رحم کرے۔ اس کے بھائی کا یہی نام تھا۔ اُس کی خبر تمہیں وہ شخص دے گا جس نے اس کی نمازِ جنازہ پڑھائی ہے۔ سلطان نے تو اسے قتل کر دیا ہے اس کے بعد شیخ کے فرمانے کے مطابق خبر آگئی۔

دسویں کرامت

شیخ کا ایک خادم ماہوار تنخواہ پر عرصہ میں کام کرتا تھا اور وہ حکومت کے ظلم سے رُوپوش تھا۔ اس کا ایک بھائی اُس کی تلاش میں تھا اور اس کی ایذا کے درپے تھا۔ شیخ نے اسے کہا کہ اسے چھوڑ دو۔ لیکن وہ نہ مانا۔ نوبت یہاں تک پہنچی کہ وہ حاکمِ ضلع کے پاس پہنچا اور کہا کہ میرا بھائی شیخ عبدالعزیز کے پاس موجود ہے اور انہوں نے مجھے اُسے یہاں لانے نہیں دیا۔ حاکم نے ایک سپاہی بھیجا۔ جب سپاہی آیا، اس وقت میں عرصہ میں آپ کے پاس بیٹھا ہوا تھا۔ کہنے لگا آپ کو حاکم بلاتا ہے، حضرت نے کہا "مجھے؟" کہا ہاں، حضرت نے فرمایا بسر وچشم۔ میں تو ایک مسکین اور رعیّت ہوں۔ مجھے بھی کہا اُٹھو۔ ہم دونوں حاکم کی طرف روانہ ہوگئے۔ سپاہی کو ندامت ہوئی تو کہنے لگا، حضرت ہمارا مقصد تو صرف اس شکایت کنندہ کے بھائی سے ہے۔ آپ اُسے ہمارے حوالے کردیں اور واپس چلے جائیں۔ فرمایا کیا میں نے تمہیں اس سے روکا ہے، چنانچہ وہ اُسے لے کر روانہ ہوگئے۔ اس کے بعد اس شخص کا بھائی صرف ایک ماہ زندہ

اور وہ شخص اس عرصہ میں واپس چلا آیا اور اُسے کوئی خطرہ نہ رہا۔

گیارھویں کرامت

جب بزتاسن کے مشہور قبیلہ نے سلطان کے خلاف بغاوت کی اور سُلطان نے اُن کے کچھ لوگ گرفتار کر لیے تو تازہ کے ایک اہلکار نے گرفتاریوں کی آگ کو اہل تازہ کی طرف منتقل کرنا چاہا۔ اُس نے اس غرض سے ایک جعلی دستاویز مرتب کی جس میں یہ ظاہر کیا کہ یہ خط انہوں نے بنی بزتاسن کو لکھا تھا اور انہیں یقین دلایا تھا کہ وہ اُن کے ساتھ ہیں اور اس تحریر کو سُلطان کے سامنے پیش کیا اور پڑھکر سنایا، سلطان یہ سُن کر آگ بگولا ہوگیا اور ارادہ کیا کہ کسی کو اُن سے بدلہ لینے کے لیے روانہ کرے، لیکن پھر خیال آیا اور اہل کار کو قید کرنے کا حکم دیا۔ اہل تازہ کو بھی اس کا پتہ چل گیا، اُن میں سے کچھ لوگ شیخ کے پاس سے گزرے اور شیخ سے مشورہ کیا کہ کیا ہم اپنا وطن چھوڑ کر بھاگ جائیں کیونکہ انہیں سلطان سے خطرہ تھا۔ شیخ نے فرمایا، اگر جیسا میں کہوں، تم کرو، تو کہوں، انھوں نے عرض کیا حضور فرمائیے ہم تو آپ کی نصیحت پر عمل کرنے کے لیے آئے ہیں۔ فرمایا، "سیدھے سلطان کا رُخ کرو، لیکن پہلے وزیر کے پاس جانا۔" انہوں نے ایسا ہی کیا۔ وزیر اُنہیں لے کر سلطان کی خدمت میں آیا۔ ان کی تعریف کی اور جو الزام اُس اہلکار نے لگایا تھا اُس سے اُنہیں بری قرار دیا۔ اس پر سلطان نے اسے قتل کرادیا۔ یہ اس کی بدذاتی کا انجام تھا۔

اسی طرح ایک اور واقعہ پیش آیا جو فاس کے اسی سرکاری عملہ میں سے تھا جن کے کچھ اوپر بیس آدمی شوال ۱۰۳۱ھ میں قتل ہو چکے تھے۔ اتفاق ایسا ہوا کہ جب اس شخص نے حاکم ضلع کی گرفتاری سے پہلے تفتیش کی خبر سُنی تو یہ بھاگ جانے کے متعلق شیخ سے مشورہ کرنے کو آیا۔ آپ نے فرمایا، بھاگنا نہیں اور خود حاکم کے پاس چلے جاؤ اور کہو میں حاضر ہوں، آپ جو چاہیں سزا دیں، لیکن میں تو فرمانبردار ہوں۔ اس نے ایسا ہی کیا۔ حاکم نے کہا اگر تو سچا ہے تو بجیج چلا جا اور تیراندازوں کے ساتھ فوجی خدمت انجام دے۔ اس نے شیخ کے پاس آکر بتایا کہ مجھے حاکم نے یہ حکم دیا ہے۔ شیخ نے فرمایا فوراً اُدھر چلا جا۔ اس کے چند دن بعد حاکم اور اس کے ساتھی گرفتار ہوگئے اور اُن کے اتنے ہی آدمی مارے گئے جتنے عملہ والوں کے مارے گئے تھے اور اللہ تعالیٰ نے شیخ کی برکت سے اس شخص کو نجات دلوائی۔

اس قسم کے معاملات میں حضرت کا یہی طریقہ تھا کیونکہ جس کسی نے آپ سے حکومت سے بھاگ جانے کا مشورہ کیا تو آپ نے یہی مشورہ دیا کہ سرکار کے ہاں خود چلے جاؤ اور اس کا انجام اچھا

ہی نکلتا۔ اگر اس قسم کی حکایات ذکر کرنے لگوں تو قصہ طولانی ہو جائے۔

بارھویں کرامت

ایک حاکم کو سلطان نے معزول کر دیا۔ اس نے کسی کو شیخ کی خدمت میں روانہ کیا تاکہ اُن سے دعا کرائے کہ وہ دوبارہ اپنے عہدے پر مقرر ہو جائے آپ نے وعدہ فرمالیا۔ چند ہی روز گزرے تھے کہ سلطان نے اُسے اپنے عہدے پر بحال کر دیا۔ حضرت نے چند حافظِ قرآن لوگوں کے بارے میں سفارش کی کہ کچھ ٹیکس انہیں معاف کر دیئے جائیں، لیکن اُس نے نہ مانا اور انکار کر دیا۔ اب اُس حاکم کا بھائی حضرت کی خدمت میں آیا اور حضرت نے اس سے وعدہ فرمالیا کہ بھائی کا عہدہ تمہیں مل جائے گا اور ایسا ہی ہوا کیونکہ حضرت کا فرمان نہ ماننے کے چند دن ہی بعد وہ آخرت کی طرف سفر کر گیا اور اُس کا بھائی اس عہدے پر مقرر ہو گیا اور اس نے جن لوگوں کے متعلق حضرت نے سفارش کی تھی، اُن کا کام کر دیا۔

تیرھویں کرامت

ابھی میری شیخ سے جان پہچان کی ابتدا ہی تھی اور میری شادی مولانا العلامہ محمد بن عمر السلجماسی (جو خانقاہِ ادریس میں رہتے تھے اور وہاں مسجد کے امام اور خطیب بھی تھے) کی بیٹی سے ہوئی تھی۔ مجھے ان کے مرتبے کا بھی علم تھا اور لڑکی کے کمالِ عقل، حسنِ معاشرت اور سلیقہ شعاری کی وجہ سے مجھے اس سے سخت محبت تھی، جب شیخ کو اس کا علم ہوا کہ میرے دل میں اُس کی کتنی قدر ہے اور اُس سے کس قدر محبت ہے تو کبھی مجھ سے یوں پوچھتے کیا تجھے مجھ سے اس جتنی محبت ہے یا اُس کی محبت زیادہ ہے۔ میں سچ کہہ دیتا اور عرض کرتا کہ اُس کی محبت زیادہ ہے اور میں معذور تھا کیونکہ مجھے شیخ کے مرتبہ اور اُن کے امام وقت ہونے کا علم نہ تھا۔ حضرت پر اس جواب کا اثر ہوتا اور ہونا بھی چاہیئے تھا کیونکہ جب تک مُرید کے دل میں شیخ، اللہ اور رسول کے سوا کسی اور چیز کی محبت ہو تو اس کا کچھ کام نہیں بن سکتا[۱]۔ آپ اس میں میرا ساتھ دیتے اور

---

[۱] شیخ کا کام مرید کو واصل باللہ بنانے کا ہوتا ہے اور جب مرید علائقِ دُنیاوی میں پھنسا ہوا ہو اس وقت اس کی توجہ ذات باری کی طرف کیسے ہو سکتی ہے؟ اس لیے شیخ دنیا و ما فیہا سے قطع تعلق کرا کے پہلے اسے فنافی الشیخ کے درجہ میں لاتا ہے جب اس میں کمال حاصل کرتا ہے تو پھر فنا فی الرسول کی باری آتی ہے اور پھر فنافی اللہ میں پہنچ کر کمال حاصل کرتا ہے اس طرح شیخ وَاللّٰہِ لَا یُؤْمِنُ اَحَدُکُمْ حَتّٰی اَکُوْنَ اَحَبَّ اِلَیْہِ مِنْ وَّالِدِہٖ وَوَلَدِہٖ وَالنَّاسِ اَجْمَعِیْنَ۔ مشکوٰۃ باب الایمان ص ۱۲ اور قُلْ اِنْ کَانَ اٰبَآؤُکُمْ وَاَبْنَآؤُکُمْ وَاِخْوَانُکُمْ وَاَزْوَاجُکُمْ وَعَشِیْرَتُکُمْ وَاَمْوَالُۨ اقْتَرَفْتُمُوْھَا

(بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر)

مجھے اس حالت سے نکالنا چاہتے، لیکن جب میں نہ مانا اور اللہ کی تقدیر میں جو کچھ لکھا ہونا تھا لکھا جا چکا تھا۔ ۲۷ رمضان ۱۱۲۵ھ کی صبح کو جب میں حاضر ہوا تو آپ نے اثنار گفتگو میں فرمایا کہ اولیار کے ساتھ میل جول رکھنا بمنزلہ زہر کھانے کے ہے۔ ہمارے فلاں شیخ نے اپنے مرید کے لیے نہ بیوی چھوڑی نہ بچہ اور اُس کو اپنا بنا لیا۔ لیکن اس اشارہ کو نہ سمجھا۔ اس کلام کے چند دن ہی بعد عورت سے جو واقعہ ہونا تھا ہوا۔ وہ بیمار ہوئی اور مر گئی۔ حضرت کو بھی اُس سے بڑی محبت تھی اس لیے آپ دلاسا دیتے رہتے اور اسے دوائیں، شربت اور جن چیزوں کی مریض کو رغبت ہوتی ہے، اس کے لیے بھیجتے اور اسے شفا کا وعدہ کرتے اور آپ کی مراد شفاء آخرت ہوتی جیسا کہ اس کا اظہار بعد میں فرمایا۔ اس کی وفات کے بعد میری گرویدگی بچہ کے ساتھ بڑھی جسے وہ نشانی چھوڑ گئی تھی کہ جب اس کو دیکھتا تو دل اُسی میں لگا رہتا۔ ماں کے بعد وہ بھی چند دن ہی زندہ رہا اور چل بسا۔ اس کے بعد میں نے فقیہ مذکور کی دوسری بیٹی سے شادی کی۔ جب اُس کے پاس گیا تو اسے اپنے گمان سے کہیں زیادہ خوبصورت اور عقل و کمال والی پایا اور وہ میرے دل پر قابض ہو گئی۔ تھوڑی مدت بعد وہ بھی چل بسی۔ اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے مجھے شیخ کی محبتِ کاملہ نصیب کی۔ جس سے بالا کوئی محبّت نہیں۔ اس کی صورت یوں ہوئی کہ ایک مرتبہ میں آپ کے پاس گھر میں بیٹھا ہوا تھا اور آپ محبّتِ الٰہی کے متعلق تقریر فرما رہے تھے کہ وہ کیسی ہوتی ہے۔ میں نے اس پر کئی ایک سوالات کئے جن کا حضرت نے جواب دیا۔ میں نے یہ جواب و سوال لکھ دیئے ہیں جنہیں آئندہ چل کر انشاء اللہ آپ دیکھ لیں گے۔ پھر آپ مسکرائے اور فرمایا ہم تمہارے ساتھ کیا تدبیر کریں۔ تم دنیا میں دو بیویوں سے محبّت کرتے رہے یہاں تک کہ اللہ نے انہیں اپنی رحمت میں لے لیا اور انہیں برزخ میں باقی تمام ارواح کے ساتھ اتارا، اس کے باوجود بھی تم اُن سے کامل محبت کرتے رہے اب بتاؤ کہ اللہ انہیں برزخ سے کہاں لے جا کر رکھے تاکہ وہ تمہارے دل سے غائب ہو جائیں۔ اللہ کی قسم شیخ کے ان الفاظ سے ان کی محبّت میرے دل سے جاتی رہی اور اب ساری محبت خالص شیخ کے ساتھ ہو گئی۔ حالانکہ میں نے فقیہ مذکور کی تیسری بیٹی سے بھی شادی کر لی تھی، لیکن دل اس کے ساتھ نہ لگا۔ چنانچہ یہ بحمد اللہ بخیر و عافیت ہے۔

(بقیہ حاشیہ صفحہ سابقہ)

وَتِجَارَةٌ تَخْشَوْنَ كَسَادَهَا أَحَبَّ إِلَيْكُمْ مِنَ اللهِ وَرَسُولِهِ وَجِهَادٍ فِي سَبِيلِهِ فَتَرَبَّصُوا حَتَّى يَأْتِيَ اللهُ بِأَمْرِهِ کا مفہوم سمجھا کر سعادتِ دارین عطا کرتا ہے۔

چودھویں کرامت

ایک مرتبہ حضرت مخدومہ پیرانی صاحبہ کو حمل قرار پایا۔ کہنے لگیں: اے میرے سردار عبدالعزیز! مجھے خدا نے کافی اولاد دی ہے لہٰذا مجھے اس حمل کی ضرورت نہیں، خاص طور پر جبکہ مجھے خانگی اُمور میں کافی مشقت اٹھانی پڑتی ہے اور نہ ہی کوئی باندی ہے جو میری مدد کرسکے۔ لہٰذا اگر آپ واقعی ولی ہیں جیسا کہ لوگ کہتے ہیں تو دُعا کریں کہ حمل گر جائے۔ شیخ ان سے فرمایا کرتے تھے کہ جب سویا کرو تو سر ڈھانپنے کے بعد چہرہ کھلا نہ چھوڑا کرو مبادا ایسی چیز نظر آجائے جس کی برداشت نہ کرسکو۔ ایک رات اتفاق سے انہوں نے چہرے سے کپڑا اٹھایا تو انہوں نے شیخ کے پاس تین مردانِ غیب دیکھے۔ اس سے وہ اتنی ڈریں کہ حمل گر گیا۔

پندرھویں کرامت

تمام گھر والوں نے اور ان لوگوں نے جو حضرت کی زیارت کے لیے آتے ہوئے تھے اس کرامت کا مشاہدہ کیا ہے کہ کبھی آپ کو اپنے جسم سے خفیف غیبوبت[1] حاصل ہوتی تھی یہاں تک کہ جو آپ کے پاس بیٹھے ہوتے وہ یہ خیال کرتے کہ آپ کی رُوح جسم سے پرواز کر گئی ہے اور آپ کی ذات میں کوئی حرکت نہ ہوتی۔ نہ سانس میں نہ ہونٹوں میں نہ رگوں میں چنانچہ ایک دن ایسی حالت طاری ہوئی اور ایک آدمی آیا۔ اس نے دیکھا کہ نور بجلی کی طرح اُوپر کو چڑھ رہا ہے اور پھیل رہا ہے۔ اگرچہ یہ سُرعت میں بجلی سے کم تیز ہے مگر صفائی میں اُس سے زیادہ صاف ہے۔ اُس نے باہر جاکر لوگوں کو خبر دی۔ لوگوں نے آکر یہ حالت دیکھی۔ دوسرے دن جب حضرت سے ملا اور آپ کے ساتھ عرصہ کی طرف گیا تو آپ نے اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّآ اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ پڑھا اور فرمایا کل ایسی بات ظاہر ہو گئی جسے میں مخفی رکھا کرتا تھا۔ میں نے عرض کیا حضرت واقعہ تو میں سن چکا ہوں، لیکن اس میں کیا راز ہے۔ فرمایا یہ جناب محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا نور تھا اور پھر تمام واقعہ بیان کیا۔ خدا ہمیں حضرت کی ذات سے نفع پہنچائے۔

سولھویں کرامت

میرا ایک حافظ قرآن دوست مشہور قبیلہ جبائیہ میں سے تھا۔ جب ۱۱۲۷ھ میں اس قبیلے پر ظلم و ستم ڈھائے گئے تو جو شخص اُن پر حاکم مقرر تھا میں نے اُس کے پاس ایک شخص کو اپنے مذکورہ بالا دوست کی سفارش کرنے کو بھیجا۔ اُس نے میرے دوست کو تمام مطالبات سے رہائی دے دی۔ پھر وہ حاکم دو سال مامور رہنے کے بعد معزول ہو گیا اور اس کی جگہ ایسا شخص حاکم مقرر ہوا جس کے بارے میں پختہ یقین تھا کہ وہ جیسا میں کہوں گا۔ ویسا ہی

---

[1] روح کی جسم سے علیحدگی

کریگا۔ چنانچہ میں نے اسی دوست کے بارے میں کہلا بھیجا، لیکن اس نے کسی قسم کا کوئی کام نہ کیا میں نے چاہا کہ حاکمِ اعلیٰ کو کہلا بھیجوں تو شیخ نے فرمایا اگر اللہ کی مرضی اُسے آزاد کرنے کی ہوتی تو حاکم تمہاری بات مان لیتا اور کام کر دیتا، لیکن میں نے تغافل برتا اور سفارش پر سفارش بھیجتا گیا جو لوگ میرا سفارشی رُقعہ لے کر جاتے انہیں دیکھ کر وہ بہت خوش ہوتا اور واضح طور پر کہتا کہ میں کام کر دُونگا، لیکن اس کے باوجود نہ کرتا۔ میں نے کئی بار کوشش کی، لیکن اس سے اللہ نے کوئی کام نہ ہونے دیا۔ مجھے شیخ کے کشف کی صداقت معلوم ہو گئی۔

سترھویں کرامت

ایک روز میں آپ کے پاس عرصہ میں تھا اور آپ کے پاس عبدالسلامؒ بن مشیش کی اولاد میں سے ایک سید بھی بیٹھا ہوا تھا۔ اس سید نے عرض کیا کہ حضرت سادات نے سلطان کے پاس اس پہاڑ کے رہنے والوں میں سے جو شیخ عبدالسلامؒ کی قبر کے پاس ہے ایک شخص کی شکایت کی ہے کہ اس نے سیدانیوں سے شادی کی ہے۔ حالانکہ وہ عوام میں سے ہے اور سلطان اس بات کو سخت بُرا جانتا ہے۔ جب اس نے یہ سنا تو اُسے گرفتار کر کے لایا گیا اور قتل کی دھمکی دی گئی۔ شیخ نے فرمایا: کیا یہ شخص اللہ سے نہیں ڈرتا۔ اس نے کیسے مولائی عبدالسلام کی بیٹیوں سے شادی کر لی۔ حالانکہ اس میں کئی قسم کے عیب[1] پائے جاتے ہیں۔ اس سید نے عرض کیا حضور آپ کو یہ کیسے معلوم ہو گیا حالانکہ نہ تو آپ اس شخص کو جانتے ہیں اور نہ ہی کبھی آپ نے اُسے دیکھا اور نہ کبھی پہلے اُس کے متعلق کچھ سُنا اور یہ عیب جس کا ذکر آپ نے کیا ہے اس کا تو اس کے قبیلے کے چند لوگوں کو علم ہے۔ اس کو شیخ کا کشف دیکھ کر تعجب ہوا اور اس نے شیخ کے ہاتھوں کو بوسہ دیا۔

اٹھارویں کرامت

یہ کرامت میں نے آپ کے اپنے ہاتھ سے الحاج عبدالقادر التّازی کی بیاض میں لکھی ہوئی دیکھی ہے۔

حضرت پہلے محمد بن عمر الدلامیؒ کے حمام میں ملازم تھے۔ وہ حج کی غرض سے چلے گئے تو آپ اسی خدمت پر الحاج عبدالقادر شمازی کے پاس ملازم ہو گئے۔ عبدالقادر بیان کرتے ہیں کہ ایک دن حضرت نے کاپی لی اور اس پر لکھا "شکر ہے خدا کا جو ایک ہے" سیدی محمد بن عمر آج فوت ہو گئے اور جوارِ رحمت میں چلے گئے۔ یہ الفاظ ماہ ذوالقعدہ ۱۱۱۸ھ میں عبدالعزیز بن مسعود الدباغؒ نے کہے اور لکھے۔ خدا اس پر مہربانی کرے، آمین۔

عبدالقادر کہتے ہیں، میں نے بلند آواز سے کہا، کیا لکھ رہے ہو وہ کہتے ہیں کہ اس سے پہلے بھی میں

---

[1] اصل کتاب میں تجرطافیت لکھا ہے جس کے معنی نہ معلوم ہو سکے (مترجم)

کرامات کا مشاہدہ کر چکا تھا۔ اس پر حضرت نے قلم لے کر لکھی ہوئی عبارت کاٹ دی اور فرمایا کچھ نہیں لکھ۔ عبدالقادر کہتے ہیں کہ جب حاجی آئے تو انہوں نے محمد بن عمر مذکور کی وفات کی خبر دی کہ اسی ماہ میں انتقال ہوا جس میں شیخ نے فرمایا تھا۔

میں نے شیخ سے عرض کیا آپ نے یہ کیسے کہا حالانکہ آپ کو فتح (کشف) تو ۱۱۲۵ھ میں حاصل ہوئی تھی۔ فرمایا: جب سے میں نے وہ امانت پہنی تھی جس کی وصیت سیدی عربی فشتالیؒ نے کی تھی، مجھے فتح حاصل ہو چکی تھی، لیکن وہ تنگ تھی اور جب کسی چیز کی طرف توجہ دیتا تو وہ مجھ سے چھپتی نہ تھی، لیکن ساتھ ہی اس کے سوا کچھ اور نظر نہ آتا تھا۔

(مؤلف کتاب کہتا ہے) کہ حضرت نے صحیح فرمایا کیونکہ جو لوگ آپ سے دوسرے دَور میں ملتے رہتے تھے وہ آپ کے کشف و کرامات کا ذکر کرتے رہتے تھے۔

اُنیسویں کرامت

جس زمانہ میں آپ محمد بن عمرؒ مذکور کے پاس ملازم تھے تو ایک دن علی الصبح آپ اس دیگچے کے قریب گئے جس پر وہ کام کیا کرتے تھے اس پر دیگچے کے منتظم نے آپ کو ڈانٹا۔ شیخ کو غصہ آگیا اور فرمایا جتنی دیر چاہو لکڑیاں جلاتے رہو۔ اللہ کی قسم یہ دیگچہ کبھی گرم نہ ہوگا، چنانچہ صبح سے لیکر عصر تک وہ لکڑیاں جلاتے رہے اور بہت سا ایندھن ضائع ہو گیا، لیکن پھر بھی پانی ٹھنڈا تھا۔ محمد بن عمرؒ کہیں گئے ہوئے تھے۔ جب آئے تو انہوں نے سارا قصہ سنایا۔ کہنے لگے، سیدی عبدالعزیز کیا مجھے آپ چھوڑنا چاہتے ہیں؟ مجھے تو آپ سے محبت ہے اور آپ سے نیکی کرتا رہتا ہوں۔ جس نے آپ کو ڈانٹا ہے اُسے تو کوئی نقصان نہیں پہنچ رہا۔ نقصان تو میرا ہے اور میرا کوئی قصور نہیں۔ الغرض وہ شیخ سے مہربانی کی درخواست کرتے رہے اور اُن کو راضی کرنا چاہتے تھے۔ شیخ فرماتے ہیں کہ مجھے شرم آگئی، کیونکہ اُن کا مجھ پر بڑا احسان تھا کیونکہ خواہ میں کام کرتا یا نہ کرتا وہ مجھے اُجرت دے دیا کرتے اور کہتے کہ میں نے تو آپ کو برکت کے لیے رکھا ہوا ہے، نہ کام کے لیے۔ شیخ فرماتے ہیں کہ میں نے ایندھن لے کر دیگچے کے نیچے ڈالا اور کہا تمہیں تو آگ جلانا نہیں آتا۔ یہ لو دیگچہ گرم ہونے لگا۔ انہوں نے پانی کو چھوڑا تو اسے گرم پایا۔ اس سے سب متعجب ہوتے۔

اس حکایت اور کرامت کو میں نے کئی ایک شخصوں سے سنا ہے اور خود شیخ سے بھی سنا ہے۔

بیسویں کرامت

آپ کی ایک کرامت یہ بھی ہے کہ جب میں آپ سے کسی مسئلہ کے متعلق علماء کے اقوال دریافت کرتا (تو باوجود اُمّی ہونے کے) آپ کو پورا علم ہوتا کہ اس

مسئلہ میں اتفاق ہے اور اس میں اختلاف ہے اور ہر مسئلہ میں علماء ظاہر اور علماء باطن کے اقوال سے واقف پاتا۔ پورے چھ سال تک میں اس کا تجربہ کرتا رہا۔ آپ کو گذشتہ زمانہ کے حوادث کا بھی علم تھا۔ ایک روز میں آپ کے ساتھ سوق الخمیس میں تھا کہ آپ سے بجلی کی گرج اور کڑک کا سبب دریافت کیا تو آپ نے اس کے متعلق ایسی باتیں بیان کیں جنہیں آپ جیسا شخص ہی بیان کر سکتا ہے پھر دورانِ گفتگو میں اُس آگ کا ذکر ہوا جو قریظہ میں جمادی الآخرہ ۶۵۴ھ میں ظاہر ہوئی تھی، اسکا ذکر قرطبیؒ نے تذکرہ میں، حافظ ابن حجرؒ نے کتاب الفتن میں اور ابو شامہؒ اور نوویؒ نے اپنی تصانیف میں بالتفصیل کیا ہے۔ میرا ارادہ ہوا کہ ان کی روایات آپ کو سناؤں، لیکن آپ نے اس کا قصہ اور اس کی کیفیت بیان کرنی شروع کر دی اور علماء رضی اللہ عنہم کے اقوال بھی نقل کر دیئے اور اپنی طرف سے اس کا سبب بھی بیان فرما دیا اور اس شخص کا نام بھی جس کو آخرت میں اس آگ کا عذاب دیا جائے گا مع دیگر اسرار کے جن کا اظہار مناسب نہیں ہے۔ اس سے مجھ کو بہت تعجب ہوا۔

یاد رکھیں کہ آپ کی کرامات لاتعداد ہیں۔ اگر جتنی کرامات کا مجھے علم ہے اور جن کا علم دوستوں کو ہے سب کا ذکر کرنے لگوں تو ایک ضخیم کتاب بن جائے، لیکن ہم اتنے پر ہی اکتفا کرتے ہیں۔

احادیث کے متعلق استفسار

اکیسویں اور سب سے بڑی کرامت

جس طرح میں نے ایک بڑی کرامت (سلامتی عقیدہ واستقامت علی الدین) سے ابتدا کی تھی اسی طرح

۱۔ قرطبیؒ: شمس الدین محمد بن احمد بن فرح انصاری اُندلسی متوفی ۶۷۱ھ: ۱۲۷۲ء کتاب کا پورا نام التذکرہ باحوال الموتیٰ و امور الآخرۃ ہے۔ اس کا اختصار امام عبدالوہاب شعرانی نے کیا اور مختصر التذکرہ نام رکھا یہ دونوں چھپ چکے ہیں۔

۲۔ ابو شامہؒ: حافظ علامہ المجتہد، ذوالفنون شہاب الدین ابوالقاسم عبدالرحمن بن اسمٰعیل المقدسی، شافعی تھے ۵۹۹ھ ۱۲۰۳ء میں پیدا ہوئے اور ۶۶۵ھ ۱۲۶۶ء میں ان کی وفات ہوئی۔ کتاب الروضتین فی اخبار الدولتین اور کتاب الذیل ان کی تصانیف میں سے ہیں۔

۳۔ نوویؒ: ابوزکریا محی الدین بن یحییٰ بن یحیی بن شرف مشہور محدث اور شارح صحیح مسلم ۶۳۱ھ ۱۲۳۲ء میں پیدا ہوئے اور ۶۷۶ھ ۱۲۷۷ء میں وفات پائی۔

ایک بڑی کرامت پر اس بحث کو ختم کرتا ہوں اور وہ یہ ہے کہ شروع میں جب آپ سے تعارف ہوا اور میں نے آپ کے وسعتِ عرفان اور فیضانِ ایمان کو دیکھا تو میں نے آپ کو آزمانا شروع کر دیا اور آپ سے صحیح اور موضوع احادیث کے متعلق دریافت کیا اس وقت میرے پاس حافظ جلال الدین السیوطی رحمۃ اللہ تعالیٰ کی مشہور کتاب اَلدُّرَرُ الْمُنْتَثِرَۃُ فِی الْاَحَادِیْثِ الْمُشْتَھِرَۃِ تھی۔ یہ ایک عجیب تالیف ہے جس میں سیوطیؒ نے مشہور احادیث کو حروف تہجی پر مرتب کیا ہے اور ہر حدیث کے متعلق بیان کیا ہے کہ یہ صحیح ہے یا موضوع۔ چنانچہ صحیح کے متعلق کہتے ہیں کہ صحیح ہے اور جھوٹی کو جھوٹی۔ یہ کتاب ہر طالب علم کے پاس ہونی چاہیئے۔ کیونکہ یہ ایک نفیس کتاب ہے۔

حدیث: اُمِرْتُ اَنْ اَحْکُمَ بِالظَّوَاھِرِ چنانچہ میں نے آپ سے حدیث اُمِرْتُ اَنْ اَحْکُمَ بِالظَّوَاھِرِ کے متعلق دریافت کیا فرمایا یہ آنحضرتؐ کا فرمودہ نہیں۔ چنانچہ حافظ سیوطیؒ نے بھی یہی لکھا ہے۔

حدیث: کُنْتُ کَنْزًا لَّا اُعْرَفُ میں نے کُنْتُ کَنْزًا لَّا اُعْرَفُ کے متعلق پوچھا، فرمایا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمودہ نہیں ہے اسی طرح حافظ سیوطیؒ نے کہا ہے کہ اس کی کوئی اصل نہیں ہے۔

حدیث: اَوَّلُ مَا خَلَقَ اللّٰہُ الْعَقْلَ پھر حدیث اَوَّلُ مَا خَلَقَ اللّٰہُ الْعَقْلَ کے متعلق دریافت کیا۔ فرمایا نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے نہیں فرمایا۔ احمد بن حنبل نے بھی یہی کہا ہے۔ ابن الجوزیؒ[2] نے اس کا ذکر موضوعات میں کیا ہے۔ ابن تیمیہؒ[3] نے تصریح کی ہے کہ یہ جھوٹ ہے۔ زرکشی نے بھی کہا ہے کہ بالاتفاق یہ موضوع ہے۔ اسی طرح حافظ سیوطیؒ نے اپنی کتاب اَللّآلِی الْمَصْنُوْعَۃُ فِی الْاَحَادِیْثِ الْمَوْضُوْعَۃِ میں لکھا ہے اگرچہ اَلدُّرَرُ الْمُنْتَثِرَۃِ میں اس کی

۱۔ حافظ جلال الدین سیوطیؒ: سیوط میں ۸۴۹ھ ۱۴۴۵ء میں پیدا ہوئے۔ ابھی آٹھ سال کی عمر نہ ہوئی تھی کہ قرآن مجید حفظ کر لیا تھا۔ قاہرہ میں عرصہ تک درس دیتے رہے۔ اُن کی پانچ سو کے قریب تصانیف ہیں ۹۱۱ھ ۱۵۰۵ء میں وفات پائی۔ انہیں خاتم الحفاظ بھی کہا جاتا ہے۔

۲۔ ابو الفرج عبد الرحمٰن بن الجوزی الحنبلیؒ: پیدائش ۵۱۰ھ میں اور وفات ۵۹۷ھ میں ہوئی مشہور محدث اور مؤرخ گزرے ہیں۔

۳۔ ابن تیمیہؒ: حرّان میں ۶۶۲ھ ۱۲۶۳ء میں پیدا ہوئے۔ دمشق میں تعلیم حاصل کی، انکا بلا کا حافظہ تھا چنانچہ کہا جاتا ہے کہ جس حدیث کو ابن تیمیہ تسلیم نہ کریں وہ حدیث ہی نہیں ہے انکی بہت سی تصانیف ہیں۔ ۷۲۹ھ ۱۳۲۸ء میں وفات پائی۔

تائید میں ایک اور حدیث نقل کی ہے (اس سورت میں یہ روایت بالمعنی ہو گی جو محتاط محدثین کے ہاں مقبول نہیں ہے اور روایت بالمعنی میں حدیث کے الفاظ آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کے الفاظ نہیں ہوتے)۔

(مؤلف کہتا ہے) کہ یہ مؤید حدیث حسن بصریؒ کی مرسل احادیث میں سے ہے جن کے متعلق ابن حجر نے شرح میں کہا ہے کہ حسن بصری کی مرسل احادیث قابل استدلال نہیں ہیں۔

حدیث: اِتَّخِذُوا عِنْدَ الْفُقَرَاءِ یَدًا فَاِنَّ لَهُمْ دَوْلَةً یَوْمَ الْقِیَامَةِ

پھر میں نے حدیث اِتَّخِذُوا عِنْدَ الْفُقَرَاءِ یَدًا فَاِنَّ لَهُمْ دَوْلَةً یَوْمَ الْقِیَامَةِ کے متعلق پوچھا فرمایا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسا نہیں فرمایا۔ حافظ سیوطی نے اَلْحَاوِیْ فِی الْفَتَاوٰی میں یہی کہا ہے۔

حدیث: اُحِبُّ الْعَرَبَ لِثَلَاثٍ الخ

پھر حدیث اُحِبُّ الْعَرَبَ لِثَلَاثٍ لِاَنِّیْ عَرَبِیٌّ وَّ الْقُرْاٰنُ عَرَبِیٌّ وَّ کَلَامُ اَهْلِ الْجَنَّةِ عَرَبِیٌّ کے متعلق پوچھا۔ فرمایا نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے نہیں فرمایا۔ ابن الجوزی نے موضوعات میں یہی لکھا ہے حاکمؒ نے جو اسے صحیح لکھا اس میں شک ہے۔

حدیث: عُلَمَاءُ اُمَّتِیْ

پھر حدیث عُلَمَاءُ اُمَّتِیْ کَاَنْبِیَاءِ بَنِیْ اِسْرَائِیْلَ کے متعلق دریافت کیا۔ فرمایا یہ حدیث ہی نہیں ہے۔ سیوطی نے الدرر میں یہی لکھا ہے۔

حدیث: اَکْرِمُوْا عَمَّاتِکُمُ النَّخْلَ

پھر حدیث اَکْرِمُوْا عَمَّاتِکُمُ النَّخْلَ کے متعلق پوچھا فرمایا یہ حدیث نہیں ہے۔ ابن حجرؒ نے شرح میں، سیوطی نے اللآلی المصنوعہ میں اور ابن جوزی نے موضوعات میں یہی لکھا ہے۔

۱۔ حسن بصریؒ: مشہور صوفی اور زاہد گزرے ہیں۔ وہ ان لوگوں میں سے تھے جو خدا کے بارے میں لومۃ لائم کی پروا نہیں کرتے تھے۔ ۱۱۰ھ، ۷۲۸ء میں وفات پائی۔

۲۔ حاکمؒ: ابو عبداللہ محمد بن عبداللہ المعروف بالحاکم نیشاپوری متوفی ۴۰۵ھ، ۱۰۱۴ء انہوں نے مستدرک تالیف کی جس میں صحیحین کی شرط پر احادیث کا اخراج کیا مگر اس کتاب میں بہت سی ضعیف اور موضوع احادیث پائی جاتی ہیں۔ حافظ ابن حجرؒ فرماتے ہیں کہ انہوں نے پہلے مستدرک لکھی پھر اس میں کانٹ چھانٹ کرنا چاہا مگر موت نے مہلت نہ دی اس لیے ضعیف احادیث رہ گئیں۔

حدیث: اَنَا اَفْصَحُ مِنْ نَطَقَ بِالضَّادِ

پھر حدیث اَنَا اَفْصَحُ مِنْ نَطَقَ بِالضَّادِ کے متعلق دریافت کیا۔ فرمایا یہ بھی حدیث نہیں ہے۔ حافظ ابن کثیرؒ[1] اور حافظ الجزریؒ نے النشر اور سیوطی نے الدرر میں اسی طرح لکھا ہے۔

اسی طرح میں نے بہت سی احادیث کے متعلق دریافت کیا جو اس وقت مجھے یاد نہیں ہیں اور آپ کا جواب بالکل علماء و محدثین کے موافق پایا۔

عجیب بات تو یہ تھی کہ جب میں آپ سے اس قسم کی گفتگو کرتا تو آپ اُس حدیث کو جسے بخاری نے بیان کیا ہے اور مسلمؒ[2] میں نہیں ہے یا مسلم نے دی ہے اور بخاری نے نہیں دی اُن میں امتیاز کر لیتے بالآخر جب ایک عرصے تک آپ کا امتحان کرتا رہا اور مجھے تحقیق ہوگئی کہ آپ حدیث اور غیر حدیث میں امتیاز کر سکتے ہیں تو میں نے دریافت کیا کہ آپ کیسے یہ معلوم کرتے ہیں؟ تو ایک بار فرمایا کہ

کلام نبی صلی اللہ علیہ وسلم چُھپا نہیں رہتا

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا کلام چُھپا نہیں رہ سکتا، لیکن ایک بار پھر یہی سوال کیا تو فرمایا جب انسان موسم سرما میں بات کرتا ہے تو اس کے منہ سے بھاپ نکلتی ہے، لیکن یہ بھاپ موسم گرما میں نہیں نکلتی یہی حال اُس شخص کا ہے جو کلام

اولیاء اللہ کلام نبیؐ کو کیسے پہچانتے ہیں۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم پڑھتا ہے کہ اس کے کلام سے نور نکلتا ہے اور جو کسی اور کا کلام پڑھتا ہے تو کلام بغیر نور کے نکلتا ہے۔[3]

دوسری پہچان

ایک بار پھر پوچھا تو فرمایا: جب چراغ غذا حاصل کرتا ہے تو اس کا نُور قوی ہو جاتا ہے، لیکن جب غذا کے بغیر چھوڑ دیا جائے تو اپنی حالت پر رہتا ہے۔

۱۔ ابن کثیرؒ: امام حافظ ابوالفداء اسمٰعیل بن عمر القرشی الدمشقی متوفی ۷۷۴ھ، ۱۳۷۲ء مشہور محدث ہیں ان کی متعدد تصانیف ہیں۔ ان میں سے ایک تفسیر قرآن بھی ہے۔

۲۔ مسلمؒ: مسلم بن حجاج القشیری ۲۰۴ھ، ۸۱۹ء میں پیدا ہوئے اور ۲۶۱ھ، ۸۷۴ء میں وفات پائی۔ ان کی صحیح مسلم کا شمار صحاح ستہ میں ہوتا ہے۔

۳۔ امام عبدالوہاب شعرانیؒ متوفی ۹۷۳ھ نے اسی قسم کا ایک واقعہ شیخ محمد بن احمد فرغلؒ متوفی ۸۵۳ھ کا نقل کیا ہے۔ حضرت فرغل امی تھے ایک روز ایک فقیہ ان کے پاس آکر بیٹھ گئے اور قرآن پڑھنا شروع کیا۔ فقیہ نے قرارت میں چند آیات چھوڑ دیں اور آگے پڑھنا جاری رکھا حضرت فرغلؒ بول اُٹھے آپ نے عبارت چھوڑ دی ہے حضرت فرغل نے فرمایا: جب آپ قرآن پڑھ رہے تھے تو (بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر)

عارفین کا بھی یہی حال ہے کہ جب وہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا کلام سنتے ہیں تو ان کے انوار قوی اور ان کے معارف میں بیشی ہو جاتی ہے لیکن جب غیر کا کلام سنتے ہیں تو اپنی حالت پر رہتے ہیں۔

اولیاء اللہ خواہ وہ اُمّی ہی کیوں نہ ہوں قرآن اور حدیث میں امتیاز کر سکتے ہیں

جب مجھے یہ معلوم ہو گیا کہ آپ اس معاملہ میں راسخ ہیں اور آپ ان الفاظ کو پہچاننے میں جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے دہن مبارک سے نکلے ہوں پہاڑ کی طرح متزلزل نہیں ہوتے، تو میں نے چاہا کہ قرآن اور حدیث میں فرق کے متعلق آپکو آزماؤں کیونکہ انہیں دوسری سورتوں کا تو ذکر ہی کیا سبّح کا حزب بھی یاد نہ تھا۔ چنانچہ کبھی میں ایک آیت پڑھتا اور پوچھتا حضور یہ حدیث ہے یا قرآن۔ فرماتے یہ تو قرآن ہے، پھر حدیث پڑھتا اور پوچھتا کیا یہ قرآن ہے یا حدیث، فرماتے حدیث ہے۔ مدت تک اس کا بھی امتحان کرتا رہا حتی کہ ایک مرتبہ یوں پڑھا حَافِظُوا عَلَى الصَّلٰوٰتِ وَالصَّلٰوةِ الْوُسْطٰى وَهِيَ صَلٰوةُ الْعَصْرِ وَقُوْمُوْا لِلّٰهِ قٰانِتِيْنَ اور پوچھا آیا یہ قرآن ہے یا حدیث۔ فرمایا کچھ قرآن ہے کچھ حدیث وَهِيَ صَلٰوةُ الْعَصْرِ کے الفاظ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے دہن مبارک سے نکلے ہیں۔ یہ قرآن کے الفاظ نہیں ہیں اور باقی قرآن کے ہیں۔ جب میں نے یہ سوال کیا تھا تو میرے ساتھ علماء کی ایک جماعت بھی بیٹھی ہوئی تھی۔ یہ سنکر واللہ سب حیران رہ گئے۔

قرآن اور حدیث قدسی میں فرق

جب مجھے علم ہو گیا کہ آپ قرآن اور حدیث میں امتیاز کر سکتے ہیں تو خیال آیا کہ قرآن اور حدیثِ قدسی کے فرق کے بارے میں آزماؤں۔ اس پر میں نے حدیث قدسی ذکر کرنی شروع کی اور پوچھتا گیا یہ قرآن ہے یا حدیث؟ آپ فرماتے یہ نہ تو قرآن ہے نہ ایسی حدیث ہے جیسی تم پہلے پوچھتے رہے ہو۔ یہ تو حدیث کی ایک اور قسم ہے جسے حدیثِ ربانی کہا جاتا ہے۔ میں نے آپ کے دستِ مبارک پر بوسہ دیا اور عرض کیا کہ ہم اللہ سے پھر آپ سے درخواست کرتے ہیں کہ ان تینوں میں فرق بیان کر دیں کیونکہ حدیثِ قدسی ایک طرف تو قرآن سے مشابہت رکھتی ہے اور دوسری طرف اس حدیث سے جو قدسی نہیں ہے قرآن سے اس کی مشابہت تو اس لیے ہے کہ یہ اللہ کی طرف سے مُنزّل ہوتی ہے اور غیر قدسی حدیث

(بقیہ حاشیہ صفحہ سابقہ)

مجھے آسمان تک چڑھتا ہوا ایک نور دکھائی دیتا تھا کہ یکایک درمیان میں منقطع ہو گیا اور بعد کے نور سے اس کا اتصال نہ ہوا۔ اس سے میں سمجھ گیا کہ آپ نے عبادت چھوڑ دی ہے۔ (لواقح الانوار ج ۲: ۹۶)

سے مشابہت اس لیے ہے کہ اس کی تلاوت کا حکم نہیں دیا گیا۔

آپ نے فرمایا: یہ تینوں کلام اگرچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے دہنِ مبارک سے نکلے ہیں اور ان میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے انوار پائے جاتے ہیں، پھر بھی ان میں یہ فرق ہے کہ قرآن میں جو نور ہے وہ قدیم ہے اور ذاتِ حق سبحانہ میں سے نکلا ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ کا کلام بھی قدیم ہے[1] اور حدیثِ قدسی کا نور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی رُوح کا نور ہے اور نورِ قرآن کی طرح قدیم نہیں ہے اور جو نور حدیثِ غیر قدسی میں پایا جاتا ہے وہ آپ کی ذات کا نور ہے۔ روح کا نہیں لہٰذا یہ تین قسم کے نور ہوئے جو اپنی نسبت کے لحاظ سے مختلف ہوتے ہیں۔ چنانچہ نورِ قرآن ذاتِ حق سبحانہ وتعالیٰ کی طرف سے ہے۔ نورِ حدیثِ قدسی روحِ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے اور غیر قدسی حدیث کا نور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات سے۔

نورِ ذاتِ نبی اور نورِ روح میں فرق

میں نے عرض کیا: نورِ رُوح اور نورِ ذات میں کیا فرق ہے فرمایا کہ ذات کی پیدائش تو مٹی سے ہوئی اور تمام مخلوقات بھی مٹی سے پیدا ہوئی اور رُوح ملأ اعلیٰ سے ہے اور ملاءِ اعلیٰ حق سبحانہٗ و تعالیٰ کی سب سے زیادہ معرفت رکھتے ہیں اور چونکہ ہر شے اپنی اصل کی طرف رجوع کرتی ہے لہٰذا

---

[1] بندۂ عاجز مترجم کہتا ہے کہ اس میں بھی حضرت دباغؒ کی کرامت پائی جاتی ہے کیونکہ حضرت کا یہ عقیدہ عین اہل السنت کے عقیدہ کے مطابق ہے کہ کلام اللہ قدیم ہے، حادث نہیں ہے برخلاف معتزلہ کے کہ اُن کے عقیدہ کے مطابق کلام اللہ قدیم نہیں بلکہ حادث ہے اور تمام محدثین و فقہا اہل السنت کا اجماع ہے کہ معتزلہ کا عقیدہ باطل ہے۔ (مترجم)

[2] حضرت عبدالعزیز دباغ رحمۃ اللہ علیہ کے اس فرمان سے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا نور حادث ہے۔ قدیم نہیں ہے ایک اہم مسئلہ حل ہو جاتا ہے جس کی وجہ سے آج کل مسلمان کے دو مقتدر گروہوں کے درمیان جھگڑا چل رہا ہے۔ یعنی دیوبندی اور بریلوی۔ ایک گروہ نورِ محمدی صلی اللہ علیہ وسلم پر زور دیتا ہے اور دوسرا گروہ توحید باری تعالیٰ کے پیشِ نظر اس سے انکار کرتا ہے لیکن اگر حضرت دباغ کے بیان کو مدنظر رکھا جائے تو کوئی اشکال نہیں رہتا اور درست بھی یہی ہے کہ نورِ محمدی صلی اللہ علیہ وسلم حادث ہے اور نورِ خداوندی ازلی و قدیم۔ اور دونوں کے درمیان بیّن فرق ہے۔ (مترجم)

نورِ رُوح کو حق سبحانہٗ کے ساتھ تعلق ہوگا اور نورِ ذات کو مخلوق سے۔ اسی لیے احادیثِ قدسیہ کا تعلق حق سبحانہٗ کے ساتھ ہے یا تو ان میں حق سبحانہ کی عظمت کا اظہار ہوگا یا اظہار رحمت کا یا اس کی وسعتِ ملک اور کثرتِ عطا کا۔

حدیثِ قدسی کی قسمیں

چنانچہ پہلی قسم کی حدیث قدسی کی مثال جس میں عظمت خداوندی کا اظہار ہے مسلم کی یہ حدیث ہے جس کی روایت ابوذر رضؓ نے کی ہے۔ یَا عِبَادِیْ لَوْ اَنَّ اَوَّلَکُمْ وَاٰخِرَکُمْ وَاِنْسَکُمْ وَجِنَّکُمْ الخ[1]

دوسری قسم کی حدیث کی مثال جس میں اظہار رحمت ہوتا ہے، یہ حدیث ہے اَعْدَدْتُ لِعِبَادِیَ الصّٰلِحِیْنَ۔

تیسری قسم کی حدیث کی مثال جس میں وسعت ملک اور کثرتِ عطا کا ذکر ہے، یہ حدیث ہے یَدُ اللّٰہِ مَلْاٰیٌ لَا تَغِیْضُھَا نَفَقَۃٌ سَحَّآءُ اللَّیْلِ وَالنَّھَارِ الخ[2]

اور حق سبحانہ تعالیٰ کے بارے میں یہ علوم رُوح کے علوم ہیں اور جو احادیث غیر قدسیہ ہیں ان میں اُن کا روئے سخن صرف ان امور کی جانب ہوتا ہے جن کا تعلق عباد و بلاد کی اصلاح کے ساتھ ہے مثلاً یہ کہ ان میں حلال وحرام بیان ہوتا ہے یا وعدہ و وعید کا ذکر کر کے خدا کی اطاعت کی ترغیب دی جاتی ہے۔

میں نے حضرت کی تقریر سے جو کچھ سمجھا یہ اس کا خلاصہ ہے ورنہ حق بات یہ ہے کہ میں اسے پورے طور پر بیان نہیں کر سکا اور نہ ہی پورا مفہوم ادا کیا ہے۔

حدیثِ قدسی کلام خداوندی نہیں بلکہ کلام نبی صلعم ہے

پھر میں نے دریافت کیا کہ حدیث قدسی اللہ کا کلام ہے یا نہیں۔ فرمایا یہ اللہ کا کلام نہیں ہے، یہ تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا کلام ہے۔ میں نے سوال کیا تو پھر اسے اللہ تعالیٰ کی طرف کیوں منسوب کیا جاتا ہے اور اسے حدیثِ قدسی کیوں کہا جاتا ہے اور پھر اس حدیث کے متعلق یہ الفاظ استعمال کئے جاتے ہیں کہ اس حدیث کو آنحضرت صلی اللہ علیہ [illegible] نے اپنے رب سے روایت فرمایا ہے اور جب یہ حدیث کلام نبی صلی اللہ علیہ وسلم قرار پائی تو پھر رب سے روایت کہاں ہوئی؟ مزید براں ان احادیث میں جو ضمیر متکلم کی آتی ہے، ان کا کیا کریں؟

---

[1] مشکوٰۃ باب الاستغفار صہ ۲۰۳ نیز صہ ۲۰۵ باب التوبہ)

[2] مشکوٰۃ باب صفۃ الجنۃ و اھلھا صہ ۴۹۵

مثلاً اس حدیث میں یَا عِبَادِی لَوْ اَنَّ اَوَّلَکُمْ وَاٰخِرَکُمْ الخ اور اس حدیث میں اَعْدَدْتُ لِعِبَادِیَ الصَّالِحِیْن اور اس حدیث میں اَصْبَحَ مِنْ عِبَادِیْ مُؤْمِنٌ بِیْ وَکَافِرٌ کیونکہ اس طرح خطاب کرنا تو اللہ ہی کو مناسب ہے۔ لہٰذا احادیث قدسیہ کو اللہ کا کلام ہونا چاہیئے۔ اگرچہ ان کے الفاظ معجزہ نہیں ہیں اور نہ ہی ہمیں ان کی تلاوت کا حکم دیا گیا ہے حضرت نے ایک بار تو اس کا یوں جواب دیا کہ حق سُبحانہٗ کی طرف سے ذاتِ نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر انوار اس کثرت سے برستے کہ آپ کو ایک خاص قسم کا مشاہدہ حاصل ہوتا، اگرچہ عام مشاہدہ تو آپ کو ہر وقت حاصل ہوتا۔ چنانچہ ایسی حالت میں اگر انوار کے ساتھ حق سبحانہٗ و تعالیٰ کا کلام بھی سنائی دیتا یا کوئی فرشتہ نازل ہوتا تو یہ قرآن تھا، لیکن اگر کلام سنائی نہ دیتا اور نہ ہی کوئی فرشتہ اُترتا تو یہ وقت حدیثِ قدسی کا ہوتا۔ چنانچہ اس حالت میں جب آپ کلام فرماتے تو شانِ ربوبیت میں کلام فرماتے۔ اس کی عظمت کی وجہ سے اور اس کے حقوق کے ذکر کی وجہ سے۔ اب اس کلام کو رب کی طرف منسوب کرنے کی وجہ یہ ہے کہ یہ کلام اس مشاہد کے ساتھ ہوتا جس میں امور مُختلط ہو جاتے، یہاں تک کہ غیب بمنزلہ شہادت ہو جاتا اور باطن بمنزلہ ظاہر کے۔ اسی لیے اسے رب کی طرف منسوب کیا گیا اور کہا گیا کہ یہ حدیث ربانی ہے اور یہ کہ یہ وہ حدیث ہے جسے آنحضرتؐ نے اپنے رب سے روایت کیا اور ضمیر متکلم لانے کی وجہ یہ ہے کہ اپنے ربّ کی شان مشاہدہ کر کے بزبانِ حال (حق تعالیٰ کی طرف سے[1]) نقل فرمایا اور جو حدیث قدسی نہیں ہوتی، اس کے ساتھ وہ نُور نکلتا ہے جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات میں دائم رہتا ہے اور اس سے کبھی جدا نہیں ہوتا۔

نورِ نبی کی تشریح

اس کی وجہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کی ذات کو انوارِ حق سے مستفیض کیا ہے بعینہٖ اسی طرح جل جلالہٗ نے جرمِ آفتاب کو انوارِ محسوسہ سے نوازا ہے لہٰذا جس طرح سورج کے لیے نور ہونا ضروری ہے اسی طرح آپ کی ذات شریفہ کے لیے بھی نُور کا ہونا لازم ہے۔

دوسری تشریح

دوسری مرتبہ فرمایا: ہم فرض کر لیتے ہیں کہ ایک شخص کو دائمی بخار ہے اور ہے بھی ایک معیّن درجہ کا، اور پھر فرض کر لیں کہ بخار اُسے زیادہ زور کا ہو گیا یہاں تک کہ اس کے حواس جاتے رہتے ہیں اور وہ ایسی باتیں کرنے لگتا ہے کہ وہ خود بھی

---

[1] علماء حدیث نے حدیث قدسی کے متعلق جو کچھ لکھا ہے اس کا خلاصہ یہ ہے کہ اس کا مفہوم اللہ کی طرف سے ہوتا ہے مگر الفاظ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ہوتے ہیں۔

نہیں سمجھتا کہ میں کیا کہہ رہا ہوں۔ پھر یہ فرض کرلیں کہ یہ بخار اسی قدر زور پکڑ جائے کہ وہ اپنے حواس نہ کھوئے اور اپنی عقل پر قائم رہے اور جو کچھ بولے اُسے سمجھتا بھی ہو اور اس بخار کی تین حالتیں ہوئیں:

۱۔ بخار کی معلوم مقدار۔

۲۔ بخار کی اس قدر شدت کہ مریض حواس کھو بیٹھے۔

۳۔ بخار کی اس قدر شدت کہ مریض حواس نہ کھوئے۔

نورِ نبیؐ کی تین حالتیں

آنحضرتؐ کی ذات مطہرہ کے انوار کا بھی یہی حال ہے (۱) معین مقدار کے نوُر کے وقت جو کلام فرمائیں گے وہ حدیث غیر قدسی ہوگی (۲) اگر انوار پھیل جائیں اور ذاتِ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو مشتعل کردیں یہاں تک کہ آپ اپنی معتادہ[۱] حالت سے باہر ہو جائیں تو اس وقت جو کلام ہو گا وہ کلام اللہ ہو گا نزول قرآن کے وقت آپ کی یہی حالت ہوتی تھی (۳) اگر انوار پھیل جائیں لیکن آپ کو اپنی حالت سے نہ نکالیں تو اس وقت جو کلام آپ فرمائیں گے وہ حدیث قدسی کہلائے گی۔

تیسری تشریح

ایک اور مرتبہ یوں فرمایا: جب نبی صلّی اللہ علیہ وسلّم کلام فرمائیں تو اگر یہ کلام آپ کے اختیار سے باہر ہو تو یہ قرآن ہے۔ اگر آپ کے اختیار میں ہے اور پھر اس میں عارضی انوار پھیل جائیں تو یہ حدیثِ قدسی ہے اور اگر انوار دائمی ہوں تو یہ حدیث غیر قدسی ہے اور چونکہ آپ کے کلام کے ساتھ حق سُبحانہٗ کے انوار کا ہونا ضروری ہے اس لیے جو بات بھی آپ فرماتے ہیں وہ سب وحی الٰہی ہے البتہ ان میں انوار کے اختلاف کی وجہ سے تین قسمیں بن گئیں ہیں۔ واللہ اعلم۔

میں نے عرض کیا یہ تو نہایت عمدہ کلام ہے، لیکن اس بات کی کیا دلیل ہے کہ حدیثِ قدسی اللہ کا کلام نہیں ہے۔ فرمایا بھلا اللہ کا کلام بھی چھُپ سکتا ہے؟ میں نے عرض کیا: کیا کشف کے ذریعہ سے؟ فرمایا کشف کے ذریعہ سے بھی اور بغیر کشف کے بھی۔ جس کسی میں عقل ہو اور وہ خاموشی سے قرآن سُنے، پھر خاموشی سے کسی اور کا کلام سُنے تو دونوں میں بالضرور فرق پائیگا۔ صحابہؓ سب سے عقلمند لوگ تھے اور انہوں نے اپنے آباء کے دین کو صرف اس لیے چھوڑا کہ ان پر یہ بات واضح ہو گئی تھی کہ یہ اللہ کا کلام ہے اور اگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس صرف احادیثِ قدسیہ کا

[۱] عام حالت

سا کلام ہوتا تو ایک شخص بھی آپ پر ایمان نہ لاتا۔ وہ چیز جس کے سامنے اُن کی گردنیں جھک گئیں وہ قرآنِ عزیز ہی ہے جو ربّ سبحانہٗ و تعالیٰ کا کلام ہے۔

میں نے عرض کیا کہ انہیں کیسے معلوم ہوا کہ یہ رب کا کلام ہے حالانکہ عرب لوگ تو بُت پرست تھے اور انہیں اس سے پہلے اللہ تعالیٰ کی پہچان نہ تھی کہ وہ معلوم کر سکتے کہ یہ اللہ کا کلام ہے۔ زیادہ سے زیادہ انہیں یہ سمجھ آتا تھا کہ ایسا کلام کہنا بشری طاقت سے باہر ہے۔ سو ہو سکتا ہے کہ مثال کے طور پر یہ فرشتوں کا کلام ہو۔

کلام اللہ کی ہیبت اور دبدبہ شاہی فرمان کا سا ہے

حضرت نے جواب دیا جو شخص بھی قرآن کو سنے گا اور اس کے معانی کو دل پر جاری کرے گا تو اسے لازمی طور پر یہ محسوس ہو جائے گا کہ یہ اللہ تعالیٰ کا کلام ہے کیونکہ جو عظمت اس میں پائی جاتی ہے اور جو ہیبت اس سے طاری ہوتی ہے وہ عظمتِ ربوبیت اور سطوتِ اُلوہیت کے سوا کسی اور کی نہیں ہو سکتی۔ چنانچہ جب ایک عقلمند اور ذی فہم انسان کسی دنیاوی بادشاہ کا کلام سن لے، پھر اس کے بعد اس کی رعیت کا کلام سنے تو بادشاہ کے کلام میں ایک خاص بات پائے گا جس سے وہ پہچانا جائے گا۔ حتیٰ کہ اگر ہم فرض کر لیں کہ وہ شخص نابینا ہے اور ایک جگہ نیچے لوگ بیٹھے باتیں کر رہے ہوں اور بادشاہ بھی اُن میں چھپ کر بیٹھا ہو اور باری باری تقریر کریں تو یہ اندھا بادشاہ کے کلام کو دوسروں کے کلام سے پہچان لے گا اور اس میں قطعاً شک و شبہ نہ ہوگا۔ جب فانی کا فانی کے ساتھ یہ رنگ ہے تو کلامِ قدیم کا کیا رنگ ہوگا صحابہ رضی اللہ عنہم نے قرآن ہی سے اپنے پروردگار کو پہچانا۔ اس کی صفات کو پہچانا اور جس ربوبیت کا وہ مستحق ہے اس کو پہچانا۔ قرآن کا محض سن لینا ہی ان کے لیے اللہ کا علم الیقین حاصل کرنے میں معاینہ اور مشاہدہ کا قائم مقام ہو گیا۔ یہاں تک حق سبحانہٗ ان کے نزدیک ایسا بن گیا جیسا ہمنشین اور کسی سے اُس کا ہمنشین چھپا نہیں ہوتا۔

کلام اللہ کی پہچان

پھر فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کی پہچان ان اُمور سے ہوتی ہے :-

۱- پہلی پہچان : طاقتِ بشری سے خارج ہونا : یہ کلام انسانوں بلکہ تمام مخلوقات کی قدرت سے باہر ہوتا ہے کیونکہ اللہ کا کلام اللہ کے علم محیط[1] فیصلے اور حکم کے مطابق ہے اور فانی کا علم نہ

[1] اللہ کا علم ہر چیز پر محیط ہے وہ عالم الغیب ہے۔ اس کے حکم کو کوئی رد نہیں کر سکتا (بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر)

تو محیط ہوتا ہے اور نہ اس کے فیصلے نافذ ہوتے ہیں۔ لہٰذا فانی اپنے فانی علم اور عاجز حکم کے مطابق بات کریگا۔ کیونکہ اس کے اختیار میں کوئی چیز نہیں ہوتی۔

۲۔ دوسری پہچان: اس میں دبدبہ پایا جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کے کلام میں وہ عظمت پائی جاتی ہے جو اوروں کے کلام میں نہیں پائی جاتی۔ کیونکہ کلام جس ذات سے نکلتا ہے، اسی کے احوال کے تابع ہوتا ہے۔ لہٰذا جب اللہ کا کلام نکلے گا تو اس کے ساتھ الوہیت کی سطوت اور ربوبیت کی شان ہوگی۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن میں انعام کے وعدے کے ساتھ ساتھ سزا کی دھمکی اور اجر کی بشارت کے ساتھ ساتھ عذاب کا خوف دلایا گیا ہے۔ اگر بالفرض اللہ میں صرف اتنی عظمت ہوتی کہ وہ کلام کر رہا ہے اور سارا ملک اس کی ملکیت ہے اور تمام شہروں پر اُس کی حکومت ہے اور سارے بندے اس کے غلام ہیں۔ زمین اس کی ملکیّت ہے اور آسمان اس کا ہے، مخلوقات اسی کی ہے جس میں کسی اور کا دخل نہیں ہے۔ تب بھی اس کا کلام پہچاننے کے لیے یہ کافی تھا اور دوسرے کے کلام میں بالضرور خوف کی علامت پائی جائے گی کیونکہ متکلم خواہ کتنا مقرب کیوں نہ ہو اُس کے دل میں اللہ کا خوف بھرا ہوگا اور اللہ تعالیٰ تو کسی سے ڈرتا نہیں ہے کیونکہ وہ غالب ہے اور اس کا کلام بھی غالب ہے۔

۳۔ تیسری پہچان: جب کلام قدیم سے ان فانی حروف کو علیحدہ کر دیا جائے اور خالص معانی قدیمہ رہ جائیں تو تو دیکھے گا کہ ان کا تخاطب تمام مخلوقات سے (یعنی ابتدائے آفرینش سے انتہائے آفرینش تک) ہے اور اس کلام میں ماضی، حال اور مستقبل[1] میں کوئی فرق نہیں ہوتا، اسکی وجہ یہ ہے کہ معنئ[2] قدیم

(بقیہ حاشیہ صفحہ سابقہ)

- اور نہ اس کے فیصلے کی خلاف ورزی ہو سکتی ہے۔ لہٰذا اللہ کے کلام میں ان باتوں کے پائے جانے سے معلوم ہو جائے گا کہ یہ غیر کا کلام نہیں بلکہ اللہ کا کلام ہے۔

[1] ماضی حال اور مستقبل نام ہے زمانے کا، لیکن زمانہ ہی اٹھ گیا تو نہ ماضی رہا نہ حال وغیرہ کیونکہ احکام تو مخلوقات کے لیے ہیں اور جب اس میں تخلیقِ عالم سے قیامت تک کی تمام مخلوقات کو مخاطب کر لیا گیا تو پھر ماضی یا حال یا مستقبل کی ضرورت ہی اُٹھ جاتی ہے اور اس قسم کا تخاطب اسی کو زیب دیتا ہے جو ازلی و ابدی ہو اور وہ ذات باری ہے لہٰذا اس کے کلام میں بھی یہ وصف ہے۔

[2] اللہ کے ہاں زمانہ کا امتیاز نہیں۔ ماضی اس کے سامنے حال اور مستقبل اُس کے سامنے لہٰذا یہ سب کچھ اس کے لیے حال ہے اور ترتیب انہی زمانوں کے مطابق ہوتی ہے لہٰذا جب (بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر)

میں نہ ترتیب ہے نہ تجزیہ۔ اللہ جس شخص کی بصیرت کی آنکھ کھول دے اور وہ معنی قدیم کو دیکھے تو اسے لا انتہا پائے گا۔ اس کے بعد جب وہ حروف پر نظر ڈالے گا کہ یہ ایک قسم کی صورت ہے جس میں معنیٔ قدیم چھپے ہوئے ہیں۔ لہٰذا جب اس صورت کو الگ کر دیتا ہے تو اسے ایک غیر متناہی شیٔ دکھائی دیتی ہے اور یہی باطنِ قرآن ہے اور جب صورت کو دیکھتا ہے تو اس کو دو دفتیوں میں محدود دیکھتا ہے اور یہ ظاہرِ قرآن ہے اور جب قرآن کو کان لگا کر سنتا ہے تو معانیٔ قدیمہ کو الفاظ کے سایہ میں اس طرح پڑا ہوا پاتا ہے کہ وہ انہیں صاف دیکھ لیتا ہے۔ بعینہٖ اسی طرح جس طرح کہ وہ محسوسات کو بینائی کے ذریعہ سے دیکھ لیتا ہے۔

۴۔ **چوتھی پہچان:** وہ امتیاز جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے کلام اور اللہ تعالیٰ کے کلام میں قائم رکھا۔ کیونکہ آپ نے اللہ تعالیٰ کے کلام کے لکھنے کا حکم دیا اور اس کے علاوہ کسی اور کلام کے لکھنے سے منع فرما دیا اور حکم دیا کہ جو کچھ کلام اللہ[1] کے علاوہ لکھا ہے اسے مٹا دیا جائے اور یہ جو کہیں ثبوت ملتا ہے کہ صحابہ نے احادیثِ قدسیہ کو بھی لکھ لیا تھا تو یہ منجملہ اُن تحریروں کے ہوگا جس میں انہوں نے آنحضرت کے کلام کو لکھ لیا تھا۔ نہ ان تحریروں میں جن میں کلام الٰہی لکھا تھا مزید براں مذکورہ بالا تین خصلتیں احادیثِ قدسیہ میں نہیں پائی جاتیں یعنی طاقتِ بشری سے خارج ہونا وغیرہ۔

یہ خلاصہ ہے جو ہم نے ان تینوں (عام احادیث، حدیثِ قدسی اور قرآن) میں فرق کے متعلق حضرت کے ارشادات سے سمجھا ہے اور آپ کا آخری جواب یعنی آپ کا یہ فرمانا کہ جو شخص بھی قرآن کو غور سے سنے گا اور پھر اور کلام سنے گا تو وہ یقیناً دونوں میں فرق پائے گا الخ اسکے قریب قریب امام ابوبکر[2] باقلانی رح نے کتاب الانتصار میں اشارہ کیا ہے اور اس پر بہت زور دیا ہے حتٰی کہ اسی سے

(بقیہ حاشیہ صفحہ سابقہ)

زمانہ نہ رہا تو ترتیب بھی نہ رہی۔ شیخ کے فرمان سے ایک اور اشکال بھی حل ہو گیا کہ کلام اللہ کسی خاص ترتیب سے مرتب نہیں۔ نہ زمانۂ نزول کے لحاظ سے اور نہ بیان کردہ واقعات کے لحاظ سے۔ پھر اگر ماضی کو ایک لمحہ کے لیے نظر انداز کر دیا جائے تو قرآن زمانِ نزول سے لیکر قیامت تک کے تمام زمانوں کے لیے ہے کیونکہ یہ آخری الہامی کتاب ہے اس لیے بھی اس میں حال و مستقبل برابر ہوئے۔

---

[1] تاکہ کہیں آپ کا کلام اللہ کے کلام سے نہ مل جائے۔

[2] ابوبکر باقلانی: قاضی ابوبکر محمد بن الطیب اشعری باقلانی متوفی ۴۰۳ھ

روافض کے بہتیرے دعوے جن میں غیر قرآن کو انہوں نے قرآن کی طرف منسوب کیا ہے۔ رد کیا ہے اگر طوالت کا اندیشہ نہ ہوتا تو ان کا کلام بھی یہاں نقل کر دیتا تاکہ تو اپنی آنکھوں سے دیکھ لے۔

الحاصل جب حضرت نے جواب دینا شروع ہی کیا تھا تو میں حیران ہو گیا تھا کہ آپ نے فوراً وہ بات کہی جس کا ذکر امام مذکور (امام باقلانی) نے کیا ہے۔ پھر یہ کہ آپ نے آخری جواب میں ایک پانچواں فرق بھی بیان فرما دیا جس کی بنیاد محض کشف پر ہے، لیکن ہم نے یہ جواب درج نہیں کیا کیونکہ یہ عوام کی عقلوں سے بالا ہے۔ اس مقدمہ میں ہم جو کچھ لکھنا چاہتے تھے اسے اسی پر ختم کرتے ہیں۔

اب ہم اصل مقصد کی طرف آتے ہیں اور وہ اُن علوم کا جمع کرنا ہے جو ہم نے شیخ سے سنے اس کا ذکر کئی ابواب میں آئے گا۔

پہلا باب

وہ احادیث جن کا مطلب ہم نے شیخ سے دریافت کیا

پہلی حدیث ترمذی میں عبداللہ بن عمرو بن العاص سے مروی ہے کہ ایک دن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم باہر تشریف لائے اور آپ کے دونوں ہاتھوں میں دو کتابیں تھیں۔ ایک کتاب کی طرف اشارہ کرکے فرمایا کہ یہ کتاب ربُّ العالمین کی طرف سے ہے اور اس میں اہل جنت کے نام، ان کی ولدیت اور قومیت درج ہے۔ ان میں کبھی بھی کوئی کمی یا بیشی نہ ہوگی، پھر بائیں ہاتھ کی کتاب کی طرف اشارہ کرکے اسی قسم کے الفاظ دوزخیوں کے متعلق فرمائے۔ اس کے بعد آپ نے ہاتھ سے اشارہ فرماکر ان کو پھینک دیا اور فرمایا: پروردگار بندوں سے فارغ ہو چکا۔ ایک فریق جنت میں جائیگا اور ایک فریق دوزخ میں[2]۔ ابنِ حجر کہتے ہیں کہ اس حدیث کے اسناد حسَن ہیں۔ ایک شخص کو اس میں اشکال پیدا ہوا اس نے خیال کیا کہ اس حدیث میں قدرت کا تعلق ناممکن چیز سے کیا ہے کیونکہ تمام اہل جنت کے نام ایک ایسی کتاب میں جمع کر دیئے گئے ہیں جس کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا دایاں ہاتھ اٹھا سکے اور اسی طرح اہل دوزخ کے نام ایک ایسی کتاب میں جمع کر دیئے گئے ہیں جسے آپ بائیں ہاتھ میں اٹھا سکیں۔ اس شخص نے سوال وضاحت سے کیا اور اس نے کئی ایک باتیں پوچھیں۔

اس حدیث پر اعتراض اور اسکا جواب علماء کلام کہتے ہیں کہ قدرت الٰہیہ کا تعلق ممکنات سے ہوتا ہے، محال سے نہیں۔ اس کے باوجود اس

---

[1] عبداللہ بن عمرو بن العاص مشہور صحابی ہیں۔ یہ اپنے باپ عمرو سے پہلے ایمان لائے۔ ان کا باپ ان سے صرف تیرہ سال بڑا تھا۔ ان کی تاریخ وفات میں بہت اختلاف ہے چنانچہ یہ تاریخیں بیان کی جاتی ہیں سنہ ۶۳ھ، ۷۳ھ، ۶۷ھ، سنہ ۵۵ھ اور سنہ ۶۵ھ

[2] ملاحظہ ہو مشکوٰۃ باب الایمان بالقدر صہ ۲۱، طبع مجتبائی۔

حدیث میں آیا ہے کہ آنحضرت اپنے دونوں ہاتھوں میں دو کتابیں لیے باہر نکل کر آئے اور فرمایا کہ اہلِ جنت کے نام مع ولدیت، قومیت اور قبیلے کے ایک ہیں، اور اہلِ دوزخ کے نام مع اُن کی قوم اور قبیلے کے، دوسری کتاب میں ہیں حالانکہ دونوں کتابیں چھوٹی سی تھیں اور ناموں کی تعداد بہت زیادہ ہے اس میں صغیر شئی کو کبیر پر وارد کیا گیا ہے، بدون اس کے کہ بڑی کو چھوٹا اور چھوٹی کو بڑا کیا جائے، ورنہ کونسا دفتر اِن کے ناموں کو ضبط کر سکتا ہے۔ یہ محالِ عقلی کی بڑی مضبوط دلیل ہے کہ وسیع چیز کو تنگ چیز پر داخل کیا گیا ہے باوجود اس کے کہ چھوٹی چھوٹی رہی اور بڑی بڑی حالانکہ اس کی خبر دینے والا نبیؐ معصوم ہے جو اپنی خواہش سے نہیں بولتا بلکہ بذریعۂ وحی بولتا ہے۔

حضرت نے جواب دیا کہ جو کچھ علمائے کلام نے اور اہل السنّت والجماعت نے کہا ہے عقیدہ وہی ہے، ولی کی کرامت اور نبی کے معجزات میں ایسی چیز نہیں ہو سکتی جسے عقل ناممکن قرار دے لیکن ان میں ایسی باتیں ہوتی ہیں جن کے سمجھنے سے عقل قاصر ہوتی ہے مگر جب معنی مراد کی طرف ہدایت کی جاتی ہے تو پھر عقل اس کو قبول کر لیتی ہے۔

مذکورہ کتابوں میں کتابت سے مراد کتابتِ قلم نہیں بلکہ کتابت نظر ہے۔ اس کی تشریح یہ ہے کہ صاحب بصیرت بالخصوص سید الاوّلین والآخرین سیدنا و مولانا محمد صلی اللہ علیہ وسلم جب کسی چیز کو دیکھنے کا ارادہ کریں تو ان کی بصیرت اُن کے اور اُس شئی کے درمیان ہر قسم کے پردوں کو پھاڑ کر نکل جاتی ہے، حتیٰ کہ اُس کی روشنی اس چیز تک پہنچ کر اس کا احاطہ کر لیتی ہے۔ لہٰذا جب اس چیز کی صورت بصیرت میں حاصل ہو جاتی ہے اور ہم نے بصیرتِ کاملہ فرض کیا ہے، تو اس کا اثر بصر تک جا پہنچتا ہے۔ لہٰذا جو قدرت بصیرت کو حاصل ہوتی ہے وہی بصر کو حاصل ہو جاتی ہے۔ چنانچہ بصر اپنے سامنے کی چیز میں اس شئی کو منقوش دیکھ لیتی ہے لہٰذا اگر بصر کے بالمقابل دیوار ہوگی تو اس چیز کو دیوار میں دیکھے گا اگر اس کا ہاتھ ہوگا تو اسے ہاتھ میں دیکھے گا اور اگر اس کے بالمقابل کاغذ ہوگا تو اُس چیز کو کاغذ میں دیکھ لے گا۔ یہی مراد ہے حضور کے اس فرمان[1] کی کہ مُثِّلَتْ لِیَ الْجَنَّۃُ وَالنَّارُ فِیْ عَرْضِ ھٰذَا الْحَائِطِ (مجھے اس دیوار کی پہنائی میں جنت و دوزخ دکھائی گئی ہے) کیونکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی بصیرت کی توجہ ان کی طرف کی، جبکہ آپ صلوٰۃ الکسوف[2] پڑھ رہے تھے تو تمام پردوں کو پھاڑ کر آپ کی بینائی میں یہ دونوں آگئیں

---

[1] ملاحظہ ہو مشکوٰۃ، طبع مجتبائی ص۵۰۵ [2] سورج گرہن

اور آپ کے سامنے دیوار کا عرض تھا۔ لہٰذا آپ نے ان دونوں کی صورت دیوار میں دیکھ لی۔

دو کتابوں کی حدیث سے یہی مراد ہے۔ کیونکہ آپ نے اپنی بصیرت سے جنت کی طرف توجہ کی تو اس کی صورت آپ کی بصر میں آگئی۔ اس وقت آپ کے سامنے وہ کتاب تھی جو آپ کے دائیں ہاتھ میں تھی تو آپ جنت اور اہل جنت کی صورت اس جسم میں دیکھنے لگ گئے سو آپ کے داہنے ہاتھ میں تھا اور فرمایا کہ یہ رب العالمین کی طرف سے کتاب ہے۔ اس میں اہلِ جنت کے نام مع ولدیت اور قومیت کے درج ہیں۔ پھر آپ نے اپنی بصیرت کو دوزخ کی طرف متوجہ کیا تو اس کی صورت آپ کی بصر میں آگئی اور آپ کے بالمقابل وہ جسم تھا جو آپ کے بائیں ہاتھ میں تھا۔ چنانچہ آپ اس کی صورت اور اس کی تمام چیزوں کی صورت دیکھنے لگ گئے اور فرمایا: یہ رب العالمین کی طرف سے کتاب ہے اس میں دوزخیوں کے نام مع ولدیت اور قومیت کے درج ہیں اگر مُثِّلَتْ لِیَ الْجَنَّۃُ وَالنَّارُ والی حدیث میں کوئی اشکال[1] ہوسکتا ہے تو اس میں بھی ہوسکتا ہے اور اگر اس میں کوئی اشکال نہیں ہے تو اس میں بھی نہیں ہے۔ اشکال اسی صورت میں ہوسکتا ہے جب ہم قلم کی لکھت مُراد لیں۔ اگر اس حدیث میں قلم کی لکھت مراد لی گئی ہوتی تو حدیث کے آخری حصّے میں اور اس میں تناقض[2] پیدا ہوجاتا ہے۔ کیونکہ اس حدیث کے آخر میں ہے" پھر آپ نے ان دونوں کتابوں کو پھینک دیا اور یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اس کتاب کو جو رب العالمین کی طرف سے آئی ہو اور اس میں اللہ کے رسولوں، اصفیا اور برگزیدہ لوگوں کے نام ہوں، پھینک دیں حالانکہ آپ اللہ اور اس کے رسولوں اور فرشتوں کی سب سے زیادہ تعظیم کرنے والے تھے۔

آپ نے تو اسی صورت کو جو اس جسم میں حاصل ہوئی تھی کتاب کا نام اس لیے دیا کہ وہ خارجی چیز پر دلالت کرنے میں کتابت سے مشابہ تھی۔ علاوہ برایں جو چیز خارج میں ہو اس پر بھی کتابت کا لفظ استعمال کیا جاسکتا ہے کیونکہ "کتابت" کا لفظ[3] جمع سے لیا گیا ہے لہٰذا ہر مجموعے کو مکتوب

---

[1] مشکل ہونا [2] ایک دوسرے کی ضد ہونا۔

[3] حیرت کا مقام ہے کہ حضرت سید عبدالعزیز دباغ رحمۃ اللہ علیہ باوجود اُمّی ہونے کے عُلوم سے کس قدر واقف تھے۔ یہاں پر آپ نے ٹھیٹھ لغوی بحث دی ہے جس کا علم بڑے بڑے مدعیانِ علم کو بھی نہیں۔ چنانچہ اہل لغت کتاب کی تشریح میں یہی کہتے ہیں کہ اسے کتاب اس لیے کہا جاتا ہے کہ اس میں حروف کو اکٹھا کیا جاتا ہے اور ایک دوسرے سے ملایا جاتا ہے اور اس کی تائید میں یہ محاورہ پیش کیا جاتا ہے کَتَبَ حَیَاءَ النَّاقَۃِ اذا جمعھا میرا مقصد اس لفظ پر بحث کرنا نہیں حضرت کے علم لدُنّی کی تائید کرنا ہے۔ (مترجم)

کہہ سکتے ہیں۔ اسی وجہ سے فوجی دستوں کو کتائب کہا جاتا ہے کیونکہ وہ مجتمع ہوتے ہیں اور کتائب کا مفرد کَتِیْبَۃٌ ہے یعنی مجموعہ اور دوسرے دستوں سے ملی ہوئی۔

کتابت کو رب العالمین کی طرف اس لیے منسوب کیا گیا کہ وہ نور جو اس صورت کے حاصل ہونے کا سبب ہے جسے کتابت سے تعبیر کیا گیا ہے، وہ نہ انسانی طاقت میں ہے نہ اس کے اکتساب میں وہ صرف مددِ ربانی ہے اور اللہ سبحانہٗ کا نور ہے اس سے ظاہر ہو گیا کہ کتابت سے مراد صرف وہ صورت ہے جو نظر میں حاصل ہے اور بس۔ اور نظر میں اس صورت کا حاصل ہونا کوئی مشکل نہیں جس طرح تمام مرئی اشیاء نظر میں حاصل ہوتی ہیں کیونکہ باوجود اس کے کہ آنکھ کی پتلی چھوٹی ہے اس میں ایک بڑی صورت مرتسم ہو جاتی ہے۔ مثلاً آسمان کی صورت اور آنکھ کی پتلی ایک مسور کے دانے سے بھی چھوٹی ہے۔ لہٰذا یہ حدیث ممکنات میں سے ٹھہری۔ تمام معجزات اور خوارق کا بھی یہی حال ہے۔

دوسری حدیث میں نے کئی بار آپ سے اس حدیث کے متعلق سوال کیا: اِنَّ ھٰذَا الْقُرْاٰنَ اُنْزِلَ عَلٰی سَبْعَۃِ اَحْرُفٍ[1] قرآن سات حرفوں پر اتارا گیا۔ آپ نے اس کے کئی ایک جواب دیئے مگر پھر بھی طبیعت مطمئن نہ ہوئی اور جواب ثانی کی منتظر رہی اشکال اس طرح پیدا ہوا کہ "حرف" کا لفظ لغت کے اعتبار سے ظاہر ہے جس میں اس قسم کا کوئی اشکال نہیں جس قسم کا سورتوں کے ابتدائی حروف[2] میں ہے اور علماء نے اس کی تشریح میں بہت اختلاف

---

[1] مشکوٰۃ کتاب فضائل القرآن ص ۱۹۲ اُنْزِلَ الْقُرْاٰنُ عَلٰی سَبْعَۃِ اَحْرُفٍ حافظ حدیث امام جلال الدین سیوطی تنویر الحوالک شرح مؤطا مالک (ج ۱: ۱۵۹ مطبعہ مصطفیٰ البابی ۱۹۵۰ء) میں لکھتے ہیں کہ اس بارے میں کہ "سبعہ احرف" سے کیا مراد ہے۔ علماء میں سخت اختلاف پایا جاتا ہے یہاں تک کہ اس میں چالیس کے قریب مختلف اقوال نقل کیے گئے ہیں جن کا ذکر میں نے اپنی کتاب الاتقان میں کر دیا ہے۔ ان میں سے میرے نزدیک سب سے بہتر قول یہی معلوم ہوتا ہے کہ آنحضرت کا فرمان متشابہات میں سے ہے جس کی تاویل کا ہمیں علم نہیں کیونکہ جس طرح قرآن مجید میں متشابہات پائے جاتے ہیں اس طرح حدیث میں بھی متشابہات ہیں۔ ۱۲

راقم کہتا ہے کہ ابو عبداللہ محمد بن احمد المعروف بابن اللبان المصری متوفی ۷۴۹ھ نے اس پر ایک کتاب لکھی ہے جس کا نام اِزَالَۃُ الشُّبُھَاتِ عَنِ الْاٰیَاتِ وَالْاَحَادِیْثِ الْمُتَشَابِھَاتِ رکھا ہے (کشف الظنون ۱: ۷۰)

[2] ان سے مراد حروف مقطعات ہیں مثلاً الٓمٓ وغیرہ۔ ۱۲

کیا ہے جس کے مطالعہ سے پریشانی اور اشکال بڑھتا ہے، کیونکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی مُراد تو ایک ہی ہوگی اور اختلافی اقوال کی تعداد چالیس تک پہنچ جاتی ہے، جو اس کے مبہم اور دقیق ہونے کے موجب ہیں۔ کیونکہ کسی بات میں اقوال کی کثرت اس شئی کے متعلق عدم واقفیت کی سبب بنتی ہے لیکن اس کے باوجود ممکن ہو سکتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی مراد کچھ اور ہی ہو جس کا ذکر ان تمام اقوال میں سے کسی ایک میں بھی نہیں کیا گیا اور اس حدیث کی روایت متعدد صحابہؓ نے کی ہے۔ مثلاً عمر بن الخطابؓ، حشامؓ[1] بن حکیمؓ، اُبی بن کعبؓ، عبدالرحمٰنؓ[2] بن عوفؓ، عثمان بن عفانؓ، عمرؓ[3] بن ابی سلمہؓ، ابی جُہیم، سمرہ بن جُندب، عمرو بن[4] العاصؓ، اُم ایوبؓ[5] انصاریہ اور ان کے علاوہ اور صحابہ نے بھی۔ رضی اللہ عنہم اجمعین یہاں تک کہ ابو یعلیؒ[6] نے اپنی مسند کبیر میں لکھا کہ ایک دن حضرت عثمان بن عفانؓ منبر پر خطبہ دینے کے لیے کھڑے ہوئے اور فرمایا میں تمہیں خدا کا واسطہ دیکر پوچھتا ہوں کہ تم میں سے جس جس نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زبانی یہ الفاظ سنے ہیں کہ "قرآن سات حرفوں پر اتارا گیا اور ہر حرف ایک شان بیان کرتا ہے۔" وہ کھڑا ہو جائے۔ اس پر ہر جانب سے صحابہ جن کی تعداد مجھے یاد نہیں، اُٹھ کھڑے ہوئے ہر ایک یہی کہتا تھا کہ میں نے آنحضرتؐ سے یہ الفاظ سنے تھے۔ حضرت عثمانؓ نے کہا میں نے بھی حضورؐ کو

---

[1] حشام بن حکیمؓ: حشام بن حکیم بن حزام قرشی فتح مکہ کے دن ایمان لائے انکا شمار فضلاء صحابہؓ میں ہوتا ہے ان کے والد حکیم کی وفات ۵۴ھ (۶۷۴ء) ہوئی اور یہ اپنے والد کی حیات میں ہی وفات پا گئے تھے۔

[2] عبدالرحمٰن بن عوفؓ، مشہور صحابی ہیں قریش میں سے تھے۔ یہ ان لوگوں میں سے ہیں جنہیں سابقین اولین کہا جاتا ہے اور یہ عشرۂ مبشرہ سے ہیں۔ پہلے حبشہ کی طرف ہجرت کی اور پھر مدینہ کو۔ انہوں نے تمام جنگوں میں شرکت کی ۷۵ برس کی عمر میں ۳۲ھ (۶۵۲ء) میں وفات پائی۔

[3] عمر بن ابی سلمہؓ، ان کے باپ ابوسلمہ کا اصل نام عبداللہ ہے ان کی پرورش آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے کی تھی اور اُم المومنین ام سلمہ کے بیٹے تھے۔ ان کی پیدائش حبشہ میں ۲ھ (۶۲۳ء) ہوئی۔ حضرت علیؓ نے اپنے عہد خلافت میں انہیں بحرین اور فارس کا گورنر بنایا تھا۔ ان کی وفات مدینہ میں ۸۳ھ (۷۰۲ء) میں ہوئی۔

[4] عمرو بن العاصؓ: مشہور صحابی ہیں ۸ھ (۶۲۹ء) میں فتح مکہ سے چند ماہ قبل ایمان لائے۔ انہوں نے مصر میں سکونت اختیار کر لی تھی اور وہیں ستر برس کی عمر میں ۴۳ھ (۶۶۴ء) میں وفات پائی۔

[5] اُم ایوب انصاریہؓ: حضرت ابوایوب انصاریؓ کی بیوی تھیں۔ یہ قیس بن سعید خزرجی کی بیٹی اور ابوایوب انصاری کی بیوی تھیں۔ صحابیہ ہیں۔

[6] ابو یعلیٰ احمد بن علیؒ: مولف مسند کبیر حافظ حدیث اور ثقہ تھے ان کی وفات ۳۰۷ھ (۹۱۹ء) میں ہوئی۔

یہی کہتے ہوئے سنا تھا۔ اسی لیے ابو عبیدہؓ[1] اور دیگر حفاظِ حدیث نے کہا ہے کہ یہ حدیث متواتر حدیثوں میں سے ہے قدیم زمانے سے لیکر آج تک علماء نے اس پر خوب بحث کی ہے اور بعض نے تو اس پر مستقل کتابیں لکھیں۔ مثلاً ابوشامہؒ نے اس پر بہترین بحثیں تو میں نے چار بڑے بڑے عالموں کی دیکھی ہیں

۱۔ لسان المتکلمین قاضی ابوبکر باقلانیؒ کی کتاب الانتصار میں۔ انہوں نے مسئلہ کو اچھی طرح سے واضح کیا ہے۔

۲۔ حافظ کبیر ابن الجزریؒ کی النشر میں۔ اس نے دس فصلوں میں کئی طرح سے بحث کی ہے اور ان صحابہؓ کے نام ذکر کئے ہیں جنہوں نے اس حدیث کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کیا ہے۔

۳۔ حافظ امیر المومنین فی الحدیث امام ابن حجرؒ شرح بخاری میں فضائلِ قرآن کے باب میں۔

۴۔ امام جلال الدین سیوطیؒ الاتقان فی علوم القرآن میں۔ انہوں نے چالیس مختلف اقوال نقل کئے ہیں۔

باوجود اس کے کہ مجھے ان بزرگ علماء کے اقوال کا علم تھا اور ان کو خوب اچھی طرح سمجھتا تھا پھر بھی میری سمجھ میں نہ آیا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی مراد کیا ہے اور تعیینِ[2] مراد میں مجھے شک ہی رہا۔ لہٰذا میں نے شیخؒ سے عرض کیا کہ میں تو آپ سے صرف یہ دریافت کرنا چاہتا ہوں کہ آنحضرتؐ نے اس سے کیا مُراد لی ہے۔ فرمایا انشاء اللہ کل جواب دیں گے۔ دوسرا دن ہوا تو فرمایا اور سچ فرمایا کہ میں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا ہے کہ اُن کی اس حدیث سے کیا مراد ہے ؛ تو آپ نے اپنی مراد کی تشریح کردی ہے۔ میں نے اس مسئلہ میں حضرت سے تین دن بحث کی اور آپ تشریح فرماتے رہے کہ اس سے یہ معنی مراد لیے گئے ہیں، جس سے مجھے معلوم ہوگیا کہ اس حدیث کی بڑی شان ہے اور اسکے متعلق میں نے وہ اسرار سُنے جن کی کیفیت بیان نہیں کی جاسکتی اور نہ کسی کو سمجھنے کی طاقت ہے۔ مختصر بات جو ہم تحریر کرسکتے ہیں وہ یہ ہے :۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ شریف میں اللہ تعالیٰ نے ایک ایسی قوت ودیعت[3] کر رکھی ہے جس کے انوار سات قسم کے ہیں۔ ان ساتوں نوروں کے دو دو رُخ ہیں ایک حق تعالیٰ کی طرف اور دوسرا مخلوقات کی طرف۔ یہ انوار پہلے رُخ میں متواتر فیضان کرتے رہتے ہیں اور کبھی نہیں تھمتے اور نہ ہی سُست پڑتے ہیں۔ پس جب اللہ تعالیٰ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر قرآن نازل کرنا چاہتے ہیں تو جو آیت نازل

---

[1] ابوعبیدہ معمرؓ بن مثنیٰ حافظِ حدیث اور لغت دان تھے ان کی متعدد تصانیف ہیں ۱۲۱ھ ۸۲۵ء میں وفات پائی۔ [2] مخصوص کرنا [3] امانت

ہوتی ہے اس کے ساتھ پہلے رُخ کے نُور میں سے تھوڑا سا نُور بھی ہوتا ہے، سارا تو نہیں ہوتا کیونکہ وہ تو خدا کی طرف توجہ ہونے کی وجہ سے نہ تھمتا ہے اور نہ سُست پڑتا ہے، اس لیے مخلوقات کی طرف توجہ کے وقت صرف تھوڑا سا نور ظاہر ہوتا ہے۔ پھر اللہ تعالیٰ دوسری آیت اتارتا، تو اس میں دوسرے رخ کا کچھ نور ہوتا ہے۔ پھر تیسری آیت اترتی ہے اور اس میں تیسرے نور میں سے کسی قدر نورٌ ہوتا ہے، اسی طرح ساتویں نُور تک۔

سات حروف کیا ہیں؟

اس پر میں نے عرض کیا یہ ساتوں نُور جن کی طرف سات حروف کہہ کر اشارہ کیا گیا ہے، کیا چیز ہیں؟ حضرت نے فرمایا: وہ سات حروف یہ ہیں (۱) حرفِ نبوت (۲) حرفِ رسالت (۳) حرفِ آدمیت (۴) حرفِ روح (۵) حرفِ علم (۶) حرفِ قبض (۷) حرفِ بسط۔

۱- حرفِ نبوت: حرف نبوت کی شناخت یہ ہے کہ آیت صبر کا حکم دے رہی ہو، حق راہ بتا رہی ہو اور دنیا و شہواتِ دنیا سے نفرت دلوا رہی ہو۔ کیونکہ نبوت کا طبعی خاصہ حق کی طرف جھکنا حق بات کہنا، حق راہ بتانا اور حق میں خیر خواہی کرنا ہے۔

۲- حرفِ رسالت: حرف رسالت کی یہ علامت ہے کہ آیت میں آخرت، اس کے درجات مقامات اور ثواب وغیرہ کا ذکر ہو۔

۳- حرفِ آدمیّت: حرف آدمیّت کا ماحصل وہ نور ہے جسے اللہ تعالیٰ نے انسانوں میں ودیعت کر رکھا ہے اور انہیں اس سے انسانی کلام کرنے پر قادر کیا ہے تاکہ ان کا کلام ملائکہ جنوں اور باقی تمام کلام کرنے والی مخلوقات کے کلام سے ممتاز ہو سکے اور باوجودیکہ یہ صفت ہر انسان میں پائی جاتی ہے، اسے ان ساتوں میں اس لیے شامل کیا گیا کہ یہ صفت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم میں طہارت اور صفائی کے لحاظ سے انتہا کو پہنچ چکی ہے، جس کی وجہ یہ ہے کہ طہارت اور صفائی میں آپ کی ذات کا کمال اس درجے تک پہنچ چکا ہے جس سے بڑھکر کوئی کمال نہیں ہو سکتا اور آنحضرتؐ کی ذات کے سوا کسی اور کی ذات میں اس کا ہونا بھی ناممکن ہے۔ مختصر یہ کہ جب یہ نُور جس سے انسان کلام کرتا ہے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات میں نورِ نبوت۔ نورِ رسالت۔ نورِ روح، نورِ علم، نورِ قبض اور نورِ بسط کے ساتھ پایا گیا تو یہ نور انتہائی کمال پہ ہوگا، کیونکہ آپ کی ذات، ان چھ نوروں سے مستفیض ہو رہی ہوتی ہے لہٰذا آپ پر آیات کا نزول ہوگا اور کوئی آیت بھی ایسی نہ ہوگی جس میں یہ نُور نہ پایا جائے، کیونکہ قرآن اسی بشری لغت میں نازل ہوا ہے۔

۴۔ حرفِ رُوح : حرفِ رُوح کی نشانی یہ ہے کہ آیت کا تعلق اللہ تعالیٰ اور اس کی بلند صفات سے ہو اور اس میں مخلوق کا کوئی ذکر نہ ہو کیونکہ روح ہمیشہ حق کا مشاہدہ کر رہی ہوتی ہے لہٰذا جب اس صفت پر آیت اُترے گی تو اس کے ساتھ نورِ رُوح موجود ہوگا۔

۵۔ حرفِ علم : حرفِ علم کی پہچان یہ ہے کہ آیت میں گذشتہ لوگوں کے حالات بیان کیے گئے ہوں مثلاً عاد۔ ثمود۔ قوم نُوح۔ قوم ہود۔ قوم صالح وغیرہ کے حالات یا اس میں کسی راستے کے مذموم ہونے کی اطلاع دی گئی ہو۔ مثلاً اللہ کا فرمان : اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ اشْتَرَوُا الضَّلٰلَةَ بِالْهُدٰى فَمَا رَبِحَتْ تِّجَارَتُهُمْ وَمَا كَانُوْا مُهْتَدِيْنَ[1] (ترجمہ یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے ہدایت کے بدلے میں گمراہی خرید لی۔ نہ تو انہیں اس سودے میں فائدہ ہوا اور نہ ہی وہ سیدھی راہ پر تھے) مختصر یہ کہ قصص[2]، مواعظ اور حِکَم[3] وغیرہ حرفِ علم پر نازل ہوں گی اور اس حرف کا نور جسے عطا ہو جائے اس سے جہالت کی نفی ہو جاتی ہے اور وہ عارفِ مُعرَّف[4] بن جاتا ہے، یہاں تک کہ اگر فرض کر لیا جائے کہ ایک شخص پہاڑ کی چوٹی پر پیدا ہوا اور بغیر کسی سے میل جول رکھنے کے وہیں رہا سہا ہو یہاں تک کہ جوان ہو گیا ہو، پھر اسے شہر میں ایسی حالت میں لایا جائے جبکہ اللہ تعالیٰ نے اُسے اس حرف کے نور سے مدد کی ہو تو اس صورت میں جس شخص نے تمام عمر علم حاصل کرنے میں لگا دی ہو وہ اس شخص کے ساتھ کسی باب میں بھی بحث نہیں کر سکتا۔

۶۔ حرف قبض : حرفِ قبض کی پہچان یہ ہے کہ آیت کا رُوئے سخن کفار اور تاریکی کی طرف ہو چنانچہ آپ دیکھیں گے کہ کبھی تو آپ انہیں بد دعا دے رہے ہیں اور کبھی انہیں دھمکی دے رہے ہیں مثلاً اللہ تعالیٰ کا فرمان فِیْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ فَزَادَهُمُ اللّٰهُ مَرَضًا وَلَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ[5] بِمَا كَانُوْا يَكْذِبُوْنَ ٥ (ان کے دلوں میں شک وکفر کا مرض ہے خدا نے (ان کی ضد کی وجہ سے) اس مرض کو اور بڑھا دیا اور ان کے جھٹلانے کی وجہ سے انہیں دردناک عذاب دیا جائے گا) اس کی وجہ یہ ہے کہ نُور اور تاریکی کی فوجیں متواتر آپس میں لڑتی رہتی ہیں۔ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی توجہ تاریکی کی طرف ہوتی ہے تو آپ میں انقباض[6] پیدا ہوتا ہے جس کی وجہ سے مذکورہ قسم کی آیات آپ سے نکلتی ہیں۔

---

[1] سورہ بقرہ آیت ۱۶

[2] قصہ کی جمع [3] حکمت کی جمع [4] تعریف کیا ہوا [5] سورۂ بقرہ آیت ۱۰ [6] رُکنا

۷۔ حرفِ بسط: حرفِ بسط[1] کی علامت یہ ہے کہ مخلوقات پر اللہ تعالیٰ نے جو انعامات کئے ہیں اُن کا ذکر آیت میں کیا جائے اور مخلوقات کو یہ نعمتیں گنائی جائیں کیونکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی توجہ ان نعمتوں کی طرف ہوتی جو اللہ تعالیٰ نے اپنی مخلوقات پر کی ہیں تو آپ کو انبساط[2] ہوتا جس کی وجہ سے آیت بھی مقامِ بسط سے نکلتی۔

حضرت نے فرمایا ان ساتوں حرفوں میں سے ہر حرف کی تقریباً یہی پہچان ہے جو ذکر کی گئی ہے ورنہ ہر حرف میں ۳۶۶ (تین سو چھیاسٹھ) وجہیں ہیں۔ اگر میں ہر حرف میں اُن وُجوہ کی تشریح کروں اور اُن کی تشریح ہر آیت میں ظاہر کروں تو لوگوں کے سامنے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا باطن سُورج کی طرح روشن ہو جائے، مگر یہ اُن اسرار میں سے ہے جن کا چھپانا واجب ہے اور جن لوگوں پر اللہ کی فتحِ کبیر ہوتی ہے وہ اسے جانتے ہیں اور جسے فتح حاصل نہیں اُسے اپنی حالت پر ہی چھوڑ دینا چاہیئے۔

شیخ کی تقریر پر اعتراض

میں نے عرض کیا حضرت اس بارے میں جتنی احادیث وارد ہوئی ہیں ان میں حروفِ سبعہ سے قرآنی الفاظ کے بولنے کی کیفیت مراد لی گئی ہے۔ مثلاً حضرت عمرؓ کا فرمانا کہ میں نے ہشام بن حکیمؓ کو ان حروف پر قرآن مجید پڑھتے ہوئے سنا جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے نہیں پڑھائے تھے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عمرؓ اور حضرت ہشامؓ دونوں کے حروف کو درست قرار دیتے ہوئے فرمایا: اِنَّ هٰذَا الْقُرْاٰنَ اُنْزِلَ عَلٰی سَبْعَةِ اَحْرُفٍ فَاقْرَءُوْا مَا تَيَسَّرَ مِنْهُ (ترجمہ: قرآن مجید سات حرفوں پر اتارا گیا ہے جسے جو حرف آسان معلوم ہوں وہی پڑھ لے) لیکن جناب کی تقریر سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ حروف آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات میں باطنی اوصاف اور انوارِ ربانیہ ہیں جن میں حضرت عمرؓ اور حضرت ہشامؓ کا باہمی اختلاف کرنا ناممکن ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم انہیں یہ جواب دیں کہ قرآن ان سات انوار پر نازل ہوا ہے۔

شیخ کی طرف سے اعتراض کا جواب

حضرت نے فرمایا کہ تلفظ کے اختلاف کے بارے میں جو کچھ بھی حدیثوں کے اندر مذکور ہے وہ ان انوارِ باطنیہ کے اختلاف کی فرع ہے چنانچہ حروف کا ساکن ہونا یا اُن پر پیش کا ہونا قبض سے پیدا ہوتا ہے۔ زبر حروفِ

---

[1] فراخی [2] خوشی

رسالت سے پیدا ہوتی ہے اور زیر حروفِ آدمیّت سے پیدا ہوتی ہے اور ہر آیت کے لیے ایک خاص فتح اور مخصوص ذوق ہوتا ہے۔

جب مَیں نے حضرت سے یہ نورانی کلام سنا تو میں نے فوراً سورۂ فاتحہ اور سورۂ بقرہ کی ابتدائی آیتیں پڑھیں۔ چنانچہ حضرت نے جو تشریح مذکورہ بالا بیان کے مطابق کی ہیں اُسے سُنکر ششدر رہ گیا۔ میں نے ان آیات کو دوبارہ پڑھا اور میں نے قرارت نافع[1]، ابنِ کثیر[2]، ابی عمرو بن العلاء البصری[3]، ابنِ عامر[4]، عاصم[5]، حمزہ[6]، کسائی[7] کی ساتوں روایات پڑھیں۔ جن کی تشریح میں مَیں نے آپ سے حیرت انگیز باتیں سنیں اور مَیں نے دیکھ لیا کہ ان ساتوں قراءتوں میں باطنی انوار کے لحاظ سے اختلاف پیدا ہوا ہے۔ چنانچہ الحمدللہ اس حدیث کے مفہوم میں جس چیز کو میں تیس سال سے زائد عرصہ سے تلاش کر رہا تھا وہ مجھے مل گئی۔ مجھ سے پہلے حافظ ابن

---

[1] نافعؒ: نافع بن عبدالرحمٰن بن ابی نعیم المدنی، اہل مدینہ کے امام تھے اور مدینہ میں انہی کی قرارت کو پڑھا جاتا تھا صحابہ کے بعد یہ تیسرے طبقہ کے آدمیوں میں سے ہیں۔ یہ سخت سیاہ رنگ کے تھے اور انہوں نے قرارت اُم المومنین ام سلمہؓ کے آزاد کردہ غلام ابو میمونہؓ سے سیکھی تھی۔ ان کی وفات ۱۶۹ھ میں ہوئی۔

[2] ابن کثیرؒ: عبداللہ بن کثیر، ابوبکر ان کی کنیت تھی، انہیں دارانی کہا جاتا ہے کیونکہ حجاز میں عطّار کو دارانی کہتے ہیں ان کی وفات مکہ میں ۱۲۰ھ ، ۷۳۷ء میں ہوئی اور وہیں دفن ہوئے۔

[3] ابوعمرو بن العلاء البصریؒ: ان کا اصلی نام زبان بن العلاء تھا بصری نحویوں میں بڑے ممتاز نحوی ہوئے ہیں۔ انہوں نے قرآن کی قراءتوں میں خاص مہارت حاصل کی تھی ان کی وفات ۱۵۴ھ ، ۷۷۰ء میں ہوئی۔

[4] ابنِ عامرؒ: عبداللہ بن عامر۔ ابوعمرو کنیت کہا جاتا ہے کہ انہوں نے قرآن حضرتِ عثمانؓ سے سیکھا تھا۔ دمشق کے رہنے والے تھے اور وہیں ان کی وفات ۱۱۸ھ ، ۷۳۶ء میں ہوئی۔

[5] عاصمؒ: ابوبکر عاصم بن ابی النجود بہدلۃ الاسدی، ان کی کنیت ابوبکر بن ابی النجود ہے ان کی وفات ۱۲۸ھ ، ۷۴۵ء میں ہوئی۔ ابن خلکان نے ان کی تاریخ وفات ۱۲۷ھ دی ہے انہوں نے قرارت ابوعبدالرحمٰن سلمیؓ اور زر بن عبیشؓ سے سیکھی۔

[6] حمزہؒ: حمزہ بن حبیب الزیات۔ ان کو زیات اس لیے کہا جاتا ہے کہ یہ زیتون کی تجارت کرتے تھے، ان کی وفات ۱۵۶ھ ، ۷۷۲ء میں ہوئی۔

[7] کسائیؒ: علی بن حمزۃ الکسائی۔ یہ کوفیوں کے امام نحو تھے کوفے ہی میں نشو و نما پائی اور یہیں علم قرآت حمزہ الزیات سے سیکھا، لیکن بعد میں اپنی خاص قرارت کے لحاظ سے ممتاز ہو گئے اور ساتوں قراء میں شمار ہونے لگے ان کی وفات ۱۷۹ھ ، ۷۹۵ء میں ہوئی۔ یہ سب قرآن مجید کے ساتوں قاریوں کے نام ہیں۔

الجوزی بھی تیس سال سے اوپر اسے تلاش کرتے رہے، تب جاکر انہیں اس حدیث کے معنی کی وجہ ظاہر ہوئی تھی، اس کے بعد ابن الجوزی نے لکھا ہے کہ انہیں اور لوگوں کی کی ہوئی تشریحات کا بھی پتہ چلا ہے اس کا بیان مصنف[1] کتاب الانتصار نے شرح وبسط سے کیا ہے لیکن وہ تشریح صرف ظاہر تلفظ اور اس کے اختلافات تک محدود ہے اور ان میں انوار باطنیہ کا ذکر نہیں ہے جن کی وجہ سے یہ لفظی اختلافات پیدا ہوتے، مختصر یہ کہ یہ تشریح اور دوسری تشریحات جو اس حدیث میں کی گئیں اس میں بیان کنندگان نے صرف درخت کے سایے کو لیا ہے اور یہ تشریح جو ہمارے شیخ نے آنحضرت صلّی اللہ علیہ وسلّم سے سُنی اس میں تمام درخت کا، اس کی جڑوں کا اور اس کی شاخوں کا ذکر ہے اور تمام چیزوں کا ذکر ہے جو اس درخت سے پیدا ہوتی ہیں حضرت نے فرمایا: اگر میں اس کے متعلق سات کتابیں بھی لکھنا چاہوں تو لکھ سکتا ہوں، لیکن چونکہ راز کی باتیں ہیں اس لیے نہیں لکھاتا۔

جب آپ تشریح فرمارہے تھے تو میں نے آپ کو فرماتے سُنا کہ آیت میں کچھ تو اجزاء نبوت کے ہوتے ہیں، کچھ اجزاء رسالت کے اور اسی طرح باقی سات حروف کے، اس لیے میں نے عرض کیا کہ حضرت ان سات حروف کے اجزاء کی تشریح فرمادیجیے، پھر یہ بھی فرمادیں کہ ان حروف کی ان پر تفریع[2] کیسے ہوتی ہے تاکہ اُن کا فائدہ مکمل ہو جائے۔

حروف کی مزید تشریح فرمایا: ان سات حرفوں میں سے ہر ایک کے سات اجزاء ہیں چنانچہ آدمیت کے سات، نبوّت کے سات، رسالت کے سات، رُوح کے سات، قبض کے سات، بسط کے سات اور عِلم کے سات۔ کل ۴۹ اجزا ہوئے۔

۱۔ آدمیّت

اجزاء آدمیّت اور اس کا پہلا جُزو آدمیت کا پہلا جُزو ظاہری صورت کا کمالِ حُسن ہے اس طرح کہ چہرہ، ہاتھ پاؤں انگلیاں اور باقی تمام اجزاء اور ظاہری اوصاف مثلاً حسن کی سفیدی و رونق نہایت عمدہ اور خوبصورت ہوں۔

دُوسرا جُز جسم کے ظاہری منافع کا کمال مثلاً حواسِ خمسہ ظاہرہ کہ ان کی قوتِ سماع بھی پورے کمال

---

[1] انتصار کے نام سے بہت سی کتابیں لکھی گئیں ہیں مگر یہاں ابوبکر محمد بن الطیب الاشعری الباقلانی المتوفی ۴۰۳ھ کی تصنیف مراد ہے۔

[2] شاخ نکالنا

کی ہو، بینائی بھی کمال کی ہو۔ اسی طرح قوتِ شامہ[1]۔ ذوقِ لمس[2] ہو اور مثلاً آواز اور اُن حروف کا تلفظ بھی حدِ کمال تک پہنچا ہو کہ یہ حروف نہایت کمال اور فصاحت و بلاغت تک پہنچ چکے ہوں۔

تیسرا جُزو صورتِ باطنیہ کا کمالِ حسن۔ تاکہ دل بہترین شکل اور بہترین حالت کا ہو اور جگر بھی کامل شکل کا ہو، اسی طرح دماغ، رگیں وغیرہ حتیٰ کہ تمام اجزاء کمال پر ہوں۔

چوتھا جزو حسنِ باطنی کا کمال۔ تاکہ لذت و حُسن کی جو کیفیت اسے حاصل ہو وہ کمال پر ہو۔

پانچواں جُزو: نر ہونا پانچواں جزو ذکوریت (نر ہونا) ہے کیونکہ یہی آدمیت کا کمال ہے اس لیے کہ اس میں فعل (دوسرے پر اثر کرنے کا) کا راز پایا جاتا ہے اور انوثیت (مادہ ہونا) میں انفعال (اثر قبول کرنے) کا راز ہوتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آدمؑ کو اپنے لیے پیدا کیا اور باقی تمام چیزوں کو آدم کے لیے پیدا کیا اور ان میں عورتیں بھی شامل ہیں اور جب اللہ تعالیٰ نے تمام اشیاء کو آدم کے لیے پیدا کیا تو اسے فعل کا راز بھی عطا کیا اور اسے اپنا خلیفہ بنایا اور خلافت کو قیامت تک آپ کی نرینہ اولاد میں مقرر فرمایا۔

چھٹا جُزو: انسانی جسم سے شیطانی حصہ نکال دینا چھٹا جزو جسم انسانی سے شیطانی حصے کا نکال لینا ہے کیونکہ اسی سے آدمیت کی تکمیل ہوتی ہے، یہی وجہ تھی کہ ملائکہ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا سینہ شق کیا اور اس میں سے جو نکالنا تھا نکالا اور پھر جس چیز سے دھونا تھا دھویا اور اسے ایمان و حکمت سے بھر دیا۔

ساتواں جزو کمالِ عقل ساتواں جُزو کمالِ عقل ہے اس طرح کہ عقل انتہا درجہ کی صاف اور معرفت میں کمال تک پہنچتی ہو۔ یہ وہ سات جُزو ہیں جنہیں قریب قریب آدمیت کے اجزا سے تعبیر کیا جاتا ہے اور آدمیت کے اجزا اپنے انتہائی کمال میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات کے سوا کسی اور میں نہیں پائے گئے۔

۲۔ قبض

پہلا جُزو: حاسّہ اس کا پہلا جزو وہ حاسّہ ہے جو ذاتِ انسانی میں رکھا ہوا اور اس کے تمام جواہر میں پھیلا ہوا ہے جس کے ذریعے سے ذاتِ انسانی اپنے تمام جواہر میں خیر سے لذت حاصل کرتی ہے بعینہٖ اسی طرح جس طرح انسان شہد کی مٹھاس سے لذت حاصل

---

[1] سونگھنے کی قوت [2] چھونا [3] محسوس کرنے کی قوت

کرتا ہے اور اسی کے ذریعہ سے ذاتِ انسانی کو اپنے تمام جواہر میں تکلیف پہنچتی ہے، جس طرح انسان حنظل وغیرہ کی کڑواہٹ سے تکلیف محسوس کرتا ہے۔

۲- انصاف دوسرا جزو انصاف ہے اس کے بغیر قبض کی تکمیل نہیں ہوتی، کیونکہ یہاں پر قبض نورانی کی بحث ہو رہی ہے چنانچہ اگر اس قبض کے ساتھ انصاف نہ ہوگا تو یہ قبض ظلمانی ہوگی اور قبض ظلمانی والا انسان اللہ کے غضب کا مستحق ہوتا ہے۔

۳- ضد سے نفرت تیسرا جزو ضد سے نفرت ہے جس طرح ہر ضد اپنی ضد سے نفرت کرتی ہے اور اس کے ساتھ اکٹھی نہیں ہوتی جیسا کہ سفیدی اور سیاہی اکٹھی نہیں ہوتی اور قیام اور قعود جمع نہیں ہو سکتے (ایک وقت اور ایک مقام میں ایک ہی چیز ہوگی)

۴- حق بات کہنے سے نہ شرمانا چوتھا جزو حق بات کہنے سے شرم نہ کرنا ہے چنانچہ انسان خواہ حق بات کڑوی ہی کیوں نہ ہو کہہ دے اور اللہ کے بارے میں وہ کسی طعنہ اور ملامت کی پروا نہ کرے۔

۵- تعمیلِ احکام پانچواں جزو تعمیل احکام ہے۔ کیونکہ بحث قبضِ نورانی کی ہو رہی ہے لہٰذا اگر قبض کے ساتھ شریعت کی مخالفت ہو تو یہ قبضِ ظلمانی ہوگی جس کی وجہ سے انسان حق تعالیٰ کی ناراضگی کا مستوجب ہوتا ہے۔

۶- میل اِلی الجنس چھٹا جزو ہمجنس کی طرف میلِ تام ہے یہاں تک کہ وہ اپنے اندر ہمجنس کی کیفیت پیدا کرے۔ مثلاً آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جب کسی کو یہ کہتا سنتے کہ اللہ برحق ہے وہی ہمارا خالق اور رازق ہے اور وہ واحد ہے اس کے ملک میں اس کا کوئی شریک نہیں ہے یا اسی قسم کا کوئی اور کلام سنتے تو آپ کا قلب اس کی طرف کھنچتا اور آپ اسے اس حد تک محبت کرتے کہ آپ کے اعضاء میں انشراح[1] پیدا ہوتا حتیٰ کہ اس کلام کے راز کی کیفیت آپ[2] پر طاری ہو جاتی اور آپ کی ذات اس نور کو بیان کرتی جو اس کلام کے ساتھ نکلا تھا۔ پس جس طرح ضد سے کلی نفرت ہوتی تھی اسی طرح ہمجنس کی طرف کلی میلان ہوتا تھا۔

---

[1] کھلنا، کشادہ ہونا۔

[2] محقق دوانی نے شیخ شبلی رحمۃ اللہ علیہ کا ایک واقعہ لکھا ہے کہ کسی شخص نے ایک جانور کو لاٹھی ماری۔ شیخ پر اس کا اتنا اثر ہوا کہ عین اسی مقام پر جہاں جانور پر لاٹھی لگی تھی شیخ کے جسم پر لاٹھی کے نشان پڑ گئے۔ یہ کمال کیفیت احساس کی وجہ سے تھا۔ ۱۲ مترجم۔

۷۔ کمالِ گرفت

ساتواں جزو کمالِ گرفت کی قوت ہے۔ چنانچہ اگر کسی چیز کو جھپٹ کر پکڑنا چاہے تو اس میں ذرہ بھر بھی ہاتھ سے نہ گرے۔ محسوسات میں اس کی مثال یہ ہے کہ جو شخص جھپٹ کر دس چیزوں کو لینا چاہے تو اگر ان میں سے ایک بھی گر جائے تو اس میں قوتِ کاملہ گرفت نہیں ہے اور اگر ایک بھی نہ گرے تو اس میں گرفت کی قوت کاملہ ہے۔ اسی طرح اگر کوئی شخص کسی چیز کو جھپٹ کرے کر اس پر دائم نہ رہا تو بھی اس میں گرفت کی قوتِ کاملہ نہیں ہے اور اگر اس پر دائم رہے تو پھر یہ قوت اس میں پائی جائے گی۔ پہلے بیان ہو چکا ہے کہ قبض کے اجزاء میں سے ایک جزو میل الی الجنس اور جنس کی کیفیت اخذ کرنا ہے اور اس اخذِ کیفیت کے ساتھ ساتھ گرفت کی قوتِ کاملہ کا ہونا ضروری ہے اسی طرح قبض کا ایک جزو ضد سے نفرت ہے اس میں بھی گرفت کی قوتِ کاملہ کا ہونا ضروری ہے تاکہ اپنی نفرت پر قائم رہے۔

۳۔ بَسط

۱۔ فرحِ کامل

بَسط کا پہلا جزو فرحِ[1] کامل ہے اور یہ ایک نُورِ باطن ہوتا ہے جس کے اندر بھی یہ پایا جائے تو یہ نور اس شخص کے دل سے کینہ، حسد، تکبر، بخل اور عداوت کو نکال دیتا ہے کیونکہ یہ اوصاف فرحِ کامل کے منافی ہیں۔ لہٰذا جب اس فرح کے ساتھ کسی ذات میں نُورِ ایمان پایا جائے تو اس کا نزول اس ذات پر مُجانسِت[2] اور موافقت کا نزول ہوگا اور یہ فرح ذات میں مناسب طور متمکن[3] ہو جائے گی اور اس کی مثال ایسی ہوگی جیسے کہ ایک اچھی زمین پر بارش کا نزول ہو، لہٰذا اُس سے پاکیزہ اخلاق پیدا ہوں گے۔

۲۔ سکون خیر فی الذات

دوسرا جزو ذاتِ انسانی میں بُرائی کی بجائے نیکی کا ساکن ہونا ہے یہ ایک نُور ہے کہ جسے حاصل ہو، بھلائی اس کی طبیعتِ ثانیہ بن جاتی ہے اور وہ بھلائی اور بھلائی کرنے والوں سے محبت کرتا ہے اور اس کے ذہن میں بھی وہی خیالات آتے ہیں جو بھلائی کی طرف لے جائیں اور اگر کوئی شخص اُس سے بھلائی کرتا ہے تو وہ کبھی نہیں بھولتا، لیکن اگر کوئی ایذا رسانی کرتا ہے تو وقت گزرنے پر وہ اسے بھول جاتا ہے اور وہ ایذا رسانی اس کے ذہن میں نہیں رہتی، حتیٰ کہ اگر اس کے بعد اسے آزمائیں تو اس کا دل اس سے خالی پائیں گے اور وہ خود مطمئن اور خوش ہوتا ہے گویا کوئی ایذا پہنچانے والی بات ہی نہیں ہوئی اور یہی بَسط کا کمال ہے۔

---

[1] خوشی [2] ہم جنسی [3] جگہ پکڑنے والا

۳- فتح حواسِ ظاہرہ

تیسرا جُزو حواسِ ظاہری کی فتح[1] ہے۔ یہ ایک لذّت ہوتی ہے جو حواسِ ظاہرہ میں حاصل ہوتی ہے۔ اس طرح کہ یہ لذّت ان رگوں کو کھول دیتی ہے جو ان حواس میں پائی جاتی ہیں۔ پھر جو اِدراک حواس کو ہوتا ہے اس کی کیفیت اُن عُروق[2] میں آجاتی ہے اور اسی لذّت سے بَسط کا کمال ہوتا ہے چنانچہ بصر میں ایک لذّت ہے جس کے ذریعہ سے خوب صورت صورتوں کی طرف میلان حاصل ہوتا ہے اور اسی سے اس چیز سے جسے دیکھا گیا ہو عشق اور انقطاعِ باطنی پیدا ہوتا ہے اور سمع میں بھی ایک لذّت ہے جس کی وجہ سے خوش آوازوں اور نغموں کو سنکر انکساری پیدا ہوتی ہے اور بعض اوقات اس سے ذات میں اضطراب اور وَجد پیدا ہو جاتا ہے، باقی حواس کا بھی یہی حال ہے۔ چنانچہ ہر حِس میں مطلق[3] اِدراک کے علاوہ ایک زائد لذّت پائی جاتی ہے۔

فتحِ حواسِ ظاہرہ اور کمالِ حواسِ ظاہرہ میں فرق

حواس ظاہرہ کی فتح جو بسط کا جزو ہے اور حواسِ ظاہر کے کمال، جو آدمیت کا جُزو ہے میں فرق یہ ہے کہ حواس ظاہرہ کی فتح عُرُوقِ سابقہ کو کھول کر اس کے کمال کو بڑھا دیتی ہے کیونکہ رگوں کا کھلنا اس ادراک سے زائد چیز ہے جو کمالِ حواس میں پایا جاتا ہے۔ عُروق کی اسی فتح اور کیفیت جاذبہ کی وجہ سے گرویدگی پیدا ہوتی ہے برخلافِ مطلق اِدراک کے کیونکہ اس کے ہوتے ہوتے گرویدگی حاصل نہیں ہوتی کیونکہ بہت سے لوگ حسین امور دیکھنے کے باوجود اُن سے متاثر نہیں ہوتے اور کئی دوسرے حضرات ہیں کہ خوش آوازیں سنتے ہیں، لیکن ان پر کچھ اثر نہیں ہوتا۔ اسی فتح اور تکیّف[4] سے کمالِ بَسط حاصل ہوتا ہے۔

۴- فتح حواسِ باطنہ

چوتھا جُزو فتح حواسِ باطنہ فتح عُروق اور ان کا مُدرَک بالحواس[5] سے اثر پذیر ہونا اور اس کے ساتھ انسان کا مُدرَک کا گرویدہ ہو جانا جن کا ذکر ہم فتحِ حواسِ ظاہرہ میں کر چکے ہیں، وہی سب امور یہاں بھی جاری ہوں گے اور مذکورہ بالا فرق یہاں بھی فتح حواسِ باطنہ اور کمالِ حواسِ باطنہ میں اسی طرح پایا جائے گا۔

۵- مقامِ رفعت

پانچواں جُزو مقامِ رفعت[6] ہے، کیونکہ جب انسان اجزاء آدمیت سے آراستہ ہو جاتا ہے، اس کے بعد اجزاء قبض اور پھر مذکورہ چار اجزاء بَسط سے آراستہ ہوتا ہے تو اسے اس چیز کی قدر معلوم ہو جاتی ہے جو اسے عطا کی گئی اور اسے یہ بھی معلوم ہو جاتا ہے کہ اوصاف

---

[1] کشائش، کھلنا [2] رگوں۔ نسوں [3] معلوم کرنا، سمجھنے کی قوت [4] کیفیت پر ہونا، خوشی منانا

[5] جن کا ادراک حواس کے ذریعے ہو [6] بلندی

کسی بڑی ہستی کو ہی عطا ہوتے ہیں تو وہ سمجھ جاتا ہے کہ وہ اپنے رب کے نزدیک بلند قدر والا اور بڑے درجے والا ہے اور بڑا شخص وہی ہوتا ہے جو بلند مرتبہ کام کرے اور اس میں مکارم اخلاق پائے جائیں چنانچہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: ولقد کرمنا بنی آدم (ہم نے بنی آدم کو عزت دی) اور فرمایا ولقد[1] خلقنا الانسان فی احسنِ تقویم (ہم نے انسان کو عمدہ صورت عطا کی) چنانچہ جب اُسے علم ہوگا کہ وہ کبیر القدر اور رفیع الدرجہ ہے تو اس کا بسط بھی کامل ہوگا۔ اسی وجہ سے مقامِ رفعت اجزاء بسط میں سے ہے۔

۶۔ حُسنِ تجاوز

چھٹا جُزو حسن تجاوز ہے جس کی وجہ سے یہ اس شخص کو معاف کر دیگا جس نے اس پر ظلم کیا ہے اور جس نے اس سے بُرا برتاؤ کیا ہے اسے درگزر کر دے گا۔ حسنِ تجاوز اجزاء بسط میں سے اس لیے ہے کہ ہماری بحث بسطِ نورانی سے ہے نہ کہ بسط ظلمانی سے اور ہم پہلے اجزاء بسط میں مقام رفعت کا ذکر کر چکے ہیں اور یہ بھی بتا چکے ہیں کہ مقامِ رفعت سے مراد رفعت قدر اور شان کی بزرگی ہے اور اگر اس رفعت کے ساتھ حسنِ تجاوز بھی ہوگا تو یہ بسط نورانی ہوگا لیکن اگر اس رفعت کے ساتھ بُرا برتاؤ اور ظلم ہوگا تو یہ مقامِ رفعت ظلمانی ہوگا جس کی وجہ سے انسان غضبِ الٰہی کا مستوجب[2] ہوگا، یہاں سے یہ بات واضح ہوگئی کہ بسط نورانی کی حقیقت اور اس کے اجزاء کے لیے حسنِ تجاوز کا ہونا ضروری ہے۔

۷۔ نرم خوئی و تواضع

ساتواں جزو نرم خوئی و تواضع ہے۔ بسط کے اجزاء میں اس کے داخل ہونے کی وجہ وہی ہے جو ہم حسن تجاوز میں ذکر کر چکے ہیں۔ کیونکہ بسط والے کا مرتبہ بلند ہوتا ہے۔ لہٰذا اپنے ہم جنسوں کے ساتھ جو اس کے رفیق ہیں تواضع اور نرمی کرنا ضروری ہے کیونکہ اگر وہ اپنے آپ کو اُن سے بلند ظاہر کرے گا تو اس بسط میں کبر داخل ہو جاتے گا جس کی وجہ سے غضب خداوندی کا مستحق ہوگا۔

آدمیت، قبض اور بسط کے اجزاء انبیاء و غیر انبیاء دونوں میں پائے جاتے ہیں، لیکن انبیاء میں بدرجۂ اکمل ہوتے ہیں

یاد رہے کہ آدمیت اور اس کے اجزاء اسی طرح قبض اور بسط اور ان کے اجزاء جیسے نبی صلی اللہ علیہ وسلم میں پائے جاتے ہیں اسی طرح اوروں میں بھی پائے جاتے ہیں خواہ وہ شخص کافر ہی کیوں نہ ہو، لیکن نبی صلی اللہ علیہ وسلم میں وہ مخصوص آدمیت پائی جاتی ہے جس سے بڑھکر خارج میں

---

[1] سورۂ تین (پارہ ۳۰) آیت ۴ [2] جس پر واجب ہو۔

کوئی آدمیت نہیں پائی جاسکتی اور یہ جو آدمیت کے اجزاء میں نزع حظ الشیطان (شیطانی حصے کا نکالنا) کا ذکر کیا گیا ہے اس سے شقِ صدرِ النبی ہی مراد ہے، یہ اوصاف اور انسانوں میں کمال کے درجات میں سے صرف ایک حد تک پائے جاتے ہیں اعلیٰ درجات نہیں پائے جاتے اور وہاں نزع حظ الشیطان سے مراد ذات سے قباحت اور بے حیائی کا نکالنا ہوگا تاکہ وہ شخص نہ شریر ہو نہ بدخلق، ان لوگوں سے نزع حظِ الشیطان سے مراد اس گوشت کے لوتھڑے کا نکالنا نہیں جس کا ذکر شقِ صدر النبی صلی اللہ علیہ وسلم میں کیا گیا، کیونکہ یہ بات تو درجۂ نبوت کے ساتھ مخصوص ہے۔

ذاتِ نبی اور غیر نبی کے قبض میں فرق

اب رہا قبض تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات کے ساتھ صرف وہی قبض نورانی مختص ہے جو بلند ترین درجے کا ہو۔ رہے دوسرے لوگ سو اگر وہ آپ کے طریقے کے متبع اور آپ کی سیرت پر چل رہے ہیں تو انکا قبض اسی قدر نورانی ہو گا جس قدر کہ وہ آپ کی تابعداری کرتے ہیں، لیکن پھر بھی وہ قبضِ نورانی انتہائی کمال کا نہ ہوگا بلکہ مراتبِ کمال میں سے ایک مرتبہ پر ہوگا اس لیے کہ انتہائی کمال خصائصِ نبوت میں سے ہے۔

شیاطین کا قبض

اور اگر وہ آپ کی شریعت کا مخالف ہوگا تو یہ قبض ظلمانی ہوگا اور قبض کے جزوِ اوّل میں حواس کی جو کیفیت بیان کی گئی ہے یہاں اس کے برعکس ہوگی، جس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ یہ شخص شر سے لذت حاصل کرے گا اور خیر سے تکلیف پائے گا اور قبض کا جزوِ ثانی یعنی انصاف تو بالکل ہی جاتا رہے گا کیونکہ جب اُسے بدی سے مزہ آئے گا اور خیر سے تکلیف ہوگی تو اس صورت میں اس سے انصاف کا واقع ہونا محال ہے کیونکہ انصاف تو اُسی شخص سے ممکن ہوگا جو خیر سے لذت پاوے اور شر سے دل دُکھے اور قبض کا تیسرا جزو یعنی ضد سے نفرت بھی اس میں بالکل برعکس ہوگی۔ یعنی وہ شخص خیر سے نفرت کرے گا۔ یہی حال باقی اجزاء کا ہوگا کیونکہ قبض ظلمانی میں وہ بالکل برعکس ہوجاتے ہیں اور جب تمام اجزاء قبض منعکس ہوگئے تو یہ ایسا قبض ظلمانی ہے جو سرکش شیاطین اور کفار میں پایا جاتا ہے۔ ہم اللہ سے دعا کرتے ہیں کہ وہ ہمیں اس سے بچائے، یہی وجہ تھی کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے اس قدر معجزات دیکھنے کے باوجود ان کی سرکشی اور کفر بڑھتا ہی گیا۔

عامۃ المومنین کا قبض

اور اگر قبض کے بعض اجزاء منعکس ہوتے اور بعض نہ ہوتے تو یہ عامۃ المومنین کا قبض ہے۔

بسط کا بھی یہی حال ہے کہ ذاتِ محمدیؐ میں بسطِ نورانی کا اعلیٰ ترین درجہ کمال ہے اور دوسروں میں وہی تفصیل جاری ہوگی جو قبض میں بیان ہوئی۔ ہاں بسطِ نورانی حسنِ تجاوز اور تواضع ہوگی کہ دونوں اسکے جزو ہیں اور بسطِ ظلمانی میں یہ دونوں باتیں نہ ہوں گی۔ واللہ اعلم۔

۴۔ نبوّت

۱۔ حق گوئی نبوّت کا پہلا جزو حق گوئی ہے اور یہ صفت اس ذاتی نور سے پیدا ہوتی ہے جو حق گوئی پر مجبور کرتا ہے اور یہ اس کی طبیعت اور خصلت بن جاتی ہے اور وہ شخص حق گوئی سے باز نہیں آتا خواہ دوست واحباب اُس کے مخالف ہی کیوں نہ ہو جائیں اور اسے وطن ہی کیوں نہ چھوڑنا پڑے۔ بلکہ خواہ اس میں اس کی گردن ہی کیوں نہ کٹ جائے، چنانچہ مشرکینِ مکہ نے کتنا ہی چاہا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم حق گوئی[1] چھوڑ دیں اور ہر ممکن طریقے سے آپ کو پھسلانا چاہا مگر آپ نے انکار کر دیا اور آپ نہ مانے۔ اس پر وہ آپ کے مخالف ہو گئے اور سب نے متحد ہو کر آپؐ سے جنگ کی اس کے باوجود آپ کی ثابت قدمی بڑھتی گئی اس لیے کہ آپ کی ذاتِ مقدس کی سرشت میں حق گوئی ہے اور اُس کے خلاف تصور میں ہی نہیں آ سکتا۔ اس کے بعد آپ نے دو حکایتیں بیان کیں

حکایت۔ ۱ عجم کے کسی شہر میں سدھائے ہوئے پرندے دروازے پر ہوتے ہیں۔ اگر کوئی چور گھر میں گھس آئے تو پرندے شور مچانے لگ جاتے ہیں "چور آ گئے" اور یہ پرندے ان الفاظ کو دوہرانے سے باز نہیں آتے خواہ انہیں کتنا ہی دھمکایا جائے اور ڈرایا جائے اسی طرح اگر اُن کو کھانے کو بھی کوئی چیز دی جائے تب بھی یہ باز نہیں آتے۔ مختصر یہ کہ یہ پرندے خواہ انہیں قتل بھی کر دیا جائے تب بھی باز نہیں آتے۔ اس حکایت کے بیان کرنے سے آپ کا مقصد حق گوئی کی

---

[1] آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم یوں تو ہر بات میں صادق و امین تھے، لیکن یہاں قولِ حق سے مراد اعلانِ نبوت اور شرک کی مذمت ہے۔ اسی واسطے جب غزوۂ حنین میں مسلمانوں کو شکست ہوئی اور آپ کے ساتھ صرف چند صحابی رہ گئے اور دوسری طرف کفار تیروں کی بارش برسا رہے تھے تو پھر بھی اس موقعہ پر آپ نے یہی اعلان کیا۔

اَنَا النَّبِیُّ لَا کَذِبْ   اَنَا ابْنُ عَبْدِ الْمُطَّلِبْ

میں نبی ہوں، جھوٹا نہیں ہوں کہ قولِ حق سے پھر جاؤں۔ عبدالمطلب کا پوتا ہوں جس نے تم میں ساری عمر گذاری ہے۔ ۱۲ مترجم

تشریح کرنا تھا اور یہ بھی سمجھانا مقصود تھا کہ تعلیم سے بھلائی حاصل ہو جاتی ہے کیونکہ پرندے نے باوجود دُوری کے یہ بات سیکھ لی یہاں تک کہ یہ اس کی طبیعت بن گئی تو انسان کا کیا حال ہوگا اور مومن کا تو کیا ہی کہنا۔

حکایت ۔ ۲ ایک مُرید نے اپنے پیر سے کہا مجھے کوئی ایسی بات بتائیں جس سے مجھے اللہ کے ہاں راحت ہو، شیخ نے کہا اگر تمہارا ارادہ یہی ہے تو اللہ تعالیٰ کے اوصاف[ف] میں سے کسی ایک کی مشابہت اختیار کر لو۔ کیوں کہ اگر تو ان میں سے کسی ایک کے ساتھ بھی موصوف ہو جائیگا تو اللہ تعالیٰ تجھے قیامت کے دن اپنے اولیاء کے ساتھ رہنے کو جگہ دے گا اور تجھے جہنم میں اپنے دشمنوں کے ساتھ نہیں رکھے گا۔ مُرید نے عرض کیا یہ کیسے ہو سکتا ہے، اللہ کے اوصاف تو بیشمار ہیں، فرمایا کسی ایک میں اسکی شبیہ بن جاؤ۔ مرید نے عرض کیا وہ کونسا وصف ہے، فرمایا: ان لوگوں میں سے ہو جاؤ جو حق بات کہتے ہیں کیونکہ حق گوئی اللہ تعالیٰ کی صفت ہے۔ اگر تو حق گو بن گیا تو اللہ تجھ پر رحم فرماتے گا، اُس نے سچ بولنے کا وعدہ کیا اور چلا گیا۔ مرید کے پڑوس میں ایک لڑکی رہتی تھی، وہ شیطان کے نرغے میں آگیا اور اُس نے اس سے بدکاری کر کے اس کی بکارت کو زائل کر دیا، لڑکی سے نہ رہا گیا حالانکہ اُسی نے ابتدا کی تھی کیونکہ اسے معلوم تھا کہ یہ بات چھُپنے والی نہیں اور اس نے اپنے باپ کو کہہ دیا اور اس نے عدالت میں دعویٰ دائر کیا۔ حاکم نے مرید سے کہا کہ سنتے ہو یہ شخص کیا کہہ رہا ہے؟ اُس نے کہا ہاں یہ سچ کہہ رہا ہے مجھ سے یہ فعل سرزد ہوا ہے اور اسے اپنے پیر کا عہد یاد تھا۔ اس لیے وہ انکار نہ کر سکا، حاکم نے یہ سنکر کہا: یہ شخص دیوانہ ہے اسے پاگل خانہ لے جاؤ کیونکہ کوئی عقلمند انسان ایسی بات کا اقرار نہیں کرتا جس سے اُسے دُکھ پہنچے۔ چنانچہ اسے پاگل خانہ میں بھیج دیا گیا۔ کچھ دنوں بعد کسی نے اس کی سفارش کی اور حاکم نے اسے چھوڑ دیا۔

اس قصہ سے حضرت کا یہ بیان مقصود تھا کہ حق گوئی کا انجام ہمیشہ اچھا ہی ہوتا ہے واللہ اعلم۔

۲۔ صبر وہ ایک نُور ہے جو جسم کو ان مصائب و آلام کا احساس نہیں ہونے دیتا جو اسے اللہ کی خاطر پہنچیں۔ یہی حقیقی صبر ہوتا ہے جو بغیر تکلیف کے ہوتا ہے اس لیے کہ اپنے فکر کی وسعت کی وجہ سے صابر کی عقل بھی وسیع ہوتی ہے کیونکہ جسم کو اس کا راز کھل چکا ہوتا ہے تو اس کی عقل اللہ تعالیٰ کے لاتعداد کمالات کی سیر کرتی رہتی ہے۔ لہٰذا جب جسم کو کوئی تکلیف ہونے لگتی ہے تو جسم اس تکلیف

[ف] اور یہی معنی ہیں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے فرمان کے تَخَلَّقُوا بِاَخْلَاقِ اللّٰہِ لیکن سب اوصاف میں تو مشابہت ہو نہیں سکتی اس لیے کسی ایک کی مشابہت کا حکم دیا۔

کا خیال چھوڑ کر اُن امور میں مشغول ہو جاتا ہے جن میں فکر مشغول ہوتا ہے (اور یہی مشغولیت اسے تکلیف کا احساس نہیں ہونے دیتی) چنانچہ ایسا واقعہ ایک وَلی سے پیش آیا جو اپنے زمانے کا غوث تھا کہ چار آدمی اسے قتل کرنے کو آئے۔ اس وَلی کے کئی ایک بچے بھی تھے۔ یہ آدمی اُسے اس کے گھر اور بیوی بچوں کے درمیان سے گھسیٹ کرلے گئے اور اس کی اولاد چیخ پکار کرتی رہ گئی اور انہوں نے اسے ذبح کر دیا اس واقعہ کے دوران اس ولی کی فکر اپنے دھیان میں لگی ہوئی تھی اور اس نے قطعاً اس بات کی طرف توجہ ہی نہیں کی کہ اس کے ساتھ کیا واقعہ گذر رہا ہے اور نہ ہی اپنی اولاد اور عورتوں کے چلانے کی طرف توجہ دی، یہ عجیب وغریب صبر ہے جو سننے میں آیا۔ جب اولیاء اُمّت کی یہ شان ہے تو آنحضرت صلّی اللہ علیہ وسلّم کے صبر[1] کا کیا حال ہوگا۔

لیکن اگر ذات حجاب میں ہو تو عقل کا نُور ذات میں جمع ہو جائے گا اور اسی میں بند ہو کر رہ جائے گا، چنانچہ جب جسم پر کوئی تکلیف دہ چیز نازل ہوتی ہے تو جسم بہت زیادہ تکلیف کا احساس کرتا ہے اور اگر تو ایک سلاخ سے اسے داغ دے گا تو اسے اس قدر تکلیف ہوگی جس قدر کہ سَو سلاخوں سے داغنے سے ہوتی ہے، لیکن اگر تو اسی سلاخ سے صاحب فتح (ولی) کو داغ دے تو یا تو وہ بالکل ہی محسوس نہ کرے گا جیسا کہ ولی مذکور سے ہوا یا اگر محسوس کرے گا بھی تو تھوڑا۔

۳۔ رَحمت تیسرا جزو رحمت ہے اور یہ ذات کے اندر ایک نُور ہے جس کا تقاضا ہے کہ تمام مخلوقات پر رحم کھایا جائے اور یہ نور اس رحمت سے پیدا ہوتا ہے جو اللہ کی طرف سے بندے کو پہنچتی ہے اور جس قدر کہ اللہ کی رحمت بندے پر ہوتی ہے اسی قدر اس بندے کی رحمت تمام لوگوں کیلئے ہوتی ہے اور اس بات میں شک نہیں ہو سکتا کہ تمام مخلوقات میں کوئی شخص ایسا نہیں جس پر اللہ تعالیٰ کی اس قدر رحمت ہوتی ہو جس قدر کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر ہوئی۔ یہی وجہ ہے کہ عامۃ الخلائق پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی رحمت کے برابر کسی اَور کی رَحمت نہیں ہے اور آپ کی رَحمت عظیم اس حد تک پہنچ چکی ہے کہ آپ کی رحمت عالمِ سفلی[2]، عالمِ علوی[3] اور اہلِ دنیا اور

---

[1] آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تمام زندگی صبر کی مثالوں سے پُر ہے جب آپ طائف تبلیغ کے لیے تشریف لے گئے اور کفار نے پتھر برسائے، کتے پیچھے چھوڑے، خون آپ کے سر سے پاؤں تک بہ رہا تھا، لیکن زبان سے یہی الفاظ نکلے۔ اَللّٰھُمَّ اِنْ لَّمْ یَکُنْ بِیْ غَضَبٌ مِّنْکَ فَلَا اُبَالِیْ (ترجمہ خدایا: اگر تو مجھ سے ناراض نہیں ہے تو مجھے ان تکالیف کی پروا نہیں) یہی وجہ تھی کہ اس کے بعد فرمایا: اَللّٰھُمَّ اھْدِ قَوْمِیْ فَاِنَّھُمْ لَا یَعْلَمُوْنَ (خدایا میری قوم کو راہ راست پر لا۔ کیونکہ وہ نہیں جانتے)۱۲

[2] نیچے کا [3] اوپر کا

اہلِ آخرت سب پر عام ہے۔

اللہ تعالیٰ نے بِالْمُؤْمِنِیْنَ رَءُوْفٌ رَّحِیْمٌ کی آیت میں چار باتوں کی طرف اشارہ فرمایا ہے:

۱۔ یہ وہ نور ہے جس سے اس تمام مخلوق کو سیراب کیا جاتا ہے جنہیں خوشنودیٔ حق کا پروانہ حاصل ہو چکا ہے (یعنی مومنین)

۲۔ اس نور کو خدا کا قرب حاصل ہے اور قرب سے مراد قربِ مرتبہ ہے نہ قربِ مکانی۔

۳۔ یہ نور جسے اللہ کا قرب حاصل ہے، تمام کا تمام ذاتِ نبی صلی اللہ علیہ وسلم میں پایا جاتا ہے،

۴۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ مبارک کو اس کے نور کے برداشت کرنے کی طاقت ہے چنانچہ اس کے اٹھانے میں آپ کو کسی قسم کی کلفت و مشقت نہیں ہوتی اور یہی وہ کمال ہے جس کی وجہ سے آپ کو تمام مخلوقات پر فوقیت حاصل ہوئی ہے۔[1]

اس آیتِ شریفہ میں ان چار باتوں کی طرف اشارہ کرنے کا جو حقیقی سبب ہے وہ ان اسرار میں سے جن کا چھپانا ضروری ہے اس آیت میں اور اشارات بھی ہیں، واللہ اعلم

۴۔ معرفتِ الٰہی چوتھا جزو معرفتِ الٰہی ہے ایسی کہ جیسی ہونی چاہیئے۔

۵۔ خوفِ تام[2] پانچواں جزو کامل خوفِ خدا ہے۔ کامل خوفِ خدا سے ہماری مراد یہ ہے کہ باطنی خوف جو اصلی خوف ہے اور تمام اجسام میں پایا جاتا ہے، اس کے ساتھ ظاہری خوف بھی ملا ہوا ہو جس کا سبب عقلِ سلیم اور اللہ تعالیٰ کی ظاہری معرفت ہے۔ باطنی خوف تو تمام جسم میں پایا جاتا ہے اور جسم کے ایک ایک عضو پر حاوی ہوتا ہے کیونکہ ہر جوہر کا خالق خدا ہے اور مخلوق اپنے رب سے ڈرتی ہے جس طرح حادثؔ قدیم سے ڈرتا ہے اور یہ خوف ہر مخلوق میں خواہ وہ جاندار ہو یا غیر جاندار موجود ہوتا ہے جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ثُمَّ اسْتَوٰٓى اِلَى السَّمَآءِ وَهِيَ دُخَانٌ فَقَالَ لَهَا وَلِلْاَرْضِ ائْتِيَا طَوْعًا اَوْ كَرْهًا قَالَتَآ اَتَيْنَا طَآئِعِيْنَ (سورہ حم سجدہ آیت ۱۱) ترجمہ: پھر اللہ تعالیٰ نے آسمان کی طرف توجہ فرمائی اور یہ ابھی دھوئیں کی شکل میں تھا اور اس سے اور زمین سے فرمایا کہ دونوں حاضر ہو جاؤ بخواہ بخوشی یا بجبر۔ دونوں نے کہا ہم بخوشی حاضر ہیں) ان کی زبان سے ان الفاظ کے نکلنے کا سبب وہی اصلی اور باطنی خوف ہے اور اسی خوف کی وجہ سے وہ تسبیح ظہور پذیر ہوتی ہے جو آیت وَاِنْ مِّنْ شَيْءٍ اِلَّا يُسَبِّحُ بِحَمْدِهٖ (ہر چیز خدا کی تسبیح بیان کرتی ہے) میں مذکور

---

[1] بندۂ عاجز مترجم کہتا ہے کہ یہیں سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی رحمۃ للعالمینی کا راز کھل جاتا ہے۔ ۱۲

[2] پورا۔ [3] وہ چیز جو نئی پیدا ہوتی ہو۔

ہے۔ اس خوف کا حکم دوام واستمرار[1] ہے تاکہ ایک لمحہ کے لیے بھی جدا نہ ہو، لیکن ظاہری خوف کا سبب اللہ کی طرف توجہ ہے، جب تک یہ توجہ رہے گی خوف رہے گا، لیکن اگر خیالات کسی اور طرف مشغول ہوجائیں تو یہ توجہ اور خوف دونوں زائل ہوجائیں گے، مگر جس پر اللہ کی رحمت ہوتی ہے تو وہ اس حجاب کو جو خوفِ ظاہری اور خوفِ باطنی حقیقی اصلی دائمی کے درمیان حائل ہوتا ہے زائل کردیتا ہے اس کیلئے یہ خوف بھی ظاہر، دائمی اور صافی بن جاتا ہے جو تاریکی سے پاک ہوتا ہے، پھر اس کے خوف کی یہ کیفیت ہوجاتی ہے کہ یہ اپنے رب کی معرفت سے مدد حاصل کرتا ہے اسی واسطے اس کے خوف کی کوئی انتہا نہیں کیونکہ معرفتِ الٰہی کی کوئی انتہا نہیں لہٰذا جس خوف کو اس معرفت سے مدد حاصل ہو وہ بھی لاانتہا ہوگا۔ مختصر یہ کہ ظاہر باطن سے صفاء اور دوام حاصل کرتا ہے اور باطن ظاہر سے زیادتی اور فیضان حاصل کرتا ہے اسی کا نام خوفِ تام ہے۔ باطن ظاہر سے زیادتی اس لیے حاصل کرتا ہے کہ باطنی خوف کی تمام اجسام کے ساتھ برابر کی نسبت ہے۔ صرف خوفِ ظاہری میں اجرام[2] کی نسبت مختلف ہوتی ہے کیونکہ خوفِ ظاہری کا سبب معرفتِ الٰہیہ ہے اور معرفتِ الٰہیہ میں اجرام کے درجات مختلف ہیں۔ واللہ اعلم۔

۶۔ بغض باطل

چھٹا جزو بغض باطل ہے اور یہ اُس نور سے پیدا ہوتا ہے جو ذات کے اندر ہروقت موجود ہوتا ہے جس کا کام یہ ہے کہ وہ تاریکی کی طرف متوجہ ہوئے اور ان کو اس طرح حاضر کرے گویا وہ اس کی آنکھوں کے سامنے ہیں اور پھر اس کو دفع کرنے کے لیے اس طرح بالمقابل آجائے جسطرح ایک ضد دوسری ضد کے بالمقابل آجاتی ہے اور ضد کا استحضار[3] اس چیز سے مکمل طور پر بغض رکھنے میں ممد ہوتا ہے لہٰذا جب ضد کا استحضار دائمی ہوگا تو اس چیز سے بغض بھی دائمی ہوگا اور باطل سے ہمیشہ اور ہر لحظہ بغض رکھنا اجزاء نبوت کا ایک جزو ہے واللہ اعلم۔

۷۔ عفو

ساتواں جزو عفو[4] ہے۔ یہ اس نور سے پیدا ہوتا ہے جو ذات کے اندر ہمیشہ موجود ہوتا ہے اس نور کی طبیعت ہے کہ جو اُسے نقصان پہنچائے یہ اسے نفع پہنچاتا ہے اور جو اس سے تعلقات منقطع کرے یہ اس سے تعلقات جوڑتا ہے جو اس پر ظلم کرے یہ اس سے درگذر کرتا ہے جو اس سے برائی کرے یہ اس سے نیکی کرتا ہے اور جو عفو اس قسم کا ہو وہ نبوت کا ایک جزو ہے اور اس کا دائمی ہونا ضروری ہے، کیونکہ اس کا سبب نورِ سابق (بغض باطل) ہوتا ہے اور وہ (بغض باطل ذات کے اندر ہمیشہ موجود ہوتا ہے۔ لہٰذا حالتِ عفو بھی دائمی ہوگی، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی

[1] ہمیشگی [2] جسم [3] یاد رکھنا۔ حاضری چاہنا [4] معافی

یہی کیفیت تھی۔

یاد رہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سوا کسی اور نے خصائلِ نبوت کو اس اکمل طریقہ پر حاصل نہیں کیا جس سے اوپر کوئی کمال نہیں ہو سکتا۔ اس کا سبب یہ ہے کہ آدمیت، قبض اور بسط کی خصلتیں کسی ذات میں اس کمال تک نہیں پہنچیں جس حد تک آپ کی ذات میں پہنچی تھیں۔ لہٰذا جب یہ خصلتیں آپ کی ظاہری ذات میں اعلیٰ درجے کی تھیں اور پھر ان پر نبوت کی خصلتوں کا اضافہ ہوا تو اس کے انوار بڑھ گئے اور اس کے اسرار پھیل گئے۔ لہٰذا خصائلِ نبوت کی پہلی خصلت آدمیت، قبض اور بسط کی خصلتوں پر اترتی ہے یہاں تک کہ یہ خصلت اس طرح ہو جاتی ہے گویا مذکورہ بالا خصلتوں کے نور اس میں گھل مل گئے ہیں اور نبوت کی دوسری خصلت میں بائیس خصلتیں اترتی ہیں اور ان خصلتوں کے تمام انوار اس میں جمع ہو جاتے ہیں۔ تیسری خصلت تیئیس خصلتوں پر اترتی ہے اور ان کے انوار اس میں جمع ہو جاتے ہیں۔ مختصر یہ کہ نورِ حق ایسا ہو جاتا ہے جیسا کہ یہ بائیس نوروں سے مرکب ہو اس کے اپنے نور سے اور ماقبل کے انوار سے اور نورِ صبر تیئیس نوروں سے مرکب ہے، اپنے نور اور ماقبل کے انوار سے۔ نورِ رحمت چوبیس نوروں سے مرکب ہے۔ اسی وجہ سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی رحمت مذکورہ بالا صفت سے موصوف ہوئی۔ یہاں تک کہ تمام مخلوقات پر عام ہوئی، آپ کی معرفتِ الٰہیہ کی شرح بیان نہیں ہو سکتی۔ مختصر یہ کہ جب تو نبوت کے جلال کو اپنی آنکھوں کے سامنے رکھے گا پھر جو کچھ اس کی شرح میں کہا گیا اس پر غور کرے گا اور اس کی حقیقت تک پہنچے گا، پھر اس کے انوار کو ماقبل کے انوار پر اتارے گا اور ماقبل کے انوار کو اس میں شامل کرے گا تو تجھے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی بزرگی اور اللہ تعالیٰ کے ہاں ان کی عظمت کا پتہ چل جائے گا جیسا کہ علامہ بوصیریؒ نے کہا ہے:

مُنَزَّہٌ[1] عَنْ شَرِیْکٍ فِیْ مَحَاسِنِہٖ   فَجَوْھَرُ الْحُسْنِ فِیْہِ غَیْرُ مُنْقَسِمِ

(ترجمہ: آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے محاسن میں آپ کا کوئی شریک نہیں (یعنی آپ جیسے محاسن کسی اور میں نہیں پائے جاتے) لہٰذا آپ کا جوہرِ حسن غیر منقسم ہے) صلی اللہ علیہ وعلیٰ آلہٖ وصحبہٖ اجمعین۔

---

[1] یہ شعر علامہ بوصیری کے قصیدۂ بردہ میں سے ہے جس کا ذکر پہلے ہو چکا ہے۔

۵۔ رُوح

پہلا جُزو: ذَوقُ الانوار

روح کا پہلا جزو ذوقُ الانوار[1] ہے اور یہ نُور رُوح کے اندر جاری و ساری ہوتا ہے جس کی وجہ سے رُوح اللہ تعالیٰ کے افعال کے نور کو کائنات میں اور ان انوار میں چکھتی ہے جو عالمِ علوی میں موجود ہوتے ہیں۔ اس اندازے سے جو تقدیر میں لکھا جا چکا ہے اور اس کے حصّے میں آچکا ہے۔ یہ ذوقِ رُوح ذوقِ ذات سے کئی لحاظ سے مختلف ہوتا ہے۔

ذَوقِ رُوح اور ذَوقِ جسم میں فرق

(۱) ذوقِ رُوح نورانی ہوتا ہے اس لیے اس کا تعلق بھی نور ہی سے ہوتا ہے بر خلاف جسمانی ذوق کے کہ اس کا تعلق اجسام سے ہوتا ہے، لہٰذا جب شہد کا جسم ہماری زبان سے لگتا ہے تو جسم شہد کی مٹھاس کا ذوق محسوس کرتا ہے، لیکن رُوح شہد کی مٹھاس کو شہد کے جسم سے محسوس نہیں کرتی بلکہ اُس نورِ عقل سے محسوس کرتی ہے جس کی وجہ سے اس مٹھاس کی حقیقت قائم ہے یہی حال دوسری ذائقہ دار اشیاء کے ذوق کا ہے (۲) ذوقِ رُوح میں اتصال ضروری ہے جیسے کہ لوگوں میں عام عادت ہے اور رُوح کی عام عادت یہ ہے کہ اس کے ذوق میں اتصال شرط نہیں۔[2] (۳) روح میں یہ فرق کسی خاص حصّہ کے ساتھ مخصوص نہیں بلکہ یہ ذوق تمام ظاہری اور باطنی جواہر میں سرایت کئے ہوتے ہے۔ بر خلاف جسم کے ذوق کے کیونکہ وہ عادتاً صرف زبان کے ساتھ مخصوص ہے (۴) ذوقِ رُوح تمام حواس میں پایا جاتا ہے اس سے ہماری مراد یہ ہے کہ یہ ذوق تمام حواس سے پیدا ہوتا ہے لہٰذا جب رُوح کوئی چکھنے کی چیز دیکھے گی مثلاً شہد تو رُوح کو اس نورِ عقل سے جو مٹھاس میں پایا جاتا ہے مٹھاس کا ذائقہ حاصل ہو جاتے گا۔ یہی حال ہر ذائقہ دار چیز اور تمام انوارِ علویہ کے دیکھنے سے ہو گا۔ اسی طرح الفاظ کے سننے سے بھی اسے ذوق حاصل ہو گا۔ چنانچہ جب رُوح شہد کا لفظ سنے گی تو اس نور کا ذوق حاصل کرے گی جو شہد میں ہے اور اسے مٹھاس کا ذائقہ حاصل ہو جائے گا اسی طرح جب یہ جنّت یا رضوان یا رحمت کا لفظ سنے گی تو یہ ذوق اسے حاصل ہو گا، لیکن جب

---

[1] انوار کا مزہ چکھنا [2] ملنا

[3] شہد کا ذائقہ جسم کو صرف اُسی صورت میں حاصل ہو گا جب شہد زبان کے ساتھ لگے گا لیکن روح کے لیے یہ ضروری نہیں۔ ۱۲

رُوح قرآن مجید کو سنے گی تو سب سے پہلے اسے کلام الٰہی کے نُور کا ذوق حاصل ہوگا پھر اس کے بعد اسے اور مزے آئیں گے جن کی کیفیت بیان نہیں کی جاسکتی۔

الغرض رُوح اپنے تمام جسم اور جواہر سے مزہ لیتی ہے جو اسے تمام حواس کے ذریعہ سے حاصل ہوتا ہے۔ واللہ اعلم۔

رُوح محمدّی صلّی اللہ علیہ وسلّم و دیگر اَرواح میں فرق

اَرواح اگرچہ مذکور بالا طریقہ پر ذوق میں مساوی ہیں لیکن وہ قوت اور ضُعف کے اعتبار سے متفاوت ہیں، سب سے قوی وہ رُوح ہے جس کا ذوق عرش، فرش اور دیگر عوالم کو چیر کر نکل جائے اور یہ طاقت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی روح کو ہی ہے کیونکہ آپ کی روح سلطان الارواح ہے اور یہ روح آپ کے جسم مبارک میں رضا، محبت اور قبول کی طرح ساکن ہو چکی ہے اور دونوں کے درمیان سے حجاب بھی اُٹھ چکا ہے، چنانچہ آپ کی رُوحِ مقدس کا ذوق آپ کے کمال کے مطابق ہے اور آپ کے طاہر تُرابی جسم کا عوالم کو چیر کر نکل جانا ثابت ہے اور یہی وہ کمال ہے جس سے بڑھکر کوئی کمال نہیں ہو سکتا۔

۲- طہارت

روح کا دوسرا جزو طہارت ہے طہارت سے مراد روح کی وہ صفائی ہے جس پر یہ پیدا کی گئی ہے اور اس کی دو قسمیں ہیں۔ حِسّی اور معنوی۔ حِسّی طہارت تو اس لیے ہے کہ روح ایک نور ہے اور نور انتہائی درجے کا صاف اور پاک ہوتا ہے اب رہی معنوی تو اس سے مراد معرفتِ باطنی اور معرفتِ ظاہری کا امتزاج[1] ہے اس کی تشریح یہ ہے کہ تمام مخلوقات خواہ وہ زبان دار ہو یا بے زبان، ذی حیات ہو یا جامد، اپنے خالق کو پہچانتی ہے اور کوئی ایسی مخلوق نہیں جس کے تمامی جواہر میں یہ معرفتِ باطنیہ نہ پائی جاتی ہو۔ جیسے خوفِ تام کے تحت ذکر کیا جا چکا ہے پھر جس پر اللہ کی عنایت ہو جاتی تو اس کے لیے باطن بھی ظاہر کی طرح ہو جاتا ہے چنانچہ وہ تمام جواہر کی معرفتِ الٰہیہ کو محسوس کرنے لگ جاتا ہے اور باطن کی طرح ظاہر کے تمام اجزا عارف بن جاتے ہیں اور یہی معرفت کا اعلیٰ درجہ ہے جو حق تعالیٰ نے تمام ارواح کو بخشا ہے اور وہ اپنی ذات کے ساتھ اپنے ظاہر میں اپنے رب کو جانتی نہیں، لیکن باوجود اس کے کہ یہ صفائی میں برابر ہوتی ہیں اپنی بڑائی اور چھٹائی کے تفاوت کے لحاظ سے مختلف ہوتی ہیں، کیونکہ بعض ارواح کا حجم چھوٹا ہوتا ہے بعض کا بڑا، اور اس میں کوئی شک نہیں کہ جس کا حجم بڑا ہوگا اس کے جواہر بھی زیادہ ہوں گے اسی وجہ سے اسے معرفت الٰہی بھی

---

[1] آپس میں مل جانا

زیادہ ہوگی۔

آنحضرتؐ کی رُوح سب سے بڑی رُوح ہے

تمام ارواح سے بڑی قدر والی اور حجم کے لحاظ سے عظیم ترین روح آنحضرت صلّی اللہ علیہ وسلّم کی رُوح ہے کیونکہ وہ تمام زمینوں اور آسمانوں کو پُر کئے ہوتے ہے، مگر بایں وُسعت آپؐ کی ذاتِ مقدسؐ نے اُسے اپنے اندر لے لیا ہے اور وہ اس کے تمام اسرار پر حاوی ہے۔ پاک ہے وہ خدا جس نے آپ کی ذات کو یہ قدرت عطا کی۔

مزید براں جب رُوح ذات میں برضا و محبّت قیام پذیر ہوا اور دونوں کے درمیان حجاب زائل ہو چکا ہو تو یہ روح اپنی حسّی اور معنوی صفائی سے فیض پہنچائے گی اور ذات میں حسّی صفائی حاصل ہوگی جس کی وجہ سے جسم کے خون کی صفائی پیدا ہوگی اور یہ صفائی چار باتوں سے ہوگی۔

خُون کی صفائی چار باتوں سے حاصل ہوتی ہے

۱۔ خون کو ہلکا کرنے اور اس کے ثقل[1] کو زائل کرنے سے کیونکہ جس قدر خون بھاری ہوگا اسی قدر اُس میں خباثت ہوگی اور خباثت کے ہوتے ہوتے شہوات کی کثرت ہوگی۔

۲۔ بُو کی صفائی۔ اس کی پہچان یہ ہے کہ اس کی بُو گندھے ہوتے آٹے کی سی ہو اور اگر خون خبیث ہوگا تو اس کی بُو سڑی ہوئی کیچڑ کی سی ہوگی۔

۳۔ رنگ کی صفائی۔ اس کی علامت یہ ہے کہ خون زردی مائل ہو کیونکہ خونِ فاسد کا رنگ سیاہی مائل ہوتا ہے اور جتنا زیادہ سیاہی مائل ہوگا اسی قدر فسادِ خون بھی زیادہ ہوگا۔

۴۔ مزہ کی صفائی۔ اس کی شناخت یہ ہے کہ خون میٹھا ہو۔ کیونکہ خونِ فاسد کا مزہ جلی ہوئی چیز کا سا ہوتا ہے۔

لہٰذا جب جوہر خون صاف ہوگا تو اُس سے تمام شیطانی حصّے نکل جائیں گے اور شہوات اور معصیت کی تحریکیاں منقطع ہو جائیں گی۔ اس کے بعد جسم کی رگیں اس صاف خون سے غذا حاصل کریں گی اور وہ بھی خون کی صفائی کے باعث صاف ہو جائیں گی اور ان سے بھی شہوات اور شیطانی علائق منقطع ہو جائیں گے۔ جب جسم کے اندر یہ حسّی صفائی حاصل ہو گئی تو پھر رُوح معنوی صفائی سے اس کی مدد کرے گی اور اسے تمام جواہر کے ساتھ معرفتِ الٰہی حاصل ہو جائے گی اور چونکہ ذاتِ محمدیؐ روحِ شریف پر محیط اور اس کے تمام اسرار کو حاصل کر چکی ہے اس لیے اسے حسّی اور معنوی دونوں قسم کی صفائی حاصل

[1] بھاری پن

ہو چکی ہے۔

۳۔ تمییز

تیسرا جزو تمییز ہے اور یہ رُوح میں ایک قسم کا نور ہوتا ہے جس کی مدد سے رُوح اشیاء کی حقیقت کو کامل طور پر پہچان لیتی ہے، لیکن اس پہچان کے لیے روح کسی تعلیم کی محتاج نہیں ہوتی بلکہ محض دیکھ کر یا سن کر ہی پہچان لیتی ہے کہ یہ کیا ہے۔ اس کے حالات کیا ہیں، اس کا مبدا اور منتہیٰ کیا ہے۔ اس کا انجام کیا ہوگا اور اسے کیوں پیدا کیا گیا ہے۔

پھر اپنی اطلاع کے مطابق روحیں اس پرکھنے میں مختلف ہوتی ہیں۔ چنانچہ بعض ارواح کی اطلاع قوی ہوتی ہے اور بعض کی ضعیف۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی روح کی اطلاع قوی ترین ہے،

رُوحِ محمدیؐ سے کوئی چیز محجُوب نہیں

کیونکہ دنیا کی کوئی شئے اس سے محجوب نہیں ہے۔ اسی لیے آپؐ کو عرش و فرش، عُلوّ و سفل، دنیا و آخرت اور دوزخ و جنت سب کی خبر ہے۔ اس لیے کہ یہ سب کچھ تو آپؐ ہی کی بدولت پیدا ہوا ہے۔ لہٰذا آپؐ کی تمییز ان تمام جہانوں کو چیر کر نکل جانے والی ہے۔ چنانچہ آپؐ کو اجرامِ سماویہ میں سے ہر جرم کا علم ہے کہ یہ کہاں سے پیدا کیا گیا ہے، کب اور کیوں پیدا کیا گیا اور اس کا منتہیٰ کیا ہوگا۔ آپؐ کو ہر آسمان کے فرشتوں کا پتہ ہے کہ کون فرشتہ کس فلک پر پیدا کیا گیا۔ کب پیدا کیا گیا۔ کیوں پیدا کیا گیا اور ان کا انجام کیا ہوگا اور آپؐ کو ان کے اختلافِ مراتب اور منتہیٰ درجات کا بھی علم ہے اور اسی طرح آپؐ کو ستّر حجابوں اور ہر حجاب کے فرشتوں کا بھی علم ہے اسی طرح آپؐ کو عالمِ علوی کے اجرامِ نیرّہ کا بھی علم ہے مثلاً ستارے، سورج، چاند، لوح، قلم، برزخ اور وہ روحیں جو برزخ میں ہیں، اسی طرح آپؐ کو ساتوں زمینوں، ہر زمین کی مخلوقات اور بر و بحر کی تمام اشیاء کا علم ہے، اسی طرح آپؐ کو جنت، اس کے درجات، اس کے رہنے والوں کی تعداد اور ان کے مقامات کی پوری واقفیت ہے۔ علیٰ ہذا القیاس دیگر عوالم کے متعلق بھی آپؐ کے علم کا یہی حال ہے۔

علمِ ازلی الٰہی اور علمِ نبویؐ میں کیا فرق ہے

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا علم اللہ تعالیٰ کے قدیم ازلی علم سے مزاحم نہیں ہوتا، کیونکہ علمِ خداوندی کی معلومات لاانتہا ہیں۔ اس لیے کہ اللہ تعالیٰ کا علم اس عالم میں نہیں سما سکتا، جس کی وجہ یہ ہے کہ اسرارِ ربوبیت اور اوصافِ الوہیت جن کی کوئی انتہا نہیں ہے ان سے اس عالم کو کوئی نسبت نہیں ہو سکتی۔

پھر جب رُوح کو ذات سے محبت ہوتی ہے تو وہ ذات کی اس تمییز کے ساتھ مدد کرتی ہے، اسی

واسطے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ مقدس اور تمام عوالم کو جانتی تھی جن کا ذکر ہو چکا۔ پاک ہے وہ خدا جس نے آپ کی ذات کو شرف بخشا، عزت بخشی اور اس تمیز پر قدرت دی۔

ٹ اس مسئلہ نے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا علم کس قدر تھا، مسلمانوں میں عجیب صورت اختیار کر رکھی ہے ایک فرقہ نے اس سے قطعاً انکار کر دیا کہ آنحضرتؐ کو قطعاً علم مغیبات نہ تھا۔ ان بزرگوں نے ان مغیبات کی طرف قطعاً توجہ نہیں کی جن کا ذکر قرآن میں آیا ہے، پھر احادیث صحیحہ میں بے شمار واقعات پائے جاتے ہیں جن میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے علم کا ثبوت ملتا ہے۔ مثلاً غزوۂ بدر کے خاتمہ پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے چچا حضرت عباسؓ کا یہ کہنا کہ میرے پاس کچھ نہیں ہے جس سے فدیہ ادا کر سکوں اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا اُن کے مال کا پتہ بتانا۔ پھر فتح مکہ کے موقعہ پر اس شخص کا پتہ بتانا جو کفارِ مکہ کو مسلمان فوج کی آمد کی خبر دینے جا رہا تھا۔ بہرحال ان دوستوں نے نہ اپنے سے انصاف کیا اور نہ آنحضرتؐ کی ذاتِ مقدس کے ساتھ، کیونکہ انہوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے مرتبے کو بہت ہی گھٹا دیا۔ ان بزرگوں کی خدمت میں مؤدبانہ گذارش ہے کہ کسی خاص شخصیت یا خاص فرقے کی عداوت کو ذہن سے خارج کر کے ٹھنڈے دل سے سوچیں کہ کیا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اسی تعظیم کے مستحق ہیں جس کا اظہار انہوں نے کیا ہے، راقم الحروف ان سے صرف اس قدر درخواست کرتا ہے کہ بے اعتدالی سے کام نہ لیں۔

ممکن ہے کہ یہ حضرات وہ واقعات پیش کریں جن میں آنحضرتؐ کو اصل واقعہ کی خبر نہ ہو سکی مثلاً رعل اور ذکوان کا واقعہ، غزوۂ تبوک کو روانگی وغیرہ۔

اس کا جواب یہ ہے کہ ذاتِ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو فیض باری سے یہ علم تو حاصل تھا، لیکن یہ اسی وقت حاضر ہوتا جس وقت آپ کو مشغولیت بحق سبحانہٗ نہ ہوتی، کیونکہ جس وقت آپ مشاہدۂ حق سبحانہٗ میں مشغول ہوتے اُس وقت آپ کو کسی اور چیز کی خبر نہ ہوتی تھی، یہی وجہ ہے کہ آپ نے فرمایا لِیْ مَعَ اللّٰہِ وَقْتٌ لَا یَسَعُہٗ نَبِیٌّ مُرْسَلٌ وَلَا مَلَکٌ مُقَرَّبٌ (جب مجھے مشاہدۂ حق حاصل ہوتا ہے، اس مشاہدہ کو نہ کوئی نبی مرسل اور نہ مقرب فرشتہ برداشت کرنے کی طاقت رکھتا ہے) اور یہ حالت آپ کی بیشتر اوقات رہتی تھی، پھر یہ کہ اللہ تعالیٰ بعض اوقات کسی مصلحت کی بنا پر درمیان سے حجاب کو زائل نہ کرتا جس کی وجہ سے اس امر کا خفا رہتا۔ یہاں پر بحث کرنا مقصد نہیں ہے محض اشارہ کرنا ہی مقصود ہے۔

ایک دوسرا گروہ ہے جس نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے علم کے بارے میں اس قدر غلو کیا کہ آپ کو ہر ذرہ ہر حالت اور ہر جزئی کا عالم بتایا، نہ صرف یہ بلکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو ہر جگہ حاضر بھی جانا، ان بزرگوں

(بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر)

۴۔ بصیرت چوتھا جزو بصیرت ہے۔ اس سے مراد تمام اجزاء روح میں فہم کا اس طرح سرایت کرنا ہے جس طرح تمام حواس یعنی بصارت وسماعت وقوتِ شامہ وذوق اور لمس اجزاءِ روح میں سرایت کئے ہوئے ہیں۔ چنانچہ علم تمام اجزاء میں قائم ہے اور بصر بھی تمام اجزاء میں موجود ہے یہی حال شم[۱]، ذوق اور لمس[۲] کا ہے یہاں تک کہ روح کا کوئی ایسا جزو نہیں جس میں علم و سمع و بصر و شم و ذوق و لمس موجود نہ ہوں۔ چنانچہ روح ہر جہت سے دیکھتی ہے اور یہی حال باقی حواس کا ہے، لہٰذا جب روح ذات سے محبت رکھتی ہے اور ان دونوں کے درمیان سے حجاب اُٹھ جاتے تو وہ اسے اس بصیرت سے مدد دیتی ہے جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ذات کے سامنے اور پیچھے، اوپر اور نیچے دائیں اور بائیں اپنے تمام اجزاء کے ذریعہ سے دیکھتی ہے اور اسی طرح سنتی ہے اور سونگھتی ہے وغیرہ الغرض جو شان روح کی ہوتی ہے وہی جسم کی ہو جاتی ہے چنانچہ جب بچپن میں ملائکہ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا سینہ مبارک چاک کیا تو اُس وقت سے آپؐ کی ذاتِ طاہر اور روحِ شریف کے درمیان حجاب اُٹھ گیا تھا اور اُسی وقت سے آپؐ کی رُوح اور ذات کے درمیان اتحاد اور خلا ملا ہو گیا تھا اور آپؐ کی ذات ان اُمور پر مُطلع ہو گئی تھی جن پر آپؐ کی رُوح مُطلع تھی۔ یہی وجہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اپنے پیچھے سے اسی طرح دیکھ سکتے تھے جس طرح سامنے سے۔ چنانچہ آپ نے صحابہ سے فرمایا: اَتِمُّوا رُكُوْعَكُمْ وَسُجُوْدَكُمْ فَاِنِّیْ اَرَاكُمْ مِنْ خَلْفِیْ كَمَا اَرَاكُمْ عَنْ اَمَامِیْ[۳]۔ (اپنے رکوع اور سجود کو ٹھیک ادا کیا کرو کیونکہ

(بقیہ حاشیہ صفحہ سابقہ)

نے بھی زیادتی کی۔ انہوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے فرمان لَا تُطْرُوْنِیْ كَمَا اَطْرَتِ النَّصَارٰی عِیْسَی ابْنَ مَرْیَمَ کو بھلا دیا۔ ان احباب کی خدمت میں بھی گذارش ہے کو یہ بھی اعتدال پسندی کو نہ چھوڑیں کسی کی مخالفت کی بنا پر حق بات سے گریز نہیں کرنا چاہیئے۔

آخر میں ایک ضروری بات عرض کردوں کہ جو کچھ حضرت عبدالعزیز دباغ رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا ہے، یہ ایک صاحب کشف اور قطب عالم اور غوثِ زماں کا ذاتی مشاہدہ ہے جو بیان کیا گیا۔ اہلِ باطن اور اولیاء اللہ کو ہی حقیقتِ محمدیہ کا علم ہے، دوسرے لوگ اس حقیقت کو دریافت نہیں کر سکتے، اس لیے اہلِ ظاہر اور عوام کے لیے صرف یہ عقیدہ رکھنا کافی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اللہ تعالیٰ نے جتنا چاہا علم دیا ہمیں نہ اس کا علم ہے نہ اس کا اندازہ کر سکتے ہیں اسی واسطے شیخ سعدی نے فرمایا ہے: ع

تو در علمش چہ دانی باش تا فردا علم گردد

حاشیہ صفحہ ہٰذا۔ [۱] سونگھنا [۲] چھونا [۳] مشکوٰۃ باب ... صفحہ ۱۱

میں تم کو اپنے پیچھے سے ایسا ہی دیکھتا ہوں جیسا سامنے سے) واللہ تعالیٰ اعلم۔

۵۔ عدمِ غفلت

پانچواں جزو عدمِ غفلت ہے یعنی جس قدر کہ روح کا مبلغ علم ہے اور جہاں تک روح کی نظر پہنچتی ہے اس سے علم کی ضد اور جہل کی تمام کیفیات ایسی منتفی[۱] ہوں کہ اس معلوم مقدار میں نہ سہو پیش آتے نہ غفلت نہ نسیان[۲]۔ اور روح کے لیے حصولِ معلومات تدریجی[۳] نہیں ہے بلکہ یہ اسے ایک ہی نظر میں حاصل ہو جاتا ہے اور نہ اس کا علم ایسا ہوتا ہے کہ اگر ایک چیز کی طرف متوجہ ہو تو دوسری سے غافل ہو جائے بلکہ یوں ہوتا ہے کہ جب ایک چیز کی طرف متوجہ ہو تو دوسری چیز بھی اس کے ساتھ حاصل ہو جاتی ہے کیونکہ روح میں علوم فطری ہوتے ہیں اور اس کی ابتداء فطرت میں ہی دفعتہً اسے علوم حاصل ہو چکے ہوتے ہیں۔ پھر یہ علوم اس کے لیے قائم رہتے ہیں جیسے اس کی ذات قائم ہے عدمِ غفلت سے یہی مراد ہے اور یہ وصف ہر روح میں موجود ہوتا ہے۔ صرف مقدار علم میں فرق ہوتا ہے۔ بعض کے علوم قلیل ہوتے ہیں بعض کے کثیر اور سب سے زیادہ علم والی اور سب سے قوی نظر والی روح آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی روح ہے کیونکہ یہ سلطان الارواح ہے اور جیسے کہ ذکر ہو چکا ہے، یہ ایک ہی دفعہ بغیر ترتیب اور بغیر تدریج کے تمامی عوالم کی موجودات پر مطلع ہے پھر جب آپ کی ذاتِ شریف اور رُوح میں خلاملاً پیدا ہو گیا تو روح نے عدمِ غفلت کے ساتھ ذات کی مدد کی، یہاں تک کہ ذات بھی عالم کی تمام اشیاء پر مطلع ہو گئی اور اسے اس علم میں غفلت لاحق نہ ہو گی، لیکن ذات کا علم روح کا سا نہیں ہوتا کیونکہ روح کی اطلاع بغیر ترتیب کے دفعتہً ہوتی ہے اور ذات کی اطلاع بتدریج و بترتیب ہوتی ہے اس طرح کہ جس چیز کی طرف متوجہ ہو گی اسے معلوم کرے گی مگر توجہ کے بغیر یہ علم حاصل نہیں ہوتا۔ اس کے بعد جب ذات کسی اور چیز کی طرف متوجہ ہو گی تو اسے بھی معلوم کرے گی۔ علیٰ ہذا القیاس۔ اور چیزوں کی طرف توجہ دے گی یہاں تک کہ تمام اشیاء عالم کا علم حاصل کرے گی اور اسے موجوداتِ عالم پر تسلط ہو جائے گا مگر یہ توجہ کا محتاج ہو گا، لیکن دفعتہً حصول کی جو طاقت روح میں پائی جاتی ہے وہ ذات میں نہیں۔ عدم غفلت کے لحاظ سے بھی دونوں میں یہی فرق ہے کہ توجہ کے وقت ذات میں بھول چوک نہ ہو گی نہ یہ کہ توجہ ہٹ جانے پر بھی سہو و نسیان لاحق نہ ہو، اسی واسطے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے جیسا کہ صحیح بخاری میں ہے اِنَّمَا اَنَا بَشَرٌ اَنْسٰی کَمَا تَنْسَوْنَ فَاِذَا نَسِیْتُ فَذَکِّرُوْنِیْ (مشکوٰۃ طبع مجتبائی دہلی صـ۹۲ باب السہو) (میں ایک انسان ہوں۔ تمہاری طرح میں بھی بھول جاتا ہوں۔ لہٰذا جب بھول جاؤں تو یاد دلا دیا کرو) آپ نے یہ الفاظ اس وقت فرمائے

[۱] نابود ہونے والی [۲] بھولنا [۳] رفتہ رفتہ

جب آپ سے سہو ہوا اور صحابہ نے آپ کو آگاہ نہ کیا۔

(مؤلفِ کتاب کہتا ہے) خدا حضرت عبدالعزیز دبّاغ کا بھلا کرے آپ نے طریقت اور حقیقت دونوں کا حق ادا کر دیا۔

حدیث اِنِّیْ لَا اَنْسٰی وَلٰکِنِّیْ اُنَسّٰی لِاَسُنَّ

رہی وہ حدیث جس میں حضرت کا یہ ارشاد مروی ہے اِنِّیْ لَا اَنْسٰی وَلٰکِنِّیْ اُنَسّٰی لِاُسُنَّ (میں بھولتا نہیں ہوں بلکہ مجھ پر بھول ڈالی جاتی ہے تاکہ بھول کے لیے بھی ایک طریقہ قرار دے دیا جائے[1]) سو حفاظِ حدیث مثلاً امام عبدالبر[2] نے تمہید میں حافظ ابن حجرؒ نے فتح میں اور جلال الدین سیوطیؒ نے مؤطا کے حاشیہ میں لکھا ہے کہ یہ ایک ایسی حدیث ہے جس کی سند کسی حدیث کی کتاب میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم تک متصل نہیں ہے۔ ابن حجر کہتے ہیں کہ اس کے ردّ میں آپ کا یہی ارشاد کافی ہے اِنَّمَا اَنَا بَشَرٌ اَنْسٰی کَمَا تَنْسَوْنَ کیونکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی طرف صرف بشریت کو منسوب کرنے پر اکتفا نہیں کیا بلکہ اپنے نسیان کو صحابہ کے نسیان سے تشبیہہ دی ہے۔ باقی بحث فتح الباری میں دیکھیں۔ واللہ اعلم۔

۶۔ قوتِ سَریان

چھٹا جزو قوتِ سَریان[3] ہے اور یہ اس طرح کہ حق تعالیٰ نے رُوح کو طاقت دی ہے کہ وہ اجرام کو پھاڑ کر ان میں داخل ہو جائے چنانچہ یہ پہاڑوں، پتھروں،

---

[1] مؤطا امام مالک (۱: ۹۲ مطبع مصطفی البابی) پر یہ حدیث اس طرح دی ہے عَنْ مَالِکٍؒ اِنَّہٗ بَلَغَہٗ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَاٰلِہٖ وَسَلَّمَ قَالَ اِنِّیْ لَاَ اَنْسٰی اَوْ اُنَسّٰی لِاَسُنَّ اس کی شرح میں جلال الدین سیوطیؒ لکھتے ہیں کہ ابن عبدالبرؒ کا قول ہے کہ مجھے معلوم نہیں کہ یہ حدیث اس سند کے علاوہ کسی اور سند سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے مسند یا مقطوع طور پر بھی روایت کی گئی ہو اور یہ حدیث مؤطا کی ان چار حدیثوں میں سے ہے جو حدیث کی دوسری کتابوں میں نہ مسنداً اور نہ مرسل طور پر پائی جاتی ہیں مگر اصولی طور پر اس حدیث کے معنی درست ہیں، اگر سیوطیؒ نے مؤطا کی شرح کے مقدمہ (چوتھے فائدہ) میں یہ حدیث اسی طرح دی ہے جس طرح کتاب میں ہے۔

[2] عبدالبرؒ: یوسف بن عبدالبرؒ علماء اندلس کے شیخ اور اپنے زمانہ میں وہاں کے بہت بڑے محدث تھے، کتاب الاستذکار بمذاہب علماء الامصار فیما تضمنہ المؤطا من معانی الآثار تصنیف کی جس میں مؤطا کے طرز و ابواب کے موافق اس کی شرح کی اور فقہ میں کتاب الوافی وغیرہ لکھی۔ انہوں نے ۳۸۰ھ ۹۹۰ء میں وفات پائی ان کی کتاب تمہید کا جس کا یہاں ذکر کیا گیا ہے پورا نام تمہید لما فی المؤطا من المعانی والاسانید ہے۔

[3] ایک چیز کا دوسری میں مل جانا۔

چٹانوں اور دیواروں کو پھاڑ کر ان میں گھس جاتی ہے اور ان کے اندر جہاں چاہتی ہے چلتی پھرتی ہے اور رُوح کسی ذات میں سکونت پذیر ہو جاتے اور اس سے محبّت کرنے لگے اور اسے اپنا ساتھی بنا لے تو رُوح اس قوت سے ذات کی مدد کرتی ہے اور ذات وہی کام کرنے لگ جاتی ہے جو روح کرتی ہے۔

یحییٰ علیہ السّلام کا قصہ

یحییٰ علیہ السلام کا قصہ بھی اسی قبیل سے ہے کہ آپ کی قوم نے آپ کو گرفتار کرنا چاہا تو آپ ان سے بھاگ کر ایک درخت کے اندر گھس گئے کیونکہ آپ کی رُوح نے بدن کو باہمی محبت کے سبب اجرام میں سرایت کرنے کی طاقت دی تھی اسی واسطے آپکا جسم جرم درخت کو پھاڑ کر اُس کے اندر گھس گیا۔

اولیاء اللہ میں بھی یہ قوت پائی جاتی ہے

اسی قبیل سے ہیں اولیاء اللہ کے واقعات کہ وہ کسی جگہ بغیر دروازہ کھولے داخل ہوگئے اور مکان کے اندر پائے گئے۔

اور اسی قبیل سے ہیں اولیاء اللہ کے واقعات کہ ایک قدم اٹھایا اور ایک پاؤں مشرق میں رکھا اور دوسرا مغرب میں، کیونکہ جسم تو ایک لحظہ میں اس ہوا کو پھاڑ کر نکل جانے کی طاقت نہیں رکھتا جو مشرق و مغرب کے درمیان ہے اس لیے کہ ہوا اس کے جوڑوں کو توڑ ڈالے گی اور اس کے اعضاء کو ریزہ ریزہ کر دے گی اور اس کے خون اور رطوبتوں کو خشک کر دے گی، لیکن رُوح نے قوتِ سریان سے جسم کی مدد کر کے اسے اس فعل کے کرنے کے قابل بنا دیا۔

واقعۂ معراج

معراج کا واقعہ بھی اسی قبیل سے ہے کیونکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم تھوڑی سی مدت کے اندر جہاں پہنچے، پہنچے اور پھر واپس بھی آگئے اور یہ سب کچھ رُوح کا کام تھا کہ اس نے اپنی سرایت کرنے والی قوت سے جسم کی مدد کی، واللہ اعلم۔

۷۔ مؤلمات اجرام کا عدم احساس

ساتواں جزو اجسام کو دکھ دینے والی اشیاء کا احساس نہ کرنا مثلاً بھوک، پیاس، گرمی اور سردی وغیرہ کیونکہ رُوح تو ان میں سے کسی چیز کو محسوس نہیں کرتی چنانچہ اس کے نزدیک بھوک، پیاس، گرمی، سردی کوئی چیز نہیں۔ اسی طرح جب رُوح کسی تیز چیز میں نفوذ کرتی ہے تو اسے کوئی تکلیف نہیں پہنچتی، اسی طرح جب روح گندگی کی جگہ سے گزرتی ہے تو اسے اس سے کوئی تکلیف نہیں محسوس ہوتی، برخلاف فرشتوں کے کہ اس آخری امر میں (یعنی تعفن سے) انہیں تکلیف پہنچتی ہے کیونکہ ان کا میلان خوشبو کی طرف ہوتا ہے اور بدبُو سے انہیں نفرت ہوتی ہے اگر رُوح میں عدم احساس کی قوت نہ پائی جاتی تو جس جسم میں یہ موجود ہوتی ہے اس میں ایک لمحہ بھی قرار نہ پا سکتی۔ واللہ تعالیٰ اعلم

یہ سات امور ہیں جن کا ہونا ہر روح میں ضروری ہے اسی واسطے ہم نے کہا ہے کہ قریب قریب یہی روح کے اجزا ہیں، ماسبق کی طرح ان میں رُوحوں کے حالات مختلف ہوتے ہیں اور یہ بھی بیان کیا جا چکا ہے کہ اعلیٰ ترین روح، رُوحِ محمدی صلی اللہ علیہ وسلم ہے اور یہ بھی بیان ہو چکا کہ ان اوصاف میں جو اوصاف آپؐ کی روح میں پائے جائیں وہی آپؐ کی ذات میں بھی پائے جائیں گے۔ پھر ان ساتوں کو اٹھائیس کیساتھ ملایا جائے گا، اٹھائیس سے مراد آدمیت، قبض، بسط اور نبوت کے اٹھائیس انوار ہیں کہ پہلا نور یعنی ذوق الانوار جو آپ کی ذات شریف میں ہے، اس میں تمام سابقہ انوار شامل ہو جائیں گے اور وہ انتیس انوار کا مرکب ہوگا، پھر اسی طرح تیسرا چوتھا حتیٰ کہ ساتواں نُور پینتیس انوار سے مرکب ہوگا۔

۶۔ علم

علم سے ہماری مراد علم کامل ہے جو پاکیزگی اور طہارت میں انتہائی درجے کو پہنچا ہوا ور اس میں مندرجہ ذیل سات خصلتیں جمع ہوں۔ یاد رکھو کہ علم نورِ عقل ہے اور عقل نورِ روح ہے اور رُوح نُورِ ذات ہے یہ مذکور ہو چکا کہ وہ ذاتِ طاہر جس کے اور رُوح کے درمیان سے حجاب زائل ہو چکا ہو اُن تمام اوصاف سے موصوف ہوتی ہے جو نورِ عقل کے لیے ثابت ہو چکے ہوتے ہیں اور نورِ عقل علم ہی ہے لہٰذا رُوح ان ساتوں انوار سے متصف ہوتی ہے جو علم میں پائے جاتے ہیں۔

۱۔ معلومات کا بار اُٹھانا علم کا پہلا جزو معلومات کا بار اٹھانا ہے۔ یہ علم کے اندر ایک نور ہے جس کا مقتضیٰ یہ ہے کہ معلومات اس درجہ حاصل کی ہوں کہ آنکھ کو اپنی دیکھی ہوئی اور کان کو اپنی سنی ہوئی، اسی طرح باقی حواس کی ادراک کی ہوئی چیزوں کا جتنا حصول ہوتا ہے، ان سب پر فوقیت لے جاتے لہٰذا نورِ علم میں اشیاء کا حصول بمنزلہ ذات کے ہوتا ہے اور بصر میں اشیاء کا حصول بمنزلہ ظل اور خیال کے ہوتا ہے، بالفاظ دیگر پہلے حصول کے مقابلے میں دوسرا حصول بمنزلہ خیال کے ہوتا چنانچہ نورِ علم میں ادراک حقیقی ہوتا ہے اور بصر میں خیالی، لیکن لوگوں میں اس کے برعکس مشہور ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ لوگوں میں نورِ علم بہت کم بلکہ محض بال برابر یا اس سے بھی کم ہوتا ہے اور جب علم ان میں کم ہو گیا تو انہوں نے حواس پر اعتماد کرنا شروع کر دیا، لیکن جسے اللہ تعالیٰ نے علم کامل عطا کیا ہو تو بصر اور باقی حواس اس علم کے مقابلے میں جو اسے حاصل ہے اس کے نزدیک محض ایک خیال ہوگا پھر اس حالت کو واضح کرنے کے لیے شیخ نے ایک مثال بیان کی اور فرمایا:

اگر ہم فرض کریں کہ ایک شخص نے ایک گھر بنایا اور اُس کی تعمیر میں ہر چھوٹا اور بڑا کام اس نے خود اپنے ہاتھوں سے کیا کہ مٹی خود لایا اور اُسے پکا کر اینٹیں بنائیں اور پتھر لایا اور انہیں پکا کر چونا بنایا، پھر خود ہی لکڑی لایا، خود ہی اسے چیرا عمارت تیار کر لی اور اسے چونے کا پلستر کیا۔ ان تمام امور میں کسی نے اس کی مدد نہ کی، بلکہ اول سے آخر تک تمام کاموں کو اس نے خود ہی کیا ہو اور جو کچھ بھی اس نے کیا ہو، وہ ارادے، نیت اور سوچ و بچار سے کیا ہو حتیٰ کہ ہر چیز ایسی ہو گئی ہو گویا اس کی طبعی اور فطری چیز ہے اور یہ تمام چیزیں اس کے ذہن میں موجود ہوں اور کبھی غائب نہ ہوتی ہوں، اب اگر وہ اس گھر سے کچھ مدت تک غائب رہے اور پھر واپس آئے اور اس گھر کو دیکھے اور اس کے ساتھ ایک اور شخص بھی اسی گھر کو دیکھے تو ہر چند دونوں اس گھر کو دیکھنے میں تو برابر ہوں گے، لیکن بنانے والے کا دیکھنا دوسرے آدمی کے دیکھنے سے بہت بڑھا ہوا ہوگا کیونکہ اس کے تمام اجزاء اور اجزاء کے اجزاء اور کام کی تفصیل اور تفصیل کی تفصیل ایسی چیزیں ہیں جنہیں صانع نے خود اپنے ہاتھ سے کیا ہے چنانچہ وہ گھر کو ظاہر اور باطن اور بیرون اور اندرون سے اس طرح جانتا ہے جس کا دوسرے کو علم نہیں۔ یہی حال علمِ کامل کا ہے کہ وہ شئے کے ظاہر و باطن، اجزاء اور اجزاء کے اجزاء اور تفصیل اور تفصیل کی تفصیل پر محیط ہوتا ہے اور بصر کا تعلق محض گھر کی سطح سے ہوتا ہے، عام نہیں ہوتا چہ جائیکہ وہ چیر کر باطن تک پہنچ سکے یہ مثال تقریبی ہے، تحقیقی نہیں ہے کیونکہ علم کامل کا تو صرف انہی لوگوں کا علم ہوتا ہے جن پر اللہ کی عنایت ہو اور اس کی حقیقت تک پہنچنے کے لیے مثالوں سے ہی کام لیا جاتا ہے۔

میں نے عرض کیا کہ علم اشیاء کا کیسے ادراک کرتا ہے؟ فرمایا: اگر ہم فرض کریں کہ علم بمنزلہ ایک اونس صاف سفید پانی کے ہے جو اپنی اصلی حالت پر قائم ہو۔ پھر ہم ایک اونس اور پانی فرض کریں جو کئی ایک مختلف قسم کے قطرات سے مرکب ہو مثلاً ایک قطرہ نمکین ہو، ایک قطرہ میٹھا، ایک کڑوا، ایک ترش، ایک ٹھنڈا، ایک گرم وغیرہ وغیرہ، پھر ہم اس ایک اونس مرکب پانی کو صاف پانی میں ڈال دیں تو یہ دونوں آپس میں مخلوط ہو کر ایک ہی پانی بن جائیں گے، پہلا اونس پانی بمنزلہ علم کے ہے اور دوسرا اونس اپنے اختلاف کی وجہ سے بمنزلہ معلومات کے ہے، میں نے عرض کیا کہ کیا یہ قطرے مل جل کر ایک ہی ہو جاتے ہیں یا ہر قطرہ علیحدہ متمیز رہتا ہے؟ فرمایا یہ مخلوط ہوتے ہیں، پھر آپ نے ہتھیلی بھر پانی لیا اور فرمایا یہ علم ہے پھر ایک اور قطرہ لیا اور اسی پانی میں ملا دیا اور فرمایا کیا یہ اس سے مل جل نہیں گیا، میں نے عرض کیا ہاں۔ فرمایا یہ گویا منجملہ معلومات کے ایک معلوم ہے، پھر

ایک اور قطرہ لیا اور اسی پانی میں ملا دیا اور فرمایا کیا یہ بھی اس سے مل جل نہیں گیا؟ میں نے عرض کیا ہاں۔ فرمایا یہ گویا دوسرا معلوم ہے پھر تیسرا قطرہ لیا اور اس پانی میں ملا دیا اور کہا بس علم اور معلومات کے حاصل ہونے کی یہی کیفیت ہے۔ کیونکہ نورِ علم پہلے قطرے میں علوم سے خالی ہوتا ہے، پھر معلومات کے آنے سے تدریجاً بڑھتا ہے، معلومات حاصل ہوتے رہتے ہیں اور نورِ علم بڑھتا رہتا ہے اسی لیے نورِ علم کی کوئی انتہا نہیں ہے جس طرح معلومات کی کوئی انتہا نہیں ہے۔ علم معلومات کے لیے بمنزلہ غلاف کے ہے۔ اگر غلاف کے اندر تھوڑی چیز ہوگی تو غلاف کا جسم چھوٹا ہوگا، اگر کثیر ہوں گی تو غلاف بڑا ہو جائے گا۔ عجیب بات یہ ہے کہ ابتدا میں یہ غلاف بہت ہی چھوٹا ہوتا ہے اس قدر کہ اس میں ایک ہی معلوم سما سکتا ہے اگر اس میں ایک اور معلوم کا اضافہ ہو تو غلاف بڑا ہو جاتا ہے اور اسی طرح بڑھتے بڑھتے بے حد بڑھ جاتا ہے، واللہ اعلم

۲۔ ضائع نہ کرنا

دوسرا جزو۔ عدم تضییع (ضائع نہ کرنا) ہے اور وہ ایک نور ہے جس کا مقتضیٰ یہ ہے کہ اس کے معلومات صرف مستحق کو پہنچیں۔ لہٰذا اُسے نا اہل لوگوں تک پہنچنے سے محفوظ رکھتا ہے چنانچہ یہ نور براہِ راست نا اہل تک نہیں پہنچتا اور اگر بالفرض نا اہل تک یہ نور پہنچ بھی جائے تو یہ اسے واپس لے آتا ہے۔ اسے چوس لیتا ہے اور اپنی اصل تک پہنچا دیتا ہے اور نا اہل کے پاس قائم رہنے سے بچاتا ہے۔

یہی حال آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا تھا کہ آپ جب کلام فرماتے تو انوارِ علوم نکلتے اور اسے نیک و بد اور مومن و منافق ہر قسم کے لوگ سنتے اور جو بد اور منافق لوگ ہوتے تو یہ نور ان کے پاس قرار نہ پاتا اور نہ اُن کے دل پر اس کا اثر ہوتا کیونکہ نور مذکور اُن انوار کو اپنی پاکیزہ اصل اور روشن محل کی طرف واپس لے آتا، یعنی ذاتِ محمدی کی طرف، لیکن جو اہلِ محبت اور اہلِ ایمان ہوتے، وہ حکمت کے اہل اور نیکیاں قبول کرنے کے قابل ہوتے جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے وَكَانُوٓا اَحَقَّ بِهَا وَاَهْلَهَا تو اُن کی طہارت کی وجہ سے انوار اُن کے پاس پہنچ کر قائم و برقرار رہتے۔

غرض علم کی دو قسمیں ہیں، پاک جس کے نور میں سفیدی ہو اور دوسرا ناپاک جس میں نیلا پن ہو۔ فرض کرو چار آدمی ہیں ایک کا علم طاہر اور کامل ہے۔ دوسرے کا علم طاہر اور قلیل ہے، تیسرے کا علم غیر طاہر مگر کامل ہے اور چوتھے کا علم غیر طاہر اور قلیل ہے پھر فرض کریں کہ وہ ایک جگہ اکٹھے ہو کر باتیں کرنے لگیں تو طاہر ناقص علم والا طاہر کامل علم والے سے استفادہ کرے گا اور تیسرے سے کچھ بھی استفادہ نہ کر سکے گا۔ اس لیے کہ وہ دونوں ہمجنس نہیں ہیں اور ناپاک ناقص علم والا مستفید ہوگا

ناپاک کامل والے سے اور پاک علم کا کچھ اثر نہ لے گا کیونکہ ان میں مجانست نہیں ہے۔ علم مطلق کا خاصہ عدم تضییع ہے (ضائع نہ جانا) اس لیے طاہر غیر طاہر پر داخل نہ ہوگا اور اس کے پاس نہ ٹھہر سکے گا۔ اسی طرح غیر طاہر طاہر کے ساتھ نہیں ملے گا اور نہ اس کے پاس ٹھہر سکے گا۔ طاہر طاہر کے پاس جائے گا اور خبیث خبیث کے پاس۔

۳۔ زبانوں اور حیوانات اور جمادات کی آوازوں کی معرفت

تیسرا جزو معرفتِ لغات و اصوات ہے اس کی تشریح اس طرح ہے کہ جب علمِ کامل میں اشیاء کا حصول ہوتا ہے تو یہ علم مع ان کے حقائق، ذاتیات، لوازمات اور عوارض کے ہوتا ہے اور اصوات (آوازیں) امورِ عرضیہ سے پیدا ہوتی ہیں اور یہ ناممکن ہے کہ عرضیات کا علم تو حاصل ہو جائے اور ان اشیاء کا علم نہ ہو جو ان سے پیدا ہوتی ہیں۔

پھر جن معلومات کے حقائق علم میں حاصل ہو چکے ہیں اُن کی دو قسمیں ہیں۔ حیوان اور جماد۔ جماد کی بھی آواز ہوتی ہے۔ مثلاً پانی کی سرسراہٹ اور دروازے کی کھڑاہٹ اور ایک پتھر کی دوسرے پر گرنے کی آواز وغیرہ وغیرہ اور علم والا انسان آوازوں کو سن کر مطلب سمجھ جاتا ہے۔

پھر حیوان کی بھی دو قسمیں ہیں، ناطق اور غیر ناطق۔ حیوانِ ناطق یعنی انسان کی کوئی نہ کوئی زبان ہوتی ہے جسے عام لوگ جانتے ہوتے ہیں اور حیوان غیر ناطق جس کی قسمیں پرندے حیوانات وغیرہ ہیں اوران تمام کی الگ الگ بولیاں مشہور ہیں اور کامل علم والا انسان ان سب کو جانتا ہوتا ہے۔

(مؤلفِ کتاب کہتا ہے کہ) میں نے اس کے متعلق حضرت سے بہت سی حکایتیں سنی ہیں جن میں سے بعض کا ذکر دورانِ کتاب ہوگا۔ انشاء اللہ تعالیٰ۔

حضرت نے فرمایا کہ صامت جس کی آواز نہیں ہوتی مثلاً دیوار، گھر، جنگل، چٹیل میدان، پہاڑ درخت وغیرہ ان کی آواز کو اللہ کے سوا کوئی نہیں جانتا اور یہ آواز اُن کے اور ان کے حقائق کے درمیان باطنی ہے مگر بعض اوقات ان کی آواز کو بھی اللہ تعالیٰ نبی کے معجزے کی صورت میں یا ولی کی کرامت کی صورت میں ظاہر کر دیتا ہے۔

۴۔ انجام سے واقفیت

چوتھا جزو معرفتِ انجام ہے، اجزاء روح میں تمیز کی بحث میں مذکور ہو چکا ہے کہ یہ ایک نور ہے کہ جس کے ذریعہ سے اشیاء کی حقیقتِ نفس الامری مکمل طور پر متمیز ہو جاتی ہے لہٰذا اس نور سے ایک دوسرے سے اشیاء کا امتیاز ہوتا ہے اور یہ انہیں درجہ بدرجہ لے آتا ہے یہاں تک کہ یہ انجام تک پہنچ جاتی ہیں اور جب انجام

کو پہنچ گیئں تو تمییز کا کام ختم ہو گیا اور اس علم یعنی معرفتِ عواقب کا کام شروع ہو جاتا ہے اس طرح کہ یہ ہر شئی کا حقیقی انجام تفصیل وار نظر کے سامنے لے آتا ہے۔

پھر انجام کی دو قسمیں ہیں: (۱) دارُالآخرت میں فنا جیسا کہ جمادات وغیرہ کا حال ہے جنہیں آخرت میں کوئی زندگی نصیب نہ ہوگی (۲) یا بقار جیسا کو مکلفین[1] (انسان وجنات) وغیرہ کے لیے ہے۔ جس کا انجام فنا ہو، تو یہ جزء دیکھ لیتا ہے کہ اس کی فنار کب اور کس طرح ہوگی اور یہ شئی کس طرح فنا تک بتدریج پہنچے گی۔ اس کے اجزار کس طرح کم ہوتے ہوتے بالآخر معدوم ہو جائیں گے، یہاں تک کہ آخر کار یہ عدم محض بن جائیں گے۔ اس کی فنار کس جگہ ہوگی اس فنا کے اسباب و مقتضیات کیا ہوں گے، حتیٰ کہ اس کا فنا ہونا بالکل امرِ ظاہر اور معقول بن جائے گا کہ نہ اس میں کوئی بُعد اور نہ خرقِ عادت ہوگا اس کے اندر کئی ایک علم شامل ہیں۔

لیکن جس کا انجام بقا ہے تو نورِ تمییز اسے درجہ بدرجہ لے جاکر جنت یا دوزخ تک پہنچا دیتا ہے پھر یہ جزو آتا ہے اور اس کی جزاء میں غور کرتا ہے اور ہر شخص کی جزاء کے مطابق جنت میں ہے تو جنت کی اور دوزخ میں ہے تو دوزخ کی جزا میں بالتفصیل غور کرتا ہے اس کی شرح بڑی لمبی ہے اور ممکن ہے کہ حضرت سے سنے ہوئے کچھ واقعات اثنار کتاب میں ذکر کردیں۔ بِحَوْلِ اللّٰہِ وَقُوَّتِہٖ۔

۵۔ اُن علوم کی معرفت جن کا تعلّق انسانوں اور جنوّں سے ہے

پانچواں جزو اُن علوم کی معرفت ہے جن کا تعلق جنّ و انس سے ہے اور یہ بہت سے علوم ہیں، خاص انسانوں سے تعلق رکھنے والے علوم کی تعداد تین سو چھیاسٹھ ہے اور جنوّں سے متعلق علوم کی تعداد ان سے تین کم یعنی تین سو تریسٹھ ہے انہی میں وہ علوم بھی شامل ہیں جن سے اُن اسباب کی معرفت حاصل کی جاتی ہے جن پر اُن کی زندگی ظاہری اور باطنی کا بقار موقوف ہے ظاہری معاش وہ ہے جس پر اُن کی ذات کا انحصار ہے اور جس سے ان کی زندگی قائم رہتی ہے لہٰذا اس میں کسب کے اسباب مثلاً کھیتی کرنا، ہل چلانا، بڑھئی کا کام وغیرہ یا دستکاری سب شامل ہیں اس لیے ان تمام کا جاننا اور اُن اسباب کا جاننا ضروری ہے جس سے فائدہ ہوتا ہو یا نقصان۔ اسی میں علمِ ادب بھی شامل ہے جسے آج کل لوگ علم سیاست کہتے ہیں کیونکہ اسبابِ معاشرت کا جاننا بھی ضروری ہے اور اس میں بھی بہت سے علوم شامل ہیں۔

اب رہی باطنی معاش تو یہ ایسی معاش ہے جو بندے کو رب سے ملا دے، انہیں ہانک کر ادھر لے

[1] جن کو طاقت کے اندازے کے مطابق کام تبلایا ہوا ہے۔

آئے اور اللہ کی راہ بتائے - اس میں شریعتوں کا جاننا اوران کے انوار اور اُن اسرار کا جاننا شامل ہے جو اللہ تک پہنچا دیں- چنانچہ انسان واقعات میں اللہ کی حکمتوں کو جاننے لگتا ہے اور جانتا ہے کہ شریعت میں اس کے حکم کرنے کا کیا راز ہے اور یہ کہ دنیا اور آخرت میں بندے کو اس سے کیا نفع پہنچتا ہے -اگر اس بارے میں ہم تمام امور کا ذکر کر دیں جنہیں ہم نے حضرت سے سُنا اور ہم جزئیات اور بڑی تفاصیل کو بیان کریں جن کے متعلق ہم نے شیخ سے سوال کیا تو ہمیں بے شمار عجائب و غرائب کا ذکر کرنا پڑے گا- نیز اس نور والا حکم شرعی کو سنتے ہی سمجھ جائے گا کہ یہ یقیناً حق بات ہے کیونکہ میں نے حضرت سے ان اختلافات کے متعلق بحث کی جو شیوخ مذاہب میں واقع ہوئے (مثلاً چشتیہ، سہروردیہ وغیرہ) پھر ان اختلافات میں بحث کی جو اصحاب مذاہب اربعہ (یعنی امام ابوحنیفہ، امام شافعی، امام مالک اور امام احمد بن حنبل) کے درمیان واقع ہوئے اور پھر اُن اختلافات میں جو انبیاء کی شریعت میں واقع ہوئے - یہ گفتگو کئی سال تک جاری رہی- اس عرصے میں آپ سے وہ اسرار و معارف سُننے میں آئے جن کا شمار نہیں، خدا ہمیں اپنے فضل و کرم سے ان سے دنیا و آخرت میں نفع پہنچائے -

حضرت نے فرمایا کہ انہی علوم میں اُن آفات کی معرفت بھی شامل ہے جو اسبابِ معاش ظاہری و باطنی کو لاحق ہوتی ہیں اور یہ کہ ان آفات سے بچنے کا کیا طریقہ ہے تاکہ اس علم کا جاننے والا اپنی معاش کے تمام اسباب میں صاحبِ بصیرت ہو جائے چنانچہ اسے یہ معلوم ہو جاتا ہے کہ دونوں جہانوں میں اسے خاص طور پر کونسی چیز نفع رساں ہے اور کونسی ضرر رساں - اسی میں علم طب کی ایسی کامل معرفت بھی شامل ہے جو نفس الامری ہو اور یہ یا تو ظاہری ہے جس کا تعلق ظاہری معاش کی بہتری کے ساتھ ہے یا باطنی جس کا تعلق معاشِ باطنی کے ساتھ ہے -

۶ - اُن علوم کی معرفت جن کا تعلّق کونین کے احوال کے ساتھ ہے

چھٹا جزو ان علوم کی معرفت ہے جن کا تعلق کونین کے احوال کے ساتھ ہے اور کونین سے مراد عالم علوی اور عالم سفلی ہے - اس کا بیان اس طرح ہے کہ عالم کا انحصار سات امور پر ہے - عناصرِ اربعہ یعنی پانی، مٹی، ہوا اور آگ پر اور مرکباتِ ثلثہ پر یعنی نباتات، حیوانات اور معدنیات پر - لہٰذا علمِ کامل میں ان اشیاء کی حقیقت کو کامل طور پر جاننا ضروری ہے نیز ان کی امتیازی خاصیتوں کا علم - ان میں نفع رساں اور ضرر رساں اشیاء کا علم، ان کی قوتوں کا علم اور ان قوتوں میں ان کے تمام افراد کے اختلاف کا علم بھی ہو، کیونکہ بعض اوقات ایسا ہوتا ہے کہ آگ کا جسم تو بہت وسیع ہوتا ہے، لیکن اس کی قوتیں کمزور ہوتی ہیں اور اس کے برعکس بھی یعنی جرم چھوٹا لیکن

حرارت قوی۔ اس کی بحث لمبی ہے واللہ اعلم

۷۔ جہات کا ایک جہت میں محصور ہو جانا

ساتواں جزو جہات کا ایک جہت میں محصور ہونا ہے اور وہ ایک جہت سامنے کی جہت ہے اور یہ علم کامل کے اجزاء میں سے ہے اس کی تشریح یہ ہے کہ علم چونکہ ایک نور ہے جسے تمام جہات میں اشیاء کا ادراک کرنا ہے، لیکن اگر کسی کو اللہ کی طرف سے زائد نور عطا ہو کہ جو کچھ وہ سامنے کی جہت کے علاوہ اور جہات میں دیکھتا ہے وہ اس کے لیے ایسے ہی ہو جائیں جس طرح کہ بدونِ کم و کاست کے سامنے کی اشیاء کو دیکھتا ہے اور اس وقت اس کی نگاہ میں صرف ایک جہت رہ جاتی ہے اور باقی تمام جہات معدوم ہو جاتی ہیں اس لیے کہ اس کا علم کامل ہوتا ہے اور یہ کیفیت صاحب فتح (کشف) کے سوا کسی اور کو حاصل نہیں ہوتی۔ یہی مفہوم ہے اس حدیث کا جس میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ[۱] اِنِّی لَاَرَاکُمْ مِنْ خَلْفِیْ کَمَا اَرَاکُمْ مِنْ اَمَامِیْ (ترجمہ: میں اپنے پیچھے سے تمہیں اس طرح دیکھتا ہوں جس طرح سامنے سے) لہٰذا باوجود اس کے کہ صحابہؓ آپؐ کے پیچھے ہوتے آپؐ انہیں اپنے سامنے دیکھتے بعینہٖ اسی طرح جس طرح آپؐ سامنے کے رُخ کی چیزوں کو دیکھتے لیکن اگر صاحب علم الگ الگ جہات کو محسوس کرے تو اس کا علم کامل نہیں ہے واللہ تعالیٰ اعلم۔

۷۔ رِسالت

۱۔ رُوح کا جسم میں برضا و رغبت قیام

رسالت کا پہلا جزو رُوح کا جسم میں برضا و رغبت قیام پذیر ہونا ہے اس لیے کہ پاکیزہ اجسام کے اندر وہ نور ہوتے ہیں جو ایمان باللہ سے فیضیاب ہوتے ہیں انہی انوار کی قلت و کثرت کے مطابق جسم میں نور کا قیام قوی ہوتا ہے یا ضعیف کیونکہ نور بہ نسبت روح کے زیادہ مائل ہوتا ہے اور ارواح بھی نور ہی میں سے ہیں، صرف اتنا فرق ہے کہ نورِ ایمان کو کسی ذات میں دیکھتی ہے تو وہ اس کی طرف مائل ہوتی ہے اور اس سے لذت پاتی ہے پھر جس ذات میں نورِ ایمان مثلاً ایک ہاتھ برابر ہو، اس میں روح کی سکونت اس قدر رضا و رغبت کی نہ ہوگی جس قدر کہ اس ذات میں ہوگی جس میں نورِ ایمان دو ہاتھ برابر ہے وعلیٰ ہذا القیاس۔

مزید براں نورِ ایمان نیک اعمال کے اجر کی زیادتی سے بڑھتا رہتا ہے اس لیے کہ اعمال کے اجر ہیں

---

[۱] ملاحظہ ہو مشکوٰۃ۔ طبع مجتبائی صفحہ ۹۸ اور ۱۰۱ باب ما علی الماموم من المتابعۃ اور مؤطا امام مالک ج ۱ صفحہ ۱۳۹۔ ۱۲

اور ان اجور کا خاص نور ہوتا ہے جن کا عکس ذات پر پڑتا ہے اور جن کی بدولت اجسام کو دنیا میں نیک نفع حاصل ہوتا ہے اس طرح کہ ان کی وجہ سے ان کا نور ایمان بھی بڑھ جاتا ہے اور آخرت میں ظاہر نفع ہوتا ہے کہ یہی اجور جنت میں نعمتیں بن جائیں گے جن سے عمل کنندگان حظ حاصل کریں گے۔

حضرت نے فرمایا: اگر ہم فرض کرلیں کہ دو آدمی نورِ ایمان میں برابر ہیں اور ان میں سے ایک دن بھر نیک اعمال کرتا رہے اور دوسرا نہ کرے۔ پھر دونوں رات کو سو جائیں، تو نیک اعمال والے کا نور رات بھر روشن اور زیادہ پھیلا ہوا ہوگا برخلاف اس شخص کے نور کے جس نے کوئی نیک کام نہیں کیا۔ پھر فرمایا کہ تمام اعمال میں رسالت کے اعمال سے بڑھ کر کوئی عمل نہیں ہو سکتا، اسی لیے مرسلینؑ کے ایمان کے برابر پہنچنا ناممکن ہے، پھر خود مرسلینؑ میں بھی ان کے متبعین کی قلت و کثرت کے اعتبار سے فرقِ مراتب ہے اور کوئی مرسل کثرتِ متبعین کے اعتبار سے ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے برابر نہیں ہو سکتا اسی لیے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا اجر دیگر مرسلین کے اجر سے بڑھ کر ہوگا۔ اس لیے کہ آپؐ کا نورِ ایمان اس عظمت تک پہنچ چکا ہے کہ کوئی نہیں پہنچ سکتا۔ اس سے یہ لازم آیا کہ جس طرح مُرسلین کی ارواح ذوات میں سکونت پذیر ہیں، اس طرح دوسروں کی ارواح نہیں۔ اسی خاص رہائش کو ہم نے جزوِ رسالت قرار دیا ہے۔ یہ بھی معلوم ہو چکا کہ ذاتِ محمدیؐ میں روح محمدیؐ کی سکونت دیگر مرسلین سے بڑھ کر ہے لہٰذا آپؐ کی ذات میں یہ جزو بھی انتہائے کمال پر ہوگا۔ نیز روح کی رہائش میں اس اعتبار سے بھی فرقِ مراتب ہوتا ہے کہ کسی کا نورِ ایمان جرمِ روح کے مساوی ہوتا ہے اور کسی کا چھوٹا اور کسی کا بڑا۔ لہٰذا جس کا نورِ ایمان جرمِ رُوح سے بڑا ہوگا تو اس کی روح کا قیام بھی زیادہ ہوگا۔ پھر فرمایا کہ جن کی ذات میں نورِ ایمان قطعاً ہوتا ہی نہیں وہ کافروں کی ذات ہے ان میں روح کا قیام صرف بحکم تقدیر قہری جبراً ہوتا ہے ورنہ حقیقت میں روح ان کی ذات کو سخت ناپسند کرتی ہے۔

۲۔ علمِ کامل

دوسرا جزو علمِ کامل ہے خواہ غیب کا ہو، خواہ سامنے موجود اشیاء کا (غیباً و شہادۃً) اس جگہ علمِ غیب سے ہماری مُراد وہ علوم ہیں جن کا تعلق اللہ تعالیٰ اور اس کی صفات کی معرفت سے ہے اور علم شہادت سے مراد وہ علوم ہیں جن کا تعلق مخلوقات سے ہے لہٰذا اس میں وہ عُلوم جن کا تعلق جنّ وانس کے احوال سے ہے اور وہ علوم جن کا تعلق احوالِ کونین سے ہے اور وہ علوم جن کا تعلق احوالِ عاقبت سے ہے سب شامل ہوں گے اس کے متعلق پہلے بھی کچھ اشارہ کیا جا چکا ہے لیکن یہاں جسے جزوِ رسالت شمار کیا گیا ہے وہ ان امور کی معرفت میں کمال حاصل کرنا ہے لہٰذا ان امور میں کمال اور پھر کمال کا انتہائی درجہ حاصل کرنا رسالت کا ایک جزو ہے جس کا ہر رسول میں ہونا ضروری ہے اور یہ کمال

کمال ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات میں انتہائی غایت کو پہنچ چکا تھا واللہ اعلم

۳۔صدق

تیسرا جزو ہر ایک کے ساتھ قول و فعل میں سچائی ہے ، اسی طرح کہ افعال و اقوال اللہ کی خوشنودی اور محبت کے مطابق ہوں کیونکہ مخلوقات کو پیغمبروں علیہم الصلوٰۃ والسلام کی تابعداری کرنے کا حکم دیا گیا ہے لہٰذا رسولوں کا مذکورہ حالت پر ہونا ضروری ہے لہٰذا رسول حق و سچائی کے سوا کوئی بات دل سے نہیں نکالتے ۔ ان کا مزاج بھی سنجیدہ ہوتا ہے لہٰذا جب وہ کسی بات کی خبر دے دیں تو وہ ہو کر رہے گی اور اگر کوئی بات بظاہر اس کے خلاف نظر آتی ہو تو اس کی صحیح تاویل کی جائے گی اور انشاء اللہ ہم اس کتاب میں اس کا کچھ ذکر کریں گے ۔

غرض رسولوں کے کلام اور اہل جنت کی خواہشات ایک ہی قسم کی ہیں چنانچہ جس طرح اہل جنت جب کسی چیز کی خواہش کریں گے تو یہ یقیناً پوری ہو گی ۔ اسی طرح جب رسول کوئی بات کریں تو وہ پوری ہو کر رہے گی ، واللہ اعلم ، لہٰذا جو کچھ ہم قولِ حق (جو کہ نبوت کا جزو ہے) کے تحت میں پہلے کہہ آئے ہیں اس کے مقابلے میں "صدق" میں صرف اسی قدر مفہوم کا اضافہ ہے کیونکہ یہاں صدق بمنزلہ اس شخص کے ہے جو ان امور کی حکایت کر رہا ہو جو تقدیر میں لکھی جا چکی ہیں ، گویا کہ اس کا قائل مَسلُوبُ الاختیار ہے ، برخلاف قولِ حق کے کیونکہ وہ اس درجے تک نہیں پہنچا ہوتا لہٰذا صدق میں قولِ حق کے مقابلے میں زائد نور ہوتا ہے ۔

۴۔سکینہ و وقار

جزوِ چہارم سکینہ اور وقار ہے اور وہ دل میں ایک نُور ہے جو صاحبِ نور کے لیے ضروری کر دیتا ہے کہ اس کا اللہ پر اطمینان اور اعتماد ہو اور یہ کہ وہ ہر قسم کی قوت اور طاقت اللہ کی طرف پھیرے اور اللہ کے سوا کسی اور کی پروانہ کرے ، یہاں تک کہ جب اللہ تعالیٰ صاحب سکینہ اور وقار کو کسی امر کا لوگوں تک پہنچانے کا حکم دیتا ہے اور تمام دنیا کے لوگ اس معاملے میں اُس کی مخالفت اور دشمنی کا ارادہ کر لیں تو وہ ان کی قطعاً پروا نہ کرے بلکہ اُن کو کالعدم سمجھے اور اس کے نزدیک اُن کا دوستی کرنا ، محبت کرنا اور مدد کرنا سب یکساں ہو کیونکہ اُس کے نزدیک تو انہیں مخالفت یا موافقت کرنے کی طاقت ہی نہیں ۔

لیکن جسے سکینہ حاصل نہ ہو تو جب اسے معلوم ہو گا کہ فلاں شخص اسے نقصان پہنچانے کا قصد کرتا ہے تو جس طرح وہ اپنے اندر قوت و طاقت محسوس کرتا ہے اسی طرح وہ دشمن میں بھی قوت و طاقت دیکھتا ہے لہٰذا وہ دشمن کی مدافعت کی تدبیریں سوچے گا کہ وہ کیسے بھاگ جائے اور کبھی سوچے گا کہ جب مقابلہ آن پڑا تو نجات کی کیا صورت ہو گی

ابھی اس شش و پنج میں ہوتا ہے کہ دشمن سے مقابلہ آن پڑتا ہے اس لیے وہ کچھ بھی نہیں کر سکتا ، یہی وجہ ہے کہ سکینہ کو اجزاءِ رسالت میں سے شمار کیا گیا ہے

کیونکہ صاحبِ رسالت کو دنیا والوں سے عداوت کا حکم دیا گیا ہے یہاں تک کہ وہ اپنے کفر و باطل سے باز آجائیں۔ اسی لیے اسے ان کی توجہ یا عدم توجہ ان کی محبت یا ان کی روگردانی کی پروا نہیں ہوتی چنانچہ حضراتِ مرسلین کی یہی حالت تھی کیونکہ دنیا والوں نے اُن سے عداوت کی اور متحد ہو کر ان سے لڑے لیکن ان کے دل پر اس کا اثر نہ ہوا پھر حضرت نے فرمایا کہ قرآن مجید کی کئی آیات میں اسی سکینہ کا ذکر ہے مثلاً ثُمَّ اَنْزَلَ اللّٰهُ سَكِيْنَتَهٗ عَلٰى رَسُوْلِهٖ وَعَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ (سورہ توبہ آیت: ۲۶) (پھر اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول اور مومنین پر سکینہ اتاری) رسول پر سکینہ اتارنے کا مطلب یہ ہے کہ اس کے آثار کا مشاہدہ کرا دیا کہ آپ کثیر التعداد دشمن کے مقابلے پر بھی ڈٹے رہے اور مومنین پر انزال سکینہ سے مراد یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی برکت سے ان کے دلوں میں سکون و اطمینان پیدا کر دیا۔

پھر سلسلہ کلام میں اس سکینہ کا تذکرہ ہوا جو بنی اسرائیل کے تابوت میں تھی جس کا ذکر قرآنِ مجید کی اس آیت میں ہے۔[1] اَنْ يَّاْتِيَكُمُ التَّابُوْتُ فِيْهِ سَكِيْنَةٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ (کہ تمہارے پاس ایک تابوت آئے گا جس میں تمہارے رب کی طرف سے سکینہ ہو گی) اور پھر اس سکینہ کا ذکر ہوا جس کا ذکر اُسیدؓ[2] بن حُضیرؓ کی حدیث میں ہے اور اس سکینہ کا ذکر ہوا جن کا ذکر دیگر احادیث میں کیا گیا ہے جو کچھ آئمہ تفسیر نے ان کے بارے میں لکھا ہے مجھے اُس کا علم تھا، لیکن حضرت نے ان مقامات کی اس طرح تشریح کی جس طرح کوئی معاملے کا مشاہدہ کر رہا ہو۔ حتیٰ کہ حضرت جبرئیل کا وحیہؓ[3] کلبیؓ کی صورت میں آنے کا ذکر ہوا، اگر یہ ڈر نہ ہوتا کہ کہیں پڑھنے والے اکتا نہ جائیں تو میں یہ سب کچھ لکھ دیتا واللہ اعلم

۵۔ مُشاہدۂ کاملہ پانچواں جزو مشاہدۂ کاملہ ہے اس کی تشریح نہیں کی جاسکتی کیونکہ یہ عقول کی دسترس سے باہر ہے جیسے کہ معرفتِ باری تعالیٰ کی جو جزوِ نبوت ہے، تشریح نہیں کی جاسکتی۔

---

[1] قرآن مجید سورۃ البقر (پارہ ۲) آیت ۲۴۸

[2] اسید بن حضیرؓ: یہ اُن صحابہ میں سے ہیں جو عقبہ ثانیہ کے وقت موجود تھے، بدر اور بعد کی تمام جنگوں میں انہوں نے شرکت کی۔ ان کی وفات مدینہ میں ۲۰ھ : ۶۴۱ء میں خلافتِ عمرؓ میں ہوئی۔

[3] وحیہ کلبیؓ: یہ کبار صحابہ میں سے ہیں۔ اُحد اور بعد کی جنگوں میں شریک ہوئے۔ انہی کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ۶ھ : ۶۲۷ء میں قیصر کی طرف روانہ کیا تھا اور انہی کی شکل میں جبرئیل آیا کرتے تھے۔ امیر معاویہ کے عہد تک زندہ رہے۔

۶۔ زندگی میں موت

چھٹا جزو زندگی ہی میں موت ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اپنی زندگی کے احوال کا مشاہدہ اسی طرح کریں جس طرح مُردے اپنی موت کے بعد کریں گے اسے جزو رسالت اس لیے شمار کیا گیا ہے کیونکہ مرسلین علیہم الصلوٰۃ والسلام کو رغبت اور خوف دلانے (ترغیب و ترہیب) کی غرض سے بھیجا گیا اور ترغیب و ترہیب وہی شخص کر سکتا ہے جو آخرت کے احوال کا مشاہدہ کر رہا ہو۔ لہٰذا وہ جنت کے حاصل کرنے کی ترغیب لوگوں کو دے سکے گا اور دوزخ سے بچنے کے لیے لوگوں کو ڈرا سکے گا اور تشریح کر سکے گا کہ عذاب قبر کیسے ہوگا اور برزخ میں ارواح کس طرح چڑھ جاتی ہیں اور اسی قسم کی اور باتوں کی تشریح کر سکے گا جنہیں لوگوں کی عقلیں برداشت کر سکیں۔

میں نے عرض کیا کہ انبیاء کو ان کے متعلق وحی کا آجانا کافی ہے، مشاہدے کی کیا ضرورت ہے حضرت نے فرمایا کہ وحی ایک خطاب ہے اور خطاب کلام انہی سے ہوتی ہے جو معنی کو سمجھتے ہوں۔ پس مشاہدہ پیغمبر کے لیے آخرت کے احوال کو واضح کر دیتا ہے جس سے ان سے عینی واقفیت حاصل کر لیتا ہے، لیکن وحی جو ہوتی ہے اس سے پیغمبر کو اللہ کی طرف سے اجازت حاصل ہو جاتی ہے کہ جن باتوں کا تبلیغ کرنا مقصود ہے ان کی تبلیغ کرے ایسی باتیں جن کو لوگوں کی عقول برداشت کر سکیں اور ان کی ذوات ان کے سننے کی قدرت رکھیں۔ الا جن باتوں کو عقلیں برداشت نہ کر سکتی ہوں اور ان کے سننے سے جگر پھٹ جانے کا خطرہ ہو، پیغمبر اپنے سابق مشاہدہ پر ہی رہتا ہے، اس کے متعلق کوئی وحی نازل نہیں ہوتی اور اگر کلام کسی ایسے کے ساتھ ہو جو معانی کو نہیں سمجھتا تو اس شخص کے لیے تو سمجھنا اور سمجھانا ہی ناممکن ہے واللہ اعلم۔

۷۔ جنتیوں کی سی زندگی بسر کرنا

ساتواں جزو جنتیوں کی سی زندگی بسر کرنا ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ ذاتِ رسول علیہ السلام انہی انوار سے سیراب ہو جن سے اہلِ جنت جنت میں داخل ہونے کے بعد سیراب ہوں گے۔ لہٰذا مرسلین علیہم السلام کی ذات ایسی ہی ہوتی ہے جیسے جنتی کی جنت میں۔ اس کی شرح یہ ہے کہ عالم دو ہیں۔ دارِ فنا اور دارِ بقاء۔ پھر ہر ایک کی دو قسمیں ہیں ظلماتی اور نورانی۔ دار البقاء کی نورانی قسم جنت اور ظلمانی کو دوزخ ہے۔ جب حجاب زائل ہو جائے تو دارِ بقاء کی ہر قسم اپنی موافق نوع کو مدد پہنچاتی ہے۔ چنانچہ نورانی نورانی کو اور ظلماتی ظلمانی کو مدد پہنچاتی ہے۔ پھر یہ بات بھی ہے کہ حجاب کے زائل ہونے کا عمل مختلف ہوتا ہے۔ چنانچہ مرسلین علیہم السلام میں یہ حجاب اسی دنیا میں پہلے ہی سے زائل ہو چکا ہوتا ہے جیسا کہ چھٹے جزو میں مذکور ہو چکا اور

مرسلین اسی دنیا میں ہر نورانی سے بڑھ کر نورانی ہوتے ہیں اور ان کی ذاتِ شریف دارِ بقا کے نورانی حصّے یعنی جنّت سے مدد لیتی رہتی ہے، لیکن عامۃُ الخلائق کے لیے حجاب صرف قیامت کے دن زائل ہوگا اور اسی دن انہیں مدد بھی حاصل ہوگی چنانچہ جو ایمان والا ہوگا وہ انوارِ جنت سے مدد حاصل کرے گا اور سرکش نارِ جہنم سے مدد حاصل کرے گا۔ خدا ہمیں اپنے فضل وکرم سے دوزخ سے پناہ دے۔ مختصر یہ کہ استمداد کا انحصار زوالِ حجاب پر ہے اور یہ حجاب مرسلین حضرات علیہم السلام سے زائل ہو چکا ہوتا ہے اس لیے ان کی زندگی اہلِ جنّت کی زندگی کی طرح ہوتی ہے۔

حضرت نے فرمایا کہ آدمیّت، قبض، بسط، نبوّت، روح، علم، رسالت کے ہر حرف کے سات اجزا کی یہ تشریح ہے جو بیان ہو چکی۔ (مؤلف کتاب کہتا ہے) کہ ہم انہیں دوبارہ بیان کرتے ہیں کیونکہ یہ اختلافات کی تفریع کے لیے جس کے متعلق سوال کیا گیا تھا، بہت مفید ہے چنانچہ یہ اس طرح ہیں:

آدمیّت کے اجزاء: کمالِ حسنِ ظاہری، کمالِ حواسِ ظاہری، کمالِ حسنِ باطنی، کمالِ حواسِ باطنی، ذکوریّت (یعنی نر ہونا)، نزعِ حظِ شیطان اور کمالِ عقل۔

قبض کے اجزاء: وہ حِس جس سے خیر میں لذت ہو اور باطل سے کلفت۔ انصاف، ضد سے نفرت، امتثالِ امر، جنس کی طرف میلان اس طرح کہ اس کی کیفیت اختیار کرے، انقباض کی قوتِ کاملہ اور حق گوئی سے عزم دکرنا۔

بسط کے اجزاء: فرحِ کامل، ذات میں خیر کا قیام، فتحِ حواسِ ظاہری، فتحِ حواسِ باطنی، رفعت، حسنِ تجاوز، انکساری۔

نبوّت کے اجزاء: قولِ حق، صبر، رحمت، معرفتِ الٰہیہ، خوفِ تام، بغضِ باطل، عفو۔

روح کے اجزاء: ذوقِ انوار، طہارت، تمیز، بصیرت، عدمِ غفلت، قوتِ سریان اور تکلیف والے اجرام سے بے حسی۔

علم کے اجزاء: حملِ علوم، عدمِ اضاعت، معرفتِ لغات، انجام سے واقفیت، احوالِ کونین

ؔ چنانچہ مشکوٰۃ باب صلوٰۃ الکسوف ص۹ میں مذکور ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے صلوٰۃ کسوف پڑھی اور فارغ ہونے پر صحابہ نے عرض کیا کہ ہم نے دیکھا کہ آپ نماز میں پہلے آگے بڑھے پھر پیچھے ہٹ گئے فرمایا میں جنت میں تھا اور چاہا کہ انگور کا ایک خوشہ تمہارے لیے توڑ لوں پھر دوزخ دیکھی اور باقی حدیث بیان کی یہاں سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ حضرات انبیاء کی زندگی اہلِ جنّت کی سی ہوتی ہے۔ ۱۲

سے تعلق رکھنے والے علوم سے آگاہی، احوالِ ثقلین سے تعلق رکھنے والے علوم کی واقفیت اور جہات کا صرف سامنے کی جہت میں محصور ہو جانا۔

رسالت کے اجزاء: برضا و رغبت روح کا ذات میں قیام، علمِ کامل، ہر ایک سے سچائی، سکینہ و وقار، مشاہدۂ کاملہ، موت بحالتِ حیات، اہلِ جنت کی سی زندگی۔

حضرت نے فرمایا: اب رہا صحابہؓ و تابعینؒ میں قرّاء کے لفظی اختلافات کا سات باطنی انوار پر متفرع ہونے کی تشریح یوں ہے کہ تجھے علم ہو چکا ہے کہ باطنی حروف کے اجزاء انچاس ہیں اور تجھے یہ بھی معلوم ہے کہ عربی کلام کے حروفِ تہجّی اُنتیس ہیں اور ہر حرف کے لیے مذکورہ اجزاء میں سے ایک جزو ہے۔

چنانچہ ہمزہ (ء) کے لیے امتثال ہے جو قبض کا ایک جزو ہے۔ بؔ کے لیے سکینت ہے جو رسالت کا ایک جزو ہے۔ تؔ کے لیے کمالِ حواسِ ظاہری ہے کہ اجزاءِ آدمیت میں سے ہے ثؔ کے لیے انصاف جو قبض کا جزو ہے۔ جؔ کے لیے صبر ہے جو جزوِ نبوت ہے حؔ کے لیے رحمتِ کاملہ ہے اور یہ اجزاءِ نبوت میں سے ہے۔ خؔ کے لیے ذوقِ انوار ہے اور وہ روح کا جزو ہے دؔ کے لیے طہارت کہ اجزاءِ روح میں سے ہے ذؔ کے لیے معرفتِ لغات کہ اجزاء علم میں سے ہے۔ سؔ کے لیے حسنِ تجاوز جو اجزاءِ بسط میں سے ہے اور شؔ کے لیے ہر شخص کے ساتھ سچائی ہے اور وہ اجزاءِ رسالت میں سے ہے۔[سؔ کے لیے انکسار ہے کہ اجزاءِ بسط میں سے ہے شؔ کے لیے حق گوئی ہے کہ اجزاءِ قبض میں سے ہے صؔ کے لیے عقلِ کامل ہے کہ اجزاءِ آدمیت میں سے ہے۔ ضؔ کیلئے حق گوئی ہے کہ اجزاءِ نبوت میں سے ہے][1] طؔ کے لیے تمییز کہ اجزاءِ روح میں سے ہے۔ ظؔ کے لیے نزعِ حظّ الشیطان ہے کہ اجزاءِ آدمیت میں سے ہے۔ عؔ کے لیے عفو ہے اور وہ اجزاءِ نبوت میں سے ہے غؔ کے لیے کمالِ صورتِ ظاہری ہے اور جو اجزاءِ آدمیت میں سے ہے۔ فؔ کے لیے حملِ علوم ہے کہ جزوِ علم ہے قؔ کے لیے بصیرت اور وہ اجزاءِ روح میں سے ہے کؔ کے لیے معرفتِ الٰہی ہے جو اجزاءِ نبوت میں سے ہے۔ لؔ کے لیے علمِ کامل ہے جو اجزاءِ بسط میں سے ہے مؔ کے لیے ذکوریت جو اجزاءِ آدمیت میں سے ہے نؔ کے لیے فرحِ کامل کہ اجزاءِ بسط میں سے ہے۔ وؔ کے لیے موت بحالتِ حیات کہ اجزاءِ رسالت میں سے ہے ہؔ کے لیے ضد سے نفرت ہے کہ اجزاءِ قبض میں سے ہے۔ لاؔ کے لیے عدمِ غفلت کہ اجزاءِ روح میں سے ہے اور یؔ کے لیے خوفِ تام کہ اجزاءِ نبوت میں سے ہے۔

---

[1] یہ عبارت مطبوعہ کتاب جو ہمارے پاس ہے اس میں نہ تھی، لیکن چونکہ اس کے بغیر مفہوم مکمل نہیں ہوتا اور یہ طباعت کے اغلاط میں سے تھا اس لیے میں نے اتنی عبارت کو مکمل کر دیا ہے۔ ۱۲ مترجم

یہ انتیس حروف ہوئے۔ ان میں سے آدمیّت کے پانچ[۵] ہیں۔ ت۔ ظ۔ م۔ ص۔ غ۔ تؔ کے لیے کمالِ حسنِ ظاہری۔ ظؔ کے لیے نزع حفظِ شیطان۔ مؔ کے لیے ذکوریت۔ صؔ کے لیے کمالِ عقل اور غؔ کے لیے کمالِ صورتِ ظاہری اور آدمیّت کیلئے دو جزو باقی رہ گئے۔

ان حروف میں سے قبض کے لیے چار[۴] ہیں۔ ء۔ ث۔ ش۔ مد۔ ہمزہ کے لیے امتثال۔ ثؔ کے لیے انصاف۔ شؔ کے لیے قوتِ انکماش اور ھؔ کے لیے نفرت عن الضّد۔ قبض کے اجزا میں سے تین باقی رہ گئے۔

بسط کے لیے تین حرف۔ ر۔ ف۔ س۔ رؔ کے لیے حسنِ تجاوز، فؔ کے لیے فرحِ کامل اور سؔ کے خفضِ جناح الذّل (انکساری) بسط کے چار جزو باقی رہ گئے۔

نبوت کے لیے چھ حروف ہیں۔ ج، ح، ک، ض، ع، ی چنانچہ ج کے لیے صبر، ح کے لیے رحمتِ کاملہ، ک کے لیے معرفتِ الٰہی۔ ض کے لیے حق گوئی، ع کے لیے عفو اور ی کے لیے خوفِ خدا تامّ اور نبوت کا ایک جزو باقی رہ گیا۔

روح کے پانچ حروف ہیں۔ د۔ خ۔ ط۔ ق۔ ہ۔ چنانچہ د کے لیے طہارت۔ خ کے لیے ذوق انوار طؔ کے لیے تمیز۔ قؔ کے لیے بصیرت۔ ہؔ کے لیے عدمِ غفلت اور روح کے دو جزو باقی رہ گئے۔

علم کے دو حرف ہیں۔ ذ اور ف۔ چنانچہ ذؔ کے لیے معرفتِ لغات اور ف کے لیے حملِ علم۔ اور اجزاء علم میں سے پانچ جزو باقی رہ گئے۔

رسالت کے چار حرف ہیں۔ ب۔ ز۔ ل۔ و چنانچہ بؔ کے لیے سکینہ۔ ز کے لیے ہر ایک سے سچائی۔ لؔ کے لیے علمِ کامل اور وؔ کے لیے موت اور حیات۔ اس طرح رسالت کے تین جزو باقی رہ گئے۔

یہ اُنتیس حروف اس طرح اُنتیس اجزاء پر منقسم ہیں اور بیس جزو باقی رہ گئے۔ اب ہم ان باقی ماندہ بیس جزوں کا ذکر کرتے ہیں۔ اس کے بعد اُن کی تقسیم کریں گے اور وہ یہ ہیں۔

کمالِ[1] حسنِ باطنی، کمالِ[2] حواس باطنی، قوتِ[3] ساریہ، میل[4] الی الجنس، عدم الحیا[5] از قولِ حق، سکونِ[6] خیر در ذات، فتح[7] حواسِ ظاہرہ، فتح[8] حواسِ باطنہ، مقامِ[9] رفعت، بغضِ[10] باطل، قوتِ[11] سریان، تکلیف[12] دہ اشیاء سے دردمند نہ ہونا۔ عدمِ[13] تضییع، جہات[14] کا سامنے کی جہت میں محصور ہونا۔ انجام[15] کی معرفت، جنّ[16] وانس سے متعلق علوم کی معرفت، احوالِ کونین[17] سے متعلق علوم کی معرفت، سکونِ[18] روح در ذات، اہلِ[19] جنّت کی سی زندگی بسر کرنا اور مشاہدہ[20] کاملہ۔

ان میں سے پہلا جزو آدمیت کا ہے اس کے بعد کے تین قبض کے اور پھر بعد کے چار بسط کے پھر ایک نبوت کا اس کے بعد کے دو روح کے اور پھر بعد کے پانچ علم کے اور آخری تین رسالت کے۔

اس کے بعد یاد رکھو کہ ان میں سے اٹھارہ حروف مدّولین پر منقسم ہوتے ہیں۔ حروفِ مدّولین یہ ہیں: ا۔ و۔ ی چنانچہ الف کے چھ، وَ کے چھ اور یَ کے چھ۔ ان میں سے ہر ایک کے لیے چھ چھ حروف اس لیے ہوئے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو چھ مراتب تک لمبا کیا۔ چنانچہ آپ نے کبھی ایک الف کی مقدار لمبا کیا کبھی دو الف جتنا، کبھی تین الف جتنا اور کبھی چار، کبھی پانچ اور کبھی چھ الف جتنا لمبا کیا اور یہ اندازہ بھی تقریبی ہے تحقیقی نہیں ہے۔

(مؤلف کتاب کہتا ہے) کہ شیخ المقرئین حافظ ابن[۱] الجزری رحمۃ اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب النشر میں اسی طرح ذکر کیا ہے کیونکہ انہوں نے مدّ کے مراتب پر بحث کرتے ہوئے یوں لکھا ہے:

"پہلا مرتبہ قصر ہے اور اس کی لمبائی کی مقدار ایک الف جتنی ہوتی ہے اور اس نے اس قرارت کو ابنِ کثیرؒ اور ابو جعفرؒ کی طرف منسوب کیا ہے۔ دوسرا مرتبہ قصر سے ذرا بڑھ کر ہے اور اس کی مقدار دو الف جتنی ہوتی ہے اور بعض ڈیڑھ الف جتنی بتاتے ہیں اور اسے زیادتی کے بعد زیادتی یا تمکین بغیر اشباع کے یا زیادتِ متوسط کہتے ہیں اور بعض نے اس قرارت کو دوری[۲] اور قالون[۳] کی طرف منسوب کیا ہے۔ تیسرا مرتبہ دوسرے مرتبے سے تھوڑا زیادہ ہے اور یہ متوسط لمبائی ہے اور اسے اندازاً تین الف تک کہا گیا ہے بعض ڈیڑھ الف اور بعض نے دو الف کہا ہے، جنہوں نے تیسرا درجہ دو الف بتایا ہے ان کے نزدیک دوسرا مرتبہ ڈیڑھ الف کا ہے اور اس قرارت کو الکسائیؒ کی طرف منسوب کیا ہے چوتھا مرتبہ تیسرے سے تھوڑا زیادہ ہے اور اندازاً اسے چار الف تک کہا گیا ہے بعض نے ساڑھے تین الف بتایا ہے اور بعض نے تین الف اور اس قرارت کو عاصمؒ اور ابن عامرؒ کی طرف منسوب کیا ہے۔ پانچواں مرتبہ چوتھے سے تھوڑا اوپر ہے اور اس کا اندازہ

۱؎ شیخ شمس الدین ابو الخیر محمد بن محمد الجزریؒ۔ ان کی کتاب النشر فی القرآت العشر ہے اس کے بعد انہوں نے خود اس کا اختصار کیا اور اس کا نام "التقریب" رکھا (کشف ۲: ۲۹۱)

۲؎ دوریؒ: عباس بن محمد بن حاتم دوری حافظ حدیث تھے اور یحییٰ بن معین کے شاگرد تھے ان کی پیدائش ۱۵۸ھ میں ہوئی اور وفات ۲۷۱ھ میں ہوئی۔

۳؎ عیسیٰ بن مینا قالونؒ: انہوں نے نافع کی قرارت کی روایت کی ہے۔

پانچ الف تک کیا گیا ہے۔ بعض نے ساڑھے چار الف تک کہا ہے اور بعض نے چار اور اس قرارت کو حمزہؒ اور ورشؒ کی طرف منسوب کیا ہے۔ چھٹا مرتبہ پانچویں سے ذرا زیادہ ہے اور اسے تمطیط کہا جاتا ہے اور اندازاً اسے چھ الف تک بتایا جاتا ہے۔ ابوالقاسمؒ[1] نے اس کا ذکر کیا ہے اور قاریوں کی ایک جماعت سے اسے روایت کیا ہے اور اس قرارت کو ورشؒ[2] کی طرف منسوب کیا ہے اور پانچویں مرتبہ کو صرف حمزہؒ کی طرف منسوب کیا ہے"۔

لیکن ابن الجزریؒ نے اس میں سے اختلاف کیا ہے۔

اس کے بعد ابن الجزریؒ نے دو مرتبے بیان کئے ہیں۔ ایک قصر سے بھی پہلے کا جسے بَتر کہتے ہیں اور اس سے مراد حرفِ مدّ کو حذف کر دینا اور کلام سے اسے منقطع کر دینا ہے پھر اس نے نقل کیا ہے کہ ابوعمرو الدانیؒ نے بَتر کے قائلوں کی تردید کی ہے، لیکن اس کے بعد اس کی ایک عمدہ تاویل کی ہے اور یہ فیصلہ دیا ہے کہ قصر کے مرتبہ کا ہونا ضروری ہے اور حروفِ مدّ کا حذف کرنا درست نہیں اور دوسرے مرتبے کو پانچویں اور چھٹے مرتبے کے درمیان بیان کیا ہے اور لکھا ہے کہ زیادہ صحیح یہی ہے کہ اس مرتبے کو شمار نہ کیا جائے۔ لہٰذا ان کے کلام کا ماحصل بھی یہی ہوا۔ شیخ کے فرمان کے مطابق ان کے نزدیک بھی مراتب چھ ہی ہیں۔ اس کے بعد ابن الجزریؒ نے شرح وبسط سے بیان کیا ہے کہ ان کا الفوں سے اندازہ لگانا کوئی تحقیقی امر نہیں ہے۔

(مؤلف کتاب کہتا ہے کہ) اگر میں اس کی تفصیل اور دلیل دینے لگ جاؤں تو اصل غرض سے دُور ہٹ جاؤں گا۔

اور اس مسئلہ کو کتبِ اصول سے مدد ملتی ہے چنانچہ ابن حاجبؒ[3] نے کہا ہے کہ مدّ وغیرہ متواتر نہیں ہے جو شخص تواتر اور اس کے شرائط کو جانتا ہو اور یہ بھی جانتا ہو کہ کیا یہ تواتر مراتبِ مدّ میں موجود ہے یا نہیں تو وہ اس مسئلہ کی گہرائی کو سمجھ جائے گا۔

---

[1] ابوالقاسمؒ: ابوالقاسم سے یہاں مراد ابومحمد القاسم بن فیرہ الشاطبی ہیں جنہوں نے قصیدہ شاطبیہ لکھا تھا ان کا ذکر آگے آئے گا۔

[2] ورشؒ: انہوں نے نافعؒ کی قرارت کی روایت کی ہے۔ یعنی نافعؒ کے شاگرد تھے۔

[3] ابن حاجبؒ: ابوعمرو عثمان بن عمر المعروف بابن الحاجب مصر کے شہر اسنا میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد عزالدین موسک الصلاحی کے حاجب تھے اس لیے انہیں ابن الحاجب کہا گیا۔ ان کی بہت سی تصانیف ہیں جن سے کافیہ اور شافیہ زیادہ مشہور ہیں ۶۴۶ھ، ۱۲۴۸ء میں ان کی وفات ہوئی۔

اب ہم اصل مقصد کی طرف لوٹتے ہیں اور کہتے ہیں کہ جو چھ جزو الف کے لیے ہیں، وہ یہ ہیں: کمالِ صورتِ باطنی، سکونِ روح در ذات، سرایتِ حِسّ در ذات، کمالِ حواسِ باطنہ، بغضِ باطل، سکونِ خیر در ذات۔

پھر الف ممدودہ کی دو قسمیں ہیں۔ کبھی تو مدّ ایک ایسے کلمہ میں ہوتی ہے جسے نفسِ متکلّم کہتے ہیں مثلاً اِنَّا، اٰمَنَّا کیونکہ الف ممدودہ ضمیرِ متکلّم میں واقع ہوا ہے۔ دوسرے یہ کہ الف ممدودہ ایسے کلمہ میں واقع ہو جس میں ضمیرِ متکلّم نہ پائی جاتی ہو۔ مثلاً مِنَ السَّمَآءِ مَآءً لہٰذا اگر مدّ ضمیرِ متکلّم میں ہو تو پہلے مرتبہ یعنی قصر کے لیے کمالِ حُسنِ باطنی ہوگی اور دوسرے مرتبہ کے لیے جو دو الفوں کے برابر ہے تو کمالِ حسنِ باطنی کے علاوہ سکونِ روح بھی ہوگا اور تیسرے مرتبہ کے لیے پہلے اور دوسرے مرتبہ کے مقابلہ میں سرایتِ حِسّ کا اور اضافہ ہوگا اور چوتھے مرتبہ کے لیے پہلے تین مرتبوں کے اجزاء کے علاوہ کمالِ حواسِ باطنی ہوگا۔ اسی طرح پانچویں مرتبہ میں بغضِ باطل کا اضافہ ہوگا اور چھٹے مرتبہ میں سکونِ خیر در ذات کا اضافہ ہوگا۔ لہٰذا پہلے مرتبہ میں ایک جزو ہوگا۔ دوسرے میں دو تیسرے میں تین، چوتھے میں چار، پانچویں میں پانچ اور چھٹے میں چھ جزو ہوں گے اور اگر الف ضمیرِ متکلم کے علاوہ کسی اور حرف میں پایا جائے تو پہلے مرتبہ کے لیے کمالِ صورتِ باطنہ دوسرے کے لیے بغضِ باطل کا اضافہ ہوگا اور علیٰ ہٰذا القیاس تیسرے میں سکونِ خیر در ذات کا، چوتھے میں قوتِ ساریہ کا، پانچویں میں کمالِ باطنی حِسّ کا اور چھٹے میں سکونِ رُوح در ذات کا اضافہ ہوگا۔

پہلے مرتبہ میں کمالِ حُسنِ باطنی اور دوسرے میں کمالِ صورتِ باطنی سے ابتدا کرنے کا راز یہ ہے کہ جب الف ضمیرِ متکلّم کا جُزو ٹھہرا تو کمالِ حسنِ باطن کی طرف اشارہ کرے گا اور آدمیّت کمال کا بچھونا ہے اور اسی پر کمال کی تربیت ہوتی ہے لہٰذا جب کلام نفسِ متکلم سے ہوگی تو اس کا بچھونا بھی ذاتی آدمیّت ہوگی اور جب کلام نفسِ متکلم کے سوا کسی اور میں ہو مثلاً سمآء اور مآء تو آدمیت غیر ذاتِ متکلّم ہوگی اور اس بات میں کوئی شک نہیں کہ صورتِ باطنی کے کمال کا مرجع خلقتِ باطنی کو خوبصورت بنانا ہے کیونکہ خلقتِ باطنی سے ہی خوبصورت آواز پیدا ہوتی ہے مثلاً اَلسَّمَآء اور اَلسَّمَآء میں برخلاف کمالِ حسنِ باطنی کے کیونکہ اس کا تعلق قوائے نفس کو خوبصورت بنانے سے ہے۔ واللہ اعلم۔

اب رہے وہ چھ مراتب جو واؤ کے ہیں تو وہ یہ ہیں: عدمِ حیاء، میل بجنس، فتحِ حواسِ ظاہرہ فتحِ حواسِ باطنہ، جسم کا تکلیف دہ اشیاء کا احساس نہ کرنا اور قوتِ شریان۔

اگر واؤ ممدودہ متکلم کے سوا کہیں اور آجائے مثلاً لِيَسُوْءُا وُجُوهَكُمْ تو پہلے مرتبہ میں مقدار ایک واؤ تک ہوتی ہے اس کے لیے عدم حیار ہے۔ دوسرے مرتبے کے لیے جس کی مقدار دو واؤ کی ہوتی ہے، عدمِ حیار اور میل الی الجنس۔ تیسرے کے لیے عدم حیار، میل الی الجنس اور فتح حواسِ ظاہرہ ہے۔ چوتھے میں عدمِ حیار، میل الی الجنس، فتح حواسِ ظاہرہ اور فتح حواس باطنہ، پانچویں کے لیے عدم حیار، میل الی الجنس، فتح حواسِ ظاہرہ، فتح حواسِ باطنہ اور دُکھ دینے والی اشیاء کا محسوس کا نہ کرنا اور چھٹے کے لیے پانچویں مرتبے کے تمام اجزاء کے علاوہ قوتِ سرایت بھی ہے چنانچہ ہر لبعد کے مرتبے میں پہلے مرتبے کے تمام اجزاء مع اضافے کے پائے جاتے ہیں

اور اگر واؤ ضمیر متکلم میں ہو مثلاً قَالُوْا آمَنَّا تو پہلے مرتبہ کے لیے فتح حواسِ باطنی، دوسرے کے لیے یہ اور فتح حواس ظاہری۔ تیسرے کے لیے یہ دونوں اور میلِ بجنس۔ چوتھے کے لیے یہ تینوں اور عدم حیا، پانچویں کے لیے یہ چاروں اور جسم کا دکھ دینے والی اشیاء کا محسوس نہ کرنا اور چھٹے کے لیے یہ پانچوں اور قوتِ سرایت، چنانچہ یہاں بھی ہر مرتبے میں پہلے مرتبے پر ایک جُزو کا اضافہ ہوگا اور اس کی وجہ ظاہر ہے کیونکہ دو واؤں میں ایک واؤ شامل ہے۔ اسی طرح تین واؤں میں دو واؤیں شامل ہیں یہی حال الفوں اور یاؤں کا ہے۔

یؔ کے یہ چھ جزو ہیں: عدم تضیع، تمام جہات کا سامنے کی جہت میں محصور ہونا، انجام کی معرفت انسؔ و جنؔ کے احوال کے متعلق علوم کی معرفت۔ احوالِ کونین کے متعلق علوم کی معرفت، اہل جنت کی سی زندگی۔

پھر اگر یؔ ضمیر متکلم میں ہوگی مثلاً اِنِّیْٓ اُتْقِيْ اِلَیَّ تو پہلے مرتبہ کے لیے احوالِ کونین کے متعلق امُور کی معرفت۔ دوسرے کے لیے یہ اور عدم تضیع، تیسرے کے لیے یہ دونوں اور انجام کی معرفت، چوتھے کے لیے یہ تینوں اور انحصارِ جہات، پانچویں کے لیے یہ چاروں اور احوالِ ثقلین سے متعلق علوم کی معرفت اور چھٹے کے لیے یہ پانچوں کے لیے یہ اہل جنت کی سی زندگی۔

اور اگر یؔ ضمیر متکلم کے سوا کہیں اور ہو مثلاً وَفِیْٓ اَنْفُسِكُمْ تو پہلے مرتبے کے لیے انحصارِ جہات دوسرے کے لیے یہ اور ثقلین کے متعلق علُوم کی معرفت، تیسرے کے لیے یہ اور اہلِ جنّت کی سی زندگی، چوتھے کے لیے یہ اور انجام کی معرفت پانچویں کے لیے یہ تمام اور عدم تضیع اور چھٹے کے لیے یہ تمام اور احوالِ کونین کے متعلق علوم کی معرفت۔

یہ اٹھارہ اجزاء کی اور ان مراتب کی تشریح ہے جو اُن سے متفرّع ہوتے ہیں۔

اب رہے باقی دو جزو جن سے بیس مکمل ہوتے ہیں تو وہ مشاہدۂ حق اور کمالِ رفعت ہیں اور قرآن مجید کا رسم الخط انہی دونوں کے انوار اور عجیب و غریب اسرار کے مطابق آیا ہے چنانچہ وہ حروف جنہیں لکھا تو جاتا ہے، پڑھا نہیں جاتا مثلاً الصّلٰوۃ - الزّکٰوۃ - الرِّبٰو - مِشکٰوۃ - عیسٰی - مَلَائِہٖ - بِاَیْیدٍ میں ی یہ تمام کے تمام واؤ یا ی ان دونوں اسرار میں سے کسی نہ کسی سِرّ کے لیے آئے ہیں لیکن اگر کلمہ کا مدلول امر محسوس اور بظاہر دکھائی دیتا ہوگا۔ جیسے مُوْسٰی - عیسٰی - مَلَائہٖ - منٰوۃ - مشکٰوۃ تو ان میں مشاہدہ کا راز پایا جائے گا، لیکن اگر ان کا مدلول غیر محسوس یا امر معنوی ہوگا، مثلاً ھُدٰی یھُدٰی سَاوُرِیکُمْ - بِاَیْیدٍ تو ان میں مقامِ رفعت کا راز ہوگا۔

اس پر میں نے عرض کیا کہ اس طرح کا رسمُ الخط آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے فرمان سے استعمال کیا گیا یا صحابہ رضی اللہ عنہم نے خود ہی اختیار کر لیا تھا۔ آپ نے فرمایا کہ یہ آنحضرت صلّی اللہ علیہ وسلّم کے حکم سے ہوا تھا۔ آپؐ ہی نے صحابہؓ کو اس طرح لکھنے کا حکم دیا تھا چنانچہ جو کچھ انہوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلّم سے سُنا اس پر نہ اضافہ کیا اور نہ اس سے کم کیا۔

میں نے عرض کیا کہ علماء کی ایک جماعت نے رسمُ الخَط کے معاملہ میں کھُلی اجازت دے رکھی ہے اور وہ کہتے ہیں کہ یہ تو صحابہ رضی اللہ عنہم کی اصطلاح تھی اور اسی رسم الخط میں لکھتے رہے جس میں قریش جاہلیت کے زمانے میں لکھتے تھے یہاں تک کہ فراء نے ربٰو کو واؤ سے لکھنے کے متعلق کہا ہے کہ قریش نے اسے واؤ سے اس لیے لکھا کہ انہوں نے اہلِ حِیرہ سے لکھنا سیکھا تھا اور اہلِ حیرہ ربٰو کو واؤ سے بولتے ہیں، لہٰذا انہوں نے اسی طرح لکھ دیا جس طرح وہ اسے بولتے ہیں، لیکن قریش ربٰو کو الف سے بولتے ہیں لہٰذا ربٰو کو واؤ سے لکھنا اپنی زبان کے مطابق نہ تھا بلکہ دوسروں کی بولی کے مطابق تھا اور اس میں انہی کی تقلید کی گئی تھی یہاں تک کہ قاضی ابوبکر باقلانیؒ نے کتاب الانتصار میں کہا ہے کہ خطوط تو صرف علامات و نشانات ہیں جو اشاروں، عقود[1] اور رموز کے قائم مقام ہوتے ہیں، لہٰذا ہر نشان جو کسی کلمہ پر دلالت کرتا ہو اور اس کی قراءت کی وجہ کے لیے مقیّد ہو اُسے صحیح طور پر لکھنا چاہیئے خواہ وہ کسی صورت میں ہو اب ابوبکر باقلانی

---

[1] عقود سے یہاں مراد عقود انامل ہے عقود انامل عربوں میں حساب کا ایک طریقہ تھا جو انگلیوں اور ان کی گرہوں کے اعتبار سے کیا جاتا۔ جیسا کہ کسی زمانے میں ہندوستان میں بھی کیا جاتا تھا اور بیوپاری بغیر زبانی بات کیے انگلیوں کے ذریعہ سے ہی سودا کر لیتے تھے۔ چنانچہ تشہد میں جب شہادت کی اُنگلی کھڑی کی جاتی ہے تو اسکے متعلق حدیث میں آتا ہے کہ ترپن ۵۳ کا عقد بنایا جائے یعنی انگلیوں کو اس طرح بند اور کھولا جائے کہ عقد انامل کے حساب سے ترپن کا عدد مراد لیا جا سکے۔ ملاحظہ ہو مشکوٰۃ باب تشہد۔

کا کلام اگرچہ لمبا ہے، انہی کے الفاظ میں نقل کرتے ہیں :۔

قرآن مجید میں لحن کے بارے میں ابوبکر باقلانی کی رائے

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے اس قول پر کہ اِنَّ فِی الْمُصْحَفِ لَحْنًا سَتُقِيمُهُ الْعَرَبُ بِاَلْسِنَتِهَا (قرآن میں لحن (غلط اعراب) پایا جاتا ہے جسے عرب لوگ اپنی زبانوں سے ٹھیک کرلیں گے) پر بحث کرتے ہوئے ابوبکر باقلانی لکھتے ہیں۔

"کہ حضرت عثمانؓ کے اس قول کی تاویل کہ اِنَّ الْقُرْاٰنَ اَدٰی فِیْهِ لَحْنًا سَتُقِيمُهُ الْعَرَبُ بِاَلْسِنَتِهَا کی جائز تاویل یہی ہو سکتی ہے کہ اس قول سے مراد وہ حذف یا اختصار یا کسی حرف کا اضافہ ہے جسے کاتب نے دورانِ کتابت میں کر دیا ہو اور یہ کہ اگر کاتب نے اسے مخارج لفظ اور اس کی ظاہری صورت کے مطابق لکھا ہوتا تو زیادہ مناسب اور بہتر ہوتا۔ نیز ان لوگوں کے لیے جنہیں زبان سے بولنے کی عادت نہیں ان سے شبہہ نہ پڑ سکتا اور سَتُقِيمُهُ الْعَرَبُ بِاَلْسِنَتِهَا سے یہ مراد ہے کہ عرب لوگ کتابت کے ظاہری نقش کی پروا نہیں کرتے وہ تو اسے مخرج لفظ اور اس کی صورت کے مطابق پڑھ جاتے ہیں چنانچہ وہ الصَّلٰوۃ۔ اَلزَّکٰوۃ اَلْحَیٰوۃ کو واؤ سے لکھتے ہیں حالانکہ وہ مخرج کے مطابق نہیں ہے اور اسی طرح اسمٰعیل۔ اسحٰق۔ ابراھیم۔ الرَّحمٰن اور مٰلِك ایسے حروف ہیں جن میں مخرج کے خلاف الف حذف کر دیا گیا ہے۔ اسی طرح قَالُوْا۔ خَرَجُوْا اور کَفَرُوْا وغیرہ الفاظ میں الف زیادہ کر دیا گیا ہے حالانکہ اسے بولا نہیں جاتا لہٰذا حضرت عثمانؓ کی یہ رائے تھی کہ ان کلمات کو مخرج کے مطابق لکھنا بہتر اور زیادہ مناسب تھا چنانچہ اگر کوئی ان الفاظ کو کتابت کے مطابق پڑھے گا تو غلطی کرے گا مگر ساتھ ہی حضرت عثمانؓ اور دیگر صحابہؓ کو معلوم تھا کہ عرب ان الفاظ کو اسی طرح نہیں پڑھتے جس طرح کہ انہیں لکھا گیا ہے اسی واسطے فرمایا سَتُقِيمُهُ الْعَرَبُ (عرب انہیں ٹھیک کرلیں گے) اس تاویل کے درست ہونے کی دلیل وہ روایت ہے جسے ابوعبیدہؒ نے حجاج سے اس نے ہارون بن موسیٰؒ سے اس نے زبیر بن حریثؒ سے اس نے عکرمہؒ سے روایت کیا ہے کہ عکرمہؒ نے کہا کہ جب قرآن مجید لکھے جا چکے اور انہیں حضرت عثمانؓ کے سامنے پیش کیا گیا تو انہوں نے اس میں لحن (غلطی) دیکھ کر فرمایا اسے اسی طرح رہنے دو کیونکہ عرب انہیں ٹھیک کرلیں اور اگر کاتب قبیلہ ثقیف سے اور لکھانے والا بنی ہذیل سے ہوتا تو یہ حروف قرآن میں نہ پائے جاتے ان کی مراد اللہ بہتر جانتا ہے یہ صحیح ہے کہ ثقیف کے لوگ حروف تہجی کو خوب سمجھتے تھے اور الفاظ کو مخارج کے مطابق لکھنے پر بہت زور دیتے تھے اور انہیں دوسرے قبائل کے مقابلے میں

اس کا زیادہ علم تھا، لیکن قبیلۂ ہذیل اپنے کلام میں ہمزہ کا استعمال بکثرت کرتے ہیں اور ہمزہ کو واضح طور پر بولتے ہیں اور جب ہمزہ کو لکھانے والا واضح طور پر بولے گا تو کاتب بھی اُسے سنکر مخرج کے مطابق لکھ دے گا اس کے بعد قاری کو اختیار ہو گا خواہ وہ اسے لغتِ قریش کے مطابق تلیین ہمزہ کر کے اسے گرا دے یا ھُذیل کی بولی کے مطابق ہمزہ کو برقرار رکھے۔ اگر حضرت عثمانؓ کے اس قول کی یہی تاویل نہ ہوتی تو ثقیف اور ہذیل کا ذکر کرنا بے معنی ہوتا ہے۔ لہٰذا ثابت ہوا کہ حضرت عثمانؓ کی لحن سے مراد یہی ہے کہ کاتب نے ظاہری الفاظ کا لحاظ نہیں رکھا۔ اب رہی یہ بات کہ آپ نے اسے نہ صرف یہ کہ خود تبدیل نہیں کیا بلکہ اوروں کو بھی تبدیل کرنے سے منع کیا تو اس کی وجہ یہ تھی کہ آپ نے دیکھا کہ یہ رسم الخط عام پھیل چکا ہے اور قرآن مجید کے نسخوں میں اس قدر کثرت سے لکھا جا چکا ہے کہ ان کا تلاش کرنا بڑا مشکل ہے۔ مزید برآں اس صورت میں انہیں ان تمام نسخوں کو باطل قرار دینا پڑتا جو آپ کو پیش کیے گئے تھے اور نئے نسخے لکھوانے پڑتے جس میں بڑی مشقت کا سامنا کرنا پڑتا اور جنہیں لکھنے کے لیے مقرر کیا گیا تھا انہیں بھی مشکل پڑتی کیونکہ وہ ان الفاظ کو اسی صورت میں لکھنے کے عادی تھے یا یہ کہ حضرت عثمانؓ اس بات سے ڈرے کہ اس طرح ان پر نکتہ چینی کرنے سے ان کے دلوں میں نفرت پیدا ہو جائے گی لہٰذا انہوں نے انہیں اسی طرح رہنے دیا کیونکہ انہیں علم تھا کہ عرب الفاظ کو کتابت کے مطابق کبھی نہیں بولتے۔

اگر اس جواب پر یہ اعتراض کیا جائے کہ تم نے تو یہ مان لیا ہے کہ قرآن مجید کے لکھنے میں خطا واقع ہوئی ہے اور اس میں وہ حروف داخل ہو گئے ہیں جن کا داخل ہونا صحیح نہ تھا بلکہ بہتر طریقہ کوئی اور تھا اور یہ بھی تم نے مان لیا ہے کہ تمام قوم نے اسے جائز قرار دیا ہے جس کا یہ مطلب ہے کہ ان کا اجماع ایک غلط بات پر ہوا ہے۔

اس کے جواب میں مَیں یہ کہتا ہوں کہ ہمارے بیان پر آپ کا اعتراض وارد نہیں ہو سکتا کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اُمتِ محمدیہؐ کو قرآن اور اس کے الفاظ کی حفاظت کا حکم دیا ہے کہ وہ اس میں کسی قسم کی کمی یا بیشی نہ کریں اور نہ ہی الفاظ کو آگے پیچھے کریں اور قرآن مجید اسی طرح پڑھیں جس طرح کہ انہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے پڑھ کر سنایا ہے، لیکن کتابت کے متعلق اللہ کا کوئی حکم صادر نہیں ہوا کیونکہ قرآن مجید کے لکھنے والوں اور خطّاطوں کے لیے کوئی ایک قسم کا رسم الخط مقرر نہیں کیا گیا جس سے یہ ظاہر ہو کہ اس قسم کا رسم الخط ضروری ہے اور دوسرے کا ترک واجب ہے۔ کیونکہ اگر ایک معیّن رسم الخط میں قرآن مجید کا لکھنا واجب ہوتا تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے ضرور مروی ہوتا،

لیکن نہ تو نص قرآن اور نہ مفہوم قرآن میں کہیں اس کا ذکر ہے کہ قرآن مجید کو ایک مخصوص طرز میں لکھا جائے یا یہ ایک خاص حد میں لکھا جائے جس سے تجاوز کرنے کی اجازت نہ دی گئی ہو۔ نیز نصِ سنّت میں بھی کوئی ایسی بات نہیں پائی جاتی جس سے قرآنِ مجید کا ایک خاص رسم الخط میں لکھنا واجب قرار دیا جائے یا اس پر دلالت ہی کرسکے اور نہ ہی اجماع میں کوئی بات پائی جاتی ہے جس سے اسے واجب قرار دے سکیں اور نہ قیاسیاتِ شرعیہ میں اس کا کہیں پتہ چلتا ہے۔

بلکہ سنّت میں تو قرآن مجید کا جس طرح بھی آسان ہوسکے، لکھنے کا پتہ چلتا ہے کیونکہ رسول اللہ صلعم قرآن مجید کے لکھنے کا تو حکم فرماتے ہیں، لیکن آپ نے اس کے لکھنے کا کوئی معین طریقہ بیان نہیں فرمایا اور نہ ہی کسی کو لکھنے سے منع فرمایا۔ یہی وجہ تھی کہ قرآن مجید کے رسمُ الخط میں اختلاف پیدا ہوگیا چنانچہ کوئی کاتب مخرج لفظ کے مطابق لکھتا اور کوئی ایک حرف زائد یا کم کردیتا، اس لیے کہ وہ جانتا تھا کہ یہ ایک اصطلاح ہے جس کا لوگوں کو علم ہے اسی وجہ سے خطِّ کوفی اور خطِّ اوّل میں قرآن مجید کا لکھنا جائز تھا اور یہ بھی جائز تھا کہ ل کو ک کی طرح اور الف کو ٹیڑھا لکھا جائے یا کسی اور طرز میں لکھا جائے اور کاتب کو اس کی بھی اجازت تھی کہ وہ قرآن مجید کو قدیم خط یا ہجایں لکھے یا جدید میں۔ اور ان دونوں طرزوں کے بَین بَین لکھنے کی بھی اجازت تھی۔ لہٰذا جب قرآن مجید کے خطوط اور اس کے اکثر حروف میں اختلاف ہے اور لوگوں نے ان کے لکھنے کو جائز قرار دیا ہے اور اس بات کی بھی اجازت دی ہے کہ ہر شخص اپنی عادت کے مطابق جس طرح اسے آسان یا بہتر معلوم ہو لکھے، بغیر اس کے کہ کوئی اسے گناہ قرار دے یا اس سے انکار کرے، تو اس سے معلوم ہوگیا کہ اس بارے میں جس طرح کہ قرآن کے پڑھنے میں حد مقرر کی گئی تھی لوگوں کے لیے کوئی مخصوص حد مقرر نہیں کی گئی تھی اس کی وجہ یہ ہے کہ خطوط تو محض علامات و نقوش ہیں جو اشارات، عقود اور رموز کا کام دیتے ہیں لہٰذا ہر نقش جو کلمہ پر دلالت کرتا ہو اور اس طرزِ قرارت کے لیے مفید بھی ہو اسے درست سمجھنا چاہیئے اور جس طرح بھی کاتب نے لکھا ہو اس پر صاد کرنا چاہیئے۔ مختصر یہ کہ جس کا یہ دعویٰ ہو کہ ایک خاص رسم الخط میں قرآنِ مجید کا لکھنا واجب ہے، اسے اپنے دعوے کی دلیل پیش کرنا چاہیئے، مگر یہ ناممکن ہے یہ قاضی ابوبکر باقلانیؒ کے کلام کا ماحصل ہے۔

حضرت شیخ عبدالعزیز دباغ نے فرمایا کہ رسم قرآن میں صحابہ نے ایک بال بھر بھی تغیر و تبدل نہیں کیا۔ یہ سب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے توفیقی تھا، آپ ہی نے انہیں ایک خاص طرز میں کہیں حروف کو زیادہ کرکے کہیں کم کرکے لکھنے کا حکم خاص اسرار کی وجہ سے دیا تھا جن تک عقل کی

رسائی نہیں ہو سکتی۔ جاہلیت میں نہ عرب اس رسم الخط کو جانتے تھے اور نہ دیگر اُمتیں اپنے مذاہب میں
اس قسم کی بات کو جانتی تھیں اور نہ ہی اُن کی عقل یہاں تک پہنچ سکتی تھی۔ یہ بھی ایک خداوندی راز ہے
جو صرف قرآن مجید کے ساتھ مخصوص ہے چنانچہ یہ طرزِ کتابت نہ تورات میں پایا جاتا ہے نہ انجیل میں اور
نہ کسی اور آسمانی کتاب میں جیسا کہ نظمِ قرآن معجزہ ہے اسی طرح رسمِ قرآن بھی معجزہ ہے۔ عقل کیا جانے
کہ مائۃ میں الف کیوں زائد ہے اور فئۃ میں کیوں نہیں یا یہ کہ اسے اس راز کا کیا پتہ کہ
قرآن مجید کی اس آیت وَالسَّمَآءَ بَنَيْنٰهَا بِاَيْيدٍ میں بِاَيْيدٍ میں ی کیوں زائد لکھی گئی ہے
یا یہ کہ وَالَّذِيْنَ سَعَوْا فِيْٓ اٰيٰتِنَا مُعٰجِزِيْنَ اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ الْجَحِيْمِ (حج ۲۲: ۵۱)
میں سورۂ حج میں سَعَوْا میں الف بڑھانے کا کیا راز ہے اور سبا (آیت ۵) میں وَالَّذِيْنَ
سَعَوْ فِيْٓ اٰيٰتِنَا مُعٰجِزِيْنَ اُولٰٓئِكَ لَهُمْ عَذَابٌ مِّنْ رِّجْزٍ اَلِيْمٌ میں کیوں نہیں
بڑھایا گیا۔ اسی طرح فَعَقَرُوا النَّاقَةَ وَعَتَوْا عَنْ اَمْرِ رَبِّهِمْ میں الف بڑھانے کا کیا راز ہے
اور عتو عُتُوًّا كَبِيْرًا میں کیوں حذف کر دیا گیا اور اَوْ يَعْفُوَا الَّذِيْ بِيَدِهٖ عُقْدَةُ
النِّكَاحِ میں يَعْفُوَا میں الف بڑھانے کا کیا راز ہے اور فَاُولٰٓئِكَ عَسَى اللّٰهُ اَنْ يَّعْفُوَ
عَنْهُمْ میں حذف کرنے کا کیا اور اٰمَنُوْا ۔ عَفَرُوْا ۔ خَرَجُوْا ۔ بَاءُوْ ۔ جَاءُوْ ۔ تَبَوَّءُوْ
میں کیوں گرا دیا گیا یا بیچاری عقل کی رسائی اس راز تک کیسے ہو سکتی ہے کہ ایک جیسے کلمات میں کہیں
الف حذف کر دیا گیا اور کہیں لکھا گیا ہے مثلاً سورۂ یوسف اور الزخرف میں قُرْءٰنًا الف گرا
کر لکھا ہے اور باقی تمام مقامات میں الف سے لکھا گیا ہے اسی طرح سورہ فصلت میں سَمٰوٰت
میں واؤ کے بعد الف لکھا گیا ہے اور باقی مقامات پر اسے حذف کر دیا گیا ہے اور لفظ میعاد میں
ہر جگہ الف قائم رکھا گیا ہے مگر سورۂ انفال میں اسے حذف کیا گیا۔ سراجا میں ہر جگہ الف برقرار
رکھا گیا، لیکن سورۂ الفرقان میں حذف کر دیا گیا اسی طرح بعض جگہ ت کو لمبا لکھا گیا اور کہیں ۃ لکھا
گیا جیسے رَحْمَة ۔ نِعْمَة ۔ قُرَّة ۔ شَجَرَة کیونکہ ان میں ۃ کو بعض جگہ تو ت لکھا گیا اور بعض
جگہ ۃ اسی طرح الصَّلٰوۃ اور الحَیٰوۃ کو کہیں تو واؤ سے لکھا گیا مثلاً اَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَالْحَيٰوةَ
الدُّنْيَا وَعَلٰى حَيٰوةٍ اور بعض جگہ الف سے لکھا گیا مثلاً قُلْ اِنَّ صَلَاتِيْ وَنُسُكِيْ ۔ كُلٌّ
قَدْ عَلِمَ صَلَاتَهٗ وَتَسْبِيْحَهٗ وَلَا تَجْهَرْ بِصَلَاتِكَ وَاَذْهَبْتُمْ طَيِّبٰتِكُمْ
فِيْ حَيَاتِكُمُ الدُّنْيَا وغیرہ اور یہ سب کسی نہ کسی خداوندی راز اور نبوی غرض کے لیے اسی طرح
آتے ہیں لوگوں سے یہ راز اس لیے پوشیدہ ہیں کہ یہ تمام باطنی اسرار میں سے ہے جن کا ادراک فتح

ربانی (خدا کی طرف سے شرح صدر) کے بغیر نہیں ہو سکتا چنانچہ ان کی حیثیت سورتوں کے شروع میں حروف مقطعات کی سی ہے اور ان کے بڑے اسرار اور بہت سے معانی ہیں یہاں تک کہ جن سورتوں کی ابتدا میں یہ حروف آئے ہیں ان کے تمام معانی اور اسرار ان حروف میں پائے جاتے ہیں چنانچہ جو کچھ بھی معانی و اسرار سورہ صٓ میں ہیں وہ سب حروف صٓ میں پائے جاتے ہیں۔ اسی طرح جو کچھ سورۂ قٓ، سورۂ نٓ، سورۂ یٰسٓ، سورۂ طٰہٰ وغیرہ میں ہے وہ ان رموز میں مشتمل ہے۔ اکثر لوگ ان کے اسرار کو نہیں سمجھ سکتے اور نہ ہی جن معانی کی طرف اشارہ کیا گیا انہیں دریافت کر سکتے ہیں حتیٰ کہ بعض نے خیال کر لیا کہ یہ سورتوں کے نام ہیں اور دوسروں نے یہ خیال کیا کہ ان کا شمار معلوم تعداد کی طرف ہے۔ ایک اور جماعت نے خیال کیا کہ یہ مہمل حروف ہیں جن کے کوئی معنی نہیں حالانکہ ان سب کو ان کے عجیب و غریب اور واضح معانی کی خبر ہی نہیں ہے یہی حال قرآن مجید کے ایک ایک حرف کی کتابت کا ہے۔

یہ کہنا کہ صحابہؓ نے اس طرز پر لکھنے کی اصطلاح بنالی تھی تو اس سے کئی قباحتیں پیدا ہوں گی۔ اس لیے کہ قرآن مجید آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد میں اور ان کے سامنے ایک طرز میں لکھا گیا۔ لہٰذا صحابہ کا طرز تحریر یا تو وہی ہوگا جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا بتلایا ہوا تھا یا کوئی اور تھا اگر وہی طرز تھا اسے صحابہ کی اصطلاح کہنا درست نہیں کیونکہ اصطلاح ایجاد و اختراع کی جاتی ہے اور اس کا توقیفی ہونا اختراع کے منافی ہے اور اس کی اتباع کرنا ضروری ہے اگر اس کے باوجود بھی یہ کہا جائے کہ وہ اصطلاح کے پیچھے چلتے تھے تو اس کی مثال یہ ہوگی جیسے کوئی کہے کہ صحابہؓ نے پانچ نمازوں کی اصطلاح گھڑلی ہے یا یہ کہ مثلاً رکعات کی تعداد چار ہے اور اگر صحابہ کا طرز تحریر آنحضرتؐ کے لکھائے ہوئے طرز سے مختلف تھا تو یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ آنحضرتؐ نے تو قرآن کو ایک طرز پر لکھوایا ہو اور صحابہ نے اس کی مخالفت کر کے کسی اور ہیئت پر لکھ لیا ہو اور یہ دو وجہ سے درست نہیں ہو سکتا (۱) اس میں صحابہ کی طرف جو امت کے لیے مشعلِ ہدایت ہیں آنحضرت کی مخالفت منسوب کی گئی ہے اور یہ ناممکن ہے۔

(۲) صحابہ و غیرہم تمام امت کا اس بات پر اتفاق ہے کہ قرآن مجید میں ایک حرف کی بھی کمی یا بیشی کرنا جائز نہیں اور کتابت بھی چار وجودوں میں سے ایک وجود ہے اور ابتدا سے انتہا تک تمام کا تمام اللہ کا کلام ہے۔

لہٰذا اگر نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک ہیئت پر لکھا ہو مثلاً اَلرَّحْمٰن اور اَلْعٰلَمِیْنَ میں الف لکھا ہو اور مائۃ، کَفَرُوْا، خَرَجُوْا میں الف زیادہ نہ کیا ہو اور نہ بِاَیْیدٍ اور اَفَاِیْن مِتَّ میں ی وغیرہ جن کا ذکر اوپر کیا گیا ہے۔ نیز وہ مقامات جن میں زیادتی تو پائی جاتی ہے

لیکن ہم نے اوپر ذکر نہیں اور پھر بعد میں صحابہ رضی اللہ عنہم نے اس کے برخلاف کیا ہو اور آنحضرت کی ہیئتِ کتابت کی مخالفت کی ہو تو اس سے یہ لازم آتا ہے کہ نعوذ باللہ صحابہ نے قرآن مجید میں کمی یا بیشی کر کے اس میں تصرف کیا ہے اور وہ ایسے فعل کے مرتکب ہوئے ہیں کہ جس کے عدم جواز پر سب کا اتفاق ہے اور تمام قرآن مجید میں اس طرح لازمی طور پر شک پیدا ہو جاتا ہے کیونکہ جب ہم نے قرآن میں ان حروف کے اضافہ کی اجازت دے دی جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو نہ معلوم تھے اور نہ ہی اس قرآن میں پائے جاتے تھے جو آپ کے پاس تھا اور وہ حروف نہ وحی میں سے تھے نہ اللہ کی طرف سے، تو اس سے تمام قرآن کے متعلق شک و شبہ پیدا ہو جاتا ہے اور اگر ہم ایک صحابی کے لیے اس بات کو جائز قرار دیتے ہیں کہ وہ قرآن مجید کی کتابت میں ایک ایسا حرف زائد کر دے جو وحی میں سے نہیں ہے تو پھر ایک دوسرے صحابی کو بھی اجازت دینی پڑے گی کیونکہ وحی میں کمی یا بیشی دونوں ایک سی باتیں ہیں (یعنی دونوں ناجائز ہیں) اور اس طرح تو اسلام کا تمام شیرازہ ہی بکھر جائے گا، ہاں اگر صحابہ نے قرآن مجید کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد لکھا ہوتا تو اسے ہم صحابہ کی اصطلاح کہہ سکتے تھے، لیکن جب حقیقتِ امر یہ نہیں ہے تو ثابت ہوا کہ قرآن مجید کا رسم الخط توقیفی ہے اصطلاحی نہیں ہے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ہی خود قرآن مجید کو اس طرح لکھنے کا حکم دیا تھا۔

میں نے عرض کیا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم تو لکھنا نہیں جانتے تھے اور آپ کی تعریف میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: وَمَا كُنْتَ تَتْلُوا مِنْ قَبْلِهٖ مِنْ كِتٰبٍ وَّلَا تَخُطُّهٗ بِيَمِيْنِكَ اِذًا لَّارْتَابَ الْمُبْطِلُوْنَ (سورہ عنکبوت: آیت ۴۸) اے نبی (صلی اللہ علیہ وسلم) نزولِ قرآن سے پہلے نہ تو آپ کوئی کتاب پڑھ سکتے تھے اور نہ ہاتھ سے لکھ سکتے تھے (اگر ایسا ہوتا) تو اہلِ باطل کو قرآن مجید کے مُنَزَّل مِنَ اللہ ہونے پر شک ہو سکتا تھا۔

نزولِ وحی کے بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم معجزہ کے طور پر لکھنا پڑھنا جانتے تھے

حضرت نے فرمایا کہ یہ صحیح ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اصطلاحی معنوں میں کتابت نہ جانتے تھے اور نہ ہی آپ

ف کچھ محدثین اس طرف گئے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو امی ہونے کے بعد معجزہ کے طور پر لکھنا اور پڑھنا آگیا تھا چنانچہ ابو الولید باجی نے اس پر ایک رسالہ لکھا ہے (خفاجی نسیم الریاض: ۱: ۱) نیز ملاحظہ ہو خفاجی ۲: ۲۲۷) حافظ شمس الدین ابو عبداللہ الذہبی متوفیٰ ۷۴۸ھ ابن سندہ کی سند سے عبداللہ بن عتبہ کا یہ

(بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر)

نے لوگوں سے لکھنا یا پڑھنا سیکھا تھا لیکن فتح ربانی کے طور پر آپ لکھنا اور پڑھنا جانتے تھے بلکہ اس سے بھی زیادہ جانتے تھے۔ ایسا کیوں نہ ہو جب کہ آپ کی اُمّت کے اولیاء جنہیں اللہ تعالیٰ نے فتح (شرح صدر) عطا کی ہے وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے طفیل آدم علیہ السلام سے لے کر آج تک کی تمام اُمتوں اور قوموں کے خطوط اور ان کے رسم الخط جانتے ہیں، تو یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو ان کا علم نہ ہو۔

حضرت نے فرمایا جسے اللہ تعالیٰ نے فتح (شرح صدر) عطا فرمائی ہو اور وہ قرآن مجید کی تختیوں کے حروف کی شکلیں دیکھے اور اس کے بعد لوحِ محفوظ میں لکھے ہوئے الفاظ کی شکل دیکھے تو اسے دونوں کے درمیان مشابہت دکھائی دے گی اور وہ اپنی آنکھوں سے دیکھ لے گا کہ لوحِ محفوظ میں کَفَرُوْا آمَنُوْا وغیرہ الفاظ میں جن کا ذکر ہو چکا ہے الف زائد موجود ہے اور اسے یہ بھی معلوم ہو جائے گا کہ ان میں خاص راز پایا جاتا ہے جو لوگوں کی عقلوں سے بالا ہے۔

(مؤلّف کتاب احمد بن مبارک کہتا ہے کہ) میں نے حضرت سے باوجود اُن کے اُمّی ہونے کے کَفَرُوْا مِائَۃ وغیرہ تمام الفاظ کے اسرار سُنے اور میں نے ان کا مقابلہ ان تحریروں سے کیا جو آئمہ رسم نے اپنی تصانیف میں کی ہیں تو حضرت کے فرمان کو صحیح پایا۔ شاید اللہ تعالیٰ اپنے کرم سے مجھے توفیق دے کہ میں اس کے متعلق ایک مستقل کتاب تصنیف کروں تاکہ ہماری عقلیں آئمہ رسم کے اقوال پر ہی قانع نہ ہو جائیں تاہم آئمہ رسم نے جو کچھ لکھا ہے اس میں بہت ہی تھوڑے الفاظ کی توجیہ بیان کی گئی ہے ہمیں رسم قرآن اور اسے صحابہ کی طرف منسوب کرنے میں کئی اشکال پیش آئے مگر حضرت نے تشریح کر کے ان اشکال کو دُور کر دیا خدا آپ کو ہماری طرف سے بہترین جزا دے۔

اس کے باوجود کہ مجھے معلوم تھا کہ آپ جواب دینے سے قاصر نہیں ہیں اور باوجود اس کے کہ آپ کو قرآن مجید کا ایک حزب بھی یاد نہیں میں نے بطور امتحان کے آپ سے سوال کیا کہ بِاَیْیدٍ میں

(بقیہ حاشیہ صفحہ سابق) اثر نقل کرتے ہیں مَا مَاتَ النَّبِیُّ صلی اللہ علیہ وسلم حتّٰی قَرَاءَ وکَتَبَ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو وفات سے پہلے پڑھنا اور لکھنا آ گیا تھا۔ پھر کہتے ہیں کہ یہ عبداللہ بن عتبہ وہی صحابی ہیں جن کے لیے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے دعا کی تھی (تذکرۃ الحفاظ: ۲: ۲۷۷) خفاجی کہتے ہیں کہ ابوذر، ابوالفتح نیساپوری اور ابوالولید باجی کی یہی رائے ہے چنانچہ انھوں نے اس بارے میں ایک کتاب بھی لکھی ہے۔ ان سے پہلے ابن ابی شیبہ بھی یہی کہہ چکے ہیں۔ ابو محمد بن معوذ نے باجی کے ردّ میں کتاب لکھی ہے۔

(خفاجی: ۱: ۱۱۷)

کونسی ی زائد ہے پہلی یا دوسری ۔ فرمایا دوسری ۔ میں نے آپ کو شک میں ڈالا مگر آپ نے یقین سے فرمایا کہ دوسری ی زائد ہے ابو عبداللہ الخراز[۱] نے یہی لکھا ہے کہ بِاَیْیٖدٍ کی دوسری ی ایید اور الایید میں فرق کرنے کے لیے زائد لکھی گئی ہے ۔

پھر میں نے مَلَاْئِہٖ کے الف زائد کے متعلق سوال کیا کہ یہ کونسا ہے کیا وہ الف جو لام سے ملا ہوا ہے یا ہمزہ جو بصورت ی مکتوب ہے ۔ فرمایا الف زائد ہے اسی قسم کے اور سوالات میں نے کئے اور ان کے اسرار دریافت کئے ۔ آپ نے صحیح جواب دیے جس طرح کہ ایک ماہر حافظِ قرآن دیتا ہے ۔

پھر میں نے عرض کیا کہ یہ جو آپ نے فرمایا ہے کہ رسم قرآن توقیفی ہے اس پر مخالف کہہ سکتا ہے کہ مان لیا کہ یہ رسم توقیفی ہے، لیکن قرآن مجید کو قیاسی رسم کے مطابق لکھنا کیوں کرنا جائز ہوا تاکہ جہاں قیاس الف کو لکھنے کا مقتضی ہے وہاں الف لکھا جائے اور جہاں زوائد کو حذف کرنا ہے وہاں انہیں حذف کیا جائے اور اس طرح کرنے میں حرج ہی کیا ہے ؟

حضرت نے فرمایا اللہ کے کلام میں اسرار پائے جاتے ہیں اور ان اسرار میں کتابت کا بھی دخل ہے لہٰذا جو شخص قرآن مجید کو اسی توقیفی (یعنی نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے بتلائے ہوئے) طرز پر لکھے گا وہی اسے ٹھیک مع تمام اسرار کے ادا کر سکے گا مگر جو قیاسی طرز پر لکھے گا تو وہ اس کے اسرار کو کم کر دے گا اور جو کچھ وہ لکھیگا وہ خدا کے اتارے ہوئے کلمات نہ ہوں گے ۔ پھر آپ نے مثال دیکر سمجھایا کہ فرض کر لیا جائے کہ ایک شخص لفظ کَانَ کہ جو افعال ناقصہ میں سے ہے الف کو الٹا کر واوٗ کے ساتھ کون کی شکل میں لکھتا ہے اور اس میں اس نے کوئی راز رکھا ہو جس کی کسی کو خبر ہو اور کسی کو نہ ہو ۔ اس کے بعد ایک ایسا شخص آتا ہے جسے اس راز کا علم نہیں ہے اور وہ کہتا ہے کہ کَانَ کو کوٰن لکھنے سے معنیٰ میں کوئی فرق نہیں پڑتا اس لیے میں تو اسے الف کے ساتھ کَانَ ہی لکھوں گا کیونکہ معنی تو دونوں کے ایک ہی ہیں اور اصل کتابت بھی الف ہی کے ساتھ ہے، لیکن جو اس راز سے واقف ہو گا وہ کہے گا کہ تو نے اس کا راز ناقص کر دیا کیونکہ تو نے کوئی اور کَانَ لکھا ہے وہ کَانَ نہیں لکھا جو اصل لکھنے والے کو مقصود تھا کیونکہ اس نے تو واوٗ کے ساتھ کوٰن کی شکل میں لکھا تھا اور واوٗ کے اوپر الف لکھا تھا تاکہ یہ لفظ وجود، ایجاد دونوں مفہوم ادا کرے، یوں سمجھو کہ کوٰن لکھنے میں اس نے کَانَ وکَوَّنَ دونوں لفظ لکھ دیے ہیں جس کے معنی کَانَ زَیْدٌ وَکَوَّنَہُ اللّٰہُ عَزَّوَجَلَّ زید کا وجود تھا

---

[۱] ابو عبداللہ الخر : ابو محمد الخراز ۔ ری کے بڑے مشائخ میں سے تھے بڑے متقی اور پرہیزگار تھے ان کی وفات سنہ ۲ ؟ سنہ ۹۲۰ء سے پہلے ہوئی ۔

اور یہ وجود اسے اللہ نے بخشا ہے ایسی حال اس شخص کا ہے جو الصّلوٰۃ ، الزّکوٰۃ اور الحیوٰۃ کو بغیر واؤ کے الصّلاۃ ، الزکاۃ اور الحیاۃ کی شکل میں لکھے کیونکہ اس طرح لکھنے سے وہ شخص ان کے اسرار کو ناقص کر رہا ہے۔

قرآن کا رسم الخط توقیفی ہے

میں نے عرض کیا کہ اگر یہ رسم الخط توقیفی ہے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر بطور وحی کے نازل ہوا ہے اور اس کی حیثیت الفاظ قرآن کی سی ہے تو پھر قرآن کی طرح اسے بھی بطریق تواتر منقول ہونا چاہیئے تھا تاکہ الفاظ قرآن کی طرح اس میں بھی کوئی شک و شبہ باقی نہ رہتا اور دلوں کو اطمینان ہوتا کیونکہ قرآن مجید کا ایک ایک حرف بطریق تواتر منقول ہے اور اس میں کسی قسم کا اختلاف وغیرہ نہیں ہے برعکس اس کے رسم قرآن جیسا کہ اس موضوع پر لکھی ہوئی کتابوں سے پتہ چلتا ہے خبرِ واحد کے ذریعہ سے منقول ہے یہی وجہ ہے کہ اس کے نقل کرنے والوں میں کئی ایک جگہ اختلاف پیدا ہو گیا ہے ورنہ کیسے ہو سکتا ہے کہ امتِ محمدیہ وحی الہیٰ کا ذرا سا حصہ بھی ضائع کر دے ؟

حضرت نے فرمایا کہ اُمت نے وحی کو بال برابر بھی ضائع نہیں کیا اور قرآنِ بحمد اللہ بلحاظ الفاظ اور بلحاظ رسم الخط ہر طرح سے محفوظ ہے کیونکہ اہلِ عرفان نے جنہیں مشاہدۂ حق حاصل ہے قرآن مجید کے الفاظ اور رسم الخط دونوں کو محفوظ رکھا اور اس میں بال برابر بھی فرق نہ آنے دیا۔ یہ بات انہیں معاینہ و مشاہدہ سے حاصل ہوئی ہے جو تواتر سے کہیں بڑھ چڑھ کر ہے اور دونوں نے ان الفاظ کو محفوظ رکھا جو بطریق تواتر ان کے پاس پہنچے۔ رہا بعض الفاظ میں رسم الخط کا اختلاف تو اس سے کوئی خلل پیدا نہیں ہوتا اور نہ اُمت کو ضائع کنندہ کہا جا سکتا ہے، بعینہٖ اسی طرح جس طرح عوام کی الفاظِ قرآن سے جہالت اور ان کا یاد نہ ہونا وحی و قرآن کے لیے مضر نہیں۔

میں کہتا ہوں کہ شیخ نے جو کچھ فرمایا ہے نہایت عمدہ اور معرفت کا کلام ہے آپ کے کلام ہی سے بہت سے اسرار و انوار باقی رہ گئے ہیں جنہیں ہم نے طوالت کے خوف سے درج نہیں کیا۔

حدیث اِنَّ فِی الْقُرْاٰنِ لَحْنًا سَتُقِیْمُہُ الْعَرَبُ بِاَلْسِنَتِہَا

یہ حدیث حضرت عثمانؓ سے منقول ہے کہ آپ نے فرمایا اِنَّ فِی الْقُرْاٰنِ لَحْنًا سَتُقِیْمُہُ الْعَرَبُ بِاَلْسِنَتِہَا سو یہ تو حدیث مرسل ہے اور مرسل ہونے کے علاوہ اس کے اسناد میں اضطراب پایا جاتا ہے جس کی وجہ سے بعض رجالِ اسناد کا پتہ نہیں چلتا اور قاضی ابوبکر باقلانی نے خود مذکورہ بالا کتاب میں اس کا ردّ کیا ہے اور اسی طرح اہلِ علم کی ایک جماعت نے بھی اس کا ردّ کیا

ہے ابو عمر الدانی[1] رحمۃ اللہ نے اَلْمُقنِع میں جس کا موضوع قرآن مجید کا رسم الخط ہے چنانچہ وہ المقنع کے آخر میں لکھتے ہیں اگر کوئی یہ سوال کرے کہ تمہارے پاس اس حدیث کا جواب جسے تم نے یحییٰ بن یعمر[2] اور ابن عباس[3] کے غلام عکرمہ[4] کی سند سے حضرت عثمانؓ سے روایت کیا کہ جب قرآن مجید لکھے جا چکے اور انہیں حضرت عثمانؓ کے روبرو پیش کیا گیا تو آپ نے ان میں غلط تحریر شدہ الفاظ پائے۔ اس پر حضرت عثمانؓ نے فرمایا انہیں اسی طرح رہنے دو کیونکہ عرب انہیں ٹھیک کر لیں گے یا یہ فرمایا کہ عرب اپنی زبان کے ذریعہ سے معلوم کر لیں گے۔ اس روایت کے ظاہری الفاظ سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ رسمِ خط میں اغلاط رہ گئے تھے اس کا جواب یہ ہے کہ یہ روایت بھی ہمارے نزدیک قابلِ حجت نہیں اور اس سے استدلال کرنا بھی دو طرح سے درست نہیں ہے۔

۱۔ اس کے اسناد میں تخلیط اور الفاظ میں اضطراب پائے جانے کے علاوہ یہ حدیث مُرسل ہے کیونکہ ابن یعمر اور عکرمہ دونوں نے نہ تو حضرت عثمانؓ کو دیکھا اور نہ ان سے کوئی حدیث سنی (لہٰذا حضرت عثمان سے روایت کیسی؟) مزید برآں اس روایت کے الفاظ خود اس بات کی نفی کرتے ہیں کہ یہ الفاظ حضرت عثمانؓ کی زبان سے نہیں نکلے ہوں گے کیونکہ اس میں حضرت عثمانؓ پر طعن پایا جاتا ہے باوجود اس کے کہ ان کا دینِ اسلام میں بڑا مرتبہ ہے اور باوجود اس کے کہ وہ اُمّت کی خیر خواہی میں سخت کوشاں رہتے اور امت کی اصلاح کے لیے بڑا اہتمام کرتے۔ لہٰذا یہ ناممکن ہے کہ وہ نیک اور پرہیز گار صحابہ کے

---

[1] ابو عمر الدانی: شیخ الاسلام حافظ ابو عمر عثمان بن سعید قرطبی۔ دانی کے نام سے اس لیے مشہور ہو گئے کہ انھوں نے دانیہ میں سکونت اختیار کر لی تھی۔ ۳۷۱ھ ؍ ۹۸۱ء میں پیدا ہوئے علم قراءت تفسیر وغیرہ کے اماموں میں سے تھے ان کی ایک سو بیس تصانیف ہیں ۴۴۴ھ ؍ ۱۰۵۲ء میں ان کی وفات ہوئی۔

[2] یحییٰ بن یعمر: قاضی یحییٰ بن یعمر ابو سلیمان، مرو کے قاضی تھے۔ انہوں نے ابوہریرہ ابن عباس وغیرہ سے روایت کی ہے کہا جاتا ہے کہ یہ پہلے شخص ہیں جنہوں نے قرآن مجید پر نقطے لگائے۔ عربی زبان کے فصیح و بلیغ فقہا میں سے تھے وفات ۹۰ھ سے پہلے ہوئی۔

[3] ابن عباس: حضرت عبداللہ بن عباس آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے چچازاد بھائی تھے ان کی پیدائش ہجرت سے تین سال پہلے ہوئی انہیں خیر الامت کہا جاتا ہے بلا کا حافظہ تھا۔ حضرت عمرؓ ان سے مشورہ لیا کرتے تھے۔ آخر عمر میں ان کی بینائی جاتی رہی تھی، اکہتر برس کی عمر میں ابنِ زُبیر کے عہد میں ۶۸ھ ؍ ۶۸۷ء میں وفات پائی۔

[4] عکرمہ: یہ حضرت ابن عباس کے آزاد کردہ غلام تھے دراصل بربر میں سے تھے تابعی اور مکہ کے فقیہ تھے، اسی برس کی عمر میں ۱۰۷ھ ؍ ۷۲۵ء میں انھوں نے وفات پائی۔

ساتھ مل کر قرآن کو جمع کرنے کا کام تو اپنے ذمہ لیں تاکہ اُمت میں بھی قرآنِ مجید کے بارے میں اختلاف نہ ہو اور پھر اس میں لحن اور اغلاط چھوڑ دیں تاکہ بعد میں آنے والے لوگ جو بلا شک و شبہ حضرت عثمانؓ کے مرتبہ تک نہیں پہنچ سکتے ان اغلاط کو درست کریں۔ اور یہ بات کہنا یا یہ اعتقاد رکھنا کسی طرح بھی درست نہیں۔ اس کے بعد اس نے اپنی سند سے یحییٰ بن یعمر اور عکرمہ کا طریق سند نقل کیا ہے جو انہیں دیکھنا چاہیئے اس کی کتاب میں دیکھ لے۔ نیز ملاحظہ ہو وہ بحث جو الانتصار میں کی گئی ہے کیونکہ اس میں زیادہ بسط سے ردّ کیا گیا ہے۔

نیز ابو القاسم الشاطبیؒ[1] نے العقیلہ میں کہا ہے:

وَمَنْ رَوٰی سَتُقِیمُ الْعُرْبُ اَلْسُنَہَا لَحْنًا بِہٖ قَوْلُ عُثْمَانٍ نَمَا شَہَرَا

(حضرت عثمانؓ سے ستقیم العرب الخ کی روایت ایک غیر معروف روایت ہے) الجعبریؒ[2] نے اس شعر کی شرح میں حدیث نقل کرنے کے بعد کہا ہے کہ مصنف نے اس کا وہی جواب دیا ہے جو جواب المقنع میں دیا گیا ہے کہ یہ روایت صحیح نہیں ہے اس لیے کہ اس کی سند مضطرب اور منقطع ہے میں کہتا ہوں کہ اس روایت کے تو الفاظ بھی مضطرب ہیں کیونکہ آپ کا کہنا اَحْسَنْتُمْ وَاَجْمَلْتُمْ اَرٰی فِیْہِ شَیْئًا مِنْ لَحْنٍ الخ (تم نے بہت اچھا کیا مجھے اس میں کچھ لحن دکھائی دیتی ہے) مدح ہے اور حضرت عثمانؓ برے کام پر کیسے ان کی تعریف کر سکتے ہیں؟ نیز یہ کہ ان کا مطلب یہ تھا کہ صحابہ آپ کی طرف رجوع کریں اور اگر حضرت عثمانؓ کی صحت کا دار و مدار صحابہ پر ہوتا اور ان کی صحت کا اُن پر تو اس سے دور لازم آتا ہے جو محال ہے۔ نیز اگر مُصحف سے مراد جنس مصحف ہے تو پھر سارا معاملہ ہی بگڑ جاتا ہے

---

[1] ابو القاسم شاطبی: صحیح نام ابو محمد قاسم بن فیرہ بن ابو القاسم خلف بن احمد الشاطبی متوفی ۵۹۰ھ انہوں نے عمر الدانی کی کتاب المقنع کو نظم کر دیا تھا جس کا نام عقیلۃ اتراب القصائد فی اسنی المقاصد رکھا تھا پھر اس قصیدہ کی شرح جعبری نے کی۔ شاطبی نے علم قرارت میں ایک قصیدہ ایک ہزار ایک سو تہتر شعروں میں لکھا تھا جس کا نام حرز الامانی ووجہ التہانی ہے۔ ابن خلکان (ج ۳: ۲۳۴) نے اس قصیدہ کی بہت تعریف کی ہے۔ شاطبی نابینا تھے۔ انھوں نے ایک اور دالیہ قصیدہ لکھا جس میں ابن عبد البر کی کتاب التمہید کو نظم کر دیا، ان کی ولادت ۵۳۸ھ میں ہوئی (مزید حالات کے لیے ملاحظہ ہو ابن خلکان ج ۳ ص ۲۳۴)

[2] الجعبری: برہان الدین ابراہیم بن عمر الجعبری۔ متوفی ۷۳۳ھ ۱۳۳۲ء جنہوں نے شاطبی کے عقیلہ کی شرح کی اور اس کا نام جمیلہ ارباب المواصد رکھا۔ عقیلہ کی ایک اور شرح الوسیلہ الی کشف العقیلہ ہے جسے علم الدین علی بن محمد بن عبد الصمد السخاوی المتوفی ۶۴۳ھ ۱۲۴۵ء نے لکھا۔

اور اگر مراد ایک خاص مصحف ہے تو اس میں ہمیں کوئی بھی لحن کا اختلاف دکھائی نہیں دیتا۔ لہٰذا معلوم ہوگیا کہ قرآن کے کسی ایک نسخے میں بھی کسی قسم کا لحن نہ تھا۔ کتابت اور فصاحت نے قریش میں نشوونما پائی، دیگر قبائل تو ان کی فرع شمار ہوتے ہیں۔ پس ہم فرع کو اصل کیسے قرار دے سکتے ہیں؟ لہٰذا دیگر قبائل کو اصل قرار دینا خلافِ حقیقت ہے یہاں پر الجعبری رحمۃ اللہ کا قول ختم ہوتا ہے اور اگر یہ حدیث بھی درحقیقت مردود ہو تو پھر معاملہ آسان ہے۔

خدا ابوالحسن القالبسیؒ رحمۃ اللہ تعالیٰ کو جزائے خیر دے کیونکہ انھوں نے استاذ ابوبکر بن فورکؒ رحمۃ اللہ پر اعتراض کیا ہے کہ انھوں نے مشکل احادیث کا جواب دینے کا ذمہ لیا، حالانکہ یہ احادیث ہی باطل تھیں۔ قالبسی فرماتے ہیں کہ کسی حدیث کے اشکال کا جواب دینے کی ضرورت صرف اس وقت پڑتی ہے جب کہ حدیث صحیح ہو۔ باطل حدیث کے جواب میں اس کا باطل ہونا ہی کافی ہوتا ہے۔

قاضی ابوبکر بن فورک رحمۃ اللہ کا یہ کہنا کہ نہ کتاب اللہ نہ سنتِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نہ اجماع نہ قیاس میں کوئی بات ایسی پائی جاتی ہے جس سے رسم قرآن کا اتباع واجب قرار دیا جاسکے تو اس کا جواب پہلے گذر چکا ہے۔ کیونکہ انہوں نے رسم قرآن کو اصطلاحِ صحابہ سمجھ کر یہ بات کہی ہے لیکن ہم نے جب رسم قرآن کو توقیفی قرار دیا تو اس کا اتباع بھی واجب ہوا۔ اس کے اتباع کی قرآنی دلیل تو یہ آیت ہے وَمَا آتَاكُمُ الرَّسُولُ فَخُذُوهُ وَمَا نَهَاكُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوا (سورۂ حشر آیت ۷) (رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جس کام کے کرنے کا حکم دیں اس پر عمل کرو۔ (یا جو کچھ بھی وہ دیں، لے لو) اور جس سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم روکیں، اس سے رُک جاؤ) جب کوئی دوسرا رسم الخط پورے طور پر شارع کے مفہوم کو ادا نہیں کرسکتا اس لیے ضروری ہوگیا کہ قرآن مجید کو اسی ہیئت میں لکھا جاتے جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بتلائی اور اسی ہیئت کا اتباع واجب ہوگیا اور مذکورہ بالا آیت میں فَخُذُوهُ کا فعل امر اس مسئلہ میں وجوب کے لیے ہوگا کیونکہ توقیفی رسم الخط کی طرح کوئی اور رسم الخط پورے معنی ادا نہیں کرتا، سنت میں ہے

ابوالحسن قالبسی: ابوالحسن علی بن محمد بن خلف ۳۲۴ھ ۹۳۵ء میں پیدا ہوئے، حدیث اور علل حدیث کے واقف وحافظ تھے، نابینا ہونے کے باوجود ان کی کتابیں نہایت صحیح ہوتی تھیں، ان کی ایک صحیح کتاب ہے، انہوں نے بہت سی تصانیف کیں مثلاً الممھد، المنقذ، المنبہ وغیرہ، ان کی وفات ۴۰۳ھ ۱۰۱۲ء میں ہوئی۔

استاذ ابوبکر بن فورک: امام ابوبکر محمد بن الحسن نیشاپوری شافعی متوفی ۴۰۶ھ ۱۰۱۵ء ثعلبی کہتے ہیں کہ انھوں نے قرآن مجید کی تفسیر حافظے سے لکھائی یہ پہلے عراق میں درس دیتے رہے پھر نیشاپور چلے گئے اور وہاں ایک مدرسہ قائم کیا انہیں زہر دیکر مار ڈالا گیا۔

اس کی دلیل آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا عمل ہے اور آپ کا فرمان ہے جو صحابہ کے لیے امر کے معنی رکھتا ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے تو انہیں ایک خاص ہیئت میں لکھنے کا حکم دیا تھا۔

اگر کوئی شخص یہ کہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے تو اس طرز میں لکھنے کا حکم نہیں دیا تو ہم کہیں گے چلیئے اگر آپ یہ نہیں مانتے کہ آنحضرتؐ نے اس طرز میں لکھنے کا حکم دیا تھا تو اس میں تو آپ کو کوئی اعتراض نہیں ہونا چاہیئے کہ آپ کے سامنے اس طرح لکھا گیا اور آپ نے اسے برقرار رکھا اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا کسی ایسی بات کو برقرار رکھنا جس کی جگہ کسی اور کو نہ رکھ سکیں۔ اس کے واجب ہونے کی دلیل ہے اور وہ بات لازم ہو جاتی ہے۔ مزید برآں امام مالک اور احمد بن حنبل اور دیگر آئمۂ اجتہاد کے صریح فرمان اسی بات کی تائید کرتے ہیں کہ قرآن مجید کے رسم الخط میں تغیر جائز نہیں۔

حافظ ابو عمرو الدانی نے المقنع میں لکھا ہے حَدَّثَنَا ابو مُحَمَّدٍ عَبْدُ الْمَلِكِ بن الْحَسَنِ ان عبد العزیز بن علی حَدَّثَهُمْ قَالَ حَدَّثَنَا المقدامُ بن تلید قال حَدَّثَنَا عبد الله بن عبد الحکیم قَالَ قَالَ اَشْهَبُ سُئِلَ مَالِكٌ رحمة الله تعالیٰ فقیل لَهُ أَرَأَيْتَ من اسْتَكْتَبَ مُصْحَفًا الیوم أَتَرَى اَنْ يَكْتُبَ عَلَى مَا اَحْدَثَ النَّاسُ مِنَ الْهِجَاءِ الیوم فقال لا اَرَى ذلك وَلٰكِنْ يُكْتَبُ على الكتابة الْاُوْلٰى (امام مالکؒ سے پوچھا گیا کہ قرآن مجید کی کتابت اگر جدید حروف تہجی کے مطابق کی جائے تو آپ کی رائے میں کیسا ہے فرمایا: میں اس کو جائز نہیں سمجھتا، لیکن اسے قدیم طرز پر ہی لکھا جانا چاہیئے۔ ابو عمر فرماتے ہیں کہ علماء امت میں سے کسی کو بھی امام مالک سے اس بارے میں اختلاف نہیں ہے۔ ابو عمرو نے ایک اور جگہ مذکورہ بالا سند سے روایت کی ہے کہ امام مالک سے سوال کیا گیا کہ واؤ اور الف جو قرآن مجید میں لکھنے میں زائد ہوتی ہیں، کیا ان کو تبدیل کر کے واؤ یا الف کے بغیر لکھنا جائز ہے؟ فرمایا جائز نہیں ہے ابو عمروؒ کہتے ہیں کہ سائل سے مراد اس واؤ اور الف زائدہ سے بھی جو لکھنے میں کسی معنی کے لیے زائد لکھے جاتے ہیں مثلاً اُولٰئِكَ، اُولِی اور اُولَاتِ وغیرہ میں واؤ اور لَنْ نَدْعُوَا، قَتَلُوا، ولا اَوْضَعُوا، لَا اَذْبَحَنَّهٗ، مِائَةٌ، مِائَتَيْنِ، لَا تَايْأَسُوا، يَبْدَؤُا، تَفْتَؤُا، يَعْبَسُوا وغیرہ میں الف اسی طرح نَبَإِ الْمُرْسَلِيْنَ مَلَا۟ئِهٖ وغیرہ میں ی۔

---

[1] ابو عمرو دانی: ابو عمرو عثمان بن سعید الدانی متوفی ۴۴۴ھ انہوں نے قرآن مجید کے رسم الخط کے متعلق کتاب لکھی جس کا نام المقنع فی رسم المصحف ہے۔

الجعبریؒ[1] نے عقیلہ کی شرح میں لکھا ہے ابو عمرؒو نے امام مالک کا جو قول نقل کیا ہے وہی چاروں اماموں کا مذہب ہے۔ اس نے خصوصیت سے امام مالک کا قول اس لیے نقل کیا ہے کہ ابو عمرو خود مالکی ہے اور امام مالک اس کا امام ہے اور چاروں اماموں کی سند خلفاءِ اربعہ ہیں۔

یہ بحث تو بہت لمبی ہے اور اگر ہم اسے بالتفصیل بیان کرنا چاہیں تو اس کے لیے ایک یا دو جلدیں بھی کافی نہ ہوں گی اور اس تفصیل میں پڑنے سے ہم اپنی غرضِ اصلی سے کہ حضرت کا کلام جمع کرنا ہے دُور نکل جائیں گے۔

حرکاتِ ثلثہ اور جزم کے انوار

حضرت نے فرمایا کہ انچاس انوار پر انتیس حروف ہجا، مدہ کے مراتب اور رسم الخط میں حروفِ زوائد کی تفریع کا بیان تو ہو چکا اور یہ بھی بیان ہو چکا کہ ہر حرف کے لیے کون کون سے اجزاء ہیں۔ رہیں حرکاتِ ثلثہ (زیر، زبر، پیش) اور جزم سو ان کے الگ الگ انوار ہیں، چنانچہ پیش اور جزم منجملہ قبض کے ہے۔ زبر منجملہ رسالت کے اور زیر منجملہ آدمیت کے۔ پس اگر کوئی حرف جو منجملہ قبض کے ہو، پیش یا جزم والا ہو تو اس میں قبض کے دو جزو ہوں گے اور اگر قبض کے حروف میں سے نہ ہوگا تو حرف کو تو اپنے نور کی طرف منسوب کیا جائے گا اور اس حرف کی پیش اور جزم قبض کی طرف منسوب ہوں گی۔ مثال کے طور پر شُ، شْ، ہ قبض کے حروف ہیں اور ان کی پیش یا جزم بھی قبض میں سے ہے اور ی، ب، ت قبض کے حروف نہیں ہیں اور ان کی پیش اور جزم قبض میں سے ہے۔ اسی طرح اگر حرفِ رسالت زبر والا ہوگا تو اس میں رسالت کے دو جزو پائے جائیں گے ایک جزو حرف کا اور ایک زبر کا۔ یہی حال حروفِ آدمیت کا ہے کہ اگر زیر والے ہوں گے تو ان میں آدمیت کے دو جزو پائے جائیں گے ایک جزو حرف کا اور دوسرا زیر کا، لیکن حرُوفِ نبوّت، حروفِ بَسط حروفِ روح اور حروفِ علم کی حرکات کا ان حروف میں کوئی حصہ نہیں کیونکہ اُن کی رفع (پیش) قبض کیلیے ہے نصب (زبر) رسالت کے لیے اور خفض (زیر) آدمیت کے لیے اور جزم قبض کے لیے یہاں سے

---

[1] برہان الدین ابراہیم بن عمر الجعبری متوفی ۷۳۳ھ انہوں نے عقیلة أتراب القصائد فی أسنی المقاصد کی جو قرآن مجید کے رسم الخط کے متعلق ہے شرح کی۔ عقیلہ میں ابو عمرو الدانی کی المقنع کو نظم کر دیا گیا ہے جعبری کی شرح کا نام جمیلة أدباب المراصد ہے ان کی تقریباً تمام تصانیف نظم میں ہیں اور وہ بھی زیادہ تر علم قرارت میں، چنانچہ ان کی ایک اور نظم نزھة البررة فی قراءة الائمة العشرة ہے (کشف الظنون ۲: ۲۸۶) اور نہج الاماثة فی القرآت الثلاثة اس کے بعد خود ہی اس کی شرح کی اور اس کا نام خلاصة الابحاث فی شرح نہج القرأات الثلاث رکھا۔

واضح ہو گیا کہ قبض رسالت اور آدمیت باقی چاروں پر داخل ہوں گے۔

رُفع کی سات قسمیں ہیں

رفع (پیش) جو قبض کے لیے ہے اس کی اجزاء قبض کے لحاظ سے سات قسمیں ہیں۔ چنانچہ جو پیش ھُدًی۔ لِلْمُتَّقِیْنَ۔ یُوْمِنُوْنَ۔ اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ۔ نَعْبُدُ اور نَسْتَعِیْنُ میں ہے وہ اس حس کے لیے ہے جو خیر سے لذت حاصل کرتی ہے اور شر سے درد محسوس کرتی ہے اور کَفَرُوْا، اَلْکَافِرُوْنَ اور ھُمُ الْکَافِرُوْنَ اور ھُمُ الظَّالِمُوْنَ کی پیش نفرت از ضد کے لیے ہے اُنْزِلَ وغیرہ کی رفع امتثال کے لیے اور اُولٰئِکَ جہاں بھی آئے اُس کی رفع میل بسوئے جنس کے لیے خَرَجُوْا، اَخْرِجُوْ ھُمْ اور تُنْذِرْ ھُمْ کی پیش تَ پر آتی ہے قوتِ انقباض کے لیے اور اِنَّکَ لَعَلٰی خُلُقٍ عَظِیْمٍ اور اسی طرح کی اور حق کی باتیں جن میں کوئی نزاع نہیں ہے ان کی پیش انصاف کے لیے ہے اور قَالَ اللّٰہُ وغیرہ کی پیش حق گوئی سے شرم نہ کرنے کے لیے۔

جَزْم کے اَقسام

جزم کی بھی سات قسمیں ہیں: اَلْحَمْدُ کا جزم حاسہ ساریہ کے لیے ہے اَلْعٰلَمِیْنَ کا جزم انصاف کے لیے اَلرَّحْمٰنِ کا امتثال امر کے لیے، نَعْبُدُ کا انقباض کے لیے اور اِھْدِنَا کا نفرت از ضد کے لیے اور غَیْرِ کا حق گوئی سے شرم نہ کرنے کے لیے اور ذٰبِہِمْ وغیرہ کا جزم میل بسوئے جنس کے لیے۔

زبر کے اِقسام

زبر کی بھی اجزاء رسالت کے اعتبار سے سات قسمیں ہیں چنانچہ اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ میں ہمزہ کا زبر مشاہدہ کے لیے ہے اور ح کا زبر سکینت کے لیے اور اَلْعٰلَمِیْنَ کے نون کا زبر حیاتِ اہل جنت کے لیے اور مَالِکِ یَوْمِ الدِّیْنِ کا زبر اور یَوْمِ الدِّیْنِ کی ی کا زبر صدق کے لیے اِیَّاکَ کے کَ کا زبر اور ع کا زبر اور عَلَیْھِمْ کے ل کا زبر علم کامل کیلئے اور نَسْتَعِیْنُ کی ت کا الصِّرَاطَ کی ط کا زبر جسم میں روح کی برضا و رغبت رہائش کیلئے اور اُولٰئِکَ، عَبْدِکَ، عِبَادِکَ کے کاف کی زبر موت بحالتِ حیات کے لیے۔

زیر کے اقسام

زیر کی بھی آدمیت کے اجزاء کے لحاظ سے سات قسمیں ہیں لِلّٰہِ کی زیر اور ہر اس ل کی زیر جو پہلے یا بیچ میں آئے کمالِ حس باطنی کے لیے اور لِلّٰہِ کی ھ کی زیر ذکوریت کے لیے اور رَبِّ کی ب کی زیر عقلِ کامل کے لیے اور اَلْعٰلَمِیْنَ کے میم کی زیر کمالِ حواسِ ظاہری کے لیے اور اَلرَّحْمٰنِ کے ن کی زیر کمالِ صورت باطنی کے لیے مٰلِکِ کے ک کی زیر کمال صورت ظاہری کے لیے اور اَلدِّیْنِ کے ن کی زیر نزعِ حظِ شیطان کے لیے۔

جب تو نے یہ سمجھ لیا اور تجھے معلوم ہو گیا کہ تمام حروف، حرکات اور مراتب مد میں سے کوئی بھی انوارِ سبعۂ باطنیہ سے باہر نہیں ہیں تو تجھے حدیث کا مفہوم سمجھ میں آ جائے گا اور آنحضرت کے اس فرمان کہ اِنَّ هٰذَا الْقُرْآنَ اُنْزِلَ عَلٰی سَبْعَةِ اَحْرُفٍ (یہ قرآن سات حرفوں پر نازل ہوا ہے) کے

لہ چونکہ اس بحث میں قراءتوں کا ذکر ہے اس لیے یہاں قراءت کے متعلق ابن خلدون کا بیان نقل کرتا ہوں:۔

"قرآن اللہ کی وہ کتاب مقدس ہے جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر اتری اور اب وہ کتابی صورت میں مسلمانوں کے پاس موجود ہے۔ اس کی نقل تواتر سے ہوئی ہے مگر اس کے الفاظ کی ادائیگی اور حروف کی کیفیات کے لحاظ سے صحابۂ کرامؓ مختلف الروایت ہیں۔ روایات کے اختلاف سے مختلف قراءتیں بن گئیں۔ اب ان میں صرف سات قراءتیں بہت مشہور ہیں جن کی نقل تواتر کی حد تک پہنچ گئی ہے اور ہر قراءت ایک خاص قاری کی طرف منسوب ہے۔ یہ سات قراءتیں گویا قرائت کے لیے اصول مانی گئی ہیں بعض نے ان پر چند اور قراءتوں کی بھی زیادتی کی ہے، لیکن ائمہ قرار کے نزدیک ان کی قراءت سبع کی نقل کی طرح باوثوق نہیں۔"

"قراءتوں کے تواتر اور عدم تواتر میں لوگوں کا اختلاف ہے۔ بعض تواتر سے انکار کرتے ہیں کیونکہ قرأت کیفیات ادا سے عبارت ہے اور وہ ناقابلِ ضبط ہے۔ البتہ قرآن متواتر ہے بعض تواتر کے قائل ہیں اور کچھ کہتے ہیں کہ تواتر بغیر ادا کے ہے یعنی روایتِ قراءت تو ان کو تسلیم ہے، لیکن ادائیگی مثلاً مد و تسہیل کا تواتر تسلیم نہیں۔ کیونکہ وہ کہتے ہیں کہ خالی سُن لینے سے کیفیتِ ادا سے واقفیت نہیں ہوتی، ہمارے نزدیک یہی قول صحیح ہے۔"

"جب تک علوم و فنون کتابی و تدوینی شکل میں نہیں آئے قراءت کی تعلیم بھی دیگر علوم کی طرح زبانی جاری رہی اور جب تمام علوم ضبط تحریر ہوئے تو علم قراءت کی تالیف و تصنیف بھی عمل میں آئی اور اس نے ایک مستقل فن کی شکل اختیار کر لی، پھر اس کی نقل ملک در ملک چلتی رہی۔ یہاں تک کہ مشرقی اندلس میں مجاہد مولائے عامریین بادشاہ ہوا۔ یہ اس علم کی بہت زبردست معلومات رکھتا تھا کیونکہ اس کے آقا منصور بن ابی عامر نے بہت شوق و ذوق اور کوشش سے اس کو اس کی تعلیم دلائی تھی اور اس کے لیے چیدہ قاری جمع کر کے اس علم میں ماہر بنایا تھا۔ چنانچہ جب یہ دانیہ اور جزائر شرقیہ کا مجاہد امیر قرار پایا تھا تو اس کے اثر سے وہاں علمِ قراءت کا بہت فروغ ہوا۔ یوں تو مجاہد کو دیگر علوم سے بھی کافی دلچسپی تھی، لیکن علمِ قراءت کا تو وہ خاص طور سے دلدادہ تھا۔ ابوعمرو الدانی اسی کے عہد میں قراءت کا ماہر بن کر چمکا اور یکتائے روزگار ہوا اس نے اس علم میں کئی کتابیں لکھیں جو لوگوں کی مرکزِ توجہ بن گئیں۔ ان میں کتاب تیسیر نے خاص شہرت حاصل کی اور مرجع خلائق ہوئی۔ پھر اس کے چند روز بعد ابوالقاسم بن فیرہ شاطبی اس میں چمکا۔ اس نے ابوعمرو کی کتابوں

(بقیہ اگلے صفحہ پر)

معنی سمجھ میں آجائیں گے اور تجھے بدونِ شک وشبہ یہ بات واضح طور پر معلوم ہو جائے گی کہ ائمہ قرار کے درمیان جو لفظی اختلافات پائے جاتے ہیں، وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی مراد اور حدیث شریف سے جو لطیف راز مقصود ہے، اس سے خارج نہیں ہے۔ اب ہم سورۂ فاتحہ کو لے کر اس کی تشریح کرتے ہیں تاکہ تم خود اس کا مشاہدہ کر لو۔

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ میں آدمیت کے تین جزو ہیں ایک میم میں کہ ذکوریت کے لیے ہے دوسرا ہ کا زیر کہ

(بقیہ حاشیہ صفحہ سابقہ)

کا خلاصہ نظم میں کیا اور یوں کہنا چاہیئے کہ سارے علم کو سمیٹ کر گویا سمندر کو کوزے میں بند کر دیا۔ قرار سبعہ کے نام ؤ، ب، ج، د کی شکل میں لکھے۔ لوگوں نے اسے بہت ہی پسند کیا اور ہر طالب قرارت کے ہاتھ میں وہ رہنے لگی، مغرب اور اندلس میں وہ داخل نصاب ہوئی اور لوگ اسی کو پڑھنے لگے۔

قرارت ہی کے ساتھ فن رسم الخط بھی شامل کر لیا گیا۔ اس میں قرآن کریم کے حروف کے رسم الخط سے بحث ہوئی اور ان کی صحیح رسم الخط متعین کی گئی۔ چونکہ بعض حروف قرآنیہ کی رسم الخط مروجہ رسم الخط سے بہت کچھ مختلف پائی گئی اس لیے اس علم کی تدوین کی ضرورت پیش آئی مثلاً بِاَیٰیدٍ میں "یا" کی زیادتی اور لَاَاذْبَحَنَّهٗ میں الف کا اضافہ اور جَزٰٓؤُا الظّٰلِمِیْنَ میں "واو" کی کتابت کھٹکی غرض اسی طرح بہت سے اختلافات دیکھے گئے۔ لامحالہ رسم الخط کے اصول و قواعد ضبط ہوئے اور کتابی شکل میں ان کو یکجا ترتیب دیا گیا۔ لوگوں نے اس میں بہت سی کتابیں لکھیں ادھر مغرب میں ابو عمرو الدانی نے بھی اس پر قلم اٹھایا اور مقنع نامی ایک کتاب لکھ ڈالی اور دیگر تصانیف بھی اس بارے میں اس کے قلم سے نکلیں۔ مقنع نے بہت شہرت پکڑی اور اس کی قبولیت عام ہوئی پھر اسی کتاب کے مطالعہ کو ابوالقاسم شاطبی نے ایک قصیدہ کی شکل میں نظم کیا جس کو لوگوں نے بہت ذوق وشوق سے یاد کیا۔ اس کے بعد چند دیگر کلمات و حروف کی رسم الخط میں پھر اختلاف پڑا اور ابوداؤد سلیمان بن نجاح نے اپنی کتاب میں اس کی وضاحت کی، یہ ابوداؤد مجاہد کے غلاموں میں سے تھا اور ابوعمر والدانی کا شاگرد رشید بھی تھا، مشہور ہے کہ یہی صحیح معنوں میں اپنے استاد کے علوم کا حامل اور اس کی کتابوں کا راوی تھا۔ اختلاف کا دروازہ اب بھی بند نہ ہوا اور چند اور اختلافات رونما ہوئے تو مغرب میں علماء متاخرین میں سے خزاز نے ایک نظم لکھی اور مقنع کے بیان کردہ اختلافات میں چند اور اختلافات کی زیادتی کی، مغرب میں اس نظم کو اس قدر شہرت نصیب ہوئی کہ اس کے مقابلے میں ابوداؤد، ابی عمرو اور شاطبی کی تصانیف کو پس پشت ڈال دیا گیا اور لوگوں نے اسی کو اپنے حافظہ میں جگہ دی۔ (اردو ترجمہ مقدمہ ابن خلدون از مولانا سعد حسن خاں

صہ۴۵۹ صہ۴۶۱)

وہ بھی ذکوریت کے لیے ہے تیسرا لَ کا زیر کہ کمال حِس باطنی کے لیے ہے اور اس کی حَ میں نبوت کا جزو ہے کہ وہ رحمت کے لیے ہے اور ایک جزو روح کا ہے۔ دٓ میں جو طہارت کے لیے اور اس کے حروف اور حرکات میں قبض کے پانچ جزو ہیں چنانچہ امتثال کے لیے، لَ اور مٓ کا جزم اور دٓ کا پیش تینوں حاسۂ ساریہ کے لیے ہیں سورۂ فاتحہ میں ہر پیش حاسہ ساریہ کے لیے ہٓ ضد سے نفرت کے لیے۔ اس میں رسالت کے چھ جزو ہیں آ کا زبر مشاہدہ کے لیے۔ ل علم کامل کے لیے، ل کا شد اور زبر مشاہدہ کے لیے۔ سورۂ فاتحہ میں جہاں بھی شد زبر کے ساتھ آئے وہ مشاہدہ کے لیے ہے لہٰذا یہ واضح ہوگیا کہ اس میں آدمیت کے تین جزو ہیں ایک جزو نبوت کا، ایک جزو روح کا پانچ جزو قبض کے اور چھ جزو رسالت کے ہیں۔ چنانچہ اُ میں حرف کے لحاظ سے قبض ہے اور حرکت کے اعتبار سے رسالت ۔ ل میں اس کے برعکس ہے کہ حرف کی جہت سے نور رسالت ہے اور جزم کے لحاظ سے قبض اور ح میں حرف کے اعتبار سے نبوت اور حرکت کے اعتبار سے رسالت اور م میں حرف کے لحاظ سے آدمیت اور جزم کے لحاظ سے قبض۔ د میں حرف کے اعتبار سے روح اور حرکت کے اعتبار سے قبض۔ پہلے لام میں بروئے حرف رسالت اور بروئے حرکت آدمیت دوسرے تشدید والے ل میں حرف اور حرکت دونوں اعتبار سے رسالت ہے اور ہٓ میں حرف کے اعتبار سے قبض اور حرکت کے اعتبار سے آدمیت۔

رَبِّ الْعَالَمِیْنَ اس میں آدمیت کے چار اجزاء ہیں۔ ب کا زیر عقلِ کامل کے لیے۔ ع کے بعد کا الف کمال حِس ظاہری کے لیے۔ م ذکوریت کے لیے اور اس کی زیر کمالِ حواسِ ظاہری کے لیے۔

اس میں قبض کے دو جزو ہیں۔ ہمزۂ وصل امتثال کے لیے اور اَلْ کے ل کا جزم انصاف کے لیے۔

بسط کے بھی دو جزو ہیں۔ رٓ حسنِ تجاوز کے لیے اور ن فرحِ کامل کے لیے اور اس میں نبوت کا ایک جزو ہے کیونکہ ع عفو کے لیے ہے۔

اس میں رسالت کے آٹھ اجزاء ہیں۔ ر کا زبر سکینت کے لیے اور ب بھی سکینت کے لیے ہمزہ کا زیر مشاہدہ کے لیے۔ ل علمِ کامل کے لیے۔ ع کا زبر سکینت کے لیے۔ ل علم کامل کے لیے ل کا زبر مشاہدے کے لیے اور ن کا زبر اہلِ جنت کی سی زندگی کے لیے اور یہ سب اجزاء رسالت ہیں۔

اس میں علم کا ایک ہی جزو ہے اور وہ م کے بعد کا ی ہے جو جہات کو سامنے کی جہت میں محصور کرنے کے لیے ہے۔

لہٰذا اس میں حرف کے لحاظ سے میں بسط ہے اور حرکت کے لحاظ سے رسالت۔ ل ساکن میں حرف کے لحاظ سے رسالت اور جزم کے اعتبار سے قبض۔ ع میں حرف کی نبوت اور حرکت کی رسالت الف

میں آدمیت اور ل میں حرف اور حرکت دونوں اعتبار سے رسالت اور میم میں بھی حرف اور حرکت دونوں لحاظ سے آدمیت ہے۔ ی میں علم۔ ن میں حرف کے لیے بسط اور حرکت کی رسالت۔

اَلرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ۔ اس میں آدمیت کے پانچ جزو ہیں۔ م ذکوریت کے لیے۔ ن کا زیر کمالِ صورتِ باطنی کے لیے۔ ح کا زیر کمالِ حسِّ ظاہری کے لیے۔ پھر ذکوریت کے لیے اور اس کا زیر کمالِ عقل کے لیے۔

اس میں قبض کے بھی پانچ جزو ہیں۔ آ امتثال کے لیے۔ ل کا جزم حاسہ ساریہ کے لیے۔ ح کا جزم امتثال کے لیے اور آ بھی امتثال کے لیے اور ل کا جزم حاسّۂ ساریہ کے لیے۔

اس میں بسط کے تین جزو ہیں۔ ر حسنِ تجاوز کے لیے۔ ن فرحِ کامل کے لیے اور دوسرا ر بھی حسنِ تجاوز کے لیے۔ اس میں نبوت کے دو جزو ہیں۔ پہلا ح اور دوسرا ح دونوں رحمتِ کاملہ کے لیے۔

اس میں رسالت کے سات جزو ہیں۔ آ کا زبر مشاہدے کے لیے۔ ل علمِ کامل کے لیے۔ ر مشدد کا زبر مشاہدے کے لیے اور م کا زبر حق گوئی کے لیے آ کا زبر مشاہدے کے لیے۔ ل علمِ کامل کے لیے اور ر مشدّد کا زبر مشاہدے کے لیے۔ اگر مابعد میں مدغم ہونے کی وجہ سے دونوں لام ساقط کر دیے جائیں تو پھر پانچ رہ جاتے ہیں۔ اس طرح رسالت اور قبض میں سے دو جزو ساقط ہوں گے۔

اس میں علم کا ایک ہی جزو ہے اور وہ ی ممدودہ ہے جو سامنے کی جہت میں جہات کے محصور ہونے کے لیے ہے۔ م کے بعد کا الف کمالِ حواسِ ظاہری کے لیے ہے، اس طرح ایک جزو کا آدمیت کے اجزاء میں اضافہ ہو جائے گا۔

مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ۔ اس میں سات آدمیت کے اجزاء۔ م ذکوریت کے لیے۔ ل کا زیر کمالِ حسِ باطنی کے لیے ک کا زیر کمالِ صورتِ باطنی کے لیے۔ ن کا زیر نزع حظِ شیطان کے لیے۔ یہ اس صورت میں ہے جب مقصود پڑھا جائے، لیکن اگر ممدود پڑھا جائے اور م کے بعد الف بڑھا یا جائے یعنی مَالِكِ پڑھا جائے تو آدمیت کے آٹھ اجزاء ہو جائیں گے کیونکہ الف ممدودہ جسے ایک الف کے برابر لمبا کیا جائے کمالِ حواسِ باطنی کے لیے ہے جب یہ ضمیرِ متکلم میں نہ ہو۔

اس میں قبض کا ایک جزو ہے اور وہ واؤ کا جزم ہے جو حاسّۂ ساریہ کے لیے ہے اور ل جو الدّین کی دال میں مدغم ہو چکا ہے اس کے جزم کا اعتبار نہ کیا جائے۔

اس میں بسط کا بھی ایک ہی جزو ہے اور وہ ن ہے جو فرحِ کامل کے لیے ہے۔

اس میں نبوت کے دو جزو ہیں کیونکہ کٰ معرفتِ الٰہی کے لیے اور ی خوفِ تام کے لیے۔

اس میں روح کا ایک جزو ہے اور وہ د ہے جو طہارت کے لیے ہے۔

اس میں رسالت کے تین جزو ہیں۔ ل علمِ کامل کے لیے ال کا ہمزہ اور ل دونوں ساقط ہیں میم کا زبر صدق کے لیے۔ اسی طرح ی کا زبر بھی صدق کے لیے۔

اس میں علم کے دو جزو ہیں۔ واوؔ موت در حیات کے لیے۔ اور ی انحصارِ جہات در امام کے لیے

اِیَّاكَ نَعْبُدُ وَاِیَّاكَ نَسْتَعِیْنُ۔ اس میں آدمیت کے چھ جزو ہیں۔ ہمزہ کا زیر جو کمالِ عقل کے لیے ہے الف ممدودہ کمالِ حواسِ ظاہرہ کے لیے اور اُولٰئِكَ کے ہمزہ کا کسرہ اور الف ممدودہ اور ت کمالِ حواسِ ظاہرہ کے لیے۔ ع کا زیر کمالِ حسنِ باطنی کے لیے۔

قبض کے چھ اجزاء ہیں۔ ابتدائی ہمزہ امتثال کے لیے۔ ع کا جزم انقباض کی قوتِ کاملہ کے لیے ب کا پیش حاسۂ سامعہ کے لیے۔ اسی طرح د کا پیش حاسۂ سامعہ کے لیے۔ س کا جزم امتثال کے لیے آخری ن کا پیش حاسۂ سامعہ کے لیے۔

اس میں بسط کے چار اجزاء ہیں۔ تینوں ن فرحِ کامل کے لیے۔ س انکساری کے لیے۔

اس میں نبوت کے چھ اجزاء ہیں۔ ی خوفِ تام کے لیے۔ ک معرفتِ الٰہی کے لیے۔ ع عفو کے لیے اسی طرح وَاِیَّاكَ نَسْتَعِیْنُ کی ی۔ ک اور ع خوفِ تام، معرفتِ الٰہی اور عفو کے لیے ہیں۔

اس میں روح کا صرف ایک جزو ہے اور وہ د ہے جو طہارت کے لیے ہے۔

اس میں رسالت کے دس جزو ہیں۔ ی کا زبر ہر ایک سے حق گوئی کے لیے، ک کا زبر علمِ کامل کیلئے ن کا فتح حیاتِ اہلِ جنت کے لیے۔ ی سکینت کے لیے۔ واوؔ موت در حیات کے لیے۔ واوؔ کا زبر مشاہدے کے لیے۔ اسی طرح ی کا زبر حق گوئی کے لیے۔ ک کا زبر علمِ کامل کے لیے اور ن کا زبر (حیاتِ اہلِ جنت کے لیے) ی کا زیر رضا و رغبت سکونِ روح در ذات کے لیے۔

اس میں علم کا ایک جزو ہے اور وہ ی ممدودہ ہے اور یہاں یہ کونین کے حالات کی معرفت کے لیے ہے۔

اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِیْمَ۔ اس میں آدمیت کے نو اجزاء ہیں۔ اِ کا زیر کمالِ عقل کے لیے د کا زیر کمالِ صورتِ باطنی کے لیے ص کمالِ عقل کے لیے اور ص کا زیر کمالِ حسنِ باطنی کے لیے اور الف ممدودہ بھی کمالِ حسنِ باطنی کے لیے۔ م ذکوریت کے لیے۔

اس میں قبض کے آٹھ اجزاء ہیں۔ ء امتثال کے لیے۔ ھ نفرت از ضد کے لیے۔ ھ کا زیر بھی نفرت از ضد کے لیے۔ الصراط کا ہمزہ وصلِ امتثال کے لیے۔ اسی طرح اَلْمُسْتَقِیْمَ کا ہمزۂ وصل بھی

امتثال کے لیے ہے ل کا جزم حاسۂ سارِیہ کے لیے۔ م کا پیش بھی حاسۂ سارِیہ کے لیے - س کا جزم انصاف کے لیے۔

اس میں بسط کے تین جزو ہیں۔ ن فرح کامل کے لیے۔ ر حسن تجاوز کے لیے اور س انکساری کے لیے یہ اس صورت میں جب الصراط کو ص سے پڑھا جائے، لیکن اگر س سے پڑھا جائے جو قنبل[1] اور اس کے موافقین کی قرارت ہے تو اس صورت میں اس میں بسط کے چار جزو ہوں گے کیونکہ الصراط کی س کے اضافہ سے چار جزو بن جائیں گے۔

اس میں نبوت کا کوئی جزو نہیں ہے۔

اس میں روح کے تین جزو پائے جاتے ہیں۔ د طہارت کے لیے۔ ط تمییز کے لیے اور ک بصیرت کاملہ کے لیے۔

اس میں رسالت کے آٹھ جزو ہیں۔ دَ طہارت کے لیے۔ طَ تمییز کے لیے ہے۔ اَلصِّرَاط کے ہمزہ کا زبر مشاہدے کے لیے۔ رَ کا زبر سکینت کے لیے اور طؔ کا زبر روح کا بر ضا ور غبت جسم میں قیام کے لیے۔ ہ کا ہمزہ مشاہدے کے لیے اور لؔ علمِ کامل کے لیے تؔ کا زبر سکینت کے لیے م کا زبر بھی سکینت کے لیے ہے۔

اس میں علم کا ایک ہی جزو ہے اور وہ یؔ ممدودہ ہے جو یہاں جہات کا سامنے کی جہت میں محصور ہونے کے لیے ہے۔

صِرَاطَ الَّذِیْنَ اَنْعَمْتَ عَلَیْھِمْ اس میں آدمیت کے آٹھ جزو ہیں۔ صؔ کمالِ عقل کے لیے۔ ص کا زیر کمالِ حسِّ باطنی کے لیے۔ الف ممدودہ کمالِ حسِّ ظاہری کے لیے۔ ذ کا زیر کمال حس باطنی کے لیے۔ مؔ ذکوریت کے لیے۔ تَ کمال حواس ظاہری کے لیے۔ تؔ کا زیر بھی کمالِ حواسِ ظاہرہ کے لیے ہے۔ م ذکوریت کے لیے۔

اس میں قبض کے سات اجزاء ہیں۔ اَنْعَمْتَ کا ہمزہ امتثال کے لیے۔ نؔ کا حاسۂ سارِیہ کے لیے م کا جزم انصاف کے لیے۔ ی کا جزم بھی انصاف کے لیے۔ ھ نفرت از ضد کے لیے۔ حمزہ اور اسکے موافقین کی قرارت کے مطابق ھ کا پیش بھی میل بجنس کے لیے۔ م کا جزم بھی میل بجنس کے لیے اسی طرح ابنِ کثیر اور اس کے موافقین کی قراءت کے مطابق م کا پیش بھی میل بجنس کے لیے۔

---

[1] قنبل: اصل نام محمد بن عبدالرحمٰن بن محمد خالد بن سعید بن جرجہ المکی المخزومی چھیانوے سال کی عمر میں ۲۹۱ھ میں وفات پائی۔ یہ ابوسعید عبداللہ بن کثیر کے راوی تھے۔

اس میں بسط کے چار اجزا ہیں۔ قنبل اور اس کے موافقین کی قراءت کے مطابق سراط کا سؔ لیکن صؔ کو زؔ سے اشمام کر کے پڑھنے کی قراءت کی صورت میں حمزہ نے الصواط کے لفظ میں اسے اسی طرح پڑھا ہے اور خلف[1] نے بھی صراط۔ صِرَاطِیْ اور صِرَاطَکَ میں اسی طرح صؔ کو زؔ سے اشمام کر کے پڑھا ہے۔ اس صورت میں اس لفظ میں آدمیت کا جزو ہوگا کیونکہ اس میں صؔ کا ایک جزو ہے اور وہ آدمیت کے حروف میں سے ہے اور ایک جزو رسالت کا ہوگا کیونکہ اس میں زؔ کا ایک جزو ہے جو حروفِ رسالت میں سے ہے۔ مختصر یہ کہ اشمام کئے گئے حرف میں کچھ حصہ آدمیت کا ہے اور کچھ رسالت کا۔ بسط کا دوسرا جزو رؔ ہے۔ جو حسنِ تجاوز کے لیے۔ تیسرا جزو پہلا اؔ ہے اور چوتھا جزو اؔ ثانی جو فرحِ کامل کے لیے ہے۔

اس میں نبوت کے تین جزو ہیں۔ پہلی ع اور دوسری ع عفو کے لیے یؔ ساکن اللہ سے خوفِ تام کے لیے۔

اس میں رسالت کے بارہ جزو ہیں۔ رؔ کا زبر سکینت کے لیے۔ طؔ کا زبر رضا و رغبت روح کا جسم میں قیام کے لیے۔ ہمزہ وصل کا زبر مشاہدے کے لیے۔ ل علمِ کامل کے لیے۔ ل کا زیر مشاہدے کے لیے۔ ن کا زبر حیاتِ اہلِ جنت کے لیے۔ ہمزہ کا زبر مشاہدے کے لیے۔ ع کا زیر سکینت کے لیے۔ تؔ کا زبر علمِ کامل کے لیے اسی طرح عَلَیۡھِمۡ کے ع اور ل کا زیر نیز حرف آؔ سب علمِ کامل کے لیے ہے

اس میں علم کے دو جزو ہیں۔ ذؔ معرفتِ لغات کے لیے۔ ی ممدودہ انحصارِ جہات در امام کے لیے۔

اس میں روح کا ایک جزو ہے اور وہ طؔ ہے جو تمیز کے لیے ہے۔

غَیۡرِ الۡمَغۡضُوۡبِ عَلَیۡھِمۡ وَلَا الضَّآلِّیۡنَ۔ اس میں غ کمالِ صورتِ ظاہرہ کے لیے جو آدمیت کا جزو ہے اور غؔ کا زبر سکینت کے لیے ہے جو اجزاء رسالت میں ہے۔ ی ساکن اللہ سے خوفِ تام کے لیے جو اجزاء نبوت میں سے ہے۔ یؔ کا جزم حق گوئی سے نہ شرمانے کے لیے جو قبض کے اجزاء میں سے ہے۔ رؔ حسنِ تجاوز کے لیے ہے جو بسط کا جزو ہے۔ ر کا زیر کمالِ صورتِ باطنہ کے لیے جو آدمیت کا جزو ہے ہمزہ وصل امتثال کے ہے جو قبض کا جزو ہے۔ ہمزہ کا زبر مشاہدے کے لیے ہے جو رسالت کا جزو ہے۔ لؔ ساکن علمِ کامل کے لیے جو رسالت کا جزو ہے۔ ل کا جزم حاسۂ شاریہ کیلئے

---

[1] خلف: خلف بن ہشام بن ثعلب البزار دراصل الصلح کے رہنے والے تھے مگر بغداد میں رہائش اختیار کر لی تھی۔ اسی لیے بغدادی شمار کئے گئے۔ شریک، ابو عوانہ اور حماد بن زید سے حدیث سنی اور سلیم سے قراءت سیکھی حمزہ کی صحبت میں بھی رہے مگر بہت سی قراءتوں میں حمزہ سے اختلاف کیا۔ ۲۲۹ھ / ۸۴۳ء میں وفات پائی۔

جو قبض کا جزو ہے۔ مَ ذکوریت کا ہے اور یہ آدمیت کا جزو ہے۔ مِ کا زیر سکینت کے لیے اور یہ رسالت کا جزو ہے۔ غَ کمالِ صورتِ ظاہرہ کے لیے جو آدمیت کا جزو ہے۔ غْ کا جزم انقباض کی قوتِ کاملہ کے لیے جو قبض کا جزو ہے۔ ضَ حق گوئی کے لیے جو اجزاءِ نبوت میں سے ہے۔ ضُ کا پیش حاسۂ ساریہ کے لیے جو قبض کا جزو ہے واو ممدودہ حق گوئی سے نہ شرمانے کے لیے جو قبض کا جزو ہے۔ بِ سکینت کے لیے جو رسالت کا جزو ہے۔ بِ کا زیر عقلِ کامل کے لیے جو آدمیت کا جزو ہے۔ عَ عفو کے لیے جو نبوت کا جزو ہے۔ عَ کا زبر علم کامل کے لیے جو رسالت کا جزو ہے۔ لَ علم کامل کے لیے جو رسالت کا جزو ہے۔ لَ کا زبر بھی علم کامل کے لیے ہے جو رسالت کا جزو ہے۔ یَ اللہ سے خوفِ تام کے لیے اور وہ اجزاءِ نبوت میں سے ہے۔ یْ کا جزم انصاف کے لیے ہے جو قبض کا جزو ہے۔ ہ نفرت کے لیے جو قبض کا جزو ہے۔ ہِ کا زیر کمال حسنِ ظاہری کے لیے جو جزوِ آدمیت ہے، لیکن ھ پر پیش پڑھیں تو اس قراءت کے مطابق ھ کا پیش ضد سے نفرت کے لیے اَنْعَمْتَ عَلَیْھِمْ میں عَلَیْھُمْ کے پیش کے برعکس کیونکہ وہاں یہ میل بجنس کے ہے ہے۔ اس لیے کہ جن پر اللہ کا انعام ہو، ان کی طرف طبیعت کا میلان ہوتا ہے اور جن پر اللہ کا غضب ہو، ان سے نفرت ہوتی ہے۔ مَ ذکوریت کے لیے جو جزوِ آدمیت ہے اور ابن کثیر اور اس کے موافقین کی قراءت کے مطابق م کا پیش ضد سے نفرت کے لیے جو قبض کا جزو ہے دوسروں کی قراءت کے مطابق مْ کا جزم اس نفرت پر زور دینے کے لیے جس کا مفہوم ابن کثیر کی قراءت سے حاصل ہوتا ہے۔ اس لیے کہ پیش اصل ہے جزم تو اس پر بعد میں واقع ہوئی واو موت در حیات کے لیے جو جزو رسالت ہے واو کا زیر مشاہدے کے لیے جو رسالت کا جزو ہے اور ہَ علم کامل کے لیے جو جزوِ رسالت ہے لاَ کا زبر بھی علم کامل کے لیے جو جزوِ رسالت ہے۔ الف وصل امتثال کے لیے جو قبض کا جزو ہے۔ اس کا زبر مشاہدے کے لیے جو رسالت ہے۔ الف ہوائی ممدودہ جو یہاں ضمیر متکلم میں نہیں ہے لہٰذا مدہ کے چھ کے چھ مراتب آئیں گے۔ اگر اسے ایک الف جتنا لمبا کریں تو یہ کمالِ صورتِ باطنی کے لیے۔ اگر دو الف کے برابر لمبا کریں تو یہ کمالِ صورتِ باطنی اور روح کے برضا و رغبت جسم میں قیام کے لیے۔ اگر تین الف کے برابر لمبا کریں تو یہ کمالِ صورتِ باطنی سکونِ روح برضا و رغبت اور قوتِ ساریہ کے لیے ہے۔ اگر چار الف جتنا لمبا کریں تو کمالِ صورتِ باطنی سکونِ روح برضا و رغبت، قوتِ ساریہ، کمالِ حسِ باطنی کے لیے ہے۔ اگر پانچ الف جتنا لمبا کریں تو یہ کمال صورت باطنی، سکون روح، قوتِ ساریہ، کمالِ حسِ باطنی اور بغضِ باطل کے لیے ہے اور اگر چھ الف جتنا لمبا کریں تو یہ کمالِ صورت باطنی۔ سکونِ روح۔ قوتِ ساریہ کمالِ حسِ باطنی، بغضِ باطل اور مع سکونِ خیر در ذات کے لیے ہے اور تو یہ معلوم کر چکا ہے کہ کمالِ

صورتِ باطنی جزو آدمیت ہے۔ سکونِ رسالت کا۔ قوتِ سار یہ قبض کا۔ کمالِ حس باطنی آدمیت کا بعض باطل نبوت کا اور سکونِ خیر در ذات بسط کا جزو ہے۔ پس جب مدالف کے برابر ہو تو اس میں صرف آدمیت ہوگی۔ بقدر دو الف ہو تو آدمیت اور رسالت بقدر تین الف ہو تو آدمیت، رسالت، قبض، بقدر چار الف ہو تو آدمیت، رسالت، قبض اور آدمیت، بقدر پانچ الف ہو تو آدمیت، رسالت، قبض، آدمیت اور نبوت۔ بقدر چھ الف ہو تو آدمیت، رسالت، قبض، آدمیت، نبوت اور بسط۔ زیر والا لام۔ مشدد علم کامل کے لیے جو رسالت کا جزو ہے آل کا زیر کمالِ حس باطنی کے لیے جو آدمیت کا جزو ہے ئی ممدودہ اگر ن پر وقف کریں اور اسے ساکن پڑھیں تو یہاں بھی چھ مراتب ہوں گے۔ چنانچہ اگر بقدر ایک ئی کے لمبا کریں تو یہ سامنے کی جہت میں جہات کے انحصار کے لیے۔ اگر دو ئی جتنا لمبا کریں تو یہ انحصار جہات اور ثقلین کے متعلق علوم کی معرفت کے لیے ہے اگر بقدر تین ئی لمبا کریں تو یہ انحصار جہات، ثقلین کے متعلق علوم کی معرفت اور اہلِ جنت کی سی زندگی کے لیے ہے۔ بقدر چار ئی لمبا کریں تو انحصار جہات، ثقلین کے متعلق علوم کی معرفت، اہلِ جنت کی سی زندگی اور انجام کی معرفت کے لیے ہے۔ بقدر پانچ ئی لمبا کریں تو انحصارِ جہات، ثقلین کے متعلق علوم کی معرفت، اہلِ جنت کی سی زندگی، انجام کی معرفت اور عدمِ تضییع کے لیے ہے۔ بقدر چھ ئی لمبا کریں تو انحصارِ جہات، ثقلین کے متعلق علوم کی معرفت، اہل جنت کی زندگی، انجام کی معرفت، عدم تضییع اور احوالِ کونین کے متعلق علوم کی معرفت کے لیے ہے اور تو یہ معلوم کر چکا ہے کہ انحصار۔ معرفت علوم متعلقہ با حوال ثقلین۔ انجام کی معرفت، معرفتِ علوم متعلقہ با حوال کونین اور عدم تضییع سب اجزاء علم میں سے ہیں اور ان چھ میں سے صرف اہلِ جنت کی سی زندگی جزو رسالت ہے لہٰذا اس مد میں جو ایک ئی کے برابر ہو علم کا ایک جزو ہے بقدر دو ئی دو جزو، بقدر تین ئی میں دو جزو علم کے اور ایک جزو رسالت کا۔ بقدر چار ئی میں تین جزو علم کے اور ایک جزو رسالت کا۔ بقدر پانچ ئی میں چار جزو علم کے اور ایک جزو رسالت کا۔ بقدر چھ ئی میں پانچ جزو علم کے اور ایک جزو رسالت کا۔ ئ مفتوحہ فرحِ کامل کے لیے جو بسط کا جزو ہے۔ ئن کا زیر اہلِ جنت کی سی زندگی کے لیے جو رسالت کا جزو ہے۔ عام قراءت کے مطابق سورۂ فاتحہ سے جو متعلق باتیں تھیں سب ذکر کر دی گئیں اور تو نے یہ بھی دیکھ لیا ہے کہ سات حروف میں سے زیادہ آنے والے تین حرف ہیں۔ آدمیت، قبض اور رسالت اور یہ حرف اور حرکات سب میں آتے ہیں۔ چنانچہ ہر رفع اور جزم قبض کے لیے ہے ہر زبر رسالت کے لیے، ہر زیر آدمیت کے لیے لہٰذا جس کلام میں زبر زیادہ آئے اس میں نور رسالت بھی زیادہ ہوگا اور جس میں زیر زیادہ آئے اس میں نور آدمیت زیادہ ہوگا اور جس میں پیش

یا جزم زیادہ ہو اس میں قبض زیادہ ہو۔

سورۂ فاتحہ کی مختلف قراءتوں کے معانی!

جو باتیں سورۂ فاتحہ کے متعلق سات قراءتوں کے علاوہ اور قراءتوں کے اعتبار سے ہیں ان کے متعلق جان لینا چاہیئے کہ ان میں بہت سا اختلاف ہے۔ چنانچہ ان میں سے زید بن رُوبہ بن العجاج اور العتکی[1] نے اَلْحَمْدَ لِلّٰہِ دال کے زبر سے پڑھا ہے بظاہر اس کی توجیہ یہ ہے کہ یہاں فعل محذوف ہے اور اَلْحَمْدَ اس کا مفعول مطلق ہے یعنی یہ دراصل اَحْمَدُ اللّٰہ حَمْدًا تھا۔ پھر اسے اس خاص ترکیب میں بدل دیا گیا اور پیش کی قراءت کی توجیہ یہ ہے کہ اَلْحَمْدُ مبتدا ہے، باطن کے لحاظ سے اس کی توجیہ پیش اور زبر کی حرکات کے راز کے تابع ہے چنانچہ پیش کی قراءت کے لحاظ سے اس میں اللہ کی تعریف کا ذکر ہوگا اور ساتھ ہی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات میں حمد کی ایک ایسی کیفیت پیدا ہوگی جو آپ کی تمام ذات میں سرایت کر جائے گی کیونکہ اس سے دال کے پیش کی کیفیت پیدا ہوتی ہے جو حاسۂ ساریہ کے لیے ہے۔ یوں سمجھو کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات نے اللہ کی حمد بیان کرنے کے بعد اس کے معنی کو بھی محسوس کیا اور وہی کیفیت آپؐ میں پیدا بھی ہو گئی چنانچہ آپؐ کی مثال اس شخص کی سی ہے کہ جس نے ایک بات کہی ہو اور پھر اس کے مطابق عمل کر کے بھی دکھا دیا ہو۔ برخلاف ال پر زبر کی قرأت کے کیونکہ دال کا نصب تو یہ بتاتا ہے کہ آنحضرت کو اللہ کے متعلق علم کامل تھا اور یہ بھی معلوم تھا کہ خدا حمد کا مستحق ہے، لیکن اس بات کے بیان کرنے سے آیت بالکل خاموش ہے کہ آیا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات میں یہ کیفیت بھی پیدا ہوئی یا نہ۔ اسی وجہ سے پیش والی قراءت زیادہ درست زیادہ مشہور اور زیادہ کثرت سے پائی جاتی ہے۔

اگر آپ اس پر یہ اعتراض کریں کہ ل اور م کا جزم حاسۂ ساریہ کے لیے ہے جو تکیف کا فائدہ دیتا ہے لہٰذا پیش اور جزم کی دونوں قراءتیں ایک جیسی ہوئیں۔ ایک کے جواب میں میں کہتا ہوں کہ یہ جیسا آپ نے کہا کہ حاسۂ سازیہ تکیّف کا فائدہ دیتا ہے لیکن اگر یہ تکیف لفظ کے پورا ہو جانے سے پہلے ہی پیدا ہو جائے مثلاً ل اور م کا جزم تو اس صورت میں تکیف کا تعلق محض لفظ کے ساتھ ہوگا بالفاظ دیگر یہ کہ ذات اس لفظ سے متکیف ہوئی اور اس نے اس کے حروف کی لذت اٹھائی، لیکن اگر تکیف کلمہ کے ختم ہو جانے کے بعد ہو جس طرح دال کا پیش تو تکیّف کا تعلق معنی کے ساتھ ہوگا اور یہ بات دال کی

---

[1] العتکیؒ: عباد بن عباد بن حبیب بن المہلب بن ابی صفرہ الامام الصدوق العتکی۔ ابی جمرۃ ضبعی اور ہشام بن عروہ وغیرہ سے حدیث کی روایت کی اور ان سے احمد بن حنبلؒ وغیرہ نے کی ان کی وفات ۱۸۱ھ ؍ ۷۹۷ء میں ہوئی۔

زبر والی قراءت میں نہیں پائی جاتی اور پیش والی قراءت میں موجود ہے یہی وجہ ہے کہ پیش والی قراءت بہتر و افضل ہے۔

یا قراءت شاذہ میں امام حسن بصری (م ۱۱۰ھ) کی قراءت ہے اَلْحَمْدِ لِلّٰہِ دال اور لام دونوں پر زیر اس کی ظاہری توجیہ تو یہ ہے کہ لام کو دال کے زیر کی اتباع میں زیر دیا گیا ہے (نصب جوار) اور باطنی توجیہ تو یہ ہے کہ زیر تو کمالِ حسِ باطنی کے لیے تھی جس سے کمالِ وجدان حاصل ہوتا ہے لہٰذا زیر والی قراءت کا مفہوم یہ ہوگا کہ خدا کی طرف حمد کی نسبت کو وجدان نے بھی محسوس کیا ہے اور اس کی کیفیت بھی حاصل کی ہے۔ برخلاف زبر والی قراءت کے کہ وہ علمِ کامل کے لیے ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ ذات کو علمِ کامل حاصل ہے کہ حمد خدا کے لیے ہے، لیکن تکیف اور تاثر کا ذکر نہیں اور کسی شئے کا احساس اس کے علم کے مقابلہ میں زیادہ قوی ہوتا ہے اسی لیے زیر والی قراءت زیادہ صحیح، زیادہ مشہور اور افضل ہے۔

یا مثلاً الکسائی سے روایت کرتے ہوتے قتیبہ[۱] کی قراءت لِلّٰہِ جس میں ل کے اوپر الف کو ی کی طرف امالہ کر کے پڑھا گیا ہے (لِلّیہِ) اور امالہ میں زیر کا جزو پایا جاتا ہے اور ہر زیر جو درمیانی لام یا ابتدائی لام کے نیچے ہو وہ کمالِ حسِ باطنی کے لیے ہوتی ہے۔ لہٰذا امام میں مفہوم کے احساس کا شعور پایا جاتا ہے جو تعظیم اور تبلیغ معنی کے لیے ہے۔

اسی الکسائی سے روایت کی ہوئی قتیبہ کی دوسری روایت ہے جس میں اَلْعَالَمِیْنَ، اَلرَّحْمٰنِ اور مَالِکِ یَوْمِ الدِّیْنِ تینوں میں امالہ کیا گیا ہے، لیکن یہ احساس چونکہ لفظ کے مکمل ہونے اور معنی کے ظہور سے پہلے پیدا ہوتا ہے اس لیے اس احساس کا تعلق محض لفظ کے ساتھ ہوگا اسی وجہ سے امالہ زبر سے افضل نہیں ہے کیونکہ امالہ سے جو احساسِ لفظی حاصل ہوتا ہے وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو کبھی کبھی ہوتا یعنی صرف اس وقت ہوتا جب آپؐ کو نشاط ہوتا اور صرف اپنی ذات کے لیے قرآن مجید پڑھتے۔ لہٰذا آپؐ باطنی معنوں کو نکال کر اپنی قراءت میں ظاہر کرتے، لیکن جب آپ امت کی تبلیغ اور تعلیم کے لیے قرآن مجید پڑھتے تو اغلب حالات میں آپ الفاظ کو اس کیفیت میں مشغول کرنا نہیں چاہتے تھے جس میں آپؐ کا باطن مشغول ہوتا۔ اسی وجہ سے زبر والی قراءت زیادہ مشہور اور افضل ہے کیونکہ یہ آپؐ کی عام عادت کے مطابق ہے۔

---

[۱] قتیبہؒ: قتیبہ بن سعید محدث خراسان ۱۴۹ھ؍۷۶۶ء میں پیدا ہوئے۔ ثقہ اور عالم تھے ان کی وفات ۲۴۰ھ؍۸۵۴ء میں ہوئی۔

اسی طرح رَبُّ الْعٰلَمِیْنَ ، الرَّحْمٰنُ الرَّحِیْمُ کی ابوزید الانصاری[1] کی پیش والی قرأت ہے انہیں زبر سے بھی پڑھا گیا ہے۔ ان قراءتوں کی ظاہری توجیہ یہ ہے کہ زیر تو ان پر اللہ کا تابع ہونے کی وجہ سے آئی ہے اور پیش اور زبر اس لحاظ سے آئے ہیں کہ یہ پہلے جملہ سے منقطع ہیں اور پیش کی صورت میں مبتدا محذوف ہے اور زبر کی صورت میں فعل ناصب اور باطن کے اعتبار سے تینوں حرکات کے اسرار کے اختلاف کے مطابق توجیہ ہوگی زیر عقل کے لیے ہے جو جزوِ آدمیت ہے اور آدمیت ہمہ تن تواضع اور با ادب ہونا ہے لہٰذا یہاں عقلِ کامل متکلم میں اپنے رب کے لیے تواضع کا زیادہ شعور پیدا کرتی ہے تاکہ وہ یہ مشاہدہ کرے کہ وہ مفعول اور پروردہ ہے اور یہ زیر کا ایک راز ہے۔ زبر والی قراءت کا زبر علمِ کامل کے لیے ہے جس سے یہ لازم آتا ہے کہ متکلم اشیاء کی حقیقت کو جان لے چنانچہ وہ رب کو رب جانتا ہے اور عالمین کو پروردۂ رب۔ یہ الگ بات ہے کہ آیا اس کی ذات نے اپنے رب کے سامنے تواضع کی یا باادب رہی یا نہ۔ پیش والی قراءت میں پیش حاسۂ سازیہ کے لیے ہے لیکن یہ حاسۂ مفہوم مکمل ہونے سے پہلے ہی حاصل ہو جاتا ہے کیونکہ مضاف الیہ کے ذکر سے پہلے مضاف کے معنی مکمل نہیں ہوتے۔ لہٰذا یہاں پر حاسہ نے یہ معلوم تو کر لیا کہ ذات نے لفظ رب سے تاثر حاصل کیا اور اس سے حظ اٹھایا اسی لیے زیر والی قراءت معنی کے اعتبار سے زیادہ بہتر ہے۔ اسی واسطے یہ زیادہ مشہور بھی ہے۔

یا مثلاً مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ کی قاریوں نے کئی ایک قراءتیں بیان کی ہیں جمہور نے اسے مَلِكِ بغیر الف کے پڑھا ہے۔ کسائی، عاصم اور ان کے موافقین نے مَالِكِ میم کے بعد الف سے پڑھا ہے اس کی ظاہری وجہ تو یہ ہے کہ:

بغیر الف کے پڑھنے کی صورت میں صفت مشبہ ہے جیسے مَلِكِ النَّاسِ میں اور مَالِكِ الف کے ساتھ پڑھنے کی صورت میں مَالِكُ الْمُلْكِ کی طرح اسم فاعل ہے اور باطن کے لحاظ سے اس کی بنا مد والی قراءت میں الف مدہ کے راز پر ہوگی جو کمالِ صورت باطنی کے لیے اس سے یہ اشارہ نکلتا ہے کہ مخبر عنہ نے ایک کام کیا ہے لہٰذا الف کا اشارہ اس طرف ہوگا کہ اللہ تعالیٰ مَلِك کی صفت سے موصوف ہے جو اس کے افعال میں سے ایک فعل ہے۔ نیز یہ قراءت اس بات کی طرف اشارہ کرتی

---

[1] ابوزید انصاریؓ: ابوزید عمرو بن اخطب بن رفاعہ الانصاری۔ صحابی ہیں۔ لنگڑے تھے۔ انہوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ تیرہ جنگوں میں شرکت کی، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے سر پہ ہاتھ پھیر کر دعا کی کہ خدا اسے خوبصورت بنا دے" اس کے بعد ان کا کوئی بال سفید نہیں ہوا۔ ابن حجر فرماتے ہیں کہ بغوی نے ابوزید عمرو بن اخطب اور ابوزید انصاری کو الگ الگ شخص شمار کیا ہے (تہذیب التہذیب ج ۸ ص ۳)

ہے کہ اس کلام کے سننے والے حاضرین کو اس امرِ عظیم سے متنبّہ کر دیا جائے۔ چنانچہ الف کی آواز کمالِ صورتِ باطنی سے نکلی ہے اور آواز کے دو مقصد ہیں ایک مقصد مخبر عنہ کے متعلق ہے کہ جو بات اس کی طرف منسوب کی گئی ہے وہ مخبر عنہ کے افعال میں سے ہے اور دوسرا مقصد سامعین کے لیے ہے کہ غفلت کی نیند سے بیدار ہو جائیں۔ حضرتؒ نے فرمایا کہ یہ معنی بغیر الف والی قراءت (مَلِكِ) میں نہیں پائے جاتے ہاں اس قراءت میں ایک اور راز پایا جاتا ہے وہ اضافت کا راز ہے یعنی مَلِكِ کی یَوْمِ الدِّینِ کی طرف اضافت اور یہ مفہوم مَالِكِ کی قراءت میں بہت کم پایا جاتا ہے۔

مولف کتاب کہتا ہے کہ یہ قواعدِ نحویہ کے عین مطابق ہے کیونکہ اسم فاعل حدوث اور تجدّد کے لیے آتا ہے۔ الف سابق کا یہی راز ہے اور اس کی اضافت بہ نیت انفصال ہے۔ حضرت کے فرمان کہ یہ مفہوم پیش والی قراءت میں کمزور ہے کا یہی مطلب ہے خدا اس امام کو جزاء خیر دے۔

اور یمانیؒ[1] کی قراءت مَلِيكِ يَوْمِ الدِّينِ ہے (باضافہ ی بعد لام) اور یہاں یہ ی انجام کی معرفت کے لیے ہے کیونکہ اگر ی نہ بھی ہو تب بھی بناءِ حرف میں کوئی فرق نہیں آتا اس لیے یہ انجام کی معرفت کے لیے ہوئی۔ ورنہ یہ مذکورہ بالا تفصیل کے مطابق ہوگی، چنانچہ ی زائدہ میں نفسِ متکلم کی طرف اشارہ کا سر پایا جاتا ہے۔ لہٰذا اگر وہ انجام سے واقف ہوگا تو اپنے نفس کو متنبہ کرے گا اور یہ قراءت اس لیے ضعیف ہے کہ تنبیہ نفس میں جس پر ی دلالت کرتی ہے، یہ بات بتاتی ہے کہ کلام کا مفہوم کچھ ایسا ہے جس سے کبھی غفلت بھی برتی جا سکتی ہے اور اس مقام پر اس بات کی کہیں بھی روایت نہیں ملتی کیونکہ ہر ایک اس سے خود بخود آگاہ ہو جاتا ہے اسی لیے ی کے بغیر (مَلِكِ) کی قراءت بہتر ٹھہری۔

حضرت علیؓ کی قراءت مَلَّاكِ يَوْمِ الدِّينِ

اور حضرت علی کرّم اللہ وجہہ کی قراءت مَلَّاكِ يَوْمِ الدِّينِ جس میں مَلَّاك بصیغۂ مبالغہ ہے۔ حضرت نے فرمایا کہ اس قراءت کے معنی پہلی قراءتوں کے معانی کی نسبت بہت مخصوص معنی ہو جاتے ہیں۔ کیونکہ اس کا یہ مفہوم بن جاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ قیامت کے دن تمام مخلوقات کو چھوڑ کر خاص طور پر مکلّف لوگوں کی گردنوں کا مالک ہوگا۔ اس مفہوم کی وجہ یہ ہے کہ ک نیچے کا زیر کمالِ

---

[1] یمانیؒ: الیمان بن معاویہ الاسود: حاملین قرآن میں سے تھے۔ ان کی بینائی جاتی رہی تھی مگر جب قرآن مجید کو ہاتھ میں لیتے تو دکھائی دینے لگ جاتا مگر ادھر قرآن مجید کو الگ کیا تو بینائی پھر ویسی کی ویسی ہو گئی۔ (شعرانی ص۵۳)

صورتِ ظاہری کے لیے ہے اور صورتِ ظاہری انسانوں کی صورت ہے جو ک کے نیچے سے سر نکالے ہوئے دکھائی دیتی ہے اور الف مدہ سے جو آواز پیدا ہوتی ہے اس کی تنبیہہ کر رہی ہے۔ ل کال میں ادغام اور اس کا مکرّر آنا اس کی اور بھی تاکید اور تحقیق معنیٰ کر رہا ہے اور تاکید و تحقیق دوسروں کو خارج کرنے کے متقاضی ہیں۔ بر خلاف قراءت مشہورہ کے کہ اس میں تاکید و تحقیق نہیں پائی جاتی لہٰذا وہ غیر کے اخراج کی بھی متقاضی نہیں۔ مختصر یہ کہ ادغام اس بات کا تقاضا کرتا ہے کہ غیر بنی آدم کے لیے دروازہ بند کر دیا جائے۔ یہی وجہ ہے کہ غیر بنی آدم اس قراءت میں داخل نہیں ہیں لہٰذا یہ قراءت بھی ضعیف ٹھہری۔

مؤلّفِ کتاب کہتا ہے کہ فعّال کے صیغہ پر مَلَكَ سے جو اسم مبالغہ بنتا ہے اس کا یہی تقاضا ہے کیونکہ مَلِك وہ ہے جو صاحبِ تصرّف ہو اور عذاب و ثواب کے ساتھ تصرف بنی آدم میں دوسروں کے مقابلے میں زیادہ ہوتا ہے کیونکہ مقصود بالذّات تو انسان ہیں اور دوسرے مقصود بالتبع، اسی واسطے مَلّاك اسی معنی کا زیادہ تر مفہوم ادا کرے گا۔ لہٰذا قراءتِ متواتر زیادہ مشہور ہوئی کیونکہ اس قراءت میں بنی آدم اور ان کے علاوہ اور اشیاء بھی شامل ہو جاتی ہیں۔

ابو حیوۃؒ کی قراءت مَالِكَ يَوْمِ الدِّيْن

اور ابو حیوۃ[1] کی قراءت مَالِكَ يَوْمِ الدِّيْن کی زبر سے، اس خیال سے کہ یہ یا تو منادیٰ مضاف ہے یا اس کا فعل محذوف ہے باطن کے لحاظ سے ک کا زبر علمِ کامل کے لیے ہے۔ لہٰذا جس نے ک پر زبر پڑھا اس نے نہ اپنے آپ کو خدا کی غلامی میں داخل کیا نہ اور کو۔ بر خلاف اس کے جس نے ک کے نیچے زیر پڑھا کیونکہ زیر آدمیت کے لیے ہے اور آدمیت میں متکلم کی طرف سے ادب اور عاجزی پائی جاتی ہے۔ مزید برآں آدمیّت کا ادب آدمیّت کے ساتوں اجزا سے پیدا ہوتا ہے اور یہاں آدمیت کا جزو کمالِ صورتِ ظاہری ہے جس پر زیر دلالت کرتا ہے۔ لہٰذا زیر میں جو ادب پایا جاتا ہے اس کی وجہ ایک تو آدمیت پر اللہ کا احسان ہے اور دوسرے یہ کہ اللہ تعالیٰ نے انسانوں کی صورت اچھی طرح سے بنائی ہے اور متکلم اور غیر متکلم کا خدا کی مالکیّت کا اعتراف کرنے سے یہی مراد لی جاتی ہے لیکن زبر والی قراءت میں یہ معنی نہیں پائے جاتے۔ اسی لیے یہ قراءت مشہور نہیں ہے۔

---

[1] ابو حیوۃؒ: شریح بن یزید ابو حیوۃ الحمصی، موذن اور قاری تھے۔ ابن حبان نے انہیں ثقہ شمار کیا ہے۔ ان کی وفات ۲۰۳ھ و ۸۱۸ء میں ہوئی۔ (تہذیب التہذیب ج ۴ ص ۳۳۱)

عمر بن عبد العزیزؒ کی قرارت مَلۡكِ یَوۡمِ الدِّیۡن

یا مثلاً عمر بن عبد العزیزؒ کی قرارت مَلۡكِ یَوۡمِ الدِّیۡن جس میں ل کو ساکن پڑھا گیا ہے اس کی ظاہری وجہ تو یہ ہے کہ ل کے زیر کو تخفیف کی غرض سے ساکن کر دیا گیا ہے، جس طرح کَتِفٌ کے ت کو تخفیف کر کے کَتۡفٌ پڑھ لیتے ہیں اور اس کی باطنی توجیہ یہ ہے کہ یوں سمجھو کہ یہ الفاظ حق تعالیٰ کی زبان سے نکلے ہیں اور متکلم باوجود طاقت نہ رکھنے کے اللہ تعالیٰ کا نائب بن کر ان الفاظ کو لڑکھڑاتے ہوئے ادا کرتا ہے اور اس مفہوم کو ل کا جزم ادا کرتا ہے جو قرارت کے بدلنے کا سبب ہے ان معنوں پر اسکے دلالت کرنے کی وجہ یہ ہے کہ حرفِ رسالت کو مثلاً ل جو علمِ کامل کے لیے ہے جب ساکن کیا جائے تو یہ اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ اس کے ماقبل کی حرکت بھی علمِ کامل کے لیے ہے اور اگر ماقبل کی حرکت جزم کے ساتھ نہ آئے تو علمِ کامل کے لیے نہیں - لہٰذا ضروری ہوا کہ جب وہ جزم کے ساتھ آئے تو علمِ کامل کے لیے ہو جیسا کہ یہاں ہے کیونکہ جب لام پر حرکت تھی - تو م کی حرکت صدق کے لیے تھی، لیکن جزم کے ساتھ یہ علمِ کامل کے لیے ہو گئی کیونکہ جزم ماقبل کی تاکید کرنے والے کی تحقیق کے لیے ہے جس کی وجہ سے جزم ماقبل کی حرکت کو اپنے معنی سے خارج کر دیتی ہے اور حرف کو بھی اپنی حرکت سے نکال دیتی ہے کیونکہ اگر ل پر زبر ہو تو وہ علمِ کامل کے لیے ہے اور اگر زیر ہو تو کمالِ حسن باطنی کے لیے - لفظ میں تغیر اور اس میں لرزہ صرف اسی صورت میں پیدا ہوا ہے جب متکلم کی ذات میں اضطراب اور زلزلہ پیدا ہوا، اور یہ اضطراب اور زلزلہ اس لیے پیدا ہوا کہ اس نے وہ الفاظ بولے ہیں جن کے بولنے کی اس میں طاقت نہ تھی - یعنی یہ کہ اس نے مَلۡكِ کی نسبت اپنی ذات سے کر دی جس کی قدرت محض ذاتِ قدیم کو ہے - اسی لیے متکلم کی ذات عبودیت کی طرف ہوئی جس طرف ک کا زیر جو آدمیت کے لیے اشارہ کرتا ہے لہٰذا ل کا جزم حاسۂ ساریہ کے لیے ہے، لیکن جب اس سے لفظ میں اضطراب پیدا ہو گیا تو۔

اس نے یہ بھی بتا دیا کہ متکلم کی ذات میں بھی اسی قسم کا اضطراب پیدا ہو گیا ہے اور متکلم کی ذات میں اضطراب اسی صورت میں پیدا ہو سکتا ہے جب اس کی مثال ایک بچے کی سی ہو جو اپنی طاقت سے بڑھکر اٹھائے - اسی واسطے جمہور کی قرارت بہتر اور زیادہ مشہور ہے کیونکہ اس قرارت کے مطابق ذاتِ متکلم اس درجہ تک نہیں گری کہ وہ ناقابل برداشت چیز کو اٹھاتے - واللہ اعلم۔

ؒ عمر بن عبد العزیز خلفاء بنی اُمیہ میں سے ایک خلیفہ ہیں - انہیں عمر ثانی کہا جاتا ہے - نہایت متقی، عابد و زاہد تھے - ان کی وفات ۳۹ برس کی عمر میں سنہ ۱۰۱ھ - سنہ ۷۱۹ء میں زہر دیے جانے کی وجہ سے ہوئی - ان کی مدت خلافت دو سال چودہ دن ہے - ۱۲

مذکورہ بالا قراءتوں کے علاوہ اور قراءتیں

کچھ اور قراءتیں رہ گئی ہیں۔ ان میں سے ایک مَلَكَ يَوْمَ الدِّينِ کی قراءت ہے۔ اس طرح مَلَكَ فعل ماضی ہے اور يَوْمَ الدِّينِ اس کا مفعول اور یہ علیؓ بن ابی طالب کی قراءت ہے اور مَالِكٌ يَوْمَ الدِّينِ ك پر تنوین والا پیش اور یوم پر زبر اور یہ عاصم جحدری کی قراءت ہے اور مَالِكُ يَوْمِ الدِّينِ لَ پیش (تنوین کے بغیر) اور یوم کے میم کے نیچے اضافت کی وجہ سے زیر ان قراءتوں کے اسرار ان کے حرکات کے اسرار سے معلوم ہو سکتے ہیں اور ان غیر مشہور قراءتوں میں سے کسی ایک میں بھی وہ اسرار نہیں پائے جاتے جو دونوں متواتر قراءتوں کے معانی و اسرار کو ادا کر سکیں۔

اِيَّاكَ کی مختلف قراءتیں

سورۂ فاتحہ کی قراءتوں کے اختلاف میں ایک اختلاف اِيَّاكَ میں ہے۔ جمہور نے اسے ہمزہ کی زیر پڑھا ہے سفیان ثوریؒ[1] نے أَيَّاكَ ہمزہ کی فتح (زبر) سے پڑھا ہے۔ اس کی ظاہری وجہ تو یہ ہے کہ أَيَّاكَ اور إِيَّاكَ دونوں لغتیں ہیں، لیکن باطنی وجہ یہ ہے کہ زیر کا راز اور ہے اور زبر کا راز اور۔ زیر میں اللہ کے سامنے ادب اور انکساری اور اس امر مطلوب میں تواضع پائی جاتی ہے اور متکلم کی اللہ تعالیٰ کی عبادت کرنے میں یہی نسبت ہوتی ہے۔ زیر سے یہ معانی یوں مستفاد ہوئے کہ زیر عقلِ کامل کے لیے ہے اور کمالِ عقل تواضع اور انکساری کا متقاضی ہے کیونکہ اسے علم ہوتا ہے کہ بندے کا مرتبہ کیسا ہونا چاہیئے اور رب کا مرتبہ کیسا۔ زبر کا راز مشاہدۂ کاملہ سے حاصل ہوتا ہے جو رسالت کا جزو ہے اور یہ مشاہدہ خدا سے وصل اور اجتماع کا احساس دلاتا ہے اور ان دونوں میں ایک قسم کا عاجز کرنا پایا جاتا ہے مگر زیر میں عاجزی پائی جاتی ہے اور یہی بات عام مخلوقات کے لیے مناسب بھی ہے اسی وجہ سے زیر والی قراءت زیادہ مشہور اور افضل ہے۔

اسواری کی قراءت اِيَاكَ

اسواری کی قراءت اِيَاكَ ہے جس میں ی پر تشدید نہیں پڑھی گئی بلکہ اسے مخفف کیا گیا ہے قراءت جمہور اور اس قراءت میں کوئی خاص فرق نہیں ہے اگر فرق ہے تو صرف اتنا کہ جمہور کی قراءت (اِيَّاكَ) میں اللہ سے ڈرنے کی تاکید اور اس خوف کے اندر حق گوئی کی تاکید ہے اور یہ دونوں امور اللہ سے مضبوط تعلق اور

---

[1] سفیان بن سعید ثوریؒ: انہیں امیر المومنین فی الحدیث کہا جاتا ہے۔ نہایت ہی متقی اور عابد و زاہد تھے ان کی پیدائش ۹۷ھ میں کوفہ میں ہوئی اور وفات بصرہ میں ۱۶۱ھ میں ہوئی۔

سخت خوف کا تقاضا کرتے ہیں اور یہ بات تخفیف والی قرات میں نہیں پائی جاتی کیونکہ اگرچہ اس میں بھی خوف اور سچائی پائی جاتی ہے اس لیے کہ یٰ خوف کے لیے ہے اور اس کا زبر صدق کے لیے جیسا کہ بیان ہو چکا ہے۔ پھر بھی تشدید والی قراءت میں زیادہ تاکید پائی جاتی ہے۔

بعض اہلِ مکہ کی قرارت نَعۡبُدُ

قرارت کے اختلافات میں سے ایک قرارت اہلِ مکہ کی ہے کہ انھوں نے دال کو ساکن کر کے نَعۡبُدۡ پڑھا ہے تخفیف کی وجہ وہی ہے جو ابُو عمرو نے یَأمُرۡکُمۡ کی رَا کو ساکن کرنے کی بیان کی ہے۔ باطن کے اعتبار سے اس کی وجہ یہ ہے کہ اگرچہ پیش کا راز اس مقام پر جزم کے راز کے قریب ہے کیونکہ پیش اور جزم دونوں حالت سار یہ کے لیے ہیں پھر بھی ان دونوں میں فرق پایا جاتا ہے۔ اس طرح کہ جزم میں پیش کا راز شامل ہوتا ہے اور اس میں اسی قدر زیادتی بھی ہے کیونکہ پیش تو اصل ہے اور جزم اس پر عارضی طور پر واقع ہوتی ہے اور اصلی راز عارضی چیز کے پیدا ہونے سے زائل نہیں ہو سکتا اس لیے جزم میں پیش کے مقابلہ میں زیادہ تاکید پائی گئی، لیکن چونکہ جزم تو ایک عارضی چیز ہے کبھی آئے گی اور کبھی نہیں اسی لیے پیش زیادہ مشہور اور افضل ٹھہری، مزید برآں اصلی راز تمام مومنین کے لیے عام ہے اور عارضی راز خاص الخواص ہے، اس لیے پیش کی قراءت میں عوام کے لیے قبضِ عام ہے اور جزم کی قراءت میں خاص لوگوں کے لیے قبضِ خاص ہے۔

اِیَّاكَ یُعۡبَدُ کی قرارت

ایک اور قرارت اِیَّاكَ یُعۡبَدُ کی ہے جس میں یُعۡبَدُ کو مجہول پڑھا گیا ہے۔ صیغۂ مخاطب سے صیغۂ غائب کی طرف التفات کی وجہ سے۔ باطن کے اعتبار سے اس کی توجیہ یہ ہے کہ یٰ کا پیش انقباض کے لیے ہے اور جس چیز سے انقباض پیدا ہوا ہے وہ یٰ اور عَ کے معنی کی ضد ہے۔ یٰ اللہ تعالیٰ سے خوف کے لیے ہے جس کی ضد عدم خوف یعنی خدا کی نافرمانی ہے۔ عَ عفو کے لیے ہے جس کی ضد ظلم اور بُرا برتاؤ ہے لہٰذا یہ متکلم دونوں حرفوں کے معنوں سے متصف ہونے کے بعد ان دونوں بُرے معنوں سے منقبض ہوا اور یہ انقباض اس قدر مضبوط ہوا کہ متکلم کی حالت یہاں تک پہنچ گئی کہ وہ ان عارفین میں سے ہو گیا جو اہلِ جنت کی سی زندگی بسر کرتے ہیں اور یہ حال اُن اہلِ باطن کا ہوتا ہے جو اللہ کی ہر مخلوق کی عبادت اور تسبیح کا مشاہدہ کرتے ہیں جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: وَاِنۡ مِّنۡ شَیۡءٍ اِلَّا یُسَبِّحُ بِحَمۡدِهٖ ہم نے جو یہ کہا ہے کہ وہ ان لوگوں میں سے ہو جاتا ہے جو اہلِ جنت کی سی زندگی بسر کرتے ہیں۔ یہ اس لیے کہا ہے کہ ع کے بعد کا زبر اہلِ جنت کی سی زندگی کے معنوں کو ادا کرتا ہے۔ لہٰذا یہ قراءت صرف عارف لوگ ہی ادا کر سکتے ہیں

حضرتؒ نے فرما سعیدؒ بن جبیر اس آیت کو اسی طرح پڑھا کرتے تھے کیونکہ وہ اکابر عارفین میں سے تھے۔ نَفَعَنَا اللّٰہُ بِہٖ۔ آمین۔ یہی وجہ ہے کہ اس قراءت والے کو اس بات کی ضرورت نہ ہوئی کہ وہ اپنے آپ کو اس بات میں شامل کرے کیونکہ وہ تو اپنی آنکھوں سے مشاہدہ کر رہا ہے کہ کوئی شخص بھی اللہ کی عبادت سے مستثنیٰ نہیں ہو سکتا۔ برعکس قراءتِ جمہور کے جو نَ اور مضارع معروف سے ہے کیونکہ اس صورت میں متکلم اپنے آپ کو عبادت میں شامل کرتا ہے اور اس قراءت میں عارف و غیر عارف سب شامل ہو سکتے ہیں۔ اگر وہ مشاہدہ ہی کیوں نہ کرے کہ کوئی شخص اللہ کی عبادت سے باہر نہیں رہ سکتا۔ تو اس صورت میں اس کا اپنے آپ کو عبادت میں شامل کرنا لذت حاصل کرنے کے لیے ہوگا اور اگر وہ مشاہدہ نہ کر رہا ہوگا تو قاری غیر عارف ہوگا۔ اس کے باوجود جمہور کی قراءت بہتر ہے کیونکہ جب قاری قراءت میں مشغول ہو جاتے تو حروف کے معانی کے انوار چمک اُٹھتے ہیں اور متکلم کی ذات کو اُن انوار سے سیراب کرتے ہیں لہٰذا اگر وہ نَ سے پڑھے گا تو اس نے اپنے آپ کو عبادت میں شامل کر لیا اور وہ نَ کے معنی سے سیراب ہوگا اور اگر یَ سے پڑھے گا اور پڑھنے والا غیر عارف ہے تو وہ نور جس پر نَ دلالت کرتا ہے اس سے چھوٹ جائے گا حالانکہ سورۂ فاتحہ کے پڑھنے سے ہماری غرض اسے تمام انوار کے ساتھ پڑھنے سے ہے۔ عارف سے انوار نہیں چھوٹ سکتے کیونکہ وہ خود دیکھ رہا ہوتا ہے کہ کوئی شخص بھی اللہ کی عبادت سے خارج نہیں ہو سکتا۔ مختصر یہ کہ ن والی قراءت تمام اُمت کے مناسب ہے خواہ وہ عارف ہو یا غیر عارف برخلاف یَ کی قراءت کے کیونکہ اسے پڑھنے والا ضروری ہے کہ عارف ہو کیونکہ اس کی قراءت میں وہ معانی پائے جاتے ہیں جو یہ ظاہر کرتے ہیں کہ اس نے خدا کا حق بھی ادا کیا ہے یعنی اسے خدا سے خوفِ تام حاصل ہے اور یہ مفہوم یَ سے مستفاد ہوتا ہے اور خلق کا حق بھی ادا کیا ہے یعنی انہیں معاف کرنا، درگزر کرنا اور ان سے برائی نہ کرنا اور یہ مفہوم ع سے حاصل ہوتا ہے پھر عارف جب ان دو بڑے اہم اخلاق سے مزین ہو چکتا ہے تو ان کی ضد سے منقبض ہوتا ہے اور یہ مفہوم ی کے پیش اور ع کے جزم سے سمجھ میں آتا ہے اور یہ کیفیت بہت اعلیٰ درجہ کی کیفیت ہے یہی وجہ ہے کہ وہ ان انوار سے

---

[1] سعید بن جُبیرؒ: ۴۵ھ/۶۶۵ء میں پیدا ہوئے اور ستاون سال کی عمر میں ۹۵ھ میں ابن اشعث کی بغاوت میں حجاج نے انہیں قتل کیا۔ جب اہلِ کوفہ حج کو جاتے اور حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے مسئلہ پوچھتے تھے تو وہ کہتے تھے کہ "کیا تم میں سعید بن جُبیر نہیں"، وہ کسی کو اپنے پاس غیبت کی اجازت نہیں دیتے تھے۔ قتل ہونے سے پہلے انہوں نے دعا کی کہ اے خدا حجاج کو میرے بعد کسی پر مسلط نہ ہونے دینا۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا کہ حجاج ان کے پندرہ دن بعد مر گیا۔ اس عرصہ میں حجاج کو نیند نہ آتی تھی۔ جب سوتا تو حضرت سعید خواب میں آکر پاؤں کھینچتے اور اٹھا دیتے۔

سیراب ہوتا ہے جن سے اہل جنت سیراب ہوتے ہیں تاکہ وہ ان کی سی زندگی بسر کر سکے۔

قرارت نَعْبُدُوْ

اسی طرح بعض نے نَعْبُدُوْ دال کے بعد وٓ کی زیادتی سے پڑھا ہے۔ یہ نافعؒ کی روایت ہے جسے اصبہانیؒ[1] نے ورش سے روایت کیا ہے۔ اس کی ظاہری وجہ تو یہ ہے کہ دال کی پیش کو اشباع کر کے واوٓ پڑھا گیا، لیکن باطن کے لحاظ سے اس قرارت میں جمہور کی روایت پر واوٓ زیادہ کی گئی ہے اور یہاں واوٓ حق گوئی سے نہ شرمانے کے لیے ہے اور عدم معیار کے معنی یہ ہیں کہ بندے نے اپنے الفاظ میں تصریح کر دی تاکہ جب وہ اللہ کے سامنے ہو اس معنی کی تحقیق ہو جائے اور اس کی اس حد تک تاکید کر دی جائے کہ اس میں کوئی شبہ نہ رہے۔ یہ مفہوم اگرچہ ایک اچھا مفہوم ہے مگر اس سے بھی اچھی بات یہ ہے کہ بندہ یہ خیال کرے کہ اس نے کوئی عمل کیا ہی نہیں۔ ایسا کیوں نہ ہو۔ خدا ہی اس کا اور اس کے حرکات و سکنات کا خالق ہے۔ یہی وجہ ہے جمہور کی قرارت سے واوٓ گرادی گئی ہے کیونکہ اس مقام پر حیا کرنا عدم حیا سے بہتر ہے کیونکہ اس میں اپنے عمل کو دیکھنا اور اللہ سے بے ادبی پائی جاتی ہے، حضرت نے فرمایا واوٓ کی قرارت صحیح ہے اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت ہے اور جمہور کی قرارت کو ترجیح صرف اس لیے ہے کہ اس کی نسبت ہم سے ہے۔ آنحضرت کے ساتھ نہیں کیوں کہ آنحضرت کی نسبت سے جو قرارتیں آتی ہیں، ان کے پیچھے اتنے انوار آتے ہیں، جتنے اللہ چاہتا ہے۔

حضرت نے فرمایا اس قرارت میں واوٓ کے بعد الف اس لیے نہیں لکھا جاتا ہے کہ واوٓ تو یہاں صرف کلمہ کے معنی کو ثابت کرنے کے لیے آئی ہے، اس لیے اس کے بعد الف زائد نہیں لکھا گیا۔

یحیٰی بن وثابؒ کی قرارت نِسْتَعِیْنُ

ان قرارتوں میں سے ایک قرارت یحیٰی بن وثابؒ[2] کی ہے جنہوں نے نِسْتَعِیْنُ نؔ کے نیچے زیر سے پڑھا ہے اس کی ظاہری وجہ ہے کہ یہ ایک لغت ہے۔ اگرچہ مشہور لغت نون کی زبر سے ہے۔ باطن کے اعتبار سے اس کی وجہ یہ ہے کہ زبر کا راز الگ ہے اور زیر کا الگ۔ اس لیے کہ زیر کی قرارت میں غیر متکلم

---

[1] اصبہانیؒ: اصبہانی پانچ مشہور بزرگ ہوئے ہیں۔ غالباً یہاں مراد ابراہیم بن اورمہ سے ہے۔ یہ حافظِ حدیث اور عالم تھے۔ معرفت اور حافظے کے اعتبار سے یہ اپنے زمانے میں اپنی نظیر نہ رکھتے تھے۔ پچپن برس کی عمر میں ۲۶۶ھ ۸۷۹ء میں وفات پائی۔

[2] یحیٰی بن وثاب: اسدی کوفی تھے۔ یہ مشہور قاری ہیں۔ ابن عمر اور ابن عباس وغیرہ سے روایت کی، جب مسجد میں قرآن مجید پڑھتے تو سناٹا چھا جاتا۔ ان کی وفات ۱۰۳ھ ۷۲۱ء میں ہوئی۔

کو خارج کر دیا جاتا ہے اور یہ بات زبر میں نہیں پائی جاتی - اس کا سبب یہ ہے کہ زیر حسنِ باطنی کے لیے ہے جو آدمیت کا جزو ہے اور تو معلوم کر چکا ہے کہ آدمیت میں ادب اور انکساری پائی جاتی ہے لہٰذا زیر کا اشارہ خود اس متکلم کی طرف ہے جس نے عاجزی کی اور با ادب رہا اور چونکہ اس نے اشارہ اپنی طرف ہی کیا ہے اس لیے غیر کو اس سے خارج کرنا لازم ٹھہرا - اسی وجہ سے جمہور کی قرارت بہتر ہے کیونکہ وہ زیادہ عام اور زیادہ فائدہ مند ہے۔

حضرت عمرؓ کی قرارت غَیْرُ الْمَغْضُوْبُ

انہی میں سے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی قرارت غَیْرُ الْمَغْضُوْبِ ہے۔ بعضوں نے غَیْرَ الْمَغْضُوْبِ زبر کے ساتھ بھی پڑھا ہے اور یہ ابنِ کثیر کی سند سے خلیل بن احمدؒ[1] کی قرارت ہے۔ خلیل سے جمہور کی زیر والی قرارت بھی مروی ہے - نحوی اعتبار سے اس کی توجیہ ظاہر ہے اور باطن کے اعتبار سے ان کی توجیہہ تینوں حرکات کے راز کے مطابق ہو گی چنانچہ زیر آدمیت کے لیے ہے جو یہاں کمالِ صورتِ باطنی کے لیے ہے اور اس میں بہت ادب پایا جاتا ہے اس کا سبب یہ ہے کہ زیر کی صورت میں مغضوب علیہم کی تعیین پائی جاتی ہے اور اشارہ یہ ہے کہ وہ ہماری جنس میں سے ہی نہیں بلکہ ہمارے ہی رشتہ داروں اور اصل میں عزادوں میں سے ہیں۔ یوں سمجھو کہ جس نے غَیْرِ کو زیر سے پڑھا وہ یہ کہہ رہا ہے کہ سوائے ان لوگوں کے جن پر تیرا غضب ہوا مثلاً یہودی اور وہ ہمارے اقارب میں سے ہیں، لیکن اس کے باوجود خدایا تو نے ہم کو ان پر فضیلت اور ہدایت دیکر ان سے ممتاز کر دیا۔ لہٰذا ہم تیرا شکریہ ادا کرتے ہیں۔ لہٰذا اس میں بڑا بھاری ادب پایا جاتا ہے - اسی واسطے جمہور نے اسی طرح پڑھا ہے۔ پیش کی قرارت میں بھی مغضوب علیہم کی تعیین اور تخصیص ایک معین قوم سے کی گئی ہے اور ساتھ ہی اُن سے نفرت، ان سے دُوری اور بیزاری کا اظہار کیا گیا ہے اور یہ پیش کا راز ہے، کیونکہ ضمّہ، قبض، ضد سے نفرت اور بیزاری کے لیے ہے۔ لہٰذا اس میں وہ انکساری نہیں پائی جاتی جو زیر میں پائی جاتی ہے۔

زبر کی قرارت (غَیْرَ) میں مغضوب علیہم کی تعیین نہیں اور کلام اپنے عموم پر قائم رہتا ہے اور پہلی دو قراءتوں میں عام سے مراد وہ عام ہو گا جس سے خاص مراد لیا جاتا ہے۔

---

[1] خلیل بن احمد فراہیدی: مشہور نحوی اور لغوی گزرے ہیں - ان کی کتاب العین عربی لغت کی پہلی کتاب خیال کی جاتی ہے خلیل علم عروض عرب کے بھی موجد ہیں - ان کی وفات ۱۷۵ھ / ۷۹۱ء میں ہوئی۔

ابوالیوب سختیانیؒ کی قرارت وَلَا الضَّالِّیْنَ

ان میں ایک قرارت ابوالیوب سختیانیؒ کی قرارت وَلَا الضَّالِّیْنَ کی قرارت ہے جس میں الف کو ہمزہ ساکن میں تبدیل کر دیا گیا ہے اس کی وجہ ظاہری یہ ہے کہ یہ ایک نہایت شاذ لغت ہے ۔ باطنی وجہ یہ ہے کہ ہمزہ بھی امتثال کے لیے ہے اور اس کا جزم بھی امتثال کے لیے ہے چنانچہ اس میں دو قبض پائے گئے ۔ ایک ہمزہ کا اور دوسرا حرکت کا اور یہ قبض امتثال کا قبض ہے اور امتثال سے مراد یہ ہے کہ ہم اس قول کو مان لیں کہ گمراہ لوگ ہمارے دشمن ہیں لہٰذا اس ہمزہ کی مثال ایسی ہوئی جیسے کہ کوئی کہے نہ گمراہ لوگوں کی اور وہ ہمارے دشمن ہیں ۔" ہمزہ ساکن یہاں پر اس جملے کے قائم مقام ٹھہری ۔ اس کے باوجود جمہور کی قرارت اس سے بہتر ہے کیونکہ الف ممدودہ اور اس کے مراتب میں وہ معانی پائے جاتے ہیں جیسا کہ ذکر ہو چکا ہے جن کے ایک حصّے کو بھی یہ قرارت ادا نہیں کر سکتی ۔

یہ تمام اس کلام کا خلاصہ ہے جو ہم نے شیخ سے ان قراءتوں کی تفسیر اور اُن کی توجیہ کے بارے میں سنا ۔ ان کے علاوہ اور قراءتیں بھی ہیں جن کا ذکر ائمہ قرّاء نے کیا ہے اور شیخ نے ان کے علاوہ اور قراءتوں کا بھی ذکر کیا تھا جن کا ذکر میں نے اس خیال سے نہیں کیا کہ کہیں لوگ اُکتا نہ جائیں کیونکہ اگر میں اس مسئلہ کی تفصیلات میں جاتا اور جو معلومات حضرت کے بطن میں تھیں ، ان تمام کو لکھنا چاہتا تو وہ کئی جلدوں میں بھی سما نہیں سکتی تھیں ۔

شیخ کے مذکورہ بالا بیان میں کئی ایک نکات پائے جاتے ہیں جن کا ہم ذیل میں ذکر کئے دیتے ہیں :

۱ ۔ مقامِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم

پہلی بات جس سے مطالعہ کنندہ کو آگاہ ہونا چاہیئے وہ یہ ہے کہ حضرتؒ کے منور کلام میں نبی صلّی اللہ علیہ وسلّم کے باطن کی تشریح اور آپؐ کے قلب و جسم مبارک کے اسرار کے بلند مقام کے متعلق تنبیہ پائی جاتی ہے اور اسی سے آنحضرت صلّی اللہ علیہ وسلّم کے بلند مرتبہ و مقام کا پتہ چلتا ہے کیونکہ انچاس اجزاء کے نور جس طرح آنحضرت صلّی اللہ علیہ وسلّم کی ذاتِ شریف میں پائے جاتے ہیں کسی اور میں نہیں پائے جاتے ۔ اس لیے آپؐ کی ذات میں ان کے حقائق و انوار مکمل طور پر پائے جاتے ہیں ۔ اگر کوئی شخص یہ چاہے کہ آنحضرت صلّی اللہ علیہ وسلّم

لہ ابوبکر ایوب بن ابی تمیمۃ کیسان السختیانیؒ ؛ مگر کتاب میں صرف ابوایوب دیا ہے ۔ تابعی ہیں ۔ بہت پائے کے عالم تھے حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے ان کی ملاقات ہوئی انھوں نے حدیث کی روایت حسن بصریؒ ، سعید بن جبیرؒ وغیرہ سے کی اور ان سے شعبہ ، سفیان ثوری ، سُفیان عُیینہ ، حُماد بن زید ، حماد بن سلمہ وغیرہم نے روایتِ حدیث کی ۔ ۶۶ھ بمطابق ۶۸۵ء میں ان کی پیدائش ہوئی اور ۱۳۱ھ بمطابق ۷۴۸ء میں ان کی وفات ہوئی ۔

سے اُسے اور زیادہ محبت ہو جائے تو اسے چاہیئے کہ ان انچاس اجزا کو ایک ایک کر کے آپ کے پہلو میں رکھے، پھر ان سب انوار کو مرکب کر کے ایک ہی نور بنا دے تو اسے بہت بڑا نور دکھائی دیگا۔ جس کی نہ کیفیت بیان کی جا سکتی ہے اور نہ کوئی دوسرا شخص ان کو برداشت کرنے کی طاقت رکھ سکتا ہے۔ پھر ان انوار کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے باطن میں رکھے تو اسے بالضرور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے محبت زیادہ ہو جائے گی اور اس طرح اس کے لیے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ظاہری اور باطنی صورت کی تشریح بھی ہو جائے گی۔

۲۔ شرح حالِ روح

آپ کے بیان میں جو دوسری بات پائی جاتی ہے وہ رُوح کے حال کی تشریح اس کے خصالِ حمیدہ اور عجیب و غریب اوصاف کا بیان ہے۔ روح کے اوصاف یہ ہیں۔ ذوق۔ تمییز۔ بصیرت۔ عدم غفلت۔ قوتِ سریان اور جسم کا آزار رساں اشیاء کو محسوس نہ کرنا لہٰذا جو شخص ان اوصاف کو جان لے اور ان معانی کو اچھی طرح سمجھ لے تو اسے رُوح کے متعلق مع اس کے لوازمات اور خواص کے بہت سی معلومات حاصل ہو جائیں گی۔ لوگوں میں روح کے متعلق سخت اختلافات پایا جاتا ہے۔ کوئی یہ کہتا ہے کہ میں تو اس بحث میں پڑنا ہی نہیں چاہتا لہٰذا اس نے اس بحث کا دروازہ ہی بند کر دیا اور کچھ لوگ اس کی بحث میں پڑتے ہیں اور اس بات کے مدعی ہیں کہ روح کے متعلق انہیں معلومات حاصل ہیں۔ اس کے باوجود انہوں نے روح کے خواص کا ذکر نہیں کیا جس کی وجہ سے لوگوں کی عقلیں حیران رہ گئیں مگر حضرت کا کلام روح کے خواص اور لوازمات کو نہایت عمدہ طور پر بیان کرتا ہے لہٰذا جو شخص اس بحث میں پڑنا چاہے تو اسے بھی شیخ کا مسلک اختیار کرنا چاہیئے۔

اب رہی یہ بات کہ روح کیا چیز ہے؟ اس کی ماہیت کیا ہے؟ روحوں کا ہم جنس یا مخالف ہونا کیسے ہوتا ہے اور اجسام میں داخل ہونے سے پہلے ارواح کی کیا کیفیت تھی؟ تو ان کے متعلق ہم نے شیخ سے نہایت عجیب و غریب باتیں سنی ہیں جن میں سے ہم بعض کا ذکر کتاب میں کریں گے۔ انشاء اللہ تعالیٰ۔

۳۔ معارفِ اولیا کی شرح

آپ کے کلام میں جو تیسری بات پائی جاتی ہے وہ اولیاء اللہ کے معارف کی تشریح ہے جس سے ولایت اور عرفان کا پتہ چلتا ہے کہ یہ کیا ہیں؟ کیونکہ ولی اور غیر ولی میں اس وقت تک فرق معلوم نہیں ہو سکتا جب تک کہ ولی کی ذات اور رُوح کا درمیانی پردہ نہ اُٹھ جائے لہٰذا جس کی ذات پر روح کے اسرار کھل جائیں اور اُن کے درمیان کا پردہ زائل ہو جائے وہی ولی عارف اور صاحب فتح کہلائے گا اور جس کی ذات روح سے حجاب میں رہے تو وہ ایک عامی شخص ہے خواہ وہ ہوا میں ہی کیوں نہ اڑ سکتا ہو یا پانی پر ہی کیوں

نہ چل سکتا ہو۔ اگر میں ان تمام باتوں کا ذکر کروں جو میں نے حضرت سے اس بارے میں سنیں تو کلام طول پکڑ جائے گا۔ شاید ہم آئندہ چل کر کچھ باتیں کتاب میں درج کریں۔ واللہ اعلم۔

۴۔ شرح حدیث اُنْزِلَ الْقُرْاٰنُ عَلٰی سَبْعَةِ اَحْرُفٍ

چوتھی بات حدیث شریف کی شرح ہے، جسے حضرت نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے انوارِ باطنی اور اسرارِ قلبی کے مطابق بیان فرمایا ہے کیونکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نبیِ کریم اور رسولِ عظیم ہیں۔ آپ کا باطن بھی بہت بڑا باطن ہے اور آپ کا قلب مبارک انوار سے مالامال ہے اور قرآن مجید آپ کے اس بڑی صفت والے ولی پر نازل ہوا ہے چنانچہ حضرت کی بیان کردہ تفسیر ان تمام اسرار کو پورا کر رہی ہے اور ان تمام انوار پر شامل ہے۔

اب رہی حدیث کی ظاہری شرح اور اسے ظاہری عبارت اور عربی زبان کے مطابق پیش کرنا، تو یاد رکھنا چاہیئے کہ اس قسم کی شرح کو مقامِ نبوت اور مقامِ رسالت کے ساتھ کوئی نسبت نہیں کیونکہ اسرارِ باطن کے اختلاف کے بغیر لفظی اختلافات صرف اس باطن میں پیدا ہوتے ہیں جو اسرار سے عاری ہو۔

اس سے بھی زیادہ عجیب تفسیر اس شخص کی تفسیر ہے جس نے سات حرفوں کی تشریح حلال، حرام وعد، وعید، استخبار اور نداسے کی ہے۔ کیونکہ اس صورت میں یہ کہنا درست نہ ہوگا کہ قرآن سات حروف پر نازل ہوا، لہٰذا تم جتنا آسانی سے پڑھ سکو، پڑھ لو۔ اور نہ ہی صحابہ کے لیے یہ مناسب تھا کہ وہ ان معانی میں آپس میں جھگڑتے۔ اسی طرح جنہوں نے اس کی تشریح امر، نہی، وعد، وعید وغیرہ سے کی ہے وہ بھی درست نہیں۔ الغرض عاقل و ذکی آدمی پر حق بات مخفی نہیں رہ سکتی۔

۵۔ آئمہ قراء اور حضرت کے بیانات میں فرق

اگر آئمہ قراء کی بیان کردہ سات قراءتوں کی توجیہ اور حضرت کے بیان کا غور سے مطالعہ کیا جائے تو دونوں میں نمایاں فرق ظاہر ہو جاتا ہے کیونکہ جو کچھ آئمہ قراء نے بیان کیا ہے اگرچہ وہ اپنی جگہ پر درست ہے، لیکن وہ تو ایک عام بات ہے جس میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ہمارے نبی ہونے کی حیثیت میں کوئی خصوصیت نہیں پائی جاتی کیونکہ مَلْكِ يَوْمِ الدِّين میں لام کی جزم والی قراءت میں جو توجیہ انھوں نے بیان کی ہے کہ لام کی جزم عَضْد اور كَتْف کی طرح تخفیف کے لیے ہے وہ تو تمام عربی کلام میں پائی جاتی ہے چنانچہ یہی بات عَضْد اور كَتْف میں موجود ہے حالانکہ یہ دونوں لفظ قرآن مجید میں نہیں پائے جاتے۔ کجا یہ توجیہ اور کجا حضرت کے بیان کردہ اسرار۔

اسی طرح اِیَّاکَ یُعْبَدُ جہاں یُعْبَدُ مضارع مجہول ہے کی جو قرأۃ نے توجیہ کی ہے کہ یہاں التفات ہے۔ مخاطب سے غائب کی طرف، تو سب جانتے ہیں کہ التفات عام عربوں کے کلام میں پایا جاتا ہے لہٰذا یہ توجیہ حضرت کے بیان کردہ اسرار کا کیسے مقابلہ کر سکتی ہے جہاں انھوں نے ی اور اس کی مخصوص حرکت ع اور اس کی مخصوص جزم کا راز بیان کیا ہے اس کے بعد ب اور اس کی مخصوص زبر اور دال اور اس کی مخصوص حرکت کا راز بیان کیا ہے۔

۶۔ کہیں کوئی یہ خیال نہ کر بیٹھے کہ قرآن مجید کی تفسیر انہی سات باطنی حروف سے ہو سکتی ہے اور بس

کہیں یہ نہ سمجھ لینا کہ قرآن مجید کی تفسیر انہی سات باطنی حروف سے ہو سکتی ہے اور بس۔ کیونکہ یہ سمجھ لینا درست نہیں بلکہ قرآن مجید کے اور معانی بھی ہیں جن میں علوم اولین و آخرین مندرج ہیں اور یہ سات باطنی حروف ان معانی کے لیے بمنزلہ لباس کے ہیں۔ پس معلوم ہوا کہ یہ معنی ایک الگ چیز ہے اور اس کا لباس الگ۔ سورۃ فاتحہ کی مذکورہ بالا تشریح میں غور کرنے سے اس کا تھوڑا سا نقشہ ذہن میں آجائے گا اور قرآن مجید کی اس کے حقیقی معنوں میں تفسیر کی جائے تو قرآن مجید کے ظاہری اور باطنی دونوں معنی معلوم ہو جائیں گے اور اس کے باطن سے یہ بھی معلوم ہو جائے گا کہ جسم میں داخل ہونے سے پہلے ارواح کی کیا کیفیت تھی اور جسم سے مفارقت کے بعد اس کی کیا کیفیت ہو جائے گی۔ نیز یہ بھی معلوم ہو جائے گا کہ قرآن مجید سے ان تمام علوم کا استخراج کیسے ہو سکتا ہے جن پر زمین و آسمان کے رہنے والوں کے علوم مشتمل ہیں اور اس سے شریعتِ محمدیہ نہیں بلکہ تمام شرائع کا استخراج کس طرح ہو سکتا ہے اور اسی طرح ان تمام معارف کا اخراج جن کی طرف ہم نے اجزاء علم میں اشارہ کیا ہے مثلاً انجام کی معرفت علوم متعلقہ باحوالِ کونین کی معرفت، علوم متعلقہ باحوالِ ثقلین کی معرفت اور تمام لغات کا جاننا وغیرہ وغیرہ اور یہ سب کچھ آنحضرت کے باطن کے سمندر کا ایک قطرہ ہے۔ اگر قرآن کریم کو اس طریقے پر سمجھا جائے، پھر اس تعبیر کو ان سات حروف کے انوار سے ملا دیا جائے اور معانی کو ان کا لباس پہنا دیا جائے تو ایسی باتیں ظاہر ہوں گی جن کے سننے سے عقلیں حیران ہو جائیں گی، تب جا کر یہ بات واضح ہو جائے گی کہ اگر زمینوں اور آسمانوں کے لوگ مل کر قرآن کی سی ایک سطر بھی پیش کرنے کی کوشش کریں تو نہ کر سکیں گے لہٰذا پاک ہے وہ خدا جس نے ہمارے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو ان اسرار کے ساتھ مخصوص کیا جن کی نہ کیفیت بیان کی جا سکتی ہے اور نہ ان کی کوئی شخص طاقت رکھ سکتا ہے۔

حروف ملفوظہ کے اسرار کا علم سوائے اصحاب کشف کے کسی کو نہیں ہوسکتا!

قرآن کے حروف تلفظیہ کے اسرار کا علم اور ہر حرف کا ایک سرّ خاص سے مخصوص ہونے کی وجہ مثلاً اَ امتثال کے لیے ہے اور بَ سکینت کے لیے اور تَ کمالِ حسنِ ظاہری کے لیے وغیرہ وغیرہ بجز اہلِ فتح اور صاحبِ عرفان اور اربابِ شہود کے کسی دوسرے کو معلوم نہیں ہوسکتی۔ اسی طرح اعرابی حرکات کا خاص خاص اسرار کے ساتھ متصف ہونا بھی بغیر فتح وعرفان کے ناممکن ہے کیونکہ اگر ان اسرار وتخفیصات کا کوئی ضابطہ ہوتا تو لوگ ان اسرار کو معلوم کرلیتے لہٰذا اگر کوئی ان سے واقف ہونا چاہے تو وہ اربابِ شہود وعرفان سے بالمشافہ گفتگو کرے اور ان سے ہر حرف اور ہر حرکت کا راز دریافت کرے، انشاء اللہ اسے حق تک رسائی ہوگی وَمَا تَوْفِيْقِيْ اِلَّا بِاللّٰهِ عَلَيْهِ تَوَكَّلْتُ وَاِلَيْهِ اُنِيْبُ۔

۸۔ قرآن مجید کا رسم الخط توقیفی ہے اصطلاحی نہیں

آٹھواں یہ کہ قرآن مجید کا رسم الخط توقیفی ہے اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم سے اسی طرح لکھا گیا تھا اور اس کے خاص اسرار ہیں جن سے رسم قرآن کے متعلق اشکالات رفع ہوجاتے ہیں جب اکثر لوگوں نے اسے صحابہ کی اصطلاح سمجھ لیا تو وہ دو گروہوں میں بٹ گئے۔ ایک جماعت کا خیال ہے کہ یہ اصطلاح درست ہے اور اس میں اسرار رکھے ہوئے ہیں جن میں بعض کو ہم سمجھتے ہیں اور بعض کو ہم نہیں سمجھتے۔ پس جن کو ہم سمجھتے ہیں وہ ان آیات واحکام کی طرح ہیں جن کے معانی سمجھ میں آسکتے ہیں اور بعض کو ہم نہیں سمجھتے۔ یہ دونوں خیال درست ہیں، لیکن ان کے ذہن سے یہ خیال نکل گیا کہ اتباع تعبدی صرف احکام الٰہیہ میں ہی ہوتا ہے لوگوں کی تجویز کردہ اصطلاح میں اتباع تعبدی[1] نہیں ہوا کرتا اور اتباعِ تعبدی جس کا ذکر انھوں نے کیا ہے وہ صرف رسم خط کو توقیفی ماننے کی صورت میں ہے نہ کہ اصطلاح ماننے کی صورت میں۔ ایک جماعت نے اسے اصطلاح قرار دینا صحیح نہیں سمجھا اور وہ کہتے ہیں کہ عرب کتابت سے واقف نہ تھے اس لیے انھوں نے غلطی سے الفاظ کو جس طرح چاہا لکھ دیا اور فراء کے مذکورہ بالا قول کا مطلب بھی یہی ہے ابو اسحٰق ثعلبی[2] مفسر نے اَلَّذِيْنَ يَاْكُلُوْنَ الرِّبٰوا کے

---

[1] تعبدی وہ امور ہیں جن کی ہمارے پاس کوئی دلیل نہیں مگر بلا چون وچرا ان پر عمل کرتے ہیں۔

[2] ابو اسحٰق ثعلبی مفسرؒ: ابو اسحٰق احمد بن محمد بن ابراہیم ثعلبی نیشاپوری۔ ان کی وفات ۴۲۷ھ ۱۰۳۵ء میں ہوئی ان کی تفسیر کا نام الکشف والبیان فی تفسیر القرآن ہے۔

تحت فراءؒ[1] کے اس قول کو نقل کیا ہے۔ ولی الدین ابن خلدونؒ[2] نے اپنی تاریخ کبیر کے مقدمہ میں بھی اسی رائے کا اظہار کیا ہے۔

۹۔ دو اعتراض اور ان کا جواب

نواں نکتہ دو سوالوں میں پایا جاتا ہے جو میں نے حضرت سے کیے۔

پہلا سوال تو یہ تھا کہ میں نے عرض کیا آپ نے فرمایا ہے کہ ہم نے حروف کو انوار باطنیہ پر تقسیم کیا ہے چنانچہ ان میں سے مثلاً ت[1]، ظ[2]، م[3]، ص[4]، ع[5] آدمیت[(1)] کے لیے نکلے۔ ء[6]، ث[7]، ش[8]، ہ[9] قبض[(2)] کے لیے اور ر[10]، ن[11]، س[12] بسط[(3)] کے لیے اور ج[13]، ح[14]، ک[15]، ض[16]، غ[17]، ی[18] نبوت[(4)] کے لیے اور خ[19]، د[20]، ط[21]، ق[22]، ھ[23] روح[(5)] کے لیے اور ذ[24]، ف[25] علم[(6)] کے لیے اور ب[26]، ز[27]، ل[28]، و[29] رسالت[(7)] کے لیے، مگر یہی حروف عام لوگوں کے کلام میں بھی تو پائے جاتے ہیں۔ قرآن مجید کے ساتھ مخصوص نہیں جس سے یہ لازم آتا ہے کہ جس کلام میں بھی یہ حروف پائے جاتے ہوں اس میں یہ سات انوار بھی پائے جائیں گے، حالانکہ یہ شان تو صرف قرآن مجید کے ساتھ مخصوص ہے۔ عام کلام کا تو ذکر ہی کیا۔ دیگر آسمانی کتابوں کی بھی یہ شان نہیں ہو سکتی کیونکہ صحیح حدیث میں آیا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ابن مسعود رضی اللہ عنہ[3] سے فرمایا کہ دیگر کتب سماویہ ایک دروازے سے اور ایک حرف پر اترا کرتی تھیں، مگر قرآنِ مجید سات دروازوں سے سات حروف پر نازل ہوا ہے الخ

حضرت نے اس کے جواب میں فرمایا کہ حروف کی یہ تقسیم صرف قرآن مجید کے حروف کے ساتھ مخصوص ہے کسی اور کلام کے حروف کے لیے ثابت نہ ہو گی۔ لہٰذا ہر ہمزہ قبض کے لیے نہیں ہے اور نہ ہر ب سکینت کے لیے اور نہ ہر ت کمالِ حواسِ ظاہرہ کے لیے اور نہ ہر ج صبر کے لیے اور نہ ہر ح رحمت کے لیے اور نہ ہر خ ذوقِ انوار کے لیے بلکہ اِن حروف کے لیے ان انوار کے ہونے کی شرط یہ ہے کہ یہ حروف قرآنِ مجید میں

---

[1] فراءؒ: الکسائی کا شاگرد اور ہم شہری۔ بہت بڑا نحوی اور لغوی تھا۔ اس نے ۸۱۶ء، ۲۰۰ھ میں وفات پائی۔

[2] ولی الدین ابن خلدون: مشہور مورخ جس کے مقدمہ نے دنیا میں بہت شہرت حاصل کی ہے ۱۳۳۲ء، ۷۳۳ھ میں پیدا ہوا اور ۱۴۰۶ء، ۸۰۹ھ میں وفات پائی۔

[3] ابن مسعودؓ اصل نام عبداللہ، یہ مشہور عبادلہ میں سے ہیں اور صحابی ہیں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے صاحب راز تھے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا تکیہ، مسواک، نعلین اور وضو کے پانی کا انتظام سفر میں انہیں کے سپرد تھا۔ آنحضرتؐ حجرۂ مبارک میں آتے تو پہلے یہ داخل ہوتے۔ آپ کے پاؤں سے جوتا اتار کر کونے میں رکھ دیتے حضرت عثمانؓ کے عہدِ خلافت میں ۳۲ھ، ۶۵۲ء میں ان کی وفات ہوئی۔

پائے جائیں، تب ان کے یہ انوار ہوں گے، لیکن اگر یہ حروف قرآن مجید کے علاوہ کسی اور کلام میں ہونگے تو اس صورت میں ان کی تقسیم اور طرح سے ہو گی۔ اس طرح کہ انتیس کے انتیس حروف آدمیّت کے سات اجزاء میں محصور ہوں گے چنانچہ کمالِ صورتِ باطنی تو ہر حرف کے لیے اسی پر وہ نور نکلیں گے اور اسی کے نور سے ان کی آوازیں پیدا ہوں گی اور ذکوریت پیش کے لیے اور کمالِ صورتِ ظاہری زبر کے لیے اور کمالِ عقل زیر کے لیے اور کمالِ حسّ باطنی جزم کے لیے اور الف ممدودہ کے لیے نزع حظِ شیطان اور ی ممدودہ کے لیے کمال حواسِ ظاہرہ، رہا داد کا مدسووہ کچھ حصّہ نزعِ حظِّ شیطان کا لیتا ہے اور کچھ حصّہ کمالِ حواسِ ظاہرہ کا۔ یہ ان حروف کی تقسیم ہے جو قرآنِ مجید کے علاوہ دیگر کتب سماویہ، احادیث قدسیہ وغیرہ اور دیگر لوگوں کے کلام میں پائے جاتے ہیں۔ باقی چھ حروف یعنی قبض، بسط، نبوّت، روح، علم، رسالت کے انوار ان کلاموں میں راکد و ساکن ہوں گے اور وہ چمکتے نہیں ہیں۔

میں نے عرض کیا کہ یہ چھ انوار تو تمام پیغمبروں کی ذات میں موجود ہوتے ہیں، لہٰذا جب کوئی کتاب ان پر نازل ہو گی تو یہ ضرور ہو گا کہ وہ کتاب ان انوار کے ساتھ نازل ہو۔ اس صورت میں وہ کتاب بھی سات حروف پر نازل ہوئی ہو گی۔

حضرت نے جواب دیا کہ یہ درست ہے کہ یہ چھ انوار دیگر پیغمبروں کی ذات میں بھی اسی طرح موجود ہوتے ہیں جس طرح آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات میں، جب آپؐ احادیث قدسیہ یا دیگر احادیث بیان فرماتے ہیں، مگر ان انوار کے وجود سے ان کا مشتعل ہونا اور اسرار کا پایا جانا لازم نہیں آتا۔ ان کے انوار صرف اس وقت چمکتے ہیں جب یہ قرآن مجید میں ہوں کیونکہ ان میں ایک راز اس حکم کا ہوتا ہے جس کے متعلق آیت نازل ہوئی ہوتی ہے۔ اور دوسرا راز آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات میں ہوتا ہے، مگر دوسری کتب سماویہ سرِ ثانی کا مرتبہ رکھتی ہیں کیونکہ ان میں آنحضرتؐ کی ذات نہیں پائی جاتی اسی لیے احادیث نبویہ کا مرتبہ سرِ اوّل کا مرتبہ ہے اس طرح دو سِر ہوتے۔ حضرت نے سِرِ اوّل اور سرِ ثانی کی ایسی تشریح کی تھی جس کا علم کشف اور علم لدنّی کے بغیر حاصل نہیں ہو سکتا۔

حضرت نے فرمایا: یہی وجہ ہے کہ قرآن مجید معجزہ ہے جس کا مقابلہ نہ اس کی نظم میں، نہ ترکیب میں اور نہ معانی میں ہو سکتا ہے۔ برخلاف دیگر کتبِ سماویہ کے کہ ان کا مقابلہ نظم اور ترکیب میں تو ہو سکتا ہے مگر معانی میں نہیں ہو سکتا، جس کی وجہ یہ ہے کہ یہ کلامِ قدیم میں سے ہیں۔ واللہ اعلم۔

کلام شیخ اور حدیث میں تطبیق

دوسرا سوال حضرت کی بیان کردہ تفسیر اور ان احادیث میں تطبیق دینے کے متعلق تھا جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے

اس بارے میں مروی ہیں۔ لہٰذا ہم پہلے ان احادیث کو بیان کرتے ہیں، پھر ان میں تطبیق دینے کی طرف رجوع کریں گے۔

ان میں سے ایک حدیث حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی ہے جو ہشام[1] بن حکیمؓ کے ساتھ پیش آئی اور یہ حدیث متفق علیہ ہے اور اس کا قصہ بھی مشہور ہے جو صحیح بخاری وغیرہ میں موجود ہے۔

ابن حجر[2] کہتے ہیں کہ طبری[3] کے ہاں اسحٰق[4] بن عبداللہ بن ابی طلحہ عن ابیہ عن جدہ کی سند سے مروی ہے کہ ایک شخص نے قرآن پڑھا اور حضرت عمرؓ نے اس کی اصلاح کی۔ پھر دونوں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اس شخص نے عرض کیا: یا رسول کیا آپ نے مجھے اس طرح نہیں پڑھایا؟ آپؐ نے فرمایا: ہوں ہیں۔ راوی کہتا ہے کہ حضرت عمر کے دل میں پریشانی سی پیدا ہو گئی جسے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم حضرت عمرؓ کے چہرے سے پہچان گئے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عمرؓ کی چھاتی پر ہاتھ مار کر کہا، شیطان کو نکال دو" یہی الفاظ تین مرتبہ فرمائے۔ اس کے بعد فرمایا۔ اے عمر قرآن سب ٹھیک ہے۔ جب تک کہ رحمت کے الفاظ کو عذاب اور عذاب کے الفاظ کو رحمت نہ بنا دیا جائے۔

دوسری حدیث اُبیؓ[5] بن کعب کی ہے کہ میں مسجد میں نماز پڑھنے کے لئے گیا۔ ایک اور آدمی آیا اور اس نے سورۃ نحل پڑھنی شروع کی مگر اس کی قراءت میری قراءت سے مختلف تھی جب وہ نماز سے فارغ

---

[1] ہشام بن حکیم: ان کا ذکر پہلے آچکا ہے ۵۴ھ میں اپنے باپ کی زندگی میں وفات پائی۔ صحابی ہیں۔

[2] ابن حجر العسقلانیؒ: مشہور محدث اور شارح بخاری، اُن کی بخاری کی شرح جو فتح الباری کے نام سے مشہور ہے۔ اہل علم کے ہاں بہت مقبول ہوئی۔ ان کی دوسری کتاب اصابہ فی تمییز الصحابہ ہے ان کی وفات ۸۵۳ھ، ۱۴۴۹ء میں ہوئی۔

[3] طبری: ابوجعفر محمد بن جریر الطبری مشہور محدث، مفسر اور مورخ، ان کی پیدائش آمل میں ۸۳۸-۸۳۹ء، ۲۲۴ھ میں ہوئی اور وفات ۹۲۳ء، ۳۱۱ھ میں ہوئی۔

[4] اسحٰق بن عبداللہ انصاریؒ مدینہ کے معتبر تابعین میں سے تھے امام مالکؒ انہیں بہت ہی زیادہ معتبر سمجھتے تھے ان کی وفات ۱۳۲ھ، ۷۴۹ء میں ہوئی۔

[5] اُبی بن کعبؓ مشہور صحابی اور قاری ہیں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں اللہ کے حکم سے سورۃ بیّنہ اول سے آخر تک پڑھ کر سنائی۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے کاتب وحی تھے اور ان چھ صحابہ میں سے تھے جنہوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد میں ہی قرآن مجید حفظ کر لیا ان کی وفات ۱۹ھ، ۶۴۰ء میں ہوئی۔

ہوا تو میں نے اس سے پوچھا کہ تمہیں کس نے یہ سورت پڑھائی ہے؟ اس نے جواب دیا، رسول اللہؐ نے پھر ایک اور آدمی نے آکر نماز پڑھنی شروع کی۔ اس نے بھی سورۂ نحل پڑھنی شروع کی اور اس کی قراءت ہم دونوں کی قراءت سے مختلف تھی۔ جب وہ نماز سے فارغ ہوا تو میں نے پوچھا تمہیں یہ سورت کس نے پڑھائی۔ اس نے بھی یہی جواب دیا کہ رسول اللہؐ نے۔ اس پر میرے دل میں اس قدر سخت شک و شبہ پیدا ہو گیا کہ جاہلیت میں پیدا نہ ہوا تھا، پھر میں ان دونوں کو پکڑ کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں لے آیا اور میں نے عرض کیا یا رسول اللہ ان سے سورۂ نحل پڑھوایئے۔ آپؐ نے ایک کو پڑھنے کے لیے فرمایا۔ جب اس نے پڑھ کر سنایا، تو آپؐ نے فرمایا: "بہت خوب! اس پر میرے دل میں اس قدر شک و شبہ پیدا ہو گیا کہ جاہلیت میں پیدا نہ ہوا تھا۔ پھر آپؐ نے دوسرے کو پڑھنے کے لیے فرمایا۔ جب اس نے پڑھا تو اسے بھی فرمایا "بہت خوب" اس پر میرے دل میں اور شک پیدا ہو گیا پھر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنا دستِ مبارک میرے سینے پر مار کر فرمایا "اے اُبیؓ میں تمہیں اس شک سے خدا کی پناہ میں دے جاتا ہوں۔" پھر فرمایا کہ جبرئیلؑ نے مجھے آکر کہا کہ اللہ تعالیٰ کا آپ کو حکم ہے کہ قرآن کو ایک ہی حرف پر پڑھا جائے۔ میں نے کہا: خدایا میری اُمت سے تخفیف کر دی جائے۔ جبرئیلؑ پھر آئے اور کہا کہ اللہ کا حکم ہے کہ قرآن کو دو حرفوں پر پڑھا جائے۔ میں نے پھر کہا: خدایا میری اُمت سے تخفیف کر دی جائے۔ جبرئیل پھر آئے اور کہا کہ اللہ تعالیٰ کا حکم ہے کہ قرآن کو سات حرفوں پر پڑھ لیا جائے اور ہر حرف کے عوض میں آپ کی ایک درخواست منظور کی جائے گی۔ (الحدیث)

اس حدیث کو حارث بن اسامہ[1] نے ان الفاظ میں اپنی مسند میں روایت کیا ہے اس کا تذکرہ ابن الجزری نے النشر میں کیا ہے۔ ابی بن کعب سے مسلم[2] کی روایت یوں ہے کہ جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم بنی غِفار (غین کے نیچے زیر اور ف مخفف ہے) کے تالاب کے پاس کھڑے تھے کہ جبرئیل

---

[1] حارث بن اسامہ: کتاب میں ان کا نام اسی طرح دیا گیا ہے مگر دراصل ان کا نام حارث بن محمد بن ابی اسامہ ہے۔ کشف الظنون میں بھی یہی نام دیا ہے۔ یہ حافظِ حدیث اور مؤلفِ مسند ہیں۔ ان کی پیدائش ۱۸۶ھ / ۸۰۲ء میں ہوئی اور ستانوے سال کی عمر میں ۲۸۲ھ / ۸۹۵ء میں وفات پائی۔ یہ محتاج تھے اور ان کی بہت بیٹیاں تھیں اس لیے روایت حدیث کی اُجرت میں پیسے لیا کرتے تھے جس کی وجہ سے بعض نے انھیں ضعیف قرار دیا ہے۔ (ذہبی ج ۲: ۱۷۶)

[2] مسلم: مسلم بن حجاجؒ ۲۰۲ھ / ۸۰۹ء میں پیدا ہوئے اور ۲۶۱ھ / ۸۷۳ء میں وفات پائی۔ انکی صحیح مسلم کا شمار صحاح ستہ میں ہوتا ہے

آپ کے پاس آئے اور کہا اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ آپ اپنی اُمت کو ایک حرف پر قرآن مجید پڑھائیں
آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے کہا: میں خدا سے عافیت اور مدد کی درخواست کرتا ہوں کیونکہ میری اُمت
یہ برداشت نہ کرسکے گی۔ پھر جبرئیل نے دوبارہ آکر دو حرفوں پر پڑھنے کی اجازت دی۔ آپ نے وہی پہلے
الفاظ دہرائے۔ پھر جبرئیل تیسری بار تین حرفوں کی اجازت لے کر آئے آپ نے پھر وہی الفاظ دہرائے،
جبرئیلؑ چوتھی مرتبہ آئے اور کہا کہ اللہ تعالیٰ کا حکم ہے کہ قرآن کو سات حرفوں پر پڑھا جائے۔ آپ کی اُمت
جس حرف پر بھی پڑھ لے ٹھیک ہے۔

صحیح مسلم میں عبدالرحمن بن ابی لیلیٰ[1] کے سلسلے سے اُبی بن کعب کی ایک روایت اس طرح ہے:

اُبی بن کعب کہتے ہیں کہ میں مسجد میں تھا کہ ایک آدمی نے آکر نماز پڑھنی شروع کی اور اس طرح قرآن
مجید کی قرارت کی جسے میں نے ناپسند کیا۔ پھر ایک اور آیا اور اس نے کسی اور طرز میں پڑھنا شروع کیا۔
نماز پڑھنے کے بعد ہم سب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے تو میں نے عرض کیا: یا رسول اللہ
صلّی اللہ علیہ وسلّم اس شخص نے قرآن کو اس طرح پڑھا ہے جسے میں نے پسند نہیں کیا، پھر ایک اور شخص
آیا اور اس نے پہلے سے بھی مختلف قرارت پڑھی۔ آنحضرتؐ نے دونوں کو پڑھنے کے لیے فرمایا
اور آپ نے دونوں کی قرارت کو پسند فرمایا۔ اُبیؓ کہتے ہیں کہ میرے دل میں جاہلیت کے زمانے سے
بڑھکر شکوک پیدا ہوگئے۔ اس پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے میرے سینے پر دست مبارک مارا جس سے میں پسینہ
پسینہ ہوگیا، ایسا معلوم ہوتا تھا کہ میں خوف کے مارے اللہ کی طرف دیکھ رہا ہوں۔ پھر فرمایا "اے اُبیّ!
مجھے حکم دیا گیا ہے کہ میں قرآن کو سات حروف پر پڑھوں"۔

اس حدیث میں طبری کی روایت میں یہ الفاظ ہیں: میرے دل میں شیطانی وسوسہ داخل ہوگیا یہاں
تک کہ میرا چہرہ سُرخ ہوگیا، تو آنحضرت صلّی اللہ علیہ وسلّم نے میرے سینے پر ہاتھ مار کر فرمایا: خدایا!
شیطان کو اس سے دُور کردے۔

طبری کی ایک اور روایت میں ہے کہ یہ واقعہ اُبیؓ اور ابن مسعودؓ کے درمیان پیش آیا۔ آنحضرت صلی اللہ
علیہ وسلم نے فرمایا "تم دونوں خوب ہو اور تم دونو ٹھیک پڑھ رہے ہو" اُبی کہتے ہیں کہ میں نے عرض کیا کہ ہم
دونوں تو ٹھیک ہو سکتے نہیں اس پر آپ نے میرے سینے پر ہاتھ مارا۔ الخ

---

[1] عبدالرحمٰنؒ بن ابی لیلیٰ: ان کے باپ ابو لیلیٰ کا اصلی نام بیسار تھا۔ بعض نے بلال کہا ہے۔ ان کی اپنی کنیت
ابو عیسیٰ تھی مشہور تابعی ہیں۔ ان کی وفات ۸۳ھ یا ۸۲ھ میں ابن الاشعث کے واقعہ میں ہوئی۔ بعض کا خیال
ہے کہ یہ بصرہ کی نہر میں غرق ہوگئے۔

اسی طرح عمرو بن العاص[1] کی حدیث ہے کہ ایک شخص نے قرآن مجید کی ایک آیت پڑھی تو عمرو نے کہا یہ آیت تو اس طرح ہے۔ پھر بعد میں اس نے اس کا تذکرہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے کیا تو آنحضرت نے فرمایا کہ قرآن مجید سات حرفوں پر نازل ہوا ہے ان میں سے جو بھی پڑھ لو ٹھیک ہے لہٰذا اس میں جھگڑا نہ کیا کرو۔ اس حدیث کو احمد[2] نے سندِ حسن سے روایت کیا ہے۔

احمد، ابی عبید[3] اور طبری میں ابو جہیم[4] کی یہ حدیث ہے کہ قرآن مجید کی ایک آیت میں دو شخصوں کا اختلاف ہو گیا۔ ان میں سے ہر ایک یہی کہتا تھا کہ اس نے یہ آیت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پڑھی تھی اس کے بعد اسی طرح ذکر کیا جس طرح عمرو بن العاص کی حدیث میں گزر چکا۔

طبری اور طبرانی[5] نے زید بن ارقم[6] سے روایت کی ہے کہ ایک شخص رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی

۱؎ عمرو بن العاص: مشہور صحابی ہیں۔ قریش میں تھے۔ فتح مکہ سے چند ماہ پہلے ۸ھ، ۶۲۱ء میں ایمان لائے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں ذات السلاسل کی فوج پر امیر بنا کر بھیجا تھا ان کی وفات مصر میں ۴۲ھ، ۶۶۲ء میں ستر برس کی عمر میں ہوئی۔

۲؎ احمد: احمد بن حنبلؒ اہل سنت کے چوتھے امام تھے ان کا تذکرہ پہلے کیا جا چکا ہے ان کی وفات ۲۴۱ھ، ۸۵۴ء میں اکہتر برس کی عمر میں ہوئی۔

۳؎ ابو عبید: ابو عبید بن سلامؒ بغدادی۔ فقیہ اور قاضی تھے ان کی بہت سی تصانیف ہیں ان کی وفات ۲۲۴ھ ۸۳۸ء میں ہوئی یہ ۲۱۳ھ، ۸۲۸ء میں یحییٰ بن معین کے ساتھ مصر آئے۔ ابو قدامہ کا قول ہے کہ یہ لغات عرب کے بہت ماہر تھے حافظ ابن حجر نے ان پر ایک طویل مقالہ لکھا ہے۔ تہذیب التہذیب ج ۸ ص ۳۱۵ تا ص ۳۱۸

۴؎ ابو جہیم بن حارث بن الصمۃ الانصاریؓ صحابی ہیں۔ ان سے ابن الحضرمیؓ کے آزاد کردہ غلام بسر بن سعیدؓ نے اور ابن عباسؓ کے آزاد کردہ غلام عمیرؓ نے روایت کی ہے۔

۵؎ طبرانیؒ: ابو القاسم سلیمان بن احمد طبرانی حافظِ حدیث تھے۔ ۲۶۰ھ، ۸۷۳ء میں ان کی پیدائش ہوئی۔ ذہبی نے ان کی کتابوں کی ایک طویل فہرست دی ہے یہاں پر ان کی معجم کا ذکر ہے انھوں نے تین کتابیں تالیف کی ہیں جن کا نام معجم تھا۔ ایک معجم کبیر، دوسری اوسط اور تیسری صغیر۔ ان کی وفات ۳۶۰ھ، ۹۷۰ء میں ایک سو سال اور دس ماہ کی عمر میں ہوئی۔

۶؎ زید بن ارقمؓ: ابو عمر زید بن ارقم انصاریؓ خزرجی صحابی ہیں، انکا شمار کوفیوں میں ہوتا ہے اور وہیں انھوں نے رہائش اختیار کر لی تھی۔ انھوں نے ہی عبداللہ بن ابی بن سلول کا نفاق ظاہر کیا تھا اور انہی کی تصدیق کے لیے سورۂ منافقون نازل ہوئی تھی۔ مختار کے ایام میں عبدالملک بن مروان کے عہد میں ۶۶ھ، ۶۸۵ء میں وفات پائی۔

خدمت میں آیا اور عرض کیا کہ ابن مسعود نے مجھے ایک سورت پڑھائی جو پہلے زیدؓ سے پڑھ چکا تھا اور ابیؓ بن کعب نے بھی وہی سورت پڑھائی ہے مگر ان کی قراءتوں میں اختلاف ہے۔ اب میں کس کی قراءت کو اختیار کروں؟ آنحضرتؐ خاموش رہے۔ حضرت علیؓ آپ کے پاس بیٹھے تھے۔ انھوں نے فرمایا جس طرح تمہیں پڑھایا گیا ہے اسی طرح پڑھو۔ وہی اچھا ہے۔

ابن حبانؓ اور حاکمؒ نے ابن مسعود سے روایت کی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے سورۂ آل عمران کی کچھ آیتیں پڑھائیں۔ اس کے بعد میں مسجد میں گیا تو ایک شخص کو پڑھنے کے لیے کہا تو وہ کسی اور طرح پڑھ رہا تھا اور وہ بھی یہی کہتا تھا کہ مجھے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ آیتیں پڑھائی ہیں پھر ہم دونوں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور آپؐ سے اس کا ذکر کیا تو آپؐ کا چہرہ متغیر ہو گیا اور فرمایا کہ تم سے پہلے لوگوں کو اسی اختلاف نے تباہ کیا ہے۔ پھر آپ نے حضرت علیؓ کے کان میں کچھ فرمایا تو حضرت علیؓ نے کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ جس طرح تمہیں پڑھایا گیا ہے۔ اسی طرح پڑھا کرو۔ پھر ہم چلے گئے اور ہر ایک وہ قراءت پڑھتا تھا جو دوسرا شخص نہیں پڑھتا تھا۔

ایک اور طریقہ سے ترمذی کی روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ اے جبرئیل! مجھے ایک اُمّی قوم کی طرف بھیجا گیا ہے جن میں بڑھیا، بوڑھا، لڑکی، لڑکا اور وہ آدمی بھی ہے جس نے کبھی کوئی کتاب نہیں پڑھی، تو جبرئیل نے کہا: انہیں کہہ دیں کہ قرآن کو سات حروف پر پڑھ لیا کریں۔

اس حدیث کے کئی اور طریقے ہیں۔ اگر ہم ان سب کا بالتفصیل ذکر کریں تو بات طول پکڑ جائے اور ان تمام احادیث کی ظاہری عبارت اس بات کی گواہ ہے کہ حروف سے لفظی اختلافات مراد ہیں جس کی دلیل آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ فرمان ہے کہ "وہ جس حرف پر بھی پڑھ لیں ٹھیک ہے" اور یہ قول بھی کہ ہم چلے گئے اور ہر کوئی دوسرے سے الگ حروف پڑھتا تھا۔ پھر راوی کا یہ کہنا کہ جبرئیلؑ پہلی بار ایک حرف لے کر آتے پھر دوسری بار دو حرف اور تیسری بار تین حرف اور چوتھی بار سات

لہ ابن حبان: ابو حاتم محمد بن حبان یہ ابن خزیمہ کے شاگرد تھے، نہایت عقلمند تھے اور علم لغت اور حدیث کے بڑے ماہر تھے انھوں نے حدیث کی کتاب "صحیح ابن حبان" تالیف کی۔ انکی وفات ۳۵۴ھ میں وفات پائی۔

لہ حاکم: ابو عبداللہ محمد بن عبداللہ نیشاپوریؒ؛ انھوں نے حدیث کی کتاب مستدرک لکھی جس میں ان صحیح احادیث کو درج کیا جنہیں مسلم اور بخاری نے چھوڑ دیا تھا ان کی وفات ۴۰۵ھ ۱۰۱۴ء میں ہوئی۔

حرف لے کر آئے اور یہ صرف لفظی اختلافات میں ہی ہو سکتا ہے۔ کیونکہ باطنی حروف تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات کی طبیعت ہیں لہٰذا یہ کہنا درست نہیں کہ ایک بار تو جبرئیل ایک لے کر آئے ہوں، پھر دوسری بار دو حروف اور اسی طرح سات تک کیونکہ سب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے باطن میں پہلے ہی موجود تھے بالخصوص اس لیے بھی کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اللہ تعالیٰ سے قرآن مجید کو سات حروف میں اتارنے کی درخواست مدینہ میں کی تھی۔ جیسا کہ اُبی بن کعب کی حدیث میں ذکر ہو چکا۔

حضرت نے اس کے جواب میں فرمایا کہ لفظی اختلافات کی مثال سایہ کی سی ہے اور انوارِ باطنی جسم کی طرح ہیں تو جو شخص سایہ کا قائل ہو اسے جسم کا منکر نہیں کہا جا سکتا بلکہ وہ درحقیقت جسم کا قائل ہے کیونکہ سایہ جسم کے بغیر نہیں ہو سکتا۔ جبھی تو ایک سایہ ایک جسم کا مقتضی ہوگا اور متعدد سائے متعدد جسموں کے۔ لہٰذا جب جبرئیل سایہ کا کوئی حرف لے کر آئیں تو درحقیقت وہ جسم کا حرف لے کر آئے ہوں گے یعنی یہ کہ اسے قرأت کے لیے متعین کر دیا اگرچہ وہ پہلے سے موجود تھا اور جب ظل کے دو حروف لے کر آئیں تو دراصل جسم کے دو حرف لے کر آئے ہیں یعنی یہ کہ انہیں قرأت کے لیے متعین کر دیا ہے۔ اگرچہ وہ دونوں پہلے ہی سے آپ کی طبیعت میں موجود تھے اور جب سائے کے سات حروف لیکر آئے تو آپ کو تمام ساتوں انوارِ باطنیہ پر پڑھنے کی اجازت دی۔

اس پر میں نے عرض کیا ہم سات باطنی حروف کو تو آپ کی برکت سے سمجھ گئے۔ یہ سات لفظی اختلافات کیا ہیں؟ کیا یہ اختلافات لغات ہیں جیسا کہ بعض کا خیال ہے اور پھر ان اختلافات کی تعیین میں ان کے کئی فرقے بن گئے یا کیا یہ اختلاف اختلافِ احکام ہے جیسا کہ ایک دوسرے گروہ کا خیال ہے اور ان کی دلیل ابن مسعود کی یہ حدیث ہے کہ پہلی کتابیں ایک دروازے سے ایک حرف پر نازل ہوا کرتی تھیں اور قرآن مجید سات دروازوں سے سات حروف نازل ہوا ہے۔ یعنی زجر[1]، امر[2]، حلال[3]، حرام[4]، محکم[5]، متشابہ[6] اور امثال[7] لہٰذا تم اس کے حلال کو حلال سمجھو اور حرام کو حرام۔ جن باتوں کے کرنے کا حکم دیا گیا ہے ان پر عمل کرو اور متشابہات پر ایمان لاؤ اور کہو اٰمَنَّا بِهٖ كُلٌّ مِّنْ عِنْدِ رَبِّنَا (ہم اس پر ایمان لے آئے یہ سب ہمارے رب کی طرف سے ہے)۔

ان کے مخالفین نے اس کا یہ جواب دیا ہے کہ یہ حدیث صحیح نہیں ہے کیونکہ ابوسلمہ[1] بن عبدالرحمٰن

---

[1] ابوسلمہ بن عبدالرحمٰنؒ: بعض نے اس کا نام عبداللہ بتایا ہے اور بعض نے اسمٰعیل اور بعض کہتے ہیں کہ ان کی کنیت ہی ان کا نام ہے۔ بہت بڑے فقیہ اور امام تھے۔ ابن سعد نے انہیں ثقہ قرار دیا ہے۔ مدینہ میں بہتر سال کی عمر میں ۹۴ھ و ۷۱۳ء میں وفات پائی۔

اور عبداللہ بن مسعود کا درمیانی حلقہ منقطع ہے اس لیے کہ ابوسلمہ کی عبداللہ بن مسعود سے تو ملاقات نہیں ہوئی اور وہ ابن مسعود سے روایت کر رہا ہے۔ یا کیا یہ مختلف قراءتوں کا اختلاف ہے؟ اور اس کی تعیین میں بھی ان کے کئی فرقے ہو گئے ہیں۔ سات قراءتوں سے معیّن تعداد مراد نہیں ہے۔ سات سے مراد وسعت اور سہولت ہے نہ کہ تعداد معیّن۔ لہٰذا آنحضرت صلّی اللہ علیہ وسلّم کے اس فرمان کا کہ قرآن سات زبانوں پر اتارا گیا ہے، یہ مطلب ہے کہ اسے سہولت وسعت اور آسانی کے لیے اتارا گیا ہے لہٰذا جس طرح کسی کو آسان معلوم ہو پڑھ لیا کرے چنانچہ بعض لوگوں کی یہی رائے ہے۔

حضرت نے فرمایا کہ اختلافِ قراءت ہی مراد ہے مگر ہم انہیں کیا کہیں کیونکہ انھوں نے تو ہمیں بچپن میں قراءت سکھائی ہی نہیں کیونکہ جس حد تک قراءت میں اختلاف ہوا ہے وہ سب میری نظر میں ہے لیکن میری سمجھ میں نہیں آتا کہ میں اسے کس طرح بیان کروں۔ پھر حضرت جو کچھ کہ دیکھ رہے تھے اس کی طرف اشارہ کرتے رہے اور اس کے اخراج اور تعیین کے لیے مثالیں دیتے رہے یہاں تک کہ ہم آپ کی مراد سمجھ گئے۔ والحمد للہ۔ ہم نے بار بار یہ مفہوم آپ کو پیش کیا آپ نے یہی فرمایا کہ میری مراد یہ ہے۔

اختلافِ قراءت سات قسم کا ہے

اختلاف قراءت سات قسم کا ہے:۔

۱۔ حرکات وسکون و وجہ اعراب کے اعتبار سے قراءت کا اختلاف مثلاً لَهُمْ عَذَابٌ مِنْ رِجْزٍ اَلِيْمٌ میم[1] کے نیچے زیر اور پیش کے ساتھ بھی۔

۲۔ اختلاف قراءت بلحاظ حرفوں کی کمی اور بیشی کے جیسے وَسَارِعُوْا اور سَارِعُوْا یا جیسے وَقَالُوا اتَّخَذَ اللّٰهُ وَلَدًا اور قَالُوا اتَّخَذَ اللّٰهُ وَلَدًا۔

۳۔ اختلاف قراءت بلحاظ کلمات کی کمی یا بیشی کے جیسے اِنَّ اللّٰهَ هُوَ الْغَنِيُّ الْحَمِيْدُ کہ ایک قراءت میں هُوَ کا لفظ ہے اور دوسری میں نہیں ہے۔

۴۔ اختلاف قراءت بنا بر تقدیم و تاخیر۔ جیسے وَقُتِلُوْا وَقَاتَلُوْا پہلا فعل مجہول اور دوسرا معروف اور اس کا برعکس (یعنی[2] وَقَاتَلُوْا وَقُتِلُوْا) یا جیسے فَيَقْتُلُوْنَ وَيُقْتَلُوْنَ وَعْدًا عَلَيْهِ حَقًّا کیونکہ اسے بھی دونوں طرح پڑھا گیا ہے یا جیسے وَجَاءَتْ سَكْرَةُ الْمَوْتِ بِالْحَقِّ اسے

---

[1] زیر اس لیے کہ رِجْز کی صفت ہے اور پیش اس لیے کہ عَذَابٌ کی صفت ہے۔

[2] سورۂ آل عمران کا آخری رکوع۔

وَجَاءَتْ سَكْرَةُ الْحَقِّ بِالْمَوْتِ بھی پڑھا گیا ہے اور یہ ابوبکر الصدیق۔ طلحہ[۱] ابن مطرف اور زین العابدین[۲] کی قراءت ہے۔

۵۔ مخارج حروف کے اعتبار سے اختلافِ قراءت جیسے اَلصِّرَاط کو اشمام کے ساتھ پڑھنا کیونکہ اشمام کا مخرج ص کا مخرج نہیں ہے یا جیسے قِيْلَ میں زیر اور اشمام کے ساتھ ق کا مخرج اسی طرح حِيْلَ، جِيْئَ، سِيْئَ اور سِيْقَ میں۔ اسی طرح اَلصَّلٰوۃ میں لام کو تفخیم یا ترقیق کے ساتھ پڑھتے ہیں۔ اسی طرح مُنْذِر جیسے کلمات میں ر کو مفخم یا مرقق کر کے پڑھتے ہیں۔

۶۔ زبر اور امالہ اظہار اور ادغام کے اعتبار سے اختلاف قراءت۔

۷۔ تیزی اور آہستگی سے پڑھنے کے اعتبار سے اختلافِ قراءت کیونکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کبھی ترتیل سے پڑھتے اور کبھی تیزی سے (یعنی رواں جس کو حدر کہتے ہیں)

حضرت نے فرمایا ان مختلف وجوہ کو انوارِ باطنیہ سے مربوط کیا جاتا ہے اور یہ انوار ان انوار سے علاوہ ہیں جن کا ذکر حروف و حرکات کی تقسیم میں کیا جا چکا ہے چنانچہ ترتیل اور آہستگی روح سے پیدا ہوتی ہے اور روانی بشرطیکہ حروف درست ادا ہوں۔ قبض سے پیدا ہوتی ہے۔ امالہ نبوت سے پیدا ہوتا ہے۔ زبر رسالت سے اور اشمام ہر قسم کا روح کے لیے ہے اور عدم اشمام نبوت کے لیے ہے حروف کی زیادتی قبض کے لیے اور کمی روح کے لیے اور کلمات کی زیادتی رسالت کے لیے اور کمی علم کے لیے اور تقدیم آدمیت کے لیے اور تاخیر علم کے لیے اور وہ حرکات جن میں کسی قسم کا اختلاف نہیں ہے بسط کے لیے ہیں۔

یہ تمام تشریح حضرت کی بیان کردہ ہے۔

ابن[۳] قتیبہ نے اَلْمُشْكِل میں وجوہِ قراءت کو شمار کیا ہے اور ابن الجزری نے النشر میں

۱؎ طلحہ بن مطرف: اصل کتاب میں یہ نام اسی طرح دیا ہے مگر ابن حجر (تہذیب التہذیب ج ۵ ص ۲۵) نے طلحہ بن مصرف مصاد کے ساتھ دیا ہے یہ اہل کوفہ کے سب سے بڑے قاری تھے ان کی وفات ۱۱۲ھ ۷۳۰ء میں ہوئی۔

۲؎ زین العابدین رضی اللہ عنہ: علی بن الحسین رضی اللہ عنہ المعروف بہ زین العابدین، مشہور امام اور زاہد و متقی ہیں۔ انہی کو علی اصغر کہا جاتا ہے ان کے مناقب بے شمار ہیں۔ اٹھاون برس کی عمر میں ۹۹ھ ۷۱۷ء میں ان کی وفات ہوئی۔

۳؎ ابن قتیبہ: مشہور لغوی اور ادیب جس کی بہت سی تصانیف ہیں۔ یہ اصل میں مرو کا رہنے والا تھا اور کچھ عرصہ دینور میں قاضی بھی رہا۔ اس کی چند تصانیف یہ ہیں: کتاب[۱] المعارف، کتاب[۲] الشعر و شعراء، ادب[۳] الکاتب اور عیون[۴] الاخبار۔ ۲۷۶ھ ۸۸۹ء میں اس کی وفات ہوئی۔

اور ابن حجر نے شرح (بخاری) میں اس کا کلام نقل کیا ہے۔ قاسم[1] بن ثابت نے الدلائل میں اس پر اعتراض کیا ہے۔ ابوالفضل رازی[2] نے اور پھر ابن الجزری نے بھی النشر[3] میں ان قراءتوں کو شمار کیا ہے اور ان کے بیانات میں بہت معمولی اختلاف پایا جاتا ہے۔ اسی طرح قاضی ابوبکر نے بھی کتاب الانتصار میں قراءتوں کا شمار کیا ہے اگر ان کے شمار کردہ اختلافات کا حضرت کے بیان کردہ اختلافات سے مقابلہ کیا جائے تو انشاءاللہ حق بات ظاہر ہو جائے گی۔ بالخصوص اس لیے بھی کہ حضرت کے بیان کا منبع کشف صحیح ہے کیونکہ آپ کو تو انہی قرارت کا علم ہے جن کا آپ نے کشفِ صریح میں مشاہدہ کیا، خاص طور پر اس لیے بھی کہ آپ کی بیان کردہ وجوہ قرارت کا ربط انوارِ باطنیہ کے ساتھ ہے جیسا کہ گزر چکا یہاں پر اس مسئلہ کی بحث ختم ہوتی ہے خدا ہمیں اس سے دنیا اور آخرت میں نفع پہنچائے۔ اِنَّہٗ سَمِیْعٌ قَرِیْبٌ وَحَسْبُنَا اللّٰہُ وَکَفٰی بِہٖ وَکِیْلًا۔

---

[1] قاسم بن ثابت : ابومحمد قاسم بن ثابت سرقسطی۔ ان کی وفات ۱۱۴۱ھ ۱۰۲۰ء میں ہوئی، ان کی کتاب دلائل حدیث کی کتاب ہے۔

[2] ابوالفضل رازی : ان کا حال معلوم نہ ہو سکا۔

[3] نشر فی القرآات العشر یہ کتاب دو جلدوں میں ہے اور شمس الدین ابوالخیر محمد بن محمد الجزری کی تالیف ہے۔

تیسری حدیث

میں نے حضرت سے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اس فرمان کے متعلق دریافت کیا کہ
اَلرُّؤْيَا الصَّالِحَةُ مِنَ الرَّجُلِ الصَّالِحِ جُزْءٌ مِنْ سِتَّةٍ وَّاَرْبَعِيْنَ جُزْءًا مِنَ النُّبُوَّةِ۔ نیک آدمی کی نیک خواب نبوت کے چھیالیس اجزاء میں کا ایک جزو ہے۔ (مشکوٰۃ کتاب الرویا: ۴۹۴) امام بخاری نے اس حدیث کو اس طرح روایت کیا ہے۔ مسلم میں ابوہریرہؓ[1] کی روایت سے پینتالیس[۴۵] میں سے ایک جزو ہے۔ طبری اور امام احمد، عبداللہ بن عمرو بن العاص کی روایت سے انچاس میں سے ایک جزو ہے اور قرطبیؒ[2] کی شرح میں پینتالیس میں سے ایک جزو ہے۔ طبری نے عبادہؓ[3] کی روایت سے چوبیس میں سے ایک جزو۔ ابن ابی جمرہؒ[4] کی شرح میں پچیس میں سے ایک جزو۔ اسی میں ستائیس میں سے ایک جزو کی بھی روایت ہے۔

یہ نو روایتیں ہیں۔ پانچ اربعین کی، چار بیس کی۔ ان کے علاوہ اور روایتیں بھی ہیں۔ ستّر کی بہتّر کی۔ چھہتّر کی، پچاس کی، چالیس کی اور بیالیس کی۔ یہ کل پندرہ روایتیں ہیں، ان میں صحیح ترین

---

۱ ان کے نام میں بہت اختلاف پایا جاتا ہے نووی کہتے ہیں کہ میرے نزدیک صحیح ترین عبدالرحمٰنؒ بن صخر ہے انہیں حافظ صحابہ کہا جاتا ہے۔ یہ اسی سال اسلام لائے جس سال خیبر فتح ہوا، ان کی وفات ۵۷ھ ۶۷۶ء میں ہوئی۔ امام شافعی کہتے ہیں کہ ابوہریرہ کو اپنے زمانہ میں سب سے زیادہ احادیث یاد تھیں۔

۲ قرطبیؒ: ابوالعباس احمد بن عمر بن ابراہیم قرطبیؒ متوفی ۶۵۶ھ ۱۲۵۸ء ان کی شرح مسلم مختصر سی ہے (کشف الظنون ۲/۲۸۷) جس کا نام المفہم لما اشکل من تلخیص کتاب مسلم ہے۔ انھوں نے قرآن مجید کی تفسیر بھی لکھی ہے جس کا نام جامع احکام القرآن ہے (کشف الظنون: ۱: ۴۲۷) انکی تفسیر بہترین تفسیروں میں سے شمار کی جاتی ہے۔

۳ عبادہؓ: عبادہ بن صامت مدنی صحابی ہیں۔ عقبۂ اولی ثانیہ پر یہ موجود تھے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ تمام جنگوں میں شریک ہوتے ان کی وفات امیر معاویہ کی خلافت میں شام میں ہوئی۔

۴ ابن ابی جمرہؒ: عارف باللہ عبداللہ بن سعد بن ابی جمرہ الاندلسی۔ یہ مدونہ جو فقہ مالکی کی مشہور کتاب ہے کے حافظ تھے ان کی وفات ۵۹۶ھ ۱۲۰۰ء میں ہوئی انھوں نے بخاری کی شرح کی جس کا نام بهجة النفوس وغایتها بمعرفة ما لها وما علیها رکھا۔

چھیالیس اور پھر پینتالیس کی روایت ہے۔ باقی روایتوں میں کلام ہے ماسوائے ستر کی روایت کے کیونکہ اسے مسلم نے اپنی صحیح میں ابن عمرؓ سے روایت کیا ہے۔

سوال میں نے حضرت سے سوال کیا اجزاءِ نبوت سے کیا مراد ہے؟ اور ان روایات کے اختلافات میں کیا حکمت ہے؟ اور کیا ان تمام احادیث میں تطبیق ہو سکتی ہے؟ تاکہ ان سب کے مطابق حدیث کی روایت ہو سکے کیوں کہ یہ ایک ایسا مسئلہ ہے جس میں بڑے بڑے محدثین کی عقلیں حیران ہیں اور انھوں نے کوئی نتیجہ خیز بات نہیں کہی۔

جواب حضرت نے فرمایا اجزاءِ نبوت سے مراد وہی آدمیت، قبض، بسط اور خود نبوت کے اجزاء ہیں۔ چنانچہ آدمیت کے اجزاء۔ کمالِ صورتِ ظاہری، کمالِ حواسِ ظاہری، کمالِ صورتِ باطنی، کمالِ حواسِ باطنی، ذکوریت، نزعِ حظِ شیطان اور کمالِ عقل اور قبض کے سات اجزاء، حاسہ، ساریہ، انصاف، نفرت عن الضد، حق گوئی سے نہ شرمانا، امتثالِ امر، میل الی الجنس، قوتِ انقباض بسط کے اجزاء، فرحِ کامل، ذات میں خیر کا قیام، فتحِ حواسِ ظاہرہ، فتحِ حواسِ باطنہ، مقامِ رفعت حسنِ تجاوز اور انکساری۔ نبوت کے سات اجزاء۔ حق گوئی، صبر، رحمتِ کاملہ، معرفتِ الٰہیہ، خوفِ تام۔ بغضِ باطل اور عضو کل اٹھائیس ہوتے، ان اجزاء کی شرح بیان کی جا چکی ہے۔ اگر چاہو تو اس کو دیکھ لو۔ پھر ذکوریت اس سے خارج ہو جاتی ہے کیوں کہ مرد اور عورت دونوں کو خواب آتی ہے، لہٰذا ستائیس رہ گئے اور ابن ابی جمرہ کی ستائیس والی روایت اسی پر محمول کی جائے گی اور اگر کمالِ صورتِ ظاہرہ کو بھی خارج کر دیں کیونکہ اگرچہ یہ اجزاءِ نبوت میں سے ہے مگر خواب سے اس کا کوئی خاص تعلق نہیں ہے تو باقی چھبیس رہ جائیں گے تو ابنِ عبد البر[1] کی مذکورہ چھبیس والی روایت کو اسی پر محمول کریں گے اور اگر اسی وجہ سے کمالِ صورتِ باطنہ کو بھی نکال دیں تو پچیس باقی رہ جائیں گے۔ ابنِ ابی جمرہ کی مذکورہ بالا پچیس والی روایت کو اسی پر محمول کریں گے اور کمالِ حواسِ ظاہرہ کو بھی اسی سبب سے نکال دیں تو چوبیس باقی رہ جائیں گے اور نوویؒ[2] کی مذکورہ بالا چوبیس

---

[1] ابن عبد البرؒ: یوسف بن عمر بن عبد البر۔ علماءِ اندلس کے شیخ اور اپنے زمانے میں وہاں کے بہت بڑے محدث تھے انھوں نے کتاب الاستذکار تصنیف کی۔ انھوں نے ۳۸۰ھ ء ۹۹۰ء میں وفات پائی۔

[2] نووی: ابوزکریا محی الدین بن یحییٰ بن شرف نووی، اپنے زمانے کے امام تھے ان کی بہت سی تصانیف ہیں، مثلاً روضۃ، الریاض، اذکار، اور شرح مسلم۔ نووی دمشق میں ایک گاؤں کا نام ہے جس کی طرف نووی کی نسبت ہے۔ انھوں نے پینتالیس برس کی عمر میں ۶۷۶ھ ء ۱۲۷۷ء میں وفات پائی۔

والی روایت کو اسی پر محمول کریں گے۔

حضرت نے فرمایا یہ تو اس صورت میں ہے جب بغیر رسالت کے صرف نبوت کے اجزاء لیے جائیں گے۔ ورنہ روح و علم اور رسالت تینوں کے سات سات اجزاء جن کی تفصیل و شرح گزر چکی ہے اس پر اضافہ ہوں گے اور نبوت کے مجموعی اجزاء انچاس ہو جائیں گے۔ اس پر طبریؒ اور احمدؒ کی عبداللہ بن عمرو بن العاص کی روایت محمول ہو گی اور اگر ذکوریت اور کمالِ صورتِ باطنی کو بھی خارج کر دیا جاتے تو سینتالیس باقی بچیں گے اور اس پر قرطبی کی روایت محمول ہو گی اور اگر کمالِ صورتِ باطنی کو بھی خارج کر دیں تو چھیالیس رہ جائیں گے اور یہی بخاری کی صحیح متفق علیہ روایت ہے اور اگر کمالِ حواسِ ظاہرہ کو بھی خارج کر دیا جائے تو باقی پنیتالیس رہ جاتے ہیں جس پر مسلم کی روایت محمول ہو گی۔

حضرت نے فرمایا یہ ان سات روایتوں کی توجیہات ہیں اور باقی روایات کی صحت کی مجھے کوئی وجہ نظر نہیں آتی لہٰذا ان کی توجیہ کرنی بیکار ہے۔

میں نے عرض کیا یہ توجیہ جو آپ نے بیان کی ہے اس میں خواب کو اجزاء نبوت میں سے شمار کرنے کا ذکر نہیں ہے اور حدیث اس بات کا تقاضا کرتی ہے کہ خواب نبوت کے اجزاء میں سے ہے کیونکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے تو یہ فرمایا ہے کہ نیک خواب نبوت کے چھیالیس اجزاء میں سے ایک جزو ہے جس سے لازم آتا ہے کہ خواب ان اجزاء نبوت میں سے ایک جزو ہے اور آپ نے تو اسے اجزاء میں سے شمار نہیں کیا۔

حضرت نے فرمایا: نیک خواب آدمیت کے اجزاء میں سے ایک جزو یعنی نزعِ حظِ شیطان سے اور پھر اجزاء روح میں سے ایک جزو بصیرت سے مدد لیتی ہے، لہٰذا جب بصیرت کا نزول شیطانی حصے کے نکل جانے پر ہو تو ان کے مجموعے سے اچھی خوابیں پیدا ہوں گی۔

میں نے عرض کیا اس سے تو یہ لازم آتا ہے کہ حدیث میں اجزاء نبوت میں سے دو جزوں کا ذکر ہوتا کیونکہ نزعِ حظِ شیطان اور بصیرت دو جزو ہیں۔ ایک نہیں لہٰذا رویا بھی دو جزو ہونی چاہیئے تھی نہ کہ ایک جزو۔

حضرت نے فرمایا کہ درحقیقت خواب کا دارومدار نزعِ حظ الشیطان پر ہے۔ روح کا جزو صرف تابع اور مددگار ہونے کی حیثیت سے ہے۔ لہٰذا جس سے اللہ تعالیٰ شیطانی حصہ نکال دے تو اس کے تمام افکار نیک ہوں گے اور وہ جب سوئے گا تو وہی خیالات دیکھے گا جن میں بیداری کی حالت میں سوچا کرتا تھا لہٰذا اس کا خواب بھی نیک ہو گا اور جس سے شیطانی حصہ نکالا نہ گیا ہو۔ اسکے خیالات

اس کے برعکس ہوں گے لہٰذا اس کا خواب بھی بد ہوگا۔

مولّفِ کتاب کہتا ہے کہ جو کچھ شیخ نے فرمایا ہے وہ محض کشف اور صفائیٔ معرفت کی وجہ سے ہے کیونکہ علماء نے تو ان میں سے ایک جزو کا بھی ذکر نہیں کیا اور انھوں نے ان کے شمار کی ذمہ داری حقائقِ نبوت کے عارفین کے ذمہ ڈال دی۔ امام حلیمی نے بڑے تکلف سے کام لیتے ہوئے کچھ باتیں بیان کی ہیں۔ جن کا ذکر میں بیان کئے دیتا ہوں تاکہ تو حقیقتِ حال سے واقف ہو جائے۔

شیخ علاؤالدین قونوی فرماتے ہیں کہ اس مقام پر حلیمی[1] نے رؤیائے صالحہ کو چھیالیس اجزاء میں سے ایک جزو ثابت کرنے کی کوشش کی ہے اور اس سلسلے میں انبیاء کے خصائص علیہ کی کئی وجوہ بیان کی ہیں جن میں سے بعض میں تکلف سے کام لیا ہے، یہاں تک کہ ان اجزاء کو چھیالیس تک پہنچا دیا ہے تاکہ رؤیا ان اجزاء میں سے ایک جزو بن جائے چنانچہ نبوت کا بلند ترین جزو اللہ تعالیٰ سے بلا واسطہ[1] کلام کرنا ہے، اس کے بعد الہام جس میں کلام نہ ہو۔ سوم[3] وحی بزبانِ فرشتہ۔ چہارم[4] فرشتہ کا دل میں القاء، پانچواں[5] کمالِ عقل، چھٹا[6] قوتِ حافظہ کا کمال کہ ایک بار سننے سے پوری سورت یاد ہو جائے۔ ساتواں[7] اجتہاد میں خطا سے معصوم ہونا۔ آٹھواں[8] ذکاء فہم تاکہ کئی قسم کے مسائل کا استنباط کر سکے۔ نواں[9] کمالِ بصر تاکہ دنیا کے بعید ترین حصّوں میں ان اشیاء کو دیکھ سکے جو دوسروں کو دکھائی نہیں دے سکتیں۔ دسواں[10] کمالِ سماعت تاکہ دنیا کے بعید ترین علاقوں کی وہ باتیں سن سکے جن کو دوسرے نہ سن سکیں۔ گیارھواں[11] کمالِ قوتِ شامّہ جیسے حضرت یعقوب علیہ السلام کے ساتھ یوسف علیہ السلام کی قمیض کا واقعہ پیش آیا۔ (کہ انھوں نے دُور سے ہی قمیض کی بُو سونگھ لی) بارھواں[12] جسمانی طاقت کہ ایک ہی رات میں ایک ماہ کی مسافت طے کر سکے، تیرھویں[13] آسمانوں پر عروج۔ چودھواں[14] وحی کا گھنٹی کی سی آواز میں آنا۔ پندرھواں[15]

---

[1] حلیمیؒ: شؒ امام ابوعبداللہ حسین بن الحسن الحلیمی الجرجانی الشافعی متوفی ۴۰۳ھ ۱۰۱۲ء ان کی کتاب منہاج الدین فی شعب الایمان ہے۔ یہ تین جلدوں میں ضخیم کتاب ہے جس میں اصول ایمان پر بحث کی گئی اس کتاب کا اختصار قاضی علاؤالدین ابوالحسن علی بن اسمٰعیل تبریزی قونوی متوفی ۷۳۹ھ ۱۳۳۸ء نے کیا۔ مصنف کشف الظنون نے ان کے بیٹے محب الدین ابوالثناء محمد بن الشیخ علاؤالدین علی القونوی ثم القاہری الشافعی المتوفی ۷۵۸ھ کا ذکر کیا ہے کہ اس نے منتھی السوال والامل فی علمی الاصول والجدل کی شرح کی ہے۔ ۱۲ علاؤالدین قونوی نے التصرف فی التصوف بھی لکھی جو حاجی خلیفہ کے خیال میں التعرف کی شرح ہے۔

بکری کا کلام کرنا۔ سولھواں[16] نباتات کو گویا کرنا۔ سترھواں[17] کھجور کے تنے کا گویا کرنا۔ اٹھارواں[18] پتھر کو گویا بنانا انیسواں[19] بھیڑیوں کے چیخنے کو سمجھنا کہ وہ آپ سے کوئی چیز کھانے کو مانگ رہے ہیں۔ بیسواں[20] آپ کا اونٹوں کے بلبلانے کی آواز کو سمجھنا۔ اکیسواں[21] ایسی آواز کا سننا جس کا بولنے والا دکھائی نہ دے رہا ہو۔ بائیسواں[22] جنات کے مشاہدے کی قدرت رکھنا۔ تیئسواں[23] نظر سے اوجھل چیزوں کا سامنے آجانا جیسے شب معراج کی صبح کو بیت المقدس آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے لا رکھا گیا۔ چوبیسواں[24] ایسے واقعہ کا پیش آنا جس سے انجام کا علم حاصل ہو۔ مثلاً جب آپؐ کی اونٹنی حدیبیہ کے مقام پر بیٹھ گئی تو آپؐ نے فرمایا کہ ہاتھیوں کو روکنے والے نے اسے بھی آگے جانے سے روک دیا ہے۔ پچیسواں[25] نام سے کسی معاملہ پر استدلال کرنا چنانچہ جب صلح حدیبیہ میں سہیل[1] بن عمرو آیا تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "تمہارا معاملہ آسان ہوگیا"۔ چھبیسواں[26] کسی آسمانی چیز کو زمین کے کسی واقعہ پر استدلال کرنا، مثلاً آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بادل کو دیکھ کر فرمایا کہ یہ بنی کعب کی فتح کی خوشخبری دے رہا ہے۔ ستائیسواں[27] پشت کی طرف سے دیکھنا۔ اٹھائیسواں[28] کسی مرنے والے کے متعلق ایسے معاملہ کی اطلاع پانا جو اس کے مرنے سے پہلے واقع ہوا تھا مثلاً آپ کا حنظلۃ الغسیل[2] کے متعلق فرمانا کہ میں نے دیکھا کہ ملائکہ اسے غسل دے رہے ہیں اور حنظلہؓ

---

[1] سہیل بن عمرو: صلح حدیبیہ کے موقعہ پر یہ قریش مکہ کی طرف سے سفیر بن کر آئے تھے ان کے بیٹے ابو جندلؓ اس وقت اسلام لا چکے تھے۔ یہ جنگ بدر میں مشرکوں کے ساتھ ہوکر لڑے اور قید ہوئے۔ یہ قریش کے بہت بڑے خطیب تھے۔ جب جنگ بدر میں قید ہوکر آئے تو حضرت عمرؓ نے عرض کیا، اس کے اگلے دانت نکال دیئے جائیں تاکہ آئندہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف تقریر نہ کر سکے مگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، اسے اسی طرح رہنے دو۔ یہ آئندہ جاکر ایسا کام کرے گا جس سے تو خوش ہوگا چنانچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات پر جب مکہ کے لوگوں میں اختلاف پیدا ہوگیا اور کچھ لوگ مرتد بھی ہوگئے تو اس وقت ان کی تقریر نے لوگوں کو مدھم کیا تھا۔ ان کی وفات عمواس کی طاعون میں ۱۸ھ۔ ۶۳۹ء میں ہوا۔

[2] حضرت حنظلہ بن مالک مشہور صحابی ہیں جن کا لقب غسیل الملائکہ ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کی نئی نئی شادی ہوئی تھی بیوی کے پاس گئے ہی تھے کہ اعلان جنگ ہوگیا۔ اسی حالت میں نکل آئے اور لڑتے لڑتے جنگ احد میں شہید ہوگئے۔ آپ چونکہ جنبی تھے اور شہید کو غسل نہیں دیا جاتا اس لیے انہیں فرشتوں نے غسل دیا۔ یہاں اسی واقعہ کی طرف اشارہ ہے۔ ایک اور صحابی کا نام بھی حنظلہؓ ہے مگر ان کے والد کا نام رُبیع الاُسَیدی ہے۔

مرنے سے پہلے جُنبی تھے۔ انتیسواں[29] ایسے امور کا ظہور جن سے آئندہ ہونے والی فتوحات پر استدلال ہو سکے جیسا کہ خندق کے دن کا واقعہ ہوا۔ تیسواں[30] دنیا کے اندر ہی جنت و دوزخ پر اطلاع پانا۔ اکتیسواں[31] فراست۔ بتیسواں[32] درخت کا آپ کی اطاعت کرنا یہاں تک کہ وہ ٹہنیوں اور جڑوں سمیت ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل ہو گیا۔ تینتیسواں[33] ہرنی کا واقعہ اور اپنے چھوٹے بچے کی ضرورت کی شکایت کرنا۔ چونتیسواں[34] خواب کی تعبیر کو جاننا اور اس میں کبھی بھی غلطی نہ کھانا۔ پینتیسواں[35] کسی چیز کا اندازہ معلوم کر لینا اور اس کا ٹھیک اسی طرح نکلنا۔ چھتیسواں[36] مخلوقات کو اسلام کی طرف ہدایت کرنا۔ سینتیسواں[37] مخلوق کو دینی و دُنیوی سیاست کی راہ دکھانا۔ اڑتیسواں[38] نیکی اور ہدایت کے راستوں کی طرف مخلوق کی ہدایت کرنا۔ انتالیسواں[39] طبی طریقوں سے اصلاحِ جسمانی کی تعلیم۔ چالیسواں[40] قربِ الٰہی حاصل کرنے کی راہ دکھانا۔ اکتالیسواں[41] مفید صنعتوں کی تعلیم۔ بیالیسواں[42] مغیبات کا علم جن کا ذکر پہلے کسی نے نہ کیا ہو۔ تینتالیسواں[43] آئندہ پیش آنے والے واقعات کا علم۔ چوالیسواں[44] لوگوں کے مخفی معاملات اور اسرار سے واقفیت۔ پینتالیسواں[45] استدلال کے طریقوں کی تعلیم۔ چھیالیسواں[46] معاشرے میں مہربانی کے طریقوں کا علم۔

اس طرح عالی نبوی خصائص کی تعداد چھیالیس[46] ہو جاتی ہے۔ ان میں سے ہر وجہ رویائے صالحہ کے مل جانے کے قابل ہے تاکہ وہ چھیالیس اجزاء نبوت میں کا ایک جزو بن جائے اور اگرچہ ان میں سے خصائل غیر نبی میں بھی پائے جاتے ہیں، لیکن نبی سے ان میں کوئی غلطی واقع نہیں ہوتی اور دوسروں کو کبھی غلطی لگ جاتی ہے واللہ اعلم۔

مؤلفِ کتاب کہتا ہے کہ حلیمی کے بیان پر اعتراض ہے کیونکہ اس کا مقصد محض اجزاء نبوت کا شمار کرنا تھا اور جن وجوہ کا ذکر ہوا ان میں سے اکثر ایسی خصال ہیں جو صرف ذاتِ محمدی کے ساتھ مخصوص ہیں، مثلاً بکری کا کلام کرنا۔ پتھر کا سلام کرنا۔ کھجور کے تنے کا رونا۔ بھیڑیے اونٹ اور ہرنی کی زبان سمجھنا۔ بیت المقدس کا آنکھوں کے سامنے آجانا اور یہ فرمانا کہ ہاتھیوں کو روکنے والے نے اسے بھی روکا ہے اور آپ کا فرمانا "تمہارا کام تمہارے لیے آسان ہو گیا" اور آپ کا فرمانا "یہ بادل بنی کعب کی فتح کی خبر دے رہا ہے"۔ حنظلہؓ کی جنابت کا علم اور جو کچھ خندق کے کھودنے میں پیش آیا۔ درخت کا آپ کی اطاعت کرنا اور ایک جگہ سے دوسری جگہ چلا جانا وغیرہ وغیرہ کیونکہ یہ تو اجزاء نبوت میں شامل نہیں کی جا سکتیں کیونکہ یہ تو ایسی جزئیات ہیں جو واقع ہوئیں اور منقطع ہو گئیں مزید براں ان میں سے پہلے چھ اجزاء تو معرفت لغات میں شامل ہیں جس طرح آنحضرت کا فرمانا کہ حَسْبُهَا حَابِسُ الْفِيلِ

(اسے اسی خدا نے روکا ہے جس نے ہاتھیوں کو روکا تھا) اور اس کے اگلے چار اور اجزاء یہ سب انجام کی معرفت میں شامل ہیں۔ یہ گیارہ خصلتیں تو محض دو خصلتیں رہ گئیں۔ پھر یہ تمام چھیالیس خصلتیں جن کے متعلق اس نے کہا ہے کہ یہ وجود علم میں سے ہیں تمام کی اصل رسالت کی خصلتوں میں سے ایک خصلت ہے یعنی غائبانہ حالت میں اور موجودگی میں علم کامل کا وجود ہے جیسا کہ اس کی شرح میں گزر چکا ہے۔ چنانچہ اس طرح بھی رسالت کی خصلتوں اور اجزاء کے لحاظ سے بھی یہ سب لوٹ کر ایک خصلت بن گئیں۔ علامہ حلیمی رحمۃ اللہ نے صرف اتنا کیا ہے کہ اس نے ان معجزات میں سے جو آنحضرت کے ہاتھوں ظاہر ہوئے تھے کچھ معجزات لے لیے ہیں جن کو اس نے نبوت مطلقہ کے ان اجزاء میں سے شمار کر لیا ہے جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور دیگر انبیاء میں پائے جاتے تھے۔ پھر ان معجزات میں سے بہت سے معجزات آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی اُمت کے اولیا کی کرامت ہو سکتے ہیں۔ کیونکہ ایک نبی کا معجزہ ایک ولی کے لیے کرامت بن سکتا ہے، جیسا کہ اہل السنت والجماعت کا عقیدہ ہے جس سے یہ واضح ہوتا ہے کہ مذکورہ بالا معجزات غیر نبی کے لیے بھی ہو سکتے ہیں۔ لہٰذا یہ کسی صورت میں بھی اجزاء نبوت میں سے نہیں ہو سکتے۔ واللہ اعلم۔

اس حدیث کی وہ شرح جو امام غزالی نے کی ہے۔

امام غزالی[1] فرماتے ہیں کہ یہ خیال نہیں کرنا چاہیئے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی بیان کردہ مقدار آپ کی زبان پر محض اتفاقیہ طور پر آجاتی تھی بلکہ آپ تو صحیح حقیقت بیان کیا کرتے تھے مثلاً آپ کا یہ فرمانا کہ صالح آدمی کا رؤیائے صالحہ نبوت کے چھیالیس (۴۶) اجزاء میں سے ایک جزو ہے کیونکہ یہ ایک صحیح تخمینہ ہے، لیکن دوسرے لوگوں کو طاقت نہیں کہ وہ اسے تخمینہ کے بغیر سمجھ سکیں کیونکہ نبوت اس مرتبے کا نام ہے جو نبی کے ساتھ مخصوص ہے جس سے نبی و غیر نبی میں امتیاز ہو سکے اور اس کے چند خواص ہیں تاکہ نبی کو اللہ اور اس کی صفات، ملائکہ اور دارِ آخرت سے متعلق حقیقی معرفت حاصل ہو مگر اس طرح کی معرفت نہیں جس طرح اوروں کو حاصل ہوتی ہے بلکہ نبی کے پاس کثرتِ معلومات اور یقین و تحقیق اس قدر ہو کہ کسی اور کو حاصل نہ ہو۔ نبی میں ایک صفت یہ ہوتی

---

[1] امام غزالی ابو حامد محمد الغزالی اپنے زمانے کے بہت بڑے امام، فلسفی اور صوفی گزرے ہیں مدرسۂ نظامیہ بغداد میں درس دیتے رہے مگر آخر عمر میں درس و تدریس چھوڑ کر گوشہ نشین ہو گئے۔ ان کی کئی ایک تصانیف ہیں جن میں زیادہ مشہور یہ ہیں: مقاصد الفلاسفہ، تہافت الفلاسفہ، کیمیاء سعادت، جواہر القرآن وغیرہ۔ ان کی پیدائش طوس میں ۴۵۰ھ، ۱۰۵۸-۱۰۵۹ء میں ہوئی اور وفات ۵۰۵ھ، ۱۱۱۱ء میں ہوئی۔

ہے کہ ملائکہ اور عالم ملکوت کو اس طرح دیکھتا ہے کہ اس میں اور دوسروں میں وہی فرق ہوتا ہے۔ جو اندھے اور بینا میں۔ اسؐ میں ایک اور قوت ہوتی ہے جس کے ذریعہ سے وہ آئندہ آنے والے مغیبات کو معلوم کر لیتا ہے اور اسی قوت کے ذریعہ سے وہ لوحِ محفوظ کا بھی مطالعہ کر سکتا ہے اور قوت کی مثال بعینہٖ اس قوت کی سی ہے جس سے ذکی اور کند ذہن کا امتیاز ہو سکتا ہے۔

نبیؐ میں ایک اور قوت بھی پائی جاتی ہے جس سے وہ خارقِ عادت افعال کو اس طرح کر جاتا ہے جس طرح ایک عامی انسان اختیاری افعال کو کرتا ہے۔ یہ تمام صفات تحقیقی طور پر آنحضرت صلّی اللہ علیہ وسلّم میں پائی جاتی تھیں جن میں سے ہر ایک کو کئی مزید قسموں میں تقسیم کیا جاتا ہے چنانچہ ہو سکتا ہے کہ ہم ان کی چالیس قسمیں بنالیں۔ یا پچاس یا اس سے بھی زیادہ۔ اسی طرح یہ بھی ممکن ہو سکتا ہے کہ ہم انہیں چھیالیس جزوؤں میں اس طرح تقسیم کر لیں کہ نیک خواب اس کا ایک جزو بن جائے مگر ہماری تقسیم محض اندازہ اور تخمینہ ہو گی نہ یہ کہ آنحضرت صلّی اللہ علیہ وسلّم کی مراد درحقیقت یہی تھی۔ یہ امام کی تشریح کا خلاصہ ہے۔ ہم نے اسے اس لیے یہاں نقل کر دیا ہے تاکہ تجھے حضرت کی بزرگی کا پتہ چل جائے اور ان کے علم و عرفان کا اندازہ ہو سکے اور یہ کہ اللہ جس پر چاہتا ہے اپنا فضل کرتا ہے۔

مازریؒ کی تشریح

مازریؒ[1] کہتے ہیں کہ یہ ضروری نہیں کہ عالم کو ہر چیز کا پورا اور تفصیلی علم ہو کیونکہ اللہ تعالیٰ نے عالم کے لیے بھی ایک حد مقرر کر دی ہے جہاں پہنچ کر وہ ٹھہر جاتا ہے اور آگے نہیں چل سکتا۔ چنانچہ بعض ایسے امور ہوتے ہیں جن کا نہ اجمالی علم ہوتا ہے نہ تفصیلی۔ بعض ایسے ہوتے ہیں جن کا اجمالی علم تو ہو جاتا ہے مگر تفصیلی علم نہیں ہوتا اور یہ حدیث اسی زمرے میں سے ہے۔ اھ۔ اس سے ان کی مراد چھیالیس جزو والی حدیث ہے۔

ابن بطال[2]، ابن العربی[3] اور الخطابی[4] وغیرہ کا بھی یہی بیان ہے۔

---

[1] مازریؒ: ابو عبداللہ محمد بن علی بن عمر التیمی المازری الصقلی، اہل افریقہ اور اس کے علاوہ مغرب کے امام تھے وہ سب سے آخری شخص تھے جو تحقیق فقہ میں مشغول تھے اور اجتہاد اور دقتِ نظر رکھتے تھے۔ مسلم اور قاضی عبدالوہاب کی کتاب التلقین کی شرح کی۔ نیز امام الحرمین کی برہان کی شرح کی اور اس کا نام محصول من برہان الاصول رکھا۔ انھوں نے ۵۳۶ھ / ۱۱۴۱ء میں وفات پائی۔

[2] ابن بطالؒ: ابوالحسن علی بن خلف المعروف بابن بطال مغربی مالکی۔ انھوں نے بھی بخاری کی شرح کی ہے

[3] ابن العربیؒ: ابوبکر محمد بن عبداللہ المعروف بابن العربی المعافری الاشبیلی۔ اپنے شہر میں ادب

(بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر)

ابوسعید سفاقسیؒ کی تشریح

ابوسعیدؒ السفاقسی کی سند سے ابن بطال نے بیان کیا ہے کہ بعض علماء نے ذکر کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر پہلے چھ ماہ تو خواب میں وحی نازل فرمائی پھر باقی زندگی میں اللہ تعالیٰ نے بیداری میں آپ پر وحی نازل فرمائی۔ کیونکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم صحیح روایت کے مطابق اس کے بعد تیئیس سال زندہ رہے۔ اس طرح وحی منامی کی بیداری سے جو نسبت ہے وہ ایک اور چھیالیس کی ہے۔

اس پر اعتراض

اس پر کئی طریقوں سے اعتراض کیا گیا ہے۔

۱۔ وحی منامی کے بعد جو وحی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہوئی اس کی مدت میں اختلاف ہے۔ تیئیس سال کی مدت پر سب کا اتفاق نہیں ہے۔

۲۔ اگر چھیالیس کی روایت صحیح بھی ہو تو پھر یہ توجیہ کرنے والا باقی روایات کے متعلق کیا کہے گا۔ مثلاً پینتالیس، انچاس، ستر اور پچاس جن کا اوپر ذکر ہو چکا۔

۳۔ یہ کہ ہم تسلیم نہیں کرتے کہ وحی منامی کی مدت چھ ماہ ہے۔ اگر ہے تو اس کی کیا دلیل ہے۔

۴۔ یہ کہ وحی منامی کی مدّت کے بعد جو وحی نازل ہوئی وہ صرف بیداری ہی میں نہیں نازل ہوئی بلکہ بعض اوقات خواب میں بھی وحی نازل ہوئی اور نیک خواب بھی آئے جنہیں چھ ماہ کے ساتھ ملا دینا چاہیئے تو اس طرح وحی منامی کی مدت چھ ماہ سے بڑھ جائے گی۔

تیسرے اعتراض کا جواب

تیسرے اعتراض کا یہ جواب دیا گیا ہے کہ

(بقیہ حاشیہ صفحہ سابقہ)

حاصل کیا۔ پھر بلادِ مشرق کا طویل سفر کیا اور بہت سے علماء سے جن میں امام غزالی بھی تھے ملاقات کی۔ ان کی بہت سی تصانیف ہیں۔ مثلاً احکام القرآن، کتاب المسالک فی شرح موطا امام مالک۔ انھوں نے ۵۴۳ھ ۱۱۴۸ء میں وفات پائی۔ یہ وہ ابن العربی نہیں ہیں جو مشہور صوفی ہیں۔

٤ الخطابی: امام ابوسلیمان احمد بن محمد الخطابی اپنے زمانے کے امام تھے معالم السنن، اعلام السنن اور غریب الحدیث ان کی تصانیف میں سے ہیں ان کی وفات ۳۰۸ھ ۹۲۸ء میں ہوئی۔ انھوں نے صحیح بخاری کی بھی شرح کی ہے جس کا نام اعلام السنن رکھا ہے۔

---

٥ ابوسعید السفاقسیؒ: امام عبدالواحد بن تین سفاقسی شارح بخاری۔ ان کی تفسیر بھی ہے ان کے ایک بھائی محمد بن سفاقسی نے منہاج کی شرح کی ہے انھوں نے بخاری کی بھی شرح کی ہے۔

ابن اسحٰق[1] وغیرہ کے بیان کے مطابق آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو وحی کی ابتدا چالیس سال کی عمر کے شروع میں ربیع الاوّل میں ہوئی۔ پھر غارِ حرا میں جبرئیل ماہ رمضان میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئے اور ان کا درمیانی عرصہ چھ ماہ کا ہے۔

جواب الجواب

اس جواب کا پہلا جواب تو یہ دیا گیا ہے کہ اس پر اتفاق نہیں کہ وہ مہینہ رمضان کا ہی مہینہ تھا۔ ایک جماعت کی رائے ہے کہ یہ رجب کا مہینہ ہے ایک اور جماعت کہتی ہے کہ یہ ربیع الاوّل کا مہینہ تھا۔

دوسرا جواب یہ ہے کہ اگر ہم یہ بات تسلیم بھی کر لیں کہ یہ مدت چھ ماہ کی مدت تھی پھر بھی اس میں یہ تصریح نہیں پائی جاتی کہ اس عرصہ میں وحی خواب میں ہوئی۔

چوتھے اعتراض کا جواب

چوتھے اعتراض کا یہ جواب ہے کہ خواب سے ہماری مراد متواتر خواب ہیں نہ کہ مطلق خواب۔ لہٰذا ان میں توافق پیدا کرنے کی ضرورت نہیں رہتی۔

دوسرے اعتراض کا جواب

دوسرے اعتراض کا جواب یہ ہے کہ روایات میں تعداد کا جو اختلاف پایا جاتا ہے وہ اس وقت کے اعتبار سے ہے جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حدیث بیان فرمائی مثلاً وحی آنے کے بعد تیرہ سال مکمل کر لینے کے بعد جب آپ نے بیان فرمایا ہو کہ نیک خواب نبوت کا چھبیسواں حصّہ ہے اور یہ وقت ہجرت کا وقت تھا۔ بیس سال مکمل کر لینے کے بعد فرمایا ہو کہ چالیسواں جزو ہے اسی طرح بائیس سال کے بعد چوالیسواں اور آخر عمر چھیالیسواں جزو فرمایا ہو۔ ان کے سوا دوسری تمام روایات ضعیف ہیں۔ پچاس کی روایت ممکن ہے کہ کسر کو پورا کرنے کے لیے ہو اور ستر کی روایت مبالغہ کے لیے ان کے سوا دوسری روایات صحیح ثابت نہیں ہو سکتیں۔ ان روایات میں جو مناسبت پیدا کی گئی ہے ان کا ذکر صرف حافظ ابن حجر نے کیا ہے۔ اس کے بعد اس نے کہا ہے کہ اس مناسبت میں بھی ایک اعتراض رہ جاتا ہے۔

ابن حجر کے بیان پر اعتراض

اس حدیث سے جو معنی متبادر ہوتے ہیں وہ یہ ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی مراد مؤمن صالح کے خواب کی فضلیت

---

[1] ابن اسحٰق: محمد بن اسحٰق سب سے پہلا شخص ہے جس نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سوانحعمری لکھی۔ منصور کے عہد میں ۱۵۰ھ یا ۱۵۱ھ۔ ۷۶۷ء میں وفات پائی۔

بیان کرنا ہے اور مناسبت مذکورہ اس بات کی متقاضی ہے کہ یہ جز صرف اس خواب کے متعلق ہے جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو آئی جس کا مطلب یہ ہے کہ وہ مدت جس میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو خواب میں وحی نازل ہوئی اس مدت کا چھیالیسواں حصہ ہے جس میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو بیداری میں وحی نازل ہوئی اور اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ ہر نیک آدمی کی خواب میں بھی یہی نسبت پائی جائے۔ مزید برآں ابن ابی جمرہ نے اس تاویل کو پسند نہیں کیا کیونکہ اس تاویل سے مقصد حل نہیں ہوتا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جنہیں اللہ تعالیٰ نے کمالِ فصاحت و بلاغت عطا کی تھی ان کے اِن الفاظ سے اس قسم کے معنی مراد لینا مناسب معلوم نہیں ہوتا۔ شاید اس کے قائل کا یہ مقصد ہو کہ رویائے صالحہ اور نبوت کے درمیان ایک قسم کی مناسبت پیدا ہو جائے اور اجزاء کی تعداد میں جو اختلاف ہے اسے اسی میں کھول دیا جائے۔

اس مذکورہ بالا اختلاف میں مناسبت پیدا کرنے کی کئی ایک علماء نے کوشش کی ہے۔

ابو جعفر طبری کا بیان

امام ابو جعفر طبری نے لکھا ہے کہ ستّر والی روایت ہر مسلمان کی سچی خواب کے متعلق ہے اور چالیس والی روایت سچے اور دیندار مومن کی خواب کے بارے میں ہے اور ان کے درمیان والی روایتیں عام مومنین کے حالات کے اعتبار سے ہوں گی۔

ابن بطّال کا بیان

امام ابن بطال فرماتے ہیں۔ تعداد اجزاء میں کمی یا بیشی کے اعتبار سے جو اختلاف پایا جاتا ہے تو ان میں صحیح ترین روایت چھیالیس اور ستر والی روایتیں ہیں۔ کیونکہ خواب کی دو قسمیں ہیں۔ ایک صاف اور واضح خواب مثلاً اگر کوئی خواب میں دیکھے کہ اسے پھل دیا گیا ہے اور پھر بیداری میں وہی واقعہ پیش آئے اور اسے اسی قسم کا پھل دیا جائے، اس قسم کی خواب کی تعبیر میں نہ کوئی دقت پیش آتی ہے اور نہ اس کی تفسیر میں کوئی رمز یا اشارہ ہوتا ہے اور دوسری مخفی جو ظاہر نہ ہو۔ اس قسم کی خواب کی تعبیر ایک ماہر ہی کر سکتا ہے کیونکہ اس میں بہت دور کی مثال دی گئی ہوتی ہے۔ اس لحاظ سے ہو سکتا ہے کہ خواب کی دوسری قسم ستر میں سے ایک جزو ہو اور پہلی قسم چھیالیسواں جزو۔ کیونکہ جس قدر اجزا کم ہوں گے۔ اسی قدر خواب سچائی کے زیادہ قریب ہو گی اور اسی قدر اس کی تعبیر میں غلطی کا کم احتمال ہو گا اس کے برخلاف جس قدر اجزاء زیادہ ہوں گے اس کی تعبیر میں غلطی کا زیادہ احتمال ہو گا۔ ابن بطال کہتے ہیں کہ میں نے یہ جواب کئی ایک لوگوں کو سنایا تو انھوں نے اسے پسند کیا۔

ایک اور بیان

کسی اور نے اس میں یہ اضافہ کیا ہے کہ نبوت اسی قسم کے دو وصفوں پر مشتمل ہے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جبرئیل کے ذریعہ سے انہی دو طریقوں پر نبوت حاصل کی۔ چنانچہ آپ فرماتے ہیں کہ کبھی آپ کو وحی آتی تو آپ جبرئیل سے بے تکلفی سے باتیں کرتے اور بعض اوقات جبرئیل آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو کچھ جملے اور جوامع کلمات پڑھاتے تو آپ کو شدید معلوم ہوتے یہاں تک کہ آپ کو لرزہ طاری ہو جاتا اور آپ سے پسینہ بہنا شروع ہو جاتا۔

مارزی نے اس کا خلاصہ یوں کیا ہے کہ خواب میں اصل واقعہ پر کئی ایک دلالتیں پائی جاتی ہیں چنانچہ بعض دلالتیں واضح ہوتی ہیں اور بعض خفی۔ مگر جلی میں دلالتوں کی تعداد بہت کم ہوتی ہے اور خفی میں زیادہ اور ان کے درمیان دیگر درمیانی مدارج ہیں۔

امام ابو محمدؒ ابن ابی جمرہ کا بیان

امام ابو محمد ابن[1] ابی جمرہؒ کے بیان کا خلاصہ یہ ہے کہ نبوت تو واضح امور لے کر آئی ہے۔ چنانچہ بعض وحیوں میں اجمال ہوتا ہے جسے کسی دوسری جگہ واضح کر دیا گیا ہوتا ہے۔ اسی طرح بعض خوابیں بھی صریح ہوتی ہیں جن کی تاویل کی ضرورت نہیں ہوتی اور بعض میں تاویل کی ضرورت ہوتی ہے لہٰذا اس خواب میں سے جس قدر خفی بات کو عارف سمجھ جاتے وہ اجزاء نبوت میں سے ایک جزو ہوتا ہے اور یہ جزو عارف کی سمجھ کے مطابق کبھی کم ہوتا ہے کبھی زیادہ۔ چنانچہ بلند ترین عارف وہ ہوگا جس کے فہم اور نبوت کے درجے کے درمیان کم سے کم اجزاء کی تعداد اور ادنیٰ ترین عارف وہ ہوگا جس میں تعداد زیادہ ہوگی اور ان کے علاوہ کے لیے درمیانی مدارج ہیں۔

مؤلفِ کتاب کہتا ہے کہ اس کلام کا خلاصہ یہ ہوا کہ جس قدر عارف زیادہ فہم والا ہوگا تو اس میں اجزا کی تعداد بھی کم ہوگی اور سب سے زیادہ اجزا کی تعداد ضعیف الفہم عارف کی تعبیر میں ہوگی اور درمیانی فہم والے کے لیے درمیانی حالت اور اس پر اعتراض وارد ہوتا ہے کیونکہ اسی صورت میں

---

[1] امام ابو محمد بن ابی جمرہؒ شیخ ابو محمد بن سعد بن ابی جمرۃ الازدی اندلسی متوفی ۶۹۵ھ۔ یہ بہت بڑے ولی گزرے ہیں۔ شریعت کی بڑی تعظیم کیا کرتے اور بیداری میں انہیں دیدارِ نبویؐ حاصل ہوتا۔ ان کی متعدد تصانیف ہیں جن میں سے بخاری کی شرح مسمی بھجۃ النفوس وغایتھا بمعرفۃ مالھا وما علیھا۔ تفسیر قرآن مجید وجمع النھایۃ فی بدء الخیر وغایۃ حدیث میں ایک مختصر کتاب ہے امام شعرانی نے ان کا حال لکھا ہے۔ (لواقح: ۱: ۱۳۸) کشف الظنون (ج ۱: ۱۹۳ھ) میں ان کی ایک اور کتاب شرح حدیث عبادۃ بن الصامت بھی دی ہے۔ وہاں ان کی تاریخ وفات ۶۷۵ھ دی ہے۔

تعداد کے اختلاف کو مُعبّر کے فہم سے متعلق کیا گیا ہے حالانکہ خواب تو کسی اور کو آئی ہوتی ہے نہ کہ مُعبّر کو۔
اگر بات اسی طرح ہوتی تو حدیث کے الفاظ یوں ہونے چاہئیں تھے "نیک آدمی کی نیک خواب کا سمجھنا نبوّت کے چھیالیس اجزاء میں سے ایک جزو ہے"۔ لہٰذا یہ عارف کے فہم کی خوبی ہوئی نہ کہ خواب کی اور یہ حدیث کے مفہوم کے خلاف ہے۔ واللہ اعلم

رحمانی وشیطانی خوابیں

میں نے حضرت سے رحمانی اور شیطانی خواب کے متعلق دریافت کیا تو حضرت نے فرمایا کہ ذات انسانی کی دو قسمیں ہیں ایک وہ جو ہر وقت حق میں مشغول ہوتی ہیں اور ان کا تعلق حق کے ساتھ ہوتا ہے دوم وہ جو ہر وقت باطل میں لگی رہتی ہیں اور ان کا تعلق بھی باطل سے ہوتا ہے اور ان میں سے ہر ایک کو وہی چیز مل جاتی ہے جو اس کے مناسب ہوتی ہے اور جو ہمیشہ سے اس کی حالت رہی ہوتی ہے۔ پھر آپ نے اس کی تشریح اس طرح کی کہ فرض کرو کہ دو سائل ہیں۔ ہر ایک نے دس دینار مانگے جو انہیں دے دیئے گئے اور وہ بہت ہی خوش ہوئے مگر ایک کی خوشی کا تعلق عطیہ دینے والے کے ساتھ ہے یہاں تک کہ اس خوشی کی شعاعیں اسکے باطن پر بھی پڑیں اور باطن بھی اس سے مسرور ہوا تاآنکہ یہ اس کی دن رات کی عادت بن گئی یہ تو وہ شخص ہے جو حق پر قائم ہے اور حق سے وابستہ ہے۔ دوسرے کی خوشی دیناروں کے ساتھ ہے کہ ان سے حاجت پوری کرے گا۔ چنانچہ دینار ملنے کے بعد اس کا خیال اُن حاجتوں کی طرف جائے گا جنہیں وہ ان سے پورا کرے گا، لیکن اپنی حاجتیں پورا کرنے اور مراد حاصل کر لینے کے بعد وہ پھر مانگنا شروع کر دے گا اور کہے گا خدایا مجھے دس دینار اور دے اس شخص کا دل تو حاجتوں میں مبتلا ہے اور اس کی نظر بھی انہی کی طرف لگی رہتی ہے اور اس کا یارب کہنا محض برائے نام ہوتا ہے دل اس سے بالکل خالی ہوتا ہے کیونکہ وہ خدا سے بے تعلق اور حجاب کے پردے میں ہوتا ہے۔ یہی وہ شخص ہے جو باطل میں لگا رہتا ہے اور اسی سے اس کا تعلق ہوتا ہے چنانچہ پہلے کے خواب اللہ سے تعلق ہونے کی وجہ سے اللہ کی طرف سے ہوتے ہیں اور دوسرے کے شیطان سے تعلق ہونے کی وجہ سے شیطان کی طرف سے۔

درحقیقت دونوں خواب اللہ کی طرف سے ہوتے ہیں۔ دوسری قسم کی خواب کو شیطان کی طرف اس لیے منسوب کیا گیا کہ شیطان اس سے خوش ہوتا ہے اور بنی آدم کے لیے اسے پسند کرتا ہے کیونکہ یہ اُن ظلمتوں سے پیدا ہوتی ہیں جنہیں شیطان پسند کرتا ہے بعینہٖ اس طرح جس طرح ایک فرع اپنی اصل کو پسند کرتی ہے کیونکہ شیطان کی اصل تاریکی ہے۔

(مؤلف کہتا ہے) آئمہ حدیث مثلاً ابن حجرؒ، ابن العربی، ابن بطالؒ اور ابن ابی جمرہؒ وغیرہ نے بھی

یہی لکھا ہے کہ خوابیں خواہ کسی قسم کی بھی ہوں اللہ کی طرف سے ہوتی ہیں۔ شیطان کی طرف انہیں صرف اس لیے منسوب کیا جاتا ہے کہ وہ ان سے خوش ہوتا ہے۔

سچی اور جھوٹی خواب

پھر میں نے سچی اور جھوٹی خواب کے متعلق سوال کیا۔

حضرت نے جواب دیا کہ سچی خواب وہ ہے جس کے دیکھنے والے کا دل سوتے ہوئے بھی معاینہ و مشاہدۂ حق میں لگا ہوا ہو۔ جیسا کہ اکثر جاگتے میں رہتا ہے اور جھوٹی خواب اس کے برعکس حالت والے کی ہوتی ہے کہ اس کا دل سوتے میں ایسا ہوتا ہے جیسے عام لوگ کہا کرتے ہیں وہم لیکر گیا اور وہم لے کر واپس آیا۔ اسی لیے جس طرح وہ بیداری میں معاینۂ حق سے محجوب ہوتا ہے اسی طرح خواب میں بھی محجوب ہوتا ہے۔

میں نے عرض کیا کہ بعض اہل ظلام کی خوابیں بھی کبھی سچی ہوتی ہیں اور خواب والے کے دل کو محجوب نہیں کرتیں حالانکہ آپ نے فرمایا ہے کہ اہل ظلمت کے خواب شیطان کی طرف سے ہوتے ہیں اور جو شیطان کی طرف سے ہو اس میں حجاب کا ہونا ضروری ہے۔ چنانچہ عزیز مصر نے خواب دیکھا جس کا ذکر قرآن مجید میں کیا گیا ہے چنانچہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: وَقَالَ الْمَلِكُ إِنِّي أَرَىٰ سَبْعَ بَقَرَاتٍ سِمَانٍ (الآیہ) (سورۂ یوسف)

حضرت نے فرمایا یہ اس لیے ہوا کہ اس میں یوسف علیہ السلام کا راز اور حق شامل تھا اور یہی خواب حضرت یوسف علیہ السلام کی شہرت، اُن کے قید خانہ سے نکلنے اور ملک پر تسلّط کا باعث ہوا۔ اس کے علاوہ بھی کبھی کافر کی خواب سچی نکل آتی ہے۔ جب اس کے ساتھ کسی اور کا تعلق ہو اور اس خواب کا تعلق بادشاہ کے تمام معاصرین کے ساتھ ہے اسی لیے یہ خواب اوروں کے لیے تھا، خاص بادشاہ کے لیے نہ تھا۔

میں نے عرض کیا تو کیا قید خانہ میں حضرت یوسف علیہ السلام کے دو ساتھیوں کی خواب انہی کے متعلق نہ تھی کیونکہ ہر ایک کی خواب واقعہ کے مطابق نکلی تھی، لہٰذا غیر کا تعلق کہاں رہا۔

حضرت نے فرمایا: اس میں بھی یوسف علیہ السلام کا حق تھا اور یہی اُن کی شہرت، اُن کے قید سے نکلنے اور ملک پر قابض ہونے کا سبب بنا۔ مختصر یہ کہ اہلِ ظلمت کی خواب اُسی وقت سچی نکلتی ہے جب اس میں اور کا حق شامل ہو یا اس میں خواب دیکھنے والے کے لیے اس مذہب حق کے حق ہونے کی شہادت ہو جس مذہب پر خواب دیکھنے والا خود نہیں ہے یا یہ خواب اس کی توبہ کا سبب ہو وغیرہ۔

(مؤلف کہتا ہے) فتح الباری میں اسی طرح دیا ہے۔ حافظ ابن حجر بے حیا، مفسدہ پرداز اور

مشرکوں کی خواب کے باب میں لکھتے ہیں کہ معبّرین کا کہنا ہے کہ اگر کوئی خائن یا فاسق کوئی نیک خواب دیکھے تو یہ خواب بعض اوقات اس کے ایمان لے آنے کی خوشخبری ہوتی ہے۔ یا توبہ کرنے کی یا اس میں اس کے کفر و فسق پر قائم رہنے کی اطلاع پائی جاتی ہے اور بعض اوقات یہ خواب اوروں کے لیے ہوتی ہے مثلاً اُن اہلِ فضل لوگوں کے لیے جن کے ساتھ اسے نسبت ہوتی ہے اور بعض اوقات انہیں ایسی خواب آتی ہے جس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ جو کچھ وہ کر رہے ہیں وہ درست ہے حالانکہ یہ ایک قسم کی آزمائش، دھوکا اور فریب ہوتا ہے۔

(میں کہتا ہوں) جب وہ ایسی خواب دیکھے جس میں کفر پر رضامندی پائی جائے تو یہ نیک نہیں کیونکہ نیک خواب تو سچی خواب ہوتی ہے یا اس سے بھی خاص جیسا کہ اس سے پہلے مذکور ہو چکا۔ ہو سکتا ہے کہ حضرت کا ذہن نیک خواب کی بجائے کافر کی مطلق خواب کی طرف چلا گیا ہو۔

ضرر رساں اور غیر ضرر رساں خوابیں

پھر میں نے حضرت سے سوال کیا کہ کون سی پریشان کن خواب ضرر رساں ہوتی ہے اور کونسی غیر ضرر رساں اور اس سے پہلے عورت کا قصّہ بھی سنا دیا جس نے خواب میں دیکھا کہ اس کے گھر کا ستون گر گیا ہے اور اس نے ایک کانا بیٹا جنا ہے اور خواب کے وقت اس کا خاوند تجارت کے لیے دُور سفر میں گیا ہوا تھا۔ اس عورت نے آکر یہ خواب آنحضرت صلّی اللہ علیہ وسلّم کی خدمت میں سنایا تو آپ نے فرمایا، تمہارا خاوند انشاء اللہ صحیح و سلامت واپس آجائے گا اور تیرے ہاں ایک صالح بچہ پیدا ہو گا۔ اس کے بعد وہی عورت پھر ایک بار آئی اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اس وقت تشریف فرما نہ تھے۔ اس لیے اس نے اپنی خواب حضرت عائشہ[1] سے بیان کی۔ حضرت عائشہ رضؓ نے فرمایا کہ اگر تمہاری خواب سچی ہے تو تمہارا خاوند سفر میں مر جائے گا اور تیرے ہاں ایک بدکار بچہ پیدا ہو گا جب آنحضرتؐ تشریف لائے اور حضرت عائشہ رضؓ نے ان سے خواب اور تعبیر کا ذکر کیا۔ آنحضرتؐ کو ناگوار گزرا اور فرمایا۔ اے عائشہ جب کسی مسلمان کی خواب کی تعبیر کرو تو اچھی تعبیر کیا کرو کیونکہ خواب اپنی تعبیر کے مطابق واقع ہوتی ہے۔

[1] عائشہ رضؓ: اُمُّ المومنین حضرت عائشہ رضؓ حضرت ابوبکر رضؓ صدّیق کی بیٹی تھیں آنحضرت صلّی اللہ علیہ وسلّم سے ان کی شادی مکہ ہی میں چھ برس کی عمر میں ہو گئی تھی مگر یہ آنحضرتؐ کے گھر مدینہ میں جنگ بدر کے بعد ۲ھ میں گئیں۔ جب کہ اُن کی عمر نو سال کی تھی۔ آپ سے بے شمار لوگوں نے حدیث کی روایت کی ہے۔ ان کی وفات ۵۷ھ / ۶۷۶ء یا ۵۸ھ / ۶۷۷ء میں ہوئی۔

ابنِ حجر کہتے ہیں کہ دارمیؒ[1] نے اس حدیث کو سلیمان بن یسارؒ[2] کی سند سے حضرت عائشہ سے بسند حسن روایت کیا ہے۔

حضرت نے فرمایا کہ پریشان کن خواب اللہ کی طرف سے بندے کے لیے تنبیہ اور آزمائش ہوتی ہے کہ آیا اس خواب کے دیکھنے کے بعد بھی وہ اپنے رب کے ساتھ رہتا ہے یا نہیں۔ لہٰذا اگر بندے کا تعلق اللہ کے ساتھ ہو اور وہ پریشان کن خواب دیکھے تو وہ نہ اس کی طرف توجہ دے گا اور نہ پروا کرے گا کیونکہ اسے علم ہے کہ یہ خواب اس خدا کی طرف منسوب ہے جس کے قبضہ میں تمام معاملات اور ان کا ردّ و بدل ہے اور یہ کہ جو کچھ اللہ تعالیٰ نے اختیار کر لیا ہے وہ تقدیر میں لکھا جا چکا ہے اس لیے وہ خواب سے نہیں ڈرے گا اور نہ اس کی طرف توجہ دے گا اور انشاء اللہ یہ خواب اسے نقصان دہ نہ ہوگا۔ مگر جب بندے کا تعلق اللہ سے نہ ہوگا اور اُسے پریشان کُن خواب آئے گا تو وہ اُسے اپنی آنکھوں کے سامنے رکھے گا اور اس کا باطن ہمہ تن اسی کی طرف مشغول ہوگا اور وہ اپنے رب سے منقطع ہو جائے گا اور وہ سمجھے گا کہ یہ خواب ضرور پوری ہو کر رہے گی اور وہ اس سے غافل ہو جائے گا کہ اللہ نے اس کی تقدیر میں کیا لکھا ہے اور جو کسی چیز سے ڈرتا ہے وہ اس پر مسلّط ہو جاتی ہے۔ لہٰذا خواب اس قسم کے آدمیوں کو نقصان پہنچاتی ہے۔

جب خواب نقصان دہ نہیں تو پھر تعوّذ کا کیوں حکم دیا گیا؟

میں نے عرض کیا جب خواب نقصان نہیں دے سکتی تو پھر دیکھنے والے کو کیوں حکم دیا گیا کہ وہ اس خواب اور شیطان سے اللہ کی پناہ طلب کرے اور بائیں جانب تین بار تھوکے۔

حضرت نے فرمایا کہ مومنین کے دل اللہ کے نام پر سوتے ہیں اور اسی کے نام پر بیدار ہوتے ہیں۔ لہٰذا جب وہ سوتے ہیں تو اللہ ان کے دل میں ہوتا ہے اور جب بیدار ہوتے ہیں تب بھی اللہ تعالیٰ ان کے دلوں میں ہوتا ہے۔ لہٰذا جب اُن میں سے کوئی شخص پریشان کن خواب دیکھتا ہے اور

---

[1] دارمیؒ: ابومحمد عبداللہ بن عبدالرحمٰن دارمی۔ حافظ سمرقندی۔ انہیں اپنے زمانے کا امام سمجھا جاتا تھا۔ ۱۸۱ھ، ۷۹۷ء میں پیدا ہوئے اور چالیس سال کی عمر میں ۲۲۵ھ، ۸۳۹ء میں وفات پائی۔

[2] سلیمان بن یسارؒ: ابوایوب سلیمان بن یسار الھلالی المدنی۔ اپنے زمانے کے بہت بڑے عالم تھے زہری کہتے ہیں کہ یہ علماء میں سے تھے۔ نسائیؒ کہتے ہیں کہ امام تھے اور ابوزرعہ انہیں ثقہ کہتے ہیں۔ تہتر برس کی عمر میں ۱۰۷ھ، ۷۲۵ء میں وفات پائی۔

بیدار ہوتا ہے تو اس کا دل اس حالت سے متزلزل ہو جاتا ہے جس پر سویا تھا اسی واسطے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے اپنی حالت پر لوٹ جانے کا حکم دیا۔ اس طرح کہ وہ اللہ کی طرف لوٹے اور اللہ تعالیٰ کو اپنے اور پریشان کن خواب کے درمیان رکھے۔ استعاذہ سے یہی مراد ہے اس طرح اس کا تعلق اللہ سے ہو جائے گا اور پریشان کن خواب سے منقطع ہو جائے گا اور چونکہ شیطان تو یہ پسند نہیں کرتا کہ وہ اللہ کی طرف رجوع کرے اس لیے اُسے اللہ کی پناہ لینے کے لیے کہا گیا ہے کہ وہ اللہ کو اپنے اور اس لعین (یعنی شیطان) کے درمیان کر دے اور اس کا تعلق لعین سے منقطع ہو کر اللہ سے ہو جائے اور تھوکنے کا حکم اس لیے دیا گیا ہے کہ وہ جس حالت سے رجوع کر رہا ہے اس کو پلید (استقذار) سمجھے اس لیے کہ اس حالت میں وہ اللہ سے منقطع ہو چکا ہے اسی لیے اس حالت کو حقیر سمجھتے ہوئے وہ بائیں جانب تین بار تھوکتا ہے۔

بائیں طرف تھوکنے کا حکم کیوں دیا گیا

حضرت نے فرمایا کہ بائیں طرف تھوکنے کا حکم اس لیے دیا گیا کہ شیطان جب کسی کے پاس آتا ہے تو بائیں جانب سے آتا ہے۔ پھر فرمایا کہ ہر طرح کی بھلائی دائیں جانب سے ہوتی ہے۔ چنانچہ وہ حافظِ کتاب فرشتہ جس کا نور قوی ہوتا ہے دائیں طرف ہوتا ہے اور جس کا نور کمزور ہوتا ہے وہ بائیں طرف ہوتا ہے جنت دائیں طرف ہے اور جہنم بائیں طرف۔ جبرئیل جب کبھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آتے تو دائیں جانب سے آتے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم شہداء کی ارواح کو دائیں جانب سے ہی دیکھا کرتے تھے کیونکہ بدر اور اُحُد وغیرہ میں ان کی شہادت کے بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جب ان کی وجہ سے پریشان ہوتے تو آپ دائیں طرف دیکھتے اور انہیں گھوڑوں پر سوار کفار کے خلاف جہاد کرتے ہوئے دیکھتے۔ عرش دائیں جانب ہے اور فرش (زمین) بائیں جانب۔ زمین کے جس حصے میں بنی آدم کے مومنین آباد ہیں وہ دائیں جانب ہی ہے اور جس حصہ میں جنّ آباد ہیں وہ بائیں جانب ہے دائیں جانب کی رگیں کثرت سے اللہ کی تسبیح بیان کرتی ہیں۔ برخلاف اس کے بائیں جانب کی رگیں خاموش ہیں۔ نورِ حق دائیں طرف سے آتا ہے اور باطل بائیں سے۔ مختصر یہ ہے کہ خیر دائیں جانب سے آتی ہے اور شر بائیں جانب سے۔

دائیں جانب سے کیا مراد ہے؟

مَیں نے عرض کیا کہ دائیں جانب سے کیا مراد ہے؟

حضرت نے فرمایا جسے اللہ کی طرف سے فتح (شرحِ صدر) نصیب ہو، اسے ہر طرح کی بھلائی

دائیں جانب سے ہی حاصل ہوتی ہے اور ہر طرح کی شر بائیں جانب سے۔ پھر جب وہ رُخ بدلتا ہے تو صورتِ حال بھی بدل جاتی ہے۔ چنانچہ اگر فرض کر لیا جائے کہ وہ مشرق کی طرف جا رہا ہے تو ہر قسم کی بھلائی مثلاً جنت، عرش، ارواحِ شہداء، کو دائیں جانب یعنی جنوب کی طرف دیکھے گا اور اپنی بائیں جانب یعنی شمال کی جانب جہنم، شیاطین اور اشقیاء کی ارواح وغیرہ ظلمانی چیزیں دکھائی دیں گی۔ اسی طرح اگر وہ پلٹ کر مغرب کی جانب رُخ کرے اور اس کا دایاں ہاتھ شمال کی جانب ہو اور بایاں جنوب کی جانب تو اسے مذکورہ بالا خیرات دائیں جانب دکھائی دیں گی اور ہر قسم کی مذکورہ بالا شر وغیرہ بائیں طرف۔ علیٰ القیاس، جب وہ کسی اور جانب رُخ پھیرے تو صورتِ حال بھی اسی کے مطابق پھر جائے گی۔

حضرت نے فرمایا کہ اس کا راز یہ ہے کہ عارف کے دو آئینے ہوتے ہیں جن سے وہ دیکھتا ہے ایک نورانی جس سے صرف نور ہی نظر آتا ہے اور دوسرا ظلمانی جس سے صرف تاریکیاں ہی دکھائی دیتی ہیں۔ نورانی اشیاء اس کی دائیں جانب ہوتی ہیں اور یہ دراصل اس کا نورِ ایمان ہوتا ہے اور ظلمانی اس کی بائیں جانب اور یہ دراصل نفسِ خبیثہ کی شہوات اور ان کا خُبث ہے جو بمقابلہ نورِ ایمان کے ہے۔ لہٰذا جب وہ دائیں جانب دیکھے گا تو اس کا دیکھنا نورِ ایمان کے ساتھ ہوگا اسی لیے اسے نورِ ایمان کے مشابہ اشیاء، جو حق و نور ہیں دکھائی دیں گی اور جب وہ بائیں جانب دیکھے گا تو شہواتِ نفس کی ظلمتوں کو دیکھے گا۔ اسی لیے اسے اس کی ہم شکل اشیاء دکھائی دیں گی، اس کی وجہ یہ ہے کہ اس کا دیکھنا طبیعتِ ذات کی نگاہ سے ہوتا ہے کیونکہ اس میں روح اور ذات دونوں کام کر رہی ہوتی ہیں لہٰذا جب روح ایمان کے ہوتے ہوئے ذات میں محبت رضا اور قبول سے قرار پائے گی تو ان دونوں کے ساتھ نور برقرار رہے گا اور یہ نور اس کا نورِ ایمان ہی ہوتا ہے جو اس کی ذات سے مل کر ایک ہو گیا ہوتا ہے اور دیکھنے والی چیز عقل ہوتی ہے چنانچہ جب یہ عقل نورِ روح کے آئینہ سے دیکھتی ہے تو اُسے پاکیزہ چیزیں دکھائی دیتی ہیں، لیکن جب نورِ ذات کے آئینہ سے دیکھتی ہے تو اسے تاریک اور اسی قسم کی دیگر اشیاء نظر آتی ہیں۔

وہ حدیث اسی پر محمول ہے جس میں اُن اشکال کا ذکر آتا ہے جو آدم علیہ السلام کی دائیں جانب تھیں اور جنہیں دیکھ کر وہ ہنستے تھے اور اُن اشکال کا جو آدم علیہ السلام کی بائیں جانب تھیں اور جنہیں دیکھ کر وہ رو پڑتے تھے۔ پہلی قسم کی شکلیں نیک لوگوں کی روحیں تھیں اور دوسری قسم کی شکلیں بدبختوں کی روحیں تھیں۔

تین بار تھتکارنے میں حکمت

حضرت نے فرمایا کہ تین بار تھتکارنے کا حکم اس لیے دیا کہ پہلا ذات کی طرف سے۔ دوسرا روح کی طرف سے اور تیسرا بندے کا حق تعالیٰ سے مدد چاہنے کے لیے۔ تین بار تھتکارنے میں یہی راز پایا جاتا ہے کہ آنکھ کھلنے پر کروٹ بدلے تو یہ اس لیے ہے کہ پہلی نیند کا معاملہ ختم ہو جائے اور وہ ایسا ہو گا جیسا کہ اس نے از سرِ نو اللہ کے ذکر سے نیند شروع کی ہو برخلاف اس کے اگر کروٹ نہ بدلے گا تو یوں سمجھا جائے گا کہ وہ ابھی پہلی نیند ہی سو رہا ہے۔

پریشان خواب دیکھنے کے بعد نماز پڑھنے کا حکم!

حضرت نے فرمایا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک بار تو نماز پڑھنے کو فرمایا۔ (مؤلف کہتا ہے کہ یہ روایت صحیح مسلم کی ہے) اور دوسری مرتبہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے نماز کا ذکر نہیں کیا (مؤلف کہتا ہے کہ یہ بخاری کی روایت ہے) لہٰذا جس کا دل چاہے نماز پڑھ لے اور جس کا دل چاہے اپنی حالت پر رہے اور نہ پڑھے۔ نماز پڑھنے کے حکم میں یہ راز ہے کہ جو ظلمت پریشان خواب کی وجہ سے اس کی ذات میں داخل ہو گئی ہے وہ مٹ جائے اور وہ نماز سے ذات کو اس ظلمت سے نکال کر پاک کر لے۔

مؤلف کتاب کہتا ہے کہ پریشان خواب کے آداب یہ ہیں۔ اُس کے شر سے اللہ کی پناہ چاہنا۔[۱] شترِ شیطان سے پناہ مانگنا۔ تین[۳] بار بائیں طرف تھتکارنا۔ جس[۴] کروٹ خواب آئی ہو اُسے بدلنا۔ اور[۵] نماز کیلئے کھڑا ہونا۔ پہلی چار باتیں ضروری ہیں اور پانچویں کے متعلق ایک روایت میں حکم دیا گیا ہے اور دوسری میں نہیں۔ ان کے علاوہ علماء نے دو اور آداب کا ذکر کیا ہے ایک یہ کہ آیت الکرسی پڑھے۔ ابن حجرؒ فرماتے ہیں کہ بعض علماء نے اس کا ذکر کیا ہے، لیکن مجھے اس کی کوئی سند معلوم نہیں ہو سکی۔ حضرت نے فرمایا کہ بات اسی طرح ہے جس طرح کہ ابن حجرؒ نے فرمایا ہے کیونکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے پڑھنے کا حکم نہیں دیا۔ دوسرے یہ کہ اس خواب کا کسی سے تذکرہ نہ کرے اور یہ بخاری میں مذکور ہے۔ حافظ ابن حجر فرماتے ہیں کہ خواب کے شر سے اعوذ باللہ پڑھنے کے متعلق ایک صحیح روایت آئی ہے جس کی روایت سعید[۱] بن منصور، ابن[۲] ابی شیبہ اور عبدالرزاق[۳] نے ابراہیم[۴] نخعی سے صحیح سندوں سے کی ہے

---

[۱] سعید بن منصورؒ: سعید بن منصور بن شعبہ خراسانیؒ۔ ان کی پیدائش جوزجان میں ہوئی۔ بلخ میں نشوونما پائی اور مکہ میں رہائش اختیار کی اور وہیں وفات پائی۔ یہ آئمہ حدیث میں سے تھے ان کی بہت سی تصانیف ہیں، ان کی وفات ۲۲۷ھ ۸۴۱ء میں ہوئی۔

(بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر)

کہ جب تم سے کوئی شخص بُری خواب دیکھے تو بیدار ہونے پر یہ الفاظ پڑھے:
اَعُوْذُ بِمَا اَعَاذَتْ بِہٖ مَلَآئِکَۃُ اللّٰہِ وَرُسُلُہٗ مِنْ شَرِّ رُؤْیَایَ ھٰذِہٖ اَنْ یُّصِیْبَنِیْ مِنْھَا مَا اَکْرَہُ فِیْ دِیْنِیْ وَدُنْیَایَ - (ترجمہ: میں اس خواب کے شر سے اسی ہستی کے پاس پناہ لیتا ہوں جس کے پاس اللہ کے فرشتے اور رسول پناہ لیتے رہے ہیں تاکہ مجھے اس خواب سے دین و دنیا کی کوئی تکلیف نہ پہنچے)

ڈراؤنی خواب دیکھ کر استعاذہ کے بارے میں امام مالک کی ایک اور روایت ہے وہ کہتے ہیں ہیں کہ مجھے معلوم ہوا ہے کہ خالد[۵] بن ولید رضی اللہ عنہ خواب میں ڈرا کرتے تھے۔ انھوں نے اس کا ذکر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے کیا، تو آپؐ نے فرمایا جب خواب میں ڈرو تو یہ کلمات پڑھ لیا کرو۔
اَعُوْذُ بِکَلِمَاتِ اللّٰہِ التَّامَّاتِ مِنْ غَضَبِ اللّٰہِ وَعَذَابِہٖ وَمِنْ شَرِّ عِبَادِہٖ وَمِنْ ھَمَزَاتِ الشَّیَاطِیْنِ وَاَعُوْذُ بِکَ رَبِّ اَنْ یَّحْضُرُوْنِ۔ (ترجمہ: میں اللہ تعالیٰ کے علم تام کے ساتھ اللہ کے غضب، اس کے عذاب، اس کے بندوں کے شر اور شیطانی وساوس سے پناہ لیتا ہوں، خدایا میں تیرے پاس پناہ لیتا ہوں تاکہ یہ شیاطین وغیرہ میرے پاس نہ آسکیں)۔
نسائیؒ نے عمر بن شعیبؒ عن ابیہ عن جدہ کی سند سے اسے یوں روایت کیا ہے کہ خالد بن الولیدؓ

(بقیہ حاشیہ صفحہ سابقہ)

۲؎ ابن ابی شیبہؒ: ابوبکر عبداللہ بن محمد بن ابی شیبہ حافظ کوفیؒ۔ انھوں نے عبداللہ بن ادریس اور ابن مبارک وغیرہ سے روایت کی۔ ان کی وفات ۲۳۵ھ / ۸۴۹ء میں ہوئی۔

۳؎ عبدالرزاقؒ: عبدالرزاق بن ہمام ابوبکرؒ۔ بڑے پایہ کے عالم تھے۔ انھوں نے پچاسی برس کی عمر میں ۲۱۱ھ / ۸۲۶ء میں وفات پائی۔

۴؎ ابراہیم نخعیؒ: حضرت ابراہیم بن یزید النخعی فقیہ العراقؒ۔ علقمہ، مسروق اور اسود وغیرہ سے روایت کی اور حماد بن ابی سلیمان فقیہ کے شیخ ہیں، وہ مخلص علماء میں سے تھے۔ شہرت سے بچتے تھے۔ ۹۵ھ / ۷۱۳ء میں وفات پائی۔

۵؎ خالد بن الولیدؓ: خالد بن ولید بن مغیرہ مخزومی جو سیف اللہ کے نام سے مشہور ہیں۔ یہ مشہور صحابی ہیں۔ صلح حدیبیہ کے بعد اور فتح مکہ سے پہلے ایمان لائے۔ انھوں نے غزوۂ موتہ میں شرکت کی اور انہی کے ہاتھوں فتح ہوئی۔ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے عہد خلافت میں یہ اہل روما سے جنگ کرنے پر مامور ہوئے، پھر انھوں نے عراق و شام کی جنگوں میں فتوحات حاصل کیں۔ ۲۱ھ / ۶۴۲ء میں حمص میں وفات پائی۔ ۱۲

(بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر)

خواب میں ڈر جایا کرتے تھے۔ پھر باقی روایت اسی طرح ہے لیکن اس کی ابتدا میں یہ الفاظ زائد دیے ہیں کہ جب تو سونے لگے تو یہ الفاظ پڑھ لیا کر۔ اور وہی پہلی دعا ذکر کی ہے۔ اصل حدیث ابو داؤد[1] اور ترمذی[2] میں ہے۔ حاکم نے اسے حسن اور صحیح کہا ہے، واللہ اعلم۔

۵۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی موجودگی میں حضرت ابوبکرؓ کی دی ہوئی تعبیر کے متعلق سوال

میں نے حضرت سے اس کے خواب کے متعلق سوال کیا جس کی تعبیر ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی موجودگی میں دی تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کچھ ٹھیک بتائی ہے اور کچھ غلط۔ امام بخاری نے اس قصہ کا مفصل ذکر دیا ہے۔ چنانچہ امام بخاری فرماتے ہیں: حَدَّثَنَا یَحْیٰی بن بُکَیْرٍ قَالَ حَدَّثَنَا اللَّیْثُ عَنْ یُوْنُسَ عَنْ ابْنِ شِہَابٍ عَنْ عُبَیْدِ اللّٰہِ بْنِ عُتْبَۃَ اَنَّ ابْنَ عَبَّاسٍ کَانَ یُحَدِّثُ اَنَّ رَجُلًا اَتَی النَّبِیَّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ فَقَالَ اِنِّیْ رَاَیْتُ اللَّیْلَۃَ فِی الْمَنَامِ ظُلَّۃً تَنْطِفُ السَّمْنَ وَالْعَسَلَ فَاَرَی النَّاسَ یَتَکَفَّفُوْنَ مِنْہَا فَالْمُسْتَکْثِرُ وَالْمُسْتَقِلُّ وَاِذَا سَبَبٌ وَاصِلٌ مِنَ الْاَرْضِ اِلَی السَّمَآءِ فَاَرَاکَ اَخَذْتَ بِہٖ فَعَلَوْتَ ثُمَّ اَخَذَ بِہٖ رَجُلٌ اٰخَرُ فَعَلَا بِہٖ ثُمَّ اَخَذَہٗ رَجُلٌ اٰخَرُ فَعَلَا بِہٖ ثُمَّ اَخَذَہٗ رَجُلٌ اٰخَرُ فَانْقَطَعَ ثُمَّ وُصِلَ۔

(ترجمہ: ابن عباس روایت کرتے ہیں کہ ایک شخص آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کی میں نے آج رات خواب میں ایک سایہ دار بادل دیکھا جس سے گھی اور شہد ٹپک رہا تھا دیکھا

(بقیہ حاشیہ صفحہ سابقہ)

۲؎ نسائی: مشہور محدث ہیں جن کی سُنن بالنسائی۔ مشہور حدیث کی کتاب ہے۔ انھوں نے ۳۰۳ھ ۹۱۵ء میں وفات پائی۔

۳؎ عمرو بن شعیبؒ: عمرو بن شعیب بن محمد بن عبداللہ بن عمرو بن العاص۔ ان کی اکثر احادیث کی روایت اسی طرح آئی کہ عن ابیہ عن جدہ۔ اسی لیے بخاری اور مسلم نے ان کی کوئی حدیث اپنی کتاب میں نہیں دی کیونکہ اس طرح بعض اوقات گڑبڑ پڑ جاتی ہے۔

۱؎ ابو داؤد: ابو داؤد سجستانی مشہور محدث اور مؤلف سنن ابی داؤد ہیں انہوں نے ۲۷۵ھ، ۸۸۹ء میں وفات پائی۔

۲؎ ترمذی: ابو عیسیٰ محمد الترمذی۔ جامع الترمذی کے مؤلف اور مشہور محدث ہیں انھوں نے ۲۷۹ھ، ۸۹۲ء میں وفات پائی۔

تو لوگ ہاتھ پھیلائے اسے لے رہے ہیں چنانچہ کسی نے زیادہ لے لیا اور کسی نے کم۔ پھر ایک رسّی دیکھی جو زمین سے آسمان تک پہنچی ہوئی تھی۔ چنانچہ میں نے دیکھا کہ آپؐ اس کو پکڑ کر اوپر چڑھ گئے۔ پھر اسے ایک اور شخص نے پکڑا اور وہ بھی اوپر چڑھ گیا، پھر تیسرے نے پکڑا اور وہ بھی چڑھ گیا۔ پھر چوتھے نے پکڑا تو رسی ٹوٹ گئی، لیکن پھر جڑ گئی۔

حضرت ابوبکر صدیق اللہ عنہ نے عرض کیا یا رسول اللہ! میرے ماں باپ آپؐ پر قربان ہوں۔ آپؐ مجھے اس کی تعبیر بیان کرنے دیں۔ آنحضرتؐ نے فرمایا: بہت اچھا اس کی تعبیر بیان کرو۔ ابوبکرؓ نے کہا سایہ دار بادل تو اسلام ہے اور جو گھی اور شہد اس سے ٹپک رہا ہے وہ قرآن ہے، جس کی مٹھاس ٹپک رہی ہے کوئی اس میں سے زیادہ لے رہا ہے کوئی کم۔ اور جو رسّی زمین سے آسمان تک پہنچی ہوئی ہے وہ طریق ہے جس پر آپؐ قائم ہیں۔ آپؐ اسے پکڑے ہوئے ہیں اور اللہ آپؐ کو اوپر چڑھا رہا ہے پھر آپؐ کے بعد کوئی اور اسے تھامے گا اور وہ بھی اوپر جائے گا۔ پھر تیسرا تھامے گا اور اوپر چڑھ جائے گا پھر چوتھا تھامے گا تو وہ ٹوٹ جائے گی پھر اسے جوڑا جائے گا اور وہ اوپر چڑھ جائے گا۔

یا رسول اللہ! میرے ماں باپ آپؐ پر قربان ہوں، مجھے بتلائیں کیا میں نے درست تعبیر کی یا غلط؟ آنحضرتؐ نے فرمایا کچھ ٹھیک ہے کچھ غلط۔ پھر عرض کیا کہ یا رسول اللہ آپؐ کو قسم ہے اللہ کی مجھے ضرور بتائیں کہ میں نے کیا غلطی کی۔ آنحضرتؐ نے فرمایا "قسم نہ دو"۔

حدیث کے الفاظ کی روایت میں اختلاف

"وَاِذَا سَبَبٌ وَاصِلٌ" کی بجائے ابن وہب[1] کی روایت میں سَبَبًا وَاصِلًا ہے اور وَ اَمَّا الَّذِیْ یَنْطِفُ مِنَ الْعَسَلِ وَ السَّمَنِ کی بجائے سلیمان[2] بن کثیر کی روایت میں وَاَمَّا الْعَسَلُ وَالسَّمَنُ فَالْقُرْاٰنُ فِیْ حَلَاوَۃِ الْعَسَلِ وَلِیْنِ اللَّبَنِ ہے اور لَا تُقْسِمْ کی بجائے ابن ماجہ[3]

---

[1] ابن وہبؒ: ابو محمد عبداللہ بن وہبؒ۔ انھوں نے امام مالک اور امام لیث سے فقہ کی تعلیم حاصل کی ۱۴۸ھ ۷۶۵ء میں امام مالک کے پاس آئے اور وفات تک انکی خدمت میں رہے ۱۲۵ھ ۷۴۳ء میں پیدا ہوئے ۱۹۷ھ ۸۱۳ء میں بمقام مصر وفات پائی

[2] سلیمان بن کثیرؒ: ابوداؤد سلیمان بن کثیر العبدیؒ۔ ذہبی کہتے ہیں۔ جائز الحدیث لاباس بہ ان کی وفات ۱۳۳ھ ۷۵۰ء میں ہوئی۔

[3] ابن ماجہؒ: ابو عبداللہ محمد بن یزید ابن ماجہ مشہور محدث ہیں ان کی کتاب سنن ابن ماجہ کا شمار صحاح ستہ میں ہوتا ہے۔ ان کی وفات ۲۷۳ھ ۸۸۶ء میں ہوئی۔

ہیں "لَا تُقْسِمْ یَا اَبَا بَکْرٍ" ہے۔

ابوبکرؓ کی غلطی کے بارے میں علماء کا اختلاف

علماء کا اس میں اختلاف ہے کہ ابوبکر رضی اللہ عنہ نے تعبیر میں کہاں غلطی کھائی۔ مُہلّبؒ[1] اور اس کے متبعین کا قول ہے کہ ابوبکرؓ نے ثُمَّ وَصَلَ لَہٗ کے الفاظ میں غلطی کھائی ہے اس لیے کہ حدیث میں صرف "ثُمَّ وَصَلَ" ہے "لَہٗ" کا لفظ اس میں نہیں ہے۔ انہیں وہیں ٹھہر جانا چاہیئے تھا جہاں خواب ختم ہوئی اور جس کے لیے رسی جوڑی گئی تھی اس کا تذکرہ نہ کرتے اس صورت میں معنی یوں ہوتے کہ حضرت عثمانؓ کے لیے رسّی ٹوٹی اور پھر کسی اور کے لیے جوڑی گئی یعنی خلافت کسی اور کے پاس پہنچی۔

قاضی عیاضؒ کی رائے

قاضی عیاضؒ[2] فرماتے ہیں کہ کسی نے کہا ہے کہ ابوبکر رضی اللہ عنہ کی خطا "وَصَلَ لَہٗ" کہنے میں تھی حالانکہ حدیث میں صرف "وَصَلَ" کا لفظ ہے "لَہٗ" کا نہیں ہے۔ اسی لیے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے لیے رسّی نہیں جوڑی گئی اور حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے لیے جوڑی گئی یعنی اُن تک خلافت پہنچی۔

اس کا جواب یہ ہے کہ اگرچہ "لَہٗ" کا لفظ اُصیلیؒ[3] اور کریمہ[4] کے نزدیک لیثؒ[5] کی روایت میں سے

---

[1] مُہلّب: مہلب بن ابی صفرۃ الازدیؒ، انھوں نے بخاری کی شرح لکھی ہے اور ان کے شاگرد ابوعبداللہ محمد بن خلف بن مراد نے اس شرح کو مختصر کیا ہے (کشف الظنون: ۱: ۲۸۰)

[2] قاضی عیاضؒ: ابوالفضل عیاض بن موسیٰؒ۔ مغرب میں سبتہ کا قاضی رہنے کی وجہ سے انہیں بالعموم قاضی عیاض کہا جاتا ہے ان کی تیس کے قریب تصانیف ہیں جن میں مسلم شریف کی شرح اور تفسیر قرآن میں المشارق اور الشفا فی تعریف حقوق المصطفیٰ زیادہ مشہور ہیں ۴۷۶ھ ۱۰۸۳ء میں پیدا ہوئے اور ۵۴۴ھ ۱۱۴۹ء میں وفات پائی۔

[3] اُصیلیؒ: حافظ علامہ ابومحمد عبداللہ بن ابراہیم بن محمد الاندلسیؒ: قاضی عیاض کہتے ہیں کہ یہ مالکی مذہب کے حافظوں میں سے تھے۔ حدیث، رجال اور علل حدیث سے واقف تھے۔ ان کی کتاب الدلائل فی اختلاف العلماء مشہور ہے ان کی وفات ۳۹۲ھ ۱۰۰۱ء میں ہوئی۔

[4] کریمہ: ان کا حال معلوم نہ ہو سکا۔

[5] لیثؒ: لیث بن سعدؒ: انہیں فقیہ اہل مصر کہا جاتا ہے۔ مصر میں ۹۴ھ ۷۱۳ء میں ہوئے اور ۱۷۵ھ ۷۹۱ء میں وفات پائی۔

ساقط ہوگیا ہے، لیکن اس کے تینوں استادوں کی روایت سے ابوذرؓ[1] کی حدیث میں لہ کا لفظ موجود ہے۔ اسی طرح نسفیؒ[2] کی روایت میں بھی یہ لفظ موجود ہے اور مسلم کے ہاں بھی یونسؒ[3] سے ابن وہب وغیرہ کی روایت میں یہ لفظ پایا جاتا ہے اور ترمذی کے ہاں مُعمرؒ[4] کی روایت میں۔ اسی طرح نسائی اور ابن ماجہ کے ہاں ابن عیینہؒ[5] سے سلیمان کی روایت میں۔ امام احمدؒ کے ہاں ابنِ حسینؒ[6] کی روایت سے۔ دارمیؒ[7] اور ابی عوانہؒ[8] کے ہاں سلیمان بن کثیر کی روایت سے۔ ان سب نے زہریؒ[9] سے روایت کی ہے۔ سلیمان بن کثیر کی روایت میں اِتَّصَلَ کے اضافہ سے "فَوَصَلَ لَہٗ فَاتَّصَلَ" کے الفاظ ہیں۔ لہٰذا ثابت ہوا کہ "لَہٗ" کا لفظ حدیث میں موجود ہے اس صورت میں معنی یوں ہوتے "کہ حضرت عثمانؓ ان امور کے سبب جو اُن کی خلافت میں واقع ہوتے اور لوگوں نے انہیں ناپسند کیا، قریب تھا کہ اپنے ساتھیوں تک نہ پہنچ سکتے پھر جب ان کی شہادت واقع ہوئی تو رسّی جڑ گئی اور وہ بھی اُن تک پہنچ گئے۔

---

۱ الوذرؓ: ابوذر غفاریؓ جلیل القدر صحابہ میں سے ہیں، کہا جاتا ہے کہ یہ پانچویں اسلام لانے والے تھے بعثت سے پہلے ہی اللہ کی عبادت کیا کرتے تھے حضرت عثمانؓ کے عہد میں ۳۲ھ / ۶۵۲ء میں وفات پائی۔

۲ نسفیؒ: ابوالبرکات نسفیؒ مشہور فقیہ ہیں ۷۱۰ھ / ۱۳۱۰ء میں وفات پائی۔

۳ یونسؒ: یونس بن یزید ایلیؒ انھوں نے قاسم، عکرمہ، زہری سے روایت کی اور اُن سے عبداللہ بن مبارک اور ابن وہب نے روایت کی ہے۔ ثقہ راوی اور تابعی تھے۔ ۱۵۹ھ / ۷۷۶ء میں وفات پائی۔

۴ معمر: ابوعروۃ معمر بن اشد الازدی، عالم یمن تھے۔ زہری اور حمام نے ان سے روایت کی ہے اور ان سے ثوری اور ابن عیینہ نے روایت کی ہے۔ عبدالرزاق کہتے ہیں کہ میں نے ان سے دس ہزار حدیثیں سنیں۔ اٹھاون برس کی عمر میں ۱۵۳ھ / ۷۷۰ء میں وفات پائی۔

۵ ابن عیینہ: سفیان بن عیینہ ان کا حال پہلے گزر چکا ہے، پیدائش ۱۰۷ھ / ۷۲۵ء۔ وفات ۱۹۸ھ / ۸۱۳ء۔

۶ ابن حسینؒ: ان کا حال معلوم نہ ہو سکا۔

۷ دارمی: ابومحمد عبداللہ بن عبدالرحمٰن دارمیؒ، حافظ حدیث سمرقندی ہیں۔ ۱۸۱ھ / ۷۹۷ء میں پیدا ہوئے اور ۲۵۵ھ / ۸۶۸ء میں وفات پائی۔

۸ ابوعوانہ: یعقوب بن اسحٰق ابوعوانہ اسفرائنیؒ انکی مسند ہے، حافظ حدیث اور ثقہ تھے انکی وفات ۳۱۶ھ میں ہوئی۔

۹ زہری: ابوبکر محمد بن مسلم بن شہاب الزہریؒ مشہور محدث گزرے ہیں ۵۰ھ / ۶۷۰ء میں پیدا ہوئے ۱۲۵ھ / ۷۴۲ء میں وفات پائی۔ تابعی ہیں۔

قتیبہ بن سعیدؒ وغیرہ کی رائے اور اس کا جواب

قتیبہ بن سعید[1]، ابو محمد بن ابی زید[2]، ابو محمد الاصیلی[3]، ابوبکر الاسماعیلی[4] احمد بن نصر الداؤدی[5] وغیرہم کی رائے ہے کہ ابوبکر رضی اللہ عنہ کی غلطی یہ تھی کہ انھوں نے پیشتر اس کے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم خواب کی تعبیر بیان کرنے کا حکم فرماتے تعبیر کرنے میں جلدی کی۔ لہٰذا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے فرمان کا مطلب یہ ہوا کہ تونے تعبیر تو ٹھیک کی ہے، لیکن عجلت کرنے میں غلطی کھائی۔

اس کا جواب یہ ہے کہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے تعبیر بیان کرنے کی اجازت طلب کرلی تھی اور آپؐ نے اجازت بھی دے دی تھی لہٰذا عجلت نہ ہوئی کیونکہ انھوں نے اجازت حاصل کرنے کے بعد تعبیر بیان کی ہے۔ مزید برآں آنحضرت صلعم کے فرمان أَصَبْتَ بَعْضًا وَّاَخْطَأْتَ بَعْضًا سے جو فوراً مفہوم سمجھ میں آتا ہے یہ ہے کہ ان کی تعبیر کا کچھ حصہ صحیح اور کچھ غلط ہے۔

امام طحاویؒ وغیرہ کی رائے

امام طحاوی[6]، خطابیؒ، ابن العربیؒ، ابن الجوزیؒ اور کچھ جماعت اس طرف گئی ہے کہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ

---

[1] قتیبہ بن سعیدؒ: قتیبہ بن سعید الثقفی۔ ابن عدی کہتے ہیں کہ ان کا اصلی نام یحیٰی ہے اور قتیبہ لقب ہے انھوں نے مالک، لیث وغیرہ سے روایت کی اور ان سے ترمذی وغیرہ نے کی۔ نسائی کہتے ہیں کہ یہ ثقہ اور سچے تھے ان کی وفات ۲۴۰ھ ۸۵۴ء میں ہوئی۔

[2] ابو محمد بن ابی زیدؒ: ان کا حال نہ معلوم ہو سکا۔

[3] ابو محمد الاصیلی۔ ان کا ذکر پہلے ہو چکا ہے۔

[4] ابوبکر الاسماعیلی: محمد بن مہران ابوبکر نیشاپوری جو اسمٰعیلی کے نام سے مشہور ہیں۔ حاکم کہتے ہیں کہ یہ حدیث کے ایک رکن تھے۔ ان کی وفات ۲۹۵ھ ۹۰۷ء میں ہوئی۔ انہیں آخر عمر میں لقوہ ہوگیا تھا۔ زہری کی احادیث کو انھوں نے نہایت عمدگی سے جمع کیا۔

[5] احمد بن نصر الداؤدی: ابن حجر نے چار شخصوں کا نام احمد بن نصر دیا ہے مگر ان میں سے کوئی بھی داؤدی نہیں ہے۔ میرے خیال میں احمد بن نصر کی بجائے احمد بن سعید داؤدی ہونا چاہیئے جنہوں نے بخاری کی شرح کی تھی۔ ابن تینؒ نے داؤدی کی شرح کے حوالے دیئے ہیں۔

[6] طحاویؒ: ابوجعفر احمد بن محمد بن سلامہ ازدی طحاوی۔ متاخرین کے امام گزرے ہیں۔ ۲۲۳ھ ۸۳۸ء میں پیدا ہوئے

(بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر)

نے سمن (گھی) اور عسل (شہد) دونوں کی قرآن سے تعبیر کی ہے حالانکہ یہ دو الگ الگ چیزیں ہیں۔ حق تو یہ تھا کہ ان کی تعبیر بھی دو چیزوں سے کی جاتی۔ جیسا عبداللہ بن عمروؓ بن العاص کی حدیث میں ہے جس کی روایت امام احمد نے کی ہے۔ عبداللہؓ کہتے ہیں کہ میں نے خواب میں دیکھا ہے کہ میری ایک انگلی میں گھی اور دوسری میں شہد ہے اور میں دونوں کو چاٹ رہا ہوں۔ صبح ہوئی تو میں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں جا کر خواب کا ذکر کیا۔ آپ نے فرمایا تم قرآن اور توراۃ دونوں پڑھو گے چنانچہ بعد میں یہ دونوں کتابوں کا مطالعہ کیا کرتے تھے۔ اس حدیث میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے گھی اور شہد کی تعبیر دو چیزوں سے دی۔ اسی طرح اس حدیث میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے گھی اور شہد کی تعبیر دو چیزوں سے دی۔ اسی طرح اس حدیث میں بھی ان دونوں کی تعبیر کتاب اور کتاب اور سنت یا علم اور عمل یا حفظ اور فہم وغیرہ کے ساتھ کرنی چاہیئے۔

ایک اور قول بعض کی رائے ہے ابوبکر رضی اللہ عنہ نے "سایہ دار بادل" کی تعبیر "اسلام" سے دینے میں غلطی کھائی۔ حالانکہ اس کی تعبیر نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے دینی چاہیئے تھی اور گھی اور شہد کی تعبیر کتاب اور سنت سے ہونی چاہیئے۔

ایک اور قول بعض نے کہا ہے کہ خطا سے یہاں مراد "ترک" ہے یعنی تو نے کچھ حصہ تعبیر کیے بغیر ہی چھوڑ دیا ہے کیونکہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد آنے والے تین آدمیوں کی تعیین نہیں کی۔ اسی وجہ سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ابوبکرؓ کے قسم دلانے کی پروا نہ کی اور اس کو پورا نہ کیا کیونکہ قسم کو پورا کرنے کا مطالبہ اسی صورت میں کیا جا سکتا ہے جب اس قسم کے پورا کرنے میں کوئی خرابی یا ظاہری مشقت نہ پائی جاتی ہو، لیکن اگر پائی جاتی ہو پھر اس کو پورا کرنا ضروری نہیں۔ ہو سکتا ہے کہ اس کی خرابی یہ ہو کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو حضرت عثمانؓ کی رسی ٹوٹنے کا سبب معلوم تھا جو ان کے قتل اور جنگوں اور فتنوں کے اشتعال کا باعث بنا۔ چنانچہ آنحضرت صلی اللہ

(بقیہ حاشیہ صفحہ سابقہ)

پہلے امام شافعی کے شاگرد مزنی سے تعلیم حاصل کی جو ان کے ماموں تھے اس کے بعد قاضی احمد بن ابی عمران کے حلقۂ درس میں شامل ہوتے اور ان سے علم فقہ حاصل کیا۔

۷ خطابیؒ: ابو سلیمان احمد بن محمد بن ابراہیم بن خطاب البستی الخطابی۔ متوفی ۳۰۸ھ: ۹۲۰ء: انھوں نے بخاری کی شرح لکھی ہے جس کا نام اعلام السنن رکھا۔ اس سے پہلے انھوں نے بلخ میں معالم السنن لکھی تھی۔ یہ فقہ اور حدیث میں یکتائے روزگار تھے۔

علیہ وسلم ابوبکرؓ کی قسم کو پورا کرتے تو آنحضرتؐ کو تینوں آدمیوں کی تعیین کرنی پڑتی اور اگر تعیین کر دیتے تو یہ ان کی خلافت کا صریح حکم ہوتا۔ حالانکہ مشیتِ ایزدی میں یہ بات قرار پا چکی تھی کہ خلافت اسی طرح بغیر تعیین کے ہوگی۔ اسی لیے آپؐ نے فساد کے خوف سے ان کی تعیین نہ کی۔ یہ ساری تشریح محی الدینؒ نووی[1] کی ہے۔

ابن العربیؒ[2] کی رائے

ایک گروہ کی یہ رائے ہے کہ ابوبکر صدیقؓ کی تعظیم کو مدِّ نظر رکھتے ہوئے اس بحث میں پڑا ہی نہ جائے چنانچہ ابوبکر ابن العربی رحمۃ اللہ فرماتے ہیں کہ میں نے ایک عارف سے جو خواب کی تعبیر کے فن سے واقف تھے پوچھا کہ ابوبکر رضی اللہ عنہ نے کیا غلطی کی تھی؟ فرمایا بھلا یہ کس کو معلوم ہے؟ اگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی موجودگی میں حضرت ابوبکر صدیقؓ کا تعبیر کرنے میں پیش قدمی کرنا غلطی ہے تو حضرت ابوبکرؓ کی غلطی تعیین کرنے میں پیش قدمی کرنا اس سے بھی بڑھ کر غلطی ہے لہٰذا دانش مندی اور دینداری یہی ہے کہ اس بحث میں پڑا ہی نہ جائے۔

حضرت سید عبدالعزیز دباغؒ کی بیان کردہ تشریح

حضرت نے فرمایا سایہ دار بادل اسلام ہے اور جو شہد اور گھی اس سے ٹپک رہا ہے وہ لوگوں کے صرف وہ اعمال ہیں جو مقبول اعمال ہیں۔ یہ محض تلاوتِ قرآن کے ساتھ مخصوص نہیں بلکہ تمام مقبول اعمال پر مشتمل ہے مثلاً نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ، صدقہ، غلام آزاد کرنا، مومن کی حاجت براری کرنا، شرکتِ جنازہ کرنا، قیدیوں کا فدیہ ادا کر کے ان کو رہا کرانا، وغیرہ وہ ظاہری اعمال جن سے ذات حرکت میں آتی ہے اور یہی ظاہری اعمال برزخ کو چڑھتے ہیں اور انہیں برزخ کی روحیں دیکھتی ہیں اور کہتی ہیں کہ یہ فلاں بن فلاں کی نیکی ہے جو ہمارے پاس فلاں فلاں دن آئے گا چنانچہ اس کا باپ اور اس کا دادا وغیرہ اس کے نیک عمل کو دیکھتے ہیں اور اس مشاہدے میں سب روحیں یکساں ہیں خواہ وہ زمین پر اتر کر پھر برزخ کی طرف لوٹ گئی ہوں یا اعمال کے بعد زمین پر نہ اتری ہوں، یہاں تک کہ اگر اللہ تعالیٰ چھوٹے بچے کو فتح تصیبب کر دے تو وہ لوگوں کو ان کے نیک اعمال سے واقف

---

[1] محی الدین نووی: ابوزکریا محی الدین یحییٰ بن شرف النووی۔ اپنے زمانے کے امام تھے فاضل پرہیزگار فقیہ محدث اور ثقہ آدمی تھے۔ انھوں نے بہت سی تصانیف کیں مثلاً ریاض، اذکار، شرح مسلم وغیرہ۔ ان کا نام نوی کی طرف منسوب ہے جو دمشق کی ایک بستی ہے ۵۸۶ھ میں پیدا ہوئے اور ۶۷۶ھ میں وفات پائی۔

[2] ابوبکر بن العربی: یہ مشہور صوفی محی الدین العربی نہیں بلکہ اشبیلیہ کے ایک مشہور عالم ہیں جو زیادہ تر قاضی ابوبکر ابن العربی کے نام سے مشہور ہیں اُن کی وفات ۵۴۶ھ ۱۱۵۱ء میں ہوئی۔

کر سکتا ہے اور وہ کہہ سکتا ہے کہ اے فلاں! تمہارا فلاں عمل فلاں دن ہمارے پاس برزخ میں پہنچا تھا۔ اور اے فلاں تمہارا مقبول عمل اس سے پہلے یا بعد ہمارے پاس آیا تھا، لیکن اللہ تعالیٰ نے انہیں پوشیدہ رکھنے کا فیصلہ کیا ہے اس لیے اجسام میں داخل ہونے کے بعد انہیں یہ باتیں بھلا دی جاتی ہیں۔

پھر ان ظاہری اعمال کی دو قسمیں ہیں۔ ایک وہ جو محض للہ ہوتی ہیں اور اُن سے مخلوقات کو بظاہر کوئی فائدہ نہیں پہنچتا مثلاً اللہ کے لیے سجدہ یا رکوع کرنا، نماز روزہ سے اس کی عبادت کرنا، اس سے ڈرنا، اس کی طرف رغبت کرنا وغیرہ، تمام وہ اعمال جن کا تعلق صرف بندے اور رب کے ساتھ ہوتا ہے۔

دوسری قسم وہ ہے جس سے مخلوق کو نفع پہنچے مثلاً غلام آزاد کرنا، صدقہ، قیدیوں کو رہا کرانا، لوگوں کی حاجت روائی کرنا اور تمام وہ نیک اعمال جن میں مخلوقات کا نفع ہو۔ اللہ کی طرف سے پہلی قسم کے اعمال کی جزا یہ ہے کہ وہ اسے نور عطا کرے جس سے اس کا ایمان بڑھے اور اس کے عرفان کو قوت حاصل ہو۔ اس سے اس کے دل سے وسوسے مٹ جائیں گے اور شکوک رفع ہو جائیں گے اور دنیا ہی میں اس کا ایمان صاف ہو جائے گا اور آخرت میں اسے مشاہدۂ عظیم حاصل ہوگا لہٰذا اس قسم کی جزاء نورِ محض اور قوتِ ایمان ہے۔ دوسری قسم کے اعمال کی جزاء اصلاحِ ذات سے دی جاتی ہے جیسے کثرتِ رزق اور اترنے والی مصیبتوں کو دور کرنا۔ اس طرح ذات کو بہت نفع حاصل ہوتا ہے کیونکہ جب اُس سے مصائب دُور ہو جائیں اور وہ مصائب سے محفوظ ہو جائے اور اسے رزقِ کثیر حاصل ہو تو ذات ان سے فائدہ اٹھائے گی اور اس دنیا میں خوب پھلے پھولے گی، لیکن آخرت میں یہی صدقات جن سے اس نے مخلوقات کو فائدہ پہنچایا ہوتا ہے اس کے لیے اس کی پسند کی نعمتیں بن جاتی ہیں مثلاً پلاؤ، کیک، وہ پرندے جن کا گوشت حلال ہے اور مجامعت کے لیے بیویاں وغیرہ اور اشیاء جن کا نفس خواہش مند ہوتا ہے اور جن سے آنکھیں لذت یاب ہوتی ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ قسم اول کی جزاء ایسی ہوتی ہے جو ایمان کے لیے مفید ہو اور قسم ثانی کا ثواب اصلاحِ ذات کے لیے نافع ہے لہٰذا اس خواب میں شہد کا اشارہ قسم اوّل کی طرف ہے اور گھی کا اشارہ قسم ثانی کی طرف ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ شہد ذات کے لیے تقویت کا سبب ہوتا ہے اور جو اشیاء تقویت کے منافی ہوں، ان کے ضرر کو روکتا ہے، لیکن نہ ہی جسم کو موٹا کرتا ہے اور نہ گوشت ہی پیدا کرتا ہے لہٰذا یہ قسم اوّل کے مشابہ ہوا جو ذات کے لیے قوتِ ایمان کا سبب بنتی ہے مگر رزق میں وسعت نہیں

ہوتی اور یہ قسم شکوک و شبہات کو دور کر کے نورِ ایمان کو صاف کر دیتی ہے یہی خاصّہ شہد کا ہے کہ وہ بھی جسم کو تقویت دیتا ہے اور اسے کمزوری اور سستی سے بچاتا ہے۔ لیکن گھی جسم کو تر و تازہ کرتا ہے گوشت پیدا کرتا ہے اور جسم کو موٹا کرتا ہے، لیکن اس سے وہ قوّت پیدا نہیں ہوتی جو شہد سے پیدا ہوتی ہے لہٰذا گھی دوسری قسم کے اعمال کے مشابہ ہوا جن سے رزق میں وسعت حاصل ہوتی ہے اور جسم کے بیرونی مصائب دور ہوتے ہیں لہٰذا اس خواب میں شہد اور گھی سے یہی دونوں قسم کے اعمال مراد ہیں۔ پس شہد مُقوّی ہے اور گھی نشوونما دینے والا۔ اسی طرح پہلی قسم کے اعمال ایمان کو تقویت دیتے ہیں اور دوسری قسم کے رزق میں وسعت۔ لہٰذا شہد سے مراد قسم اول کی عبادت ہوئی اور گھی سے قسم ثانی کی۔

میں نے عرض کیا ان دونوں قسم کے اعمال میں سے کون سی قسم افضل ٹھہری؟

حضرت نے فرمایا تمہارے نزدیک کونسی صورت بہتر ہے آیا یہ کہ تم گھاس کی طرح پتلے دُبلے ہو مگر تم میں چالیس آدمیوں کی طاقت ہو یا یہ کہ تم اس قدر موٹے ہو جاؤ کہ چلنے سے بھی عاری ہو جاؤ اور جسم میں طاقت بھی نہ ہو۔

میں نے عرض کیا مجھے تو یہی پسند ہے کہ میں گھاس کی طرح دُبلا پتلا ہوں مگر مجھ میں چالیس آدمیوں کی طاقت ہو۔

حضرت نے فرمایا یہی حال ان اعمال کا ہے جو نورِ ایمان کو زیادہ کرتے ہیں اور ان اعمال کا جو رزق میں وسعت دیتے ہیں۔

پھر میں نے عرض کیا کہ یہ ظاہری اعمال جو دو قسموں پر منقسم ہیں، زمین سے آسمان کو چڑھتے ہیں۔ اور شہد اور گھی تو خواب میں نیچے اتر رہا تھا۔ لہٰذا ان دونوں سے اعمالِ مذکورہ مراد لینا کیسے درست ہوا؟

حضرت نے فرمایا کہ چڑھنا اور اُترنا تو امرِ اضافی ہے کیونکہ ہو سکتا ہے کہ ایک چیز جسے ہم اوپر چڑھتی ہوئی سمجھ رہے ہیں دوسرے کے نزدیک نیچے اتر رہی ہو لہٰذا ہو سکتا ہے کہ خواب دیکھنے والے کی روح آسمان میں ہمارے مقابل جہت میں ہو (یعنی سر ہماری طرف ہو اور پاؤں آسمان کی جانب) اور اس جہت میں نہ ہو جو دوسرے آسمان کے بالمقابل ہے اور اس میں کوئی شک نہیں کہ جن لوگوں کے چہرے ہماری طرف ہیں ان کے سر ہماری طرف ہیں اور پاؤں دوسری طرف۔ لہٰذا جب ان کے سر ہماری طرف ہوں گے تو جو چیز زمین سے آسمان کو چڑھ رہی ہو گی وہ اسے اترتی ہوئی ہی سمجھیں گے۔

مزید براں خواب کا مقصد تو صرف یہ ہوتا ہے کہ دیکھنے والا اسے سمجھ جائے اور اگر اسلام کا سائبان زمین پر ہمارے سروں کے اوپر رکھا جاتا تو خواب دیکھنے والے کو چڑھنے والے امور دکھائی نہ دیتے۔ یہی وجہ ہے کہ "چڑھنے" کو "اترنے" کے لفظ سے تعبیر کیا گیا۔ پھر یہ کہ "نزول" میں بھی تاویل و تعبیر کرنے کی ضرورت ہے نہ یہ کہ "نزول" حقیقی معنوں میں ہے۔

حضرت نے فرمایا جو رسّی آسمان سے زمین تک لٹکی ہوئی تھی اس سے مراد ایمانِ کامل ہے لیکن اس سے ہر ایمانِ کامل مراد نہیں ہے بلکہ اس کے لیے شرط ہے کہ یہ ایمانِ کامل ان حکام میں پایا جائے جو شریعت کے حدود کو اپنی رعایا پر کامل طور قائم رکھتے ہیں کیونکہ یہ رسی سائبان سے ملی ہوئی ہے اور یہی گھی اور شہد برسانے کا سبب بھی ہے یہاں تک کہ یہ لوگوں پر بھی اترا اور انھوں نے اس سے ہاتھ بھر لیے۔ بعض نے زیادہ اور بعض نے تھوڑے۔ اور ایمانِ کامل ان کے اعمال کی مقبولیت، کثرتِ عبادت اور ان پر نزولِ برکات کا اس وقت تک سبب نہیں ہو سکتا جب تک صاحبِ ایمانِ کامل کا مومنین پر پورا اختیار نہ ہو اس طرح کہ وہ کمزوروں کی مدد کرے اور طاقتوروں کو کمزوروں پر ظلم کرنے سے روکے اور حدودِ شریعت کو کامل طور پر قائم کرے۔ تب جا کر بندگانِ خدا میں نیکیاں زیادہ ہوں گی اور گناہ کم ہوں گے۔ چنانچہ وہ نہ تو زنا کریں گے نہ چوری کریں گے اور نہ ناجائز طور پر کسی کو قتل کریں گے اور اس وقت تمام اُمّت نیک ہو گی اور امیر بمنزلہ اس شخص کے ہوگا جو لوگوں کے لیے اسلام کا ستون مضبوط کر رہا ہو اور ان پر نیکیوں اور برکات کا مینہ برسا رہا ہو اور یہ حالت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد میں درجہ کمال پر تھی۔

امراءِ ثلٰثہ سے کون مراد ہیں؟

حضرت نے فرمایا کہ اب یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ خواب میں جن امراءِ ثلٰثہ کا ذکر ہے وہ کون ہیں؟ اولیاء عارفین کا اس میں اختلاف ہے چنانچہ اولیاء کا ایک گروہ جنہیں ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے متّبعین ہونے کی وجہ سے صدّیقیہ کہا جاتا ہے اور میرے شیوخ بھی انہی میں سے ہیں اس طرف گیا ہے کہ ان سے مراد خلفاء ثلٰثہ یعنی ابوبکر، عمر اور عثمان رضی اللہ عنہم ہیں اور حضرت عثمانؓ کی رسی ٹوٹنے سے مراد وہ اعتراضات ہیں جو ان پر کیے گئے اور اس کے جُڑ جانے سے مراد آپ کی شہادت ہے اولیاء کے ایک اور گروہ کی جنہیں حسین بن علی رضی اللہ عنہما کے متّبع ہونے کی وجہ سے حسینیہ کہا جاتا ہے یہ رائے ہے کہ ان امراء سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی اولاد میں سے وہ اشراف مراد ہیں جن میں سے دو پر تو اُمّتِ اسلامیہ کا اتفاق ہوگا اور پھر تیسرے پر۔ پہلے تو سب متفق ہوں گے پھر اختلاف پڑ جائے گا اور اس کے بعد

پھر سب متفق ہو جائیں گے۔ رسّی کٹنے اور اس کے جڑ جانے سے یہی مراد ہے۔ پھر فرمایا کہ خواب کا مقصد وہی ہے جو اس گروہ نے بیان کیا ہے کیونکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا مقام بہت بلند ہے۔ آپؐ کے مقام پر وہی شخص قدم رکھ سکتا ہے یا آپ کی سیڑھی پر وہی چڑھ سکتا ہے جو یا تو نبی ہو یا نبی کی اولاد میں سے ہو اور جب خواب میں نظر آنے والی رسّی ایک ہی تھی اور اس پر تینوں امرا اسی طرح چڑھے جس طرح آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم چڑھے تھے تو اس میں اس امر کا اعلان ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور ان امراء میں مجانست ہے اور یہ بات تو پہلے معلوم ہو چکی کہ کوئی شخص بھی ایمانِ کامل میں آپ کا ہم جنس نہیں ہو سکتا لہٰذا اب صرف نسبی مجانست باقی رہ گئی اور یہ مذکورہ بالا اولادِ نبی کے امراء کے لئے ثابت ہے کیونکہ کسی آدمی کی جگہ اور گھر میں یا وہ خود داخل ہوتا ہے یا اس کی اولاد مزید براں خواب دیکھنے والا شخص ایک صحابی ہے جو ابوبکرؓ، عمرؓ اور عثمانؓ کو پہچانتا ہے۔ اگر خواب میں یہی لوگ مراد ہوتے تو وہ ان کو پہچانتا ہوتا اور آنحضرتؐ کے ذکر کے بعد یوں کہتا کہ میں نے ابوبکرؓ کو دیکھا جنہوں نے رسی کو پکڑا اور چڑھ گئے پھر عمرؓ نے اور پھر عثمانؓ نے لیکن جب اس نے ان کا ذکر نہیں کیا اور ان کی بجائے

لہ یاد رہے کہ یہاں پر بحث خواب کی تعبیر پر ہو رہی ہے امرِ خلافت پر نہیں۔ حضرت کا یہ فرمانا کہ خواب دیکھنے والا چونکہ صحابی تھا، اس لیے اگر رسّی پکڑنے والے ابوبکر، عمر اور عثمان رضی اللہ عنہم ہوتے تو وہ انہیں پہچان لیتا اور یوں کہتا کہ ابوبکر نے پھر عمر اور پھر عثمان رضی اللہ عنہم نے رسی کو پکڑا، مگر حضرت کا یہ قیاس درست نہیں کیونکہ خواب میں اکثر ایسا ہوتا ہے کہ محض شبح (ش ب ح) ہی دکھائی دیتا ہے اور بینندہ پہچان نہیں سکتا۔ چنانچہ اس نے صاف الفاظ میں کہا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو واضح طور پر خواب میں دیکھا۔ مزید براں حضرت کا یہ فرمانا کہ ان امراء ثلٰثہ سے مراد اہلِ بیت میں سے تین شخص ہیں، بھی قرینِ قیاس نہیں اور پھر مزہ یہ کہ حضرت نے ان کی تعیین نہیں کی کہ وہ امراء ثلٰثہ کون ہیں۔ امراء فاطمیہ کا دعویٰ تھا کہ وہ خاندانِ نبوت سے تعلق رکھتے ہیں لیکن وہ شیعہ تھے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے فرمان کے مطابق مَا انا علیہ واصحابی سے منحرف تھے۔ لہٰذا وہ طریقِ حق پر نہ ہوئے اور جب طریقِ حق پر نہ ہوئے تو بمقامِ نبوی پر قدم رکھنا ناممکن ہوا اور ان پر قرآن کی اس آیت اِنَّهٗ لَيْسَ مِنْ اَهْلِكَ اِنَّهٗ عَمَلٌ غَيْرُ صَالِحٍ کا اطلاق ہوتا ہے حضرت کشف و فتح سے کلام فرما رہے تھے اور اُمّتِ محمدیہ کے اندر مختلف ادوار گزر چکے ہیں جن میں طرح طرح کے امراء بھی شامل ہیں گیا اتنے عرصہ کے اندر وہ امراء جو اس خواب میں دکھائے گئے تھے پائے نہیں گئے؟ خواب اس قدر لمبے عرصہ کے امور کے متعلق نہیں آیا کرتی۔ بہر حال یہ خواب اب بھی غیر منحل ہی رہ گیا بلکہ حضرت کے ظاہری الفاظ نے اہلسنت کے عقیدہ کے مطابق اس میں اور زیادہ اُلجھن پیدا کر دی ہے۔ ۱۲ "مترجم"

یوں کہا کہ میں نے ایک آدمی دیکھا، پھر ایک اور تو اس کا مطلب یہ ہے کہ اس نے ایسے اشخاص کو دیکھا جنہیں وہ پہچان نہیں رہا تھا لہٰذا وہ خلفاء ثلٰثہ نہیں ہیں۔

(مؤلف کہتا ہے) کہ میں نے شیخ سے اس بارے میں کئی بار بحث کی اور اُن سے کئی بار جھگڑا مگر حضرت نے یہی فرمایا کہ حق بات وہی ہے جو میں کہہ رہا ہوں، یعنی یہ کہ ان سے مراد اشراف ہیں نہ کہ خلفاء ثلٰثہ۔ پھر مذکورہ بالا دو دلیلیں دے کر مجھے تسکین کر دی اور فرمایا کہ میں تو صدیقیہ طائفہ میں سے ہوں لیکن حق بات کہنی ہی پڑتی ہے۔

پھر میں نے شیخ سے عرض کی کہ یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ تو خواب کی تعبیر سمجھ جائے مگر ابوبکرؓ پر مخفی رہے۔ اگرچہ یہ تو اللہ کا فضل ہے جسے چاہے دے مگر ہمارا عقیدہ ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ تمام اُمت کے سید العارفین اور امام الاولیاء ہیں اور ہم کئی بار آپ کی زبانِ مبارک سے یہ بھی سن چکے ہیں کہ اُمت محمدیہ میں کوئی شخص معرفت الٰہیہ میں ابوبکرؓ کی برابری نہیں کر سکتا اور اولیاء اور صالحین میں کوئی شخص بھی ایسا نہیں جو ابوبکر رضی اللہ عنہ کی طرح باطنِ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو جانتا ہو اور وہی سید العارفین امام المحبین ہیں۔

حضرت نے فرمایا کہ ابوبکر رضی اللہ عنہ اس خواب کی تعبیر کو جانتے تھے بلکہ اس سے بھی ہزار گنا زیادہ جانتے تھے مگر اُس وقت اس خواب کی تعبیر ان پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی موجودگی کی وجہ سے مخفی رہی۔ اس لیے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی موجودگی میں حاضرین کے علمی انوار غائب ہو جاتے تھے اور ان میں روشنی نہیں رہتی تھی کیونکہ ان کا انعکاس نورِ محبت پر پڑتا تھا جس سے شوق کی آگ بھڑک اٹھتی اور اس کے افکار اسی محبت میں مشغول ہو جاتے اور باطن بھی اسی میں مستغرق ہو جاتا اور اس میں کوئی شک نہیں کہ جب انوارِ علم غائب ہو جاتے ہیں اور محبت اور شوق کے انوار مشتعل ہو جاتے ہیں تو جو شخص بھی اس حالت میں گفتگو کرتا ہے اس کی مثال ایسی ہوتی ہے جیسے کہ ایک لاعلم انسان کیونکہ قلب کی توجہ ایک ہی طرف ہو سکتی ہے لہٰذا جب ایک چیز کی طرف متوجہ ہوگا تو دوسری چیزوں سے منقطع ہو جاتے اور عارفین کے لیے جن کے سردار ابوبکر رضی اللہ عنہ ہیں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات ہی مقصودِ اصلی اور امیدِ حقیقی ہے لہٰذا جب آپ کی ذات ان کے سامنے ہوگی تو نہ وہ کسی علم کی طرف متوجہ ہوں گے اور نہ کسی اور چیز کی طرف کیونکہ علم تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات کا ایک نور ہے لہٰذا جب ذات نظروں سے اوجھل ہوتی ہے تو اُن کا تعلق اس کے انوار سے ہو جاتا ہے تاکہ وہ صاحبِ انوار ذات تک پہنچا دیں مگر جب خود ذات موجود ہو تو تمام

وسائل ساقط ہو جاتے ہیں اور اس ذات کی طرف توجہ واجب ہو جاتی ہے اور دل اس کی طرف پھر جاتے ہیں۔

میں نے عرض کیا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات کی طرف توجہ کس طرح حاصل ہوتی ہے؟

حضرتؒ نے فرمایا: تین باتوں سے۔ محبت، تعظیم اور ان کمالات پر تعجب کرنے سے جو اللہ تعالیٰ نے آپؐ کو عطا فرمائے ہیں۔ جب یوسف علیہ السلام کے متعلق عورتیں یہ کہہ سکتی ہیں کہ حَاشَ لِلّٰہِ مَا ھٰذَا بَشَرًا ط اِنْ ھٰذَا اِلَّا مَلَکٌ کَرِیْمٌ (خدا پاک ہے یہ تو انسان نہیں۔ یہ تو بڑی خوبیوں والا فرشتہ ہے) تو خیال فرمائیں کہ عارفین سید الوجود صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں کیا کہتے ہوں گے اور ان تینوں کی تکمیل اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات کی طرف صحیح توجہ صرف اسی وقت ہو سکتی ہے جب عارف کی طرف سے سات امور پورے طور پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر ہی مرکوز ہو جائیں اور ان ساتوں کا مقصد صرف آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ شریفہ ہی ہو۔ لہٰذا اگر ان میں سے کسی ایک میں بھی خلل پیدا ہوگا تو توجہ میں بھی خلل پیدا ہو جائے گا۔ یہ سات امور یہ ہیں: فکر نفسؒ، خیالؒ یعنی نظر نفس، عقلؒ مثالؒ یعنی نظر عقل، ذاتؒ، روحؒ اور علمؒ۔ چنانچہ عارف کی توجہ کاملہ کے لیے یہ شرط ہے کہ ان سات امور کے تصور کا انحصار آنحضرتؐ کی ذات شریفہ میں ہو اور جب ان ساتوں کے انوار آنحضرتؐ کی ذات پر مرکوز ہوں گے تو محبت، تعظیم اور تعجب کے ساتھ توجہ حاصل ہو گی اور ماسویٰ کی آرزو نہ رہے گی۔

حضرت نے فرمایا کہ جب عارف اس حالت میں ہو اور اس سے اگر اس کے فرزند کا رنگ پوچھا جائے کہ سفید ہے یا نہیں تو وہ حیران ہو جائے گا اور کچھ نہ بتا سکے گا اور اگر کچھ جواب بھی دے گا تو بے خبری کے عالم میں دے گا اور فرض کر لیں کہ جواب درست دیا گیا ہے تو وہ صرف اس لیے ہوگا کہ اسے درست بات کہنے کی عادت پڑی ہوئی ہے۔ یہی وجہ تھی کہ ابوبکر صدیقؓ سے خواب کی تعبیر میں خطا ہوئی اور اگر سائل ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے پاس ان کی خلافت کے زمانے میں آتا اور خواب کی تعبیر دریافت کرتا تو آپ سے اس بارے میں عجیب و غریب باتیں سنتا اور یہ تعبیر بھی ہمیں تو ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے واسطے سے معلوم ہوئی ہے لہٰذا یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ ایک بات کو ہم تو جانتے ہوں اور ابوبکر صدیق نہ جانتے ہوں۔ یہ ناممکن ہے، لیکن اصل راز وہی ہے جس کا ذکر ہم کر چکے۔ واللہ اعلم۔

(مؤلف کہتا ہے) یہ سب کچھ ہم نے اپنے اُمّی پیر سے سنا۔ عنایات اللہ کے ہاتھ میں ہیں جس پر چاہے کرے۔ مجھے کئی سال گزر گئے تھے کہ میں اس خواب کی تسلی بخش تعبیر کرنا چاہتا تھا، مگر

یہ مجھے حضرت کے سوا نہ کسی کتاب میں اور نہ کسی انسان سے حاصل ہوئی اور ظاہر ہے کہ شیوخ متقدمین کا مذکورہ بالا بیان اصل مقصد سے بہت دور ہے ۔ واللہ اعلم ۔

خواب کیا ہے اور کیسے نظر آتی ہے

میں نے حضرت سے سوال کیا کہ خواب کی حقیقت کیا ہے ؟ یہ کیا چیز ہے ؟ اور کیسے واقع ہوتی ہے ؟ کیونکہ لوگوں کا اس میں بہت سا اختلاف ہے اَطِبّاء کا خیال ہے کہ اخلاط اربعہ کی وجہ سے خوابیں آتی ہیں چنانچہ جس آدمی کی مزاج میں بلغم کا غلبہ ہو تو وہ خواب میں یوں دیکھتا ہے جیسے کہ پانی میں تیر رہا ہے وغیرہ ، اس لیے کہ پانی کی بلغم سے مناسبت ہے اور جس پر صفرا کا غلبہ ہو وہ خواب میں آگ ، ہوا میں بلند ہونا یا اسی قسم کی پریشان صورتیں دیکھتا ہے ۔ جس پر خون کا غلبہ ہو وہ شیریں چیزیں اور خوش کن باتیں دیکھتا ہے اس لیے کہ خون میٹھا اور مفرح ہے اور جس پر سودا کا غلبہ ہو وہ سوداوی باتیں اور ترش چیزیں دیکھتا ہے ۔

مارزی کی رائے

علامہ مارزی کہتے ہیں کہ یہ سب غلط ہے کیونکہ گو عقل اسے جائز قرار دیتی ہے مگر اس پر کوئی دلیل قائم نہیں ہوتی اور نہ ہی اس قیاس آرائی ہو سکتی ہے جواز اور امکان کی صورت کو قطعی قرار دینا درست نہیں ہے ۔

فلاسفہ کی رائے

فلاسفہ کی یہ رائے ہے کہ زمین پر جو واقعات کی صورت پیش آتی ہے وہی صورتیں عالم بالا میں نقوش کی طرح منقش ہوتی ہیں ۔ لہٰذا ان میں سے جو صورت بھی نفس کے سامنے آجاتی ہے اس کا نقش نفس میں اتر آتا ہے ۔

علامہ مارزی کہتے ہیں کہ یہ بھی غلط ہے کیونکہ یہ دعویٰ بلا دلیل ہے اور نقش قبول کرنا اجسام کی صفت ہے حالانکہ اکثر چیزیں جو عالم علوی میں واقع ہوتی ہیں وہ از قسم اعراض کے ہیں اور اعراض کا نقش نہیں ہوتا ۔

مُعتزلہ کی رائے

معتزلہ کی یہ رائے ہے کہ یہ محض بے حقیقت خیالات ہوتے ہیں ۔ اور ان کا اس سے مقصد خواب کو بالکل باطل قرار دینے سے ہے اسی طرح وہ عذاب قبر کا بھی انکار کرتے ہیں ۔

ابن عربیؒ کی رائے

ابن العربی[1] اپنی کتاب قبس میں فرماتے ہیں کہ معتزلہ عوام کیساتھ اپنی چالبازی کے اصولوں

---

[1] ابن عربی سے یہاں مراد حافظ ابو بکر بن العربی المالکی ہیں جنہوں نے ۵۴۳ھ میں وفات پائی انہوں نے موطا امام مالک کی شرح لکھی ہے جس کا نام قبس ہے ۔

پر قائم رہے چنانچہ انھوں نے جنوں اور ان کے کلام کرنے، فرشتوں اور اُن کے کلام کرنے کے متعلق اصولِ شریعت کا ہی انکار کر دیا یہاں تک کہ یوں کہہ دیا کہ اگر جبرئیل علیہ السلام آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے باآواز کلام کرتے تو حاضرین بھی اسے ضرور سنتے۔

صالح معتزلی کی رائے

صالح معتزلیؒ کی رائے ہے کہ خواب سر کی آنکھوں سے دیکھی ہوئی چیز ہوتی ہے۔ ابن العربی کہتے ہیں کہ یہ بات جمہور کے قول کے خلاف ہے۔

ایک اور رائے

اوروں کی یہ رائے کہ دل میں دو آنکھیں ہوتی ہیں جن سے دل دیکھتا اور دو کان ہوتے ہیں جن سے دل سنتا ہے چنانچہ خواب انہی دل کی نگاہوں اور دل کے کانوں کا سنا اور دیکھا ہوا منظر ہوتا ہے۔

خواب کے متعلق اہلسنت کی رائے

اہل سنت کی یہ رائے ہے کہ خواب ایسے اعتقادات اور ادراکات ہوتے ہیں جنہیں اللہ تعالیٰ سونے والے کے دل میں پیدا کر دیتا ہے بعینہٖ اسی طرح جس طرح کہ بیدار آدمی کی آنکھوں اور دل میں پیدا کرتا ہے اور جب انہیں پیدا کر چکتا ہے تو انہیں ان امور و اشیاء کی علامت بناتا ہے جو بعد میں پیدا ہونے والی ہوتی ہیں کبھی ان اعتقادات کے پیدا ہونے کے وقت فرشتہ موجود ہوتا ہے تو یہ خواب اچھی خواب ہوتی ہے اور کبھی شیطان حاضر ہوتا ہے تو یہ خواب پریشان کن ہوتی ہے۔

ایک اور رائے

بعض کا خیال ہے کہ ایک فرشتہ ان مناظر پر مقرر ہوتا ہے جو انہیں سوتے ہوئے آدمی کے سامنے پیش کرتا ہے، لہٰذا وہ کبھی انہیں ایسی صورتیں پیش کرتا ہے جو آئندہ ہونے والے واقعات کے مطابق ہوتی ہیں اور کبھی یہ معانی معقولہ کی مثالیں ہوتی ہیں۔

قرطبی کہتے ہیں یہ قول بھی مردود ہے کیونکہ یہ قول بھی دلیل کا محتاج ہے۔

ایک اور قول

بعض کا خیال ہے کہ ان مناظر کا سبب روح کا عرش کی طرف چڑھنا ہے لہٰذا سونے والے کو جو باتیں پیش آتی ہیں وہ انہیں دیکھتا ہے اگر رُوح کے عرش تک پہنچے تک وہ بیدار نہ ہو تو خواب سچی ہوگی اور اگر اس سے پہلے ہی بیدار ہو جائے تو خواب جھوٹی ہوگی اس قول کے قائل نے اس حدیث سے استدلال کیا ہے

لے صالح معتزلی: ان کا حال معلوم نہ ہو سکا۔

جیسے حاکم، عقیلی[1] نے محمد بن عجلان[2] عن سالم[3] بن عبداللہ بن عمر[4] بن الاسیر کی سند سے روایت کیا ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی حضرت علی کرم اللہ وجہہ سے ملاقات ہوئی تو کہا اے ابوالحسن آدمی خواب دیکھتا ہے تو بعض سچا نکلتی ہے اور بعض جھوٹا۔ حضرت علیؓ نے فرمایا ہاں کہ جو بندہ یا عورت بھی سوتا ہے پھر اسے گہری نیند جب آتی ہے تو اس کی روح عرش پر چڑھ جاتی ہے۔ لہٰذا جو شخص روح کے عرش تک پہنچنے سے پہلے بیدار نہیں ہوتا، اس کا خواب سچا ہوتی ہے اور جو عرش پر پہنچنے سے پہلے ہی بیدار ہوجاتا ہے اس کی خواب جھوٹی ہوتی ہے۔

اس حدیث کے متعلق ذہبی کی رائے

امام ذہبی[5] اپنی کتاب تلخیص میں فرماتے ہیں کہ یہ حدیث منکر ہے اور حاکم نے بھی اسے صحیح قرار نہیں دیا۔ شاید اس نے جو گرفت کی ہے وہ اس راوی پر ہے جس نے ابن عجلان سے روایت کی ہے اور اس راوی کا نام عبداللہ الازدی خراسانی[6] ہے۔ عقیلی نے اس کا ذکر کیا ہے اور کہا ہے کہ وہ غیر محفوظ ہے۔ پھر اس نے ایک طریقے سے عن اسرائیل عن ابی اسحٰق عن الحرث عن علی کی روایت میں اس کے ایک حصے کی روایت کی ہے اور اس حدیث کے مرفوع اور موقوف ہونے کے متعلق اختلاف بیان کیا ہے۔

---

[1] عُقیلی : محمد بن عمرو بن موسیٰ عقیلی مصنف کتاب الضعفاء الکبیر۔ جلیل القدر عالم و محدث ہوتے انکی بہت سی تصانیف ہیں۔ ان کی وفات ۳۲۳ھ ۹۳۳ء میں ہوئی۔

[2] محمد بن عجلانؒ : ابو عبداللہ محمد بن عجلان المدنیؒ : ابن عیینہ نے انہیں ثقہ قرار دیا ہے ان کی والدہ کی عادت تھی کہ انہیں چار سال تک حمل رہتا تھا۔ چنانچہ ان کا حمل بھی چار سال تک رہا تھا، انکی وفات ۱۴۸ھ ۷۶۵ء میں ہوئی

[3] سالم : سالم بن عبداللہ بن عمر : ابوعمر کنیت۔ مدینہ کے فقہا میں سے تھے، علماء تابعین میں ان کا شمار ہوتا ہے ان کی وفات مدینہ میں ۱۰۶ھ ۷۲۴ء میں ہوئی۔

[4] عبداللہ بن عمرؓ : حضرت عمرؓ کے بیٹے تھے۔ مشہور زاہد و عابد تھے۔ بچپن میں ہی اپنے باپ کیساتھ ایمان لائے۔ سب سے پہلی جنگ جس میں انھوں نے شرکت کی غزوۂ خندق ہے۔ ان کی پیدائش وحی سے ایک سال پہلے ہوئی اور ۷۳ھ ۶۹۲ء میں وفات پائی۔

[5] ذہبیؒ : شمس الدین ذہبی مؤلف عبر، دول الاسلام۔ ۷۴۹ھ ۱۳۴۸ء میں وفات پائی۔

[6] عبداللہ الازدی خراسانی : غالباً یہاں مراد عبداللہ بن فروخ خراسانی سے ہے یہ ۱۱۵ھ ۷۲۳ء میں پیدا ہوتے اور ۱۷۵ھ ۷۹۱ء میں وفات پائی۔ خطیب نے انکو منکر الحدیث کہا ہے (تہذیب التہذیب ج ۵ : ۳۵۶)

ایک اور رائے

اور بعض کی یہ رائے ہے کہ خواب ایک قسم کا کلام ہے اور اس طریقے سے اللہ سبحانہ و تعالیٰ اپنے بندے سے کلام کرتا ہے انھوں نے اس حدیث سے استدلال کیا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ رُؤْیَا الْمُؤْمِنِ کَلَامٌ یُکَلِّمُ بِہٖ الْعَبْدُ رَبَّہٗ (مومن خواب کے ذریعہ سے اپنے رب سے کلام کرتا ہے) اس حدیث کی روایت حکیم ترمذی[1] نے عبادہ بن[2] الصامت کی سند سے کی ہے اور نوادر الاصول کی اٹھترویں اصل میں اس کا ذکر کیا ہے اور اس نے اس کی روایت اپنے استاد عمر بن ابی عمر[3] سے کی ہے جو ضعیف ہے مزید براں اس سند میں ایسے لوگ ہیں جنھیں محدثین پسند نہیں کرتے۔

حکیم ترمذی فرماتے ہیں کہ بعض مفسرین نے وَمَا کَانَ لِبَشَرٍ اَنْ یُکَلِّمَہُ اللّٰہُ اِلَّا وَحْیًا اَوْ مِنْ وَّرَآءِ حِجَابٍ میں مِنْ وَّرَاءِ حِجَابٍ کی تشریح فِی الْمَنَامِ (خواب میں) کی ہے۔ کچھ اور مفسرین اس طرف گئے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے خواب پر ایک فرشتہ کو مقرر کر رکھا ہے جو لوحِ محفوظ سے بنی آدم کے حالات معلوم کر کے کچھ حالات لکھ لیتا ہے اور پھر ہر انسان کے واقعات کی مثال بیان کرتا ہے۔ چنانچہ جب وہ سو جاتا ہے تو اسے یہی مثال اشیاء حکمت کے طرز میں اسے پیش کرتا ہے تاکہ یہ اشیاء اس کے لیے بشارت دینے والی ہوں یا ڈرانے وال یا عتاب کرنے والی بعض اوقات شیطان انسان کی سخت عداوت کی وجہ سے اس پر مُستَلط ہو جاتا ہے اور طرح طرح کی چالیں اس سے چلتا ہے اور اس کے معاملات کو ہر طرح سے خراب کرنا چاہتا ہے لہٰذا یا تو وہ اس کی خواب کو گڑبڑ ڈال کر تلف کر دیتا ہے یا اسے خواب سے غافل کر دیتا ہے۔

خواب کی دو قسمیں ہیں خواطر اور ادراکات

حکیم ترمذی فرماتے ہیں خواب کی دو قسمیں ہیں۔ خواطر[1] اور ادراکات[1] بعینہٖ اسی طرح جس طرح بیداری میں ہوتا ہے کیونکہ بیداری میں انسان کے دل میں کئی قسم کے خیالات گزرتے ہیں اور اسی طرح بیداری میں کئی قسم کے علوم کا ادراک کرتا ہے یا اپنے حواس کے ذریعہ اشیاء کو محسوس کرتا ہے۔

---

[1] حکیم ترمذی: ابوعبداللہ محمد بن علی بن حسن بن بشیر مؤذن حکیم ترمذیؒ۔ ۲۸۶ھ تک زندہ تھے۔ ان کی کتاب نوادر الاصول میں ۲۸۸ اصول پر بحث کی گئی۔

[2] عبادہ بن صامت: ان کا ذکر پہلے آچکا ہے۔

[3] عمر بن ابی عمر: ابو محمد عمر بن ابی عمر کلاعی الدمشقی۔ ابن حجر نے ابن عدی کے حوالہ سے لکھا ہے کہ یہ منکر الحدیث ہیں اگرچہ ثقہ لوگوں سے روایت کرتے ہیں۔ بیہقی کہتے ہیں کہ یہ بقیہ کے مجہول استادوں میں سے ہے (تہذیب التہذیب ج ۷، ص ۴۸۷)

یہی حال سوئے ہوئے انسان کا ہوتا ہے کہ کبھی اسے خواب ان خواطر کی وجہ سے آتی ہے جو اس کے دل میں پیدا ہوتے ہیں اور کبھی کسی شئی کے ادراک اور اس کے مشاہدے کی وجہ سے۔ لہٰذا خواب کی دو قسمیں ہوئیں ادراکات اور خواطر۔

پہلی قسم: ادراکات پہلی قسم ادراکات ہیں۔ اور ادراکات کی بھی دو قسمیں ہیں۔ ایک وہ جو رُوح کی طرف منسوب ہیں۔ کیونکہ درحقیقت دیکھنے والی شئی تو روح ہی ہے اور اس کا دیکھنا بصیرت کے ذریعہ سے ہوتا ہے اور ہم اجزاءِ روح میں اِنَّ ھٰذَا الْقُرْاٰنَ اُنْزِلَ عَلٰی سَبْعَۃِ اَحْرُفٍ کی حدیث پر بحث کرتے ہوئے بصیرت پر بحث کر چکے ہیں۔ لہٰذا اگر رُوح اپنی بصیرت کے ذریعہ سے دیکھے گی تو اسے روح کی طرف منسوب کریں گے اور اگر ذاتِ انسانی اور قلب کے ذریعہ سے ایسی اشیاء کو دیکھے گی جنہیں انسان دیکھنے کا عادی ہے مثلاً گھر، مسجد، باغ وغیرہ تو اس خواب کو ذات کی طرف منسوب کریں گے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ جس طرح روح کے دو کان ہیں ایک وہ جس کی طرف روح ذات میں بند ہونے سے پہلے منسوب ہوتی ہے اور وہ دنیا کے مشرق اور مغرب تک کی اشیاء سن لیتے ہیں اور دوسرے وہ کان ہیں جن کی طرف ذات میں محجوب ہونے کے بعد منسوب ہوتی ہے اور وہ صرف یہی کان ہیں جن سے انسان سنتا ہے اسی طرح روح کی دو بصارتیں ہیں۔ ایک محجوب ہونے سے پہلے جو مشرق اور مغرب تک جا پہنچتی اور ساتوں طبقوں کو بھی چیر کر نکل جاتی ہے اور دوسری محجوب ہونے کے بعد کی بصارت اور یہ صرف آنکھ کے ذریعہ سے ہوتی ہے اور دو مشیتیں[1] ہیں۔ ایک محجوب ہونے سے پہلے اور یہ وہ مشیت ہے جس کے ذریعہ سے روح مشرق اور مغرب کو ایک قدم اٹھانے سے طے کر لیتی ہے اور دوسری محجوب ہونے کے بعد اور یہ محض پاؤں کے ذریعہ سے ہوتی ہے۔ اسی طرح اس کی دو نظریں ہوتی ہیں۔ ایک محجوب ہونے سے پہلے اور یہ وہ نظر ہوتی ہے جو روح کی بصیرت کے ذریعہ سے ہوتی ہے اور یہ اس کے تمام جواہر کے ذریعہ سے ہوتی ہے اور روح اس کے ذریعہ سے اپنی تمام معلومات کو ایک لحظہ کے اندر دیکھ لیتی ہے۔ اور اس کے لیے قرب و بعد کوئی نہیں یہاں تک کہ جس ذات میں یہ ہوتی ہے اور دوسری طرف عرش ہو تو اس کے نزدیک دونوں برابر ہوں گے۔ اور دوسری محجوب ہونے کے بعد کی اور یہ صرف دل میں ہوتی ہے لہٰذا جب کوئی شخص سو جاتا ہے اور خواب میں کوئی چیز دیکھتا ہے تو کبھی اسے رُوح کی نظر سے دیکھتا ہے اور کبھی ذات کی نظر سے اور ان کے درمیان صرف صفائی اور پاکیزگی کا فرق ہے

---

[1] ارادہ

کیونکہ جو نظر روح کی طرف منسوب ہے اس میں صفائی اور پاکیزگی ہوتی ہے اور جو ذات کی طرف منسوب ہوتی ہے وہ اس کے برعکس ہوتی ہے اسی لیے پہلی قسم کے خواب کی کوئی تعبیر نہیں ہوتی یا اگر ہوتی بھی ہے تو بہت قریب کی تعبیر ہوتی ہے، لیکن دوسری قسم میں اس میں دور کا اور خفی اشارہ ہوتا ہے۔ جس کی وجہ سے تعبیر میں دقت پیش آتی ہے۔ مثلاً فرض کرو کہ زید کو کسی شخص نے زخمی کر دیا پھر فرض کر لیا جائے کہ واقعہ سے پہلے یہی واقعہ اس نے خواب میں دیکھا پس اگر اُس نے رُوح کی نظر سے دیکھا ہے تو بعینہٖ وہی صورت پیش آئے گی، لیکن اگر بنظرِ ذات دیکھا ہو گا تو اس طرح دیکھے گا کہ وہ راستہ میں جارہا ہے اور کوئی لکڑی لگی جس سے زخم آگیا۔ پہلی خواب میں چونکہ صفائی اور پاکیزگی پائی جاتی ہے اس لیے کہ یہ نورِ رُوح سے دیکھی جاتی ہے اور نورِ روح صحیح ہوتا ہے اور وہ ہر چیز کی حقیقی صورت پیش کرتا ہے برخلاف ثانی کے کہ وہ نورِ ذات سے دیکھی گئی ہے اور نورِ ذات میں باطل شامل ہوتا ہے اور باطل کسی چیز کی حقیقی صورت پیش نہیں کرتا بلکہ اس کو متغیر و متبدّل کر دیتا ہے لہٰذا خواب میں اونٹ بصورتِ مینڈک اور پرند بصورتِ پتھر اور انسان بصورتِ لکڑی دکھائی دے گا اور چونکہ بجز نبی کے کہ اُن کی ذات معصوم ہوتی ہے اور کوئی ذات ظلمت سے خالی نہیں ہے اس لیے اُمتی کے ہر خواب میں کم و بیش ہوتا ہے اور تعبیر کی ضرورت پیش آتی ہے)

ظلامِ ظلمت کے دس درجے ہیں

قوت و ضعف کے اعتبار سے ظلمت کے دس درجے ہیں:

پہلا درجہ: پہلا درجہ وہ ظلمت ہے جو فعلِ مکروہ کے سہواً مرتکب ہونے سے ذات پر آتی ہے۔ جیسا کہ کوئی شخص سہواً بائیں ہاتھ سے کوئی چیز کھائے یا اسی قسم کی کوئی مکروہ بات کا مرتکب ہو۔ لہٰذا جب اس قسم کا سہو بندہ سے سرزد ہو تو اس سے اُس کی ذات میں ہلکی سی تاریکی داخل ہو جاتی ہے اور جب وہ شخص سوئے گا اور یہ تاریکی اس کی ذات میں ہو گی تو جب خواب دیکھے گا تو یہ اس کو کسی قدر پلٹ دے گی۔ مثال کے طور پر اس قسم کا آدمی اگر خواب میں جنت دیکھے اور اس میں داخل ہونے کا ارادہ نہ کرے تو اس کی تعبیر یہ ہے کہ اس نے ایک غیر واجب نیکی کرنی چاہی مگر پھر اس سے رجوع کر لیا۔ اس تعبیر کی وجہ یہ ہے کہ نیکی جنت میں داخل ہونے کا سبب ہے اسی لیے خواب میں جنت کے واقع ہونے سے مراد نیکی ہے اور جنت میں داخل ہونے کا ارادہ نہ کرنا اس بات کی علامت ہے کہ وہ اس نیک کام کرنے سے رُک گیا ہے اور بغیر پلٹنے کے خواب کی حقیقت یہ ہے کہ وہ یوں دیکھے کہ اس نے ایک نیک کام کرنے کا ارادہ کیا، لیکن پھر اس سے رک گیا اسی لیے خواب میں تھوڑا سا ردّوبدل ہو گیا جس کا سبب تاریکی ہے۔

دوسرا درجہ : دوسرا درجہ اس ظلمت کا ہے جو ایک حرام بات کو سہواً کرنے سے ذات کے اندر داخل ہو جاتی ہے۔ مثلاً یہ کہ کوئی شخص روزہ رکھ کر سہواً کچھ کھالے یا اسی قسم کی کوئی اور حرام بات جو انسان سے سہواً سرزد ہو جائے مگر اس سہو کی وجہ سے اُسے گناہ گار نہ کہا جا سکتا ہو کیونکہ یہ ظلمت میں اس ظلمت سے جو مکروہ میں سہو واقع ہو جانے سے پیدا ہوتی ہے، زیادہ ہوتی ہے اور اس میں خواب کو اس صورت سے زیادہ پلٹ دیا جاتا ہے۔ مثلاً اگر کوئی شخص خواب میں جنت دیکھے اور اس میں داخل ہونے کا ارادہ بھی کرے مگر اُسے داخل ہونے سے روک دیا جائے تو اس کی تعبیر یہ ہوگی کہ وہ ایک فرض کفایہ کرنے کا ارادہ کرتا ہے مگر پھر نہیں کرتا۔ اس کی تعبیر کی وہی وجہ ہے جو پہلے گزر چکی ہے۔ اس خواب میں تاریکی اس قدر قوی ہو گئی ہے کہ خواب میں اسے اس شخص کی طرح دکھایا گیا ہے جسے جنت میں داخل ہونے سے روکا گیا ہو تاکہ یہ تاریکی فرض کفایہ سے روکتی ہے اور یہ حرام چیز کو سہواً کرنے سے پیدا ہوتی ہے۔ برخلاف مذکورہ بالا خواب کے، واللہ تعالیٰ اعلم۔

تیسرا درجہ : تیسرا درجہ اس ظلمت کا ہے جو ذات میں مکروہ چیز کو عمداً کرنے سے داخل ہو جاتی ہے مثلاً کسی نے عمداً بائیں ہاتھ سے کھانا کھایا وغیرہ۔ لہٰذا جب کبھی اس قسم کا فعل کسی انسان سے عمداً سرزد ہوگا تو اس میں اس قدر ظلمت داخل ہو جائے گی جو حرام فعل کو سہواً کرنے سے زیادہ ہوگی لہٰذا اس کی خواب پچھلی صورت کے مقابلہ میں زیادہ بدل کر آئے گی۔ مثلاً کسی نے خواب میں دیکھا کہ شیاطین اس کے گھر میں گھس آئے ہیں تو اس کی تعبیر یہ ہوگی کہ اس کی بیوی زانیہ ہے اور لوگ اس کے پاس آتے رہتے ہیں۔ اس تعبیر کی وجہ یہ ہے کہ خواب میں شیاطین کو دیکھنے سے مراد زانی لوگ ہیں۔ کیونکہ ان میں آپس میں مشابہت ہے اور شیاطین کے گھس جانے سے مراد زنا ہے اور گھر سے مراد بیوی ہے اور اس تعبیر میں بُعد پایا جاتا ہے مگر اس میں خواب کو زیادہ نہیں پلٹا گیا، لیکن جو چیز خواب سے مقصود ہے اس میں خبث اور تاریکی کی زیادتی پائی گئی۔ اس لیے کہ اس میں عار، بے عزتی اور آبروریزی سب پائی جاتی ہیں۔ چنانچہ یہاں جس شخص کے متعلق تعبیر بیان کی جاتی ہے اس میں تاریکی قوی ہے۔ یہاں سے معلوم ہو جائے گا کہ تاریکی بعض اوقات تعبیر میں قوی ہوتی ہے اور کبھی خواب میں دیکھی ہوئی چیز میں۔

چوتھا درجہ : وہ تاریکی ہے جو حرام کو ارادۃً کرنے سے پیدا ہو جاتی ہے۔ مثلاً کسی نے ارادۃً زنا کیا یا ارادۃً روزہ رکھ کر پھر توڑ دیا وغیرہ۔ لہٰذا جب اس قسم کا فعل انسان سے قصداً سرزد ہوگا تو اس سے انسان میں پہلے درجوں سے بڑھ کر ظلمت داخل ہو جائے گی مثلاً کسی نے دیکھا کہ

وہ ایک بوڑھے مسلمان کے آگے آگے چل رہا ہے تو اس کی تعبیر یہ ہے کہ وہ صاحبِ معصیت ہے، لیکن اس کا ایمان صحیح ہے کیونکہ بوڑھے مسلمان سے مراد اس کا ایمان ہے کیونکہ بڑھاپا اور کبر سنی اس پر دال ہیں کہ وہ بصیرت پر ہے لہٰذا اس کے ایمان کی پختگی معلوم ہو گئی، لیکن اس کے آگے آگے چلنا گناہوں پر دلالت کرتا ہے کیونکہ صاحبِ ایمان ایمان کی تابعداری نہیں کرتا بلکہ اس کی پرواہ نہ کرتے ہوئے اس کے آگے آگے جا رہا ہے۔ لہٰذا اس خواب کی تعبیر میں تاریکی بھی قوی ہو گی کیونکہ بوڑھے آدمی سے ایمانِ صحیح مراد لینے میں کافی بُعد ہے اور اسی طرح اس سے آگے چلنے سے معصیت مراد لینے میں بھی کافی بُعد پایا جاتا ہے۔ اسی لیے ہم نے کہا ہے کہ اس درجے کی ظلمت پہلے درجات کی نسبت زیادہ قوی ہے اور خواب میں بھی ظلمت قوی ہے کیونکہ معصیت کا معاملہ اور ان کا خطرہ کوئی معمولی چیز نہیں۔

پانچواں درجہ: پانچواں درجہ اس ظلمت کا ہے جو خفیف عقیدے میں جہلِ بسیط کی وجہ سے داخل ہو جاتی ہے کیونکہ عقیدہ دو قسم کا ہے عقیدۂ خفیفہ اور ثقیلہ۔ خفیفہ وہ ہے جس کی وجہ سے صاحبِ عقیدہ ہمیشہ دوزخ میں نہیں رہے گا مگر اس پر سزا ضرور ملے گی۔ مثلاً یہ ایک عقیدہ ہے کہ آخرت میں اللہ تعالیٰ کا دیدار ہو گا اور یہ کہ اللہ تعالیٰ پر جزا واجب نہیں۔ یعنی نیک اعمال پر ثواب اور برے اعمال پر عذاب دینا واجب نہیں بلکہ ثواب اس کی مہربانی سے ملے گا اور اگر وہ عذاب دیگا تو یہ اس کا عدل ہو گا اور یہ کہ اللہ تعالیٰ اپنے افعال میں کسی واسطے کا محتاج نہیں اور تمام واسطے اور وہ اشیاء جو ان سے پیدا ہوتی ہیں سب اللہ تعالیٰ کے افعال میں شامل ہیں۔ چنانچہ آگ اور اس کا جلانا اور کھانا اور اس کا پیٹ کو بھر دینا۔ تلوار اور اس کا کاٹنا یہ سب اللہ کے افعال میں سے ہے۔ نیز یہ بھی ایک عقیدہ ہے کہ جنت اب بھی موجود ہے اور دوزخ بھی اس وقت موجود ہے اور یہ کہ اللہ تعالیٰ نہ دنیا میں کسی پر ظلم کرتا ہے نہ آخرت میں کرے گا۔ یہ تمام امور عقائدِ خفیفہ ہیں۔ جس کا یہ عقیدہ ہو گا وہ صحیح مومن ہے اور اس کا ایمان کامل ہے اور جو ان سے بے خبر ہے مثلاً یہ کہ اس کا عقیدہ یہ ہو کہ اللہ کا دیدار نہ ہو گا یا یہ کہ اللہ پر جزا و سزا دینا واجب ہے یا یہ کہ اللہ اپنے افعال میں واسطہ کا محتاج ہے یا یہ کہ جنت اور دوزخ موجود نہیں تو اس قسم کے عقائد رکھنے والوں کو قیامت کے دن اس قدر عذاب ہو گا جو غیر اعتقادی گناہوں سے زیادہ ہو گا۔

عقیدۂ ثقیلہ وہ ہے جس سے جہالت کی وجہ سے اعتقاد رکھنے والے کو ہمیشہ کے لیے دوزخ میں جانا پڑے گا۔ مثلاً یہ ایک عقیدہ ثقیلہ ہے کہ اللہ تعالیٰ موجود ہے اور اس کا وجود ازلی اور ابدی ہے اور یہ کہ وہ جو کام کرتا ہے اپنے اختیار سے کرتا ہے اور اس کے افعال نہ طبعی طور پر سرزد ہوتے

ہیں اور نہ ہی کسی علت یا سبب کی وجہ سے اور یہ کہ وہ ہمارے افعال کا خالق ہے اور ان میں ہمارا قطعاً کوئی اختیار نہیں اور یہ کہ اس کے ملک میں نہ دنیا کا کوئی بڑا انسان مثلاً بادشاہ یا وزیر اور نہ ہی آسمان کا مثلاً سورج، چاند، ستارے اور تمام فرشتے کوئی بھی اس کا شریک نہیں۔ اور یہ کہ اللہ تعالیٰ سننے اور دیکھنے والا ہے اور یہ کہ وہ علیم ہے۔ یہ سب عقائدِ ثقیلہ ہیں۔ لہٰذا جب کوئی بندہ عقائدِ خفیفہ کے ساتھ ان کا بھی عقیدہ رکھے تو اس کا ایمان مکمل ہو جاتا ہے، لیکن اگر ان سے عدمِ واقفیت ہو یا ان میں سے کسی ایک سے بھی ناواقف ہو تو اس کے لیے خُلُود فی النّار واجب ہے۔ خدا ہمیں اس سے بچائے۔

جب تو نے یہ بات سمجھ لی تو اب ہم عقیدۂ خفیفہ میں جہل بسیط کی طرف لوٹتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ان عقائد سے ذاتِ انسانی پر اس قدر ظلمت طاری ہو جاتی ہے جو مذکورہ بالا تاریکیوں سے زیادہ ہوتی ہے اور اس سے اس کی خواب میں ردّ و بدل بھی بہت زیادہ ہوگا۔ مثلاً اگر کوئی شخص خواب میں کوئی مردہ دیکھے اور اسے علم بھی ہو کہ وہ مردہ ہے اور وہ اس سے اس کا حال پوچھے اور پوچھے اللہ تعالیٰ نے تم سے کیا برتاؤ کیا اور میت اپنی حالت کی شکایت کرنے لگ جائے اور اپنی بداعمالیوں کا ذکر کرے تو اس کی تعبیر یہ ہے کہ یہ دیکھنے والے کے دیندار ہونے کی دلیل ہے اور یہ کہ اس کی آخرت اچھی ہوگی اور وہ عنقریب اپنے بُرے اعمال سے توبہ کرے گا۔ اس تعبیر کی وجہ یہ ہے کہ خواب میں نصیحت کرنے کا ضرور اثر ہوتا ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اسے زجر و توبیخ کے قائم مقام قرار دیا ہے اور جو بات اللہ کی طرف سے ہو تو وہ ضرور ہو کر رہے گی، بندے کی طاقت نہیں کہ وہ میت سے ملاقات کر سکے اور اس سے اس کی حالت کی بابت سوال کرے، بلکہ یہ اللہ ہی کی طرف سے ہے کہ اس نے خواب دیکھنے والے اور میت کو اکٹھا کر دیا تاکہ وہ جو کچھ بھی سُن سکے سُن لے تاکہ اس پر اللہ کی رحمت ہو اور اگر اللہ چاہتا تو وہ اس شخص کو اپنی گمراہی میں حیران چھوڑ دیتا۔ پس اس تعبیر میں ظلمتِ قوی ہوئی کہ اشارہ بہت خفی اور تعبیر بہت زیادہ دقیق ہوگئی۔ واللہ تعالیٰ اعلم۔

چھٹا درجہ: وہ ظلمت جو ذاتِ انسانی پر جہلِ مرکّب کے طور پر عقیدہ خفیفہ میں جہالت کی وجہ سے طاری ہو جاتی ہے مثلاً یہ عقیدہ رکھنا کہ اللہ تعالیٰ کا دیدار نہ ہوگا۔ یا یہ کہ اللہ کے لیے جزا و سزا دینا واجب ہے اور ساتھ ہی یہ عقیدہ رکھنا کہ اس کا یہ عقیدہ درست ہے لہٰذا جو ظلمت اس جہل مرکّب عقیدے کے رکھنے سے ذات پر طاری ہوگی وہ اس ظلمت سے زیادہ ہوگی جو اس مرتبے کے پہلے مرتبے میں طاری ہوتی ہے۔ اس کی مثال یوں ہے کہ کوئی شخص خواب میں دیکھے کہ وہ دوزخ کا شوربہ

کھا رہا ہے اور دوزخ کا گرم پانی پی رہا ہے تو اس کی تعبیر یہ ہے کہ وہ ہر طرح سے حرام میں داخل ہوگا خواہ روپیہ جمع کرنے کے اعتبار سے خواہ حرام سے منع رہنے کے اعتبار سے چنانچہ وہ ناجائز طور پر دنیا کو جمع کریگا اور اسے حقداروں پر صرف نہ کریگا اس تعبیر کی وجہ یہ ہے کہ حرام دوزخ میں لے جانے دوزخ کا زقوم کھانے اور اس کا گرم پانی پینے کا سبب ہے اور تعبیر کے اعتبار سے اس کی ظلمت یہ ہے کہ زقوم اور گرم پانی دونوں طبعاً مکروہ چیزیں ہیں اور مال و زر طبعاً محبوب ہے لہٰذا مکروہ و محبوب ہونے میں دونوں میں فرق ہوا۔ لہٰذا یہ تعبیر بالضد ہوئی۔ مزید برآں جس بات سے تعبیر دور کی ہو جاتی ہے۔ یہ ہے کہ جس کی تعبیر کی جاتے وہ تو دنیا کی چیز ہو اور جس سے تعبیر کی گئی ہو وہ آخرت کی چیز ہو یا بالعکس کیونکہ دونوں گھروں (دنیا و آخرت) میں بُعد ہے اور ان کے درمیان کے اشارے میں بھی بُعد ہے کیونکہ جہنم تھوہر اور گرم پانی مکروہ چیزیں ہیں، لہٰذا یہاں تین وجہ سے ظلمت قوی ہو گئی ہے جو مذکورہ ظلمتوں میں سے کسی ظلمت میں نہیں پائی جاتی۔ واللہ تعالیٰ اعلم۔

ساتواں درجہ : وہ ظلمت جو ذات پر عقیدۂ ثقیلہ میں جہلِ بسیط کی وجہ سے داخل ہوتی ہے مثلاً کوئی شخص عقیدۂ مذکورہ میں بیان کردہ اعتقادات کے منافی عقیدہ رکھتا ہو مگر اگر کوئی اسے بتادے تو وہ اس عقیدے سے باز آجائے۔ لہٰذا یہ ظلمت پہلے ذکر کردہ ظلمتوں سے بڑھکر ہوگی۔ اس کی مثال یہ ہے کہ کوئی شخص خواب میں دیکھے کہ وہ جہنم میں داخل ہوا ہے تو اس کی تعبیر یہ ہوگی کہ وہ والدین کا نافرمان ہے یا اسی قسم کے کسی کبیرہ گناہ میں مبتلا ہے اس تعبیر کی وجہ ظاہر ہے اور ظلمت کی قوت تعبیر کے لحاظ سے ہے، اس لیے کہ یہاں دونوں جہانوں میں اختلاف ہے۔ کیونکہ مرئی شی دارِ آخرت میں ہے اور جس چیز سے اس کی تعبیر کی گئی ہے وہ دنیا میں ہے اور خواب کے لحاظ سے بھی ہے کہ جہنم میں داخل ہونا اور والدین کی نافرمانی دونوں بُری چیزیں ہیں اور ان کی ظلمت کسبِ حرام کی ظلمت سے زیادہ ہے اسی لیے اس مرتبے کی ظلمت زیادہ قوی ہے۔ واللہ تعالیٰ اعلم۔

آٹھواں درجہ : وہ ظلمت جو ذات پر عقیدۂ ثقیلہ میں جہلِ مرکب کی وجہ سے داخل ہوتی ہے مثلاً یہ عقیدہ رکھنا کہ انسان اپنے افعال کا خالق ہے اور پھر یہ سمجھتا ہو کہ اس کا یہ عقیدہ درست عقیدہ ہے لہٰذا یہ ظلمت اوپر والی ظلمت سے بھی زیادہ ہوگی اور اس سے خواب میں اس سے بھی زیادہ ردّ و بدل ہوگا۔ اس کی مثال یوں ہے کہ کسی شخص نے دیکھا کہ اسے ایک فرشتے نے پکڑ لیا اور جہنم میں ڈال دیا ہے تو اس کی تعبیر یوں ہوگی کہ تقدیر الٰہی اسے معصیت کی طرف لے جائے گی

اور اس تعبیر کی وجہ یہ ہے کہ یہاں فرشتہ کا اشارہ تقدیر کی طرف ہے اور جہنم کا اشارہ معصیت کی طرف ہے اور اس میں ظلمت کی وجہ یہ ہے کہ فرشتے سے مراد تقدیر لی گئی ہے اور یہ بہت خفی اور دقیق اشارہ ہے اور ساتھ ہی خواب بھی گھناؤنی ہے کیونکہ فرشتے کا بندہ کو جبراً پکڑنا اور اسے دوزخ میں ڈالنا نہایت ہی مکروہ بات ہے برخلاف اس کے کہ جس نے دیکھا کہ وہ جہنم میں داخل ہوگیا ہے یا یہ کہ اس نے زقوم کھایا ہے اور دوزخ کا گرم پانی پیا ہے کیونکہ وہاں کسی قسم کا جبر نہیں پایا جاتا۔ یہی وجہ ہے کہ ہم نے کہا ہے کہ اس مرتبہ کی ظلمت مذکورہ بالا مراتب سے بڑھکر ہے۔ واللہ تعالیٰ اعلم۔

نواں درجہ: وہ ظلمت جو ذات پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات کے متعلق جہلِ بسیط کی وجہ سے داخل ہوتی ہے مثلاً یہ کہ کوئی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں ایسی صفات کا عقیدہ رکھے جو درحقیقت آپ میں نہیں پائی جاتیں۔ مگر یہ عقیدہ ایسا ہو کہ اگر اسے علم ہو جائے تو اس سے باز آجاتے۔ لہٰذا یہ ظلمت ماقبل کی ظلمت سے زیادہ ہوگی کیونکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کا دروازہ ہیں اور جو دروازے سے ناواقف ہوگا اور اس سے بھٹک جائے گا تو وہ گھر میں کبھی بھی داخل نہ ہو سکے گا۔ کیونکہ اگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نہ ہوتے تو نہ تو ہمارا ایمان باللہ درست ہوتا اور نہ ہی دنیا اور آخرت کی کوئی بھلائی درست ہوتی۔ اس کی مثال یہ ہے کہ کوئی شخص خواب میں دیکھے کہ وہ جوان ہوگیا ہے حالانکہ وہ دراصل بوڑھا تھا تو اس کی تعبیر یہ ہوگی کہ اسے بہت سی دنیا حاصل ہوگی جس میں وہ اللہ تعالیٰ کی فرمانبرداری نہ کریگا۔ اس تعبیر کی وجہ یہ ہے کہ بڑھاپے کی حالت کا اشارہ فقر کی طرف ہے اور جوانی جس کی طرف وہ لوٹ کر گیا ہے اس کا اشارہ مالداری کی طرف اور اس میں ظلمت کی قوتِ تعبیر کی وجہ سے ہے کیونکہ شباب سے حصولِ دنیا مراد لینا نہایت ہی خفی امر ہے اور خود خواب میں بھی ظلمت قوی ہے کہ دنیا ہر گناہ کی اصل ہے بالخصوص جب کہ بکثرت ملے جیسے کہ اس خواب میں اور اس لیے بھی کہ وہ مالداری میں نیک کام نہ کریگا۔ واللہ اعلم۔

دسواں درجہ: وہ ظلمت جو ذات پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات کے متعلق جہلِ مرکب کی وجہ سے داخل ہو۔ مثلاً یہ کہ وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق ایسی صفات کا عقیدہ رکھے جو درحقیقت آپ میں نہیں ہیں اور پھر یہ بھی عقیدہ رکھے کہ اس کا عقیدہ صحیح ہے لہٰذا یہ ظلمت جو ذات پر مذکورہ بالا جہل مرکب کی وجہ سے داخل ہوگی ہر پہلی ذکر کردہ ظلمت سے

بڑھکر ہوگی مثلاً کوئی یہ دیکھے کہ وہ ایک نوجوان کے پیچھے پیچھے چل رہا ہے تو اس کی تعبیر یہ ہے کہ وہ لوطیوں والا کام کرے گا اور اس میں تعبیر کی وجہ ظاہر ہے اور ظلمت کی قوتِ نفس خواب میں ہے کہ لواطت بہت بڑا گناہ ہے۔ نَسْأَلُ اللّٰہَ السَّلَامَةَ بِعِنَتِہٖ وَکَرَمِہٖ۔

حضرت نے فرمایا یہ ظلمت کے دس درجے بنگاہِ ذات کی طرف منسوب ہیں۔

درجاتِ طہارت

رہے درجاتِ طہارت جو روح کی طرف منسوب ہیں وہ بھی دس ہیں اور یہ مذکورہ بالا درجات کا عدم اور ان کی ضد ہیں اسی لیے درجاتِ طہارت کا حال ثقل اور خفت کے اعتبار سے درجاتِ ظلمت کے برعکس ہوگا۔ کیونکہ مذکورہ بالا دس درجوں میں سے ثقیل ترین اور آخری درجہ بارگاہ محمدیہ میں جہل مرکب کا ہے اور یہاں درجاتِ طہارت میں جہل مرکب سے پاک ہونا، پھر جہلِ بسیط سے پاک ہونا، پھر عقیدۂ خفیفہ میں جہلِ مرکب سے پاک ہونا۔ پھر جہل بسیط سے پاک ہونا۔ پھر حرام چیز کا عمداً نہ کرنا۔ پھر مکروہ بات کا عمداً نہ کرنا پھر حرام میں سہو کا واقع نہ ہونا اور یہ ثقیل ترین امر ہے کیونکہ مکروہ میں سہو کے نہ ہونے کے ساتھ ساتھ جہل مرکب یا بسیط بھی ہوسکتا ہے جس کی مثالیں ہم عنقریب بیان کریں گے۔

پھر یاد رکھیں کہ جب رُوح اپنی بصیرت اور صاف نگاہ سے خواب دیکھتی ہے تو اصلی حالت پر دیکھتی ہے کہ اس میں کسی قسم کی تبدیلی یا تغیر نہیں ہوسکتی۔ پھر جب روح اسے ذات کے حوالے کرنے لگتی ہے تو ذات کی طرف دیکھتی ہے پس اگر ذات ظلام سے پاک اور ہر لحاظ سے معصوم ہو تو وہ اس خواب کو روح تک بغیر تبدیلی اور تغیر کے جیسا اس نے دیکھا ہوتا ہے ادا کر دیتی ہے، لیکن اگر ذات میں ظلمت ہوگی تو اسے ادا کرتے وقت خواب میں ردّ و بدل ہوگا اور تعبیر اس کی ظلمت کی مقدار کے مطابق ہوگی اس سے یہ نتیجہ نکلا کہ روح جب ذات تک خواب پہنچاتی ہے تو اس کا پہنچانا ہی دو قسموں میں منقسم ہوجاتا ہے لہٰذا خواب کی ادائیگی کے وقت خواب میں ذاتِ طاہرہ کے لیے کسی قسم کا ردّ و بدل نہیں ہوتا یہ ردّ و بدل تو صرف ظلمتوں کی وجہ سے ہوتا ہے اور ہم نے ذات کو پاک فرض کیا ہے مگر غیر طاہر ذات کے لیے ظلمت کی مقدار کے مطابق ردّ و بدل واقع ہوتا ہے کیونکہ اگرچہ اس میں صفائی ہوتی ہے مگر ظلمت کسی اور وجہ سے ہوتی ہے۔ مختصر یہ کہ صفائی یا تو کُلّی صفائی ہوتی ہے اور وہ صرف انبیاء معصومین علیہم الصلوٰۃ والسلام کی ذات میں ہوتی ہے یا جزئی ہوتی ہے اور ایک جہت سے ہوتی ہے اور دوسری جہت سے نہیں ہوتی۔ اسی لیے اس کے بھی دس درجے ہیں اور ان کی ترتیب مذکورہ بالا دس درجوں کی ترتیب سے برعکس ہے۔

طہارت کا پہلا درجہ

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات کی نسبت جہل مرکب کا نہ ہونا، اس قسم کے جہل سے پاک ہونا ہر طرح کی دوسری صفائی سے بڑھکر ہے اسی لیے اس صفائی کے ہوتے ہوئے جو خواب آئے گا۔ اس کی تعبیر کی گویا کوئی ضرورت ہی نہیں۔ مثلاً کوئی شخص یہ دیکھے کہ حق تعالیٰ اس سے راضی اور خوش ہیں اور تبسم فرما رہے ہیں تو اس کی تعبیر یہی ہے کہ اللہ اُس سے راضی ہے اور اس کے اعمال اللہ کے نزدیک پاک ہیں۔

دوسرا درجہ: بارگاہِ عالیۂ رسالت مآب کے بارے میں جہل بسیط سے پاک ہونا۔ اس صفائی کا درجہ مذکورہ بالا صفائی کے درجہ سے کم ہے مگر اس کے بعد اس کا درجہ آتا ہے اسی لیے اس صفائی والے آدمی کی خواب میں تھوڑی تعبیر کی ضرورت ہے مثلاً کوئی دیکھے کہ وہ فرشتوں سے لڑ رہا ہے تو اس کی تعبیر یہ ہے کہ اسے یا پھنسیاں نکلیں گی یا کھجلی لاحق ہوگی یا کسی عادی سبب کے بغیر اس کے کسی عضو کی ہڈی ٹوٹ جائے گی۔ اس تعبیر کی وجہ یہ ہے کہ دیکھنے والی تو روح ہے اور جو فرشتے دکھائی دیے ہیں وہ ذات کے فرشتے ہیں جو اس کی حفاظت پر مقرر ہیں اور روح ان سے جھگڑ رہی ہے کیونکہ جب روح نے دیکھا کہ عنقریب ذات میں پھوڑے پھنسیاں وغیرہ نکلنے والی ہیں تو ذات کے محافظ فرشتوں سے جھگڑنا شروع کر دیا تو گویا وہ یوں کہہ رہی ہے کہ یہ تمہاری حفاظت میں کوتاہی کی وجہ سے ہے لہٰذا یہ خواب اس کلام کی طرح ہے جس میں کچھ حذف کیا گیا ہو۔ پس جب اس محذوف کلام کو مقدر مان لیا تو کلام صحیح اور مطلب واضح ہوگیا۔ یہی حال اس جگہ ہے کہ اگر جھگڑنے کا سبب ذکر کر دیا جاتا تو خواب واضح ہو جاتی اور تعبیر کی ضرورت ہی نہ پڑتی۔

تیسرا درجہ: تیسرا درجہ عقیدۂ نقلیہ میں جہلِ مرکب سے پاک ہونا ہے اس درجے کی صفائی کا درجہ گزشتہ درجے کی صفائی کے بعد آتا ہے اسی لیے اس کی خواب میں تعبیر کی ضرورت پڑتی ہے مثلاً کوئی یوں دیکھے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے سامنے خوف زدہ اور مرعوب حالت میں کھڑا ہے تو اس کی تعبیر یہ ہے کہ وہ کسی مصیبت میں گرفتار ہوگا اور اللہ تعالیٰ اسے نجات بخشے گا اور اس میں اسے اجرِ عظیم ملے گا اور اس تعبیر کی وجہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے سامنے لوگ صرف قیامت کے دن کھڑے ہونگے اور وہ بھی مومن لوگ۔ اگر اس مومن کی ذات ظلمت سے پاک نہ ہوتی تو اسے خواب میں ڈانٹ ضرور پڑتی۔ پھر انجام کار اسے نجات ملے گی اور وہ ہمیشہ کے لیے جنت میں جائے گا۔ لہٰذا جب اس نے دیکھا کہ وہ اس حالت میں (یعنی گھبراہٹ کے عالم میں) اللہ تعالیٰ کے سامنے کھڑا ہے تو اس کی تعبیر وہی ہے جو ذکر کی گئی۔ درحقیقت دیکھنے والی تو روح ہے اور تعبیر کی ضرورت تو اس وقت پڑی

جب روح نے یہ خواب جسم کے حوالے کی نہ اس لیے کہ روح کی نگاہ میں کوئی ظلمت تھی اور اگر اس خواب کا دیکھنے والا کوئی ولی یا عارف یا نبی یا رسول ہوتا تو اس کی تعبیر کسی اور طرح ہوتی جس کا ذکر بہت لمبا ہے۔ واللہ تعالیٰ اعلم۔

چوتھا درجہ: چوتھا درجہ عقیدۂ ثقیلہ میں جہل بسیط سے پاک ہونے کا ہے اس صفائی کا درجہ ماقبل کے درجے سے بعد آتا ہے مثلاً کسی نے عزرائیل علیہ السلام کو دیکھا وہ اسے دیکھ کر ہنس رہے ہیں اور خوش ہو رہے ہیں اس کی تعبیر درازی عمر ہے۔ اس تعبیر کی وجہ یہ ہے کہ اس شخص کے لیے ایسے بزرگ فرشتہ کے ساتھ خوش ہونے کا مطلب سوائے درازی عمر کے اور کچھ نہیں ہو سکتا، مگر ذات کے حوالے کرتے وقت اس میں ظلمت آئی اور تعبیر میں دقت واقع ہوئی۔ اس لیے کہ ملک الموت کی ہنسی سے درازی عمر مراد لینا ایک خفی اور دقیق اشارہ ہے۔ واللہ تعالیٰ اعلم۔

پانچواں درجہ: پانچواں درجہ عقیدۂ خفیفہ میں جہل مرکب سے پاک ہونا ہے۔ یہ عدم اور صفائی، ماقبل سے بھی نیچے درجے کی ہے۔ مثلاً یہ کہ کسی نے ابوبکر صدیقؓ کو خواب میں دیکھا تو اس کی تعبیر یہ ہے کہ دیکھنے والے کو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے بہت محبت ہے اور اس میں ذات کو حوالے کرنے میں جو ظلمت آئی وہ یہ ہے کہ ابوبکرؓ سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف اشارہ لیا گیا حالانکہ دونوں میں کوئی تلازم[1] نہیں۔ اسی لیے یہ اشارہ بہت خفی ہوا اور ذات کے حوالہ ہوتے وقت ظلمت کی وجہ سے خفاء لاحق ہوا۔ اس لیے اس کی ظلمت پہلے سے زیادہ ہوئی۔

چھٹا درجہ: چھٹا درجہ عقیدۂ خفیفہ میں جہل بسیط سے پاک ہونا ہے کہ اس عدم کا درجہ ماقبل کے بعد آتا ہے۔ مثلاً کسی نے فرشتوں کو کسی ایک جگہ دیکھ لیا تو اس کی تعبیر یہ ہے کہ اس مقام پر ایک مسجد بنے گی، جس میں اللہ کی عبادت اور اسی کی تسبیح و تقدیس ہوا کرے گی اس تعبیر کی وجہ تو ظاہر ہے اور اس میں ذات کے حوالے ہوتے وقت جو ظلمت آئی وہ یہ ہے کہ کہاں عالمِ انوار کے فرشتے اور کہاں عالمِ اغیار کی مسجد۔ برخلاف ماقبل کے کہ وہاں اگرچہ حضرت صدیقؓ اور محبتِ محمدیہ میں کوئی تلازم نہ تھا مگر عالم تو ایک تھا۔

ساتواں درجہ: ساتواں درجہ یہ ہے کہ حرام کا قصداً ارتکاب نہ کیا جائے مثلاً کسی نے اسرافیل کو کسی جگہ دیکھ لیا تو اس کی تعبیر یہ ہے کہ اس جگہ سخت فتنہ بپا ہوگا یا بڑی خوشی واقع ہوگی۔ وجہ تعبیر یہ ہے کہ حضرت اسرافیلؑ فتنوں اور خوشی کے معاملات پر متعین ہیں اور اس میں

---

[1] لازم و ملزوم ہونا

حوالۂ ذات ہونے کے وقت کی ظلمت ماقبل سے زیادہ قوی اس اعتبار سے ہے کہ فتنہ و سرور کیسا تھ حضرت اسرافیلؑ کا تعلق اتنا مشہور نہیں جتنا حضرت عزرائیلؑ کا تعلق عمر و زندگی کے ساتھ معروف و مشہور ہے۔ مزید برآں اس میں عالم انوار اور عالم اغیار کا بُعد موجود ہے لہٰذا اس میں ماقبل والی ظلمت کے ساتھ مزید ظلمت بھی پائی گئی۔ واللہ اعلم۔

آٹھواں درجہ: آٹھواں درجہ مکروہ بات کا عمداً نہ کرنے کا ہے مثلاً کسی نے دیکھا کہ شیاطین اسے گھیرے ہوتے ہیں پس اس کی تعبیر یوں ہوگی کہ چوروں کا گروہ اس پر حملہ آور ہوگا یا اس کا مال چوری ہو جائے گا یا لوگ اس کی بلاوجہ غیبت کریں گے وجہ تعبیر ظاہر ہے اور ظلمت تو یہ نفس خواب میں ہے کہ مال چوری جانا اور غیبت ہونا اس خواب دیکھنے والے کے لیے پریشان کن اور ناگوار امر ہے جو کہ پہلی صورت میں نہ تھا۔

نواں درجہ: نواں درجہ عدم سہو حرام ہے مثلاً دیکھا کہ کسی مقام پر قیامت بپا ہوگئی ہے اس کی تعبیر یہ ہے کہ اس جگہ کی حالت بدل جائے گی۔ اگر عدل ہو رہا تھا تو ظلم ہونے لگے گا یا بالعکس۔ اس میں ظلمت ذات کے حوالہ ہوتے وقت تعبیر میں آئی ہے کیونکہ حقیقی قیامت اور تبدیلِ حالت میں بہت بُعد پایا جاتا ہے پھر قیام قیامت سے عدل سے ظلم کی طرف منتقل ہونا تو اور بھی زیادہ بعید ہے کیونکہ قیامت کے دن کسی قسم کا ظلم نہ ہوگا۔ لہٰذا اس میں اسرافیل علیہ السلام کو دیکھنے کے مقابلے میں زیادہ ظلمت پائی گئی کیونکہ ان کا تعلق فتنہ و فرح کے ساتھ یکساں تھا مگر یہاں قیام قیامت کا تعلق عدل و ظلم کے ساتھ ایک جیسا نہیں۔ واللہ اعلم۔

دسواں درجہ: دسواں درجہ عدم سہو مکروہ کا ہے یہ درجہ سب سے زیادہ ثقیل اور ذات کا حوالہ کرتے وقت سب سے زیادہ ظلمت والا ہے مثلاً یہ دیکھنا کہ وہ شیطانوں کا دوست ہے تو اس کی تعبیر یہ ہے کہ اس کے دوست و احباب بُرے لوگ ہیں۔ وجہ تعبیر ظاہر ہے اب اس کی ظلمت کو دیکھو کہ یہ اس ظلمت جتنی ہے جو ذات کی نگاہ میں ہے کیونکہ انسان اپنے دوست کے دین پر ہوتا ہے لہٰذا جب ہمنشینوں میں کوئی بھلائی نہیں تو ہمنشین بھی ویسا ہی ہوگا۔ لہٰذا یوں سمجھنا چاہیئے کہ اس خواب کی ظلمت خبثِ ذات اور اس کی بداعمالی کی طرف اشارہ کر رہی ہے، بعینہٖ اُن ظلمتوں کی طرح جو ذات کی طرف منسوب کردہ دس قسموں میں پائی جاتی ہیں۔ کیونکہ ان میں سے ہر ایک، اگرچہ ان کے مراتب مختلف ہیں، خبثِ ذات کی طرف اشارہ کرتی ہے جیسا کہ گزر چکا۔ واللہ تعالیٰ اعلم۔

سوال میں نے عرض کیا حضرت اس تعبیر کا تو یہ مطلب نکلا کہ تعبیر کا سبب وہ ظلمت ہے جو ذات میں پائی جاتی ہے۔ اگرچہ صورت مختلف ہوتی ہے کہ روح کے دیکھے ہوئے میں تعبیر کی ضرورت ذات کو حوالہ کرتے وقت ہوئی اور ذات کے دیکھے ہوئے میں تعبیر کی ضرورت نفسِ خواب میں ہوئی جیسا کہ ذکر ہو چکا مگر جب کسی ذات میں اس کے ہر لحاظ سے معصوم ہونے کی وجہ سے کوئی ظلمت نہ ہو مثلاً انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسّلام کی ذات تو وہاں تعبیر کی حاجت نہ ہونی چاہیئے کیونکہ جو تعبیر کا سبب تھا۔ یعنی ظلمت وہ ان میں مفقود ہے مگر ہم دیکھتے ہیں کہ انبیاء کے بہت سی خوابوں کی تعبیر کی گئی مثلاً یوسف علیہ السلام کا خواب جس کا ذکر اس آیت میں ہوا ہے۔ اِنِّیْ رَاَیْتُ اَحَدَ عَشَرَ کَوْکَبًا وَّالشَّمْسَ وَالْقَمَرَ رَاَیْتُھُمْ لِیْ سَاجِدِیْنَ (سورہ یوسف۔ پہلا رکوع) کیونکہ درحقیقت جنہوں نے یوسف علیہ السلام کو سجدہ کیا تھا وہ ان کے بھائی اور والدین تھے کیونکہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں۔ وَخَرُّوْا لَہٗ سُجَّدًا (وہ سجدے میں گر گئے) وَقَالَ یٰٓاَبَتِ ھٰذَا تَاْوِیْلُ رُءْیَایَ مِنْ قَبْلُ قَدْ جَعَلَھَا رَبِّیْ حَقًّا (سورۂ یوسف) (ابا جان یہ میرے خواب کی تعبیر ہے۔ میرے رب نے میرے خواب کو سچ کر دکھایا) اسی طرح ابراہیم علیہ السلام کا خواب ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: یٰبُنَیَّ اِنِّیْٓ اَرٰی فِی الْمَنَامِ اَنِّیْٓ اَذْبَحُکَ فَانْظُرْ مَاذَا تَرٰی (سورۂ صٰفّٰت آیت ۱۰۲) (بیٹا میں نے خواب میں دیکھا ہے کہ میں تمہیں ذبح کر رہا ہوں اب دیکھ لو کہ تمہاری کیا رائے ہے) کیونکہ درحقیقت ذبح تو مینڈھے کو کیا گیا تھا، کیونکہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں۔ وَفَدَیْنٰہُ بِذِبْحٍ عَظِیْمٍ (ہم نے اس کے فدیے میں ایک بڑا ذبیحہ دیدیا) اسی قسم کا خواب آنحضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا خواب ہے کہ آپ نے دیکھا کہ گائے ذبح کی جا رہی ہے اور آپ کی تلوار کی دھار دندانہ دار ہوگئی ہے اور ایک مضبوط زرہ ہے (جس میں آپ داخل ہوگئے) تو آپ نے گائے ذبح کیے جانے سے یہ اشارہ سمجھا کہ آپ کے گھرانے کا ایک فرد شہید ہوگا اور مضبوط زرہ سے مراد مدینہ لی اور یہ کہ اگر آپ مدینہ سے باہر نہ نکلتے تو آپ کو کوئی تکلیف نہ پہنچتی۔ اسی طرح آپ کی یہ خواب ہے کہ لوگ قمیضیں پہنے آپ کے سامنے پیش ہو رہے ہیں بعض کی قمیضیں پستانوں تک ہیں اور بعض کی اس سے نیچے اور پھر عمرؓ کو دیکھا کہ ان کی قمیض اس قدر لمبی ہے کہ وہ اُسے گھسیٹتے ہوئے چلے آ رہے ہیں۔ اس پر صحابہ نے عرض کیا یا رسول اللہ! آپ نے اس کی کیا تعبیر فرمائی ہے۔ فرمایا: دین۔ اسی طرح آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے دیگر کثیر التعداد خواب ہیں جن میں تعبیر کی گئی۔

جواب انبیاء کی خوابیں دو قسم کی ہیں معاینہ اور وحی: اس کے جواب میں حضرت نے

فرمایا کہ انبیاء علیہ السلام کی نیند عام لوگوں کی طرح نہیں ہوتی کیونکہ وہ خواہ سوئے ہوئے ہی کیوں نہ ہوں مشاہدہ حق میں لگے ہوئے ہوتے ہیں۔ یہی وجہ تھی کہ ان کی آنکھیں تو سوئی ہوتی تھیں مگر دل بیدار ہوتے تھے اسی لیے ان کی خوابیں بھی دو قسم کی تھیں: معائنہ اور وحی۔ معاینہ یہ ہے کہ نبی خواب میں ایک چیز کا مشاہدہ کرے اور بیداری میں وہ چیز بغیر کم وکاست کے بعینہٖ اسی طرح نکل آئے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ خواب کہ آپؐ اور آپؐ کے صحابہ بڑے امن سے سر منڈا کر یا کتروا کر مسجد حرام میں داخل ہوں گے، اسی قسم کی تھی۔ اسی لیے اللہ تعالیٰ نے یہ آیت اتاری لَقَدْ صَدَقَ اللّٰهُ رَسُوْلَهُ الرُّؤْيَا بِالْحَقِّ (سورۂ فتح آیت ۲۷) اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول کی خواب سچی کر دی) چنانچہ اس جگہ خواب کو نہ تو محض روح کی طرف اور نہ محض ذات کی طرف منسوب کیا جائے گا بلکہ دونوں کی طرف منسوب کیا جائے گا، کیونکہ صفائی اور طہارت دونوں میں یکساں ہے۔ اسی قسم میں سے وہ تمام

معراج دو مرتبہ ہوئی۔ ایک مرتبہ روحانی، دوسری مرتبہ جسمانی

امور ہیں جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے معراج کی رات دیکھے کیونکہ ایک بار تو معراج روحانی طور پہ ہوئی۔ جیسے کہ دوسری بار آپؐ کی ذاتِ شریف کو معراج کرائی گئی چنانچہ پہلی[1] بار جو معراج رُوح کے ساتھ ہوئی وہ رویائے منامی تھا، چنانچہ اس وقت آپؐ کی ذات سو رہی تھی اور جو کچھ بھی دیکھا رُوح نے دیکھا اور اس میں کسی قسم کی تاویل یا تعبیر نہ کی گئی۔ مختصر یہ کہ اس قسم کی خواب آنکھوں دیکھی بات کی مانند ہوتی ہے چنانچہ جیسے بصیرت میں کوئی تبدیلی نہیں کی جاسکتی۔ اس طرح اس خواب میں بھی کوئی تبدیلی نہیں کی جاسکتی۔

خوابِ وحی

اب رہی خواب کی دوسری قسم یعنی خواب بطور وحی کے تو وہ انبیاء کی ہر ایسی خواب ہے جس کی تعبیر کی جاسکتی ہو، اس کی تحقیق یوں ہے کہ نبی علیہ السلام نے اس قسم کی خواب میں کسی خارجی وجود والی چیز کو نہیں دیکھا اور اس کی طرف آپ کی ذات یا روح نے توجہ کی ہوتی ہے بلکہ اللہ تعالیٰ جو بھی حکم یا ممانعت یا کسی بات کی خبر دینا چاہتے ہیں فرما دیتے ہیں مگر اپنے کلام کے بجائے کچھ امور پیدا کر کے دکھا دیے جاتے ہیں اور وہ وحی الٰہی کے معلوم کرنے کا ذریعہ بن جاتے ہیں اس کی صورت یوں سمجھیں کہ کوئی شخص دوسرے کو رمز اور اشارے سے حکم کر رہا ہو، یا منع کر رہا ہو یا کسی چیز کی خبر دے رہا ہو۔ لہٰذا یہ چیزیں جو ان کی خوابوں میں واقع ہوتی ہیں ان کو

---

[1] ہو سکتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو پہلی بار خواب میں معراج کرانے کا مقصد یہ ہو کہ آپ کا دل ان احوال و مناظر کو برداشت کرنے کے قابل ہو جائے جو بعد میں مشاہدہ کے طور پر بیداری میں دکھائے گئے۔

اللہ تعالیٰ نبی کے ساتھ مخاطب ہونے کے لیے وضع فرماتا ہے چنانچہ انبیاء علیہم السلام ان اشاروں کو سمجھ جاتے ہیں۔ اسی لیے وہ ان کی اطاعت کرتے ہیں اور انہیں اس وحی کا قائم مقام سمجھتے ہیں جو انہیں بیداری میں ہوتی ہے۔

حضرت نے فرمایا ان مذکورہ بالا خوابوں میں موجودہ اشیاء کا راز یہ ہے کہ صرف مشاہدے کی چیزوں میں بیان اور خطاب ہوتا ہے اور انبیاء علیہم السلام تو ہر وقت مشاہدۂ حق میں ہوتے ہیں خواہ وہ خواب کی حالت میں ہی کیوں نہ ہوں اور اللہ کی مخلوق کو دیکھکر بھی وہ مشاہدۂ حق کر رہے ہوتے ہیں۔ بعینہٖ اسی طرح جس طرح کہ ایک پرندہ ایک حالت پر قائم نہیں رہتا، چنانچہ تو دیکھتا ہے کہ وہ کبھی اس ٹہنی پر ہوتا ہے کبھی اس ٹہنی پر اور کبھی اس درخت پر اور کبھی اس درخت پر۔ یہی حال انبیاء علیہم السلام کا ہوتا ہے، کبھی انہیں مشاہدۂ حق آسمانوں اور زمینوں کو دیکھکر حاصل ہو جاتا ہے اور کبھی ستاروں، سورج اور چاند کو دیکھکر۔ لہٰذا جب وہ ان چیزوں کو دیکھتے ہیں تو خالق سبحانہٗ کی عظمت ان کی آنکھوں کے سامنے آجاتی ہے اور انہیں اس قدر عظیم الشان مشاہدہ حاصل ہوتا ہے جس کا بیان نہیں ہو سکتا۔ بس جب حق تعالیٰ چاہتا ہے کہ اس مشاہدے کی حالت میں انہیں کسی اجنبی چیز پر مطلع فرمائے تو وہ چیز ان کو اسی شئے میں دکھلاتا ہے جس میں ان کو مشاہدۂ حق ہو رہا ہے۔ چنانچہ یوسف علیہ السلام کی خواب میں یہی بات واضح ہوئی کہ انہیں خواب میں ستاروں، سورج اور چاند کو دیکھکر مشاہدۂ حق حاصل ہوا اس لیے کہ جب آپ کی روح آسمانوں کو چڑھی تو اسے مشاہدۂ مذکورہ حاصل ہوا۔ لہٰذا جب اللہ تعالیٰ نے انہیں یہ تبلانا چاہا کہ ان کے والدین اور بھائی انہیں سجدہ کریں گے تو یہ سجدہ انہیں ستاروں، سورج اور چاند میں دکھلایا جن میں کہ مشاہدۂ حق ہو رہا تھا کیونکہ باطن بغیر ارادے کے جس مشاہدہ میں مشغول ہے اسی میں مشغول رہے اور حضرت یوسف علیہ السلام کا ارادہ وقصد کسی اور چیز کی طرف نہ جائے۔

اسی طرح حضرت ابراہیم علیہ السلام نے جب اللہ کی اس نعمت کو دیکھا کہ ان کو بیٹا عطا کیا گیا ہے اور خیال آیا کہ کتنا بڑا انعام ہے تو انہیں مشاہدۂ حق حاصل ہوا لہٰذا جب اللہ تعالیٰ نے چاہا کہ انہیں اس مینڈھے کے ذبح کرنے سے مطلع کیا جائے جو بیٹے کا فدیہ ہوگا تو انہیں اسی بیٹے کا ذبح کرنا دکھایا گیا جس میں مشاہدۂ حق ہو رہا تھا۔ یہی حال مذکورہ بالا تمام خوابوں کا ہے (جن میں تعبیر کی ضرورت پڑی) واللہ اعلم۔

الحاصل یہ تمام تفصیل قسم اول کے متعلق ہے جن کو ادراکات کہتے ہیں۔ رہی دوسری قسم جسے خواطر

کہتے ہیں تو میں نے حضرت سے اس قسم کے خواب کا سبب پوچھا تو آپ نے اس قسم کا بیان بھی فرما دیا۔

سوال میں نے ایک دن حضرت سے ان امور کے متعلق دریافت کیا جنہیں خواب دیکھنے والا دیکھتا ہے۔

جواب حضرت نے فرمایا کہ خوابوں کے اختلاف اور ان کی نوعیت کے بدلنے کا سبب ذات کے خواطر کا اختلاف اور ان کا تنوّع ہے۔ اور خواطر کے اختلاف اور تنوّع کا سبب ایک امرِ غیبی ہے جس پر اکثر مخلوقات کو اطلاع نہیں ہوتی۔

میں نے عرض کیا کہ وہ امرِ غیبی کیا چیز ہے؟

فرمایا: وہ بندے کے دل میں اللہ کا فعل ہے اور اللہ کا فعل بندے کے دل میں جاری رہتا ہے اور کسی حالت میں خواہ خواب کی ہو، خواہ بیداری کی بند نہیں ہوتا تاآنکہ روح بدن سے نہ نکل جائے اور انسان کے وجود میں آنے سے لیکر موت تک دل کی ہر حرکت اللہ کے فعل کا نتیجہ ہوتا ہے جس سے اللہ تعالیٰ کو ایک معین اور مخصوص امر مقصود ہوتا ہے لہٰذا اس امر کا دل پر گزر ہوتا ہے اور جب دل کی دوسری حرکت ہوتی ہے تو دوسرا امر معین دل پر گزرتا ہے۔ علیٰ ہذا القیاس تیسرا اور چوتھا وغیرہ لہٰذا جب اللہ تعالیٰ کسی بندے سے بھلائی کا ارادہ فرماتے ہیں تو دل کی پہلی حرکت کا خیال نیک ہوتا ہے۔ اسی طرح دوسری اور تیسری وغیرہ حرکات کا خیال بھی نیک ہی ہوتا ہے اور جب اللہ تعالیٰ اپنے بندے سے برائی کا ارادہ فرماتے ہیں تو پہلی حرکات کا خیال بھی بُرا ہوتا ہے، اسی طرح باقی حرکات کا حال ہے، حتیٰ کہ اللہ تعالیٰ کرم فرمائے۔ اور اس سے بھلائی کا ارادہ فرمائے تو خواطر بھی خیر کی طرف منتقل ہو جاتے ہیں۔ لہٰذا بندوں کے تمام اعمال ان خواطر کے تابع ہوتے ہیں اور ان کے خواطر ان کے دل کی حرکات کے تابع ہوتے ہیں اور یہ حرکات ان کے خواطر کے تابع ہوتے ہیں۔

اس پر میں نے عرض کیا کہ اس حدیث کا کیا یہی مطلب ہے کہ بندوں کے دل اللہ کی دو انگلیوں کے درمیان ہیں جس طرح وہ چاہتا ہے پلٹ دیتا ہے؟

حضرت نے فرمایا۔ ہاں یہی مراد ہے۔

اس پر مجھے حرکاتِ قلب اور ان کے تغیّرات کے خیال سے سخت خوف طاری ہو گیا اور مجھے معلوم ہو گیا کہ تمام سعادت یا شقاوت کا دارومدار انہی حرکات پر ہے۔ خدا سے ہماری درخواست ہے کہ ان حرکات کو اس طرح چلائے جس طرح کہ وہ پسند کرتا ہے۔

حضرت نے فرمایا کہ ان حرکاتِ قلبیہ کے ثمرے کی مدت خواہ خیر ہو یا شر سات دن ہے جس کا

یہ مطلب ہے کہ حرکتِ قلب سے حق تعالیٰ کی جو مراد ہوتی ہے اسے یا تو بندہ فوراً پا جاتا ہے یا تھوڑی دیر کے بعد۔ بعض اوقات اس میں تاخیر بھی واقع ہو جاتی ہے، لیکن سات دن سے زیادہ نہیں ہوتی۔ چنانچہ ایسا ہوتا ہے کہ بندہ ایک دن کوئی کام کر رہا ہوتا ہے اور اس کی حرکت ایک دن یا زیادہ پہلے سے ہو چکی ہوتی ہے۔ اس کی مثال نباتات کی سی ہے کہ باوجود اس کے کہ بیج ایک ہی ہوتا ہے مگر کچھ حصہ ایک دن میں ظاہر ہوتا ہے اور کچھ بعد میں آتا ہے اور کچھ پہلے۔ فَتَبَارَكَ اللّٰهُ أَحْسَنُ الْخَالِقِيْنَ۔

(حضرت نے فرمایا) کہ جب یہ بات معلوم ہو چکی کہ خواطر کا دار و مدار قلب میں ارادۂ باطنی پر ہے تو اب یاد رکھیں کہ انسان کی دو حالتیں ہیں، حالتِ بیداری اور حالتِ نوم۔ بیداری کی حالت میں ذات حکم کرے گی اور روح اور زندگی اور ذات کا حکم جہالت اور اشیاء کی حقیقت سے ناواقفیت کی بناء پر ہوتا ہے لہٰذا اگر بیداری کی حالت میں بندے پر حج کا خیال گزرے تو فقط حج ہی کا گزرے گا کوئی اور زائد چیز ساتھ نہ ہوگی۔ یا اگر آسمان پر جنت یا دوزخ وغیرہ کا خیال آئے گا تو اسے صرف ان چیزوں کا شعور آئے گا مگر حالتِ نوم میں حواس معطل ہو جاتے ہیں اور اعضاء کو سکون و آرام ملتا ہے اور اللہ کا فعل دل پر بدستور جاری رہتا ہے، نہ بیداری میں بند ہوتا ہے نہ نیند کی حالت میں۔ لہٰذا جب دل کسی ایک چیز کے خیال سے متحرک ہوگا تو روح اس کی طرف دیکھے گی کیونکہ ذات کا حکم تو منقطع ہو چکا ہے اور روح ہر شئے سے واقف پیدا کی گئی ہے لہٰذا جب وہ ان اشیاء کی طرف متوجہ ہوتی ہے تو ان کا اس طرح ادراک کر لیتی ہے جس طرح آنکھ سے دیکھ لیا۔ پس اگر کوئی اپنے آپ کو آسمانوں کے اوپر یا حج میں کسی خاص جگہ دیکھے تو اس کی حقیقت یہ ہے کہ اس جگہ کا خیال دل پر گزرا اور روح اس کے پیچھے پیچھے ہو لی، اور اس کا ایسا ادراک کر لیا جیسا کہ آنکھ سے دیکھ لیا، خواطر اور ادراک میں فرق صرف اتنا ہے کہ اگرچہ ادراک دونوں قسموں میں پایا جاتا ہے مگر اگر کسی چیز کا خیال ادراک سے پہلے دل پر گزرا ہوگا تو خوابِ اضغاثِ احلام میں سے ہے اور ان کی کوئی تعبیر نہیں ہوتی اور اگر ادراک سے پہلے دل پر کوئی خیال نہیں گزرا بلکہ ذات یا روح کی توجہ اس طرف ہوئی بغیر اس کے کہ خواطر میں حرکت پیدا ہوئی ہو تو خواب درست ہوگی اور اس کی تعبیر ہو سکے گی اور اس کی بیس قسمیں ہیں جنہیں ہم بیان کر چکے۔ واللہ اعلم۔

جنابِ سید الوجود علیہ الصلوٰۃ والسلام کو خواب میں دیکھنا

حضرت نے فرمایا کہ اگر کوئی شخص

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو خواب میں دیکھے تو اس کی دو قسمیں ہیں۔ ایک وہ جس میں تعبیر کی ضرورت نہیں اور وہ یہ ہے کہ وہ ذاتِ محمدیؐ کو بعینہٖ اسی حالت میں دیکھے جس حالت میں وہ دنیا میں تھے اور جس حالت پر صحابہ رضی اللہ عنہم آپ کو دیکھا کرتے تھے۔ مزید برآں اگر بینندہ اہلِ فتح یا اہلِ عرفان و شہود و عیاں میں سے ہو تو جو کچھ اس نے دیکھا ہو گا وہ حقیقۃً آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ پاک ہو گی اور اگر دیکھنے والا اہلِ فتح میں سے نہیں ہے تو کبھی تو اس کی خواب اسی قسم کی ہو گی اور یہ بہت شاذ و نادر ہی واقع ہوتا ہے اور کبھی انسان آپؐ کی ذاتِ شریف کی صورت دیکھ لیتا ہے نہ آپ کی حقیقی ذات کیونکہ آپ کی ذاتِ شریف کی کئی صورتیں ہیں جو خواب اور بیداری میں بہت سے مقامات پر دیکھی جاتی ہیں اس کی وجہ یہ ہے کہ آپؐ کی ذات سے ایک نور نے دنیا کو بھر دیا ہے چنانچہ دنیا کی کوئی جگہ نہیں جہاں یہ نور شریف نہ ہو۔ اور اس نور میں آپؐ کی ذات اس طرح ظاہر ہوتی ہے جس طرح چہرے کی شکل آئینہ میں ظاہر ہوتی ہے چنانچہ یہ تمام نور بمنزلہ ایک آئینہ کے ہے جس نے تمام دنیا کو بھرا ہوا ہے اور اس میں آپؐ کی ذاتِ کریمہ کی شکلیں دکھائی دیتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ آپؐ کو ایک شخص مشرق میں اور ایک مغرب میں اور ایک جنوب میں اور ایک شمال میں اور اسی طرح لاتعداد لوگ ایک ہی آن میں مختلف مقامات میں دیکھ لیتے ہیں اور ان میں ہر ایک آپؐ کو اپنے پاس دیکھتا ہے کیونکہ وہ نور کریم جس میں آپؐ کی ذات کی تصویر آتی ہے، ہر ایک کے پاس موجود ہوتا ہے اور صاحب فتح جب آپؐ کی صورت دیکھتا ہے جو اس کے پاس ہوتی ہے تو اپنی باطنی بصیرت سے اس کا پیچھا کرتا ہے اور اس بصیرت کے نور سے چیرتا ہوا آپؐ کی ذاتِ کریمہ تک جا پہنچتا ہے۔ بعض اوقات یہ غیر صاحب فتح کے لیے بھی واقع ہو جاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے کرم سے آپؐ کی ذاتِ کریمہ دکھا دیتا ہے اور یہ اس طرح کہ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اس شخص کا کمالِ محبت اور کمال صدق معلوم ہو تو آپؐ بنفسِ نفیس اس کے پاس تشریف لے آئیں۔ لہٰذا اس بات کا مدار آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر ہے، جسے چاہیں اپنی ذات کریمہ دکھا دیں اور جسے چاہیں اپنی صورت دکھا دیں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور صورتوں میں بھی ظاہر ہوتے ہیں اور

---

[1] بزرگوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو خواب میں دیکھنے کے متعلق بھی کتابیں لکھی ہیں چنانچہ شیخ یوسف بن یعقوب خلوتی شیخ الحرم النبوی نے تَنْبِیْهُ الْغَبِیِّ بِیْ رُؤْیَةِ النَّبِیِّ لکھی اور شیخ جمال الدین بن علی بسطامی نے غَایَةُ الْإِعْلَامِ فِی رُؤْیَةِ النَّبِیِّ عَلَیْهِ السَّلَام لکھی۔ (کشف الظنون: ۲: ۴۸) اور شیخ شمس الدین ابو عبد اللہ محمد الاطعانی اللبی نے تُحْفَةُ الطُّلَّابِ (الطَّالِبِ؟) الْمُسْتَهَامِ فِی رُؤْیَةِ النبی علیہ السلام لکھی (کشف الظنون: ۱: ۲۰۲)

ان صورتوں کی تعداد اسی قدر ہے جس قدر انبیاء اور مرسلین علیہم الصلوٰۃ والسلام کی تعداد تھی۔ اور ان صورتوں میں بھی جو آپؐ کے زمانہ سے لیکر قیامت تک آپ کی اُمت کے اولیاء کی ہوں گی۔ صحیح بات یہ ہے کہ مذکورہ بار صُور کی تعداد معلوم نہیں ہے بعض کا خیال ہے کہ ان کی تعداد ایک لاکھ چوبیس ہزار ہے لہٰذا جن صورتوں میں آپؐ ظاہر ہوتے ہیں ان کی تعداد بھی ایک لاکھ چوبیس ہزار ہوئی۔ اسی قدر تعداد آپؐ کی اُمت کے اولیاء کی ہے لہٰذا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ظہور دو لاکھ اڑتالیس ہزار صورتوں میں ہوا۔ کیونکہ یہ سب لوگ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے نور سے فیضیاب ہوتے ہیں یہی وجہ ہے کہ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ بعض مرید آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنے شیخ کی شکل میں دیکھتے ہیں۔

(مولف کہتا ہے کہ) میں نے ایک بار آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنے شیخ کی شکل میں دیکھا اور میں نے آپؐ کو بغل میں لے لیا اور چاہا کہ آپؐ کو اپنے باطن میں لے لوں اس پر مجھے حضرت نے فرمایا کہ یہ بات ایک ہی بار نہ ہو سکے گی بلکہ بتدریج تھوڑا تھوڑا کر کے ہوگی اس سے آپؐ کا مقصد یہ تھا کہ دیکھنے والے کے باطن میں آنحضرت کا داخل ہونا بتدریج ہو سکتا ہے۔ میں نے یہ الفاظ شیخ کی طرف اسی لیے منسوب کیے ہیں (کیونکہ انھوں نے دراصل تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا تھا) کیونکہ انھوں نے ایک اور پہلو سے بات کی تھی اور جس ذات کو میں نے بغل میں لیا تھا، اس نے صرف تبسّم فرمایا تھا اور مجھ سے خوشی کا اظہار کیا تھا۔

یہ بات میرے دل میں کھٹکتی رہی ہے۔ واللہ اعلم

خواب کی دوسری قسم

اس قسم کے خواب کی دوسری قسم وہ ہے جس میں تعبیر کی ضرورت ہوتی ہے اور یہاں تعبیر ظلمت کے درجات کی بنا پر ہوتی ہے۔ خواب کی تاویل کی بنا پر نہیں، کیونکہ دراصل تو اس میں کوئی تاویل ہو ہی نہیں سکتی اس لیے کہ جس نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا تو درحقیقت اس نے آپؐ ہی کو دیکھا۔

اب ہم ظلمت کے ان درجات کا ذکر کرتے ہیں جو ان خوابوں میں واقع ہوتے ہیں لہٰذا اگر کوئی آپؐ کو یوں دیکھے کہ آپؐ اُسے دنیا کی ترغیب دے رہے ہیں تو اس کی ذات کی ظلمت پہلے درجے کی ہے یعنی اس میں سہو مکروہ پایا جاتا ہے اس خواب میں ظلمت اس لیے پائی گئی کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا کام تو حق تعالیٰ کی طرف رہنمائی کرنا ہے نہ کہ دنیائے فانی کی طرف۔

اگر کوئی یوں دیکھے کہ آپؐ نے اسے مال دیا ہے تو اس کی ظلمت دوسرے درجے کی ہوگی یعنی سہو حرام کی۔ یہاں ظلمت توی اس لیے ہوئی کہ آپؐ نے فانی چیز عطا کی اور دوسرے کو اس کا جو قابض ٹھہرایا

تو اس کی دلالت ترغیب دلانے کے مقابلے میں زیادہ قوی ٹھہری۔

اور اگر کوئی آپؐ کو نوجوان اور چھوٹی عمر کی حالت میں دیکھے تو اس کی ظلمت چوتھے درجے کی ہوگی اور یہ عمد حرام ہے۔

اور اگر کوئی آپؐ کو بڑی عمر کا مگر بغیر داڑھی کے دیکھے تو اس کی ظلمت پانچویں درجے کی ہوگی عقیدۂ حنیفہ میں جہل بسیط کی۔

اور اگر کوئی آپؐ کو سیاہ رنگ والا دیکھے تو اس کی ظلمت چھٹے درجہ کی ہوگی، یعنی عقیدۂ حنیفہ میں جہلِ مرکب کی۔

تعبیرِ رؤیا ایک وہبی علم ہے جو کسب سے حاصل نہیں ہو سکتا

خدا انہیں توفیق دے۔ یاد رکھو کہ خواب کے متعلق تمام تر تحقیق اور اس کے عجائبات کی تحقیق علم تعبیر کے جاننے پر موقوف ہے اور علم تعبیر ایک وہبی اور مستور علم ہے یعنی اس کا چھپانا واجب ہے۔

میں کئی سال سے حضرت سے اپنے خوابوں کی تعبیر پوچھتا تو آپ ہمیشہ یہی فرماتے کہ تو جو کچھ چاہے پوچھ میں جو کچھ جانتا ہوں تجھے بتلاؤں گا، لیکن خواب کے متعلق سوال نہ کر کیونکہ یہ اُن اشیاء میں سے ہے جن کا چھپانا واجب ہے۔ کئی بار آپ سے درخواست کی اور کئی بار یہی سوال دہرایا مگر آپ وہی ایک جواب دیتے یہاں تک کہ اللہ کی عنایت سے انھوں نے چند سوالوں کے جواب دیے اور میں نے انہیں ضبطِ تحریر کر لیا اور یہ وہی خواب ہیں جن کا ذکر اوپر ہو چکا ہے۔ آپ نے ان مسائل پر باد ل ناخواستہ بحث کی اور فرمایا کہ جو کچھ تو پوچھ رہا ہے ان کی صحیح تحقیق کا مدار علم کے جاننے پر ہے اور یہ سیکھنے اور پڑھنے سے نہیں آتا کیونکہ اس میں دیکھنے والے کے خارجی احوال کا جاننا بھی ضروری ہوتا ہے کہ آیا وہ شہری ہے یا گاؤں کا رہنے والا اور اہل علم میں سے ہے یا عوام میں سے۔ نیز یہ کہ اس کا پیشہ کیا ہے آیا سبزی فروش ہے یا تاجر ہے یا کاریگر اور کیا وہ مال دار ہے یا تنگ دست وغیرہ وغیرہ اور پھر اس کے باطنی حالات کا جاننا بھی ضروری ہے کہ آیا روح نے ذات کو اپنے تمام اجزاء عطا کر دیے ہیں جن کی تعداد تین سو چھیاسٹھ ہے یا کچھ اجزاء دیے ہیں اور کچھ نہیں دیے، مزید برآں عطا کردہ اجزاء کم ہیں یا زیادہ اور ذات میں سرِّ عقل کس طرح رکھا گیا ہے اور خواب دیکھنے والے کے افکار و تخیلات کس امر میں ڈوبے رہتے ہیں۔ وغیرہ وغیرہ۔ یہاں تک کہ اگر ہم فرض کر لیں کہ علم تعبیر کے ماہر کے پاس ایک سو آدمی آئیں اور ہر ایک یہی کہے کہ میں نے خواب دیکھا ہے کہ میں شہد پی رہا ہوں تو وہ ماہر ہر ایک کو جدا تعبیر دے گا جو

ایک دوسرے سے میل نہ کھائے گی۔ اس کا سبب یہی ہے کہ تعبیر جیسا کہ ذکر کیا جاچکا ہے ظاہری اور باطنی حالات پر موقوف ہے اور ان میں دو شخص بھی ایک جیسے حالات والے نہ نکلیں گے۔ تیسرے کا تو ذکر ہی کیا حالات معلوم ہونے سے یہی فائدہ ہے۔ والسلام۔

حدیث اَلْاِحْسَانُ اَنْ تَعْبُدَ اللہَ کَاَنَّکَ تَرَاہُ

مَیں نے حضرت سے دریافت کیا کہ اس حدیث کا کیا مطلب ہے: اَلْاِحْسَانُ اَنْ تَعْبُدَ اللہَ کَاَنَّکَ تَرَاہُ۔ (احسان یہ ہے کہ تو اللہ کی اس طرح عبادت کرے جیسے کہ تو اللہ کو دیکھ رہا ہوتا ہے (مشکوٰۃ کتاب الایمان صہ۱۱)

حدیث کی تشریح

حضرت نے اس حدیث کی تشریح ایک مثال دیکر بیان کی کہ فرض کرو ایک شخص ایک کھلے میدان میں آتا ہے جہاں اسے کوئی شخص بھی دکھائی نہ دیتا ہو اور وہ کسی سخی کو جو وہاں موجود نہیں، پکار رہا ہو کہ اے میرے آقا مجھے فلاں چیز دے۔ مجھ سے یوں برتاؤ کر۔ مجھے فلاں چیز درکار ہے وغیرہ وغیرہ۔ تو اسے کھیل اور مذاق کرنے والا سمجھا جائے گا نہ کہ سائل اور جو بھی اسے دیکھیگا اس کا مذاق اڑائے گا اور ہنسے گا اور اگر اس کا یہ خیال ہو کہ یہ کھیل کر لینا ہی درخواست کرنا ہے اور یہ خیال کرنا کہ وہ اس مالدار کے دروازے پر کھڑا ہے تو یہ بھی وبال کا سبب اور گمراہی پر گمراہی ہو گی۔

پھر فرمایا کہ اگر اس غنی کے سامنے کھڑے ہو کر زبان سے درخواست کرے تو اس وقت نہ صرف زبان سے درخواست کرے گا بلکہ اس کا بدن بھی جھک جائے گا اور اس کے اعضاء میں بھی عاجزی پائی جائے گی۔ اور جہاں تک ہو سکے گا عاجزی کرنے میں زمین بوسی تک کر جائے گا اور ہر طرح سے اپنے اعضاء کے ذریعہ سے عاجزی کا اظہار کرے گا۔ تب جا کر وہ غنی اس کی طرف بنظرِ رحمت دیکھے گا اور اس کی درخواست منظور کرے گا۔ خیال کرنے والا یہی خیال کریگا کہ غنی نے اسے جو کچھ دیا ہے اس کے زبانی سوال کی وجہ سے دیا ہے حالانکہ اس نے جو کچھ بھی دیا ہے اسے اس باطنی خشوع و خضوع کی وجہ سے دیا ہے جو اس کے تمام اعضا میں ظاہر ہوا تھا اور یہ ناممکن ہے کہ اس وقت اس کے باطن میں اس غنی کے علاوہ کسی اور کا دھیان جاگزین ہوا ہو۔

حضرت نے فرمایا پس اس مثال میں دیئے ہوئے مفہوم اور دونوں حالتوں کے فرق کی طرف آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ فرما کر اشارہ فرمایا کہ اَنْ تَعْبُدَ اللہَ کَاَنَّکَ تَرَاہُ (کہ تو اللہ کی عبادت اس طرح کرے گویا کہ تو اسے دیکھ رہا ہے) یعنی جس نے اللہ کے سامنے حضوری کی صورت میں اللہ کی عبادت کی تو اس نے اچھی طرح عبادت کی اور جس نے ایسا نہ کیا یعنی عبادت کو غفلت سے ادا کیا تو اس کی عبادت

اچھی نہ ہو گی اور حضور اور غفلت کی عبادت کی پہچان اس طرح ہے کہ عبادت کے وقت عبادت گزار کے باطن کی طرف نظر جائے، اگر اس کے باطن کو دُنیوی امور اور ان دُنیوی حاجات نے مشغول کر رکھا ہو جو اللہ سے غافل کر دیتے ہیں تو اس کی مثال پہلے شخص کی سی ہے، لیکن اگر اس کا باطن ماسوی اللہ سے خالی ہو اور کُلی طور پر اللہ کی طرف متوجہ ہو تو ایسی حالت والا انسان دوسری قسم کے شخص کی طرح ہو گا۔

سوال میں نے عرض کیا کہ مسلم اور بخاری کی حدیثوں میں تھوڑا سا اختلاف ہے کیونکہ بخاری نے پہلے ایمان کا ذکر کیا ہے اور پھر اسلام کا اور تیسرے درجے پر احسان کا، اور مسلم نے پہلے اسلام کا ذکر کیا ہے، پھر ایمان کا اور تیسرے درجے پر احسان کا۔

جواب حضرت نے فرمایا میرے نزدیک جو بخاری نے ذکر کیا ہے وہی بہتر ہے کیونکہ اسلام تو ایمان کے لیے بمنزلہ لباس کے ہے لہٰذا ایمان پہلے آئے گا اور بعد میں اسلام۔

سوال میں نے عرض کیا کہ اللہ تعالیٰ کے فرمان کے مطابق قَالَتِ الْاَعْرَابُ اٰمَنَّا قُلْ لَّمْ تُؤْمِنُوْا وَلٰكِنْ قُوْلُوْٓا اَسْلَمْنَا وَلَمَّا يَدْخُلِ الْاِيْمَانُ فِيْ قُلُوْبِكُمْ (سورۂ حجرات آیت ۱۴) (بدوی لوگ کہتے ہیں ہم ایمان لے آئے۔ آپ انہیں کہہ دیں تم ایمان نہیں لائے بلکہ یوں کہو کہ ہم اسلام لے آئے کیونکہ ابھی تک ایمان تمہارے دلوں میں داخل نہیں ہوا) اسلام ایمان پر مقدم ہے۔

جواب حضرت نے فرمایا ہم اس حقیقی اسلام کی بات کر رہے ہیں جس کا ذکر جبرئیل والی حدیث میں آیا ہے کہ وہ گویا ایمان کا لباس ہے اور شیخین (مسلم اور بخاری) کا اختلاف بھی اسی کے متعلق ہے، لیکن جو شخص محض زبانی اور ظاہر سے اسلام لایا ہو وہ تو نہایت ہی کھوکھلا اسلام ہے، ایسے اسلام لانے والے کے ہاتھ میں کچھ بھی نہیں۔ اس کی مثال اس شخص کی ہے جو لوگوں کو بندوقیں چلاتا اور گولیاں برساتا دیکھے اور دیکھے کہ وہ بندوقوں کو نشانہ لگانے کے لیے گاڑ رہے ہیں اور آنکھوں کی سیدھ لگا رہے ہیں اور دیکھ رہے ہیں کہ وہ کس طرح گولی چلائیں اور کیا ان کی گولی بھی نشانے پر لگے گی یا نہیں۔ اس پر یہ دیکھنے والا آ کر ان ہی کی نقل اتارنے لگے اور ایک ہاتھ پھیلاتے اور دوسرے کو سمیٹ لے اور اسے بندوق کے قائم مقام سمجھے پھر آنکھ کو کمان کی طرح بنائے اور دیکھے کہ آیا اس کا نشانہ ٹھیک لگے گا یا نہیں لہٰذا جب ان لوگوں کی بندوقیں چلیں گی تو اس کی بندوق (جو اس نے ہاتھوں سے بنائی تھی) نہ چلے گی کیونکہ درحقیقت تو اس کے پاس کوئی بندوق نہیں ہے یہی حال اس شخص کا ہے جو محض زبان سے اسلام لایا ہو۔ لہٰذا جب وہ نماز پڑھتا ہے تو اس کا باطن کہتا ہے کہ

تیری نماز نہیں ہوئی۔ روزہ رکھتا ہے تب بھی اس کا باطن کہتا ہے کہ تیرا کوئی روزہ نہیں، اسی طرح زکوٰۃ، حج، جہاد وغیرہ سب کچھ بھی کر جائے مگر اس کا باطن یہی شہادت دے رہا ہوتا ہے کہ جو کچھ بھی تو نے کیا محض ظاہری طور پر کیا ہے لہٰذا اس کے ظاہر و باطن میں زمین و آسمان کا فرق ہوتا ہے اور جیسے وہ نقال سمجھتا ہے کہ اس کے پاس درحقیقت کوئی بندوق نہیں اور وہ محض ایک کھیل کر رہا ہے، یہی حال منافقوں کا ہے کہ وہ سمجھتے ہیں کہ ان کے پاس اسلام ہے مگر درحقیقت ان کے پاس اسلام کی کوئی بات نہیں۔

(میں کہتا ہوں) حضرت نے بالکل صحیح فرمایا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے منافقین کا یہی حال بیان فرمایا ہے وَاِذَا خَلَوْا اِلٰی شَیٰطِیْنِهِمْ قَالُوْٓا اِنَّا مَعَكُمْ اِنَّمَا نَحْنُ مُسْتَهْزِءُوْنَ (جب وہ اپنے شیطان دوستوں اور ہم مذہبوں کے پاس علیحدگی میں جاتے ہیں تو کہتے ہیں کہ ہم تو تمہارے ساتھ ہیں۔ ہم تو ان سے محض مذاق کر رہے ہیں) (سورۂ بقرہ آیت ۱۴) اس مثال سے اللہ تعالیٰ نے منافقین کے بُرے ارادوں اور خبثِ باطن کو فاش کر کے انہیں انتہا درجے کا رسوا کر دیا۔ اس مثال کو سننے سے پہلے میں خیال کیا کرتا تھا کہ ان کی نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ اور جہاد وغیرہ قلب اور باطن سے ہے مگر انہیں انکے کفر کی وجہ سے قبول نہیں کیا گیا، لیکن یہ مثال سن کر ان کا معاملہ میرے لیے بھی کھل گیا اور واضح ہو گیا کہ انہیں تمام کافروں سے بڑھکر خبیث کیوں کہا جاتا ہے۔

سوال میں نے حضرت سے اس حدیث کے متعلق دریافت کیا جسے مُطّلب بن حنطب نے حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میں نے اپنی اُمّت کے گناہوں کی طرف دیکھا تو مجھے کوئی گناہ اس قدر عظیم نظر نہ آیا جس قدر کہ یہ گناہ ہے کہ ایک آدمی کو قرآنِ مجید کی ایک آیت دی گئی ہو اور وہ اسے بھلا بیٹھے اور میں نے عرض کیا کہ امام ترمذی نے امام بخاری سے نقل کیا ہے کہ یہ حدیث معلول[1] ہے کیونکہ مطلب[2] بن حنطب نے یہ حدیث انس[3] بن مالک سے

---

[1] حدیثِ معلول: یا معلّل وہ حدیث ہوتی ہے جس کے اسناد میں ایسے دقیق علل و اسباب پائے جائیں جو حدیث کی صحت کے منافی ہوں اور انہیں سوائے ماہرین حدیث کے دوسرا شخص نہ سمجھ سکے مثلاً موصول حدیث میں ارسال کرنا یا مرفوع حدیث میں وقف لانا۔ (مقدمہ اصطلاحات حدیث مشکوٰۃ)

[2] مُطّلب بن عبداللہ بن حنطب المخزومی المدنی۔ ابوزرعہ اور دارقطنی نے انہیں ثقہ قرار دیا ہے مگر ابن سعد کہتے ہیں کہ ان کی حدیث سے استدلال نہیں کیا جا سکتا۔

[3] انس بن مالک: یہ رسول اللہ صلعم کے خادم تھے انھوں نے ۱۰ سال آپؐ کی خدمت کی [illegible] ۹۳ھ میں ان کی وفات ہوئی۔

نہیں سنی لہٰذا یہ حدیث مطّلب اور انس کے درمیان سے منقطع ٹھہری۔ امام احمد بن حنبل سے بھی یہی مروی ہے۔ ترمذی، بخاری اور امام احمد بن حنبل ان تینوں نے مذکورہ بالا انقطاع کی وجہ سے اسے معلول کہا ہے اس قول کو امام ابو محمد عبدالحق الاشبیلی[1] نے الاحکام الکبریٰ میں اور حافظ ابن حجر نے شرح بخاری میں اور شیخ عبدالرؤف المناوی[2] نے شرح جامع الصغیر میں نقل کیا ہے۔

جواب حضرت نے فرمایا کہ حدیث تو صحیح ہے کیونکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا نور اس میں موجود ہے مگر یہ حدیث[3] ان لوگوں کے بارے میں نہیں جنہوں نے ایک آیت حفظ کی اور پھر اسے بھول

---

[1] ابو محمد عبدالحق اشبیلی : ابو محمد عبدالحق بن عبدالرحمٰن الازدی الاشبیلی۔ ان کی وفات ۵۸۲ھ، ۱۱۸۶ء میں ہوئی ان کی کتاب احکام الکبریٰ فی الحدیث تین جلدوں میں ضخیم کتاب ہے۔ یہ کتب احادیث کا انتخاب ہے۔

[2] شیخ عبدالرؤف المناوی : شمس الدین محمد عبدالرؤف المناوی الشافعی متوفی ۱۰۳۱ھ، ۱۶۲۰ء تقریباً انھوں نے سیوطی کی جامع الصغیر کی پہلے مختصر شرح کی، پھر ایک ضخیم شرح کی جس کا نام فیض القدیر رکھا۔ ان کی متعدد تصانیف کا حاجی خلیفہ نے تذکرہ کیا ہے ایک کتاب الکواکب الدّریّۃ فی مناقب الصوفیہ بھی لکھی ہے (کشف الظنون : ۲ : ۱۹۴)

[3] ہو سکتا ہے کہ حدیث کا مطلب وہی ہو جو حضرت عبدالعزیز دباغ رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا، مگر جو بات کہ ظاہر حدیث سے متبادر ہوتی ہے وہ یہی ہے کہ قرآن کی ایک آیت کا بھی بھول جانا بہت بڑا گناہ ہے ذرا سوچیں کہ اسلام کا ابتدائی زمانہ ہو جبکہ ایک ایک آیت کی حفاظت نہایت اہمیت رکھتی ہو، کیونکہ ایک آیت کا کھو جانا گویا تمام قرآن کا کھو جانا سمجھا جاتا ہو اس وقت قرآن کی ایک آیت کا بھی بھولنا واقعی بہت بڑا جرم کیوں نہ ہوتا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم قرآن کی حفاظت میں شدت سے اہتمام کرتے اور اگرچہ آپؐ کے سینے میں وحی محفوظ ہوتی تھی مگر پھر بھی وحی کو ضبطِ تحریر کر لیتے تاکہ قرآن میں کسی قسم کا نقص پیدا نہ ہو۔ ابتدا میں حفاظ قرآن کی تعداد بہت کم تھی۔ کسی کو ایک سورت یاد تھی، کسی کو دو اور کسی کو صرف چند آیتیں۔ لہٰذا اس زمانہ میں جب حفاظت قرآن کا دار و مدار صرف حافظہ پر تھا، آیت کا بھول جانا یقیناً بہت بڑا گناہ ہوگا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حفاظتِ قرآن کو مدِّنظر رکھتے ہوئے کتابتِ حدیث تک منع فرمادی تھی، حالانکہ حدیثِ نبوی بھی وحی میں شامل ہے مگر اس کا درجہ قرآن کے بعد آتا ہے۔

بندۂ حقیر کی یہ رائے ہے کہ احادیثِ نبویہ پر غور کیا جائے تو ہم دیکھیں گے کہ ان میں ظاہری اور تاویلی دونوں قسم کے معنی مراد ہوتے ہیں اور اولیٰ اور افضل یہی ہوتا ہے کہ ظاہری الفاظ اور باطنی معنی دونوں پر عمل کیا جائے مثال کے

(بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر)

گئے ہوں یعنی اس کے لفظ بھول گئے ہوں خواہ اس آیت پر وہ عمل کرنے والا ہو۔ یہ حدیث تو صرف ان لوگوں کے متعلق ہے جن کے پاس قرآن پہنچا مگر انھوں نے بے رُخی برتی اور اپنے آپ کو اس کے نور سے محروم رکھا اور اس نور کے بدلے میں ظلمت کو اختیار کیا اس طرح کہ اس نے جس امرِ حق کا قرآن میں ذکر ہے اُسے چھوڑ کر گمراہی کی تابعداری کی حالانکہ گمراہی وہ ظلمت ہے جو بندے کو دنیا اور آخرت میں اللہ سے دور کرنے والی چیز ہے جیسا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے کے منافقین کا حال تھا۔ پس یہ حدیث انہی کے بارہ میں وارد ہوئی، انہی پر پوری اترتی ہے اور اس کا اشارہ بھی انہی کی طرف ہے کیونکہ بظاہر تو ان کا شمار اُمّتِ اجابت میں ہے جو خاص اُمّت خیال کی جاتی ہے اور اس اُمّت میں منافقت اور باطنی کفر سے بڑھکر کوئی گناہ نہیں۔

میں نے عرض کیا جس نورِ قرآن کی طرف آپ کا اشارہ ہے وہ کونسا نور ہے؟

فرمایا: قرآن میں تین قسم کے نور ہیں۔ پہلا اللہ کی طرف ہدایت کا نور دوسرا احکام کی تعمیل کا نور اور تیسرا نواہی سے پرہیز کرنے کا نور۔ لہٰذا جو شخص اپنی ذات میں ان تینوں نوروں کو داخل نہ ہونے دے، حالانکہ وہ انہیں سن رہا ہے تو اس حدیث سے وہی شخص مراد ہے۔

حضرت نے فرمایا کہ آیت صادق آتی ہے لفظی آیت پر بھی جس کے ساتھ حفظ اور تلاوت کا تعلق ہے اور معنی پر بھی جس کا تعلق عمل اور اطاعت کے ساتھ ہے اور اسی دوسری قسم میں تین نور ہوتے ہیں اور حدیث مذکورہ میں یہی تینوں نور مراد ہیں۔

پھر فرمایا کہ ایک آیت اللہ کی طرف سے مومن کے پاس ایک دستاویز ہے جس میں اس کا حق لکھا ہوتا ہے اور حق والا اپنی دستاویز کو ضائع نہیں کیا کرتا اور اگر وہ اسے کھو دے یا کوتاہی کرے تو اس کا

(بقیہ حاشیہ صفحہ سابقہ)

طور پر فَضْلُ الْاِزَارِ فِی النَّارِ کی حدیث میں ظاہری معنوں کی اتباع بھی ضروری ہے یعنی یہ کہ شلوار وغیرہ ٹخنوں سے نیچے نہ ہو اور باطنی معنی بھی یعنی تکبر وغیرہ سے اجتناب ہو۔ میں نے یہاں صرف اشارے ہی سے کام لیا ہے ذہبی لکھتے ہیں کہ ترمذی نے اس حدیث کے متعلق محمد بن اسمٰعیل سے بات کی تو انہیں اس حدیث کا پتہ نہ تھا اور فرمایا کہ مطلب نے انسؓ بن مالک سے حدیث نہیں سنی۔ پھر ان سے روایت کیسی؟ (تذکرۃ الحفاظ ج ۲: ۹۸)

ہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے کے منافقین میں دونوں باتیں پائی جاتی تھیں۔ نہ تو وہ آیت کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے سیکھنے کے بعد یاد رکھتے اور نہ ہی اس پر عمل کرتے۔ اس لیے حدیث کے ظاہری الفاظ سے گریز نہیں ہو سکتا۔

حق ضائع ہو جائیگا اسی طرح آیت میں مومن کا حق ہے لہٰذا اگر آیت کو محفوظ رکھا اور اس کے حکم پر عمل کیا تو اللہ کے ہاں اس کا حق ثابت ہوا اور جنت میں داخل ہونے کا حق دار ٹھہرا۔ لیکن اگر اس پر عمل کرنے میں کوتاہی کرے اور اس سے ہنسی یا تحقیر کے طریقے میں بے رخی برتے تو وہ بہت بڑے گناہ کا مرتکب ہوگا جس کی طرف اس حدیث میں اشارہ کیا گیا ہے۔ واللہ اعلم۔

۱۰۱سوال میں نے حضرت سے اس حدیث کے متعلق سوال کیا کہ جنت اور دوزخ کی آپس میں بحث ہو گئی تو دوزخ نے کہا مجھے تو متکبر لوگوں پر مامور کیا گیا ہے۔ جنت نے کہا: کیا بات ہے کہ مجھ میں کمزور اور ادنیٰ درجے کے لوگوں کے سوا کوئی اور داخل نہ ہوگا۔"

میں نے عرض کیا کہ جنت نے تو گویا دوزخ کے غالب ہونے کا اعتراف کر لیا۔ کیونکہ وہ تو متکبرین سے مخصوص ہے اور جنت میں صرف کمزور لوگ داخل ہوں گے۔

جواب حضرت نے فرمایا کہ آخرت میں مکان مکینوں کے حال کا تابع ہوگا۔ اگر مکین متکبر اور مغرور ہوں گے تو ان کے بھی کچھ اوصاف مسکن میں سرایت کر جائیں گے اور اگر ساکنین متواضع اور منکسر المزاج ہوں گے تو ان کے بھی کچھ اوصاف مسکن میں سرایت کر جائیں گے اور ظاہر ہے کہ متکبر اور جابر لوگ جہنم میں جائیں گے اور متواضع اور منکسر المزاج لوگ جنتی ہوں گے لہٰذا دوزخ پر اس کے مکینوں کے اوصاف ظاہر ہوتے اور جنت پر اس کے مکینوں کے۔ پس بظاہر تو بحث اور تکرار جنت اور دوزخ کے درمیان ہوئی مگر مقصد اصلی دوزخیوں اور جنتیوں کے باطن کا اظہار ہے اسی لیے دوزخ نے اپنی دلیل میں اس چیز کا ذکر کیا جس میں غرور اور گھمنڈ پایا جاتا ہے اور جنت نے اپنی دلیل میں اس چیز کا ذکر کیا جس میں تواضع اور عاجزی پائی جاتی ہے۔ غور کرنے سے معلوم ہوگا کہ اس بحث میں جنت دوزخ پر غالب آئی کیونکہ اس کی دلیل کا ماحصل یہ ہے کہ جنت نے کہا کہ اللہ کے سامنے تواضع کرنے والے عاجزی کرنے والے اور اللہ کو پہچاننے والے مجھ میں داخل ہوں گے اور دوزخ نے کہا مجھ میں صرف متکبر، جابر اور وہ لوگ داخل ہوں گے جنہیں اپنے رب کا علم نہیں اور جنہیں اللہ کی بارگاہ اور آستانۂ رحمت سے نکال دیا گیا ہے مختصر یہ کہ گویا جنت نے کہا کہ مجھ میں صرف اللہ کے حبیب داخل ہوں گے اور گویا کہ دوزخ نے یوں کہا کہ مجھ میں صرف خدا کے دشمن داخل ہونگے۔

میں نے عرض کیا کہ یہ تو نہایت عمدہ جواب ہے اور اسی سے مذکورہ بالا اشکال رفع ہو جاتا ہے، نیز ایک اور اشکال بھی رفع ہو جاتا ہے اور وہ یہ ہے کہ جنت نے یہ کیوں نہیں کہا اللہ کے انبیاء، رسول، ملائکہ اور اللہ کے مومن بندے مجھ میں داخل ہوں گے تاکہ دوزخ کے خلاف اس کے پاس یہ

ایک بھاری حجت ہوتی۔ اُسے کیا ہو گیا کہ اس نے اپنے آپ کو شکست خوردہ ظاہر کیا اور یوں کہا کہ کیا بات ہے کہ مجھ میں صرف کمزور اور ادنیٰ لوگ ہی داخل ہوں گے اور اس نے انبیاء و رسل علیہ السلام کا جو سب سے اشرف اور افضل ہیں ذکر نہیں کیا کیونکہ دراصل اس کا مقصد یہی تھا۔ یوں سمجھو کہ اس نے یہ الفاظ درحقیقت بولے ہیں مگر مذکورہ بالا صورت میں جو کلام اس نے کیا ہے وہ محض اس تواضع اور انکساری کے اظہار کے لیے کی ہے جو اہلِ جنت کے دلوں میں پایا جاتا ہے چنانچہ ہر جنتی اللہ کی مخلوقات میں سے کسی کو اپنے سے زیادہ محتاج خیال نہیں کرتا۔ اسی لیے وہ اپنے آپ کو سب سے زیادہ کمزور اور اللہ کے محتاج سمجھتے ہیں۔ واللہ اعلم۔

۱۱۔سوال میں نے حضرت سے اس حدیث کی نسبت پوچھا کہ نزولِ وحی کے ابتدائی زمانے میں جب جبرئیل کچھ مدت وحی لے کر نہ آتے تو آپ پہاڑ کی چوٹی پر چڑھ کر اپنے آپ کو پھینک دینے کا ارادہ کرتے اور یہ جبرئیل علیہ السلام کی ملاقات کے شوق میں کرتے اس پر جبرئیل علیہ السلام ظاہر ہوتے اور کہتے آپ رب العالمین کے رسول ہیں"؛ اس سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو تسکین ہوتی۔

جواب حضرت نے فرمایا ایک شخص کو میں جانتا ہوں کہ اس نے ابتدائے سلوک میں ایک دن کے اندر نوّے مرتبہ گھر کی چھت سے اپنے آپ کو نیچے پھینکا مگر اس سے اسے کوئی تکلیف نہ پہنچی اور ایسا ہوتا تھا جیسے کوئی اپنے بستر پر لیٹ رہا ہو تو اس کی وجہ یہ ہے کہ ابتدائی حالتوں میں روح کو ذات پر غلبہ ہوتا ہے اور تمام کائنات روح کے لیے یکساں ہوتی ہے۔ چنانچہ رُوح ہوا پر اسی طرح چار زانو بیٹھ جاتی ہے جس طرح کہ زمین پر اور ہوا میں اسی طرح لیٹ جاتی ہے جس طرح کہ ایک آدمی اپنے بستر پر لیٹ جاتا ہے اور اس کے نزدیک بے ضرر ہونے میں پتھر، ریشم، اُون اور پانی سب برابر ہیں۔ لہٰذا اگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اپنے آپ کو پہاڑ سے گرا بھی دیتے تو اس میں انہیں ذرہ برابر تکلیف نہ ہوتی چہ جائیکہ ہلاکت۔ لہٰذا اس کے عزم کرنے میں آپ پر کوئی نقص لازم نہیں آتا۔

(مؤلف کتاب کہتا ہے کہ) ہم اہلِ حال لوگوں کو دیکھتے ہیں کہ جب ان پر حالتِ وجد طاری ہوتی ہے تو پورے زور سے اپنا سر دیوار سے مارتے ہیں اور انہیں خراش تک نہیں آتی۔ سبحان اللہ حضرت نے کیسے کیسے معارف و نکات بیان کر دیے ہیں۔

(مؤلف کتاب کہتا ہے) حضرت نے جس شخص کا ذکر کیا ہے کہ اس نے نوّے بار اپنے آپ کو پھینکا وہ خود حضرت ممدوح ہی تھے۔ میں نے حضرت ہی کی زبانی یہ بات سُنی تھی جس وقت آپ اس سوال کا جواب دے رہے تھے۔

حضرت نے فرمایا کہ ان لوگوں کو اس بات کا علم ہوتا ہے کہ اپنے آپ کو گرانے سے انہیں کوئی تکلیف نہ پہنچے گی اور نہ اس سے ان کا اضطراب رفع ہوتا ہے، صرف طبیعت کے تقاضے اور عادت کے مطابق وہ یہ کام کر جاتے ہیں جس طرح کہ ایک شخص زمین میں کھونٹا گاڑتے وقت مدد کی خاطر آواز سے مدد لیتا ہے جو آہ کی سی ہوتی ہے، حالانکہ اُسے معلوم ہوتا ہے کہ اس سے اسے کچھ فائدہ نہ ہوگا مگر طبیعت کے تقاضے کے مطابق یہ کر جاتا ہے۔ واللہ تعالیٰ اعلم۔

۱۲۔ سوال میں نے حضرت سے اس حدیث کا مطلب پوچھا کہ محشر میں اللہ تعالیٰ مومنین کے سامنے ایسی صورت میں آئیں گے جسے وہ نہیں پہچانتے ہوں گے تو وہ اس سے پناہ چاہیں گے اور کہیں گے کہ ہم تو یہیں کھڑے رہیں گے جب تک ہمارا رب نہ آئے گا اور وہ جب آئے گا تو ہم اسے پہچان لیں گے۔ پھر حق تعالیٰ ایسی صورت میں آئیں گے کہ وہ اسے پہچان لیں گے اور فوراً سجدے میں گر جائیں گے۔

اس پہلی اور دوسری صورت سے کیا مراد ہے کیونکہ ابن العربی[1] الحاتمیؒ اس رسالے میں جو انہوں نے فخر الدین[2]ؒ کو لکھا تھا فرماتے ہیں کہ اس معاملے کو اولیاء اللہ کے سوا کوئی نہیں سمجھ سکتا۔

جواب حضرت نے فرمایا کہ صورت[3] سے مراد حالت ہے چنانچہ اللہ تعالیٰ کی دو حالتیں ہیں ایک حالت

---

[1] ابن العربی: ان کے حالات کے لیے ملاحظہ ہو دیباچہ کتاب ہذا۔

[2] فخر الدین: یہاں مراد فخر الدین رازی سے ہے جن کی وفات ۶۰۶ھ ۱۲۱۰ء میں ہوئی، مشہور مفسر اور فلسفی گزرے ہیں۔ یہ طویل رسالہ جو محی الدین ابن العربی نے فخر الدین رازی کو لکھا تھا اس کا ذکر امام عبدالوہاب شعرانی نے لواقح الانوار جلد ا ص ۱۵ پر کیا ہے۔ کشف الظنون میں بھی اس کا ذکر ہے۔

[3] یوں تو اللہ تعالیٰ کی شانِ الوہیت ہر لحظہ بدلتی رہتی ہے۔ کبھی قہاری شان ہے اور کبھی رحمانی، جیسا کہ فرمایا کُلَّ یَوْمٍ هُوَ فِی شَاْنٍ مگر قیامت کے دن یہ شانِ الوہیت نمایاں طور پر ظاہر ہوگی۔ چنانچہ اس دن مختلف احوال و اطوار ہوں گے قہاری و جباری کی شان کا جب مظاہرہ ہوگا تو لوگ تھرا اٹھیں گے لیکن ابرار پر اس سے کوئی خوف و ہراس طاری نہ ہوگا۔ وہ صرف اپنے رب سے جسے وہ غفور و رحیم کے طور پر جانتے رہے ہیں پناہ کے طالب ہوں گے تاکہ وہ انہیں اس ہول سے نجات دلائے، جیسا کہ دعا میں آیا ہے کہ لَا مَلْجَأَ وَلَا مَنْجَا مِنْكَ اِلَّا اِلَيْكَ (خدایا! تیرے سوا نہ تو کوئی جائے پناہ ہے اور نہ کہیں اور بھاگ کر جا سکتے ہیں) اس کے بعد شانِ رحیمی کا اظہار ہوگا جو مومنین کے لیے مخصوص ہوگی اور وہ اس سے مطمئن ہو جائیں گے۔

میں یعنی پہلی حالت میں مومن اسے پہچان نہ سکیں گے اور دوسری حالت میں مومن اسے پہچان سکیں گے کیونکہ جب کوئی اپنے دوست سے مخاطب ہوتا ہے تو اُس کے کلام کے ساتھ اس قسم کا کوئی نور نہیں نکلتا بلکہ وہ مہربانی وغیرہ سے عاری ہوتا ہے اور یہ ایک عام بات ہے جسے ہر شخص جانتا ہے۔ کیونکہ جب دوست دوست سے کلام کرتا ہے تو تُو دیکھے گا کہ وہ اس سے نرمی سے پیش آئے گا اور اس کا لہجہ مہربانی اور پیار کا لہجہ ہوگا اور اس سے ہر طرح کی مسرت کا اظہار کرے گا اور جب دشمن سے ہمکلام ہوگا تو اس کے کلام میں انقباض اور ترشروئی ہوگی جب یہ بات سمجھ میں آگئی تو اب سمجھو کہ پہلی حالت میں اللہ تعالیٰ نے ساری اُمت کو خطاب کیا جس میں اس کے دوست یعنی مومن اور دشمن یعنی منافقین سب شامل تھے۔ اس لیے اس حالت میں وہ انوار نہ نکلے جن کو مومن اپنے رب کے کلام میں پایا کرتے تھے اور چونکہ یہ انوار ان کی ذات اور روح میں پائے جاتے تھے اور دنیا ہی میں اللہ نے یہ انوار ان کو عطا فرمائے تھے، اس لیے وہ انہیں پہچانتے تھے، اسی لیے جب انھوں نے پہلی صورت میں خطاب سنا تو انھوں نے اللہ سے پناہ طلب کی اور کہا کہ یہ تو ہمارا رب نہیں ہے۔ کیونکہ ہمارے اور ہمارے رب کے درمیان تو ایک خاص علامت ہے اور یہ علامت وہی انوار ہیں جو اس کے خطاب میں پائے جاتے ہیں۔ جب ان کی زبان سے اس قسم کے الفاظ نکلیں گے تو پھر اللہ تعالیٰ صرف مومنین سے خاص طور پر مخاطب ہوں گے اور اس خطاب کے ساتھ وہ سابقہ انوار جن سے وہ مانوس تھے پائے جائیں گے۔ لہٰذا جب یہ انوار ان پر برسیں گے اور انہیں ان کا علم ہو جائیگا تو ان کو یقین ہو جائے گا کہ یہ حق سبحانہٗ وتعالیٰ ہی کا جلوہ ہے تو وہ سجدے میں گر پڑیں گے اور یہ دوسری حالت وہی حالت ہوگی جس سے وہ پہلے سے مانوس ہوں گے، پہلی صورت میں چونکہ خطاب سب کو کیا گیا تھا جس میں دشمن بھی شامل ہیں؟ اس لیے اس میں انوار کا نزول نہیں ہوا، مگر دوسری صورت میں دشمنوں پر پردہ ڈال دیا گیا اور صرف دوستوں سے خطاب ہوا لہٰذا اس خطاب کے ساتھ وہ انوار نکلے جن کا مشاہدہ وہ اپنی ذات میں کیا کرتے تھے اور جس کے اسرار اپنے ظاہر وباطن میں وہ دیکھا کرتے تھے۔

میں نے عرض کیا کہ ان مومنین سے جنھوں نے اللہ تعالیٰ کو پہلی حالت میں نہیں پہچانا کون لوگ مراد ہیں؟ کیا تمام مومنین (جن میں خواص بھی شامل ہیں) یا محض عوام؟

حضرت نے فرمایا ان سے صرف عوام مراد ہیں۔ کیونکہ خواص تو ہر حالت میں اللہ تعالیٰ کو پہچانتے ہیں۔

پھر میں نے عرض کیا کہ کیا پہلا خطاب سب مومنین کے لیے ہوگا یا محض عوام کے لیے فرمایا صرف عوام کے لیے ہوگا۔ قیامت کے دن تو ساری باتیں خرقِ عادت ہوں گی چنانچہ اللہ تعالیٰ ایک شخص

سے جو دوسرے کی گود میں اپنا سر رکھے ہوگا کلام فرمائیں گے تو وہی شخص جس نے اپنا سر گود میں رکھا ہوگا اس کلام کو سنے گا۔ دوسرا نہ سن سکے گا۔ مختصر یہ ہے کہ جس سے کلام کرنا مقصود ہوگا وہی سنے گا اور دوسرے پر پردہ ڈال دیا جائے گا خواہ وہ سننے والے سے کتنا ہی قریب کیوں نہ کھڑا ہو۔

(مؤلف کہتا ہے) کہ ابن العربی نے رسالہ مذکورہ میں بھی اسی طرح لکھا ہے کہ عارفین پہلی حالت میں اللہ تعالیٰ سے ناواقف نہ ہوں گے صرف محجوبین ہی ناواقف رہیں گے۔

یہ کلام نہایت عمدہ اور انتہائی لطیف ہے اس میں شیخ نے عمدہ معنی ذکر کر دیے جس سے نہ تو عقل انکار کر سکے اور ساتھ ہی اللہ تعالیٰ کو صورت، آنے، جانے سے بھی منزہ قرار دیا ہے کیونکہ آپکی بیان کردہ تفسیر کے مطابق نہ کوئی آنا ہے نہ جانا اور نہ حق تعالیٰ کی کوئی شکل ہے۔

مذکورہ بالا حدیث میں خدا کی صورت کے متعلق جو کچھ امام شعرانیؒ[۱] نے اپنی کتاب کشفُ الغُمّہ عَنْ وُجُوہِ اَسْئِلَۃِ الْجَان میں لکھا ہے اس پر کئی ایک اعتراض وارد ہوتے ہیں۔ لہٰذا اسکے مطالعہ کنندہ کو اس قسم کے خیالات سے پرہیز کرنا چاہیئے۔ حافظ ابن حجر نے اپنی شرح میں استاذ ابن فورک[۲] رحمۃ اللہ سے نقل کرتے ہوئے قریب قریب وہی تاویل بیان کی ہے جو شیخ رضی اللہ عنہ نے بیان کی ہے۔ حضرت کے مرتبہ اور معرفتِ الٰہیہ میں ان کی بزرگی کا پتہ ابن فورک کے کلام کے مطالعہ سے ہی ہو سکتا ہے۔ نَفَعَنَا اللہُ بِہٖ۔ آمین۔

۱۳۔سوال میں نے حضرت سے اس حدیث کے متعلق دریافت کیا اِنَّ قَلْبَ[۳] الْعَبْدِ بَیْنَ اِصْبَعَیْنِ مِنْ اَصَابِعِ الرَّحْمٰنِ (بندے کا دل تصرفات خداوندی میں سے دو تصرف کے درمیان ہے۔)

۱؎ امام شعرانی: عبدالوہاب شعرانی سولھویں صدی عیسوی کے شروع میں پیدا ہوئے اور ۹۷۳ھ۔ ۱۵۶۵ء میں وفات پائی۔ اپنے زمانہ کے بہت بڑے اور مشہور صوفی گزرے ہیں ان کی بہت سی تصانیف ہیں جن میں سے لطائف المنن، لواقح الانوار فی طبقات الاخیار اور رسالۃ الانوار القدسیۃ فی بیان آداب العبودیۃ زیادہ مشہور ہیں۔

۲؎ ابن فورک: امام ابوبکر محمد بن حسن نیشاپوری شافعی متوفی ۴۰۶ھ ان کا ذکر پہلے بھی آچکا ہے۔

۳؎ مشکوٰۃ باب الایمان بالقدر ص ۲۰-۲۱ میں یہ حدیث یوں دی ہے عَنْ عَبْدِ اللہِ بْنِ عُمَرٍو قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللہِ صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اِنَّ قُلُوْبَ بَنِیْ اٰدَمَ کُلَّھَا بَیْنَ اِصْبَعَیْنِ مِنْ اَصَابِعِ الرَّحْمٰنِ کَقَلْبٍ وَاحِدٍ یُصَرِّفُہٗ کَیْفَ یَشَاءُ (رواہ مسلم)

جواب حضرت نے فرمایا کہ انگلی سے مراد معنوی انگلی ہے یعنی تصرّف جو انگلی کے ذریعہ ہوا کرتا ہے لہٰذا مطلب یہ ہوا کہ بندے کا دل تصرفاتِ خداوندی میں سے دو تصرف کے درمیان ہے

میں نے عرض کیا کہ دو تصرّف سے کیا مراد ہے۔

فرمایا: ایک مقتضائے ذات اور دوسرا مقتضائے روح۔ کیونکہ ذات مٹی سے بنی ہے لہٰذا خواہشات کی طرف مائل ہوتی ہے اور روح نور سے بنی ہے، لہٰذا یہ حقائق اور معارف کی طرف مائل ہوتی ہے اور ان دونوں میں ہمیشہ مخالفت اور تصادم رہتا ہے۔

میں نے سوال کیا کہ دونوں میں غالب کون ہے؟

فرمایا: روح کا تصرّف حرکات میں ہوتا ہے اور ذات کا تصرف اسرار میں چلتا ہے لہٰذا حرکت کے اعتبار سے روح غالب رہتی ہے اور اپنے ہنر خبیث کے اعتبار سے ذات غالب رہتی ہے، اسی لیے شکر گزار بندے کم ہیں ان کی مثال چکّی کے دو پاٹوں کی سی ہے۔ روح کی مثال اوپر والے پاٹ کی ہے کیونکہ وہی حرکت کرتا ہے اور ذات نچلے پاٹ کی طرح ہے کہ اندرونی سوزش و شورش اسی کا کام ہے اوپر کے پاٹ کی مثال ایسی ہے جیسی کہ دیگچی کے اوپر کی، چپنی بیرونی طور پر دیگچی پر اثر کرتی ہے کہ بھاپ روک کر کھانا پکاتی ہے اور دیگچی اندرونی طور پر (دیگچی کی حرارت سے یہ گرم اور بے قرار ہوتی ہے) اَعَاذَنَا اللّٰہُ مِنْ دَرْکِ الشَّقَاءِ وَسُوْءِ الْقَضَاءِ (خدا ہمیں بدبختی کی مذلت اور قضاء بد سے بچائے)

میں نے عرض کیا کہ علماء نے تو ان دونوں تصرّفوں کی تفسیر فرشتے کی تحریک اور شیطان کی تحریک سے کی ہے۔

فرمایا یہ فرشتہ اور شیطان تو دونوں عارضی اور تابع ہیں۔ اصل وہی ہے جو ہم نے بیان کیا، کیونکہ ہر ذات خواہ پاک ہو یا ناپاک اس کے لیے خواطر (خیالات و وساوس) کا ہونا ضروری ہے یہی خواطر اس کی نجات یا تباہی کا سبب بنتے ہیں اور فرشتہ اور شیطان دونوں ان خواطر کے تابع ہیں، لہٰذا اگر خواطر اچھے ہوں گے تو فرشتہ اس کے پیچھے ہوئے گا اور وہ شخص اچھے کام کرے گا اور اگر خواطر پسندیدہ نہ ہوں گے تو شیطان ساتھ ہوئے گا اور وہ انسان ان وساوسِ شیطانی کے تقاضے کے مطابق عمل کرے گا کیونکہ ہر خاطر (بات جو دل میں آتی ہے اس) کا تعلق ذات سے ہے اور وہ ذات کا راز ہوتا ہے۔ اگر خاطر پاک ہوگی تو ذات بھی پاک ہوگی ورنہ نہیں۔ محسوسات میں اس کی مثال یوں ہے کہ ایک سیر گیہوں لے لو۔ سیر بھر جَو، سیر بھر چنا اور سیر بھر باقلا اور علیحدہ علیحدہ پیس لو، ان کا

کھانا بنالو، پھران کو کڑاہی میں ڈال کر جلاؤ اور غور سے دیکھو تو ہر کھانے کی بھاپ دوسرے سے جدا ہوگی اور وہ بھاپ اپنی اصل کا پتہ دے رہی ہوگی، یہی حال خواطر کا ہے کہ ان کا تعلق ذات کیساتھ وہی ہے جو بھاپ کا ان کھانوں سے ہے پس خواطر بہت اہم چیز ہیں اور انہی پر نجات وہلاکت کا دارومدار ہے اور فرشتہ اور شیطان دونوں ان خواطر کے تابع ہیں چنانچہ بہت سے خواطر انسان کو علیین تک پہنچا دیتے اور بہت سے اسفل سافلین تک۔ اچھے خواطر روح کے تقاضے کے مطابق ہوتے ہیں اور روح کی پاکیزگی کی وجہ سے ہی ذات میں ظاہر ہوتے ہیں اور خبیث خواطر ذاتِ انسانی اور خواہشاتِ نفسانی کے تقاضے کے مطابق ہوتے ہیں۔ واللہ اعلم۔

۱۴۱۔ سوال میں نے حضرت سے اس حدیث کے متعلق دریافت کیا کہ حجرِ اسود دنیا میں اللہ کا دایاں ہاتھ ہے۔

جواب حضرت نے فرمایا یہ تشبیہ کے طور پر استعمال ہوا ہے کیونکہ جو شخص شاہی حفاظت و پناہ میں آنا چاہتا ہے وہ جلدی کرتا ہے اور اس کا دایاں ہاتھ چومتا ہے، اسی طرح جو شخص اللہ کی رحمت اور حفاظت میں آنا چاہے اسے حجرِ اسود کو بوسہ دینا چاہیئے۔ اس کا درجہ اللہ کے ہاں وہی ہے جو بادشاہ کے دائیں ہاتھ کا ہے۔

مؤلفِ کتاب کہتا ہے کہ امام غزالیؒ نے بھی حرف بحرف یہی لکھا ہے جو چاہے کتاب التفرقہ میں دیکھ لے، واللہ تعالیٰ اعلم۔

لے یہ تو حضرت شیخ عبدالعزیز دباغ رحمۃ اللہ تعالیٰ کا بیان ہے مگر علماء کے نزدیک اصبع (انگلی) سے مراد قبضہ قدرت ہے چنانچہ عربی زبان میں یَدٌ کا لفظ بھی جس کے لفظی معنی ہاتھ کے ہیں، قبضہ اور قدرت کے معنوں میں آتا ہے، اور قرآن مجید میں کئی ایک مقام پر ید کا لفظ انہی معنوں میں استعمال ہوا ہے چنانچہ اس حدیث کا مفہوم یوں ہوا کہ انسانوں کے دل خدا کے قبضہ قدرت میں ہیں جدھر چاہتا ہے، پھیر دیتا ہے اسی لیے دعاؤں میں یوں پڑھا جاتا ہے یَا مُقَلِّبَ الْقُلُوبِ الخ، اَللّٰهُمَّ قَلِّبْ قَلْبِیْ اِلَیْکَ وغیرہ۔ مزید براں قرآن مجید کی یہ آیت یَهْدِیْ مَنْ یَّشَآءُ اِلٰی صِرَاطٍ مُّسْتَقِیْمٍ بھی اسی معنی کی تائید کرتی ہے۔ اسی طرح تمام وہ آیات جن میں ہدایت وگمراہی کو خدا کی طرف سے بتلایا گیا ہے، تمام اسی پر دال ہیں کہ قلوب بنی آدم اللہ کے قبضہ میں ہیں۔ انہیں جدھر چاہے پھیر دے۔ ۱۲

۱۵۔ سوال میں نے حضرت سے اس حدیث کے متعلق دریافت کیا یُؤتٰی بِالْمَوْتِ فِی صُوْرَةِ کَبْشٍ ثُمَّ یُذْبَحُ (قیامت کے دن موت کو ایک مینڈھے کی صورت میں لایا جائیگا اور پھر اس کو ذبح کیا جائے گا)

جواب فرمایا یہ حدیث صحیح اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے دہنِ مبارک سے نکلی ہے اور اس سے مراد فرشتہ ہے جو مینڈھے کی شکل میں ہوگا کہ اسے اہلِ جنت کی نعمت اور اہلِ دوزخ کے عذاب میں اضافے کی خاطر ذبح کیا جائے گا اور فرشتوں کی سب سے بڑی مراد یہی چیز ہے کیونکہ وہ سجدے میں گر کر یہ دعا مانگتے ہیں کہ یا اللہ ہمیں اپنے مؤمن بندوں کے لیے نعمت اور ان پر نزولِ رحمت کا سبب بنا اور فرشتہ ہی مومن کے حق کو سمجھ سکتا ہے۔ ہم نے حدیث مذکور کی یہ تاویل اس لیے کی ہے کہ موت دوستوں کا ایک دوسرے سے بچھڑنے کا نام ہے۔ چنانچہ ذات تو مٹی کی طرف لوٹ جاتی ہے اور روح عالمِ ارواح کو لہٰذا موت اس اتصال اور اجتماع کے عدم کا نام ہے جو ان کے درمیان تھا۔

حضرت نے فرمایا کہ فرشتہ مینڈھے کی شکل میں ذبح ہونا چونکہ بصیرت سے نظر آ رہا ہے لہٰذا اس حدیث کو اسی پر محمول کیا جائے گا۔ واللہ اعلم۔

حضرت نے فرمایا کہ جب لوگ جنّت میں داخل ہو چکیں گے وہ بالخصوص پہلے دن کی تکالیف خاص طور پر مرنے کی تکلیف کا آپس میں تذکرہ کریں گے اسی لیے انعام فرمانے اور ان کو خوش کرنے کے لیے اسکو مینڈھے کی شکل میں لاکر ذبح کیا جائے گا اور درحقیقت جس کو ذبح کیا[1] جائے گا وہ فرشتہ ہوگا۔

کنکریوں کی تسبیح، تنہ کھجور کے رونے وغیرہ معجزات کے متعلق حضرت کا بیان

میں نے حضرت کو ان احادیث کے متعلق جن میں کنکریوں کے تسبیح کرنے، کھجور کے تنہ کے سسکیاں لینے، پتھر کے سلام کرنے اور درخت کے سجدہ کرنے وغیرہ وغیرہ

---

[1] امام جلال الدین سیوطیؒ اپنی کتاب البدور السافرہ فی امور الآخرہ طبع لاہور ص ۲۱۳ پر فرماتے ہیں کہ موت تو ایک معنوی چیز اور عرض ہے اور عرض کا کوئی جسم نہیں لہٰذا یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ اسے مینڈھے کی شکل میں لاکر ذبح کر دیا جائے۔ حکیم ترمذیؒ نے نقل کیا ہے کہ اس حدیث کے متعلق سلف صالحین کا یہی طریقہ ہے کہ اس حدیث کے متعلق بحث نہ کریں، اس پر جوں کا توں ایمان رکھیں اور اس کی حقیقت کو اللہ کے سپرد کر دیں مگر ایک گروہ کا کہنا ہے کہ موت تو ایک جسم ہے عرض نہیں ہے اور موت کو مینڈھے کی صورت میں پیدا کیا گیا ہے جیسا کہ حیات کو گھوڑے کی شکل میں پیدا کیا گیا چنانچہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں اَلَّذِیْ خَلَقَ الْمَوْتَ وَالْحَیٰوۃَ (خدا تو وہ ہے جس نے موت اور حیات کو پیدا کیا) سیوطی فرماتے ہیں کہ میرے نزدیک یہی جواب درست ہے۔

معجزات کا ذکر آیا ہے یہ فرماتے ہوئے سنا کہ یہ ان کی روزمرہ کی تسبیح اور کلام تھا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اللہ تعالیٰ سے حاضرین سے صرف پردہ اٹھا دینے کی درخواست کی تھی تاکہ وہ بھی ان کی تسبیح اور کلام کو سن لیں۔

میں نے عرض کیا کہ کیا ان اشیاء میں بھی حیات اور روح ہے؟ فرمایا نہیں لیکن تمام مخلوقات خواہ بولنے والی ہو خواہ خاموش، جس وقت بھی اس سے خالق کی بابت سوال کیا جائے گا تو وہ واضح الفاظ میں کہے گی کہ اللہ وہ ذات ہے جس نے مجھے پیدا کیا ہے پس مخلوقات میں یہ امتیاز کہ ان میں بعض ناطق ہیں بعض صامت اور بعض جماد، صرف مخلوقات کے اعتبار سے ہے، تاکہ ایک دوسرے سے ان میں امتیاز ہو سکے ورنہ جہاں تک ان کی نسبت اللہ سے ہے، سب اس سے واقف ہیں۔ اس کی عبادت کرتے ہیں اور اس کے سامنے عاجزی کرتے ہیں کیونکہ جمادات کے دو پہلو ہیں۔ ایک رُخ خالق کی طرف اور اس میں وہ اللہ سے واقف، اللہ کے مطیع اور اس کے عبادت گزار ہیں اور دوسرا رخ مخلوق کی طرف ہے اور اس میں نہ وہ کچھ جانتے ہیں، نہ سنتے ہیں نہ بولتے ہیں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اللہ تعالیٰ سے اسی رُخ کو دُور کرنے کی درخواست کی تھی، تاکہ حاضرین کے لیے دوسرا پہلو جو اللہ کی طرف ہوتا ہے ظاہر ہو جائے اور اسی پہلو کے اعتبار سے جس میں ان کی توجہ خالق کی طرف ہوتی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا وَاِنْ مِّنْ شَیْءٍ اِلَّا یُسَبِّحُ بِحَمْدِہٖ یعنی ہر چیز اللہ کی حمد کے ساتھ ساتھ تسبیح پڑھتی ہے۔

حضرت داؤدؑ اور مینڈک کا قصہ

اسی قسم کا جواب حضرت نے اس قصے کے متعلق دیا جو حضرت داؤد علیہ السلام اور مینڈک کے درمیان واقع ہوا۔ اس طرح کہ حضرت داؤد علیہ السلام کو خیال آیا کہ وہ بہت زیادہ اللہ کی تسبیح بیان کرتے ہیں۔ اس کے بعد ایک مینڈک کو دیکھا کہ عمر بھر تسبیح پڑھتا رہا تھا اور ایک لمحہ کے لیے بھی خاموش نہ ہوا تھا تب جا کر حضرت داؤد علیہ السلام نے اپنی اس حالت کو جسے وہ کثیر سمجھ رہے تھے بہت تھوڑا سمجھا۔

حضرت نے فرمایا کہ حضرت داؤد علیہ السلام نے مینڈک کے اس رُخ کا مشاہدہ کیا جو حق سبحانہ کی طرف تھا اور یہی اس کی باطنی حالت ہے کہ اس میں تسبیح متواتر جاری رہتی ہے اور اس میں کسی قسم کا وقفہ نہیں پڑتا۔

محمد لہواجؒ اور مچھلیوں کا قصہ

اسی قسم کی وہ حکایت ہے جس میں محمد لہواج کا قصہ بیان کیا تھا۔ حضرت نے حسب عادت تقریر کی ایک تمہید اٹھائی

اور فرمایا کہ زمین کو بھی ایک علم عطا کیا گیا ہے جسے وہ اٹھائے ہوئے ہے اور آگاہ بھی ہے۔ بعینہٖ اسی طرح جس طرح ایک انسان قرآن مجید کا حامل اور اس سے آگاہ ہوتا ہے اسی طرح جمادات کی ہر مخلوق کو ایک علم عطا کیا گیا ہے جسے وہ اٹھائے ہوئے ہے۔

میں نے عرض کیا کہ اس سے معلوم ہوا کہ اس میں عقل اور علم ہے اور یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ وہ تو دراصل جمادات ہے؟

حضرت نے فرمایا کہ وہ تو ہماری نگاہ میں جمادات ہے، لیکن خالق کی نسبت کے اعتبار سے تو وہ عارف ہے اور فرمایا کہ مخلوق خواہ کسی قسم کی ہو کسی حالت میں یہ کہنے سے خالی نہیں کہ اللہ میرا رب ہے اور یہ حالت تمام مخلوقات میں پائی جاتی ہے اسی طرح ہر قسم کی مخلوق سبحانہٗ کے سامنے عاجزی کرنے، اس سے ڈرنے اور اس کے دبدبے سے خوف کھانے سے خالی نہیں، لیکن لوگ چونکہ زمین اور دیگر جمادات کی اصلی حالت سے واقف نہیں ہوتے اس لیے وہ یہ خیال کرتے ہیں کہ وہ بے جان چیز پر چل رہے ہیں اور بے رُوح چیز پر آتے جاتے ہیں اور اسی عدم واقفیت نے انہیں تباہ کیا ہے۔

حضرت نے فرمایا کہ اگر لوگوں کو زمین کی اصلی حالت کا پتہ چل جائے تو ممکن نہیں ہو سکتا کہ کوئی شخص بھی زمین پر اللہ کی نافرمانی کر سکے۔

حضرت نے فرمایا کہ میں فتح نصیب ہونے سے پہلے حضرت محمد لمواجؒ کے ساتھ تھا اور حق تعالیٰ نے انہیں فتح نصیب کی ہوئی تھی۔ آپ میرے ساتھ خولان کے علاقے میں سخونہ کے چشمے پر گئے تاکہ وہاں اس نخلستان سے جو علی بن حرزہم کے روضہ پر وقف تھا، خام کھجوریں توڑیں ہمارا گزر فاس کے دروازوں میں سے باب الفتوح سے باہر ابن عُمر کے گھر سے ہوا اور وہاں ایک چشمہ بہتا تھا، میں نے کانٹا لے کر اس میں روٹی لگائی اور مچھلی کا شکار کرنا چاہا اور مچھلیاں وہاں بہت تھیں۔ شیخ محمد لمواج نے منع بھی فرمایا مگر میں نے قسم کھالی کہ ضرور شکار کروں گا چنانچہ وہ میرے ساتھ چشمہ پر آئے اور میں نے کانٹا ڈالا۔ اصل پانی کے قریب ایک بڑا پتھر تھا جس میں سے میں نے اللہ! اللہ! کی آواز آتی سنی۔ ابھی اس طرف نگاہ اُٹھی ہی تھی کہ ہر پتھر نے اللہ اللہ کہنا شروع کر دیا، بجز سوائے اس مچھلی کے جس نے کانٹے کی روٹی کھائی تھی، یہی پکارنا شروع کر دیا۔ اس اللہ! اللہ! کی پکار کا مطلب یہ تھا کہ اے شکار میں مشغول ہونے والے کیا تجھے اللہ کا خوف نہیں؟

حضرت فرماتے ہیں کہ اس وقت مجھ پر اس قدر خوف و رُعب طاری ہوا کہ میں چاہتا تھا کہ اسکے مقابلے میں مجھے رسی میں باندھ کر ایک بلند جگہ پر اٹھا دیا جائے اور ایک کھمبے پر کنڈی میں لٹکا دیا جائے

مگر اس خوف سے نجات مل جائے۔

میں نے عرض کیا: آپ کو اس قدر سخت خوف کیوں ہوا؟

فرمایا: اس کی مثال یوں سمجھو کہ ایک شخص نے نہ کبھی بیل دیکھا اور نہ سنا ہو، پھر وہ آنکھیں مل کر دفعتہً کھولے اور دیکھے کہ لاتعداد بیلوں کے سامنے کھڑا ہوں تو بتاؤ اس کا کیا حال ہوگا؟

میں نے عرض کیا کہ اس کا مطلب یہ ہے کہ یہ خوف جو آپ پر طاری ہوا یہ محض خرقِ عادت امر کے مشاہدے سے ہوا؟

فرمایا: ہاں۔ اس خرقِ عادت معاملے کے مشاہدے سے یہ خوف لاحق ہوا۔

میں نے عرض کیا: آپ نے ان کا یہ خارقِ عادت کلام عربی زبان میں سُنا تھا یا جمادات کی زبان میں؟

فرمایا: جمادات کی زبان میں۔ ان کی اپنی زبانیں اور بولیاں ہیں جو ان کی ذات اور جمادیت کے لائق ہے اور میں نے جو اسے سنا ہے تو تمام جسم سے سنا ہے نہ صرف ان کانوں سے جو سر کے اندر ہیں،

پھر فرمایا کہ دل کو اس قسم کا مشاہدہ ابتدائی حالت میں کرایا جاتا ہے ورنہ بعد میں تو وہ اس فعل کو اللہ کی طرف سے دیکھتا ہے اور اسے یوں نظر آتا ہے کہ خالق سُبحانہٗ نے ان میں کلام اور تسبیح وغیرہ پیدا کردی ہے اور یہ خود بمنزلہ خالی برتنوں اور محض تصویروں کے ہیں۔

میں نے عرض کیا کہ یہ مشاہدہ تو جمادات کے ساتھ مخصوص نہیں کیونکہ یہ تو انسان وغیرہ ذوی العقول میں بھی ہوسکتا ہے۔

فرمایا: ہاں بلا امتیاز سب ہی چیزوں میں ہوسکتا ہے۔ پھر فرمایا کہ یہ جو ہم نے ذکر کیا ہے کہ جمادات اپنے خالق کو پہچانتی ہے اسے وہی شخص سمجھ سکتا ہے جو عالم زمین و آسمان سے باہر نکل گیا ہو اور اس سے اتنا دور نکل گیا ہو کہ زمین و آسمان اس کے سامنے ایک گیند کی مانند ہوں پھر وہ ان کی طرف اس قوی اور ہر چیز کو پھاڑ کر نکل جانے والی نگاہ سے دیکھے، جو آج کل میرے خیال میں تین شخصوں کے سوا کسی کو حاصل نہیں، تو اسے یہ تمام امور آنکھوں کے سامنے دکھائی دیں گے اور اسے جمادات کی ہر مخلوق یا تو سجدے میں پڑی ہوئی یا رکوع کی حالت میں اللہ کے خوف سے سرنگوں دکھائی دے گی اور سب سے پہلے تو اسے خود زمین بھی رکوع کی حالت میں دکھائی دے گی۔ واللہ تعالیٰ اعلم

حضرت نے فرمایا کہ ایک دن میں باب الفتوح سے باہر سیدی احمد الیمنیؒ کے مزار کے پاس نر دی کے درخت کے نیچے بیٹھا ہوا تھا کہ دیکھتا کیا ہوں کہ سارے پتھر کیا چھوٹا اور کیا بڑا اور سب درخت

اور ٹہنیاں اپنی اپنی زبان میں اللہ تبارک وتعالیٰ کی تسبیح پڑھ رہی ہیں۔ اس کے سننے سے قریب تھا کہ میں بھاگ جاؤں۔ پھر میں نے ایک پتھر کی آواز کو کان لگا کر سنا تو مجھے اس سے مختلف آوازیں آ رہی تھیں۔ جب میں نے غور سے دیکھا تو دیکھا کہ وہ کئی پتھروں سے مرکب ہو کر ایک پتھر بنا ہے اسی لیے اس میں سے مختلف آوازیں آتی تھیں۔

(مؤلفِ کتاب کہتا ہے کہ) یہ واقعات حضرت کو فتح ہونے کے ابتدائی زمانے میں پیش آئے تھے اور اس کے قریب وہ تذکرہ ہے جو آپ نے بے زبان جانوروں کے بارے میں فرمایا کہ ایک بیل جب دوسرے بیل کو دیکھتا ہے تو دن بھر میں جو کچھ پیش آیا ہے وہ اس سے ذکر کرتا ہے اور کہتا ہے کہ میں نے فلاں گھاس کھائی اور فلاں فلاں پانی پیا اور ابھی میرے دل میں فلاں فلاں بات کرنے کا خیال باقی ہے اور دوسرا بیل بھی اسی طرح اس کو جواب دیتا ہے اور دونوں اللہ کے حکم سے باتیں کرتے رہتے ہیں۔ جیسے ہماری گفتگو میں حروف اور مخارج ہوتے ہیں۔ اسی طرح اُن کی گفتگو میں بھی ایک اندازہ ہوتا ہے اور اس میں الگ الگ ٹکڑے ہوتے ہیں مگر یہ ہم سے پوشیدہ رکھا گیا ہے۔ یہی حال تمام حیوانات، درختوں اور پتھروں کے کلام کا ہے جیسا کہ ان سے ہمارے کلام کی سماعت جو مخارج اور حروفِ تہجی سے مرکب ہوتا ہے، پوشیدہ رکھی گئی ہے اور وہ اس سے سوائے پکار اور آواز کے کچھ نہیں سن سکتے، ہاں جس شخص کو فتح نصیب ہو وہ ان کا کلام سنتا ہے اور سمجھتا بھی ہے اور الگ الگ فقروں کے ٹکڑوں کو پہچانتا ہے اور یہ سمجھنا روح کے ذریعہ سے حاصل ہوتا ہے اور روح مقاصد اور اغراض کو قبل اس کے کہ ان کو زبان سے ظاہر کیا جائے پہچانتی ہے اور اگر تو نے ایک عجمی صاحب فتح کو ایک عربی صاحبِ فتح سے باتیں کرتے نہیں دیکھا کہ دونوں دن بھر آپس میں باتیں کرتے رہیں، ایک تو عجمی زبان میں بات کرتا ہو اور دوسرا عربی میں جواب دیتا ہو، تو سمجھ لے تو نے کچھ نہیں دیکھا۔

میں نے حضرت کو یہ فرماتے ہوئے سنا کہ بسا اوقات قضاء حاجت کی غرض سے بیت الخلا کو جاتا اور جب پانی کو ذکر کرتے ہوئے اور اللہ کا نام لیتے ہوئے سنتا تو حاجت رفع کیے بغیر واپس چلا آتا۔[۱]

---

[۱] جمادات نباتات وغیرہ کی تسبیح کے پوشیدہ رکھنے کا راز یہی ہے کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ ہم سے اللہ کے نام کی بے حرمتی ہو جائے۔ پانی جب تک پاکیزہ ہے خواہ جاری ہو یا ساکن تسبیح پڑھتا رہتا ہے اور جونہی کہ ناپاک ہوا، تسبیح منقطع ہو گئی۔ اسی لیے حضرت قضاء حاجت کیے بغیر واپس آ جاتے کہ جو پانی طہارت کے لیے لے جاتے اس سے تسبیح کی آواز سنتے اور اسے پلید کر کے اس کی تسبیح کو منقطع نہ کرنا چاہتے تھے۔ یہی حال درخت کا ہے کہ پتے جب تک سرسبز ہیں تسبیح پڑھتے ہیں، خشک ہوتے تو تسبیح بند ہو گئی۔ ۱۲

(مؤلف کتاب کہتا ہے کہ) معرفتِ لغات کے بیان میں اس کا کچھ تذکرہ کیا جا چکا ہے جہاں ہم نے اجزاءِ علم پر بحث کی ہے اور "خوفِ تام" میں بھی جو اجزاءِ نبوت میں سے ہے، اس کا ذکر کیا ہے۔

۱۹ سوال میں نے حضرت سے بزارؒ[ل] کی اس حدیث کے متعلق دریافت کیا جو حضرت انسؓ سے مرفوعاً روایت ہے کہ بنی اسرائیل نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے درخواست کی کہ اللہ تعالیٰ کے کلام کی کیفیت بیان فرمائیں اور یہ کہ آپ نے اسے کیسے سنا، موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا: جیسے گرج اور کڑک کی آواز کہ فوراً دم نکال دے مگر ہو نہایت شیریں، اگر سُنی جائے، یہی مثال اللہ کے کلام کی ہے۔ نیز موسیٰ علیہ السلام نے عرض کیا کہ اے باری تعالیٰ کیا آپ نے تمامی کلام سے میرے ساتھ کلام فرمایا ہے؟ ارشاد ہوا کہ تمہارے ساتھ صرف دس ہزار زبان کی قوت سے کلام کیا گیا ہے اور اگر تمامی کلام سے بات کرتا تو اسی وقت تم پگھل جاتے۔

جواب حضرت نے فرمایا: گرج اور کڑک کی آواز سے مراد خوف ہے جو انسان کو اس آواز کے سننے سے لاحق ہوتا ہے کیونکہ اس خوف کی نہ کیفیت بیان ہو سکتی ہے اور نہ ہی کوئی اس کے برداشت کرنے کی طاقت رکھتا ہے اسی طرح جو شخص حق سبحانہ' و تعالیٰ کا کلام سنتا ہے، اُسے اس قدر خوف اور ہیبت طاری ہوتی ہے کہ تمام اجزاءِ بدن اس سے متاثر ہوتے ہیں حتیٰ کہ ذاتِ انسانی کے ہر جوہر کو علیحدہ علیحدہ اس قدر خوفِ تام لاحق ہوتا ہے جتنا پورے انسان کو لاحق ہوتا ہے کہ ہر رگ اور اس کا ہر جز و لرزتا ہے اور اگر اللہ تعالیٰ کی مہربانی نہ ہو تو ہو سکتا ہے کہ وہ پگھل جائے۔

اور اعلیٰ حلاوت سے مراد وہ الطاف، رحمتیں اور انعامات ہیں جو موسیٰ کو اس وقت حاصل ہوئے نیز وہ لذت مراد ہے جو اس کلام ازلی کے سننے والے کی ہر ہر رگ کو نصیب ہوا کرتی ہے اور آواز سے حقیقی آواز مراد نہیں کیونکہ اللہ تعالیٰ کی نسبت اس کا خیال کرنا محال ہے۔

اور یہ ارشاد کہ میں نے دس ہزار زبان کی قوت سے کلام کیا، اس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام سے حجاب اٹھا دیا کہ انھوں نے اللہ تعالیٰ کے کلام کے اتنے مدلولات سُن لیے جن کو

ل بزارؒ: بزار نام کے دو محدث گزرے ہیں۔ دونوں حافظ حدیث تھے اور دونوں نے حدیث کی کتاب لکھی، ایک ابو الفضل احمد بن سلمہ نیشاپوری ہیں جو امام مسلم کے ہمسفر رہے تھے ان کی وفات ۲۵۶ھ ۸۹۹ء میں ہوئی انھوں نے صحیح مسلم کی طرز میں حدیث کی کتاب لکھی۔ (تذکرۃ الحفاظ ج ۲ صنہ ۱۹)

دوسرے بزار احمد بن عمرو بن عبد الخالق بصری ہیں۔ انھوں نے مسند معلل تالیف کی، ان کی وفات ۲۹۲ھ ۹۰۴ء میں ہوئی۔

اگر ہزار زبانیں یک لحظہ کے اندر ادا کرتیں تو ان کی مقدار ان مدلولات کلام الٰہی کے برابر ہوتی۔ یہ بعینہٖ اسی طرح ہے جس کا ذکر صاحب فتح ولی کے بیان میں آئے گا کہ نہ مختلف آوازیں اس پر مخلوط ہوتی ہیں اور نہ ایک آواز دوسری آواز کے سننے سے مانع ہوتی ہے (بلکہ وہ صاف صاف اور الگ سنائی دیتی ہیں) لہٰذا اگر دس ہزار زبانیں بھی فرض کرلی جاتیں کہ حضرت موسیٰؑ کی طرف متوجہ ہوئی ہوں اور انھوں نے انہیں کان لگا کر سنا ہو اور ایک لحظہ میں بغیر ترتیب اور تقدیم و تاخیر کے سمجھا ہو تو حدیث مذکور میں اسی شان کی طرف اشارہ سمجھنا چاہیئے۔

حضرت نے فرمایا کہ یہ سماعت روح کی تھی نہ ذات کی، کیونکہ روح کے علم میں کوئی ترتیب نہیں ہوتی چنانچہ جب روح کسی علم کی طرف متوجہ ہوتی ہے مثلاً نحو یا فقہ تو نحو یا فقہ کے تمام مسائل ایک لحظہ کے اندر اس کے سامنے حاضر ہو جاتے ہیں۔ یہی حال روح کی قراءت کا ہے۔ لہٰذا جب روح قرآن مجید کی تلاوت کا ارادہ کرے گی تو اس کو تمام حروف کے ساتھ ایک لحظہ میں صحیح مخارج ادا کر کے پڑھ جائے گی۔

میں نے حضرت سے یہ جواب ابتدائی زمانے میں سنا تھا واقعہ یوں ہوا کہ میں عین علوان کی مسجد میں دُرِّ منثور[۵] لیے بیٹھا تھا کہ میں نے یہ حدیث پڑھی اور میرے دل میں خیال آیا کاش اس وقت حضرت موجود ہوتے تو میں ان سے اس حدیث کے متعلق دریافت کرتا۔ ابھی تھوڑی دیر نہ ہوئی تھی کہ آپ تشریف لے آئے اور میرے سامنے آبیٹھے، میں نے کتاب کھولی اور عرض کیا کہ حضرت میں تو خواہش ہی کر رہا تھا کہ اس کتاب کی ایک حدیث کے متعلق آپ سے سوال کروں۔ حضرت نے فرمایا کہ ہاں پوچھو میں جواب ہی کے لیے آیا ہوں چنانچہ میں نے حدیث پڑھی اور حضرت نے یہ جواب دیا: رَضِیَ اللّٰہُ عَنْہُ وَ نَفَعَنَا بِعُلُوْمِہٖ۔

۱۷۔ جبرئیل کا ایک سائل کی صورت میں آنا اور آنحضرتؐ کا اُسے نہ پہچاننا!

مسلم کی ایک حدیث (مشکوٰۃ باب الایمان) میں جبرئیل کے ایمان اور احسان کے متعلق سوال کرنے کا ذکر آیا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جبرئیل کے چلے جانے کے بعد فرمایا کہ اس شخص کو جو سوالات کر رہا تھا واپس لاؤ۔ چنانچہ صحابہ نے ان کی تلاش کی مگر ان کا پتہ نہ لگا۔ تب حضرتؐ نے فرمایا: یہ جبرئیل تھے اور وہ مجھ سے اس مرتبہ

---

[۵] دُرِّ منثور: جلال الدین سیوطی متوفی ۹۱۱ھ، ۱۵۰۵ء کی مشہور تفسیر کی کتاب ہے پورا نام الدُّرُّ المنثور فی التفسیر بالماثور ہے۔

کے سوا کبھی نہیں چھپ سکے (یعنی اب کی بار میں انہیں نہ پہچان سکا۔) اس حدیث کے متعلق میں نے حضرت کو فرماتے ہوئے سنا کہ یہ جو آنحضرتؐ پر جبرئیلؑ چھپے رہے اس میں بھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی اس قدر تعظیم و تکریم پائی جاتی ہے جسے صرف وہی لوگ جان سکتے ہیں جن پر اللہ کی رحمت ہو، اس کی تشریح یوں ہے کہ بعض اوقات آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم مشاہدۂ حق میں اس قدر مستغرق ہو جاتے کہ آپ کی ذاتِ پاک مع اپنے تمامی تعلقات اور اجزاء و عروق کے اس عالم سے بے تعلق ہو کر نورِ حق سبحانہٗ میں محو ہو جاتی۔ چنانچہ اس طرح آپ کی ذات کا تعلق غیر اللہ سے کلی طور پر منقطع ہو جاتا مگر اس کے باوجود آپ کی ذات غلطی سے محفوظ ہوتی! ور حق کے سوا کوئی فعل صادر نہ ہوتا تھا اور نہ ہی صدق کے سوا کوئی بات زبان سے نکلتی چنانچہ جب فرشتے دیکھتے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر یہ حالت طاری ہوئی ہے اور انہیں یہ بھی معلوم ہے کہ آنحضرتؐ کے سوا کوئی اور اس کی کیفیت[1] کی طاقت نہیں رکھتا اور یہ کہ اس حالت میں آپؐ کو ان کا شعور نہ ہو سکے گا تو اس موقع کو غنیمت سمجھ کر جلدی کرتے اور حاضر خدمت ہو کر آپؐ سے ایمان کے متعلق سوال کرتے اور آپؐ کو اپنا مرشد بنا کر آپؐ سے ایمان اخذ کیا کرتے چنانچہ فرشتہ ایک بدوی کی شکل میں آکر عرض کرتا "یا رسول اللہ! میں آپ کی خدمت میں ایمان لانے اور آپؐ کے سچے رسول ہونے کا اقرار کرنے کے لیے آیا ہوں لہٰذا آپؐ مجھے سکھائیں کہ میں کس طرح اللہ اور اس کے رسول پر ایمان لاؤں"۔ چنانچہ آنحضرت اس کو تعلیم دیتے۔

میں نے عرض کیا کہ فرشتوں کو اللہ کے برگزیدہ بندے اور مقرب فرشتے ہونے کے باوجود آپؐ سے ایمان کی تعلیم لینے کی کیا ضرورت تھی؟

اس پر حضرت نے فرمایا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بہت بڑی شان ہے لہٰذا جس نے بھی آپؐ سے ایمان اخذ کیا اور پھر اسے بدلا نہیں، اسے نہ پلصراط دیکھنی پڑے گی نہ دوزخ۔ اسی لیے فرشتے اس موقع کو غنیمت سمجھتے۔

میں نے عرض کیا کہ فرشتے کسی دوسرے وقت میں کیوں سوال نہیں کرتے تھے؟

فرمایا جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اپنے اصلی حِس و ادراک کی طرف لوٹ آتے اور فرشتوں کو اس کا پتہ چل جاتا اور وہ سمجھ جاتے کہ آپ ان کو پہچان گئے ہیں تو اس حالت میں وہ بدوی کی شکل نہ بنا سکتے تھے اور اس صورت میں ذاتِ محمدیؐ سے خاص نور اور مدد کے ساتھ جواب نہ نکلے گا۔ برخلاف اس حالت کے جب آپؐ حق سبحانہٗ کی طرف مستغرق ہوں اور آپؐ کی یہ حالت ہو کہ آپؐ

---

[1] لِیْ مَعَ اللّٰہِ وَقْتٌ لَا یَسَعُہٗ مَلَکٌ مُقَرَّبٌ وَلَا نَبِیٌّ مُرْسَلٌ

متکلّم کے کلام کے سوا کچھ اور نہ سُن سکتے ہوں تو اس حالت میں ان کی خواہش کے مطابق جواب نکلے گا

پھر میں نے سوال کیا کہ کیا فرشتوں کو یہ معلوم ہو جاتا ہے کہ یہ وہ حالت ہے جس میں آپؐ اپنے حس و ادراک کی طرف لوٹ آتے ہیں اور یہ وہ حالت ہے جس میں آپؐ حق تعالیٰ کی طرف بکُلّی مستغرق ہیں۔

حضرت نے فرمایا یہ امر نہ تو فرشتوں پر مخفی رہ سکتا ہے اور نہ اُن لوگوں پر جنہیں اللہ تعالیٰ نے فتح عطا کی ہو۔ واللہُ اَعْلَمُ۔

۱۸۔ حدیث مَا مِنْ نَبِیٍّ اِلَّا وَقَدْ اعطی ما مثلہٗ اٰمن علیہ البشر

میں نے حضرت کو اس حدیث کی تشریح فرماتے ہوئے سنا "کہ جو نبی بھی گذرا ہے اسے اس قدر معجزات عطا کیے گئے جس قدر لوگ اس پر ایمان لاتے ہیں اور جو کچھ مجھے عطا ہوا ہے وہ ایک وحی ہے جس کی (ہر روز) تلاوت ہوتی ہے۔

حضرت نے فرمایا کہ انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام کے معجزات ان کی اپنی ذات اور اس کے متعلقات جنس میں سے ہوتے تھے۔ چنانچہ ان انبیاء کو بعض معجزات کبر سنی میں عطا کیے جاتے اور بعض معجزات ایسے ہوتے جو بچپن ہی سے ان کی ذات کے ساتھ ترقی پاتے رہتے تا آنکہ کبر سنی میں ان کا ظہور ہوتا مگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلّم کا معجزہ اپنی ذات سے نہ تھا بلکہ حق سبحانہٗ کی طرف سے تھا اور اس کے نور اور مشاہدہ اور ہمکلامی سے تھا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ آنحضرتؐ کی ذات، عقل، نفس، روح اور ستر میں اس قدر قوّت تھی کہ اگر یہ تمام انبیاء علیہم الصّلوٰۃ والسلام پر تقسیم کی جاتی تو بھی ان میں اسکے متحمل ہونے کی قوت نہ ہوتی۔ اسی لیے تو آنحضرت صلّی اللہ علیہ وسلّم نے فرمایا ہے کہ مجھے جو معجزہ دیا گیا ہے وہ خالص وحی ہے جس کی تلاوت کی جاتی ہے یعنی آپ کا معجزہ دیگر انبیاء علیہم السلام کے معجزات جیسا نہیں ہے۔ اگرچہ جمیع انبیاء کے معجزات اتنے جلیل القدر اور رفیع الشان تھے کہ ان کے ذریعہ سے تمام کائنات کو مومن بنایا جا سکتا تھا، لیکن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا معجزہ ان تمام کے معجزات سے ارفع و اعلیٰ ہے[1] کیونکہ یہ معجزہ حق سبحانہٗ کی طرف سے ہے نہ

---

[1] اگرچہ تمام الہامی کتابیں کلام الٰہی ہیں مگر ان الہامی کتابوں کو بطور معجزہ کے نازل نہیں کیا گیا، برخلاف قرآن مجید کے کہ یہ کلام الٰہی ہونے کے علاوہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے بطور معجزہ کے نازل ہوا ہے اسی لیے یہ معجزہ دیگر انبیاء کے معجزات سے بلند ٹھہرا۔ مثلاً موسیٰ علیہ السلام کا عصا کا معجزہ کہ یہ ان کی ذات میں سے تھا اسی طرح آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے دیگر معجزات آپ کی ذات میں سے تھے اور وہ بطور دلیلِ نبوت کے عطا نہیں کیے گئے اور قرآن مجید بطور نبوت کی دلیل کے نازل ہوا تھا۔ ۱۲

آپ کی ذات کی طرف سے۔

اس کے بعد آپ نے ایک مثال بیان فرمائی کہ ایک بادشاہ ہے۔ جب اس کے گھر کوئی لڑکا پیدا ہوا تو اس نے اسے کسی مقام پر پرورش پانے کے لیے بھیج دیا اور ہر ایک کے ساتھ بطور نشانی کے ایک قیمتی لعل بھی بھیجتا رہا جس سے رعایا کو علم ہو کہ یہ شاہزادہ ہے اور ہمارے بادشاہ کا بیٹا ہے، بالآخر ایک اور لڑکا پیدا ہو جس کو بادشاہ نے اپنے پاس رکھ لیا اور خود ہی اس کی تربیت اور تمام معاملات کی نگہداشت کی لہٰذا جو کمالِ معرفت اور اپنے باپ کے اسرار سے جو واقفیت اسے حاصل ہو گی اس کی کیفیت بیان نہیں کی جا سکتی اور جس قدر اس کے بھائیوں کو اپنے باپ کے اسرار کا علم ہوا ہو گا اس کا قیاس اس علم کے ساتھ ہرگز نہیں کیا جا سکتا جو اسے حاصل ہوا ہو گا۔

بعض صحابہ رضوان اللہ علیہم کی خواہش ہوتی کہ آنحضرت صلّی اللہ علیہ وسلّم سے بعض ایسے معجزات صادر ہوں جس قسم کے دیگر انبیاء علیہم السلام سے صادر ہوتے ہیں تو آنحضرت صلّی اللہ علیہ وسلّم کی نظر ادھر تو ان کی خواہش پر جاتی اور ادھر اس مخصوص عنایتِ الٰہی پر جو مولیٰ کریم نے خاص آپ کی ذات پر کی تھی اور اس سے آپ کو بڑی شرم آتی۔ پھر حضرت نے فرمایا کہ اس کی مثال ایسی ہے جیسے کہ ایک شخص کو بادشاہ نے اپنا تمام ملک دے دیا ہو اور اسے اختیار دے دیا ہو کہ جیسا چاہے تصرف[1] کرے اور اس کا کوئی دوست اس سے خواہش کرے کہ فلاں گاؤں میں تصرف کر کے دکھلائیں۔

ایک اور مرتبہ میں نے حضرت کو یہ فرماتے ہوئے سنا کہ قرآن مجید میں جو اسرار و انوار ہیں اور جو مقامات اور احوال اس میں درج ہیں اس کی مثال ایسی ہے کہ ایک شخص کپڑا تراش کر ٹوپی، قمیض اور عمامہ غرض جو کپڑے بھی پہنے جاتے ہیں سب ہی سلوائے اور اپنے سامنے رکھ لیے۔ اب ایک نگاہ ڈالو۔ ان کپڑوں پر اور پھر تمام مخلوقات کی طرف دیکھو (کہ کیا کوئی اس لباس کے پہننے کا مستحق ان میں ہے) تو تمہیں معلوم ہو جائے گا کہ اسے پہننے اور اس کے متحمل ہونے کی طاقت آنحضرت صلّی اللہ علیہ وسلّم کی ذات کے سوا کسی میں نہیں ہے اور اس کی وجہ وہی قوت ہے جو آپ کی ذات شریف سے مخصوص کی گئی ہے۔

---

[1] اللہ تعالیٰ حقیقی مالک الملک ہیں اور اپنے خاص بندوں میں سے جسے چاہیں اس کے مرتبہ اور قرب کے مطابق تصرف اور حکم کرنے کی اجازت دے دیتے ہیں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا سا قرب اور مرتبہ کسی کا نہ تھا لہٰذا کائنات میں آپ کا سا تصرف کسی اور کا نہیں ہو سکتا۔ ہوا، پانی، آگ، شجر، حجر، زندہ، مردہ غرض ہر چیز پر تصرف تھا۔ باایں ہمہ آپ اس تصرف کا استعمال اذنِ خداوندی کے بغیر نہ کرتے تھے۔

١٩- مشاہدۂ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم

ایک اور مرتبہ میں نے آپ کو "مشاهدة النبی لا تطاق" کی تشریح فرماتے ہوئے سنا کہ مشاہدہ اپنی اپنی معرفت کے مطابق ہوتا ہے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو معرفت اسی وقت سے حاصل ہو چکی تھی جب حبیب اپنے محبوب کے پاس تھا اور کوئی تیسرا ان کے پاس نہ تھا اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم تمام مخلوقات[1] سے پہلے پیدا ہوئے اسی زمانہ سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی روحِ مقدس ان انوارِ قدسیہ اور معارفِ ربانیہ سے سیراب ہو چکی تھی لہٰذا یہ ہر طالب نور کے لیے اصل اور ہر طالب ضیاء کے لیے مادہ بن گئی تھی۔ لہٰذا جب آپؐ کی پیدائش کے وقت آپؐ کی رُوحِ مقدس آپؐ کی ذات مُطہّر میں داخل ہوئی تو اس میں رضا اور محبت کے ساتھ سکونت پذیر ہوئی اور ذات کو اپنے اسرار و معارف سے فیضیاب کرتی رہتی تا آنکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی عمر چالیس سال کی ہوئی تو وہ پردہ جو ذات اور روح کے درمیان تھا، اٹھ گیا اور حجاب کلیتہً ہٹ گیا اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو وہ مشاہدہ حاصل ہوا جسے کوئی اور برداشت نہیں کر سکتا چنانچہ آپؐ کا مشاہدہ ایسا تھا جیسا کہ آپ اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہوں کہ حق سبحانہٗ کی ذات ہی تمام مخلوقات کی محرّک اور انہیں ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل کرنے والی ہے اور مخلوقات کی حیثیت تو ظروف اور کمہار کے برتنوں کی سی ہے جو اپنی جگہ ذات کو نہ نفع پہنچا سکتے ہیں نہ نقصان۔ چنانچہ جب آپؐ مبعوث ہوئے اور خلعتِ رسالت ملی تو آپؐ کو یہ مشاہدہ حاصل ہو چکا تھا اور مخلوقات آپؐ کی نگاہ میں محض خالی اجسام اور تصویریں تھیں (یہ مشاہدہ اس لیے کرایا گیا) تاکہ آپؐ ان کے لیے مجسم رحمت بنیں اور ان کے کسی فعل[2] کو بھی ان کی جانب سے خیال کر کے بد دعا نہ کریں جس سے وہ ہلاک ہو جائیں، جس طرح کہ آپؐ سے پہلے انبیاء نے اپنی امتوں سے کیا۔ اسی لیے انھوں نے دعا کرنے میں جلدی کی اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی دعاء اپنی اُمّت کی شفاعت کی خاطر قیامت کے دن پر اٹھا رکھی گئی ہے۔ لہٰذا آپؐ کی دعا بھی رحمت بنی اور اللہ تعالیٰ کے فرمان وَمَآ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا رَحْمَةً لِّلْعٰلَمِيْنَ (ہم نے آپؐ کو تمام جہانوں والوں کے لیے رحمت بنا کر بھیجا ہے) اور آنحضرت صلی اللہ

---

[1] حدیث: كُنْتُ نَبِيًّا وَّاٰدَمُ بَيْنَ الْمَآءِ وَالطِّيْنِ اور وَكُنْتُ نَبِيًّا وَّاٰدَمُ بَيْنَ الرُّوْحِ وَالْجَسَدِ اور وَكُنْتُ نَبِيًّا وَّاٰدَمُ منجدل فی الطّين اور اَوَّلُ مَا خَلَقَ اللّٰهُ رُوْحِیْ وغیرہ

[2] یعنی کفار کی ایذا رسانی اور استہزا کو ان کی جانب سے خیال نہ فرماتے کیونکہ وہ تو خالی جسم ہیں جنہیں اپنے نفع و نقصان کا علم نہیں ہے اور نہ پتہ ہے کہ وہ کیا کر رہے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ان کے جواب میں یہی فرماتے "خدایا! میری قوم کو ہدایت دے کیونکہ انہیں معلوم نہیں کہ میں کون ہوں اور کیا ہوں"۔

علیہ وسلم کے فرمان کہ اِنَّمَا اَنَا رَحْمَۃٌ مُّھْدَاۃٌ لِلْخَلْقِ (میں مخلوقات کے لیے رحمت کا تحفہ ہوں) کا مصداق ظاہر ہوا اور یہ تو اس مشاہدے کے ابتدائی زمانے کا حال تھا چہ جائیکہ ہر لحظہ آپؐ کو ترقی ہو رہی ہو اور ان مقامات پر آپؐ کا عروج ہو رہا ہو جن کی کیفیت بیان نہیں ہو سکتی۔

میں نے عرض کیا اب کوئی درجہ باقی ہے؟

حضرت نے فرمایا کہ اگر آنحضرت صلّی اللہ علیہ وسلّم آج تک زندہ رہتے تو بھی کسی ایک مقام پر نہ ٹھہرتے بلکہ متواتر بلند ہوتے جاتے اس لیے کہ اللہ تعالیٰ کے کمالات کی کوئی انتہا نہیں ہے۔

میں نے عرض کی کہ اس مشاہدے سے تو کوئی نبی بھی خالی نہ ہوگا کیونکہ ان کے پاس اگر صرف اس بات پر ایمان بالغیب ہے کہ اللہ تعالیٰ ہمارے اور ہمارے افعال کے خالق ہیں تو وہ بالکل عام مومنین کی طرح ہو جاتے ہیں۔

حضرت نے فرمایا اس میں کوئی شک نہیں کہ انہیں یہ مشاہدہ حاصل ہوا مگر پردہ کُلّی طور پر نہ ہٹا تھا برخلاف اس کے ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے پردہ کُلّی طور پر زائل ہو گیا تھا۔

اس کے بعد حضرت نے کشفی حقائق بیان فرمائے جن کے سمجھنے سے عقل قاصر ہے۔

آخر میں فرمایا کہ قرآن مجید میں انوارِ قدسیہ اور معارف ربانیہ اور اسرارِ ازلیہ اس قدر بالا از طاقت ہیں کہ اگر حضرت موسیٰؑ صاحبِ توراۃ، حضرت عیسیٰؑ صاحبِ انجیل اور حضرت داؤد صاحبِ زبور علیہم التسلیمات نزولِ قرآن کے زمانے تک زندہ ہوتے اور اس کو سنتے تو قرآن کا اتباع اور نبی صلّی اللہ علیہ وسلّم کی ان اقوال میں تابعداری اور آپؐ کے افعال سے ہدایت پانے کے بغیر ان سے کچھ بن نہ آتا اور سب سے پہلے یہی لوگ آپؐ کی دعوت قبول کر کے آپؐ پر ایمان لاتے اور تلوار لے کر آپؐ کے آگے ہو کر جہاد کرتے۔

مؤلّف کہتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے اسی قسم کی ایک حدیث وارد ہوئی ہے جس میں آپؐ نے فرمایا ہے کہ لَوْ کَانَ عِیْسٰی وَمُوْسٰی حَیَّیْنِ لَا تَّبَعَانِیْ[1] (اگر موسیٰؑ وعیسیٰؑ زندہ ہوتے تو بالضرور میری تابعداری کرتے) یا جیسے آپؐ نے فرمایا ہو۔

---

[1] احادیث میں صرف موسیٰ علیہ السلام کا نام ہے۔ کسی صحیح حدیث میں عیسیٰ علیہ السلام کا نام نہیں دیا گیا خود مؤلف نے آگے چل کر ابن حجر کی کتاب فتح الباری کی کتاب التوحید کا حوالہ دیا ہے اس بندۂ عاجز نے اس مقام کو بغور دیکھا ہے مگر عیسیٰ علیہ السلام کا نام کہیں نہیں پایا۔ مؤلف کو دھوکا ہوا ہے ملاحظہ ہو فتح الباری ج ۱۳ ص ۴۵۰۔ اگر کسی ضعیف روایت میں عیسیٰ علیہ السلام کا نام آ بھی گیا ہو تو وہاں ان کی (بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر)

ابنِ حجرؒ کو دیکھیں کہ انھوں نے فتح الباری کی کتاب التوحید کے آخر میں اس حدیث کے متعدد طُرُق نقل کیے ہیں اور اگر یہ خارج از مبحث بات نہ ہوتی تو میں ان کو یہاں درج کر دیتا۔

۲۰- حدیث الاَشعَرِیّین

میں نے حضرت سے اس حدیث کے متعلق سوال کیا جس میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان اشعریین کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا تھا جنہوں نے آپؐ کی خدمت میں حاضر ہو کر سواری کے اونٹ مانگے تھے کہ "وَاللّٰهِ لَا اَحْمِلُكُمْ عَلَيْهِ وَلَا عِنْدِیْ مَا اَحْمِلُكُمْ عَلَيْهِ" اللہ کی قسم میں تم کو سواری کے لیے اونٹ نہ دوں گا اور نہ میرے پاس ہیں کہ تم کو دوں۔ مگر (اس قسم کھانے کے بعد) آپ نے ان کو اونٹ عطا فرما دیے۔

دریافت طلب امر یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زبانِ مبارک سے حق بات کے خلاف اور صدق کے سوا کوئی بات نہ نکل سکتی تھی (پھر یہ بات کیوں کر ہوئی کہ پہلے تو قسم کھا کر انکار کر دیا اور پھر قسم کے خلاف اونٹ دے بھی دیے)

فرمایا: بیشک نبی صلی اللہ علیہ وسلم سچ ہی بولا کرتے تھے اور حق بات ہی فرمایا کرتے تھے مگر آپ کا کلام باطن اور مشاہدے کے اعتبار سے نکلا کرتا تھا۔ چنانچہ کبھی تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ذاتِ الٰہی کے مشاہدے میں ہوتے اور جو لذت اس مشاہدے میں ہوتی ہے اس کی کیفیت نہ تو بیان ہو سکتی ہے اور نہ کوئی اور اس کا متحمل ہو سکتا ہے اور دنیا کی کوئی لذت بھی اس کے مماثل نہیں اور یہ وہ لذت ہے جو جنتیوں کو جنت میں دیدارِ الٰہی کے وقت حاصل ہوگی۔

اور کبھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ذاتِ باری تعالیٰ کی قوت اور غلبۂ قدرت کے مشاہدے میں مستغرق ہوتے اور اس مشاہدے میں اللہ تعالیٰ کی قوت اور غلبۂ قدرت کے مشاہدے کی وجہ سے خوف اور بے چینی ہوتی۔ ان دونوں مشاہدوں میں آپ مخلوق سے غافل ہو جاتے اور کسی کو بھی نہ دیکھتے تھے۔ اس کی تھوڑی سی تشریح حضرت جبرئیل کو نہ پہچان سکنے کی حدیث میں گزر چکی ہے۔

اور کبھی آپ ذاتِ خداوندی کا مشاہدہ مخلوقات کے ساتھ کرتے اور آپؐ اللہ کی قدرت کو تمام مخلوقات میں ساری پاتے۔ اس مشاہدے میں ذاتِ باری آپؐ کے باطن سے غائب ہو جاتی اور اس کے افعال باقی رہ جاتے

(بقیہ حاشیہ صفحہ سابقہ)

وفات کا ذکر "تغلیب" کے ہوگا جیسے کہتے ہیں متقلّداً سیفاً و رمحاً یا جیسے سورج اور چاند کو "القمران" کہہ دیتے ہیں اور ابوبکر و عمر کو "العمران" کہا جاتا ہے ورنہ حضرت عیسیٰ کی حیات کے متعلق صریح احادیث موجود ہیں۔

اسی تیسرے مشاہدے میں احکامِ شرعیہ کی تعمیل اور مخلوق کی تعلیم و تربیت اور ان کو اللہ تک پہنچانے کی خدمت انجام پاتی تھی۔ لہٰذا آپؐ کی زبانِ مبارک سے جو کچھ بھی نکلتا تھا ان تینوں مشاہدوں سے خارج نہ ہوتا تھا، چنانچہ کلام فرماتے وقت کبھی آپؐ پہلے مشاہدے میں ہوتے اور کبھی تیسرے میں اور حدیث مذکور کا تعلق دوسرے مشاہدے سے ہے کیونکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ذاتِ باری اور اس کی قدرت کے مشاہدے میں اس قدر مستغرق تھے کہ وہ اپنے آپ سے بھی بے خبر تھے اور کا تو ذکر ہی کیا۔ لہٰذا جب اشعریین نے آنحضرت سے یہ درخواست کی کہ ہمیں سواری کے اونٹ عطا فرمائیں اور آپؐ اس مشاہدے کی حالت میں تھے تو جواب میں یہ فرما دیا کہ اللہ کی قسم کہ میں تمھیں سواری کے لیے اونٹ نہ دوں گا اور نہ میرے پاس ہیں کہ دوں (کیونکہ مالکِ حقیقی اور مُعطیِ حقیقی تو اللہ تعالیٰ ہیں) اور یہ بات ہے بھی درست، لیکن جب آپ مشاہدۂ حق سے مشاہدۂ خلق کی طرف لوٹے اور اتفاق ایسا ہوا کہ اونٹ بھی آ گئے تو آپؐ نے اس مشاہدے کے مطابق عمل کیا کیونکہ اس مشاہدہ کا تقاضا یہ ہے کہ احکامِ الٰہی کی اطاعت ہو اور حقوق بھی ادا کیے جائیں۔ اسی لیے آپؐ نے دریافت فرمایا کہ اشعریون کہاں ہیں؟ اس پر وہ بلائے گئے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں اونٹ عطا فرمائے۔ انھوں نے عرض کیا بھی کہ یا رسول اللہ آپ نے تو حلف اٹھایا تھا کہ آپ ہمیں اونٹ نہ دیں گے اور اب آپ دے رہے ہیں۔ آپؐ نے جواب میں ایسے کلمات فرمائے جن سے مطلب نکلتا ہے کہ آپ نے ابتدا میں جو قسم کھائی تھی وہ اس مشاہدے کے حال کے مطابق تھی (کیونکہ اس حالت میں آپ کو اپنے نفس پر ہی اختیار نہ تھا چہ جائیکہ اونٹوں کا دینا) اس لیے فرمایا کہ میں نے تم کو سواری کے لیے اونٹ نہیں دیے بلکہ اللہ نے دیے ہیں یعنی میں نے ہی تو قسم کھائی کہ مَیں نہ دوں گا اور نہ میرے پاس اونٹ ہیں جو سواری کے لیے دوں اور یہی حقیقت ہے کیونکہ تمہیں سواری کے اونٹ دینے والا اللہ ہے، نہ کہ مَیں۔ چنانچہ آپؐ نے انہیں اس طرح تبلا دیا کہ آپ نے جو کہا ہے سچ کہا ہے اور جو کچھ فرمایا ہے درست ہے۔

مَیں نے عرض کیا تو پھر آپؐ نے قسم کا کفارہ کیوں دیا اور فرمایا "میں اگر کسی بات کی قسم کھالوں اور پھر اس کے خلاف بہتر سمجھوں تو اس قسم کا کفارہ ادا کر کے بہتر بات کو کروں گا۔"

حضرت نے فرمایا: آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس قصہ میں تو قسم کا کفارہ ادا نہیں کیا۔ اس حدیث میں جو ذکر ہوا ہے وہ تو صرف نئی بات کا ذکر اور ایک حکم کی تاسیس اور ایک قاعدۂ شرعیہ مقرر فرمایا ہے۔ اس واقعہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا قسم کا کفارہ دینا قطعاً ثابت نہیں ہے۔

مولف کہتا ہے کہ بڑے بڑے اکابر مثلاً حسن بصریؒ وغیرہ کی یہی رائے ہے اس شیخ عظیم کا عرفان کتنا

صحیح واقع ہوا ہے۔

اس کے بعد حضرت نے فرمایا کہ پہلے مشاہدہ کی مثال جس کے متعلق ہم نے کہا ہے کہ اس کی لذت اہلِ جنّت کی سی لذت ہے اس کی مثال یوں سمجھو کہ ایک شخص کی ملاقات ایک باسطوت وجلال سلطان سے ہو جس کے پاس ہتھیار اور ہر قسم کے آلاتِ قتل اور دیگر خوفزدہ کرنے والے امور ہوں پھر وہ بادشاہ ان آلات واسلحہ کو اتار دے اور گھوڑے سے اتر آوے اور اپنی رعایا میں سے ایک شخص کو بلاوے اور اس کے ساتھ انبساط اور خوش طبعی کی باتیں کرنے لگے۔ پھر یہ خوش طبعی اس حد تک پہنچ جائے کہ بادشاہ اُسے اپنے ساتھ ایک ہی کپڑے میں سلائے، بھلا بتاؤ کہ اس شخص کی خوشی کی کیا حد ہوگی، کیا کوئی اس کا اندازہ کر سکتا ہے یا کوئی شخص اس کی حقیقت بیان کر سکتا ہے؟ اس مثال سے صرف لفظوں میں اس مشاہدہ کی لذت کی طرف اشارہ نکلتا ہے ورنہ درحقیقت وہ کجا اور یہ کجا۔

حضرت نے فرمایا: اس مشاہدہ والے کو سکون، آرام، خوشی اور انشراح صدر کے علاوہ ایسی لذت حاصل ہوگی جو اس کی رگوں میں، گوشت میں، خون میں، ہڈیوں میں اور بال بال میں اور روئیں روئیں میں غرض تمامی جواہر ذات میں سرایت کیے ہوگی، حتیٰ کہ بالفرض اس کا ایک بال لے کر اس کی لذت کو دیکھا جائے تو اس میں بھی بعینہٖ وہی لذت پائی جائے گی جو اس کی عقل اور دل میں پائی جاتی ہے گی، حتیٰ کہ اگر ہم دنیا کی سب سے بڑی لذت یعنی لذتِ جماع کو لے لیں اور فرض کر لیں کہ یہ لذتِ مشاہدہ کا کروڑواں حصہ ہے اور پھر اس مجموعہ کو ستر کروڑ کا ایک جزو قرار دیں اور یوں سمجھیں کہ مشاہدہ کی لذت اس کا دسواں حصہ (عشر) ہے تب بھی اس لذت کے قریب قریب تک نہ پہنچیں گے۔

پھر فرمایا کہ دوسرے مشاہدہ کی مثال ایسی ہے جیسے کوئی شخص بادشاہ کے خلاف بغاوت کرے اور بادشاہ بھی اس کے خلاف اسلحہ اور اپنے دبدبے اور قہر کے ساتھ نکل کر آئے تو اگرچہ پہلی لذت کا کچھ اثر اس مشاہدہ میں بھی پایا جائے گا مگر ساتھ ہی ناقابلِ برداشت ہیبت اور دہشت بھی ہوگی کیونکہ جو شخص بادشاہ کو ہاتھ میں نیزہ لیے ہوئے گھوڑے پر سوار دیکھے، پھر وہ نیزے کو حرکت دے کر ڈراتا دھمکاتا بھی ہو تو جو ڈر اس پر طاری ہوگا اس کا حال کچھ نہ پوچھو اور فرمایا کہ پہلے مشاہدہ میں کچھ خواب کی صورت پائی جاتی ہے اور دوسرے میں بیداری کی سی کیفیت ہے اس لیے کہ اس میں ہیبت و دبدبہ خداوندی کے مشاہدہ سے بے چینی ہوتی ہے۔

فرمایا کہ اس حدیث میں کہ "میرے دل پر کبھی کبھی بادل چھا جاتے ہیں تو اللہ سے استغفار کرتا ہوں" تیسرے مشاہدہ کی طرف اشارہ ہے۔

(مؤلف کہتا ہے) اس حدیث کو مسلم نے اپنی صحیح میں بیان کیا ہے اور بڑے بڑے محدثین مثل قاضی عیاض، نووی اور عراقی[ل] وغیرہ رحمہم اللہ نے بھی اس حدیث پر بحث کی ہے جس کا ماحصل تقریباً وہی ہے جو حضرت نے فرمایا مگر حضرت نے جو بات فرمائی ہے وہ مشاہدہ اور معاینہ کے بعد فرمائی ہے۔

حضرت نے فرمایا کہ تمام مخلوقات میں سے کسی کو بھی پہلے اور دوسرے مشاہدہ پر دوام حاصل نہیں ہو سکتا اسی لیے انہیں تیسرے مشاہدہ کی طرف آنا ضروری ہے تاکہ آرام کر سکیں۔ اسی لیے جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اس مشاہدہ کی طرف نزول کرتے تو (چونکہ یہ مشاہدہ بمقابلہ پہلے دو مشاہدوں کے ادنیٰ مشاہدہ ہوتا اس لیے) آپ اللہ[ک] سے استغفار کرتے اور اسے گناہ سمجھتے۔ حضرت نے اس کے علاوہ اس میں دیگر اسرار کا بھی ذکر کیا جن کا افشا نہیں کیا جا سکتا۔

مؤلف کہتا ہے کہ جب حضرت سے میں نے ان تینوں مشاہدات کی تشریح سنی اور انھوں نے یہ بھی فرمادیا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا کلام ان سے باہر نہیں ہو سکتا اور اس کلام کا مفہوم سمجھنا صرف انھی لوگوں کے لیے مشکل ہوتا ہے جو اس کی حقیقت سے بے خبر ہیں۔ نیز یہ کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ہر بات

۱۲۱۔ تأبیر نخل کا قصہ

سچی ہوتی ہے اور ہر بات اور ہر حال میں آپ حق بات کہتے ہیں تو میں نے سوال کیا کہ صحیح مسلم میں کھجور کو پیوند لگانے کا قصہ دیا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ایک بار صحابہ کے پاس سے گزرے جبکہ وہ کھجوروں کو پیوند لگا رہے تھے، آپ نے دریافت فرمایا یہ کیا کر رہے ہو؟ صحابہ نے عرض کیا: یارسول اللہ ان کی اسی طرح اصلاح کی جاتی ہے۔ آپ نے فرمایا اگر تم ایسا نہ کرو تب بھی اچھا پھل آئے، چنانچہ صحابہ نے آپ کے فرمان کے مطابق پیوند نہ لگایا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ خراب قسم کی کھجور آئی۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو دیکھا تو فرمایا کہ کھجور کو کیا ہو گیا کہ ایسی آئی، صحابہ نے عرض کیا: یا رسول اللہ آپ ہی نے تو ہمیں ایسا فرمایا تھا۔ اس پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "تم اپنی دنیا کو بہتر جانتے ہو"

ل عراقی: حافظ زین الدین عبدالرحیم بن حسین عراقی۔ ان کی وفات ۸۰۶ھ ۔ ۱۴۰۳ء میں ہوئی۔ انھوں نے اصولِ حدیث میں الفیہ لکھا۔

ک جیسا کہ کہتے ہیں کہ حَسَنَاتُ الْاَبْرَارِ سَیِّئَاتُ الْمُقَرَّبِیْنَ اسی طرح اس تیسرے مشاہدہ کی طرف آنا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو گناہ معلوم ہوتا تھا۔ ایک بزرگ کے متعلق مشہور ہے کہ نماز سے فارغ ہو کر کہنے لگے کہ یوں معلوم ہوتا ہے کہ نماز پڑھ کے نہیں آیا بلکہ زنا کر کے آیا ہوں کیونکہ اللہ والوں کے ہاں تو نماز بمصداق اَلصَّلٰوۃُ مِعْرَاجُ الْمُؤْمِنِیْن صحیح معنوں میں معراج ہوتی ہے اور جب یہ کیفیت نہ پائی گئی ہو تو ان کے نزدیک نماز نہ ہوئی بلکہ گناہ ہوا۔ ۱۲

حضرت نے فرمایا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ فرمانا کہ "اگر تم اس طرح نہ بھی کرو (یعنی پیوند نہ بھی لگاؤ) تب بھی پھل اچھا آوے" بالکل حق اور سچا کلام ہے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ بات اس جزم اور یقین کی بنا پر فرمائی جو حضور کو حاصل تھا کہ فاعل مطلق تو اللہ تعالیٰ ہی ہے اور یہ جزم اور یقین آپ کو اس طرح حاصل ہوا تھا کہ آپ نے مشاہدہ فرمایا تھا کہ اللہ تعالیٰ کا فعل تمام ممکنات میں براہِ راست اور بلا سبب و واسطہ جاری و ساری ہے چنانچہ نہ کسی ذرہ کو سکون ہوتا ہے نہ بال کو حرکت، نہ دل کو اضطراب، نہ رگ میں پھڑک، نہ پلک کی کوئی جھپک نہ ابرو کا اشارہ، مگر اللہ تعالیٰ بلا واسطہ اس کا فاعل ہوتا ہے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اس کا اس طرح مشاہدہ کیا کرتے تھے جس طرح عام لوگ محسوسات کا مشاہدہ کیا کرتے ہیں اور یہ کیفیت آپ سے کسی حالت میں بھی غائب نہ ہوتی تھی نہ بیداری میں نہ خواب میں۔ اس لیے کہ آپ کا قلب جس میں یہ مشاہدہ تھا کبھی نہ سوتا تھا[1] اور یہ بات یقینی ہے کہ جس ہستی کو اس قسم کا مشاہدہ حاصل ہو اس کی نگاہ سے تمام اسباب گر جائیں گے اور وہ ایمان بالغیب سے ترقی کر کے شہود و عیان تک جا پہنچے گا۔ لہٰذا اس کے نزدیک اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان: وَاللّٰہُ خَلَقَکُمْ وَمَا تَعْمَلُوْنَ محض ایک عقیدہ نہ ہوگا بلکہ مشاہدۂ دائمی ہوگا جو نظر سے اوجھل نہ ہوگا اور وہ یقین نصیب ہوگا جو اس مشاہدہ کے مناسب ہے یعنی اس آیت کے معنی پر اس قدر پختہ یقین ہوگا کہ غیر اللہ کی طرف کسی فعل کے منسوب کرنے کا چیونٹی کے سر کے برابر بھی وسوسہ نہ گزرے گا اور یہ بات بھی یقینی ہے کہ جس پختہ یقین کی یہ کیفیت ہو اس سے معجزات کا ظہور ہوتا ہے اور اشیاء خود بخود متاثر ہونے لگتی ہیں۔ یہ ایک سِرِّ الٰہی ہے جس کے ہوتے ہوئے تمام اسباب و وسائل اُٹھ جاتے ہیں۔ لہٰذا جس ہستی کو یہ مقام حاصل ہو اگر وہ اسباب کے ساقط ہونے اور ربّ الارباب کی طرف فعل کے منسوب ہونے کا اشارہ فرمائے تو اس کا قول حق اور اس کی بات سچ ہوگی، مگر جس شخص کو صرف ایمان بالغیب حاصل ہو (یعنی مشاہدہ حاصل نہ ہو جیسے صحابہ رضوان اللہ علیہم) اس کے نزدیک وَاللّٰہُ خَلَقَکُمْ وَمَا تَعْمَلُوْنَ میں مشاہدہ نہیں ہوگا، اس کے نزدیک مشاہدہ یہی ہے کہ افعال کی نسبت ان کی طرف ہے جن سے یہ فعل صادر ہوئے اس کو آیت شریفہ کے معنی اور فعل کو خدا کی طرف منسوب کرنے کی جانب اس کا وہ ایمان کھینچتا ہے جو حق تعالیٰ نے اسے بخشا ہے۔ پس اس کے لیے دو جاذب ہیں، ایک جاذب خدا کی طرف سے ہے یعنی اس کا یہ ایمان جو اسے حق کی طرف کھینچتا ہے اور دوسرا اس کی اپنی طبیعت کی طرف سے یعنی اس کا یہ دیکھنا کہ یہ فعل تو بظاہر غیر اللہ سے صادر ہو رہا ہے اور یہ اسے باطل کی طرف کھینچتا ہے۔ اسی لیے انہی دو باتوں میں الجھا رہتا ہے

[1] چنانچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے تَنَامُ عَیْنَایَ وَلَا یَنَامُ قَلْبِیْ (الحدیث)

کبھی جاذبِ ایمانی قوی ہو جاتا ہے تو اسے گھڑی یا دو گھڑی کے لیے آیت مذکورہ کا مفہوم مستحضر ہو جاتا ہے اور کبھی جاذبِ طبعی قوت پکڑتا ہے تو وہ آیت کے معنی سے ایک دن یا دو دن کے لیے غافل ہو جاتا ہے اور اس غفلت کے زمانے میں وہ یقین جو خارقِ عادت تھا، جاتا رہتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمودہ (کہ اگر پیوند نہ بھی لگاؤ تب بھی اچھا پھل آئے) وقوع[۱] میں نہ آیا کیونکہ وہ معجزہ نما یقین جس پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا باطن مشتمل تھا اور جس کے مطابق آپؐ سے حق اور سچی بات نکلتی تھی، صحابہ کو حاصل نہ تھا۔ لہٰذا جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو علم ہو گیا کہ عمدہ کھجور پیدا نہ ہونے کا سبب یہ ہے اور یہ علم ہو گیا کہ اس کا ازالہ صحابہ کی طاقت سے باہر ہے تو ان کو ان کی حالت پر چھوڑ دیا اور فرمایا: تم اپنی دنیا کے امور سے زیادہ واقف ہو (لہٰذا تم اپنے دستور پر قائم رہو)

(مؤلف کہتا ہے) خدا تمہیں توفیق دے، بھلا غور کریں، ایسا عمدہ جواب کبھی سننے میں آیا ہے یا کسی کتاب میں دیکھا گیا ہے، حالانکہ یہ وہ حدیث ہے جو جمال الدین[۲] بن الحاجب، سیف الدین[۳] آمدی، صفی الدین ہندی[۴] اور

---

[۱] شہاب الدین خفاجیؒ (نسیم الریاض شرح شفاء عیاض جلد ۳ صفحہ ۲۵۲) نے اس حدیث کے متعلق سنوسیؒ کی یہ تشریح بیان کی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم تو انہیں توکل خدا پر اعتماد کرتے ہوئے ایک خارقِ عادت بات کہنے کو کہہ رہے تھے، مگر صحابہ نے نہ مانا اور صبر نہ کیا، اگر صبر کر لیتے تو ان کے لیے بہتر ہوتا کہ چند سال تک صبر کر کے آپؐ کے فرمان پر عمل کریں اور ایسا کرتے رہتے تو کھجور کو پیوند لگانے کی مصیبت سے چھٹکارا مل جاتا کیونکہ وہ ہر بات کو خدا کی طرف سے سمجھتے تھے۔ پھر کسی کا قول نقل کرتے ہوئے کہا ہے کہ غور کرنے والے کے لیے سنوسی کی بیان کردہ تشریح بہت ہی نفیس ہے۔ ۱۲

[۲] جمال الدین ابن الحاجبؒ: جمال الدین ابو عمرو عثمان بن عمر المعروف بابن الحاجب ان کی وفات ۶۴۶ھ / ۱۲۴۹ء میں ہوئی۔ مصنف کشف الظنون نے ان کی تاریخ وفات ۶۴۶ھ لکھی ہے ان کی کتاب منتہی السوال والامل فی علمی الاصول والجدل ہے۔ جو مختصر ابن حاجب کے نام سے مشہور ہے۔

[۳] سیف الدین آمدیؒ: ابو الحسن سیف الدین علی بن ابوبکر علی بن محمد ثعلبی حنبلی ثم الشافعی معروف بسیف الدین آمدی متوفیٰ ۶۳۱ھ / ۱۲۳۳ء۔ ان کی کتاب کا نام منتہی السول فی الاصول ہے (کشف الظنون ج ۲: ۳۴۷) ان کی ایک اور کتاب ابکار الافکار علم کلام میں ہے غایۃ المرام فی علم الکلام بھی انہی کی تالیف ہے (کشف: ۲: ۵)

[۴] صفی الدین محمد بن عبد الرحیم ہندی الارموی متوفیٰ ۷۱۵ھ انھوں نے الرسالۃ السفیہ اصول فقہ میں (کشف الظنون ۱: ۴۴۲) اور الفائق فی اصول الدین لکھی ہے (کشف الظنون: ۲: ۲۱) اور تیسری نہایۃ الوصول فی علم الاصول ہے (کشف الظنون: ۲: ۴۰۸)

ابو حامد الغزالی جیسے اکابر علماء اصول کو مشکل نظر آئی۔

۲۲- حدیث إِذَا أُذِّنَ بِالصَّلٰوةِ أَدْبَرَ الشَّيْطَانُ وَلَهُ ضُرَاطٌ!

میں نے حضرت سے اس حدیث کا مطلب دریافت کیا کہ جب مؤذن اذان دیتا ہے تو شیطان گوز مارتا ہوا دُم دبا کر بھاگ جاتا ہے۔

حضرت نے فرمایا کہ شیطان کے بھاگنے کی وجہ یہ ہے کہ جب اذان کے الفاظ کسی پاکیزہ ہستی سے نکلتے ہیں تو جہاں تک آواز پہنچتی ہے تمام فضا اس کے نور سے لبریز ہو جاتی ہے اور نور میں ٹھنڈک ہے اور شیطان کی پیدائش شعلۂ نار سے ہوئی ہے۔ ٹھنڈک اور آگ ایک دوسرے کی ضد ہیں۔

بعینہٖ اس طرح کی بات ایک اور بار حضرت نے فرمائی کہ جنّات کو جہنم میں آگ کا عذاب نہیں دیا جائے گا کیونکہ آگ تو ان کی طبیعت ہے۔ آگ سے آپ کی مراد گرم آگ تھی کیونکہ وہ اس کی طبع ہونے کے سبب اسے نقصان نہ پہنچا سکے گی انہیں تو بَرد اور زمہریر سے عذاب دیا جائے گا جس سے آپ کی مراد ٹھنڈی آگ تھی اور فرمایا کہ جن سردی سے سخت خوف کھاتے ہیں۔ یہاں تک کہ گرمی کے موسم میں بھی ٹھنڈی ہوا کے چلنے سے سخت ڈرتے ہیں اور جب ٹھنڈی ہوا چلتی ہے تو وہ جنگلی گدھوں کی طرح بھاگ جاتے ہیں۔ اب رہا پانی سو وہ اس میں کبھی بھی داخل نہیں ہوتے اگر تقدیر سے کوئی جن پانی میں گھس جائے تو وہ بجھ جائے گا اور پگھل جائے گا۔ جیسے اگر ہم میں سے کوئی شخص آگ میں پڑ جاتے تو جل کر فنا ہو جائے۔

پھر فرمایا کہ اگر جنّ کی کیفیت معلوم کرنا چاہو تو ایک نہایت تاریک بہت دھواں دینے والی آگ کو دیکھیں جس طرح کہ آوے کی آگ ہوتی ہے۔ پھر جس شکل پر حق تعالیٰ نے جنّات کو پیدا کیا ہے اس کا تصور کر کے اس دھوئیں والی آگ میں کھڑا کر دو۔ یہی جنّ کی صورت ہوگی۔ واللہ اعلم۔

۲۳- حدیث أَبِيتُ عِنْدَ رَبِّي يُطْعِمُنِي وَيَسْقِينِي

میں نے اس حدیث کے متعلق دریافت کیا کہ میں اپنے رب کے پاس رات گزارتا ہوں اور وہ مجھے کھلاتا پلاتا ہے۔

فرمایا: رب کے پاس ہونے سے مراد اس کی معیت ہے (اس لیے کہ اللہ تعالیٰ جگہ سے منزہ ہے) اور کھلانے اور پلانے سے مراد اللہ تعالیٰ کا اپنے نبی کو قوت بخشنا ہے۔

اس پر میں نے عرض کیا کہ ذاتِ ترابی کے لیے کیا انوار و تجلیات کا ذوق کافی ہو جاتا ہے کہ پھر کھانے کی حاجت نہیں رہتی؟

فرمایا: کافی نہیں ہوتا۔ فرض کرو کوئی شخص نبی کو پکڑ لے اور اس کا کھانا پانی بند کر دے تو نبی یقیناً مرجائے گا اس لیے کہ مٹی سے پیدا ہونے والی ذات کے لیے مٹی ہی سے پیدا ہونے والی غذاؤں کا ہونا ضروری ہے یہی وجہ ہے کہ آپ دیکھتے ہیں کہ انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام کھاتے بھی ہیں، پیتے بھی ہیں۔ بھوکے بھی رہتے ہیں، سیر بھی ہوتے ہیں۔ واللہ اعلم

۲۴۔ ولادتِ نبوی صلّی اللہ علیہ وسلم

میں نے حضرت سے دریافت کیا کہ کیا ولادتِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم رات کے وقت ہوئی جیسا کہ ایک جماعت کا خیال ہے اور انھوں نے ثبوت میں وہ حدیث پیش کی ہے جو عثمان[1] بن ابی العاص نے اپنی والدہ فاطمہ[2] بنت عبداللہ ثقفیہ سے روایت کی ہے وہ بیان کرتی ہیں کہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی پیدائش کے وقت موجود تھی جب آپؐ پیدا ہوتے تو تمام گھر نور سے بھر گیا اور کیا دیکھتی ہوں کہ ستارے قریب آ رہے ہیں یہاں تک کہ یوں خیال ہوا کہ وہ مجھ پر آ گریں گے اس حدیث کی روایت بیہقی[3] اور ابن السکن[4] نے کی ہے اور ستارے صرف رات کے وقت پائے جاتے ہیں۔

یا یہ کہ آپ کی ولادت دن کو ہوئی اور محدثین نے مسلم وغیرہ کی حدیث سے استدلال کرتے ہوئے اسے صحیح سمجھا ہے مگر ساتھ ہی کہتے ہیں کہ یہ طلوعِ فجر سے تھوڑا سا وقت بعد میں ہوئی جیسا کہ ایک حدیث میں ہے اگرچہ وہ حدیث ضعیف ہے کیونکہ فضائل و مناقب میں ضعیف حدیث پر بھی عمل کر لیا جاتا ہے انھوں نے مذکورہ بالا حدیث کا جواب یہ دیا ہے کہ تارے تو فجر طلوع ہونے کے بعد تک دکھائی دیتے ہیں لہٰذا اس حدیث سے یہ استدلال نہیں ہو سکتا کہ آنحضرت صلّی اللہ علیہ وسلّم کی ولادت رات کے وقت طلوعِ فجر سے پہلے ہوئی۔

حضرت نے فرمایا (جس سے آپ کی ذاتِ کریمہ کے اسرار کا پتہ چلتا ہے) کہ واقعہ اور نفس الامر بات یہ

---

[1] عثمان بن ابی العاص ثقفیؓ: صحابی ہیں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں طائف کا گورنر مقرر کیا اور یہ وہاں ابوبکرؓ اور عمرؓ کے عہد خلافت میں بھی گورنر رہے ان کی وفات ۵۱ھ؍ ۶۷۱ء میں ہوئی۔

[2] فاطمہ بنت عبداللہ ثقفیہ: یہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت کے موقع پر موجود تھیں (استیعاب)

[3] بیہقی: ابوبکر احمد بن الحسین البیہقی اپنے زمانے میں حدیث میں یکتا تھے یہ حاکم ابو عبداللہ کے شاگرد تھے ۳۸۴ھ؍ ۹۹۴ء میں پیدا ہوئے اور ۴۵۸ھ میں چھہتر سال کی عمر میں وفات پائی۔

[4] ابن السکنؒ: ابوعلی سعید بن عثمان البغدادی محدث ہیں ان کی صحیح بھی قابل قدر سمجھی گئی ہے اس کا نام صحیح المنتقی ہے ان کی وفات ۳۵۳ھ؍ ۹۶۴ء میں ہوئی۔

ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی پیدائش رات کے آخری حصہ میں طلوع فجر سے بہت پہلے ہونا شروع ہوئی مگر آپؐ کی والدہ ماجدہ کی خلاصی (کیونکہ آنول وغیرہ کو نکلنا تھا) کہیں طلوع فجر کے وقت جاکر ہوئی۔ وہ وقت جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا بطنِ مادر سے باہر آنے اور والدہ سے علیحدہ ہونے میں گزرا یہی دعا کی مقبولیت کا وقت ہوتا ہے جس کا ذکر احادیث میں آیا ہے اور جس کی عظمت و بزرگی بیان کی گئی ہے۔ اس گھڑی کی مقبولیت کا وصف قیامت تک رہے گا۔

حضرت نے فرمایا یہی وہ وقت ہوتا ہے جس میں روئے زمین کے اولیاء جن میں غوث واقطاب سبعہ، اہل دائرہ اور عدد بھی شامل ہیں۔ اکٹھے ہوتے ہیں۔ ان کا اجتماع مکہ سے باہر غارِ حرا میں ہوتا ہے۔ یہی لوگ نورِ اسلام کے عمود کے حامل ہیں اور انہی کی بدولت تمام امّتِ محمدیہؐ کو مدد حاصل ہوتی ہے لہٰذا جس کی دعا ان کی دعا سے اور جس کی تہجد ان کی تہجد سے موافقت کھا جائے، خدا اس کی دعا کو قبول کرتا ہے اور اس کی حاجت روائی کرتا ہے۔

حضرت ہمیں اکثر اس گھڑی کے وقت سے مطلع کیا کرتے اور فرماتے کہ مکہ میں فاس سے پہلے فجر طلوع ہوتی ہے (کیونکہ مکہ مشرق میں ہے اور فاس جنوب میں) لہٰذا اپنی تہجد میں مکہ کی فجر کا لحاظ رکھا کرو اور اسی کو اپنا معمول بناؤ پھر میں نے دریافت کیا کہ مکہ میں فجر فاس سے کتنا عرصہ پہلے طلوع ہوتی ہے فرمایا کہ مکہ میں فجر ابن جمو جو قردین کی مسجد کا موذن ہے اس کے اذان دینے سے تھوڑا وقت پہلے طلوع ہوتی ہے۔

میں نے عرض کیا پھر مقبولیت کی گھڑی وردی اور اس کے بعد سلاوی کے اٹھنے کے درمیان ہوئی،

حضرت نے فرمایا: ہاں۔

چنانچہ میں حضرت کی خدمت میں حاضر ہونے سے پہلے سورۂ کہف کی آخری آیت اِنَّ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ کَانَتْ لَھُمْ جَنّٰتُ الْفِرْدَوْسِ نُزُلًا خٰلِدِیْنَ فِیْھَا لَا یَبْغُوْنَ عَنْھَا حِوَلًا سے لے کر آخر تک پڑھا کرتا تھا تاکہ میری آنکھ اس وقت کھل جائے۔ تقریباً سولہ سال اس پر میرا عمل رہا۔ چنانچہ میری آنکھ بالعموم وردی کے وقت میں کھلا کرتی اور کبھی اگر دیر ہو جاتی تو سلاوی کے وقت میں کھلتی۔ دیگر ممالک کے اصحاب سے بھی جو اس مبارک گھڑی کو حاصل کرنے کی کوشش کرتے ہیں، میں نے یہی سنا ہے کہ وہ بھی اپنے ملک کی فجر طلوع ہونے سے بہت پہلے اٹھا کرتے واللہ تعالیٰ اعلم۔

۲۵- ولادتِ نبویؐ کس ماہ میں ہوئی!

میں نے حضرت سے دریافت کیا: آنحضرت صلّی اللہ علیہ وسلّم کی ولادت کس ماہ میں ہوئی؟ کیونکہ اس میں علماء میں بہت اختلاف پایا جاتا ہے، چنانچہ بعضے صفر بتاتے ہیں اور بعضے ربیع الآخر۔ بعضے رجب کہتے ہیں اور بعضے رمضان۔ بعضوں نے عاشورہ کا دن کہا ہے اور بعضوں نے کہا ہے کہ مہینے کی تعیین کا ہمیں علم نہیں ہے،

حضرت نے فرمایا آنحضرت صلّی اللہ علیہ وسلّم کی ولادت ربیع الاول میں ہوئی۔

۲۶- آنحضرت صلعم کا یوم ولادت

میں نے حضرت سے دریافت کیا کہ آنحضرت صلّی اللہ علیہ وسلّم کی ولادت ربیع الاول کے مہینہ میں کس دن ہوئی کیونکہ اس میں بھی علماء کا اختلاف ہے۔ چنانچہ بعض ۲ ربیع الاوّل بعض ساتؔ اور اکثر علماء نے اسے ہی اختیار کیا ہے۔ بعض نے ۹ اور بعض نے ۱۲ ربیع الاوّل بیان کیا ہے۔

حضرت نے فرمایا کہ آنحضرت صلّی اللہ علیہ وسلّم کی ولادت ۷ ربیع الاول کو ہوئی۔ یہی حقیقتِ نفس الامری ہے۔ یعنی آنحضرت صلّی اللہ علیہ وسلّم کی پیدائش ربیع الاول کی ساتویں رات ہوئی جیساکہ بیان ہوچکا کہ آپ کی ولادت رات کے وقت ہوئی۔

۲۷- آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا سالِ ولادت

میں نے حضرت سے دریافت کیا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ولات کس سال ہوئی؟ کیونکہ اس میں بھی علماء کا اختلاف ہے۔ چنانچہ بعض کہتے ہیں کہ عام الفیل میں ہوئی اور ہاتھیوں کے واقعہ سے پچاس دن بعد ہوئی اور بعض کہتے ہیں کہ اس واقعہ سے پچپن ماہ بعد ہوئی۔ بعض چالیس ماہ بعد بعض دس سال بعد اور بعض ۱۵ سال بعد بتاتے ہیں۔

جواب حضرت نے فرمایا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت ہوئی تو عام الفیل میں = مگر ہوئی ہاتھیوں کے آنے سے پہلے اور اللہ تعالیٰ نے مکہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے وجود پاک کی بدولت ہی تو ہاتھیوں کو مکہ سے دھکیل دیا تھا۔ میں نے حضرت سے یہ نہ پوچھا کہ ہاتھیوں کے آنے سے کس قدر پہلے ہوئی۔ اگر دریافت کرتا تو حضرت تعیین فرما دیتے کیونکہ اگر آپ انہیں جواب دیتے ہوئے سن لیں تو اللہ تعالیٰ کی بڑی بڑی نشانیاں سنیں۔ واللہ اعلم۔

۲۸- آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی مدّتِ حمل

میں نے دریافت کیا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی مدّتِ حمل کس قدر تھی؟

جواب حضرت نے فرمایا: آپؐ کی مدّت حمل دس ماہ تھی۔

۲۹- آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بغل کے بال

میں نے حضرت سے دریافت کیا کہ آیا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بغل شریف میں بال تھے یا نہ تھے کیونکہ اس میں بھی علماء میں بہت اختلاف ہے، جس کا ذکر بہت لمبا ہے۔

جواب فرمایا: آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بغل میں اتنے بال نہ تھے کہ نوچے جا سکیں۔ بلکہ بہت ہی کم بال تھے یعنی آپ کی بغل مبارک سفید تھی، جس میں تھوڑی سی بالوں کی سیاہی ملی ہوئی تھی آپؐ کی بغلوں میں کم بال ہونے کی وجہ یہ تھی کہ آپؐ کی چھاتی کے اوپر کے حصہ اور کندھوں پر بال بہت زیادہ تھے۔ چنانچہ ان دونوں اعضاء پر بکثرت بال تھے یہی وجہ تھی کہ آپؐ کی بغلوں میں بال کم تھے۔ واللہ اعلم۔

مؤلف کہتا ہے میں جب بعض روایت میں دیکھتا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے کندھوں پر بال تھے تو یہ بات میری سمجھ میں نہ آتی تھی، تاآنکہ جب میں نے حضرت سے یہ کلام منور سنا تو فوراً یہ بات سمجھ میں آ گئی۔

۳۰- کیا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ابرو ملے ہوئے تھے

میں نے پھر دریافت کیا کہ کیا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ابرو ملے ہوئے تھے جیسا کہ ایک روایت میں ہے یا غیر اقرن تھے (یعنی ابروؤں میں فاصلہ تھا) جیسا کہ دوسری روایت میں ہے۔

حضرت نے فرمایا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اقرن نہ تھے یعنی آپ کے ابرو آپس میں ملے ہوئے نہ تھے۔

۳۱- آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی چال

میں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی چال مبارک کے متعلق دریافت کیا کہ کیا آپؐ دائیں بائیں جھک کر چلتے تھے جیسا کہ بعض روایات میں آیا ہے یا آگے کو جھک کر چلتے تھے جیسا کہ ایک روایت میں ہے کہ گویا آپؐ ڈھلان کی طرف اتر رہے ہیں،

فرمایا: آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم دائیں بائیں جھک کر چلتے تھے اس وقت ہمارے ساتھ کوئی اور نہ تھا تو فرمایا: لوئیں تمہیں دکھاؤں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اپنی حیات میں اس دنیا میں کیسے چلا کرتے تھے اور آپ آگے کو تقریباً ساٹھ قدم چلے، میں نے آپ کو دائیں بائیں جھکتے دیکھا۔ یہ ایک ایسی چال تھی جس کی خوبی کو دیکھ کر میری عقل اڑنے کو تھی۔ میں نے اس سے زیادہ خوبصورت اور زیادہ محیّر العقول چال کبھی نہیں دیکھی۔ خدا حضرت سے راضی ہو۔ انہیں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق کس قدر صحیح علم تھا

واللہ تعالیٰ اعلم۔

۳۲۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی داڑھی!

چونکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ریش مبارک کے متعلق روایات میں بڑا اختلاف ہے، اس لیے میں نے حضرت سے حضور علیہ السلام کی ریش مبارک کے متعلق دریافت کیا۔

فرمایا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ریش مبارک گھنی تھی اور ساتھ ہی ٹھوڑی متوسط طور پر لمبی تھی اور جہاں رخسار اور ٹھوڑی ملتے ہیں، وہاں ریش مبارک ہلکی تھی۔

۳۳۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بال سفید بال۔ خضاب اور چونہ کا استعمال

میں نے حضرت سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بالوں (کیونکہ اس میں اختلاف ہے) آپ کے سفید بالوں اور خضاب کے متعلق دریافت کیا اور پوچھا کیا آنحضرت نے چونہ استعمال کیا؟

حضرت نے فرمایا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سر کے بال کبھی لمبے ہوتے تھے اور کبھی چھوٹے، ہمیشہ ایک جیسے نہ ہوتے تھے اور پیشانی کے پاس بال کترا دیتے تھے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حج کے سوا کبھی سر کے بال نہیں منڈوائے۔ نچلے ہونٹ اور ٹھوڑی کے درمیان تقریباً ۵ سفید بال تھے، کچھ تھوڑے سے کنپٹیوں میں تھے اور ٹھوڑی میں اس سے کچھ زیادہ تھے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مہندی سے داڑھی کو خضاب لگایا مگر صرف اس وقت جب آپؐ مکہ میں بطور فاتح داخل ہوئے اور چند بار مدینہ میں بھی۔ آپؐ نے چونے کا استعمال بھی کیا۔ حضرت خدیجہؓ اور حضرت عائشہؓ چونہ تیار کیا کرتی تھیں۔

۳۴۔ شق صدر

میں نے حضرت سے دریافت کیا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا شق صدر کتنی بار ہوا کیونکہ احادیث میں اس بارے میں بڑا اختلاف پایا جاتا ہے۔

حضرت نے فرمایا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا شق صدر تین بار ہوا، پہلی بار حلیمہ کے پاس جبکہ آپؐ کے سینۂ مبارک سے شیطانی حصہ نکال دیا گیا کیونکہ ذاتِ ترابی کا تقاضا یہ ہے کہ حکم کی مخالفت کرے اور اپنی خواہشات کے پیچھے چلے۔ دوسری بار جب آپؐ کی عمر دس سال کی تھی اس بار بیہودہ وساوس کو جڑ سے نکال دیا گیا اور تیسری بار نبوت کے وقت میں نے حضرت سے یہ نہ پوچھا کہ اس مرتبہ کون سی چیز نکال گئی۔

میں نے پوچھا بہت سی احادیث کے ظاہر الفاظ سے یوں معلوم ہوتا ہے کہ معراج کی رات بھی شق صدر ہوا۔ حضرت نے فرمایا: مگر یہ درست نہیں ہے۔

پھر فرمایا کہ شقِ صدر نہ تو کسی اوزار سے کیا گیا اور نہ اس میں خون بہا اور بغیر سلائی اور آلے کے آپؐ کا سینۂ مبارک پھر جڑ گیا اس تمام عمل کے باوجود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو کسی قسم کی تکلیف نہیں ہوئی کیونکہ یہ اللہ سبحانہٗ کا فعل ہے۔ واللہ اعلم

مؤلف کہتا ہے کہ جو شقِ صدر اس وقت ہوا جبکہ آپؐ حلیمہ کے پاس تھے اس پر بخاری اور مسلم کا اتفاق ہے۔ دس سال کی عمر میں جو شق صدر ہوا اس کا ذکر ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی اس حدیث میں آیا ہے جسے عبداللہ[1] ابن الامام نے زوائدِ مسند میں بیان کیا ہے اور جو شقِ صدر نبوت یعنی ابتدا۔ بعثت کے وقت ہوا اس کا ذکر ابو داؤد طیالسیؒ[2] نے اپنی مسند میں، ابو نعیمؒ[3] اور بیہقی نے دلائل النبوۃ میں کیا ہے مگر جو شقِ صدر معراج کے وقت ہوا اس سے بعض نے انکار کیا ہے وہ کہتے ہیں کہ اس کا ذکر صرف شریکؒ[4] بن عبداللہ بن ابی نمر المدنی کی روایت میں آیا ہے اور شریک منکر الحدیث ہے۔ ابن حجر کہتے ہیں کہ درست یہ ہے کہ یہ شق صدر بھی شریک کے سوا اوروں کی روایت سے صحیحین میں ثابت ہے۔ یہ ابو ذرؓ[5] کی حدیث سے ثابت ہے، دیکھیں ابن حجر (فتح الباری) کتاب التوحید کے آخر میں۔ حالانکہ آپ کو معلوم ہے کہ حضرتؐ

---

[1] عبداللہ بن الامام احمدؒ: ان کی پیدائش ۲۱۳ھ / ۸۲۸ء میں ہوئی انہیں زاہد کے لقب سے پکارا جاتا تھا اور اپنے باپ احمد بن حنبل رحمۃ اللہ سے حدیث سنی۔ ان کی وفات ۲۹۰ھ / ۵۰۲ء میں ہوئی۔

[2] ابو داؤد طیالسیؒ: سلیمان بن داؤد طیالسی۔ یہ دراصل فارسی نسل کے تھے۔ بہت تیز حافظے والے تھے، کہا جاتا ہے کہ ان کی مسند پہلی مسند ہے جو لکھی گئی ہے، ان کی وفات ۲۰۴ھ / ۸۱۹ء میں ہوئی۔

[3] ابو نعیمؒ: احمد بن عبداللہ الاصفہانی: یہ حلیۃ الاولیا کے مصنف ہیں۔ حدیث کے استادوں میں سے تھے، ۳۳۴ھ / ۹۴۵ء میں پیدا ہوئے اور ۴۳۰ھ / ۱۰۳۸ء میں وفات پائی، چھیانوے سال کی عمر پائی۔

[4] شریک بن عبداللہ بن ابی نمرؒ: انھوں نے انس، سعید بن المسیب، عبدالرحمٰن وغیرہم سے روایت کی۔ ابن معین اور نسائی کہتے ہیں کہ ان کی حدیث میں کوئی قباحت نہیں، ابن اسعد کہتے ہیں ثقہ اور کثیر الحدیث ہیں، ابن عدی کہتے ہیں جب ان سے ثقہ روایت کریں تو ان کی روایت میں کوئی حرج نہیں ابن حبان نے بھی انہیں ثقات میں شمار کیا ہے مگر بعض اوقات غلطی کھا جاتے ہیں، نسائی کا دوسرا قول ہے کہ یہ قوی نہیں ہیں اور یحییٰ بن سعید ان کی حدیث کی روایت نہیں کرتے (تہذیب التہذیب ج ۴ ص ۳۳۷-۳۳۸)

[5] ابو ذرؓ: ابوذر غفاری، ان کے نام میں بہت اختلاف ہے۔ اکثر کا خیال ہے کہ ان کا نام جندب بن جنادہ ہے۔ یہ قدیم اسلام، لانے والوں میں سے تھے اور پانچویں ایمان لانے والے ہیں ان کے ایمان لانے کا واقعہ یہ ہے کہ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم مبعوث ہوئے تو (بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر)

بالکل اُمّی تھے۔ لہٰذا آپ کا کلام خالص کشف اور عیان تھا، لہٰذا درست یہی ہوگا کہ معراج کے وقت شقِ صدر نہ ہوا ہو۔ واللہ تعالیٰ اعلم۔

۳۵۔ کیا آنحضرت صلعم کی انگشتِ شہادت درمیانی انگشت سے بڑی تھی؟

میں نے حضرت سے سوال کیا کہ یہ جو کہا جاتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی انگشتِ شہادت درمیانی انگشت سے بڑی تھی کیا یہ صحیح ہے؟

حضرت نے فرمایا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاؤں کی شہادت کی انگلی پاؤں کی درمیانی انگلی سے بڑی تھی مگر آپ کے ہاتھوں کی شہادت کی انگلیاں درمیانی انگلیوں کے برابر تھیں۔ واللہ تعالیٰ اعلم

۳۶۔ جبرئیل کا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو تین بار بھینچنا

پھر میں نے دریافت کیا کہ جب جبرئیل علیہ السلام قرآن مجید کی پہلی وحی اِقْرَأْ بِاسْمِ رَبِّكَ لے کر آئے اور انھوں نے آنحضرتؐ کو تین بار بھینچا تو آنحضرت نے فرمایا مَا اَنَا بِقَارِیٍٔ (میں پڑھا ہوا نہیں ہوں) تب جبرئیلؑ نے آپؐ کو پورے زور سے بھینچا۔ یہ کیوں کر ہوا؟

حضرت نے فرمایا کہ جبرئیل نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو پہلی بار تو اس لیے بھینچا تھا کہ آنحضرت کو بارگاہِ خداوندی میں وسیلہ بنا کر خدا کی ایسی ابدی رضامندی حاصل کریں جس کے بعد کوئی ناراضگی نہ ہو

(بقیہ حاشیہ صفحہ سابقہ)

انھوں نے اپنے بھائی کو مکہ روانہ کیا تاکہ جاکر خبر لادے وہ مکہ آیا اور واپس جاکر بتایا کہ وہ شخص مکارم اخلاق کی تعلیم دیتا ہے اور جو کلام وہ پڑھتا ہے وہ نہ شعر ہے اور نہ کاہنوں کی زبان۔ ابوذرؓ کو اس کے بیان سے تشفی نہ ہوئی۔ اس لیے خود روانہ ہوگئے۔ مکہ پہنچے مگر کسی کو اپنے دل کی بات نہ بتائی۔ خود تلاش کرتے رہے اور کسی سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق پوچھا بھی نہیں۔ چنانچہ رات ہوگئی اور یہ خانہ کعبہ میں پڑے رہے، حضرت علی کرم اللہ وجہہٗ کا ادھر آنا ہوا وہ انہیں اپنے گھر لے گئے مگر کسی قسم کی بات نہ کی۔ اسی طرح تین دن اور تین راتیں گزریں۔ حضرت علیؓ اور ان کا یہی معاملہ ہوتا رہا۔ بالآخر حضرت علیؓ نے پوچھا کہ تو کون ہے اور کیوں مکہ آیا ہے اس پر ابوذر نے حال بتایا اور صبح جاکر آنحضرتؐ کی خدمت میں ایمان لے آئے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں خاموشی سے وطن چلے جانے کو کہا مگر انھوں نے کعبہ کے اندر اپنے ایمان کا اعلان کیا۔ کفار نے انہیں خوب مارا۔ حضرت عباسؓ نے انہیں یہ کہہ کر چھڑایا کہ یہ بنی غفار میں سے ہے اگر تم نے اسے مار ڈالا تو اس کی قوم تمہارا شام کی تجارت کا راستہ بند کردے گی کافروں نے انہیں مارنا بند کردیا پھر دو دن اور اسی طرح کیا اور کافروں نے مارا۔ اس کے بعد یہ وطن چلے گئے اور ہجرت کے بعد میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوتے ان کی وفات ۳۱ھ ۶۵۱ء میں ہوئی۔

دوسری بار بھینچنا اس لیے تھا کہ جاہِ محمدی میں داخل ہو اور آپ کے جمالِ شریف کی پناہ میں آجاوے اور تیسری بار اس لیے بھینچا کہ آپؐ کی اُمّت میں شامل ہو جائے۔

حضرت نے فرمایا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو کہنا کہ اِقْرَأْ (پڑھو) اس سے مراد ہے کہ کلام قدیم کو اپنی حادث (جسمانی زبان) سے لوگوں تک پہنچا دیں کیونکہ اسی مقام پر تمام کا تمام قرآنِ مجید نازل ہو گیا تھا اور اللہ تعالیٰ کے اس فرمان کہ شَهْرُ رَمَضَانَ الَّذِیْ اُنْزِلَ فِیْهِ الْقُرْاٰنُ هُدًى لِّلنَّاسِ وَبَيِّنَاتٍ مِّنَ الْهُدٰى وَالْفُرْقَانِ (سورہ بقرہ پارہ ۲، آیت ۸۵) سے یہی مراد ہے، پھر فرمایا کہ جبرئیل کا مطالبہ یہ تھا کہ آپؐ ان معانی قدیمہ اور اس ازلی مکالمے کو جو آپ کو اس وقت حاصل ہوا تھا، لوگوں تک پہنچا دیں۔ اس کے جواب میں آپؐ نے فرمایا تھا کہ میں پڑھا ہوا نہیں ہوں، (مَا اَنَا بِقَارِئٍ) یعنی کلام قدیم اور قولِ ازلی کو اپنی جسمانی اور حادث زبان سے ادا کرنے کی طاقت نہیں رکھتا۔ اس پر جبرئیلؑ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو سکھایا کہ وہ کس طرح اس حادث زبان سے کلامِ ازلی کو لوگوں تک پہنچائیں۔ یہی وجہ تھی کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو جبرئیل سے بڑی محبت تھی۔

اس کے بعد حضرت نے اس بارے میں وہ وہ باتیں بیان کیں کہ ہماری عقلیں حیرت زدہ ہو گئیں اور تقریباً سارا دن اس بیان کو جاری رکھا۔ اس بیان میں اس قدر اسرار پائے جاتے ہیں کہ اُن کا لکھنا روا نہیں۔ واللہ تعالیٰ اعلم۔

۳۷۔ حدیث اَرَأَیْتَکُمْ لَیْلَتَکُمْ هٰذِهٖ

پھر میں نے حضرت سے حدیث اَرَأَیْتَکُمْ لَیْلَتَکُمْ هٰذِهٖ کے متعلق دریافت کیا جس میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک سو سال تک اس قرن کے ختم ہو جانے کی طرف اشارہ فرمایا ہے۔

حضرت نے فرمایا کہ آنحضرت صلعم نے اپنی وفات سے تھوڑا ہی عرصہ پہلے یہ حدیث فرمائی تھی درحقیقت یہ آپؐ کی روحِ مبارک کا کلام ہے جو آپؐ کی ذاتِ کریمہ کی تعزیت کر رہی اور اسے تسلّی دے رہی ہے کیونکہ آپؐ کو قربِ وفات کا علم ہو چکا تھا، تو آپؐ کی روح نے اس پوشیدہ راز کا اظہار کیا تاکہ آپؐ کی ذات کو تسلّی ہو جائے۔

مؤلف کہتا ہے کہ حضرتؒ نے سچ فرمایا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ حدیث وفات سے تھوڑا ہی عرصہ پہلے فرمائی کیونکہ امام مسلم نے اپنی صحیح میں جابر رضی اللہ عنہ سے روایت کی ہے کہ یہ واقعہ آنحضرت صلی اللہ علیہ

ف جابرؓ: جابر بن عبداللہ بہت پایہ کے صحابی تھے، انھوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ نو غزوات میں شرکت کی، جنگِ بدر اور اُحد میں انھوں نے شرکت نہیں کی۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے لیے لیلۃ البعیر میں پچیس مرتبہ دعا مغفرت کی، ان کی وفات ۷۳ھ و ۷۷ھ میں ہوئی۔

وسلم کی وفات سے ایک ماہ پہلے کا ہے۔ اس اُمّی امام کا کیا کہنا۔ یہ شمائلِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم سے کیا خوب واقف تھا۔

پھر میں نے حضرت سے دریافت کیا اور میرے سوال کرنے کا اصل مقصد بھی یہی تھا، کیا اس حدیث سے استدلال کرتے ہوئے ہم کو ان لوگوں کی تکذیب کرنا صحیح ہوگا جو اس قرن کے گزر جانے کے بعد بھی صحبتِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کا دعویٰ کریں جس طرح کہ ان لوگوں کی تکذیب کی جاتی ہے جو دو سو سال بعد یا اسی طرح جو ۶۰۰ سال بعد یا آٹھویں صدی میں صحبت کا دعویٰ کریں۔ چنانچہ ملاحظہ ہو عکراش[1] اور معمر المغربی[2] اور رتین[3] (ص۔ رتن) ہندی، حافظ ابن حجر نے اپنی کتاب الاصابہ (فی معرفۃ الصحابہ) میں صحابہ کے بیان میں اس پر خوب بحث کی ہے اسی طرح ان کے شاگرد شمس الدین السخاوی[4] نے بھی الفیہ فی اصطلاح الحدیث کی شرح میں اس پر بحث کی ہے اور حافظ سیوطی نے بھی اپنی کتاب الحاوی فی الفتاوی میں۔

حضرت نے فرمایا صحابہ کی تعداد کا احاطہ نہیں ہو سکتا کیونکہ کچھ تو آپؐ کی وفات سے پہلے دنیا میں منتشر ہو گئے تھے اور کچھ وفات کے بعد اور ایک جماعت اطرافِ دنیا میں چکر لگاتی ہوئی چلی گئی۔ حدیث مذکورہ عام معنوں میں ہے جس سے مراد وہ خاص صحابہ ہیں جو لوگوں میں صحابی ہونے کے لحاظ سے مشہور و معروف ہیں۔ کشف اور عیان سے تو یہی معلوم ہوتا ہے!

اس کے بعد میں نے حضرت سے دریافت کیا کہ کیا جراجہ کے لوگ صحابی تھے۔ جیسا کہ لوگوں کا خیال ہے اور وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آنحضرتؐ کی زندگی میں آتے اور آپؐ نے بربری زبان میں ان سے گفتگو

---

[1] عکراشؓ بن ذویب بن حرقوص: ابن عبدالبرؒ نے استیعاب میں لکھا ہے کہ انھوں نے صرف ایک حدیث روایت کی ہے مگر ابن حجر تہذیب التہذیب میں لکھتے ہیں کہ انھوں نے دو حدیثیں روایت کی ہیں۔ یہ صحابی تھے۔ جنگِ جمل میں حضرت عائشہؓ کے ساتھ تھے۔ سو سال عمر پائی۔

[2] معمر مغربی: ان کا حال معلوم نہ ہو سکا۔

[3] رتین: اصل کتاب میں اسی طرح دیا گیا ہے۔ مولوی عاشق صاحب نے اپنے ترجمہ میں تین لکھا ہے اور یہ سب غلط ہے۔ اصل نام رتن ہے اور یہ شخص بابا رتن ہندی کے نام سے مشہور ہے یہ شخص بھٹنڈہ کا رہنے والا تھا جس کے متعلق کہا جاتا ہے کہ اس نے تقریباً آٹھ سو سال عمر پائی اور صحابی تھا، لیکن ابن حجر نے اس کا رد کیا ہے

[4] شمس الدین سخاوی: شمس الدین محمد بن عبدالرحمٰن سخاوی متوفی ۹۰۲ھ ۱۴۹۶ء۔ کاتب جلبی مصنف کشف لکھتے ہیں کہ الفیہ کی شرحوں میں یہ بہترین شرح ہے۔

کی۔ اس حکایت کا ذکر شہاب الدین[1] خفاجی نے شرح شفاء میں کیا ہے، لیکن کوئی متصل سند بیان نہیں کی اور کئی ایک آئمہ نے اس واقعہ کو عجیب و غریب خیال کیا ہے۔

حضرت نے فرمایا: یہ لوگ صحابی نہیں ہیں، اہل بصیرت پر نورِ صحبت مخفی نہیں رہتا بلکہ تمام مغرب میں کوئی صحابی نہیں ہے۔ واللہ تعالیٰ اعلم۔

یہ سب حضرت سے ہم نے ان احادیث کے متعلق سنا جو ہمیں مشکل دکھائی دیں۔ ہم اتنے پر ہی اکتفا کرتے ہیں کیونکہ اسی قدر مرید کے لیے کافی ہے۔ واللہ اعلم۔

---
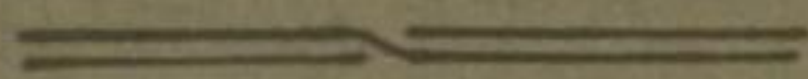
[1] شہاب الدین خفاجی: احمد شہاب الدین خفاجی شارح شفا عیاض۔ انھوں نے یہ شرح ۱۰۵۸ھ، ۱۶۴۸ء میں ختم کی، انھوں نے بہت سی تصانیف کی ہیں، مکمل فہرست نہ ہونے کی وجہ سے مجھے جراجہ کا قصہ خفاجی میں نہ مل سکا البتہ مصادرہ کا قصہ ج ۱: ۵۲۲ پر دیا ہے کہ یہ لوگ آئے۔ جب مسجد نبوی میں داخل ہوئے اور یہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو پہچانتے نہ تھے تو اپنی زبان میں کہا "من ابوان ایران" یعنی تم میں کون رسول اللہ ہیں۔ مگر کوئی صحابی اس کا مطلب نہ سمجھ سکا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان ہی کی زبان میں جواب دیا "اشکدادر" یعنی ادھر آؤ۔ اس کے بعد وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے اپنی زبان میں دیر تک باتیں کرتے رہے اور ایمان لاکر واپس چلے گئے۔

دوسرا باب

قرآنی آیات اور قرآنی آیات میں سریانی الفاظ کی تشریح۔ پھر سورتوں کے ابتدائی حروف مثلاً ص۔ ق۔ یٰس۔ طٰہٰ کٓھٰیٰعٓصٓ۔ الٓمٓ۔ الٓر کی تفسیر اور ان کے علاوہ دیگر اسرارِ الٰہیہ کا بیان جن کا علم آپ کو اس باب میں ہو جائیگا۔

۱- فَلَمَّآ اٰتٰهُمَا صَالِحًا جَعَلَا لَهٗ شُرَكَآءَ فِيْمَآ اٰتٰهُمَا فَتَعٰلَى اللّٰهُ عَمَّا يُشْرِكُوْنَ۔ (سورۂ اعراف آیت : ۱۹۰)

اللہ تعالیٰ نے آدم اور حوّا، کے قصّہ میں فرمایا ہے فَلَمَّآ اٰتٰهُمَا صَالِحًا جَعَلَا لَهٗ شُرَكَآءَ فِيْمَآ اٰتٰهُمَا فَتَعٰلَى اللّٰهُ عَمَّا يُشْرِكُوْنَ۔ (جب اللہ نے انہیں صالح لڑکا عطا فرمایا تو انھوں نے اللہ کے دیے ہوئے میں اس کے شریک بنا لیے۔ اللہ کی ذات ان کے تجویز کردہ شرک سے بلند ہے)

میں نے عرض کیا کہ حضرت آدم علیہ السلام اللہ کے نبی اور پیارے ہیں وہ اللہ کے لیے کیسے شریک تجویز کر سکتے ہیں؟

حضرت نے فرمایا: یہاں تو بیٹوں اور اولاد کے لیے باپ کو عتاب ہوا ہے (یعنی کیا ان انسانوں نے جو حضرت آدم کی اولاد ہیں اور عتاب ہے حضرتِ آدم کو) مثال کے طور پر ایک شخص کا باغ ہے جس میں مختلف قسم کے پھل اور میوے ہیں زید کی اولاد آکر پھل توڑتی ہے اور باغ کو ویران کر دیتی ہے اس پر باغ کا مالک زید کے پاس آکر اس سے جھگڑتا ہے اور اسے عتاب کرتا ہے کہ تو نے میرا باغ ویران کر دیا اور میرا

پھل کھا لیا اور تونے ایسا ایسا کیا۔ اسی طرز پر حضرت آدم کے قصہ میں حضرت آدم کو عتاب ہوا ہے، میں نے یہ جواب ابتدائی زمانے میں حضرت سے سُنا تھا۔

مؤلف کہتا ہے کہ حضرت عبداللہ بن عباس جو حبرِ اُمت کہلاتے ہیں، اُن کا یہی قول ہے۔ حافظ سیوطی نے اس قول کو اپنی کتاب "الدُرّ المنثور فی تفسیر القرآن بالماثور" میں نقل کیا ہے اور سید جرجانی[1] نے شرح مواقف میں اسے ہی اختیار کیا ہے۔ خدا اس سید جلیل سے راضی ہو، اسے اللہ اور اس کے انبیاء کے متعلق کس قدر علم حاصل ہے۔ اس تشریح کا استدلال یہ ہے کہ اس آیت کے خاتمہ کا سیاق صرف کفار کے متعلق درست بیٹھ سکتا ہے کیونکہ جَعَلَا لَہٗ شُرَکَاءَ میں شُرَکَاءَ جمع کا صیغہ ہے جو صرف کُفّار کے متعلق درست ہو سکتا ہے۔

۲۔ اَتَجْعَلُ فِیْهَا مَنْ یُّفْسِدُ فِیْهَا وَیَسْفِكُ الدِّمَاءَ وَنَحْنُ نُسَبِّحُ بِحَمْدِكَ وَنُقَدِّسُ لَكَ (سورۂ بقرہ آیت ۳۰)

میں نے حضرت سے ملائکہ کا ذکر کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ کے اس فرمان کے متعلق دریافت کیا کہ اَتَجْعَلُ فِیْهَا مَنْ یُّفْسِدُ فِیْهَا وَیَسْفِكُ الدِّمَاءَ وَنَحْنُ نُسَبِّحُ بِحَمْدِكَ وَنُقَدِّسُ لَكَ اور عرض کیا کہ اس میں تو ایک قسم کی غیبت پائی جاتی ہے (جو گناہِ کبیرہ ہے) اور ملائکہ معصوم ہیں۔

حضرت نے فرمایا اس میں کوئی غیبت نہیں پائی جاتی اور نہ اُن سے سرزد ہو سکتی ہے کیونکہ وہ تو اللہ کے مکرم بندے ہیں، اُن کے کلام کا اصل مفہوم صرف اتنا ہے کہ اے خدا کیا تو اُن انسانوں کو اس دنیا میں خلیفہ بنانا چاہتا ہے جو تجھ سے حجاب میں ہیں، حالانکہ تیرے پاس وہ فرشتے موجود ہیں جو تجھ سے محجوب نہیں ہیں اور ان میں خلیفہ بننے کی صلاحیت بھی پائی جاتی ہے یعنی ہمیں خلیفہ بنانا چاہیئے، کیونکہ ہم تیرا مشاہدہ کرتے ہیں تیری قدر پہچانتے ہیں۔ لہٰذا تیری حکم عدولی نہیں کرتے اور محجوب تیری قدر نہیں جانتا اس لیے نافرمانی کرتا ہے بالفاظ دیگر انھوں نے یوں کہا کہ خدایا کیا تو ایسے انسانوں کو خلیفہ بنانا چاہتا ہے جو تجھے نہیں پہچانتے اور ہم تجھے پہچانتے ہیں اور یہ اُن کی طرف سے اپنے مبلغ علم اور عندیہ کے مطابق اطلاع دہانی تھی۔ اسی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے جواب میں فرمایا: اِنِّیْۤ اَعْلَمُ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ (میں وہ کچھ جانتا ہوں جو تم نہیں جانتے) یعنی تمہارا یہ خیال کہ محجوب میری قدر پہچان نہیں سکتا اور یہ کہ میری قدر صرف وہی پہچان سکتا ہے جو میرا مشاہدہ کر رہا ہو۔ یہ صرف تمہارے مبلغِ علم کے مطابق ہے مگر میرا علم اس سے کہیں بالا و بلند ہے کیونکہ میں محجوب کو طاقتور بنا دونگا

---

[1] سید جرجانی: سید شریف علی بن محمد جرجانی متوفیٰ ۸۱۶ھ ۱۴۱۳ء۔ انھوں نے مواقف فی علم الکلام مولفہ عضد الدین عبدالرحمٰن بن احمد کی شرح لکھی ہے۔

اور اپنے اور اس کے درمیان سے حجاب دور کردوں گا یہاں تک کہ اسے میری معرفت حاصل ہو جائے اور اسے میرے متعلق اس قدر علم حاصل ہو جائے جس کی تم میں قدرت نہیں ہے۔ اسی واسطے فرمایا: وَعَلَّمَ اٰدَمَ الْاَسْمَاۗءَ كُلَّهَا (آدم علیہ السلام کو تمام اسمار کا علم دیا) الآیات

اس پر میں نے سوال کیا کہ کیا اس آیت میں تمام ملائکہ کو خطاب کیا گیا ہے یا صرف ملائکہ ارضی کو؟ حضرت نے فرمایا کہ اس آیت میں صرف ملائکہ ارضی کو خطاب ہے۔

مؤلف کہتا ہے کہ مفسرین کی ایک جماعت کا جن میں حبرُ الامت حضرت عبداللہ بن عباسؓ شامل ہیں یہی قول ہے۔ چنانچہ ملاحظہ ہو تفسیر ثعلبیؒ وغیرہ۔

اس کے بعد حضرت نے فرشتوں اور ابلیس اور اس قصے کے متعلق تقریر جاری رکھی اور ایسی ایسی باتیں بیان کیں جن کے سمجھنے سے عقول قاصر ہیں۔ واللہ تعالیٰ اعلم

میں نے حضرت کو یہ بھی کہتے ہوئے سنا کہ فرشتوں نے بنی آدم کے محجوب اور اس کے خود رائے ہونے کو "خلیفہ" کے لفظ سے سمجھا اسی لیے تو یہاں تک کہہ دیا کہ اَتَجْعَلُ فِيْهَا مَنْ يُّفْسِدُ فِيْهَا کیونکہ خلیفہ کی شان یہی ہے کہ وہ خود رائے ہو اور غیر سے منقطع ہو، لہٰذا وہ تدبیر، انجام کا علم اور مصلحتوں میں غور و فکر کو اپنی ذات کی طرف منسوب کرتا ہے اور اللہ تعالیٰ سے اپنے آپ کو منقطع کر لیتا ہے اسی میں اس کی ہلاکت اور موت ہوتی ہے لہٰذا خلیفہ کے لفظ سے ہی انھوں نے یہ سمجھ لیا کہ انسان اللہ سے محجوب ہیں واللہ تعالیٰ اعلم۔

۳- اِتَّبِعُوْٓا اَحْسَنَ مَآ اُنْزِلَ اِلَيْكُمْ مِّنْ رَّبِّكُمْ (سورہ زمر آیت ۵۵)

میں نے حضرت سے آیت اِتَّبِعُوْٓا اَحْسَنَ مَآ اُنْزِلَ اِلَيْكُمْ مِّنْ رَّبِّكُمْ کے متعلق دریافت کرتے ہوئے عرض کیا کہ اس آیت سے تو یہ مفہوم نکلتا ہے کہ قرآن کا کچھ حصہ اَحْسَن نہیں ہے حالانکہ قرآن مجید تمام کا تمام اَحْسَن ہے۔ میں نے حضرت سے اس بارے میں علمار نے جو جوابات دیے ہیں، وہ بھی ذکر کر دیے مثلاً (۱) یہ کہ مظلوم کے لیے اس آیت کے مطابق کہ فَاعْتَدُوْا بِمِثْلِ مَا اعْتَدٰى عَلَيْكُمْ (جتنا ظلم اس نے کیا ہے اتنا تم بھی کرلو) انتقام لینا جائز ہے، مگر اس کے لیے احسن یہی ہے کہ وہ صبر کرے کیونکہ اللہ تعالےٰ فرماتے ہیں وَلَئِنْ صَبَرْتُمْ لَهُوَ خَيْرٌ لِّلصّٰبِرِيْنَ (اگر تم صبر کرو تو صبر یقیناً صابر لوگوں کیلئے بہتر ہے) اس کا مطلب یہ ہوا کہ بجائے سزا دینے کے معاف کر دیا کرو۔ عقوبت (سزا) یہاں ایک نیکی ہے

ے ثعلبی: ابواسحٰق احمد بن محمد بن ابراہیم ثعلبی نیشاپوری متوفی ۴۲۷ھ / ۱۰۳۵ء۔ ان کی تفسیر کا نام الکشف والبیان فی تفسیر القرآن ہے۔

مگر عفو اس سے بھی بہتر ہے یا (۲) احسن سے مراد ناسخ ہے اور حَسَن سے منسوخ (۳) اللہ تعالیٰ نے بیان فرمایا ہے کہ بعض بندگان مطیع ہیں اور بعض عاصی۔ لہٰذا ہمیں مطیع کی تابعداری کرنی چاہیئے۔ یہی اَحْسَن ہے (۴) اِتَّبِعُوْا اَحْسَنَ مَآ اُنْزِلَ اِلَیْکُمْ سے مراد یہ ہے کہ جن کاموں کے کرنے کا حکم دیا گیا ہے، ان کی تابعداری کرو۔ نہ کہ ان کی جن سے منع کیا گیا ہے (۵) عزیمت کے پیچھے جاؤ۔ رخصت کے پیچھے نہ جاؤ کیونکہ عزائم احسن ہیں اور رخصت حَسَن۔

علماء کے یہ پانچ جواب ذکر کرنے کے بعد میں نے عرض کیا ان جوابات کو آیت سے کوئی مناسبت بھی نہیں ہے پہلے جواب میں اس طرح کہ آیت کے آخری الفاظ اس بات کے متقضی ہیں کہ جو شخص اَحْسَنَ کی تابعداری نہ کرے گا اس پر خدا کا عذاب نازل ہونے کا ڈر ہے اور وہ ساحرین و کافرین میں سے ہوگا اور معاف نہ کرنیوالے پر ہم یہ حکم نہیں لگا سکتے۔

دوسرا جواب: اگر مراد یہ ہے کہ منسوخ پر عمل کرنا حَسَن ہے تو یہ درست نہیں کیونکہ جس پر عمل کرنا منسوخ قرار دیا گیا، اس پر عمل کرنا جائز نہیں ہے اور اگر تلاوت کے اعتبار سے منسوخ کو حَسَن قرار دیا جائے تو یہ بھی درست نہیں کیونکہ اس اعتبار سے ناسخ و منسوخ دونوں اَحسن ہیں۔

تیسرا جواب: عاصی کی تابعداری ہی جائز نہیں چہ جائیکہ اسے حَسَن قرار دیا جائے۔

چوتھا اور پانچواں جواب: یہی بات ممنوع امور کے متعلق کہی جا سکتی ہے اب رہی رخصت تو اگرچہ اسے رخصت کہا جا سکتا ہے مگر اس کا مرتکب ان اوصاف کا مستحق قرار نہیں دیا جا سکتا جن کا ذکر آیت کے آخر میں آیا ہے بعینہٖ اس معاف نہ کرنے والے کی طرح جس کا ذکر پہلے جواب میں ہو چکا۔ کیونکہ آیت کے آخر میں مذکورہ اوصاف اس پر چسپاں نہیں ہو سکتے۔ مختصر یہ کہ اَحْسَن کا لفظ پہلے اور پانچویں جواب میں آیت کے آخری حصے سے مناسبت نہیں رکھتا اور نہ باقی جوابات میں حَسَن کا لفظ مناسبت رکھتا ہے۔ لہٰذا اس اَحْسَن میں اشکال ہوا۔

حضرت نے فرمایا: ان جوابات میں سے کسی میں بھی نہ آیت کا راز پایا جاتا ہے، نہ نور کا، اس آیت کا سِرّ اور نُور یہ ہے کہ "میرے بندو! کتاب اور رسول ہونے کے اعتبار سے جو چیز تم پر اتاری گئی ہے اس میں سے اَحْسَن کی تابعداری کرو۔ لہٰذا جتنی کتابیں اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہم پر اتاری گئیں اُن میں سے اَحْسَن قرآن ہے اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم اَحْسَن رسول۔ لہٰذا احسن اللہ کی طرف سے پہلی اُتری ہوئی کتابیں ہیں بشرطیکہ ان میں تبدیلی واقع نہ ہو چکی ہو۔ نیز وہ تمام رسول بھی حَسَن ہیں جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلے مبعوث ہوئے۔

میں نے عرض کی کہ کتب الٰہیہ میں سے تو توراۃ اور انجیل بھی ہیں اور آیت میں اِلَیْکُمْ (تم پر) کا لفظ اس کے منافی ہے کیونکہ اس سے تو یہ مراد ہوگی کہ اَحْسَن کی طرح حَسَن بھی ہم پر اتاری گئی، حالانکہ توراۃ یہود پر نازل ہوئی اور انجیل یہود و نصاریٰ دونوں پر۔

حضرت نے فرمایا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت تمام عرب، یہود، نصاریٰ اور دیگر اقوام عالم کے لیے عام ہے لہٰذا قرآن اَحْسَن ہے وہ ان سب لوگوں کی طرف اتارا گیا ہے اور وہ کتبِ الٰہیہ جو حَسَن ہیں وہ اپنی اپنی قوم کی طرف اتاری گئیں۔ چنانچہ عربوں پر شریعتِ اسمٰعیل۔ یہود پر توراۃ اور نصاریٰ پر انجیل۔ لہٰذا اَحْسَن من حیث المجموع ان پر اتارا گیا اور یہ بات واضح ہے۔

مؤلف کہتا ہے کہ مفسّرین کی ایک جماعت نے بھی یہی قول بیان کیا ہے کہ اَحْسَن سے مراد قرآن ہے لیکن پوری بات حضرت کی تقریر سے واضح ہوتی ہے اور اس میں شک نہیں کہ یہ آخر آیت کے سیاق سے مناسبت رکھتا ہے اس لیے کہ جو قرآن اور رسول کی تابعداری نہ کرے گا اور ان سے کفر کرے گا وہ آیت کے آخر میں مذکورہ اوصاف کا مستحق ہوگا۔ واللہ تعالیٰ اعلم۔

۴۔ قرآن مجید کی متعدد آیات میں سمع کو بصر پر مقدّم کیوں لایا گیا ہے

میں نے حضرت سے دریافت کیا کہ کیا وجہ ہے کہ ان آیات میں سمع کو بصر پر مقدّم لایا گیا ہے مثلاً جَعَلَ لَکُمُ السَّمْعَ وَالْاَبْصَارَ وَالْاَفْئِدَۃَ لَعَلَّکُمْ تَشْکُرُوْنَ (سورۂ نحل آیت ۷۸) اَنْشَاَ لَکُمُ السَّمْعَ وَالْاَبْصَارَ۔ اِنَّ السَّمْعَ وَالْبَصَرَ وَالْفُؤَادَ کُلُّ اُولٰٓئِکَ کَانَ عَنْہُ مَسْئُوْلًا (سورۂ بنی اسرائیل آیت ۳۶) وغیرہ آیات۔ حالانکہ بصارت کا فائدہ زیادہ ہے اور اس کا نفع زیادہ عام ہے کیونکہ دن اور رات کا فائدہ بینا آدمی سے مخصوص ہے مگر ایسا شنوا آدمی جس کی بینائی نہ ہو۔ اس کے نزدیک تو دن اور رات، روشنی اور تاریکی اور سورج اور چاند برابر ہیں اور وہ ان درخشندہ سیارگان کا نور معلوم نہیں کر سکتا۔ یہی بات خدا کی پیدا کردہ عجیب وغریب اشیاء کے متعلق ہے کہ وہ ان کو دیکھ کر عبرت حاصل نہیں کر سکتا، کیونکہ ان میں سے اکثر مخلوقات کی شکل میں ہوتی ہیں اور ان کی ترکیب کی خوبصورتی اور اُن کی صورتیں صرف بصارت سے ہی معلوم کی جاتی ہیں۔ چنانچہ بنی نوع انسان، حیوانات، قسم قسم کی نباتات اور پھولوں کی خوبصورتی کا ادراک صرف بصارت سے ہی ہو سکتا ہے۔ اسی طرح آسمانوں کی تخلیق، ان کا بلند اور بغیر ستون کے ہونا اور ستاروں سے ان کو مزیّن کرنا وغیرہ لاتعداد فوائد ایسے امور ہیں جن کا ادراک صرف بصارت سے ہوتا ہے لہٰذا بظاہر تو یوں معلوم ہوتا ہے کہ بصارت زیادہ قوی ہے لہٰذا حق یہ تھا کہ اسے

سمع پر مقدم لایا جائے۔

حضرت نے فرمایا: جو کچھ تم نے بصارت کے متعلق بیان کیا ہے درست ہے، مگر سمع میں ایک ایسا فائدہ پایا جاتا ہے جو ان تمام کے قائم مقام ہو سکتا ہے بلکہ ان سب پر فوقیت لے گیا ہے یعنی یہ کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور ان کا بھیجنے والا اللہ تعالیٰ اور تمام وہ غیبی امور جن پر ایمان لانا ضروری ہے ان سب کا ادراک صرف سمع سے ہی ہو سکتا ہے۔ اس سے یہ لازم آیا کہ تمام شرائع سمع پر موقوف ہیں اس کی تشریح یوں ہے کہ اگر فرض کر لیا جائے کہ تمام بنی نوع انسان قوتِ سمع سے عاری ہیں تو جب ان کے پاس اللہ کی طرف سے پیغامبر آئے گا اور کہے گا کہ مجھے اللہ نے رسول بنا کر تمہاری طرف بھیجا ہے تو یہ آواز دکھائی تو دے گی نہیں اور ان کے پاس قوتِ سامعہ بھی نہ ہوگی جس سے رسول کے الفاظ سن سکیں، اس طرح رسول کا آنا بیکار ہو جاتا ہے۔ پھر وہ اگر انہیں کہے گا کہ میری صداقت کی علامت فلاں فلاں معجزہ ہے تو وہ اُسے بھی نہ سن سکیں گے۔ لہٰذا یہ قول بھی رائیگاں جائے گا۔ علیٰ ہذا القیاس اگر رسول انہیں یہ کہے گا کہ اللہ تعالیٰ نے تمہیں حکم دیا ہے کہ تم مجھ پر، اللہ کے تمام رسولوں پر، اس کے فرشتوں، اس کی کتابوں اور یوم آخرت پر ایمان لاؤ، تو لوگ یہ بات بھی نہ سُن سکیں گے اور رسول کی یہ بات بھی رائیگاں جائے گی، پھر جب یہ کہے گا کہ اللہ نے تم پر یہ یہ بات واجب قرار دی ہے اور فلاں فلاں بات حرام کی ہے اور فلاں فلاں بات جائز کی ہے تو وہ یہ بھی نہ سنیں گے اور رسول کا کہنا رائیگاں جائے گا لہٰذا معلوم ہو گیا کہ اگر قوتِ سامعہ نہ ہو تو نہ رسول کی پہچان ہو سکے گی نہ بھیجنے والے کی اور نہ غیب و عیان پر ایمان لایا جا سکے اور نہ ہی کسی شریعت کی صحیح تابعداری ہو سکے گی جس سے یہ لازم آتا ہے کہ کوئی جزا و سزا ہی نہیں ہے (تو پھر جنّت و دوزخ کیسی؟) لہٰذا بعثتِ رسول کیسی؟ کیونکہ اللہ تعالیٰ تو یوں فرماتا ہے کہ مَا كُنَّا مُعَذِّبِيْنَ حَتّٰى نَبْعَثَ رَسُوْلًا (جب تک ہم رسول کو نہ بھیج لیں، کسی کو عذاب نہیں کرنے کے) اور جب سمع ہی نہیں تو بعثت کیسی؟ مختصر یہ کہ اگر بنی آدم کو قوتِ سامعہ نہ دی جائے تو شریعت کی تکلیف ہی اُٹھ جائے اور وہ چوپایوں کے برابر ہو جائیں۔ اسی قوتِ سامعہ کی بدولت ہی انہیں بلند درجہ حاصل ہوا ہے اور ان میں سے جو لوگ ملاءِ اعلیٰ سے جا ملے اسی کی بدولت جا ملے۔ لہٰذا یہ بات واضح ہو گئی کہ سمع کا فائدہ زیادہ زوردار اور اس کا نفع زیادہ عام ہے کیونکہ خداوندی اسرار اسی سے وابستہ ہیں۔ اسی لیے مذکورہ بالا آیات میں سمع کو بصر پہ مقدم لایا گیا ہے کیونکہ ان میں ایک طرح سے احسان جتایا گیا ہے اسی لیے قوتِ سامعہ عطا کرنے کا احسان قوتِ باصرہ کے احسان سے زیادہ قوی ہے۔ واللہ اعلم۔

مؤلف کہتا ہے: خدا آپ کو توفیق دے ذرا اس جواب کی خوبی پر غور کریں۔ کیونکہ جب میں نے یہ جواب سُنا تو میں اپنے اوپر تعجب کرنے لگا کہ یہ جواب نہایت واضح ہو جانے کے باوجود کس طرح مجھ پر مخفی رہا۔ اِلاَّ اللہُ سُبْحَانَہٗ۔[۱]

۵۔ آیات وَالَّذِيْنَ اِذَا فَعَلُوْا فَاحِشَةً اَوْ ظَلَمُوْٓا اَنْفُسَهُمْ ذَكَرُوا اللّٰهَ فَاسْتَغْفَرُوْا لِذُنُوْبِهِمْ (سورۂ آل عمران آیت ۱۳۵) اور وَمَنْ يَّعْمَلْ سُوْٓءًا اَوْ يَظْلِمْ نَفْسَهٗ ثُمَّ يَسْتَغْفِرِ اللّٰهَ يَجِدِ اللّٰهَ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا۔ (سورۂ نساء آیت - ۱۱) میں ظلم نفس سے کیا مراد ہے؟ کیونکہ دوسری آیت میں "برا کام کرنا" جس کا پہلے ذکر آچکا ہے اسی میں ظلم نفس بھی آجاتا ہے اور پہلی آیت میں فعل فاحشہ میں ظلم نفس شامل ہے لہٰذا ظلم ان امور سے زیادہ عام ہے جن کا ذکر پہلے کیا گیا اور اعم کا عطف لفظ اَوْ سے نہیں آتا۔ اس پر میں نے مفسّرین کے اقوال نقل کئے اور یہ کہ بعضوں نے عمل سوء اور فعل فاحشہ سے مراد گناہِ کبیرہ لی ہے اور ظلم نفس سے صغیرہ گناہ، لیکن میرا خیال ہے کہ عمل سوء اور فعل فاحشہ سے مطلق معصیت مراد لی جائے اور ظلمِ نفس سے معصیت پر اصرار مراد لی جائے کیونکہ بظاہر تو یہ کوئی عمل نہیں ہے اس کی تشریح یہ ہے کہ مثلاً کسی نے زنا پر اصرار کیا تو اسے یہ کہنا درست نہ ہوگا کہ وہ زانی ہے اور اپنے نفس کی خواہشات پوری کرتا ہے بلکہ یوں کہیں گے کہ وہ زنا کے کرنے کا عزم کر چکا ہے اور اسی عزم اور اصرار کی وجہ سے اپنے نفس پر ظلم کرنے والا ٹھہرا کیونکہ اس نے اپنے نفس کو عذاب کا مستوجب قرار دیا اور پھر بھی نفس کی خواہشات پوری نہ ہوئیں۔ پھر ہم نے اس آیت پر بہت بحث کی اور حضرت نے تین جواب بھی دیے اور ان پر بھی بحث ہوئی۔

اس کے بعد حضرت ایک لمحہ کے لیے خاموش ہوگئے، پھر فرمایا سیّدی محمد بن عبدالکریم البصری فرماتے ہیں کہ اس آیت کا شانِ نزول یہ ہے کہ آنحضرت صلّی اللہ علیہ وسلّم کے عہد میں اور جاہلیت میں بھی اہلِ عرب ظالم کی حمایت کرتے اور اُسے الزام سے بری کرنے کی کوشش کرتے تھے حالانکہ انہیں علم ہوتا کہ اس شخص نے ایسا کیا ہے مثلاً کسی نے چوری کی اور انہیں اس کا علم بھی ہو مگر پھر بھی اس کی طرف سے وہ جھگڑیں اور چوری سے انکار کریں تو اس صورت میں اصل چور تو فعلِ فاحشہ اور سُوءِ عمل کا مرتکب ہوا اور جھگڑنے والے نے جھوٹی گواہی اور باطل کی وجہ سے اپنے نفس پر ظلم کیا اور حضرت نے یہ بھی فرمایا کہ سیّدی

---

[۱] بندۂ حقیر کہتا ہے کہ حضرت دباغ رحمۃ اللہ کا جواب اصحابِ معرفت کا جواب ہے ورنہ اس کا ایک اور مختصر سا جواب ہے اور وہ یہ کہ واؤ مطلق جمع کے لیے آتی ہے۔ ترتیب کے لیے نہیں اور اس سے تمام اعتراضات اٹھ جاتے ہیں۔ ۱۲

محمد عبدالکریم بات کہنا جانتے ہیں۔ مجھے یہ تفسیر نہایت پسند آئی کیونکہ یہ اس آیت کے سیاق کے عین مناسب تھی۔ وَلَا تُجَادِلْ عَنِ الَّذِيْنَ يَخْتَانُوْنَ اَنْفُسَهُمْ (سورۂ نساء آیت ۱۰۷)
هَاۤاَنْتُمْ هٰۤؤُلَاۤءِ جَادَلْتُمْ عَنْهُمْ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا فَمَنْ يُّجَادِلُ اللّٰهَ عَنْهُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ (سورہ نساء آیت ۱۰۹)

جس وقت حضرت سے اس آیت پر بحث ہو رہی تھی ہم فاس کے دروازوں میں سے دروازۂ باب الحدید سے باہر تھے اور سیدی محمد بن عبدالکریم مذکور اس وقت بصرے میں تھے، انھوں نے ہمارا کلام سنا اور ہماری مراد سمجھ گئے اور اپنی جگہ سے ہی ہمیں جواب دیا۔ خدا اپنے اولیاء کرام سے راضی ہو۔ اتنی دور کی مسافت کے باوجود ہماری گفتگو کو سُن لینے کے راز کی تشریح عنقریب کی جائے گی، واللہ تعالیٰ اعلم۔

۶۔ وَاَلْزَمَهُمْ كَلِمَةَ التَّقْوٰى وَكَانُوْۤا اَحَقَّ بِهَا وَاَهْلَهَا (سورہ فتح آیت ۲۶)

میں نے حضرت سے اس آیت کے متعلق پوچھا: وَكَانُوْۤا اَحَقَّ بِهَا وَاَهْلَهَا حالانکہ اسلام لانے سے پہلے احقیت اور اہلیت ہی منتفی ہوتی ہے۔

حضرت نے فرمایا کہ یہ احقیت اور اہلیت اس پہلے وعدہ اور قضاء سابق کے مطابق ہے جو مخلوقات کی تخلیق سے پہلے کیا گیا تھا واللہ تعالیٰ اعلم

۷۔ وَاَنَّهٗۤ اَهْلَكَ عَادَا ِۨالْاُوْلٰى (سورہ نجم آیت ۵۰)

میں نے حضرت سے وَاَنَّهٗۤ اَهْلَكَ عَادَا ِۨالْاُوْلٰى کے متعلق پوچھا کہ کیا کوئی اور دوسری قوم عاد بھی تھی؟ میں نے یہ بھی ذکر کیا کہ مفسرین کے کلام میں اس مقام پر بڑا اضطراب پایا جاتا ہے کیونکہ وہ کہتے ہیں کہ ہُود علیہ السلام ہی کو عاد کی طرف بھیجا گیا اور وہ ابراہیم علیہ السلام سے بہت پہلے ہوتے ہیں پھر مفسرین اس قوم کی ہلاکت کے قصے میں لکھتے ہیں کہ ان کی جماعت کا وفد بارش کی دعا کے لیے مکہ آیا حالانکہ مکہ کو ابراہیم اور اسمٰعیل علیہما السلام نے بنایا تھا جس کی وجہ سے بہت سے لوگوں پر یہ قصہ مشتبہ ہوگیا یہاں تک کہ بعض نے

یوں کہا کہ صرف ایک ہی قوم عاد تھی اور انہی کو ثمود کے اعتبار سے "پہلی" کہا گیا ہے۔ ایک اور جماعت کی رائے ہے کہ عاد دو قومیں تھیں پہلی تو وہ تھی جن کی طرف ہود علیہ السلام بھیجے گئے اور انہیں ہوا کا عذاب ہوا اور دوسری عاد کی طرف ایک اور نبی بھیجا گیا اور انہیں ہوا کا نہیں بلکہ کسی اور چیز کا عذاب ہوا ان ہی میں سے کچھ لوگوں کا وفد مکہ آیا تھا اور انھوں نے اس نبی اور عذاب کی تعیین نہیں کی۔ اس صورت میں سورۂ احقاف میں جو ذکر کیا گیا ہے اس کا اشکال پیدا ہوتا ہے کیونکہ اس قصے میں اصحاب وفد کو ہوا کا عذاب دینے کا ذکر ہے اور ان کے نبی ہود علیہ السلام ہیں کیونکہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں وَاذْكُرْ اَخَا عَادٍ ایک دوسری آیت میں فرمایا: وَاِلٰی عَادٍ اَخَاهُمْ هُوْدًا۔ ہمارا یہ کہنا کہ سورۂ احقاف کا قصہ اصحاب وفد کا ہی ہے اس کی دلیل وہ حدیث ہے جو امام احمدؒ نے حسن اسناد کے ساتھ حارث[1] بن حسان بکری سے روایت کی ہے کہ میں اور علاء۔ الحضرمی[2] رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے۔

الحدیث اس حدیث میں ہے کہ میں نے کہا کہ میں اللہ اور اس کے رسول کی پناہ لیتا ہوں کہ کہیں میں عاد کے وفد کی طرح نہ بن جاؤں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ وفدِ عاد کا کیا قصہ ہے حالانکہ آپؐ کو خوب معلوم تھا مگر آپؐ مزہ لینے کی غرض سے پوچھ رہے تھے۔ میں نے عرض کیا کہ قومِ عاد میں قحط پڑا تو انھوں نے قیل بن عنز کو معاویہ بن بکر کے پاس مکہ بھیجا تاکہ بارش کے لیے دعا کریں چنانچہ وہ ایک ماہ تک اس کے ہاں مہمان رہا ایک ماہ گزرنے کے بعد اس نے جاکر بارش کے لیے دعا کی تو دو بدلیاں گزریں۔ اس نے کالی بدلی کو پسند کیا تو ہاتف نے آواز دی کہ لے لو۔ یہ تو راکھ ہے جو قومِ عاد میں سے کسی کو نہ چھوڑے گی۔ اس حدیث کے کچھ حصے کی روایت ترمذیؒ، نسائیؒ اور ابن ماجہ نے بھی کی ہے، ملاحظہ ہو ابن حجر ذیل سورہ احقاف۔ ایک اور روایت میں ہے کہ قیل بن عنز اور مرثد بن سعد قوم کے ستّر رؤسا کو لے کر نکلے اس زمانہ میں مکہ میں عمالقہ آباد تھے جن کا سردار معاویہ بن بکر تھا اور تمام قصہ بیان کیا ہے جس کے آخر میں ہے کہ مرثد بن سعد نے اپنی قوم سے کہا کہ بارش تب ہوگی جب تم اپنے رسول کی اطاعت کروگے۔ اس پر قیل نے معاویہ کو کہا کہ اسے روکے رکھو کہ کہیں ہمارے ساتھ نکل کر نہ جائے کیونکہ یہ تو ہودؑ پر ایمان لا چکا ہے اور اسے سچا جانتا ہے۔

---

[1] حارث بن حسان بکریؓ: حارث بن حسان بن کلاہ بکری صحابی ہیں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں آئے تو آنحضرت نے ان سے قومِ عاد کا قصہ پوچھا۔ کوفے میں رہتے تھے۔ بغوی کہتے ہیں کہ بادیہ میں رہتے تھے۔

[2] علاء۔ الحضرمیؓ: آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے بحرین کے گورنر مقرر ہوئے اور ابوبکرؓ اور عمرؓ نے انہیں اسی عہدے پر برقرار رکھا تاآنکہ ۱۴ھ ۶۳۵ء میں وفات پائی۔

حضرت نے فرمایا: (عاد دو قوموں کا نام ہے) دوسری عاد کی طرف ہود علیہ السلام کو ان انبیاء کی شریعت کی تجدید کے لیے بھیجا گیا تھا جو ان کی طرف پہلے بھیجے جا چکے تھے، اسی ہود کا قصہ قرآن مجید میں مذکور ہے انہی کی قوم کا ایک وفد مکہ آیا اور انہیں ریح عظیم کا عذاب دیا گیا اور وہ اسمٰعیل علیہ السلام کی اولاد میں سے تھے جن کا نسب نامہ یوں ہے: ہود بن عابر بن شیاع بن الحرث بن کلاب بن قیدار بن اسمٰعیل۔ دوسری قوم عاد تمام کی تمام حضرت اسمٰعیلؑ کی اولاد میں سے نہیں ہے بلکہ صرف ہود اور ان کا قبیلہ حضرت اسمٰعیل کی اولاد میں سے تھے قرآن مجید میں جو یہ فرمایا ہے کہ وَاِلٰی عَادٍ اَخَاهُمْ هُوْدًا یہ تغلیب کے طور پر فرمایا ہے کیونکہ ہود اور ان کا قبیلہ اکٹھے رہتے تھے اور اکٹھے ہی کوچ کرتے تھے۔ انہی میں سے شداد بن عاد تھا جس کا ستونوں والا بڑا خیمہ تھا حضرت نے فرمایا علماء کا خیال ہے کہ اِرم ذات العماد ایک شہر تھا جو جنّت کی شکل اور سونے کا بنا ہوا تھا اور علماء نے اس کا ایک لمبا چوڑا بیان دیا ہے حالانکہ بات یوں نہیں ہے بلکہ اِرم قبیلہ کا نام ہے اور "ذات العماد" اس کی نعت ہے یعنی "ستونوں والی عاد" اور یہ نام ان کے سردار کے بڑے خیمے کی وجہ سے پڑا۔ یا اس سے مراد ان تمام لوگوں کے خیموں کے عمود ہیں۔ کیونکہ میں نے ان کے مسکنوں کو دیکھا ہے اور حضرت نے جو بیان ان مساکن کا دیا وہ تقریباً وہی بیان تھا جو علماء نے احقاف کا دیا ہے پھر فرمایا کہ یہ شہر نو دن کی مسافت میں واقع ہے اور ان کا سردار عین وسط میں رہتا ہے اور جو شخص اسے ملنے کے لیے آتا وہ ننگے پاؤں اور ننگے سر کسی جہت سے بھی آتا ساڑھے چار دن کی مسافت خیموں کے درمیان چل کر آتا ہے کیونکہ وہاں کی بہت گنجان آبادی تھی اور جگہ کی تنگی تھی۔ خدا نے پانی اور چشمے ان کے لیے بھیجے جو دور دراز کے پہاڑوں سے بہ کر ان کی زمین کی طرف آتے۔ اسی پانی کی بدولت ان کی تمام کھیتی باڑی ہوتی، پھر فرمایا کہ ان کے سردار یا بادشاہ کا خیمہ ایک تیر۱؎ پرتاب زمین پر واقع تھا۔ خیمے کی میخوں اور ستونوں پر خالص سونے کے خول چڑھے ہوئے تھے اور اس کی رسیاں ریشم کی تھیں۔ میں نے سونے کے ٹکڑے زمین کے نیچے دبے ہوئے اب تک باقی پائے ہیں۔ انکے تمام خیموں پر سونا چڑھا ہوا تھا۔ اس زمانے میں کوئی خیمہ بھی جس میں وہ رہتے ہوں، سفید نہ تھا اور اسی قوم کی طرف اللہ تعالیٰ نے ہود علیہ السلام کو بھیجا جن کا نسب نامہ مذکور ہو چکا۔

مؤلف کہتا ہے شہر ارم ذات العماد کے متعلق جو کچھ حضرت نے بیان کیا اور اس کے متعلق جن بیانات کا آپ نے رد کیا، بڑے بڑے علماء مثلاً حافظ ابن حجر نے شرح بخاری میں اسی کو اختیار کیا

۱؎ اتنا رقبہ زمین جہاں تک پورے زور سے پھینکا ہوا تیر پہنچ سکے۔

ہے کیونکہ انھوں نے مدینہ مذکور کے قصّے کی طرف اشارہ کرنے کے بعد لکھا ہے کہ یہ عبداللہ بن لہیعہ[1] کی سند سے مروی ہے۔ مجاہد[2] سے بھی جو منقول ہے اس سے بھی ذات العماد کی دوسری تفسیر کی تائید ہوتی ہے مجاہد کہتے ہیں کہ وہ عمودوں والا یعنی خیموں والا تھا۔ اس کے علاوہ اور اقوال بھی ذکر کئے ہیں۔ ملاحظہ ہو سورۂ فجر۔ حضرت نے ہود علیہ السلام کا جو نسب نامہ بیان کیا ہے وہ محض کشف ہے کیونکہ آپ تو ایک عامی امّی تھے جسے تاریخ وغیرہ کا علم نہ تھا۔ اس لیے یہ مناسب نہ تھا کہ آپ کے ردّ میں ہودؑ کی نسبت کے متعلق مورخین کے اقوال پیش کیے جائیں کیونکہ وہ نسب نامے خبرِ واحد پر مبنی ہیں۔ بایں ہمہ ہود کے نسب میں خبرِ واحد میں بھی اضطراب پایا جاتا ہے چنانچہ بعض نے ان کا نسب نامہ یوں بیان کیا ہے: ہود بن عبداللہ بن رباح بن الجارود بن عاد بن عوص بن ارم بن سام بن نوح اور بقول بعض ہود بن شارخ بن ارفخشد بن سام بن نوح علیہ السلام۔ اس بناء پر وہ ابو عاد کے چچازاد بھائی ٹھہرے۔ مورخین کا خیال ہے کہ انہیں قوم عاد میں سے اس لیے خیال کیا جاتا ہے، حالانکہ وہ ان میں سے نہیں ہیں کہ وہ لوگ دوسروں کی نسبت آپ کی باتوں کو زیادہ سمجھتے تھے اور ان کے حالات کو زیادہ پہچانتے تھے اور آپؑ کی تابعداری کرنے کی طرف زیادہ راغب تھے۔

حضرت نے فرمایا پہلی عاد نوح علیہ السلام کی قوم تھی۔ خدا نے ان کی طرف ایک نبی بھیجا جس کا نام ھُوْیِن (بہاءِ مضمومہ جو قریب بہمزہ ہے۔ بین بین اور واؤ ساکن جس کے بعد یا رہے) حضرت نے فرمایا وہ ایک مستقل شریعت والے رسول ہیں، برخلاف اس ہود کے جو عادِ ثانیہ کی طرف بھیجے گئے اس لیے کہ وہ تو اپنے

---

[1] عبداللہ بن لُهَیعہ: عبداللہ لُهَیعہ (یا لھیعہ) بن عقبہ بن فراعان مصری فقیہ اور قاضی تھے، انھوں نے اعرج، ابی الزبیر وغیرہ سے روایت کی اور ان سے ان کے پوتے احمد بن عیسٰی اور بھتیجے لھیعہ بن عیسٰی اور ثوری وغیرہ نے کی۔ بہتر تابعیوں سے ان کی ملاقات ہوئی۔ یحیٰی بن سعید انہیں بہت حقیر سمجھتے تھے، ابن مہدی کہتے ہیں کہ میں ان سے کچھ بھی حاصل نہیں کرنا چاہتا پھر کہتے ہیں کہ میں سوائے ابن مبارک کی سماع کے اس کی کسی بات پر اعتماد نہیں کرتا۔ ابن معین کہتے ہیں کہ ابن لہیعہ ضعیف ہے اس کی حدیث سے استدلال نہیں کیا جا سکتا۔ ابو جعفر طبری تہذیب الآثار میں کہتے ہیں کہ آخر عمر میں ان کی عقل میں فتور آگیا تھا مگر بعض لوگوں نے انہیں ثقہ بھی قرار دیا ہے مفصل بحث کے لیے دیکھیں تہذیب التہذیب ج ۵ ص ۳۷۳ تا ص ۳۷۹) ذہبی تذکرۃ الحفاظ میں کہتے ہیں: یروی حدیثہ فی المتابعات ولا یحتج بھا (اس کی حدیث تائید کے طور پر لائی جا سکتی ہے مگر علیحدہ طور پر اس سے استدلال نہیں کیا جا سکتا)

[2] مجاہد: مجاہد بن جبر: تابعی ہیں بڑے پایہ کے متقی اور عالم تھے۔ ۱۰۲ھ یا ۱۰۳ھ میں تراسی برس کی عمر میں وفات پائی۔

سے پہلے رسولوں کی شریعت کی تجدید کرنے والے تھے۔ حضرت نے فرمایا کہ ہر مستقل رسول کے لیے ایک کتاب کا ہونا ضروری ہے اور فرمایا کہ حضرت ہوٗید مذکور کی بھی کتاب ہے جو مجھے حفظ ہے جیسے تمام رسولوں کی کتابیں حفظ ہیں۔ میں نے عرض کیا؛ کیا آپ ان کو گن سکتے ہیں۔ فرمایا: یاد ہوں اور پھر گن نہ سکوں؛ سنو! پھر آپ نے ایک ایک کر کے کتابیں گننا شروع کیں اور فرمایا کہ کوئی ولی اس وقت تک ولی نہیں ہو سکتا جب تک اس کا ایمان ان تمام کتابوں پر تفصیلاً نہ ہو۔ کیونکہ اس کے لیے اجمالی ایمان کافی نہیں۔ میں نے عرض کیا؛ کیا یہ حکم ان تمام اولیاء پر وارد ہوتا ہے جنہیں اللہ تعالیٰ نے فتح عطا کی ہو؛ حضرت نے فرمایا نہیں۔ اس حکم کا اطلاق صرف ایک پر ہوتا ہے اور وہ غوث ہے۔

حضرتِ دباغ غوث وقت تھے

اس وقت مجھے معلوم ہوا کہ حضرت غوث ہیں اور آپ کے علوم سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے کیونکہ اگر میں ان تمام باتوں کو تحریر میں لاؤں جو میں نے حضرت سے سنیں تو کئی ایک کتابیں بھر جائیں آپ نے کئی بار فرمایا کہ میں جب تم لوگوں سے باتیں کرتا ہوں تو تمہاری عقلوں کی طاقت کے مطابق کرتا ہوں۔

پھر حضرت نے فرمایا کہ پہلی قومِ عاد نے ہوٗید علیہ السلام کے امتیوں کو پتھروں اور آگ سے ہلاک کر دیا۔ قصہ یوں ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے ان پر آسمان سے پتھر برسائے اور وہ بھاگنے لگے۔ پھر اللہ نے آگ نکالی جس نے انہیں جلا دیا۔

نوح علیہ السّلام سے پہلے سات سو رسول آئے

میں نے حضرت کو فرماتے ہوئے سنا کہ حضرت نوح علیہ السلام سے پہلے سات سو رسول گزرے ہیں جن کے واقعات عجیب و غریب ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے ان کا ذکر قرآن مجید میں اس لیے نہیں کیا کہ وحی کے زمانہ میں یہ رسول غیر معروف ہو چکے تھے۔

میں نے عرض کیا کہ شفاعت والی حدیث میں حضرت نوح علیہ السلام کو اوّل الرُسل کہا گیا ہے اور آپ نے فرمایا ہے کہ سات سو رسول ان سے پہلے گزرے ہیں۔

حضرت نے فرمایا اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ پہلے رسول ہیں جو کافر قوم کی طرف بھیجے گئے اور جو رسول ان سے پہلے ہوئے ہیں انہیں ایسی قوم کی طرف بھیجا جاتا جن کا عقیدہ صحیح ہوتا۔

میں نے عرض کی جب قوم ہُوٗید کا عقیدہ صحیح تھا اور وہ مومن تھے تو پھر ان پر پتھروں اور آگ کا عذاب کیوں ہوا؟

حضرت نے فرمایا کہ ان قوموں کے ساتھ جو نوح علیہ السلام سے پہلے گزریں اللہ تعالیٰ کا دستور یہ تھا

کہ اگر بیشتر قواعد پر عمل ترک کر دیتے تو انہیں ہلاک کر دیا جاتا خواہ وہ صحیح عقیدے پر ہی کیوں نہ ہوں۔

۸- وَدَاوُدَ وَسُلَيْمَانَ إِذْ يَحْكُمَانِ فِي الْحَرْثِ إِذْ نَفَشَتْ فِيهِ غَنَمُ الْقَوْمِ وَكُنَّا لِحُكْمِهِمْ شَاهِدِينَ فَفَهَّمْنَاهَا سُلَيْمَانَ وَكُلًّا آتَيْنَا حُكْمًا وَعِلْمًا۔

(سورۃ انبیاء آیت ۷۸)

میں نے حضرت سے اس آیت کے متعلق دریافت کیا وَدَاوُدَ وَسُلَيْمَانَ إِذْ يَحْكُمَانِ فِي الْحَرْثِ إِذْ نَفَشَتْ فِيهِ غَنَمُ الْقَوْمِ وَكُنَّا لِحُكْمِهِمْ شَاهِدِينَ فَفَهَّمْنَاهَا سُلَيْمَانَ وَكُلًّا آتَيْنَا حُكْمًا وَعِلْمًا اور عرض کیا کہ اس آیت سے علماء نے یہ استدلال کیا ہے کہ اگر ایک مسئلہ میں اجتہاد کرتے ہوئے دو مجتہدوں کی رائے بالکل متضاد ہو تو مُصیب ایک ہی ہوگا اور دوسرا غلطی پر مگر اسے معذور سمجھا جائے گا بلکہ اسے اس کے اجتہاد کا اجر ملے گا کیونکہ اس نے اجتہاد میں اپنی پوری کوشش اور طاقت خرچ کی ہے کیونکہ اس قصہ[1] میں داؤد علیہ السلام نے یہ حکم دیا کہ بکریاں کھیت کے مالک کو اس کھیت کے عوض دی جائیں جو انھوں نے خراب کیا تھا اور سلیمان علیہ السلام نے حکم دیا کہ بکریاں کھیت کے مالک کو دی جائیں کہ ان سے نفع اٹھائے اور کھیت بکریوں والے کو تاکہ وہ اس کھیت کی خدمت کرے یہاں تک کہ وہ اپنی اصلی حالت پر آجائے اور جب کھیت اصلی حالت پر آجائے تو کھیت کھیت والے کو دے دے اور وہ اس کی بکریاں واپس کر دے وجہ استدلال یوں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے سلیمان علیہ السلام کے فیصلہ کو درست قرار دیا ہے کیونکہ فرمایا فَفَهَّمْنَاهَا سُلَيْمَانَ (ہم نے بات سلیمانؑ کو سمجھا دی)

علماء نے اسی قسم کا استدلال ایک اور قصہ سے بھی کیا جو ان دونوں کے درمیان واقع ہوا۔ یہ قصہ

---

[1] قصہ یوں ہے کہ ایک شخص کی بکریاں دوسرے کے کھیت میں گھس گئیں اور کچھ کھایا اور کچھ برباد کر دیا۔ کھیت والا بکریاں پکڑ کر سیدنا داؤد کی عدالت میں لایا۔ حضرت داؤد علیہ السلام اپنے وقت کے نبی تھے اور بادشاہ بھی۔ آپؑ نے دونوں فریقوں کا بیان لیا اور فیصلہ دیا کہ جس قدر کھیت والے کا نقصان ہوا اس کی قیمت کے برابر بکریاں کھیت والے کو دیدی جائیں۔ اس فیصلہ کے بعد دونوں فریق حضرت سلیمانؑ کے سامنے سے گزرے تو آپؑ نے بلایا اور فیصلہ دیا کہ بکریاں کھیت والے کو دیدی جائیں تاکہ وہ ان کے دودھ وغیرہ سے فائدہ اٹھائے اور کھیت بکری والے کے حوالے کیا جائے کہ اس کی خدمت کرے یہاں تک کہ ادھر کھیت والے کا نقصان بکریوں کے منافع سے پورا ہو جائے اور ادھر کھیت اپنی پہلی حالت پر آجائے تو بکریاں بکریاں والے کو واپس دیدی جائیں اور کھیت والے کو اس کا کھیت حوالہ کر دیا جائے۔

دو عورتوں کا ہے جن میں سے بڑی کے بیٹے کو بھیڑیا جھپٹ کرلے گیا تو اس نے چھوٹی کا بچہ لے لیا اور دعویٰ یہ کیا کہ وہ اسی کا بچہ ہے۔ وہ دونوں فیصلہ کے لیے داؤد علیہ السلام کے پاس آئیں تو آپ نے بڑی کے حق میں فیصلہ دے دیا۔ کیونکہ قبضہ اسی کا تھا مگر سلیمان علیہ السلام نے یوں فیصلہ دیا کہ بچے کو آدھا آدھا کر کے دونوں میں تقسیم کر دیا جائے جب چھوٹی نے بچے کو دو حصوں میں تقسیم کرنے کے متعلق سنا تو اس نے بڑی کا حق تسلیم کر لیا اور کہا کہ بچہ اُسی کا ہے اور بڑی تقسیم کا ہی مطالبہ کرتی رہی اس پر حضرت سلیمانؑ نے چھوٹی کے حق میں فیصلہ دے دیا اور بڑی کو کہا اگر بچہ تمہارا ہوتا تو اس کی تقسیم کا مطالبہ نہ کرتیں۔

اسی طرح ایک تیسرے قصہ سے بھی استدلال کیا ہے جو ان دونوں کے درمیان واقع ہوا۔ قصہ یہ ہے کہ لوگوں نے ایک عورت پر یہ الزام لگایا کہ اس نے کتے سے مجامعت کرائی یعنی زنا کی مرتکب ہوئی اور گواہوں نے اس پر گواہی بھی دی تو داؤد علیہ السلام نے اسے سنگسار کرنے کا حکم دیا۔ اسی قسم کا فرضی مقدمہ حضرت سلیمان کے سامنے پیش ہوا جب وہ بچوں کے ساتھ کھیل رہے تھے تو آپ نے حکم دیا کہ گواہوں کو ایک دوسرے سے الگ رکھا جائے۔ چنانچہ ایسا کیا گیا اور ان کے بیانات میں اختلاف پایا گیا اور حضرت سلیمان نے دعویٰ خارج کر دیا اس پر داؤد علیہ السلام نے گواہوں کو الگ الگ رکھنے کی طرف رجوع کیا۔

اور چوتھے قصہ سے بھی استدلال کیا گیا کہ ایک عورت کی فرج میں پانی پایا گیا اور الزام یہ لگایا گیا کہ یہ آدمی کی منی ہے اور وہ زنا کی مرتکب ہوئی ہے چنانچہ داؤد علیہ السلام نے اُسے سنگسار کرنے کا حکم دیا مگر سلیمان علیہ السلام نے حکم دیا کہ اس پانی کو لے کر پکایا جائے۔ اگر منجمد ہو جائے تو یہ انڈے کا پانی ہے ورنہ منی ہے۔ چنانچہ پانی لے کر پکایا گیا اور وہ انڈے کا پانی نکلا اور معلوم ہو گیا کہ عورت پر اتہام لگایا گیا ہے ملاحظہ ہو ابن حجر کتاب الاحکام۔

حضرت نے فرمایا تمہارا مطلب یہ ہے کہ داؤد علیہ السلام نے غلطی کھائی۔ اور سلیمان علیہ السلام نے صحیح فیصلہ دیا کیا فقہاء انبیاءؑ کے متعلق اس قسم کا عقیدہ رکھ سکتے ہیں؟ اور وہ تمام مخلوقات میں سے برگزیدہ ہوتے ہیں اور اللہ کے نزدیک ملائکہ سے بھی افضل ہیں۔ پس اگر یہ جائز سمجھ لیا جائے کہ ان سے خطا ہو سکتی ہے تو پھر ہمیں ان پر کونسا اعتماد باقی رہ جائے گا کیونکہ اس طرح تو وہ ہماری طرح کے ہو جاتے ہیں۔ معاذاللہ حضرت داؤد کا فیصلہ قطعاً غلط نہ تھا۔

پہلے قصہ کی توجیہ یہ ہے کہ داؤد علیہ السلام نے بالکل صحیح فیصلہ دیا کہ کھیت کی قیمت کا جرمانہ بھر دیا جائے اور بکریاں حوالے کرنے کا حکم اس لیے دیا کہ ان کے پاس اس زمانے میں نقدی تو ہوتی نہ تھی

اور اگر تھی بھی تو بہت کم۔ ان کا لین دین بکریوں اور مویشیوں سے ہوتا کیونکہ یہ بکثرت پائی جاتی تھیں اسی لیے آپ نے بکریاں دینے کا حکم دیا۔ نقدی کا حکم نہیں دیا، مگر سلیمان علیہ السلام کا فیصلہ صلح پر مبنی تھا لہٰذا آپؑ کا یہی خیال تھا کہ بکریوں کا منافع یعنی ان کا دودھ اور گھی اور صوف کھیت کی قیمت کے عوض دیدیا جاتے تا آنکہ کھیت یعنی انگور ٹھیک حالت پر آجائیں۔ یہ صرف طرفین کی رضامندی سے ہی ہو سکتا تھا لہٰذا جو شخص خالق حق کا فیصلہ دے اسے یہ نہیں کہہ سکتے کہ اس نے غلطی کھائی اور نہ ہی یہ کہہ سکتے ہیں کہ صلحمندانہ فیصلہ دینے والا مُصیب ہے۔

باقی قصّوں میں فیصلہ کی توجیہ یہ ہے کہ داؤد علیہ السلام نے تینوں قصّوں میں ظاہر کو مدنظر رکھتے ہوئے فیصلہ دیا اور اسی پر فیصلہ دینا ضروری ہے کیونکہ حاکم کے لیے[۱] جائز نہیں کہ وہ ظاہر کے خلاف فیصلہ دے اور سلیمان علیہ السلام نے حیلہ کر کے باطن کو ظاہر بنا دیا، تب ظاہر پر حکم دیا۔ لہٰذا پہلے فیصلہ کے متعلق یہ نہیں کہہ سکتے کہ وہ غلط تھا اور دوسرا فیصلہ صحیح بلکہ ہر دو صحیح ہیں اگرچہ باطن کے ظاہر ہو جانے پر فیصلہ کا منسوخ کرنا ضروری تھا لہٰذا اس کے منسوخ ہونے سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ فیصلہ دیتے وقت وہ فیصلہ غلط تھا۔ اس کی مثال ایسی ہے کہ چند عادل لوگوں نے قاضی کے سامنے کسی مقدمہ میں جھوٹی گواہی دی اور قاضی نے ان لوگوں کی گواہی پر فیصلہ دیدیا۔ قاضی پر یہی واجب ہے اور اس طرح فیصلہ دینا درست ہوگا پھر اس کے بعد گواہوں نے توبہ کی اور حق کی طرف آئے اور اپنے جھوٹ کا اعتراف کیا۔ اس وقت قاضی کے لیے ضروری ہے کہ ان کے رجوع کے مطابق فیصلہ دے۔ اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ اس کا پہلا فیصلہ غلط تھا۔

حکایت حضرت نے فرمایا مجھے معلوم ہے کہ فاس کا ایک شخص جس سے مراد ان کی اپنی ذات تھی وہ اپنے ملّی بھائی کو ملنے بصرہ گیا۔ ان کی مراد حضرت محمد بن عبدالکریم سے تھی جن کا ذکر اوپر ہو چکا۔ حضرت محمد بن عبدالکریمؒ قاضی تھے۔ وہ شخص (یعنی حضرت دباغ) ان کے پاس بیٹھ گئے، پھر دو شخص مقدمہ لے کر آئے۔ ایک نے کہا کہ اس شخص نے مجھ سے ایک نہایت قیمتی یاقوت لے لیا ہے اور یہ اس کے پاس موجود ہے۔ مدعا علیہ نے کہا یہ میری جامہ تلاشی لے سکتا ہے، اس پر مزید یہ کہ میں اللہ کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ میرے پاس نہیں ہے، قاضی نے چاہا کہ یہی فیصلہ دے مگر قاضی کے ہمنشین نے کہا کہ ابھی فیصلہ

---

[۱] جہاں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم میں اور خصوصیات پائی جاتی تھیں وہاں ایک خصوصیت یہ بھی تھی کہ آپؐ کبھی کبھی باطن کے اعتبار سے بھی فیصلہ دیدیا کرتے تھے۔ چنانچہ حافظ جلال الدین سیوطی نے اس پر ایک مستقل رسالہ لکھا ہے جس کا نام "الباہر فی حکم النبی صلی اللہ علیہ وسلم فی الباطن والظاہر" ہے (کشف الظنون: ۱: ۱۴۲)

نہ دیں۔ پھر وہ ہمنشین مدّعی و مدّعا علیہ کی طرف متوجہ ہوا اور کہا یہ قاضی صاحب میرے دینی بھائی ہیں۔ انھوں نے میرے لیے کھانا تیار کیا ہے۔ ہم چاہتے ہیں کہ تم بھی کھانے پر چلو۔ کھانا کھانے کے بعد قاضی صاحب تمہارے معاملہ پر غور کریں گے۔ حضرت نے فرمایا: پھر ہم قاضی کے ساتھ گئے جب کھانا لایا گیا تو ہمنشین اور قاضی دونوں مدّعا علیہ کی طرف کن انکھیوں سے دیکھنے لگے۔ دفعتہً اس نے ناک سنکی اور سنک کر ایک رومال سے جو اس کے پاس تھا، پونچھا۔ ہمنشین نے فوراً رومال اس کے ہاتھ سے چھین لیا دیکھا تو یاقوت سنک کے ساتھ ناک سے نکلا تھا اور ہم نے یاقوت مدّعی کو دیدیا۔

حضرت نے فرمایا: باطن کو ظاہر بنا دینے کا ایک یہ حیلہ ہے اگر قاضی پہلے ہی جامہ تلاشی اور قسم کھانے کا فیصلہ دے دیتا تو یہ فیصلہ درست ہوتا۔ حالانکہ ان کو کشف کے ذریعہ سے معلوم تھا کہ یاقوت مدعا علیہ کے پاس موجود ہے، کیونکہ اللہ نے انہیں اس کا مکلّف نہیں بنایا اور ہمنشین نے حیلہ کر کے باطن کو ظاہر کر دیا۔

میں نے عرض کیا: کیا قاضی کو بذریعہ کشف معلوم تھا کہ یاقوت مدعا علیہ کے پاس ہے؟

حضرت نے جواب دیا: ہاں اسے اور اس کے ہمنشین دونوں کو معلوم تھا اور فرمایا یہی حال ان فیصلوں کا ہے جو ان تینوں قصوں میں ان دو بڑے نبیوں نے دیئے۔ چنانچہ پہلے قصّہ میں داؤد علیہ السلام نے قبضہ کی وجہ سے بڑی کے حق میں فیصلہ دیا اور قبضہ اسی کا متقاضی تھا اور دوسرے قصّہ میں داؤد علیہ السلام نے سنگسار کرنے کا حکم گواہوں کی گواہی سے دیا اور تیسرے میں چوں کہ علامت پائی گئی تھی اس لیے سنگسار کرنے کا حکم دیا اور سلیمان علیہ السلام نے تینوں قصوں میں حیلہ کر کے باطن کو ظاہر بنا دیا۔ واللہ تعالیٰ اعلم

مؤلف کہتا ہے کہ خدا حضرت سے راضی ہو، ان کے پاس کس قدر علم تھا چنانچہ ابنِ حجر نے ابنؒ منیر کا قول نقل کیا ہے کہ صحیح بات یہ ہے کہ داؤد علیہ السّلام نے کھیت والے مقدمہ میں صحیح فیصلہ دیا تھا اور سلیمان علیہ السلام نے صلح کی راہ دکھائی چنانچہ اللہ تعالیٰ کا فرمان کہ کُلًّا اٰتَیْنَا حُکْمًا وَّعِلْمًا (ہم نے ہر دو کو فصلِ خصومات اور علم عطا کیا) یا تو عام ہے (کہ ہر معاملہ اور مقدمہ میں ان کا یہی حال تھا) یا خاص ہے کھیت کے معاملہ کے متعلق۔ بہرحال اللہ تعالیٰ نے داؤد علیہ السلام کی فصلِ خصومات اور علم کی تعریف کی ہے۔ لہٰذا یہ اس قبیل سے نہیں ہو سکتا اگر مجتہد غلطی بھی کرے تو معذور ہوگا کیونکہ غلطی نہ حکم ہو سکتی ہے نہ علم۔

ابن حجر کے اس بیان کا مفہوم وہی ہے جو حضرت نے فرمایا۔

ابنِ منیرؒ: شرف الدین عبدالواحد متوفی ۷۳۳ھ ؛ ۱۳۳۲ء ان کی تفسیر دس جلدوں میں ہے۔

جو بیان حضرت نے باقی تینوں قصوں میں دیا ہے وہ بالکل صحیح ہے اس میں شک وشبہ کی گنجائش نہیں اور نہ ہی اس سے گریز ہو سکتا ہے ۔ امام شافعی اور ابو عبداللہ البلخی[1] اور دیگر اکابر نے ایک اور قصے میں اسی بات کی طرف اشارہ کیا ہے ۔ واللہ تعالیٰ اعلم ۔

۹- يَوْمَ يُكْشَفُ عَنْ سَاقٍ (سورۃ القلم آیت ۴۲)

میں نے حضرت سے آیت يَوْمَ يُكْشَفُ عَنْ سَاقٍ میں ساق کے معنی دریافت کئے ۔

فرمایا سریانی زبان میں "ساق" کے معنی واقعیت (جد) بمقابلہ "ہزل" (مخول) کے ہیں ،

میں نے عرض کیا کہ عربی میں بھی تو یہی معنی ہیں ۔ چنانچہ محاورہ ہے اِنْكَشَفَ الْحَرْبُ عَنْ سَاقٍ ای عن جد[2]

فرمایا : یہ تو پھر دونوں زبانوں میں موافقت ہو گئی ۔

۱۰- **مشیخا یا مشیحا** : پھر میں نے دریافت کیا کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا نام مشیخا خاء معجمہ سے ہے یا مہملہ سے ؟

حضرت نے فرمایا یہ لفظ خاء معجمہ سے مشیخا ہے اور یہ سریانی لفظ ہے جس کے معنی "بڑے آدمی" کے ہیں ۔

۱۱- **انجیل کے معنی** : میں نے انجیل کے معنی دریافت کئے ۔

فرمایا : یہ بھی سریانی لفظ ہے جس کے معنی نور العین کے ہیں ۔

۱۲- **توراۃ کے معنی** : میں نے پوچھا توراۃ کیا لفظ ہے ۔

فرمایا : یہ عبرانی لفظ ہے جس کے معنی "شریعت اور کلام حق" کے ہیں ۔

۱۳- **مُشَفَّح** : میں نے پوچھا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ایک نام مشفح ہے کیا یہ فاء سے ہے یا قاف سے کیونکہ علماء میں اس میں بڑا اختلاف ہے ۔

---

[1] ابو عبداللہ البلخیؒ : ابو عبداللہ محمد بن الفضل البلخی ۔ دراصل بلخ کے رہنے والے تھے ۔ پھر سمرقند میں جاکر آباد ہو گئے اور وہیں ۳۱۹ھ ، ۹۳۱ء میں وفات پائی ۔

[2] مبرد نے اپنی کتاب کامل میں بھی اس آیت کی تشریح کی ہے اور "ساق" کے معنی شدۃ (سختی ، تکلیف ، مصیبت) دیے ہیں ۔ چنانچہ شاعر کہتا ہے ۔

یعنی اس کے احوال وخطرات واضح ہو گئے ۔ اس طرح آیت کے معنی یوں ہوں گے جس دن اہوال وہولناکیاں (یعنی روزِ قیامت کی) عیاں کر دی جائیں گی ۔

فرمایا یہ لفظ فار کے ساتھ ہے جس کے معنی "حمد" کے ہیں اور یہ سریانی لفظ ہے۔

۱۴۔ اَلْمُنْحَمَنَّا: میں نے پوچھا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے نام مَنْحَمَنَّا کا کیا تلفظ ہے۔ کیونکہ اس لفظ کو ضبط کرنے میں علماء میں اختلاف پایا جاتا ہے چنانچہ بعض کہتے ہیں کہ اس کی پہلی میم پر پیش اور دوسری کے نیچے زبر ہے اور بعض کہتے ہیں کہ پہلی میم پر زبر اور دوسری کے نیچے زیر ہے۔

حضرت نے فرمایا کہ دونوں میموں پر زبر ہے اور یہ دو کلمے ہیں ایک کلمہ نہیں چنانچہ مَنْ میم کا زبر اور نون ساکن سے ایک کلمہ ہے اور حَمَنَّا حاء اور میم پر زبر اور نون مشدّد دوسرا کلمہ ہے پہلے کلمہ کے معنی ہیں وہ نعمت جس کا ظاہری نفع بھی ہو اور باطنی بھی۔ ظاہری نفع وہ ہے جو ذات کو عالم اشباح میں حاصل ہو اور باطنی نفع وہ ہے جو ارواح کو عالم ارواح میں حاصل ہو۔ لہٰذا یہ ایسی نعمت ہوئی جس سے تمام مخلوقات اور تمام جہاں سیراب ہو چکے ہیں اور اس میں کوئی شک نہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی یہی شان ہے اور دوسرے کلمہ کے معنی جو پہلے کلمہ کی صفت (نعت) کے طور پر آیا ہے کہ پہلی نعمت انتہائی درجہ تک پہنچ چکی اور انتہائی درجہ تک بلند ہے، گویا یوں کہا گیا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ایسی خداوندی نعمت ہیں جو انتہا کو پہنچ چکی ہے اور آپ کے درجے تک نہ پہلے کوئی پہنچ سکا اور نہ بعد میں پہنچ سکے گا اور یہ ایک سریانی لفظ ہے۔

۱۵۔ ایک قصہ اور احمیٰ حَمِیثا واطمیٰ طمیثا کی تشریح:

تلمسان کا ایک صالح شخص ہمارے پاس آیا اور بتایا کہ ایک شخص حج کر کے آیا تھا کہہ رہا تھا کہ اس نے حضرت ابراہیم دسوقی[1] کی قبر کی زیارت کی اور کیا دیکھتا ہے کہ شیخ ابراہیم دسوقی اس کے پاس آکھڑے ہوئے اور یہ دعا سکھائی۔

بِسْمِ الْاِلٰہِ الْخَالِقِ الْاَکْبَرِ۔ وَھُوَ حِرْزٌ مَّانِعٌ لِّمَا اَخَافُ مِنْہُ وَاَحْذَرُ۔ لَا قُدْرَۃَ لِمَخْلُوْقٍ مَعَ قُدْرَۃِ الْخَالِقِ یُلْجِمُہٗ بِلَجَامِ قُدْرَتِہٖ اَحْمٰی حَمِیْثًا اَطْمٰی طَمِیْثًا وَّکَانَ اللّٰہُ عَزِیْزًا۔ حٰمٓ عٓسٓقٓ حِمَایَتُنَا کٓھٰیٰعٓصٓ کِفَایَتُنَا فَسَیَکْفِیْکَھُمُ اللّٰہُ وَھُوَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ وَلَا حَوْلَ وَلَا قُوَّۃَ اِلَّا بِاللّٰہِ الْعَلِیِّ الْعَظِیْمِ۔

---

[1] ابراہیم دسوقیؒ: جلیل القدر صوفیہ میں سے ہوتے ہیں، مکمل نام ابراہیم بن ابی المجد بن قریش ہے ان کا نسب نامہ محمد الجواد سے جا ملتا ہے، پہلے شافعی فقہ پڑھی۔ پھر صوفیاء کا طریقہ اختیار کر لیا، تنتالیس سال کی عمر میں ۶۷۶ھ، ۱۲۷۷ء میں وفات پائی۔

اور کہا یہ دعا پڑھا کرو اور کسی چیز سے نہ ڈرو۔

تمسانی دوست جن کا نام حاجی عبدالرحمٰن بن ابراہیم ہے اور ابن ابراہیم کی اس اولاد میں سے ہیں جو تمسان میں آباد ہو چکے ہیں کہنے لگے کہ بھائی حاجی محمد بن ابراہیم کو چونکہ احسُمٰی حَمِیثًا وَاطْمٰی طُمِیثًا کے معنی نہ آتے تھے اس لیے انھوں نے یہ دعا نہ پڑھی اور کہا مجھے ان کلمات کے معنی معلوم نہیں۔ ہو سکتا ہے کہ ان کے ایسے معنے ہوں جو مجھے پسند نہ ہوں اور مجھ سے ان کے معنی پوچھے۔ میں نے حضرت سے ان کے معنی پوچھے۔ حضرت نے فوراً کہا آج کل دنیا میں کوئی ایسا شخص نہیں جو ان کلمات کو بولتا ہو تجھے یہ لفظ کہاں سے ملے؛ میں نے تمام قصہ سنا دیا۔ فرمایا: ہاں حضرت ابراہیم دسوقی اکابر صالحین اور صاحبِ فتح تھے وہ اور اُن جیسے اور لوگ ایسے کلمات بول سکتے ہیں۔ پھر فرمایا یہ سُریانی زبان کے دو کلمے ہیں۔ اَحسُمٰی کے معنی ہیں یا مالک (اے مالک) اور اس کے اسرار میں ملے۔ اے مالک بادشاہ عظیم و باعظمت الحی القیوم اور حَمِیثًا کے لفظ سے اس کی سلطنت کی طرف اشارہ ہے گویا اس کا مطلب یوں ہوا کہ "اے مالک اسرار، اے مالکِ انوار، اے مالکِ لیل و نہار، اے موسلا دھار برسنے والے بادلوں کے مالک، اے شموس و اقمار کے مالک، اے عطاء اور منع کے مالک اے بلندی و پستی کے مالک، اے ہر زندہ کے مالک، اے ہر شے کے مالک" اس نام میں ایک عجیب راز ہے جس کا اظہار قلم اور تحریر سے نہیں ہو سکتا۔

اطمٰی سے اللہ تعالیٰ کی عظمت، کبریائی، قہر، غلبہ، عزت اور ان تمام امور میں یکتائی مراد ہے گویا کہ کہنے والا یوں کہہ رہا ہے "اے ہر چیز کے جاننے والے، اے ہر چیز پر قادر، اے ہر بات کا ارادہ کرنے والے، اے ہر چیز کی تدبیر کرنے والے، اے ہر چیز پر غالب، اے وہ ذات جس پر عجز طاری نہیں ہو سکتا اور نہ ہی اس کے تصرّف میں نقص کا وہم ہو سکتا ہے"۔

اور طُمِیثًا سے اشارہ ہے ان اشیاء کی طرف جن میں اللہ تعالیٰ تصرّف کرتا ہے اور ان ممکنات کی طرف جن میں جیسا چاہتا ہے عمل کرتا ہے اور جو چاہتا ہے حکم دیتا ہے سُبْحَانَہٗ لَا اِلٰہَ اِلَّا ھُوَ اس نام میں بھی عجیب راز ہے جس کی تشریح قلم سے نہیں ہو سکتی۔ واللہ اعلم

سُریانی ارواح کی زبان ہے

میں نے حضرت سے سنا کہ سریانی زبان ارواح کی زبان ہے وہ اولیاء جو صاحبِ دیوان ہوتے ہیں آپس میں اسی زبان میں گفتگو کرتے ہیں، اس لیے کہ یہ زبان مختصر ہے اور معانی کثیرہ کی حامل ہے اور کسی زبان میں یہ معانی اتنے الفاظ میں ادا نہیں کیے جا سکتے۔

میں نے پوچھا: کیا عربی زبان معانی کی ادائیگی میں سریانی کے مرتبہ کو پہنچ سکتی ہے؟

فرمایا: نہیں، بجز قرآنِ مجید کے کیونکہ جب عربی زبان میں سریانی زبان کے معانی جمع ہو جائیں اور انہیں عربی الفاظ میں ادا کیا جائے تو یہ سریانی سے زیادہ شیریں اور زیادہ عمدہ معلوم ہوں گے۔ واللہ اعلم۔

سُریانی کے سوا تمام زبانوں میں اطناب پایا جاتا ہے

حضرت نے یہ بھی فرمایا کہ تمام زبانوں میں بہ نسبت سریانی کے اطناب پایا جاتا ہے کیونکہ سریانی کے سوا تمام زبانوں میں کلام کی ترکیب کلمات سے ہوتی ہے نہ حروفِ تہجی سے مگر سریانی میں حروفِ تہجّی سے کلام مرکّب ہوتا ہے۔ لہٰذا سریانی کا ہر حرفِ تہجّی ایک مفید معنی پر دلالت کرتا ہے اور جب اسے دوسرے حرف کے ساتھ ملایا جائے تو ان سے کلام کا فائدہ حاصل ہوتا ہے، جسے یہ معلوم ہو جائے کہ سریانی کا ہر حرف کس معنی کے لیے وضع کیا گیا ہے اس کے لیے سریانی کا سمجھنا آسان ہو جاتا ہے اور جیسا چاہے سریانی میں بات کر سکتا ہے اور اس طریقے سے وہ اسرارِ حروف کی معرفت حاصل کر سکتا ہے اور اس میں بہت بڑا علم پایا جاتا ہے جسے اللہ نے لوگوں کی عقلوں سے ان پر رحمت کی غرض سے محجوب رکھا ہے تاکہ اس ظلمت کے ہوتے ہوئے جو ان کی ذوات میں ہے حکمت پر مطلع ہو کر ہلاک نہ ہو جائیں۔ نَسْئَالُ اللّٰہَ السَّلَامَۃَ، وَاللّٰہُ اَعْلَمُ۔

سُریانی زبان تمام زبانوں میں ساری ہے

میں نے حضرت کو یہ کہتے ہوئے سنا کہ سُریانی تمام زبانوں میں اس طرح ساری ہے جس طرح لکڑی میں پانی، کیونکہ ہر زبان کے کلمات کے حروفِ ہجا کی تشریح سریانی زبان میں کی گئی ہے اور انہیں ان خاص معانی کے لیے وضع کیا ہے جن کی طرف پہلے اشارہ کیا جا چکا ہے مثلاً لفظ احمد عربی زبان میں جب علم ہو، اس ذات پر دلالت کرتا ہے جو اس نام سے موسوم ہے مگر سریانی میں ابتدائی ہمزہ خاص معنی پر دلالت کرتا ہے، حاء ساکن اور معنی پر اور دال پر اگر پیش ہو تو خاص معنی پر اور اگر مفتوح ہو تو کسی اور معنی پر دلالت کرتی ہے۔ اسی طرح محمد کا لفظ عربی زبان میں اس ذات پر دلالت کرتا ہے جو اس نام سے موسوم ہے مگر سریانی میں میم ایک معنی بتاتی ہے اور حاء مفتوحہ اور معنی، میم مشدّد اور معنی اور آخری دال اور معنی۔ اسی طرح لفظ زید، عمرو، رجل امراۃ وغیرہ الفاظ جن کا انحصار صرف عربی پر ہی نہیں۔ سریانی میں ان سب کے حروفِ تہجی کے خاص معنی ہیں۔ یہی حال ہر زبان کا ہے چنانچہ البار قلیط عبرانی زبان میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا نام ہے اور سریانی میں

ابتدائی ہمزہ کا ایک معنی ہے، لام ساکن کا ایک معنی، با کا ایک معنی، علیٰ ہذا القیاس آخر تک۔ اسی لیے سریانی تمام زبانوں کی اصل ہے اور باقی زبانیں اسی سے متفرع ہیں اور ان کے متفرع ہونے کا سبب وہ جہالت ہے جو بنی آدم میں پھیل گئی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ سریانی زبان کی وضع اور اس میں گفتگو کرنے کی بنیاد وہ صاف معرفت ہے جس میں جہالت کا شائبہ نہ ہو تاکہ کلام کرنے سے پہلے ہی کلام کنندگان کو معانی معلوم ہو جائیں لہٰذا سامع کے ذہن میں ان معانی کو ڈالنے کے لیے معمولی سا اشارہ ہی کافی ہوتا ہے۔ چنانچہ ان میں اس بات پر اتفاق ہو گیا کہ معنی کو قریب کرنے اور اختصار کی غرض سے حروف تہجی سے معانی کی طرف اشارہ کیا جائے کیونکہ ان کا مقصد معانی سے بحث کرنا ہوتا ہے۔ نہ وہ حروف جو ان پر دلالت کرتے ہیں، یہاں تک کہ اگر یہ ممکن ہوتا کہ ان معانی کو ان حروف کے بغیر ہی ذہن میں حاضر کر لیا جائے تو وہ ان حروف کو کبھی وضع نہ کرتے۔ یہی وجہ ہے کہ بڑے بڑے اہل کشف کے سوا یا ارواح کے سوا، کیونکہ وہ جاننے اور سمجھنے والی ہیں یا فرشتوں کے سوا، جن کی فطرت وخلقت ہی معرفت پر ہے، کوئی بھی اس زبان میں گفتگو نہیں کر سکتا۔ اگر تو انہیں گفتگو کرتا ہوا دیکھ لے تو تو دیکھے گا کہ وہ ایک یا دو حرفوں یا ایک یا دو کلموں کے ساتھ ان معانی کی طرف اشارہ کر رہے ہیں جن کی طرف دوسرے ایک یا دو جزوں میں اشارہ کر سکیں گے۔

یہ معلوم کر لینے کے بعد آپ سمجھ جائیں گے کہ جب بنی آدم میں جہالت پھیل گئی تو اس کی وجہ سے ان حروف کو ان معانی سے جن کے لیے یہ ابتداءً وضع کیے گئے تھے، منتقل کر دیا گیا اور ان کو مہمل بنا دیا گیا لہٰذا معانی کے ادا کرنے کے لیے اس بات کی ضرورت ہوئی کہ ان کو ایک دوسرے سے ملا دیا جائے تاکہ ایک مجموعہ حاصل ہو جسے کلمہ کہا جاتا ہے تاکہ یہ ان معانی میں سے جو پہلی وضع والوں کے ہاں مروج تھے ایک معنی پر دلالت کرے لہٰذا حروف کے معانی اور ان کے اسرار کو نہ جاننے کی وجہ سے بہت بڑا علم ضائع ہو گیا، باوجود اس کے جب آپ کسی زبان کا کوئی لفظ لیں گے اور نقل سے پہلے کے معانی سے اس کی تشریح کرنا چاہیں گے تو اس میں کوئی حرف ضرور ایسا لے گا جو اپنی سابق وضع (یعنی سریانیت) میں اس پورے مفہوم کو ادا کرے گا، جس پر پورا کلمہ اس دوسری وضع میں دلالت کر رہا ہے کیونکہ یہ معانی منقول عنہ (یعنی سریانی معانی) سے متفق ہیں اور دیکھے گا کہ اس کلمہ کے باقی حروف دیگر معانی پر دلالت کرتے ہیں جنہیں سریانی لوگ تو سمجھ جاتے ہیں اور دوسرے لوگ ان سے ناواقف ہیں۔ مثلاً حائط کا لفظ عربی زبان میں گھر یا کسی اور گھیرنے والی دیوار کے لیے وضع کیا گیا، مگر سریانی زبان میں ابتدائی حاء ہی یہ تمام معنی ادا کر دیتی ہے اور لفظ ماء عربی زبان میں پانی کو کہتے ہیں مگر اس کی

آخری ہمزہ یہ معنی ادا کرتی ہے اور لفظ سماء آسمان کو کہتے ہیں مگر اس کے شروع کی سین ہی یہ معنی ادا کر دیتی ہے، غرض اکثر اسماء پر غور کریں تو سب اسی طرز پر نکلیں گے کہ ایک حرف معنی کو ادا کرتا ہے اور باقی حروف بیکار و بے فائدہ ہیں۔ واللہ تعالیٰ اعلم۔

حضرت آدمؑ کی زبان سُریانی تھی

آپ نے یہ بھی فرمایا کہ جب حضرت آدم علیہ السلام جنّت سے اُتر کر زمین پر آئے تو وہ اپنی بیوی اور بچوں کے ساتھ سُریانی زبان میں باتیں کیا کرتے تھے کیونکہ وہ ابھی ابھی جنت سے آئے تھے لہٰذا انہیں معانی کی صاف معرفت حاصل تھی لہٰذا سریانی زبان اپنی اصلی حالت پر بغیر تغیر و تبدّل کے ان کی اولاد میں قائم رہی، حتٰی کہ حضرت ادریس علیہ السلام گزر گئے تو اس میں تغیر و تبدّل شروع ہوا اور لوگ اس کو اپنی اصل سے منتقل کرنے اور اس سے اپنی اپنی بولیاں نکالنے لگے چنانچہ سب سے پہلی زبان جو اس میں سے نکالی گئی وہ ہندوستان کی زبان (سنسکرت) ہے اسی لیے یہ زبان سریانی زبان سے قریب ترین ہے اور فرمایا کہ حضرت آدمؑ جنّت سے اترنے کے بعد سریانی زبان میں اس لیے باتیں کرتے تھے کہ یہ اہلِ جنّت کی زبان ہے اور وہ جنت میں یہی زبان بولا کرتے تھے اور جنت سے یہی زبان لیکر دنیا میں آئے تھے

اس پر میں نے عرض کیا کہ مفسّرین نے خَلَقَ الاِنْسَانَ عَلَّمَہُ الْبَیَانَ کی تفسیر میں لکھا ہے کہ انسان سے مراد آدم علیہ السلام ہیں اور بیان سے مراد سات سو زبانوں میں کلام کرنا ہے جن میں افضل ترین قرآنی زبان ہے۔

حضرت نے فرمایا: یہ صحیح ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت آدمؑ کو سات سو زبانیں سکھائیں چنانچہ وہ یہ تمام زبانیں جانتے تھے بلکہ آپ سے کم درجہ والے یعنی اولیائے امتِ محمدؐ یہ بھی زبانیں جانتے ہیں، لیکن وہ وہی زبان بولتے ہیں جس پر ان کی تربیّت ہوئی اور آدم علیہ السلام کی تربیت اہل جنت کی زبان سریانی پر ہوئی، واللہ تعالیٰ اعلم۔

مؤلّف کہتا ہے کہ یہ نہایت ہی عمدہ کلام ہے اور اس پر حضرتِ ابن عباسؓ کی اس مرفوع حدیث سے اعتراض وارد نہیں ہوتا کہ عربوں سے تین باتوں کی وجہ سے محبّت رکھو۔ میں عربی ہوں، قرآن عربی میں ہے اور اہل جنت بھی عربی میں گفتگو کریں گے۔" کیونکہ عقیلی کہتا ہے کہ اس حدیث کی کوئی اصل نہیں اور ابن الجوزی نے اسے موضوعات میں شمار کیا ہے، میں نے حضرت سے بھی اس حدیث کے متعلق پوچھا: فرمایا یہ حدیث نہیں اور نبی صلّی اللہ علیہ وسلّم نے نہیں فرمائی۔

نیز حضرت نے فرمایا اگر ننھے بچوں کی گفتگو پر غور کریں تو ہم ان کی گفتگو میں بہت سی سُریانیت

پائیں گے اس کی وجہ یہ ہے کہ بچپن میں جو تعلیم دی جاتی ہے وہ پتھر پر لکیر کی طرح ہو جاتی ہے چونکہ آدم علیہ السلام اپنے بچوں سے باتیں کیا کرتے اور اسی زبان میں مختلف قسم کی کھانے پینے کی چیزوں کے نام لیا کرتے لہٰذا اسی پر ان کا نشو و نما ہوا اور اپنی اولاد کو بھی یہی زبان سکھائی اور یہ سلسلہ یوں ہی چلتا رہا، مگر جب اس میں تبدیلی واقع ہوئی اور بھول گئی تو بڑوں کے پاس اس کا کچھ بھی نہ رہا البتہ بچوں کے پاس کچھ باقی رہ گئی اس میں ایک اور راز بھی ہے وہ یہ کہ بچہ جب تک ماں کا دودھ پیتا رہتا ہے اس کی روح کا تعلق ملا اعلیٰ سے رہتا ہے اس زمانے میں جو خوابیں بچے کو نظر آتی ہیں اگر بڑے کو نظر آویں تو خوف کے مارے مر جائے کیونکہ بچپن میں غلبہ روح کا ہوتا ہے اور بڑے ہو کر جسم کا غلبہ ہوتا ہے اور پہلے ذکر ہو چکا کہ ارواح کی زبان سریانی ہے لہٰذا جس طرح بچہ عالم خواب میں جو کچھ مشاہدہ کرتا ہے بحکم غلبہ روح کرتا ہے۔ اسی طرح کبھی وہ سریانی الفاظ بول جاتا ہے تو اس وقت بھی غلبہ روح کا ہی ہوتا ہے۔

حضرت نے فرمایا اللہ تعالیٰ کے ناموں میں سے ایک نام اُغ ہے جیسے دودھ پیتا بچہ بولتا ہے اور یہ نام بلندی رفعت، لُطف اور شفقت پر دلالت کرتا ہے گویا کہ وہ یوں کہہ رہا ہے یَا عَلِیُّ، یَا رَفِیعُ، یَا حَنَّانُ، یَا لَطِیفُ۔ اسی طرح تم نے دیکھا ہوگا کہ بچے کا دودھ چھڑانے کے بعد جب باقلا، یا چنے کا دانہ اسے دیا جاتا ہے تو اس کا نام بُوبُو رکھتے ہیں کہ سریانی زبان میں کھانے کی میٹھی چیز کے لیے مقرر ہے اسی لیے ماں کے پستانوں کو بھی جن سے وہ دودھ پیتا ہے یہی نام دیا جاتا ہے اسی طرح جب بچے کو پاخانہ پھرنے کی حاجت ہوتی ہے تو ماں کو عُ عُ کہہ کر اطلاع دیتا ہے اور سریانی میں یہ لفظ ذات کی پلیدی کو نکالنے کے لیے وضع کیا گیا ہے۔ اسی طرح بچے کے پاس جب کوئی اس سے چھوٹا بچہ لایا جائے تو اس کا نام رکھتے ہیں مُوْ مُوْ جو سریانی زبان میں ایک چھوٹی اور پیاری چیز کے لیے وضع کیا گیا ہے اسی لیے آنکھ کی پتلی کو عربی میں مُو مُو کہتے ہیں مگر لفظ عین کا اضافہ کر کے مُوْ مُوْ العین استعمال کرتے ہیں یعنی آنکھ میں چھوٹی اور پیاری چیز۔ بچوں کے کلام میں باقی سریانی الفاظ تلاش کرنے لگیں تو قصہ طول پکڑ جائے۔ واللہ تعالیٰ اعلم۔

پھر حضرت نے فرمایا کہ اس وقت کہ ۹ ذی الحجہ ۱۱۲۹ھ کا دن ہے۔ اہلِ مغرب میں سے کوئی بھی سریانی میں بات کرنے والا نظر نہیں آتا۔

میں نے دریافت کیا کیا سیدی منصور جن کی وفات ہو چکی ہے سریانی میں گفتگو کرتے تھے یا نہیں۔ فرمایا ہاں اس زبان میں باتیں کرتے تھے مگر سیدی عبداللہ برناوی ان سے کہیں اچھی بول لیتے تھے۔

میں نے پوچھا اسے کیوں سیکھا جاتا ہے؟

اہلِ دیوان کی زبان سریانی ہے

فرمایا: اس لیے کہ اہلِ دیوان سے بکثرت میل جول رہتا ہے اور وہ اس زبان کے کثرتِ معانی کی وجہ سے کسی اور زبان میں گفتگو نہیں کرتے۔ عربی میں گفتگو صرف اس وقت ہوتی ہے جس وقت نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے حضور ہوتے ہیں آپؐ کے ادب و توقیر کی وجہ سے، کیونکہ دنیا میں اپنی حیات میں آپؐ کی یہی زبان تھی۔

اس کے بعد میں نے حضرت سے پوچھا سیدی عمر الھواری اور سیدی محمد اللھواج یہ زبان جانتے تھے یا نہیں؟

فرمایا: نہیں۔ واللہ تعالیٰ اعلم۔

کیا سوالِ قبر سُریانی زبان میں ہوگا یا کسی اور زبان میں

میں نے عرض کیا: کیا سوالِ قبر سریانی زبان میں ہوگا یا کسی اور زبان میں، اس لیے کہ حافظ السیوطی اپنے منظومہ میں فرماتے ہیں:

وَمِنْ غَرِیْبِ مَا تَرَی الْعَیْنَانِ ۔۔۔ اَنَّ سُؤَالَ الْقَبْرِ بِالسُّرْیَانِیْ

(عجیب بات ہے کہ سوال قبر سریانی زبان میں ہوگا) اس کا شارح کہتا ہے کہ ناظم نے اپنی کتاب شرح الصدور باحوال الموتٰی والقبور میں شیخ الاسلام علم الدین البلقینی[1] کے فتاویٰ کے حوالہ سے نقل کیا ہے کہ میّت سوالات کا جواب سریانی زبان میں دے گی۔ ناظم کہتا ہے مگر مجھے اس کی سند کہیں نہیں ملی۔ علامہ ابن حجر سے اس کے متعلق سوال کیا گیا تو انھوں نے جواب دیا کہ ظاہر حدیث سے تو معلوم ہوتا ہے کہ قبر میں سوال و جواب عربی زبان میں ہوگا مگر اس کے باوجود ہو سکتا ہے کہ ہر شخص سے خطاب اس کی اپنی زبان میں ہو اور یہ بات معقول بھی ہے۔

حضرت نے جواب دیا: سوالِ قبر سریانی زبان میں ہوگا کیونکہ یہ زبان فرشتوں اور ارواح کی زبان ہے اور سوال کرنے والے فرشتے بھی انہی میں سے ہیں اور سوالات کا جواب صرف روح دے گی جو تمام ارواح کی طرح سریانی زبان میں گفتگو کرتی ہے، کیونکہ جب روح سے جسم کا پردہ (بذریعہ موت) زائل ہو جاتا ہے تو اپنی پہلی حالت کی طرف لوٹ آتی ہے۔ پھر فرمایا کہ جب اللہ تعالیٰ کسی ولی کو فتحِ کبیر

---

[1] شیخ الاسلام علم الدین بلقینیؒ: علم الدین صالح بن السراج البلقینی شافعی متوفی ۸۶۸ھ / ۱۴۵۹ء ان کی ایک تفسیر ہے ان کے بھائی جلال الدین عبدالرحمٰن بلقینی متوفی ۸۲۴ھ / ۱۴۲۱ء نے بھی ایک تفسیر لکھی ہے۔ فتاویٰ جس کا یہاں حوالہ دیا گیا ہے۔

(یعنی مرتبہ غوثیت) عطا کرتا ہے تو وہ کسی سے سیکھنے کے بغیر ہی اس زبان میں گفتگو کر سکتا ہے کیونکہ اس پر روح کا حکم غالب ہوتا ہے، پھر مُردے کا تو کیا پوچھنا، لہٰذا اس کو سریانی میں بات کرنے میں کوئی دقت پیش نہ آئے گی۔

سوال وجواب کے الفاظ

میں نے عرض کیا حضرت ہماری درخواست ہے کہ قبر کے سوال وجواب کی کیفیت بیان فرما کر ہمیں ممنون فرمائیے۔

مُرَازہُو

حضرت نے جواب دیا: منکر ونکیر سریانی زبان میں میت کو مُرَازہُو کہیں گے اس کا تلفظ یوں فرمایا: اول میم مفتوحہ اور اس پر ہلکی سی تشدید پھر راء مفتوحہ اور پھر الف پھر راء ساکن اور آخر میں مضمومہ کے ساتھ واؤ خفیف سکون لیے ہوئے اور دل چاہے ہ پر وقف کر لو اور اس کے بعد ذرا کھینچو کہ ہلکی سی واؤ پیدا ہو جائے۔

ان حروف کے معانی سریانی زبان میں ان کے حقیقی معنوں سے معلوم ہو سکتے ہیں۔

م۔ پہلا حرف جو زبر والی میم ہے تمام کائنات اور ساری مخلوقات پر دلالت کرنے کے لیے وضع کی گئی ہے

ر۔ دوسرا حرف رَان تمام خوبیوں کے لیے وضع کیا گیا ہے جو اس کائنات میں موجود ہیں۔

ز۔ کائنات کی برائیوں کے لیے وضع کی گئی ہے۔

ہ۔ جس کے کشش ہے۔ اس ذات مقدس پر دلالت کرنے کے لیے وضع ہوئی ہے جس نے تمامی عوالم کو پیدا کیا۔ سُبْحَانَہٗ لَآ اِلٰہَ اِلَّا ھُو۔

پس حرف اول سے اشارہ ہوا ہے تمامی کائنات کی طرف اور حرف دوم سے اشارہ ہوا ان خوبیوں کی طرف جو کائنات میں موجود ہیں اور ان میں سید الوجود صلی اللہ علیہ وسلم، تمام انبیاء، فرشتے، آسمانی کتابیں، جنت، لوح، قلم اور وہ تمام انوار جو آسمانوں اور زمینوں میں ہیں اور جو کچھ عرش کے اندر اور اس کے نیچے ہیں، سب داخل ہو جائیں گے اور تیسرے حرف زؔ سے اشارہ ہوا تمام برائیوں کی طرف کہ اس میں جہنم اور ہر ذات خبیث مثلاً شیطان اور ہر وہ چیز جس میں گندگی اور شر ہو سب داخل ہو جائیں گے اور حرف چہارم ھؔ سے جو اللہ تبارک وتعالیٰ تک پہنچانے والی ہے۔

حضرت نے فرمایا: سریانی زبان کا طریقہ ہے کہ بعض معانی کے لیے صرف ارادے پر اکتفا کی جاتی ہے اور ان کے لیے کوئی الفاظ وضع نہیں کیے جاتے۔ مثلاً قسم، استفہام وتمنیٰ وغیرہ، چنانچہ یہاں استفہام مراد ہے حالانکہ اس پر دلالت کرنے والا کوئی حرف نہیں کیونکہ سوال کا قرینہ موجود ہے گویا یوں پوچھا گیا ہے کہ تمام کائنات، انبیاء، ملائکہ، کتب سماویہ، جنت، تمام خوبیوں اور شیاطین اور تمام برائیوں کا

خالق اللہ سبحانہٗ ہیں یا کوئی اور؟

مُرادازیرہُو

حضرت نے فرمایا اب رہا جواب، سو اگر میت مومن ہوگی تو وہ جواب میں مرادازیرہو کہے گی اور اسے یوں ضبط کیا: میم مفتوح بتشدید ضعیف پھر راء مفتوح پھر الف ساکن، پھر دال ساکن، دال کے بعد ہمزہ مفتوح پھر زاء مکسور پھر یاء ساکن اور یا کے بعد راء ساکن اور پھرہ مضموم جس کے ساتھ ہلکے سے سکون والی واؤ ہے ان حروف کے معانی یہ ہیں کہ پہلے حرف کا اشارہ جیسا کہ بیان کیا جاچکا تمام کائنات اور مخلوقات کی طرف ہے دوسرے حرف کا اشارہ نور محمدی صلی اللہ علیہ وسلم اور ان تمام انوار کی طرف ہے جو آپ سے نکلے مثلاً انوار ملائکہ، انوار انبیاء، مرسلین، انوار لوح وقلم اور نور برزخ اور ہر وہ چیز جس میں نور پایا جائے۔ ہم نے جواب میں اس حرف کی یہ تفسیر اس لیے بیان کی ہے حالانکہ سوال میں مذکورہ بالا تشریح دی تھی کہ جواب دینے والا امّتِ محمدیہ میں سے ہے لہٰذا وہ چاہتا ہے کہ وہ سلک محمدیؐ میں داخل ہو اور آپ کے جھنڈے کے سایہ میں آجائے اسی لیے جواب میں ان حروف سے وہی معنی مراد لیے ہیں جن کا ہم نے ذکر کیا۔ تاہم سوال میں اس کی تفسیر تمام خیرِ امت کی گئی ہے، یہ اس کے بھی مخالف نہیں ہے۔ اس لیے کہ ہر خیر نور محمدی صلی اللہ علیہ وسلم سے متفرع ہوئی ہے اور حرف سوم یعنی دال سے اشارہ ہے ان تمام چیزوں کے برحق ہونے کی جانب جو پہلے حرف میں داخل تھیں گویا کہ میت جواب میں یہ کہہ رہی ہے کہ ہاں سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم برحق ہیں۔ تمام انبیاء برحق ہیں، تمام فرشتے برحق ہیں ان میں سے کسی میں بھی شک نہیں اور تمام وہ چیزیں بھی برحق ہیں جو حرفِ سابق میں داخل ہیں۔ پھر حرف چہارم یعنی ہمزہ مفتوحہ اپنے مابعد کے مدلول کی طرف اشارہ کرتا ہے کیونکہ سریانی زبان میں ہمزہ مفتوحہ حروف اشارہ میں سے ہے جیسے ھٰذَا اور ھٰذِہٖ عربی زبان میں اور پانچواں حرف زاء جیسا کہ ذکر ہوچکا شر اور برائی پر دلالت کرتا ہے چنانچہ ظلمت حقیقی اور ہر وہ ظلمت جو اس سے متفرع ہوئی ہو اس کی تحت میں آجاتی ہے لہٰذا اس سے دوسرے حرف کی ضد مراد ہوئی اس لیے اس میں جہنم اور ہر وہ شئے جس میں ظلمت و شر ہو داخل ہوجاتی ہے، اور راء ساکنہ سے اشارہ ہے ہر اس چیز کے حق ہونے کا جو حرف سابق یعنی زٓ میں داخل ہے جس کوی کے ساتھ اشباع دیا گیا ہے اور ہ جس میں ضمہ کے کھینچنے سے واؤ پیدا ہوگئی ہے اشارہ ہے ذات علیہ کی طرف بایں لحاظ کہ وہ خالق ہے۔ مالک ہے متصرف ہے۔ قاہر ہے، مختار ہے پس حاصل جواب یہ ہوا کہ تمام کائنات کا اور ہمارے نبی برحق کا اور تمام انبیاء کا جو کہ برحق ہیں اور تمام فرشتوں کا جو کہ برحق ہیں اور عذاب جہنم کا جو کہ برحق ہے اور ہر قسم کی شر کا جو کہ برحق ہے سب کا پیدا کرنے والا

سب کا مالک، سب کا تصرف کرنیوالا اور مختارِ کل وہی اللہ سبحانہ ہے جو ایک ہے جس کا نہ کوئی مخالف اور نہ شریک ہے اور نہ کوئی اس کے حکم کو ٹالنے والا ہے۔

پھر فرمایا: جب مردہ یہ صحیح جواب دیتا ہے تو فرشتے اس سے کہتے ہیں ناصِر۔ بنون مفتوحہ جس کے بعد الف ہے اور الف کے بعد ص مکسورہ ہے اور ص کے بعد راء ساکن ہے اس کے معنی بھی سریانی حروف کی وضع سے معلوم ہو جائیں گے چنانچہ پہلا حرف نا بنُونِ مفتوحہ اور اس کے بعد الف، اس نور پر دلالت کرتا ہے جو ذات میں ساکن اور اس میں چمک رہا ہے دوسرا حرف ص مکسورہ ہے مٹی پر دلالت کرتا ہے اور راء ساکنہ دلالت کر رہی ہے ماقبل کے حق ہونے کی طرف اس کا مطلب یہ ہوا کہ ہاں تیرا نورِ ایمان جو تیری ذاتِ ترابی میں جس کی اصل مٹی ہے ساکن ہے اور وہ حق اور صحیح ہے، واقعہ کے مطابق ہے جس میں کوئی شک وشبہ نہیں۔ لہٰذا یہ مفہوم حدیث نبوی کے ان الفاظ کے قریب ہے نَم صالحًا[1] فَقَد عَلِمنَا اِن کُنتَ لَمُوقِنًا اچھا اب آرام سے سو جاؤ ہمیں معلوم تھا کہ تم صاحبِ یقین وایمان ہو۔

کلماتِ قرآنیہ کے متعلق سوال

میں نے حضرت سے ان کلماتِ قرآنیہ کے متعلق پوچھا جن کے متعلق علماء میں اختلاف ہے کہ وہ سریانی زبان کے ہیں یا کسی اور زبان کے۔

۱۔ اَسۡفَارًا

ان میں ایک لفظ اَسۡفَارًا ہے۔ واسطی[2] نے الاَرشاد میں لکھا ہے کہ یہ لفظ سریانی ہے جس کے معنی کتب (کتابوں) کے ہیں اور ابن ابی حاتم[3] نے ضحاک[4] سے نقل کیا ہے کہ یہ قبطی لفظ ہے۔ بمعنی کُتُب۔ یہ الاتقان فی علوم القرآن کا بیان ہے۔

---

[1] دوسری حدیث میں ہے نَم کنومة عروس

[2] واسطی: ابو العز محمد بن حسین بن بندار القلانسی الواسطی متوفی ۵۲۱ھ و ۱۱۲۵ء ان کی کتاب کا پورا نام ارشاد المبتدی وتذکرۃ المنتہی ہے۔ اس میں دس قراءتوں پر بحث کی گئی ہے۔

[3] ابن ابی حاتم: شیخ الاسلام ابو محمد عبد الرحمٰن بن ابی حاتم ۲۴۰ھ، ۸۵۴ء میں پیدا ہوئے۔ یہ بہت بڑے زاہد تھے اور ان کا شمار ابدال میں ہوتا ہے کہتے ہیں کہ کسی دوست نے انہیں قحط کے زمانے میں اصفہان سے کوئی جانور بھیجا جسے انھوں نے بیس ہزار کو بیچ دیا۔ اس دوست نے کہلا بھیجا کہ اس سے ایک مکان خرید لیں مگر انھوں نے تمام روپیہ فقراء میں تقسیم کر دیا اور دوست کو لکھ بھیجا کہ میں نے تمہارے لیے جنت میں محل خرید لیا ہے

(بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر)

حضرت نے فرمایا یہ سریانی لفظ ہے بمعنی کتب اور واسطی کا قول درست ہے اور تمام کلمہ کے معنی وہ خوبیاں ہیں جو طاقتِ بشر سے باہر ہیں کیونکہ ہمزہ کا اشارہ مابعد کی طرف اور سین ساکن وضع ہوا ہے، محاسن اشیاء کے لیے اور فاء مفتوحہ اس چیز کا نام ہے جو طاقت بشری سے خارج ہو اور ر مفتوح کا دوسرا اشارہ ہے۔ محاسن کی طرف۔ مطلب یہ ہوا کہ وہ کتابیں جن میں ایسی خوبیاں ہیں جو بشری طاقت سے باہر ہیں۔ واللہ تعالی اعلم۔

۲- اَلرَّبَّانِیُّوْنَ

دوسرا لفظ رَبَّانِیُّوْنَ ہے جوالیقی[۵] کہتے ہیں: ابو عبیدہ[۶] کا قول ہے کہ اہل عرب کو رَبَّانِیُّوْن کے لفظ کا علم نہیں اور میرا خیال ہے کہ یہ لفظ یا تو عبرانی ہے یا سریانی لیکن ابوالقاسم[۷] نے یقینی طور پر اسے سریانی قرار دیا ہے اس کا ذکر سیوطی نے اتقان میں کیا ہے۔

حضرت نے فرمایا: یہ لفظ سریانی ہے جس کے معنی وہ لوگ ہیں جنھیں حق تعالیٰ نے بغیر تعلّم کے فتح عطا کی ہو اور یہ مرکب ہے تین کلموں سے رَبَّا[۱]۔ نِیْ[۲]۔ یُوْنَ[۳]۔ پھر آپ نے اس کی یوں تشریح کی کہ ر اء مفتوحہ اشارہ ہے خیرِ کثیر کی طرف جس پر باء مشدّدہ دلالت کر رہی ہے گویا یوں کہا جا رہا ہے کہ یہ خیرِ کثیر ہے اور دوسرے کلمے کی تشریح یہ ہے کہ نون مکسورہ اشارہ ہے قرب کی طرف اور تیسرے کلمے کی شرح

(بقیہ حاشیہ صفحہ سابقہ)

اور دوست نے کہا کہ اگر آپ ضامن ہیں تو میں راضی ہوں انھوں نے ضمانت دیدی اس کے بعد انہیں خواب میں کہا گیا ہم نے تمہاری ضمانت قبول کر لی ہے مگر آئندہ سے ایسا نہ کرنا۔ ان کی وفات ۳۲۷ھ ء۹۳۸ء میں ہوئی۔

۴ ضحاک: ضحاک بن مخلد بن ضحاک شیبانی بصری۔ ثقہ ہیں۔ انھوں نے کثرت سے روایت حدیث کی، ان کی وفات ۲۱۴ھ میں ہوئی۔

---

۵ الجوالیقی: ابو موہوب بن ابی لاہر احمد بن محمد بن الخضر الجوالیقی البغدادی الادیب اللغوی۔ بغداد کی قابل فخر ہستیوں میں سے تھے انھوں نے ادب ابوزکریا تبریزی سے پڑھا اور بہت سی تصانیف کیں ۴۶۶ھ میں پیدا ہوئے اور ۵۳۹ھ میں وفات پائی۔ انھوں نے حریری کے درۃ الغواص کا تتمہ لکھا جس کا نام التکملہ فیما یلحن فیہ العامہ (کشف: ۱: ۳۷۱)

۶ ابو عبیدہ: معمر بن مثنّیٰ ابو عبیدہ نحوی ولغت دان تھا۔ اس کی وفات تقریباً ۲۱۰ھ ء۸۲۵ء میں ہوئی۔

۷ ابوالقاسم عبدالعزیز بن عبداللہ الدارکی: نیشاپور میں درس دیا اور ابواسحٰق مروزی سے فقہ کی تعلیم حاصل کی اور عامۃ شیوخ بغداد نے اُن سے علم حاصل کیا۔ انھوں نے ۳۷۵ھ ء۹۸۵ء میں وفات پائی۔

یہ ہے کہ یاء مضمومہ اشارہ ہے اس چیز کی طرف جو ایک حالت پر برقرار نہ رہے جیسے بجلی اور نور اور نون مفتوحہ اشارہ ہے اس خیر کی طرف جو ذات میں جاگزیں اور اس میں مشتعل ہے، مطلب یہ ہے کہ یہ خیر و خوبی جو میرے قریب ہے اور اہلِ فتح کی ذات میں پائی جاتی ہے انوار الٰہیہ میں سے ایک نور ہے اور اسرار الٰہیہ میں سے ایک سِر ہے اور وہ ان کی ذات میں جاگزیں اور مشتعل ہے۔

۳۔ هَيْتَ لَكَ اسی طرح لفظ هَيْتَ لَكَ (سورۂ یوسف آیت ۲۳) ابنِ حاتم نے ابن عباس سے روایت کی ہے کہ هَيْتَ لَكَ کے معنی قبطی زبان میں آؤ اور حسن[1] نے اسے سریانی کہا ہے۔ ابنِ جریر کی بھی یہی روایت ہے، عکرمہ[2] کہتے ہیں کہ حورانی لفظ ہے۔ یہی روایت ابوالشیخ[3] کی ہے۔ ابوزید[4] الانصاری کہتے ہیں کہ یہ عبرانی لفظ ہے اور اصل میں هیتلہ ہے یعنی آؤ۔ یہ بیان اِتقان کا ہے۔

حضرت نے فرمایا: یہ سریانی لفظ نہیں۔ واللہ تعالیٰ اعلم

۴۔ شہر اسی طرح شہر کا لفظ ہے جوالیقی کہتے ہیں کہ اہل لغت نے ذکر کیا ہے کہ یہ لفظ سریانی ہے۔

حضرت نے فرمایا: یہ سریانی نہیں۔ سریانی زبان میں شہر کے معنی پانی کے ہیں۔
مؤلف کہتا ہے جو اس کلمہ کے حروف کی تفسیر جانتا ہے اسے اس میں شک نہ ہوگا۔ واللہ تعالیٰ اعلم۔

۵۔ عَدْن ایک اور لفظ عَدْن ہے۔ ابن جریر نے ذکر کیا ہے کہ ابن عباس نے کعب سے جَنّٰتُ عَدْنٍ کے معنی پوچھے تو کعب[5] نے کہا کہ سریانی میں اس کے معنی انگوروں کے باغات کے ہیں۔ ابن جریر نے اپنی تفسیر میں اسے رومی بتایا ہے یہ بیان اتقان کا ہے۔

---

[1] حسن: حسن سے حسن بصریؒ مراد ہے۔

[2] عکرمہ: ابن عباس کے آزاد کردہ غلام تھے۔ ان کا ذکر پہلے آچکا ہے۔

[3] ابوالشیخ: حافظ اصبہانی ابوالشیخ عبداللہ بن محمد بن جعفر بن حیان۔ ان کی بہت سی تصانیف ہیں۔ ۲۷۴ھ ۸۸۷ء میں پیدا ہوتے اور ۳۶۹ھ ۹۷۹ء میں وفات پائی۔

[4] ابوزید الانصاری: صحابی ہیں۔ انھوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد میں ہی قرآن حفظ کر لیا تھا ان کے نام میں اختلاف ہے بعض سعید بن عمیر کہتے ہیں اور بعض قیس بن السکن۔

[5] کعب: ابو اسحٰق کعب بن نافع الحمیری جو کعب الاحبار کے نام سے مشہور ہیں ان کی وفات حمص میں ایک سو چار برس کی عمر میں ۳۳ھ ۶۵۳ء میں عہد عثمان میں ہوئی۔

حضرت نے فرمایا یہ سریانی لفظ ہے اور اس لفظ کی ایک بلند تشریح بیان کی۔

۶۔ رَهْوًا

ایک اور لفظ رَهْوًا ہے واسطے کہتے ہیں وَاتْرُكِ الْبَحْرَ رَهْوًا کے معنی سریانی زبان میں "ساکن" کے ہیں۔ ابوالقاسم نے قبطی زبان بتایا ہے اور اس کے معنی سَہل بتاتے ہیں۔

حضرت نے فرمایا: یہ سریانی لفظ ہے اور اس کے معنی ایسی قوت کے ہیں جس کی کوئی شخص طاقت نہ رکھ سکتا ہو چنانچہ اگر ہم کہیں کہ فلاں شخص رہو ہے یعنی اتنا قوی ہے کہ کوئی اس کے مقابلے کی طاقت نہیں رکھتا یا یوں کہیں کہ یہ شخص رہو قوم میں سے ہے یعنی ایسی قوم میں سے ہے کہ کوئی قوم ان کے مقابلے کی تاب نہیں لا سکتی۔

مؤلف کہتا ہے کہ اب آیت کے معنی ظاہر ہیں اور جو شخص اس کلمے کے حروف کی تفسیر کو پہچان لے اسے شیخ کے بیان میں شک وشبہ نہ رہے گا، واللہ تعالیٰ اعلم۔

غرض اسی قسم کے بہت سے الفاظ میں نے حضرت سے دریافت کیے جن کا آپ نے جواب دیا، لیکن میں نے قارئین کے ملال کے خوف سے ان کا ذکر نہیں کیا۔

ان سریانی کلمات کی تشریح سننے کے بعد میں سمجھ گیا کہ حضرت نے مذکورہ الفاظ مثلاً مشفح ومشیخا والانجیل ووالمنحمنّا واحمی حمیثا وغیرہ الفاظ کا ہی جواب دے رہے ہیں۔ اس پر میں نے حضرت سے درخواست کی کہ ہر کلمے کی تشریح ان کے حروف کی اصل وضع کے اعتبار سے بیان کریں تو حضرت نے یہ سب کچھ ایک ایک حرف کر کے بیان کر دیا، لیکن بخوف طوالت میں نے ان کا ذکر نہیں کیا۔ واللہ تعالیٰ اعلم۔

حضرت سے میں نے سنا کہ غوث کے سوا سریانی زبان کو کوئی شخص نہیں جانتا یا وہ اقطاب سبعہ جانتے ہیں جو اس کے ماتحت ہوتے ہیں۔ سیدی احمد بن عبداللہ نے یہ زبان مجھے تقریباً ایک ماہ میں سکھائی تھی۔ یہ ۱۱۲۵ھ کی بات ہے۔

مؤلف کہتا ہے میں نے یہ کلام حضرت سے ۴ ذی الحجہ ۱۱۲۹ھ کو سُنا۔ سیدی احمد بن عبداللہ سے حضرت کی مراد وہ احمد ہیں جو آپ سے پہلے جیسا کہ ذکر ہو چکا غوث تھے اور وہ جیسا کہ ہم بیان کریں گے، ان دس اولیاء میں سے تھے جن کی وراثت حضرت شیخ کو ملی اور ۱۱۰۹ھ میں ذی القعد کے آخر میں جیسا کہ آخر میں نے ان سے سنا ایک اور بڑے ولی کی وراثت بھی ان کو جن کا نام سیدی ابراہیم لَمْلَمْز ہے۔ دو مفتوحہ لاموں کے درمیان میم ساکن ہے جن کے آخر زاء ہے۔ حضرت نے اس کا تلفظ اسی طرح بتایا تھا۔ جس زمانہ میں سید احمد بن عبداللہ حضرت کو سریانی زبان کی تعلیم دے رہے تھے۔ یہ حضرت کی فتح کا ابتدائی

زمانہ تھا۔ انھوں نے حضرت کو سریانی زبان اس لیے سکھائی کہ ان کو علم تھا کہ حضرت قطب بننے والے ہیں چنانچہ تھوڑی مدت بعد ہی آپ قطب بن گئے۔

اس بات کی دلیل کہ اس زبان کو ان خاص اولیاء کے سوا جن کی طرف حضرت نے اشارہ کیا کوئی نہیں جانتا۔ بڑے بڑے اولیاء سے منقول وہ نصوص ہیں جو فواتح السُّوَر کی تشریح میں انھوں نے بیان کیے

پھر حضرت نے سریانی زبان میں حروف تہجّی کی اصل وضع و معانی ۸ ذی الحجہ ۱۱۲۹ھ میں مجھے سکھائے۔ بحمد اللہ میں ایک دن میں سب سمجھ گیا تو فرمایا میں نے تو ایک ماہ میں سیکھی تھی اور تم ایک ہی دن میں سیکھ گئے۔ میں نے آپ کے ہاتھ کو بوسہ دیا اور عرض کی کہ یہ حضرت ہی کی برکت اور پڑھانے و سمجھانے کا سلیقہ ہے، واللہ تعالیٰ اعلم۔

۱۱۲۹ھ میں رمضان شریف کے آخر میں ایک دن میں حضرت سے إِذَا الشَّمْسُ كُوِّرَتْ (سورہ تکویر پارہ ۳۰ آیت ۱) ذکر کر رہا تھا کہ میں نے حضرت سے دریافت کیا کہ یہ جو مشہور ہے کہ قرآن مجید کے ہر کلمہ کے ایک ظاہری معنی ہیں اور ایک باطنی۔ کیا یہ درست ہے؟

حضرت نے فرمایا یہ سچ ہے چنانچہ إِذَا الشَّمْسُ كُوِّرَتْ کے بھی ظاہری اور باطنی معنی ہیں چنانچہ اس کا ظاہر آخر کی تصدیق کرتا ہے اور اس کا باطن اوّل کی۔

میں نے عرض کیا کہ آخر سے آپ کی مراد کیا ہے؟

فرمایا: آخر سے مراد وہ امور ہیں جو قیامت کے دن محشر میں واقع ہوں گے اور اول سے مراد وہ امور ہیں جو عالم ارواح میں واقع ہوئے۔

اس کے بعد آپ نے عالم ارواح کی بعض اشیاء کا ذکر کیا کہ نہایت تعجب انگیز تھا اور آپ نے محیّر العقول باتیں بیان کیں۔ یہ امور اسرار خداوندی میں سے ہیں جن کا ذکر کرنا منع ہے۔

پھر میں نے آپ سے اس آیت کے متعلق پوچھا جس کا ظاہر عالم ارواح میں ہے مثلاً وَإِذْ أَخَذَ رَبُّكَ مِنْ بَنِيْ آدَمَ مِنْ ظُهُوْرِهِمْ ذُرِّيَّتَهُمْ (سورہ اعراف آیت ۱۷۲) اور عرض کیا اس کا باطن کہاں ہے؟

حضرت نے فرمایا اس کا باطن وہ امور ہیں جو علم ازلی اور پہلی تقدیر میں گزر چکے۔

نیز آیت اِنَّ الْمُنَافِقِيْنَ فِي الدَّرْكِ الْأَسْفَلِ مِنَ النَّارِ (سورۂ نساء آیت ۱۰۱) کے متعلق پوچھا کہ اس کے باطنی معنی کیا ہیں؟

فرمایا وہ ظلمت جو عالمِ ارواح میں تھی۔ اسی ظلمت سے جہنم پیدا ہوئی۔ خدا ہمیں اس سے پناہ دے

چنانچہ اس ظلمت کے اندر ارواحِ منافقین کا اسی طرح کا مقام ہے جس طرح کا مقام ان کے اجسام کے لیے جہنم میں ہے خدا ہمیں اس سے محفوظ رکھے۔

میں نے عرض کیا کہ اس باطن کے جاننے کا کوئی سبب بھی ہے؟

فرمایا: یہ کشف کے بغیر حاصل نہیں ہو سکتا مگر جو سریانی زبان سمجھ جائے اور حروف کے اسرار کا اُسے علم ہو جائے تو اس سے باطنِ قرآن کے جاننے میں بہت ہی مدد ملے گی اور اسے عالم ارواح، دنیا، دارِ آخرت، آسمانوں اور زمینوں اور عرش کی باتوں کا علم ہو جائے گا اور اسے علم ہو جائے گا کہ قرآن عزیز میں جن کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ ان کی کوئی انتہا نہیں اور اسے اس آیت کے معنی معلوم ہو جائیں گے مَا فَرَّطْنَا فِی الْکِتَابِ مِنْ شَیْئٍ (سورۂ انعام آیت ۳۸) واللہ تعالیٰ اعلم

کیا قرآن مجید لوحِ محفوظ میں عربی میں لکھا ہوا ہے

پھر میں نے دریافت کیا کہ کیا قرآن مجید لوح محفوظ میں عربی زبان میں لکھا گیا ہے؟ حضرت نے فرمایا: ہاں اور کچھ حصّہ سریانی میں بھی لکھا ہوا ہے۔

میں نے عرض کیا کہ سریانی میں لکھا ہوا کونسا حصّہ ہے؟

فرمایا: سورتوں کی ابتدا میں جو حروفِ مُقطّعات ہیں۔

میں نے کہا برسوں سے جس چیز کی مجھے تلاش تھی، وہ آج ہاتھ آئی۔ میری حضرت سے ملاقات رجب ۱۱۲۵ھ میں ہوئی اور میں آپ سے گفتگو کرتا رہا اور ولایت سے متعلق امور کے متعلق پوچھتا رہا میں نے حضرت سے وہ باتیں سنیں کہ میں حیران رہ گیا۔ جب حضرت نے دیکھا کہ مجھے آپ کے جواب پسند آتے ہیں، تو فرمایا: تیرا جو دل چاہے پوچھ۔ اس پر میں نے سورتوں کی ابتدا میں حروفِ مقطّعات کے متعلق دریافت کیا کہ صٓ۔ وَالْقُرْآنِ ذِی الذِّکْرِ (سورۂ ص، پارہ ۲۳ آیت ۱) کے کیا معنی ہیں؟

حضرت نے فرمایا: اگر لوگوں کو ص کے معنی اور اس کی حقیقت کا علم ہو جائے تو کسی کو بھی اللہ کے حکم کی مخالفت پر کبھی جرأت نہ ہو، مگر آپ نے اس کی تشریح نہیں کی۔

کٓھٰیٰعٓصٓ

پھر میں نے کٓھٰیٰعٓصٓ کے معنی دریافت کیے۔

فرمایا: اس میں عجیب راز ہے اور جو کچھ بھی اس سورۂ مریم میں مذکور ہے مثلاً حضرت زکریاؑ، حضرت یحییٰؑ، حضرت مریم، حضرت عیسٰیؑ، حضرت ابراہیمؑ، حضرت اسمٰعیلؑ، حضرت اسحٰقؑ، حضرت یعقوبؑ، حضرت موسٰیؑ، حضرت ہارونؑ، حضرت ادریسؑ، حضرت آدم و نوح علیہم وعلیٰ نبیّنا السلام کے قصے

اور ہر وہ قصّہ جس کا ذکر اس کے بعد سورۃ میں آیا ہے وہ سب کٓھٰیٰعٓصٓ کے معنی میں داخل ہے اور اس سے زیادہ حصّہ اس کے معنی کا ابھی باقی رہ گیا ہے۔

پھر فرمایا کہ یہ رموز لوحِ محفوظ میں لکھی ہوئی ہیں اور ہر رمز کے ساتھ اس کی شرح بھی لکھی جاتی ہے لہٰذا ان رموز کو بڑی شکلوں میں لکھا جاتا ہے اور ان کی تشریح کبھی اوپر کبھی نیچے اور کبھی درمیان میں لکھی جاتی ہے، اس کی تشبیہ تو یہ ہو سکتی ہے جس طرح کہ منصف مزاج آدمیوں کو جب کوئی لفظ دستاویز میں سے چھوٹ گیا ہو اور پھر یاد آ جائے تو وہ اس حرف کو حرفوں کے اوپر بہار کی شکل میں درج کر لیتے ہیں چنانچہ سورۃ کے ابتدائی حروف اسی شکل کی طرح ہیں اور جو کچھ باقی سورۃ میں دیا ہے وہ اس کی تفسیر ہے لوحِ محفوظ کا یہی دستور ہے کہ پہلے رمز ہوگی پھر اس کی تفسیر۔ اس سے فارغ ہو کر دوسرے رموز و تشریحات آئیں گی۔ یہ سلسلہ اسی طرح آخر تک چلتا ہے اور تفسیر حرف کے بیچ میں لکھی جاتی ہے جب حرف ص کی شکل کا ہو۔ یہی وجہ ہے کہ ص کی شکل لوحِ محفوظ میں اتنی بڑی نظر آتی ہے کہ کوئی چلے تو کم و بیش ایک دن میں اس کی مسافت کو طے کرے۔

پھر فرمایا کہ سورتوں کے ابتدائی حروف کا علم صرف دو شخصوں کو ہوتا ہے، ایک وہ جس کی نظر میں لوحِ محفوظ ہو یا وہ شخص جو اہل تصرف دیوان الاولیاء سے میل جول رکھتا ہو۔ ان دونوں شخصوں کے سوا کسی کو فواتح السُّور کے جاننے کی ہرگز خواہش نہیں کرنی چاہیئے۔

الٓمٓ پھر میں نے دریافت کیا کہ الٓمٓ جو سورہ بقرہ کے شروع میں ہے اور الٓمٓ جو سورۂ آلِ عمران کے شروع میں ہے کیا ان دونوں کا اشارہ ایک ہی شئ کی طرف ہے یا دونوں کے معنی مختلف ہیں؟

حضرت نے فرمایا: دونوں کے الگ الگ معنی ہیں اور ہر ایک کی تشریح ان مضامین سے کر دی گئی ہے جو اس سورت میں ہیں۔ مَیں نے یہ تقریر حضرت سے ابتدائی ملاقات کے زمانے میں سُنی تھی اور میں سمجھ گیا تھا کہ وہ اکابر اولیاء میں سے ہیں۔ کیونکہ میں نے اکابر صوفیہ کو دیکھا ہے کہ جب فواتِح سُور کا ذکر کرتے ہیں اور جن باتوں کا ذکر حضرت نے کیا ہے ان کی طرف اشارہ کرتے ہیں تو یہ بات واضح الفاظ میں کہہ دیتے ہیں کہ فواتِح سُور کے معانی صرف وہ اولیاء جانتے ہیں جو اوتادالارض ہیں لہٰذا یہ میرے لیے اس بات کی بڑی شہادت تھی کہ حضرت جلیل القدر ولی ہیں۔ خدا ہمیں ان کی محبت عطا کرے اور ہمیں ان علوم تک پہنچائے جو آپ سے ظاہر ہوتے تھے، حالانکہ آپ نے یہ علوم نہ بڑے ہو کر نہ بچپن میں پڑھے تھے۔ بلکہ قرآن مجید تک نہ پڑھا تھا اور آپ کو صرف چند ایک سورتیں یاد تھیں اور وہ بھی وہ سورتیں

جن کی ابتدا متشابہ سے ہوتی ہے مگر جب آپ انہیں قرآن مجید کی تفسیر کرتے سن لیں تو آپ نہایت ہی عجیب باتیں سنیں گے۔ اکابرِ صوفیہ کی یہ واضح عبارتیں ہیں جو آپ کی ولایت کی شاہد ہیں اور ان تمام باتوں کی شاہد ہیں جن کی طرف حضرت نے اشارہ کیا۔

چنانچہ حکیم ترمذی نوادر الاصول[1] میں فرماتے ہیں کہ سورتوں کے ابتدائی حروفِ مقطّعات میں ان مضامین کی طرف اشارہ ہے جو ان سورتوں میں بیان کیے گیے ہیں اور اس کا علم صرف ان لوگوں کو ہے جو اللہ کی زمین پر اللہ کے حکیم ہیں اور اوتاد الارض ہیں۔ انہیں یہ علم اللہ کی عنایت سے ملا اور یہ شریف فلسفی ہوتے ہیں اور یہ ایسی قوم ہے جن کے دل خدا کی وحدانیت تک پہنچ گئے اور اس علم کو انھوں نے خدائے واحد سے حاصل کیا۔ یہ علم حروفِ معجم کا علم کہلاتا ہے۔ انہی حروف سے تمام علوم کی تعبیر کی جاتی ہے اور انہی حروف سے اسمار خداوندی کا ظہور ہوا جس کو لوگوں نے اپنی زبانوں میں ادا کیا۔ اور اس عبارت کو ولی عارف باللہ سیّدی ابو زید عبد الرحمٰن[2] فاسی نے قطب کبیر ابو الحسن شاذلی[3] کی حزبِ کبیر کے حاشیہ میں نقل کیا ہے۔ ابو زید[4] فاسی اسی حاشیہ میں فرماتے ہیں کسی ایک صوفی نے کہا ہے کہ حروف و اسمار کی معرفت خصوصیات علوم انبیا میں سے بلحاظ اولیار ہونے کے ہے۔ یہی وجہ ہے اولیار اور انبیار دونوں اس علم میں شریک ہوتے ہیں کیونکہ یہ کشفی علوم میں سے ہے اس لیے عقل کے سرمایہ کے ساتھ ان علوم میں تصرف کرنا بے سود ہے بلکہ جو اس علم سے ناواقف ہے وہ اسے جان ہی نہیں سکتا اور جو اس علم کو جان گیا وہ ناواقف نہیں رہ سکتا اور ہر ولی کو اتنا علم عطا ہوتا ہے جتنی کہ اسے فتح نصیب ہو۔ اسی لیے اولیار میں تفاوت پایا جاتا ہے اور ان کے اشارات میں بھی اختلاف پایا جاتا ہے۔ تُسْقٰى بِمَاءٍ وَّاحِدٍ وَّنُفَضِّلُ بَعْضَهَا عَلٰى بَعْضٍ فِي الْاُكُلِ۔ انہیں ایک ہی پانی (یہاں مرادِ نورِ خداوندی) سے سیراب کیا جاتا ہے مگر ہم پھل میں ایک کو دوسرے پر فضیلت دے دیتے ہیں)

(سورۂ رعد آیت ۴)

نیز اسی حاشیہ میں فرماتے ہیں کہ ورتجی نے اپنی تفسیر میں کہا ہے کہ حروف مقطّعات قرآنی سورتوں[5]

---

[1] نوادر الاصول فی معرفتہ اخبار الرسول: ابو عبد اللہ محمد بن علی بن حسن بن بشر المؤذن الحکیم ترمذی کی تالیف ہے۔ یہ ۲۸۶ھ تک زندہ تھے۔

[2] ابو زید عبد الرحمٰن فاسی: ابو زید عبد الرحمٰن بن محمد فاسی۔ انھوں نے شاذلی کی حزبِ کبیر کی شرح لکھی ہے۔

[3] ابو الحسن شاذلی: نوادر الاصول فی معرفتہ اخبار رسول کے مصنف ابو عبد اللہ محمد بن علی بن حسن بن شیر المؤذن الحکیم الترمذی

[4] ابو زید عبد الرحمن فاسی: ابو زید عبد الرحمٰن بن محمد فاسی انھوں نے شاذلی کی حزب کبیر کی شرح لکھی ہے۔

کے معانی کی رموز ہیں اور ان امور کے معانی کو ربّانیوں کے سوا کوئی نہیں جان سکتا۔

مؤلف حاشیہ سیدی عبدالرحمٰن فرماتے ہیں کہ اس پر یہ اعتراض وارد ہوتا ہے کہ ایک ہی رمز متعدد سورتوں میں مختلف معنوں میں آئی ہے جیسے الٓمٓ، حٰمٓ وغیرہ اس کا جواب یہ ہے کہ یہ رمز اس حرف کی طرح ہے جو کئی ایک معنوں میں مستعمل ہو۔ اھ۔

مؤلف کہتا ہے کہ ان اکابر کی اس عظیم شہادت پر غور کریں۔ عبدالرحمٰن فاسی نے اسی حاشیہ میں اور حوالے بھی درج کیے ہیں مثلاً سیدی عبدالنور کا، سیدی محمد بن سلطان کا، سیدی داؤد باخلی کا، سیدی شیخ ابوالحسن[1] شاذلی کی حزب البحر کی شرح میں تو آپ کو اس امام کبیر کے مرتبہ کا پتہ چل جائے گا۔ خدا ہمیں ان کی سچی محبت عطا کرے۔

مؤلف کہتا ہے کہ اوائل السُّور کے متعلق جو کچھ میں نے حضرت سے سنا، ان کے خاص معانی کی وجہ سے میں اُن سے مستفید نہ ہو سکا یہاں تک کہ ۸ ذی الحجہ ۱۱۲۹ھ کا دن آ گیا تو میں نے مذکورہ بالا بات حضرت سے سُنی اور وہ یہ ہے کہ قرآن کا کچھ حصہ لوحِ محفوظ میں سریانی زبان میں لکھا گیا ہے اور یہ حصّہ فواتح السُّور کا ہے (یعنی حروفِ مقطعات) اس پر میں نے حضرت سے درخواست کی کہ ہر حرف کی الگ الگ تشریح کریں اور ان تمام رموز کی شرح بیان کریں آپ نے بحمداللہ میری درخواست منظور کر لی۔ میں اس کا کچھ حصّہ بیان کرتا ہوں کیونکہ تمام کی تمام تشریح نقل کرنے کے لیے ایک مستقل تالیف کی ضرورت ہے۔

---

[1] ابوالحسن علی بن عبداللہ بن عبدالجبار شاذلی۔ یہ نابینا تھے اور صوفیہ کے شاذلی فرقہ کے بانی تھے ان کی وفات ۶۵۶ھ و ۱۲۵۸ء میں صحرائے عیذاب میں ہوئی جبکہ یہ حج کے لیے جا رہے تھے اور وہیں دفن ہوئے۔ شیخ ابوعبداللہ بن النعمان نے ان کے قطب ہونے کی شہادت دی ہے۔ شیخ تقی الدین بن دقیق العید نے بھی ان کی بزرگی کا اعتراف کیا ہے انھوں نے حزب البحر لکھی ہے جو صوفیاء کے ہاں بہت مقبول ہے، ایک حزب البحر صغیر اور دوسری کبیر۔ حزب البحر اسے اس لیے کہا گیا کہ یہ سمندر کے سفر میں اس کے مصائب سے نجات کی غرض سے لکھی گئی۔ واقعہ یوں ہوا کہ شاذلی رحمۃ اللہ نے بحر قلزم کا سفر اختیار کیا۔ سمندر کے درمیان جہاز رک گیا اور کئی دن تک ہوا بند رہی۔ نجات کی کوئی صورت نظر نہ آتی تھی کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا دیدار مبارک ہوا اور انھوں نے یہ دعا پڑھنے کی تلقین کی۔ چنانچہ انھوں نے یہ دعا پڑھی اور ہوا چل پڑی۔ اسے حزب صغیر بھی کہتے ہیں۔ اس کی ابتدا یا اللہ یا عَلِیُّ یا عظیم یا حلیم الخ سے ہوتی ہے حزب کبیر کی ابتدا واذا جاءک الذین لا یؤمنون سے ہوتی ہے۔ (کشف الظنون: ۱: ۳۳۳)

۱۔ ص ص کی تفسیر میں حضرت نے فرمایا کہ اس سورت میں ص سے مراد وہ خلا ہے جہاں روزِ محشر سب لوگ اور تمام مخلوقات جمع ہوگی اور آیت میں اسے بطور وعدہ وعید کے لایا گیا ہے مطلب یہ ہے کہ وہ ص ہے یعنی جس خوفناک منظر سے تم کو ڈرایا جاتا ہے اور وہ خوشنما منظر جس کی تم کو بشارت دی جاتی ہے وہ ص یعنی محشر کا وسیع میدان ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ خلا ہر انسان کے افعال کے تقاضا کے مطابق مختلف صورتیں اختیار کرتی ہے چنانچہ کافر کے لیے عذاب کی صورت اختیار کریگی اور اس کے پہلو میں ایک مومن ہوگا اس کے لیے رحمت بن جائے گی اور ایک اور کافر کے لیے جو اس مومن کے پہلو میں کھڑا ہوگا عذاب ہوگا مگر اس قسم کا نہیں جو پہلے کافر کو ہو رہا تھا، بلکہ کسی اور قسم کا ہوگا اسی طرح ایک اور مومن کے لیے جو اس مومن کے پاس کھڑا ہوگا رحمت ہوگی مگر اس قسم کی نہیں جو پہلے مومن کے لیے تھی، بلکہ کسی اور قسم کی اُس کے افعال کے تقاضا کے مطابق، اسی طرح جتنے لوگ بھی محشر میں جمع ہوں گے اُن میں ہر ایک پر جُدا قسم کی رحمت ہوگی اور جدا قسم کا عذاب اور باوجود اس کے کہ دیکھنے میں تو فضا ایک ہی ہے اور جس طرح کہ دنیا کی طبیعت کا تقاضا ہے، ایک جگہ دوسری جگہ کے مشابہ نہ ہوگی اور صاحبِ فتح اس تمام کو آنکھوں سے دیکھ سکتا ہے کہ زید اپنی تقدیر کی حکمت کے موافق اپنے مقام میں نظر آرہا ہے اور عمر اپنی جگہ پر۔ گویا کہ وہ اللہ کے سامنے کھڑے ہیں۔ اسی لیے تو میں نے کہا تھا کہ اگر لوگوں کو علم ہو جائے کہ ص سے کیا مراد اور اس کا کس طرف اشارہ ہے تو کوئی شخص بھی اللہ کے حکم کی مخالفت کرنے کی جرأت نہ کرے کیونکہ اگر لوگوں کے لیے پردہ اٹھا کر اُن کے مقام دکھا دیے جائیں تو اطاعت گذار رشک کرے کہ کاش اور عمل کرتا تو بہتر درجہ پاتا اور مخالف افسوس سے مر جاتے اور ظاہر ہے کہ اس مقام میں کفار بھی ہوں گے، مومن بھی، انبیاء بھی، ملائکہ بھی، جن اور شیاطین بھی۔ لہٰذا سورت کی ابتداء میں کافروں کی چند جماعتوں کا ذکر کر کے کفار کی طرف اشارہ کر دیا اسی طرح انبیاء کے ذکر کے دوران میں مومنین کا ذکر کر کے ان کی طرف اشارہ کر دیا اور سورت کے آخر میں جن اور شیاطین کا ذکر کر دیا اور ان کے دنیوی حالات کا تذکرہ کیا، اگرچہ یہ حالات محشر میں نہ ہوں گے اسی لیے کہ یہی حوال اس خلا میں جس میں ان کا حشر ہوگا۔ ان کے حالات کے اختلاف کا سبب بنیں گے۔ اس سورت کے متعلق اور بہت سے اسرار ہیں جن کا ظاہر کرنا روا نہیں۔ واللہ تعالیٰ اعلم۔

۲۔ کٓھٰیٓعٓصٓ کٓھٰیٓعٓصٓ کا مفہوم اس کے ہر حرف کی الگ الگ تشریح کے بعد سمجھ میں آئے گا چنانچہ کاف مفتوحہ کے معنی ہیں بندہ، اور ہاء ساکن مفتوحہ کے معنی کو محقق کرنے کے لیے آیا لہٰذا اس میں

فار مفتوحہ کے معنی اور تحقیق و تقریر دونوں مفہوم پائے جاتے ہیں اور فار مفتوحہ کے معنی ہیں ایسی چیز جس کی طاقت ہو، لہٰذا فار ساکن کے معنی ہوئے کہ اس کا لایطاق ہونا حق ہے جس میں شک کی گنجائش نہیں

ھا مفتوحہ کے معنی ہیں صاف و پاک رحمت جس میں کوئی کدورت نہیں اور یہ تغیّر پذیر ہے۔

یا حرفِ ندا ہے۔

ع (کہ تلفظ میں عین ہے) مفتوحہ، ایک حال سے دوسرے حال کی طرف منتقل ہونے پر دلالت کرتا ہے۔

ی ساکن یہاں اختلاط پر دلالت کرتی ہے۔

ن ساکن نون مفتوحہ کے معنی کی تحقیق کے لیے ہے اور نون مفتوحہ کے معنی ہیں وہ خیر و خوبی جو ذات میں قائم و شامل ہے۔

ص مفتوحہ سے مراد خلا ہے۔

اور دال ساکن ص کے معنی کو محقق کرتی ہے کیوں کہ یہ حروفِ اشارہ میں سے ہے اور حروف اشارہ اپنے ماقبل کے معانی کی تصدیق کرتے ہیں، برخلاف دوسرے حروف کے کیونکہ جب وہ ساکن ہوں تو اپنے مفتوح کے معانی کو محقق کرتے ہیں۔

اصلِ وضع کے مطابق حروف کی تفسیر کر دی گئی۔ اب معنی یوں ہوئے کہ اللہ تعالیٰ تمام مخلوقات کو نبی صلی اللہ علیہ وسلّم کے درجے اور بڑے مرتبے کی خبر دے رہا ہے اور اس بات کی اطلاع دے رہا ہے کہ اللہ تعالیٰ کا تمام مخلوقات پر یہ احسان ہے کہ انہیں ایسا بنایا کہ وہ اپنا نور اس نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلّم سے حاصل کریں۔ اس کی تشریح تفسیرِ سابق سے اس طرح ہوگی کہ کاف سے مراد یہ ہے کہ

ک نبی صلی اللہ علیہ وسلّم اللہ کے بندے ہیں۔ فار ساکن نے دلالت کی کہ آپؐ کی سی کوئی طاقت نہیں رکھ سکتا اور آپؐ کے ایسے ہونے میں کوئی شک و شبہہ نہیں اور آپؐ کے لایطاق ہونے سے یہ مراد ہے کہ آپؐ نے تمام مخلوقات کو عاجز کر دیا ہے کہ نہ کوئی پہلا آپؐ کے مرتبہ کو پاسکا نہ پچھلا پاسکیگا اسی لیے تو آپؐ سیّد الوجود کہلاتے ہیں۔

ھا اور ھ مفتوحہ نے دلالت کی کہ آپؐ اوروں کے لیے پاک و صاف رحمت ہیں جیسے کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: وَمَا اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا رَحْمَةً لِّلْعٰلَمِيْنَ (سورۃ انبیاء آیت: ۱۰۷) خود آنحضرت نے بھی فرمایا ہے: اِنَّمَا اَنَا رَحْمَةٌ مُّهْدَاةٌ لِلْخَلْقِ (میں مخلوقات کے لیے رحمت کا ہدیہ ہوں)

ی اور ی ندا ہے بندہ مذکور کو۔ اور جس غرض کے لیے آپ کو پکارا گیا ہے وہ رحلت و انتقالِ مکانی ہے جس پر ع دلالت اور یاء ساکنہ نے جو حرفِ اشارہ ہے اس کی تاکید کر دی ہے

اس لیے جیسا کہ ذکر کیا گیا حروف اشارہ تاکید کے لیے آتے ہیں۔ مزید براں اس معنی کا بھی فائدہ دیتی ہے کہ کوچ اور اختلاط کرنا ضروری ہے اور جس چیز کو کوچ کرایا جائے گا وہ نور وجود ہے جس کی بدولت تمام موجودات قائم ہے اور یہ معنی نونِ ساکنہ سے حاصل ہوتے ہیں اور جس کی طرف کوچ کرنا ہے اس پر دلالت کرتا ہے ص۔

لہٰذا مطلب یہ ہوا کہ اے میرے ذی عزت واحترام بندے، آپ کو ان تمام لوگوں کی طرف جو اس خلاء محشر میں جمع ہیں، ضرور جانا پڑے گا ان انوار کے ساتھ جن سے ان کے وجود قائم ہیں، تاکہ وہ آپ سے مستفیض ہوں کیونکہ ان سب کا مادہ آپ ہی سے ہے۔

اس تشریح سے ان حروف کے معانی عمدہ طور پر مترتب ہو گئے اور کلام بھی بہترین طریق پر منظم ہو گیا کیونکہ سریانی زبان میں حروف کے معانی سے وہی فائدہ حاصل ہوتا ہے جس طرح دونوں زبانوں میں کلمات کے معانی سے چنانچہ کسی زبان میں جب کوئی کلام کلمات سے مرکب ہو تو جب تک اسکے کلمات کے معانی باہم مرتب نہ ہوں، کلام درست نہیں ہو سکتا۔ یہی حال سریانی زبان میں کلام کا ہے کہ جب وہ حروف سے مرکب ہو تو اس صورت میں وہ کلام درست ہو گا جب اس کے حروف کے معانی مترتب ہوں اور ان کی ترکیب بھی مضبوط ہو اور جس طرح علاوہ سریانی زبان کے دوسری زبان میں کلام کلمات سے مرکب ہو تو ان کے معانی کو ترتیب دینے کے لیے کبھی تقدیم و تاخیر کی ضرورت ہوتی ہے یا باہم متصل معنوں میں ایک اجنبی کا فصل لانے کی ضرورت ہوتی ہے اور اسی طرح کسی چیز کا ضمیر کی صورت میں لانا ضروری ہوتا ہے تاکہ معنی درست بیٹھ جائیں یہی حال سریانی زبان کا ہے کہ جب یہ حروف سے مرکب ہو جائے تو کبھی ترتیب معانی کی غرض سے اس بات کی ضرورت ہوتی ہے کہ حروف کو مقدم یا مؤخر لایا جائے یا کہیں حذف کیا جائے یا ضمیر لائی جائے وغیرہ

حضرت نے فرمایا: میں نے جو تشریح ان رموز کے معانی کی ہے وہ کشف و مشاہدہ کے ذریعہ سے اہلِ کشف کو معلوم ہے کیونکہ وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو ان تمام خداوندی عنایات و کرامات کے ساتھ جو اوروں کی طاقت سے باہر ہیں مشاہدہ کرتے ہیں اور دیگر مخلوقات کو جن میں انبیاء، فرشتے وغیرہ شامل ہیں اور جو کچھ اللہ نے انہیں دیا ہے مشاہدہ کرتے ہیں اور یہ بھی دیکھتے ہیں کہ سید الوجود سے نکل کر مادہ نور کے ڈوروں میں تمام مخلوق کی طرف جاری ہے اور انبیاء، فرشتوں تک پھیلا ہوا ہے اس طرح یہ اہل کشف اس استفادہ کی عجیب وغریب کیفیت کا مشاہدہ کرتے ہیں۔

حضرت نے فرمایا ایک صالح شخص نے کھانے کے لیے روٹی کا ٹکڑا لیا اور اس میں وہ نعمت نظر آئی

جو بنی آدم کو عطا کی گئی ہے تو اس روئی میں نور کا ڈورہ نظر آیا اس نے اس نور کا پیچھا کیا۔ دیکھا تو وہ اس نور کے ڈورے سے ملا ہوا تھا جو نورِ محمدی سے جا ملا تھا پھر دیکھا کہ یہ نور کا ڈورا ایک ہے۔ پھر تھوڑی دور تک جا کر ڈوروں کی متعدد شاخیں نکلنی شروع ہو گئیں۔ ہر شاخ اس نعمت سے ملی ہوئی تھی جو ان ذوات کو عطا کی گئی تھیں۔

مؤلف کہتا ہے: یہ قصّہ خود حضرت کا اپنا ہے خدا اُن سے راضی ہو اور ہمیں آپ کی جماعت اور گروہ سے بنائے اور ہمارا تعلق کبھی ان سے منقطع نہ ہو۔

ایک واقعہ

حضرت نے فرمایا ایک بدنصیب کا واقعہ ہے کہ کہنے لگا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے تو مجھے صرف ایمان کی راہ دکھائی ہے۔ باقی رہا نورِ ایمان سو وہ اللہ کی طرف سے ہے، نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے نہیں۔ صالحین نے اس سے کہا: اچھا اگر ہم اس تعلق کو جو تمہارے نورِ ایمان اور نورِ محمدی کے درمیان ہے منقطع کر دیں اور محض ہدایت کو جس کا تم ذکر کر رہے ہو، رہنے دیں تو کیا اس پر راضی ہو؟ کہنے لگا "ہاں" راضی ہوں۔ ابھی اس نے بات ختم نہ کی تھی کہ اس نے صلیب کو سجدہ اور اللہ اور اس کے رسول کا انکار کیا اور کفر پر مرا۔ خدا اپنے فضل و کرم سے ہمیں بچائے۔

مختصر یہ کہ اولیاء اللہ جنہیں اللہ عزوجل اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی قدر و منزلت کا علم ہے ان تمام مذکورہ بالا چیزوں کا اپنی آنکھوں سے بعینہٖ اسی طرح مشاہدہ کرتے ہیں جس طرح تمام محسوسات کا، بلکہ اس سے زیادہ، کیونکہ نظرِ بصیرت نظرِ بصارت سے زیادہ قوی ہے، جیسا کہ آگے ذکر ہوگا۔ چنانچہ وہ دیکھتے ہیں کہ حضرت زکریا علیہ السلام کے احوال و مقامات جو اللہ تعالیٰ نے ان کو عطا فرمائے ہیں۔ وہ سیّد الوجود صلی اللہ علیہ وسلم سے ممتد ہو کر حضرت زکریا تک پہنچے ہیں۔ اسی طرح تمام احوال و مقامات حضرت یحییٰ کے اس سورہ میں ذکر ہوئے ہیں۔ نیز مریم اور ان کے احوال و مقامات، عیسیٰ اور اُن کے احوال و مقامات، ابراہیم، اسمٰعیل، موسیٰ، ہارون، ادریس، آدم اور نوح اور ہر نبی جس پر اللہ کا انعام ہوا (سب نورِ محمدی سے استفادہ کرتے ہیں) یہ تھوڑا سا بیان معانی رموز کا ہے ورنہ جو معانی ابھی باقی ہیں، وہ بے شمار ہیں اسی لیے ہم نے کہا ہے کہ اس سورت میں رموز کا نہایت ہی تھوڑا حصّہ ہے کیونکہ تمام موجودات خواہ ناطق ہوں یا صامتہ، عاقلہ ہوں یا غیر عاقلہ، ذی روح ہوں یا غیر ذی روح، سب ہی ان رموز میں داخل ہیں

ایک اعتراض

حضرت سے یہ عمدہ تفسیر سن لینے کے بعد میں نے سوال کیا کہ حاشیہ سابقہ میں ابوزید نے سیدی محمد بن سلطانؒ سے یوں نقل کیا ہے، سیدی عبدالنورؒ نے سیدی ابو عبداللہ بن سلطانؒ سے جو امام شاذلی کے خواص میں سے ہیں نقل کیا ہے کہ میں نے خواب میں دیکھا کہ

ایک فقیہ کے ساتھ کھٰیٰعص اور حٰمعسق کی تفسیر کے بارے میں بحث کر رہا ہوں۔ اللہ تعالیٰ نے میری زبان پر یہ جاری کر دیا یہ اللہ اور اس کے رسول کے درمیان راز کی باتوں میں سے ہے، گویا کہ اللہ تعالیٰ فرما رہے ہیں:

ک : اے محمد تم کہف الوجود ہو جس کے پاس آکر تمام موجودات پناہ لیتی ہے۔ آپ کل وجود ہیں۔

ھ : ہم نے آپ کو ملک عطا کیا اور ملکوت مہیا کیا۔

ی ع : اے عین العیون۔

ص : تم میری صفات میں سے ہو کہ جس نے رسول کی اطاعت کی اس نے اللہ کی اطاعت کی۔

ح : ہم تمہارے حامی ہیں۔

م : ہم نے آپ کو مالک بنا دیا۔

ع : ہم نے آپ کو علم سکھایا۔

س : ہم نے آپ پر اسرار کھول دیے۔

ق : ہم نے آپ کو اپنا قرب بخشا۔

اس پر انھوں نے مجھ سے جھگڑنا شروع کر دیا اور اس تفسیر کو قبول نہ کیا اس پر میں نے کہا چلو ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں چل کر فیصلہ کراتے ہیں۔ ہم گئے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت کی۔ آپ نے فرمایا جو محمد بن سلطان نے کہا ہے ٹھیک ہے۔ اھ۔

جواب حضرت نے فرمایا: سیدی محمد بن سلطان نے جو کچھ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے مقام کے متعلق بیان کیا ہے، درست ہے مگر ان حروف کی اپنی وضع اور اصل کے اعتبار سے وہی تشریح ہے جو ہم نے بیان کی۔

مؤلف کہتا ہے کہ حضرت کی بیان کردہ تفسیر کا بلند مقام مخفی نہیں کیونکہ ملک کا ہبہ اور ملکوت کا مہیا کرنا ہر ایک اس بات کا مقتضی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور یہ چیزیں دو الگ الگ چیزیں ہیں اور یہ کہ ان کی شاخیں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے نہیں نکلیں۔ کہاں یہ تفسیر اور کہاں وہ تفسیر کہ ملک اور ملکوت اور تمام مخلوقات ص میں شامل ہے پھر حرف نون اور عین کے تقاضا کے مطابق سب پر یہ حکم لگانا کہ ان کا مادہ سید الوجود سے حاصل ہوا ہے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے کہف الوجود کا بھی یہی معنی ہے کہ یہاں پر موجودات پناہ لیتی ہے لہٰذا جو کچھ سیدی محمد بن سلطان نے بیان

فرمایا وہ سب ن ع ص کے تحت آجاتا ہے۔

اس کے بعد میں نے حضرت سے تمام حروف مقطعات کی تفسیر ایک ایک رمز کرکے سنی جس کے طویل ہونے کے باعث تحریر کرنے کی گنجائش نہیں۔ لہٰذا صرف دو جوابوں پر اکتفا کرتا ہوں۔ ان میں سے ایک حضرت نے ایک فقیہ کے سوال کے جواب میں فرمایا جسے نقراء کی محبت کا دعویٰ تھا۔

سوال ان سوالات میں سے ایک سوال یہ ہے کہ حرف مقطع ق میں کونسا رازِ خداوندی ہے کہ بعض عارفین کہتے ہیں اس میں حضرت قدیمہ اور حضرتِ حدیثہ کے دائرہ کا راز جمع ہوگیا ہے ان سوالات سے اس کا مقصد حضرت کا امتحان کرنا تھا اور یہ معلوم کرنا تھا کہ یہ جو کہا جاتا ہے کہ آپ کو علوم لدنیہ حاصل ہیں کیا یہ صحیح ہے؛ چنانچہ اس فقیہ نے علامہ حاتمی[1] وغیرہ کی کتابوں کا مطالعہ کرکے چند ایک سوالات اکٹھے کرلیے کہ اس کے خیال میں کوئی شخص بھی ان کا جواب نہ دے سکے گا، چنانچہ اس نے یہ سوالات حضرت کی خدمت میں روانہ کیے حضرت نے باوجود اُمّی عامی ہونے کے ان سب کا جواب دیا۔

جواب حضرۃ قدیمہ سے مراد وہ انوارِ حادثہ ہیں جو ارواح واشباح اور زمینوں اور آسمانوں کے پیدا ہونے سے پہلے پیدا کئے جاچکے تھے۔ یہاں قدم سے مراد قِدَم حقیقی نہیں کہ کَانَ اللّٰہُ وَلَمْ یَکُنْ شَیْءٌ (اللہ تھا اور کوئی اور چیز نہ تھی) اور حضرۃ حادثہ سے مراد وہ ارواح واشباح ہیں جو اس کے بعد آئیں اور اس میں شک نہیں کہ ارواح جب اجسام سے مل جائیں تو بعض سے تو اللہ نے جنت کا وعدہ کیا ہے اور بعض سے دوزخ کا۔ پھر جن سے اللہ نے جنت کا وعدہ کیا ہے وہ بعض انوار حضرۃ الانوار کی ایک فرع ہے جس طرح کہ جن سے دوزخ کا وعدہ کیا ہے وہ بھی بعض انوار حضرۃ الانوار کی فرع ہے لہٰذا حضرۃ الانوار کی دوسری قسم پہلی قسم کی فرع ہوئی اور ان کی دو قسمیں ہوگئیں۔ پسندیدہ اور ناپسندیدہ۔

جب تم یہ سمجھ چکے تو اب جان لو کہ اس حرف مُقطّع میں تلفظ کے اعتبار سے تین حرف ہیں۔ ق ا۔ ف۔ چنانچہ ق کو جب الف سے ملا دیا جائے تو سریانی زبان میں اس کے معنی حضرۃ قدیمہ اور حضرۃ حادثہ دونوں میں خیر و شر اور فضل و عدل کے ساتھ تصرف کرنے کے ہیں اور سریانی زبان میں ف ساکن کے معنی اپنے ماقبل سے قبیح کو زائل کرنے کے ہیں اور ان دونوں میں قبیح وہ ہے جسے شر کی وعید فرمائی گئی ہے اور جب موعود بالشر کو زائل کر دیا گیا تو موعود بالخیر باقی رہ گیا اور موعود بالخیر

[1] حاتمیؒ: حاتمی سے مراد محی الدین ابن العربی صوفی ہیں جو حاتم طائی کی اولاد میں سے تھے۔

خاصانِ خدا ہیں۔ لہٰذا اس حرف مقطع ق کا اشارہ خاصان خدا اور خیرات کی طرف ہے جن کا انعام اللہ تعالیٰ نے ان پر کیا۔ حضرتین کا یہی راز ہے لہٰذا یہ اللہ تعالیٰ کا ایک نام ہے۔ جس کی اضافت اللہ تعالیٰ کی معزز ترین مخلوق کی طرف کی گئی ہے، بعینہٖ اس طرح جس طرح عربی زبان میں لفظ سلطان چنانچہ یہ لفظ ہے اشارہ بادشاہ اور اس کی رعایا کی طرف خواہ وہ سعادت مند ہوں جیسے مسلمان یا بدبخت ہوں جیسے ذمّی (کافر) پس جب بادشاہ کی تعریف کرنا ہو تو کہیں گے سُلطان الاسلام اسلام کا لفظ لانے سے اہل ذمّہ ادب، تعظیم اور وقار کے لحاظ سے خارج ہو جائیں گے مگر در حقیقت وہ خارج نہ ہوں گے لہٰذا اس کے معنی یوں ہوئے کہ کوئی کہے اے محمدؐ! انبیاء، ملائکہ اور اہل سعادت کے رب بیان تک کر ان کی کل تعداد اور ان کے اللہ کے ہاں مقامات واحوال کو گنتے جاؤ۔ نیز اہل جنت، ان کے منازل اور درجات کا ذکر کرو۔ پس جب ان تمام کا ذکر کر چکو کہ ذرہ بھر نہ چھوٹے تو یہ ق کے معنی ہوں گے۔ لہٰذا اس میں اسرارِ رسالت، اسرارِ نبوت، اسرارِ ملائکہ اسرارِ ولایت، اسرار سعادت اسرارِ جنت، تمامی انوار کے اسرار اور وہ تمام خیرات ہوں گے جو تمام موجودات میں پائے جاتے ہیں۔

وَمَا یَعْلَمُ جُنُوْدَ رَبِّكَ اِلَّا هُوَ (تیرے رب کے لشکروں کا علم خود اسی کو ہے)

سریانی زبان کا قاعدہ ہے کہ ف جو "الگ کرنے" کے معنی میں آتی ہے، اسے کتابت میں نہ لایا جائے تاکہ کتابت و معنی ایک دوسرے کے موافق بن جائیں۔ اسی لیے اسے ق کی کتابت میں نہیں لایا گیا۔

حضرت نے فرمایا: اگر چاہو تو حضرۃ قدیمہ سے مراد وہ امور ہوں جو علم ازلی میں آ چکے ہیں اور قدیم اپنے حقیقی معنوں میں ہو اور حضرۃ حادثہ سے مراد وہ معلومات ہوں جن کو اللہ تعالیٰ وجود میں لایا اور انہیں اس دنیا میں ظاہر کیا تو یہ معنی بھی ہو سکتے ہیں اور معنی اپنی حالت پر ہی رہیں گے واللہ تعالیٰ اعلم۔

مؤلف کہتا ہے خدا آپ کو توفیق دے ذرا غور کریں یہ کس قدر عمدہ جواب ہے۔ میری سائل سے ملاقات ہوئی تو میں نے کہا، کہو حضرت کا جواب کیسا ہے؟ تو کہنے لگا: شیخ زروق[۵] نے اس کی تشریح یوں کی ہے کہ حضرت قدیمہ سے مراد قاف کا دائرہ ہے اور حضرت حادثہ سے مراد دائرہ کے نیچے کا شوشہ ہے اور اس میں جو راز ہے وہ اشارہ ہے حادثہ کے قدیمہ سے مستفیض ہونے کی طرف، اس لیے کہ تعریقہ (شوشہ) اس حلقہ سے ملا ہوا ہے جسے ہم نے دائرہ کہا ہے لہٰذا اس کے اتصال سے اشارہ ہو گیا حادثہ کے قدیمہ سے

---

۵ شیخ احمد زروقؒ، ان کا ذکر آتا رہے گا۔

مستنبیں ہونے کی طرف۔ لہٰذا سورۂ ق سے قدیم و حادث دونوں حضرتوں کی طرف اشارہ پایا گیا، اس طرح کہ حلقہ کا اشارہ حضرت قدیمہ کی طرف ہے اور تعریفہ کا حادثہ کی طرف اور حلقہ کے ساتھ تعریقہ کے اتصال کا اشارہ قدیمہ سے حادثہ کے استفادہ کی طرف۔

میں نے کہا کجا یہ تشریح اور کجا وہ تشریح جو حضرت نے بیان فرمائی کیونکہ سوال تو ق جو کہ ایک حرف ہے اس کے معنی کے متعلق تھا اور جو کچھ آپ نے ذکر کیا اس کا تعلق کتابت سے ہے نہ کہ سے کیونکہ ق میں نہ کوئی حلقہ ہے نہ کوئی تعریفہ۔ مزید برآں آپ کی تشریح میں نہ حضرۃ قدیمہ کا ذکر ہے، نہ حادثہ کا، پھر حضرۃ قدیمہ اور حلقہ میں کون سی مناسبت پائی جاتی ہے اور تعریقہ اور حضرۃ حادثہ میں کونسی مناسبت ہے؟ اگر یہ مناسبت محض اتصال کی وجہ سے ہے تو یہ میم کے حلقہ اور اس کے تعریفہ اور ص، ض، ع، غ وغیرہ حروف میں جن میں حلقہ اور تعریفہ پایا جاتا ہے موجود ہے، سائل اس اعتراض کا جواب نہ دے سکا۔ اس سے میرا مقصد حضرت زروق پر اعتراض کرنا نہیں۔ معاذاللہ کہ میں ان پر یا کسی اور ولی پر اعتراض کروں۔ خدا ہمیں ان کے علوم سے فائدہ پہنچائے۔ میرا مقصد صرف سائل سے بحث و مباحثہ کرنا تھا۔ مزید برآں میں شیخ زروق کی تشریح سے واقف نہ تھا ہوسکتا ہے کہ سائل نے اس کا صرف مفہوم ادا کیا ہو اور اس کی حقیقت سے بے خبر رہا ہو اور اسی لیے اس پر اعتراض وارد ہوا ہو۔ واللہ تعالیٰ اعلم۔

دوسرا سوال حضرت کا دوسرا جواب اس اعتراض کے متعلق تھا جس کی طرف حاشیۂ مذکورہ بالا کے مصنف عبدالرحمٰن فاسی نے کیا ہے اس اعتراض کا ماحصل یہ ہے کہ جب فواتح السُّور یعنی حروفِ مقطعات ان سورتوں کے مضامین کے رموز ٹھہرے تو پھر کیا وجہ ہے کہ رمز تو ایک ہی ہے مگر سورتیں مختلف ہیں کیونکہ اختلافِ سور کا تقاضا تھا کہ رموز بھی الگ الگ ہوں۔

جواب حضرت نے جواب دیا کہ رمز کے ایک ہونے کے باوجود سورتوں کے مختلف ہونے کا سبب یہ ہے کہ قرآنی آیات کے انوار تین قسم کے ہیں: (۱) ابیض (سفید) اور یہ رنگ ان کلمات کا ہے جن کے قائل بندے ہوتے ہیں اور جن کا سوال اپنے رب سے کرتے ہیں[۱] (یعنی کلماتِ دعائیہ) (۲) اخضر (سبز) جن کا قائل خود حق تعالیٰ ہو[۲] اور (۳) اصفر (زرد) یہ وہ کلمات ہیں جن کا تعلق ان لوگوں کے ساتھ ہے جن پر اللہ کا غضب ہوا۔ مثال کے طور پر سورۃ فاتحہ میں سبز رنگ صرف اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ کا ہے

---

[۱] مثلاً رَبِّ زِدْنِیْ عِلْمًا (خدایا مجھے اور علم دے۔)

[۲] جیسے اَقِیْمُوا الصَّلٰوۃَ (نماز پڑھو)

کہ یہ قول ہے حق سبحانہٗ کا اور سفید رنگ ہے اَلْعٰلَمِیْنَ سے لیکر غَیْرِ الْمَغْضُوْبِ تک اور زرد رنگ ہے مَغْضُوْبِ عَلَیْھِمْ سے آخر سورۃ تک اور یہ تینوں انوار ہر سورہ میں پائے جاتے ہیں، البتہ کسی میں کوئی نور کم اور کوئی نور زیادہ ہوگا۔ جیسا کہ تم نے سورہ فاتحہ میں دیکھ لیا، ان تینوں انوار کے اختلاف کا سبب یہ ہے کہ لوحِ محفوظ تین مختلف رُخوں میں ہوتا ہے کیونکہ اس کا ایک رُخ دنیا کی طرف ہے یعنی دنیا اور اہلِ دنیا کے حالات کے متعلق ہے اور اس میں ہر وہ چیز درج ہے جس کا تعلق دنیا اور دنیا والوں سے ہے اس کا دوسرا رُخ جنت کی طرف ہے اور اس میں جنت اور اہلِ جنت کے احوال وصفات درج ہیں اور تیسرا رُخ جہنم کی طرف ہے اور اس میں جہنم اور جہنمیوں کے احوال وصفات درج ہیں۔ خدا ہمیں جہنم اور عذاب جہنم سے پناہ دے، چنانچہ دنیا کی طرف جو رُخ ہے اس کا نور سفید ہے۔ جو جنّت کی طرف ہے اس کا نور سبز ہے اور جو جہنم کی طرف ہے اس کا نور زرد ہے درحقیقت یہ نور سیاہ ہے مگر مومن کی نگاہ میں یہ زرد نظر آتا ہے کیونکہ جب اس کا نور بصیرت سیاہ رنگت پر پڑتا ہے تو اُسے اس کی نگاہ میں زرد بنا دیتا ہے، حتّٰی کہ مومن جب محشر میں کھڑا ہوگا اور اس کو اس کی لکھی ہوئی تقدیر کے مطابق نور ملے گا اور اُس سے دور ایک کافر ہوگا جسے بہت بڑی سیاہی اور تاریکیوں نے گھیرا ہوگا تو وہ کافر مومن کو زرد رنگ کا دکھائی دے گا۔ اس سے مومن سمجھ جائے گا کہ یہ کسی کافر کا وجود ہے۔ حضرت نے فرمایا کہ کافر کوئی چیز نہ دیکھ سکے گا کیونکہ وہ تاریکی جو اسے چاروں طرف سے گھیرے ہوئے ہوگی اس کے لیے حجاب (پردہ) کا کام دے گی۔ لہٰذا اسے سیاہی پر سیاہی کے سوا کچھ دکھائی نہ دیگا۔

میں نے عرض کیا تب تو اس کے دل میں صرف انہی لوگوں کا خیال آئے گا جن کا حال محشر میں اس جیسا ہوگا۔ لہٰذا وہ مومن کو اپنے سے بہتر حال میں نہ دیکھ سکے گا اور اس کے دل میں یہ تمنا بھی پیدا نہ ہوگی کہ کاش دنیا میں مسلمان ہوتا۔

حضرت نے فرمایا: اللہ تعالیٰ جنّت اور اہلِ جنّت کے حالات کا اس قدر علم جتنا کہ ضروری ہے اس کے دل میں پیدا کر دیگا۔

جب تم یہ سمجھ گئے تو پھر آیت کی طرف آؤ۔ اگر اسے اس رُخ سے لیا جائے جو جنت کی طرف ہے تو اس کا نور سبز ہوگا اگر دوزخ والے رُخ سے لیا جائے تو اس کا نور زرد ہوگا اور اگر دنیا والے رُخ سے دیکھا جائے تو اس کا نور سفید ہوگا، پھر ہر رُخ میں کئی قسم کی تفصیل اور تقسیم پائی جاتی ہے جس کا احاطہ سوائے اللہ کے کوئی نہیں کر سکتا۔

اور یہ حروف مقطعات جو سورتوں کے شروع میں ہیں لوحِ محفوظ میں بعینہٖ اسی طرح لکھے ہوئے ہیں

جس طرح قرآن مجید میں، البتہ ہر حرف کے ساتھ سریانی زبان میں اس کی شرح بھی لکھی ہوئی ہے چنانچہ اگر ہر حرفِ مقطع کی شرح میں جو لکھا ہوا ہے اسے دیکھو تو تمہیں ان کے الگ الگ ہونے کا علم ہو جائے اس کی شرح یہ ہے کہ الٓمٓ رموز ہیں جن کا اشارہ اس نورِ محمدی کی طرف ہے جس سے تمام مخلوقات استفادہ کرتی ہے۔ اگر اس نُور کو جس کی طرف اس رمز سے اشارہ کیا گیا ہے اس لحاظ سے دیکھا جائے کہ مخلوقات میں سے کچھ ایسے لوگ ہیں جو آپؐ پر ایمان لائے اور کچھ ایسے ہیں جنھوں نے کفر کیا اور یہ کہ مومنین کے کیا حالات ہیں اور کفار کے کیا۔ نیز وہ امور جن کا تعلق اس سے ہے اور کلام کا ربط بھی ان سے ہے تو یہ الٓمٓ وہ ہے جو سورۂ بقرہ میں آیا ہے اور یہ ان ہی معنوں میں نازل ہوئی ہے۔

اور اگر نورِ محمدی پر ان بھلائیوں کے اعتبار سے نظر ڈال جائے جو انہیں اس نور سے حاصل ہیں اور یہ کہ وہ کس طرح حاصل ہوتی ہیں اور ان لوگوں میں سے چند لوگوں کا ذکر کیا جائے جنھیں یہ نعمتیں اور بھلائیاں حاصل ہوئیں تو یہ الٓمٓ وہ ہے جس کا ذکر سورۂ آلِ عمران میں آیا ہے اور یہ اسی غرض کے لیے نازل بھی ہوئی۔

اور اگر اس نورِ محمدی کو ان سزاؤں اور عذاب کے اعتبار سے دیکھا جائے جو نافرمان لوگوں پر نازل ہوا نیز ان مصائب کے اعتبار سے جو اس دنیا میں انہیں پہنچیں وغیرہ وغیرہ تو یہ الٓمٓ وہ ہے جس کا ذکر سورۂ عنکبوت میں آیا ہے۔ اسی طرح ہر اس سورۃ کے متعلق کہا جائے گا جس کے شروع میں یہ رمز آئیگا۔ اس بیان کو ہر وہ شخص جانتا ہے جو لوحِ محفوظ کو دیکھ رہا ہو۔

اس کے بعد میں نے ایک اور سوال کیا جس کا جواب حضرت نے ایسا دیا کہ عقلوں کے احاطہ سے باہر ہے۔ اسی لیے میں نے اسے نہیں لکھا۔ واللہ تعالیٰ اعلم۔

مؤلف کہتا ہے کہ یہ حضرت کے بیان کی صرف سطحی تشریح ہے ورنہ ان معانی کی تحقیق جن کی طرف حضرت نے اشارہ کیا اور ان کی کُنہ تک پہنچنا سوائے فتح کے نہیں ہو سکتا، یا اس طرح ہو سکتا ہے کہ شیخ کے سامنے بیٹھ کر ان سے سمجھا جائے۔ چنانچہ جب کوئی شخص اس کی تعلیم حضرت سے لے اور سائل جس قسم کا سوال دل میں آئے کرے، تو خواہ وہ صاحبِ فتح نہ بھی ہو پھر بھی تمام معنی سمجھ جائیگا واللہ تعالیٰ اعلم۔

سریانی زبان میں حروفِ تہجّی کے معانی

اب میری رائے یہ ہے کہ حروفِ تہجّی کے متعلق یہ بیان کر دوں کہ سریانی میں وہ کس معنی کے لیے وضع کیے گئے ہیں کیونکہ ان کی کبھی ضرورت پڑ جاتی ہے اور ہم اس سے پہلے اس کی طرف

اشارہ بھی کر چکے ہیں۔ لہٰذا فائدہ کی تکمیل کی غرض سے میں یہاں دیے دیتا ہوں۔

ہمزہ۔ ء ءَ (ہمزہ) اگر مفتوح ہو تو اس سے تمام اشیاء کی طرف کم ہوں یا زیادہ، اشارہ ہوتا ہے۔ بعض اوقات متکلم اپنی ذات اور نفس کی طرف بھی اشارہ کرتا ہے اور اشارے میں قبض نہیں ہوتا اور اگر ہمزہ مضموم ہو (ءُ) تو یہ اس شئ کی طرف جو قریب اور کم ہو اشارہ ہوتا ہے اور اگر ہمزہ مکسور (ءِ) ہو تو اشارہ ہوتا ہے اس چیز کی طرف جو مناسب طور پر کم ہو۔

ب بَ اگر مفتوح ہو تو اس سے مراد وہ چیز ہوگی جو غایت درجہ باعزت یا غایت درجہ ذلیل ہو اگر مکسور ہو (بِ) تو وہ شئ جو ذات میں داخل یا داخل ہونے والی ہو۔ اگر مضموم (بُ) ہو تو یہ ایسا اشارہ ہے جس کے ساتھ قبض پایا جاتا ہے۔

ت تَ اگر مفتوح ہو تو اس کا مطلب خیر کثیر وعظیم ہے۔ اور اگر مکسور (تِ) ہو تو وہ مصنوع جو ظاہر ہو اور اگر مضموم ہو (تُ) تو قلیل وظاہر چیز مراد ہے اور کبھی اجتماع ضِدَّین کے لیے بھی آتا ہے۔

ث ثَ اگر مفتوح ہو تو نور یا ظلمت کی طرف اشارہ ہے، اگر مضموم (ثُ) ہو تو مراد ہے کسی چیز کا کسی چیز سے زائل ہونا اور اگر مکسور (ثِ) ہو تو ایک چیز کا دوسری چیز کے اوپر مقرر کرنا مراد ہے۔

ج جَ اگر مفتوح ہو تو نبوت یا ولایت مراد ہے بشرطیکہ اس سے پہلے یا اس کے بعد حرف ہو جو اس پر دلالت کرے ورنہ اس کے معنی اس خیر کے ہوں گے جو کبھی زائل نہ ہو۔ اگر مضموم ہو تو وہ اچھی چیز جو کھانے میں آئے یا لوگ اس سے فائدہ اٹھائیں اور اگر مکسور ہو تو وہ کم بھلائی جو ذاتِ انسانی میں نورِ ایمان کی پائی جاتی ہے۔

حضرت نے ایک بار یوں بھی فرمایا کہ اگر مکسور ہو تو کم اور کمزور بھلائی یا نور۔

ح حَ مفتوح ہو تو مراد اشیاء کا احاطہ اور سب پر شمولیت ہے اگر مضموم ہو تو بنی آدم کے علاوہ کسی اور چیز کا عددِ کثیر۔ مثلاً ستارے، اور اگر مکسور ہو تو وہ عدد جو ذات میں داخل ہو یا ذات ان کی مالک ہو، مثلاً غلام اور درہم و دینار وغیرہ

خ خَ مفتوح ہو تو حد درجہ کا طول جس کے ساتھ رقت بھی ہو اگر مضموم ہو (خُ) تو وہ کمال جو حیوانوں میں ہو اور اگر مکسور ہو تو وہ کمال جو جمادات میں ہو۔

د دَ مفتوح ہو تو وہ شے جو ذات سے خارج ہو۔ اگر مکسور ہو تو وہ شے جو ذات میں داخل ہو یا ذات

پر داخل ہونے والی ہو یا ذات کے قریب ہو اور اگر مضموم ہو تو وہ قلیل یا قبیح شئ جس کے ساتھ غصّہ بھی ہو۔

ذ ذَ اگر مفتوح ہو تو وہ شئ جو ذات کے اندر ہے اور ساتھ اس شئ کی عظمت بھی مراد ہو۔ اگر مضموم ہو تو وہ شئ جو فی نفسہٖ کرخت یا عظیم یا قبیح ہو اور اگر مکسور ہو تو وہ قبیح شئ جس کے بعد غصّہ نہ آتے۔

ر رَ اگر مفتوح ہو تو جمیع خیرات (بھلائیاں) ظاہرہ اور باطنہ۔ اگر مضموم ہو (رُ) تو وہ شئ جو اکیلی اور ظاہر ہو اور اگر مکسور ہو تو بنی آدم کے علاوہ کوئی اور ذی روح یا خود رُوح۔

ز زَ اگر مفتوح ہو تو وہ چیز جو کسی اور چیز پر داخل ہو تو اسے ضرر پہنچائے اور کبھی یوں فرمایا وہ شئ جس سے احتراز کیا جائے اور اگر مضموم ہو (زُ) تو وہ قبیح جس میں ضرر پایا جائے مثلاً کبائر۔ اگر مکسور ہو (زِ) تو وہ قبیح جس میں ضرر نہ ہو مثلاً صغائر، شبہات اور نجاست۔

س سَ[1] اگر مفتوح ہو تو وہ ملیح شئ جو طبعاً رقیق ہو۔ اگر مضموم ہو (سُ) تو قبیح اور کُفری شئ یا ظاہر اور باطن سے سیاہ چیز۔ اور اگر مکسور ہو (سِ) تو مہر لگانے والی شئ جس کی طرف سے اشارہ بھی ہو۔ یہ تشریح حضرت کی اپنی تحریر میں تھی مگر جو کچھ میں نے سنا وہ یہ ہے کہ س مرقق مفتوح سے مراد چیزوں کی خوبیاں، مضموم ہو تو ظاہری اور باطنی سیاہی اور اگر مکسور ہو تو ذات کا مغز اور اس کا راز مثلاً عقلِ کامل، عفو اور حلم اور یہ دونوں تشریحیں تقریباً ایک ہی ہیں۔

ش شَ اگر مفتوح ہو تو ایسی رحمت جس کے بعد عذاب نہ ہو۔ یا وہ شخص جس سے عذاب دور ہو چکا ہو اور رحمت اس پر داخل ہو چکی ہو اور پاک ہو گیا ہو۔ اگر مضموم ہو تو وہ شخص جو بذاتِ خود بلند مرتبہ ہو اور اس کی تعظیم کی جاتی ہو اور مکسور ہو تو وہ شئ جس کی طبیعت میں پوشیدہ رکھنا ہو اور کبھی وہ چیز مراد ہوتی ہے جو قلب وغیرہ میں چھپی ہو۔ یہ بیان ان کی تحریر کا ہے، لیکن حضرت سے میں نے اس طرح سُنا شَ مفتوح رحمت جس کے بعد عذاب نہ ہو۔ مضموم جس میں ذہن متحیّر رہ جائے یا آنکھوں کو دکھ دے مثلاً تنکا (کنک) وغیرہ اور اگر مکسور ہو تو جسے کسی عضو یا پاؤں سے روندا جائے مگر وہ ظاہر نہ ہو یا جو قلب میں چھپی ہو۔ اور ظاہر نہ ہو۔

---

[1] اصل کتاب میں ش کے بعد ط کا ذکر ہے پھر دوسرے حروف بھی اس ترتیب میں نہیں دیے جو ترتیب ہمارے ہاں مروج ہے۔ میں نے انہیں عربی حروفِ تہجّی کی طرز میں مرتّب کر دیا ہے۔ مترجم

ص اگر مفتوح ہو تو زمین کا وہ سارا غبار جو قیامت میں اللہ کے سامنے پیش ہوگا۔ اگر مکسور ہو تو ساتوں زمینیں اور اگر مضموم ہو تو زمین کی تمام پیداوار۔ یہ معانی ص مرقّقہ کے ہیں اور اگر مفخّمہ ہو تو مفتوح ہونے کی صورت میں وہ زمین جس پر اللہ کا غضب ہوا ہو یا جس پر نبات نہ ہو اور مکسور ہو تو وہ ذات جس میں نبات نہ ہو یا جس ذات میں کوئی خوبی نہ ہو۔ اگر مضمومہ ہو تو وہ ضرر جو ہر دو مذکور چیزوں سے ہمیں پہنچے۔ ایک اور بار فرمایا کہ ص مفتوح سے مراد تمام زمین اور ایک فرسخ تک جو کچھ اس پر ہے۔ مضموم ہو تو تمام زمینیں اور وہ چیز جو مٹی سے بنی ہے اور مکسور ہو تو زمین کی سطح کی نباتات اور اگر مفخمہ ہو تو اشیاء جو ان پر ہیں مگر ساتھ ہی اللہ کا غصّہ بھی ہو۔ یہ دوسری تشریح میں نے آپ کی وفات کے بعد آپ کے ہاتھوں کی لکھی ہوئی پائی ہے۔ پہلی تشریح خود میں نے آپ سے سُنی تھی اور دوسری تشریح کی عبارت بھی حضرت کی ہے۔

ض ضَ جب مفتوح ہو تو مراد صحت اور تکلیف کا نہ ہونا ہے۔ اگر مضموم ہو تو وہ شئی جس میں قطعاً نور یا ظلمت نہ ہو۔ اگر مکسور ہو تو خشوع و خضوع۔

ط ط اگر مفتوح ہو تو وہ شئی جس کی جنس اور ذات دونوں نہایت پاک و صاف ہوں اگر مضموم ہو تو پہلے کے برعکس انتہا درجے کی خبیث شئی اور اگر مکسور ہو تو وہ شئی جس کی طبیعت میں ساکن رہنا ہو یا جسے ساکن رہنے کا حکم دیا گیا ہو۔

ظ ظ مفتوع ہو تو فی نفسہٖ عظیم شئی مگر اس کے ساتھ اس کی ضد نہ ہو۔ مثلاً شرفا میں جو دوسرا اور بیود میں کھوٹ اور دھوکا دہی۔ مضموم ہو تو وہ نفسانی تحریک جس کے پیچھے چلے حالانکہ وہ نفس اسے تباہ کرنا چاہتا ہے۔ اگر مکسور ہو تو وہ شئی جو طبعی طور ضرر رساں ہو اور بندہ اس سے ضرر محسوس بھی کرے۔

ع ع مفتوح ہو تو کسی کا آنا یا کوچ کرنا۔ اگر مضموم ہو تو وہ ساکن جو اس ذات میں ہے جس پر اس کے وجود کا دار و مدار اور اگر مکسور ہو تو ذاتی خُبث۔ یہ تشریح میں نے حضرت سے سُنی تھی مگر آپ کی تحریر میں یوں پایا گیا۔ عَ مفتوح سے مراد قبول کرنے والی چیز۔ مضموم ہو تو وہ چیز جو اپنے ارادے کے مطابق نفع اور ضرر پہنچائے اور مکسور ہو تو عبودیت کی خباثت اور یہ معنی پہلے معنی کے قریب قریب ہیں۔ کیونکہ جو چیز کسی چیز کو قبول کرتی ہے اس میں کسی چیز کا آنا ہوتا اور وہ ساکن جو اس ذات میں ہو جس سے اس کا قیام ہے اس کی مثال ہے روح۔ اور محافظ فرشتے بامر خداوندی نفع بھی پہنچاتے ہیں اور ضرر بھی اور خبثِ عبودیت وہی ذات کی خباثت اور اس کی تاریکی ہے۔

غ مفتوح ہو تو وہ نگاہ جو شئے کی حقیقت کو پہنچ جائے۔ مضموم ہو تو اسمائے حسنیٰ میں سے ایک اسم جس میں مہربانی پائی جاتی ہے، مکسور ہو تو نامعلوم کا سوال تاکہ دوسرا اپنے علم کے مطابق جواب دے یہ میں نے حضرت سے سنا تھا مگر آپ کی تحریر میں یوں ہے غ مفتوحہ وہ شے جو نظر تاً ہر اس شئ کو دور کرے جو اس کے قریب آئے۔ مضموم سے مراد مہربانی اور تعظیم اور کمالِ عزت، مکسور سے مراد وہ چیز جو بغیر جاننے کے کوئی کلمہ بولے اور یہ غیر معلوم چیز کی طرف اشارہ ہے۔ یہ دونوں تشریحیں تقریباً ایک جیسی ہیں۔

ف مفتوح ہو تو جس کے متعلق معلوم ہو کہ اس کی جنس میں گندگی پائی جاتی ہے اس سے گندگی دور کرنا، یعنی اشارہ ہے کہ یہ ظاہر ہے اور اس کی جنس خبیث ہے۔ اس کی مثال معاصی وغیرہ ہیں، اگر مکسور ہو تو مراد ذات اور جس پر مشتمل ہو اور کبھی اس کے ساتھ قلت کا اظہار بھی ہوتا ہے اگر مضموم ہو تو خبث زائل کرنے کے لیے۔

ق ق مفتوح ہو تو تمام خوبیوں کو اپنے اندر جمع کرنا یا جمیع انوار مراد ہیں۔ اگر مضموم ہو تو اصل آفرینش یا علمِ قدیم۔ اگر مکسور ہو تو مراد ذلت ہے۔

ک ک مفتوح ہو تو حقیقتِ عبودیت کاملہ۔ مضموم ہو تو سیاہ فام غلام یا قبیح غلام، مکسور ہو تو بندگی کا ہماری طرف منسوب ہونا مراد ہے۔

ل ل مفتوح ہو تو متکلم کا بہت بڑی چیز کا حاصل کرنا اور عظیم شئ کی طرف بھی اشارہ ہوتا ہے مضموم ہو تو وہ شئ جس کی انتہا نہیں، مکسور ہو تو مراد متکلم کا اپنی ذات کے وجود یا ذات کی طرف اشارہ کرنا ہے۔ یہ معنی اس وقت ہوں گے جب لام مُرَقّق ہو، لیکن اگر مُفَخّم ہو تو یہ اشارہ ہے مع اضطراب کے اور ایک بار فرمایا مع تبُّح کے۔

م م مفتوح ہو تو مراد تمام کائنات سے ہے مکسور ہو تو ذات کا ظاہری نور جیسے آنکھ کا نور، باطنی نور جیسے دل کا نور اور اگر مضموم ہو تو چھوٹی مگر پیاری چیز جیسے آنکھ کا پانی اور اسی سے ہے مُوٗ مُوٗ۔

ن ن مفتوح ہو تو وہ خیر جو ذات کے اندر ساکن اور روشن ہو۔ مضموم ہو تو خیرِ کامل یا پھیلا ہوا نور مکسور ہو تو وہ چیز جسے متکلم حاصل کرے یا وہ چیز اسی کی ہو۔

ھ ہ اگر مفتوح ہو تو بے انتہا پاک رحمت ہو گی۔ اگر مضموم ہو تو اسمائے حُسنیٰ میں سے ایک اسم اور اگر مکسور ہو تو وہ خیر جو مخلوق سے نکلتی ہے۔ یہ تشریح آپ کی تحریر میں پائی گئی تھی، لیکن میں نے حضرت سے یوں سُنا تھا۔ فتح سے بے انتہا رحمتِ طاہرہ، پیش سے اللہ کا نام جس میں تمام کائنات کا

مشاہدہ بھی پایا جاتا ہے برخلاف نون مضموم کے گویا کوئی کہہ رہا ہو رَبِّی (اے میرے رب) اور پیش والی ہ کے معنی اس طرح ہیں جس طرح کوئی کہہ رہا ہو رَبَّ الْعٰلَمِیْن (اے عالمین کے رب) اور زیر سے وہ نور جو مومنین کے اجسام سے نکلے۔

و واو مفتوح ہو تو وہ اشیاء جو انسان کے اندر جال کی طرح پھیلی ہوئی ہیں مثلاً رگیں، انگلیاں وغیرہ اگر مضموم ہو تو وہ اشیاء جو انسانوں سے مختلف ہیں مثلاً افلاک اور پہاڑ وغیرہ اور اگر مکسور ہو تو وہ پھیلی ہوئی چیزیں جنہیں پلید یا ناپسند سمجھا جاتا ہے مثلاً انتیں وغیرہ

ی ی اگر مفتوح ہو تو ندا کے لیے ہے مگر کبھی اسے تاکید کے لیے بھی لایا جاتا ہے۔ یہ میں نے حضرت سے سنا تھا مگر ان کی تحریر میں یوں تھا، مفتوح ہو تو ندا کے لیے لیکن کبھی ایسی خبر کے لیے بھی آتا ہے جس میں ضمناً ندا ہو مثلاً لَمْ یَلِدْ کیونکہ یہ جملہ خبریہ ہے جس میں ندا کے معنی پائے جاتے ہیں (یعنی اے وہ ذات جس کو کسی نے نہیں جنا) اگر مضموم ہو تو وہ چیز جسے قرار نہ ہو مثلاً بجلی وغیرہ۔ مکسور ہو تو وہ شئی جس سے حیا کی جائے یا جس سے حیا آئے مثلاً شرمگاہ۔

حضرت نے فرمایا یہ ہیں حروف کے اسرار اور پھر ہر حرف کے سات اسرار ہیں جو معانیٔ سابقہ کی مناسبت سے پیدا ہوتے ہیں۔ نیز سات اسرار اور بھی ہیں جن سے عربی زبان کو مناسبت ہے لیکن جب کلام غیر عربی ہو تو اس کے مناسب اور سات اسرار ہیں۔ خدا ہمیں محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے طفیل توفیق اور علم دے۔

اس کا کاتب عبدالعزیز بن مسعود ہے جو دباغ کے نام سے مشہور ہے۔

غور کرو خدا تم پر رحم کرے کیا اس قسم کی باتیں کہیں سنیں یا کسی کتاب میں لکھی ہوئی دیکھیں؟ واللہ تعالیٰ اعلم۔

جس مہینے میں میری حضرت سے ملاقات ہوئی اور ان کی خدمت میں حاضر ہوا یا اس سے تھوڑا عرصہ بعد آپ نے مجھے تین سریانی الفاظ کہے اور فرمایا ان کو سمجھ لو اور بھولنا نہیں سِنَرْ سِنْذُعْ مَازَرْ سین کے نیچے زیر، نون پر زبر پھر راء ساکن پھر س مکسور جس کے بعد ذال ساکن ہے پھر ع مضموم، پھر میم مفتوح پھر الف پھر زا مفتوح پھر راء ساکن۔ میں نے عرض کیا یہ کونسی زبان ہے؟ فرمایا "سریانی" دنیا میں اس زبان میں بولنے والا کوئی نہیں سوائے چند لوگوں کے۔ میں نے عرض کیا ان کلمات کے کیا معنی ہیں؟ لیکن آپ نے ان کے معانی کی تشریح نہ کی اور جب سریانی حروف کے معانی معلوم ہوئے تو میں سمجھ گیا کہ آپ مجھ سے یہ فرما رہے ہیں: دیکھو اس نور کو جو میری ذات میں قائم اور چمک رہا ہے۔ میرے ظاہر میں بھی اور میرے باطن میں بھی۔ دیکھو اس بڑی خیر و خوبی کو جس پر میری ذات نے قبضہ

پایا اور اسی سے اس کا قوام ہے، کیونکہ تمامی اکوان کا شرور سے محفوظ رہنا اسی کی بدولت ہے اور ہر وہ چیز جو آسمانوں اور زمینوں میں ہے یا تمام جہانوں میں ہے خواہ ظاہری خیر ہو خواہ باطنی، تمام کے تمام اس نور سے مستفیض ہیں جو میری ذات میں ہے۔ حضرت مجھے فرما رہے تھے کہ تمام جہانوں میں انہی کا تصرف ہے (اور یہ مرتبہ غوثیت کا ہے) واللہ تعالیٰ اعلم۔

۱۴۔ وَلِيَعْلَمَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَيَتَّخِذَ مِنْكُمْ شُهَدَاۤءَ (سورہ آل عمران آیت: ۱۴۰) اور وَلَنَبْلُوَنَّكُمْ حَتّٰى نَعْلَمَ الْمُجٰهِدِيْنَ مِنْكُمْ وَالصّٰبِرِيْنَ (سورہ محمد آیت ۳۱)

میں نے حضرت سے اللہ تعالیٰ کے فرمان وَلِيَعْلَمَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَيَتَّخِذَ مِنْكُمْ شُهَدَاۤءَ اور وَلَنَبْلُوَنَّكُمْ حَتّٰى نَعْلَمَ الْمُجٰهِدِيْنَ مِنْكُمْ وَالصّٰبِرِيْنَ[1] اور اسی قسم کی اور آیتوں کے متعلق سوال کیا جن سے یوں ظاہر ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے علم میں تجدّد و تازگی آئے حالانکہ اللہ تعالیٰ کا علم قدیم ہے اور قدیم میں تازگی نہیں آتی۔

فرمایا: جس طرح اپنے کلام میں لوگوں کی عادت ہے اسی کے موافق قرآن مجید کا نزول ہوا کہ فرض کرو کہ بادشاہ کا کوئی مقرب ہو جس سے زیادہ کوئی مقرب نہ ہو اور بادشاہ نے اپنی رعایا کے سارے معاملات اس کے سپرد کر رکھے ہوں اور خود بادشاہ لوگوں کی نظروں سے اوجھل ہو جائے اور رعایا کو اس مقرب کی اطاعت کرنے کا حکم ہو اور اس مقرب کے سوا کسی کو بادشاہ کے پاس باریابی نہ ہو۔ اب یہ مقرب بادشاہ سے وہ امور لے کر آئے گا جن سے بادشاہ کی فرماں برداری اور خدمت رعایا پر لازم آئے، لہٰذا جب وہ بادشاہ کے احکام جاری کرے گا تو یوں کہے گا بادشاہ تمہیں یوں حکم دیتا ہے، تم سے اس بات کا مطالبہ کرتا ہے اور چاہتا ہے کہ تم یہ کام کرو یہاں تک کہ یہ اس مقرب کی عادت بن جائے کہ وہ اپنے تمام خطابات میں یہاں تک کہ ان امور میں بھی جو اس کی ذات سے ہوں اور بادشاہ کی طرف سے نہ ہوں ان میں بھی اسی طرح خطاب کرے گا اور کہے گا بادشاہ کے ساتھ چلو اور فلاں مقام پر بادشاہ کیساتھ یہ برتاؤ کرو اور اس سے مراد اپنا نفس ہو گا کہ میرے ساتھ چلو اور میرے ساتھ یہ برتاؤ کرو اور اس کا سبب وہ یگانگی ہے جو بادشاہ اور اس مقرب کے درمیان ہے۔ لوگوں میں اس قسم کے کلام کرنے کا دستور مشہور ہے جس سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ اسی طرح یہاں پر بھی جو علم اللہ کی طرف منسوب کیا گیا ہے وہ کوئی نیا علم نہیں ہے یہاں تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف اس علم کی نسبت کرنا مقصود ہے۔ یعنی تاکہ

---

[1] تاکہ اللہ کو ایمان والوں کا علم ہو جائے اور تم میں بعض کو درجۂ شہادت بخشے اور فرمایا ہے "تاکہ ہم تم کو آزمائیں تاکہ مجاہدین اور صابرین کا پتہ چل جائے۔

رسول جان لے تم میں کون مجاہد اور صابر ہے اور تاکہ رسول کو معلوم ہو جائے پختہ ایمان والا۔

اس کے بعد آپ نے ایک عالی مضمون بیان فرمایا جس میں حق تعالیٰ کے ارشاد اِنَّ الَّذِیْنَ یُبَایِعُوْنَكَ اِنَّمَا یُبَایِعُوْنَ اللّٰهَ یَدُ اللّٰهِ فَوْقَ اَیْدِیْهِمْ (سورۂ فتح آیت ۱۰) کے مطلب کی طرف اشارہ تھا۔

مؤلف کہتا ہے یہ جواب مفسرین کے اس جواب سے مختلف ہے جو انھوں نے اس آیت کے متعلق دیا ہے اور یہ کہ یہاں مضاف محذوف ہے یعنی وَلِیَعْلَمَ رَسُوْلُ اللّٰهِ (تاکہ رسول اللہ کو معلوم ہو جائے) واللہ تعالیٰ اعلم۔

۱۵۔ مسئلۂ غرانیق

میں نے حضرت سے مسئلہ غرانیق کے متعلق استفسار کیا اور عرض کیا، کیا حضرت عیاض اور وہ لوگ جنھوں نے ان کا اتباع کیا اور اس واقعہ سے متعلق انکار کرنے میں حق پر ہیں یا حافظ ابن حجر حق پر ہیں جو اس واقعہ کو صحیح قرار دیتے ہیں۔

ابنِ حجر کا بیان چنانچہ ابن حجر لکھتے ہیں:

ابن ابی حاتم، طبری اور ابن المنذر نے متعدد طرق سے بروایت شعبہ[۱] از ابوالبشر[۲] از سعید[۳] بن جُبیر روایت کی ہے کہ آنحضرت صلّی اللہ علیہ وسلّم نے یہ آیت پڑھی: اَفَرَاَیْتُمُ اللّٰتَ وَالْعُزّٰی وَمَنٰوةَ الثَّالِثَةَ الْاُخْرٰی (لات، عزّیٰ اور تیسرے مناۃ کو دیکھا؟) سورہ نجم آیت ۲۰) تو شیطان نے

---

[۱] شعبہ: شعبہ بن الحجاج: انھیں امیر المو[illegible]ن فی الحدیث کہا جاتا تھا۔ ستانوے سال کی عمر میں ۱۶۰ھ ۷۷۶ء میں وفات پائی۔

[۲] ابوالبشر: ابوالبشر صالح المرّی: اکثر روتے رہتے۔ مردوں کی باتیں سنتے اور ان سے باتیں کیا کرتے تھے۔

[۳] سعید بن جبیرؓ: بڑے پایہ کے تابعی تھے روتے روتے ان کی آنکھیں چندھی ہوگئی تھیں۔ ۳۸ھ میں پیدا ہوئے اور ۹۵ھ میں حجاج کے حکم سے انہیں ظلماً قتل کر دیا گیا۔ قتل سے پہلے دعا کی، اَللّٰهُمَّ لَا تُسَلِّطِ الْحَجَّاجَ عَلٰی اَحَدٍ بَعْدِیْ۔ خدایا میرے بعد حجاج کو کسی پر مسلّط نہ ہونے دینا، چنانچہ ان کے قتل کے بعد حجاج صرف پندرہ راتیں زندہ رہا۔ دوسری روایت میں ہے کہ چھ ماہ زندہ رہا اور اسکے پیٹ میں ناسور ہو گیا جو اس کی موت کا سبب بنا اس عرصہ میں جب حجاج سوتا تو خواب میں سعید بن جبیرؓ آجاتے اور اس کا پاؤں پکڑ کر جگا دیتے۔

(نعوذ باللہ) یہ الفاظ آپ کی زبان پر جاری کرا دیے: تِلْكَ الْغَرَانِيقُ الْعُلَى وَإِنَّ شَفَاعَتَهُنَّ لَتُرْتَجَى (یہ خوبصورت اور بلند مرتبہ نوجوان ہیں ان کی شفاعت کی امید کی جاتی ہے) یہ سنکر مشرکین نے کہا کہ آج تک تو محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) نے ہمارے خداؤں کا نام اچھی طرح نہ لیا تھا پھر جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے سجدہ کیا تو مشرکین نے بھی آپ کے ساتھ سجدہ کیا، اس کے بعد اس قصہ کی جو روایت بزار نے کی ہے اور جو بحث انھوں نے کی ہے اسے نقل کر کے ابن حجر کہتے ہیں؛

ابوبکر بن العربی نے اپنی عادت کے مطابق بڑی دیدہ دلیری سے کہا ہے کہ طبری نے اس سلسلہ میں بہت سی روایات نقل کی ہیں جن کی کوئی اصل نہیں حالانکہ مطلق طور پر اس کا یہ کہنا کہ اس کی کوئی اصل نہیں قطعاً غلط ہے۔ اسی طرح عیاض کا یہ کہنا کہ اس حدیث کو کسی صاحب صحت نے نقل نہیں کیا اور نہ ہی کسی ثقہ نے اس کی روایت سالم اور متصل سند سے کی ہے۔ بایں ہمہ اس کے نقل کرنے والے ضعیف اس کی روایات مضطرب اور اس کی اسناد منقطع ہے۔ اسی طرح عیاض کا یہ کہنا کہ وہ تابعین اور مفسرین جنھوں نے اس قصہ کو نقل کیا ہے کسی نے نہ اس کی سند بیان کی ہے اور نہ صحابی تک اسے مرفوع کیا ہے اور اکثر اسناد اس سلسلہ میں کمزور ہیں حالانکہ بزّار نے بیان کیا ہے کہ اس حدیث کا مرفوع ہونا سوائے سعید بن جبیر سے ابو لبشر کی روایت کے کسی طرح جائز نہیں حالانکہ وہاں بھی اس کے متصل ہونے میں شک ہے رہے کلبی[1] سو ان کے سخت ضعیف ہونے کی وجہ سے ان سے روایت ہی جائز نہیں اس کے بعد عیاض نے اسے عقلی طور پر رد کیا ہے اور کہا ہے کہ اگر کوئی ایسا واقعہ ہوا ہوتا تو بہت سے مسلمان مرتد ہو گئے ہوتے حالانکہ اس کا کہیں ذکر نہیں (کہ کوئی مسلمان مرتد ہوا ہو)" اھ

ابن حجر فرماتے ہیں کہ "یہ دلائل اصول کی بنا پر چل نہیں سکتے اس لیے کہ جب ایک حدیث متعدد طریقوں اور مختلف لوگوں سے مروی ہو تو اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ قصہ کی اصل ضرور ہے حالانکہ ہم نے ذکر کیا ہے کہ ان میں سے تین اسنادِ صحیح کی شرط کے مطابق ہیں اور یہ مرسل احادیث ہیں جن کو حجت ماننے والے بطور دلیل پیش کرتے ہیں۔ اسی طرح جو لوگ مرسل کو حجت نہیں مانتے وہ بھی اسے تسلیم کریں گے اس لیے کہ یہ تمام طرق مل کر ایک دوسرے کو قوت پہنچاتے ہیں۔ اب جب یہ بات طے پا چکی (کہ غرانیق کا واقعہ ضرور ہوا ہے) تو جو بات اس قصہ میں بری ہے اس کی تاویل کرنی پڑے گی۔"

اس سلسلہ میں ابن حجر نے چھ تاویلیں بیان کی ہیں جنھیں اُن کی کتاب میں دیکھ لیں اور جب قصہ

---

[1] کلبی: ہشام ابن الکلبی حافظ۔ ان کی حدیث متروک خیال کی جاتی ہے اور یہ ثقہ نہیں ہیں، ان کا پورا نام ابو المنذر ہشام بن محمد بن السایب کوفی ہے اور رافضی ہیں۔ ان کی وفات ۲۰۴ھ یا ۲۰۶ھ میں ہوئی۔

ثابت ہوگیا تو ابن حجر نے اسی قصہ کے مطابق اللہ تعالیٰ کے فرمان وَمَا اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ مِنْ رَّسُوْلٍ وَّلَا نَبِيٍّ اِلَّا اِذَا تَمَنّٰى اَلْقَى الشَّيْطٰنُ فِيْ اُمْنِيَّتِهٖ (سورۃ الحج آیت ۵۲) کی تفسیر کی ہے اور نقل کی ہے کہ ابن عباس تَمَنّٰى قرأ (پڑھا) اور اُمْنِيَّتِهٖ بمعنی قرارت بتایا کرتے تھے اور ان کا اشارہ مذکورہ بالا مسئلہ غرانیق کی طرف ہے اور پھر نحاس[1] کا یہ قول نقل کیا ہے کہ اس آیت کے بارے میں یہ تاویل نہایت عمدہ و اعلیٰ ہے۔"

میں نے حضرت سے عرض کیا اس مسئلہ کے بارے میں آپ کے نزدیک کونسی بات صحیح ہے اور اس مشکل مسئلہ میں ہم کس طرز کو اختیار کریں۔

حضرتِ دباغ کا جواب

حضرت نے فرمایا اس قصہ کے متعلق ابن العربی، عیاض[2] اور وہ لوگ جو ان سے متفق ہیں، حق پر ہیں۔ ابن حجر کی رائے صائب نہیں۔ غرانیق کا واقعہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے قطعاً پیش ہی نہیں آیا۔ مجھے بعض اوقات بعض علماء کے کلام پر تعجب آتا ہے، جیسے یہی قول جو ابن حجر اور اُن کے موافقین سے صادر ہوا کیوں کہ اگر اس قسم کا کوئی واقعہ پیش آیا ہوتا تو نہ شریعت پر اعتماد رہتا نہ عصمتِ (انبیاء) کا حکم باقی رہتا اور اگر رسول اور اس کے کلام میں شیطان کا تسلط ہوتا یہاں تک کہ شیطان نبی کے ارادہ، پسند اور مرضی کے بغیر جو چاہتا اس کے کلام میں بڑھا دیتا تو پھر رسول دیگر افرادِ انسانی کی طرح کا ایک فرد ہوگیا۔ اس طرح اس قدر بھاری واقعہ کے ہوتے ہوئے رسالت پر کیا اعتماد رہتا۔ اس کے جواب میں یہ کہنا کہ اللہ تعالیٰ شیطان کے ڈالے ہوئے الفاظ محو کر دیتا ہے اور اپنی آیات کو قائم رکھتا ہے، کچھ معنی نہیں رکھتا۔ اس لیے کہ ہو سکتا ہے کہ الفاظ بھی شیطان کے ہوں کیونکہ جب یہ جائز ہوگیا کہ مسئلہ غرانیق میں الفاظ کو زیادہ کرنے میں وہ آپ پر مسلّط ہوگیا تو یہ بھی جائز ہو سکتا ہے کہ وحی پر اس کا اتنا تسلط ہو کہ ساری آیت کا اضافہ کر دیا ہو۔ اس طرح قرآنِ مجید کی تمام آیات میں شک پیدا ہو سکتا ہے، مومن پر اس قسم کی احادیث سے جن سے دین میں شک پیدا ہو، اعراض کرنا واجب ہے اور ان احادیث کو دیوار پر پھینک ماریں اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی معصومیت اور آپؐ کے مرتبہ کا اس قدر بلند ہونا جس کے اوپر کوئی

---

[1] نحاس: ابو جعفر احمد بن محمد النحاس مشہور نحوی اور لغوی گزرا ہے۔ اس کی وفات ۳۳۸ھ ۹۴۹ء میں ہوئی، انھوں نے تفسیر قرآن لکھی ہے۔

[2] تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو شفاء عیاض مع شرح خفاجی ج ۴ ص ۹۳ تا ۱۰۱ طبع استنبول ۱۳۱۵ھ)

فیض الباری: ج ۲: ۳۸۷ - ۳۸۸۔

اور بلندی نہیں، کا وہ عقیدہ رکھیں جو آپ کو شایان ہے۔

مزید برآں جو کچھ ان لوگوں نے وَمَا اَرْسَلْنَا قَبْلَكَ مِنْ رَّسُوْلٍ وَّلَا نَبِيٍّ کی تفسیر میں ذکر کیا ہے وہ اس بات کا مقتضی ہے کہ ہر رسول اور ہر نبی کی وحی پر شیطان کا تسلط اس سے بھی زیادہ ہوا ہو جس قدر کہ قرآن پر ہوا ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے مِنْ رَّسُوْلٍ وَّلَا نَبِيٍّ اِلَّا اِذَا تَمَنّٰى اَلْقَى الشَّيْطَانُ فِيْۤ اُمْنِيَّتِهٖ (سورۂ حج آیت ۵۲) فرمایا ہے لہٰذا ان کی تفسیر کے مطابق آیت کا اقتضا یہ ہوا کہ خدا کے انبیاء اور برگزیدہ بندوں کے ساتھ شیطان کی یہ عادت جاری رہی ہے اور اس کے باطل ہونے میں کوئی شک و شبہ نہیں۔

مؤلف کہتا ہے خدا حضرت سے راضی ہو، باوجود امی ہونے کے آپ کی نظر کس قدر باریک ہے چنانچہ ناصرالدین[1] البیضاوی فرماتے ہیں:۔

"بعض لوگوں کا قول ہے تَمَنّٰى کے معنی قَرَءَ (پڑھا) کے ہیں اور اُمْنِيَّتِهٖ سے مراد قراءت ہے اور شیطان نے قراءت میں الفاظ ڈال دیے یعنی غرانیق کے الفاظ اتنی بلند آواز سے پڑھے کہ سننے والوں کو یہ شبہ ہوا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ الفاظ پڑھے ہیں۔ اس قول کو مردود قرار دیا گیا ہے کیونکہ اس سے وحی پر اعتماد میں خلل واقع ہوتا ہے فَيَنْسَخُ اللّٰهُ مَا يُلْقِي الشَّيْطَانُ ثُمَّ يُحْكِمُ اللّٰهُ اٰيٰتِهٖ سے یہ خلل دور نہیں ہوتا کیونکہ ہو سکتا ہے یہ بھی شیطانی القاء میں سے ہو۔"

حضرت نے اپنے جواب میں اسی کو شرح و بسط سے بیان کیا ہے۔

مؤلف کہتا ہے کہ اس پر ایک اور اعتراض یہ وارد ہوتا ہے کہ اُمْنِيَّتِهٖ کی ضمیر ان تمام رسولوں اور نبیوں کی طرف لوٹتی ہے جو آپ سے پہلے ہوئے مگر یہ ممکن نہیں کہ شیطان نے ان میں سے ہر ایک کی قراءت میں یہی مسئلہ غرانیق کا القاء کیا ہو، تمہیں یہ بھی معلوم ہے کہ عصمتِ انبیاء کا عقیدہ ایسا عقیدہ ہے جس میں پختہ یقین چاہیے لہٰذا جو حدیث اس عقیدہ کو توڑے یا رد کرے اسے کسی صورت میں بھی قبول نہیں کیا جائے گا۔ علماء اصولِ حدیث نے اس حدیث کا جو اس قسم کی ہو، ان احادیث میں شمار کیا ہے جنہیں قطعی طور پر غلط سمجھنا چاہیے۔ رہا حافظ ابن حجر کا یہ قول کہ جو مرسل حدیث کو حجت مانتے ہیں ان کے نزدیک بھی اور جو حجت نہیں مانتے ان کے نزدیک بھی یہ حدیث

---

[1] ناصرالدین بیضاوی: قاضی ناصرالدین ابی سعید عبداللہ بن عمر بیضاوی مشہور مفسر اور عالم گزرے ہیں ان کی وفات ۶۸۵ھ، ۱۲۸۶ء میں ہوئی ان کی تفسیر کا نام انوار التنزیل واسرار التاویل ہے۔

حجت ہے اس لیے کہ یہ حدیث تین صحیح طریقوں سے وارد ہونے کی وجہ سے قوی ہوجاتی ہے، اس کا جواب یہ ہے کہ یہ حکم وہاں کیا جا سکتا ہے جہاں ظن کفایت کرتا ہو جیسے وہ امور عملیہ جن کا تعلق حلال و حرام سے ہے۔ مگر امور علمیہ اعتقادیہ کے ثابت کرنے میں خبر واحد کوئی فائدہ نہیں دیتی چہ جائیکہ ان کے نفی اور منہدم کرنے میں اس سے یہ بات ظاہر ہو گئی کہ قاضی عیاض کا قول اصولِ حدیث کے مخالف نہیں ہے بلکہ جو کچھ حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ نے بیان کیا ہے وہی اصول کے خلاف ہے کیونکہ اس نے عقائد کو منہدم کرنے میں خبرِ واحد پر عمل کرنا چاہا ہے اور یہ اصولِ حدیث کے خلاف ہے۔

اسی طرح ابن حجر کا تَمَنّٰی کی تفسیر قَرَءَ سے اور اُمْنِیَّتِہٖ بمعنی قرأۃ کے کہنا اور یہ کہنا کہ یہ ابنِ عباس سے مروی ہے اور یہ قول اس آیت کی تفسیر میں بہترین، بلند اور اعلیٰ تفسیر ہے سو اس کا جواب یہ ہے کہ ابنِ عباس سے یہ روایت علی بن ابی صالح کاتب لیث از معاویہ بن صالح از علی بن ابی[1] طلحہ از ابن عباس آئی ہے اور لوگوں کو معلوم ہے کہ ابن ابی صالح کاتب لیث پر کیا کچھ اعتراض کیا گیا ہے اور محققین بالاتفاق اس کو ضعیف قرار دیتے ہیں۔ واللہ تعالیٰ اعلم۔

آیت وَمَا اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ مِنْ رَّسُوْلٍ وَّلَا نَبِيٍّ کی تفسیر

میں نے حضرت سے عرض کیا کہ آپ کے نزدیک اس آیت کی جو تفسیر ہے اور اس سے جس نور کی طرف اشارہ ہے وہ کیا ہے؟

حضرت نے فرمایا: جس نور کی طرف اس آیت میں اشارہ ہے وہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جو رسول یا نبی کسی بھی امت کی طرف بھیجا تو وہ رسول اپنی امت کے لیے ایمان کی تمنا کرتا، اسے ان کے لیے پسند کرتا، انہیں اس کی رغبت دلاتا۔ اسی کی انتہا درجہ کی خواہش کرتا اور اسی پر ان کو حد درجہ کا زور دیتا اور ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم بھی انہی میں سے ہیں جن کے متعلق اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں، فَلَعَلَّكَ بَاخِعٌ نَّفْسَكَ عَلٰٓى اٰثَارِهِمْ اِنْ لَّمْ يُؤْمِنُوْا بِهٰذَا الْحَدِيْثِ اَسَفًا (سورۂ کہف آیت ۶) اگر یہ لوگ قرآن پر ایمان نہ لائے تو کیا آپ افسوس کے مارے ان کے پیچھے اپنے آپ کو ہلاک کر ڈالیں گے (یعنی ایمان نہیں لاتے تو نہ لائیں، آپ اس تمنا میں کیوں گھلے جاتے ہیں)

[1] علی بن ابی طلحہ: انھوں نے ابن عباس سے روایت کی ہے حالانکہ ان کے درمیان مجاہد آتے ہیں۔ ان کے ثقہ ہونے میں اختلاف ہے ۲۴۳ھ ۸۵۷ء میں ان کی وفات ہوئی۔

اور فرمایا وَمَا اَکْثَرُ النَّاسِ وَلَوْ حَرَصْتَ بِمُؤْمِنِیْنَ (سورہ یوسف آیت: ۱۰۳) آپ خواہ کتنی خواہش کیوں نہ کریں، بہت سے لوگ ایمان لانے کے نہیں اور فرمایا اَفَاَنْتَ تُکْرِہُ النَّاسَ حَتّٰی یَکُوْنُوْا مُؤْمِنِیْنَ (سورہ یونس آیت: ۹۹) کیا آپ لوگوں کو ایمان لانے پر مجبور کریں گے وغیرہ آیات جن میں اسی تمنا کا مضمون پایا جاتا ہے پھر امت کا حال بھی مختلف ہوتا ہے بعضے مومن اور بعضے کافر۔ شیطان کافر کے دل میں اس قسم کے وسوسے ڈال دیتا ہے جو نبی کی رسالت میں نقص نکالنے اور اس کے کفر کا سبب بنتے۔ اسی طرح مومن بھی وسوسوں سے نہ بچتا کیونکہ ایمان بالغیب کے لیے وسوسوں کا آنا ضروری امر ہے۔ اگرچہ یہ وسوسے اپنے اپنے متعلقات کے اعتبار سے کسی میں زیادہ ہوتے ہیں۔ جب یہ ثابت ہوگیا تو اب تَمَنّٰی کے معنی یہ ہوئے کہ نبی امت کے لیے ایمان کی تمنا کرتا ہے اور ان کے لیے بھلائی، ہدایت، بہبود اور نجات کو پسند کرتا ہے یہی ہر نبی اور رسول کی آرزو رہی ہے اور شیطانی القا۔ وہی وساوس ہیں، جنھیں وہ بعض ان لوگوں کے دلوں میں ڈالتا ہے جن کی طرف اس رسول یا نبی کو بھیجا گیا ہو اور وہ ان کے کفر کا سبب بنتے ہیں۔ پھر اللہ تعالیٰ مومنین پر رحم کرتا ہے اور ان وساوس کو ان کے دلوں سے محو کر کے ان میں وہ آیات مضبوطی سے ڈال دیتا ہے جو خدا کی وحدانیت اور رسول کی رسالت پر دلالت کرتی ہیں اور منافقین اور کافرین کے دلوں میں ان وساوس کو اسی طرح رہنے دیا جاتا ہے جس کی وجہ سے وہ فتنہ میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ یہاں یہ معلوم ہوگیا کہ وساوس پہلے دونوں فریقوں کے دلوں میں ڈالے جاتے ہیں مگر مومنین پر قائم نہیں رہتے اور کافروں پر قائم رہتے ہیں۔

مؤلف کہتا ہے کہ میرے نزدیک یہ تفسیر بہترین تفسیر ہے۔ اس کا پتہ اسی وقت چل سکتا ہے جب ہم ان تفاسیر کو نظر میں رکھیں جو اس آیت کی کی گئیں پھر ان کا اور حضرت کی تفسیر کا مقابلہ کیا جائے۔

پہلی تفسیر

چنانچہ اس آیت کی پہلی تفسیر وہ ہے جس کا ذکر ابن ابی صالح کاتب لیث کی روایت میں ہو چکا، اور ہم یہ بتا چکے ہیں کہ یہ تفسیر عقیدہ اور اس کے عموم کے مخالف ہے جس کا ذکر آیت کے شروع میں کیا گیا کیونکہ اس تفسیر میں اسے خاص مسئلہ غرانیق سے تعبیر کیا گیا ہے حالانکہ لفظ عام ہے جو ہر نبی اور رسول کے لیے ہے۔

دوسری تفسیر

دوسری تفسیر: ابو محمد مکی[1] کہتے ہیں کہ طبری نے لکھا ہے تَمَنّٰی بمعنی دل میں کسی چیز کا

[1] ابو محمد مکی: ابو محمد مکی بن ابی طالب قیسی نحوی مغربی متوفی ۴۳۷ھ؁ ۱۰۴۵ء؁ ان کی تفسیر پندرہ جلدوں میں ہے۔

خیال کرنا تو شیطان ان خیالات میں کچھ اور خیالات بطور حیلہ ڈال دیتا ہے اور کہتا ہے کہ آپ اللہ سے یہ درخواست کریں کہ آپ کو اس قدر مالِ غنیمت عطا کرے تاکہ مسلمان مالدار ہو جائیں حالانکہ خدا کو ہر قسم کی مصلحت کا علم ہے۔ لہٰذا اللہ تعالیٰ القاءِ شیطانی کو محو کر دیتا ہے چنانچہ فراء[1] اور کسائی[2] نے تمنّٰی کے معنی حدیث النفس کے دیے ہیں۔ اھ

مؤلف کہتا ہے اس تفسیر میں جو نقص ہے ظاہر ہے اور یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ شیطان نبی سے چال چلے کیونکہ نبی کی بصیرت تو اس قدر صاف و روشن ہوتی ہے کہ سارا جہاں اس سے روشنی حاصل کرتا ہے مزید برآں یہ تفسیر اس عموم سے موافقت نہیں رکھتی جو آیت کے شروع میں ہے اور نہ ہی اس تعلیل سے موافقت رکھتی ہے جو آیت کے آخر میں ہے جیسا کہ ظاہر ہے۔ واللہ اعلم۔

تیسری تفسیر بیضاوی نے لکھا ہے کہ تَمَنّٰی کے معنی ذَوَّرَ فِی نَفْسِہٖ مَا یَھْوَاہُ اپنی خواہشات کو خوبصورت بنا کر پیش کیا اور اَلْقَی الشَّیْطَانُ فِی اُمْنِیَّتِہٖ کے معنی ہیں شیطان ان کی خواہش میں ایسی چیزوں کا القاء کرتا ہے جن سے آپ دنیا کی طرف مشغول ہو جاتے ہیں جیسا کہ آنحضرت نے فرمایا ہے[3] اِنَّہٗ لَیُغَانُ عَلٰی قَلْبِیْ فَاَسْتَغْفِرُ اللہَ فِی الْیَوْمِ سَبْعِیْنَ مَرَّۃً میرے دل پر بادل چھا جاتے ہیں تو میں دن میں ستر بار اللہ سے استغفار کرتا ہوں، وغیرہ وغیرہ۔ جو کچھ بھی اس نے لکھا ہے نہ آیت کے سیاق سے مناسبت رکھتا ہے اور نہ ہی مرتبۂ رسالت کی تنزیہ ہے۔

مختصر یہ کہ اس آیت کی صحیح تفسیر وہی ہو سکتی ہے جس میں تین باتوں کا لحاظ رکھا گیا ہو (۱) آیت کی ابتدا کا عموم (۲) آیت کے آخر کی تعلیل (۳) اور رسالت کا حق ادا کرے اور یہ تینوں باتیں جیسا کہ آپ کو معلوم ہو چکا، شیخ کی تفسیر کے سوا کہیں نہیں پائی جاتیں۔ واللہ تعالیٰ اعلم۔

---

[1] فراء: ابوزکریا یحییٰ بن زیاد الفراء نحوی اور لغت دان تھا، الکسائی کا شاگرد تھا۔ ۱۴۴ھ ۷۶۱ء میں پیدا ہوا اور ۲۰۷ھ ۸۲۲ء میں وفات پائی۔

[2] کسائی: بہت بڑے نحوی اور لغت دان تھے۔ ابوالحسن علی بن حمزہ الکسائی کوفے کے نحویوں کا امام تھا۔ اس کی وفات ۱۸۹ھ ۸۰۴ء میں ہوئی۔

[3] ملاحظہ ہو مشکوٰۃ باب الاستغفار ص ۲۰۳ مگر وہاں بجائے سبعین مرۃ کے مائۃ مرۃ ہے۔ ۱۲

۱۶۔ قصہ ہاروت و ماروت

میں نے حضرت سے قاضی عیاض اور ابن حجر کے درمیان ہاروت و ماروت کے قصہ کے بارے میں جو اختلاف ہے اس کے متعلق دریافت کیا کیوں کہ قاضی عیاض نے اس سلسلہ میں جو احادیث آئی ہیں ان سے انکار کیا ہے اور انہیں باطل قرار دیا ہے اور ابن حجر نے اس قصّہ کو سچ سمجھا ہے اور کہا ہے کہ یہ قصہ متعدّد طریقوں سے آیا ہے جن سے قصہ کی صحت کا یقین ہو جاتا ہے اور اس کا وقوع قطعی طور پر ثابت ہو جاتا ہے۔ حافظ سیوطی نے بھی ابن حجر کی تابعداری کی ہے اور اپنی کتاب الحباءِ بِكِ فِی اخبار الملائكۃ میں اس کے کئی ایک طریقے دیے ہیں اور کہا ہے کہ اس نے اپنی تفسیر کبیر میں اس قصّہ کے تمام طریقے بیان کر دیے ہیں۔

حضرت نے فرمایا۔ یہاں بھی قاضی عیاض حق پر ہیں۔ اور پھر وہ اسرار بیان کئے جنہیں نہ لکھا جا سکتا ہے اور نہ ہی افشاء کیا جا سکتا ہے۔ والسلام۔

۱۷۔ وَيُنَزِّلُ مِنَ السَّمَاءِ مِنْ جِبَالٍ فِيهَا مِنْ بَرَدٍ (سورۂ نور آیت ۴۳)

میں نے حضرت سے آیت وَيُنَزِّلُ مِنَ السَّمَاءِ مِنْ جِبَالٍ فِيهَا مِنْ بَرَدٍ کے متعلق دریافت کیا کہ کیا آسمان میں پہاڑ ہیں جیسا کہ بعض مفسرین کا بیان ہے۔

حضرت نے فرمایا آسمان میں پہاڑ نہیں ہیں۔ اس آیت میں سَمَاء سے مراد ہر وہ چیز ہے جو ہمارے سر کے اوپر ہے یعنی "تمہارے اوپر سے اتارتا ہے" اور برف کے پہاڑ اوپر کی طرف سے ہی آتے ہیں۔ کیونکہ ہوا انہیں زمین سے اٹھا کر اوپر لے جاتی ہے۔

اس آیت کے متعلق حضرت سے سوال کرنے کا سبب یہ تھا کہ کسی نے مجھ سے پوچھا کہ برف کس طرح بنتی ہے اور سوال کے ضمن میں کئی ایک اور باتیں آ جاتی تھیں اور مجھے سمجھ نہ آتی تھی کہ کیا جواب دوں۔ یہ سوالات میں نے حضرت کے سامنے پیش کئے۔ آپ نے تمام باتوں کا جواب دیا، میں نے یہ تمام باتیں جواب میں ذکر کر دیں۔ اب میں یہ سوال اور جواب دیتا ہوں تاکہ اس سے پورا فائدہ اٹھایا جا سکے۔

سوال اے علمائے کرام خدا مخلوقات کو آپ سے ہمیشہ مستفیض رکھے۔ برف کی اصل کیا ہے؟ کیا اپنی جگہ سے یہ اسی طرح جمی ہوئی اترتی ہے یا یہ اصل میں پانی ہوتا ہے جسے ہوائیں جما دیتی ہیں اور یہ کس جگہ سے اترتی ہے۔

کیا یہ آسمان سے اترتی ہے یا بارش برسانے والے بادلوں سے یا یہ سمندر سے آسمان میں اکر رُکی ہوتی ہے جیسا کہ بارش کے متعلق کہا جاتا ہے اور کیا سبب ہے کہ یہ صرف سخت سرد ملکوں میں ہی پڑتی ہے گرم ملکوں میں نہیں پڑتی اور کیا وجہ ہے کہ صرف پہاڑوں پر پڑتی ہے۔ میدانوں میں نہیں پڑتی اور اگر میدانوں میں پڑے تو تھوڑی دیر کے بعد پگھل جاتی ہے حالانکہ پہاڑوں میں قائم رہتی ہے، بعض اوقات ہم دیکھتے ہیں کہ یہ بارش کے ساتھ یک لخت اولوں کی صورت میں گرنے لگتی ہے اور کبھی اکیلی برف یعنی اولے برستے ہیں۔ مزید برآں ہم دیکھتے ہیں کہ گرم اور سرد ملکوں کا درمیانی فاصلہ بہت تھوڑا ہوتا ہے مثلاً سولہ میل یا اس سے بھی کم اس کے باوجود ہر ملک کی خصوصیت الگ ہوتی ہے اِدھر سردی ہے اور اُدھر گرمی) کیا اس سبب کی کوئی علّت ہے یا نہیں؟ کیا وجہ ہے کہ سردی صرف پہاڑوں اور بلند مقامات پر ہوتی ہے۔ میدانوں میں نہیں ہوتی؟ پھر یہ کہ بجلی صرف ٹھنڈے ملکوں، پہاڑوں اور اُن مقامات پر گرتی ہے جہاں درخت ہوں اور میدانی گرم اور ہموار زمین جیسے صحرا میں نہیں گرتی، چنانچہ میدانوں کے لوگ کہتے ہیں کہ انہیں بجلی کا پتہ ہی نہیں اور نہ وہاں گرتی ہے کیا وجہ ہے کہ ایک جگہ گرتی ہے اور دوسری جگہ نہیں گرتی اور اس میں کیا راز ہے؟ شافی جواب دیں۔

جواب اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ وَحْدَہٗ وَصَلَّی اللّٰہُ عَلٰی سَیِّدِنَا مُحَمَّدٍ وعلی اٰلہ وصحبہ الجواب واللہ الموفّق لِلصَّوَابِ بِمَنِّہٖ۔

برف پانی ہے جسے ہوائیں منجمد کرتی ہیں اور اس کی اصل عموماً بحرِ محیط کے پانی سے ہے اور بحرِ محیط کے پانی میں تین خاصیتیں پائی جاتی ہیں۔

۱۔ ہواؤں کے قرب اور سورج کی گرمی سے دوری کی وجہ سے جس قدر سخت ٹھنڈا پانی ہوتا ہے کوئی اور پانی نہیں ہوتا۔ اسی لیے معمولی سے سبب سے یہ منجمد ہو جاتا ہے۔

۲۔ یہ پانی انتہا درجہ کا صاف ہوتا ہے اس لیے کہ یہ اپنی اصل پر قائم ہوتا ہے اور اس میں کسی قسم کے جواہرِ ارضی ملے نہیں ہوتے کیونکہ یہ ایک ایسا سمندر ہے جسے ازلی قدرت اٹھائے ہوئے ہے، یہ نہ زمین پر ہے نہ کسی اور چیز پر۔

۳۔ انتہائی بُعد۔ اسی لیے کہ ہمارے اور اس کے درمیان نہایت دور کی مسافت ہے۔

جب یہ معلوم ہو گیا تو یاد رکھو کہ جب اللہ تعالیٰ ہواؤں کو حکم دیتا ہے کہ اس میں سے کچھ حصّہ اٹھائے جائیں تو اپنی ٹھنڈک کے باعث اٹھانے کے بعد ہی منجمد ہو جاتا ہے۔ ہوائیں اسے تھوڑا تھوڑا کر کے اٹھائے اور بہائے چلی جاتی ہیں حتیٰ کہ اس طویل مسافت کے طے کرنے میں جو ہمارے اور بحرِ محیط کے درمیان واقع ہے اس کی بندش بے حد کھل جاتی ہے یہاں تک کہ یہ غبار کی طرح ہو جاتا ہے اور اپنی تری کے باعث اس کے اجزا مجتمع ہو جاتے ہیں اسی لیے کبھی یہ باریک صوف کی صورت میں گرتا ہے اور کبھی اس سے بھی زیادہ باریک۔ برف کی اصل یہی ہے، برخلاف اولے (ژالہ) کے اس لیے کہ اس کے منجمد ہونے اور گرنے کی درمیانی مسافت لمبی نہیں ہوتی کیونکہ اولے ان سمندروں کے پانیوں سے بنتے ہیں جو زمین کے درمیان میں ہیں اور ان تالابوں سے جو بالعموم بارشوں کے گرنے سے زمین پر جمع ہو جاتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اولے کے بیچ میں زمین کے اجزاء مثلاً گوبر وغیرہ پائے جاتے ہیں اور ثقہ لوگوں نے اس کا مشاہدہ بھی کیا ہے۔ نیز چونکہ چاروں طرف سے اس پر ہواؤں کے تھپیڑے پڑتے رہتے ہیں اس لیے وہ گول اور ایسا بنا ڈلیے ہوتا ہے جیسے گوندھے ہوتے سخت آٹے کا پیڑا کہ اس کو عورت برتن میں لت کر ہاتھوں سے گولہ بناتی ہے اور اولے کے اجزاء کو ہوا کے جھونکے متھ کر پیڑا بنا دیتے ہیں چنانچہ اگر اولہ فوراً گرے تو ہم یہ بات اس میں دیکھ سکتے ہیں اور اگر اس کے گرنے میں دیر لگے اور ہواؤں کے تھپیڑے جاری رہیں تو اس کے اجزاء ٹوٹ کر برف بن جاتے ہیں۔ برف کی اصل اور حقیقت یہی ہے اور یہیں سے گرتی ہے۔

رہی یہ بات کہ برف اور اولے کے لیے سرد مقامات اور پہاڑ کی چوٹیاں کیوں مخصوص ہیں سو اس کا جواب یہ ہے کہ جب تک کوئی مانع پیش نہ آئے برف برابر جمی رہتی ہے اور جب مانع پیش آئے تو یہ بارش بن جاتی ہے اور یہ مانع وہی زمین سے اُٹھنے والے اجزاء بخاریہ ہیں اور ان میں کسی قدر حرارت پائی جاتی ہے لہٰذا جب یہ برف سے ملتے ہیں تو اس کی خنکی کو کم کر کے اس کے انجماد کو زائل کر دیتے ہیں یہ بات ظاہر ہے کہ اجزاء بخاریہ گرم ملکوں اور میدانوں میں زیادہ پائے جاتے ہیں اس لیے وہاں برف نہیں پڑتی اور اگر پڑے بھی تو زیادہ دیر تک نہیں رہتی برخلاف سرد ملکوں اور بلند پہاڑوں کے کہ وہاں برف منجمد ہونے سے رکنے کا کوئی سبب موجود نہیں ہوتا۔

اب رہی یہ بات کہ کبھی یہ بارش کے ساتھ گرتی ہے، کبھی تنہا۔ سو بارش کے ساتھ اس کے گرنے کے دو سبب ہیں یا تو اس لیے کہ ان بخاری اجزاء کی وجہ سے جو پہلے ہی موجود ہوتے ہیں، اس کے کچھ اجزا پگھل جاتے ہیں اس طرح پگھلے ہوئے اجزاء بارش کی صورت میں گرتے ہیں اور جو اجزاء نہیں پگھلتے

وہ برف کی صورت میں۔ یہی وجہ ہے کہ جو بارش اولوں کے ساتھ گرتی ہے وہ بالعموم ہلکی کمزور اور باریک بوندوں والی پسی ہوئی شکل کی ہوتی ہے ۔یا یہ کہ یہ پورے طور پر منجمد ہونے سے پہلے گر پڑتی ہے کیونکہ ہوائیں پانی اٹھاتی ہیں تو وہ منجمد ہوجاتا ہے اور وہ اسے پیسنے لگتی ہیں پھر اور پانی اٹھاتی ہیں پھر جب اللہ تعالیٰ اسے گرنے کا حکم دیتے ہیں تو پہلا حصہ برف کی صورت میں گرتا ہے اور دوسرا بارش کی صورت میں (کیونکہ وہ تو ابھی منجمد نہ ہوا تھا)۔

رہا آپ کا یہ سوال کہ سولہ سترہ میل کے قلیل فاصلے میں کون سی دیوار کھڑی ہوگئی کہ ادھر برف پڑتی ہے اور ادھر نہیں تو اس کا جواب ظاہر ہے کہ اس فرق کا دار و مدار تمام تر مانع و عدم مانع پر ہے ۔سرد ملکوں میں انجماد سے کوئی چیز مانع نہیں ہوتی اور گرم ملکوں میں مانع موجود ہوتا ہے اسی لیے ہر ایک میں اپنی اپنی خصوصیت پائی گئی۔

یہ کہنا کہ پہاڑ اور بلند مقامات میں ٹھنڈک کیوں ہوتی ہے اور میدانوں میں کیوں نہیں ۔ اس کا جواب یہ ہے کہ پہاڑ اور بلند مقامات میں ٹھنڈک اس لیے ہوتی ہے کہ وہ اس جَو (خلا) کے قریب ہوتے ہیں جو انتہا درجہ کا سرد ہوتا ہے اور میدان اس سے دور ہوتے ہیں فرق کی یہی وجہ ہے۔

اب رہا صاعقہ کے متعلق آپ کا سوال کہ گرم ملکوں میں کیوں نہیں گرتی ، اس کا جواب یہ ہے کہ یہ دعویٰ ہی غلط ہے کیونکہ ہم نے اپنے شہر سلجماسہ میں صاعقہ گرتی دیکھی ہے حالانکہ یہ میدانی ہموار اور صحرائی علاقہ ہے ۔ہم نے بارہا اسے گرتے دیکھا ہے۔

سید نے شرح مواقف میں بھی ایک واقعہ لکھا ہے کہ ایک جنگل میں ایک بچے کے پاؤں پر بجلی گری تو اس کی دونوں پنڈلیاں گر گئیں مگر خون نہیں نکلا۔مفسرین نے بھی اللہ تعالیٰ کے اس فرمان کے تحت وَيُرْسِلُ الصَّوَاعِقَ فَيُصِيبُ بِهَا مَنْ يَشَاءُ (اللہ تعالیٰ صاعقہ بھیجتے ہیں اور جسے چاہتے ہیں لگ جاتی ہے) صحرا میں اس کے گرنے کا ذکر کیا ہے۔

یاد رکھیں کہ جو کچھ جواب میں لکھا گیا وہ سب اس شخص کی اطلاع ہے جو ارباب بصیرت میں سے ہے اور اس نے حقیقت کا مشاہدہ کیا ہے ۔ ہماری مراد حضرت سے ہے لہٰذا یہ جواب حضرات صوفیہ کا جواب ہے۔

مگر ہمیں اہل سنت والجماعت کا اس بارے میں کوئی جواب نہیں ملا۔ میں نے تفسیر، حدیث اور کلام میں ان تمام مقامات کی طرف رجوع کیا جہاں اس مسئلہ کے پائے جانے کا گمان ہو سکتا تھا مگر مجھے کہیں کچھ نہ ملا یہاں تک کہ حافظ جلال الدین سیوطی نے جن کا حدیث و آثار میں مرتبہ ہے اس کا

ذکر هِبَةُ السَّنِيَّةِ فِي الْهَيْئَةِ السَّنِيَّةِ میں بھی نہیں کیا حالانکہ علم ہیئت کے اسی قسم کے مسائل کے لیے یہ کتاب لکھی گئی تھی اور نہ بیضاوی کے حاشیہ میں حالانکہ سیوطی کا طریقہ یہ ہے کہ حکمار کے اس کلام کا جس کی اتباع بیضاوی کرتا ہے، سلف صالحین کے کلام سے رد کرتا ہے اور نہ اپنی تفسیر الدُّرُّ الْمَنْثُورُ فِي تَفْسِيرُ الْقُرْآنِ بِالْمَاثُورِ وغیرہ کتابوں میں اس کا تذکرہ کیا ہے حالانکہ ان تینوں کتابوں میں رعد، صواعق، بارش، بادل اور بجلی پر بہت بحث کی ہے اس لیے ضروری تھا کہ برف اور اولوں اور ان کے سبب کی بحث کرتا کیونکہ بیضاوی نے ان کے سبب کی فلسفیانہ بحث نقل کی ہے جس کی بنار فاعل بالاختیار یعنی خدا کی نفی پر ہے۔ المواقف[1] کے مصنّف نے اس کی طرف اشارہ کیا ہے اور حکمار کا یہی طرز ہے، مواقف اور اس کی شرح میں مصنف کہتا ہے:

"یاد رکھیں کہ سورج وغیرہ کی گرمی سے یا ہوا سے پانی کے اجزا مل کر فضا میں اٹھتے ہیں، اسی کا نام بخار ہے اور ان کا بلند ہونا بوجھل ہوتا ہے یا اجزار ناریہ ارضیہ اٹھتے ہیں، یہی دھواں ہے جس کا بلند ہونا ہلکا ہوتا ہے۔ دھواں صرف وہی نہیں جو بالعموم سیاہ رنگ کا اور ان چیزوں سے اٹھتا ہے جو آگ سے جلتی ہیں، ایسا بہت شاذونادر ہی ہوتا ہے کہ خالص بخار اور خالص دھواں اٹھے بلکہ بالعموم یہ دونوں ملے جلے ہوتے ہیں اور انہی سے تمام آثار علویہ پیدا ہوتے ہیں۔ اگر دھواں کم ہو اور ہوا میں سخت گرمی ہو تو اس میں پانی کے اجزار حل ہو جاتے ہیں اور وہ اجزاء ہوا میں بدل جاتے ہیں۔ اسے خالص ہوا کہتے ہیں ورنہ اگر دھواں زیادہ ہو اور ہوا میں اس قدر حرارت نہ ہو جو اسے حل کر دے تو جب یہ بخار بلند ہو کر ٹھنڈی ہوا تک پہنچے گا تو اس کی ٹھنڈک سے منجمد ہو جاتے گا اور گاڑھا ہو کر بادل بن جائے گا اور پانی کے اجزاء اگر منجمد نہ ہوں اور سردی زیادہ نہ ہو تو قطروں کی صورت میں گریں گے یا اگر سردی زیادہ ہو گی تو منجمد ہو کر گریں گے

اور اگر اجتماع تقاطر اور بڑے بڑے اجسام بننے سے پہلے انجماد ہو تو یہ برف ہو گی اور اگر بعد ہو تو اولے اولے گنبد کی طرح گول اس لیے ہوتے ہیں کہ اس میں بہت تیز حرکت ہوتی ہے جو ہوا کو لگ کر کے اسے پھاڑتی ہے اس لیے گرنے والے قطروں کے کونے مٹ جاتے ہیں۔ اس کے بعد اس نے سایہ، کہُر، دُھند کڑک، بجلی، صاعقہ، ہوا اور دیگر امور علویہ پر بحث کی ہے، پھر ایک طویل عبارت کے بعد جس کا ملخص ہم نے جامع عبارت میں فصل ثانی یا مرصد اول میں ذکر کر دیا ہے کہا ہے کہ یہ تمام فلسفیوں کی

---

[1] مواقف: علامہ عضدالدین عبدالرحمٰن بن احمد ایجی کی تصنیف ہے جو انھوں نے غیاث الدین وزیر خدابندہ کے لیے لکھی۔

آرار ہیں کیونکہ انھوں نے قادرِ مطلق کی نفی کی ہے جیسا کہ پہلے ذکر ہو چکا۔

ناصر الدین بیضاوی کو فلاسفہ کے طریقہ پر وَیُنَزِّلُ مِنَ السَّمَاءِ مِنْ جِبَالٍ فِيهَا مِنْ بَرَدٍ کی تفسیر میں مہارت حاصل ہے۔ تعجب ہے کہ حافظ سیوطی نے اس کتاب کے حاشیہ میں خاموشی اختیار کی ہے۔ اسی طرح شیخ الاسلام[۱] زکریا انصاری نے بھی اس کے حاشیہ میں سکوت اختیار کیا ہے۔

یاد رکھیں کہ پہلا جواب جسے ہم نے حضرت سے سنا تھا اگر ہم اسے پھیلا کر اس کی تمام وجوہ اور تفصیل بیان کرنے لگیں تو ایک کتاب میں بھی سما نہ سکیں۔ جس قدر ہم بیان کر چکے ہیں۔ بس اتنا ہی کافی ہے۔ واللہ تعالیٰ اعلم۔ اس کا قائل اور کاتب احمد بن مبارک بن محمد بن علی بن مبارک سلجماسی لمطی ہے خدا اس پر اپنا کرم کرے۔ آمین

زلزلہ اور اس کا سبب

میں نے حضرت سے زلزلہ اور اس کے سبب کی نسبت سوال کیا۔ واقعہ یوں ہوا کہ میں رصیف کے بازار میں حضرت کے ساتھ جا رہا تھا کہ ایک معمولی سا جھٹکا آیا جسے کچھ لوگوں نے محسوس کیا کچھ نے نہیں، میں نے بھی اسے محسوس نہ کیا تھا جب ہم مخفیہ کے تکیہ پر پہنچے تو لوگوں نے پوچھا کیا تم نے زلزلے کو محسوس کیا تھا، میں نے کہا میں نے تو محسوس نہیں کیا اور نہ ہی زلزلہ آیا۔ حضرت نے فرمایا: زلزلہ آیا تھا اور اس وقت آیا تھا جب ہم رصیف کے بازار میں فلاں شخص کے پاس اس کی دکان پر کھڑے تھے، پھر زلزلہ کا علم سب کو ہو گیا۔ چنانچہ میں نے حضرت سے اس کا سبب پوچھا۔ جو کچھ سلف صالحین نے زلزلے کے بارے میں کہا تھا، اس کا بھی مجھے علم تھا اور جو کچھ فلسفیوں نے کہا ہے اس کا بھی۔ اس لیے میں حضرت سے جواب سننا چاہا۔

حضرت نے فرمایا زلزلہ کا سبب زمین پر حق تعالیٰ کی تجلّی کا پڑنا ہے اس کی تفصیل میں راز ہے جو میں نے حضرت سے سن لیا تھا۔ پھر فرمایا ابتداء آفرینش اور پہاڑوں کی پیدائش سے پہلے یہ تجلّی بکثرت ہوا کرتی تھی اور زمین بے قرار ہو کر جھک جاتی۔ پھر اللہ تعالیٰ نے حجاب ڈال دیا اور پہاڑ پیدا کیے تو زمین ساکن ہو گئی۔ آخر زمانے میں پھر یہ تجلّی زیادہ ہو جائے گی جس کی وجہ سے زمین میں زلزلے بکثرت ہوا کریں گے یہاں تک کہ تمام مخلوق ہلاک ہو جائے گی۔

مولّف کہتا ہے کہ حافظ سیوطی نے اپنی کتاب کَشْفُ الصَّلْصَلَةِ عَنْ وَصْفِ الزَّلْزَلَةِ میں بروایت ابن عباس قریباً وہی بیان کیا ہے جو حضرت نے فرمایا۔

---

[۱] شیخ الاسلام زکریا انصاری الخزرجی امام شعرانی کے استاد تھے۔ شریعت اور طریقت دونوں میں اپنے زمانے میں جواب نہ رکھتے تھے ان کی بہت سی تصانیف ہیں۔ سنہ ۹۲۶ھ/ ۱۵۱۹ء میں وفات پائی۔

طبرانی نے کتاب السنۃ میں یہ باب باندھا ہے زلزلے کے وقت زمین پر اللہ تعالیٰ کی تجلی کے متعلق جو کچھ احادیث میں آیا ہے اس کا بیان حفص بن عمر ارقی از عمرو بن عثمان الکلبی از موسیٰ بن اعین از اوزاعی از یحییٰ بن ابی کثیر از عکرمہ از ابن عباس، فرمایا جب اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کو ڈرانا چاہتا ہے تو زمین کو اپنا کچھ جلوہ دکھاتا ہے جس سے وہ لرزنے لگتی ہے اور جب کسی قوم کو تباہ کرنا چاہتا ہے تو پورا جلوہ دکھاتا ہے۔

مسند فردوس میں دیلمی نے لکھا ہے: خبر دی عبدوس نے از زنجویہ از القطیعی از محمد بن اسحق البلخی القاضی از ابو نعیم از عبدالرحمن بن براء ہراتی از ابو عبداللہ الهروی از محمد بن ازہر از ایوب بن موسیٰ از اوزاعی از یحییٰ بن ابی کثیر از عکرمہ از ابن عباسؓ کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جب اللہ تعالیٰ اپنی مخلوق کو ڈرانا چاہتا ہے تو اپنی کچھ تجلی زمین پر ڈالتا ہے جس سے وہ لرزنے لگ جاتی ہے اور جب اللہ اپنی مخلوق کو ہلاک کرنا چاہتا ہے تو پورا جلوہ دکھاتا ہے۔

خدا حضرت سے راضی ہو، آپ کو امور کا کسقدر علم ہے۔

اس کے بعد امام سیوطی نے لکھا ہے، ان احادیث سے ظاہر ہو گیا کہ حکماء کا یہ کہنا فاسد ہے کہ زلزلے ان بخارات کی کثرت سے آتے ہیں جو سورج کی تاثیر سے پیدا ہو کر زمین کے نیچے جمع ہو جاتے ہیں جہاں ہوا کی برودت ان کو توڑ نہیں سکتی کہ پانی بن جائے اور نہ ہی اپنی کثرت کے باعث تھوڑی سی حرارت سے تحلیل ہوتے ہیں اور سطح زمین بھی وہاں اس قدر سخت ہوتی ہے کہ وہاں سے بخارات نکل نہیں سکتے، لہٰذا جب بخارات اوپر اٹھتے ہیں اور انہیں نکلنے کی راہ نہیں ملتی تو زمین حرکت کرتی اور اس طرح بیقرار ہوتی ہے جس طرح بخار میں مبتلا انسان مضطرب ہوتا ہے کیونکہ گرم بخارات اس کے پیٹ میں جوش مار رہے ہوتے ہیں۔ بعض اوقات زمین کی سطح پھٹ جاتی ہے تو یہ رکے ہوئے مادے باہر نکل آتے ہیں۔

اس رائے کے باطل ہونے کی وجہ یہ ہے کہ ان کا یہ دعویٰ بلا دلیل ہے بلکہ اس کے خلاف پر دلیل قائم ہے۔ یہ حافظ سیوطی کا بیان ہے۔

خسف کا سبب

میں نے حضرت سے دریافت کیا کہ زمین میں کبھی خسف ظاہر ہوتا ہے یعنی زمین پھٹ جاتی ہے اور اس میں انسان و دیگر اشیاء دھنس جاتی ہیں اور یہ صورت آخر زمانے میں بکثرت ہو گی اس کا کیا سبب ہے؟

فرمایا: زمین پانی پر ہے اور پانی ہوا پر اور ہوا اس بڑے میدان سے نکلتی ہے جو آسمان اور بحر محیط

کے درمیان واقع ہے۔ اس کی تشریح یوں ہے کہ فرض کرو کہ ایک شخص متواتر چلتا رہے تو چلتے چلتے وہ وہاں پہنچ جائے گا جہاں زمین ختم ہو جائے پھر اسے بحرِ محیط نظر آئے گا، پس اگر ہم فرض کریں کہ وہ بحرِ محیط پر بھی چلتا گیا ہے تو بالآخر وہ ختم ہو جائے گا اور اب اس کے اور آسمان کے درمیان صرف ایک خلا ہو گا جس سے ہوا نکلتی ہے اسے ایسی ہوائیں دکھائی دیں گی جن کی نہ کیفیت بیان ہو سکتی ہے نہ انہیں کوئی برداشت کر سکتا ہے یہی ہوائیں اللہ کے حکم سے پانی اور زمین کو اٹھاتے ہوتے ہیں اور آسمان کو تھامے ہوتے ہیں۔ پھر یہ ہر وقت خدمت میں لگی ہوئی ہیں اور ایک لحظہ کے لیے بھی آرام نہیں لیتیں اور آسمان کی طرف اٹھتی رہتی ہیں اور جب اللہ کسی قوم پر بارش برسانا چاہتا ہے تو ان ہواؤں میں تھوڑے سے حصہ کو حکم دیتا ہے تو یہ زمین کی طرف اپنا رُخ پھیر لیتی ہیں اور بحرِ محیط وغیرہ کی سطح کو عبور کر کے جس قدر اللہ کی مرضی ہو، اس زمین کی طرف پانی اٹھائے جاتی ہیں، کئی مرتبہ ایسا ہوا کہ میں نے اس پانی کو دیکھا جو اس جوّ (خلا) سے ملا ہوا ہے جس میں ہوائیں ہوتی ہیں تو مجھے برف کے اسقدر عظیم پہاڑ دکھائی دیے جن کی عظمت کا علم سوائے خدا کے کسی کو نہیں جب میں غار[1] سے واپس آتا تو دیکھتا کہ یہ پہاڑ منتقل ہو کر اس پانی کے کنارے چلے گئے ہیں جو کوہ قاف سے ملا ہوا ہے۔ دیکھا تو انہیں وہ ہوائیں اٹھا کر لائی ہیں جنھوں نے اپنا رُخ پلٹا تھا، واللہ تعالیٰ اعلم۔

جب اللہ تعالیٰ کسی قوم کو زمین میں دھنسانا چاہتا ہے تو یہ ہوائیں زمین میں ان سوراخوں اور ان گڑھوں میں گھس جاتی ہیں جو ان ہواؤں اور پانی کے درمیان ہیں، لہٰذا جب ان میں ہوا گھستی ہے تو زمین کھل جاتی ہے جس سے لوگ زمین میں دھنس جاتے ہیں۔ آخر زمانے میں زمین میں سوراخ زیادہ ہو جائیں گے اور زمین کی طرف ہواؤں کا رُخ بھی بکثرت پلٹا کرے گا جس کی وجہ سے خسوف بکثرت ہوا کریں گے۔ یہاں تک کہ دنیا کا نظام مختل ہو جائے گا یہ سب کچھ اللہ تعالیٰ کے فعل اور ارادے سے ہوتا ہے، واللہ تعالیٰ اعلم۔

پھر ہوائیں زمین کا بڑا برقصد کرتی رہیں گی اور اس کی تباہی کا ارادہ کریں گی یہاں تک کہ زمین ہواؤں کے ہاتھوں میں اس چھلنی کی مانند ہو گی جس کے ذریعہ سے گندم کو مٹی اور پتھروں سے جدا کیا جاتا ہے اور زمین کا غلہ وہ ریڑھ کی ہڈی ہے جس سے ذاتِ انسانی ترکیب پاتی ہے اور یہ ہڈی انسانوں کے لیے بمنزلہ بیج کے ہے چنانچہ اللہ تعالیٰ ان ہڈیوں کو زمین اور سمندروں کی گہرائیوں، غاروں

---

[1] غار سے مراد غارِ حراء ہے جہاں اہل دیوان کا اجتماع ہوتا ہے شیخ عبدالعزیز دباغ چونکہ غوث وقت تھے اس لیے ان کا وہاں جانا رہتا۔ ۱۲ مترجم

اور پہاڑوں کے نیچے سے اور جہاں کہیں بھی یہ ہوں گی جمع کرے گا۔ اس دن پہاڑ چلیں گے اور ہواؤں کے زور سے انہیں منتشر کر دیا جائے گا۔ اس کے بعد آسمان پھٹ جائے گا اور ریڑھ کی ہڈیوں پر پانی برسے گا جس سے وہ آہستہ آہستہ پرورش پائیں گی جیسے کدو اور تربوز وغیرہ پرورش پاتا ہے اور یہ سطح زمین پر ظاہر ہو جائے گا۔

حضرت نے فرمایا اسی وقت کے متعلق حضرت عبدالوہاب برناوی فرمایا کرتے تھے اُس دن کو یاد رکھو جب زمین انڈے دے گی اور ریڑھ کی ہڈی کو نشوونما دینے کی طرف جائے گی۔ پس جب یہ نشوونما مکمل ہو جائے گا تو بنی آدم اس طرح اس میں سے نکلیں گے جس طرح پرندہ انڈے کے پھٹنے سے نکلتا ہے فرمایا اس دن ناف پیٹھ کی طرف ہوگی پیٹ کی طرف نہ ہوگی اس کے بعد اللہ تعالیٰ روحوں کو اپنے اپنے جسموں میں داخل ہونے کا حکم دیں گے۔ جب روحیں داخل ہو جائیں گی تو یہ اٹھ کھڑے ہوں گے اور نال کٹ جائے گی۔ جب روحیں اجسام میں داخل ہو چکیں گی تو اللہ تعالیٰ اس نور اور سر کو جس نے جہنم کو دنیا کی طرف جانے سے روکا ہوا تھا، حکم دیں گے یعنی نور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کہ وہ جنت کی طرف جائے۔ اس وقت جہنم نکل کر اہل دنیا کی طرف آئیگا اور ہر طرف سے ان کو گھیرے گا۔ اس دن جس قدر خوف لوگوں کے دلوں پر طاری ہو گا اس کا علم اللہ تبارک وتعالیٰ کے سوا کسی کو نہیں۔

حضرت نے فرمایا: اس دن جب روحیں جسموں میں داخل ہونے لگیں گی تو ان روحوں کی سنسناہٹ، تڑپ اور شور سنائی دے گا جس سے دلوں پر رُعب چھا جائے گا اور جگر دہشت کے مارے چاک ہوتے جائیں گے۔ اس کے بعد حضرت نے جو کچھ اس دن پیش آئے گا، بیان کیا جس کا کچھ حصہ آگے چلکر بیان ہو گا، انشاء اللہ تعالیٰ۔ واللہ تعالیٰ اعلم۔

۱۷- يُرْسَلُ عَلَيْكُمَا شُوَاظٌ مِّنْ نَّارٍ وَّنُحَاسٌ فَلَا تَنْتَصِرَانِ (الآیت، سورۃ الرحمٰن)

میں نے حضرت سے دریافت کیا کہ آیت يُرْسَلُ عَلَيْكُمَا شُوَاظٌ مِّنْ نَّارٍ وَّنُحَاسٌ فَلَا تَنْتَصِرَانِ (اے گروہِ جن وانس تم پر آگ کا شعلہ اور دھواں چھوڑا جائے گا پس تم اس پر غلبہ نہ پا سکو گے) میں جن اور انسانوں کو خطاب ہے تو کیا یہ واقعہ محشر میں ہوگا یا جہنم میں ڈال دیے جانے کے بعد۔

حضرت نے فرمایا یہ واقعہ میدانِ محشر میں ہوگا اور یہ وہی آگ ہوگی جو اہلِ محشر پر نکل کر آئے گی اور انہیں ہر طرف سے گھیرے گی۔ واللہ تعالیٰ اعلم۔

۱۸۔ يَوْمَ نَطْوِي السَّمَاءَ كَطَيِّ السِّجِلِّ لِلْكُتُبِ (سورۂ انبیا آیت ۱۰۴)

میں نے حضرت سے پوچھا کہ آیت يَوْمَ نَطْوِي السَّمَاءَ كَطَيِّ السِّجِلِّ لِلْكُتُبِ (جس روز ہم آسمانوں کو اس طرح لپیٹ لیں گے جس طرح سجل کتابوں کو لپیٹ لیتا ہے) میں سجل سے کیا مراد ہے کیونکہ بعض مفسرین نے اس کے معنی صحیفہ بتاتے ہیں یعنی جس طرح صحیفہ کتاب کو لپیٹ لیتا ہے یعنی اس لکھائی کی خاطر جو اس صحیفہ میں ہے۔ مراد یہ ہے کہ اس صحیفہ کو اس لکھائی کی وجہ سے جو اس میں ہے لپیٹ لیا جائے گا۔

حضرت نے فرمایا: سجل سے مراد وہ آلہ ہے جس پر لکھنے والا اس کتاب کو رکھتا ہے جس سے وہ نقل کر رہا ہو اور جسے عوام حمار الکتاب (رحل) کہتے ہیں۔ میرا خیال ہے کہ حضرت نے یہ بھی فرمایا کہ یہ لفظ سریانی ہے معنی یہ ہوئے کہ جس دن ہم آسمانوں کو رحل کی طرح لپیٹ دیں گے کیونکہ لکھنے والا جب لکھنے سے فارغ ہو جاتا ہے تو اسے لپیٹ دیتا ہے اور للکتب کا لفظ سجل کا حال واقع ہوا ہے یعنی در آں حالیکہ سجل کتاب کے لیے ہو یعنی وہ سجل نہ ہو جو اور چیزوں کے لیے ہوتا ہے۔ مجھے حضرت سے یہ بات پوچھنے کا خیال نہ رہا کہ اس میں وجہ شبہ کیا ہے اور آسمان کے لپیٹے جانے کی کیا کیفیت ہوگی اور اللہ تعالیٰ نے آسمان کے لپیٹے جانے سے کیوں تشبیہ دی ہے اور کیا ان دونوں میں کوئی خاص مناسبت ہے جو کسی اور چیز میں نہیں پائی جاتی۔ کتاب کے سوا کسی اور چیز کا بھی سجل ہوتا ہے تاکہ اس سے احتراز کیا جائے۔ اگر ہے تو کیا ہے۔ اگر میں یہ سب کچھ پوچھ لیتا تو حضرت سے انکے جواب میں غیبی علوم ظاہر ہوتے کیونکہ حضرت جو کچھ بیان کرتے مشاہدے سے بیان کرتے مگر اب چونکہ اس مسئلہ کی تکمیل میں ان کا کلام تو موجود نہیں لہٰذا میں اسے علماء کے کلام سے مکمل کرتا ہوں۔

امام عبداللہ بخاری اپنی صحیح میں کہتے ہیں سجل کے معنی ہیں کتاب کا ورق۔ حافظ ابن حجر فتح الباری میں فرماتے ہیں فریابی[1] نے اس قول کو اپنے طریقے سے یعنی مجاہد کے طریقے سے متصل کر دیا ہے اور فراء نے اس پر تاکید کر دی۔ طبری نے علی بن ابی طلحہ از ابن عباس سجل کے معنی لکھے ہیں جس طرح ورق اپنی

---

[1] فریابی: شیخ الوقت ابوبکر جعفر بن محمد بن حسن بن مستفاض ترکی۔ دینور کے قاضی تھے اور صاحب تصانیف ہیں یہ ثقہ تھے اور اوعیہ علم میں سے شمار ہوتے تھے ان کے پاس ہزاروں کی تعداد میں طالبعلم حدیث پڑھنے آتے تھے ۲۰۷ھ / ۸۲۲ء میں پیدا ہوئے اور ۳۰۱ھ / ۹۱۳ء میں وفات پائی۔

تحریر پر لپیٹ جاتا ہے۔ بعضوں نے علی[1] کو من کے معنوں میں لیا ہے یعنی تحریر کی خاطر کیونکہ ورق اس تحریر کی خاطر جو اس میں ہے لپیٹ لیا جاتا ہے۔ ابن عباسؓ سے یہ بھی مروی ہے کہ سجل آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ایک کاتب کا نام ہے۔ اس حدیث کی روایت ابو داؤد، نسائی اور طبری نے عمر[2] بن مالک از ابی الجوزاء[3] از ابن عباس کے طریقے سے کی ہے۔ ابن مردویہ[4] کے نزدیک ابنِ عباس کی حدیث میں ہے کہ حبشہ کی زبان میں سجل کے معنی آدمی کے ہیں۔ عبد[5] بن حُمید نے عطیہ[6] کی سند سے اسی طرح بیان کیا ہے۔ نیز ایک ضعیف اسناد کے ساتھ علی کی روایت سے یہی معنی دیے ہیں۔

سُہیلی[7] نے نقاش[8] سے نقل کیا ہے کہ سجل دوسرے آسمان میں ایک فرشتہ کا نام ہے جس کے پاس فرشتے ہر دو شنبہ اور پنجشنبہ کو مخلوق کے اعمال لے جاتے ہیں۔

طبری نے ابن عمر کی حدیث سے کچھ اسی طرح کے معنی دیے ہیں۔

۱۔ مجھے اس "علی" کی سمجھ نہیں آئی کہ یہ کہاں سے آگیا ہے۔ آیت میں علی کا لفظ نہیں ہے۔

۲۔ عمر بن مالک شرعبی المعافری المصری : ابو حیان نے انہیں ثقہ شمار کیا ہے۔ ابن یونس اور ضمام دونوں اسے فقیہ پکارتے ہیں مسلم نے اس سے صرف ایک حدیث روایت کی ہے۔

۳۔ ابوالجوزار : ابو الجوزا ادس بن عبداللہ ربعی البصری تابعی ہیں۔ انھوں نے ابو ہریرہؓ، عائشہؓ اور ابن عباسؓ وغیرہم سے روایت کی ہے بہت عابد و فاضل تھے۔

۴۔ ابن مردویہ : ابوبکر احمد بن موسیٰ بن مردویہ اصفہانی۔ صاحبِ تفسیر ہیں اور تاریخ وغیرہ بھی لکھی ہے حافظ حدیث اور ثقہ تھے ۳۲۳ھ، ۹۳۴ء میں پیدا ہوئے اور ۴۱۶ھ، ۱۰۲۵ء میں وفات پائی۔

۵۔ عبد بن حمید : حافظ ابو محمد بن حمید بن نصر مصنف مسند کبیر اور تفسیر، ان کا اصل نام عبدالحمید ہے مگر مخفف کر لیا گیا۔ جوانی کے زمانے میں سفر کیا۔ امام بخاری نے انہیں عبدالحمید ہی لکھا ہے امام حدیث اور ثقہ تھے ۲۴۹ھ، ۸۶۳ء میں وفات پائی۔

۶۔ عطیہ : عطیہ بن سعد بن جنادہ قیسی۔ انھوں نے ابوسعید، ابوہریرہؓ وغیرہما سے روایت کی ۱۲۱ھ، ۷۳۸ء میں وفات پائی۔

۷۔ سہیلی : ابوزید عبدالرحمٰن بن عبداللہ : ان کی تصانیف معتبر شمار کی جاتی ہیں۔ ۵۰۸ھ، ۱۱۱۴ء میں پیدا ہوئے اور ۵۸۱ھ، ۱۱۸۵ء میں وفات پائی۔ الروض الانف شرح سیرۃ ابن ہشام انہی کی تالیف ہے۔

۸۔ نقاش : ابوبکر محمد بن علی المصری ۲۸۹ھ، ۸۹۷ء میں پیدا ہوئے اور ۳۶۹ھ، ۹۸۱ء میں وفات پائی دارقطنی ان سے حدیث پڑھنے کیلئے آتے تھے۔

سہیلی اور ثعالبی نے اس بات سے انکار کیا ہے کہ سجل نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے کاتب کا نام ہے اس لیے کہ نہ ہی کاتبین وحی میں اور نہ صحابہ میں کوئی ایسا شخص پایا جاتا ہے جس کا نام سجل ہو اور سہیل کہتے ہیں کہ یہ معنی صرف اسی حدیث میں آئے ہیں۔ سہیل کا یہ قول درست نہیں ہے اس لیے کہ ابن مندہ[1] اور ابو نعیم نے اسے صحابہ میں شمار کیا ہے اور اس کی سندیں دی ہیں۔ ابن نمیر[2] از عبید اللہ بن عمر[3] از نافع[4] از ابن عمر[5] جو کہتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ایک کاتب کا نام سجل تھا ابن مردویہ نے بھی اسی سند سے اس کی روایت کی ہے۔ یہ تمام بیان حافظ ابن حجر کا ہے۔ واللہ تعالیٰ اعلم۔

۱۹۔ رَبِّ اَرِنِیْٓ اَنْظُرْ اِلَیْکَ قَالَ لَنْ تَرٰىنِیْ وَلٰکِنِ انْظُرْ اِلَی الْجَبَلِ فَاِنِ اسْتَقَرَّ مَکَانَهٗ فَسَوْفَ تَرٰىنِیْ (سورہ اعراف آیت ۱۴۳)

میں نے حضرت سے آیت رب اَرِنِیْٓ اَنْظُرْ اِلَیْکَ قَالَ لَنْ تَرٰىنِیْ وَلٰکِنِ انْظُرْ اِلَی الْجَبَلِ فَاِنِ اسْتَقَرَّ مَکَانَهٗ فَسَوْفَ تَرٰىنِیْ (موسیٰ علیہ السلام نے عرض کی اے میرے پروردگار مجھے اپنی زیارت کرا دیں۔ فرمایا تم مجھے ہرگز نہ دیکھ سکو گے، لیکن اس پہاڑ کی طرف دیکھو اگر وہ اپنی جگہ پر برقرار رہا تو

---

[1] ابن مندہ: حافظ ابو عبد اللہ محمد بن یحییٰ بن مندہ۔ یہ اس وقت مسلمان ہوئے جب صحابہ نے اصفہان فتح کیا اور اپنے زمانے میں بڑے استادوں میں شمار ہوتے تھے۔ ۳۰۱ھ، ۹۱۱ء میں وفات پائی۔

[2] ابن نمیر: محمد بن عبد اللہ بن نمیر ابو عبد الرحمٰن کوفی، حافظ حدیث تھے امام احمد بن حنبل انہیں کی بہت تعظیم کرتے اور درۃ العراق کہا کرتے تھے۔ وہ اپنے زمانہ کے بہت بڑے زاہد اور فقیہ تھے ان کی وفات ۲۳۴ھ، ۸۴۸ء میں ہوئی۔

[3] عبید اللہ بن عمر: عبید اللہ بن عمر بن حفص بن عاصم بن عمر بن الخطاب، ان کا شمار فقہاء سبعہ میں ہوتا ہے ۱۴۷ھ، ۷۶۴ء میں وفات پائی۔

[4] نافع: نافع بن سرجس دیلمی عبد اللہ بن عمر کا آزاد کردہ غلام تھا۔ ۱۱۷ھ، ۷۳۵ء میں ان کی وفات ہوئی۔

[5] ابن عمر: عبد اللہ بن عمر حضرت عمر کے بیٹے بچپن میں ہی اپنے باپ کے ساتھ ایمان لائے بلکہ یہاں تک کہا جاتا ہے کہ سب سے پہلا بچہ جو اسلام میں پیدا ہوا وہ عبد اللہ بن عمر ہی تھے۔ کم سنی کی وجہ سے جنگ احد میں شرکت نہیں کر سکے مگر بعد کی جنگوں میں شرکت کی۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں رَجُلٌ صالحٌ کہا ہے انھوں نے کثرت سے حدیث کی روایت کی ہے چنانچہ ان کی ایک الگ سند بقی بن مخلد نے جمع کی ہے جس میں ایک ہزار چھ سو تیس (۱۶۳۰) احادیث ہیں ۷۳ھ، ۶۹۲ء میں ان کی وفات ہوئی۔

تم بھی مجھے دیکھ سکو گے) کے بارے میں دریافت کیا اور عرض کی کہ موسیٰ علیہ السلام تو بہت بڑے عارف باللہ ہیں اور عارف جب تک مشاہدے کے سمندر میں غوطہ زن نہ ہو، عارف نہیں کہلا سکتا، لہٰذا باوجودیکہ آپ کو دائمی مشاہدہ[ف] حاصل تھا، دیدار کا سوال کیوں کیا؟ اور کیا دیدار سے مشاہدے میں کچھ اضافہ ہو جاتا ہے۔

فرمایا کہ اہل مشاہدہ کو ذات باری کا مشاہدہ افعال باری سے خالی اور صاف ہو کر صرف اسی صورت میں ہو سکتا ہے جبکہ باری تعالیٰ اپنے افعال کو اس سے منقطع فرمائیں اور اگر ایک لحظہ کے لیے بھی کسی ذات سے افعال باری منقطع ہو جائیں تو وہ ذات باقی نہیں رہ سکتی اور دنیا کا نظام درہم برہم ہو جائے گا لہٰذا ہر چیز جو دنیا میں پائی جاتی ہے اس میں اللہ کا فعل پایا جاتا ہے۔ یہی اس کا مادہ اور زندگی کا سبب ہے اور یہی حجاب بنا ہوا ہے اس ذات فانی اور ذاتِ باری کے درمیان۔ اور اگر حق تعالیٰ اپنے افعال کو ذات فانی میں حجاب نہ بنائے تو عالم کا ہر حادث و فانی جل جائے۔ لہٰذا جب اہلِ مشاہدہ کا مشاہدہ افعالِ باری سے صاف اور خالی نہ ہوا اور وہ اس طرح بن گئے جیسے آنکھ میں کنک۔ اسی لیے سیدنا موسیٰ علیہ السلام نے حق تعالیٰ سے درخواست کی کہ اپنے فعل کو جو مانع رویت ہے قطع کر کے درمیان سے پردہ اٹھا دے کہ ذات باری کا صاف نظارہ ہو۔ اس پر اللہ تعالیٰ نے جواب دیا اگر میں اپنے فعل کو ذات حادث سے منقطع کر دوں تو اس کی ذات ہی فنا ہو جائے۔ چنانچہ دیکھو یہ پہاڑ جو تم سے اپنی ذات کے اعتبار سے زیادہ قوی اور جسم کے لحاظ سے زیادہ سخت ہے اس سے اپنا فعل منقطع کر لیتا ہوں، دیکھو گر یہ اپنی حالت پر قائم و برقرار رہا تو تو بھی مجھے دیکھ سکے گا۔ پس جب اللہ نے اپنی تجلی پہاڑ پر ڈالی اور اپنے فعل کا تعلق جو اس کے لیے سطوتِ ذات حق سے حجاب بنا ہوا تھا اس سے قطع فرما لیا تو وہ فوراً پارہ پارہ ہو گیا اور اس کے اجزاء اڑ گئے حتیٰ کہ سیدنا موسیٰ علیہ السلام بھی بیہوش ہو کر گر پڑے۔ واللہ تعالیٰ اعلم۔

۲۰۔ یَمْحُو اللّٰہُ مَا یَشَآءُ وَ یُثْبِتُ (سورۂ رعد آیت ۳۹)

میں نے اللہ کے فرمان یَمْحُو اللّٰہُ مَا یَشَآءُ وَیُثْبِتُ (اللہ جو چاہتا ہے مٹا دیتا ہے اور

ف استاذ علی وفا فرماتے ہیں کہ تعجب اس بات پر ہے کہ باوجودیکہ موسیٰ علیہ السلام کو حق تعالیٰ نے اپنا دائمی دیدار عطا کیا تھا مگر پھر بھی لن ترانی کہہ دیا (لواقح الانوار فی طبقات الاخبار جلد ۲ صفحہ ۲۱)

جو چاہتا ہے قائم رکھتا ہے) کے متعلق حضرت سے دریافت کیا اس لیے کہ علمار تفسیر کا اس میں بہت سا اختلاف ہے میں نے علمار کے بعض اقوال بھی نقل کیے۔

حضرت نے فرمایا میں اس آیت کی وہی تفسیر بیان کروں گا جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے کل سنی تھی پھر فرمایا کہ دنیا میں ہونے والے امور کے متعلق جو خیالات لوگوں کے دلوں میں پیدا ہوتے ہیں، ان کی دو قسمیں ہیں: (۱) وہ امور جو کبھی واقع نہیں ہوتے اور یَمْحُوا اللّٰہُ مَا یَشَاءُ (اللہ جو چاہتا ہے مٹا دیتا ہے) کا اشارہ اسی طرف ہے (۲) جو امور واقع ہونے والے ہوتے ہیں جس کی طرف یُثْبِتُ کے لفظ سے اشارہ کیا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ وہ خیالات جن کا تعلق آئندہ آنے والے امور سے ہوتا ہے مثلاً بارش کا اترنا، آنے والے کا آنا یا کسی حادثہ کا پیش آنا۔ ان میں سے بعض امور پیش نہیں آتے یہی محو شدہ امور ہیں اور بعضے صحیح ثابت ہوتے ہیں اور یہی مثبت ہیں اور اصل کتاب یعنی لوح محفوظ اللہ کے پاس ہے۔ یہی وہ ازلی علم ہے جو کبھی غلط نہیں ہوتا، میں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے اسی طرح سنا ہے، اسی پر اعتماد کرو اور باقی سب تفسیروں کو چھوڑ دو۔ باقی سب تفسیروں کو چھوڑ دو، کے کہنے کا مقصد یہ تھا کہ میں نے اس سے پہلے اس آیت کی ایک اور تفسیر سنی تھی جس میں آپ نے معرفت کے حقائق بیان فرمائے تھے (اس لیے فرمایا اسے بھی چھوڑ دو) واللہ تعالیٰ اعلم۔

۲۱- وَاِذْ قَالَتِ الْمَلٰٓئِکَۃُ یٰمَرْیَمُ اِنَّ اللّٰہَ اصْطَفٰکِ عَلٰی نِسَآءِ الْعٰلَمِیْنَ۔ یٰمَرْیَمُ اقْنُتِیْ لِرَبِّکِ وَاسْجُدِیْ وَارْکَعِیْ مَعَ الرّٰکِعِیْنَ - (سورۂ آل عمران - آیت ۴۴)

میں نے حضرت سے دریافت کیا کہ یہ آیت وَاِذْ قَالَتِ الْمَلٰٓئِکَۃُ یٰمَرْیَمُ اِنَّ اللّٰہَ اصْطَفٰکِ عَلٰی نِسَآءِ الْعٰلَمِیْنَ۔ یٰمَرْیَمُ اقْنُتِیْ لِرَبِّکِ وَاسْجُدِیْ وَارْکَعِیْ مَعَ الرّٰکِعِیْنَ۔ (سورۂ آل عمران آیت ۴۴) (اس وقت کو یاد کرو جب فرشتوں نے مریم سے کہا تھا اے مریم، تمہیں اللہ نے منتخب کر لیا ہے۔ تمہیں پاک بنایا ہے اور دنیا کی عورتوں پر فضیلت بخشی۔ اے مریم اپنے رب کی فرمانبرداری کرتی رہ اور سجدہ کرتی رہ اور جھکنے والوں کے ساتھ جھکتی رہ) حضرت مریم کی نبوت پر دلالت کرتی ہے اور کیا یہ کہنا درست ہے کہ موسیٰ علیہ السلام کی والدہ، فرعون کی بیوی آسیہ، سارہ، ہاجرہ اور حوا نبی تھیں کیونکہ بعض علماء نے انہیں نبی کہا ہے اور

بعض نے اس سے انکار کیا ہے اور بعض نے مریم علیہا السلام کی نبوت کے متعلق اجماع نقل کیا ہے اگر ایسا ہے تو دوسری عورتیں جن کے نام لیے گئے، نبوت کی زیادہ حقدار ہیں اور بعض نے مثلاً اہلسنت والجماعت کے رئیس شیخ (ابوالحسن) اشعریؒ نے توقف کیا ہے یعنی نہ اقرار کیا ہے نہ انکار۔

پہلے فریق کا استدلال یہ ہے کہ فرشتہ کا نزول صرف نبی پر ہوتا ہے اور اس آیت میں تصریحاً بیان کیا گیا ہے کہ فرشتہ کا نزول مریم پر ہوا (لہٰذا نبوت ثابت ہوگئی) اس فریق نے نبی اور ولی کے درمیان یہی فرق بتایا ہے کہ نبی پر فرشتہ اترتا ہے اور ولی پر الہام ہوتا ہے فرشتہ نہیں اترتا۔

حضرت نے فرمایا: دوسرے فریق کا قول صحیح ہے کہ عورتوں میں سے کوئی عورت نبی نہیں ہوئی اور نہ ہی اللہ نے عورتوں میں سے کسی کو نبی بنایا۔ مریم نبی نہ تھیں صدیقہ اور ولیۂ کاملہ تھیں۔ اگرچہ نبوت اور ولایت میں یہ بات مشترک ہے کہ ہر ایک انوار الٰہی میں سے نور ہے اور سر ہے اسرارِ الٰہیہ میں سے مگر دونوں کے نور میں بہت فرق ہے اور اس فرق کی حقیقت کا علم کشف ہی سے ہو سکتا ہے مگر نورِ نبوت اصلی ہے ذاتی ہے، حقیقی ہے اور ذاتِ نبی کے ساتھ اصل خلقت میں پیدا ہوتا ہے اسی لیے نبی ہر حالت میں معصوم ہوتا ہے اور نورِ ولایت ایسا نہیں ہوتا کیونکہ صاحبِ فتح انسان جب کسی ایسے انسان کو دیکھتا ہے جو آئندہ ولی ہونے والا ہو تو وہ اسے باقی لوگوں کی طرح نور سے خالی دیکھتا ہے، لیکن اگر وہ کسی ایسے شخص کو دیکھ لے جو آئندہ نبی ہونے والا ہے تو وہ اس کی ذات میں پہلے ہی سے نورِ نبوت دیکھتا ہے اور ذاتِ نبی کی طبیعت میں وہ ساتوں اجزاءِ نبوت فطری طور پر موجود پاتا ہے جن کا تذکرہ حدیث اُنْزِلَ الْقُرْآنُ عَلٰی سَبْعَةِ اَحْرُفٍ میں کیا جا چکا ہے لہٰذا نورِ نبوت کا مالک طبعی طور پر حق گو ہوتا ہے خواہ حق کتنا ہی تلخ کیوں نہ ہو، نیز صابر ہوتا ہے اور اسے صبر کرنے میں کوئی دکھ اور تکلیف محسوس نہیں ہوتی۔ رحیمِ کامل ہوتا ہے۔ اسے اللہ تعالیٰ کی اسقدر معرفت ہوتی ہے جتنی کہ ہونی چاہیئے۔ اللہ تعالیٰ سے اسے خوفِ تام ہوتا ہے کہ خوفِ باطنی کے ساتھ خوفِ ظاہری ملا ہوتا کہ ہر حالت میں یہ خوف قائم رہے۔ باطل سے ہمیشہ بغض رکھتا ہے اور کامل عفو بھی اس کی فطرت میں ہوتا ہے تاکہ جو اس سے قطع تعلق کرے یہ اس سے جوڑے اور جو نقصان پہنچائے یہ اسے نفع پہنچائے۔ یہ نبوت کی خصوصیات اور وہ سات اجزا ہیں جو نبی کی فطرت میں شامل ہوتے ہیں فتح سے پہلے بھی اور بعد بھی۔

---

[1] شیخ ابوالحسن اشعریؒ: اصل نام علی بن اسمٰعیل تھا اور ابوموسیٰ اشعری کی اولاد میں سے تھے ان کی پیدائش ۸۷۳ء / ۲۶۰ھ میں بصرہ میں ہوئی۔

مگر ولی کی ذات، فتح سے پہلے دیگر انسانوں کی طرح ہوتی ہے اور اس میں کوئی زائد بات نہیں ہوتی۔ البتہ جب اسے فتح نصیب ہوتی ہے تو یہ انوار اس میں آجاتے ہیں لہٰذا اس کے انوار عارضی ہوئے اسی لیے فتح سے پہلے اور بعد بھی ولی معصوم نہیں ہوتا۔

یہ فرق جو بیان کیا جاتا ہے کہ ولی پر فرشتہ کا نزول نہیں ہوتا اور نبی پر ہوتا ہے، درست نہیں ہے کیونکہ جس کو حق تعالیٰ فتح نصیب کرتا ہے، خواہ وہ نبی ہو خواہ ولی۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ وہ فرشتوں کو اپنی اصلی صورت میں دیکھے اور ان سے گفتگو کرے۔ جن لوگوں نے یہ کہا ہے کہ ولی فرشتوں کو نہ دیکھتا ہے نہ ان سے بات کرتا ہے یہ اس بات کی دلیل ہے کہ ان لوگوں کو حق تعالیٰ نے فتح نصیب نہیں کی۔

مؤلف کہتا ہے کہ حاتمی نے بھی فتوحاتِ مکیہ باب ۳۶۴ میں یہی لکھا ہے کہ ہماری جماعت کے بعض لوگوں نے جن میں ابوحامد امام غزالی بھی ہیں، یہ فرق بیان کرنے میں غلطی کھائی ہے کہ نبی پر فرشتہ اترتا ہے اور ولی کو الہام ہوتا ہے مگر فرشتہ نہیں اترتا۔ حالانکہ صحیح بات یہ ہے کہ فرشتہ تو دونوں پر اترتا ہے البتہ فرق اس حکم میں ہوتا ہے جو فرشتہ لے کر اترے چنانچہ ولی پر فرشتہ اترتا ہے تو اسے (نبی کی) تابعداری کا حکم دیتا ہے اور بعض اوقات فرشتہ اس حدیث کے صحیح ہونے کی اطلاع دیتا ہے جسے علماء نے ضعیف قرار دیا ہو۔ کبھی فرشتہ اللہ کی طرف سے بشارت لے کر آتا ہے کہ وہ اہل سعادت اور اہل ایمان میں سے ہے جیسے اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: لَهُمُ الْبُشْرَىٰ فِي الْحَيَوٰةِ الدُّنْيَا وَفِي الْآخِرَةِ (ان کو خوشخبری سنائی جاتی ہے دنیا کی زندگی میں بھی اور آخرت میں بھی) ان لوگوں کی غلطی کا سبب یہ ہے کہ انھوں نے حق تعالیٰ کے طریقِ سلوک کا قیاس اپنے سلوک پر کر لیا اور چونکہ ان پر فرشتہ نازل نہیں ہوا اس لیے انھوں نے خیال کر لیا کہ کسی اور ولی پر بھی فرشتہ نہیں اترا اور نہ ہی اترا کرتا ہے، اگر یہ لوگ کسی معتبر آدمی سے سن لیتے کہ فرشتہ ولی پر اترا ہے تو اپنے قول سے رجوع کر لیتے اس لیے کہ یہ لوگ اولیاء کی کرامات کو حق سمجھتے ہیں چنانچہ ایک جماعت نے اس قول کی طرف رجوع کیا ہے جس کے خلاف وہ پہلے ڈٹے ہوئے تھے۔"

جب آپ کو شیخ کی بات سمجھ آگئی کہ ولی اور نبی میں کیا فرق ہے تو یہ معلوم ہو جائے گا کہ جس فرق کو حاتمی درست سمجھے ہوئے ہیں وہ درست نہیں ہے کیونکہ اس کا ماحصل یہ ہے کہ ولی پر امر و نہی کے احکام لے کر فرشتہ نہیں آتا اور نبی پر آتا ہے اور یہ درست نہیں۔ اس لیے کہ ولی پر بھی فرشتہ امر و نہی کے احکام لے کر آتا ہے اس سے یہ لازم نہیں کہ وہ صاحب شریعت ہی ہو جیسا کہ مریم کے

قصہ میں کیونکہ فرشتہ امر لے کر آیا حالانکہ وہ نبیہ نہیں ہیں جیسا کہ ذکر ہو چکا۔ جو کچھ ہم نے حضرت سے اس بارے میں سنا اگر ہم اس کا افشا کریں تو یہ طالبین کے لیے نشانی اور رغبت کرنے والوں کے لیے سہارا ہوگا مگر یہ ایک راز ہے جس کا افشا کرنا روا نہیں۔

اہلِ فتح کو کن باتوں کا مشاہدہ ہوتا ہے

مگر میں یہاں شیخ کے علوم میں سے دو باتیں ذکر کر دینا چاہتا ہوں:

(۱) وہ چند چیزیں جن کا مشاہدہ اہلِ فتح کیا کرتے ہیں۔ حضرت نے فرمایا کہ مقامِ اول میں جن امور کا مشاہدہ ہوتا ہے وہ یہ ہیں (۱) بندوں کے افعال جن کو وہ خلوت میں کرتے ہیں (۲) ساتوں زمین اور ساتوں آسمان کا مشاہدہ (۳) اس آگ کا مشاہدہ جو پانچویں زمین میں ہے اور اس کے علاوہ ان تمام اشیاء کا مشاہدہ جو زمین اور آسمان میں ہیں اور فرمایا یہ آگ برزخ کی آگ ہے اس لیے کہ برزخ ساتویں آسمان سے لے کر ساتویں زمین تک پھیلا ہوا ہے اور روحیں اپنے اجسام سے نکلنے کے بعد اپنے اپنے درجہ کے مطابق اسی برزخ میں رہتی ہیں اور اہلِ شقاوت کی روحیں اس آگ میں رہتی ہیں اس کی شکل تنگ مکانات مثلاً کنووں، غاروں اور گھونسلوں کی سی ہے یہاں کے رہنے والے ہمیشہ کبھی نیچے کبھی اوپر ہوتے رہتے ہیں کہ اوپر آکر تم سے ایک بات کہے گا اور ابھی پوری کرنے نہ پائے گا کہ اپنے گڑھے میں گر جائے گا اور فرمایا یہ آگ جہنم کی آگ نہیں اس لیے کہ جہنم کی آگ آسمان اور ساتوں زمین کے گرے سے باہر ہے اور اسی طرح جنّت بھی۔

(۴) ساتویں زمینوں کے باہمی اشتباک اور ان میں جو مخلوقات آباد ہے، ان کا مشاہدہ کہ ایک زمین سے دوسری تک کیسے نکلیں گے اور ہر زمین کا مابہ الامتیاز کیا ہے جو دوسری میں نہیں پایا جاتا۔

۵۔ ساتویں آسمانوں کے باہمی اشتباک کا مشاہدہ کہ ایک دوسرے سے کس طرح ملا ہے اور آپس میں ان کی کیا نسبت ہے اور ان میں ستارے کس طرح رکھے گئے ہیں۔

۶۔ شیاطین کا مشاہدہ کہ ان کے توالد و تناسل کی کیا صورت ہے۔

۷۔ جنّات کا مشاہدہ اور یہ کہ وہ کہاں رہتے ہیں۔

۸۔ شمس و قمر اور ستاروں کی رفتار اور ان خوفناک آوازوں کا مشاہدہ جو فوراً ہلاک کر دیں، مثلاً صاعقہ کیونکہ یہ ہمیشہ ان کے کانوں میں پڑتی رہتی ہیں اور صاحبِ فتح کو چاہیئے کہ وہ ان مشاہدات کو بڑی چیز نہ سمجھے بلکہ معمولی سمجھے ورنہ یہیں ٹھہر جائے گا بلکہ وہ رجعتِ قہقری کرنے لگے گا اس لیے کہ فتح کے زمانے میں طبیعت شفاف ہوتی ہے اور وہ جس چیز کو اچھا سمجھتی ہے اس کے پار تک اسے دیکھ لیتی ہے اور یہ تمام چیزیں جن کا مشاہدہ ہوتا ہے چونکہ ظلمت اور تاریکیاں ہیں اس لیے

ان میں اگر کہیں بھی ٹھہر گیا تو تاریکیوں میں ٹھہرا اور اللہ سے تعلق منقطع ہو جائے گا اسی لیے تو وہ ولی جنہیں فتح حاصل نہیں ہوتی بڑے محفوظ مقام میں ہوتے ہیں اور مفتوح علیہ انتہائی خطرے میں ہوتا ہے ہاں مگر جنہیں اللہ محفوظ رکھے چنانچہ ہم دیکھتے ہیں طبیعتِ انسانی فتح سے پہلے اللہ سے غافل ہو کر درہم و دینار اور عورتوں کا تو ذکر ہی کیا، بادام، منقی اور چنے کے دانہ پر فریفتہ اور مشغول ہو جاتی ہے تو کیسے ہو سکتا ہے کہ فتح کے بعد جب اسے عالمِ بالا و زیر کا مشاہدہ ہونے لگے اور پھر شیاطین ہر اس بات میں اس کی مدد کو تیار ہوں جس کی وہ خواہش کرے اور وہ فریفتہ نہ ہو۔ اللہ کی مدد کے بغیر کوئی بھی اس سے بچ نہیں سکتا۔

نیز فرمایا جو ولی ان مذکورہ بالا چیزوں سے کسی ایک چیز پر بھی ٹھہر گیا تو شیاطین ہر وقت اس کے ہاتھ میں ہاتھ ڈالے ہوتے ہیں اور وہ یا جادوگر بن جاتے ہیں یا کاہن۔ خدا ہمیں اس سے بچائے مگر جس پر اللہ کی رحمت ہو اسے اللہ اپنی طرف کھینچتا ہے اور اس کے دل میں ایسا دلی شوق پیدا کرتا ہے جس سے وہ ان تمام پردوں کو پھاڑ دیتا ہے۔

دوسرے مقام کے مشاہدات

دوسرے مقام میں جو مشاہدات اسے حاصل ہوتے ہیں وہ یہ ہیں :۔

جیسے مقامِ اول میں اسے امورِ ظلمانی اور فانی مشاہدہ کرائے گئے تھے، اسی طرح دوسرے مقام میں اسے انوارِ باقیہ کا مشاہدہ کرایا جاتا ہے چنانچہ اسے عام فرشتے، محافظ فرشتے، دیوانِ اولیاء اور ان اولیاء کا مشاہدہ کرایا جاتا ہے جو آپ کی طرف منسوب ہوتے ہیں اور آپ کے طرز پر چلتے ہیں، پھر حضرت موسیٰؑ اور ان کے ساتھیوں کا مقام پھر حضرت ادریسؑ اور ان کے ساتھیوں کا مقام پھر حضرت یوسفؑ اور ان کے ساتھیوں کا مقام پھر تین قدیم رسولوں کا مقام جن میں سے کچھ حضرت ادریسؑ سے پہلے اور کچھ بعد ہوئے اور جن کے نام لوگوں میں مشہور نہیں مشاہدہ کرائے جاتے ہیں۔ اگر مذکورہ بالا انبیاء کے مقامات کی تشریح کر دیں اور یہ بھی بیان کر دیں کہ فرشتوں کو اپنی اصل صورت میں کیسے دیکھا جاتا ہے تو سننے والا ایسی باتیں سنے جو اس کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھیں۔ ان امور کے مشاہدہ کرنے والے کے لیے بھی لازم ہے کہ وہ کہیں نہ ٹھہرے اور وجہ وہی ہے کہ اس کی طبیعت شفاف ہوتی ہے اور جب کسی مقام پر ٹھہر جاتی ہے تو اس کی طبیعت وہاں کے اسرار پی جاتی ہے چنانچہ شلاً اگر مقامِ عیسیٰؑ پر ٹھہر گیا اور اسے پسند کر لیا تو انہی کے اسرار سے سیر ہو گا اور فوراً انہی کا مذہب اختیار کرے گا اور ملتِ اسلامیہ میں سے نکل جائے گا خدا بچائے۔ صاحبِ فتح ہر وقت بڑے خطرے اور

ہلاکت کے قریب ہوتا ہے جب تک مقامِ محمدی صلی اللہ علیہ وسلم کا مشاہدہ نہ کرے، اس مقام کے مشاہدہ کر لینے کے بعد اسے ہر طرح کی راحت و سرور حاصل ہو جاتا ہے اس لیے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات میں ایک قوت ہے جو تمام مخلوقات میں سے آپؐ کے ساتھ خاص ہے اور وہ اللہ تعالیٰ کی طرف کھینچ لیتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آپؐ اعز المخلوقات اور افضل العالمین ہیں۔ جب صاحبِ فتح مقامِ محمدی پر پہنچتا ہے تو اللہ کی طرف اس کی کشش بڑھ جاتی ہے اور وہ اللہ سے بے تعلق ہونے سے بچ جاتا ہے اس میں اور راز بھی ہیں جن کا علم اربابِ فتح کو ہوتا ہے خدا ہمیں ان میں سے بنائے اور ان کی برکت سے ہمیں محروم نہ کرے۔

تیسرا مقام: اس مقام پر صاحبِ فتح مذکورہ بالا انوار میں تقدیر کے اسرار مشاہدہ کرتا ہے

چوتھا مقام: چوتھے مقام میں اس نور کا مشاہدہ ہوتا ہے جس پر فعلِ الٰہی منبسط اور گھل مل گیا ہے جیسا کہ پانی میں زہر۔ چنانچہ فعل بمنزلہ زہر کے ہے اور نور بمنزلہ پانی کے ہے۔ اس مقام پر پہنچکر بہت سے لوگوں کو دھوکا لگ جاتا ہے چنانچہ وہ خیال کرتے ہیں کہ یہ نور نورِ الٰہی ہے حالانکہ وہ اس سے بدرجہا بلند و برتر ہے۔

پانچواں مقام: پانچویں مقام میں فعلِ الٰہی کی اس نور سے علیحدگی کا مشاہدہ ہوتا ہے کہ نور نور نظر آتا ہے اور فعل فعل، اس وقت اپنی غلطی کو محسوس کرتا اور سمجھتا ہے کہ اس کا پہلا گمان غلط تھا۔ ہم نے مقامات کے نام اور ان کے معانی کی تشریح اور تمام اقسام کا ذکر اس لیے نہیں کیا کہ ہماری غرض صاحبِ فتح کو چوکنا کرنا ہے جو بحمد اللہ حاصل ہو چکا۔ مزید برآں ان کی تشریح میں وہ اسرار پائے جاتے ہیں جن کا ذکر صاحبِ فتح سے بالمشافہ کیا جا سکتا ہے۔

۲۔ دوسری بات جس کا ذکر کرنا مناسب ہے کہ نبی اور ولی کے درمیان جو فرق ہے وہ تو معلوم ہو چکا اب روحانی اور فرشتے میں فرق سو یہ ہے کہ فرشتے کی ذات نورانی ہوتی ہے جس میں اللہ تعالیٰ نے عقل و حواس رکھ دیے ہیں۔

میں نے حضرت کو فرماتے سُنا کہ ہر فرشتے کی ذات میں پانچ سر ہوتے ہیں ہر سر کا دایاں، بایاں، ... اوپر ہے۔ چنانچہ اوپر نومنہ ہیں اور ہر سر میں کل ترلیٹھ منہ ہوئے اور ترلیسٹھ کو پانچ میں ضرب دینے سے ۳۱۵ منہ بنے اور ہر منہ میں کسی فرشتہ کی تین زبانیں ہوتی ہیں کسی کی پانچ اور کسی کی سات۔ تین زبانوں کے

ك؎ یہاں کچھ عبارت رہ گئی ہے جس سے معنی میں خلل پیدا ہو گیا ہے۔

اعتبار سے ضرب دینے سے کل زبانیں ۹۴۵ اور پانچ کے اعتبار سے ۱۵۷۵ اور سات کے اعتبار سے ضرب دینے سے ۲۲۰۵ زبانیں ہوئیں چنانچہ جب کوئی فرشتہ کوئی کلمہ بھی منہ سے نکالتا ہے تو اس کی آواز ان تمام زبانوں سے نکلتی ہے۔ پاک ہے وہ خدا جو خلاقِ عظیم ہے۔

لہٰذا اگر اللہ تعالیٰ مزید طاقت سے صاحب فتح کی تائید نہ فرمائیں تو فرشتہ کی آواز سن کر اسکا دل پھٹ جائے اور اگر وہ فرشتہ کو اپنی اصل خلقت میں دیکھ لے تو خیال کر لو کہ کیا ہو جائے گا۔

جب یہ سن چکے تو اب سمجھ لو کہ فرشتہ کی ذات ایک صاف نور ہے جس میں عقل اور حواس مرکّب ہیں تو اس کی مثال روح کی سی ہوئی کیونکہ وہ بھی نور سے پیدا ہوتی ہے اور اس میں عقل ہوتی ہے جس سے اللہ تعالیٰ کی پہچان ہوتی ہے اور اس کے ساتھ ہی وہ طاقتیں بھی ہوتی ہیں جن کا ذکر روح کے سات اجزاء میں گزر چکا ہے اور یہ بھی بیان کیا جا چکا ہے کہ ساتوں علوم اس کے فطری ہیں جو اس کی اصل پیدائش میں شامل ہیں۔ پس یہی حال فرشتہ کا ہے کہ اسے شروع سے ہی فتح نصیب ہوتی ہے۔

مگر نبی کی ذات مٹی سے پیدا ہوئی ہوتی ہے اور اس مٹی کے جسم میں روح کو مع اس کے اسرار کے پوشیدہ کیا گیا ہوتا ہے اور مٹی کی فطرت حجاب کی مقتضی ہے لیکن چونکہ اللہ تعالیٰ نے ابتداء پیدائش میں ہی نبی کی ذات کو نورِ نبوت سے تقویت دی ہوتی ہے اس لیے اس سے ظلمت زائل ہو جاتی ہے اور حجاب پتلا پڑ جاتا ہے اس نبی کی مثال اس شخص کی ہے جو ہمیشہ حق کا جلیس و ہمخواب ہو، اللہ کے قریب اس کی ہر حرکت و سکون بھی حق میں ہوتا ہے اس کی خاموشی حق پر ہوگی اور گفتگو حق کیساتھ اس کے تمام امور حق ہوتے ہیں یہاں تک کہ اگر فرض کر لیا جائے کہ وہ ایسی قوم میں پیدا ہوا ہو جس کی تربیت گمراہی پر ہوئی ہو تب بھی محض اس حق کی وجہ سے جو اس کی ذات کے اندر ہے ان سے لڑے گا اور ان کی تمام حرکات و سکنات میں ان کی مخالفت کرے گا خواہ اس نے نہ شریعت کا نام سنا ہو اور نہ امر و نہی کا۔ فتح سے پہلے اور اپنی اصل پیدائش اور ابتدا میں ہر نبی کا یہی حال ہوتا ہے، لیکن جب اسے فتح حاصل ہو جائے اور روح اور ذات کے درمیان حجاب کلیتہً زائل ہو جائے اور ہر وقت خدا کی حضوری میں رہنے لگے تب تو اس کے موجزن سمندر اور بحرِ بے کراں کا حال نہ پوچھ اس وقت نہ کوئی فرشتہ اور نہ کوئی اور مخلوق اس کی طاقت رکھ سکتی ہے۔ واللہ تعالیٰ اعلم۔

۲۲- وَذَا النُّونِ اِذْ ذَّهَبَ مُغَاضِبًا فَظَنَّ اَنْ لَّنْ نَّقْدِرَ عَلَيْهِ

(سورۂ انبیاء آیت ۸۷)

میں نے حضرت سے اللہ تعالیٰ کے فرمان وَذَا النُّوْنِ اِذْ ذَّهَبَ مُغَاضِبًا فَظَنَّ اَنْ لَّنْ نَّقْدِرَ عَلَيْهِ (اور ذوالنون کو یاد کرو جب وہ اپنی قوم سے ناراض ہو کر چلے اور خیال کیا کہ ہم ان پر عذاب کرنے کی قدرت نہ رکھ سکیں گے) کیسے ہو سکتا ہے کہ ذوالنون (یونس علیہ السلام) یہ خیال کریں کہ اللہ تعالیٰ ان پر قدرت نہ رکھ سکیں گے اور یہ کہ وہ پروردگار کے احاطۂ قدرت سے نکل جائیں گے کیونکہ اس خیال کا آنا کمزور ترین موحد سے بھی بعید معلوم ہوتا ہے چہ جائیکہ نبی یا مرسل سے۔

حضرت نے فرمایا مُغَاضِبًا کے معنی "ان پر ناراض ہو کر" کے ہیں کیونکہ انھوں نے ان پر ایمان لانے اور ان کی اس اطاعت کو ترک کر دیا تھا جس میں ان کی ہدایت اور بہتری تھی کہ ان پر اللہ کا حکم اور عذاب اس قدر قریب آگیا کہ دیکھنے والا بھی اسے دیکھ سکے اس لیے کہ عذاب ان کے گھروں کے اوپر آچکا تھا چنانچہ جب حضرت یونس نے یہ دیکھا تو وہ بھاگ کر بھری ہوئی کشتی میں چلے گئے۔

رہا اللہ تعالیٰ کا فرمان فَظَنَّ اَنْ لَّنْ نَّقْدِرَ عَلَيْهِ تو اس کے معنی یہ ہیں کہ انھوں نے یہ خیال کیا کہ ہم اسے اسی عذاب سے ہلاک نہ کریں گے جس سے ان لوگوں کو ہلاک کیا ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ جب انھوں نے عذاب کے علامات دیکھے تو اس خیال سے بھاگ نکلے کہ بچ جائیں گے اور وہ عذاب جو ان کی قوم پر آیا ہے ان پر نہ آئے گا۔ اس کی مثال ایسی ہے جیسے ایک شخص کو آگ نظر آوے کہ سامنے سے آرہی ہے اور سب لوگ اس کی زد میں آرہے ہیں یا پانی کا سیلاب دیکھے کہ اس کے سامنے جو آیا بچ نہ سکا تو وہ اس خیال سے بھاگے کہ بھاگ جانے سے وہ اس آگ اور سیلاب سے بچ نکلے گا۔ حضرت یونسؑ کی یہی حالت تھی کیونکہ جب انھوں نے اپنی قوم پر عذاب اترتا ہوا دیکھا اور خیال کیا کہ اگر وہ ان کے ساتھ رہ جائیں گے تو اُن پر بھی وہی عذاب نازل ہوگا جو ان پر نازل ہوا ہے اس لیے یہ خیال کرتے ہوئے کہ بھاگ جانے سے جو عذاب اُن پر اترا ہے ان پر نہ اترے گا تو اللہ تعالیٰ نے انہیں ایک اور قسم کی قدرت دکھائی جو ان کے گمان میں بھی نہ تھی، جب انھوں نے یہ قدرت دیکھی تو تاریکیوں میں ہی پکار اٹھے کہ تیرے سوا کوئی معبود نہیں، تو پاک ہے۔ میں نے ہی اپنے اوپر ظلم کیا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ان کی دعا قبول کی اور ان کو نجات دی۔ ان کے بعد یہ واقعہ نصیحت حاصل کرنے والوں کے لیے کرشمۂ قدرت بنا۔ توبہ کرنے والوں کے لیے نمونہ بنا اور مصیبت زدہ لوگوں کے لیے تسلی کا سبب بنا اور سائلین کے لیے کشائش کا دروازہ

کھلا کہ ارشاد ہوتا ہے نَجَّیْنَاہُ مِنَ الْغَمِّ وَکَذٰلِکَ نُنْجِی الْمُؤْمِنِیْنَ (ہم نے اسے غم سے نجات دی اور ہم مومنین کو اسی طرح نجات دیتے ہیں) لہٰذا حضرت یونسؑ کا فرار اس خیال سے تھا کہ وہ اس عذاب سے بچ جائیں، جو ان کی قوم پر نازل ہونے والا تھا۔ اس خیال سے نہ تھا کہ وہ خدا کی قدرت کو عاجز کر دیں گے اور اپنے آقا کے احاطے سے باہر چلے جائیں گے۔

مؤلف کہتا ہے کہ یہ تفسیر بہترین تفسیر ہے جو اس آیت کے بارے میں بیان کی گئی کیونکہ مفسرین نے کئی وجوہ بیان کیے ہیں جن پر غور کرنے سے معلوم ہو جائے گا کہ حضرت کی بیان کردہ تفسیر ان سب سے بہتر ہے۔ واللہ تعالیٰ اعلم۔

۲۳۔ وَاَیُّوْبَ اِذْ نَادٰی رَبَّہٗۤ اَنِّیْ مَسَّنِیَ الضُّرُّ وَاَنْتَ اَرْحَمُ الرّٰحِمِیْنَ (سورۂ انبیاء آیت ۸۳)

میں نے حضرت سے دریافت کیا کہ آیت اَیُّوْبَ اِذْ نَادٰی رَبَّہٗۤ اَنِّیْ مَسَّنِیَ الضُّرُّ وَاَنْتَ اَرْحَمُ الرّٰحِمِیْنَ (اور ایوب کو یاد کرو جب انھوں نے اپنے رب کو پکار کر عرض کی خدایا میں تکلیف میں ہوں اور تو سب سے زیادہ رحم کرنے والا ہے) میں ضُر سے کیا مراد ہے اور اس کی تفسیر میں مفسرین نے جو حضرت ایوبؑ کے بیمار ہونے کا جو ذکر کیا ہے دُرست ہے؟ اسی طرح ان کی بیماری کی طویل مدت جو بیان کی جاتی ہے کیا وہ دُرست ہے؟ اور حافظ ابن حجرؒ نے جو کچھ اپنی کتاب فتح میں انبیاء کی احادیث دی ہیں ان کا بھی میں نے ذکر کیا۔ جو اس بیان کو پڑھنا چاہے حضرت ایوب علیہ السلام کے بیان میں پڑھے۔

حضرت نے فرمایا جو تکلیف حضرت ایوب علیہ السلام کو پہنچی وہ غیر اللہ کی طرف توجہ تھی اور انبیاء و مرسلین کے نزدیک سب سے بڑی تکلیف یہی ہے۔ اسی تکلیف کو دور کرنے کی درخواست حضرت ایوب علیہ السلام نے اپنے رب سے کی تھی۔ بدنی مرض کو دور کرنے کی یہ دعا نہ کی تھی۔ کیونکہ یہ تو انہیں اللہ سے اور قریب کر رہی تھی۔ اور جو چیز آپؑ کو اپنے رب سے دور کر رہی تھی وہ غیر اللہ کی طرف توجہ اور اللہ سے قطع تعلق خواہ وہ ایک لمحہ کے لیے کیوں نہ ہو، کی تکلیف تھی، جس مرض کا ذکر مفسرین اور مورخین نے کیا ہے وہ قطعاً ہوا ہی نہیں اور مدت مرض بھی صرف دو ماہ اور چند روز ہے۔ حضرت نے ان دنوں کی بھی تعیین کر دی، لیکن مجھے بھول گئے کہ کتنے فرماتے تھے۔ واللہ تعالیٰ اعلم۔

۲۴- وَمَنْ اَعْرَضَ عَنْ ذِكْرِىْ فَاِنَّ لَهٗ مَعِيْشَةً ضَنْكًا وَّ نَحْشُرُهٗ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ اَعْمٰى -(سورۂ طٰہٰ آیت ۱۲۴)

میں نے حضرت سے دریافت کیا کہ آیت وَمَنْ اَعْرَضَ عَنْ ذِكْرِىْ فَاِنَّ لَهٗ مَعِيْشَةً ضَنْكًا وَّ نَحْشُرُهٗ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ اَعْمٰى (جس نے میری یاد سے مُنہ موڑا، اس کی زندگی تنگ ہوگی اور قیامت کے دن اسے اندھا اٹھایا جائے گا) میں معیشۃً ضنکاً سے کیا مراد ہے؟ کیونکہ اگر تنگدستی مراد لی جائے تو معاملہ مشکوک ہوجاتا ہے کیونکہ بہت سے کافر مالدار دیکھے گئے ہیں۔ ان کی معاش فراخ ہوئی نہ کہ تنگ اور آیت کا تقاضا یہ ہے کہ ہر وہ شخص جو اللہ کے ذکر سے اعراض کرے گا اس کی زندگی تنگ ہوگی۔

حضرت نے فرمایا: ذات انسانی پر جو حالات آخرت میں پیش آئیں گے ان کا اثر دنیا ہی میں عقلوں پر ظاہر ہوجاتا ہے اور اللہ تعالیٰ نے یہ فیصلہ کیا ہے کہ کافر جہنم میں ہمیشہ کے لیے رہیں گے۔ لہٰذا کوئی گھڑی بھی کافر پر ایسی نہیں گزرتی ہے کہ اس کے دل پر غم نہ طاری ہو کیونکہ اس کے دل پر وسوسے طاری رہتے ہیں اور وسوسوں سے غم کی تحریک ہوتی ہے جو اس کی زندگی کو مکدر کر دیتے ہیں۔ ادنیٰ ترین وسوسہ یہ ہے کہ اسے یہ خیال آئے کہ آیا میں صحیح مذہب پر ہوں یا نہیں اسی خیال کو اللہ کافروں کے دلوں پر ڈالتا ہے اور اسی سے ان کی زندگی تنگ ہوتی ہے۔ خواہ کس قدر مالدار اور بادشاہ ہی کیوں نہ ہوں۔ لہٰذا تنگی سے مراد دل کی تنگی ہے نہ کہ ہاتھ کی۔ اس لیے جس کے پاس وسیع دنیا ہو اور اسے معلوم ہوجائے کہ اسے آخرکار جہنم میں جانا ہے تو اس کی زندگی تنگ ہوگی۔

مؤلف کہتا ہے کہ شیخ نے نہایت خوب کہا۔ بیضاوی نے زندگی کی تنگی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ اس کی زندگی اس لیے تنگ ہوگی کہ اس کا سارا غم اور اس کی نگاہ ہر وقت دنیا کے سامان پر لگی ہوگی اور اس کے زیادہ چاہنے کا سخت حریص ہوگا اور اس میں کمی واقع ہونے سے ڈرتا ہوگا بر خلاف مومن کے جو آخرت کا طالب ہوتا ہے۔

مؤلف کہتا ہے کہ ایک فقیہ نے مجھے بتایا کہ کفار نے اسے سات سال قید میں رکھا اور میں اس تمام عرصہ میں ان سے مناظرہ کرتا رہا۔ میں ان کو مدت تک آزماتا رہا اور ان سے بہت گفتگو کی یہاں تک کہ مجھے معلوم ہوگیا کہ ان میں اکثر لوگ اپنے مذہب کے متعلق شک و شبہ میں ہیں۔ ان کے دل کی بیماری کی مثال ایسی ہے جیسے ایک خارش کا مریض ہو جو کھجانے والے کی تلاش میں ہو لہٰذا جب انہیں کسی مسلمان طالب علم کا پتہ چلتا تو دوڑ کر اس کے پاس جاتے۔ اس سے سوال اور بحث کرتے پھر اس کی معمولی سی گفتگو سے یہ کافر اس مسلمان

کے جال میں پھنس جاتے۔ یہ تو ان کے متوسط درجہ کے لوگوں کا حال ہے۔ اب رہتے ان کے بزرگ اور پادری اور ان کے اہلِ رائے سو کافی عرصہ تک ان کو آزمانے اور ان سے مناظرہ کرنے کے بعد مجھے ہوا کہ ان کو اپنی گمراہی کا پورا یقین ہے۔ وَاللّٰہُ غَالِبٌ عَلٰی اَمْرِہٖ۔ فقیہہ کہتا ہے کہ میں ان سے مناظرہ کرتا رہا حتیٰ کہ انھوں نے ذکر کیا کہ فلاں جگہ ان کا ایک عالم ہے کہ کُتُبِ سابقہ کا علم چلتا چلتا اب اس تک پہنچا ہے۔ میں اس کے پاس گیا تو اسے بحرِ بے کراں پایا۔ اسے توراۃ، انجیل، زبور اور قرآن مجید کی آیات یاد تھیں اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بہت سی احادیث بھی یاد تھیں اور امرءُ القیس[1] کندی کے کچھ اشعار بھی یاد تھے۔ میں نے اس سے کہا میں تجھ سے ایک بات پوچھنے آیا ہوں جس نے مجھے سخت غمزدہ اور پریشان کر رکھا کہ نہ رات کو نیند ہے نہ دن کو قرار۔ کہا وہ کونسی بات ہے؟ میں نے کہا جب تک میں اسلامی ملک میں رہا میں یہی سنتا رہا کہ دین اسلام سچا دین ہے اور عیسائی مذہب باطل ہے لیکن جب سے تمہارے ملک میں آیا ہوں معاملہ برعکس ہو گیا ہے اور میں ہر جگہ یہی سنتا ہوں کہ عیسائی مذہب سچا مذہب ہے اور دینِ اسلام باطل ہے اور میں نے یوں ظاہر کیا کہ مجھے مذہب کے بارے میں شک پیدا ہو گیا ہے میں نے لوگوں سے دریافت کیا کہ عیسائیوں کا سب سے بڑا عالم کون ہے سب نے بالاتفاق آپ کا نام لیا اور آپ کے سب سے زیادہ عالم ہونے اور سردار ہونے میں کسی نے بھی اختلاف نہیں کیا۔ اللہ تعالیٰ نے جاہل پر فرض کیا ہے کہ وہ عالم سے پوچھے لہٰذا میں چاہتا ہوں کہ آپ بتائیں کہ آپ کے نزدیک حق بات کیا ہے تاکہ میں قیامت کے دن اللہ اور اپنے درمیان آپ کے جواب کو حجت بنا سکوں۔ میں جاہل ہوں اور آپ عالم۔ اللہ تعالیٰ نے جاہل پر پوچھنا فرض کیا ہے اور عالم پر حق گوئی اور اللہ کے واسطے مخلوق کی خیر خواہی۔ میرے سوال کا اس پر بہت اثر ہوا اور وہ اپنا ماتھا ہتھیلی پر رکھ کر دیر تک خاموش رہا اور عیسائیوں کا ایک ہجوم اس کے پاس بیٹھا ہوا تھا۔ پھر اس نے اپنا سر اٹھایا اور میرے کان میں چپکے سے کہا اسلام کے سوا کوئی مذہب نہیں۔ یہی وہ حق مذہب ہے جس کے سوا کسی اور مذہب کو اللہ تعالیٰ قبول نہ کرے گا اور بیشتر اس کے کہ میرے جواب کا علم عیسائیوں کو ہو جائے، تو یہاں سے اُٹھ کر چلا جا۔ اس کے بعد اس فقیہ نے ان مناظرات کا ذکر جو اس نے یہود و نصاریٰ کے عالموں سے کئے جن کا یہاں ذکر کرنا ہماری غرض سے باہر ہے اور میرا مقصد صرف شیخ

---

[1] امرءُ القیس کندی: زمانہ جاہلیت میں عربی زبان کا بلند پایہ شاعر تقریباً ۵۴۰ء میں اس کی وفات انگورہ کے مقام پر ہوئی۔

کے فرمان کی تائید کرتا تھا اور جو شخص یہود و نصاریٰ سے مناظرہ کرے گا اسے شیخ کے فرمودہ کا علم ہو جائیگا میں نے بھی یہودی علماء سے بحث کی آخرکار مجھے علم ہوگیا کہ انھیں اپنے باطل پر ہونے کا یقین ہے اور ہٹ دھرمی اور اپنی قوم میں رسوائی کے خوف کے سوا کوئی اور چیز انھیں اسلام لانے سے مانع نہیں۔ یہ ایک طویل مناظرہ تھا جس میں ہمارے فقہاء اور قراء کی ایک جماعت نے شرکت کی اور یہودیوں کے ساتھ بھی کچھ یہودی آئے۔ اسی طرح میں نے ایک عیسائی سے گفتگو کی، لیکن میں نے اس کے پاس کچھ بھی نہ پایا۔ اس بارے میں بہت سی حکایات پائی جاتی ہیں جو ان کا مطالعہ کرنا چاہیے وہ عبداللہ میورقی کی تحفۃ الادیب فی الرد علی اھل الصلیب کا مطالعہ کرے۔ عبداللہ میورقی[1] عیسائیوں کا عالم تھا جو مسلمان ہوگیا تھا۔ اسی طرح عبدالحق[2] اسلامی کی تالیفات دیکھیں۔ یہ ایک یہودی عالم تھے جو مسلمان ہو گئے تھے اسی طرح نصاریٰ کے رد میں ابوالعباس[3] قرطبی کی تالیف ہے جس میں عجیب و غریب باتیں دی ہیں اور اس کی ضخامت بیس جزو کے قریب ہے۔ جو شخص ان باتوں کا مطالعہ کرے اور پھر اسے عیسائیوں اور یہودیوں سے ملنے کا اتفاق ہو تو اسے یقینی طور پر معلوم ہو جائے گا کہ ان کے دلوں میں شک کا مرض ہے اور اس بات کا یقین ہے کہ وہ گمراہی پر ہیں۔

۲۵۔ وَهَمَّ بِهَا لَوْلَا اَنْ رَّاٰ بُرْهَانَ رَبِّهٖ (سورۂ یوسف آیت ۲۴)

میں نے حضرت سے دریافت کیا کہ آیت وَهَمَّ بِهَا لَوْلَا بُرْهَانَ رَبِّهٖ میں جو هَمَّ بِهَا فرمایا، اس سے کیا مراد ہے۔ حضرت یوسف علیہ السلام نے کس بات کا ارادہ کیا تھا؟

فرمایا کہ انھوں نے زلیخا کو مارنے کا ارادہ کیا تھا۔ پھر میں نے جو کچھ مفسرین نے اس بارے میں بیان کیا ہے اس کے متعلق دریافت کیا تو آپ نے سختی سے اس کا انکار کیا اور فرمایا کہ پھر عصمت کہاں رہی؟ ایک ولی کو جب فتح نصیب ہو جاتی ہے تو اللہ تعالیٰ اس سے بہتر[2] تاریکیوں کی جڑیں نکال پھینکتا ہے جن میں بعض سے جھوٹ، بعض سے تکبر، بعض سے ریا، بعض سے حبِ دنیا بعض سے شہوت و محبتِ زنا وغیرہ وغیرہ بری باتیں پیدا ہوتی ہیں۔ یہ حال ولی کا ہے نبی جس کی فطرت ہی عصمت پر بنی ہوتی ہے اور اسی پر اسکی

---

[1] عبداللہ میورقی: عبداللہ بن عبداللہ الترجمان ان کی کتاب تحفۃ الاریب فی الرد علی اہل الصلیب نو بابوں میں لکھی گئی ہے۔ میورقی نے اسے ۸۲۳ھ ۱۴۲۰ء میں مکمل کیا۔ اس وقت تونس کا حاکم ابوالعباس احمد تھا۔

[2] عبدالحق اسلامی: ان کا حال معلوم نہ ہو سکا۔

[3] ابوالعباس قرطبی: ابوالعباس احمد بن مسعود القرطبی الخزرجی متوفی ۶۰۱ھ

تربیت ہوئی ہوتی ہے اس کا تو کیا ہی کہنا۔

پھر فرمایا کبھی ولی اس درجہ تک پہنچ جاتا ہے کہ اس کی نگاہ میں محلِ شہوت (یعنی فرج) اور دوسری جگہ ایک جیسی ہوتی ہے یہاں تک کہ عورت کی فرج اور یہ پتھر۔ آپ کا اشارہ اس پتھر کی طرف تھا جو آپ کے سامنے پڑا تھا۔ ایک جیسے ہوتے ہیں۔ ایسا کیوں نہ ہو جبکہ صاحب فتح سے اور تو اور عورت کے رحم کی چیزیں تک مخفی نہیں رہتیں۔ وہ اللہ کے اس نور سے دیکھتا ہے جس کے پاس شیطان پھٹک نہیں سکتا اور جبکے ہوتے ہوئے کسی قسم کی تاریکی نہیں آتی۔ جب ولی کا یہ حال ہے تو نبی معصوم کی کیا کیفیت ہوگی۔ خدا ہمیں ان لوگوں میں سے بنائے جو نبوت کے حق کو سمجھتے ہیں۔ واللہ تعالیٰ اعلم۔

۶: وَكَلَّمَ اللّٰهُ مُوْسٰى تَكْلِيْمًا (سورۂ نساء: آیت ۶۴)

میں نے حضرت سے عرض کیا کہ اللہ تعالیٰ کا فرمان وَكَلَّمَ اللّٰهُ مُوْسٰى تَكْلِيْمًا (اللہ نے موسیٰ سے کلام کیا) کیا یہ حضرت موسیٰ کے ساتھ مخصوص ہے اور بڑے بڑے صوفی مکالمہ کا جو ذکر کرتے ہیں حق ہے؟ مثلاً حضرت عارف باللہ ابوالحسن شاذلی حزب کبیر میں فرماتے ہیں ہمیں ایسا مشاہدہ عطا کیا گیا ہے جس کے ساتھ مکالمہ بھی ہے۔

فرمایا: شیخ ابوالحسن اور دیگر صوفیہ نے مکالمہ کے بارے میں جو کچھ کہا ہے حق ہے، اس میں کوئی شک نہیں اور یہ آیت شریفہ کے خلاف بھی نہیں ہے اس لیے کہ آیت میں حصر نہیں پایا جاتا۔

پھر فرمایا کہ جب اللہ تعالیٰ کی مفتوح علیہ پر رحمت ہوتی ہے تو وہ اللہ تعالیٰ کا کلام اس طریقے سے سنتا ہے جو خارقِ عادت ہوتا ہے چنانچہ وہ اسے بغیر حرف اور بغیر آواز کے سنتا ہے کہ نہ کسی کیفیت کا ادراک ہوتا ہے اور نہ کسی خاص جہت سے سماع ہوتا ہے بلکہ تمام جہات اور تمام اجزاء سے سنتا ہے اور جس طرح سماع کے لیے کوئی مخصوص جہت نہیں ہوتی اسی طرح کسی عضو کی بھی تخصیص نہیں ہوتی بلکہ وہ اپنے تمام جواہر اور تمام اجزاء سے سنتا ہے لہٰذا ہر جزو، ہر جوہر، ہر دانت، ہر داڑھ سے سماع ہوتا ہے یہاں تک کہ اس کا سارا جسم بمنزلہ کان کے بن جاتا ہے۔

اس کے بعد آپ نے بتایا کہ اہلِ فتح کے ہاں یہ سماع بھی اپنے اپنے مراتب کے مطابق مختلف ہوتا ہے جس کا ذکر کرنا مناسب نہیں۔ خدا ہمیں اس سے مستفیض کرے۔ واللہ تعالیٰ اعلم۔

❁

۲۷۔ وَاِذَا ضَرَبْتُمْ فِی الْاَرْضِ فَلَیْسَ عَلَیْکُمْ جُنَاحٌ اَنْ تَقْصُرُوْا مِنَ الصَّلٰوۃِ (سورۂ نساء آیت ۱۰۱)

میں نے حضرت سے اس آیت کے متعلق دریافت کیا وَاِذَا ضَرَبْتُمْ فِی الْاَرْضِ فَلَیْسَ عَلَیْکُمْ جُنَاحٌ اَنْ تَقْصُرُوْا مِنَ الصَّلٰوۃِ اِنْ خِفْتُمْ اَنْ یَّفْتِنَکُمُ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا اِنَّ الْکٰفِرِیْنَ کَانُوْا لَکُمْ عَدُوًّا مُّبِیْنًا (جب تم سفر کو جاؤ تو اگر تمہیں اس بات کا خطرہ ہو کہ کافر تمہیں تکلیف پہنچائیں گے تو کوئی حرج نہیں اگر تم نماز کو کم کردو۔ بیشک کافر تمہارے کھلے دشمن ہیں) اور عرض کیا خوف کی حالت کی قید لگانے کی کیا وجہ ہے حالانکہ امن کی حالت میں بھی قصر جائز ہے۔

حضرت نے فرمایا کہ یہ قید مفہوم مخالف کے خارج کرنے کے لیے نہیں بلکہ اس لیے ہے کہ اس بات کی تصریح کردی جائے کہ خوف کی حالت میں قصر کرنے میں کوئی حرج نہیں نیز اس بات کی تنبیہ کرنا ہے کہ خوف کی حالت کو بھی اس حکم میں شامل کرلو۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ صحابۂ کرام جب جہاد کے لیے جاتے تو اس خیال سے کہ کہیں یہ زندگی کا آخری وقت نہ ہو وہ اور بھی زیادہ عبادت کیا کرتے اور ہر وقت عبادت میں لگے رہتے۔ حتیٰ کہ بعض صحابہ کا یہ حال تھا کہ دن کو جہاد کرتے اور رات بھر کھڑے رکوع وسجود میں لگے رہتے، لہٰذا جب وہ دشمن کے خلاف جہاد کی غرض سے نکلتے تو عبادت کم کردینے کو کوتاہی اور سخت گناہ سمجھتے اس لیے کہ یہ آخرت کی تیاری کے منافی ہے اور ان کا خیال تھا کہ ایسی حالت میں زیادہ عبادت کرنا ہی ٹھیک ہے اور یہ خیال ان کے دلوں میں راسخ ہوچکا تھا لہٰذا جب اللہ تعالیٰ نے اس خیال کو ان کے دلوں سے زائل کرنا چاہا تو حکم کو اسی حالت سے مقید کرکے اتارا جسے وہ عبادت کے منافی سمجھتے تھے واللہ تعالیٰ اعلم۔

فِی الْغَنَمِ السَّائِمَۃِ زَکٰوۃٌ

جب گفتگو چلتے چلتے مفہوم تک آئی تو میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے فرمان فِی الْغَنَمِ السَّائِمَۃِ زَکٰوۃٌ (کھلی چرنے والی بکریوں میں زکوٰۃ ہے) کا مفہوم دریافت کیا۔

حضرت نے فرمایا مریض بکریاں جو چر نہ سکتی ہوں جب ان کی یہ حالت ہوجائے تو ان سے زکوٰۃ ساقط ہوجاتی ہے اس لیے کہ ملکیت کی نعمت پر زکوٰۃ واجب ہوتی ہے اور جب بکریوں کی یہ حالت ہوجائے کہ ان کا کھانا اور چرنا بھی جاتا رہے تو ملکیت کی نعمت جس سے زکوٰۃ واجب ہوتی ہے نہیں رہتی کیونکہ ایسی

حالت میں بالعموم ان کی موت اور ہلاکت واقع ہو جاتی ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا مقصد یہی ہے۔

میں نے عرض کیا کہ امام شافعی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ سائمہ سے یہاں مراد وہ بکریاں ہیں جنہیں چارہ ڈالا جائے۔

حضرت نے فرمایا کہ جن کو چارہ ڈالا جائے وہ تو حدیث کے الفاظ میں ہی آجاتی ہیں اس لیے کہ وہ اپنی طبیعت کے اعتبار سے تو سائمہ ہیں۔ انہیں صرف چرنے سے روکا گیا ہے اگر انہیں اپنی طبیعت پر چھوڑ دیا جائے تو چرنے کے لیے نکل جائیں مگر مالک نے ان کو چارہ ڈالنے کا ذمہ لیا ہے اس طرح ملکیت کی نعمت تو ثابت ہو گئی۔

اس کے بعد میں نے مجتہدین میں اس کے مفہوم میں جو اختلاف پایا جاتا ہے اس کے متعلق دریافت کیا کہ بعض نے مفہوم کا مطلق طور پر لحاظ رکھا ہے اور بعض نے اسے بالکل ہی مہمل قرار دیا ہے اور بعض نے اس میں فرق کیا ہے جیسا کہ علم اصول میں مشہور ہے۔

حضرت نے فرمایا مفہوم کا حقیقی علم صرف اسی شخص کو ہو سکتا ہے جسے ان اسباب و اغراض کا علم ہو، جن کی وجہ سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے کسی بات کی قید لگا دی ہے اور اس کا علم آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے باطن کا علم حاصل کیے بغیر حاصل نہیں ہو سکتا۔ مثلاً اگر کوئی شخص اپنے احکام میں کچھ باتوں کی قید لگا دے اور اس کے بعد کہیں چلا جائے تو اس کی قیود کی مراد کے متعلق یقینی علم اسی وقت ہو سکتا ہے جب اس کا عندیہ معلوم ہو جائے اور یہ اسی صورت میں معلوم ہو سکتا ہے کہ اگر وہ زندہ ہو تو اسی سے خود پوچھا جائے اور وہ اپنی مراد کی تشریح کر دے۔ لیکن جب کسی نے اس کی زندگی میں اس سے پوچھا ہی نہ ہو تو اس کی مراد معلوم کرنا مشکل ہو جاتا ہے۔ اسی بنا پر جنھوں نے مطلق طور پر مفہوم کو معتبر سمجھا ہے انھوں نے ان قیود کے ساتھ ایک طریقہ اختیار کر رکھا ہے اور یہ درست نہیں اس لیے قید لگانے کے مختلف اسباب ہوتے ہیں بعض حکم کی مخالفت کے مقتضی ہوتے ہیں اور بعض موافقت کے۔ یہی حال ان لوگوں کا ہے جنہوں نے اصولیوں کے طرز پر فرق کیا ہے چنانچہ جنھوں نے تعداد کو بالکل مہمل قرار دیا ہے اور مطلق طور پر شرط کا اعتبار کیا ہے انھوں نے تعداد کی قید لگانے میں ایک ہی مسلک اختیار کیا ہے اور یہ ان اغراض کے منافی ہے جن کی وجہ سے یہ قید یا شرط لگائی گئی۔

حاصل یہ کہ شرعی تقییدات کا حقیقی علم صرف بڑے بڑے صاحبانِ کشف و فتح کو ہی حاصل ہوتا ہے جیسے ہمارے حضرت۔ کیونکہ میں نے فارغ التحصیل ہونے اور ان بحثوں پر جو بڑے بڑے اصولیوں نے

مفہوم کے متعلق کی ہیں مثلاً امام الحرمین[1] نے برہان اور امام ابو حامد نے المستصفیٰ میں اور امام ابوالولید باجی[2] نے فصول میں اور ابیاری[3] اور امام علی بن اسماعیل نے شرح برہان میں اور امام ابوعبداللہ بن الحاج العبدری[4] نے شرح مستصفیٰ میں مع اس بحث کے جس کا تذکرہ تاج الدین[5] سبکی نے جمع الجوامع اور اس کی شروح اور حواشی وغیرہ میں کیا ہے پر احاطہ کر لینے کے بعد حضرت سے کئی بار گفتگو کی تو میں نے حضرت سے وہ باتیں سنیں جو اجتہاد سے بھی بڑھکر ہیں۔ ایسا کیوں نہ ہو جبکہ وہ ہر وقت نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا مشاہدہ کرتے رہتے ہیں۔ خدا ہمیں آپ کی رضا و محبت عطا کرے اور ہمارا حشر آپ کی جماعت میں کرے آمین!

۲۸- فَلَمَّا جَنَّ عَلَيْهِ اللَّيْلُ رَاٰ كَوْكَبًا قَالَ هٰذَا رَبِّيْ

(سورۂ انعام آیت ۷۷)

میں نے حضرت سے اللہ تعالیٰ کے فرمان فَلَمَّا جَنَّ عَلَيْهِ اللَّيْلُ رَاٰ كَوْكَبًا قَالَ هٰذَا رَبِّيْ (جب رات چھاگئی تو ایک ستارہ دیکھا اور کہا یہ میرا رب ہے) کے متعلق دریافت کیا کہ سیدنا ابراہیم علیہ السلام کا یہ کہنا اپنے لیے استدلال کی خاطر تھا اور اس لیے تھا کہ اللہ تعالیٰ کی مصنوعات

---

[1] امام الحرمینؒ: ابو المعالی الجوینی نیشاپور کا مشہور فقیہ اور عالم۔ انہیں امام الحرمین اس لیے کہا جاتا ہے کہ انھوں نے مکہ اور مدینہ میں کئی سال درس دیا علاؤالدین جوینی مؤلف تاریخ جہانگشا اور شمس الدین جوینی انہی کی اولاد میں سے تھے ۴۷۸ھ ۱۰۸۵ء میں ان کی وفات ہوئی ان کی کتاب کا پورا نام البرہان فی اصول الفقہ ہے۔

[2] ابوالولید باجی: اندلس کا مشہور شاعر اور فقیہ ان کی وفات ۴۷۴ھ ۱۰۸۱ء میں ہوئی۔ یہ ابن حزم کے معاصر تھے اور ان کے ساتھ ان کے بہت سے مناظرے ہوئے۔ ان کے متعلق ابن حزم کا قول تھا کہ قاضی عبدالوہاب کے بعد اصحاب مذہب مالکی میں ابوالولید الباجی کا مثل کوئی نہ تھا۔ ان کی بہت سی تصانیف میں مثلاً الاستیفا فی شرح الموطا۔ کتاب السراج فی علم الحجاج وغیرہ

[3] ابیاری: امام شمس الدین ابوالحسن علی بن اسمٰعیل الابیاری المالکی۔

[4] ابوعبداللہ بن الحاج العبدری: ابو عبداللہ محمد بن محمد الحاج العبدری الفاسی المالکی متوفی ۷۳۷ھ ان کی ایک تالیف کتاب البدع ہے (کشف الظنون: ۲: ۱۴۱۴) ایک اور تالیف مدخل الشرع الشریف علی المذاہب الاربعۃ ہے یہ کتاب انھوں نے ۷۳۲ھ میں لکھی (کشف الظنون: ۲: ۲۴۹)

[5] تاج الدین سبکی: تاج الدین عبدالوہاب بن علی السبکی الشافعی مشہور فقیہ گزرے ہیں ان کی وفات ۷۷۲ھ ۱۳۷۰ء میں ہوئی ان کی کتاب جمع الجوامع اصول فقہ میں ہے۔

پر نظر ڈال کر حق تک پہنچ جائیں یا قوم کو خاموش اور لاجواب کرنے کی غرض سے استدلال تھا کہ آپ نے پہلے ان کا دعویٰ بر سبیل تسلیم پیش کیا اور اس کے بعد اسے باطل کرنے کی طرف رجوع کیا کیونکہ مفسرین کا اس میں بڑا اختلاف ہے۔

فرمایا: اپنے نفس کے لیے استدلال تھا مگر عام لوگوں کی طرح کا استدلال نہ تھا اس لیے کہ انبیاء علیہم السلام کا استدلال عام لوگوں کی طرح نہیں ہوتا۔ کیونکہ انہیں انتہا درجہ کی اللہ کی معرفت، کمالِ عبودیت، انتہائی خوف اور حد درجہ کا خشوع و خضوع نصیب ہوتا ہے جس کی وجہ یہ ہوتی ہے کہ انکی فطرت میں حق کی معرفت اور حق کی طرف میلان پایا جاتا ہے۔ اس آیت میں حضرت ابراہیم کے استدلال کا مطلب صرف یہ ہے کہ وہ چاہتے تھے کہ اپنے سر کی آنکھوں سے وہی کچھ دیکھ لیں جو کچھ کہ انہیں اپنے باطن اور بصیرت میں دکھائی دیتا تھا۔ انھیں اپنی بصیرت کے ذریعہ سے اللہ کی معرفتِ تامہ حاصل تھی اب آپ یہ چاہتے تھے کہ انکی بصیرت تمام پردے پھاڑ کر بصارت تک پہنچ جائے۔ لہٰذا انھوں نے اپنی بصارت کے ساتھ اس موجودات میں اس چیز کی تلاش شروع کر دی جو بصیرت میں پہچانی ہوئی چیز کے مناسب ہو، اس لیے آپ نے ان روشن اجسام کی طرف نظر کی جن کا ذکر آیات میں آیا ہے۔ تو انہیں دیکھا کہ وہ منزہ اور مقدس ذات کے مناسب نہیں ہیں۔ لہٰذا ان سب سے بیزار ہو کر اس ذات کی طرف گئے جسے وہ اپنی بصیرت میں پہچانتے تھے اور وہ ذات وہ ہے جس نے تمام زمینوں اور آسمانوں کو پیدا کیا۔ اس کی مثال محض سمجھانے کی غرض سے یوں سمجھو کہ ایک صاحبِ کشف ولی نے ۲۹ تاریخ کو ہی اپنی بصیرت سے چاند دیکھ لیا پھر اپنی نگاہ سے دیکھنے لگا تو نظر نہ آیا، پھر وہ دوسرے لوگوں کے ساتھ مل کر چاند دیکھنے لگا۔ اب جو شخص اس کے باطن سے واقف نہیں اگر اسے دیکھے گا تو خیال کرے گا کہ اور لوگوں کی طرح جو چاند کو تلاش کر رہے ہیں۔ اسے بھی چاند ہونے میں شک ہے مگر جو شخص ان کے باطن کو جانتا ہو گا اسے یقین ہو گا کہ انہیں چاند کا پختہ یقین ہے اور وہ چاند کی تلاش ہمارے ساتھ صرف اس لیے کر رہے ہیں کہ آنکھوں سے بھی اس کا مشاہدہ کریں۔ برخلاف اور لوگوں کے کہ انہیں ظاہر اور باطن دونوں طرح سے چاند ہونے میں شک ہے انبیاء اور محجوبین کے استدلال میں یہی فرق ہے۔ لہٰذا ہم پر واجب ہے کہ ان کے استدلال کو اللہ کی معرفت سے ناواقفی اور شک سے پاک سمجھیں۔ نیز ہر اس چیز سے پاک سمجھیں جو اللہ کے متعلق علم ضروری کے منافی ہے جس کی وجہ وہ معصومیت ہے جو انبیاء کا خاصہ ہے اور معصومیت شک اور اللہ تعالیٰ کے متعلق ناواقفیت کے منافی ہے اس لیے کہ دونوں باتیں کفر کی قسمیں ہیں اور انبیاء علیہم السلام صغیرہ گناہوں سے بھی معصوم ہیں چہ جائیکہ کبیرہ گناہ اور پھر

چہ جائیکہ کفر۔

مؤلف کہتا ہے یہ نہایت ہی معرفت کی بات ہے۔ مجھے حضرت سے متعدد بار ایسا واقعہ پیش آیا کہ ۲۹ ر تاریخ کی رات آپ ہمیں چاند ہونے کی اطلاع دے دیتے حالانکہ آپ اپنے گھر کی چھت کے نیچے یا مسجد میں یا کسی اور جگہ ہوتے، ہم اسی طرح اپنی جگہ پر بیٹھے رہتے کہ کوئی شخص آتا اور چاند ہونے کی خبر دیتا۔ بلکہ بارہا ایسا ہوا کہ ابھی سورج کی زردی باقی ہوتی کہ آپ ہمیں چاند ہونے کی خبر دیا کرتے پھر ہم درخواست کرتے کہ چاند دیکھنے چلیں، لیکن جب ہم چاند دیکھنے کے لیے نکلتے تو چاند کی باریکی اور ہماری بینائی کی کمزوری کی وجہ سے ہم میں سے کوئی بھی اسے نہ دیکھ سکتا۔ ہم کافی دیر تک دیکھتے رہتے مگر چاند نظر نہ آتا یہاں تک کہ کوئی ہم سے زیادہ تیز نظر شخص آتا اور وہ چاند کو دیکھتا اس کے بعد چاند ہونے کی خبر ہر طرف پھیل جاتی۔ اکثر ایسا ہوتا کہ آپ مجھے فرماتے کہ آج کا دن ماہ رمضان میں ہے حالانکہ لوگوں نے اس دن کا روزہ نہ رکھا ہوتا تھا، اس خیال سے کہ وہ شعبان کا آخری دن ہے یا یہ کہ آج عید کا دن ہے اور لوگوں نے اس خیال سے روزہ رکھا ہوتا کہ رمضان کا آخری دن ہے یا یہ کہ آج عرفہ کا دن ہے اور اس دن لوگوں کے خیال کے مطابق آٹھویں تاریخ ہوتی۔ اس کے بعد ان مقامات سے جو ہم سے چار یا پانچ دن کی مسافت پر ہوتے بعینہٖ اسی طرح کی خبر آتی جس طرح کہ حضرت نے فرمایا ہوتا۔ واللہ تعالیٰ اعلم۔

۲۹۔ هُوَ الَّذِیْۤ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰی وَدِیْنِ الْحَقِّ لِیُظْهِرَهٗ عَلَی الدِّیْنِ كُلِّهٖ ؕ وَلَوْ كَرِهَ الْمُشْرِكُوْنَ۔

(سورۂ فتح آیت ۲۸)

میں نے حضرت سے اللہ تعالیٰ کے فرمان هُوَ الَّذِیْۤ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰی وَدِیْنِ الْحَقِّ لِیُظْهِرَهٗ عَلَی الدِّیْنِ كُلِّهٖ ؕ وَلَوْ كَرِهَ الْمُشْرِكُوْنَ۔ (خدا وہ ہے جس نے اپنے رسول کو ہدایت اور دین حق دے کر بھیجا تاکہ اسے تمام ادیان پر غالب کرے خواہ مشرکین بُرا ہی کیوں نہ مانیں) کے متعلق دریافت کیا کہ تمام ادیان پر غالب کرنے سے کیا مراد ہے؟ کیا اس کا یہ مطلب ہے کہ یہ تمام ادیان کو منسوخ کرنے والا ہے یا مراد اس کی حجت و دلیل کے واضح ہونے سے ہے۔

حضرت نے فرمایا۔ اللہ تعالیٰ نے اس پاک دین کو تمام ادیان پر ہر لحاظ سے غلبہ دیا ہے، خواہ اس لحاظ سے ہو کہ یہ ان کو منسوخ کرنے والا ہے، خواہ اس لحاظ سے کہ اس کے دلائل واضح ہیں یا اس

لحاظ سے کہ دنیا میں اس کی کثرت ہے یہاں تک کہ اس کے مقابلہ میں دوسرے دین کالعدم ہیں، چنانچہ جس شخص کی بصیرت اللہ تعالیٰ نے کھول دی ہو اور سطح زمین کے آباد و غیر آباد مقامات کو دیکھا ہو تو وہ دیکھے گا کہ ہر مقام میں لوگ اللہ کی عبادت کرتے ہیں اور وہ دین محمدی پر ہیں۔ زمین ان حضرات سے آباد ہے چنانچہ وہ اس ملک میں بھی ہیں اور اس ملک میں بھی یعنی دارکرٔ زمین بھی، غاروں میں بھی، پہاڑوں اور میدانوں میں بھی، آباد اور غیر آباد زمینوں میں بھی۔

اس دین کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ اس میں ایک نور ہے جو اس کی پیرو امت کو ارتداد اور رجوع الی الکفر سے روکتا ہے اور یہ صرف اس لیے کہ اللہ تعالیٰ کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بڑے محبوب ہیں لہٰذا آپ کے دین میں بہت سی ایسی خصلتیں جمع کردی ہیں جو سب کی سب ارتداد سے مانع ہیں۔

حضرت نے فرمایا، جو لوح محفوظ کو دیکھ لے اور اس میں رسولوں اور ان کی شریعتوں کو دیکھے جو لوح محفوظ میں لکھی ہوئی ہیں تو اسے شریعت محمدیہ کے دوام و بقا اور عدم ارتداد کا علم ہو جائے گا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے نور اور تاریکی کو پیدا کیا پھر بندوں اور امتوں کو پیدا کیا۔ پھر نور کے لیے دروازے رکھے جن میں سے نور ان کی ذات پر داخل ہو اور تاریکیوں کے لیے دروازے بھی رکھے جن میں سے تاریکیاں ان کی ذات میں داخل ہوں۔ اس کے بعد شریعتیں بنائیں اور رسول بھیجے تاکہ ان شریعتوں سے نور کے دروازے کھولے اور تاریکی کے دروازے بند ہوں اور یہ اوامر و نواہی ہیں۔ چنانچہ اوامر نور کے دروازے کھولتے ہیں اور نواہی تاریکی کے دروازے بند کرتے ہیں اور نور کو کھولنے والے اوامر اور تاریکی کو بند کرنے والے نواہی سوائے شریعت محمدیہ کے کسی شریعت میں پورے پورے ذکر نہیں کیے گئے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ یہ شریعت تمام شریعتوں کے اوپر ہے اور آپؐ کی امت تمام امتوں کے اوپر ہے اسی مطلب کی طرف آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس فرمودہ میں اشارہ فرمایا ہے لَا تَجْتَمِعُ اُمَّتِی عَلیٰ ضَلَالَۃٍ۔ میری امت کبھی بھی گمراہی پر متفق نہ ہوگی۔

حضرت نے فرمایا کہ جب صاحب فتح گذشتہ امتوں اور ان کی ان بستیوں کو جہاں وہ اپنے زمانوں میں بستے تھے، دیکھتا ہے تو اسے ان کی بستیوں کے اوپر سیاہ کہر کی شکل کی تاریکی دھوئیں کی طرح دکھائی دیتی ہے پھر یہ تاریکی[ا] ان کے قریب ہوتی رہتی ہے اور وہ آہستہ آہستہ اپنے دین کو چھوڑتے جاتے ہیں یہاں تک کہ وہ ان پر آگرتی ہے اور ان کے اجسام اس سے سیر ہو جاتے ہیں اور امت اپنے دین

[ا] ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہاں سے کچھ عبارت رہ گئی ہے جس سے عبارت میں خلل پڑ گیا ہے۔

سے نکل جاتی ہے اور پھر کبھی بھی مذہب کی طرف راہ نہیں پاتی۔ مذہب اسلام کی باقی تمام مذاہب پر غالب آنے کی ایک وجہ یہ بھی ہے۔

مؤلف کہتا ہے کہ انشاء اللہ ہم عنقریب ابواب ظلمت کا کچھ حال بیان کریں گے اور وہ چیزیں بیان کریں گے جن میں عبرت حاصل کرنے والوں کے لیے عبرت ہے۔ واللہ تعالیٰ اعلم۔

۳۰۔ وَمِنْهُمْ مَّنْ عَاهَدَ اللّٰهَ لَئِنْ آتَانَا مِنْ فَضْلِهٖ لَنَصَّدَّقَنَّ وَلَنَكُونَنَّ مِنَ الصّٰلِحِينَ۔

(سورۂ توبہ آیت : ۷۵)

میں نے حضرت سے اس آیت کے متعلق دریافت کیا وَمِنْهُمْ مَّنْ عَاهَدَ اللّٰهَ لَئِنْ آتَانَا مِنْ فَضْلِهٖ لَنَصَّدَّقَنَّ وَلَنَكُونَنَّ مِنَ الصّٰلِحِينَ (ان میں سے بعض ایسے ہیں جنہوں نے اللہ سے عہد کیا کہ اگر وہ ہمیں اپنے فضل سے دیگا تو ہم ضرور صدقہ کریں گے اور نیک بنیں گے) کیونکہ مفسرین نے لکھا ہے کہ یہ آیت ثعلبہ بن حاطب کے بارے میں نازل ہوئی۔ اس نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو کر آپ سے درخواست کی کہ آپ کثرتِ مال کے لیے دعا فرمائیں۔ اس پر آنحضرتؐ نے فرمایا اے ثعلبہ[1] تھوڑا مال جس کا شکریہ ادا کر سکے اس کثیر مال سے بہتر ہے جس کا تو شکریہ ادا نہ کر سکے وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے بار بار یہی درخواست کرتا رہا یہاں تک کہ کہا یا رسول اللہ میں اللہ کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ میں کثیر مال پر بھی شکریہ ادا کروں گا اور عہد کیا کہ اگر اللہ اسے بہت سا مال دے تو وہ ضرور صدقہ وخیرات کرے گا۔ اس پر آنحضرتؐ نے اس کے لیے دعا کی اور اس کے جانور اس طرح بڑھے جس طرح کیڑے بڑھتے ہیں۔ ثعلبہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ نماز با جماعت اور جمعہ ادا کیا کرتا تھا لیکن جب اس کے جانوروں کی تعداد بڑھ گئی تو ان کو لے کر مدینہ سے باہر چلا گیا اور نماز باجماعت اس سے چھوٹ گئی، لیکن جمعہ کے لیے حاضر ہوتا رہا۔ اس کے بعد اس کے جانور اور بڑھ گئے یہاں تک کہ ان میں لگے رہنے کی وجہ سے وہ نماز جمعہ کے لیے بھی حاضر نہ ہو سکتا تھا۔ چنانچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے پوچھا

---

[1] ثعلبہ : ثعلبہ بن حاطب بن عمرو بن عبید۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ہجرت کے موقع پر انھیں معتب بن عوف کا بھائی بنایا تھا، بدر، احد کی جنگوں میں شریک ہوتے۔ قتادہ اور سعید بن جبیر کے قول کے مطابق یہی ہیں جنہوں نے صدقہ ادا نہ کیا تھا اور جن کے بارے میں منہم من عاہد اللہ کی آیت نازل ہوئی۔ ان کی وفات حضرت عمرؓ یا عثمانؓ کی خلافت میں ہوئی۔ ابن حجر نے تہذیب التہذیب میں ان کا ذکر نہیں کیا۔

ثعلبہ کہاں ہے، صحابہ نے عرض کیا یا رسول اللہؐ اس کے جانور بہت زیادہ ہو گئے ہیں جن میں لگے رہنے کی وجہ سے وہ جماعت اور جمعہ کے لیے حاضر نہیں ہو سکتا۔ آپ نے فرمایا وائے افسوس ثعلبہ پر۔ اس کے بعد آنحضرت نے زکوٰۃ لینے پر دو شخص مامور کئے اور لوگ خود زکوٰۃ لے کر ان کے پاس آتے اور وہ ثعلبہ کے پاس سے گزرے تو انھوں نے اس سے بھی زکوٰۃ کا مطالبہ کیا اور وہ رقعہ بھی پڑھ دیا جس میں زکوٰۃ اور فرائض کا ذکر تھا۔ ثعلبہ کہنے لگا یہ تو جزیہ ہوا یا جزیہ کی بہن۔ اس وقت تم چلے جاؤ میں سوچ لوں۔ اس پر یہ آیت اتری تو ثعلبہ زکوٰۃ لے کر حاضر ہوا۔ آنحضرتؐ نے فرمایا مجھے اللہ تعالیٰ نے تمہاری زکوٰۃ قبول کرنے سے منع کر دیا ہے۔ ثعلبہ آہ وزاری کرنے لگا، مگر آنحضرت نے فرمایا یہ تمہارا اپنا فعل ہے۔ میں نے تو تمہیں حکم دیا تھا مگر تم نے میری بات نہیں مانی۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد وہ زکوٰۃ لیکر حضرۃ ابوبکرؓ کی خدمت میں حاضر ہوا مگر انھوں نے بھی قبول نہ کی، پھر حضرت عمرؓ کے عہد میں ان کے پاس لے کر گیا انھوں نے بھی قبول نہ کی، حضرت عثمان کے عہد میں ثعلبہ مر گیا۔ حافظ سیوطی بیضاوی کے حاشیہ میں لکھتے ہیں، اس کی روایت ابن جریر، ابن ابی حاتم، ابن مردویہ[1]، طبرانی اور بیہقی[2] نے شعب الایمان میں ابو امامہ[3] کی حدیث سے کی ہے۔ میں نے حضرت سے دریافت کیا، کیا یہ شخص صحابہ میں سے تھا اور کیا یہ قصہ درست ہے؟

حضرت نے فرمایا میں نے غور کیا ہے اور مجھے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ میں کوئی ایسا شخص نظر نہیں

---

[1] ابن مردویہ: ابوبکر احمد بن موسیٰ بن مردویہ اصفہانی صاحب تفسیر و تاریخ۔ انھوں نے مستخرج علی صحیح البخاری لکھی۔ ۳۲۳ھ / ۹۳۴ء میں پیدا ہوئے اور ۴۱۶ھ / ۱۰۲۵ء میں وفات پائی یہ بڑے عالم اور عمدہ تصانیف والے ہیں

[2] بیہقی: حافظ ابوبکر احمد بن حسین شافعی متوفی ۴۵۸ھ۔ ان کی شعب الایمان کا نام جامع المصنف ہے جس میں انھوں نے ایمان کو ستر سے زائد حصوں میں منقسم کیا ہے اور ادنیٰ ایمان لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ کہنا قرار دیا ہے۔

[3] ابو امامہ: ابو امامہ ۳ صحابیوں کی کنیت ہے ایک اسعد بن زرارہ خزرجی انصاری کی ہے عقبۂ اولیٰ اور ثانیہ میں موجود تھے ہجرت کے نو ماہ بعد انھوں نے وفات پائی اور دوسرے صحابی امامہ ریاس بن ثعلبہ ہیں۔ یہ بدر کی جنگ میں اس لیے شریک نہیں ہو سکے تھے کہ ان کی والدہ بیمار تھیں۔

تیسرے ابو امامہ باہلی جن کا نام صدی بن عجلان ہے انھوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے بہت سی احادیث روایت کی ہیں۔ یہ پہلے مصر میں رہے پھر حمص چلے گئے اور وہیں ۸۶ھ میں وفات پائی۔ یہ شام میں صحابہ میں آخری وفات پانے والے تھے یہاں یہی مراد ہیں (استیعاب: ۶۳۸)

آیا جس سے ایسا گناہ سرزد ہوا ہو اور نہ ہی مجھے اس حکایت کا کہیں وجود نظر آیا۔[1]

مؤلف کہتا ہے حافظ ابن حجر نے اپنی کتاب الاصابہ فی الصحابہ میں اس حکایت کے انکار کی طرف اشارہ کیا ہے اور لکھا ہے کہ یہ حکایت کسی ایسی سند سے مروی نہیں جس پر اعتبار کیا جائے کتاب مذکور میں ثعلبہ کے حال میں دیکھ لیں کیونکہ میں نے مفہوم ادا کیا ہے اور کتاب کا مطالعہ کیے مجھے کافی عرصہ گزر چکا ہے واللہ تعالیٰ اعلم۔

۱۳۱- وَاِذْ اَخَذَ رَبُّكَ مِنْۢ بَنِیْۤ اٰدَمَ مِنْ ظُهُوْرِهِمْ ذُرِّیَّتَهُمْ الآیۃ

(سورۂ اعراف آیت ۱۷۲)

میں نے حضرت سے اس آیت کے متعلق دریافت کیا وَاِذْ اَخَذَ رَبُّكَ مِنْۢ بَنِیْۤ اٰدَمَ مِنْ ظُهُوْرِهِمْ ذُرِّیَّتَهُمْ (اس وقت کو یاد کرو جب تمہارے پروردگار نے بنی آدم کی پیٹھوں سے ان کی اولادوں کو نکالا اور انہیں خود ان کی اپنی ذات پر گواہ بنا کر پوچھا کیا میں تمہارا پروردگار نہیں ہوں؟ کہا کیوں نہیں! اور ہم گواہ ہیں اور یہ اقرار اس لیے لیا کہ کہیں قیامت کے دن تم یہ نہ کہو کہ ہمیں تو اس کی خبر ہی نہیں تھی۔ یا یہ کہو کہ شرک تو ہم سے پہلے ہمارے باپ دادا نے کیا اور ہم ان کی اولاد تھے جو ان کے بعد آئے تو کیا آپ اس فعل میں ہمیں ہلاک کیے دیتے ہیں جو اہلِ باطل نے کیا؟)

میں نے عرض کیا کیا یہ واقعہ عالمِ ارواح میں پیش آیا یا اس وقت جب اللہ تعالیٰ نے آدم کو پیدا کیا؟ اور آپ کی اولاد کو آپ کی پشت میں سے نکالا اور اس میں عقل اور طاقتِ گویائی رکھ دی کہ انھوں نے یہ جواب دیا یا اس آیت میں جو کچھ فرمایا ہے استعارۃً فرمایا ہے کہ انسان کو دلائل کے ذریعہ اپنی وحدانیت کا علم اور عقل فرمانا گویا اقرار لینا ہے اور انسان کا عقل و فہم سے بہرہ یاب ہونا گویا ربوبیت کا گواہ بننا ہے؟

فرمایا: یہ قصہ عالمِ ارواح کا قصہ ہے اور جب اللہ نے انھیں اپنے نفسوں پر گواہ بنانا چاہا تو اسرافیل کو

---

[1] بغوی اور خازن (ج ۲ صفحہ ۱۷۰) نے آیت وَالَّذِیْنَ اتَّخَذُوْا مَسْجِدًا ضِرَارًا کے تحت منافقین کا ذکر کرتے ہوئے بارہ منافقوں کا ذکر کیا ہے جنھوں نے یہ مسجد ضرار تعمیر کی تھی ان منافقین میں ثعلبہ بن حاطب کا نام بھی دیا گیا ہے جس سے اشکال رفع ہو جاتا ہے کیونکہ جب ثعلبہ منافق ٹھہرا تو پھر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کی وفات کے بعد خلفا نے جو اس کی زکوٰۃ قبول نہیں کی تو اس کی وجہ ظاہر ہے بالخصوص جبکہ حضرت ابوبکر صدیقؓ نے مانعین زکوٰۃ سے جنگ بھی کی اور ثعلبہ سے زکوٰۃ قبول نہیں کی۔ اس کی وجہ بھی اس کا نفاق تھا۔ لہٰذا ثعلبہ صحابی نہ ہوا اس سے حضرت عبدالعزیز دباغ کے قول کی تائید ہوتی ہے۔

حکم دیا اس نے صور پھونکا جس سے ارواح میں سخت ہل چل مچ گئی جیسے حشر کے دن قبروں سے اُٹھتے وقت ہوگی بلکہ اس سے بھی زیادہ۔ پھر اللہ تعالیٰ نے پردہ دُور کر دیا اور انھیں اپنا کلامِ قدیم سنایا۔ اس وقت روحیں اپنے انوار کی قوت وضعف کے مطابق الگ الگ ہوگئیں۔ چنانچہ بعض روحوں نے محبت سے جواب دیا اور یہ مومنین کی ارواح تھیں اور بعض نے مجبوری کے عالم میں جواب دیا اور یہ کافروں کی ارواح تھیں۔ پھر محبّت سے جواب دینے والوں کے مراتب میں فرق تھا بعض کلامِ قدیم سنکر قوی وطاقت ور ہوگئے اور بعض ضعیف، اور بعض کلامِ قدیم سننے کی لذت پاکر خوشی سے جھومتے رہے اور بعض کے لیے اللہ نے اس کلام کو رحمت بنا دیا اور وہ اوروں کو مدد دینے لگا تاکہ اسے قوت آجائے۔ اس سے شیوخ و مریدین کے مراتب ظاہر ہوئے۔ اسی[1] دن روحوں میں باہم تعارف ہوا۔ اس کے بعد تمام ارواح پر کلامِ قدیم کی ہیبت چھاگئی اور وہ اپنی اپنی جگہ برزخ میں اُڑنے لگیں اور آرام لینے کی غرض سے زمین کی طرف اترنے لگیں۔ لہٰذا ان کے اترنے کے اعتبار سے زمین کی بھی تین قسمیں ہوگئیں۔

۱۔ وہ، جہاں گروہ در گروہ ہوکر صرف مومنین کی ارواح اُتریں۔

۲۔ وہ، جہاں صرف کفار کی روحیں اُتریں۔

۳۔ وہ، جہاں دونوں گروہوں کی روحیں اتریں۔

پہلی قسم جہاں صرف مومنین کی روحیں اتری تھیں وہ ایسے مقامات ہیں جہاں اہلِ ایمان واہلِ عرفان رہیں گے اور وہاں کوئی کافر کبھی بھی آباد نہ ہوگا۔ برعکس دوسری قسم کے کہ وہاں صرف کافر ہی رہیں گے اور تیسری قسم میں دونوں گروہ رہیں گے اور سب سے آخر اترنے والا وہی فریق ہوگا جس پر عالمِ ارواح میں نزول کا خاتمہ ہوا تھا۔ اگر آخر میں آنے والی سعادت مندوں کی روحیں ہوں گی تو اہلِ ایمان سے ختم کیا جائے گا اور اگر معاملہ برعکس ہوگا تو اس کے اُلٹ یعنی کفار کے نزول پر خاتمہ ہوگا اور بعض اوقات کسی مقام پر سعادتمندوں کی روحوں کے گروہ کا نزول ہوتا ہے پھر بد بخت لوگوں کی روحوں کے گروہ کا۔ پھر بدبختوں کی روحوں کا۔ اور سلسلہ اسی طرح چلا جاتا ہے کہ اترنا ختم ہو جاتا ہے۔

چنانچہ صاحبِ فتح جب کسی ایسے مقام کی طرف دیکھتا ہے جہاں آج کل مشرک بستے ہوں تو اسے علم ہو جاتا ہے کہ ان کے بعد اس مقام کو مومن آباد کریں گے یا نہیں۔ اس طرح کہ وہ روزِ اَلَستُ میں ارواح کے زمین کی طرف اترنے کو دیکھتا ہے اس کے بعد ان روحوں کی طرف دیکھتا ہے جو موجودہ

---

[1] جیسا کہ حدیث میں ہے کانت الارواح جنوداً مجنّدة فما تعارف منها ائتلف وما تناکر منها اختلف۔

گروہ کے بعد اتریں گی۔ اگر بعد میں اترنے والی روحیں بھی کافروں ہی کی روحیں ہوئیں تو وہ سمجھ جاتا ہے کہ یہاں مسلمان کبھی آباد نہ ہوں گے اور اگر اس گروہ کے بعد کچھ سعادتمند روحیں اتریں تو وہ سمجھ جاتا ہے کہ یہ مقام عنقریب دار اسلام بن جائے گا۔

حضرت نے فرمایا کہ اس کا علم دو اور طریقوں سے بھی ہو سکتا ہے۔ ایک یہ کہ وہ شرک کی زمین کی طرف دیکھتا ہے اگر اسے یہ معلوم ہو کہ وہاں اہلِ فتح اور اہلِ ولایت کی تعداد بڑھ رہی ہے تو وہ سمجھ جاتا ہے کہ یہ عنقریب دار اسلام بن جائے گا اور اگر دیکھنے کے بعد اسے معلوم ہو کہ اہلِ فتح یا اہلِ ولایت کا وہاں قطعاً وجود ہی نہیں پایا جاتا تو سمجھ جاتا ہے کہ اس بستی پر اللہ کا غضب ہے۔

میں نے عرض کیا کہ اگر مشرکوں کی زمین پر کسی کو فتح نصیب ہو جائے تو وہ کیا کرے؟

فرمایا رجالِ غیب اس کی مدد کریں گے اور وہ خود وہاں جاکر اسے علم ظاہر سکھائیں گے۔ اس لیے کہ اگر علم باطن کے ساتھ علم ظاہر نہ ہو تو شاذ و نادر ہی اس شخص کو فتح نصیب ہوتی ہے۔

ایک اور بار حضرت نے مجھے فرمایا کہ علم ظاہر کی مثال ایسی ہے جیسے کسی نے ننانوے ۹۹ سطریں آبِ زر سے لکھیں اور علم باطن ایسے جیسے کسی نے آخری سوویں سطر سیاہی سے لکھی۔ اس کے باوجود اگر یہ سیاہ سطر ان مذکورہ بالا سونے سے لکھی ہوئی سطروں کے ساتھ نہ ہو تو اسے کچھ فائدہ نہ ہوگا بلکہ ایسے علم والا آدمی شاذ و نادر ہی بچ سکتا ہے۔

ایک اور بار فرمایا کہ علمِ ظاہر کی مثال اس لالٹین کی ہے جو رات کو روشن ہو کیونکہ وہ رات کی تاریکی میں بہت کام آتی ہے اور علمِ باطن طلوع اور دوپہر کے وقت سورج کی روشنی کے پھیلنے کی طرح ہے۔ بعض اوقات اس قسم کے علم والا انسان کہہ اٹھتا ہے کہ اس لالٹین سے جو میرے پاس ہے کیا فائدہ مجھے اللہ تعالیٰ نے دن کو روشنی کے ساتھ اس سے مستغنی کر دیا ہے اس لیے وہ اس لالٹین کو بجھا دیتا ہے اور دن کی روشنی بھی اس سے جاتی رہتی ہے اور وہ رات کی تاریکیوں میں پھنس جاتا ہے لہٰذا اس کے دن کی روشنی کے قائم رہنے کی شرط یہی ہے کہ وہ لالٹین جو اس کے ہاتھ میں ہے نہ بجھے۔

حضرت نے فرمایا: بہت سے لوگ اسی دھوکہ میں پھسل گئے اور ان کے دن کی روشنی اس وقت تک واپس نہیں آسکتی جب تک وہ اس لالٹین کو لیکر دوبارہ روشن نہ کرے مگر اللہ تعالیٰ کسی کو توفیق بخشتا ہے کسی کو نہیں۔ دعا ہے کہ خدا ہمیں اس سے بچائے۔

اور دوسرا طریقہ یہ ہے کہ وہ مشرکین کی بستی کو دیکھے اگر اسے وہاں مسجدیں آباد اور غیبی طور پر وہاں جماعت ہوتی دکھائی دیتی ہو تو سمجھ جاتا ہے کہ وہ بستی عنقریب مسلمانوں کے قبضہ میں آجائے گی اور اگر یہ دکھائی نہ دے

تو سمجھا جاتا ہے کہ زمین کی قسمت میں تاریکی لکھی ہے۔

حضرت نے اس بارے میں کچھ حکایات بھی بیان کیں جنھیں ہم عنقریب بیان کریں گے، انشاء اللہ واللہ تعالیٰ اعلم۔

کیا انبیاء نبوت سے پہلے بھی معصوم ہوتے ہیں

میں نے حضرت سے یوسف علیہ السلام کے بھائیوں کے واقعہ کے متعلق دریافت کیا۔ اس سوال کی وجہ یہ تھی کہ مجھ سے کسی نے سوال کیا کہ کیا انبیاء نبوت سے پہلے بھی اسی طرح معصوم ہوتے ہیں جس طرح نبوت کے بعد اور کیا اس پر سب کا اتفاق ہے یا اختلاف پایا جاتا ہے اور کیا صغیرہ گناہ بھی جہاں تک عصمتِ انبیاء کا تعلق ہے کبیرہ گناہ کی طرح ہوتے ہیں یا نہیں۔

اگر آپ ہماری بات سمجھ گئے ہیں تو فرمایئے کہ ہمیں یوسف علیہ السلام کے بھائیوں کے متعلق کیا عقیدہ رکھنا چاہیئے؟ کیا وہ نبی ہیں یا نہیں۔ اگر نبی ہیں تو جو فعل ان سے سرزد ہوئے ان کا کیا جواب ہے، میں نے اس سوال کو اپنی نوٹ بک میں درج کر لیا اور اس کا جواب دینے کا ارادہ کر لیا۔ عصمتِ انبیاء کا جواب تو میں اسی طرح دیتا جس طرح علمِ کلام کے عالموں نے دیا ہے، مثلاً مصنف المواقف[1] نے اور یوسف علیہ السلام کے بھائیوں کے فعل کا جواب حافظ سیوطی کی کتاب دفع التعسف عن اخوۃ یوسف کی مدد سے دیتا اور میرا ارادہ تھا کہ جواب میں اسی کا خلاصہ دے دوں اس کے بعد حضرت نے میری نوٹ بک میں یہ سوال دیکھ لیا اور اپنے ہاتھ سے یہ جواب لکھا۔

الجواب واللہ الموفق للصواب: انبیاء علیہم السلام نبوت سے پہلے اور بعد بھی معصوم ہوتے ہیں اور جو فعل یوسف علیہ السلام کے بھائیوں سے صادر ہوا اس میں وہ دراصل باطنی طور پر مامور تھے اور حکم اللہ کی طرف سے تھا اور اس پر ان کو جو عتاب ہوا وہ ظاہر کے اعتبار سے ہوا۔ اس لیے کہ غیب ایک راز ہے جو اللہ کے پاس ہوتا ہے۔ والسلام۔ اس کا کاتب مبارک السلجماسی اللمطی ہے۔ آپ نے یہ جواب میری طرف اس لیے منسوب کیا کہ سوال مجھ سے کیا گیا تھا۔

حضرت نے فرمایا: اکثر عتاب جو انبیاء کو ہوئے اسی قسم کے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ باطن میں ایک کام کرنے کا حکم دیتا ہے، حالانکہ ظاہر میں ان کو اس کے خلاف کرنے کا حکم دیا گیا

---

[1] مواقف فی علم الکلام: یہ علامہ عضد الدین بن احمد الایجی القاضی کی تصنیف ہے جو انھوں نے سلطان محمد خدا بندہ کے وزیر غیاث الدین کے لیے لکھی۔ اس کتاب پر متعدد لوگوں نے شرحیں لکھیں، جن میں سب سے زیادہ مشہور سید شریف علی بن محمد جرجانی متوفی ۸۱۶ھ کی شرح ہے۔

ہوتا ہے تو بظاہر یہی ان کے گناہ ہوتے ہیں۔

میں نے عرض کیا یہ فعل اللہ کے باطنی حکم سے صادر ہوا پھر گناہ کیسا؟ اور عتاب کے کیا معنی؟ حالانکہ کرنے والے نے اللہ کے حکم سے یہ کام کیا ہے۔

حضرت نے فرمایا۔ یہ بات ٹھیک ہے لیکن جب ظاہر کو دیکھتا ہے اور اپنے آپ کو اس کے مخالف پاتا ہے تو اس کی نگاہ میں اسے وہ کام گناہ دکھائی دیتا ہے۔ کیونکہ اس کے نزدیک محض ظاہر کی مخالفت کا نام گناہ ہے۔

میں نے عرض کیا یہ تو ظاہر ہی ہے کہ وہ اسے گناہ خیال کرتا ہے، لیکن عتاب میں یہ بات ظاہر نہیں اس لیے کہ جس خدا نے اسے ظاہر کا حکم دیا ہے اسی نے باطن کا بھی حکم دیا ہے اور باطنی حکم کی حیثیت ظاہری حکم کو منسوخ کرنے یا اسے مخصوص کرنے والے حکم کی سی ہے۔ لہٰذا عتاب نہیں ہونا چاہیئے۔

فرمایا: وحی کا نزول انبیاء کے خواطر کا تابع ہوتا ہے لہٰذا جو خیال نبی کے دل پر وارد ہوگا اسی کے مطابق وحی نازل ہوگی۔ نبی کو جب اپنا فعل گناہ نظر آتا ہے تو وہ اپنے نفس کو اس پر عتاب کرتا ہے لہٰذا وحی بھی ویسی ہی نازل ہوتی ہے۔

حضرت نے فرمایا جو انبیا علیہم الصلوٰۃ والسلام کے خواطر کو معلوم کرنا چاہے تو اسے ان کتابوں کو دیکھنا چاہیئے جو ان پر نازل ہوئیں کیونکہ یہ ان کے خواطر کے مطابق نازل ہوئیں، چنانچہ جہاں کتاب میں نصیحت کی گئی ہے تو اس کا نزول اس وقت ہوا ہے جب نبی کے دل میں مخلوق کو نصیحت کرنے کا خیال آیا اور جب کتاب میں کوئی خوشخبری دی گئی ہے اس کا نزول اس وقت ہوا ہے جبکہ نبی کے دل پر انبساط اور منافع امت کی محبت تھی اور جہاں کتاب میں ڈرایا گیا ہے یا سخت وعید آیا ہے۔ اس کا نزول اس وقت ہوا ہے جس وقت نبی کے دل پر غصہ اور انقباض تھا، اسی سے تمہیں معلوم ہو جائے گا کہ عصمتِ انبیاء کا ثمرہ کیا ہے اور یہ کہ ان کے تمام خواطر اور خیالات جو انکے دل پر گزرتے ہیں حق اور خدا کی طرف سے ہوتے ہیں۔

۳۲۔ وَتَخْشَى النَّاسَ وَاللّٰهُ اَحَقُّ اَنْ تَخْشَاهُ (احزاب آیت ۳۷)

میں نے حضرت سے دریافت کیا کہ اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں وَتَخْشَى النَّاسَ وَاللّٰهُ اَحَقُّ اَنْ تَخْشَاهُ (اے محمدؐ تم لوگوں (کی باتوں) سے ڈرتے ہو حالانکہ تمہیں اللہ کی ناراضی سے زیادہ ڈرنا

چاہیئے ا میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو عتاب کیا ہے حالانکہ وہ سید العارفین اور امام الانبیاء و المرسلین ہیں۔

حضرت نے اس کا بھی وہی جواب دیا اور فرمایا کہ جب زید[1] نے آپ سے زینب[2] کو طلاق دینے کا مشورہ کیا تو آپ نے زید کو حکم دیا کہ زینب کو اپنے پاس رکھو اور اللہ سے ڈرو۔ حالانکہ آپ کو علم تھا کہ حضرت زینب ان کے نکاح میں آجائیں گی مگر آپ نے اسے چھپائے رکھا اور بعد میں آپ نے اپنے نفس کو عتاب کیا اور دل میں کہا "لوگوں سے ڈرتے ہو حالانکہ اللہ زیادہ مستحق ہے کہ اس سے ڈرو" چنانچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے باطن کے مطابق وحی کا نزول ہوا اور اللہ تعالیٰ نے اسی عتاب کے طرز میں آپ کا وارِدِ قلبی ظاہر فرمادیا۔

پھر فرمایا جسے اللہ تعالیٰ نے فتح عطا کی ہو وہ جب کسی آسمانی کتاب پر غور کرتا ہے تو اسے اس میں کلام قدیم کا نور اور وہ نور نظر آتا ہے جو نزولِ وحی کے وقت نبی کی طبعی حالت کا تھا اور نبی کبھی قبض کی حالت میں ہوتا ہے تو جو آیت اترتی ہے اس میں کلامِ قدیم کا نور اور اس قبض کا نور ہوتا ہے جو نزول وحی کے وقت نبی پر طاری تھا اور کبھی بسط کی حالت میں ہوتا ہے تو اس وقت جو آیت اترتی ہے اس میں کلام قدیم کا نور اور بسط کا نور بھی ہوتا ہے مگر پہلا نور قدیم اور دوسرا نور حادث ہے اور کبھی نبی تواضع کی حالت میں ہوتا ہے تو اس وقت جو وحی نازل ہو گی اس میں کلام قدیم کا نور اور تواضع کا نور ہو گا۔ اسی طرح ہر آیت میں طبیعتِ نبوی کا کوئی نہ کوئی جزو ضرور ہو گا یہی حال آیت وَتَخْشَى النَّاسَ وَاللّٰهُ اَحَقُّ اَنْ تَخْشَاهُ کا ہے کہ اس میں کلام قدیم کا نور اور اس کے نزول کے وقت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی طبیعت کا نور ہے اور یہی عتاب کا نور ہے لہٰذا کلام قدیم اللہ کی طرف سے امت کی طرف آیا اور عتاب خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے ہے، خدا کی طرف سے نہیں۔

---

[1] زید: زید بن حارثہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے متبنیٰ اور آزاد کردہ غلام تھے جن سے حضرت زینب کی پہلی شادی ہوئی تھی۔

[2] زینب: زینب بنت جحش یہ امہات المومنین میں سے تھیں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے ۳ھ یا ۵ھ میں شادی کی۔ یہ پہلے زید بن حارثہ کے عقد میں تھیں۔ ان کے طلاق دینے پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے عقد میں آگئیں۔ ان کی وفات ۲۰ھ ؍ ۶۴۰ء میں ہوئی۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد امہات المومنین میں سب سے پہلے ان کی وفات ہوئی۔

حضرت نے فرمایا: جب اہلِ فتح آپس میں کسی آیت کی تفسیر کرتے ہیں تو اُن کا زیادہ تر اہتمام اسباب نزول کے ساتھ ہوتا ہے۔ اسبابِ نزول سے مراد وہ اسباب نہیں جو ظاہری علم میں پائے جاتے ہیں، بلکہ وہ احوال و انوار مراد ہوتے ہیں جو آیت کے نزول کے وقت ذاتِ نبی پر وارد ہوئے ہوتے ہیں لہٰذا ان اصحابِ فتح سے وہ وہ باتیں سننے میں آتی ہیں جن کی کیفیت بیان نہیں کی جا سکتی۔ اس لیے کہ وہ ان سمندروں میں بھی غوطہ زن ہوتے ہیں جو آنحضرت کے باطن میں ہوتے ہیں یعنی آدمیتؐ، قبضؐ، بسطؐ، نبوتؐ، روحؐ، رسالتؐ اور علمِ کامل جن کا ذکر حدیث اِنَّ ھٰذَا الْقُرْاٰنَ اُنْزِلَ عَلٰی سَبْعَةِ اَحْرُفٍ کی تشریح میں ہو چکا۔

۳۲- عَفَا اللّٰهُ عَنْكَ لِمَ اَذِنْتَ لَهُمْ حَتّٰى يَتَبَيَّنَ لَكَ الَّذِيْنَ صَدَقُوْا وَتَعْلَمَ الْكٰذِبِيْنَ (سورہ توبہ۔ آیت ۴۳)

میں نے حضرت سے آیت عَفَا اللّٰهُ عَنْكَ لِمَ اَذِنْتَ لَهُمْ حَتّٰى يَتَبَيَّنَ لَكَ الَّذِيْنَ صَدَقُوْا وَتَعْلَمَ الْكٰذِبِيْنَ۔ (خدا آپ کو معاف کرے آپ نے انہیں کیوں اجازت دے دی (آپ کو اجازت نہ دینا چاہیے تھا، تاکہ سچے اور جھوٹے کا آپ کو پتہ چل جاتا)

حضرت نے اس کا جواب بھی قریب قریب وہی دیا اور فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم دیا کہ وہ معاف کریں، اچھی طرح سے درگزر کریں اور لوگوں سے معاشرت اور مدافعت باحسن طریق کریں۔ یہاں تک کہ یہ بھی فرما دیا: وَلَوْ كُنْتَ فَظًّا غَلِيْظَ الْقَلْبِ لَانْفَضُّوْا مِنْ حَوْلِكَ فَاعْفُ عَنْهُمْ وَاسْتَغْفِرْ لَهُمْ وَشَاوِرْهُمْ فِي الْاَمْرِ (سورۂ آلِ عمران آیت: ۱۵۹) (اے محمد اگر آپ بد اخلاق اور سنگ دل ہوتے تو یہ لوگ آپ کے پاس سے بھاگ گئے ہوتے لہٰذا آپ انہیں معاف کرتے رہیں۔ ان کے لیے مغفرت کی دعا کرتے رہیں اور ان سے معاملات میں مشورہ لیا کریں) چنانچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی لوگوں سے یہی عادت رہی۔ لہٰذا جب منافقین آپ کے پاس سفر میں نہ نکلنے کی اجازت چاہنے کے لیے آئے اور انھوں نے اپنا عذر پیش کیا تو باوجودیکہ آپ کو ان کی منافقت کا علم تھا اس رحمت کی وجہ سے جو آپ کی ذات میں پائی جاتی تھی اور اس لیے بھی کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو ان سے احسن طریق پر معاشرت کرنے کا حکم کئی آیات میں دیا تھا آپ نے ان کو مدینہ رہنے کی اجازت دے دی اور ان کے ساتھ ظاہری مسلک اختیار کیا، لیکن اس کے بعد آپ کے دل میں خیال آیا کہ ایسی آیت نازل ہو جو ان کا کھوٹ ظاہر کر دے۔ آپ نے ان کا کھوٹ اس لیے ظاہر نہیں کیا کہ آپ میں رحمت کا مادہ پایا جاتا تھا اور اس لیے بھی کہ اللہ تعالیٰ کا حکم فَاعْفُ عَنْهُمْ کہ ان سے درگزر کرو مدِّنظر تھا۔ اس لیے اس

اس حیا کی وجہ سے جو آپ میں پایا جاتا تھا جیسے آیت اِنَّ ذٰلِکُمْ کَانَ یُؤْذِی النَّبِیَّ فَیَسْتَحْیٖ مِنْکُمْ وَاللہُ لَا یَسْتَحْیٖ مِنَ الْحَقِّ (اس بات سے رسول کو تکلیف ہوتی ہے لیکن وہ تمہیں شرم کے مارے نہیں کہتے، لیکن اللہ حق بات کہنے سے نہیں شرماتا (سورۂ احزاب آیت ۵۳) میں تو آپ کے دل میں خیال پیدا ہوا کہ ان کی رسوائی ہو تو اللہ کی طرف سے ہو اس لیے آپ نے چاہا کہ جو آیت نازل ہو وہ اس طرز پر نازل ہو کہ خود آپ کو عتاب کیا جا رہا ہے تاکہ اس میں تہمت کا شائبہ نہ ہو اور اس میں خالص خیر خواہی بھی پائی جائے اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے دوبارہ منافقت کرنے سے زور دار تنبیہ بھی کر دی جائے، اس لیے کہ اللہ ہی تو منافقوں کے خلاف آپ کے ضامن جھگڑنے والے اور دلیل پیش کرنے والے ہیں اسی لیے اس عتاب کی صورت میں کئی مصلحتیں مضمر تھیں ورنہ درحقیقت کوئی عتاب نہ تھا۔ صرف بات اتنی تھی کہ اس جھگڑے میں حبیب اپنے محبوب کی طرف سے نیابت کر رہا ہے۔

آنحضرت صلعم کو منافقین کا علم تھا

حضرت نے فرمایا ایسا خیال نہ رکھنا چاہیے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو عذر پیش کرنے والوں میں سے سچے اور جھوٹے کا علم نہ تھا۔ آپ پر یہ بات کیسے چھپی رہ سکتی تھی جب کہ اس زمانہ میں بھی صاحب فتح آدمی کو اس زمانہ کے سچے اور جھوٹے لوگوں کا علم ہے اور تمام اہل فتح کا اس بات پر اتفاق ہے کہ جو کچھ انہیں حاصل ہوا ہے وہ صرف آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت کی بدولت حاصل ہوا ہے چنانچہ انہیں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے نور میں سے صرف بال برابر نور عطا کیا گیا ہے۔ اِنَّ ھٰذَا الْقُرْآنُ اُنْزِلَ عَلٰی سَبْعَۃِ اَحْرُفٍ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے علم کی کیفیت بیان کی جا چکی ہے۔

مؤلف کہتا ہے جن لوگوں نے مفسّرین کے کلام پر غور کیا ہے انہیں معلوم ہو جائے گا کہ اس آیت کے متعلق حضرت کا بیان نہایت ہی عمدہ ہے چنانچہ بیضاوی، خدا انہیں اور ہمیں بھی معاف کرے لکھتے ہیں: عَفَا اللہُ عَنْكَ اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے منافقین کو اجازت دے کر غلطی کی کیونکہ معافی ہمیشہ غلطی کے بعد ہوتی ہے۔

شیخ الاسلام زکریا[1] بیضاوی کے حاشیہ میں لکھتے ہیں کہ بیضاوی نے زمخشری[2] کی پیروی کی ہے اور

---

[1] شیخ الاسلام زکریا: شیخ الاسلام قاضی زین الدین زکریا بن محمد انصاری: ان کا ذکر پہلے آ چکا ہے۔ شیخ الاسلام زکریا انصاری فقہ اور طریقت دونوں کے رکن تھے ان کی بہت سی تصانیف ہیں انھوں نے بھی بخاری

(بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر)

زمحشری کے متعلق علامہ طیبی[3] لکھتے ہیں زمحشری نے اس عبارت میں بڑی فحش غلطی کھائی ہے میں حیران ہوں کہ لطائف معانی کے نکالنے میں شہرۂ آفاق ہوتے ہوتے ان سے کیسے بھول ہو گئی کہ اس قسم کے اشاروں میں یعنی عفو کا لفظ پہلے لانے میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ مخاطب واجب تعظیم ہستی ہے حقیقت بھی یہی ہے اس لیے کہ اس قسم کے خطاب سے یہ لازم نہیں آتا کہ پہلے گناہ سرزد ہو چکا ہے بلکہ اس لفظ عفو کا شروع میں لانا تعظیم پر دلالت کرتا ہے۔ جیسے تو کسی ایسے آدمی سے کہے جس کی تو تعظیم کرتا ہے "خدا آپکو معاف کرے آپ نے میرے معاملہ میں کیا کیا" اور "خدا آپ سے راضی ہو میری بات کا کیا جواب ہے" اسی لیے تو تفتازانی[4] لکھتے ہیں زمحشری کے لیے مناسب نہ تھا کہ ایسی بُری عبارت سے مضمون ادا کرتے جبکہ دیکھ رہے ہیں کہ حق تعالیٰ نے اپنے رسول کے احترام کا کتنا لحاظ رکھا کہ عفو کو پہلے ذکر کیا اور پھر اذن کا ذکر کیا جو آپ کے بلند مرتبہ اور قوت تصرف کی خبر دے رہا ہے اور کلام استفہام کی صورت میں لایا گیا۔ اگرچہ مقصد یہی ہے کہ اجازت نہ دینی چاہیئے تھی۔ مزید براں بعض اوقات عفا اللہ عنہ کا محاورہ اولیٰ

(بقیہ حاشیہ صفحہ سابقہ)

کی شرح کی ہے ۹۲۶ھ ۱۵۱۹ء میں ان کی وفات ہوئی یہ بڑے زاہد و عابد تھے۔ کشف الظنون میں ان کی تاریخ وفات ایک جگہ [illegible]ھ دی ہے مگر دوسری جگہ ۹۲۶ھ دی ہے۔

[2] زمحشری ابوالقاسم محمود بن عمر زمحشری جو جار اللہ کے لقب سے مشہور ہیں فقیہ، نحوی اور لغت دان تھے ان کی بہت سی تصانیف ہیں جن میں ایک قرآن مجید کی تفسیر میں ہے جس کا نام الکشاف ہے ان کی پیدائش زمحشر میں ۴۶۷ھ ۱۰۷۴ء میں ہوئی اور وفات ۵۳۸ھ ۱۱۴۳ء میں ہوئی۔

[3] طیبی: شرف الدین حسن بن محمد طیبی عراقی جنہوں نے کشاف پر حاشیہ لکھا، انھوں نے الفاظ میں زمحشری ہی کا تتبع کیا ہے مگر ساتھ ساتھ مذہب معتزلہ کی زبردست دلائل سے تردید کرتے گئے ہیں اور ثابت کر کے دکھایا ہے کہ بلاغت قرآن کو اہلسنت نے ہی سمجھا ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ فاضل مصنف نے تحقیق کا حق ادا کیا ہے پھر فن بلاغت کی نایاب بحثیں بھی اس میں شامل ہیں اس حاشیہ کا نام فتوح الغیب فی الکشف عن قناع الریب رکھا ہے انکی وفات ۷۴۳ھ ۱۳۴۲ء میں ہوئی۔ فتوح الغیب چھ ضخیم جلدوں میں ہے مصنف کہتے ہیں کہ حاشیہ لکھنے سے پہلے میں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو خواب میں دیکھا کہ مجھے دودھ کا پیالہ پکڑا یا ہے اور مجھے پینے کو کہا، چنانچہ میں نے کچھ پیا۔ پھر آنحضرت کی خدمت میں پیش کیا اور انھوں نے بھی پیا (کشف الظنون: ۲: ۱۴۷)

[4] تفتازانی: متوفی ۷۹۱ھ ۱۳۸۹ء علامہ سعدالدین مسعود بن عمر التفتازانی۔ انھوں نے کشاف پر حاشیہ لکھا ہے مگر یہ اسے مکمل نہیں کر سکے۔

در افضل ہے چھوڑنے پر بھی کہہ دیتے ہیں بلکہ کبھی تعظیم و تکریم کی غرض سے بھی کہہ دیتے ہیں۔ مثلاً کہیں اللہ آپ کو معاف کرے میرے معاملہ میں آپ نے کیا کیا۔

نیز علامہ سیوطی نے بیضاوی کے حاشیہ میں لکھا ہے کہ بیضاوی نے اس بُری عبارت کے لکھنے میں حالانکہ صاحب انتصاف[1] کہتا ہے کہ دو باتوں میں سے ایک بات ضرور ہے، یا تو یہ معنی جو بیضاوی نے بیان کیے مراد نہیں ہیں۔ تو یہ اس کی غلطی ہے یا یہی معنی مراد ہوں گے، لیکن اللہ تعالیٰ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تعظیم اور آپ کی قدر کو بلند رکھتے ہوئے کنایہ کا استعمال کیا مگر بیضاوی نے کھلے الفاظ میں اس کا اظہار کر دیا۔ بیضاوی نے بالخصوص آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں آداب خداوندی کا لحاظ کیوں نہ رکھا اس کے بعد انتصاف کے مصنف نے طیبی اور تفتازانی کی عبارت نقل کی ہے اور پھر لکھا ہے کہ قاضی عیاض شفاء میں لکھتے ہیں عفا اللہ عنك کا محاورہ کلام شروع کرنے کے لیے آتا ہے جس طرح کہتے ہیں اَصْلَحَكَ اللّٰہ وَ اَعَزَّكَ اللّٰہ۔

صدر حسن بن محمد بن صالح نابلسی نے اس موضوع پر زمخشری کے رد میں ایک کتاب لکھی ہے، جس کا نام جَنَّةُ النَّاظِر وَجُنَّةُ الْمُنَاظِرِ فِي الانتصار لابی القاسم الطّاهر ہے۔ اسی نکتہ اور اس قسم کے دیگر نکات کی وجہ سے دین دار اور پرہیزگار لوگوں نے کشاف کے مطالعہ اور تدریس سے منع کیا ہے۔ تقی الدین سبکی[2] نے اسی غرض سے ایک کتاب لکھی ہے جس کا نام سَبَبُ الِانْكِفَافِ عَنْ اِقْرَاءِ الْكَشَّاف رکھا ہے۔ اس کا مطالعہ اسی حاشیہ میں کر لیں کیونکہ مصنف حاشیہ نے اس رسالہ کو پورے کا پورا نقل کر دیا ہے۔ واللہ تعالیٰ اعلم۔

۳۴۔ وَمَا كُنَّا مُعَذِّبِيْنَ حَتّٰى نَبْعَثَ رَسُوْلًا (سورۂ بنی اسرائیل آیت ۱۵)

میں نے حضرت سے دریافت کیا کہ آیت وَمَا كُنَّا مُعَذِّبِيْنَ حَتّٰى نَبْعَثَ رَسُوْلًا (جب تک رسول نہ بھیج لیں، ہم عذاب نہیں کرتے) میں جس عذاب کی نفی کی گئی ہے اس سے کیا مراد ہے۔ کیا دنیا کا عذاب یا

---

[1] انتصاف: یہ امام ناصر الدین احمد بن محمد بن المنیر اسکندری کی تصنیف ہے اس میں انھوں نے تفسیر کشاف میں جسقدر معتزلی خیالات ہیں ان کا ذکر اور رد کیا ہے۔ ان کی وفات ۶۸۳ھ ۱۲۸۴ء میں ہوئی۔

[2] تقی الدین سبکی: شیخ تقی الدین علی بن عبدالکافی سبکی۔ ان سے ذہبی نے حدیث سنی، ذہبی نے انہیں فخر الحفاظ لکھا ہے ان کی متعدد تصانیف ہیں۔ ان کی پیدائش ۶۸۳ھ ۱۲۸۴ء میں ہوئی اور وفات ۷۵۶ھ ۱۳۵۵ء میں۔

آخرت کا؟ اور کیا بلوغِ دعوت شرط ہے جیسا کہ اس آیت سے معلوم ہوتا ہے یا شرط نہیں ہے جیسا کہ ان احادیث سے پتہ چلتا ہے جن میں پاگل وغیرہ کا ذکر ہے جو بات نہیں سمجھ سکتے اس لیے کہ قیامت کے دن اسے امتحان کی غرض سے دوزخ کی آگ میں داخل ہونے کا حکم دیا جائے گا۔ اگر اس نے مان لیا تو جنت میں جائیگا اور اگر نہ مانا تو دوزخ میں جائے گا۔

حضرت نے فرمایا: اس عذاب کے لیے جو دنیا میں واقع ہو مثلاً خسف ورجم وغیرہ جو ان پہلی امتوں کو دیا گیا بلوغ دعوت شرط ہے لہٰذا اللہ تعالیٰ کا فرمان وَمَا كُنَّا مُعَذِّبِينَ حَتَّىٰ نَبْعَثَ رَسُولًا یعنی ہم کسی امت کو خسف وغیرہ سے عذاب نہیں کرنے کے جب تک ان کے پاس رسول نہ آجائے اور اللہ کی حجت ان پر قائم نہ ہو جائے، لیکن آخرت کے عذاب کے لیے بعثت رسول شرط نہیں اگر ایسا ہوتا تو یاجوج اور ماجوج میں سے ایک بھی دوزخ میں نہ جاتا حالانکہ دوزخ میں جانے والوں میں بڑی تعداد انہی کی ہوگی،

میں نے کہا ایک حدیث میں آیا ہے کہ شبِ معراج آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ان پر گذر ہوا اور آپ نے ان کو خدا کی عبادت کی دعوت دی مگر انھوں نے انکار کیا اسی لیے وہ دیگر عاصی لوگوں کے ساتھ دوزخ میں جائیں گے۔

حضرت نے فرمایا: ایسا کوئی واقعہ نہیں ہوا۔

مؤلف کہتا ہے کہ حفاظ حدیث کی بھی یہی رائے ہے کہ حدیث مذکور کی سند میں نوح[1] بن ابی مریم ابوعصمہ ضبی آیا ہے جو جھوٹی حدیثوں کے بنانے میں مشہور ہے۔ چنانچہ اس بارہ میں ابن[2] حبان فرماتے ہیں "اس میں سچائی کے سوا ہر چیز پائی جاتی ہے۔"

---

[1] نوح بن ابی مریم ابو عصمۃ الضبی: نوح بن ابی مریم: ابو مریم کا نام مابنہ ہے۔ نوح مرو کے قاضی تھے اور نوحِ جامع کے نام سے مشہور ہیں۔ عباس بن مصعب کہتے ہیں کہ ان کا باپ مجوسی تھا۔ انہیں جامع اس لیے کہا گیا کہ انھوں نے فقہ ابوحنیفہ اور ابن ابی لیلی سے پڑھی اور حدیث حجاج بن ارطاۃ اور دارقطنی سے۔ ابن حجر لکھتے ہیں کہ یہ متروک الحدیث ہیں بخاری نے انہیں ذاہب الحدیث کہا ہے، نسائی کہتے ہیں یہ ثقہ نہیں۔ حاکم کہتے ہیں کہ اس نے فضائل قرآن کی حدیث وضع کی، مزید تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو (تہذیب التہذیب ج ۱۰ ص ۴۸۶ تا ص ۴۸۸

[2] ابن حبان: ابوحاتم محمد بن حبان بن احمد بن حبان۔ ان کی متعدد تصانیف ہیں۔ انھوں نے حسین بن ادریس ہروی، ابو خلیفہ جمحی وغیرہ سے حدیث سنی اور ان سے حاکم منصور بن عبداللہ خالدی وغیرہ نے۔ مدت تک سمرقند کے قاضی رہے فقیہ، حافظ حدیث، طب اور نجوم اور دیگر علوم کے عالم تھے ان کی تصانیف میں مسند صحیح، کتاب الضعفاء وغیرہ ہیں۔ انھوں نے ۳۵۴ھ و ۹۶۵ء میں وفات پائی۔

مولف کہتا ہے کہ پاگل وغیرہ کے بارے میں جو احادیث آئی ہیں ان کا ذکر کرکے میں کلام کو لمبا نہیں کرنا چاہتا اور نہ ہی جو کچھ مفسرین نے اس آیت کی تفسیر میں لکھا ہے اس کا ذکر کرنا چاہتا ہوں اور نہ علمِ اصول کے ماہرین کے اقوال نقل کرنا چاہتا ہوں کیونکہ میرا مقصد تو حضرت کا کلام جمع کرنے سے ہے۔ اگر لوگوں میں جہالت عام نہ ہوتی تو میں صرف انہی کے اقوال پر اکتفا کرتا اور ان احادیث وغیرہ کا ذکر نہ کرتا جو ہماری غرض پر دلالت کرتی ہیں۔ واللہ تعالیٰ اعلم۔

۳۵۔ وَمَا صَاحِبُكُمْ بِمَجْنُونٍ (سورۃ تکویر پارہ ۳۰ آیت ۲۲)

میں نے حضرت سے دریافت کیا کیا وجہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی شان اللہ تعالیٰ نے یوں ظاہر فرمائی وَمَا صَاحِبُكُمْ بِمَجْنُونٍ (تمہارا رفیق دیوانہ نہیں) اور حضرت جبرئیل کے متعلق یوں کہا "رَسُولٍ كَرِيمٍ مُطَاعٍ ثَمَّ أَمِينٍ" (یہ اللہ کے سفیر ہیں، عالی مقام ہیں، وہاں سردار ہیں اور امین ہیں)۔

حضرت نے فرمایا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر قرآن نورِ حق سے نازل ہوتا ہے اور جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اس کی تعبیر کرنے لگتے ہیں تو اس کی عبارت اس حالت کو اخذ کرتی ہے جو اس وقت آپ پر غالب ہوتی ہے اور یہ حالت کبھی تواضع کی حالت ہوتی ہے کبھی اور کوئی حالت اور اس وقت آپ پر تواضع کی شان کا غلبہ تھا کہ جبرئیلؑ کو بڑا سمجھا اور اپنے آپ کو چھوٹا۔

ایک اور بار حضرت نے ارشاد فرمایا کہ وَمَا صَاحِبُكُمْ بِمَجْنُونٍ ماقبل کو ثابت کرنے اور ان اوصاف کی صحت بیان کرنے کے لیے آیا جو جبرئیلؑ کی طرف منسوب کئے گئے ہیں گویا کہ یوں کہا گیا کہ جبرئیلؑ کے متعلق جو کچھ ہم نے بیان کیا ہے اس کی خبر تم کو وہ رسول دے رہا ہے جس کی سچائی امانت اور یہ کہ وہ جو کچھ وہ کہتا ہے سمجھ کر کہتا ہے سب تم کو معلوم ہے اور جب خبر دینے والا ایسا ہو اور وہ بات کرتے وقت دیوانہ بھی نہ ہو تو اس کی خبر یقیناً قابلِ وثوق ہوگی لہٰذا وَمَا صَاحِبُكُم بمجنون کہنے سے ماقبل کو مخاطبین کی عقل میں بٹھانا مقصود ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی حالت بیان کرنا مقصود نہیں لہٰذا یہ اعتراض نہیں ہو سکتا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تعریف میں تو صفت سلبیہ پر اکتفا کیا اور جبرئیلؑ کی تعریف میں بڑے بڑے وصف بیان کئے۔ واللہ تعالیٰ اعلم۔

❁

۳۶- وَمَا يَكُونُ لَنَا أَنْ نَعُودَ فِيهَا إِلَّا أَنْ يَشَاءَ اللّٰهُ رَبُّنَا

(سورۃ اعراف آیت ۸۹)

میں نے حضرت سے اللہ تعالیٰ کے فرمان وَمَا يَكُونُ لَنَا أَنْ نَعُودَ فِيهَا إِلَّا أَنْ يَشَاءَ اللّٰهُ رَبُّنَا (ہم تو اس مذہب میں واپس آنے کے نہیں مگر یہ کہ ہمارا رب چاہے) کے متعلق دریافت کیا حضرت شعیب علیہ السلام نے یہ کیسا استثناء کیا ہے کیونکہ اس جگہ استثناء سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ انہیں اپنی ایمان والی حالت پر شک تھا اور وہ اس پر ثابت قدم نہ تھے۔

حضرت نے فرمایا: کہ یہ استثنا صرف اللہ کی طرف رجوع کرنے کے لیے ہے اور یہی خالص ایمان ہے۔ اس لیے کہ اہل فتح بالخصوص انبیاء و رسل دیکھتے ہیں کہ ان میں اللہ ہی کا فعل کام کر رہا ہے اور یہ کہ ان میں ذاتی طور پر نہ کسی کام کرنے کی طاقت ہے نہ باز رہنے کی اور جو فعل بھی ان سے سرزد ہوتا ہے وہ اللہ ہی کی طرف سے ہوتا ہے پس ایسی حالت والا شخص اگر کسی فعل کو اللہ کی مشیت پر چھوڑے تو سمجھو کہ وہ بحر عرفان میں غرق ہو چکا ہے اور اس نے ایمان کا بلند ترین درجہ پیش کیا ہے۔ واللہ تعالیٰ اعلم۔

ے حضرت شعیب علیہ السلام کے استثناء کی ایک وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ انھوں نے کمالِ اطاعت کا ثبوت دیتے ہوتے یوں کہہ دیا کہ ہاں اگر اللہ چاہے اور مجھے اس کا حکم دے تو کرنے کو تیار ہوں جس طرح ملائکہ کو حکم ہوا کہ آدم کو سجدہ کرو مگر ابلیس نے اطاعت نہ کی حضرت شیخ عبدالعزیز کا جواب اہلِ فتح کا جواب ہے لیکن اہل ظاہر کے لیے [illegible] دیک بہترین جواب یہ ہے کہ یہاں استثناء تعلیق بالمحال کے طرز پر آیا ہے

وحتی یئوب القارظان کلاھما ۔۔۔ ویُنشَرَ فِی الْقَتْلٰی کُلَیْبٌ لِوَائِل

اسی طرح حضرت شعیب نے فرمایا کہ ہم تو تمہاری ملت میں واپس آنے کے نہیں جب تک اللہ نہ چاہے مگر اللہ تعالیٰ تو یہ چاہ نہیں سکتے کہ ہم بتوں کے سامنے سر جھکائیں لہٰذا ہم بھی تمہاری ملت میں نہیں آ سکتے۔ عربی زبان میں تعلیق بالمحال کی بہت سی مثالیں ملتی ہیں چنانچہ ایک اور شاعر کہتا ہے:

فَرَجِّي الْخَيْرَ وَانْتَظِرِي إِيَابِي ۔۔۔ إِذَا مَا الْقَارِظُ الْعَنَزِيُّ آبَا

(باپ بیٹی سے کہتا ہے) کہ میرے آنے کا اس وقت تک انتظار کر جس وقت تک قبیلہ عنزہ کا قرظ کے پتے

(بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر)

۳۷۔ وَالنَّجْمِ اِذَا هَوٰى مَا ضَلَّ صَاحِبُكُمْ وَمَا غَوٰى

(سورۂ نجم)

میں نے حضرت سے سوال کیا کہ آیت وَالنَّجْمِ اِذَا هَوٰى مَا ضَلَّ صَاحِبُكُمْ وَمَا غَوٰى (قسم ہے ستارہ (ثریا) کی جب وہ اترے کہ تمہارے رفیق محمد صلی اللہ علیہ وسلم نہ راستہ بھولے ہیں نہ بھٹکے ہیں) میں اللہ اور نورِ رسالت میں کیا مناسبت ہے جس کی بنا پر یہ قسم کھائی گئی۔

فرمایا ستارہ کی قسم محض اس کے جماد ہونے کی وجہ سے نہیں کھائی گئی بلکہ اس نورِ حق کی وجہ سے کھائی گئی ہے جو اس میں پایا جاتا ہے اور جو نورِ حق اس میں ہے وہ ایسا نور ہے جس سے خشکی اور سمندر کی تاریکیوں میں رہنمائی ہوتی ہے۔ اس کے بعد آپ نے ایک مثال بیان کر کے اس کی وضاحت کی اور فرمایا فرض کرو کہ دو آدمی سفر کے لیے نکلے ہوں اور راستہ بھول گئے ہوں، نہ ساتھی ساتھ رہا اور نہ زادِ راہ حتیٰ کہ دونوں کو ہلاکت کا یقین ہو گیا ہو اور نجات اور خلاصی سے مایوس ہو گئے ہوں، لیکن ان میں سے ایک کو اس ستارہ (ثریا) کا علم ہو جس کے ذریعہ سے مسافر اپنے سفر کی راہ دریافت کر لیتا ہے چنانچہ وہ اس کی تلاش میں رہا ہو اور جب رات ہوئی وہ اس کے پیچھے ہو لیا ہو، یہاں تک کہ وہ منزلِ مقصود تک پہنچ گیا ہو اور اللہ نے اسے بچا لیا ہو۔

لیکن دوسرے کو ستارہ کا علم نہیں ہے، نہ ہی اس بات کا علم ہے کہ ستارہ کے ذریعہ سے راہ کیسے پاتے ہیں اور نہ ہی اس نے اپنے ساتھی کی پیروی کی لہٰذا وہ گمراہی کی وادیوں میں بھٹکتا پھرے گا اور آخر مر جائے گا اور مرنے کے بعد اس گرمی و سردی کے باعث جو اس پر گزرے گی وہ چنے کے دانے کی طرح ہو جائے گا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ لوگوں کا بھی یہی حال ہے چنانچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ان دونوں شخصوں کے درمیان ہیں، ایک گروہ آپ پر ایمان لے آیا اور اس نے آپ کی تصدیق اور تابعداری کی اور جنتِ نعیم اور اللہ تعالیٰ کی ان عنایات میں پہنچ گئے جن کا بیان

(بقیہ حاشیہ صفحہ سابقہ)

جھاڑنے والا واپس آئے (مگر وہ تو مر چکا ہے اس لیے میری واپسی کی بھی امید نہ رکھنا) اسی طرح ایک اور ضرب المثل۔ حَتّٰى يَرْجِعَ مُصْقَلَةُ مِنْ طبرستان۔ یہاں تک کہ مصقلہ طبرستان سے واپس آئے مگر مصقلہ طبرستان میں ایک جنگ میں مارا گیا تھا اس لیے وہ تو واپس آ نہیں سکتا لہٰذا میں بھی واپس نہ آؤں گا میرے نزدیک اہلِ ظاہر کے لیے یہی تشریح بہتر ہے ۱۲۔

نہیں ہو سکتا جس طرح پہلا شخص اس جگہ پہنچ گیا جہاں خوراک اور ساتھی موجود ہیں اور نعمتیں اور وسیع سایہ پاکر اپنی مراد اور حاجت پال اور ایک فریق نے آپ کی تکذیب کی لہٰذا وہ اللہ کی ناراضگی میں رہے یہاں تک کہ مر گئے اور جہنم نے انہیں اپنی گرمی اور زمہریر سے جلا دیا۔ جس طرح دوسرے شخص کے جسم کو گرمی اور سردی نے جلایا۔ لہٰذا ستارہ اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم میں مشابہت پائی گئی اور درحقیقت تو اللہ تعالیٰ نے نورِ حق کے ایک ایسے فرد کی قسم کھا کر جسے وہ جانتے ہیں اس فرد کو محقق کرنا چاہا ہے جسے وہ نہیں جانتے۔

پھر میں نے عرض کیا کہ اِذَا هَوٰی سے کیا مراد ہے؟

فرمایا کہ اِذَا هَوٰی کے معنی ہیں کہ آسمان کے وسط سے ہٹ جاتے اس لیے کہ جب ثریا آسمان کے وسط میں ہوتا ہے تو اس سے راستہ معلوم نہیں ہو سکتا کیونکہ اس وقت وہ ٹھہرا ہوتا ہے اور کسی جہت میں جھکا نہیں ہوتا اس لیے اس سے راستہ کا پتہ بھی نہیں چل سکتا۔ واللہ اعلم۔

مؤلف کہتا ہے کہ اس آیت کے متعلق مفسرین نے بہت کچھ کہا ہے جن کا ذکر نجم الدین غیطی نے الاسرار المعراج کے متعلق اپنی تالیف میں بالاستیعاب کیا ہے۔ یہ بڑی قابل قدر کتاب ہے اگر آپ اسے پڑھ لیں تو آپ کو فرمودۂ حضرت کی قدر معلوم ہو جائے گی۔ اگر طوالت اور موضوع سے خارج ہونے کا ڈر نہ ہوتا تو ہم ان سب کا ذکر کرتے۔ واللہ اعلم

الصمد

مَیں نے حضرت کو فرماتے سنا کہ الصَّمد ایسا نام ہے جس سے تمام مخلوقات سیراب ہے خواہ درخت ہو یا پتھر یا ڈھیلا اور ذی روح ہو یا غیر ذی رُوح۔

اہلِ اعراف

میں نے اعراف والوں کے متعلق حضرت کو کہتے سنا کہ وہ سیدی فلاں اور سیدی فلاں ہیں اور آپ کا اشارہ اہلِ عرفان میں سے بڑے بڑے صاحبانِ فتح کی طرف تھا۔

حضرت نے فرمایا: جنت میں بلند مقامات ہیں جن پر چڑھ کر وہ جنت والوں سے اونچے ہو جائیں گے جس طرح کہ فاس میں ایک بلند منارہ ہے کیونکہ فاس کے لوگ وہاں چڑھ کر نیچے کی ساری آبادی کو دیکھتے ہیں ان لوگوں کے بلند مقامات کا نام اعراف ہے۔ حضرت نے یہ مثال تقریبی طور پر دی تھی۔

مؤلف کہتا ہے کہ اعراف میں کئی اقوال ہیں جن کا ذکر حافظ سیوطی نے اَلْبُدُوْرُ السَّافِرَۃ میں کیا ہے۔ ان میں سے ایک قول یہ ہے کہ ان میں سے حضرت حمزہ اور دیگر شہداء ہیں اور یہ قول حضرت کے قریب قریب ہے۔ واللہ تعالیٰ اعلم۔

پ

۳۸- اِنَّا فَتَحْنَا لَکَ فَتْحًا مُّبِیْنًا لِّیَغْفِرَ لَکَ اللّٰہُ مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْۢبِکَ وَمَا تَاَخَّرَ (سورۂ فتح)

میں نے حضرت سے آیت اِنَّا فَتَحْنَا لَکَ فَتْحًا مُّبِیْنًا لِّیَغْفِرَ لَکَ اللّٰہُ مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْۢبِکَ وَمَا تَاَخَّرَ (اے محمدؐ ہم نے آپ کو واضح فتح عطا کی تاکہ اللہ آپ کے اگلے اور پچھلے گناہ بخش دے) کے متعلق دریافت کیا۔

حضرت نے فرمایا کہ فتح سے مراد مشاہدہ ہے یعنی مشاہدۂ حق۔ اس کی تشریح یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے اللہ تعالیٰ کے علم قدیم میں یہ بات پہلے سے موجود تھی کہ ساری مخلوق کو معرفتِ حق حاصل نہ ہوگی کیونکہ اگر تمام اس کی معرفت سے بہرہ ور ہوتے تو صرف ایک ہی گھر (یعنی جنّت) ہی ہوتا حالانکہ اللہ نے دو۲ گھر تجویز فرماتے ہیں، اس لیے ان لوگوں کے مواخذہ پر خدا کی حجت ہوتی ہے سب کو معرفت سے حجاب میں ڈال دیا۔ اس لیے انہیں اپنے فعل اور ذات کے مشاہدہ سے بھی روک دیا کیونکہ اگر پردہ اٹھا دیا جاتا تو وہ خدا کا مشاہدہ کر لیتے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں۔ وَھُوَ مَعَکُمْ اَیْنَمَا کُنْتُمْ (سورۂ حدید آیت ۴) وَنَحْنُ اَقْرَبُ اِلَیْہِ مِنْ حَبْلِ الْوَرِیْدِ (سورۂ ق آیت ۱۶) وَاِذَا سَاَلَکَ عِبَادِیْ عَنِّیْ فَاِنِّیْ قَرِیْبٌ (سورۂ بقرہ آیت: ۱۸۶) وَلَآ اَدْنٰی مِنْ ذٰلِکَ وَلَآ اَکْثَرَ اِلَّا ھُوَ مَعَھُمْ اَیْنَمَا کَانُوْا (سورۂ مجادلہ آیت: ۷) (جہاں کہیں بھی تم ہو خدا تمہارے ساتھ ہوتا ہے، ہم اس کے شاہ رگ سے بھی زیادہ قریب ہیں جب میرے بندے تجھ سے میرے متعلق سوال کریں (تو کہہ دیں) میں قریب ہوں اور خواہ کم ہوں یا زیادہ، جہاں کہیں بھی وہ ہوں خدا ان کے ساتھ ہوتا ہے) اور یہ بھی دیکھ لیتے کہ ان کے تمام اخلاق اللہ ہی کے مخلوق ہیں اور فاعل حقیقی اللہ ہے وہ نہیں ہیں، اور وہ خود بمنزلہ ظروف وخالی اجسام کے ہیں جسے اللہ تعالیٰ جیسے چاہتا ہے حرکت دیتا ہے جیسا کہ خود فرماتا ہے وَاللّٰہُ خَلَقَکُمْ وَمَا تَعْمَلُوْنَ اللہ نے تمہیں اور تمہارے اعمال کو بھی پیدا کیا ہے۔ یہ مشاہدات کرنے کے بعد کوئی بھی نافرمانی نہ کرتا اس لیے کہ معصیت تو اسی شخص سے سرزد ہوتی ہے جو معصیت کے وقت اللہ سے حجاب میں ہو اور غافل ہو۔

حضرت نے فرمایا: مومن کا اگرچہ یہ عقیدہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ہی ان کے افعال کا خالق اور متصرف ہے اور اسی کا ارادہ غالب ہے، لیکن یہ اعتقاد کبھی سامنے آتا ہے اور کبھی اوجھل ہو جاتا ہے جس کا سبب

حجاب ہے۔ اس لیے ان کا ایمان محض ایمان بالغیب ہوتا ہے، مشاہدہ وعیان کا نہیں۔ جس پر اللہ کی رحمت ہو جاتی ہے، اس سے حجاب کو دور کر دیتا ہے اور خدا اپنے مشاہدہ سے اس کو نوازتا ہے لہٰذا اسے حق کے سوا کچھ نظر نہیں آتا کہ یہ حق کی طرف سے ہے اور اسی کی طرف اس کا انجام ہے "فتح مبین" سے اسی کی طرف اشارہ ہے۔

میں نے سوال کیا کہ یہ "فتح مبین" آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو کب نصیب ہوئی؟

حضرت نے فرمایا: بچپن سے ہی کیونکہ آپ پر کبھی بھی حجاب نہیں آیا۔

فرمایا: قوت وضعف کے لحاظ سے فتح میں بھی فرق ہوتا ہے لہٰذا ہر ایک کو اس کی طاقت کے مطابق دی جاتی ہے اور عقل، روح، نفس، ذات، سر اور حفظہ کے اعتبار سے جو قوت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم میں تھی کسی اور میں نہ تھی یہاں تک کہ اگر تمام انبیاء وغیرہ اصحابِ فتح کو جمع کر دیا جائے اور وہ قوتِ فتح جس کی طرف اس آیت میں اشارہ کیا گیا ہے ان پر ڈالی جاتے تو سب پگھل جائیں اور ان کے اجسام ریزہ ریزہ ہو جائیں۔

اور اللہ تعالیٰ کے فرمان مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْبِكَ وَمَا تَأَخَّرَ میں ذنب سے مراد اس کا سبب یعنی وہ غفلت اور حجاب کی ظلمت ہے جو آپ کی ترابی خلقت میں پائی جاتی ہے اور فرمایا کہ اس غفلت اور حجاب کا گناہ سے وہی تعلق ہے جو بدبودار اور میلے کچیلے کپڑے کا اس پر مکھی کے گرنے کا ہے۔ لہٰذا جب کوئی بھی اس کپڑے کو پہنے گا تو مکھی اس پر گرے گی، لیکن جب اس کپڑے کو ہی مکھی کہہ دیا جائے تو یہ جائز ہوگا۔ اسی طرح یہاں ذَنْب (گناہ) سے مراد حجاب ہے اور وَمَا تَقَدَّمَ وَمَا تَأَخَّرَ کنایہ اس کے بالکل ضائع ہو جانے سے، مطلب یوں ہوا کہ "ہم نے آپ کو واضح فتح عطا کی تاکہ آپ سے حجاب کلیتہً زائل ہو جائے اور آپ پر ہماری نعمت مکمل ہو جاتے اور تاکہ آپ کو راہ دکھائی جائے اور آپ کی مدد کی جائے اس لیے کہ زوالِ حجاب سے بڑھکر کوئی نعمت نہیں ہو سکتی اور نہ کوئی راہنمائی معارف کی طرف راہنمائی سے بڑھکر ہو سکتی ہے اور نہ ہی نصرت اس شخص کی اس نصرت سے بڑھ کر ہو سکتی ہے جس کی یہ حالت ہو

جب میں نے عرض کیا: کیا یہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے مخصوص ہے؟

فرمایا: ہاں۔

میں نے عرض کیا: کیوں؟

فرمایا: آپ ہر چیز کی آنکھ ہیں۔

میں نے کہا اسی لیے محشر میں انبیاء علیہم السلام کہیں گے آؤ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس چلیں یعنی

کیونکہ اللہ نے ان کے تمام گناہ مٹا دیے ہیں۔

مؤلف کہتا ہے کہ جو کچھ حضرت نے فرمایا نہایت ہی نفیس معرفت کی بات ہے اور نہایت لطیف لطیفہ ہے اور بارگاہ نبوت کے زیادہ مناسب اور نبی کی تنزیہ اور تعظیم کے لیے نہایت واضح اور اس عصمت کے زیادہ موافق ہے جس پر سب کا اتفاق ہے اور اس سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا حق زیادہ ادا ہوتا ہے اور ترتیب وسیاق آیت کے زیادہ مناسب ہے۔ خدا انہیں ہماری طرف سے بہترین جزا دے۔

اس آیت پر کئی ایک لوگوں نے بحث کی ہے اور وہ معنی جن کی طرف حضرت نے اشارہ کیا ہے ان کے ذہنوں میں تھے مگر اس کا اظہار نہ کر سکے۔ اسبکی کبیر اس کے گرد ہی چکر لگاتا رہا، ابویحییٰ الشریف جو ابن عبداللہ الشریف التلمسانی کے نام سے مشہور ہے، کی عقل اس کی تلاش میں سرگرداں رہی یہاں تک کہ اس نے گناہ کے تین مراتب بنائے اور اسی طرح مغفرت کے بھی تین مراتب بنائے۔ اس طرح کہ گناہ کا ایک محل صدور ہے اور وہ نفسِ امارہ ہے اور ایک اس کی حقیقت یعنی مخالفت کرنا اور ایک اس کا اثر یعنی ظلمتِ قلب جس کا ذکر آیہ کَلَّا بَلْ رَانَ عَلٰی قُلُوْبِهِمْ مَا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ (ہرگز ایسا نہیں ہے بلکہ ان کے دلوں کو ان کے اعمال نے زنگ آلود کر دیا ہے) اور حدیث میں ہے اِذَا اَذْنَبَ الْعَبْدُ ذَنْبًا حَصَلَتْ فِيْ قَلْبِهٖ نُقْطَةٌ سَوْدَاءُ (جب کوئی بندہ کسی قسم کا گناہ کرتا ہے تو اس کے دل میں ایک سیاہ داغ پڑ جاتا ہے) تلمسانی کہتے ہیں کہ محلِ صدور اور اثر کو مجازاً گناہ کہا گیا ہے کہ محل صدور میں تو سبب کے اعتبار سے یہ نام دے دیا گیا ہے اور اثر میں مسبّب کے اعتبار سے۔

مغفرت کا لفظ "غفر" سے ماخوذ ہے جس کے معنی پردہ ڈالنے کے ہیں اور ستر کے کئی مراتب ہیں پہلا درجہ جو سب سے زیادہ قوی ہے یہ ہے کہ شیٔ کا وجود ہی نہ رہے۔ چنانچہ گناہ عدم کی تاریکی میں چھپ جاتا ہے۔ دوسرا درجہ یہ ہے کہ وجود تو ہو مگر اس کا ادراک کرنے والا حاسہ ہم میں نہ ہو اور تیسرے یہ کہ وجود بھی ہو اور حاسہ مدرکہ بھی مگر درمیان میں کوئی چیز حائل ہو جائے چنانچہ سورج اگر مطلقاً آسمان پر نہ ہو تو یہ عدم میں چھپا ہوا ہو گا اور اگر سورج موجود ہو لیکن دیکھنے والے کی بینائی ہی نہیں ہے تو یہ حاسہ مدرکہ کے نہ ہونے کی وجہ سے چھپا ہوا ہو گا اور یہ ستر کا کمزور ترین درجہ ہے۔ اس لیے کہ بادل ہٹنے پر سورج نظر آجائے گا۔

تلمسانی کہتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے حق میں مغفرت کا لفظ جو استعمال ہوا ہے اس سے مراد عدم ہے اور گناہ سے محلِ صدورِ گناہ اور حقیقتِ گناہ مراد ہے نہ کہ اثر اور اس میں کوئی شک نہیں کہ

ان میں سے ہر ایک کی مغفرت سے اثر کو مٹا دینا خود لازم آجائے گا اور اگر اثر مراد لیا جائے تو محلِ صدور یعنی نفس اور حقیقت یعنی خلافِ حکم کا صدور منتفی نہیں ہوتا اور اول تو یہ عصمت کے خلاف ہوا کہ اگرچہ زنگ اتر گیا مگر مادۂ مخالفت موجود ہے لہٰذا عصمت کہاں رہی دوسرے یہ کہ اتنا تو عام مسلمان بلکہ گناہگار میں بھی پایا جاتا ہے، لیکن اس آیت میں گناہ سے مراد حقیقت یعنی مخالفت لی جائے تو لِيَغْفِرَ لَكَ اللّٰهُ مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْبِكَ میں مِنْ بمعنی عَنْ ہوگا اور ترجمہ یوں ہوگا کہ حق تعالیٰ نے مخالفت سے جو شئ مقدم ہے یعنی محلِ صدور اور نفسِ امارہ اس کو بھی معدوم فرما دیا نیز مخالفت سے جو شئ مؤخر ہے یعنی اثرِ گناہ اور ظلمتِ قلب اس کو بھی معدوم فرما دیا اور اگر گناہ سے مراد حقیقت اور مجاز دونوں لیے جائیں تو ما تقدم سے مراد حقیقتِ گناہ ہے کہ مخالفت کے فعل کو معدوم فرما دیا اور متاخر سے مراد اثرِ گناہ ہے کہ زنگ وظلمت کو بالکل مٹا دیا کیونکہ مخالفت کا وجود اثر کے وجود سے مقدم ہوتا ہے۔

علامہ مذکور کی تقریر سے مطلب تو قریب قریب وہی ادا ہو گیا جو حضرت ممدوح نے بیان فرمایا اگرچہ فتح کی تفسیر شیخ کے مطابق نہ ہو سکی حالانکہ مسئلہ کی روح وہی ہے انھوں نے فتح سے مراد قضاء قدر لی ہے۔ یعنی اے محمدؐ ہم نے تمہارے لیے مقدر فرمایا لیکن یہ بیان نہیں کیا کہ کیا چیز مقدر کی گئی تاکہ مابعد کو اس پر چسپاں کیا جا سکے۔ جیسا کہ اس کے مطالعہ سے معلوم ہو جائے گا۔

اس مسئلہ میں حافظ سیوطی نے ایک عمدہ رسالہ تالیف کیا ہے جس میں علماء کے اقوال جمع کر دیے ہیں۔ اسی ابو یحییٰ بن عبداللہ الشریف التلمسانی مذکور نے بھی ایک رسالہ اس آیت کی تفسیر میں لکھا ہے

ل۔ شیخ کی تفسیر کے مطابق آیت کا ترجمہ یوں ہوا کہ اے محمدؐ ہم نے تم کو مشاہدۂ کاملہ نصیب فرمایا تاکہ مادہ گناہ تم سے بالکل جاتا رہے اور تاکہ نعمتِ خداوندی تم پر مکمل کر دی جائے اور تاکہ تم کو ہدایت ومعارف حاصل ہوں اور تاکہ تم ملکِ حقائق کے منصور وفاتح ہو جاؤ۔

مگر اس پر یہ اعتراض وارد ہوتا ہے کہ اس آیت کے شانِ نزول اور واقعات سے تو یوں معلوم ہوتا ہے کہ ظاہری فتح مراد لی گئی ہے چنانچہ اس آیت کے نزول پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا حضرت عمرؓ کو یہ فرمانا کہ سورہ فتح نازل ہوئی ہے اور حضرت عمر کا یہ عرض کرنا کہ یا رسول اللہ کیا واقعی یہ فتح ہے اور آپ کا فرمانا کہ ہاں فتح مبین ہے اور پھر موقع صلح حدیبیہ کا ہے۔ لہٰذا اس معنی پر اس تمام گفتگو کا جو آنحضرتؐ اور صحابہ میں ہوئی کیا جواب ہوگا۔ البتہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ یہ اس آیت کے باطنی معنی ہیں۔ (مترجم)

اور شیخ ابوالعباس سیدی احمد بابا سوڈانی نے ان دونوں تالیفوں کو اپنی کتاب میں جمع کر دیا ہے خدا اپنے کرم و احسان سے ان سب پر رحم کرے اور ہمیں ان سے اور ان کے علوم سے فائدہ پہنچائے۔ آمین واللہ تعالیٰ اعلم۔

۳۹۔ عَالِمُ الْغَيْبِ فَلَا يُظْهِرُ عَلَىٰ غَيْبِهِ أَحَدًا (سورہ جن آیت ۲۶)

۴۰۔ وقولہ تعالیٰ إِنَّ اللَّهَ عِندَهُ عِلْمُ السَّاعَةِ (سورہ لقمان آیت ۳۴)

میں نے عرض کیا کہ ان آیات عَالِمُ الْغَيْبِ فَلَا يُظْهِرُ عَلَىٰ غَيْبِهِ أَحَدًا (وہ عالم غیب اپنے غیب پر سوائے چیدہ رسولوں کے کسی کو مطلع نہیں کرتا) اور إِنَّ اللَّهَ عِندَهُ عِلْمُ السَّاعَةِ (قیامت کا علم خدا کو ہی ہے) اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان خَمْسٌ لَا يَعْلَمُهُنَّ إِلَّا اللَّهُ (یہ ان پانچ امور میں سے ہے جن کا علم خدا کے سوا کسی کو نہیں) سے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ غیب کی باتیں بجز پیغمبر کے کسی کو نہیں بتاتا حالانکہ عارفین کو بھی کشف ہوتا ہے اور وہ غیب کی بات مثلاً ماں کے پیٹ میں لڑکا ہے یا لڑکی بتا دیا کرتے ہیں اور اس قسم کی کرامات اولیاء میں عام پائی جاتی ہیں۔

حضرت نے فرمایا: کہ جو حصر کلام اللہ اور حدیث میں پایا جاتا ہے اس سے مراد کاہنوں، عرّافوں اور ان لوگوں کو خارج کرنا ہے جن کے تابع ہمزاد ہوتے ہیں اور جن کے متعلق جاہل عربوں کا یہ خیال تھا کہ یہ لوگ غیب کی باتیں جانتے ہیں۔ یہاں تک کہ وہ اپنے مخاصمات کے فیصلہ کے لیے ان کے پاس جاتے اور ان کی بات پر عمل کرتے۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے اس باطل اعتقاد کو ان کے دلوں سے نکالنا چاہا لہٰذا یہ اور اسی قسم کی دوسری آیات نازل فرمائیں اور اسی طرح اس بات کو حقیقۃً اور نفس الامر میں بھی زائل کرنا چاہا چنانچہ (ان جنات کو آسمان پر جانے سے روکنے کی غرض سے) آسمان پر سخت پہرے بٹھا دیے اور شہاب ثاقب مقرر کر دیے۔ ان تمام باتوں سے مقصد صرف اتنا تھا کہ مخلوقات کو باطل سے پھیر کر حق پر جمع کر دیا جائے اور اولیاء حق میں سے ہیں، باطل میں سے نہیں ہیں، اس لیے اس آیت میں اور دوسری آیتوں میں جو حصر آیا ہے اس سے وہ خارج نہیں ہوتے۔

فرمایا کہ اس اور اس قسم کی دیگر آیات میں بات عام ہوتی ہے لیکن نور کے جو تیر اس میں ہوتے ہیں وہ اس آیت کو بعض افراد کے ساتھ مخصوص کر دیتے ہیں لہٰذا جب عارف ایک عام لفظ کو سنتا ہے تو ان کے نور کے تیروں کو دیکھتا ہے اگر وہ محض فلاں و فلاں و زید و عمرو خالد و بکر پر اترتے دکھائی

دیتے ہیں تو وہ سمجھ جاتا ہے صرف یہی لوگ مراد ہیں کوئی اور مراد نہیں اور اگر لفظ عام ہو اور وہ اس نور کو دیکھے کہ یہ تمام افراد پر اتر رہے ہیں اور کوئی فرد بھی ان سے الگ نہیں رہا تو وہ سمجھ جاتے ہیں کہ سب لوگ مراد ہیں اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو پیشتر اس کے کہ آیت آپ کی زبانِ مبارک سے نکلے اس کا علم ہوتا تھا اس لیے کہ نور کے تیر پہلے ہی سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے دل پر وارد ہو جاتے تاکہ آپ کو علم ہو جائے کہ اس سے اللہ تعالیٰ کی کیا مراد ہے۔

مولف کہتا ہے کہ حضرت کا اشارہ اس عام کی طرف ہے جس سے خاص مراد لی گئی ہو اور وہ عام جو اپنے عموم پر باقی ہو، لیکن آپ چونکہ حضرت اُمّی ہیں اس لیے آپ کو اصطلاح کا پتہ نہیں مگر پھر آپ اصطلاح سے معانی کی طرف سبقت لے گئے ہیں یہاں تک اگر علماء ظاہر کا سب سے بڑا عالم اور سب سے بڑا مناظر، چالاک اور باخبر آدمی آکر آپ سے مقابلہ کرنا چاہے تو وہ آپ کا مقابلہ نہ کر سکے گا اس لیے کہ حضرت اس سے پہلے ہی معانی معلوم کر لیں گے اور اس کے تمام راستے بند کر دیں گے حتیٰ کہ آپ سے مقابلہ کرنے سے ہتھیار ڈالنے اور مطیع ہونے کے سوا کچھ بن نہ آئے گا اور میں اکثر کہا کرتا تھا یا حضرت جس قدر آپ کے بارے میں علماء ظاہر سے بھول ہوئی ہے کسی اور سے نہیں ہوئی کیونکہ اگر وہ آپ کے پاس آتے اور ابواب علم میں آپ سے گفتگو کرتے تو ان کی عقلیں روشن ہو جاتیں اور ان کے شکوک رفع ہو جاتے۔ میرے پاس ابوالمظفر اسفراینی[1] کی کتاب التبصیر تھی جو انھوں نے بہتّر فرقوں کے متعلق لکھی ہے اور حضرت فرمایا کرتے تھے کہ اہلِ اہواء کے شبہات کا مجھ سے ذکر کرو اور جو اشکال اس میں ہو، مجھ سے پوچھو چنانچہ جب بھی میں نے ان سے اُن کا کوئی شک بیان کیا آپ نے فوراً حل کر دیا اور پھر آپ نے اور علوم و معارف کا ذکر کیا۔ میں نے آپ سے آپ کی مرض الموت میں "برھان القطع والتطبیق" کے متعلق گفتگو کی تو مجھے آپ سے بہت اسرار سننے میں آئے اور مجھے وہ علوم حاصل ہوئے جن کا ذکر علماء کلام نے کہیں نہیں کیا۔ اس کے بعد حضرت نے مجھے ان صوفیہ کی توحید کی تعلیم دی جو عارف باللہ ہوں اور فرمایا یہی وہ توحید ہے جس پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابی تھے میں نے آپ کا اشارہ سمجھنے کے بعد عرض کی میرے آقا اگر لوگوں کو توحید کے بارے میں اس حق بات کا علم ہو جاتا تو امت تہتّر فرقوں میں منقسم نہ ہوتی۔ فرمایا: ہاں اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی وفات کے وقت یہی

---

[1] ابوالمظفر اسفراینی: ابوالمظفر طاہر بن محمد الاسفراینی جو شہفور بن طاہر شافعی کے نام سے مشہور ہیں ان کی وفات ۴۷۱ھ ۱۰۷۸ء میں ہوئی، ان کی کتاب کا پورا نام تبصیر فی الدین وتمییز الفرقۃ الناجیۃ عن الفرق الھالکین ہے (ملاحظہ ہو کشف الظنون ج: ۱ ص ۱۸۹)

لکھنا پایا تھا تاکہ آپ کے بعد آپ کی امت کبھی گمراہ نہ ہو۔

اب ہم پھر اپنے مقصد کی طرف رجوع کرتے ہیں، میں نے حضرت سے عرض کیا کہ اس آیت میں رسول کو علم غیب کے ساتھ مخصوص کیا گیا ہے لہٰذا ولی اس سے خارج ہوئے (لیکن ولی کو بھی علم غیب ہوتا ہے لہٰذا) اعتراض باقی رہا۔

حضرت نے فرمایا: اس آیت سے غیر رسول خارج ہوتے ہیں اور ولی ولایت میں رسول کے ساتھ داخل ہے پھر آپ نے ایک مثال دی اور یہ کھیتی باڑی کرنے کے دن تھے کہ فرض کرو ایک بڑا آدمی مثلاً فلاں شخص یہ چاہے کہ کھیت میں جاکر اپنی زمین اور مزارعوں کو دیکھے تو اس کا کوئی نہ کوئی خادم یا عزیز دوست ضرور اس کے ساتھ جائے گا چنانچہ جب وہ وہاں پہنچے گا اور اپنی زمین اور مزارعوں کے متعلق معلومات حاصل کرے گا تو ان چیزوں کا علم اس کے خادموں اور دوستوں کو بھی ہو جائے گا۔ اسی طرح رسول کے لیے خادموں اور احباب کا ہونا ضروری ہے لہٰذا جب رسول کو غیب کا علم ہوگا تو اس میں سے کچھ حصہ اصفیاء کو بھی حاصل ہو جائے گا۔

اس کے بعد میں نے حضرت سے کہا کہ علماء ظاہر خواہ محدثین ہوں یا کوئی اور ان میں اختلاف ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو ان پانچ امور کا علم تھا جن کا ذکر اس آیت میں کیا گیا ہے کہ اِنَّ اللّٰہَ عِندَہٗ عِلْمُ السَّاعَۃِ وَیُنَزِّلُ الْغَیْثَ وَیَعْلَمُ مَا فِی الْاَرْحَامِ وَمَا تَدْرِیْ نَفْسٌ مَّاذَا تَکْسِبُ غَدًا وَمَا تَدْرِیْ نَفْسٌۢ بِاَیِّ اَرْضٍ تَمُوْتُ اِنَّ اللّٰہَ عَلِیْمٌ خَبِیْرٌ (قیامت کا علم خدا کے پاس ہے اور وہی بارش برساتا ہے، وہی جانتا ہے کہ رحم مادر میں کیا ہے اور نہ کسی انسان کو پتہ ہے کہ کل کیا کریگا اور نہ ہی کسی کو معلوم ہے کہ کہاں ہے مگر بیشک اللہ علیم وخبیر ہے) یا علم نہیں تھا۔

فرمایا[1] آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر ان پانچ چیزوں کا علم کیسے مخفی رہ سکتا تھا حالانکہ آپ کی امت

---

[1] آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے علم کے متعلق اس سے پہلے انزل القرآن علی سبعۃ احرف کے تحت مختصر بحث گذر چکی ہے اور اہل حق کا یہی عقیدہ ہے جو کچھ شیخ عبدالعزیز دباغ نے بیان کیا۔ بعض احباب نے اس کے خلاف رسالے لکھے۔ بڑی بڑی موشگافیاں کیں اور اسے خالص توحید سمجھا۔ ان احباب کی خدمت میں مؤدبانہ گذارش ہے کہ خالص توحید کے ساتھ مرتبۂ رسالت اور پھر بالخصوص آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے مرتبہ کا لحاظ بھی نہایت اہم اور ضروری ہے آخر اللہ تعالیٰ اپنے رسولوں کے ہاتھوں معجزات دکھاتا ہے تو کس لیے؟ اگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی غیب دانی کو بھی معجزہ خیال کر کے مان لیا جائے تو اس میں

(بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر)

میں ایک صاحب تصرف ان پانچ چیزوں کے علم کے بغیر تصرف کر ہی نہیں سکتا۔

پھر میں نے سوال کیا کہ علماء کا قول ہے کہ لیلۃ القدر کا علم آنحضرت کے ذہن سے نکال دیا گیا تھا اسی لیے تو آپ نے فرمایا کہ اسے انتیسویں ۲۹ شب یا ستائیسویں ۲۷ یا پچیسویں ۲۵ شب میں تلاش کرو ورنہ اگر آپ کو اس کا علم ہوتا تو آپ معین فرما دیتے۔

اس پر آپ کو غصہ آگیا اور فرمایا سبحان اللہ اور پھر فرمایا اگر لیلۃ القدر آجائے اور میں مر چکا ہوں اور میری نعش گدھے کی طرح پھول چکی ہو اور میری ٹانگیں اٹھ گئی ہوں پھر بھی اس حالت میں مجھے اس کا علم ہو جائے گا، پھر کیسے ہو سکتا ہے کہ اس کا علم سید الوجود صلی اللہ علیہ وسلم سے مخفی رہا ہو۔ اس کے بعد آپ نے مذکور بالا پانچ باتوں کے متعلق اور لیلۃ القدر کے متعلق وہ اسرار بیان کیے جو ان جیسے عارف کی زبان سے ہی نکل سکتے ہیں۔ خدا ہمیں ان کا اس کتاب میں ذکر کرنے کی توفیق دے۔ حضرت نے مختلف سالوں میں لیلۃ القدر کی تعیین فرمائی چنانچہ بعض اوقات اس کی تعیین رجب میں کی اور ایک سال شعبان میں اور ایک اور سال رمضان میں اور ایک اور سال عید الفطر کی رات۔ آپ اس رات کے آنے

(بقیہ حاشیہ صفحہ سابق)

کونسی قباحت لازم آتی ہے اور کونسا رکن اسلام منہدم ہو جاتا ہے۔ یہ کتاب عوام کے لیے نہیں لکھی گئی اور نہ عوام کے سامنے اس قسم کے مسائل کو زیر بحث لانا چاہیئے کہ ان میں فتنہ کا خوف ہوتا ہے یہ خواص کے مسائل ہیں۔

حضرت عبدالعزیز دباغ نے آگے چل کر پھر اس مسئلہ پر بحث کی ہے اور وہاں بھی یہی بات کہی ہے۔ مذکورہ بالا نوٹ لکھنے کے بعد مجھے ایک سند مل گئی کہ قدماء کے ہاں اس مسئلہ پر اختلاف پایا جاتا ہے کہ آیا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو قیامت کا علم تھا یا نہ تھا چنانچہ سیوطی نے شرح الصدور بشرح حال الموتیٰ والقبور طبع لاہور صفحہ ۲۱۴-۲۱۵ پر لکھتے ہیں کہ روح کے متعلق بعض علماء نے بحث کرنے سے احتراز کیا ہے اور بعض نے اس کی بحث کی ہے۔ پھر پہلے طریقے کے علماء میں بھی اختلاف ہے کہ آیا روح کے متعلق آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو علم تھا یا نہ تھا۔ چنانچہ ابن ابی حاتم نے عبداللہ بن بریدہ سے روایت کی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو تاحین وفات روح کا علم نہ تھا دوسرا گروہ کہتا ہے بلکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اس کا علم تھا اور اللہ تعالیٰ نے آپ کو اس کی اطلاع دی تھی مگر کسی کو بتانے کی اجازت نہ تھی اور اس مسئلہ میں اختلاف بعینہٖ اسی طرح ہے جس طرح کہ قیامت کے متعلق آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق اختلاف ہے۔

سے پہلے ہی اس کی تعیین فرما دیا کرتے تھے اور فرمایا کرتے کہ اس کی حفاظت کرو اور یہ بھی فرماتے کہ یہ رات منتقل ہوتی رہتی ہے اسی طرح جمعہ کی ساعت (جو مقبولیت دعا کی ساعت ہے) کی بھی تعیین فرمایا کرتے اس کے چند اسرار کا ذکر انشاء اللہ ہم آئندہ کریں گے۔

یہاں ہم ان آیات کو ختم کرتے ہیں جن کی تفسیر حضرت نے کی مگر ابھی کچھ اور آیتیں باقی ہیں جو اس کتاب میں اپنے مناسب مقامات پر آئیں گی اور بعض ایسی آیات ہیں جن میں ہم حضرت کی مراد کو اچھی طرح سمجھ نہیں سکے اسی لیے انہیں یہاں درج نہیں کیا گیا اور بعض آیات کی تشریح میں ایسے معرفت کے اسرار تھے جن کا تحریر کرنا مناسب نہ تھا۔ جو کچھ ہم نے لکھا ہے اسے خدا خالص اپنی ذات کے لیے بنا دے اور اسے اپنی رضامندی کا سبب بناتے اور اس سے اس کے لکھنے والے پڑھنے والے اور اس کے حاصل کرنے والے کو نفع پہنچائے بوسیلہ صاحب کلام حضرت دبّاغ۔

علم لدنی کا شاہکار

خزینۂ معارف

مشہور عربی کتاب اِبریز کا سلیس اُردو ترجمہ

اس کتاب میں حضرت علامہ احمد بن مبارکؒ سلجماسی نے غوثِ زماں حضرت سید عبدالعزیز دباغ مغربی کے مختصر سوانح حیات، عقائد کرامات، بعض آیاتِ قرآنی و احادیثِ نبوی کی بے نظیر تشریحات اور علم و عرفان کی نادر باتیں جمع کی ہیں!

حصۂ دوم

ترجمہ از

ڈاکٹر پیر محمد حسن ایم اے۔ پی ایچ ڈی

شیخ الادب جامعہ اسلامیہ بہاولپور

ناشرانِ قرآن لمیٹڈ اُردو بازار لاہور

فہرستِ مضامین

تبصرہ

موقر روزنامہ "نوائے وقت" مورخہ ۱۷ر فروری ۱۹۵۹ء میں
کتاب خزینۂ معارف جلد اوّل پر مندرجہ ذیل تبصرہ شائع ہوا۔

خزینۂ معارف

مترجمہ پیر محمد حسن ایم اے۔ پی ایچ ڈی پرنسپل گورنمنٹ ہائر سیکنڈری سکول راولپنڈی۔ طباعت و کتابت دلکش و دیدہ زیب۔ کاغذ اچھا۔ چوڑی تقطیع۔ غیر مجلد۔ سہ رنگی۔ ضخامت ۴۲۶ صفحات۔ قیمت حصہ اول ۵؍ ناشران قرآن لمیٹڈ اردو بازار لاہور سے مل سکتی ہے۔

معرفت اور علمِ لدنی کی معرکۃ الآراء عربی کتاب "ابریز" حضرت علامہ احمد بن مبارک سلجماسی کی تصنیف ہے جس میں انھوں نے حضرت سید عبدالعزیز دبّاغ مغربی کے حالاتِ زندگی، متعدد آیاتِ قرآنی، احادیثِ نبویؐ کی تشریحات اور علم و عرفان کے نایاب خزانے جمع کیے ہیں۔ "ابریز" کا اُردو ترجمہ آج سے پچیس تیس سال قبل مولانا عاشق الٰہی میرٹھی نے "تبریز" کے نام سے کیا تھا، لیکن یہ ترجمہ اب کمیاب ہے۔ مزید برآں اس کی زبان بھی پرانی اور کسی قدر نامانوس تھی، اس میں عبارت مسلسل تھی اور حواشی بھی نہیں دیئے گئے تھے اور ایک آدھ باب بھی چھوڑ دیا گیا تھا۔ ناشران قرآن نے پیر محمد حسن صاحب کی خدمات حاصل کر کے اس کتاب کو اردو کا جامہ پہنایا ہے اور بڑے اہتمام کے ساتھ شائع کیا ہے۔ پیر صاحب نے اس کتاب پر مبسوط دیباچہ بھی تصنیف کیا ہے اور کوئی ۳۲ کے لگ بھگ کتابوں سے استفادہ کر کے اس کتاب کے حواشی لکھے ہیں۔

حضرت سید عبدالعزیز دبّاغ مغربیؒ علوم ظاہری سے نابلد سہی، لیکن علوم باطنی میں ان کا کیا مقام تھا؟ اس کے بارے میں علامہ احمد بن مبارک سلجماسی لکھتے ہیں:

"مَیں نے ان کے اس قدر علوم و معارف اور شمائل و لطائف کا مشاہدہ کیا کہ میرے ہوش جاتے رہے..... میں نے ان کی زبان سے سید الوجود و علم الشہود حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی قدر و منزلت کے متعلق وہ کچھ سنا جو مَیں نے کبھی بھی نہ کسی انسان سے سنا تھا نہ کسی کتاب میں دیکھا تھا، میں نے ان سے اللہ کے انبیاء اور رسولوں کی معرفت کے متعلق وہ کچھ سنا جس سے یہ گمان پیدا ہوتا ہے کہ وہ ہر نبی کے ساتھ اس کے زمانہ میں ہوتے ہیں اسی طرح میں نے ان کی زبان سے ملائکہ کرام، ان کی مختلف جنسوں اور ان کے تفاوتِ مراتب کے متعلق وہ

معرفت کی باتیں سنیں۔ جن سے یہ خیال پیدا ہوا کہ آیا بشر بھی اس قدر علم جان سکتے ہیں۔۔۔۔ میں نے جو کچھ لکھا ہے وہ آپ کے بحرِ زخّار میں سے چند قطرے ہیں، لیکن جو علوم شیخ کے حصّہ میں تھے انھیں اللہ کے سوا کوئی نہیں جانتا۔"

کتاب کے شروع میں نسب نامہ، کردار، روحانی ترقی، بزرگانِ دین سے ملاقات، کرامات، پہلے باب میں مشکل احادیث کی تشریح۔ باب دوم میں قرآنی آیات کے مشکل مقامات کی توضیح، حصہ دوم میں تیسرے باب میں مختلف دینی مسائل کی وضاحت۔۔۔۔ مختصر یہ کہ گیارہ ابواب میں معرفت اور علم لدُنّی کے ممکنہ پہلوؤں کی تشریح ہے۔

فاضل مترجم نے ترجمہ بڑی محنت اور کاوش سے کیا ہے اور ناشر نے بھی طباعت کا حق خوب ادا کیا ہے۔

از ادارہ

تیسرا باب

اُن ظلمتوں کا بیان جو بندوں کی ذات اور اعمال میں داخل ہو جاتی ہیں اور انہیں اس کا علم ہی نہیں ہوتا۔

میں نے حضرت کو فرماتے ہوئے سنا کہ میرے پیر عمرو بن محمد الطھواری نے مجھے اپنے کھیت میں بھیجا جہاں ان کے مزدور کام کر رہے تھے اور مجھے تاکید فرمائی کہ ان کے کام کی نگرانی کروں۔ ظہر کی نماز کا وقت ہوا تو وہ خود بھی تشریف لے آئے اور ہم نے اکٹھے نماز پڑھی اور مزدوروں کے فارغ ہونے تک وہیں رہے اور انہیں اُن کی اُجرت دے دی۔ جب وہ چلے گئے تو میں نے دیکھا کہ آپ کا چہرہ بدل گیا اور اس پر غصہ کے آثار تھے یہاں تک کہ میں ڈر گیا۔ پھر فرمایا: کیا آج تُو نے کچھ دیکھا ہے؟ میں نے عرض کیا: میں نے تو کچھ نہیں دیکھا، آپ کی مراد کونسی چیز ہے؟ آپ نے فرمایا غور کر، تو نے شاید کچھ دیکھا ہو؟ میں نے پھر کہا کہ میں نے تو کچھ نہیں دیکھا پھر فرمایا ان مزدوروں کے کام میں کیا چیز دیکھی۔ میں نے عرض کیا کہ آپ کی غیر حاضری میں آپ کے آنے سے پہلے تک وہ آہستہ آہستہ کام کرتے تھے، لیکن جب آپ آئے اور انھوں نے آپ کو دیکھا وہ اپنی طاقت سے بڑھکر کام کرتے رہے۔ اس پر آپ نے فرمایا کہ تو نے فاسقوں اور محروم لوگوں کے اعمال دیکھے ہیں۔

فاسق کون ہے؟ فاسق وہ لوگ ہیں جو عبادت تو کرتے ہیں مگر عبادت اور اطاعت ان کی ذات سے بغیر نیت، اور ارادہ کے ہوتی ہے بلکہ اس لیے کہ یہ ان کی عادت بن چکی ہوتی ہے اس لیے اطاعت کی حالت میں ان کے حرکات و سکنات عادت کی وجہ سے اور طبیعت کی موافقت کی وجہ سے ہوتے ہیں اور اس میں کوئی مقصد نہیں ہوتا۔ لہٰذا ان کی اس اطاعت سے کوئی غرض نہیں ہوتی۔ نہ صحیح اور نہ فاسد۔ اسی لیے ان کی عبادت نہ اللہ کے لیے ہوتی ہے نہ کسی اور کے لیے اور ان کی عبادت صرف اس لیے ہوتی ہے کہ یہ ان کی طبیعت اور عادت بن چکی ہوتی ہے جس طرح کوئی شخص ہو کہ اسے نہ بھوک ہو نہ پیاس کہ وہ نہ کھانا پسند کرے اور نہ اس کی اشتہا ہو اور نہ اس میں کھانے کی طاقت ہو۔ پھر کچھ لوگوں کے ساتھ وہ باغ میں جائے اور وہ کھاتے کھاتے حرکت بھی کر رہے ہوں اور یہ شخص بھی ان کے ساتھ حرکت کرنے لگ جائے۔ اب وہ تو کھانے اور ذاتی نفع کی غرض سے حرکت کر رہے ہوں، لیکن یہ شخص کھانے کی خاطر حرکت نہیں کر رہا اس لیے کہ اسے کھانے کی خواہش ہی نہیں بلکہ وہ تو کھا ہی نہیں سکتا اور نہ

ہی اس کا حرکت کرنا اپنے بھائیوں کی مدد کی خاطر ہے کیونکہ (اگر ایسا ہو تو) یہ نیک ارادہ ہے مگر اس کی حرکت کا سبب صرف یہ ہے کہ جب اس نے لوگوں کو حرکت کرتے دیکھا تو یہ بھی اپنی عادت اور طبیعت کی وجہ سے حرکت کرنے لگا۔ یہ فاسقوں کے عمل کی مثال ہے۔

محرومین

محروم وہ لوگ ہیں جو اپنی ذات کے نفع اور ذاتی اغراض کو حاصل کرنے کی غرض سے عمل کرتے ہیں اور یہ عمل اللہ کی خاطر نہیں ہوتے اور ان اعمال سے انسان خدا سے دور ہوتا چلا جاتا ہے اس لیے کہ یہ اعمال ذات کی حقیقت کے راز کے مخالف ہیں کیونکہ ذات کی حقیقت کا راز یہ ہے کہ یہ اللہ کی پیدا کی ہوئی ہے۔ اسی کے فعل سے ہے اسی کی ملکیت ہے اور اسی کی طرف منسوب ہے اور کسی طرح بھی اسے کسی اور سے نسبت نہیں لہٰذا اگر اس کے افعال اس راز کے مطابق ہوں تو سب خاص اللہ کے لیے ہوں گے اور وہ یہ سمجھے گا کہ اس کے افعال میں میرا کوئی حصہ نہیں کیونکہ یہ سب اللہ کے پیدا کئے ہوتے ہیں لہٰذا ایسی حالت میں جو اعمال اس سے سرزد ہونگے وہ اس ذات کی حقیقت کے راز کے مطابق ہوں گے، لیکن اگر وہ یہ کہے کہ میری ذات تو اللہ کے لیے ہے مگر میرے افعال خود میرے ہیں لہٰذا وہ ان افعال کی نیت اپنے نفس اور اپنی اغراض کی غرض سے کرے گا تو اس کا فعل ذات کی حقیقت کے راز کے مطابق نہ ہوگا اور اس کے لیے کبھی ممکن نہ ہوگا کہ اللہ تعالیٰ کے حقوق کو پورا کرے کیونکہ وہ جو کچھ کر رہا ہے اپنے نفس کے لیے کر رہا ہے اللہ کے حقوق ادا کرنے کے لیے نہیں کر رہا۔ اس طرح اپنے افعال میں وہ اللہ سے منقطع ہو جاتا ہے اور اللہ تعالیٰ کے عطیے بھی اس سے منقطع ہو جاتے ہیں اور وہ محرومین میں سے ہو جاتا ہے۔

اپنے اعمال پر غرّہ نہیں ہونا چاہیئے

میں نے عرض کیا بہت سی آیات و احادیث میں کسی ایک کام کرنے پر ثواب اور اجر حاصل کرنے کی رغبت دلائی گئی ہے اور اگر حقیقت یہی ہوتی جیسا کہ عمرو بن محمد الھواری نے کہا تو کوئی آیت یا حدیث اعمال کی ترغیب کے لیے نہ آتی کیونکہ اس میں تو اللہ سے بے تعلقی پائی جاتی ہے۔

فرمایا: جو کچھ آیات و احادیث میں آیا ہے اس سے ہم پر اعتراض وارد نہیں ہوتا اس لیے کہ اللہ تعالیٰ نے ان آیات میں یہ نہیں فرمایا کہ اعمال اپنے نفس کی خاطر کیا کرو اور میں ایسے اعمال پر تم کو بڑے بڑے انعام دیا کروں گا۔ اللہ تعالیٰ نے تو صرف یہی فرمایا ہے کہ میری عبادت کرو اور تمہاری عبادت خالص میرے لیے ہو تو اس پر میں تم کو اجر و ثواب دونگا اس صورت میں ہمارے افعال کی نیت اللہ تعالیٰ اور اس کی عظمت اور کبریائی کے لیے ہوگی اور ان بڑے انعامات کے لیے ہوگی جو اس نے ہم پر کئے اور یہ کہ اللہ تعالیٰ ہمیں ان اعمال پر محض اپنے فضل و کرم سے ثواب دیتا ہے ہم پر اعتراض تب وارد ہوتا اگر ان آیات و احادیث میں یہ بیان کیا گیا

ہوتا کہ اخلاص کے ہوتے ہوئے بھی عبادت کا اجر نہ ملے گا اور نہ ہی ان اعمال پر ثواب ملے گا وہ بندہ کس قدر جاہل ہے جو یہ خیال کرے کہ وہ نیکیوں کو خود حاصل کرتا ہے اور اپنے افعال سے اجر و ثواب کماتا ہے جبکہ اسے معلوم ہے کہ افعال میں اس کا بال برابر بھی دخل نہیں لہٰذا جب ذات بھی اللہ کی پیدا کی ہوئی ہے اور افعال بھی تو یہ کیسے جائز ہو سکتا ہے کہ ان افعال میں جو اللہ ہی کے پیدا کئے ہوئے ہیں، ہم نیکیوں پر بھروسہ کریں اور اللہ کے محض فضل و کرم پر بھروسہ نہ کریں، مگر حق بات یہ ہے کہ اللہ سے غفلت ہماری آنکھوں کو اندھا کر دیتی ہے۔ والعیاذ باللہ۔

حکایت

فرمایا: ایک عابد اس نیت سے بیس سال تک اللہ کی عبادت کرتا رہا کہ اسے ذاتی نفع ہو اور اللہ اس کی مراد پوری کرے اور وہ بڑی لجاجت کے ساتھ دعا مانگتا مگر اس کی کوئی مراد پوری نہ ہوتی، اس پر وہ بہت حیران و پریشان ہو گیا اور خیال کرنے لگا کیا بات ہے کہ میں بیس سال سے دعا مانگ رہا ہوں اور اللہ نے مجھے کچھ نہیں دیا اور نہ ہی اس عبادت کی بدولت مجھ پر رحم کیا ہے اس پر اللہ تعالیٰ نے اس پر رحمت فرمائی اور اسی وقت اسے اپنے نفس اور اپنے افعال کی حقیقت کی معرفت عطا کی۔ اس پر وہ کہنے لگا، میں تو بیوقوف ہوں، جب اللہ ہی میری ذات، میرے افعال کو پیدا کرنے والا ہے اور اسی نے صحت اور اس مکان کو پیدا کیا جس میں میں اس کی عبادت کرتا ہوں اور اسی نے اس پانی کو پیدا کیا جس سے میں وضو کرتا ہوں اور اس کپڑے کو پیدا کیا جس سے اپنے جسم کو ڈھانپتا ہوں اور اسی نے اس وقت کو پیدا کیا جس میں میں اس کی عبادت کرتا ہوں تو میں نے کیا کیا ہے کہ اس پر اجر کا مطالبہ کروں اور اس کی وجہ سے شکر و ثنا کا استحقاق جتاؤں، یہ ہرگز نہیں ہو سکتا۔ خدا کی قسم میں نے تو کچھ بھی نہیں کیا اور کیا تو یہ کیا کہ میرے اندر اللہ کے جو افعال جاری ہیں ان کو اللہ سے قطع کر کے اپنی طرف منسوب کر لیا ہے اور پھر اس پر ثواب مانگنے لگ گیا ہوں یہاں تک کہ اب یہ بھی کہنے لگ گیا ہوں کہ میں بیس سال تک اس کے در پر کھڑا ہوں اور وہ مجھے کچھ نہیں دیتا، یا اللہ میری توبہ، یا اللہ میری توبہ۔ یا اللہ میری توبہ۔ غرض جب اس نے سچی توبہ کر لی تو اللہ نے اس پر کرم فرمایا کہ اس کی تمام آرزوئیں پوری کر دیں اور ساتھ ہی وہ معرفت عطا کی جس کا مقابلہ نہ جنت کر سکتی ہے نہ کوئی اور چیز۔

لوگ جنت میں اللہ کی رحمت سے جائیں گے نہ اعمال کی وجہ سے!

مؤلف کہتا ہے کہ اسی طرح کی ایک حدیث حافظ سیوطی نے البدور السافرۃ بابُ مَنْ نُوقِشَ فِی الْحِسَابِ ہَلَکَ میں نقل کی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ قدیم زمانہ میں سمندر کے اندر ایک جزیرہ میں ایک شخص چھ سو سال اللہ کی عبادت

کرتا رہا اور اللہ نے اسے ایک میٹھے پانی کا چشمہ عطا کیا اور انار کا ایک درخت اُگا دیا جسے ہر روز ایک انار لگتا جسے وہ کھاتا اور اس کے لیے بطور غذا کے کافی ہوتا چنانچہ وہ چھ سو سال تک بغیر سستی اور ملال کے اللہ کی عبادت کرتا رہا۔ جب وہ مر گیا تو اللہ نے فرمایا میری رحمت اور فضل سے جنت میں داخل ہو جاؤ۔ عرض کرنے لگا یارب نہیں بلکہ میری چھ سو سالہ عبادت کی وجہ سے اس پر اللہ تعالیٰ نے محاسبہ شروع کر دیا اور فرمایا کہ تیری چھ سو سالہ عبادت تو میری نعمتوں میں سے ایک نعمت کے برابر نہیں ٹھہر سکتی اس لیے کہ میں نے کھاری پانی کے سمندر کے اندر تمہارے لیے میٹھے پانی کا چشمہ نکالا اب بتا کہ کس بنا پر تو اس نعمت کا مستحق ہوتا ہے اور میں نے تمہارے لیے ایک درخت لگایا جو ہر روز پھل دیتا حالانکہ اوروں کے لیے سال بھر میں ایک بار پھل دیتا ہے، بتا کہ اس نعمت کا بھی تو کس طرح حقدار بنا اور میں نے تجھے اتنی لمبی عمر عطا کی حالانکہ اور لوگ اس سے بہت کم مدت تک زندہ رہتے ہیں اور اس تمام عرصہ میں مَیں نے تجھے عبادت کرنے کی قوت بخشی اور دوسرے لوگ اتنی مدت تک عبادت کرنے کی طاقت نہیں رکھ سکتے اور میں نے شیطان کو تجھ سے دور رکھا اور تجھے اس سے بچایا حالانکہ بہتیروں کو اس نے تباہ کیا، نیز اتنی لمبی مدت تک میں نے تجھے صحت بخشی حالانکہ اوروں کو نہیں بخشی میں نے تمہاری ذات کو پیدا کیا حالانکہ تو پہلے کوئی چیز بھی نہ تھا، میں نے تمہارے حرکات و سکنات کو پیدا کیا اور ہر طرح کی نعمت تمہیں عطا کی۔ لہٰذا فرشتوں کو حکم دیا کہ اسے جہنم میں لے جاؤ۔ جب اسے فرشتے جہنم کی طرف لے جانے لگے اور اس نے دیکھا کہ میں تو مارا گیا تو کہنے لگا یارب اپنے رحم و فضل سے مجھے جنت میں داخل کر۔ اس پر اللہ تعالیٰ نے فرمایا اور وہ بہت ہی رحیم و کریم ہے۔ اسے واپس لے آؤ۔ اور میرے رحم سے اسے جنت میں داخل کر دو پھر اللہ تعالیٰ نے فرمایا جاؤ میری رحمت سے جنت میں چلے جاؤ۔ تو اچھا بندہ تھا۔ یہ حدیث کا مفہوم ہے اور مجھے اس کا مطالعہ کئے مدت گذر چکی ہے۔

اس کے بعد میں نے حضرت سے دریافت کیا کہ فاسقین اور محرومین دونوں میں سے کس کی عبادت زیادہ بُری ہے؟

فرمایا: محروموں کی عبادت ایک وجہ سے افضل اور احسن ہے وہ یہ کہ اللہ تعالیٰ مہربانی اور رحم کرنے والا ہے چنانچہ جب وہ اپنے بندے کو دیکھتا ہے کہ وہ ایک عرصہ تک اپنی اغراض کو حاصل کرنے کی غرض سے عبادت میں لگا رہا ہے تو اپنے فضل سے اس پر رحم فرماتا ہے کہ اس کی ذات اور افعال کی حقیقت سمجھا دیتا ہے یہاں تک کہ اللہ کی طرف رجوع کرتا ہے اور اپنی عبادت خدا کے لیے کرتا ہے جس طرح بیس سال عبادت گذار عابد اور دیگر بے شمار لوگوں نے کیا۔

میں نے عرض کیا: تو اپنی رحمت اور فضل ہی سے ان کو وہ اجر و ثواب بھی عطا فرمائے گا جو آیات و

احادیث میں مذکور ہے کہ جو وجہ اس کی ہو سکتی ہے کہ ان پر رحم فرمایا اور ان کو حقیقت سے واقف بنایا وہی وجہ اس کے لیے بھی کافی ہے کہ ان پر اجر و ثواب عطا فرما دیے۔

حضرت نے فرمایا: اگر تمہارا مقصد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ انہیں تب اجر دیگا جب انہیں حقیقۃُ الامر کی معرفت عطا کرے گا تب تو ٹھیک ہے، لیکن اگر تمہاری مراد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ انہیں اس وقت بھی اجر دے گا جب ان کا تعلق اللہ سے کٹ چکا ہوگا اور وہ یہ خیال کرتے ہوں کہ ان کے فعل خود ان سے سرزد ہوئے ہیں اور یہ کہ اس کا اجر دینا اللہ پر واجب ہے تو یہ خیال ہرگز نہ رکھنا چاہیئے۔

پھر میں نے عرض کیا کہ فرض کرو ایک شخص نے حدیث نبوی میں یہ بات سنی کہ جو کوئی یوں کریگا اسے یہ یہ اجر ملے گا اور جو فلاں فلاں بات سے باز رہے گا اسے بھی فلاں فلاں اجر ملے گا اور ساتھ ہی اس کا عقیدہ یہ ہو کہ وہ اللہ کے حکم کے بغیر کوئی حرکت نہیں کر سکتا لہٰذا اس حدیث کے سنتے ہی وہ اس پر عمل کرنا شروع کر دے تاکہ جو اجر اس میں بتایا گیا ہے وہ اسے حاصل ہو جائے۔

حضرت نے فرمایا: اگر اس کی آزاد نگاہ اور ارادہ اپنے رب کے حکم کی تعمیل کے لیے ہے اور اجر کی نیت ایک ثانوی حیثیت رکھتی ہو، چنانچہ اگر حدیث میں اجر کا ذکر نہ بھی کیا گیا ہوتا تب بھی وہ اس پر عمل کرتا تو ایسے شخص کو کوئی نقصان نہیں اور اگر اس کی نیت و ارادہ اجر حاصل کرنے کے لیے ہے اور تعمیل حکم کی نیت ثانوی درجہ رکھتی ہو چنانچہ اگر حدیث میں اجر کا ذکر نہ ہوتا تو وہ اس پر عمل نہ کرتا۔ یہی شخص یہاں زیر بحث ہے اور اسی شخص کی ہم مذمت کرتے ہیں کیونکہ اسے دونوں جہان کا خسارہ ہے لیکن اگر اس کی آزاد رائے اور ارادہ دونوں باتوں کی نیت سے ہے تو اس شخص کو اجر ملے گا بشرطیکہ وہ دو صحیح نگاہوں سے دیکھے۔ پہلی نگاہ تو اسے فعل اور اطاعت ہونے کی طرف دیکھے اور یہ کہ اس پر عمل کرنے پر اتنا ثواب دیئے جانے کا وعدہ کیا گیا ہے۔ اس خیال سے عمل کرنے والے کو کسی قسم کی نصیحت کرنے کی ضرورت نہیں دوسری آنکھ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کا اور اس کے فعل کا خالق ہے اور یہ کہ اللہ نے ثواب کا وعدہ فرمایا ہے اور اللہ تعالیٰ اپنا فضل کرنے والا ہے اس پر کوئی ایسی چیز واجب نہیں جس کا اس نے وعدہ کیا ہے اور اس کے باوجود اگر چاہے کسی پر رحم فرمائے اور چاہے تو سزا دے، لیکن بندے نے اپنے رب کا حکم سن کر اس کی اطاعت کی اور اللہ سے اس کے اجر و ثواب کا امیدوار ہوا۔ لہٰذا جب بندہ اپنے رب کی طرف اس اچھی نگاہ سے دیکھے تو اگر وہ ثواب کی طرف نظر رکھے بھی تو اسے کوئی نقصان نہ ہوگا چنانچہ اللہ تعالیٰ اسے اس کا اجر دے گا اور اچھی نیکیاں اس کو ثواب میں ملیں گی

میں نے عرض کیا: اس قسم کے لوگوں کے بارے میں علماء کا اختلاف ہے چنانچہ امام غزالیؒ نے

منہاج العابدین میں لکھا ہے کہ اسے اس کا کوئی اجر نہ ملے گا اور انھوں نے اسے شرک فی العمل قرار دیا ہے اور یہ اس کے نزدیک اس ریاء کی مانند ہے جو عمل کو احاطہ کئے ہوئے ہے لیکن ابوبکرؒ بن العربی نے سراج المریدین میں قرانیؒ نے القواعد والفروق میں لکھا ہے کہ اسے اجر ملے گا اور یہ شرک اسے نقصان نہ دے گا اور یہ عمل اس ریاء کی مانند نہیں جو عمل کو گھیرے ہوئے ہو۔

حضرت نے فرمایا: حق ابن العربیؒ اور قرانیؒ کے ساتھ ہے اس لیے کہ اللہ نیک کام کرنے والوں کے اجر ضائع نہیں کرتا اور اس شخص نے بھی نیک کام کیا ہے چنانچہ اس کے عمل کا جب وہ اس کی ذریت سے نکلے ایک نور ہے اور اس کی نیک نیت اور دوسری آنکھ سے اپنے رب کو دیکھنے کے لیے ایک اور نور ہے جو نورِ العمل سے بڑھ کر ہے لہٰذا کیسے ہو سکتا ہے کہ اسے اجر سے محروم کیا جائے مگر وہ شخص جس کی نگاہ اجر کی طرف نہ لگی ہو، وہ اس سے بھی زیادہ کامل ہے اور یہ پہلی قسم ہے اور دونوں سے بھی اکمل وہ شخص ہے جو کام کی نیت کرنے کے بعد کام سے بے تعلق ہو جائے کہ اسے سوائے ابتدا کے اپنے کام کا کچھ پتہ نہ ہو تب ہم سمجھیں گے کہ اس نے فعل کی نیت اللہ کے لیے کی ہے پھر اپنے خالق سبحانہ کے مشاہدہ میں لگ کر وہ اپنے فعل سے غائب ہو جاتا ہے اور اس کے خیالات اللہ تعالیٰ کی عظمت اور کبریائی میں دوڑ رہے ہوتے ہیں دُعا ہے کہ خدا ہمیں اپنے فضل و کرم سے یہ مرتبہ عطا کرے۔

حضرت نے فرمایا: اسی مشاہدہ سے اللہ تعالیٰ کی محبت پیدا ہوتی ہے اور اللہ کی محبت اس بات کی متقاضی ہے کہ ہم اسی کے ہو لیں اور خدا کا ہو لینا اس بات کا متقاضی ہے کہ اللہ کی طرف سے اجر جو ہو ایسا ہو کہ اسی کے شایانِ شان ہو نہ کہ بندے کی قدر و شان کے مطابق اور عدم مشاہدہ اللہ سے غفلت کا موجب ہے جس سے ذات کی طرف توجہ پیدا ہوتی ہے اور ذات کی توجہ سے لازم آتا ہے کہ اجر بندے کی قدر و منزلت کے مطابق ہو نہ اللہ سبحانہ کی شان کے مطابق۔ یہی وجہ ہے کہ دیکھتے ہیں کہ دو شخص آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر درود بھیجتے ہیں لیکن ایک کا اجر ضعیف ہوتا ہے اور دوسرے کا اتنا اجر نکلتا ہے جس کی کیفیت بیان نہیں کی جا سکتی اور نہ ہی اس کا احاطہ کیا جا سکتا ہے۔ اس کا سبب وہی ہے جو ہم نے بیان کیا کہ پہلے شخص نے درود کو غفلت، اور ان خیالات کے ساتھ پڑھا جن سے اس کا دل معمور تھا گویا کہ اس نے درود اپنی عادت کی وجہ سے پڑھا ہے اسی لیے اسے معمولی اجر ملا لیکن دوسرے نے محبت اور تعظیم سے درود پڑھا

۱؎ قرانی: شہاب الدین ابوالعباس احمد بن القرانی الشافعی متوفی ۶۸۴ھ / ۱۲۸۵ء بیان کتاب میں ان کی کتاب کا نام القواعد والفروق دیا ہے۔ صحیح نام القواعد فی فروع الشافعیہ ہے (ملاحظہ ہو کشف الظنون ج ۲: ۱۲۲)

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت اس طرح پیدا ہوتی ہے کہ مومن اپنے دل میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بزرگی اور عظمت کو رکھے اور یہ خیال کرتا رہے کہ آپ کی بدولت ہی ہر موجود چیز پیدا ہوئی ہے اور آپ کے نور سے ہی ہر قسم کا نور نکلا ہے اور آپ مخلوقات کے لیے رحمت کا تحفہ ہیں اور آپ گذشتہ اور آئندہ سب لوگوں کے لیے رحمت ہیں اور تمام مخلوقات کو ہدایت آپ ہی کی طرف سے اور آپ ہی کی بدولت ہے لہٰذا بندہ اس بہت بڑے مرتبہ کی وجہ سے ان پر درود بھیجے گا نہ کسی اور غرض کے لیے جس سے اس کی ذات کو نفع پہنچے۔

اور آپ کی تعظیم کرنے کا طریقہ یہ ہے کہ آپ کے اس قدر عظیم مرتبے کو نظر میں رکھے اور سوچے کہ یہ آپ کو کس طرح حاصل ہوئی اور ایسے عظیم المرتبت نبی کی خصلتیں کیسی ہونی چاہییں اور یہ کہ تمام مخلوقات آپ کی کسی ایک خصلت کی بھی متحمل نہیں ہو سکتی اس لیے کہ اس کے حقائق آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم میں اس حد تک ترقی کر چکے ہیں کہ ان کی کیفیت کسی کی عقل و فکر میں نہیں آ سکتی چہ جائیکہ کوئی اس کا حامل بن سکے لہٰذا جب کوئی بندہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر درود بھیجتا ہے تو اس کا اجر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے مرتبہ اور اللہ تعالیٰ کے کرم کے مطابق ہوتا ہے اس لیے کہ اس درود کا محرک صرف یہی عظیم منزلت ہے اسی لیے اسی مرتبہ کے مطابق اجر ہوگا۔ اللہ کسی پر ظلم نہیں کرتا یہی حال اس عمل کا ہے جو بندہ اور خدا کے درمیان ہوتا ہے اگر اس عمل کا محرک اللہ تعالیٰ کی بزرگی اور جلالت ہوگی تو اس کا اجر اللہ تعالیٰ کی عظمت کے مطابق ہوگا اور اگر محرک بندے کے اغراض اور ذاتی فائدہ ہوگا تو اجر بھی اسی کے مطابق ملیگا، والسلام

کیا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو ہمارے درود پڑھنے سے کچھ فائدہ پہنچتا ہے؟

میں نے عرض کیا: کیا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو ہمارے درود پڑھنے سے کوئی فائدہ پہنچتا ہے یا نہیں؟ کیونکہ اس مسئلہ میں علماء کا اختلاف ہے۔

حضرت نے فرمایا: کہ اللہ تعالیٰ نے درود پڑھنے کا حکم اس لیے نہیں دیا کہ اس سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو کوئی فائدہ پہنچتا ہے بلکہ خاص ہمارے فائدہ کے لیے اس کا حکم دیا گیا ہے۔ اس کی مثال یہ ہے کہ ایک شخص کے بہت سے غلام ہوں اور اس کی نظر عمدہ زمین پر پڑے جس کا مقابلہ پیداوار کے لحاظ سے کوئی زمین نہیں کر سکتی اسے اپنے غلاموں پر رحم آ جائے اور وہ زمین غلاموں کو دیدے کہ اس کی تمام پیداوار ان کی ہوگی اور وہ اس کے مستقل مالک ہوں گے اس شرط پر نہ دی ہو کہ وہ اس کے شریک ہوں گے یہی حال ہمارے درود کا ہے اس کا تمام اجر ہمارے لیے ہے اور جب کسی وقت اس کے اجر کا نور مشتعل ہو کر آنحضرت

صلی اللہ علیہ وسلم کے نور سے جا ملے تو یوں سمجھو کہ ایک چیز اپنی اصل سے جا ملی۔ اس لیے تمام مومنین کا اجر محض آپکے ایمان کی وجہ سے ہے اور ان کا ایمان پرتو ہے نور محمدی کا لہٰذا وہ اجر جو ہمارے لیے ثابت ہوں گے وہ محض آپ ہی کی طرف سے ہوں گے۔ محسوسات میں اس کی مثال سمندر اور بارش کی سی ہے جب اس کا پانی سمندر کی طرف آتا ہے اس لیے کہ بارش کا پانی سمندر ہی کی طرف سے ہے لہٰذا جب یہ پانی سمندر کی طرف واپس آ جائے گا تو یہ نہیں کہہ سکتے کہ اس پانی سے سمندر کے پانی میں اضافہ ہو گیا ہے۔

میں نے عرض کیا کہ بعض علماء نے آنحضرت کو ہمارے درود پڑھنے سے نفع پہنچنے پر اس طرح استدلال کیا ہے

ۓ اکتوبر ۱۹۴۱ء کی بات ہے جبکہ میں ایمرسن کالج ملتان میں لیکچرار تھا اور وہاں ردین واسن نامی ایک عیسائی فلسفہ کا لیکچرار تھا۔ میرا اس سے اکثر مذاکرہ رہتا تھا چنانچہ ایک دن اس نے سوال کیا کہ لوگ جو انبیاء پر درود بھیجتے ہیں کیوں بھیجتے ہیں کیا ان کے مراتب میں کوئی کمی ہے جسے ہم درود سے پورا کرنا چاہتے ہیں اور کیا واقعی ان کو ہمارے درود سے فائدہ پہنچتا ہے؟ اس وقت تو میں اسے کوئی جواب نہ دے سکا مگر اس سوال پر غور کرتا رہا، بالآخر مجھے اس کا جواب سمجھ میں آ گیا۔

کسی محسن کے احسان کو بھولنا اور اس کا شکریہ ادا نہ کرنا انتہا درجہ کی ذلیل حرکت ہے۔ پھر احسان کا شکریہ بھی اس کے احسان کی مقدار کے مطابق ہونا چاہیئے۔ آنحضرت صلعم کا ایک یہی احسان کہ ہمارا نورِ ایمان آپ کی بدولت ہے نہایت ہی اہم اور عظیم احسان ہے جس کا شکریہ ادا کرنا ہمارے لیے ضروری ہے۔ آپ کے لیے کوئی دنیا کا تحفہ تو تحفہ نہیں ہو سکتا کیونکہ نورِ ایمان کا انعام جو آپ سے ہمیں حاصل ہوا ہے وہ غیر فانی اور لازوال چیز ہے اس لیے ہم بھی شکریہ میں اُخروی اور ابدی چیز کا تحفہ پیش کریں گے اور آپ کے مراتب کی بلندی اور رحمت کی دعا کریں گے مگر اس سے تو آپ کے مراتب میں فرق نہیں آ سکتا اس لیے کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو بلند ترین مرتبہ عطا کر رکھا ہے اس کی مثال یوں سمجھو کہ ایک شخص شہنشاہ اعظم ہے کہ تمام دنیا پر اس کی بادشاہت ہو اور کوئی بے کس انسان جس پر بادشاہ کی عنایت ہوئی یہ دعا کرے کہ خدا تمہیں اور دولت اور سلطنت عطا کرے، یہی حال آنحضرتؐ پر درود بھیجنے کا ہے۔ اب بندہ درود بھیجنے سے اپنے آپ کو شکر گزار بندہ ثابت کر چکا ہے اس لیے اس کی شکر گزاری اور اطاعت گذاری کا فائدہ اسی کی طرف لوٹ آئے گا کہ یہ ایک اطاعت شعار و شکر گزار بندہ ہے اور اس نے اپنے نورِ ایمان کا سلسلہ اپنی اصل سے منقطع کرنا نہیں چاہا ہے۔

اس کی ایک اور مثال یہ بھی ہے کہ ہم اللہ تعالیٰ کی پاکیزگی بیان کرتے ہیں۔ ہماری تسبیح سے اللہ تعالیٰ کی پاکیزگی میں کوئی فرق نہیں آتا اور نہ ہی یہ بات ہے کہ نعوذ باللہ اللہ تعالیٰ کی ذات پہلے کم پاک تھی اور ہماری پاکیزگی بیان

(بقیہ اگلے صفحہ پر)

کہ ان کے اس قیاس اس نفع سے کیا ہے جو آپ کو جنت میں حور و غلمان کی خدمت سے حاصل ہوگا چنانچہ جس طرح آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ان نعمتوں اور پھلوں سے فائدہ اٹھائیں گے جو برتنوں میں آپ کی خدمت میں پیش کئے جائیں گے۔ اسی طرح آپ ان انوار اور اجروں سے فائدہ حاصل کریں گے جو برتنوں میں آپ کی خدمت میں ان حروف میں پیش کئے جائیں گے نیز یہ کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی حالت جنت میں دنیوی حالت جیسی ہوگی لہٰذا یہ قیاس غلط نہیں۔

حضرت نے فرمایا کہ یہ خدام اور غلمان کہاں سے آئے ہیں وہ تو سب نور محمدیؐ سے ہیں بلکہ جنت و ما فیہا سب کا سب نور محمدیؐ سے ہے اس عالم کا قول تو اس وقت صحیح ہو سکتا ہے۔ جب یہ خادم آنحضرتؐ سے مختلف ہوں اور ہمارا ایمان بھی آپ سے مختلف ہو حالانکہ ایسا نہیں ہے۔

حضرت نے فرمایا جس کو علم ہو جائے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی کیا شان ہے بس وہ آرام میں ہو گیا۔

(بقیہ حاشیہ صفحہ سابقہ)

کرنے سے اس کی پاکیزگی بڑھ گئی بلکہ ہماری تسبیح کا فائدہ ہمیں ہی حاصل ہوتا ہے۔ ذاتِ خداوندی میں تسبیح بیان کرنے یا نہ کرنے سے کوئی فرق نہیں پیدا ہوتا۔ یہی حال ذاتِ مصطفویؐ کا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی بیکراں رحمت ان پر پہلے ہی سے نازل ہے۔ ہمارے درود بھیجنے یا نہ بھیجنے سے انہیں کوئی فرق نہیں پڑتا بلکہ درود بھیجنے سے ہماری سعادت مندی ظاہر ہوتی ہے۔

یہ نوٹ لکھنے کے بعد فتح الباری ج ۱۱ صفحہ ۱۴۱ میں مجھے اپنی تائید میں کچھ بزرگوں کے اقوال مل گئے چنانچہ حلیمی کہتے ہیں کہ درود بھیجنے کا مقصد اللہ کی اطاعت کرنا اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا جو حق ہم پر ہے اسے ادا کر کے اللہ کا قرب حاصل کرنا ہے۔ ابن عبد السلام حلیمی کی تائید میں کہتے ہیں کہ ہمارے درود بھیجنے سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سفارش مقصود نہیں اس لیے کہ ہم جیسا بھلا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جیسی ہستی کی کیا سفارش کر سکتا ہے مگر درحقیقت بات یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ہمیں محسن کے احسان کا بدلہ احسان سے دینے کا حکم دیا ہے اور اگر اس کے احسان کا بدلہ نہ دے سکیں تو کم از کم دعا سے ہی ان کی مکافات کر دیں۔ یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کو چونکہ علم تھا کہ ہم آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے احسان کا بدلہ نہیں دے سکتے۔ اس نے ہمیں آنحضرت پر درود بھیجنے کی ہدایت کی۔ ابن عربی کہتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر درود بھیجنے والے کو ہی فائدہ ہوتا ہے کیونکہ اس سے پتہ چلتا ہے کہ درود بھیجنے والے کا عقیدہ اور نیت خالص ہے۔ اس میں محبت کا اظہار ہوتا ہے۔ اطاعت پر مداومت اور ذات مصطفویؐ کا احترام پایا جاتا ہے۔ ۱۲

پھر فرمایا: کہ تو دیکھے گا کہ ایک شخص دلائل الخیرات پڑھ رہا ہے اور جب آنحضرتؐ پر درود بھیجنے کا ارادہ کرتا ہے تو اپنے ذہن میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی صورت کو لاتا ہے وہ ان امور کو جنہیں وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے مانگتا ہے وسیلہ، درجۂ رفیعہ اور مقامِ محمود وغیرہ جن کا ذکر ہر درود میں آیا ہے، بھی ذہن میں لاتا ہے اور اپنے ذہن میں یوں تصور کرتا ہے کہ وہ ان امور کا اللہ سے طالب ہے اور دل میں سمجھتا ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کی دعا قبول فرما کر یہ مراتب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو عطا فرمائے گا اور وہ یہ گمان کرنے لگتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اس سے بہت بھاری نفع پہنچتا ہے چنانچہ وہ خوش ہو کر اور پڑھتا ہے اور جوش سے درود پڑھتا ہے اور آواز کو بلند کرتا ہے اور یوں محسوس کرتا ہے کہ درود اس کے دل کی رگوں سے نکل رہا ہے اور اس پر خشوع اور رقت طاری ہو جاتی ہے اور یوں سمجھتا ہے کہ یہ ایک ایسی کیفیت ہے جس سے بڑھ کر کوئی کیفیت نہیں ہو سکتی حالانکہ یہ خیال بالکل غلط ہوتا ہے چنانچہ اس درود کی وجہ سے اسے اللہ کا قرب حاصل نہ ہوگا اس لیے کہ اس کیفیت کا تعلق اس کے ظن وگمان کے ساتھ درحقیقت ایک باطل چیز ہے اور باطل کا اللہ سے کوئی تعلق نہیں اللہ تعالیٰ سے تعلق صرف اس چیز کا ہوتا ہے جو درحقیقت حق ہو کہ اگر آنکھوں کو کھول کر دیکھے تو درحقیقت ویسا ہی پاوے اور جو چیز ایسی ہوگی اس کا تعلق بھی حق سبحانہٗ کے ساتھ ہوگا اور ہر وہ چیز جسے انسان آنکھ کھول کر دیکھے اور نہ پائے وہ باطل ہے اور باطل کا اللہ تعالیٰ سے کوئی تعلق نہیں۔ لہٰذا درود پڑھنے والے کو چاہیئے کہ اس آفت عظیم سے بچے اس لیے کہ اکثر لوگوں کو اس کی سمجھ نہیں اور وہ یہ سمجھ لیتے ہیں کہ جو رقت اور حلاوت انہیں حاصل ہوتی ہے وہ اللہ کی طرف سے ہے حالانکہ مناسب یہ ہے کہ درود پڑھنے کا محرک آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی محبّت اور تعظیم ہو تب جا کر کہیں اس کا نور چمکے گا، لیکن اگر محرّک ذاتی نفع ہو تو وہ شخص محجوب ہے اور اس کا اجر بھی کم ہو جائے گا اسی طرح اگر درود پڑھنے کا محرک آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا نفع ہو تو اس صورت میں بھی اس درود کا نہ کوئی اللہ سے تعلق ہے اور نہ وہ اللہ تک پہنچے گا۔ واللہ الموفق۔

نیز حضرت نے فرمایا کہ ہر عمل کا اجر ہوتا ہے اور ہر اجر کا ایک نور ہوتا ہے اور اس نور کا اس دنیا میں بھی ذاتِ انسان سے تعلق ہے چنانچہ اعمال اگر خاص اللہ کے لیے ہوں گے اور حسب سابق ذات کی سِر کی حقیقت کے موافق صادر ہوں گے تو اس کے اجر کے انوار ذات عامل پر چمکیں گے اور ذات کو ان کا ادراک و شعور بھی ہوگا جس سے خشوع یا لرزہ یا گریہ وغیرہ جیسا کہ اس نور کا تقاضا ہے طاری ہو جائیگا اور صاحبِ بصیرت سمجھ جائے گا کہ اس کا عمل مقبول ہو گیا ہے اور اسے اجر کی مقدار کا بھی علم ہو جائیگا

اکثر لوگوں کا خیال ہے کہ اجر کا پتہ تو صرف آخرت میں چلے گا حالانکہ یہ حال محجوبین کا ہے ورنہ اہلِ بصیرت پر یہ واضح ہے اور کوئی چھپی ہوئی بات نہیں، لیکن اگر عمل غیر اللہ کے لیے ہو اور حقیقت ذات کے مطابق صادر نہ ہو تو یہ محض بے سود رنج اٹھانا ہے، لہٰذا اس سے ذات پر کوئی نور نہ چمکے گا۔

نیز فرمایا کہ عمل کے وقت عامل اپنا امتحان کرے کیونکہ ہر عمل کا خواہ وہ کس قدر معمولی ہی کیوں نہ ہو، اجر ہے اور اس اجر کا نور ہے جو ذات پر جھلکتا ہے جس کا ذات یقیناً ادراک کرتی ہے لہٰذا اگر عمل کے وقت اس کا دل دنیوی دھندوں اور اللہ سے منقطع کرنے والے امور سے معمور ہوگا تو اسے سمجھ لینا چاہیئے کہ وہ اجر سے محروم کر دیا گیا ہے اسی لیے تو اس کا دل شواغل سے معمور ہے لیکن اگر دل شواغل سے پاک اور اللہ کی طرف لگا ہو تو اسے سمجھ لینا چاہیئے کہ اللہ تعالیٰ نے اس کا اجر دے دیا۔

حضرت نے فرمایا: تو ایک طالبعلم کو دیکھتا ہے کہ ملک بہ ملک علم حاصل کرنے کے لیے اس نیت سے جاتا ہے کہ اسے جاہ وجلال حاصل ہو، اس کی بات کا لوگوں پر اثر ہو یا دنیا یا دیگر باطل اغراض حاصل کرے اور سالہا سال یہی نیت لیے رہتا ہے جس کی وجہ سے وہ نورِ علم سے محروم ہو جاتا ہے اور وہ راسخین فی العلم میں سے نہیں ہو سکتا اس لیے کہ علم کی حقیقت سے وہی شخص واقف ہو سکتا ہے جو دل سے علم کی طرف متوجہ ہو اور اس شخص کا باطن تو دنیاوی اغراض اور دیگر شواغل سے لبریز ہے اور صرف اس کا ظاہر علم میں حرکت کر رہا ہے اور علم اسرار میں سے ہے جسے ظاہر کبھی حاصل نہیں کر سکتا (باطن ہی لے سکتا ہے) یہی حال ان اعمال کے اجور کا ہے جو خالص اللہ کے لیے نہیں ہوتے یہی وجہ ہے کہ انسان ان اجور کو حاصل نہیں کر سکتا کیونکہ اجر بھی اسرارِ الٰہیہ میں سے ہے اور باطن کی مدد کے بغیر ظاہر کبھی اسرار کو نہیں پا سکتا۔ واللہ الموفق۔

لوگ بزرگوں کی قسمیں یا بزرگوں کا نام لے کر فریاد کیوں کرتے ہیں، اللہ کا نام کیوں نہیں لیتے

میں نے حضرت سے سوال کیا کہ کیا وجہ ہے کہ لوگ بجائے اللہ کا نام لینے کے اللہ کے نیک بندوں کا نام لے کر فریاد کیا کرتے ہیں۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ جب کوئی قسم کھاتا ہے تو کہتا ہے فلاں بزرگ مثلاً حضرت عبدالقادر جیلانی[5]

۵؎ عبدالقادر جیلانیؒ: سید عبدالقادر جیلانی بغدادی جو غوث اعظم کے نام سے مشہور ہیں ۴۷۱ھ؍۱۰۷۸ء میں پیدا ہوئے اور ۵۶۱ھ؍۱۱۶۴ء وفات پائی۔

یا حضرت بعزیؒ[1] یا حضرت ابوالعباس سبتیؒ[2] وغیرہ کی قسم۔ اسی طرح اگر کسی کو قسم دلانا چاہتا ہے اور قسم کو زوردار بنانا چاہتا ہے تو کہتا ہے کہ فلاں بزرگ کی قسم کھاؤ اور جب کوئی مصیبت آپڑے اور لوگوں سے بھیک مانگے تو وہ فلاں بزرگ کا نام صراحتہً لیتا ہے اور وہ اس عمل میں قطعی طور پر اللہ سے منقطع ہو جاتے ہیں، لیکن اگر انھیں کہا جائے اللہ کا وسیلہ پکڑو یا یہ کہا جائے کہ اللہ کی قسم کھاؤ وغیرہ تو ان پر اس کا کچھ اثر نہیں ہوتا، اس کا کیا سبب ہے؟

فرمایا کہ جب اہلِ دیوان اولیاء اللہ نے دیکھا کہ لوگوں کی ذات میں ظلمت کی کثرت ہے اور ان لوگوں کی بھی کثرت ہے جو اللہ سے منقطع ہو چکے ہیں اور ان کی ذات خبیث ہو چکی ہے تو انھوں نے عمداً اس طرح کیا کیونکہ اہلِ دیوان کی خواہش یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کا نام وہ لوگ لیں جن کی ذات پاک ہو اس لیے کہ اللہ تعالیٰ اپنے پکارنے والے کی پکار کو سنتا ہے بشرطیکہ دعا کے وقت اس کا دھیان صرف اللہ کی طرف ہو اور اس شخص کی اجابتِ دعا دو طرح سے ہوتی ہے یا تو اس طرح کہ اس کی مراد اسے عطا کر دی جائے یا مراد پوری نہ ہونے کی صورت میں اُسے اس کا راز بتا دیا جائے اور یہ بات صرف اولیاء اللہ کو حاصل ہو سکتی ہے، اللہ سے دور اور محجوب لوگوں کو حاصل نہیں ہو سکتی چنانچہ اگر کوئی ظلمانی ذات اپنے تمام جواہر اور رگوں سے اللہ کی طرف متوجہ ہو اور خدا سے کوئی مراد مانگے اور اللہ تعالیٰ وہ مراد اسے نہ دے اور نہ ہی اسے اس مراد کے مراد کے نہ دینے کا راز بتایا جائے تو ہو سکتا ہے کہ اس کے دل میں اللہ تعالیٰ کے وجود کے متعلق شبہات پیدا ہو جائیں اور وہ اس کی مراد کے نہ پورے ہونے سے بھی بڑھ کر مصیبت اور وبال میں گرفتار ہو جائے (کہ ایمان بھی گیا) لہٰذا اہلِ دیوان نے اسی میں مصلحت سمجھی کہ لوگوں کے دلوں کو اللہ کے نیک بندوں کی طرف لگا دیا تا کہ اگر ان کی ولایت میں کبھی ان کو شبہ پیدا ہو تو انھیں اس کا کوئی نقصان نہ پہنچے۔

پھر فرمایا کہ اللہ سے بے تعلق لوگوں کی کثرت اور ان کی ذات میں ظلمت کی زیادتی کی دلیل یہ ہے

---

[1] حضرت بعزیؒ: غالباً بعزیؒ سے مراد ابویعزی مغربیؒ ہیں جو مغرب میں اولیاء اور صوفیاء کے امام مانے جاتے تھے ابتداءِ حال میں پندرہ سال جنگلوں میں شیروں اور درندوں میں گذارے۔

[2] ابوالعباس سبتیؒ: ابوالعباس احمد بن ہارون الرشید بن المہدی المعروف بالسبتی۔ انھیں سبتی اس لیے کہا گیا کہ یہ ہفتہ (سبت) کے دن اپنے ہاتھ سے اس قدر کما لیتے کہ ان کے لیے ہفتہ بھر کے لیے کافی ہو اور پھر یہ ہفتہ بھر عبادت میں مشغول رہتے۔ بہت صالح اور عابد تھے اور قدرت کے باوجود اپنے باپ کی زندگی میں ہی ترک دنیا کر بیٹھے تھے ۱۸۴ھ میں اپنے باپ کی زندگی ہی میں وفات پائی۔

کہ تم دیکھو گے کہ ایک شخص بیس موزونے کر گھر سے نکلتا ہے اور وہ کسی ولی کی قبر پہ جاتا ہے اور بیس کے بیس موزونے وہاں ڈال دیتا ہے تاکہ اس کی حاجت پوری ہو حالانکہ راستہ میں اسے کئی ایک محتاج فقیر ملتے ہیں اور وہ اس سے اللہ کے نام پر اللہ کا متاع مانگتے ہیں اور وہ انہیں کچھ نہیں دیتا اور ولی کے پاس پہنچ کر سب کچھ ڈال دیتا ہے۔ یہ نہایت ہی بری بات ہے جس کا سبب یہ ہے کہ صدقہ اللہ کے نام، اس کی عظمت اور اس کی خوشنودی کے لیے نہیں دیا گیا اس لیے اگر اللہ کے نام پہ دیا گیا ہوتا تو جو محتاج بھی اسے ملتا وہ اسے دیتا، لیکن جب صدقہ دینے کا محرک اور سبب صرف ذاتی نفع ہوا تو اس نے ایک خاص جگہ کو صدقہ دینے کے لیے مخصوص کر دیا کیونکہ وہ سمجھتا ہے کہ اس جگہ دینے سے مجھے نفع ہوگا اور اس جگہ دینے سے نہ ہوگا۔

نیز فرمایا: میں نے دیکھا ہے کہ صرف آج کے دن باب تلمسان سے ساقیۃ الحمراء تک صالحین کے نام پر اسّی دینار ۳۶۰ بکریاں اور ۲۰۷ بیل دیے گئے اور اللہ کے نام پہ کسی نے دس درہم بھی نہ دیے۔

پھر فرمایا: یہ اللہ سے قطع تعلق کے ان اسباب میں سے ایک سبب ہے جو اس امت پر طاری ہوتے ہیں اور بیشتر لوگوں کو اس کا علم نہیں ہوتا اور اللہ سے منقطع کرنے والے اسباب کی تعداد ۲۳۶ ہے

میں نے عرض کیا کہ اس وقت ان میں سے کچھ آپ کو یاد ہیں۔

اللہ سے منقطع کرنے والے اسباب

فرمایا ہاں لکھ لو: (۱) صالحین کو دنیوی منافع کی غرض سے ہدیہ دینا اور اللہ کی خوشنودی کو مدنظر نہ رکھنا۔

(۲) صالحین کے پاس جا کر اللہ کا وسیلہ لانا تاکہ ان کی مراد پوری ہو چنانچہ زائر کہتا ہے کہ اے فلاں بزرگ تمہیں اللہ کا واسطہ دیتا ہوں کہ میری ضرورت پوری کر دیں۔ یہ امر اللہ سے منقطع ہونے کا اس لیے سبب بنتا ہے کہ زائر نے مناسب اور ضروری بات کو پلٹ کر معاملہ برعکس کر دیا کیونکہ مناسب تو یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ سے دعا مانگی جائے اور اس کے اولیاء کو وسیلہ لایا جائے نہ یہ کہ ان کو اللہ کا وسیلہ کر دیا جائے۔

(۳) وہ امور جو فرض ہیں ان کا سر پہ قرض ہوتے ہوئے صالحین کی زیارت کرنا مثلاً یہ کہ چند نمازوں کی قضا سر پر ہے، ان کو ادا نہیں کیا حالانکہ یہ اللہ کا حق ہے اور اسی میں اللہ کا وہ نور اور راز ہے جس کی بدولت اللہ بندہ پر مہربانی کرتا ہے اور صالح آدمی کی زیارت کے لیے روانہ ہو گیا ہے اور ظاہر ہے کہ اس میں اللہ سے بے تعلقی اور ظلمت ہے اس لیے کہ صالحین کی زیارت کرنا نفل ہے جس کے

ترک سے گناہ لازم نہیں آتا اور فرض کے ترک سے گناہ لازم آتا ہے اور نور سے بھی محرومی ہوتی ہے۔

(۴) جان یا رزق وغیرہ کی خاطر ظالم سے ڈرنا کہ دل میں یوں کہے میں اس کے خلاف نہ کروں گا کیونکہ اگر اس کے خلاف کروں گا تو وہ مجھے قتل کر دیگا یا میری روزی بند کر دے گا وغیرہ وغیرہ جن کی وجہ سے یہ اس سے ڈرتا ہے کیونکہ اگر اسے اس بات کا یقین ہو کہ اللہ تعالیٰ اس کے ساتھ ہے اور اللہ تعالیٰ کا تصرف اس میں اور اس ظالم میں جاری ہے تو وہ سمجھ سکتا ہے کہ صرف خدا ہی فاعل ہے اور کوئی شخص خواہ وہ ظالم ہو یا اور، اس کا کسی کام میں شریک نہیں ہو سکتا۔ تب اسے اللہ کے سوا کسی کا ڈر نہیں ہوتا چنانچہ جس قدر یہ نگاہ قوی ہوتی ہے، اسی قدر اس کا قرب اللہ کے ساتھ بڑھتا جاتا ہے اور جس قدر کم یا معدوم ہوتی ہے اسی قدر اللہ سے دوری اور بے تعلقی ہوتی ہے۔

(۵) یہ طمع رکھنا کہ ظالم کا قرب حاصل کرنے سے رزق ملے گا کیونکہ اگر اُس کو اس بات کا یقین ہو کہ اللہ تعالیٰ ہی رازق ہے تو یہ فعل اس سے صادر نہ ہوتا۔

(۶) کافروں کی مدد کرنا اور انہیں دُنیوی بہبودی سمجھانا اس طرح کہ انہیں (ترقی کا) کوئی راستہ بتائے کیونکہ یہ بھی اللہ سے بے تعلقی کا ایک سبب ہے۔

مؤلف کہتا ہے کہ ہم نے جب بھی کسی شخص کو ظالم کی خیر خواہی کرتے ہوئے دیکھا ہے تو انجام کار اس کی خرابی ہوئی ہے۔

یہاں پر ہم سفیان ثوریؒ کا قصہ لکھتے ہیں کہ ایک شخص نے جوان کے ساتھ جا رہا تھا ایک سپاہی کو نماز کے لیے جگانا چاہا۔ تو سفیانؒ نے کہا اسے اس وقت بیدار نہ کرو۔ ایسا ہی رہنے دو تاکہ ہم اس سے اور اس کے شر سے بچے رہیں۔

(۷) مسلمانوں کی خیر خواہی نہ کرنا کہ کسی بات کو ان کے لیے مضر پائے اور اس سے بچنے کی ان کو نصیحت نہ کرے یا کوئی چیز ان کے لیے مفید سمجھے اور اس کے لیے آمادہ ہونے کا انہیں حکم نہ دے۔

(۸) اللہ کی عبادت کے مقابلہ پر دنیا کی طلب میں محنت و مشقت کو لذیذ سمجھنا چنانچہ جو شخص یہ محسوس کرے تو اسے سمجھ لینا چاہیئے کہ وہ اللہ سے بے تعلقی کے کسی سبب کا مرتکب ہوا ہے۔

(۹) ایسے ذرائع سے دنیا حاصل کرنا جو دنیا سے بھی زیادہ ذلیل و حقیر ہوں۔ پرانے بزرگ دنیا کو دنیا سے اعلیٰ وارفع چیز کے ذریعہ سے حاصل کیا کرتے تھے مثلاً جہاد، تجارت اور کھیتی باڑی وغیرہ حلال اسباب کے ذریعہ سے اور جو دنیا کو جھوٹ، مکر، بدکاری اور جھوٹی قسموں کے ذریعہ سے حاصل کرنا چاہتا ہے وہ دنیا کو ایسے افعال بد سے حاصل کرنا چاہتا ہے جو دنیا سے بھی زیادہ حقیر ہیں۔ لہٰذا جو

شخص اس بات کو اپنے اندر محسوس کرے اسے توبہ کرنی چاہیئے کیونکہ دنیا کو اس سے بہتر ذرائع یعنی حلال سے حاصل کرنا چاہیئے۔

(۱۰) اس نیت سے نیک عمل کرنا کہ اللہ تعالیٰ رحم فرمائے اور ذاتی نفع اور اغراض حاصل ہوں، نہ اس نیت سے کہ اللہ تعالیٰ کی خوشنودی حاصل ہو اور یہ سبب بہت عام پایا جاتا ہے۔ ہاں وہ لوگ جن پر اللہ کا کرم ہے اس سے بچے ہوتے ہیں اللہ تعالیٰ اپنے فضل وکرم سے ہمیں بھی ان میں سے بنائے۔

حضرت نے فرمایا کہ اگر اللہ تعالیٰ دوزخ اور بہشت کو پیدا نہ کرتا تو پتہ چل جاتا کہ کون اللہ کی عبادت کرتا ہے اور کون نہیں کرتا اور جو عبادت کرتا اس کی عبادت خاص اللہ کی خوشنودی کے لیے ہوتی اور اس وقت اللہ کی عبادت کرنے والے کو کمال معرفت حاصل ہوتی، لیکن جب لوگوں نے دوزخ اور بہشت کا نام سُنا تو ان کی نگاہِ اغراض ان کی طرف لگ گئیں اور وہ راستہ سے بھٹک گئے۔

(۱۱) ان مقامات میں معصیت کا مرتکب ہونا جو اللہ کے نزدیک قابل تعظیم ہیں مثلاً مساجد وغیرہ۔ کیونکہ اگر بندہ کو یقین ہو کہ اس جگہ کی نسبت اللہ کی طرف ہے اور وہ دل میں کہے کہ یہ اللہ کا گھر ہے تو وہ اس میں معصیت کا مرتکب نہ ہوگا۔

(۱۲) اغلام۔ جس کے مفاسد کا ذکر آئندہ آئے گا۔

(۱۳) مرد کا اپنی عورت کو بغیر قصور کے مارنا۔ چونکہ عورت کے مرد پر حقوق ہیں (اور مارنے میں اس حق کی خلاف ورزی ہوتی ہے اس لیے) یہ مارنا اللہ سے بے تعلقی کا سبب بنتا ہے۔

(۱۴) اہل وعیال پر نفقہ کا احسان جتانا اور احسان جتانے کی نیت سے یہ کہنا کہ میں نے تم پر اس قدر روپیہ خرچ کیا ہے۔

(۱۵) حسد کرنا۔ اس کے مفاسد کا ذکر عنقریب آئے گا۔ بہت سے معاصی کا یہی سبب بنتا ہے۔

(۱۶) معصیت کو سمجھتے ہوتے اس پر پیش قدمی کرنا۔ آگے چل کر جب ہم ان لوگوں کا ذکر کریں گے جنکو قیامت کے روز سخت عذاب ہوگا تو اس کی تشریح کریں گے۔

مؤلف کہتا ہے کہ اس سے یہ خیال نہ کرنا چاہیئے کہ یہ تو وہی نویں قسم ہے کیونکہ یہ دونوں الگ الگ ہیں۔

(۱۸) والدین کی نافرمانی۔ چنانچہ حضرت نے اپنے پیر عمر بن محمد الھواری سے حکایت کی کہ وہ ایک دن عمر بن محمد کے ساتھ اس بیری کے درخت کے پاس بیٹھے ہوتے تھے جو علی بن حرزہم کے مزار کے باہر

واقع ہے کہ ان کا بیٹا حج کو جانے کے ارادے سے باپ سے رخصت ہونے کو آیا۔ حضرت عمر بن محمد نے اسکو جانے سے منع کیا مگر وہ والدین کا نافرمان تھا اس لیے باپ کی رضامندی کے بغیر ہی حج کو روانہ ہوگیا۔ پھر فرمایا کہ والدین کی نافرمانی کا انجام چار باتیں ہیں۔ ایک یہ کہ دنیا اس سے جاتی رہتی ہے اور اس کو ایسا بُرا سمجھتی ہے جیسا کہ مومن دوزخ کو برا سمجھتا ہے۔ دوسرے یہ کہ جب وہ کسی جگہ بیٹھ کر حاضرین سے کسی بات میں گفتگو کرنے لگتا ہے تو حق تعالیٰ ان کے دلوں کو اس کی بات سننے سے پھیر دیتا ہے اور اس کی گفتگو سے نور و برکت نکال لیتا ہے (اور اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے) کہ وہ لوگوں کی نظروں میں مبغوض بن جاتا ہے۔ تیسرے یہ کہ اہلِ دیوان اولیاء جو صاحب تصرف ہوتے ہیں اس کی طرف نظرِ رحمت سے نہیں دیکھتے اور نہ ان کو اس پر کبھی ترس آتا ہے۔ چہارم یہ کہ اس کا نورِ ایمان آہستہ آہستہ کم ہوتا رہتا ہے پھر جسے اللہ تعالیٰ بدبخت کرنا چاہتے ہیں اس کے ساتھ یہ حالت جاری رہتی ہے یہاں تک کہ اس کا سارا نورِ ایمان چلا جاتا ہے اور کلیتہً فنا ہو جاتا ہے اور وہ کافر ہو کر مرتا ہے۔ خدا ہمیں اس سے بچائے اور جسے اللہ تعالیٰ بدبخت کرنا نہیں چاہتے وہ ناقص الایمان ہو کر مرتا ہے۔ خدا ہمیں اس سے پناہ دے۔

اور فرمایا: والدین کی رضامندی کے بھی چار نتیجے نکلتے ہیں جو مذکور بالا چار نتائج کی ضد ہیں۔ (۱) دنیا اس کو محبوب سمجھتی ہے جیسے مومن جنّت کو محبوب سمجھتا ہے (۲) لوگوں کو اس کی باتیں میٹھی معلوم ہوتی ہیں۔ (۳) اولیاء اللہ اس پر مہربانی کرتے ہیں۔ (۴) اور اس کا ایمان بڑھتا رہتا ہے۔ واللہ الموفق۔

برادر! والدین کی نافرمانی کے چاروں مفاسد پر اور ان کی تابعداری کے چاروں محاسن پر غور کرو۔

(۱۹) اہلِ حجاب سے صحبت اور ان سے میل جول رکھنا مثلاً امیروں اور رئیسوں سے میل جول رکھنا کہ مومن بندہ کی ذات میں ایک نور کا ڈورا ہوتا ہے جو اس کی ذات کے ایک سوراخ سے نکلتا ہے اور اللہ تعالیٰ کے عطیہ سے جا ملتا ہے۔ یہ نور اولیاء اللہ کے میل جول سے زیادہ ہوتا ہے ورنہ کم ہو جاتا ہے اور یہ بھی ڈر رہتا ہے کہ یہ نور کا ڈورا بالکل ہی منقطع نہ ہو جائے اور رئیسوں کے میل جول سے یہ سوراخ بند ہو جاتا ہے اس لیے کہ یہ لوگ اپنی ریاست مال اور جاہ و جلال کی وجہ سے اس کی ذات پر غالب آجاتے ہیں اور وہ ان کی قید اور قبضے میں آجاتا ہے اور اپنے دل و جان سے ان کی طرف مائل رہتا ہے اور ایک مدت دراز تک اسی حالت میں رہنے سے اللہ تعالیٰ کا خیال اس کے دل و دماغ پر آتا ہی نہیں اور پھر اپنی اغراض اور اسی انقطاع کی ڈھیل میں پڑے پڑے نور کا سوراخ بالکل بند ہو جاتا ہے اور یہ آفت صاحبان ریاست سے میل جول کی وجہ سے پہنچتی ہے۔

(۲۰) خلفاءِ اربعہ یعنی حضرت ابوبکر، عمر، عثمان، علی رضی اللہ عنہم میں تفریق کرنا، پھر فرمایا کہ تفریق سے مراد یہ ہے کہ خارجیوں اور رافضیوں کی طرح بعض سے محبت رکھے اور بعض سے بغض اور تفریق اس لیے اللہ تعالے سے قطع تعلق کا سبب بنتی ہے کہ ان حضرات میں سے ہر ایک آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے خصائل میں سے ایک خصلت کا وارث ہے لہٰذا ایک خلیفہ سے بغض رکھنا گویا آنحضرت صلعم سے بغض رکھنا ہے یہی وجہ ہے کہ یہ اللہ سے بے تعلقی کا سبب بن جاتا ہے۔

صحابہ میں کیا خصائل پائی جاتی تھیں

میں نے عرض کیا کہ حضرت ابوبکر[1] رضی اللہ عنہ میں آنحضرت کی خصلتوں میں سے کون سی خصلت پائی جاتی ہے؟

فرمایا: اللہ پر ایمان کی خصلت۔ اس لیے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم میں اللہ پر ایمان کی ایک خاص کیفیت تھی جو اگر تمام روئے زمین کے لوگوں پر خواہ وہ صحابہ ہوں یا کوئی اور، ڈال دی جاتی تو وہ ہلاک ہو جاتے۔ ابوبکر رضی اللہ عنہ اس کیفیت میں سے تھوڑی سی کیفیت کے جس قدر کہ آپ کی ذات متحمل ہو سکتی تھی، وارث ہوتے، اس کے باوجود اُمّتِ محمدیہ میں کوئی شخص ایسا نہیں جو اس خصلت کو اتنا برداشت کر لیتا جتنا سیدنا ابوبکرؓ نے کیا بلکہ آپ کے قریب قریب بھی کوئی نہیں پہنچا، نہ صحابہ میں سے اور نہ اہلِ فتحِ کبیر اغواث و اقطاب میں سے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اسرارِ الوہیت اور حقائقِ ربوبیت اور دقائقِ معرفت اس قدر حاصل ہو چکے تھے کہ جس کی کیفیت بیان نہیں ہو سکتی اور نہ کوئی اس کی طاقت رکھ سکتا ہے اور جن سمندروں میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم غوطہ زن ہوتے ان کے متعلق آپ کی گفتگو ابوبکر رضی اللہ عنہ سے ہوا کرتی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ ابوبکرؓ اس مرتبہ پر پہنچے اس کے باوجود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے آخری تین سالوں میں ان حقائق کے متعلق ابوبکرؓ سے گفتگو نہیں فرمائی کہ کہیں گھل نہ جائیں۔

پھر فرمایا کہ حضرت عمر[2] میں جو خصلت تھی وہ مسلمانوں کے لیے خیر خواہی، ان پر شفقت، ان کو اپنے نفس پر ترجیح دینے، ان کے لشکر کے معاملات کا بندوبست کرنا اور وہ انتظامات ہیں جو عوام و خواص سب کی بہتری کا سبب تھے۔ یہ خصلت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خصلتوں میں سے تھی جس میں سے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو بقدرِ استطاعت ورثہ ملا۔

---

[1] ابوبکرؓ: مدتِ خلافت ۱۱ھ، ۶۳۲ء تا ۱۳ھ، ۶۳۴ء

[2] عمرؓ: " " ۱۳ھ، ۶۳۴ء تا ۲۴ھ، ۶۴۴ء

حضرت عثمانؓ[1] رضی اللہ میں مہربانی، شفقت اور صلۂ رحمی کی خصلت تھی اور یہ بھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خصلتوں میں سے ایک خصلت ہے جس میں سے حضرت عثمانؓ کو اس قدر ورثہ ملا جسقدر کہ آپ برداشت کر سکتے تھے۔

حضرت علیؓ[2] کرم اللہ وجہہ میں شجاعت کی خصلت تھی اور یہ بھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خصلتوں میں سے ایک خصلت ہے جس میں سے حضرت علیؓ کو اس قدر ورثہ ملا جس قدر کہ آپ برداشت کر سکتے تھے۔

پھر فرمایا: اسی طرح ہر ایک صحابی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خصلتوں میں سے کسی نہ کسی خصلت کا وارث ہوا (یعنی اپنی اپنی بساط کے مطابق) اسی لیے کسی ایک صحابی سے بغض رکھنا خواہ وہ کوئی ہو، اللہ سے بے تعلقی کا موجب ہوتا ہے۔

اس کے بعد مجلس برخاست ہو گئی اور میں آپ سے اللہ سے بے تعلقی کے اسباب کی پوری تعداد نہ سن سکا تا آنکہ آپ رحلت فرما گئے۔ اللہ آپ کی برکت سے ہمیں فتح نصیب کرے۔

کن امور سے ایمان بڑھتا ہے

میں نے آپ کو ان امور کو شمار کرتے سُنا جن سے ایمان بڑھتا ہے۔

۱۔ زیارتِ قبور

۲۔ خاص اللہ کے لیے صدقہ کرنا

۳۔ جھوٹی قسمیں کھانے سے پرہیز کرنا۔

۴۔ دوسروں کی شرمگاہ کی طرف نہ دیکھنا اور اگر کہیں اتفاقیہ نظر پڑ جائے تو فوراً آنکھ نیچی کر لینا۔

۵۔ لوگوں کے گناہوں سے تغافل کرنا کیونکہ جو شخص لوگوں کے گناہوں کو دیکھتا ہے اور ان کی ٹوہ میں رہتا ہے اسے اللہ تعالیٰ اس وسوسے میں ڈال دیتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نافرمان پر انعام کرتا ہے اور اپنی نعمت جاری رکھتا ہے اور اسے بہت سے عطیے دیتا ہے چنانچہ جو شخص اس کی معصیت پر نظر رکھتا ہے یہ کہنے لگتا ہے کہ شاید اسے یہ نعمت اس کی معصیت کی وجہ سے ملی ہو اور شیطان اس کے دل میں گناہ کرنے کا خیال ڈال دیتا ہے کہ دیکھو اللہ نے باوجود اس کے گناہوں کے اس پر کس قدر انعام کیا ہے اور تجھے باوجود عبادت کے محروم رکھا ہے یہ تو حکمت کا مقتضی نہیں وغیرہ وغیرہ

---

[1] عثمانؓ: مدتِ خلافت: ۲۴ھ، ۶۴۴ء تا ۳۶ھ، ۶۵۶ء

[2] علیؓ: " " : ۳۶ھ، ۶۵۶ء تا ۴۱ھ، ۶۶۱ء

۶۔ ان علماء کی تعظیم کرنا جو شریعت کے حامل ہیں۔ لہٰذا ان کی تعظیم کرنے سے ایمان میں زیادتی ہوتی ہے حق تعالیٰ ہمیں توفیق بخشے کہ ہم ان کا مرتبہ پہچانیں۔

نیز آپ نے فرمایا کہ اگر لوگوں کو پتہ چل جائے کہ اللہ کے نزدیک علماء کی کیا قدر و منزلت ہے تو کبھی ان کو زمین پر نہ چلنے دیں اور ہر علاقہ کے لوگ اپنے عالم کو اپنی گردنوں پر اٹھائے پھریں۔ واللہ تعالیٰ اعلم۔

اغلام کیوں حرام ہے

حضرت نے فرمایا کہ خدا نے اغلام کو اس لیے حرام فرمایا ہے کہ آدمی کے نطفہ کے ساتھ چند فرشتے گرا کرتے ہیں۔ چنانچہ جب نطفہ مقعد میں گرتا ہے جو کہ بیج ڈالنے کی جگہ نہیں ہے تو وہ سب مر جاتے ہیں اور۔ ایک مرتبہ فرمایا کہ وہ فرشتے کبوتر کے بچوں کی طرح نازک ہوتے ہیں کہ اگر ایک بلند گھونسلہ سے گر کر پتھر پر آ پڑیں تو کیا ان میں کچھ باقی رہ جائے گا، لیکن جب نطفہ عورت کے اندام نہانی میں جاتا ہے کہ درحقیقت بیج ڈالنے کی جگہ ہے تو اس نطفہ کے ساتھ دو قسم کے فرشتے رہ جاتے ہیں۔ ایک قسم باپ کے اور دوسری قسم ماں کے نطفہ کے فرشتوں کی جن کی کل تعداد ۳۶۶ ہوتی ہے، دونوں نصفا نصف البتہ مرد میں دس زیادہ ہوتے ہیں۔ اس لیے کہ آدم اصل ہیں حوا کے لیے۔ پھر اللہ تعالیٰ نے پیدائش مقدر فرمائی تو یہ نطفہ پہلے عَلَقہ پھر مضغہ وغیرہ بنتا ہے اور نطفہ کی ترقی کے ساتھ فرشتوں کی تعداد بڑھتی رہتی ہے چنانچہ جب بچہ دنیا میں آتا ہے تو یہ فرشتے بھی اس کے ساتھ نکل کر آتے ہیں اور وہی اس کی ذات کے محافظ و نگہبان ہوتے ہیں، ان کا سردار وہ فرشتہ ہوتا ہے جو داہنے شانہ پر تعینات ہوتا ہے پس جس طرح بچہ کا نشوونما ماں اور باپ کے درمیان ہوتا ہے اسی طرح ان فرشتوں کا نشوونما ملائکہ ذات پدر اور ملائکۂ ذاتِ مادر کے درمیان ہوتا ہے جن کی کل تعداد ۳۶۶ ہوتی ہے۔

لیکن اگر تقدیر میں لکھا ہو کہ اس نطفہ سے بچہ نہ ہوگا تو جو فرشتے رحم میں جاتے ہیں مر جاتے ہیں، لیکن اس سے بندہ کو کوئی ضرر نہیں پہنچتا کیونکہ اس میں اس کے کسب و فعل کا کوئی دخل نہیں۔ اس کی مثال ایسی ہے جیسے چراغ میں مقدار سے زیادہ تیل بھرا ہو تو تیل کے قطرے بتی سے ٹپکتے ہیں۔ یہ ٹپکتے ہوئے قطرے چمکدار ہوتے ہیں مگر زمین تک پہنچنے سے پہلے ہی بجھ جاتے ہیں اور فرمایا اسی لیے رحم سے منی خارج کرنے کے اسباب پیدا کرنا جائز نہیں کیونکہ ہمیں معلوم نہیں کہ اس نطفہ سے بچہ ہوگا یا نہیں اور اس طرح ہم کہیں بہت سے ملائکہ کو ہلاک کرنے کی کوشش نہ کر بیٹھیں۔

زنا کیوں حرام ہے

جس خرابی کی وجہ سے زنا حرام کیا گیا وہ فرشتوں کی جہت سے نہیں ہے بلکہ قطع نسب کی وجہ سے ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ قیامت کے دن لوگوں کو نسب کی وجہ سے بہت فائدہ پہنچے گا اور دعویٰ نسب بغیر گواہی کے مقبول نہ ہوگا اسی لیے تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے نکاح میں گواہ مقرر کرنے، اس کے اعلان اور اشاعت کا حکم فرمایا اور زانی جو کچھ کرتا ہے چھپا چھپا کر کرتا ہے کیونکہ علی الاعلان کرے تو اسے زنا کی سزا دی جائے لہٰذا وہ نسب کو قطع اور مخلوط کرنے کی کوشش کر رہا ہے۔ ہم اغلام کی خرابی کے بیان میں اس کی طرف اشارہ کر چکے ہیں۔

قیامت کے دن سب سے سخت عذاب کسے ہوگا

ایک روز فرمایا: تجھے معلوم ہے کہ قیامت کے دن سب سے سخت عذاب کسے ہوگا؟

میں نے عرض کیا آپ ہی فرما دیجیے۔

فرمایا جسے اللہ تعالیٰ نے جسم کامل، عقلِ کامل اور صحتِ تام عنایت کی ہو اور اسے ہر قسم کا عیش اور رزق کے اسباب مہیا فرمائے ہوں۔ پھر ایک یا دو یا اس سے بھی زیادہ دن گذر جائیں اور اسے اپنے رب کا خیال بھی دل میں نہ آئے، لیکن جب گناہ کا موقعہ ملے تو تمام جسم و عقل کے ساتھ ادھر توجہ دے اور اس سے لذت اُٹھائے اور پسند کرے مگر اللہ تعالیٰ کا قطعاً خیال نہ آئے اس طرح معصیت کے ساتھ اس کا اتصال ہو جاتا ہے اور اپنے رب سے کلی طور پر بے تعلق ہو جاتا ہے۔ وہ ہمہ تن معصیت کی طرف مائل ہوتا ہے اور اسے انتہائی درجہ تک شیریں سمجھتا ہے لہٰذا قیامت کے دن اس کی سزا یہ ہوگی کہ اس کے تمام بدن کو عذاب میں ڈالا جائے اور کلیۃً" اسی طرف اس کی نظر ہو اور ایک دم آگ میں ڈال دیا جائے اور اسے عذاب میں وہ مزہ آئے جیسا کہ خارش زدہ کو کھجلی کرنے میں مزہ آتا ہے حالانکہ جتنا وہ کھجلاتا ہے اتنا ہی اسے نقصان ہوتا ہے۔

فرمایا: معصیت کی حالت میں بالخصوص اس یاد خدا کی بڑی شان ہے لہٰذا مومن کو چاہیئے کہ جب اللہ کی نافرمانی کرے تو یاد رکھے کہ اس کا ایک قادر رب ہے تاکہ اسے خوف و ہراس پیدا ہو اور اگر اسے بالکل معاف نہ کیا جائے تو کم از کم عذاب کی شدت میں کمی واقع ہو جائے۔ واللہ الموفق۔

معصیت کو جانتے ہوئے اس کی طرف پیش قدمی کرنے کے بیان میں ہم پہلے اشارہ کر چکے ہیں۔

حکایت

حضرت نے معصیت کی حالت میں اللہ کو یاد رکھنے کے متعلق سیدی عمر بن محمد الطواری سے ایک

عجیب حکایت نقل کی ہے۔ سیدی عمر نے بیان کیا کہ ایک شخص جو اپنے نفس پر ظلم کرتا اور ہمیشہ گناہ کا مرتکب ہوتا تھا، میرے شیخ کے پاس میری موجودگی میں آیا اور کہنے لگا "اے میرے آقا میں گناہ کا مرتکب ہوں اور ہمیشہ گناہ کرتا رہتا ہوں اور چھوڑ نہیں سکتا۔ ان سے نجات پانے کی کیا تدبیر ہے۔ شیخ نے فرمایا: افسوس تو کیا تو اپنے رب کی نافرمانی کرتا ہے، گناہ کرنا چھوڑ دو اور پھر کبھی نہ کرنا۔ کہنے لگا مجھ میں چھوڑنے کی قدرت نہیں۔ شیخ نے فرمایا تجھ پر افسوس ہے، اللہ کی طرف رجوع کر۔ پھر جواب دیا مجھ میں قدرت نہیں۔ شیخ نے اس سے تغافل برتا اور اس شخص نے آپ کے پاس ایک یا دو دن قیام کیا۔ جب رخصت ہونے لگا تو پھر اس نے کہا اے میرے سردار گناہ سے کیسے چھٹکارا پاؤں؟ شیخ نے فرمایا: جب تو گناہ کرنے لگے تو تین باتوں کو دل میں یاد رکھو اور پھر جو دل چاہے کرو اوّل تو اس گناہ اور اس کی برائی کو یاد رکھو اور اللہ کے غضب کو یاد رکھو جس کا یہ سبب بنتا ہے دوسرے اپنی ذات اور اپنے نفس کی خباثت کو یاد رکھو (کہ اس قدر حقیر ہونے کے باوجود تو) اپنے رب سے منہ موڑ رہا ہے، تیسرے اپنے رب کے سطوت وقہر اور قدرت کا خیال رکھو کہ جب چاہے تمہیں پکڑ لے، پھر اس کی معافی کو یاد رکھو کہ کس طرح اس نے تمہارے اعمال پر پردہ ڈال رکھا ہے اگر تو ان امور کو صحیح طور پر ذہن میں رکھے تو پھر جو دل چاہے کرو۔ چنانچہ وہ شخص چلا گیا اور کچھ مدت بعد مجھے ملا اور مجھے سلام کیا اور کہا کیا آپ مجھے نہیں پہچانتے میں نے کہا: آپ کون ہیں، کہنے لگا: میں وہی معصیت کرنے والا شخص ہوں حضرت کے کلام کی برکت سے اللہ نے میری دستگیری کی۔ اس طرح کہ جب میں معصیت کا ارادہ کرتا تو جن امور کو حضرت نے یاد رکھنے کو فرمایا تھا، یاد رکھتا تو میں گناہ نہ کر سکتا۔ یہی میری توبہ کا سبب بنا۔ واللہ تعالیٰ اعلم۔

اور فرمایا کہ میرے نزدیک کبیرہ گناہ وہ گناہ ہے جس کا ارتکاب ایسی حالت میں کیا جائے جب انسان کا دل اللہ، اس کے فرشتوں، کتابوں، رسولوں اور یوم آخرت سے بے تعلق ہو چکا ہو خواہ وہ ظاہری طور پر ان سے تعلق ہی کیوں نہ رکھتا ہو کیونکہ یہ ظاہری تعلق کچھ مفید نہیں ہو سکتا۔ ایسی حالت میں گناہ اس لیے کبیرہ بن جاتا ہے کہ بندہ بے تعلقی کی حالت میں دل وجسم، عقل ہاتھ اور پاؤں اور تمام اعضاء سے گناہ میں پڑتا ہے نہ اس کا دل اسے اس کام سے منع کرتا ہے اور نہ کوئی اور بات اسے رب کی یاد دلاتی ہے اور صغیرہ گناہ وہ گناہ ہے جسے بندہ ایسی حالت میں کرے جبکہ اس کے دل کا تعلق اللہ سے اور ان وسائل یعنی رسولوں، فرشتوں اور کتابوں سے ہو جو اللہ تک پہنچا دیتے ہیں کیونکہ ایسی حالت میں جب بندہ کرتا ہے تو بغیر ارادہ کے کرتا ہے اور ساتھ ہی اس گناہ کے ساتھ اسے ایک قسم کا بغض ہوگا اس لیے کہ اس کا دل اسے ملامت کرتا ہوتا ہے لہٰذا جب وہ گناہ کرتا ہے تو اپنے رب کی شرم وحیا

اس میں موجود ہوتی ہے۔

میں نے عرض کیا کہ اس فرق پر یہ اعتراض پیدا ہوتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جو کبیرہ گناہ گنوائے ہیں، ان میں انقطاع عن الحق کی قید نہیں لگائی چنانچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے جیسا کہ صحیحین میں ہے کہ کبیرہ گناہ یہ ہیں: اللہ کے ساتھ کسی کو شریک ٹھہرانا۔ سحر۔ والدین کی نافرمانی اور قتل نفس اور بخاری میں اضافہ ہے جھوٹی قسم کا مسلم میں اس کی بجائے جھوٹ بولنے کو گناہ کبیرہ شمار کیا گیا ہے صحیحین کی ایک اور حدیث میں ہے کہ سات مہلک گناہوں سے بچا کرو: شرک باللہ، سحر، ناحق قتل نفس، یتیم کا مال کھانا، سود خوری، جنگ کے وقت بھاگ جانا اور بے خبر پاک دامن مسلمان عورتوں پر زنا کی تہمت لگانا۔

حضرت نے فرمایا کہ یہ گناہ بندہ سے جبھی صادر ہوں گے جب وہ اللہ سے منقطع ہو گا کیونکہ اگر دل کا تعلق اللہ کے ساتھ قائم ہو تو وہ نہ شرک کرے گا اور نہ جادو اور نہ کسی اور گناہ کا مرتکب ہو گا جن کا ذکر ان حدیثوں میں آیا ہے۔

پھر فرمایا فلاں شخص کو نہیں دیکھتے کہ عنقریب ولی بننے والا ہے حالانکہ اس وقت وہ محجوبین میں سے ہے مگر اللہ کے ساتھ اس کے دل کا تعلق قائم ہے کیا وجہ ہے کہ وہ اس قسم کے گناہ کا ارتکاب نہیں کر سکتا اور ان سے اس طرح ڈرتا ہے جس طرح آگ سے کوئی ڈرے اور فلاں کو دیکھو کہ (باوجود ذکر الہٰی کے) اسے فتح نصیب نہیں ہوئی اور اس کا دل اللہ سے بے تعلق ہو چکا ہے محض زبان کا ذکر سود مند نہیں ہو سکتا اور دیکھ لو کس قدر برے افعال اس سے سرزد ہوتے ہیں۔ خدا ہمیں اپنے فضل و کرم سے ان برائیوں سے بچائے۔ پھر فرمایا کہ بے تعلق کی معصیتیں بھی چھپی نہیں رہتیں اور نہ با تعلق کی۔

پھر فرمایا کہ حصولِ معاش کے جتنے بھی اسباب ہیں مثلاً کھیتی باڑی، تجارت وغیرہ کی مثال اس کشکول کی سی ہے جو فقیروں کے ہاتھ میں ہوتے ہیں اس لیے کہ اللہ تعالیٰ کی عادت اسی طرح جاری ہے کہ بغیر حیلہ کے کسی کو رزق عطا نہیں کرتا بلکہ اس وقت دیتا ہے جب بندہ اسباب رزق کے کسی ایک کشکول کے ذریعے اللہ سے سوال کرے لہٰذا جب یہ کشکول اللہ کی طرف بڑھایا جاتا ہے تو خدا بقدر اس کے مناسب سمجھتا ہے اس میں ڈال دیتا ہے لہٰذا سبب اختیار کرنے والے پر لازم ہے کہ اپنے سبب

ف حضرت عبدالعزیز دباغ رحمۃ اللہ علیہ کے اس فرمان کی تائید کہ کبائر کا ارتکاب انسان اسی وقت کرتا ہے جب اس کا تعلق اللہ سے منقطع ہو جاتا ہے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اس فرمان سے ہوتی ہے: لَا یَزْنِی الزَّانِی حِینَ یَزْنِی وَهُوَ مُؤْمِنٌ. زانی زنا کا ارتکاب مومن ہونے کی حالت میں نہیں کرتا۔ (مترجم)

کی یہی حیثیت سمجھے۔ تاکہ اس سبب کے اختیار کرتے وقت اس کی نظر اللہ کی طرف ہو نہ سبب کی طرف جیسا کہ ایک گداگر کی نظر ان لوگوں کی طرف ہوتی ہے جو اسے خیرات دیتے ہیں اور اپنے کشکول کی طرف نہیں دیکھتا اور جب اس کی نظر اس سبب کے اختیار کرتے وقت خدا کی طرف ہوگی تو اس کا تعلق اللہ سے قائم ہوگا اور یہ سبب اسے اللہ سے ملانے کا ذریعہ بنے گا اس لیے اس کا اعتماد اور بھروسہ اپنے رب پر ہوگا نہ کہ سبب پر اور جب اللہ پر اعتماد ہوگا تو وہ صرف وہی سبب اختیار کرے گا جس کی اجازت اللہ نے دی ہے۔ ایسی حالت میں کم یا زیادہ اسباب کا اختیار کرنا ایک جیسا ہوگا کیونکہ دینے والا خدا تو ایک ہی ہے جسے اس بات پر قدرت ہے کہ ایک ہی سبب میں اسے اس قدر عطا کرے جس قدر اوروں کو متعدد اسباب میں دیتا ہے لہٰذا اسے اللہ سے ڈرنا چاہیئے اور طلب معاش میں اچھا طریقہ اختیار کرنا چاہیئے۔ یہ ان لوگوں کی کیفیت ہے جن کا تعلق اللہ سے ہوتا ہے۔

لیکن دوسرے لوگ جن کا تعلق اللہ سے نہیں ہوتا وہ سبب اختیار کرنے میں خدمت کرتے کرتے مر کھپتے ہیں اور جو ذریعۂ معاش انہیں نظر آئے، خواہ جائز ہو یا ناجائز، اسے اختیار کر لیتے ہیں اور وہ سمجھتے ہیں کہ انہیں روزی اپنی تدبیر اور چالبازی سے حاصل ہوگی چنانچہ اس قسم کے لوگوں کو اللہ سے مکمل بے تعلقی کی وجہ سے دُنیوی امور میں تدبیر، تکلیف اٹھانا اور اس کی تلاش میں مشقت برداشت کرنا اللہ کی فرمانبرداری اور عبادت کے مقابلہ میں شیریں معلوم ہوتا ہے۔

اسی سلسلہ میں آپ نے ایک مرتبہ یوں فرمایا کہ لوگوں کی مثال تو ان لوگوں کی سی ہے جن کی کمریں رسّی باندھ کر بلند پہاڑ سے لٹکا دیا جائے اس طرح کہ آسمان اور زمین کے درمیان لٹکے ہوں اور انہیں اسی طرح ہوا میں مدت دراز تک معلق رکھا جائے چنانچہ ان میں جو سمجھدار ہوں گے انہیں قرار نہ آئے گا اور نہ انہیں کسی اور کے پاس سکون حاصل ہوگا بلکہ ان کی نظر کبھی اس جگہ پر جائے گی جہاں ان کے پاؤں گریں کہ آیا یہ جگہ قریب ہے یا بعید اور کیا وہ جگہ نرم ہے یا سخت اور اگر گر پڑیں تو کیا حالت ہوگی یہ وہ منظر ہے جس سے جگر پھٹ جاتے اور دل پارہ پارہ ہو جاتے اور کبھی ان کی نظر اس شخص پر پڑے گی جس کے ہاتھ میں وہ رسّی ہے جس میں وہ لٹکے ہوئے ہیں کہ کیا وہ ہاتھ سے رسّی چھوڑنے کا ارادہ کر رہا ہے یا ابھی اور وقت باقی ہے اور ان کے درمیان دوستی اور شفقت قائم ہے تاکہ جب وہ چھوڑے، تو ان پر رحم کھائے اور انہیں جہاں بھی گرائے، نرمی سے گرائے یا اس کے اور ہمارے درمیان کسی قسم کی دوستی نہیں ہے اس لیے اسے پروا ہی نہ ہوگی کہ وہ انہیں کس طرح پھینکے۔ اس صورت میں اس کی خوشنودی حاصل کرنے کی کوشش کریں گے مگر ایسی حالت میں یہ کسی طرح بھی ممکن نہ ہوگا اس

کہ وہ کوئی عمل کرنے کے قابل ہی نہیں سوائے اس کے کہ دل و زبان سے عاجزی و انکساری کریں اور اس کی طرف اس طرح دیکھیں گے جس طرح کہ ایک خائف اور رحم کا طالب دیکھتا ہے، پھر اس کے بعد اسے اختیار ہے چاہے رحم فرمائے اور چاہے سزا دے اس لیے ان کے دل اس کے ڈر اور عذاب کے خیال سے گویا آگ میں جل رہے ہوں گے۔

لیکن ان لٹکے ہوؤں میں سے جن کو عقل نہ ہوگی وہ نہ تو اس جگہ کی طرف دیکھیں گے جہاں وہ گریں گے اور نہ اس شخص کی طرف جس کے ہاتھ میں رسی ہے بلکہ ان پر نسیان غالب آجائے گا اور وہ یہی خیال کریں گے کہ وہ جس جگہ اس وقت ہیں، ان کی قیام گاہ ہے لہٰذا وہ قیام کرنے کے اسباب کی تیاری میں مشغول ہوں گے اور وہاں گھر اور محل تعمیر کریں گے اور کھیتی باڑی اور تجارت میں مشغول ہو جائیں گے حالانکہ وہ ہوا میں لٹکے ہوئے ہیں اور انہیں رسی کے معاملے کا احساس ہی نہیں۔ جب وہ رسّی کٹ جائے گی اور جہاں گرنا ہے وہاں آپڑیں گے تب سمجھیں گے کہ بڑی کوتاہی ہوئی کہ اس کا کبھی خیال بھی نہ لاتے اور نہ کوئی اس کی اصلاح کا طریقہ اختیار کیا یہاں تک کہ دعا وزاری بھی نہ کی اور نہ اس جگہ گرنے کی تیاری کی اور نہ جس کے ہاتھ میں رسی تھی اُسے پہچانا ورنہ کم از کم اس کے سامنے گڑگڑاتے اور اس سے نجات اور سلامتی کی درخواست تو کرتے۔

فرمایا اللہ اور آخرت سے غافل اور اس کو یاد نہ رکھنے والے شخص کی یہی حالت ہے کہ رسی تو عمر ہے جو موت کے ساتھ ٹوٹ جاتی ہے اور جہاں گرنا ہے وہ یا جنت ہے یا دوزخ اور جس کے ہاتھ میں رسی ہے وہ خدا ہے۔ چنانچہ عارف لوگ ان چیزوں سے ہمیشہ ڈرتے رہتے ہیں جس کی وجہ سے اللہ انہیں قیامت کے دن آرام و راحت عطا کرے گا اور غافلوں کا حال برعکس ہے۔ واللہ تعالیٰ اعلم۔

رسولوں کے بھیجنے کا مقصد

حضرت نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کی طرف رسول بھیجے اور انہیں اطاعت کرنے کا حکم صرف ایک بات کے لیے دیا اور وہ یہ ہے کہ وہ اسے پہچان کر اسے ایک جانیں اور کسی چیز کو اس کے ساتھ شریک نہ بنائیں لہٰذا جب بندے سے یہ مقصد حاصل ہو جائے تو وہ اللہ کے نزدیک محبوب ہو جاتا ہے۔ آگے چل کر ہم بیان کریں گے کہ حضرت نے فرمایا کہ اطاعت صرف اس دروازے کا کھولنا ہے جس سے نورِ حق مطیع کی ذات پر داخل ہو اور معصیت سے ممانعت اس لیے ہے کہ اس دروازہ کو بند کر دیا جائے جس سے عاصی کی ذات پر باطل کی ظلمتیں داخل ہوتی ہیں لہٰذا جو شخص طاعت گزار ہوا اور اس نے مخالفتوں سے پرہیز کیا تو اس نے اپنی ذات کے لیے نورِ حق کے دروازے کھول دیے اور باطل کی ظلمتوں کے دروازے

بند کر دیے اور جس نے اطاعت کو چھوڑا اور مخالفتوں کا ارتکاب کیا تو اس نے اپنے لیے ظلمتوں کے دروازے کھول دیے اور نورِ حق کے دروازے بند کر دیے اور جس نے اطاعت بھی کی اور معصیت کا ارتکاب بھی کیا اور بیک وقت دونوں کام کیے تو اس نے بیک وقت دونوں دروازے اپنے لیے کھول دیئے لہٰذا بندہ کو قبل اس کے کہ پشیمان ہو اور پشیمانی نفع نہ دے، دیکھنا چاہیئے کہ وہ کس مقام میں ہے اور اس نے اپنے نفس کے لیے کونسا دروازہ کھولا ہے لیکن اکثر لوگ یہی خیال کئے بیٹھے ہیں کہ ظاہر طور اطاعت کرنا ابواب حق کھولنے کے لیے کافی ہے جیسا کہ ظاہر میں مخالفت کرنا شر کا دروازہ کھولنے کے لیے کافی ہے حالانکہ حقیقتاً ایسا نہیں ہے بلکہ ظاہر کا باطن کے موافق ہونا ضروری ہے لہٰذا لوگوں کی چار قسمیں ہوئیں :۔

۱۔ جن کا ظاہر و باطن دونوں اللہ کے ساتھ ہوں ۔ ظاہر اس طرح کہ احکام خداوندی کی تعمیل کریں اور باطن کا مع اللہ ہونا اس طرح ہے کہ اطاعت کے وقت کسی قسم کی غفلت نہ ہو اور انھیں مراقبہ و مشاہدہ حاصل ہو۔ اس قسم کے لوگ اللہ تعالیٰ کے نزدیک محبوب ہیں ۔

۲۔ (جن سے ہمیں خدا بچائے) وہ لوگ ہیں جن کا ظاہر و باطن (دونوں غیر اللہ کی طرف لگے ہوئے ہیں ۔ چنانچہ وہ ظاہر میں احکام خداوندی کی مخالفت کرتے ہیں اور ان کا باطن غفلتوں میں ڈوبا ہوا ہے اس قسم کے لوگ اللہ کے ہاں مذموم ہیں۔

۳۔ جن کا ظاہر اللہ کے ساتھ ہے اور باطن غیر اللہ کے ساتھ چنانچہ ظاہر میں وہ عبادت کرتے ہیں اور ان کا باطن اللہ سے غافل ہوتا ہے اس کی وجہ کہ عبادت بھی انھیں اللہ کی طرف نہ لوٹا سکی، یہ ہے کہ عبادت ان کی عادت بن چکی ہے اور ان کی ذات اس سے مانوس ہو چکی ہوتی ہے پس ایسا شخص طبیعت کے حکم سے عبادت کرتا ہے نہ کہ بحکم شریعت ۔بعض اوقات اس کے ساتھ ایک اور وجہ بھی مل جاتی ہے، وہ یہ کہ وہ شخص لوگوں میں عبادت، زہد اور نیک سیرت ہونے میں مشہور ہوتا ہے لہٰذا اسے ڈر ہوتا ہے کہ اگر عبادت میں کہیں کوتاہی ہوگئی تو لوگوں کی نظروں میں گر نہ جاؤں لہٰذا تو دیکھتا ہے کہ وہ دن رات اس لالچ میں عبادت میں لگا رہتا ہے کہ لوگوں کی نظروں میں اس کی قدر و منزلت بڑھے ۔یہی وہ شخص ہے کہ جس قدر وہ عبادت کرتا ہے اسی قدر اللہ سے دور ہوتا جاتا ہے۔ بعض اوقات اس قسم کے لوگوں کی ملاقات پہلی قسم کے اکابر اولیاء کے ساتھ ہو جاتی ہے تو ولی اس کی بیماری کو پہچان جاتا ہے اور اس کا علاج کرنا چاہتا ہے چنانچہ ولی اسے بعض ظاہری عبادات کو جن کا وہ عادی بن چکا ہوتا ہے چھوڑ دینے کا حکم دیتا ہے لیکن چونکہ بیماری اس

میں گھر کر چکی ہوتی ہے، وہ عبادت کو نہیں چھوڑتا اور تباہ ہو جاتا ہے۔

مؤلف کتاب کہتا ہے اسی قسم کا واقعہ ابو یزید بسطامی[۱] رحمۃ اللہ کے ساتھ پیش آیا۔ انھوں نے ایک آدمی کو جس کی یہی حالت تھی نفلی روزے چھوڑنے کا حکم دیا، لیکن وہ نہ مانا۔ اس کے پیر بھائیوں نے اس سے کہا بھی کہ تجھ پر افسوس کہ اپنے پیشوا کا کہنا بھی نہیں مانتا۔ ابو یزید نے فرمایا جو اللہ کی نظروں سے گر چکا ہے اسے چھوڑ دو۔

۴۔ جس کا ظاہر غیر اللہ کے ساتھ ہو اور باطن اللہ کے ساتھ چنانچہ وہ ظاہر میں تو مخالفتِ احکام کرتا ہے اور اس کا باطن مراقبۂ حق میں ہوتا ہے چنانچہ تم دیکھو گے کہ وہ معصیت تو کر رہا ہے مگر اس کا رب اس کی آنکھوں کے سامنے ہوتا ہے اور اس کا خیال ہمیشہ اسی کی طرف لگا ہوتا ہے لہٰذا وہ معصیت کو بہت بڑی بات سمجھتا ہے گویا کہ پہاڑ سر پر گر پڑا اور وہ ہر وقت غمگین رہتا ہے اور اس قسم کے لوگ تیسری قسم کے لوگوں کے مقابلہ میں اللہ کے نزدیک بدرجہا افضل ہیں اس لیے کہ عبادت کا مقصد انکساری اور اللہ کے سامنے ذلت و عاجزی سے کھڑا ہونا ہے جو اس قسم کے لوگوں کو حاصل ہوتا ہے اور تیسری قسم کے لوگوں کو حاصل نہیں ہوتا۔

ذکر کے وقت چیخنا چلانا

ایک شخص نے سوال کیا کہ بعض اوقات لوگ تڑپنے اور چیخنے لگ جاتے ہیں[۲] اور سائل نے خود اپنا واقعہ بیان کیا کہ جب وہ ذکر اور عبادت میں مشغول ہوتا ہے تو اس کی یہی کیفیت ہو جاتی ہے اور اسے ڈر ہے کہ کہیں یہ شیطان کی طرف سے نہ ہو اور جب دنیا کی طرف متوجہ ہو کر اس کی طرف لگ جاتا ہے تو یہ کیفیت زائل ہو جاتی ہے۔

۱۔ ابو یزید بسطامیؒ: جنہیں بالعموم بایزید کہا جاتا ہے ان کا اصل نام طیفور بن عیسیٰ ہے۔ ان کے دادا پہلے مجوسی تھے پھر اسلام لائے۔ بایزید کا شمار کبار صوفیہ میں ہوتا ہے، ان کی وفات ۲۶۱ھ؍ ۸۷۴ء میں ہوئی۔

۲۔ حضرت جنید بغدادیؒ سے کسی نے پوچھا کہ بعض لوگ وجد میں آ کر جھومنے لگ جاتے ہیں ان کا کیا حکم ہے؟ حضرت نے فرمایا: انہیں چھوڑ دو کہ اللہ کے ساتھ خوش ہو لیں۔ تمہیں صرف ان باتوں کو برا سمجھنا چاہیے جن کے متعلق شریعت نے صراحۃً معصیت کا حکم لگایا ہے راہ طریقت نے تو ان لوگوں کے جگر کاٹ ڈالے ہیں اور تھکان اور کوفت سے ان کی انتڑیاں پھٹنے کو ہیں اور ان کے دل تنگ ہو چکے ہیں لہٰذا اگر اپنی حالت کو درست کرنے کے لیے یہ لوگ سانس لیں تو کوئی حرج کی بات نہیں بھائی اگر تو ان کی کیفیت کا مزہ چکھے تو تو انہیں کپڑے پھاڑنے اور چیخنے میں معذور سمجھے گا (لواقح الانوار ج ۱ ص ۱۵۰-۱۵۱)

فرمایا کبھی روح اپنا نُور ذات انسانی پر ڈالتی ہے جس کی وجہ سے ذات کو یہ اضطراب حاصل ہوتا ہے کبھی رُوح اس نور کو طاعت کی حالت میں ذات پر ڈالتی ہے اور کبھی معصیت کی حالت میں۔ چنانچہ ایک انسان اپنے رب کی نافرمانی میں مشغول ہوتا ہے اور خواہش نفس پر جما ہوا ہوتا ہے کہ یکایک روح ذات پر یہ نور ڈالتی ہے جس کی وجہ سے ذاتِ انسانی پر خشوع طاری ہوتا ہے اور وہ اللہ کی طرف رجوع کرتا ہے پھر فرمایا کہ اگر کسی انسان کو یہ کیفیت طاعت کی حالت میں حاصل ہو تو اپنی طاعت اور عبادت کی طرف اسے منسوب نہیں کرنا چاہیئے ورنہ خود ستائی پیدا ہو جائے گی اور یہ نور جو ذات کو روح سے حاصل ہوتا ہے بمنزلہ لگام کے ہے کیونکہ جب روح ذات کو راستہ سے بھٹکتی ہوئی دیکھتی ہے اور اس کی کجروی کا اندیشہ ہوتا ہے تو یہ نور ذات پر ظاہر ہوتا ہے تاکہ اسے راستہ کی طرف لے آئے۔ یہ کیفیت صرف ان لوگوں سے پیش آتی ہے جن کے لیے اللہ بھلائی چاہتا ہے اس لیے کہ یہ ہدایت کے اسباب میں سے ایک سبب ہے اور جن لوگوں کے لیے اللہ بھلائی نہیں چاہتا، ان کے لیے یہی کیفیت ظلمت بن جاتی ہے جو اسے راستہ سے روکتی اور اطاعتِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے باز رکھتی ہے۔

فرمایا: ہر ذات کی اپنی روشنی ہے جس میں وہ چلتی ہے چنانچہ اگر اس کی روشنی اسے صحیح راستہ پر لے جائے تو یہ توفیق یافتہ ذات ہے اور اگر اس کی روشنی اسے کجرو بنا دیتی ہے اور اسی کو ہم ظلمت کہتے ہیں تو توفیقِ الٰہی نے اس کا ساتھ چھوڑ دیا۔

پھر فرمایا: روح میں ۳۶۶ راز ہیں۔ منجملہ ان کے ایک سِر ایسا ہے کہ اگر روح اس کو ذات پر ڈالے تو آدمی ہر وقت روتا ہی رہے اور ایک سِر ایسا ہے کہ اگر روح اس کو ذات پر ڈالے تو ہر دم ہنستا ہی رہے اور ایک سِر ایسا ہے کہ روح اس کو اگر ذات پر ڈالے تو ہر وقت چیختا رہے، مگر روح وہی اسرار ڈالتی ہے جو تقدیر میں پہلے سے تجویز ہو چکے ہیں۔

ایک دن میں حضرت کے ساتھ ایک جگہ بیٹھا ہوا تھا کہ ایک شخص آکر میرے پاس بیٹھ گیا حضرت کچھ بیان فرما رہے تھے کہ اس نے زور سے بُری طرح چیخنا شروع کر دیا اور دیر تک اس کی یہی حالت رہی۔ اس واقعہ کے بعد حضرت نے مجھ سے فرمایا کہ یہ حالت بڑی چیز ہے بشرطیکہ شیطان اس کے ساتھ نہ کھیلتا ہو اور اس کی نماز کو فاسد نہ کرتا ہو۔

میں نے عرض کیا: حضرت یہ کیسے؟

فرمایا: دلوں کی توجہ کا خدا کی طرف ہونا، یہ ان کی نماز ہے جیسا کہ بدن کا رکوع وسجود بدن کی نماز ہے، نماز اور دیگر عبادات کا حکم صرف اس لیے دیا گیا ہے کہ یہ توجہ حاصل ہو اور عبادات کا یہی مو

نتیجہ اور فائدہ ہے جو بندے کے لیے نفع اور رحمت کا سبب بنتا ہے۔ پس جب شیطان کسی کو دیکھتے ہیں کہ وہ ذکر اللہ یا کوئی اور رقت آمیز وغیرہ بات سنکر یہ توجہ حاصل کرنا چاہتا ہے تو وہ اس بغض و حسد کی بنا پر جو انہیں بنی آدم کے ساتھ ہے، اُس کے دل میں گھس کر اس توجہ کو فاسد کر دیتے ہیں جس سے چیخنے والے کے لیے کئی خرابیاں پیدا ہو جاتی ہیں۔ اوّل یہ کہ وہ توجہ جو اس کے نفع کا سبب ہے، جاتی رہتی ہے۔ دوسرے یہ کہ وہ یہ سمجھنے لگتا ہے کہ اسے کچھ حاصل ہو گیا ہے اور تیسرے یہ کہ اس میں اس بات کا خدشہ ہوتا ہے کہ کہیں وہ اللہ سے بے تعلق نہ ہو جاتے اس لیے کہ وہ اس چیخنے سے اپنے آپ کو کچھ سمجھنے لگتا ہے اور اسی طرح لوگ بھی یہ سمجھنے لگتے ہیں کہ وہ کچھ ہے اور اس کی طرف انگلیاں اُٹھانے لگتے ہیں اور جس کی طرف انگلیاں اٹھیں وہ تباہ ہو جاتا ہے۔

مؤلف کہتا ہے کہ اس حکایت کی تائید اس حکایت سے ہوتی ہے جس کا ذکر شیخ زروق[۵] رحمۃ اللہ نے کیا ہے جس کا ماحصل یہ ہے کہ فاس میں چند درویشوں کی ایک خانقاہ تھی۔ ایک دن انھوں نے ایک صادق الحال شیخ سے جو نابینا تھا، درخواست کی کہ ان کے ساتھ جاتے چنانچہ وہ ان کے ساتھ اس جگہ گئے۔ جب وہ اپنے ذکر میں مشغول ہو گئے تو دفعتہً نابینا بزرگ نے کہا کہ دوستو! شیطان تم میں ایک سینگوں والے مینڈھے کی صورت میں گھس آیا ہے۔ پھر فرمایا کہ تم میں سے سرخ گدڑی والا کون ہے؟ کیونکہ میں نے دیکھا ہے کہ شیطان اسے بری طرح سونگھ رہا ہے اس کے بعد شور مچایا کہ ارے شیطان نے سینگ مار دیا اور سینگ اس کے اندر گھس گیا ابھی اس نے بات ختم نہ کی تھی کہ سرخ گدڑی والے نے چیخ ماری اور اپنے حواس کھو بیٹھا۔ اس اندھے نے پھر کہا کہ تم میں فلاں لباس پہنے ہوتے کون ہے کیونکہ میں دیکھ رہا ہوں کہ شیطان اب اس کی طرف ہو لیا ہے اور اسے سونگھ رہا ہے پھر چلا کر کہا کہ شیطان نے اسے بُری طرح سینگ مارا ہے چنانچہ جسے شیطان نے سونگھا تھا، اس نے چیخ ماری اور حواس کھو بیٹھا۔ اسی طرح باقی حکایت ہے چنانچہ وہ تمام کے تمام اس صادق الحال کی موجودگی کے سبب رسوا ہوتے حالانکہ اس سے پہلے وہ خیال کرتے تھے کہ وہ کچھ ہیں مگر یہ ان کا جہلِ مرکب تھا۔

---

[۵] شیخ زروق: شیخ شہاب الدین ابوالفضل احمد بن محمد البرنسی الفاسی المالکی جو شیخ زروق کے نام سے مشہور ہیں ان کی وفات ۸۹۹ھ بمطابق ۱۴۹۳ء میں ہوئی۔ ان کی کتاب قواعد الطریقۃ فی الجمع بین الشریعۃ والحقیقۃ تصوف میں مشہور کتاب ہے انھوں نے "المقصد الاسمیٰ فیما یتعلق بمقاصد الاسماء" (کشف الظنون ۲: ۳۲۳) اور النصیحۃ الکافیہ لمن خصہ اللہ بالعافیہ بھی لکھی ہے (کشف الظنون ۲: ۱۹۵۳)

حکایت

ایک مرتبہ ایک شخص نے ایک عارف بزرگ کی موجودگی میں چیخ ماری تو اس بزرگ نے کہا کہ میں نے تمہاری چیخ کا پیچھا کیا ہے تا آنکہ وہ فلاں قبرستان میں ایک قبر میں داخل ہو گئی۔ اس پر چیخنے والے نے جواب دیا حالانکہ وہ اس بزرگ کے مریدوں میں سے نہ تھا: حضرت آپ نے درست فرمایا کیونکہ جب میں آپ کے پاس سے گذرا اور دیکھا کہ آپ اپنے محبوب کی یاد کر رہے ہیں تو مجھے اپنی محبوبہ یاد آگئی جو میری چچازاد بہن تھی اور اب مر چکی ہے اور وہ قبر اسی کی قبر ہے چنانچہ جب اس کی یاد آئی تو اس کے فراق کے درد کی وجہ سے میں چیخ اٹھا۔ واللہ تعالیٰ اعلم۔

تمباکو نوشی

حضرت نے فرمایا تمباکو پینا حرام ہے کیونکہ اس سے بدن کو نقصان پہنچتا ہے اور دوسرے یہ کہ پینے والوں کو ایسی لت لگ جاتی ہے کہ اللہ کی عبادت سے غافل بنا دیتی ہے اور قطع تعلق کرا دیتی ہے اور ہمیں جب کسی چیز کے حرام یا حلال ہونے میں شک ہو اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے کوئی نص منقول نہیں ملتی تو ہم اہلِ دیوان اولیاء اللہ کو دیکھتے ہیں اور یہی لوگ اہلِ دائرہ اور اہلِ عدد بھی کہلاتے ہیں پس اگر ان کو اس کا استعمال کرتے دیکھتے ہیں تو ہم سمجھ جاتے ہیں کہ یہ چیز حلال ہے اور اگر دیکھیں کہ وہ اسے استعمال نہیں کرتے بلکہ اس سے پرہیز کرتے ہیں تو سمجھ جاتے ہیں کہ وہ حرام ہے اور اگر بعض استعمال کرتے ہوں اور بعض نہیں تو ہم دیکھتے ہیں کہ اکثریت کس طرف ہے کیونکہ حق اکثریت کے ساتھ ہے اور اہلِ دیوان تمباکو استعمال نہیں کرتے۔ مزید برآں فرشتوں کو اس کی بُو سے تکلیف پہنچتی ہے۔

اس کے بعد حضرت نے ایک متعفن شہر کا قصہ سنایا جہاں باوجود پانی کی قلت کے انسانوں کے فضلے اور جانوروں کے گوبر اس میں جمع ہو گئے تھے اور آپ نے شہر کی صفت، اس کی شکل اور مقام بھی بتایا، لیکن چونکہ ہمارا مقصد اتنے سے ہی حل ہو جاتا ہے اس لیے ہم نے اس کی صفت بیان نہیں کی، فرمایا کہ اس شہر میں اس قدر بدبو پھیلتی کہ بیان سے باہر ہے۔ پھر ایک دن آٹھ اہلِ تصرف اولیاء اس شہر میں آئے مگر جب وسط شہر میں پہنچے تو بڑی سرعت سے وہاں سے نکل گئے جس کی وجہ یہ تھی کہ ان کی ذات کے فرشتوں کو اس بدبُو سے نفرت ہوئی کیونکہ ذات سے ملائکہ کی وحشت اور نفرت سے جو خطرات پیدا ہوتے ہیں انہیں صاحبِ بصیرت لوگ ہی سمجھ سکتے ہیں، اس کی مثال یوں سمجھو کہ ایک شخص کو دشمن اور چوروں کے ملک میں لایا جائے اور پھر اس کے ہتھیار اس سے علیحدہ کر دیے جائیں اب وہ کس چیز سے دشمن کا مقابلہ کرے گا۔

میں نے کہا: لہسن اور پیاز میں بھی تو بُو ہے، لیکن یہ حرام نہیں ہیں؟

فرمایا: جب آدمی اور فرشتہ کے حقوق کا مقابلہ آپڑے تو آدمی کے حق کو مقدم سمجھا جاتا ہے اس لیے

کہ ہر چیز بنی آدم کے لیے پیدا کی گئی ہے لہٰذا جس میں بنی آدم کا فائدہ ہوگا وہ حرام نہ ہوگی خواہ اس سے فرشتہ کو ضرر ہی کیوں نہ پہنچتا ہو اور لہسن اور پیاز کے منافع کسی سے پوشیدہ نہیں۔ برخلاف تمباکو کے کہ اس میں کوئی فائدہ نہیں بلکہ اس کے پینے سے ذات کو نقصان پہنچتا ہے، لیکن بعد میں یہی تمباکو اس مضرت کا دافع بن جاتا ہے۔ اس کی مثال ایسی ہے جیسے کوئی خود کپڑا پھاڑے اور پھر پیوند لگائے اور تمباکو نہ پیتا تو نہ کپڑا پھٹتا، نہ پیوند کی ضرورت پڑتی۔ اس لیے حقہ پینے والے سمجھتے ہیں کہ اس میں نفع ہے حالانکہ اس نفع کی حقیقت بس اسی قدر ہے۔

مولّف کہتا ہے کہ میں نے ایک حقہ پینے والے کو سنا کہ وہ بیان کر رہا تھا کہ ایک ماہر عیسائی طبیب سے بھی اس نے یہی سُنا تھا جو کچھ حضرت نے بیان فرمایا۔

حضرت نے یہ جو بیان فرمایا کہ ذاتِ انسانی سے فرشتوں کے نفرت کرنے میں بہت خطرے ہیں ایک مرتبہ ننگے لوگوں کے ساتھ حمام میں داخل ہونے کے متعلق شیخ حطاب اور شیخ مواق کے اختلاف کا ذکر کرتے ہوئے ہم نے حضرت سے سوال کیا تو اسی قسم کا جواب دیا کیونکہ شیخ حطابؒ[1] فرماتے ہیں کہ اگر ٹھنڈے پانی کے استعمال سے خطرہ ہو تو وہ تیمّم کرے اور حمام میں نہ جائے، لیکن شیخ مواقؒ[2] فرماتے ہیں کہ حمام میں چلا جائے لیکن خود ستر کرے اور اپنی آنکھیں نیچی رکھے تو کوئی حرج نہیں۔

حضرت نے فرمایا کہ شیخ حطاب کی رائے صحیح ہے اور شیخ مواق کی رائے پر عمل کرنے میں خواہ وہ خود ستر بھی کرلے اور انتہائی درجہ پرہیز کرے اور دوسروں کی شرمگاہوں کی طرف بھی نہ دیکھے تب بھی اس میں آفت ہے اور آفت یہ ہے کہ معاصی اور اللہ کے احکام کی مخالفت اسی صورت میں ہوتی ہے، جب انسان میں وہ ظلمتیں پائی جاتی ہیں جن کا جہنم کی ان ظلمتوں کے ساتھ اتصال ہے جن کی وجہ سے جہنم میں شقاوت حاصل ہوگی اور فرشتوں سے بڑھکر اس کی شناخت کوئی نہیں کر سکتا چنانچہ مثال کے طور پر اگر کچھ لوگ خدا کی نافرمانی کے لیے حمام کی چھت کے نیچے جمع ہو جائیں اور سب کے سب معصیت میں مبتلا ہوں تو ظلمت اس تمام جگہ پر چھا جائے گی لہٰذا فرشتے ان سے نفرت کریں گے اور جب فرشتے بھاگ جائیں گے تو شیطان اور اس کا لشکر آئے گا اور اس جگہ کو آگھیرے گا، اس لیے اس مبتلائے معصیت قوم کے انوارِ ایمان کی ایسی حالت ہو جائے گی جیسے جلتے ہوئے چراغوں پر چاروں طرف سے تند ہوا کے جھونکے آ دیں اور چراغ

---

[1] شیخ حطّاب: عارف باللہ محمد بن محمد الحطّاب الرعینی مالکی جنہوں نے شیخ خلیل بن اسحٰق جندی مالکی متوفی ۷۶۷ھ کی کتاب مختصر کی شرح کی ہے۔ مختصر مالکی فقہ کی کتاب ہے (کشف الظنون: ۲: ۲۴۲)

[2] شیخ مواق: امام حافظ عبداللہ بن المواق جنہوں نے بغیة النقاد فی اصول الحدیث لکھی۔

کی تو کبھی ادھر جائے کبھی اُدھر اور کبھی نیچے کے رُخ پلٹے کھا دے حتیٰ کہ خیال ہوتا ہے کہ چراغ بُجھ گیا۔ اسی وجہ سے معاصی کو کفر کا قاصد کہا جاتا ہے ۔ والعیاذ باللہ۔

لہٰذا جب حمام کے لوگ اس حالت میں ہوں گے جس کا ذکر ہو چکا اور فرض کرلیں کہ ایک فاضل دیندار اور پرہیزگار انسان داخل ہوا تو اس کے نورِ ایمان کو بھی ان ظلمتوں کی وجہ سے جو حمام کے اندر موجود ہیں، اضطراب لاحق ہو جائے گا اس لیے کہ یہ ظلمتیں ایمان کی ضد ہیں ۔ اسی لیے اس کے فرشتے بھی مضطرب ہوں گے اور شیاطین کو اس کے متعلق امید بندھے گی اور اس کے پاس پہنچ کر اوروں کی شرمگاہوں کو دیکھنے کی خواہش دلائیں گے اور اسے گمراہ کریں گے غرض ان کے ساتھ ہر لمحہ اس کی جنگ رہے گی ، شیاطین قوت پکڑتے جائیں گے اور وہ ان کے مقابلہ میں کمزور ہوتا جائے گا یہاں تک کہ یہ مغلوب ہو کر شہوت کو پسند کرنے لگ جائے گا اور اسے شرمگاہوں کو دیکھنے میں مزہ آنے لگے گا ۔ نَسْأَلُ اللّٰهَ السَّلَامَةَ ۔

بدکاروں کی مجلس میں بیٹھنا منع ہے

پھر فرمایا کہ فرض کرو کہ کچھ لوگ شراب پی رہے ہوں ، اس سے لذت اٹھا رہے ہوں اور اس قسم کی معصیت کا اظہار کر رہے ہوں جو شراب کا لازمہ ہیں اور شراب کے نشے میں فحش بک رہے ہوں ۔ نہ کسی کا لحاظ کر رہے ہوں اور نہ انہیں کسی کا ڈر ہو ۔ اسی اثنا میں ایک شخص ہاتھ میں "دلائل الخیرات" لئے آجائے اور وہیں ان کے پاس بیٹھ کر "دلائل الخیرات" پڑھنے لگے اور دیر تک پڑھتا رہے یہاں تک کہ تمام دن گذر جائے اور دوسرا دن بھی ہو جائے اور دونوں اپنی اپنی حالت پر ہوں یعنی شرابی تو شراب پیئے جائیں اور معصیت کیے جائیں اور یہ دلائل الخیرات[1] پڑھتا جائے ، یقین جانو کہ تھوڑے ہی عرصہ بعد یہ شخص بھی پلٹا کھا کر ان جیسا ہو جائیگا اس کی وجہ یہی ہے جو ہم نے ابھی بیان کی اس لیے شریعت میں بدکار لوگوں کی مجلس میں بیٹھنے سے روکا گیا ہے کیونکہ خون ، شہوت اور غفلت ہم میں اور ان میں سب پائے جاتے ہیں ۔ ہاں جس پر اللہ

---

[1] دلائل الخیرات : پورا نام دلائل الخیرات وشوارق الانوار فی ذکر الصلوٰۃ علی النبی المختار علیہ الصلوٰۃ والسلام ہے ۔ ان کی ابتدا ان الفاظ سے ہوتی ہے : اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ هَدَانَا لِلْاِیْمَانِ ۔ الخ یہ شیخ ابوعبداللہ محمد بن سلیمان بن ابی بکر الجزولی السملالی الشریف الحسنی متوفی ۸۵۴ھ کی تالیف ہے ۔ یہ ایک معجزہ نما کتاب ہے جس کا ورد مشرق و مغرب میں بالخصوص ممالک روم میں کیا جاتا ہے ۔ چونکہ دلائل الخیرات کی روایت بہت سے لوگوں نے کی ہے اس لیے اس کے نسخوں میں اختلاف پیدا ہو گیا ہے مگر معتبر نسخہ وہی ہے جس کی روایت ابوعبداللہ محمد الصغیر السہیلی نے کی ہے یہ مؤلف کے قابل اعتماد مریدوں میں سے تھے اور اس کی تصحیح انہوں نے ۸۶۲ھ میں اپنی وفات سے آٹھ سال پہلے اپنے شیخ سے کرائی تھی (کشف الظنون : ۱ : ۲۷۹)

رحم فرمائے (وہ محفوظ رہ سکتا ہے) مگر وہ بہت ہی کم ہیں۔ واللہ تعالیٰ اعلم

جہنم کا ذکر

ایک مرتبہ آپ نے دوزخ کی کیفیت بیان فرمائی اور ایسے اوصاف بیان کئے جو ناقابلِ برداشت ہیں حتیٰ کہ حاضرین میں سے ایک صاحب نے کہا کہ یا حضرت، اگر لوگوں کو جہنم کی حقیقت کا علم ہو جائے تو وہ کھانا اور پینا بھی چھوڑ دیں۔ فرمایا جن لوگوں کا اللہ اور اس کے رسول پر ایمان ہے وہ سب جہنم سے واقف ہیں کیونکہ ان میں سے کسی ایک کی زبان پر جہنم کا ذکر آتا ہے تو جس طرح زبان سے ذکر جاری ہوتا ہے اسی طرح دل پر بھی جاری ہوتا ہے اور جب وہ کسی اور کو جہنم کا ذکر کرتا ہوا سنے تو جس طرح کان سنتے ہیں۔ اسی طرح دل بھی سنتا ہوتا ہے اس طرح جہنم پر ایمان رکھنے میں اس کا ظاہر و باطن برابر ہوتا ہے اور جہنم باطن بھی اسی طرح حاضر ہوتی ہے جس طرح ظاہر میں ہوتی ہے لیکن خوبی تو اسی میں ہے کہ یہ حضوری دائمی ہو نہ کہ وقتی لہٰذا جس نے اس حضوری کو دائمی کر لیا اس پر اللہ کی رحمت ہوگئی۔ اس کی غفلت جاتی رہی اور مخالفت کم ہوگئی جس نے اسے دائمی نہیں کیا۔ اس کا معاملہ اس کے برعکس ہوگا۔

میں نے عرض کیا کہ اس حضوری کے دائمی نہ ہونے کی کیا وجہ ہے؟

فرمایا: اس کا سبب وہ خون اور اس کے بخارات ہیں جو جسم انسانی کے اندر پائے جاتے ہیں اس طرح کہ جب بندہ جہنم کا ذکر کرتا ہے یا اس کا ذکر سنتا ہے تو یہ ذکر اس کے دل پر اترتا ہے جیسا کہ بیان ہو چکا تو اس وقت خون اور اس کے بخارات ہٹ جاتے ہیں۔

(مؤلف کہتا ہے) کہ یہی وجہ ہے کہ خوفزدہ انسان کا چہرہ زرد ہوتا ہے۔ لہٰذا جب خون بھاگ گیا تو غفلت جو اسی کی وجہ سے ہوتی ہے وہ بھی زائل ہو جاتی ہے اور جب یہ ذکر جو خون کے بھاگنے کا سبب ہے منقطع ہو جاتا ہے تو خون بھی اپنے مجازی میں لوٹ آتا ہے اور غفلت غالب آجاتی ہے چنانچہ جب انسان پھر اس کا ذکر کرتا ہے تو خون پھر لوٹ جاتا ہے اور غفلت زائل ہو جاتی ہے اور اگر وہ اس کے ذکر سے غافل ہو جاتے تو خون اپنی جگہ پر لوٹ آتا ہے اور انسان پر غفلت طاری ہو جاتی ہے چنانچہ سلسلہ اسی طرح رہتا ہے کہ ذکر سے غفلت دور ہو جاتی ہے اور ذکر سے غافل ہونے سے غفلت آجاتی ہے ہاں البتہ اللہ رحم فرمائے (تو پھر غفلت نہیں آتی)

پھر یاد اور غفلت کی درمیانی مدت کے اعتبار سے لوگوں کی مختلف حالتیں ہیں، بعض ایک گھنٹے میں لوٹ آتے ہیں اور بعض دو گھنٹوں میں اور بعض ایک دن میں لوٹ آتے ہیں اور بعض دو دن میں، لہٰذا جائے دیکھو تم کس قسم میں سے ہو۔ وَمَا تَوْفِيْقِيْ اِلَّا بِاللّٰهِ عَلَيْهِ تَوَكَّلْتُ وَاِلَيْهِ اُنِيْبُ۔

میں نے عرض کیا جب ذات ذکر سنتی ہے تو اس سے غفلت کیوں زائل ہو جاتی ہے اور خون کیوں بھاگتا ہے اور ذات جب ذکر نہیں سنتی تو معاملہ اس کے برعکس کیوں ہوتا ہے؟

فرمایا کہ ذکر کے سننے سے ذات بیدار ہو جاتی ہے اور اسے غفلت سے افاقہ حاصل ہوتا ہے یوں سمجھو جیسے کوئی بے ہوشی سے ہوش میں آگیا تو اس کے تمام افعال درست اور ہوش والوں کے سے ہوں گے اور جب سماع (ذکر) زائل ہو گیا تو ذات پھر خواب غفلت میں چلی جاتی ہے اس حالت میں اس کی مثال اس سونے والے کی ہے جو نہایت مزے کی اور میٹھی نیند سو رہا ہو تو اس حالت میں اگر کوئی اسے بلائے یا پکارے تو وہ بلانے والے کو گرانی اور ناگواری کے ساتھ جواب دیگا اور جوں ہی کہ اسے پکارنا بند کیا وہ پھر سو جائے گا کیونکہ نیند کا اس پر غلبہ ہے اور وہ اسے پکارنے سے پہلے اس پر مسلط ہو چکی ہے یہی حال غفلت کا ہے جو ذاتِ انسانی پر پہلے ہی سے غالب اور مسلط ہے۔

کشف کا سبب انقطاع القلب عن الحق ہوتا ہے

میں نے حضرت سے کشف اور اس میں غور و فکر کے متعلق دریافت کیا کہ اس سے غیب کا علم کیونکہ حاصل ہوتا ہے۔

حضرت نے فرمایا کشف (جفر و رمل وغیرہ علوم) اور خط وغیرہ کا سبب دل کا تعلق اللہ سے ٹوٹ جانا اور باطن کا اللہ کی شاہانہ حکومت سے ویران ہونا ہے کیونکہ جب بندہ اللہ کو اپنے دل سے یاد کرتا ہے اور وہ سمجھتا ہے کہ اللہ تعالیٰ ہی کی یہ شان ہے کہ جو چاہے کرے اور جو چاہے حکم دے، اس کے سوا نہ جہان کا کوئی اور تدبیر کرنے والا ہے اور نہ ہی اس کے ملک میں کوئی اس کا شریک ہے۔ اللہ تعالیٰ بندوں پر بید مہربان ہے کہ ان کی تمناؤں سے زیادہ ان کو دیتا ہے اور ان کے وہم و گمان سے بڑھکر ان پر رحم فرماتا ہے اس حالت میں انسان بخوشی اللہ تعالیٰ کو اپنا کارساز بناتا ہے اور تمام کاموں میں اسے ہی رہنما قرار دیتا ہے اور ہمہ تن اسی کی طرف متوجہ ہوتا ہے اور دل سے اسی کا ہو رہتا ہے اور اپنی ساری کنجیاں اور باگ ڈور اسی کے قبضہ میں دے دیتا ہے اور اپنے تمام امور میں اس کے سوا کسی اور پر اعتماد نہیں رکھتا، اس وقت اس کو اپنے آقا کے برتاؤ میں جو اس کے ساتھ ہوتا ہے وہ خوبیاں اور بھلائیاں دیکھنے میں آتی ہیں جنہیں نہ آنکھوں نے کبھی دیکھا اور نہ کانوں نے سُنا اور نہ کسی بشر کے دل پر ان کا وہم و خیال گذرا۔ یہ شان تو اس شخص کی ہے جس کا دل اللہ تعالیٰ سے معمور ہو، لیکن جس کا دل اللہ سے خالی ہو اور غفلت اس پر غالب آچکی ہو اور اسے اپنی ذات کے سوا کچھ اور نظر نہ آتا ہو اور وہ یہ خیال کرتا ہو کہ تمام افعال خود اس سے صادر ہوتے ہیں تو اس قسم کا آدمی ان علوم مذکورہ میں مشغول ہوتا ہے اور اپنی اندھی رائے اور تاریک تدبیر

کے موافق یوں چاہتا ہے کہ واقعات آئندہ کا علم حاصل کروں تاکہ بکثرت خوبیاں اور منافع حاصل کرسکوں لہٰذا حق تعالیٰ اس کو اس کے نفس کے حوالہ کر دیتا ہے اور اس کی اپنی تدبیر ہی اس کی ہلاکت کا سبب بنتی ہے اور اللہ تعالیٰ اسے طرح طرح کی بلاؤں اور مصیبتوں میں مبتلا کرتا ہے اسے امیدوں میں ناکامی ہوتی ہے اور مقصود ہاتھ سے جاتا رہتا ہے۔ جیسا کہ ہم اس فن کے لوگوں کو دیکھتے ہیں۔ نَسْأَلُ اللّٰہَ السَّلَامَۃَ بِمَنِّہٖ وَفَضْلِہٖ اور یہ سزا اس شخص کے لیے جو اپنے آقا سے مُنہ موڑے اور اپنی تقدیر اور قسمت پر راضی نہ ہو تھوڑی ہے۔

عجیب حکایت

پھر فرمایا کہ ایک عیسائی راہب کا عجیب وغریب قصّہ ہے، وہ یوں ہے کہ یہ شخص راہبوں کا سردار اور ان کا لیڈر سمجھا جاتا تھا۔ یہ جب بھی گرجا سے نکلتا تو صلیب کی طرف پیٹھ کر کے نہ نکلتا تھا تاآنکہ وہ گرجا سے نکل جاتا۔ ایک دفعہ ایسا اتفاق ہوا کہ اس کا بیٹا ایسے وقت میں سفر کو گیا جبکہ سمندر موجزن تھا۔ اس سے اسے اپنے بیٹے کے متعلق سخت خوف لاحق ہوا اور وہ ہر وقت اس کی خیریت معلوم کرنے کے انتظار میں رہتا تاآنکہ اسے خبر ہوئی کہ وہ بخیریت واپس آگیا۔ اس سے اسے اس قدر خوشی ہوئی کہ وہ گرجا سے نکلتے وقت اپنی عادت کو بھول گیا۔ چنانچہ صلیب کی طرف پیٹھ کر کے باہر نکل آیا۔ مگر جب بیٹے سے ملا تو اسے یاد آیا کہ وہ تو صلیب کی طرف پیٹھ کر کے باہر نکل آیا ہے لہٰذا وہ اسی وقت واپس آگیا اور راہبوں سے کہا کہ مجھے ایک ہزار کوڑے لگاؤ۔ انھوں نے جب اس کا سبب پوچھا تو بتایا کہ آج میری پیٹھ صلیب کی طرف ہوگئی ہے انھوں نے اس حرکت کو بہت بڑا گناہ سمجھا اور انھوں نے اس کو کوڑے مارنے شروع کیے یہاں تک کہ ہزار کی تعداد پوری کردی مگر اس سزا کے باوجود صلیب کی محبت قائم رہی۔ لوگوں کا خیال تھا کہ جو تکلیف اسے کوڑے لگنے سے ہوئی ہے اس کی وجہ سے اس کی نیت صلیب کے متعلق بدل جائے گی اور وہ اپنا مذہب چھوڑ دے گا، لیکن اس نے چھری لے کر اپنے دونوں پاؤں کو ٹخنوں سے کاٹ ڈالا اور کہا جو اپنے آقا سے منہ موڑے اس کی یہی سزا ہے۔[1]

حضرت نے فرمایا: جب اس قسم کی باتیں گمراہ لوگوں سے صادر ہوں تو ان لوگوں کا کیا حال ہونا چاہیئے جو

---

[1] امیر خسرو نے اسی قسم کی ایک برہمن کی حکایت بیان کی ہے جو سومنات کو زمین پر رینگتا ہوا جارہا تھا۔ راستہ میں ایک حاجی مل گیا اس نے برہمن سے کہا کہ اس طرح تو کب سومنات پہنچ سکتا ہے۔ برہمن نے جواب دیا کہ اگر میری جان بھی بت کی راہ میں چلی جائے تو کوئی مضائقہ نہیں اس کے بعد امیر خسرو نتیجہ کے طور پر یہ شعر لکھتے ہیں:

اے کہ زبت طعنہ بہندو بری   ہم زوے آموز پرستش گری

حق پر ہیں اور حق سبحانہ کی عبادت کرتے ہیں، پھر فرمایا: کیونکہ اللہ تعالیٰ کے علمِ ازلی اور ارادۂ ازلی میں یہ بات آچکی ہے کہ اس نے کچھ لوگوں کو پیدا کیا اور ان کو اپنی رحمت کا اہل بنایا ہے اور کچھ اور لوگوں کو پیدا کیا اور انہیں عذاب کا اہل بنایا اس لیے ان کی حرکات اور کوشش بھی اسی کے مطابق ہوتی ہیں، لہٰذا اہلِ رحمت کے دلوں کو اپنے سے متعلق کر دیا اور ان کی ہمت کو اپنی طرف پھیر دیا، اسی لیے تو ان کی حرکات و سکنات اس کے تابع ہوتی ہیں چنانچہ ان کی نماز، ان کا روزہ، ان کا اٹھنا، ان کا بیٹھنا، ان کی بیداری اور ان کی محبت سب اللہ کے لیے ہی ہوتی ہے، اللہ تعالیٰ انہیں اپنی محبوب چیزوں کی تحریک کرتا رہتا ہے یہاں تک کہ وہ اللہ تک پہنچ جاتے ہیں اور اس کی رحمت حاصل کرنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں اس طرح وہ رحمت کے اس حصہ کو پا لیتے ہیں جو ازل سے ان کے لیے لکھا گیا تھا۔

لیکن اللہ نے اہلِ نقمت و عذاب کے دل اوروں کی طرف لگا رکھے ہیں اور ان کی ہمتیں ان اشیاء کی طرف پھیر دی ہیں جو مکڑی کے جالے سے بھی زیادہ کمزور ہیں جیسے کہ وہ امور جن کا ذکر ہو چکا (علم جفر و رمل وغیرہ) لہٰذا ان کی تمام حرکات و سکنات انہی امور کے تابع ہوتی ہیں چنانچہ ان کا اٹھنا، ان کا بیٹھنا ان کی بیداری اور ان کی تمام کوششیں غیر اللہ کے لیے ہوتی ہیں تا آنکہ ازلی وعید جو ان کے لیے مقرر ہو چکا ہے پورا ہو جائے اور وہ مقرر کردہ عذاب کا حصہ پالیں۔

حکایت

ایک بزرگ نے مجھ سے یہ قصہ نقل کیا کہ میں صبح سے زوال کے وقت تک دو سن رسیدہ آدمیوں کے پاس بیٹھا جن کی عمر تقریباً ستر سال کی ہو چکی تھی اور وہ اس تمام عرصہ میں دنیا کی باتیں کرتے رہے اور ان کی زبان پر نہ اللہ کا ذکر آیا اور نہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا، میں اٹھا اور تازہ وضو کر کے دو لڑکوں کے پاس آبیٹھا جو روزہ رکھنے کے قابل ہونے والے تھے اور وہ اللہ تعالیٰ کی وحدانیت اور اس کی صفات کے متعلق باتیں کرتے رہے اور میں نے ان سے عجیب و غریب باتیں سنیں۔ مجھے ان دونوں کی اس کیفیت کو دیکھ کر اور ان بوڑھوں کی حالت دیکھ کر تعجب ہوا۔ ذلک تقدیر العزیز العلیم۔

حکایت

حضرت نے اس کی تائید میں کہا کہ جب اللہ تعالیٰ اپنے بندے کے دل کو غیر سے متعلق کر دیتا ہے تو اس کو اس قدر ڈھیل دیتا ہے کہ اسے گمان بھی نہیں ہوتا اور ایسی چیزوں سے اسے مدد پہنچاتا ہے جو اس کے لیے فتنہ بن جاتی ہیں حتیٰ کہ مغیبات وغیرہ اس کے لیے ظاہر ہونے لگ جاتے ہیں اس پر آپ نے ایک حکایت بیان کی جس کے سننے سے دل دہل جاتے ہیں اور وہ یہ کہ اللہ تعالیٰ نے ایک ولی کا تمام مرتبہ سلب کر لیا اور اس کے دل سے نورِ حق منقطع ہو گیا، اس سلب سے پہلے اس سے کرامات ظاہر ہوتی تھیں اور سلب ہونے کے بعد اس سے عجیب و غریب طبی باتیں ظاہر ہونے لگیں۔ درحقیقت یہ

امور اس کے لیے فتنہ کا سبب تھے تاکہ وہ سلب کے بعد بھی یہ سمجھتا رہے کہ وہ کچھ ہے۔ ہر جگہ کے لوگوں کو اس کی خبر ہوئی اور وہ بہت سامال لے کر اس کے پاس آنے لگے وہ مال جمع کرنے میں بڑا حریص تھا۔ چنانچہ تیرہ سال تک اس کی یہی حالت رہی اور اسی عرصہ میں اس نے ستر ہزار دینار جمع کر لیے، لیکن جب مرا تو اس کا کوئی وارث نہ تھا۔ اس لیے تمام مال بیت المال میں داخل کر دیا گیا اور اس کا انجام خسران ہوا نسئال اللہ السّلامۃ والعافیۃ۔ واللہ تعالیٰ اعلم۔

ولی کو کسی کے جُنبی ہونے کا علم کیسے ہو جاتا ہے!

میں نے حضرت سے سوال کیا کہ اگر کسی شخص پر غسل کرنا فرض ہو گیا ہو، لیکن اس نے غسل نہ کیا ہو تو ولی کو اس کا علم کس طرح ہو جاتا ہے۔

فرمایا: اولیاء اللہ کے نزدیک جنابت کی کئی ایک قسمیں ہیں، لیکن غسل ایک ہی میں واجب ہوتا ہے پھر اولیاء کے نزدیک جنابت کے کئی ایک اسباب ہیں اور علماء کے نزدیک اس کا صرف ایک ہی سبب ہے چنانچہ اولیاء اللہ کے نزدیک ان تمام اسباب میں غسل واجب ہوتا ہے، لیکن علماء کے نزدیک صرف ایک سبب سے واجب ہوتا ہے۔

اس پر میں نے سوال کیا کہ وہ کونسا امر ہے جس کا علماء کے نزدیک تو ایک ہی سبب ہے اولیاء اللہ کے نزدیک اس کے متعدد اسباب ہیں۔

فرمایا: وہ یہ ہے کہ ذات اپنی نگاہ میں اللہ سے اس طرح منقطع ہو جائے کہ اس کی تمام نگاہیں اللہ کی طرف سے بند ہو جائیں اور اس کا ہر رگ و ریشہ غیر اللہ کے ساتھ سرور سے لبریز ہو اور اس کی اور اس کے تمام اجزاء و جواہر کی ساری توجہ اس کی طرف ہو بشرطیکہ یہ غیر اس حالت میں اللہ سے تعلق منقطع کرنے والا ہو لہٰذا جب ذات اس طرح سے کلی طور پر اللہ سے منقطع ہو جاتی ہے تو ملائکہ اور محافظ فرشتے اس سے بھاگ جاتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ سے بندہ کے تعلق کے ٹوٹ جانے کو بہت بڑا گناہ سمجھتے ہیں۔ لہٰذا صوفیہ کے نزدیک ہر وہ بات جس سے ذات اللہ سے کلی طور پر منقطع ہو جائے اس سے غسل واجب ہو جاتا ہے لیکن علماء کے نزدیک جماع یا اس قسم کی کسی اور بات سے غسل واجب ہو جاتا ہے۔ پھر فرمایا کہ غسل کا راز یہ ہے کہ ذات کو اس انقطاع سے پاک کر دیا جائے کیونکہ یہ انقطاع بمنزلہ نجاست حسیّہ کے ہوتا ہے چنانچہ جب انسان غسل کرنے لگتا ہے تو فرشتے بھی واپس آنے لگ جاتے ہیں لہٰذا جب ولی فرشتوں کو اس ذات سے جو اللہ سے منقطع ہو چکی ہے، بھاگتا ہوا دیکھتا ہے تو وہ سمجھ جاتا ہے کہ اس بھاگنے کا سبب یہی اللہ سے انقطاع ہے جو جنابت کی وجہ سے پیدا ہوا ہے۔

میں نے عرض کیا آپ کے فرمان کے مطابق اگر کوئی شخص جماع کے وقت اللہ کی طرف دھیان رکھے تو اس پر غسل واجب نہیں ہونا چاہیئے۔

فرمایا: ایسا شخص شاذ و نادر ہی کوئی ہوگا اور نادر پر کوئی حکم نہیں لگایا جاتا۔ واللہ تعالیٰ اعلم

ولی کامل انسان کو ایک لحظہ میں واصل باللہ بنا سکتا ہے

میں نے حضرت کو یہ کہتے ہوئے سنا کہ ولی میں یہ قدرت ہوتی ہے کہ وہ اگر کسی کے کان میں کوئی بات کہہ دے اور جب کہہ کر اٹھے تو وہ شخص اور وہ ولی بغیر کسی قسم کے فرق کے معارف میں برابر ہو جائیں ان سے مراد یہ تھی کہ ولی کامل انسان کو ایک لحظہ کے اندر واصل باللہ بنا سکتا ہے۔

پھر فرمایا: لیکن اس کا سارا دار و مدار اس گوند پر ہے جس سے یہ راز چسپاں کیا جاتا ہے، لیکن ذاتِ انسانی میں گوند ہی نہ پائی جاتی ہو تو سر اپنی اصل کی طرف لوٹ آتا ہے۔ اس کی مثال ایسی ہے جیسے کوئی ہوا پر قمیص شلوار اور عمامہ پہنا دے۔ کیونکہ ظاہر ہے کہ یہ چیزیں ہوا پر قائم نہ رہ سکیں گی، میں نے حضرت سے اس کے متعلق مزید دریافت کرنا چاہا، لیکن اس وقت نہ پوچھ سکا اور عشا کے قریب مجلس برخاست ہوگئی جب رات کو سویا تو حضرت خواب میں آئے تو میں نے وہی سوال کیا تو آپ نے فرمایا کہ وہ گوند "موتِ نفس" ہے جب صبح کو آپ کی خدمت میں حاضر ہوا اور میں نے خواب والے جواب کا ذکر کیا تو فرمایا جواب درست ہے اس پر میں نے سوال کیا کہ موتِ نفس سے کیا مراد ہے؟ آپ نے اس کا جواب ایک بار تو یوں دیا کہ موتِ نفس کی یہ علامت ہے کہ بندہ کے تمام افعال خالص اللہ کے لیے ہوں اور اگر اعمال غیر اللہ کے لیے ہوں گے تو یہ نفس کے زندہ ہونے کی علامت ہے۔

پھر فرمایا: اس کی ایک اور علامت ہے وہ یہ ہے کہ جب بندہ کے دل میں وسواس پیدا ہوں تو یہ نفس کے زندہ ہونے کی دلیل ہے اور جس قدر نفس زندہ ہوگا اسی قدر زیادہ وسواس ہوں گے۔ جس کے دل میں وسواس نہیں، اس کا نفس بھی نہیں اور جس کے دل میں وسواس آئیں اس کا نفس زندہ ہے اور جس کا نفس زندہ ہوگا اس کے اعمال اللہ کے لیے نہ ہوں گے بلکہ اپنے نفس کے لیے ہوں گے اسی کے لیے اس کی ساری دوڑ دھوپ اور تدبیریں ہوں گی۔

اس پر میں نے عرض کیا پھر اس کا کیا تریاق ہے جسے اگر اس نفس پر ڈالا جائے تو نفس مرجائے اور اس طرح پگھل جائے جس طرح نمک پانی میں پگھل جاتا ہے آپ ہمیں بتلائیں تاکہ ہم اس پر وہ تریاق ڈالیں اور اس نفس سے نجات حاصل ہو۔ فرمایا: اس کا کوئی علاج نہیں، صرف ایک علاج ہے اور وہ یہ کہ اس پر بہت بڑا پہاڑ گرے، میں نے عرض کیا وہ بڑا پہاڑ کیا چیز ہے؟

فرمایا: وہ پہاڑ اللہ کی معرفت اور اس کا مشاہدہ ہے لہٰذا جب بندہ کا دل اللہ کی معرفت سے معمور ہوگا اور اسے یقین ہوگا کہ اللہ اس کی باتوں کو دیکھ اور سُن رہا ہے اور یہ کہ اس کی ہر حرکت کا محرک اللہ تعالیٰ ہی ہے اور اللہ تعالیٰ ہی اس پر جو انعامات چاہتا ہے کرتا ہے اور یہ کہ آخرت میں اسے اپنے رب کے ہاں جانا ہے اور وہ اسے جہاں چاہے گا ڈال دے گا۔ جب وہ ان باتوں کو سوچے گا تو اسے یقینی طور پر اس بات کا علم ہو جائے گا کہ وہ نہ اپنے آپ کو، اور نہ کسی اور کو، نہ اس دنیا میں، نہ آخرت میں کسی قسم کا فائدہ پہنچا سکتا ہے۔ ہاں اگر اللہ تعالیٰ عطا کرے تو اس وقت وہ اوروں کی طرف نظر اٹھا کے نہیں دیکھتا اور اس کا نفس مر جاتا ہے خدا اپنے فضل و کرم سے ہمیں نفس کو مارنے کے اسباب عطا کرے۔ واللہ تعالیٰ اعلم۔

میرا گزر کچھ لوگوں کے پاس سے ہوا جو ضامہ (ایک قسم کا کھیل) کھیل رہے تھے۔ اس پر میں نے حضرت سے دریافت کیا کہ اس کھیل کے کھیلنے کے متعلق شریعت کا کیا حکم ہے؟

حضرت نے فرمایا: یہ کھیل کھیلنا حرام ہے۔

میں نے سوال کیا: کیوں حرام ہے؟

فرمایا تمام محرّمات کی وجہ تحریم ایک ہی امر ہے اور وہ انقطاع عن اللہ ہے لہٰذا ہر وہ چیز جو اللہ سے تعلق توڑ دے اور شارع کی اس میں کوئی غرض بھی نہیں پائی جاتی تو اسے اللہ تعالیٰ حرام قرار دے دیتے ہیں پھر فرمایا کہ اس کھیل میں سوائے اس کے کہ اللہ سے غافل کر دے کوئی اور فائدہ تو پایا نہیں جاتا کیونکہ اس کھیل کے کھیلنے والے جب یہ کھیل کھیل رہے ہوتے ہیں تو دل و جان سے اس میں اس طرح مشغول ہو جاتے ہیں کہ ان کی ذات کی تمام نگاہیں اس گھڑی میں اللہ کی طرف سے مسدود ہو جاتی ہیں۔

میں نے اعتراض کیا کہ تیر اندازی سیکھنے اور گھوڑ دوڑ وغیرہ آلاتِ حرب میں بھی تو انسان کی یہی کیفیت ہوتی ہے کہ وہ اس وقت اللہ سے منقطع ہو جاتا ہے۔

فرمایا: یہ چیزیں پہلی کھیل کی سی نہیں ہیں اس لیے کہ اس کھیل میں شارع کی کوئی غرض موجود نہ تھی اور ان میں بندہ کے لیے بھی کوئی فائدہ نہیں پایا جاتا برخلاف تیر اندازی اور گھوڑ دوڑ وغیرہ آلاتِ حرب کے کہ ان کا سیکھنا اعدادِ قوت کے تحت میں آجاتا ہے جس کا حکم اللہ تعالیٰ نے آیت وَأَعِدُّوا لَهُم مَّا اسْتَطَعْتُم مِّن قُوَّةٍ وَمِن رِّبَاطِ الْخَيْلِ (کافروں سے جنگ کرنے کے لیے جس قدر قوت تم تیار رکھ سکو اور جس قدر گھوڑے تیار رکھ سکو، رکھو) میں فرمایا ہے چنانچہ جو چیز بھی شارع کا مقصود ہو یا مقصود ہونے کی اس میں صلاحیت ہو وہ اللہ سے قاطع نہیں ہو سکتی۔ پھر فرمایا: یہی وجہ ہے کہ شطرنج کی حلّت کے

بارے میں ائمہ میں اختلاف پایا جاتا ہے۔ بعض (امام شافعی) نے تو اسے اس لیے مباح قرار دیا کہ اس میں کیفیتِ جنگ وغیرہ کی تعلیم پائی جاتی ہے اور اس کا مقصودِ شارع ہونا صحیح ہو سکتا ہے اور بعض نے اسے اس خیال سے حرام قرار دیا ہے کہ کیفیتِ جنگ وغیرہ کے سیکھنے میں شارع کی غرض صرف اسی خاص طریقہ پر موقوف نہیں ہو سکتی بلکہ یہ غرض کسی اور طریقہ سے بھی حاصل ہو سکتی ہے جو اس سے زیادہ آسان اور زیادہ واضح ہو۔ اسی لیے شطرنج کی حرمت کا حکم ضامہ سے کم درجہ کا ہے واللہ تعالیٰ اعلم۔

مومنین کی محبت توبۂ نصوح کا سبب ہوتی ہے

حضرت نے صالحین میں سے ایک شخص کا قول نقل کیا کہ مجھ میں رجوع الی اللہ کے راسخ ہونے، اس کی شاخوں کے پھیلنے اور اس کی جڑوں کے مضبوط ہونے اور اس میں انتہا تک پہنچنے کا سبب بلا امتیاز تمام مومنین سے محبت اور بلا امتیاز تمام کافروں سے بغض رکھنا ہے۔

پھر فرمایا: جب بندے میں یہ محبت پائی جائے تو خواہ پسند کرے یا نہ اللہ کی طرف سے اس پر توجہ (توجّہ الی اللہ) کا نزول ہوتا ہے اور اگر وہ اسے دور ہٹانے کا ارادہ کرے تب بھی اتر کر رہے گی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ انسان مومنین کی محبت میں امتیاز اس طرح کرے کہ بعض سے محبت رکھے اور بعض سے بغض صرف اسی وقت رکھتا ہے جب اس کے دل میں حسد یا تکبر کی وجہ سے چھپا ہوا بغض پایا جائے لہٰذا اس کی نیت بد ہوگی اور توبۂ نصوح تو اسی شخص کو نصیب ہوتی ہے جس کی زمین طیب اور ارادہ پاک ہو اور جب وہ تمام مومنین سے محبت رکھے گا تو تمام مکاریاں اس کے دل سے اُٹھ جائیں گی اور اس وقت اس پر توبہ کا نزول ہوگا۔

حضرت نے ایک بار یوں فرمایا کہ اس قسم کے آدمی کو (جس کے دل میں عامۃ المسلمین کی محبت پائی جائے) توبہ کی ضرورت نہیں رہتی کیونکہ یہ عام محبت تمام گناہوں کو مٹانے کے لیے کافی ہے اس لیے کہ یہ ان تمام مکاریوں کو جو گناہ کا موجب بنتی ہیں، دل سے محو کر دیتی ہے۔ نیز فرمایا، ان میں سب سے بڑا فریب حسد ہے جو اس محبت کے ہوتے ہوتے نہیں رہ سکتا۔ ہم نے حسد کو سب سے بڑا فریب اس لیے قرار دیا ہے کہ تمام معاصی اور مکر اسی سے نکلے ہیں اور یہ ان سب کا سبب ہے کیونکہ کسی شخص سے اس لیے بغض رکھنا کہ اس کا مال یا اولاد وغیرہ تم سے زیادہ ہے حسد کے بغیر نہیں ہو سکتا۔ اسی طرح جب تو اس تکبر اور غرور کے ذریعہ سے اسے اس مرتبہ تک پہنچنے سے روکنا چاہے گا اور یہ اسی لیے ہوگا کہ تو یہ نہیں چاہتا کہ یہ مرتبہ اسے مل جائے اور اسی کا نام حسد ہے۔ اسی طرح تمام گناہوں کی اصل حسد نکل سکتی ہے۔

(مؤلف کہتا ہے) کہ حسد کی نحوست کا ذکر پہلے ہو چکا ہے اور یہ بھی بیان ہو چکا ہے کہ حسد الواب ظلام میں سے ایک باب ہے اور وہاں ہم نے اس بات کی طرف بھی اشارہ کیا تھا۔ خدا ہمیں اپنے نفس کے شر اور ہر شر انگیز بات کے شر سے بچائے۔

اگر تمام مومنین سے محبّت کی جائے تو حبّ فی اللہ اور بغض للہ کہاں رہا!

اس پر میں نے حضرت سے سوال کیا جب یہ شخص بلا امتیاز تمام مومنین سے محبت کرے تو حب فی اللہ اور بغض فی اللہ جو ایمان کی شاخوں میں سے دو شاخیں ہیں، کہاں رہا۔ اس لیے کہ ہمیں معصیت کرنے والے سے بُغض رکھنا چاہیئے چنانچہ جب ہم اس سے فی اللہ محبت رکھیں گے تو مقتضائے مشیت کے خلاف کریں گے۔

بغض معصیت... سے ہونا چاہیئے نہ کہ مومن سے

حضرت نے فرمایا ہمیں بغض[1] گناہگار کے افعال سے ہونا چاہیئے نہ کہ اسکی مومن ذات اس کے طاہر دل اور ایمان دائم سے۔ جو امور اس کی محبت کو لازم قرار دیتے ہیں وہ تو دائمی ہیں برخلاف ان گناہوں کے جو اس سے بغض رکھنے کو لازم قرار دیتے ہیں وہ عارضی اور وقتی ہوتے ہیں لہٰذا ہمارے دلوں میں مومن کی محبت جاگزین ہونی چاہیئے اور امور عارضہ سے بغض ہونا چاہیئے اور اپنے ذہن اور آنکھوں کے سامنے اس کے گناہوں کو یوں سمجھنا چاہیئے جیسے اس کے کپڑوں سے پتھر بندھے ہوں چنانچہ اس کے کپڑوں سے بندھے ہوئے پتھروں سے تو بغض ہو گا، لیکن اس کی ذات سے محبت ہو گی، شریعت نے ہمیں معصیت کرنے والے سے اسی قدر بغض رکھنے کا حکم دیا ہے اس سے زیادہ کا نہیں۔ اکثر لوگ ذات سے خارج افعال کے بغض اور ذات کے بغض میں فرق نہیں کرتے۔ وہ چاہتے تو یہ ہیں کہ افعال سے بغض رکھیں، لیکن انہیں اس کا طریقہ نہیں آتا لہٰذا وہ ذات سے بغض کرنے لگ جاتے ہیں حالانکہ ہمیں صرف کافر کی ذات سے بغض رکھنے کا حکم دیا گیا ہے اسی لیے ان کی ذات اور جو کچھ ان کی ذات سے صادر ہوتا ہے سب سے بغض رکھتے ہیں، لیکن ہمیں معصیت کار مومن سے ایسا بغض رکھنے کا حکم نہیں دیا گیا جس سے اس کی ذات کی محبّت انس کے

---

[1] حضرت ابوالدرداء، عویمر بن زید متوفی ۳۲ھ فرماتے ہیں: "جب تمہارا مسلمان بھائی خدا کی نافرمانی کرے تو تجھے صرف اس کے عمل سے بغض رکھنا چاہیئے کیونکہ جب وہ ترک معصیت کر دے گا تو پھر پہلے کی طرح بھائی ہو گا (لواقح الانوار: ۱: ۲۱) پھر فرماتے ہیں اگر تمہارے (مومن) بھائی میں تغیر پیدا ہو جائے اور وہ کجرو ہو جائے تو تو اس کی کجروی کی وجہ سے اسکو ترک نہ کر دے۔ اس لیے کہ بھائی کبھی راہِ راست پر اور کبھی گمراہ ہوتا ہے۔ پھر فرمایا: حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ امام نخعی اور دیگر بہت سے لوگوں کا یہی دستور تھا (لواقح الانوار: ۱: ۲۱)

ایمان باللہ ہونے کی محبت، ایمان بالرسول کی محبت، تمام رسولوں پر ایمان لانے کی محبت، تمام انبیاء پر ایمان لانے کی محبت، تمام آسمانی کتابوں پر ایمان لانے کی محبت، یوم آخرت اور جو کچھ بھی آخرت میں ہوگا یعنی حشرونشر، جنت و دوزخ اور صراط و میزان کی محبت اور اس کے ملائکہ پر ایمان رکھنے کی محبت اور خیر و شر کی تقدیر پر ایمان لانے کی محبت بجھ جاتے اس طرح ہم ہر قابلِ تعریف وصف پر اس سے محبت رکھیں گے لہٰذا جب ان پسندیدہ خصال کی وجہ سے اس کی محبت ہمارے دلوں میں سما چکی ہوگی تو اس کا بغض کبھی بھی ہمارے دلوں میں داخل نہ ہوسکے گا۔ ہم صرف اس کے افعال سے بغض رکھیں گے اور اس کے لیے دعاءِ خیر کریں گے بالخصوص جب ہم اس کی طرف حقیقت کی نگاہ سے دیکھیں۔ اکثر لوگوں کا یہ حال ہے کہ جب وہ معصیت کار سے بغض رکھنا چاہتے ہیں تو سب سے پہلے ان کی توجہ اس کی ذات سے بغض رکھنے کی طرف جاتی ہے اور وہ ان خصلتوں کو نظر انداز کر دیتے ہیں جن کی وجہ سے اس سے محبت کرنا واجب ہو جاتا ہے اسی لیے انکے دلوں میں اس کا بغض جگہ پکڑ لیتا ہے اور وہ ہوتے ہوتے اس کی ذات سے بغض کرنے لگ جاتے ہیں۔ چنانچہ ان کی نظروں میں اس کی ذات مبغوض ہو جاتی ہے حالانکہ یہ بات جائز و روا نہیں۔ واللہ تعالیٰ اعلم۔

لوگوں کی توجہ اپنی طرف کرنے کی غرض سے عمدہ لباس پہننا یا خوراک کھانا وغیرہ بُری بات ہے

میں نے حضرت کو یہ کہتے ہوئے سنا کہ جو شخص اپنی سواری، لباس، مکان اور خوراک وغیرہ میں لوگوں سے امتیاز رکھتا ہے وہ بُرا شخص ہے۔ میں نے عرض کیا: یہ کیوں کر بُرا ہوا؟

فرمایا: یہ لوگوں کے دلوں کو اپنی طرف متوجہ کرکے انہیں اللہ سے منقطع کر دیتا ہے۔ اسی لیے اس کا ممتاز ہونا اسے اللہ سے منقطع ہونے کا باعث بنا۔

اس پر میں نے عرض کیا کہ وہ لوگ جو اللہ سے پہلے ہی محجوب ہیں اور اس کی طرف متوجہ ہوتے ہیں وہ تو پہلے سے ہی اللہ سے منقطع ہو چکے ہوتے ہیں، اس لیے انہیں اس کی طرف متوجہ ہونے سے کوئی نقصان نہیں پہونچتا۔

فرمایا (کیوں نہیں) بے تعلقی تو پہلے سے ہوتی ہے اس پر اور بے توجہی کا اضافہ ہو جاتا ہے نیز زبان جو ذات اس امتیاز میں مشغول ہوتی ہے روح اس سے بھاگنے لگتی ہے۔

اس لیے کہ اس امتیاز سے روح کو ذلت و خواری لاحق ہوتی ہے لہٰذا وہ ذات کے فعل کو بُرا سمجھ کر اس سے نفرت کرنے لگتی ہے اور اسے اپنے خالق کے ساتھ جو برتاؤ مناسب تھا اس کا راستہ نہیں دکھاتی

اور یہ بات اس کی ہلاکت کا سبب بنتی ہے۔

(مؤلف کہتا ہے) اس صورت میں اس امتیازی شان دکھانے میں آفتیں پائی گئیں ایک اپنے لیے اور ایک اوروں کے لیے۔

حاضرین میں سے ایک صاحب نے جو بڑے سخی اور کریم تھے عرض کیا کہ حضرت اگر کوئی شخص اس امتیازی شان سے صدقہ وخیرات کرے تو کیا وہ مضر ہے؟

فرمایا: ہاں جہاں تک ہو سکے اسے صدقہ چھپا کر کرنا چاہیے۔[1]

نیز فرمایا: میں ایک شخص کو جانتا ہوں کہ اس نے مغرب اور عشاء کے درمیان پچیس مثقال سونا فقیروں میں صدقہ کیا اور ان میں سے ایک بھی اسے نہ جانتا تھا۔

اس سخی نے سوال کیا: حضرت وہ صدقہ تو چھپا کر کرتا ہے، لیکن اگر اس کا دل اسی کی طرف لگا رہتا ہے اور اس سے خوش ہوتا ہے۔

فرمایا: اگر اس کے دل کا صدقہ کی طرف لگا رہنا صدقہ سے خوش ہونے کی وجہ سے اور اسے اپنے خیال میں بڑی بات سمجھنے کی وجہ سے ہے جس کی وجہ سے اس کا دل خوش ہوتا ہے تو یہ بات مانع صدقہ نہیں کیونکہ ممکن ہے کہ صدقہ کرنے والا کبھی اس نظر سے غافل ہو جائے اور صدقہ عیب سے سالم نکلے اور حق تعالیٰ اسے قبول فرمالے۔

طولِ عمر میں حکمت

حضرت نے فرمایا کہ ہماری عمریں لمبی کرنے میں یہی فائدہ ہے۔ ہم ساٹھ ستر سال تک بھی زندہ رہتے ہیں تاکہ شاید ہمیں اتنی لمبی عمر میں کوئی قبولیت کی گھڑی ہاتھ آجائے (اور ہم نجات پا جائیں) کیونکہ ہم پر شہوت اور نفس کا اتنا غلبہ و تسلط ہے کہ ہمارا کوئی عمل بھی پاک نہیں ہوتا اور نہ کوئی عمل (ریا و نمود سے) خالص ہوتا ہے۔ لہٰذا اس قسم کے اسباب نیک کام سے مانع نہیں ہو سکتے، لیکن اگر نفس کا صدقہ کو دیکھنا ریا۔ و نمود کی غرض سے ہو یا اس شخص نے صدقہ محض لوگوں کی خاطر کیا ہو تو اس صورت میں یہ علت صدقہ سے مانع ہو گی اور اس فعل کو معصیت بنا دے گی۔ اگرچہ بظاہر دیکھنے میں یہ ایک عبادت دکھائی دیتی ہے۔

(مؤلف کہتا ہے) اس تفصیل سے حضرت کا اشارہ آئمہ کے اس فرمان کی طرف ہے کہ غرور کے خوف سے کوئی کام نہیں چھوڑنا چاہیئے، البتہ اگر ریاء پایا جائے تو اسے ترک کرنا چاہیئے خدا حضرت سے راضی ہو آپ کے علم کا دائرہ کس قدر وسیع ہے اور مجھے اس سے اکثر تعجب ہوتا ہے۔ تعجب پر تعجب کی بات یہ ہے کہ

[1] تمام نوافل کا یہی حکم ہے یعنی اخفا مگر فرائض مثلاً زکوٰۃ میں اظہار ضروری ہے

ایک عامی اور اُمّی ہوتے ہوئے آپ سے ان علوم کا ظہور ہوتا جن کا نہ شمار ہو سکتا ہے اور نہ کوئی ان کے متحمل ہونے کی طاقت رکھ سکتا ہے اور نہ ہی آپ کو ان کے ذکر کرنے میں سوچنے کی ضرورت پڑتی ہے۔ پاک ہے وہ خدا جس نے حضرت کو یہ علوم لُدُنّی اور معارف ربانی عطا کیے۔

اس کے بعد اس سخی نے پھر سوال کیا کہ حضرت فرمائیں کہ ہمارے اعمال خواہ وہ صدقہ ہو یا کوئی اور عمل، خالصاً للہ کیسے ہو سکتے ہیں؟

حضرت نے فرمایا: جو کام بھی تم اجر یا نیکی کی نیت سے کرو وہ اللہ کے لیے نہیں ہے۔ کسی اور کے لیے ہے اور اس میں وسوسوں کا آنا بھی ضروری ہے۔ چنانچہ جب تو اس نیت سے صدقہ کرے گا تو تجھے دل میں خیال پیدا ہوگا، ہو سکتا ہے کہ جسے صدقہ دیا گیا وہ صدقہ کا اہل نہ ہو اور اگر اہل تھا تو ممکن ہے کہ کوئی اور شخص اس سے زیادہ حقدار اور اس کو دینے میں مقبولیت کا زیادہ امکان ہو اور میں نے اسے صدقہ نہیں دیا۔ حتیٰ کہ آخری وسوسہ یہ ہوگا کہ نہ معلوم میرا صدقہ اللہ نے قبول بھی کیا ہے یا نہیں اور جس عمل میں وسوسہ کا دخل ہو گیا، اس میں اللہ کا کوئی حصہ نہیں کیونکہ وسوسہ شیطان کی طرف سے ہوتا ہے اور جو کام اللہ کے لیے ہو، شیطان اس کے قریب بھی نہیں پھٹک سکتا۔

سائل نے پھر سوال کیا: اگر میں اجر اور نیکی کی نیت سے صدقہ نہ کروں اور اللہ کے قرب حاصل کرنے کی نیت سے کروں تو کیا یہ بھی نقصان دہ ہے یا نہیں؟

فرمایا: ہاں! یہ بھی مضر ہے۔ اللہ تعالیٰ کے قرب کی نیت بھی ایک غرض ہے، لہٰذا اس غرض سے عمل کرنا اسی غرض کی خاطر ہے۔

فرمایا: خالص اللہ کے لیے عمل ہونے کا مطلب یہ ہے کہ انسان اللہ کے اوصاف جلال و کمال اور اس کی کبریائی اور عظمت کو معلوم کرے اور دیکھے کہ اللہ تعالیٰ کی کس قدر اَن گنت اور بے شمار نعمتیں اسے حاصل ہیں چنانچہ وہ سمجھ لے کہ خدا ہی اس بات کا اہل ہے کہ اس کے سامنے سر جھکایا جائے اور اس کے سامنے عاجزی کی جائے اور اس کے دل میں حظوظِ نفس میں سے قطعاً کسی حظ کا خیال نہیں آنا چاہیئے چہ جائیکہ اس کا عمل ہی اس حظ کی خاطر ہو۔ بلکہ اس کے ذہن میں یہ خیال ہونا چاہیئے کہ اگر وہ ابدالآباد تک بھی اللہ کی عبادت کرتے رہیں اور جس قدر بھی بھاری اور تکلیف دہ عبادت ہو سکتی ہو، اللہ کی ہمیشہ کے لیے اطاعت کرتے رہیں اور ان کی عمر بھی لمبی اور وہ ان اعمال پر مداومت بھی کرتے رہیں تب بھی وہ اس حق کو ادا نہ کر سکیں گے جو اللہ کے بندہ پر واجب ہے۔ بندہ کو حظِ نفس کے لیے عمل کرنے کا خیال تو اس وقت کرنا چاہیئے جب وہ اپنے رب کے حقوق کی ادائیگی سے فارغ ہو چکا ہو لہٰذا جب وہ اللہ کے ایک حق کو بھی ادا

کرنے کی طاقت نہیں رکھتا تو اللہ کے تمام حقوق کی ادائیگی کا خیال اسے کیسے آسکتا ہے یا وہ حظِّ نفس کی طرف متوجہ ہونے کا کیسے خیال کر سکتا ہے؟ نیز فرمایا: جب اہلِ جنت جنت میں داخل ہو چکیں گے اور انہیں اللہ تعالیٰ کی مزید معرفت حاصل ہو گی تو سب کے سب اللہ کی اطاعت میں کوتاہی کرنے سے نادم ہوں گے۔

حضرت نے فرمایا: جو کچھ میں نے کہا ہے، اگر تو اس پر غور کرے تو تجھے معلوم ہو جائے گا کہ اجر کی خاطر عمل کرنا اللہ سے بے تعلق اور اس کے حقوق کی ادائیگی سے دور کر دیتا ہے اسی وجہ سے اس قسم کا عمل کرنے والا اللہ سے اور دور ہو جاتا ہے اور اگر تو اس نیت سے اللہ کی عبادت کرے کہ وہی اس کا اہل ہے تو تمہاری عبادت میں کبھی بھی وسواس نہیں آئے گا۔

(مؤلف کہتا ہے) میں نے عرض کیا: حضرت اگر صدقہ دینے والا صدقہ دیتے وقت یہ خیال کرے کہ مال بھی اللہ کا ہے اور اس کی ذات بھی اللہ ہی کے لیے ہے اور یہ مسکین بھی اللہ ہی کا ہے چنانچہ اس کے ذہن میں یہی بات ہو کہ ہر چیز اللہ ہی کے لیے ہے اور اسی نیت پر صدقہ نکالے اور یہ سمجھے کہ اس میں میرا تو کچھ بھی نہیں ہے تو اس شخص کا صدقہ کیسا رہے گا؟

فرمایا اس شخص کا صدقہ بہترین صدقہ ہو گا۔

اس تاخیر کی حکمت بتا ہی چکے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جب تک چالیس سال کو نہ پہنچ لیے مبعوث نہیں فرمائے گئے اور ہم اسے پھر ذکر کریں گے۔

حکایت

اس کے بعد حضرت نے ایک واقعہ بیان کیا جو ایک مجذوب سے آپ کو پیش آیا تھا جس کا ماحصل یہ ہے کہ حضرت نے فرمایا کہ مجذوب سے جو صالحین میں سے تھے میری جان پہچان تھی۔ جاڑے کے موسم میں سردی سے بچنے کے لیے ان کے پاس کوئی کپڑا نہ تھا مجھے ان پر ترس آتا اور اکثر ان کا خیال رہتا۔ اکثر ایسا ہوا کہ کسی نے ان کو کپڑا دیا کہ سردی سے بچاؤ ہو مگر کوئی آیا جس کے دل میں اللہ کا خوف نہ ہوتا اور وہ کپڑا ان کے بدن سے اتار کر لے جاتا وہ ایک چکی میں جہاں آٹا پستا تھا رہا کرتے تھے میں وہاں پہنچا۔ وہ وہاں موجود تھے۔ میں ان سے بات کرتا اور وہ جواب دیتے۔ اس کے بعد میں نے کہا کہ میں آپ کے پہننے کے لیے کپڑا لایا ہوں اور میں یہ کپڑا اس نیت سے لایا تھا کہ اللہ تعالیٰ اس صدقہ کے عوض میری فلاں حاجت روا کرے اور اس کا اللہ کے سوا کسی کو علم نہ تھا۔ کہنے لگے میں نہ قبول کروں گا نہ پہنوں گا جب میں نے انکار سنا تو دوبارہ سہ بارہ قبول فرمانے کی درخواست کی۔ اس پر فرمایا: میں ایسا کپڑا نہ پہنوں گا جسے تو اس غرض سے دے رہا ہے کہ تمہاری فلاں حاجت بر آئے اور بعینہٖ اس حاجت کا ذکر

کر دیا۔ میں تو وہ کپڑا پہنوں گا جو خاص اللہ کے لیے ہوگا۔ اس پر میں اس کپڑے کو ان کے پاس چھوڑ کر چلا آیا اور چکی والوں کو کہہ آیا کہ وہ انہیں وہ کپڑا پہنادیں مگر وہ کپڑا کئی دن تک وہیں پڑا رہا اور انھوں نے اسے نہ پہنا۔ جب یہ مخلوق کا حال ہو کہ اس نے اس چیز کو جو غیر اللہ کے لیے ہے قبول کرنے سے انکار کر دیا تو کیا پوچھنا اللہ سبحانہ و تعالیٰ کا۔

ایک عابد کا واقعہ جس نے اپنے اعمال پر اعتماد کیا

حضرت نے فرمایا کہ ایک عابد کو عبادت میں فتح نصیب کی گئی اور وہ مرضِ استسقار میں مبتلا ہو گئے۔ جب انھوں نے محسوس کیا کہ موت کا وقت آگیا ہے اور ان کے ہوش و حواس قائم تھے کیونکہ مرض استسقار کے اکثر مریضوں کے ہوش قائم رہتے ہیں۔ چنانچہ جب انھوں نے نزع کی تکلیف محسوس کی اور محسوس کیا کہ اتنا تکلیف دِہ وقت ان پر عمر بھر نہیں آیا تو اس سے ان پر خدا کا خوف طاری ہو گیا اور ان پر اللہ تعالیٰ کے سامنے پیش ہونے کا رعب چھا گیا۔ اس پر انھوں نے اپنی کثیر عبادت کا خیال کیا جو انھوں نے عمر بھر کی تھی اور انہیں خوشی ہوئی اور دل گرما گیا اور اس عبادت کو اس خوف کے مقابلہ میں رکھا اس لیے اس نے اپنے دل میں امن و راحت محسوس کی جب اللہ تعالیٰ نے دیکھا کہ اس نے اپنی عبادت پر اعتماد کیا ہے تو اس کی ساری عبادت سلب کر لی گئی اور وہ اسی حالت میں مر گیا۔ خدا اس سے بچائے۔

حضرت نے فرمایا: اس قسم کے کئی عابد اس لیے جہنم میں گئے کہ انھوں نے اپنے اعمال پر بھروسا کیا تھا پھر فرمایا کہ یہ بات یقینی ہے کہ اپنی عبادت پر وہی شخص اعتماد کرے گا جس نے اجر کی خاطر عبادت کی ہوگی اگر یہ عبادت محض اللہ کے لیے ہوگی تو ان کو اس بڑے دن کام آئے گی۔

پھر فرمایا کہ عارفین کی عبادت محض اللہ تعالیٰ کی ذاتِ کریم کے لیے ہوتی ہے اسی لیے تو نہایت تعظیم و اکرام کے ساتھ اور ڈرتے ہوتے کرتے ہیں اور انہیں یقین ہے کہ اگر وہ عمر بھر بھی عمل کرتے رہیں اور اپنے ماتھوں کو پتھروں سے ٹکراتے رہیں، تب بھی اللہ تعالیٰ کی ربوبیت کا حق ادا نہیں کر سکیں گے چہ جائیکہ اجر کا مطالبہ کریں۔ اس لیے کہ اجر کا مطالبہ تو وہی کرتا ہے جو جانتا ہو کہ اس نے حق ادا کر دیا اور عارفین کو تو یقین ہوتا ہے کہ انھوں نے عبادت کرنے میں کوتاہی کی ہے علاوہ بریں وہ یہ بھی دیکھ رہے ہوتے ہیں کہ جو فعل ان سے صادر ہوا ہے وہ اللہ ہی کی طرف سے ہے، ان کی اپنی طرف سے نہیں لہٰذا ایسے فعل پر جس کا فاعل کوئی اور ہو، وہ کس طرح اجر کا مطالبہ کر سکتے ہیں؟

میں نے عرض کیا کہ اس عابد کی کونسی چیز سلب کی گئی۔ کیونکہ اگر کہیں کہ معرفت سلب کی گئی تو یہ تو

اسے حاصل ہی نہیں ہوئی تھی۔ اس لیے کہ اگر اُسے معرفت حاصل ہوتی تو اپنے اعمال پر بھروسہ نہ کرتا لہٰذا سلب شدہ چیز یا تو ایمان ہے یا نیکیاں؟

حضرت نے فرمایا: سلب شدہ چیز نیکیاں ہیں جو اس نے کی تھیں اس لیے کہ اس نے چونکہ انہی پر نظر لگا رکھی تھی اور انہی پر اعتماد کر بیٹھا تھا۔ اس لیے اللہ نے ان تمام رحمتوں کو جو ان اعمال پر مترتب ہونے والی تھیں، زائل کر دیا جس کی وجہ سے تمام نیکیاں معاصی اور گناہوں میں بدل گئیں جن کا عذاب جہنم میں اسے ہوگا۔

میں نے عرض کیا کہ اس کو سزا دینے کے لیے حبطِ اعمال ہی کافی تھا، پھر اس پر مزید یہ کہ ان اعمال کو گناہوں میں کیوں بدل دیا گیا۔

فرمایا: چونکہ اس نے انہی پر امید لگا رکھی تھی اس لیے وہ اعمال گناہوں میں بدل دیے گئے کیونکہ جب تو دیکھے کہ ایک نیزہ تیری طرف آرہا ہے اور لامحالہ وہ تیرے پہلو کو لگے گا اور اگر تو ڈھال سے بچنا چاہے تو تجھے پہلے یقین ہونا چاہیئے کہ وہ ڈھال نیزہ کی چوٹ کو بچا سکتی ہے لیکن اگر تجھے معلوم ہو کہ ڈھال نیزے کے وار کو روک نہیں سکتی تو تو اس ڈھال کو اپنا بچاؤ نہ بنائے گا بلکہ تو کسی اور نیزے والے کی پناہ میں جائے گا اور اس کی رضامندی طلب کرے گا تاکہ وہ تم پر رحم کھا کر اس کے نیزہ کو تم سے روکے۔ یہی حال اس عابد کا ہے کیونکہ اس نے اپنی عبادت کو اس خوف کے مقابلہ میں اسی لیے رکھا اور اسی پر مطمئن اور بے خوف ہو بیٹھا کہ اس کے اعمال اللہ کے حقوق سے زیادہ قوی ہیں اور وہ اس کے خوف وغیرہ کو رد کر سکتے ہیں اور یہی انتہا درجہ کی گمراہی ہے۔

نیز فرمایا کہ جملہ عبادات اور تمام کی تمام اطاعات اور کل شریعتیں محض اس لیے قائم کی گئی ہیں کہ دنیا میں توحید کو قائم کیا جائے اور مخلوقات کو اپنے رب کی معرفت حاصل ہو لہٰذا جب یہ معرفت حاصل ہو گئی تو اصل مقصود حاصل ہو گیا، لیکن جب معرفت ہی حاصل نہ ہو اور اصل مقصود فوت ہو جائے تو پھر وسیلہ (یعنی عبادات) کا کیا اعتبار اور معصیت کو اس لیے حرام قرار دیا گیا کہ ان کی وجہ سے بندہ کا تعلق اللہ سے منقطع ہو جاتا ہے لہٰذا جب طاعت و عبادات سے بھی بندہ کا تعلق اللہ سے منقطع ہو جاتا ہو تو پھر ان کے معاصی ہونے میں کیا شبہ واللہ تعالیٰ اعلم

میں نے حضرت کو فرماتے سنا کہ پولیس والوں میں بھی بعض لوگ مومن ہوتے ہیں جن کا دل اللہ سبحانہ کی طرف لگا رہتا ہے اور بعض لوگ اللہ سے منقطع ہوتے ہیں۔ اس کی علامت انقباض اور انبساط ہے جو ان میں سے منقبض اور اس کا رنگ بدلا ہوا ہوگا اسے معلوم ہوگا کہ وہ اپنے رب کے حکم کی مخالفت کر رہا ہے

اور کسی اور کے حکم کی اطاعت کر رہا ہے۔ اس کا دل مغموم اور اس کی حالت بدلی ہوئی ہے تو یہ پہلی قسم میں سے ہے اور آخرت میں یہ حساب عقاب، ملامت اور عتاب کے بعد نجات پانے والوں میں سے ہوگا۔ البتہ اگر خدا معاف کر دے تو پھر حساب کے بغیر ہی جنت میں جائے گا اور ظلم کی حالت میں خوش ہو اور اسے کسی قسم کی فکر نہ ہو تو یہ شخص دوسری قسم میں سے ہے اور یہ شخص معصیت اور لوگوں پر ظلم کرنے میں مزہ پاتا ہے جس طرح گبریلا نجاست اور گندگی کھانے میں مزہ پاتا ہے۔

(مؤلف کہتا ہے کہ) قیامت کے دن اس شخص کو سب سے سخت عذاب ہوگا۔

حضرت نے یہ بات ایک شخص کے جواب میں فرمائی جس نے آپ سے پولیس والوں سے اختلاط رکھنے کے متعلق دریافت کیا تھا کہ اگر وہ ان سے میل جول نہیں رکھتا تو اسے اپنی جان کا خطرہ ہے۔ اس پر حضرت نے اسے نیکی کی راہ دکھائی اور اسے مسکینوں سے بھلائی کرنے کا حکم فرمایا اور پھر مذکورہ بالا کلمات فرمائے اس کے بعد فرمایا کہ مومن کی مثال اس پرندہ کی سی ہے جو ایک نجس زمین پر اترے گا تو وہ منقبض ہوگا اور اپنے پیروں کو سمیٹے گا اور اگر پاک زمین پر اترے گا تو منبسط ہوگا اور اپنے پیروں کو پھیلائے گا اور رزق کی تلاش میں سعی کرے گا۔

مزید برآں حضرت نے اس شخص کو فرمایا کہ جب وہ لوگ جو اللہ سے منقطع ہو چکے ہوتے ہیں (خدا ہمیں اپنی پناہ میں رکھے) جب کسی سے چند درہم غصب کر لیتے ہیں اور انہیں اپنی جیب میں ڈال لیتے ہیں اور ان درہموں پر اللہ تعالیٰ کا نام بھی کندہ ہو پھر کوئی ایسا شخص آئے جس کا دل اللہ کی طرف لگا رہتا ہے اور وہ ان درہموں کو کسی تدبیر سے مثلاً مانگ کر یا کسی اور حیلہ سے اس کے قبضہ سے نکال لے تو اس نے اللہ کے محترم فرشتوں کو چھڑا لیا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے ناموں کے ہر حرف پر ایک فرشتہ ہوتا ہے اور ہر اسم الٰہی پر وہ فرشتہ تعینات ہوتا ہے جس میں ستر آدمیوں کی قوت پائی جاتی ہے لہٰذا جب تک یہ درہم اس منقطع عن اللہ کے پاس رہتے ہیں تو اس فرشتہ کی حالت اس پرندہ کی سی ہوتی ہے جو گرفتار کر لیا گیا اور اس کے بازو باندھ دیے گئے ہوں اور اس کا سر اور جوڑ اس کے پروں کے نیچے سے نکال دیے گئے ہوں چنانچہ جب کوئی ایسا بندہ آتا ہے جس کا دل اللہ سے لگا ہوتا ہے اور وہ اس درہم کو کسی نہ کسی حیلہ سے اس سے حاصل کر لیتا ہے تو اس فرشتہ کو خوشی ہوتی ہے اور اس کی تنگی دور ہو جاتی ہے اس لیے کہ فرشتہ کو ان لوگوں سے جو اللہ سے بے تعلق ہو چکے ہوں کراہت ہوتی ہے۔ واللہ تعالیٰ اعلم۔

حضرت نے فرمایا اس کمزور بندہ کو گرفت صرف اس لیے ہوئی کہ اس نے خود اپنی چالوں سے اپنے آپکو تباہ کیا اس طرح کہ اس نے اپنی ذات کو اللہ سے بے تعلق کر لیا اور اپنی تدبیر پر نظر رکھی اور اپنے مطالب کے

حصول کے لیے اس قدر تنگ و دو کی کہ اس دوران میں کلیۃً اللہ سے غافل رہا لہٰذا اللہ تعالیٰ نے بھی اسے اس کی ذات پر چھوڑ دیا اور جس طرح وہ غیر اللہ سے تعلق رکھنے لگا تھا اسی طرح وہ غیر اللہ کو محسوس کرنے لگا چنانچہ اسے سردی اور گرمی سے تکلیف محسوس ہونے لگی اور زخم اور دیگر قسم کی اذیتوں سے اسے دکھ محسوس ہونے لگا، لیکن اگر وہ اپنے آپ کو اللہ تعالیٰ سے بے تعلق نہ کر لیتا اور اپنی باگ ڈور اللہ پر چھوڑ دیتا اور غیر اللہ سے نظر ہٹا لیتا اور تمام اغیار کو دل سے نکال دیتا تو اسے خواہ وہ لوہے کے گوکھرو اور لوہے کی سلاخوں پر ہی کیوں نہ چلتا، قطعاً کسی قسم کا درد محسوس نہ ہوتا۔

پھر فرمایا: اس غفلت ہی کی وجہ سے بندہ پر بھاری بوجھ ڈالا گیا اور اسے احکام کا مکلف بنایا گیا اور رسولوں کو شریعت دیکر انسانوں کی طرف بھیجا گیا تاکہ وہ اسے غفلت سے ہٹا کر اللہ کی طرف لوٹا دیں اور اگر یہ اللہ تعالیٰ سے غفلت نہ ہوتی تو انسان فرشتوں کی طرح ہوتے اور ان کو سخت تکالیف کے برداشت کرنے کی ضرورت نہ ہوتی نیز اگر غفلت نہ ہوتی تو جہنم بھی نہ ہوتی اور جب غفلت نہ ہوتی تو بندہ اللہ تعالیٰ کو اپنے افعال کا خالق سمجھتا اور اس کا وہ نفس ہی نہ ہوتا جس کی نظر ان افعال پر جاتی چہ جائیکہ ان کو اپنی طرف منسوب کرتا اور جب اس کی یہ حالت ہوتی تو وہ ہر وقت فانی ہوتا ایسے شخص کو پھر مکلف کیسے بنایا جاتا۔ واللہ تعالیٰ اعلم۔

نیز فرمایا: سب سے بڑا احمق وہ ہے جو چلے جانے والی چیز یعنی دنیائے فانی اور اس کے متعلقات کے لیے دوڑ دھوپ کرے اور سب سے عقلمند وہ ہے جو باقی یعنی حق سبحانہ کی خاطر دوڑ دھوپ کرے کیونکہ جب فانی فانی کی خاطر مرا تو کسی کو بھی فائدہ نہ ہوگا، لیکن اگر فانی باقی کی خاطر مرا تو فانی باقی بن گیا۔

پھر فرمایا: لوگ کہتے ہیں کہ موت کی کوئی دوا نہیں حالانکہ اس کی دوا موجود ہے اور اس کی دوا یہی ہے جو ہم نے بیان کی۔ بجز اس کے اس کی اور کوئی دوا نہیں ہے اس کے بعد قسم کھائی اور بار بار قسم کھا کر یہی فرماتے رہے اور فرمایا جب بندہ اللہ سبحانہ میں ظاہراً و باطناً پوری دوڑ دھوپ کرتا ہے تو اس کو نہ فنا آتی ہے نہ وہ فنا آتی ہے جسے لوگ موت سمجھتے ہیں۔

اہلِ دیوان مرنے کے بعد اپنے آپ کو خود غسل دیتے ہیں

حضرت نے فرمایا کہ اکثر اہلِ دیوان جب مر جاتے ہیں تو اپنے آپ کو خود غسل دیتے ہیں۔ چنانچہ دیکھنے میں میت تختہ پر نظر آئے گی اور ایک غسال بھی نظر آئے گا حالانکہ دونوں ایک ہی ہوں گے، واللہ تعالیٰ اعلم۔

ہم اس باب کو ایک عجیب حکایت پر جو ہم نے حضرت سے سُنی ختم کرتے ہیں۔ قصّہ یوں ہوا کہ ایک روز میں آپ سے باتیں کر رہا تھا تو میں نے ذکر کیا کہ لوگ ان لوگوں کی جو غاروں یا سمندری جزیروں میں کنارہ کش ہو جاتے ہیں، تعظیم کرتے ہیں اور میں نے بھی ان کی بہت تعریف کی اور کہا کہ یہ لوگ حق سبحانہٗ کی عبادت کرنے کی غرض سے لوگوں سے کنارہ کش ہو جاتے اور لوگوں سے علیحدگی اختیار کر لیتے ہیں اس پر حضرت نے فرمایا: میں ایک قصّہ بیان کرتا ہوں، اسے سُنو اور اگر میں اس میں ذرا بھی اپنی طرف سے اضافہ کروں تو اللہ مجھ سے باز پرس فرماتے۔ میں نے عرض کیا معاذاللہ اس کا ہمیں وہم و گمان بھی بھی نہیں ہو سکتا۔

ایک واقعہ

فرمایا: ایک روز میں حضرت منصور قطب کے پاس باب الفتوح میں نماز گاہ میں بیٹھا تھا کہ یکایک ہمیں خیال آیا کہ سمندر کے اس جزیرہ میں جائیں جس کے کنارے پر شہر سلا واقع ہے چنانچہ ہم گئے اور دیکھا کہ تقریباً ایک میل رقبہ کا جزیرہ ہے جس میں میٹھے پانی کے دو چشمے جاری ہیں۔ وہاں ہمیں ایک شخص ملا جس کی عمر قریب چالیس سال کے ہوگی اور وہ اللہ کی عبادت کر رہا تھا اسی جزیرہ میں پتھر تراش کر گھر بنائے گئے تھے۔ ان گھروں کے وسط میں ایسی چھوٹی چھوٹی کوٹھریاں تھیں جیسے حمام کے اندر ہوتی ہیں۔ معلوم نہیں انہیں کس نے تراشا تھا، اس لیے کہ یہ جگہ آبادی سے بہت ہی دور ہے اور وہاں کوئی پہنچتا بھی نہیں۔ البتہ کبھی کوئی کشتی وہاں پہنچ جاتی ہے۔ وہاں دو قسم کے درخت تھے ایک قسم کے درخت کو بادام کی شکل کا پھل لگتا ہے مگر یہ بادام سے مختلف ہوتا ہے اور دوسری قسم کا درخت ایسا ہے جیسے ہمارے ہاں کا "تعزار" کا درخت مگر یہ درخت تعزار سے چھوٹا ہوتا ہے اور اس کے پتے چوڑے مگر ہمیشہ سبز رہتے تھے۔ انہی دونوں درختوں کے پھل اس عابد کی خوراک تھی اور اس کے لباس کی طرف نگاہ ڈالی تو دیکھا کہ اس نے تعزار کی پتلی پتلی ٹہنیوں کو باہم گوندھ کر کمر بند سا بنا لیا تھا اور ستر عورت کر لیا تھا اور باقی ماندہ بدن کا حصّہ ننگا تھا۔ پھر ہم نے اس سے باتیں شروع کر دیں اور پوچھا کہ تم اس مقام میں کب سے ہو؟ اس نے کہا: تقریباً چالیس برس سے۔ ہم نے کہا: تمہاری تو کل عمر ہی چالیس سال کے قریب معلوم ہوتی ہے پھر تم یہاں کب آئے؟ جواب دیا: کہ ابھی میں پانچ برس کا تھا کہ اپنے باپ کے ساتھ یہاں آیا تھا۔ پھر قریب پچیس سال میں اپنے باپ کے ساتھ رہا۔ آخر ان کا انتقال ہو گیا اور میں نے ان کو یہیں دفن کر دیا، ہم نے کہا کہ ان کی قبر ہمیں دکھاؤ کہ زیارت کریں چنانچہ اس نے قبر دکھائی اور ہم نے مرحوم کے لیے دعاءِ مغفرت کی۔ ہم پھر اس سے باتیں کرنے لگے۔ چونکہ اس کا لوگوں سے کم میل جول ہوتا تھا اور پھر بچپن ہی سے یہاں آگیا تھا اس لیے اس کی زبان بہت بھاری تھی اور چونکہ وہ ان لوگوں میں سے تھا جو تونس کے قرب و جوار میں رہتے ہیں

اس لیے عربی زبان بولتا تھا پھر ہم نے اس سے ایمان کے متعلق دریافت کیا تو معلوم ہوا کہ وہ اللہ کو پہچانتا ہے مگر جہت کا معتقد ہے (کہ آسمان پر ہے) ہم نے اسے اس خیال سے روکا اور صحیح عقیدہ بتا دیا۔ نیز ہم نے اس کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے بھی واقف پایا اور اس سے بھی کہ آپ سید الاولین والآخرین ہیں۔ وہ حضرت ابو بکرؓ اور حضرت فاطمہؓ بنت الرسول سے بھی واقف تھا۔ ہم نے اس سے ان کے فرزند حضرت حسنؓ کی بابت سوال کیا تو معلوم ہوا، ان سے واقف نہیں ہے پھر ہم نے ماہ رمضان کے متعلق دریافت کیا تو اس سے بھی ناواقف پایا، لیکن اس نے بتایا کہ سال بھر میں متفرق طور پر تیس دن کے روزے رکھتا ہے اس پر ہم نے اسے بتایا کہ رمضان کے روزے فرض ہیں اور سال میں ماہ رمضان کا مہینہ بھی متعین کر کے بتایا کہ فلاں مہینہ رمضان کا ہوتا ہے۔ نیز ہم نے پوچھا کہ کیا کچھ قرآن مجید بھی یاد ہے تو اسے صرف اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ۔ اَلرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ۔ اَلَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ اور اسی طرح غلط یاد تھا ہم نے کہا: عبادت کیسے کرتے ہو؟ کہنے لگا: اللہ کے لیے رکوع اور سجدہ کر لیتا ہوں۔ ہم نے پوچھا کیا سوتے بھی ہو؟ جواب دیا کہ ہاں سورج ڈوبنے کے وقت سے سوتا ہوں یہاں تک کہ خوب اندھیرا ہو جاتے اور باقی رات رکوع و سجود میں گذار دیتا ہوں، پھر میں نے کہا کیا تم اسلامی ملک میں چلو گے تاکہ انکے ساتھ رہو کیونکہ تو مسلمان ہے اور ان کے نبی پر تمہارا ایمان ہے۔ کہنے لگا ہاں میں بھی مسلمانوں کی طرح ایک مسلمان ہوں مگر اپنی جگہ سے نکلنا نہیں چاہتا حتیٰ کہ یہیں موت آجاتے اور چونکہ وہ انسانوں سے مانوس نہ تھا اس لیے جب ہم باتیں کرتے کرتے اس کے قریب آجاتے تھے تو وہ ہم سے بھاگ جاتا تھا اور وہ ہماری غذا بھی کھا نہ سکتا تھا اور نہ ہی اس کا وجود اسے برداشت کر سکتا تھا اس لیے کہ عرصہ سے دوسری غذا کا عادی تھا۔ ہم نے دیکھا کہ قریب ڈیڑھ پاؤ وزن ریال (چاندی کا ایک سکہ ہے جو تقریباً دو روپیہ دس آنہ کے برابر ہوتا ہے) اس کے پاس ایک طرف پڑے ہیں جن میں چند طلائی مثقال بھی تھے۔ ہم نے پوچھا کہ یہ تمہارے پاس کہاں سے آتے ہیں؟ کہنے لگا بعض اوقات کشتی والے اس جزیرہ میں آجاتے ہیں اور وہ مجھے دیکھ کر میری زیارت اور مجھ سے دعا کی غرض سے چند ریال یا دینار دے جاتے ہیں۔ میں ان کے لیے دعا کرتا ہوں اور وہ چلے جاتے ہیں۔ ہم نے کہا یہ دینار ہمیں دے دے کیونکہ تجھے تو ان دیناروں اور ریالوں کی نہ ضرورت ہے اور نہ ہی تو نے مکان بنانا ہے نہ شادی کرنا اور نہ کپڑے بنانا ہے اور ہمیں ان کی ضرورت ہے لیکن اس نے وہ دینار دینے سے انکار کر دیا۔ غرض ہم دیر تک اس کے پاس رہے اور اسے احکام شریعت سکھلاتے رہے۔ اس کے بعد رخصت ہوتے اور چل دیے۔ جب اس نے دیکھا کہ ہم سطح آب پر پاؤں سے چل رہے ہیں۔ نہ پانی ہم پر پڑتا ہے اور نہ ہم ڈوبتے ہیں تو ہمارے متعلق یہ خیال کرنے لگا کہ ہم

شیاطین ہیں اور ہم سے اللہ کی پناہ مانگنے لگا۔

حضرت نے یہ بھی فرمایا کہ وہ اب تک اسی جزیرہ میں بقیدِ حیات ہے اور اس روز ۲۰ ذوالحجہ ۱۱۲۹ھ کی تاریخ تھی۔

مؤلف کہتا ہے کہ اس حکایت میں کئی ایک مواعظ ہیں۔ اوّل اللہ تعالیٰ کی اس نعمت کو جاننا جو ہمیں مسلمانوں کے ساتھ ملنے جلنے سے حاصل ہوتی ہے اس لیے کہ اس سے ہمیں اسلامی احکام، آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم اور آپ کے صحابہ کی زندگی اور سیرت کے حالات معلوم ہوتے ہیں اور یہ کہ آنحضرتؐ اور صحابہ کا زمانہ کیسا تھا وغیرہ امور جن سے ایمان بڑھتا ہے چنانچہ مسلمانوں سے اختلاط نہ رکھنے کی وجہ سے یہ شخص ان حالات سے واقف نہ ہو سکا یہاں تک کہ مجھے حضرت سے کہنا پڑا کہ اس کے باپ نے اسے بہت نقصان پہنچایا کہ اسی جزیرہ میں اسے لے آیا اور اسے مسلمانوں سے منقطع کر دیا۔ اگر اسے وہیں رہنے دیتا تو اس کے لیے بہتر ہوتا۔ حضرت نے فرمایا تو ٹھیک کہتا ہے۔

یہاں سے معلوم ہوا کہ مسلمانوں کی خواہ وہ اللہ کے نافرمان ہی کیوں نہ ہوں، کیا قدر و قیمت ہے کیونکہ دین اور احکامِ شریعت کی معرفت کے برابر کوئی چیز نہیں ہو سکتی لہٰذا اللہ کا شکر ہے کہ ہمارا اختلاط مسلمانوں سے ہے اور ہم بازاروں میں بھی انہی سے ملتے ہیں بالخصوص جبکہ ہم ان سے ایسے مقامات پر مل بیٹھیں جہاں نیک کام ہوتے ہوں۔ اسی لیے تو شیخ عبد القادر جیلانی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ مسلمانوں کے چہروں کو دیکھنے سے بھی ایمان زیادہ ہوتا ہے۔

دوّم: ان نعمتوں کی معرفت جو اللہ تعالیٰ نے ہم پر کھانے، پینے، پہننے، سونے، آرام کرنے، شادی کرنے اور نسل پیدا کرنے وغیرہ میں کی ہیں کہ یہ عابد جیسا کہ ان نعمتوں کی معرفت سے محروم تھا۔ اسی طرح ان نعمتوں سے بھی محروم تھا۔ اگر وہ مسلمانوں میں رہتا تو ان نعمتوں سے حظ اٹھاتا اور ان پر اللہ کا شکریہ ادا کرتا اور ان نعمتوں پر اس کا شکر کرنا اس جزیرہ میں اس کی عمر بھر کی عبادت کے برابر ہوتا۔

سوم: اکثر لوگوں کو بن باسی فقیروں اور گوشہ نشینوں کے متعلق دھوکا ہوتا ہے اور وہ یہ سمجھ لیتے ہیں کہ یہ صاحبِ کمال لوگ ہیں اور یہ کہ جس مرتبہ کو یہ پہنچے ہوئے ہیں، وہاں وہ اولیاء عارفین نہیں پہنچ سکتے جو لوگوں میں مل جل کر رہتے ہیں۔ حالانکہ میں نے اکثر حضرت کو فرماتے سنا کہ بعض اوقات ان انوارِ ایمان کو دیکھتا ہوں جو لوگوں کی ذات سے نکلتے ہیں تا آنکہ وہ انوار برزخ میں جا ملتے ہیں اور یہ انوار اپنی رقت اور غلظ کے اعتبار سے الگ الگ ہوتے ہیں کیونکہ رقت ایمان کی کمزوری کی علامت ہے اور غلظ قوت ایمان کی۔ مزید برآں ہم دیکھتے ہیں کہ جو لوگ غاروں یا جنگلوں میں چلے جاتے ہیں تو چند آدمیوں کے سوا ان کے

نورِایمان رقیق دکھائی دیتے ہیں اور جب عامۃ المومنین پر نظر دوڑاتے ہیں تو ان کے انوار ان بن باسیوں سے بہتر دکھائی دیتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ عوام کا اعتماد اللہ سبحانہ کے فضل وکرم پر ہوتا ہے اور عبادت گذاروں کا اعتماد اکثر اپنی عبادت پر ہوتا ہے۔

پھر فرمایا: عابد اپنی عبادت کے ذریعہ سے نجات نہیں پا سکتا جب تک کہ باطناً اس کو اپنے رب کی طرف سے نہ سمجھے اور اس کا یہ خیال وفکر دائمی ہونا چاہیئے، لیکن اگر یہ خیال وفکر ذرا بھی ہٹ گیا تو وہ سلامتی کی نسبت ہلاکت کے زیادہ قریب ہوگا۔

(مولف کہتا ہے) جب میں نے یہ قصہ حضرت سے سُنا تو اللہ تعالیٰ کی ان نعمتوں کو پہچان کر جو اللہ نے ہم پر کی ہیں مگر ہم ان سے غافل ہیں، مجھ پر بہت رقت وخشوع طاری ہوا۔

اس کے بعد میں نے حضرت سے عرض کیا کہ آپ اس کا ہاتھ پکڑ کر وہاں سے اسے نکال لاتے اور کسی اسلامی شہر میں آباد کر دیتے تاکہ وہ آرام پاتا اور اللہ تعالیٰ اس پر رحم فرماتا۔

حضرت نے فرمایا: یہ وہ مقام ہے جو اللہ تعالیٰ نے اس کے لیے مقرر رکھا ہے۔ پاک ہے وہ خدا جس کی قدرت میں یہ تمام کائنات ہے۔

حضرت نے فرمایا: جو شخص سطحِ زمین کی عجائبات پر نظر کرے تو اس کے لیے اللہ تعالےٰ کی وحدانیت معلوم کرنے کے لیے یہی کافی ہے۔ کسی دوسری دلیل کی ضرورت نہیں کیونکہ اسے سطح زمین پر کئی قسم کی مخلوقات اکٹھی نظر آئے گی چنانچہ ان میں بعض عاقل ہوں گے اور بعض غیر عاقل، کوئی خوشحال اور کوئی بدنصیب، کوئی کسی کو قتل کر رہا ہے اور کوئی کسی پر ترس کھا رہا ہے کوئی امورِ دنیا میں غور کر رہا ہے، کوئی امورِ تجارت میں اور کوئی پڑوسیوں کے معاملات میں، کوئی علمی بحثوں میں لگا ہوا ہے اور کوئی امورِ آخرت میں۔

حضرت نے فرمایا: میرے شیخ عمر بن محمد الھواری نے ذکر فرمایا کہ وہ جمعرات کو باب محروق میں بیٹھے ہوئے تھے اور دروازہ سے باہر نکلنے والوں کے باطن پر نظر ڈال رہے تھے چنانچہ ایک شخص نکلا اس کے باطن کو دیکھا تو اس کی تمام تر توجہ اپنی فلاں محبوبہ کی طرف تھی کہ اس کو حاصل کرنے میں کیسے کامیاب ہو۔ یہ خیال اس پر اس طرح مسلط ہو چکا تھا کہ اس نے اسے باقی تمام چیزوں سے غافل کر رکھا تھا، پھر دوسرا نکلا۔ دیکھا تو اس کا دل بھی پہلے شخص کی طرح تھا مگر اس کا تعلق لڑکے سے تھا، پھر تیسرا نکلا تو اس کا دل دنیا سے لگا ہوا تھا اور دنیا کی فکر اس پر اس طرح مسلط ہو چکی تھی کہ کسی اور بات کا خیال ہی نہ گزرتا تھا۔ پھر چوتھا نکلا تو اس کا باطن شراب نوشی کی محبت میں چور تھا، صرف اسی کی اسے آرزو تھی اور اس کے

سوا کسی اور چیز کا اسے خیال نہ تھا۔ پھر پانچواں نکلا تو اس کے خیالات آخرت اور امورِ آخرت میں جولانی کرتے تھے۔ یہ خیالات اس طرح اس پر غالب آ چکے تھے کہ ان کا اثر اس پر نمایاں تھا چھٹا نکلا تو اس کا دل علم اور تحصیل علم کی محبت سے معمور تھا۔ اس کے سوا کسی چیز کا اسے خیال بھی نہ آتا تھا، پھر ساتواں نکلا تو اس کا تمام تر فکر گھوڑے کی سواری کی محبت میں غرق تھا اور یہ خیال اتنا غالب آ گیا تھا کہ باقی سب کچھ بھلا دیا تھا۔ آٹھواں نکلا تو اس کے خیالات کھیتی کی محبت میں لگے ہوئے تھے کہ اس کے لیے کس طرح دوڑ دھوپ کرے اور کسی اور بات کا خیال ہی نہ آتا تھا، پھر نواں نکلا تو اس کا دل سیّد الوجود صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی محبت میں معمور تھا اور اس کا اتنا غلبہ تھا کہ احوالِ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے سوا کسی دوسری طرف اس کا خیال ہی نہ جاتا تھا۔ یہی سوچتا کہ بعثت سے پہلے آپ کے کیا حالات تھے اور بعثت کے بعد کیا، پھر یہ سوچتا کہ وحی اترنے کے بعد آپ کے کیا احوال تھے مکہ میں آپ کس طرح رہے اور مدینہ میں کس طرح رہے۔ پھر دسواں نکلا تو اس کا دل اللہ رب العلمین کی محبت سے معمور تھا چنانچہ اس کے خیالات اللہ تعالیٰ کی عظمت وجلال اور تقدس میں اور اس کی صفاتِ عالیہ میں دوڑتے تھے۔

حضرت عمر بن محمد فرماتے ہیں کہ اس کے بعد میں نے اس امر باطن پر نظر ڈالی جو ان سب میں حاکم اور اللہ تعالیٰ کے ارادہ سے ان میں پیدا ہوا تھا تو میں نے ان کے باطن میں انہیں ایسا پایا کہ ایک رسی مشیّتِ ایزدی کی طرف کھینچے لیے جا رہی ہے مگر وہ اس سے بے خبر ہیں اور خیال کرتے ہیں کہ وہ فعل ان کی اپنی طرف سے ہے اور اپنے اختیار سے ہے۔

حضرت نے فرمایا کہ اس سے مجھے بہت عبرت حاصل ہوئی اور مجھے یقین ہو گیا کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور اللہ کے ملک میں کوئی اس کا شریک نہیں۔ وہ جو چاہتا ہے کرتا ہے اور جو چاہتا ہے فیصلہ کرتا ہے۔ اس کے فیصلہ کو کوئی رد نہیں کر سکتا اور وہ بہت جلد حساب کرنے والا ہے۔ مخلوقات تو بہت بڑی غفلت اور حجاب میں پڑی ہے۔

مؤلف کہتا ہے کہ اس قسم کی فکر عارفین کو ہی ہوتی ہے اور میں نے حضرت سے سنا کہ فرما رہے تھے کہ دو شخص کسی ایک جگہ سے گزرتے ہیں اور ابھی تھوڑا ہی چلے ہوتے ہیں کہ ان میں سے ایک کو معرفت حاصل ہو جاتی ہے۔ میں نے عرض کیا یہ کیسے؟ فرمایا اس کی معرفت کی وجہ سے کہ وہ اللہ کی مخلوق میں کس طرح غور و فکر کرتا ہے اور اس کے ساتھ ساتھ چلنے والا غافل اور بے خبر ہوتا ہے۔

خدا تجھے توفیق دے اس باب کے متعلق حضرت کا جو فرمان ہمیں معلوم ہو سکا وہ ہم نے لکھ دیا۔ اگر

اس کے ساتھ خواب کی تعبیر کے بیان میں جو ظلمتوں کے دس درجے بیان کیے ہیں: سہو مکروہ، سہو حرام عمد مکروہ، عمد حرام، عقیدۂ خفیفہ میں جہلِ بسیط، عقیدہ خفیفہ میں جہلِ مرکب، عقیدہ ثقیلہ میں جہلِ بسیط اور اس میں جہلِ مرکب، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات کے متعلق جہلِ بسیط اور اس میں جہل مرکب کے درجات کو بھی ملا دیا جائے اور دونوں میں جو کچھ ہم نے بیان کیا اس سے انسان واقف ہو جاتے تو اسے بہت بڑی معرفت حاصل ہو جائے گی۔ خدا ہر کسی کو حضرت کی برکت سے فائدہ پہنچائے۔ آمین۔ والحمد للہ رب العلمین۔

چوتھا باب

دیوان صالحین رضی اللہ عنہم اجمعین

حضرت نے فرمایا کہ صالحین کا دیوان اسی غار حرا میں لگتا ہے جس میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بعثت سے پہلے عبادت کیا کرتے تھے۔ غوث[1] غار کے باہر اس طرح بیٹھتا ہے کہ مکہ اس کے دائیں شانہ کے پیچھے ہوتا ہے اور مدینہ اس کے دائیں گھٹنے کے سامنے اور چار قطب اس کی دائیں جانب ہوتے ہیں اور یہ باقی تینوں مذاہب

---

[1] لطف کی بات ہے کہ جو چیز صوفیاء کے ہاں تواتر کی حد تک پہنچی ہوئی ہے اور جو ایک حقیقت ہے، اس کے خلاف بھی کتاب لکھی گئی۔ چنانچہ شیخ عزالدین بن عبدالعزیز بن عبدالسلام الدمشقی متوفی ۶۶۰ھ نے ایک رسالہ لکھا جس کا نام رسالة فی القطب والغوث والابدال الاربعین وغیرھم۔ اس رسالہ میں انھوں نے قطب وغیرہ کے وجود کو باطل قرار دیا ہے اور کہا ہے کہ ان کے وجود کا کوئی جواز ہی نہیں پایا جاتا۔

(کشف الظنون : ۱ : ۸۲۸)

میں یہاں اس کتاب کی تردید کے متعلق صرف ایک حدیث کی طرف اشارہ کر دیتا ہوں جہاں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے اَنَا الْقَاسِمُ وَاللّٰهُ يُعْطِي دینے والا تو خدا ہے مگر میں تقسیم کرتا ہوں۔

یاد رہے کہ عز بن عبدالسلام کو باہمہ علم وفضل ابتدا میں صوفیا سے کد تھی چنانچہ انھوں نے محض اللہ اللہ کا ورد کرنے کو بدعت قرار دیا ہے جس کی وجہ سے صوفیاء کو اس کے رد میں رسالے لکھنے پڑے چنانچہ قطب قسطلانی متوفی ۹۲۳ھ عارف باللہ مرصفی متوفی ۹۳۳ھ اور شیخ عبدالکریم خلوتی نے اس کے رد میں رسالے لکھے (خفاجی : ۱ : ۲۷، ۲۸) خفاجی کہتے ہیں کہ احادیث میں صراحةً ان کے وجود کا ذکر آیا ہے چنانچہ سیوطی نے اس پر ایک مستقل رسالہ لکھا ہے (خفاجی ۲ : ۲۳۳) قسطلانی کی کتاب کا نام کتاب الانوار فی الادعیة والاذکار ہے (کشف الظنون : ۲ : ۱۴۱) اور امام

(بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر)

میں سے ایک ایک ہوتا ہے۔ وکیل غوث کے سامنے ہوتا ہے جسے قاضی دیوان کہتے ہیں۔ آج کل یہ بھی مالکی مذہب کا ہے اور نبی خالد میں سے ہے جو بصرہ کی ایک جانب سکونت پذیر ہیں ان کا نام محمد بن عبدالکریم البصراوی ہے۔ غوث وکیل سے بات کرتا ہے اور اسے وکیل بھی اسی مناسبت سے کہا جاتا ہے کہ یہ تمام اصحاب دیوان کی ترجمانی اور وکالت کرتا ہے۔ پھر فرمایا کہ یہ ساتوں قطب غوث کے حکم سے تصرف کرتے ہیں اور ہر قطب کے ماتحت امدادی جماعت ہوتی ہے اور اس کے حکم سے تصرف کرتے ہیں اور وکیل کے پیچھے چھ صفیں ہوتی ہیں جن کا حلقہ چوتھے قطب سے شروع ہو کر اس قطب پر ختم ہوتا ہے۔ جو تین قطبوں کی بائیں جانب ہے چنانچہ یہ سات قطب حلقہ کی ایک طرف کا کام دیتے ہیں یہ پہلی صف ہے اسی طرح اس کے پیچھے دوسری صف ہوتی ہے، علیٰ ہٰذا القیاس چھٹی صف تک۔ پھر فرمایا کہ کچھ عورتیں بھی اس دیوان میں حاضر ہوتی ہیں مگر ان کی تعداد کم ہوتی ہے اور ان کی تین صفیں بائیں جانب کے اقطاب ثلٰثہ کی جانب اور صف اول کے دائرہ سے اوپر غوث اور اقطاب ثلٰثہ کے درمیان خالی جگہ میں ہوتی ہیں۔

(بقیہ حاشیہ صفحہ سابقہ)

ابو السعادات عبداللہ بن اسعد یافعی نے الارشاد والتطریز فی فضل ذکر اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ و تلاوۃ کتابہ العزیز لکھی۔

مترجم کہتا ہے کہ علامہ جلال الدین السیوطی کے رسالہ کا نام الخبر الدال علی وجود القطب والاوتاد والنجباء والابدال ہے۔ اس رسالہ کی ابتدا یوں ہوتی ہے: اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ الَّذِیْ فَاوَتَ بَیْنَ خَلْقِہٖ فِی الْمَرَاتِبِ الخ (کشف الظنون: ۱: ۳۵۲) مصطفیٰ بن احمد العالی شاعر متوفی ۱۰۰۸ھ نے ترکی زبان میں ایک کتاب لکھی جس کا نام حلیۃ الرجال فی الاقطاب والنجباء والابدال رکھا (کشف الظنون: ۱: ۲۴۷) شیخ سالم بن السید احمد المتوفی ۸۶۴ھ نے بھی رجال الغیب کے متعلق ایک رسالہ لکھا جس کا نام شق الجیب فی معرفۃ اہل الشہادۃ والغیب ہے (کشف الظنون: ۱: ۵۰۲) شیخ ابوعبداللہ محمد بن احمد العجیسی التلمسانی متوفی ۸۴۲ھ نے نور الیقین فی شرح حدیث اولیاء اللہ المتقین لکھی جس میں نقباء، نجباء اور بدلاء، رجال المقامات کا ذکر کیا ہے (کشف الظنون ۲: ۴۰۵) اور شیخ عبدالغفار بن عبدالمجید قوصی نے اپنی کتاب وحید فی سلوک اہل التوحید میں بھی ہر اقلیم کے اقطاب و اوتاد کا ذکر کیا ہے یہ کتاب انھوں نے ۷۰۸ھ میں اسکندریہ میں لکھی (کشف الظنون ۲: ۴۱۴)

عز بن عبدالسلام نے بعد میں توبہ کر لی تھی۔

گذشتگان میں سے بعض کاملین بھی دیوان میں حاضر ہوتے ہیں

حضرت نے فرمایا کہ گذشتہ لوگوں میں سے بعض کاملین بھی دیوان میں حاضر ہوتے ہیں۔ صرف تین باتوں سے ان کی شناخت ہوتی ہے، پہلی یہ کہ ان کا لباس اور ہیئت نہیں بدلتی بر خلاف زندہ کے کہ اس کی ہیئت اور لباس بدلتا رہتا ہے چنانچہ کبھی زندہ کے بال منڈے ہوتے ہیں اور کبھی نئے کپڑے پہنے ہوتے ہیں وغیرہ وغیرہ مگر اموات اولیاء کی حالت نہیں بدلتی۔ چنانچہ اس مجلس میں جب ایسے شخص کو دیکھو جس کی ہیئت بدلتی ہی نہیں مثلاً یہ کہ اس کے بال منڈے ہوں اور پھر اُگیں ہی نہیں تو سمجھ لو کہ وہ اموات میں سے ہیں اور اسی حالت میں اس کی وفات ہوئی۔ اسی طرح اگر دیکھو کہ اس کے سر کے بال نہ گھٹتے ہیں اور نہ بڑھتے ہیں تو اس سے بھی سمجھ لو کہ وہ اموات میں سے ہے اور اس کی موت اسی حالت میں ہوئی ہے۔

اموات اولیا سے زندوں کے امور کے بارے میں مشورہ نہیں کیا جاتا

دوسری علامت یہ ہے کہ زندہ لوگوں کے معاملات میں ان لوگوں سے مشورہ نہیں لیا جاتا۔ اس لیے کہ انہیں زندوں کے امور میں تصرف کرنے کا اختیار ہی نہیں ہے کیونکہ وہ تو منتقل ہو کر ایسے جہان میں جا چکے ہیں جو اس جہان سے بالکل مختلف ہے، صرف عالم اموات کے امور کے متعلق ان سے مشورہ کیا جاتا ہے۔

مُردوں کے لیے دعاء مغفرت کرتے وقت فوت شدہ اولیاء میں سے کسی کا وسیلہ لانا چاہیئے

حضرت نے فرمایا کہ زیارتِ قبور کے آداب میں سے ہے کہ جب کسی مردہ کیلئے دعا کرنا چاہیئے اور قبولیت دعا کے لیے کسی ولی کا وسیلہ لائے تو فوت شدہ ولی کا وسیلہ لائے کیونکہ اس طرح مراد پوری اور دعا قبول ہونے کا زیادہ امکان ہے۔

تیسری علامت یہ ہے کہ اموات کا سایہ نہیں ہوتا چنانچہ اگر میت تمہارے اور سورج کے درمیان کھڑا ہو تو اس کا سایہ نہ دیکھو گے اور اس کی وجہ یہ ہے کہ اس کی روح حاضر مجلس ہوتی ہے نہ کہ اس کی ترابی ذاتِ فانیہ اور روح خفیف و شفاف ہوتی ہے اس میں ثقل اور کثافت نہیں ہوتی۔

ؔ اس کی تائید شمس الدین حنفی متوفی ۸۴۷ھ ؍ ۱۴۴۳ء کے اس قول سے ہوتی ہے "جب ولی وفات پا جاتا ہے تو دنیا سے اس کا تصرف مثلاً کسی کی مدد کرنا وغیرہ ختم ہو جاتا ہے لہٰذا اگر کسی زیارت کنندہ کو فیضان حاصل ہو یا اس کی کوئی حاجت پوری ہو تو یہ صاحب وقت قطب کے ذریعہ سے ہوتی ہے جو زائر کو فوت شدہ ولی کے مرتبہ کے مطابق مدد پہنچاتا ہے (طبقات ج ۲۔ صفحہ ۹۲)

آپ نے فرمایا: اکثر میں مجلس دیوان یا اولیاء کے کسی مجمع میں جاتا ہوں اور سورج نکل چکا ہوتا ہے اور وہ مجھے دور ہی سے دیکھکر استقبال کرتے ہیں جو اموات آتے ہیں وہ برزخ سے اتر کر روح کی پرواز اڑتے ہوئے آتے ہیں مگر جب دیوان کے قریب پہنچتے ہیں تو زمین پر اتر کر پاؤں سے چلتے ہوئے مجلس میں آتے ہیں بوجہ احیاء کے ادب و احترام اور ان سے خوف و ہیبت کے اور یہی حال رجالِ غیب کا ہے کہ جب ایک دوسرے سے ملنے کو آتے ہیں تو روح سے چل کر آتے ہیں مگر اس جگہ کے قریب پہنچتے ہیں تو ادب اور ڈر کے مارے اپنی ذات ثقیلہ سے چلتے ہیں۔ فرمایا: دیوان میں فرشتے بھی حاضر ہوتے ہیں مگر وہ صفوف کے پیچھے ہوتے ہیں اور کاملین جنات بھی آتے ہیں جن کا نام روحانیون ہے اور وہ سب کے پیچھے بیٹھتے ہیں مگر ان کی پوری ایک صف بھی نہیں ہوتی۔

دیوان میں جن و ملائکہ کے حاضر ہونے کا سبب!

حضرت نے فرمایا: کہ ملائکہ اور جنوں کے حاضر ہونے کا فائدہ یہ ہے کہ اولیاء اللہ کا تصرف ان امور میں بھی ہوتا ہے جو ان کی قدرت میں ہوتے ہیں اور ان امور میں بھی جو ان کی قدرت سے باہر ہوں لہٰذا جو امور ان کی قدرت سے باہر ہوتے ہیں، ان میں وہ ملائکہ اور جنات سے مدد لیتے ہیں۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بھی کبھی کبھی دیوان میں تشریف فرما ہوتے ہیں

فرمایا کہ کبھی کبھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بھی اس مجلس میں شرکت فرماتے ہیں اور جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تشریف لاتے ہیں تو غوث کی جگہ پر تشریف رکھتے ہیں اور غوث وکیل کی جگہ پر بیٹھتا ہے اور وکیل پیچھے ہٹ کر صف والوں سے جا ملتا ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جب تشریف لاتے ہیں تو آپ کے ساتھ وہ انوار آتے ہیں جن کے برداشت کرنے کی کسی میں طاقت نہیں اور یہ انوار جلا دینے والے گھبرا دینے والے اور دم میں قتل کر دینے والے ہوتے ہیں اور یہ ہیبت و جلال و عظمت کے انوار ہیں یہاں تک کہ فرض کر لیا جائے کہ چالیس آدمی ہیں جو شجاعت کے انتہائی درجہ پر پہنچے ہوئے ہوں اور پھر یکایک یہ انوار ان کے سامنے آجائیں تو یقیناً وہ سب یکدم بیہوش ہو کر گر پڑیں گے مگر حق تعالیٰ اپنے اولیاء کو ان انوار کو پالینے کی طاقت عطا فرما دیتا ہے لیکن اس کے باوجود بہت ہی کم اہل مجلس ہوتے ہیں جو ان امور کو محفوظ رکھ سکتے ہیں جو کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی موجودگی کے وقت طے پاتے ہوں۔ فرمایا: آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم غوث سے گفتگو فرماتے ہیں۔

[1] شیخ ابوالفضل عبدالقادر بن حسین بن علی شاذلی نے ۸۹۴ھ میں ایک کتاب لکھی جس کا نام الکواکب الزاہرة فی اجتماع الاولیاء بسید الدنیا والآخرة رکھا (کشف الظنون ۲: ۱۴۹۰)

اسی طرح جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اس دیوان میں تشریف فرما نہیں ہوتے تو غوث کے لیے خارق عادت انوار ہوتے ہیں کہ اہلِ مجلس غوث کے قریب بھی نہیں جا سکتے بلکہ دور بیٹھتے ہیں۔ پس جب امراللہ تعالیٰ کی طرف سے نازل ہوتا ہے اس کی طاقت آنحضرتؐ کی ذات کے سوا کسی میں نہیں اور جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے وہ امر نکلتا ہے تو اس کی طاقت غوث کی ذات کے سوا کسی میں نہیں ہوتی اور پھر غوث کی طرف سے وہ امر ساتوں اقطاب پر پھیلتا ہے اور ساتوں اقطاب سے اہلِ مجلس پر۔

دیوان کا وقت

جیسا کہ پہلے بیان ہو چکا اس مجلس کا وقت وہی ساعت ہے جس میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت ہوئی اور رات کے آخری تیسرے حصہ کی یہی وہ ساعت اجابت ہے جس کا احادیث میں ذکر آیا ہے کہ ہر رات اللہ تعالیٰ دنیا کے آسمان کی طرف نزول فرماتا ہے جبکہ رات کا آخری تہائی حصہ باقی رہ جاتا ہے اور فرماتا ہے کوئی ہے جو مجھ سے دعا مانگے پس میں قبول کروں۔ الحدیث

ساعتِ قبولیت پانے کا طریقہ

مؤلف فرماتے ہیں کہ جو شخص اس نیک ساعت کو پانا چاہے تو وہ سوتے وقت سورۂ کہف کی آخری آیت

اِنَّ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ کَانَتْ لَھُمْ جَنّٰتُ الْفِرْدَوْسِ نُزُلًا خٰلِدِیْنَ فِیْھَا لَا یَبْغُوْنَ عَنْھَا حِوَلًا قُلْ لَّوْ کَانَ الْبَحْرُ مِدَادًا لِّکَلِمٰتِ رَبِّیْ لَنَفِدَ الْبَحْرُ قَبْلَ اَنْ تَنْفَدَ کَلِمٰتُ رَبِّیْ وَلَوْ جِئْنَا بِمِثْلِہٖ مَدَدًا قُلْ اِنَّمَآ اَنَا بَشَرٌ مِّثْلُکُمْ یُوْحٰٓی اِلَیَّ اَنَّمَآ اِلٰھُکُمْ اِلٰہٌ وَّاحِدٌ ۔ فَمَنْ کَانَ یَرْجُوْا لِقَآءَ رَبِّہٖ فَلْیَعْمَلْ عَمَلًا صَالِحًا وَّلَا یُشْرِکْ بِعِبَادَۃِ رَبِّہٖٓ اَحَدًا

پڑھے اور دعا کرے کہ یا اللہ مجھے وقت مذکور میں بیدار کر دینا تو اس کی آنکھ عین اس وقت کھل جائے گی۔ یہ شیخ عبدالرحمٰن ثعالبی[1] کا بیان ہے ہم نے بھی بدہا اسے آزمایا ہے اور اوروں نے بھی اس کا تجربہ کیا ہے حتیٰ کہ اکثر ایسا ہوا کہ متعدد آدمیوں نے یہ آیت پڑھ کر اس وقت پر جاگنے کی دعا مانگی اور کسی ایک کو دوسرے کی نیت کا علم نہ تھا مگر جب بیدار ہوئے تو ایک ہی وقت میں۔

---

[1] شیخ عبدالرحمٰن ثعالبی: عبدالرحمٰن بن محمد الثعالبی الجزائری متوفی ۸۷۶ھ۔ انھوں نے العلوم الفاخرة فی النظر فی امور الاخرة لکھی ہے۔

اُمتِ محمدیہ سے پہلے اصحاب دیوان ملائکہ تھے!

میں نے حضرت سے سنا کہ قدیم زمانے میں اہلِ دیوان فرشتے ہوا کرتے تھے، لیکن جب آنحضرت صلّی اللہ علیہ وسلّم مبعوث ہوئے تو دیوان اس امت کے اولیاء سے معمور ہونے لگا اس سے یہ معلوم ہوا کہ یہ فرشتے اس امتِ شریفہ کے اولیاء کے نائب تھے چنانچہ ہم نے دیکھا ہے کہ جب کوئی ولی دنیا میں آیا اور اللہ تعالیٰ نے اسے فتح نصیب فرما کر اہلِ دیوان بنایا تو وہ اپنی مخصوص جگہ پر صفِ اول میں ہو یا کسی اور جگہ پر آکر بیٹھتا تو اس جگہ کا فرشتہ آسمان پر چڑھ جاتا پھر جب دوسرا ولی آیا اور اپنی جگہ پر آبیٹھا تو اس جگہ کا فرشتہ آسمان پر چڑھ جاتا، اس طرح دیوان کی ابتدا ہوئی تا آنکہ وہ مکمل ہو گیا وللہ الحمد کہ جب ولی ظاہر ہوا تو فرشتہ اُٹھ گیا۔ اب رہے وہ فرشتے جو ابھی تک باقی ہیں اور چھیوں صفوں کے پیچھے بیٹھتے ہیں۔ جیسا کہ ذکر ہوا وہ (اہل دیوان نہیں بلکہ) ذاتِ محمدی کے وہ فرشتے ہیں جو دنیا میں ذاتِ شریف کے محافظ تھے اور چونکہ ذاتِ محمدی کا نور اہلِ دیوان میں پھیلا ہوا ہے اس لیے نورِ شریف کے ساتھ ذاتِ شریف کے فرشتے موجود رہتے ہیں۔ اور جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم دیوان میں تشریف لاتے ہیں اور آپ کے ساتھ ناقابلِ برداشت انوار آتے ہیں تو یہ فرشتے جو اہلِ دیوان کے ساتھ ہوتے ہیں، بڑی تیزی سے نورِ محمدی میں سما جاتے ہیں اور جب تک آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم دیوان میں تشریف رکھتے ہیں، ان میں سے کوئی فرشتہ نظر نہیں آتا مگر جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لے جاتے ہیں تو وہ فرشتے اپنی اپنی جگہ پر لوٹ آتے ہیں۔ واللہ اعلم۔

ہر شہر میں اولیاء کی مدد کے لیے فرشتوں کی ایک جماعت ہوتی ہے

حضرت نے فرمایا کہ ہر شہر میں ان امور میں مدد کے لیے جو اہل تصرف اولیاء کی طاقت سے باہر ہوں، فرشتوں کی ایک جماعت موجود رہتی ہے۔ کسی جگہ ستر اور کہیں اس سے کم اور کہیں زیادہ۔ یہ فرشتے انسانی شکل میں ہوتے ہیں چنانچہ کوئی خواجہ کی صورت میں ہوتا ہے اور کوئی فقیر کی صورت میں اور کوئی چھوٹے بچے کی صورت میں، غرض یہ ملے جلے رہتے ہیں مگر لوگوں کو ان کا پتہ نہیں چلتا۔ اس بارے میں حضرت نے کئی ایک حکایات بھی بیان فرمائیں جن کے اسرار کی نہ کیفیت بیان ہو سکتی ہے نہ کوئی انکو برداشت کر سکتا ہے ان کے بیان کرنے کا سبب یہ ہوا کہ حضرت نے مجھے ایک شخص سے یہ کہتے ہوئے سن لیا کہ بیان کیا جاتا ہے کہ اگر کوئی شخص بخاری شریف کا ایک پارہ لے کر کسی ولی کے مزار پر جائے اور اسے کھول کر اس کے راویانِ حدیث اور اس ولی کے وسیلہ سے دعا مانگے تو اس کی مراد پوری ہوتی ہے خصوصاً بخاری شریف کا آخری پارہ۔ اس پر میں نے حضرت سے دریافت کیا کہ کیا یہ صحیح ہے یا غلط؟ آپ نے فرمایا

ہر شہر میں ملائکہ کی خاص تعداد ہوتی ہے لہٰذا جب وہ کسی بندہ کو اللہ سے کوئی چیز مانگتے ہوئے دیکھتے ہیں اگر وہ دیکھیں کہ یہ چیز اس کی تقدیر میں لکھی جا چکی ہے تو اسے (دعا کرنے) میں صحیح طریقہ پر لے آتے ہیں اور (دعا کرنے میں) اس کا ساتھ دیتے ہیں جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ توفیق ایزدی اس کے شامل حال ہو جاتی ہے اور شیطان اس کے راستہ سے ہٹ جاتا ہے لیکن اگر دیکھیں کہ وہ چیز اس کی تقدیر میں نہیں لکھی ہوئی تو وہ اس کو اپنی حالت پر چھوڑ دیتے ہیں اور شیطان آموجود ہوتا ہے لہٰذا جب وہ کسی کو دیکھتے ہیں کہ بخاری شریف کا پارہ لیے کسی مزار پر جا رہا ہے اور پھر دیکھتے ہیں کہ اس کی (اللہ کے ہاں) حاجت روائی ہونے والی ہے تو وہ اس کو سیدھے طریقہ پر لے آتے ہیں اور اس کے دل میں دعا کرنے میں عجز و انکساری ڈال دیتے ہیں اور مزار تک اس کے ساتھ ہو لیتے ہیں۔ وہ شخص تو صرف پارہ اٹھائے ہوتا ہے اور یہ اس کے اسرار اٹھائے ہوتے ہیں اور جب وہ دعا مانگتا ہے تو یہ آمین کہتے ہیں لہٰذا اس کی دعا قبول ہوتی ہے، لیکن اگر دیکھتے ہیں کہ اس کی حاجت (اللہ کے ہاں) پوری ہونے والی نہیں تو یہ کتاب کے اسرار کو نکال لیتے ہیں لہٰذا سائل صرف جسم کتاب لے کر مزار پر جاتا ہے اور راستہ میں شیطان وسوسہ و تشویش لیے ہوئے آملتا ہے جس کی وجہ سے اس کی دعا میں حلاوت باقی نہیں رہتی۔

میں نے عرض کیا: وہ اسرار کیا ہیں جو جرم کتاب سے زائد ہوتے ہیں اور جنہیں فرشتے نکال لیتے ہیں؟

حضرت نے فرمایا: وہ کیا راز ہے جس کی وجہ سے شہد کا جسم رال کے جسم سے ممتاز ہوتا ہے؟

میں نے عرض کیا: مٹھاس۔

فرمایا: پھر یہ جسم شہد کے علاوہ ایک صفت ہوتی۔

میں نے عرض کیا: ہاں۔ فرمایا: اسی طرح ہر کتاب میں ایک راز ہوتا ہے جو جسم کتاب کے علاوہ ہوتا ہے چنانچہ جب شہد کی حلاوت زائل ہو جائے تو اس کا نفع جاتا رہتا ہے اسی طرح کتاب کا حال ہے جب اس کا سر نکال لیا جائے۔

فرمایا کہ بہت سے کاغذ اور ورق زمین پر گرے پڑے پائے جاتے ہیں، جن پر اللہ تعالیٰ کے نام لکھے ہوتے ہیں اور لوگوں کے پاؤں کے نیچے آتے ہیں، اگر فرشتے ان اسماء کے اسرار کو نہ نکال لیں تو اکثر لوگ ہلاک ہو جائیں۔ وَالْحَمْدُ لِلّٰہِ عَلٰی فَضْلِہٖ وَمَنِّہٖ۔ واللہ اعلم

کیا انبیاء علیہم السلام بھی دیوان میں شرکت فرماتے ہیں

میں نے حضرت سے پوچھا کہ مجلس دیوان میں سیدنا ابراہیم و سیدنا موسےٰ

علیہما السلام و دیگر انبیاء بھی تشریف لاتے ہیں؟

فرمایا: سال بھر میں صرف ایک رات تشریف لاتے ہیں، میں نے پوچھا وہ کونسی رات ہے؟

فرمایا: شب قدر کیونکہ اس رات دیوان میں تمام انبیاء و مرسلین اور مقرب فرشتوں میں سے ملاءاعلیٰ وغیرہ بھی تشریف لاتے ہیں اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مع ازواجِ مطہرات اور اکابر صحابہ کے تشریف فرما ہوتے ہیں۔

حضرت خدیجہؓ اور حضرت عائشہؓ میں کون افضل ہے

میں نے حضرت سے حضرت خدیجہؓ اور حضرت عائشہؓ کے متعلق ایک دوسرے پر فضیلت دینے کے بارہ میں جو اختلاف ہے، دریافت کیا۔

حضرت عائشہ کی افضلیت

فرمایا: میں نے شب قدر میں دونوں کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ دیکھا تو حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کا نور[ل] حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کے نور سے زیادہ تھا۔

لیلۃ القدر کی اصل

اس کے بعد حضرت نے شب قدر کا سبب بیان فرمایا کہ سورج کی ٹکیہ میں نور پیدا کئے جانے سے پہلے دنیا تاریک تھی اور تمام زمین، آسمان، غاروں، میدانوں پہاڑوں اور وادیوں میں فرشتے آباد تھے جب اللہ تعالیٰ نے سورج میں نور پیدا کیا اور دنیا کو اس سے روشن کر دیا تو آسمان اور زمین کے فرشتوں میں شور بپا ہو گیا اور انہیں دنیا کے تباہ ہو جانے کا خطرہ لاحق ہو گیا اور یہ خیال کرنے لگے کہ شاید کوئی بڑی مصیبت ان پر نازل ہونے والی ہے۔ چنانچہ آسمان کے فرشتے بھی زمین پر اتر آتے اور زمین کے فرشتوں کے ساتھ مل کر روشنی کے سایہ کی طرف بھاگنے لگے یعنی دن کی روشنی سے جس سے وہ ناواقف تھے رات کی تاریکی کی طرف جس سے وہ واقف تھے، ڈرتے، عاجزی کرتے اور سب مل کر اللہ کی بارگاہ میں گڑگڑاتے اور زاری کرتے اور ڈرتے ہوئے اللہ کی خوشنودی چاہتے تھے اور دعا کرتے تھے کہ کہیں خدا ان پر ناراض نہ ہو جائے۔ انہیں یہی خیال تھا کہ اللہ تعالیٰ نے دنیا کو لپیٹ دینے کا ارادہ کر لیا ہے لہٰذا وہ پھر پہلے کی طرح عاجزی کرنے اور اللہ کی بارگاہ میں گڑگڑانے لگے۔ ہر لحظہ انہیں

ل مشکوٰۃ (طبع مجتبائی ص۵۰۹) میں ابو موسیٰ اشعری کی متفق علیہ حدیث مروی ہے جس میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ:

فَضْلُ عَائِشَةَ عَلَى النِّسَاءِ كَفَضْلِ الثَّرِيدِ عَلَى سَائِرِ الطَّعَامِ۔ حضرت عائشہؓ کو دیگر عورتوں پر فضیلت اسی طرح ہے جس طرح ثرید باقی کھانوں سے افضل ہے۔

یہی خطرہ لاحق رہتا کہ ابھی دنیا تہ و بالا ہوئی اور جس قدر روشنی بڑھتی جاتی وہ اسی قدر اس سے سایہ کو بھگا
چنانچہ ان کی یہی حالت رہی کہ روشنی سایہ کو کم کرتی جاتی اور وہ اس سے بھاگتے بچتی کہ ساری زمین کا چکر
لگا لیا اور جہاں سے چلے تھے ، پھر وہیں آ گئے ۔ لیکن جب انھوں نے دیکھا کہ جس بات خطرہ تھا وہ تو واقع
ہوئی نہیں تو انہیں اطمینان ہو گیا اور وہ زمین اور آسمان میں اپنی اپنی جگہ پر لوٹ آتے اس کے بعد وہ ہر سال
ایک رات میں باہم جمع ہونے لگے یہی لیلۃ القدر کی اصل ہے ۔

میں نے عرض کیا : اس سے تو یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ شبِ قدر حضرت آدم علیہ السلام کی پیدائش سے
پہلے سے چلی آتی ہے حالانکہ حدیث کے الفاظ سے یوں مستفاد ہوتا ہے کہ یہ رات خاص امتِ محمدیہ
کے لیے بنائی گئی ۔

فرمایا : آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی برکت سے اس کا ثواب اور اس کی شناخت اس اُمت کے
لیے مخصوص ہے کیونکہ گذشتہ امتوں کو اس کی واقفیت کی توفیق نہیں دی گئی جس طرح جمعہ کی ساعتِ قبولیت
کہ وہ بھی آدم علیہ السلام کی پیدائش کے دن سے موجود تھی مگر اس کو پانے کی توفیق صرف اسی امتِ شریفہ
کو عطا کی گئی اس لیے کہ یہود پر پیش ہوئی تو انھوں نے ہفتہ کو اختیار کر لیا اور عیسائیوں پر پیش ہوئی تو
انھوں نے اتوار کو اختیار کر لیا ۔ وَفَّقَنَا اللّٰہُ تعالیٰ لَھَا بِمَنِّہٖ وَجُوْدِہٖ (خدا اپنے فضل و کرم سے ہمیں یہ
ساعت پانے کی توفیق دے) واللہ اعلم ۔

ساعتِ جمعہ کی قبولیت کا سبب

میں نے حضرت سے جمعہ کی ساعت کا سبب پوچھا ۔
فرمایا : اس کا سبب یہ ہے کہ جب اللہ تعالیٰ
اشیاء کو پیدا کر چکے اور اس وقت جمعہ کی آخری ساعت تھی تو تمام مخلوقات نے اللہ تعالیٰ سے دعا و
گریہ و زاری کی کہ اللہ تعالیٰ ان پر اپنی نعمتیں تمام کرے اور اپنی رضا کے ساتھ ساتھ وہ چیزیں عطا
کرے جو ان کی بقاء اور بہبود کا سبب ہوں ، پھر فرمایا کہ جس شخص کو اللہ تعالیٰ جمعہ کی ساعت پر مطلع
فرماتے اور اسے توفیق بخشے ، اسے چاہیئے کہ وہ اسی قسم کی دعا مانگے اور اللہ تعالیٰ سے دنیا و آخرت کی
بھلائی مانگے ۔ کیونکہ اس دن مخلوقات کے دل سے یہی دعا نکلی تھی اور انھوں نے محض آخرت کے لیے دعا
نہ کی تھی ۔ لہٰذا جس کی دعا اس ساعتِ مقبولہ سے موافقت پا جائے گی ، اس کی مراد بر آئے گی ، نیز
فرمایا کہ یہ ساعت بہت ہی تھوڑی ہے ۔ اس قدر ہے جس قدر کہ کوئی شخص اطمینان سے رکوع کرے کہ ہر عضو
اپنی جگہ پر لوٹ آتے اور اس کے عروق اور جوارح میں سکون آ جاتے ۔ نیز فرمایا کہ یہ ساعت منتقل ہوتی رہتی
ہے ،

(حاشیہ اگلے صفحہ پر)

لیکن ہوتی جمعہ کے دن ہی ہے چنانچہ کبھی زوال سے پہلے ہوتی ہے اور زوال سے پہلے کی گھڑیوں میں منتقل ہوتی رہتی ہے اور کبھی زوال کے وقت اور زوال کے بعد ہوتی ہے اور غروب شمس تک کی ساعات میں منتقل ہوتی رہتی ہے۔ چھ ماہ تک قبل زوال ہوتی ہے اور چھ ماہ بعد از زوال۔ ایک مرتبہ یوں بھی فرمایا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے عہد میں یہ گھڑی اس وقت ہوتی تھی جب آپ خطبہ فرمایا کرتے تھے۔ یعنی زوال کے وقت

(حاشیہ صفحہ سابقہ)

ل علامہ جلال الدین سیوطی (تنویر الحوالک ج ۱ صفحہ ۹۸-۱۰۰) فرماتے ہیں صحابہ اور تابعین کا اس کے متعلق اختلاف ہے اور اس کے متعلق تیس سے زائد اقوال پائے جاتے ہیں۔ چنانچہ ابن عبد البر نے ایک یہ قول نقل کیا ہے کہ یہ ساعت اٹھالی گئی ہے مگر ابن عبد البر نے اسے غلط قرار دیا ہے دوسرا قول یہ ہے کہ یہ سال بھر میں ایک جمعہ میں ہوتی ہے تیسرا قول یہ ساعت مخفی ہے اور جمعہ کے دن کوئی ساعت ہوتی ہے جس طرح کہ لیلۃ القدر آخری عشرے میں مخفی رکھی گئی۔ اسی طرح اسماء حسنیٰ میں اسم اعظم کو مخفی رکھا گیا۔ رافعی وغیرہ کے کلام کا یہی مقتضا ہے اس میں حکمت یہ ہے کہ لوگوں کو اس کی تلاش میں کوشش کرنے کی ترغیب دی جائے تاکہ وہ تمام وقت عبادت میں گذار دیں چوتھا[۴] قول: یہ جمعہ کے دن منتقل ہوتی رہتی ہے اور ہر جمعہ میں ایک ہی ساعت نہیں ہوتی، غزالی اور محب طبری نے اسی کو اختیار کیا۔ پانچواں[۵] قول: صبح کی نماز کے لیے اذان کے وقت یہ ساعت ہوتی ہے۔ چھٹا[۶] قول: طلوعِ فجر سے طلوعِ شمس تک ہوتی ہے۔ ساتواں[۷] قول: طلوعِ شمس کے وقت ہوتی ہے۔ آٹھواں[۸] قول، طلوعِ شمس کے فوراً بعد ہوتی ہے، نواں[۹] قول: دن کے تیسرے پہر کی آخری ساعت۔ دسواں[۱۰] قول: زوال کا وقت، گیارھواں[۱۱] قول: جب مؤذن جمعہ کی اذان دے۔ بارھواں[۱۲] قول: زوال سے لے کر اس وقت تک کہ سایہ ایک ہاتھ بھر لمبا ہو جائے۔ تیرھواں[۱۳] قول: اذان سے لیکر امام کے نکلنے تک۔ چودھواں[۱۴] قول: اذان سے لے کر نماز شروع ہونے تک، پندرھواں[۱۵] قول: زوال سے غروب شمس تک۔ سولھواں[۱۶] قول: امام کے نکلنے سے نماز شروع ہونے تک۔ سترھواں[۱۷] قول: امام کے نکلنے کے وقت۔ اٹھارواں[۱۸] قول: امام کے نکلنے سے نماز سے فارغ ہونے تک، انیسواں[۱۹] قول: بیع کے حرام ہونے کے وقت سے بیع جائز ہونے کے وقت تک۔ بیسواں[۲۰] قول: اذان سے نماز ختم ہونے تک، اکیسواں[۲۱] قول: امام کے منبر پر بیٹھنے سے نماز ختم ہونے تک بائیسواں[۲۲] قول: جب تک امام خطبہ پڑھتا رہے۔ تیئسواں[۲۳] قول: دونوں خطبوں کے درمیان۔ چوبیسواں[۲۴] قول: جب امام منبر سے اترتا ہے۔ پچیسواں[۲۵] قول: جب امام نماز کے لیے کھڑا ہوتا ہے۔ چھبیسواں[۲۶] قول: اقامت سے نماز ختم ہونے تک۔ ستائیسواں[۲۷] قول: عصر کی نماز سے غروب شمس تک۔ اٹھائیسواں[۲۸] قول، عصر کی نماز میں۔ انتیسواں[۲۹] قول: عصر کی نماز کے بعد سے لے کر جب تک نماز پڑھی جا سکے۔ تیسواں[۳۰] قول: سورج کے زرد ہونے سے غروب

(بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر)

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے زمانہ میں منتقل ہو کر یہ گھڑی زوال کے بعد ہوتی تھی اور خطبہ کا وقت جبکہ لوگ نماز کے لیے جمع ہوتے تھے، اس ساعت سے خالی ہو گیا۔ حالانکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے خطبہ اور اجتماع کا حکم اسی ساعت کو پانے کے لیے دیا تھا، لیکن چونکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا کھڑا ہونا اور عجز و انکساری کے ساتھ خطبہ پڑھنا ایسا تھا جس کے برابر کوئی چیز نہیں ہو سکتی اس لیے آنحضرت کے قیام کے وقت کو بہت بڑا شرف اور نورِ کثیر حاصل ہوا اور یہ وقت بمنزلہ ساعت جمعہ بلکہ اس سے بھی افضل ہو گیا لہٰذا جس سے ساعت جمعہ چھوٹ گئی مگر اس نے وہ ساعت پالی جس میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم خطبہ کے لیے کھڑے ہوا کرتے تھے تو اس کو کوئی نقصان نہیں ہوا۔ یہی وجہ تھی کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے خطبہ کی ساعت کو جمعہ کی طرف جوں جوں وہ منتقل ہوتی جائے، منتقل ہوتی جائے، منتقل کرنے کا حکم نہیں دیا اسی لیے کہ آپ کی ساعت تو منتقل نہیں ہوتی اسی لیے بہتر یہی ہے کہ جمعہ کی ساعت کے مقابلہ میں اسی کا لحاظ رکھا جائے کیونکہ امت کے لیے سہولت اسی میں ہے۔ مزید براں ساعت جمعہ ایک امرِ غیب اور رازِ خداوندی ہے جس کا علم خواص کے سوا کسی کو نہیں ہوتا اور آنحضرت کے خطبہ کا وقت ظاہر اور اس کی تعیین زوال کے وقت سے ہوتی ہے جو کہ کسی پر مخفی نہیں رہ سکتی اس لیے کہ اسی کا اعتبار کیا جائے اسی بناء پر اگر کوئی شخص زوال کے وقت جمعہ پڑھے اور جمعہ میں تاخیر کرنے کی اس کی عادت ہو تو سمجھ لو کہ اس نے بلاشبہ ساعتِ نبویہ کے پانے میں کوتاہی کی اور ساعتِ جمعہ پانے کا کسی کو یقین نہیں اس طرح وہ شک کی خاطر یقینی بات کو ضائع کر بیٹھتے ہیں اور یہ بڑی بھاری کوتاہی ہے۔ ہم خدا سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے طریقہ پر چلنے کی توفیق چاہتے ہیں۔

مشرق و مغرب کے اعتبار سے اس ساعت کو کس طرح پایا جائے

میں نے عرض کیا ہم لوگ جو مغرب میں رہتے ہیں، اگر زوال کے وقت خطبہ پڑھیں اور ساعت نبویہ کو پانا چاہیں تو نہیں پا سکتے اس لیے کہ ہمارے ہاں زوال کا وقت اہل مدینہ کے زوال

(بقیہ حاشیہ صفحہ سابقہ)

تک، اکتیسواں[۳۱] قول: عصر کے بعد آخری ساعت، بتیسواں[۳۲] قول: جب آدھا سورج غروب ہو جائے۔ میں نے یہ تمام اقوال اس لیے دیے ہیں کہ حضرت دباغ رحمہ اللہ کے علم لدنی کا پتہ چل جائے۔ باقی بحث کے لیے دیکھیں تنویر الحوالک حوالہ مذکور۔

شمس الدین محمد بن طولون دمشقی نے جمعہ کی ساعت اجابت کے متعلق ایک رسالہ لکھا ہے جس کا نام ارسال الدمعہ فی بیان ساعۃ الاجابۃ یوم الجمعہ رکھا ہے (کشف الظنون ۱: ۱: ۶۶)

کے وقت سے بہت بعد میں ہوتا ہے لہٰذا اس ساعت کو پانے کے لیے زوال سے پہلے وقت میں تلاش کرنا پڑے گا جس سے یہ لازم آئے گا کہ نماز جمعہ زوال سے پہلے پڑھی جائے جو جائز نہیں، لہٰذا کیا چارہ کیا جائے؟

فرمایا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ساعت کا سرّ مطلق طور پر تمام زوال کے وقت میں جاری و ساری ہے لہٰذا خاص زوال کا اعتبار نہیں جیسا کہ طلوع و غروب میں کسی خاص جگہ کا اعتبار نہیں بلکہ ہر علاقے اور ہر جگہ کے اپنے طلوع کا اعتبار کیا جاتا ہے۔ اسی لیے تو ہم صبح کی نماز اپنی فجر کے طلوع پر پڑھیں گے نہ کہ مدینہ کی فجر کے طلوع پر، اور روزہ افطار کریں گے اپنے غروب پر نہ کہ مدینہ کے غروب پر۔ یہی حال ان تمام احکامات کا ہے جن میں وقت کا اعتبار کیا جاتا ہے اور منجملہ ان کے زوال بھی ہے۔

ساعتِ جمعہ اور شب قدر کے منتقل ہونے کا کیا سبب ہے

پھر میں نے درخواست کی کہ ساعتِ جمعہ کے منتقل ہونے کی کیفیت بیان فرمائیں اور اس کے بتدریج منتقل ہونے کی کیا وجہ ہے اور کیا وجہ ہے کہ پہلے تو جمعہ کی آخری ساعت میں تھی، پھر آہستہ آہستہ پیچھے ہٹتی گئی تا آنکہ زوال پر پہنچی، پھر آگے بڑھی تو قبل از زوال شروع دن پر جا پہنچی، پھر یہ کیسے منتقل ہو کر اپنی پہلی حالت پر آخر دن پر آجاتی ہے حالانکہ جو سرّ تقدیر ایزدی میں لکھا جا چکا ہے اس کا تقاضا ہے کہ یہ منتقل نہ ہو جیسے کہ رات کے آخر کا تیسرا حصہ منتقل نہیں ہوتا اور یہی وقت آنحضرتؐ کی ولادت کا ہے۔ مزید برآں جمعہ کی ساعت تو بہت ہی چھوٹی ہے تو وہ غروبِ شمس سے لے کر زوال تک چھ ساعت کیسے پورے کر لیتی ہے اور دوسرے چھ ساعت میں زوال سے طلوعِ شمس تک یہ تو اسی صورت میں ہو سکتا ہے کہ وہ بڑی ہو۔

حضرت نے فرمایا: جو بات تم نے پوچھی ہے اس کی تشریح سے ممانعت کر دی گئی ہے۔

احادیث سے حضرت کے بیان کی تائید

مؤلف کہتا ہے کہ اب میں ان احادیث کا ذکر کرتا ہوں جن میں حضرت کے بیان کی تائید پائی جاتی ہے۔

حضرت کا فرمان کہ صرف امتِ محمدیہ کو ساعتِ جمعہ حاصل کرنے کی توفیق دی گئی اس کی دلیل مسلم شریف کی وہ حدیث ہے جس کے راوی ابوہریرہ رضی اللہ عنہ ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا "ہم وہ سب سے بعد میں آنے والے لوگ ہیں جو قیامت کے دن سب سے آگے ہوں گے۔ ہم تمام امتوں سے پہلے جنت میں داخل ہوں گے۔ انہیں ہم سے پہلے کتاب ملی اور ہمیں ان کے بعد، مگر انھوں نے اختلاف کیا اور اللہ تعالیٰ نے ہمیں اس حق بات کی راہ بتا دی جس میں ان کا اختلاف تھا۔ چنانچہ اس دن

کے بارے میں ان میں اختلاف ہوا۔ اللہ نے ہماری رہنمائی کی اور جمعہ کا دن بتا دیا۔ جمعہ ہمارا ہے اور ہفتہ یہود کا اتوار نصاریٰ کا۔

حضرت کا یہ فرمان کہ یہ ساعت منتقل ہوتی رہتی ہے اور یہ بہت ہی چھوٹی ہوتی ہے، اس کی دلیل ابوداؤد[1] کی وہ حدیث جس کے ابوہریرہ رضی اللہ عنہ راوی ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ بہترین دن جس میں سورج طلوع ہوا جمعہ کا دن ہے۔ اسی دن آدم علیہ السلام کی پیدائش ہوئی۔ اسی دن جنت سے نکالے گئے، اسی دن ان کی توبہ قبول ہوئی۔ اسی دن وفات پائی اور اسی دن قیامت ہوگی۔ جمعہ کے دن قیامت کے بپا ہونے کے ڈر سے جن و انس کے سوا تمام مخلوق چلا رہی ہوتی ہے۔ اس دن میں ایک ایسی ساعت ہے کہ جو مسلمان اس ساعت میں نماز پڑھکر دعا مانگے اللہ اس کی دعا قبول فرماتا ہے

مسلم شریف میں یوں ہے: اسی میں آدم علیہ السلام پیدا کیے گئے، اسی میں جنت میں داخل ہوئے اور اسی میں نکالے گئے۔ مسلم نے اس ساعت کے متعلق لکھا ہے کہ ھِیَ سَاعَۃٌ خَفِیفَۃٌ۔

مسلم بن حجاج[2] نے ابوموسیٰ کی روایت سے اس کے وقت کے متعلق لکھا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ یہ ساعت امام کے بیٹھنے سے لے کر نماز ختم ہونے تک ہوتی ہے۔

عبدالحق[3] لکھتے ہیں کہ اس حدیث کی روایت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم تک صرف مخرمہ[4] بن بکیر عن

---

[1] ابوداؤد: سلیمان بن اشعث ابوداؤد سجستانی مشہور محدث ہیں ان کی سنن ابی داؤد صحاح ستہ میں شمار کی جاتی ہے ان کی وفات ۲۷۶ھ، ۸۸۹ء میں ہوئی۔ انھوں نے پانچ لاکھ احادیث میں سے منتخب کرکے چار ہزار آٹھ احادیث اپنی سنن میں دی ہیں۔

[2] مسلم۔ بن حجاج مشہور محدث ہیں۔ ان کی کتاب صحیح مسلم کا شمار صحاح ستہ میں ہوتا ہے ان کی وفات ۲۶۱ھ، ۸۷۴ء میں ہوئی۔

[3] عبدالحق: عبدالحق بن عبدالرحمن اشبیلی ابن الخراط کہا جاتا ہے ان کی متعدد تصانیف ہیں جن میں الجمع بین الصحیحین اور ایک بڑی تصنیف ہے جس میں انھوں نے صحاح ستہ کو جمع کر دیا ہے۔ یہ ۵۱۰ھ، ۱۱۱۶ء میں پیدا ہوئے اور ۵۸۱ھ، ۱۱۸۵ء میں وفات پائی۔

[4] مخرمہ بن بکیر: مخرمہ بن بکیر قرشی۔ انھوں نے اپنے باپ بکیر اور دوسروں سے حدیث کی روایت کی ہے انہیں ثقہ مانا جاتا ہے انھوں نے اپنے باپ سے صرف ایک ہی حدیث سنی۔ باقی احادیث ان کی کتاب سے روایت کی ہیں۔ اسی لیے انہیں بعض نے مدلس شمار کیا ہے ان کی وفات ۱۵۹ھ، ۷۷۵ء میں ہوئی۔

ابیہ عن ابی بردہ[1] عن ابی موسیٰ الاشعری[2] کی سند سے ہوئی ہے، لیکن اکثر لوگوں نے صرف اس طرح روایت کی ہے: عن ابی بردہ عن ابی موسیٰ یعنی اسے ابوموسیٰ کا قول بتایا ہے نہ کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا۔ یعنی یہ حدیث مرفوع نہیں بلکہ موقوف ہے عبدالحق فرماتے ہیں کہ مخرمہ نے خود اپنے باپ سے حدیث نہیں سنی وہ تو اپنے باپ کی کتابوں سے احادیث روایت کیا کرتا تھا۔

ابوداؤد میں جابرؓ[3] بن عبداللہ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے روایت کی ہے کہ جمعہ کی بارہ گھڑیاں ہیں اللہ کا جو مسلمان بندہ اس سے کچھ مانگے تو اللہ عطا فرماتا ہے۔ لہٰذا تم عصر کے بعد آخری ساعت کو تلاش کیا کرو۔

عبدالحق لکھتے ہیں: اس حدیث کی سند میں عبدالعزیز[4] بن مروان کا آزاد کردہ غلام بھی ہے۔ اسی حدیث کو ابوعمر بن عبدالبر[5] نے عبدالسلام[6] بن حفص کی روایت سے نقل کیا ہے۔ عبدالسلام کو ابن معقب بھی

---

[1] ابوبردہ: ابوموسیٰ اشعریؓ کے بیٹے ہیں۔ اپنے باپ سے حدیث کی روایت کی۔ یہ تابعی کوفی اور ثقہ تھے۔ شریح کے بعد کوفہ کے قاضی بنے مگر بعد میں حجاج نے انہیں معزول کر دیا تھا۔ ان کی ولادت اس زمانہ میں ہوئی جب انکے باپ ابوموسیٰؓ کوفہ کے گورنر تھے۔ اسی برس سے اوپر عمر پاکر ۱۰۴ھ ۷۲۲ء میں وفات پائی۔

[2] ابوموسیٰ اشعری: ابوموسیٰ عبداللہ بن قیس بن سلیم الاشعری۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے زبید، عدن اور ساحل یمن کا حاکم مقرر کیا تھا اور حضرت عمرؓ نے کوفہ کا۔ ان کی وفات ۴۴ھ ۶۶۴ء میں ہوئی۔ ساٹھ سال سے اوپر عمر پائی۔

[3] جابرؓ بن عبداللہ: صحابی ہیں، انھوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ نو جنگوں میں شرکت کی، بدر اور اُحد میں شرکت نہ کرسکے ان کے باپ نے انہیں روک دیا تھا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے لیلۃ البعیر میں پچیس بار دعاء مغفرت کی۔ مسجد نبوی میں ان کا حلقہ درس ہوتا تھا۔ ان کی وفات ۷۸ھ ۶۹۷ء میں ہوئی۔

[4] عبدالعزیزؓ بن مروان: عبدالعزیز بن مروان بن حکم بن ابی العاص۔ عبدالملک بن مروان کے بھائی اور عمر ثانی کے باپ تھے۔ یہ مصر کے گورنر تھے۔ اپنے باپ ابوہریرہ اور دوسروں سے حدیث کی روایت کی ہے، ثقہ اور قلیل الحدیث ہیں۔ ۸۶ھ ۷۰۵ء میں وفات پائی۔

[5] ابوعمرؒ بن عبدالبر: یوسف بن عمیر بن عبدالبر مصنف کتاب التمہید والاستذکار بمذاہب علماء الامصار فیما تضمن الموطا من معانی الآثار" انھوں نے اس کتاب میں موطا امام مالک کے طرز والواب کے موافق اسکی شرح کی اور فقہ میں کتاب الکافی وغیرہ لکھی جو انکی مہارت پر دلالت کرتی ہے ۳۶۸ھ ۹۷۸ء میں پیدا ہوئے اور پچانوے سال کی عمر میں ۴۶۳ھ ۱۰۷۰ء میں وفات پائی۔

[6] عبدالسلام بن حفص: ابن معینؒ انہیں ثقہ قرار دیتے ہیں۔ انہیں ابی مصعب بھی کہا جاتا ہے کتاب میں ابن معقب دیا ہے جو غلط ہے (ملاحظہ ہو تہذیب التہذیب ج ۶ ص ۳۱۷–۳۱۸)

کہتے ہیں علاء[1] بن عبدالرحمن اپنے باپ سے نقل کرتے ہیں کہ ابوہریرہ نے کہا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: جمعہ کے دن دعا کرنے کے لیے جس ساعت کی تلاش ہوتی ہے وہ جمعہ کی آخری ساعت ہے۔ ابن عبدالبر لکھتے ہیں کہ عبدالسلام ثقہ اور مدنی ہے۔ اس کے متعلق ابن معین[2] کی بھی یہی رائے ہے شاید ابوعمر بن عبدالبر نے اسی کا قول نقل کیا ہے ملاحظہ ہو عبدالحق کی کتاب احکام الکبریٰ[3] اور ابن حجر کی فتح الباری جہاں انھوں نے اکتالیس اقوال نقل کیے ہیں معہ دلائل اور ان کے رد کے۔ چنانچہ انھوں نے طویل بحث کرتے ہوئے ہر قول کے قائل کا بھی ذکر کیا ہے اور وہ احادیث پیش کی ہیں جو اس قول کی تائید کرتی ہیں۔ پھر بتایا ہے کہ ان احادیث میں کونسی صحیح، کونسی ضعیف اور کونسی موقوف وغیرہ ہیں۔ چونکہ مجھے یہ تمام اقوال یاد تھے اور انکے دلائل کا بھی مجھے علم تھا اس لیے میں نے حضرت سے اس ساعت کے متعلق گفتگو کی اور آپ سے وہ اسرار سنے جن میں سے کچھ ذکر ہو چکے۔ خدا ان سے ہمیں فائدہ پہنچائے۔ آمین۔

اب میں پھر اس مضمون کی طرف آتا ہوں۔ حضرت نے فرمایا کہ اہلِ دیوان سریانی زبان میں گفتگو فرماتے ہیں، اس لیے کہ یہ مختصر زبان ہے اور کم الفاظ میں بہت سے معنی ادا ہوتے ہیں۔ نیز اس لیے بھی کہ دیوان میں ارواح اور فرشتے بھی شریک ہوتے ہیں اور ان کی زبان سریانی ہے لیکن جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تشریف فرما ہوتے ہیں تو آپ کا ادب ملحوظ رکھتے ہوئے عربی میں گفتگو کرتے ہیں۔

اہلِ دیوان میں سے ہر کوئی لوحِ محفوظ کو نہیں دیکھ سکتا

فرمایا: ضروری نہیں کہ ہر وہ ولی جو دیوان میں آتا ہے، لوحِ محفوظ کو دیکھ سکے بلکہ بعض دیکھ سکتے ہیں اور بعض ایسے ہیں جو اپنی بصیرت کے ذریعہ سے اس کی طرف توجہ کرتے ہیں، لیکن جو کچھ اس میں لکھا ہے، اسے معلوم نہیں کر سکتے اور بعض اس طرف اس لیے توجہ نہیں کرتے کہ انہیں علم ہوتا ہے کہ وہ اہلِ نظر میں سے نہیں۔ فرمایا: اس کی مثال پہلی رات کے چاند کی سی ہے کہ اس کے دیکھنے والوں کی حالت مختلف ہوتی ہے۔

---

[1] علاء بن عبدالرحمن: ان کا پتہ نہ چل سکا۔

[2] ابن معینؒ: ابوزکریا یحییٰ بن معین، انہیں سید الحفاظ کہا جاتا ہے ۱۵۸ھ؍ ۷۷۴ء میں پیدا ہوئے اور ۲۳۳ھ؍ ۸۴۷ء میں مدینہ میں غریب الوطنی میں وفات پائی۔ فرماتے ہیں کہ میں نے دس لاکھ حدیث اپنے ہاتھ سے لکھی ہے انہیں احمدؒ بن حنبل کا ہم پلہ شمار کیا جاتا تھا۔

[3] الاحکام الکبریٰ: کشف الظنون میں عبدالحق بن عبدالرحمن ابن خراط اشبیلی متوفیٰ ۵۸۲ھ کی ایک کتاب الاحکام الکبریٰ فی الحدیث کا ذکر کیا ہے۔ یہ تین ضخیم جلدوں میں ہے ان کی ایک کتاب الاحکام الصغریٰ بھی ہے۔

فرمایا: جب اولیاء دیوان میں اکٹھے ہوتے ہیں تو ایک دوسرے کو روحانی مدد دیتے ہیں چنانچہ انوار ان میں تیروں کی طرح ایک سے نکلتے ہیں اور دوسرے میں داخل ہوتے دکھائی دیتے ہیں لہٰذا جب مجلس برخاست ہوتی ہے تو پہلے سے زیادہ نورانیت کے ساتھ نکلتے ہیں۔

اولیاء کبار مختلف شکلیں اختیار کر سکتے ہیں

فرمایا: چھوٹے ولی دیوان میں اپنی ذات سے حاضر ہوا کرتے ہیں، مگر بڑے ولی پر کوئی پابندی نہیں۔ مطلب یہ کہ جب چھوٹا ولی دیوان میں آتا ہے تو اپنی جگہ اور گھر سے غائب ہو جاتا ہے اور وہ اپنے شہر میں موجود نہ ملے گا کیونکہ وہ اپنی ذات کے ساتھ دیوان میں جایا کرتا ہے برخلاف بڑے ولی کے کہ وہ دماغ و فکر سے کام لیتا ہے اور اپنے گھر سے غائب نہیں ہوتا کیونکہ بڑا ولی جو صورت چاہے اختیار کر سکتا ہے اور کمالِ روح کی وجہ سے تین سو چھیاسٹھ مختلف صورتیں اختیار کر سکتا ہے، بلکہ میں نے ایک مرتبہ حضرت سے جب ہم فاس میں باب الحبشہ سے باہر تھے، یہ بھی سنا ہے کہ دیوان اور اہل دیوان کیا ہیں؟ وہ سب میرے سینہ کے اندر ہیں۔

ایک مرتبہ فرمایا: وہ مجلس میرے سینہ میں منعقد کی جاتی ہے۔

ایک اور بار فرمایا: تمام آسمان اور زمینیں میرے سامنے ایسے ہیں جیسے ایک موزونہ (بیسیہ) بیابان کے اندر۔

آپ اس قسم کی باتیں اس وقت کیا کرتے تھے جب آپ ترقی کر رہے ہوتے، نہیں بلکہ وہ تو ہر وقت ترقی پر تھے۔

ایک مرتبہ میں آپ کے ساتھ باب الفتوح سے باہر جا رہا تھا تو باوجود اُمّی ہونے کے آپ نے اکابر صالحین کا ذکر کیا۔ اس پر میں نے عرض کیا آپ کو ان لوگوں کا کیسے علم ہوا، فرمایا: جن لوگوں کو اللہ فتح کبیر عطا فرماتا ہے ان کی ارواح قبۂ برزخ میں رہتی ہیں۔ لہٰذا جسے ہم اس قبہ میں دیکھتے ہیں، سمجھ لیتے ہیں کہ یہ اکابر میں سے ہے۔

اس کے بعد حضرت ابراہیم دسوقی[1] کا تذکرہ ہونے لگا۔ آپ نے فرمایا: وہ اکابر میں سے ہیں پھر میں ان کے مناقب اور ان عجیب و غریب کرامات کا ذکر کرنے لگا جو ان سے صادر ہوئیں تو فرمایا: اگر حضرت ابراہیم دسوقی اپنے زمانہ سے اس زمانہ تک بھی زندہ رہتے تو (اس عرصہ میں بھی) وہ مقامات اور ترقی نہ پا سکتے جو تمہارے بھائی عبدالعزیز نے کل سے آج تک (یعنی صرف ایک دن میں) حاصل کر لی ہے۔ واللہ میں یہ فخریہ طور پر نہیں کہتا بلکہ صرف اظہار نعمت کی بنا پر کہہ رہا ہوں۔

---

[1] ابراہیم دسوقی: ابراہیم بن ابی المجد القرشی الہاشمی مشہور صوفی اور عالم ہوتے ہیں۔ کتاب الجواہر جو ایک ضخیم کتاب ہے ان کی تالیفات میں سے ہے۔ انھوں نے تینتالیس سال کی عمر میں ۶۷۶ھ ۱۲۷۷ء میں وفات پائی۔

ایک دن ہم باب الحبشہ سے شہر کے اندر آرہے تھے تو میری طرف دیکھ کر فرمایا: اس وقت مجھے تین خلعتیں عطا کی گئی ہیں۔ ان میں سے اگر ایک بھی شہر فاس پر ڈال دی جائے تو تمام باشندے پگھل جائیں اور اس کی فصیل، مکانات اور تمام باشندے فنا ہو جائیں۔

ایک روز ہم باب الفتوح سے شہر کو آرہے تھے تو میں نے آپ سے اسماء حسنیٰ اور ان کی تعداد کے متعلق دریافت کیا کیونکہ بعض علماء کا قول ہے وہ چار ہزار ہیں۔

فرمایا: میں ایک لحظہ میں یعنی آنکھ جھپکنے میں ایک لاکھ کے قریب اللہ تعالیٰ کے اسماء کا مشاہدہ کرتا ہوں بلکہ اس سے بھی زیادہ اور یہ حال متواتر رہتا ہے۔

اب ہم پھر اصل موضوع کی طرف آتے ہیں کیونکہ وہ اتھاہ سمندر ہے اور ہم آرزو کے ساحل پر بیٹھے اپنے امکان کے مطابق حضرت کے سمندروں سے گھونٹ گھونٹ پی رہے ہیں۔

دیوان سے غوث کی غیر حاضری

فرمایا: کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ غوث دیوان میں تشریف نہیں لاتے تو ان کی غیر حاضری میں اہلِ دیوان میں اختلاف پیدا ہو جاتا ہے اور وہ اس طرح کا تصرّف کرتے ہیں جو ایک دوسرے کو قتل کرنے کا سبب بن جاتا ہے اگر ان کی اکثریت کسی معاملہ میں ایک طرف ہو اور کم اولیاء اس کی مخالفت کریں تو ان میں تصرفِ سابق واقع ہوتا ہے اور وہ سب کے سب مر جاتے ہیں۔ ایک روز ایک معاملہ میں ان کا اختلاف ہو گیا، کم جماعت نے کہا اگر ہماری مرضی کے مطابق نہ ہوگا تو ہمیں مرجانا چاہیئے۔ کثیر جماعت نے کہا اگر تمہاری یہی مرضی ہے تو مر جاؤ۔ چنانچہ کم جماعت مر گئی۔ پھر فرمایا: اگر دونوں جماعتیں برابر ہوں تو ان دونوں میں تصرّف واقع ہوتا ہے۔

میں نے عرض کیا: یہ لوگ تو صاحبِ بصیرت و کشف ہوتے ہیں، پھر ان میں جھگڑا کیوں پیدا ہوتا ہے، حالانکہ وہ اپنی بصیرت سے مرادِ خداوندی کا مشاہدہ کر رہے ہوتے ہیں؟

فرمایا: اگر کم جماعت مخالف ہو تو انہیں مرادِ خداوندی سے محجوب کر دیا جاتا ہے تاکہ جو فیصلہ انکے متعلق کیا جا چکا ہے، پورا ہو جائے اور اگر دونوں فریق برابر ہوں تو مرادِ حق دونوں سے مخفی رکھی جاتی ہے اس لیے کہ اولیاء و اصفیاء، تقدیرِ خداوندی کے مظہر ہوتے ہیں، لیکن جب ان میں برابر کا اختلاف پیدا ہو گیا تو سب سے تقدیر کو مخفی رکھا گیا۔

میں نے دریافت کیا کہ غوث کی غیر حاضری کا کیا سبب ہوتا ہے؟

فرمایا: اس کے صرف دو سبب ہوتے ہیں یا تو وہ اس لیے غیر حاضر ہوتا ہے کہ وہ حق سبحانہ کے مشاہدہ میں مستغرق ہوتا ہے اور تمام عوالم اس کی نظروں میں فنا ہو جاتے ہیں۔ اسی لیے وہ دیوان میں نہیں آتا یا اس لیے کہ

اس کا تقرر ابھی ابھی ہوا ہے مثلاً یوں کہ ابھی ابھی غوث کی وفات ہوئی اور انہیں اس جگہ مقرر کیا گیا لہٰذا ابتدا میں وہ دیوان میں نہیں آتا حتیٰ کہ آہستہ آہستہ اس کی ذات مانوس ہو جاتی ہے۔

فرمایا: غوث کی غیر حاضری میں کبھی سید الوجود محمد صلی اللہ علیہ وسلم تشریف فرما ہوتے ہیں تو اہلِ دیوان پر اس قدر خوف و اضطراب طاری ہوتا ہے کہ انہیں آپ کی موجودگی میں انجام کار ہی کا پتہ نہیں چلتا اور وہ اپنے حواس کھو بیٹھتے ہیں یہاں تک کہ اگر یہ کیفیت کئی دن تک جاری رہے تو دنیا منہدم ہو جائے

فرمایا: غوث کی عدم موجودگی میں جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لاتے ہیں تو آپ کے ساتھ ابوبکرؓ، عمرؓ، عثمانؓ، علیؓ، حسنؓ، حسینؓ اور ان کی والدہ فاطمۃ الزہراء بھی تشریف فرما ہوتے ہیں، کبھی سب کے سب اور کبھی بعض ان میں سے اور حضرت فاطمۃ الزہراء ان عورتوں میں بیٹھتی ہیں جو دیوان میں بائیں جانب بیٹھتی ہیں اور حضرت فاطمہؓ ان کی امام ہوتی ہیں۔

فرمایا: میں نے حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کو ایک رات اپنے باپ پر اس طرح کا درود پڑھتے سنا:

اَللّٰھُمَّ صَلِّ عَلٰی مَنْ رُوْحُہٗ مِحْرَابُ الْاَرْوَاحِ وَالْمَلَائِکَۃِ وَالْکَوْنِ۔ اَللّٰھُمَّ صَلِّ عَلٰی مَنْ ھُوَ اِمَامُ الْاَنْبِیَاءِ وَالْمُرْسَلِیْنَ۔ اَللّٰھُمَّ صَلِّ عَلٰی مَنْ ھُوَ اِمَامُ اَھْلِ الْجَنَّۃِ عِبَادِ اللہِ الْمُؤْمِنِیْنَ۔ آپ کے درود کے یہی الفاظ نہ تھے۔ میں نے ان کا مفہوم ادا کیا ہے۔ واللہ اعلم۔

غوث کی موجودگی میں کسی کو مخالفت کی جرأت نہیں ہو سکتی

میں نے پوچھا: کیا غوث کی موجودگی میں کوئی مخالفت نہیں کر سکتا ہے؟

فرمایا: غوث کی موجودگی میں کوئی اپنا نچلا ہونٹ تک نہیں ہلا سکتا چہ جائے کہ مخالفت کا لفظ منہ سے نکالے کیونکہ اور تو اور اس طرح اس کے ایمان کے سلب ہونے کا خطرہ ہوتا ہے۔

فرمایا: جب اہل دیوان کا اجتماع ہوتا ہے تو اس وقت سے دوسرے دن کے اسی وقت تک جو کچھ ہونے والا ہوتا ہے اس پر اتفاق کرتے ہیں چنانچہ آئندہ دن اور آئندہ رات میں جو کچھ بقضاء الٰہی ہونے والا ہوتا ہے، اس پر بحث کرتے ہیں۔ ان کا تصرف تمام عوالم میں ہوتا ہے خواہ وہ عالم علوی ہو خواہ سفلی، نہیں بلکہ ستر حجابوں میں بلکہ عالم رتقا میں بھی جو کہ ستر حجابوں سے بھی اوپر ہے، ان کا تصرف ہوتا ہے۔ ان کا تصرف ان میں، ان کے رہنے والوں میں، ان کے دلوں میں اور ان کے مافی الضمیر میں ہوتا ہے۔ اہلِ تصرف کے اذن کے سوا ان کے دل میں بھی کوئی خیال پیدا نہیں ہو سکتا۔ جب عالم رتقا کا جو ستر حجابوں سے بھی اوپر ہے وہ ستر حجاب جو عرش سے بھی اوپر ہیں، ان کا یہ حال ہے تو ان عوالم کا کیا حال ہوگا۔

ایک واقعہ

مؤلف کہتا ہے کہ پولیس والوں نے میرے ایک دوست کا لڑکا گرفتار کر لیا، پولیس والے اس کی تلاش میں تھے اور وہ ان سے بہت ڈرتا تھا جب وہ پکڑا گیا تو اس کے باپ کو یقین ہوگیا کہ وہ اسے مار ڈالیں گے وہ میرے پاس آیا۔ میں حضرت کی خدمت میں حاضر ہوا اور ان سے اس لڑکے کے بارے میں تذکرہ کیا۔ حضرت نے فرمایا: کیا تمہارا خیال ہے کہ بلی میرے حکم کے بغیر چوہے کو کھا سکتی ہے اور چیزوں کا تو ذکر ہی کیا لہٰذا بچے کو کوئی خوف نہیں۔ اس کے باپ کو کہہ دو کہ مطمئن رہے۔ اور ایسا ہی ہوا کیوں کہ جب وہ کوتوالی پہنچا تو کوتوال نے بغیر کسی وجہ کے اسے چھوڑ دیا۔

حضرت فرمایا کرتے تھے جب کوئی اپنی یا کسی اور کی حاجت ہو تو مجھ سے صرف اس کا ذکر کر دیا اور بس۔ آپ کی مراد یہ تھی کہ پھر اس کے پورا ہونے پر اصرار نہ کرو اور نہ اس کا غم کرو کیونکہ یہی امر اس حاجت کے پورا نہ ہونے کا باعث ہوتا ہے چنانچہ ایسا ہی ہوتا کہ کوئی حاجت پیش آتی اور آپ سے اس کا ذکر کر کے خاموش ہو جاتے تو بہت کامیابی ہوتی، لیکن اگر زیادہ اہتمام کرتے اور زیادہ زور دیتے تو ناکامی ہوتی۔ واللہ تعالیٰ اعلم۔

میں نے عرض کیا کہ غارِ حرا کے علاوہ کہیں اور بھی دیوان لگتا ہے؟

فرمایا: ہاں مگر مذکورہ مقامات کے علاوہ کہیں بھی دس یا دس سے زائد اولیاء جمع نہیں ہوتے اس لیے کہ زمین ان کے انوار کو برداشت نہیں کر سکتی کیونکہ اللہ تعالیٰ کا منشا یہی ہے کہ یہ لوگ زمین میں پھیلے رہیں۔ واللہ تعالیٰ اعلم۔

مجاذیب کا دیوان میں کوئی دخل نہیں ان کا دخل تباہی کی علامت ہے۔

میں نے عرض کیا: کیا مجاذیب کا دیوان میں کوئی دخل ہوتا ہے اور کیا اوروں کی طرح وہ بھی تصرف کر سکتے ہیں؟

فرمایا: ان کا دیوان میں کوئی دخل نہیں اور نہ ہی ان کے اختیار میں کسی قسم کا تصرف ہے۔ جب ان کے پاس تصرف آ جائے گا تو دنیا تباہ ہو جائے گی۔

خروجِ دجّال کے وقت تصرف مجذوبوں کے ہاتھ میں ہوگا!

میں نے دریافت کیا: ان کے ہاتھوں میں کب تصرّف آئے گا؟ فرمایا: خروجِ دجال کے وقت ان کے قبضہ میں تصرف ہوگا چنانچہ دیوان کا رئیس انہی میں سے ہوگا اور چونکہ نہ اسے عقل ہوگی نہ تمیز اس لیے تصرف میں خلل پیدا ہوگا اور یہی وجہ دجّال کے نکلنے کی ہوگی۔

میں نے حضرت سے ایک قصہ سنا جس میں مجذوبوں اور انکے احوال کا ذکر تھا اور اس قصہ میں دیگر فوائد بھی ہیں

اس لیے میں اس تمام قصہ کا بیان ذکر کرتا ہوں۔ فرمایا: اہلِ مغرب میں سے حضرت حماد ایک مجذوب بزرگ تھے مصر کے بازاروں میں کھانے کو مانگتے پھرتے۔ یہ گراں سالی کا زمانہ تھا چنانچہ ایک مرتبہ وہ ایک شخص کی دوکان پر روٹی مانگنے کے لیے جارہے تھے کہ انھوں نے اپنی باطن کی نگاہ سے دیکھا کہ ایک مٹکہ میں جو اس شخص کی دوکان کے سامنے مدفون تھا، بہت سا سونا ہے۔ حضرت نے فرمایا کہ صاحبِ دکان عارفین میں سے تھا۔ اس نے دیکھا کہ حضرت حماد اس کی طرف آرہے ہیں تو اس نے انہیں آزمانا چاہا جب حضرت حماد نے سوال کیا تو فرمایا: معاف کرو۔ حضرت حماد نے پھر سوال کیا۔ انھوں نے پھر کہا "معاف کرو" پھر کہا اگر تم حماد ہو تو میں تمہیں آزمانا چاہتا ہوں۔ تم لوگوں سے سوال کرتے پھرتے ہو حالانکہ جو کچھ تمہارے پاؤں کے نیچے ہے وہ تمہارے لیے کافی ہے۔ ان کی مراد اسی مدفون سونے سے تھی جس کے اوپر حضرت حماد کھڑے تھے۔ حضرت حماد نے جواب دیا: میرے پاؤں کے نیچے تو سونا ہے۔ میں تو روٹی کے لیے چاندی کا نصف سکّہ مانگتا ہوں۔ اس سے اس شخص کو ان کا حال معلوم ہوگیا اور انہیں چاندی کے دس نصف سکّے عطا کئے اور حماد چلے آئے۔

میں نے عرض کیا: حضرت حماد کو دیکھنے سے پہلے ہی وہ شخص ان کو کیسے پہچانتا تھا کہ اس نے انہیں آزمانا چاہا؟

فرمایا: دیکھنے سے پہلے ان کا حضرت حماد کو جاننا ایسا ہے جیسے ایک سویا ہوا شخص جاگنے والا ہی ہو اور وہ خواب میں کسی شخص کو دیکھے۔ اس کے بعد جب اس کی آنکھ کھُل جائے تو اس شخص کو اپنے سامنے کھڑا پائے تو اسے وہ غور سے دیکھے گا کہ آیا یہ وہی شخص ہے جسے اس نے خواب میں دیکھا یا کوئی اور ہے تاآنکہ شک رفع ہو جاتے کہ یہ وہی شخص ہے جسے اس نے خواب میں دیکھا تھا۔ ایسا خواب جو بمنزلہ بیداری کے ہے۔

میں نے عرض کیا: اس کی کیا وجہ ہے کہ اس شخص نے پہلے تو اسے کہا کہ "معاف کرو" لیکن جب معلوم ہوا کہ وہ ولی ہیں تو جو انھوں نے مانگا تھا بلکہ اس سے زیادہ عطا کیا۔ کیونکہ اگر کسی کو اللہ کے لیے کچھ دیا جائے تو اس میں ولی یا غیر ولی کا لحاظ نہیں ہوتا۔ اس لیے کہ دونوں کا رب تو ایک ہی ہے اور اگر وہ عطیہ بغیر اللہ ہو تو وہ عارفین کے حال کے مناسب نہیں۔ لہٰذا اگر پہلی بار دینے سے انکار اللہ کے لیے تھا تو دوسری بار بھی انکار ہی ہونا چاہیئے تھا مگر جب دوسری بار انہیں دیا تو بہتر تھا کہ اللہ کی خاطر دینا تھا تو پہلی بار ہی دے دیتے۔

فرمایا: مومن کا ایک حق ہوتا ہے یعنی ایمان کا حق اور ولی کے دو حق ہوتے ہیں ایک ایمان کا اور

ایک اللہ کی معرفت کا۔ انھوں نے پہلی بار اسے کہا کہ معاف کرو تو اس بنا پر کہا کہ وہ ایک عام مسلمان سائل ہے، اس لیے اسے دینے سے انکار کیا کیونکہ اس وقت صرف حقِ ایمان کی وجہ سے اسے دینا ضروری نہ تھا لیکن آزمانے کے بعد جب معلوم ہو گیا کہ وہ عارفین میں سے ہیں تو ان کے سوال میں زور پیدا ہو گیا اور ان کا حق اور زیادہ ہو گیا اسی لیے اس کے مال میں سے انہیں حق پہنچتا تھا کیونکہ معرفتِ الٰہی میں دونوں مشترک ہیں اور معرفتِ خداوندی کی صفت ایسی ہے جیسے دو دینی بھائیوں کے درمیان عقدِ اخوت۔ لہٰذا پہلی مرتبہ دینے سے انکار بھی اللہ کے لیے تھا اور دوسری بار دینا بھی اللہ کے لیے۔ اس کی مثال یوں سمجھو کہ کوئی شخص دروازے کے پیچھے سے سوال کرے اور وہ سائل کو کہہ دے کہ معاف کرو۔ پھر دروازہ کھولنے پر معلوم ہو کہ وہ تو اس کا بھائی ہے لہٰذا مناسب ہوگا کہ جاننے کے بعد اس سے اجنبیوں کا سا برتاؤ نہ کرے کہ جاننے کے بعد بھی اسے انکار کر دے۔ کیونکہ یہ اخوت اور صلۂ رحمی کے تقاضا کے منافی ہے۔

میں نے عرض کیا کہ مسئول عنہ کے مال میں سے معرفتِ الٰہی کی بنا پر کس قدر حصہ دینا ضروری ہوتا ہے؟

فرمایا: اسی قدر جس قدر کہ دینی بھائی کے لیے واجب ہوتا ہے۔ لہٰذا اگر صرف ایک بھائی ہو تو نصف اور اگر نو ۹ بھائی ہوں تو ہر ایک کو مال کا دسواں حصہ۔

میں نے عرض کیا پھر انھوں نے کیوں چاندی کے صرف دس نصف سکّے دیے اور اپنا آدھا مال نہیں دیا؟

فرمایا: صرف یہی ایک سائل عارف تو نہ تھا ہو سکتا ہے کہ اس کے جانے کے بعد کوئی دوسرا عارف آ جاتا۔ پھر تیسرا، پھر چوتھا علیٰ ہذا القیاس۔ انسان اپنے نفس کو خود سمجھ سکتا ہے کہ دینی بھائیوں کے حقوق کس طرح ادا کرے۔

میں نے دریافت کیا کہ حضرت حماد کیا تھے؟

فرمایا: مجذوب تھے اور جن سے وہ مانگنے گئے تھے وہ حضرت ابراہیمؒ تھے جو سالک تھے اور یہ دونوں عارفین میں سے ہیں۔

سالک اور مجذوب میں فرق

میں نے عرض کیا کہ سالک اور مجذوب میں کیا فرق ہے جبکہ معرفت میں دونوں شریک ہیں۔ فرمایا: مجذوب وہ ہوتا ہے جو ان چیزوں سے جنہیں وہ دیکھتا ہے متاثر ہوتا ہے اور اپنے مشاہدہ سے خوش ہو کر اپنے بدن سے اس کی نقل اتارتا ہے اور اسی طرح کی حرکات کرنے لگتا ہے جب اللہ تعالیٰ کسی شخص پر رحم فرماتے ہیں اور اس کی چشمِ بصیرت کھول دیتے ہیں تو وہ ہر وقت ملاءِ اعلیٰ کی وہ عجیب و غریب باتیں مشاہدہ کرتا رہتا ہے جس کی نہ کیفیت

بیان ہو سکتی ہے اور نہ انھیں کوئی برداشت کر سکتا ہے لہٰذا اگر عارف مجذوب ہے تو وہ اپنی بصیرت سے جن اشیاء کا مشاہدہ کرتا ہے اسی طرح اپنے بدن سے کرنے لگتا ہے اور بصیرت کے مشاہدات لاتعداد ہیں یہی وجہ ہے کہ وہ ایک حالت پر قائم نہیں رہتا چنانچہ اگر کوئی مجذوب خوشی کے مارے جھومتا دکھائی دے تو سمجھ لو کہ وہ حورِ عین کے مشاہدہ میں کھویا ہوا ہے کیونکہ ان کی حرکات اسی قسم کی ہوتی ہیں۔ لہٰذا اس کا ظاہر بدن انہی حرکات کی نقل اتارتا ہے جنھیں وہ کر رہا ہوتا ہے لیکن سالک کا بدن نہ اپنے مشاہدہ سے متاثر ہوتا ہے اور نہ ہی وہ ان حرکات کی نقل اتارتا ہے جنھیں وہ مشاہدہ کر رہا ہوتا ہے بلکہ اس کی مثال تو ساکن اتھاہ سمندر کی سی ہے جس پر کسی چیز کا اثر ظاہر نہیں ہوتا۔ سالک مجذوب کے مقابلہ میں زیادہ کامل ہوتا ہے اور اس کا اجر بھی مجذوب کے اجر کے مقابلہ میں تین گنا ہوتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ سالک آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے نقشِ قدم پر چلتا ہے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ظاہر کسی چیز سے متاثر نہ ہوتا تھا اسی لیے سالک کے ہوش و حواس قائم ہوتے ہیں اور اکثر مجذوبوں کے قائم نہیں ہوتے کیونکہ جب ان کا بدن دوسروں کے ظاہری حرکات کی نقل کرنے لگ گیا تو فتح سے پہلے ان کا بدن جس پیدائشی حالت پر تھا وہ جاتی رہتی ہے جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ان کی عقل بھی جاتی رہتی ہے۔

ایک عارف اور ان کے بیٹے کا قصہ

فرمایا کہ اکابرین سے ایک عارف دیوان میں حاضر ہوا کرتے تھے، ان کا ایک لڑکا تھا، ان کو معلوم تھا کہ وہ لڑکا ان کا روحانی وارث بھی ہوگا، لیکن یہ معلوم نہ تھا کہ مجذوب ہوگا یا سالک۔ چنانچہ وہ اسے ایک بار گردن پر اٹھا کر مجلسِ دیوان میں لے آئے۔ اہلِ مجلس نے اعتراض کیا کہ تمھیں یہ معلوم ہونے کے باوجود کہ جو شخص اس مرتبہ کا نہیں اسے یہاں لانا جائز نہیں، پھر تم اسے یہاں کیوں لے آئے۔ انھوں نے کہا میں آپ حضرات سے معافی چاہتا ہوں اور چشم پوشی اور درگزر کی درخواست کرتا ہوں۔ اس کے بعد بچہ کو لے کر غوث کے سامنے آئے اور عرض کیا کہ حضرت میں اس مقدس مجلس میں ایک درخواست کرتا ہوں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا واسطہ اور اس مجلس کا واسطہ میرے اس بچے کے متعلق یہ ظاہر فرما دیجئے کہ آیا بچہ مجذوب ہوگا یا سالک؟ غوث نے فرمایا: یہ تو ایسی بات ہے جس کا علم ہو نہیں سکتا کیونکہ جو نورِ ایمان سالک میں ہوتا ہے وہی مجذوب میں ہوتا ہے اور جو معرفتِ الٰہی اس میں ہوتی ہے وہی اس میں ہوتی ہے رہا نیکیوں اور درجوں کا فرق اس کا ہمیں علم نہیں۔ اس کا علم آخرت ہی میں ہوگا۔ پس کس طرح معلوم ہو کہ تیرا بیٹا مجذوب ہوگا یا سالک۔ یہ تو ہو نہیں سکتا۔ اس نے پھر غوث سے عرض کی کہ آپ کو اللہ تعالیٰ نے غوث اسی لیے بنایا ہے کہ آپ کو اس کا اور اس سے بھی زیادہ کا علم دیا ہے پھر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی جاہ کا واسطہ دے کر کہا آپ ضرور بتلائیں کہ

یہ بچہ مجذوب ہوگا یا سالک۔ اس پر غوث نے کہا ایک لکڑی لاؤ۔ لکڑی لائی گئی۔ پھر چھُری منگوائی اور بچے کو بُلا کر اپنے سامنے بٹھالیا۔ پھر چھُری سے لکڑی کو تراشا اور کاٹنا شروع کیا اور کبھی وہ اپنی زبان دانتوں میں لیتے تھے اور کبھی ہونٹوں کو اور ساتھ ساتھ بچہ کو بھی تاڑتے جاتے تھے تو کیا دیکھتے ہیں کہ جب غوث زبان دانتوں میں لیتے تو وہ بھی زبان دانتوں میں لے لیتا اور جب وہ اپنے ہونٹوں کو دانتوں میں لیتے وہ بھی اپنے ہونٹ دانتوں میں لے لیتا۔ پھر فرمایا: اپنے بچہ کو لے جاؤ۔ یہ مجذوب ہوگا۔ اس نے عرض کیا: حضرت یہ کیسے معلوم ہوا؟ تو فرمایا: اس کا ظاہر بدن ان چیزوں سے متاثر ہوتا ہے جنہیں یہ دیکھتا اور مشاہدہ کرتا ہے۔

سالک چند باتوں میں مجذوب سے پرہیز کرتا ہے

پھر فرمایا: سالک چند باتوں میں مجذوب سے پرہیز کرتا ہے ایک یہ کہ سالک مجذوب کے ساتھ کھانا نہیں کھاتا کیونکہ مجذوب کو پروا نہیں ہوتی کہ اس کی زبان سے گالی نکلتی ہے یا کچھ اور۔ اس لیے سالک کو اس سے پرہیز کرنا چاہیئے۔ دوسرے یہ کہ اسی وجہ سے مجذوب کا ہمسفر نہیں ہوتا۔ تیسرے یہ کہ سالک مجذوب کا لباس نہیں پہنتا کیونکہ مجذوب نجاست سے بچتا نہیں۔ چوتھے یہ کہ سالک کے لیے مجذوب عورت سے نکاح کرنا بھی درست نہیں اور نہ ہی مجذوب کو سالکہ سے نکاح کرنا صحیح ہے۔ رہی تربیت سو کبھی سالک پیر کا تربیت یافتہ مجذوب ہوتا ہے جیسا مذکورہ بالا بچہ کا قصہ کیونکہ وہ مجذوب تھا اور اس کا باپ سالک اور کبھی مجذوب پیر کا تربیت یافتہ سالک ہوتا ہے۔ جیسے حضرت یوسف فاسی کا قصہ ہے وہ سالک تھے اور ان کے پیر عبدالرحمٰن المجذوب مجذوب تھے۔

میں نے عرض کیا: یہ کیسے ہوتا ہے حالانکہ مجذوب کو تو اپنی خبر نہیں ہوتی، پھر دوسروں کی کیسے تربیت کرے گا؟

فرمایا: قوت اور ضعف کے اعتبار سے جذب کی مختلف حالتیں ہوتی ہیں۔ چنانچہ بعض کا جذب کم ہوتا ہے اور بعض کا اس قدر زیادہ کہ کسی وقت بھی ہوش نہیں آتا۔ واللہ اعلم۔

اولیاء اللہ کے لیے اشیاء کا مسخر ہونا اور ان کا حیرت انگیز امور کا کرنا

فرمایا اولیاء اللہ بڑے بڑے کام جن پر اللہ نے ان کو مسلط کیا ہوتا ہے کر جاتے ہیں کہ دیکھنے والوں کو ان پر تعجب ہوتا ہے اگر حقیقت کی آنکھ سے دیکھا جائے تو ان کا کرنے والا خود اللہ تعالیٰ ہوتا ہے اور یہ لوگ اوروں کی طرح محض آلۂ کار ہوتے ہیں۔

میں نے عرض کیا کہ اس کا مطلب یہ ہوا کہ اولیاء اللہ حق سبحانہٗ کے افعال کا مشاہدہ کر رہے ہوتے ہیں

اور جب حقیقت یہ ہے تو پھر وہ ان افعال کو اپنی ذات کی طرف سے کیسے دیکھتے ہیں یا یہ کہ انہیں اپنی ذات کی طرف کیسے منسوب کرتے ہیں؟

فرمایا: اولیاء اللہ اور جن لوگوں پر اللہ کا لطف و کرم ہوتا ہے۔ وہ افعالِ الٰہیہ کو دوسروں کی وساطت سے دیکھتے ہیں۔ مخلوقات میں سے کسی کو بھی طاقت نہیں کہ افعالِ باری تعالیٰ کا مشاہدہ خود اس کی ذات میں کر سکے اور اگر وہ اس کا مشاہدہ خود ذاتِ باری میں کرے تو فنا ہو جائے۔ مخلوقات افعالِ حق کا مشاہدہ اوروں کی وساطت سے کر سکتی ہے اسی لیے تو واسطہ پیدا کیا اور فرشتوں کو اپنے افعال کا مظہر بنایا تاکہ مخلوقات فنا نہ ہو جاتے۔ فرشتوں کو اس کے حامل ہونے کی طاقت اس لیے ہے کہ ان کی ذات صاف نور سے بنی ہے جسم ترابی سے نہیں۔ یہ بھی یاد رکھو کہ ملائکہ کو ان افعال کا واسطہ بننے میں دیگر مخلوقات سے ممتاز کیا گیا ہے چنانچہ اگر تجھے اللہ تعالیٰ فتح نصیب کرے تو تُو دیکھے گا کہ کائنات کی کوئی جگہ بھی ان سے خالی نہیں۔ تُو انہیں حجب میں، ان کے نیچے، عرش میں اور اس کے نیچے، جنت میں، دوزخ میں، آسمان میں، زمین میں، پہاڑوں میں، وادیوں میں اور تمام سمندروں میں دیکھے گا۔

فرمایا: مخلوقات اور خالق کے درمیان ان کے واسطہ بننے سے جو فائدہ حاصل ہوتا ہے، اسی کی وجہ سے دیگر بڑی مخلوقات مثلاً حجب وغیرہ کو چھوڑ کر ان پر ایمان لانا ضروری ہے۔

امّتِ محمدیہ کے اولیاء کی فضیلت

ایک روز گفتگو کے دوران میں مَیں نے حضرت سلیمان علیہ السلام کا ذکر کیا کہ اللہ تعالیٰ نے جنوں، انسانوں، شیطانوں اور ہوا کو کس طرح ان کے لیے مسخر کیا اور پھر حضرت داؤد علیہ السلام کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ اللہ نے انہیں لوہے کی صنعت عطا کی اور لوہے کو ان کے ہاتھوں میں اس طرح نرم کر دیا جیسے گوندھا ہوا آٹا اور ان معجزات کا ذکر کیا جو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو عطا ہوئے مثلاً مادر زاد اندھوں اور کوڑھیوں کو شفا دینا اور مردوں کو زندہ کرنا وغیرہ معجزات انبیاء کا ذکر کیا اور آپ سمجھ گئے کہ میری مراد یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سب سے افضل ہیں مگر اس قسم کے معجزات آپ سے صادر نہیں ہوئے اور جو معجزات آپ سے صادر ہوئے ہیں وہ اور طرح کے ہیں۔

فرمایا: حضرت سلیمان علیہ السلام کو اپنے ملک میں جو کچھ عطا ہوا اور جو کچھ بھی حضرت داؤد علیہ السلام کے لیے مسخر کیا گیا اور جو عزت حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو دی گئی ہے امّتِ محمدیہ کے اہلِ تصرف اولیاء اللہ کو یہ تمام بلکہ اس سے بھی زیادہ طاقت دی گئی ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے جن، انس، شیاطین، ہوا اور

فرشتے تمام کو ان کے لیے مسخر کر دیا ہے بلکہ دنیا و مافیہا کی تمام اشیاء ان کی مسخر ہیں۔ انہیں مادر زاد اندھوں اور کوڑھیوں کو تندرست کرنے اور مردوں کو زندہ کرنے کی قدرت دی گئی ہے، لیکن چونکہ یہ ایک پوشیدہ امر ہے اس لیے یہ امور ان پر ظاہر نہیں ہوتے تاکہ کہیں لوگ ان کی طرف لگ کر اللہ کو بھول نہ جائیں۔ یہ سب کچھ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی برکت سے اہلِ تصرف کو حاصل ہوا ہے لہٰذا یہ سب کچھ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے معجزات میں شمار ہوگا۔ اس کے بعد ایسے اسرار کا ذکر فرمایا جو انسانی عقلوں کی سمجھ سے باہر ہیں۔ واللہ اعلم۔

اہلِ تصرف اولیاء کفار کو ہلاک کیوں نہیں کر دیتے

ایک دن میں نے حضرت سے پوچھا کہ اہلِ تصرف اولیاء کو کفار کو ہلاک کرنے کی قدرت ہوتی ہے جہاں کہیں بھی وہ ہوں۔ پھر کیا وجہ کہ ان کے کفر اور غیر اللہ کی عبادت کے باوجود انہیں زندہ چھوڑ دیا جاتا ہے حالانکہ اس قسم کے لوگوں کا ہلاک کرنا واجب ہے۔

پیچھے کی طرف مڑ کر دیکھا پھر چہرہ سیدھا کر کے کہا کہ ولی ایک لحظہ کے اندر تمام روئے زمین کے لوگوں کو فنا کر دینے کی طاقت رکھتا ہے لیکن اس کے باوجود جب مسلمانوں اور کافروں کے درمیان جنگ میں شریک ہوگا تو اسے اپنے سرّ کے ذریعہ سے کافروں میں تصرف کرنا منع ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اقتداء کرتے ہوئے اسے جنگ کے دستور کے مطابق تلوار اور نیزہ سے لڑنا ہوگا۔

ایک واقعہ

مسلمانوں کی ایک کشتی کا جس میں دو ولی تھے، کافروں کی ایک کشتی سے مقابلہ ہو گیا۔ جب ان کی جنگ تیز ہو گئی تو ان میں سے ایک ولی جو مرتبہ میں چھوٹا تھا اٹھا اور اپنے سرّ کے ذریعہ سے کافروں کی کشتی میں تصرف کیا اور ان کے دیکھتے دیکھتے کافروں کی کشتی میں آگ لگ گئی اور اس سے کوئی ظاہری سبب صادر نہ ہوا جس سے وہ اپنے تصرف کو چھپا سکے بلکہ کشتی خود بخود بغیر کسی سبب کے جل گئی۔ جب اس ولی نے یہ کام کیا تو دوسرے ولی نے جو اس سے بڑا تھا اس فعل کی سزا میں اس تصرف کو سلب کر لیا۔ فرمایا کافروں میں اس سرِّ باطنی کے ذریعہ سے تصرف کرنا اس لیے ناجائز ہے کہ صاحبِ تصرف اس حالت میں درحقیقت

کافروں سے جنگ کرنے میں اہلِ تصرف تصرفِ باطن کو استعمال نہیں کر سکتے

عالمِ بشر سے خارج اور دوسرے عالم سے جا ملتا ہے اور جیسے (مثلاً) عام ملائکہ کو جائز نہیں کہ اپنی قوتِ اصلیہ کے مطابق کافروں میں تصرف کریں اسی طرح صاحبِ سرّ کو جائز نہیں کہ ان میں اپنے تصرف کی طاقت کو عمل میں لائے بلکہ صاحبِ تصرف کے ہاتھوں وہی امور جاری ہوں گے جو ان کی بقاء و زندگی اور دوامِ عیش کا سبب ہوں گے جیسا کہ نگہبان فرشتے ان کی پیدائش سے لے کر مرتے دم

تک ان کے تمام امور کا انتظام کرتے ہیں۔ الحاصل چونکہ کفار عالم بشریں سے ہیں اس لیے ان سے جنگ کرنے اور ان کو ہلاک کرنے کے لیے صرف وہی طریقے اختیار کئے جائیں گے جو عالم بشر میں عادتاً اختیار کئے جاتے ہیں۔[1] واللہ اعلم۔

ایک عیسائی بچی کا قصہ

حضرت نے فرمایا: ایک چھوٹی عیسائی بچی نے ایک دن چاند کو دیکھ کر باپ سے کہا کہ اس چاند کو کس نے پیدا کیا؟ اس کے باپ نے زمین میں گڑی ہوئی صلیب کی طرف اشارہ کر کے کہا کہ اس نے۔ اس پر بچی نے صلیب کو اٹھایا اور سر کے برابر جاکر ہوا میں چھوڑ دیا اور وہ زمین پر آگری اور کہا ابا جو چیز اتنی قریب جگہ میں اپنے آپ کو خود نہ تھام سکی اس کو کس نے تھاما کہ اس قدر بلندی پر پہنچ کر وہ چاند کو پیدا کر آئی۔ اس پر اس کے باپ نے اسے بُرا بھلا کہا۔

میں نے حضرت سے پوچھا کیا وہ لڑکی مسلمان تھی؟ فرمایا: نہیں۔ میں نے پھر پوچھا کیا وہ بعد میں اسلام لائی؟ فرمایا: نہیں۔ میں نے کہا پھر اس نے ایسا صحیح اعتراض کیسے کیا اور ایسا واضح نور اسے کہاں سے عطا ہوا۔ فرمایا: ایک اہلِ حق وہاں موجود تھا اس نے لڑکی کی طرف دیکھا تھا جس کی وجہ سے اس نے یہ گفتگو کی۔ واللہ اعلم۔

موّلف کہتا ہے کہ اس اہلِ حق سے جو وہاں موجود تھا مراد خود حضرت شیخ ہیں اور جو نظر اس لڑکی پر پڑی تھی وہ باطن کی نظر تھی جو لوگوں کی نگاہوں سے مخفی ہے واللہ اعلم۔

اگر ولی اپنے جسم کے سوا کسی اور جسم میں قتل ہو تو تکلیف کسے ہوگی!!

میں نے حضرت سے دریافت کیا کہ جب ولی اپنی صورت چھوڑ کر کسی اور شکل میں ہو اور وہ اسی شکل میں قتل ہو جائے تو اس وقت تکلیف کسے ہوگی؟ اس کی روح کو یا اس کے اصلی جسم کو جس کی شکل اس نے اختیار کی ہے؟

فرمایا: ہمیں یہی عقیدہ رکھنا چاہیے کہ دونوں جہانوں میں تکلیف ایک ہی طرح کی ہے مگر لوگوں کو اس کا علم نہیں اس لیے کہ وہ یہی سمجھتے ہیں کہ تکلیف جسم کو ہوتی ہے حالانکہ درحقیقت ایسا نہیں روح کو

---

[1] اگر یہی بات ہوتی تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو جنگیں لڑنے کی کیا ضرورت تھی۔ محض سِر سے ہی تمام کفار کو ہلاک کر دیتے اور بس۔ پھر اس قدر انبیاء جو قتل ہوتے ہیں، نہ ہوتے لہٰذا مومن و منافق میں تمیز بھی نہ ہو سکتی اور نہ مرتبۂ شہادت رہتا۔ اسی طرح اگر ان اسرارِ خداوندی پر غور کیا جائے تو بات واضح ہو جاتی ہے کہ کفّار کو ہلاک کرنے میں سِر کا استعمال درست نہیں۔ ۱۲۔

تکلیف پہنچانا مقصود ہے۔ پھر کچھ اسرار کی باتیں بیان کرکے اس کی وضاحت کی۔ اس کی دلیل یہ ہے کہ جب اللہ تعالیٰ کسی ولی کو کسی ایسی جگہ پر متعین فرماتے ہیں جسے اس کی ذاتِ ترابی سخت گرمی یا سخت سردی وغیرہ کی وجہ سے برداشت نہیں کرسکتی۔ اس لیے اس کی روح اپنی ذات سے نکل کر اس دوسرے جسم میں داخل ہو جاتی ہے جو اس کی برداشت کی طاقت رکھتا ہو اور اس طرح جس کام پر وہ ولی مامور ہوتا ہے۔ اسے پورا کرتا ہے اور اس نئے جسم میں اگر اسے کوئی تکلیف ہوگی تو بعینہٖ اسی طرح اسے درد محسوس ہوگا جس طرح اپنی ذات میں۔

میں نے پوچھا: جن اجسام میں روح داخل ہوتی اور منتقل ہوتی ہے وہ کون سے ہیں؟

فرمایا: پہاڑ اور بیل وغیرہ جو ان موانع کو برداشت کرسکیں۔

میں نے عرض کیا: جب ان کی اپنی روح اپنی ذات میں موجود ہوتی ہے تو پھر ولی کی رُوح ان میں کیسے داخل ہو جاتی ہے؟

فرمایا: ان کی روح اگرچہ ان کی ذات میں موجود ہوتی ہے مگر وہ انسانوں کی روح کی طرح نہیں ہوتی کیونکہ بہائم کی روح ان کی عقل کی طرح (کمزور) ہوتی ہے اور ان کی عقل ان کی روح کی طرح ہے یہی وجہ ہے کہ ان کی روحیں ان کی ذات پر اس طرح حکم نہیں چلا سکتیں جس طرح بنی آدم کی روحیں ان کی ذات پر حکم چلا سکتی ہیں اسی لیے تو ولی جب ایسے امر مقدّر کو (اللہ کے حکم سے) نافذ کرنا چاہتا ہے جو تبدیلِ جسم پر موقوف ہو تو چوپایوں کی شکل اختیار کر لیتا ہے اور انسانوں کی شکل اختیار نہیں کرتا کہ ان میں ان کی روح موجود ہوتی ہے۔

میں نے کہا بعض اوقات ہم دیکھتے ہیں کہ ایک روشنی غیر متحرک ہوتی ہے مگر پھر کوئی بات پیش آجاتی ہے جس سے وہ اپنی جگہ سے اکھڑ کر کسی شخص کی طرف حرکت کرتی دکھائی دیتی ہے حتیٰ کہ اسے قتل کر دیتی ہے ہو سکتا ہے کہ ولی نے اس امر مقدر کو پورا کرنے کے لیے آگ کی شکل اختیار کی ہو۔

فرمایا: ممکن ہے ایسا ہی ہو بشرطیکہ مقتول کافر ہو۔ اس لیے کہ نور کے لشکر اور ظلمت کے لشکر میں سخت جنگ رہتی ہے۔

میں نے کہا: بلی اور کتوں کی شکل میں جو شیاطین متشکّل ہوتے ہیں، ممکن ہے کہ اس کی بھی یہی نوعیت ہو؟

فرمایا: ہاں. شیاطین میں ظلمت اور باطل (کی قوت) ہے اور اولیاء اللہ میں حق اور نور کی اور ظلمت اور نور دو لشکر ہیں۔ تقدیرِ الٰہی کو نافذ کرنے کی غرض سے کبھی یہ لشکر چوپایوں کی صورت اختیار

کرلیتا ہے اور کبھی وہ۔

میں نے کہا: کیا ولی سانپ کی صورت بھی لے لیتا ہے؟

فرمایا: ہاں۔ اگر اللہ کا حکم ہو کہ زید کو زہر سے قتل کیا جائے تو اس وقت اس کی روح سانپ کی شکل اختیار کرلیتی ہے تاکہ تقدیر الٰہی نافذ ہوسکے۔

میں نے عرض کیا کہ ولی کی روح میں تو زہر نہیں ہوتا۔

فرمایا: زہر کیا ہے؟ ولی کی ہمت اور عزیمت سے تمام اشیاء اثر پذیر ہوتی ہیں۔ ولی جس بات کا ارادہ کرتا ہے ہو جاتی ہے۔

اس کے بعد جب ولی کی روح اس کی ذات سے نکل کر کسی اور ذات میں منتقل ہو جاتی ہے تو اس کی ذات کی کیا حالت رہ جاتی ہے؟

فرمایا: وہ روح کے بغیر رہ جاتی ہے۔ اگر وہ چھوٹا ولی ہو تو اس کی ذات مبہوت اور بے ہوش رہ جاتی ہے اور وہ کوئی بات نہیں کرسکتا اور اگر بولے بھی تو اس کی بات سمجھ نہیں آسکتی۔ لیکن اگر وہ کبارِ اولیاء میں سے ہو تو اس کی ذات اسی حالت میں رہتی ہے چنانچہ وہ اس طرح باتیں بھی کرتا ہے اور ہنستا بھی ہے۔

میں نے عرض کیا: جب ذات روح کے بغیر رہ گئی تو وہ مرگیا۔ پھر پہلے شخص کا مبہوت و مدہوش کی صورت میں رہنے کا کیا مطلب؟ اور دوسرے کے اپنی حالت میں رہنے سے کیا مراد ہے جبکہ روح دونوں کی نکل چکی ہے؟

فرمایا: جب روح نکل جاتی ہے تو اس کے آثار مثلاً حرارت وغیرہ باقی رہتے ہیں اور جب تک آثار باقی ہوں ذات زندہ رہتی ہے اور یہ آثار چوبیس گھنٹوں کے بعد کہیں زائل ہوتے ہیں چنانچہ جس کی روح چوبیس گھنٹے گزرنے سے پہلے ذات میں لوٹ آتی ہے وہ بدستور زندہ رہتا ہے اور جس پر چوبیس گھنٹے گزر جائیں اور روح واپس نہ آئے تو پھر وہ کبھی بھی بدن کی طرف لوٹ نہیں سکتی اور اس کا شمار مُردوں میں ہوتا ہے بہت سے ولیوں کی روح اسی حالت میں قبض ہوگئی اور جن لوگوں کی روح اس حالت میں قبض ہو جائے ان پر اللہ کی بڑی عنایت ہوتی ہے۔

اس پر میں نے سوال کیا کہ میں نے سنا ہے کہ بعض اولیاء کی روح اپنی ذات سے تین تین دن غائب رہتی ہے اور پھر واپس آجاتی ہے اس سے تو مذکورہ بالا تقریر کی تردید ہوتی ہے۔

فرمایا: تم نے جو کچھ سنا ہے، سچ ہے۔ روح سترہ دن بلکہ اس سے بھی زیادہ روز تک غائب رہتی ہے

مگر اس حالت میں ذات کی طرف روح کی توجہ کا رہنا ضروری ہے۔ اسی توجہ کی بدولت تو ذات زندہ رہتی ہے۔ پھر اس کی مثال یوں بیان کی کہ کوئی شخص ایسی جگہ پہنچے جہاں چوری وغیرہ کا خطرہ ہو پھر وہ اپنے کپڑے اتار کر ندی میں تیرنے لگے۔ وہ خود تو پانی میں ہوگا، لیکن اسے اپنے کپڑوں کا ڈر ہوگا چنانچہ تو دیکھے گا کہ کبھی تو وہ غوطہ لگاتا ہے اور کبھی وہ سر اٹھا کر کپڑوں کو دیکھتا ہے کہ کہیں کوئی شخص چرا نہ لے جائے یہی حال روح کا ہے جب یہ ذات سے نکل کر جاتی ہے تو اسی طرح اپنی ذات کی خبر گیری کرتی ہے جس طرح کہ یہ تیرنے والا اپنے کپڑوں کی کرتا ہے فرق اتنا ہے کہ تیرنے والا صرف نگاہ سے اپنے کپڑوں کا خیال رکھتا ہے اور روح خفیف ہونے کی وجہ سے ذات میں داخل ہو کر اس کی نگرانی کرتی ہے چنانچہ ذات کی طرف محض توجہ سے ہی روح کا اس میں دخول ہو جاتا ہے اس کے بعد جو کام اللہ نے اس کے سپرد کیا ہوتا ہے، اسے پورا کرنے کے لیے نکل جاتی ہے۔ پھر توجہ کرتی ہے اور داخل ہو جاتی ہے اور یہ معاملہ اسی طرح جاری رہتا ہے تاآنکہ وہ کام پورا ہو جاتا ہے خواہ اس میں تین یا اس سے بھی زیادہ دن گزر جائیں۔ لہٰذا ان دونوں بیانوں میں کوئی تضاد نہیں پایا جاتا ہے۔ واللہ تعالیٰ اعلم۔

صاحبِ تصرف ولی جس کی جیب میں سے چاہے بدون اس کے کہ اسے پتہ چلے ہاتھ ڈال کر پیسے نکال سکتا ہے۔

فرمایا کہ صاحب تصرف جس کی جیب میں سے چاہے، ہاتھ ڈالکر اسے پتہ چلنے کے بغیر جتنے پیسے چاہے نکال سکتا ہے۔ مؤلف کہتا ہے کہ اس کی وجہ یہ ہے کہ جس ہاتھ سے ولی پیسے نکالتا ہے وہ باطن کا ہاتھ ہوتا ہے ظاہر کا نہیں۔

اس کے بعد آپ نے ایک ولی کا ایک واقعہ ذکر کیا جو اسے پڑوسی کے ساتھ پیش آیا تھا۔ اس پڑوسی کی بیوی کے پاس کسی شخص نے پانچ مثقال (سونے کا سکہ) بطور امانت رکھے اور خود فجیج کی طرف مسافرت میں چلا گیا اور کہہ گیا کہ زندہ رہا تو پانچ مثقال خود لوں گا اور اگر مر گیا تو میری اولاد کو دے دینا۔ اس شخص کے چلے جانے کے بعد عورت کی موت کا وقت آگیا۔ اس نے اپنے خاوند سے وصیت کی کہ اگر ان مثقالوں کا مالک آگیا تو یہ اسے دیدینا۔ خاوند نے اس وقت تو اس سے ہاں کر لی مگر اسے دفن کرنے کے بعد اس کا دل بے ایمان ہوگیا اور ان مثقالوں کو ہضم کر گیا۔ پھر جب ان کا مالک آیا تو اس نے دینے سے انکار کر دیا۔ اس کے بعد اس نے پیسہ جمع کرنا شروع کر دیا یہاں تک کہ اس نے اسی قدر رقم یعنی پانچ مثقال جمع کر لیے اور اس پر بہت خوش ہو کر گھر سے نکلا اور اس وقت اس کا پڑوسی ولی اپنے دروازہ پر تھا۔ یہ دونوں فاس میں راس الجناس کے محلہ میں رہتے تھے اس نے شمع فروش سے ایک شمع خریدی تاکہ حضرت

عبدالقادر فاسی کے مزار پر جا کر جلائے جب وہ اس تنور کے پاس پہنچا جو سبع لویات میں ہے تو ولی نے رأس الجنان سے (جہاں وہ اب تک کھڑا تھا) اس کی جیب میں ہاتھ ڈالکر امانت میں خیانت کرنے کی سزا میں پانچ مثقال نکال لیے اور اسے کسی بات کا علم بھی نہ ہوا۔ یہاں تک کہ وہ اس مزار پر پہنچا اور وہاں شمع روشن کی۔ پھر رأس الجنان کی طرف جھانک کر دیکھا۔ جب اس کی نگاہ اس ولی پر پڑی تو اس کے دل میں خیال پیدا ہوا کہ اپنی جیب تو دیکھ لوں۔ ہاتھ ڈالا تو جیب میں کچھ بھی نہ تھا۔ اس سے وہ بہت برہم ہوا اور ولی سے بات کرنے لگا مگر اسے اس کی ولایت کا علم نہ تھا کہنے لگا خدا کی قسم اللہ کا کوئی ولی نہیں رہا نہ زندہ اور نہ مردہ۔ ولی کو اس قدر ہنسی آئی کہ ہنسی کے مارے گرنے کو تھا۔ پھر ولی نے پوچھا: چچا عبدالرحمن کیا بات ہے، کہنے لگا جب گھر سے نکلا تھا تو پانچ مثقال جیب میں تھے ان کی خوشی میں مَیں نے ارادہ کیا کہ حضرت عبدالقادر فاسی کے مزار پر شمع جلانے کو لے جاؤں مگر اچکوں نے جیب تراش لی۔ اس سے ولی کو اور بھی ہنسی آئی۔ واللہ اعلم۔

مؤلف کہتا ہے ولی مذکور خود حضرت شیخ تھے۔ اسی قسم کا واقعہ آپ کو فقیہ محمد بن علی مُجّادی (میم پر زبر اور جیم پر شد۔ مجادہ کی طرف نسبت ہے جو تازی کے رہنے والے ایک قبیلہ کا نام ہے) کے مریدوں کی ایک جماعت کی موجودگی میں پیش آیا کہ محمد بن علی مجادی اپنے وطن سے حضرت کی زیارت کے لیے آئے حضرت گھر سے نکل آئے۔ اپنے گھر کے دروازہ کے قریب دیوار سے تکیہ لگا کر بیٹھ گئے اور محمد بن علی مجادی بالمقابل کے گھر کی دیوار کے ساتھ بیٹھ گئے۔ دونوں کے درمیان راستہ تھا جہاں سے لوگوں کی آمدورفت رہتی تھی۔ حضرت نے فقیہ سے کہا (اور حضرت کو اُن سے بڑی الفت تھی) آپ کے پاس کچھ درہم ہیں۔ جواب دیا کہ میرے پاس تو کچھ بھی نہیں۔ حضرت نے یہی سوال تین بار دہرایا اور فقیہ نے تینوں مرتبہ یہی جواب دیا۔ حضرت نے فرمایا ذرا دیکھو تو سہی۔ فقیہ کے پاس ایک کپڑے میں بندھے ہوئے اٹھارہ موزونے تھے لہٰذا انہیں اقرار کرنے کے سوا کچھ بن نہ پڑا اور کہا ہاں اٹھارہ موزونے ہیں۔ حضرت نے فرمایا: لاؤ تو۔ فقیہ نے اپنی جیب میں ہاتھ ڈال کر ٹٹولا تو کچھ بھی نہ تھا اور وہ حیران رہ گئے۔ شیخ ہنسے اور اپنے نیچے سے کپڑے میں بندھے بندھائے نکال دیے اور فرمایا: اے محمد بن علی جس شخص کو اتنی قدرت ہو تو اس سے کیسے انہیں چھپا سکتا ہے۔

ہم نے اسی فقیہ کے ساتھ حضرت کی ایک اور کرامت دیکھی۔ اس طرح کہ فقیہ مذکور بڑا حریص تھا اور اسے دنیا سے بہت محبت تھی اور اس نے دنیا کا بہت سا مال جمع کر رکھا تھا مگر اس کے کوئی اولاد نہ تھی۔ جب حضرت سے اس کی ملاقات ہوئی اور اللہ تعالیٰ نے حضرت کی محبت اس کے دل میں ڈال دی تو

حضرت اسے اللہ کے لیے مال خرچ کرنے کو کہا کرتے اور فقیہ بھی بے دریغ خرچ کیا کرتا اور وہ خود بھی اس سے تعجب کرتا تھا۔ کیونکہ اس سے پہلے اس قسم کی اس کی عادت نہ تھی۔ اس کے بعد حضرت نے صدقہ و خیرات میں اس کا روپیہ نکالنے میں اور بھی سختی شروع کردی یہاں تک کہ ہمیں اس پر رحم آتا تھا اور ہم کہا کرتے کہ حضرت نے اس پر بہت بوجھ ڈال دیا ہے مگر فقیہ مذکور اس سے بہت خوش تھا، ہمیں تو اس کے انجام کا علم نہ تھا مگر شیخ کو اس کا پتہ تھا۔ اس لیے کہ فقیہ کی موت کا وقت قریب آچکا تھا اس لیے حضرت اس کے لیے جنت میں محل تیار کروا رہے تھے اور اس کے مال کو اس کے لیے پہلے سے ہی وہاں پہنچا رہے تھے جس کا ہمیں علم نہ تھا۔ جب فقیہ کا مال ختم ہونے کو آیا اور صرف اس قدر باقی رہ گیا جس کی اس کی بیوی وارث ہو سکے اور اپنا مہر لے سکے تو فقیہ مذکور نے وفات پائی۔

حضرت نے اپنے ایک بزرگ دوست علی بن عبداللہ صنہاجی سے بھی جن کا ذکر ابتداءِ کتاب میں ہو چکا ہی کیا تھا۔ کیونکہ حضرت نے ان سے پہچان ہونے کے دن سے ہی اللہ کی راہ میں مال خرچ کرنے پر اصرار کیا تھا اور مال ختم ہو جانے پر ان کی وفات ہوئی اور وہ جوارِ رحمت میں جا بسے۔

خدا تمہیں توفیق دے۔ ذرا غور کرو کہ حضرت جیسے بزرگوں کی معرفت سے لوگوں کو کیا فائدہ حاصل ہوتا ہے۔

مال لینے میں ولی اور چور میں فرق

فرمایا: صاحبِ تصرف ولی کے لوگوں کا مال نکالنے میں اور چور کے مال نکالنے میں فرق صرف حجاب اور عدمِ حجاب کا ہے کہ ولی کو مشاہدۂ حق نصیب ہوتا ہے اور اسی کی طرف سے وہ مال لینے پر مامور ہوتا ہے جیسا کہ قرآن مجید میں ارشاد ہوا کہ مَا فَعَلْتُهٗ عَنْ اَمْرِیْ (میں نے یہ کام اپنی مرضی سے نہیں کیا)

فرمایا: حضرت منصور قطب ایک مرتبہ مولانا ادریس کے مزار پر آئے وہاں حضرت ابو لعیزی بن ابو زیان ہکاری بھی زیارت کو آئے ہوئے تھے۔ حضرت منصور ان کا زادِ راہ لے کر چل دیے۔

میں نے حضرت سے اس کے متعلق عرض کیا (کہ یہ تو چوری ہے)

فرمایا: چور اور ولی کے لینے میں فرق حجاب اور عدمِ حجاب کا ہے حضرت منصور چونکہ قطب تھے انہیں وہ زادِ راہ اپنا دکھائی دیتا تھا اور لوحِ محفوظ میں انہیں وہ اپنی قسمت میں دکھائی دیتا تھا اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس کے لینے کا حکم بھی سن لیا تھا اس لیے ان کے لیے اس کا لینا جائز تھا خواہ وہ کسی طریقہ میں ہو اور چور جو ہوتا ہے وہ محجوب اور رب سے غافل ہوتا ہے۔ پھر آپ نے حضرت عبدالرحمٰن مجذوب کا قصہ بیان کیا کہ ان کے مریدوں نے ایک بیل پکڑ لیا۔ حضرت عبدالرحمٰن نے انہیں اسے ذبح

کرنے اور کھا لینے کا حکم دیا، مگر حضرت یوسف فاسی نے جو بعد میں ان کے جانشین بنے ہاتھ کھینچ لیا آخر کار بیل کا مالک آیا اور اس نے بتایا کہ وہ بیل حضرت عبدالرحمٰن اور ان کے مریدوں کے لیے صدقہ ہے۔

مؤلف کہتا ہے کہ یہ ایک مشہور واقعہ ہے۔ اسی طرح حضرت ابو یعزیٰ مذکور کا حال ہے کہ ان کے لیے اگر یہ ممکن ہوتا کہ اپنا گوشت حضرت منصور کو کھانے کو دے سکیں تو وہ ضرور کر گزرتے۔ خدا ہمیں کاملین کے متعلق بُرے عقیدے رکھنے سے بچائے۔ اس باب میں ہمارا ارادہ صرف اتنا ہی لکھنے کا تھا۔ خدا اس سے لوگوں کو فائدہ پہنچائے۔ آمین۔

پانچواں باب

پیر پکڑنے اور مرید بننے کے بارے میں اور اس کے متعلق جو کچھ حضرت سے سننے میں آیا

پہلا سوال: کیا تربیت منقطع ہو گئی ہے؟

ایک نقیبہ نے حضرت سے دریافت کیا یہ جو کسی نے کہا ہے کہ تربیت منقطع ہو چکی کیا یہ درست ہے؟ اصل سوال کی عبارت اس طرح ہے: اے حضرت امام جن پر اللہ تعالیٰ نے اپنے اولیاء کی سی فتوحات عنایت کیں اور انہیں خاندان نبوت کی نسبت سے سرفراز کیا۔ خدا اس صاحب نبوت پر بہترین درود اور پاکیزہ ترین سلام بھیجے۔ خدا آپ کو اپنے علوم لدنیہ عطا کرے۔ ہمیں اس طرح واضح طور پر بتلائیں کہ تمام شبہات زائل ہو جائیں اور عقلوں سے ہر قسم کا اشکال دور ہو کر علوم روحانیہ حاصل کر سکیں اور ساتھ ساتھ عبارت کی تشریح کر کے مثالیں بھی دیں کیونکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے وارد ہے کہ تمام مخلوق اللہ کا عیال ہے اور مخلوقات میں سے اللہ کو وہ لوگ زیادہ پیارے ہیں جو اس کے عیال کو زیادہ نفع پہنچائیں۔ جناب عالی! ان شبہات میں سے ایک شبہ یہ ہے کہ حضرت زروقؒ نے فرمایا ہے کہ اصطلاح صوفیہ میں جسے تربیت کہتے ہیں وہ ختم ہو گئی۔ اب صرف ہمت اور حال کے ذریعہ سے ہی تربیت رہ گئی ہے لہٰذا تم بغیر کم و کاست کے کتاب و سنت پر عمل کیا کرو۔ کیا یہ انقطاع تربیت خاص آپ کے زمانہ کے لیے ہے یا نزول عیسیٰ علیہ السلام تک منقطع رہے گی۔ اگر واقعی منقطع ہو چکی ہے تو اس کا کیا سبب ہے؟ اور اگر باقی ہے تو وہ شیخ کون ہے جسے مرید کی روح دے دی جائے تاکہ علیحدگی میں جیسا چاہے وہ اس میں تصرف کرے۔ ہمیں بتلائیں وہ شیخ کس ملک اور کس شہر میں ہے جس کے ہاتھوں مخلوق کامیاب ہوئی ہو۔ یہ نقیبہ وہی ہیں، جن کا ذکر ن کی تفسیر میں اور ان دو کتابوں والی حدیث کی تشریح میں آ چکا ہے جن میں اہلِ جنت و اہلِ نار کے نام ہیں۔

خیر القرون میں پیری مریدی کیوں نہ تھی

حضرت نے جواب دیا: تربیت کا مقصد ذات کی صفائی اور رعونت سے اسے پاک کرنا ہے تاکہ سرِ خداوندی کی متحمل ہو سکے اور یہ اسی صورت میں ہو سکتا ہے جب اس کی ظلمتیں دور ہو جائیں اور باطل سے اس کے تمام تعلقات منقطع ہو جائیں۔ پھر باطل سے اس کا قطع تعلق کبھی اس طرح ہوتا ہے کہ اصل خلقت میں اسے پاک و صاف کیا جاتا ہے کہ حق تعالیٰ بلا واسطہ اس کو پاک بنا دیتا ہے۔ یہ حالت تو قرونِ ثلثہ کی تھی جنھیں خیر القرون کہا جاتا ہے کہ اس زمانہ کے لوگ بالطبع حق کے ساتھ متعلق اور اس کی تلاش میں لگے ہوتے تھے۔ سوتے تھے تب بھی اسی حال میں اور جاگتے تھے تب بھی اسی میں اور حرکت کرتے تھے تب بھی اسی طلب و تلاش میں۔ یہاں تک کہ جنھیں اللہ نے بصیرت دی ہے اور وہ ان کے باطن کی طرف دیکھے تو شاذ و نادر ہی ایسا شخص ملے گا جس کی عقل اللہ اور رسول کے ساتھ نہ لگی ہو اور وہ اللہ اور رسول کی رضا تک پہنچنے کی کوشش میں نہ لگا ہو۔ یہی وجہ تھی کہ ان میں کثرت سے بھلائی پائی جاتی تھی اور ان میں نورِ حق چمکتا تھا اور ان میں اس قدر علم کا ظہور ہوا اور اس حد تک درجۂ اجتہاد کو پہنچے جس کی نہ کیفیت بیان ہو سکتی ہے اور نہ کسی کی وہاں تک پہنچنے کی طاقت ہے۔ اسی لیے اس زمانہ میں تربیت کی کوئی ضرورت نہ تھی۔ صرف اتنا ہوتا کہ پیر کی ملاقات اپنے اس مرید سے ہوتی جو بعد میں اس کا صاحبِ سر اور نور کا وارث ہوتا۔ پیر مرید کے کان میں کوئی بات کہہ دیتا اور صرف اسی سے مرید کو فتح نصیب ہو جاتی اس لیے کہ ان کی ذات پاک ہوتی، ان کی عقلیں صاف ہوتیں اور وہ راہِ ہدایت کی تاک میں لگی رہتی تھیں۔

کبھی تربیت شیخ کے ذریعہ سے ہوتی ہے کہ پیر کو مرید کی ذات سے تاریکی دور کرنی پڑتی ہے۔ یہ اس زمانہ کی بات ہے جو قرونِ ثلثہ کے بعد کا زمانہ ہے۔ جب نیتیں فاسد ہو گئیں۔ ارادوں میں کھوٹ آگیا اور لوگوں کی عقلیں دنیا کی طرف لگ گئیں اور شہواتِ نفسانی تک پہنچنے اور لذات کو حاصل کرنے کی کوشش میں ہر وقت لگی رہتیں، پھر یہ ہوتا کہ صاحبِ بصیرت پیر کی ملاقات اپنے مرید سے ہوتی۔ وہ اسے پہچانتا اور دیکھتا کہ اس کی عقل باطل اور شہوات کے حصول کی طرف لگی ہوئی ہے اور اس کی ذات بھی عقل کی تقلید کر رہی ہے چنانچہ وہ بھی لہو و لعب کرنے والوں اور باطل لوگوں کی طرف مائل ہو جاتی ہے اس کے اعضاء کی حرکت بھی غیر محمود ہے۔ اس سب کا سبب یہ ہوتا ہے کہ عقل جو ذات کی مالک ہے وہ خود باطل میں جکڑی ہوتی ہے۔ لہٰذا جب پیر مرید کو اس حالت میں دیکھتا ہے تو وہ اسے خلوت ذکر اور کم کھانے کا حکم دیتا ہے۔ خلوت کی وجہ سے وہ ان باطل لوگوں سے منقطع ہو جاتا ہے جن کا شمار

مردوں میں ہے۔ ذکر سے کلام باطل اور لغو باتیں دور ہو جاتی ہیں جو اس کی زبان پر چڑھی ہوئی ہوتی ہیں اور کم کھانے سے وہ بخارات جو خون میں ہوتے ہیں کم ہو جاتے ہیں لہٰذا شہواتِ نفسانی بھی کم ہو جاتی ہیں اور عقل کا تعلق پھر اللہ اور اس کے رسول کے ساتھ ہو جاتا ہے جب مرید اس حد تک پاک و صاف ہو جاتا ہے تو اس کی ذات سِر کو برداشت کرنے کے قابل ہو جاتی ہے۔ شیخ کا اسے تربیت دینے اور خلوت میں لے جانے کا مقصد بھی یہی ہوتا ہے۔

پھر ایک مدت یہ طریقہ جاری رہا یہاں تک کہ حق باطل سے اور نور ظلمت سے مخلوط ہو گیا چنانچہ اہل باطل ان لوگوں کی جو ان کے پاس آتے تھے، تربیت کرتے کہ انہیں بری نیت اور باطل اغراض سے خلوت میں جانے کو کہتے اور اسماء الٰہیہ کی تلقین کرتے۔ پھر ان کے ساتھ تعویذات اور عملیات کا اضافہ کر دیتے جس کا انجام مکرُ اللہ اور استدراج ہوتا۔ حضرت زروق اور ان کے شیوخ کے زمانہ میں چونکہ یہ رنگ عام پھیل گیا تھا اس لیے انھوں نے دینی خیر خواہی کی غرض سے یہ مشورہ دیا کہ اس طریق تربیت کو جس میں اہلِ باطل کی کثرت ہو گئی ہے ترک کر دیں اور وہ امن کا راستہ اختیار کریں جس میں نہ کوئی خطرہ ہے نہ پریشانی یعنی کتاب اللہ اور سنتِ رسولؐ کا اتباع۔ اور جس نے ان دونوں سے ہدایت پائی وہ پھر گمراہ نہیں ہو سکتا لہٰذا انھوں نے جو کچھ کہا ہے وہ از روئے نصیحت و احتیاط کہا ہے۔ ان کا مقصد یہ ہرگز نہیں کہ حقیقی تربیت بالکل ہی منقطع ہو چکی ہے اور وہ ایسا کیسے کہہ سکتے ہیں جبکہ نور نبوی صلی اللہ علیہ وسلم باقی ہے اور اس کی خیر و برکت اُمّت کے شاملِ حال ہے اور یہ قیامت تک باقی رہے گی۔

اس بات کا جواب کہ کونسا شخص ہے جو پیر تربیت بن سکے اور جس کے حوالے مرید اپنے آپ کو کردے یہ ہے کہ وہ شیخ جس کے حوالے مرید اپنے آپ کو کر دے وہ شخص ہو سکتا ہے جو احوالِ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے قدم بقدم چلتا ہو اور اللہ تعالےٰ نے اسے ایمانِ کامل اور صاف معرفت عطا کی ہو، پس ایسا شخص اس قابل ہے جس کے حوالے انسان اپنا آپ کو دے اور جو محبت کے لائق اور جس کی دوستی نفع رساں ہوتی ہے کیونکہ ایسا شخص بندہ کو رب سے ملا دیتا ہے اور جو وساوس اللہ کی معرفت میں رکاوٹ پیدا کرتے ہیں، ان کو دور کرتا ہے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت میں ترقی دلاتا ہے۔

اب یہ سوال کہ اس کی تعیین کی جائے کہ وہ کس ملک اور شہر میں ہے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ مذکورہ بالا صفات کی مالک کئی ایک ہستیاں ہیں اور بحمد اللہ شہروں اور ملکوں میں پھیلی ہوئی ہیں مگر

اہل السنت والجماعت سے باہر نہیں، ان کی تلاش میں رہو تمہیں مل جائیں گے۔ فَاِنَّ اللّٰہَ مَعَ الَّذِیْنَ اتَّقَوْا وَّالَّذِیْنَ ھُمْ مُّحْسِنُوْنَ (اللہ ان لوگوں کے ساتھ ہے جو گناہ سے بچتے اور نیک کام کرتے ہیں۔)

دوسرا سوال: بیداری میں دیدارِ مصطفوی صلی اللہ علیہ وسلم

فقیہہ نے اس شخص کے متعلق بھی سوال کیا جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے دیدار کا دعویٰ کرتا ہو۔ سوال یوں کیا گیا کہ حضرت ایک سوال یہ ہے کہ جو شخص یہ دعویٰ کرتا ہو کہ وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو بیداری میں دیکھتا ہے اس کے متعلق عارفین کا قول ہے کہ اس کے دعویٰ کو دلیل کے بغیر قبول نہ کیا جائے اور وہ دلیل یہ ہے کہ وہ ایک کم تین ہزار مقام طے کر چکا ہو اور مدعی کو ان مقامات کے بیان کرنے کو کہا جائے۔ آپ سے ہماری یہ درخواست ہے کہ آپ ان مقامات کو گنیں خواہ رمز و اختصار کے ساتھ ہی کیوں نہ ہو یا جس قدر بھی آپ بسہولت بیان کر سکیں۔

حضرت نے جواب دیا ہر شخص کے اندر تین سو چھیاسٹھ رگیں ہیں۔ ہر رگ ایک نہ ایک خاصیت کی حامل ہے جس کے لیے اسے پیدا کیا گیا ہے۔ صاحب بصیرت عارف ان رگوں کو اپنی خاصیتوں میں روشن و مشتعل دیکھتا ہے چنانچہ ایک رگ جھوٹ کی ہے جو اس خاصیت سے چمک رہی ہوتی ہے۔ ایک رگ حسد کی ہے جس سے وہ روشن ہے، ایک رگ ریا کی ہے اسی طرح ایک رگ غدر کی۔ ایک غرور کی اور ایک تکبر کی علیٰ ہذا القیاس باقی تمام رگیں بھی اپنی اپنی خاصیت سے روشن ہوتی ہیں۔ عارف جب ذوات انسانی کو دیکھتا ہے تو وہ ہر ذات کو بمنزلہ ایک جھاڑ کے دیکھتا ہے جس میں تین سو چھیاسٹھ قمقمے لٹکا دیے گئے ہوں اور ہر قمقمے کا جدا جدا رنگ ہو، پھر ان خواص میں سے ہر ایک کی مزید تفصیل و اقسام ہیں۔ چنانچہ مثال کے طور پر خاصیت شہوت کی کئی قسمیں ہیں۔ فرج کی طرف شہوت کو نسبت دی جائے تو شہوتِ فرج ایک قسم بن جائے گی اسی طرح شہوتِ جاہ ایک قسم ہے شہوتِ مال ایک قسم ہے اور طولِ امل ایک قسم ہے۔ اسی طرح کذاب کی خاصیت ہے لہٰذا اگر کوئی شخص خود جھوٹ نہ بولتا ہو تو یہ ایک

لہ میں نے آگے چل کر چند اولیاء اللہ کے نام دیے ہیں جنہیں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا دیدار بحالت بیداری ہوتا تھا مثلاً ابوالمواہب، ابراہیم دسوقی، محمد بن ابی حمزۃ عبداللہ بن ابی جمرہ وغیرہم۔ ان کے حالات لواقح الانوار فی طبقات الاخیار للشعرانی میں دیکھ لیں (نیز ملاحظہ ہو ص ۶۲۵)

قسم ہوگی اور اگر کوئی دوسرے کے متعلق یہ خیال رکھتا ہو کہ وہ سچ نہیں بولتا اور اسے اس کی باتوں میں شک گزرتا ہو اور اس کی تصدیق نہ کرتا ہو تو یہ ایک الگ قسم ہوگی۔ جب تک بندہ ان تمام مقامات کو طے نہ کرلے اسے فتح نصیب نہیں ہوتی۔ لہٰذا جب اللہ تعالیٰ کسی بندہ کے لیے نیکی کا ارادہ کرتا ہے اور اسے فتح کا اہل بناتا ہے تو اسے ان خواص سے بتدریج منقطع کرتا ہے۔ مثلاً جب کذب کی خاصیت منقطع ہوگئی تو مقام زہد میں پہنچ جاتا ہے اور شہوتِ معاصی قطع ہوگی تو مقام توبہ میں پہنچ گیا یا شہوت طول الامل جاتی رہی تو اس دھوکے کی دنیا سے بے تعلقی کے مقام پر پہنچ جاتا ہے۔ یہی باقی مقامات کا حال ہے۔

اس کے بعد جب اللہ تعالیٰ اسے فتح نصیب کرتا ہے اور اس کی ذات میں سِر رکھ دیا جاتا ہے تو بتدریج عوالم کے مشاہدہ کے مقامات طے کرتا ہے سب سے پہلے اسے اجرام ترابیہ کا مشاہدہ ہوتا ہے۔ پھر اجرام علویہ کا پھر اجرامِ نورانیہ کا پھر وہ اس بات کا مشاہدہ کرتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے افعال مخلوقات میں کس طرح جاری وساری ہیں۔ اجرام ترابیہ کا مشاہدہ بھی بتدریج ہوتا ہے۔ پہلے اپنی زمین کا مشاہدہ ہوتا ہے پھر اسے اپنے سمندروں کا پھر اس علاقہ کا جو اس کی زمین اور دوسری زمین کے درمیان واقع ہے اس طرح کہ اس کی نظر سرحدوں کو پھاڑ کر دوسری زمین میں چلی جاتی ہے۔ اسی طرح دوسری زمین میں پھر تیسری یہاں تک کہ وہ ساتوں زمینوں کا مشاہدہ کرلیتی ہے۔ پھر وہ اس خلا کا مشاہدہ کرتا ہے جو اس کے اور پہلے آسمان کے درمیان ہے۔ پھر پہلے آسمان کا حتٰی کہ ساتوں آسمانوں کا مشاہدہ ہوجاتا ہے۔ اس کے بعد برزخ اور ارواحِ برزخ کا مشاہدہ ہوتا ہے۔ پھر ملائکہ کا، محافظ فرشتوں اور آخرت کے امور کا مشاہدہ کرتا ہے ان تمام مشاہدات میں سے ہر مشاہدہ میں بندہ پر اللہ تعالیٰ کا ایک حق ہے اور بندگی کے آداب میں سے ایک ادب (جن کا لحاظ رکھنا ضروری ہے) ان مشاہدات کے دوران میں اسے ایسے امور پیش آتے ہیں جو اللہ سے منقطع کر دینے والے ہوتے ہیں اور بہت سی رکاوٹیں پیش آتی ہیں اور اسے بہت خوفناک اور ہلاک کرنے والے امور دکھائی دیتے ہیں۔ اگر بندۂ ضعیف پر اللہ تعالیٰ کا فضل، اس کی رحمت اور توفیق شامل نہ ہو تو اس کا کم از کم نتیجہ یہ نکلے کہ وہ عقل وہوش کھو بیٹھے۔ پھر مقاماتِ مشاہدہ اور اس احوال کا قطع کرنا نفس کی خاصیتوں کے مقامات کو طے کرنے سے بھی زیادہ دشوار ہے اس لیے کہ مقاماتِ خواص کا قطع کرنا باطنی امر ہے جس کا شعور صرف فتح کے بعد ہوتا ہے اور مقاماتِ مشاہدہ کا قطع کرنا ظاہری امر ہے جس کا معائنہ کرتا ہے اور دیکھتا ہے کیونکہ وہ فتح کے بعد اس میں مشغول ہوتا ہے لہٰذا جب اس کی نظر صاف ہوجاتی ہے اور اس کی بصیرت کا نور مکمل ہوجاتا ہے اور اللہ تعالیٰ اس پر ایسی رحمت

فرماتا ہے جس کے بعد کسی قسم کی بدبختی کا خطرہ نہیں رہتا تو اللہ تعالیٰ اسے سید الاولین والآخرین صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا دیدار عطا کرتے ہیں چنانچہ وہ آپ کو آنکھوں سے دیکھتا اور بیداری میں آپ کا مشاہدہ کرتا ہے اور اللہ تعالیٰ اسے اس نعمت سے مالا مال فرماتے ہیں جسے نہ کسی آنکھ نے دیکھا نہ کان نے سنا اور نہ کسی بشر کے دل پر اس کا خیال بھی گزرا ہو۔ تب جاکر اسے آرام وسرور کا مقام حاصل ہوتا ہے۔ خدا اسے یہ سعادت مبارک کرے۔ خواص نفوس کے اعداد اور ان کے اقسام کا اگر اعتبار کیا جائے اور ان مقامات کا بھی جو سابقہ مشاہدات سے حاصل ہوتے ہیں تو ان کی تعداد مذکورہ بالا تعداد (یعنی تین ہزار) سے بھی زیادہ ہو جاتی ہے۔ مزید براں آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاک شمائل اُمّت سے مخفی نہیں ہیں۔ کیونکہ علماء نے آپ کے ظاہری اور باطنی اوصاف مخصوصہ کو کتابوں میں جمع کر دیا ہے لہٰذا جو شخص بیداری میں آپ کے دیدار کا دعویٰ کرے اس سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاکیزہ حالات کے متعلق دریافت کرنا چاہیئے اور اس کا جواب سننا چاہیئے کہ آنکھوں سے دیکھ کر جواب دینے والا چھپ نہیں سکتا اور وہ نہ دیکھنے والے کے ساتھ مشتبہ نہیں ہو سکتا۔ والسلام۔

اگر اس جواب سے آپ کی تسلّی ہو گئی ہو، فبہا اور اگر مزید تشریح چاہتے ہیں تو یاد رکھو کہ جب اللہ تعالیٰ کسی بندے کو فتح نصیب کرتے ہیں تو اس کی مدد انوارِ حق کے ساتھ فرماتے ہیں جو اس کی ذات میں تمام جہات سے داخل ہو جاتا ہے اور اس کے گوشت اور ہڈیوں کے اندر بھی جا گھستا ہے اور وہ اس کی ٹھنڈک اور جسم میں اس کے داخل ہونے کی اس قدر تکلیف محسوس کرتا ہے جس قدر کہ سکراتِ موت کی تکلیف ہوتی ہے۔ پھر اس نور کی شان یہ ہے کہ جس مخلوق کا اس بندہ کو حق تعالیٰ مشاہدہ کرانا چاہتا ہے اس کے اسرار اس پر وارد کرتا ہے کہ ذاتِ عبد پر یہ نور مخلوقاتِ مذکورہ کے الوان سے متلوّن ہو کر داخل ہوتا ہے مثلاً جب حق تعالیٰ اس زمین کی مخلوقات کا مشاہدہ کرانا چاہتا ہے تو یہ نور ایک دفعہ آتا ہے اور وہ اسرار جن سے بنی آدم کی تخلیق ہوئی ہے ساتھ لے کر اس ذات میں گھس جاتا ہے پھر دوسری بار آتا ہے اور وہ اسرار ساتھ لے کر گھستا ہے جن سے بہائم کی تخلیق ہوئی ہے اور کبھی ان اسرار کے ساتھ آتا ہے جن سے جمادات کی تکوین ہوتی ہے مثلاً پھل اور میوہ جات وغیرہ۔ چنانچہ جب تک ان کے اسرار اس میں سرایت نہ کر جائیں ان میں سے کسی کا بھی اسے مشاہدہ نہیں کرایا جاتا اس کے باوجود اسے وہی پہلے کی طرح جان کنی کی سی تکلیف ہوتی ہے۔ سید الوجود اور علم الشہود حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بھی جملہ مخلوقات میں سے ہیں لہٰذا جب اللہ تعالیٰ اپنے بندہ کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ مبارک کا مشاہدہ کرانے کا وعدہ فرماتا ہے تو یہ مشاہدہ اس وقت تک نہیں ہو سکتا جب تک وہ آپ کی ذاتِ مبارک کے اسرار

سے سرشار نہ ہو جائے۔ فرض کرو کہ صاحب فتح کی ذات فتح سے پہلے ایک تاریک و معظم شئ کی طرح تھی اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ شریف بمنزلہ ایک نور کے ہو جس کے متعدد شعبے ہوں، جن کی تعداد لاکھ یا لاکھ سے بھی زائد ہو۔ پس جب اللہ تعالیٰ اس تاریک ذات پر رحم فرمانا چاہتے ہیں تو یہ نور محمدی اس کی مدد فرمائے گا اور اسے سیراب کرے گا چنانچہ ایک مرتبہ آکر ان نور کے شعبوں کے ذریعہ سے ایک ایک کر کے اس میں گھسے گا مثلاً شعبۂ صبر کے داخل ہونے سے اس کی ضد یعنی اضطراب و بے صبری کی ظلمت زائل ہو جائے گی۔ پھر یہ ایک اور شعبہ (شاخ) کو لے کر داخل ہو گا مثلاً رحمت تو اس سے بھی اس کی ضد یعنی عدمِ رحمت کی ظلمت زائل ہو جائے گی، پھر ایک اور شعبہ کو لائے گا مثلاً حلم تو اس سے بھی ضد کی ظلمت زائل ہو جائے گی، چنانچہ اسی طرح ذاتِ مطہرہ کے نور کے تمام شعبے ایک ایک کر کے اس میں سرایت کریں گے اور ایک ایک کر کے اس تاریک ذات میں سے تاریکی کے تمام اوصاف زائل ہوتے جائیں گے تب جا کر بندہ ذاتِ شریفہ کا مشاہدہ کرنے کے قابل ہوتا ہے کیونکہ جب تک اس میں ذرّہ بھر بھی سیاہی باقی رہے گی یہ اس کی ذات کے لیے تاریکی کا باعث ہوگی اور جب تک اس کی ذات میں سے تمام کی تمام سیاہی نکل نہ آئے اس وقت تک وہ ذاتِ شریفہ کا مشاہدہ کرنے کے قابل نہیں ہو سکتی اس سے ہمارا یہ مطلب نہیں ہے کہ جب ذاتِ شریفہ کے اسرار اس میں سرایت کر جاتے ہیں تو وہ پورے کے پورے اسی کمال سے اسمیں داخل ہوتے ہیں جو کمال کہ یہ ذات ان اسرار سے اپنی ذات اور خلقت کی طاقت کے مطابق سیراب ہوتی ہے نہ ہی ہماری مراد یہ ہے کہ جب یہ ان شعبوں سے سیراب ہو جاتی ہے تو ذاتِ شریفہ میں کوئی کمی پیدا ہو جاتی ہے یا یہ کہ ان کی جگہ ان اسرار سے خالی رہ جاتی ہے کیونکہ انوار سے اخذ کرنے سے وہ اپنی جگہ سے زائل نہیں ہو جاتے اس سے یہ واضح ہو گیا کہ جب تک اسرارِ شریفہ اور انوارِ لطیفہ کے وارد ہونے سے بندہ کے اپنے تمام اوصاف محو نہیں ہو جاتے اس وقت تک وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا مشاہدہ نہیں کر سکتا اور اس منزل تک پہنچنے کے لیے[1] بے شمار مقامات طے کرنے پڑتے ہیں۔

---

[1] اصحابِ فتح کے لیے بیداری میں مشاہدۂ ذاتِ نبوی اختیاری بات نہیں رہتی بلکہ اگر وہ اس سے غافل ہونا چاہیں تو نہیں ہو سکتے چنانچہ امام احمد ابو العباس مرسی فرماتے ہیں کہ چالیس سال گزر گئے ہیں مگر اس عرصہ میں کبھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے حجاب میں نہیں ہوا اور اگر ایک لحظہ کے لیے میں حجاب میں آجاؤں اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو نہ دیکھوں تو میں اپنے آپ کو مسلمان ہی نہ خیال کروں گا۔ مگر اہلِ ظاہر اصحابِ مشاہدہ پر اعتراض کرتے ہی رہتے ہیں چنانچہ جب شیخ محمد بن ابی جمرہ (یہ وہ عبداللہ بن ابی جمرہ نہیں ہیں جو امام احمد بن حنبل کے زمانہ میں تھے)

(بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر)

فَاِنَّ فَضلَ رَسُولِ اللهِ لَیسَ لَہٗ حَدٌّ فَیُعرِبَ عَنہُ نَاطِقٌ بِفَمٖ

(کیونکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے فضل وکمال کی کوئی حد نہیں کہ کوئی انسان زبان سے ان کی تشریح کرسکے)

جن لوگوں نے ان مقامات کی تعداد دو ہزار یا اس سے زیادہ بتائی ہے یوں معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے اپنی حالت کا ذکر کیا کہ اس قدر فتح اسے عطا ہوئی ہے مگر ابھی بہت کچھ باقی ہے (جس کا مشاہدہ اور جن مقامات کو اس نے طے نہیں کیا) ہم نے جو یہ کہا کہ جو ذات ان تمام شعبوں سے سیراب نہ ہو وہ ذاتِ شریف کا مشاہدہ نہیں کرسکتی اس سے ہماری مراد کامل مشاہدہ سے ہے کیونکہ اگر کسی کا کوئی شعبہ باقی رہ گیا ہو اور اس کے باوجود اسے مشاہدہ حاصل ہو جائے تو مشاہدہ تو ہو جائے گا مگر کامل نہ ہوگا۔ واللہ اعلم۔

تیسرا سوال: پیر کی موجودگی اور عدم موجودگی کی وجہ سے مرید کی تربیت میں کمی وزیادتی کیوں ہوتی ہے

فقیہ مذکور نے آپ سے سوال کیا کہ کوئی مرید تربیتِ حاصل کرنے کی غرض سے شیخ کامل کی صحبت اختیار کرتا ہے اور شیخ کا یہ دعویٰ ہو کہ وہ اپنی ہمت سے اس کی تربیت کرتا ہے۔ پھر جب شیخ موت یا سفر کی وجہ سے موجود نہیں ہوتا تو مرید اپنے نفس میں حال، علم اور عمل تینوں میں ضعف پاتا ہے۔ سو باوجود اس کے کہ اسے پیر کی عدم موجودگی کی وجہ سے نفع میں کمی واقع ہو جاتی ہے، حال اور ہمت سے تربیت کا کیا مطلب ہوا۔

فرمایا: شیخ کامل کی ہمت اس کا نورِ ایمان ہے اور اسی کے ذریعہ سے وہ مرید کی تربیت کرتا ہے اور ایک حالت سے دوسری حالت تک ترقی دیتا ہے لہٰذا اگر مرید کو شیخ کے ساتھ محض نورِ ایمان کی وجہ سے محبت ہو تو شیخ اس کو ہر حالت میں مدد پہنچاتا ہے خواہ شیخ موجود ہو یا نہ بلکہ شیخ کی وفات کے بعد بھی ہزاروں برس کیوں نہ گزر جائیں تب بھی فیض جاری رہتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہر زمانہ کے اولیاء آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے نور ایمان سے فیضیاب حاصل کرتے رہے ہیں اور آنحضرت ان کو ترقی دے رہے ہیں اور ان کی تربیت کرتے رہے ہیں اس لیے کہ ان اولیاء کی محبت محض ان کے نورایمان کی وجہ سے ہوتی تھی اور اگر مرید کو شیخ کی محبت صرف اس کی ذات کی طرف سے ہو اور نورِ ایمان سے نہ ہو تو اسے پیر کی حاضری میں

(بقیہ حاشیہ صفحہ سابقہ)

نے بیداری میں آنحضرت کے دیدار کا دعویٰ کیا تو لوگوں نے اس کا انکار کیا اور ان سے جھگڑنے کی غرض سے مجلس قائم کی جس کی وجہ سے انہیں گوشہ نشینی اختیار کرنی پڑی (طبقات ۱: ۱۳۸) امام شعرانی نے متعدد لوگوں کا ذکر کیا ہے جنہیں یہ سعادت نصیب تھی (ملاحظہ ہو صفحہ ۶۲)

تو فیض پہنچے گا مگر غیر حاضری میں فیضان منقطع ہو جائے گا۔ ذات کی محبت کی علامت یہ ہے کہ محبت دنیوی یا اخروی نفع حاصل کرنے یا ضرر سے بچنے کی غرض سے ہو اور ایمان کی محبت کی علامت یہ ہے کہ محبت محض اللہ کی خوشنودی کے لیے ہو اس میں کسی قسم کی غرض نہ ہو لہٰذا جب مرید شیخ کی غیر حاضری کی وجہ سے اپنے اندر کمی محسوس کرے تو قصور خود اس مرید کا ہے نہ کہ شیخ کا۔ واللہ اعلم۔

چوتھا سوال: کیا طریقِ شکر افضل ہے یا طریقِ مجاہدہ

فقیہ نے ایک سوال یہ کیا کہ ولی عارف حضرت شاذلی اور ان کے متبعین کے طریقے اور امام غزالی اور ان کے متبعین کے طریقہ میں کیا فرق ہے۔ پہلے گروہ کا مدار منعم جل جلالہ کے ساتھ فرح و شکر پر ہے اور دوسرے گروہ کا مدار ریاضت، مشقت، بیداری اور بھوک وغیرہ پر۔ کیا دونوں بزرگ ریاضت پر متفق ہیں۔ کیا حضرت شاذلی واصل باللہ ہونے کے بعد یا اس کے قریب شکر کا حکم کرتے ہیں یا یہ کہ وہ ابتدا ہی سے شکر کا حکم کرتے ہیں اور کیا ایک شخص کے لیے دونوں طریقوں پر چلنا ممکن ہے یا جب تک دوسرے سے یکسو نہ ہو جائے، نفع حاصل نہیں کر سکتا۔

فرمایا: اصل طریق تو شکر کا ہی طریقہ ہے اور انبیاء علیہم السلام اور صحابہ وغیرہ میں سے جس قدر اصفیاء گزرے ہیں ان کے دل اسی طریقۂ شکر پر کاربند تھے۔ طریقِ شکر یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی عبادت خالص عبودیت سے ہو، انسان تمام حظوظِ نفسانی سے مبرا ہو، اور یہ اعتراف کرے کہ میں اللہ تعالیٰ کی ربوبیت کا حق ادا کرنے سے عاجز و قاصر ہوں اور یہ کیفیت ہر وقت دل پر طاری رہے خواہ اس پر کس قدر زمانہ گزر جائے۔ جب حق تعالیٰ نے ان کو اس بات میں سچا پایا تو اپنے کرم کے مقتضا کے مطابق انہیں فتح اور اسرارِ ایمان عطا کئے، مگر جب اہلِ ریاضت نے دیکھا کہ انہیں تو فتح نصیب ہو گئی تو انھوں نے بھی اسی کو اپنا مطلوب و مرغوب قرار دیا۔ لہٰذا وہ روزے رکھ کر، نمازیں پڑھ کر، راتوں کو جاگ کر اور مدتوں خلوت میں رہ کر اس کی طلب میں لگ گئے یہاں تک کہ انھوں نے بھی جو کچھ حاصل کرنا تھا حاصل کر لیا، چنانچہ طریقِ شکر میں تو ہجرت شروع سے ہی اللہ اور رسولؐ کی طرف ہوتی ہے نہ کہ فتح اور کشف حاصل کرنے کی طرف اور طریقِ ریاضت میں ہجرت فتح اور مراتب حاصل کرنے کے لیے ہوتی ہے۔ پہلے طریقہ میں دل کی سیر ہوتی ہے (کہ دل اللہ کی طرف کھنچے آتے ہیں) اور دوسرے میں بدن کی سیر ہوتی ہے (کہ جسم مولیٰ کی اطاعت میں جھکتا ہے) پہلے طریقہ میں فتح دفعتہً حاصل ہوتی ہے بندہ اس کا منتظر نہیں ہوتا (اس لیے کہ وہ فتح کی غرض سے کوئی عمل کر ہی نہیں رہا ہوتا محض للہ کرتا ہے) ابھی وہ توبہ طلب کرنے اور گناہوں کی معافی مانگنے کے مقام پر ہی ہوتا ہے کہ اچانک اسے فتح نصیب ہو جاتی ہے۔ دونوں طریقے صحیح ہیں لیکن

شکر کا طریقہ بہتر اور زیادہ اخلاص کا حامل ہے۔

دونوں طریقے ریاضت پر متفق ہیں، لیکن پہلے طریقے میں دل کی ریاضت ہوتی ہے۔ اس لیے کہ دل حق سبحانہ کے ساتھ لگے اور اسی کے آستانہ پر پڑے ہوتے ہیں۔ حرکات و سکنات میں اسی کی پناہ لیتے ہیں، پروردگار کی حضوری کے وقت کسی قسم کی غفلت ان کے پاس نہیں آتی۔ مختصر یہ کہ طریق شکر میں یہی ریاضت ہے کہ دل اللہ تعالیٰ سے لگا رہے اور اس پر مداومت کرے، خواہ ظاہر میں وہ کوئی بڑی عبادت نہ کرتا ہو۔ یہی وجہ ہے کہ طریق شکر اختیار کرنے والا روزہ رکھتا بھی ہے اور کبھی نہیں بھی رکھتا۔ رات کو نماز کے لیے اٹھتا بھی ہے اور سوتا بھی ہے۔ اپنی عورت کے پاس بھی جاتا ہے اور تمام شرعی وظائف کو ادا کرتا ہے جو ریاضت بدن کے منافی ہیں۔

ایک مرتبہ حضرت نے یہ فرمانے کے بعد کہ طریق ریاضت میں ہجرت فتح اور نیل مراتب کی غرض سے ہوتی ہے،" فرمایا: فتح حاصل ہو جانے کے بعد ان میں سے بعض اپنی پہلی نیت پر قائم رہتے ہیں جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ان کا دل انہی امور میں پھنس جاتا ہے جن کا وہ مشاہدہ کرتا ہے اور کشف پانی پر چلنا اور زمین کا طے ہو جانا وغیرہ جب دیکھتے ہیں تو اس پر خوش ہوتے ہیں اور خیال کرتے ہیں کہ یہی منتہیٰ ہے۔ یہ وہ لوگ ہوتے ہیں جن کے دل ابتدا سے لے کر آخر تک اللہ سے خالی ہوتے ہیں لہٰذا وہ ان لوگوں میں سے ہوتے ہیں جن کے متعلق باری تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہے: اَلْاَخْسَرِيْنَ اَعْمَالًا اَلَّذِيْنَ ضَلَّ سَعْيُهُمْ فِى الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَهُمْ يَحْسَبُوْنَ اَنَّهُمْ يُحْسِنُوْنَ صُنْعًا (سورہ کہف آیت ۱۰۳، ۱۰۴) (جن کے اعمال بہت خسارہ میں ہیں جن کی کوشش دنیا کی زندگی میں ہی رائیگاں گئی مگر وہ یہی سمجھتے رہے کہ وہ نیک کام کرتے ہیں) اور بعض ایسے ہوتے ہیں جن کی نیت فتح کے بعد بدل جاتی ہے اور ان پر اللہ رحم فرماتا ہے اور ان کا ہاتھ پکڑ لیتا ہے چنانچہ ان کا دل حق سبحانہ کی طرف لگ جاتا ہے اور غیر اللہ سے منقطع ہو جاتا ہے اس شخص کو جو حالت فتح کے بعد نصیب ہوتی ہے طریق شکر میں اس سے ابتدا ہوتی ہے لہٰذا سمجھ لو کہ دونوں طریقوں میں کس قدر بُعد ہے اور دونوں مقاصد میں کس قدر تفاوت ہے۔ الحاصل پہلے طریقہ میں سیر قلوب ہے اور دوسرے میں سیر ابدان۔ پہلے میں نیت میں خلوص پایا جاتا ہے اور دوسرے میں اغراض کی آمیزش ہوتی ہے۔ پہلے میں بندہ کی طرف سے کسی انتظار اور توقع کے بغیر یکایک فتح نصیب ہوتی ہے لہٰذا وہ فتح ربانی ہوتی ہے اور دوسرے میں حیلہ و سبب سے حاصل ہوتی ہے لہٰذا اس کی دو قسمیں ہوئیں: پہلی حالت میں فتح صرف مومن عارف اور حبیب حاصل کر سکتا ہے برخلاف

دوسری حالت کے کیونکہ تو نے سنا ہو گا کہ راہب اور یہودیوں کے پادریوں نے ریاضت کی جس کے ذریعہ سے وہ استدراج تک پہنچ جاتے ہیں (کیونکہ ان سے خارقِ عادت امورِ ظہور میں آنے لگ جاتے ہیں)

فرمایا: میں جو کچھ کہہ رہا ہوں وہ مطلق ریاضت کے متعلق کہہ رہا ہوں خواہ وہ اہلِ حق کی ہو یا اہلِ باطل کی۔ خاص ابو حامد الغزالیؒ کے طریقِ ریاضت کی بحث نہیں کر رہا۔ وہ تو امامِ حق اور سچے دلی تھے۔

اب رہا یہ سوال کہ آیا ایک ہی شخص کے لیے دونوں طریقوں پر چلنا ممکن ہے تو اس کا جواب یہ ہے کہ ہاں ممکن ہے اس لیے کہ یہ دونوں طریقے ایک دوسرے کے منافی نہیں ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ ایک شخص کا دل تمام حرکات وسکنات میں اللہ کی طرف بھی لگا ہوا ہو اور ظاہر میں بھی وہ مجاہدہ وریاضت میں مشغول ہو۔ واللہ تعالیٰ اعلم۔

لے امام غزالی رحمۃ اللہ تعالیٰ کا کوئی خاص فرقہ نہیں جو ان کی طرف منسوب ہوتا ہو۔ یہ طوس کے رہنے والے تھے مگر کچھ عرصہ بغداد میں بھی رہے۔ اہلِ مشرق میں انہی کا طریقہ زیادہ مقبول تھا مگر شیخ ابو الحسن شاذلی رحمۃ اللہ مغرب کے رہنے والے تھے اور انھوں نے اسکندریہ میں رہائش اختیار کر لی تھی۔ ان کے متبعین کو شاذلیہ کہا جاتا ہے۔ شاذلیہ فرقہ مغرب میں کافی مشہور ہے۔ شاذلہ قدیم افریقیہ میں ایک شہر کا نام ہے۔ حضرت عبدالعزیز دباغ بھی مغرب کے رہنے والے تھے اس لیے انہیں بھی شاذلی رحمۃ اللہ کا طریقہ پسند تھا۔ چنانچہ شاذلی فرماتے ہیں (رسالۃ الانوار القدسیۃ فی بیان آداب العبودیۃ بر حاشیہ لواقح الانوار، فی طبقات الاخیار ج ۲ صفحہ ۱۲۷)

بعض اہل اللہ کے نزدیک بدترین گناہ یہ ہے کہ وہ اللہ کا قرب وغیرہ حاصل کرنے کے لیے عبادات اور اوراد کے ذریعہ سے چاپلوسی کرے۔ تقدیر کا قلم ہر ہونے والی بات لکھ کر خشک ہو چکا ہے لہٰذا نہ کسی متقی کا تقویٰ اس لکھت میں اضافہ کر سکتا ہے نہ کسی بدکار کی بدکاری تقدیر میں کچھ اضافہ کر سکتی ہے۔ لہٰذا اللہ کی عبادت خالص اس کی اطاعت کی غرض سے کرو۔ یاد رکھو کہ اطاعت صرف اللہ کی ہے اور بس شیخ عبدالوہابؒ شعرانی بھی چونکہ اہلِ مغرب میں سے ہیں۔ اس لیے ان کا میلان بھی شاذلی طریقہ کی طرف ہے چنانچہ وہ مذکورہ بالا کتاب ج ۱ صفحہ ۱۶۵ پر لکھتے ہیں۔ یاد رکھیں کہ خلوت اور ریاضت کے ذریعہ سے طریقِ سلوک پر چلنا بعض مشائخ کا طریقہ ہے مگر ہمارے بزرگوں اور ساتھیوں کا یہ طریقہ نہیں ہے۔ اس لیے کہ وہ ہر اس حالت پر راضی اور قانع ہیں۔ جسے اللہ ان کے لیے پسند کرے۔ ان کی نگاہ اور توقع نہ کسی مرتبہ اور نہ دنیا نہ آخرت میں کسی حالت کی طرف لگی ہوتی ہے کہ وہ اس کے منتظر رہیں۔

پانچواں سوال: انسان کے لیے کیا یہ ممکن ہے کہ وہ یہ معلوم کر سکے کہ آیا وہ مرید بننے کے قابل ہے یا نہیں!

حضرت کیا یہ ہو سکتا ہے کہ انسان یہ معلوم کر سکے کہ آیا وہ ارادت (مرید بننے) کے قابل ہے یا نہیں؟ اس سے ہماری مراد خاص اہلیت سے ہے یا اسے اس کا پتہ اور دل کی مدد کے بغیر نہیں ہو سکتا مثلاً شیخ صالح یا خیر خواہ برادر؟

فرمایا: انسان اس بات کی اہلیت خود معلوم کر سکتا ہے اس طرح کہ دیکھے کہ اس کے خیالات بالعموم کس قسم کے ہوتے ہیں لہٰذا جس قسم کے خیالات بالعموم اس کے دل میں آئیں گے اسی کے لیے اس کی ذات پیدا کی گئی ہو گی۔ ذات کے لیے اپنے تخیلات کی تابعداری کرنا ابدی ہے خواہ وہ اس میں ابتداءً سے قائم ہوں یا نہ۔ چنانچہ جس کے خیال میں اللہ کی محبت اور اس کی بارگاہ کی طرف میلان غالب ہو اور اسے اللہ کی عظمت وجلال کا ہر وقت خیال رہتا ہو تو یہ اس بات کی علامت ہے کہ اللہ تعالیٰ کا ارادہ اس کے لیے خیر کا ہے خواہ اس کی ذات اپنے تخیلات کے موافق عمل کر رہی ہو خواہ مخالف۔ اس لیے کہ وہ مخالف اعمال میں پھنسا ہوا ہی کیوں نہ ہو پھر بھی اللہ تعالیٰ اسے بھلائی۔ نجات اور ہدایت کی طرف لے آئیں گے۔

پھر قوت وضعف کے اعتبار سے مذکور قابلیت کے مختلف مراتب ہیں جس طرح چستی اور شجاعت کے مراتب مختلف ہیں۔ چنانچہ اگر بچوں کو کھیلتے ہوتے دیکھیں تو معلوم ہو جائے گا کہ ان میں کون چست رفتار، کون سست رفتار اور کون متوسط رفتار والا ہے۔ یہی حال ارادت کی اہلیت رکھنے والوں کا ہے چنانچہ بعض اعلیٰ درجہ کی اہلیت کے مالک ہوتے ہیں کہ خداوندی جلال کا خیال ہر وقت انھیں لگا رہتا ہے اور بعض ایسے ہیں جنھیں یہ خیال کبھی کبھی آتا ہے اور بعض کی حالت متوسط درجہ کی ہوتی ہے۔ اس میں راز یہ ہے کہ انسان کے باطن میں فکر وتخیل عقل کا ایک نور ہے جس کا فیضان تقدیر الٰہی اور قسمتِ ازلی کے مطابق ذاتِ انسانی پر ہوتا ہے۔ پس اگر ذات کے ساتھ بھلائی کا ارادہ کیا گیا ہو تو عقل اس میں اس کی فکر اور اس کے اسباب کا خیال دل میں ڈال دیتی ہے حتیٰ کہ وہ اسے پالیتی ہے۔ پھر خیر وشر دونوں میں مراتب فکر کے تینوں مذکورہ بالا درجے پائے جاتے ہیں۔ پھر قابلیت کا اصول خیر وشر کے ساتھ مخصوص نہیں بلکہ یہ ہر اس امر سے تعلق رکھتا ہے جس کے متعلق تقدیر میں یہ لکھا ہوتا ہے کہ ذات اسے پالے گی کیونکہ ان تمام امور میں قابلیت واہلیت ظاہر ہو جاتی ہے لہٰذا اگر بچوں کی ایک جماعت کی طرف دیکھیں تو مثلاً اگر تقدیر میں یہ لکھا ہو کہ ایک منشی ہو گا

دوسرا حجام ہوگا اور تیسرا سپاہی تو پہلے کی پہچان اس طرح کی جائے گی کہ وہ قلم پکڑتا ہے اور اسے معمولی سی تنبیہ سے لکھنا آجائے گا، لیکن اسے استرہ پکڑنا نہیں آئے گا اور نہ ہی اسے تلوار لٹکانا آئے گا خواہ اسے تنبیہ کیوں نہ کی جائے۔ دوسرا بچہ استرہ پکڑنا جانتا ہوگا اور اسے قلم پکڑنا اور تلوار لٹکانا نہ آتا ہوگا اور تیسرے کو تلوار لٹکانا آتا ہوگا مگر قلم اور استرہ پکڑنا نہ آتا ہوگا۔ وَکُلٌّ مُیَسَّرٌ لِمَا خُلِقَ لَہٗ ہر شخص کے لیے وہ کام جس کے لیے اسے پیدا کیا گیا ہوتا ہے، آسان کر دیا جاتا ہے۔ یہی حال اس بچے کا ہے جس کا خیال ہر وقت کپڑے کی تجارت میں لگا ہو اور اس کا باپ اسے زراعت میں لگانا چاہے تو اسے کامیابی نہ ہوگی اور اگر اسے تجارت میں لگائے گا تو اس سے بہت فائدہ ہوگا اسی سے معلوم ہو گیا کہ ہر چیز کی قابلیت کا مدار اس کی نکہ پر ہے اور ہر شخص کو معلوم ہے کہ اس کے خیالات کس طرف لگے رہتے ہیں۔ توفیق عطا کرنے والا تو اللہ ہی ہے۔

ایک عورت کا قصہ

حضرت نے فرمایا کہ قدیم زمانہ میں ایک عورت کے دو لڑکے اور ایک لڑکی تھی جب اس کے مرنے کا وقت آگیا تو کہا کہ میرا فلاں بیٹا تو صالحین میں سے ہوگا دوسرا ظالم ہوگا اور بیٹی بڑی مالدار اور دنیا دار ہوگی لوگوں نے کہا کیا تجھے غیب کا علم ہے؟ کہنے لگی میں غیب تو نہیں جانتی، لیکن میں نے پہلے کو دیکھا تو اسے اللہ سے بہت ڈرنے والا پایا۔ وہ کسی بچہ پر ظلم نہیں کرتا۔ اس کا دل ہر وقت اللہ کی یاد میں رہتا ہے۔ اس سے میں سمجھ گئی کہ وہ نیکی کی طرف جائے گا۔ دوسرے کو دیکھا تو اس کے برعکس پایا تو سمجھ گئی وہ شر کی طرف جائے گا۔ بچی کو دیکھا حالانکہ وہ ابھی چھوٹی ہے۔ اسے بلند پایہ کے صنعت بناتے دیکھا کہ وہ پازیب، ہار، بازوبند اور دیگر زیورات بناتی ہے جو عورتوں کے پہننے اور زینت کے کام آتے ہیں اور وہ ہر وقت اسی میں لگی رہتی ہے، یہاں سے سمجھ لیا کہ اسے بہت سی دنیا حاصل ہوگی۔

مؤلف کہتا ہے کہ کسی نے مجھے بتایا کہ وہ یتیم رہ گیا تھا اور اس کی والدہ نے اسے ریشم کے کام میں لگا دیا۔ میں نے اس پیشہ کو اختیار کر لیا مگر مجھے یہ سخت بوجھل اور مشکل معلوم ہوتا حتیٰ کہ میں ایک دن کچھ لوگوں کے پاس سے گزرا جو چونہ کے پلستہ میں گلکاری اور بیل بوٹے بنایا کرتے تھے۔ انہیں دیکھ کر میرا دل اسی طرف لگ گیا۔ میں نے اسی دن سے ریشم کا کام چھوڑ دیا اور ان کے ساتھ کام کرنا شروع کر دیا اور اس کام کو میں بڑی چستی اور تیزی سے کرتا۔ میرے دل میں نشاط پیدا ہو گیا یوں معلوم ہوتا تھا کہ میں قید سے چھوٹ کر آیا ہوں۔ چونہ کاری کا کام میں نے بہت آسانی سے سیکھ لیا اور پھر ریشم کا کام کرنے کا نام بھی نہ لیا۔

ایک اور شخص نے بتایا کہ اس کا ایک کمزور سا گدھا تھا اور وہ جنگل میں کچھ لوگوں کے پاس سکونت پذیر تھا۔ ان کا ایک چھوٹا یتیم بچہ تھا جس کا ہر وقت یہی کام تھا کہ میرے گدھے پر سواری کرتا رہے۔ سوار ہوتا تو اس طرح جس طرح گھوڑے پر سوار ہوتے ہیں۔ چنانچہ وہ اپنے پاؤں میں کانٹوں کی مہمیز بنا کر لگا لیتا اور گوگل کے پٹھوں کی لگام بنا لیتا اور کھجور کے درخت سے کاٹ کر نیزہ بنا لیتا اور اس طرح گدھا دوڑاتا رہتا ۔ میں اسے بھگا دیتا مگر جونہی ذرا سا غافل ہوا پھر گدھے پر آجاتا چنانچہ وہ بچہ بڑا ہو کر سلطانی گھوڑ سواروں کی فوج کا سپاہ سالار بنا۔ وَکُلٌّ مُیَسَّرٌ لِمَا خُلِقَ لَہٗ (جو شخص جس کام کے لیے پیدا کیا گیا ہے وہ اس کے لیے آسان کر دیا جاتا ہے۔)

ایک معلّم کا واقعہ

ایک معلّم نے بچوں کا امتحان کرنا چاہا۔ ہر ایک کو ایک پرندہ دیا اور کہا کہ اسے ایسی جگہ جا کر ذبح کر لاؤ جہاں تجھے کوئی نہ دیکھ رہا ہو۔ ایک کے سوا سب ذبح کر لائے۔ کہا جاتا ہے کہ وہ بچہ حضرت ابو العبّاس سبتی تھے۔ وہ پرندکو زندہ ہاتھ میں لیے واپس آگیا اور کہا کہ جہاں کہیں میں اسے ذبح کرنا چاہتا اللہ کو اپنے ساتھ پاتا۔ اس سے استاد کو معلوم ہو گیا کہ وہ مقامِ معرفت حاصل کرے گا چنانچہ وہ اس کے بعد اس کا خاص خیال رکھتا رہا۔ واللہ تعالیٰ اعلم۔

حضرت نے فرمایا: جب کسی میں ولایت کی رگ ہوتی ہے اور کچھ عرصہ تک بدکاروں میں رہتا ہے، لیکن جب اس کے پاس سے کوئی ولی گزرتا ہے حالانکہ وہ انہی لوگوں میں ہوتا ہے پھر بھی اس کی ولایت کی رگ زندہ ہو جاتی ہے اور اسے خوشی حاصل ہوتی ہے اور اس کا سینہ جاری ہو جاتا ہے۔ یہ اثر محض ولی کے گزرنے کا ہوتا ہے خواہ وہ شخص اس ولی کو جانتا بھی نہ ہو اور نہ ہی ولی اس سے گفتگو کرے، لیکن اگر ان میں میل جول ہو جائے اور آپس میں جان پہچان ہو جائے تو پھر اس رگ کی زندگی کا کیا پوچھنا کہ ہر لحظہ خیر میں اسے کس قدر ترقی ہوگی۔

اور اگر کسی آدمی میں شر کی رگ ہو مثلاً چوری اور وہ مدت تک ولیوں میں رہے۔ ان کی خدمت کرتا رہے پھر جب کبھی کوئی چور ان کے پاس سے گزرے تو جس شخص میں چوری کی رگ ہوگی وہ زندہ ہو جائے گی اور بدی کے لیے اس کا سینہ کھل جائے گا۔ محض چور کے پاس سے گزرنے سے اس کا یہ حال ہوگا بغیر اس کے کہ ان میں جان پہچان یا اختلاط ہو، لیکن اگر جان پہچان ہو جائے تو شر اپنے کمال کو پہنچ جائے گا۔ خدا بچائے۔ وَکُلٌّ مُیَسَّرٌ لِمَا خُلِقَ لَہٗ۔

مؤلف کہتا ہے کہ یہ ایک بہت وسیع باب ہے اور مفید طریقہ ہے جس کا ان لوگوں کو علم ہے جو درس و تدریس میں لگے رہتے ہیں کیونکہ اُن کے سامنے قابلیت کی بحث کو پیش کیا جائے تو انھیں یوں معلوم ہوگا کہ یہ سب کچھ ان کے زمانۂ تدریس کے تجربات کی نقل ہے۔ میں نے بحمد اللہ ستائیس سال درس و تدریس میں گزارے ہیں لہٰذا حضرت سے اہلیت کی بحث اور ان خیالات کی بحث کو سنا جن پر ذات کا انحصار ہوتا ہے تو میں نے اس کا مقابلہ ان واقعات سے کیا جو ہمیں بہت سے طلبہ سے پیش آئے اور میں نے اسے جامع اور مانع ضابطہ پایا جس کی وجہ سے بہت سا بوجھ اتر گیا جو میں ان کو تعلیم دینے میں برداشت کیا کرتا تھا۔ میں ان کی خیر خواہی اور مسائل کی تشریح میں بہت کوشش کرتا۔ دلیلوں سے انہیں سمجھاتا۔ ان کو فائدہ پہنچانے کی آرزو رکھتا حتی کہ اس غرض سے ان کے ساتھ کھاتا اور پیتا، لیکن بعد میں دیکھتا کہ انہیں اس سے کوئی نفع نہیں پہنچا۔ جس چیز کی بنیاد سالہا سال سے رکھتا تھا وہ محض ایک اہل باطل کے میل جول سے منہدم ہو جاتی بلکہ صرف میری غفلت اور تنبیہ نہ کرنے سے جاتی رہتی۔ جیسے کہ جب تک چوپایہ کو مارتے رہو وہ چلتا رہے گا اور جونہی کہ مارنا چھوڑ دیا ٹھہر جاتا ہے، مگر بہت سے لوگوں میں اس کے برعکس بھی واقع ہوا ہے کہ محض ہم سے مخالطت کرنے اور میل جول رکھنے سے جو کچھ ہم سے سنتے تھے وہ انہیں یاد ہو جاتا اس کے بعد جس مجلس میں ہمارے ساتھ بیٹھتے ان کا علم بڑھتا جاتا حالانکہ میں انہیں تعلیم دینے میں اس قدر کوشش نہ کرتا تھا جس قدر کہ پہلی قسم کے لوگوں کو تعلیم دینے میں کرتا تھا۔ میں اس میں ہمیشہ سوچتا رہا اور اس کا سبب تلاش کرتا رہا تا آنکہ میں نے حضرت سے قابلیت کی بحث سنی اور جو معاملہ مجھے پہلی قسم کے لوگوں سے پیش آتا تھا میں نے حضرت سے ذکر کیا۔ فرمانے لگے: اس قسم کے لوگوں کو تعلیم دینے کا خیال دل سے نکال دو کیونکہ اس کی مثال تو ٹھنڈے لوہے کو کوٹنے کی ہے (کہ بے کار ہوتا ہے) وَالنَّاسُ مُيَسَّرُونَ لِمَا خُلِقُوا لَهُ۔ ابتدا سے انتہا کا پتہ چل جاتا ہے۔ ابتدا سے دیکھ کر ہر ایک کو اپنے اپنے مقام پر اتارا کرو۔ اس دن سے میں نے آرام محسوس کیا اور مجھے بحمد اللہ ہر چیز میں لوگوں کی اہلیت کے متعلق بہت سی معلومات بہم پہنچ گئیں۔ والحمد للہ۔ لہٰذا اگر تو سمجھ دار اور عقلمند ہے تو اس کلام کو ہمیشہ اپنے سامنے رکھ۔ اس سے مختلف قسم کے لوگوں سے باوجود اس کے کہ ان کی طبائع مختلف ہوتی ہیں میل جول رکھنے میں بہت سہولت ہوگی۔

چھٹا سوال

فقیہ مذکور نے ایک سوال یہ بھی کیا کہ ابلیس لعین نے سہل رحؒ بن عبداللہ تستری سے کہا کہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں وَرَحْمَتِي وَسِعَتْ كُلَّ شَيْءٍ (میری رحمت ہر چیز پر شامل ہے)

(حاشیہ اگلے صفحہ پر)

اور میں بھی ایک چیز ہوں۔ لہٰذا رحمتِ خداوندی سے باہر نہیں رہ سکتا اس کے جواب میں حضرت سہلؒ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے ساتھ ہی فرمایا ہے فَسَأَكْتُبُهَا لِلَّذِينَ يَتَّقُونَ میں نے اس رحمت کو متقیوں کے لیے لکھ رکھا ہے اور تو متقی نہیں رحمت کے نازل ہونے کی شرط تقویٰ ہے لہٰذا یہ آیت مطلق نہیں مقید ہے۔ ابلیس نے جواباً کہا کہ اس آیت کو تو نے مقید بنا دیا ہے ورنہ اللہ نے تو اسے مطلق ہی رکھا ہے لہٰذا تقویٰ کی قید تمہاری طرف سے ہوئی نہ کہ اللہ کی طرف سے۔ بندے کی کیا مجال کہ مقید بنا دے حالانکہ آیت میں قید موجود ہے مگر شیخ عارف محی الدین حاتمی فرماتے ہیں اس مسئلہ میں ابلیس لعین سہل کا استاذ ہو گیا۔ لہٰذا گزارش ہے کہ اس مسئلہ کی وضاحت فرمائیں۔ اس حکایت کا ذکر امام شعرانیؒ نے بھی کیا ہے مگر سکوت اختیار کیا ہے ان کے سکوت سے سائل کو خیال ہوا کہ ابلیس ملعون کی بات درست ہے۔ مسئلہ میں اشکال یہ ہے کہ تقیید تو خود اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہے نہ سہل کی طرف سے۔

(حاشیہ صفحہ سابقہ)

۱؎ ابو محمد سہلؒ بن عبداللہ تستری کبار صوفیاء میں سے تھے اور یکتائے روزگار تھے۔ ان کی کرامات مشہور ہیں جب حج کے لیے تشریف لے گئے تو ذوالنونؒ مصری سے ان کی ملاقات ہوئی۔ ۲۸۳ھ / ۸۹۶ء میں ان کی وفات ہوئی۔ ان کے اپنے بیان کے مطابق انہوں نے چھ یا سات برس کی عمر میں قرآن مجید حفظ کیا۔ ابھی تین برس کی عمر تھی کہ اپنے خالو محمد بن سوار سے ذکر کی تعلیم لی اور آخر عمر تک کاربند رہے۔

۲؎ مؤلف نے کتاب کا حوالہ نہیں دیا۔ مجھے حوالہ کی تلاش میں امام عبدالوہاب شعرانیؒ کی تصنیفات کی طرف رجوع کرنا پڑا اور بہت تلاش کے بعد اس مناظرہ کا تذکرہ ان کی تصنیف الانوار القدسیہ فی بیان آداب العبودیہ (ج ۲ صفحہ ۴ برحاشیہ لواقح) میں مل گیا۔ امام شعرانی لکھتے ہیں:۔

"میں چاہتا ہوں کہ یہاں پر حجۃ اللہ اور ولی کامل سہل بن عبداللہ تستری کے اس مناظرہ کا ذکر کروں جو ابلیس کے ساتھ ہوا تاکہ تجھے معلوم ہو جائے کہ اللہ تعالیٰ نے اسے مخلوقات پر تسلط کی کس قدر قدرت عطا کی ہے اگر ایسی بات نہ ہوتی تو اللہ تعالیٰ ہمیں اس سے نہ ڈراتا۔ سہلؒ فرماتے ہیں مجھے شیطان ملا اور میں نے اسے پہچان لیا۔ اور شیطان کو بھی معلوم ہو گیا کہ میں نے اسے پہچان لیا ہے۔ اس کے بعد ہمارے درمیان مناظرہ ہوا۔ شیطان نے مجھے کہا اور میں نے اسے کہا چنانچہ بات بڑھ گئی اور بحث طول پکڑ گئی یہاں تک کہ وہ بھی ٹھہر گیا اور میں بھی ٹھہر گیا وہ بھی پریشان تھا اور میں بھی پریشان۔ بالآخر شیطان نے کہا "اے سہل! اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں وَرَحْمَتِي

(بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر)

حضرت نے فرمایا: تقید اللہ ہی کی طرف سے ہے۔ سہلؒ کی طرف سے نہیں۔ شیطان کا استدلال باطل ہے۔ حضرت سہلؒ حق پر ہیں نہ کہ ابلیس۔ ابلیس کے کلام کی مدح کرنے کی وجہ یہ ہے کہ حضرت حاتمی اور حضرت سہلؒ نے اس سے وہ مفہوم لیا ہے جو نہ شیطان کے وہم وگمان میں آیا، نہ اس نے اسے سمجھا جس سے سہلؒ کی خوابیدہ صفات بیدار ہوگئیں اور ان میں حرکت پیدا ہوگئی اور جن امور کو وہ خدا کی طرف سے جانتے تھے ان کا مشاہدہ کرنے لگے کیونکہ صوفیاء فتح نصیب ہوجانے اور اللہ تعالیٰ کو جیسا کہ وہ درحقیقت ہے، پہچان لینے کے بعد جب وہ اپنی پہلی حالت پر نظر دوڑاتے ہیں تو دیکھتے ہیں کہ انھوں نے حق تعالیٰ کی صفات کو بے شمار قیود میں مقید کر رکھا تھا اور اسکی معرفت سے بےخبر

(بقیہ حاشیہ صفحہ سابقہ)

وَسِعَتْ كُلَّ شَيْءٍ (میری رحمت ہر چیز پر چھائی ہوئی ہے) اللہ تعالیٰ کا یہ حکم عام ہے (یعنی خاص نہیں کہ خاص لوگوں کے لیے ہی رحمت ہو) اور تجھ سے مخفی نہیں کہ میں بھی بیشک ایک چیز ہوں۔ اس لیے کہ کُلّ کا لفظ بتاتا ہے کہ یہ رحمت عام اور سب پر محیط ہے اور شی کا لفظ نکرہ ہے (جس میں تمام اشیاء آجاتی ہیں) لہٰذا رحمتِ خداوندی میں میں بھی آگیا۔"

سہلؒ فرماتے ہیں: اللہ کی قسم اس نے تو مجھے گونگا کردیا اور یہ آیت پڑھ کر اس نے مجھ پر غلبہ پالیا اور مجھے حیران کردیا۔ اس لیے کہ اس آیت سے جو کچھ وہ سمجھ سکا تھا میں نہ سمجھ سکا اور جوبات اس کے علم میں آئی تھی میرے علم میں نہ آئی لہٰذا میں حیران اور متفکر ہوکر دل ہی دل میں اسی آیت کو پڑھنے لگا حتیٰ کہ ان الفاظ پر پہنچا فَسَاَكْتُبُهَا لِلَّذِيْنَ يَتَّقُوْنَ وَيُؤْتُوْنَ الزَّكٰوةَ وَالَّذِيْنَ هُمْ بِاٰيٰتِنَا يُؤْمِنُوْنَ۔ (میں اپنی رحمت کو ان لوگوں کے لیے لکھوں گا جو متقی ہیں، زکوٰۃ دیتے ہیں اور ہماری آیات پر ایمان لاتے ہیں) تو میں خوش ہوا کہ مجھے ایک دلیل مل گئی اور میں اب اس پر غالب آگیا چنانچہ میں نے کہا: اے ملعون! اللہ تعالیٰ نے اپنی رحمت کے لیے: اس قید لگا رکھی ہے جس کی وجہ سے یہ عام حکم سے خارج ہوجاتی ہے چنانچہ میں نے آیت کا باقی حصہ پڑھا۔ اس پر ابلیس ہنسا اور کہا اے سہلؒ! میرا خیال نہ تھا کہ تو اس حد تک جاہل ہے۔ اے سہلؒ یہ قید لگانا تو تمہاری صفت ہے نہ اللہ کی۔ سہلؒ کہتے ہیں کہ میں سخت پریشان تھا مجھے کوئی جواب نہ سوجھا یہاں تک کہ میرے حلق میں تھوک بھی خشک ہوگیا اور میں سمجھ گیا کہ وہ مجھے پھسلانے آیا ہے اس لیے میں بھی چلا آیا اور وہ بھی چلا گیا۔ سہلؒ کہتے ہیں کہ اس پر میں نے اس سے معرفت کا طریقہ معلوم کرنا چاہا اگرچہ وہ خود اس سے نفع نہ حاصل کرسکتا تھا۔ کیونکہ بزرگوں کا قول ہے اُنْظُرْ مَا قَالَ وَلَا تَنْظُرْ اِلٰى مَنْ قَالَ (یہ دیکھو کہ کسی نے کیا کہا۔ یہ نہ دیکھو کہ کس نے کہا)۔ ۱۲

تھے۔ چنانچہ جب ابلیس نے کہا کہ یہ قید تو تمہاری طرف سے لگائی گئی نہ اللہ کی طرف سے تو ان الفاظ کو سُن کر سہلؒ کی توجہ اپنی دونوں حالتوں کی طرف ہوئی تو ان پر تحیّر وسکوت طاری ہوگیا، حالانکہ جس مفہوم کی طرف سہلؒ کا خیال گیا وہ ابلیس نے مراد نہ لیا تھا اور نہ ہی اس کے دل پر اس کا خیال گزرا تھا۔ یہ بات صوفیہ کے سماع سے تعلق رکھتی ہے۔

ایک پیر اپنے مرید کے گھر آیا۔ دروازہ پر دستک دی۔ گھر میں مرید کے سوا کوئی نہ تھا۔ مرید نے جواب دیا۔ کون دستک دے رہا ہے۔ یہاں کوئی نہیں ہے (چلے آؤ) پیر نے جب یہ لفظ سنے کہ "یہاں میرے سوا کوئی اور نہیں ہے۔" تو بیہوش ہوکر گر پڑے (انہیں "مَا فِی قَلْبِی غَیْرُ اللہ" کا مفہوم ذہن میں آگیا) لیکن مرید کو اس کا علم بھی نہ ہوا۔ لہٰذا اگر کوئی یہ کہہ دے کہ یہاں مرید اپنے پیر کا استاد بن گیا تو کوئی حرج نہیں ہے۔

ایک بچی نے اپنے باپ سے کوئی کام کہا کہ بازار سے فلاں چیز لادو۔ باپ لانے کے لیے نکلا والدہ نے بچی کو کہا تو نے اپنے (بوڑھے) باپ کو کیوں تکلیف دی۔ بچی نے کہا "ابا کے سوا میرا کوئی اور بھی ہے" یہ الفاظ کسی صوفی نے سُن لیے تو غش کھا کر گر پڑے۔

یہاں سے ابلیس کی بات کا بطلان اور صوفیہ کے اشارات وکنایات کا صحیح ہونا ثابت ہوجاتا ہے واللہ تعالیٰ اعلم۔

ساتواں سوال فقیہ نے ایک اور سوال کیا جس کا اس باب سے کوئی تعلق نہیں۔ سوال یہ ہے کہ بعض عارفین کا قول ہے کہ مخالفت یعنی معصیت میں ایک سَو رحمتیں پائی جاتی ہیں جن کا نفع مومن کو ہوتا ہے۔ یہ کونسی سو رحمتیں ہیں جن کی اصل اللہ کا غضب ہے اور اس غضب کے رحمت اور فضل میں بدل جانے کی کیا حقیقت ہے؟

حضرت نے جواب دیا کہ اس معصیت سے مراد اس مومن کی معصیت ہے جو اپنے رب کے جلال وعظمت کا عارف ہو کیونکہ ایسی معرفت والے انسان سے معصیت کا صدور بحکم غلبۂ تقدیر ہوگا۔ اس عارف سے ہماری مراد صاحب فتح نہیں ہے بلکہ وہ شخص ہے جس کے ایمان میں خلوص اور اس کا یقین صاف ہو کیونکہ جب اس کی یہ حالت ہوگی تو بحالتِ طاعت بھی ہر وقت خوفِ حق تعالیٰ اس کے دل میں رہے گا۔ معصیت کی حالت کا ذکر ہی کیا۔ کیونکہ اس کے دل میں خوف طاری رہنے کا سبب اللہ تعالیٰ کی سطوت کا جاننا ہے۔ جب ہم نے فرض کرلیا کہ یہ معرفت ہر وقت رہتی ہے اور اس کے منافی امور مثلاً غفلت وغیرہ معدوم ہوتے ہیں تو خوف بھی ہر وقت رہے گا اور کسی حالت میں بھی اس سے

جدا نہ ہوگا حتیٰ کہ طاعت کی حالت میں بھی اسے یہ خوف لگا رہے گا کہ کہیں میں نے اطاعت ایسے طریقہ پر نہ کی ہو جو مجھے اللہ سے بُعد کا سبب بنے لہٰذا تو دیکھے گا کہ وہ اس احتمال کے خیال سے اس قدر لرز رہا ہوگا کہ اس کا لرزہ تھمنے میں نہیں آتا۔ یہ خوف اسے عمل سے پہلے، عمل کے دوران میں اور عمل کے بعد بھی طاری رہتا ہے کہ کہیں مجھ پر عذاب نہ نازل ہو جائے۔ جب طاعت میں اس کی یہ حالت ہے تو معصیت کی حالت میں اس کا کیا حال ہوگا۔

ایک مومن معصیت کا مرتکب ہونے کے بعد چوبیس سال تک زندہ رہا۔ اس طویل عرصہ میں ایک لحظہ بھی اس پر ایسا نہیں گزرتا تھا کہ اس معصیت کے ڈر سے اس کے آنسو نہ بہتے ہوں۔ اس معصیت کی وجہ سے جو خوف پیدا ہوا اس کی برکت سے اللہ تعالیٰ نے اسے اس طویل مدت میں گناہ کا مرتکب ہونے سے بچا لیا اور اس عرصہ میں اللہ تعالیٰ کی طرف لگے رہنے سے اس پر اپنا فضل و کرم کیا اور اس پر صد ہا رحمتیں نازل ہوئیں۔ الحاصل رحمتِ الٰہیہ کا مدار اس خوف پر ہے جو ہر وقت دل میں قائم ہو اور اس کا سبب خداوندی سطوت کی معرفت ہے جو روح کی طرف سے حاصل ہوتی ہے، روح عالم بالا کی چیز ہے جسے اوروں کی نسبت اللہ کی معرفت زیادہ حاصل ہے لہٰذا جب ذات پاک ہوگی تو روح ہر حالت میں خواہ طاعت کی حالت ہو خواہ معصیت کی۔ اپنے معارف سے اسے مدد پہنچاتی رہتی ہے جس سے ذات کو فائدہ پہنچتا ہے اور جب ذات پاک نہ ہو تو روح اپنے معارف روک لیتی ہے جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ذات شہوات و لذاتِ نفسانیہ میں لگ جاتی ہے اور یہ باتیں اس کے اندر گھر کر لیتی ہیں اور حالت محمودہ اس کے لیے خواب و خیال بن جاتی ہے جو چیزیں اس کے اندر گھر کر چکی ہوتی ہیں انہی کا غلبہ ہوتا ہے اور انہی کا حکم چلتا ہے لہٰذا اس کے تمام اعمال و افعال تحصیلِ شہوات کی غرض سے ہوتے ہیں اور اگر اطاعت بھی کرتا ہے تو اس لیے نہیں کہ عبودیت اس بات کی مقتضی ہے کہ حقِ ربوبیت ادا کیا جائے بلکہ کسی ذاتی نفع کی غرض سے کرتا ہے اور اپنی لذات کو پورا کرنے کے لیے بے پروا ہو کر نافرمانی کرتا ہے اس سے معلوم ہو گیا کہ رحمت کا مدار طاعت و معصیت پر نہیں بلکہ خوف و عدم خوف پر ہے (اور اس پر بھی نہیں ہے) درحقیقت سارا مدار معرفت الٰہیہ اور عدم معرفت پر ہے۔ رحمت کے ساتھ تنوّ کی بھی تخصیص نہیں اصل مقصد وہی ہے جو ہم نے بیان کر دیا۔ واللہ تعالیٰ اعلم۔

اٹھواں سوال ۷۸ عارفین کا قول ہے "مجھے ہر چیز میں خدا نظر آتا ہے"۔ خدا قدیم ہے اور اشیاء حادث پھر قدیم حادث میں کیسے نظر آ سکتا ہے؛ پھر یہ کہنا کہ "ہم اللہ کے نہ عین ہیں نہ غیر" یہ تو ارتفاع نقیضین ہوا جو محال ہے۔

فرمایا: عارف کا یہ کہنا کہ "مجھے ہر چیز میں خدا نظر آتا ہے"؛ اس سے مراد یہ ہے کہ ہر چیز میں مجھے افعالِ خداوندی نظر آتے ہیں اس لیے کہ عارف لوگ اپنی قوتِ عرفان کی وجہ سے تمام کائنات میں افعال باری تعالیٰ کا مشاہدہ کرتے رہتے ہیں۔ ہر مخلوق میں لامحالہ اللہ کے افعال پائے جاتے ہیں لہٰذا حلول و اتحاد کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اس قول میں دیگر اسرار بھی پائے جاتے ہیں جن کا فاش کرنا مناسب نہیں الحاصل اس کا جواب تحقیقی طور پر بیان نہیں کیا جا سکتا۔

دوسرا قول غیر واضح ہے اس لیے کہ قدیم یقیناً حادث سے مباین ہے اور مباین قطعی طور پر عین شئی نہیں ہو سکتا، لہٰذا بلا شک و شبہ غیر ہوگا۔ لہٰذا جب عینیت نہ ہوئی تو غیریت پائی گئی۔ واللہ الموفق۔

نواں سوال

کیا آنحضرت صلّی اللہ علیہ وسلم کی صورتِ شریفہ کا ذہن میں استحضار و تشخص عالمِ ارواح سے ہے یا عالمِ مثال سے یا عالمِ خیال سے ہے؟ اور کیا وہ صورت ذہنیہ جس میں آنحضرتؐ سے مکالمہ و باتیں بھی ہوتی ہیں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے فرمان کے مطابق کہ "جس نے مجھے دیکھا اس نے مجھ ہی کو دیکھا کیونکہ شیطان میری صورت نہیں لے سکتا" خواب کی طرح شیطانی اثر سے محفوظ ہے یا نہیں۔

فرمایا: یہ استحضار اس شخص کی رُوح اور عقل کا فعل ہے۔ جس شخص نے اپنی توجہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف کی اس کے ذہن میں آپ کی صورت شریفہ آجائے گی۔ اگر یہ شخص ان لوگوں میں سے ہوگا جو آپ کی صورت سے واقف ہیں مثلاً صحابی یا عالم جس نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے حلیہٴ مبارک کو تحقیق کرنے کے بعد حاصل کیا ہے تو یہ صورت واقعہ کے مطابق آپ کی اصل صورت ہوگی اور اگر کوئی اور ہوگا تو اسے ایک ایسے انسان کی صورت ذہن میں آئے گی جو خلق اور خُلق دونوں اعتبار سے کامل ہوگا چنانچہ کبھی یہ صورت حقیقی صورت کے مطابق ہوتی ہے اور کبھی مخالف، مگر یہ ذہنی صورت آپ کی ذاتِ مبارک کی صورت ہوتی ہے روح کی نہیں۔ کیونکہ جسے صحابہ نے دیکھا اور علماء نے بیان کیا وہ آپ کی ذات تھی نہ روح اور انسان کے خیالات معلوم چیز کا ہی تصور کر سکتے ہیں۔ رہا یہ سوال کہ کیا یہ عالم ارواح سے ہے، اگر اس سے تمہاری مراد استحضار ہے تو اس کا جواب یہ ہے کہ اس کا تعلق عالمِ ارواح سے ہے یعنی یہ فکر کنندہ کی روح کا فعل ہے اور اگر مراد صورتِ حاضرہ ہے کہ ہماری فکر میں جو صورت آئی ہے وہ عالمِ ارواح سے ہے یا نہیں، اس کا جواب ہو چکا کہ نہیں ہے۔ اب رہا یہ سوال کہ وہ گفتگو شیطانی اثر سے محفوظ ہے یا نہیں۔ اس کا جواب یہ ہے کہ اگر اس فکر کنندہ کی ذات طاہر ہے اور اس کی روح کو بھی اس

سے محبت ہے کہ اپنے اسرار سے اسے نوازتی رہتی ہے اور ذات کے ساتھ اس کا ایسا تعلق ہے جیسا دوست کا دوست سے تو یہ گفتگو شیطانی اثر سے محفوظ اور سچ (حق) ہو گی ورنہ غیر محفوظ اور باطل ہو گی۔ واللہ الموفق۔ فقیہ کے نو سوالوں کے جواب ختم ہوئے۔

ایک دن میں نے حضرت سے ذکر کیا کہ کوئی بزرگ اپنے مریدوں کے ساتھ بیٹھے ذکر میں مشغول تھے کہ ان میں سے ایک شخص کا رنگ بدل گیا اور حالت دگرگوں ہو گئی اور اس نے اپنی نشست کو بھی بدل لیا۔ کسی نے اس سے اس کا سبب پوچھا تو کہا "خبردار ہو جاؤ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم یہاں موجود ہیں"۔ اس کی مراد یہ تھی کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اس وقت وہاں موجود تھے اور اس نے اس کا مشاہدہ کیا ہے۔ میں نے حضرت سے دریافت کیا کہ کیا یہ مشاہدہ جو اس شخص کو حاصل ہوا مشاہدۂ فتح تھا یا مشاہدۂ فکر؟ حضرت نے فرمایا: یہ مشاہدۂ فتح نہ تھا بلکہ مشاہدۂ فکر تھا اور اگرچہ مشاہدۂ فکر کا درجہ مشاہدۂ فتح سے کم ہے، لیکن اسی شخص کو نصیب ہوتا ہے جس کا ایمان خالص، پاک محبت اور سچی نیت ہو۔ مختصر یہ کہ مشاہدہ بھی انہی لوگوں کو حاصل ہوتا ہے جن کا تعلق آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے کمال کو پہنچا ہوتا ہے۔ بہت سے لوگ اس مشاہدہ کو مشاہدۂ فتح سمجھ بیٹھتے ہیں حالانکہ یہ مشاہدۂ فکر ہوتا ہے۔ اس قسم کے لوگ جو صاحب فتح نہ ہونے کے باوجود مشاہدہ کرتے ہیں اگر عامۃ المومنین کا ان سے مقابلہ کیا جائے تو وہ کالعدم ہوں گے اور ان کا ایمان اس کے ایمان کے مقابلہ میں لاشئ ہو گا۔ واللہ تعالیٰ اعلم۔

مؤلف کہتا ہے کہ اس امر کی تائید کہ مشاہدۂ فکر یہ ان لوگوں کے لیے بھی ہو جاتا ہے جو صاحب فتح نہیں ہوتے اس بات سے ہوتی ہے کہ یہ مشاہدۂ فکر یہ ان لوگوں کو بھی ہو جاتا ہے جنہیں کسی شخص سے خواہ وہ کوئی بھی ہو کامل محبت ہو جائے۔ ایک قصاب نے مجھے بتایا کہ اس کا ایک بیٹا جس سے اسے بہت ہی محبت تھی مر گیا اور اس کی ذات ہر وقت اس کے ذہن میں رہتی حتیٰ کہ اس کی عقل و اعضا بھی اسی بیٹے کی طرف لگے رہتے۔ دن رات اس کا یہی حال رہتا کہ ایک دن شہر فاس کے باب الفتوح کی طرف قصابوں کی عادت کے مطابق بکریاں خریدنے گیا۔ اس وقت بھی اس کے ذہن میں وہی مردہ بیٹا تھا چنانچہ جب اس کی فکر میں تھا، اس نے اسے اپنی طرف آتے ہوئے دیکھا یہاں تک کہ وہ اس کے پاس آکر کھڑا ہو گیا۔ قصاب کہتا ہے کہ میں نے اس سے باتیں کیں اور کہا بیٹا یہ بکری جو میں نے خریدی ہے اسے پکڑے رکھو تاکہ میں دوسری خرید لاؤں۔ اس وقت مجھ پر بے حسی کی سی کیفیت تھی۔ جب پاس کے لوگوں نے مجھے بیٹے سے باتیں کرتے ہوئے سنا تو کہنے لگے کس سے باتیں کر رہے ہو اس وقت میں ہوش میں آیا۔ اور بیٹا میری آنکھوں سے غائب ہو گیا۔ اس پر جو غم کی کیفیت مجھ پر طاری ہوئی اس کا علم اللہ

کے سوا کسی کو نہیں ہو سکتا۔

حضرت نے فرمایا: شیخ اور مرید کے درمیان اسی قسم کی محبت ہونی چاہیئے کہ اس سے بہت فائدہ ہوتا ہے۔

نیز فرمایا: اس قسم کی محبت والے نفع ونقصان بھی پہنچا سکتے ہیں جس طرح کہ اہلِ تصرف کر سکتے ہیں۔ جب محبت کی آگ مشتعل ہو جاتی ہے تو اسے کوئی چیز رد نہیں کر سکتی۔

نیز فرمایا: ایک شیخ کا ایک مرید تھا جسے شیخ سے بہت محبت تھی یہاں تک کہ اس مرید کے ذہن وفکر میں ہر وقت شیخ کا خیال رہتا چنانچہ جب شیخ اپنے گھر میں بیٹھا کوئی کام کرتا تو مرید اپنے گھر میں اس کی نقل اتارتا۔ جب شیخ اپنے گھر اپنی بیٹی فاطمہ کو بلاتا تو مرید بھی فاطمہ کہہ کر پکارتا۔ جب شیخ کہتا کہ یوں کرو تو مرید بھی اپنے گھر میں یہی کہتا۔ جب شیخ اپنی پگڑی سر پر لپیٹتا تو مرید بھی کوئی چیز لے کر سر پر لپیٹنے لگ جاتا۔ اپنے شیخ کے حالات کے ساتھ اس کا ہر وقت یہی حال تھا۔ اسی کمال محبت سے مرید شیخ کا وارث ہوتا ہے۔

فرمایا: ایک شخص کو ایک خوبصورت لڑکی سے عشق تھا۔ اس کا عشق اس حد تک پہنچ گیا تھا کہ اگر کوئی شخص اس کا نام لے کر پکارتا کہ فاطمہ تو عاشق بے اختیار کہتا: جی ہاں۔ فرمایا یہ قصہ تم میری طرف سے لوگوں کو سنا سکتے ہو کیونکہ میں نے خود اسے دیکھا ہے کہ جب اس کا نام پکارا جاتا تو وہ "جی" کہہ کر جواب دیتا۔ جب امور ہزلیہ میں محبت کا یہ حال ہو تو اہلِ جد وحقیقت لوگوں کی محبت کا کیا حال ہوگا۔

ایک عیسائی کی محبت کا واقعہ

حضرت نے فرمایا کہ میرے شیخ منصور فرمایا کرتے تھے کہ جو لوگ محبت الٰہیہ کے مدعی ہیں ان کے لیے ایک عیسائی کا قصہ تازیانہ کا کام دے گا۔ اسے ایک پادری کی لڑکی سے عشق ہو گیا۔ جب دونوں اکٹھے ہوئے اور ایک ہی بستر پر بیٹھے تو اس کی محبت میں اسے محویت کا عالم طاری ہو گیا اس لڑکی کی نظر اس کے چہرہ پر پڑی تو اس میں ایک مَسّہ تھا۔ اس کے ہاتھ میں ایک زہریلی چھری تھی، لیکن اسے اس کے زہر آلود ہونے کا علم نہ تھا اس نے وہ مَسّہ چھری سے کاٹ ڈالا اور زہر اس کے جسم میں سرایت کر گیا اور اسی محویت کے عالم میں اس کی روح پرواز کر گئی۔ یہ ایک کافر کا حال ہے جو اپنی شیطانی محبت میں اس حد تک پہنچ گیا تھا کہ اس کی روح بھی نکل گئی مگر اسے پتہ نہ چلا۔ تو اپنے رب کی محبت میں ایک مومن کا کیا حال ہونا چاہیئے؟

جب تک مرید کو شیخ سے محبّت نہ ہو محض شیخ کی محبّت سے مرید کو فائدہ نہیں پہنچتا!

فرمایا: بڑے کی محبّت سے خواہ وہ نبی ہی کیوں نہ ہو چھوٹے کو فائدہ نہیں پہنچتا جب تک کہ خود چھوٹے کو بڑے سے محبت نہ ہو، تب جاکر اسے فائدہ ہوتا ہے۔ البتہ جب اللہ تعالیٰ کسی بندے سے محبت کرتے ہیں تو اسے فائدہ ہوتا ہے خواہ بندہ کتنا ہی کیوں نہ اعراض کرتا ہو۔ کیونکہ جب چھوٹے کو بڑے سے محبّت ہوتی ہے تو وہ بڑے کے اندر جو کچھ ہوتا ہے، سب کچھ کھینچ لیتا ہے مگر بڑا کسی چھوٹے سے محبّت کرے تو وہ جاذب نہیں ہوتا۔ اس وقت حضرت کے سامنے ایک آلوچہ رکھا تھا۔ فرمایا: مثلاً اگر اللہ تعالیٰ اس کے دل میں ترش سیب کی محبت ڈال دے اور اس محبّت کا اس پر غلبہ ہوجائے تو یہ سیب کے اندر سے سب کچھ جذب کرلے گا، چنانچہ اگر ہم آلوچہ کو چیریں تو اس میں سیب کی سی ترشی پائیں گے مگر سیب کے اندر آلوچہ کا ذائقہ قطعاً نہ ہوگا، مگر حق تعالیٰ (کا معاملہ کچھ اور ہے) کہ اگر بندہ اس سے محبت کرے تو جب تک اللہ تعالیٰ بھی اس سے محبت نہ کریں وہ اپنے اندر اسرارِ الٰہیہ کو جذب نہیں کرسکتا۔ اس فرق کا راز یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ بھی اس وقت تک کسی بندہ سے محبّت نہیں کرتے جب تک کہ اسے اپنی معرفت عطا نہ کردیں۔ اسی معرفت سے وہ اسرارِ الٰہیہ سے واقف ہوجاتا ہے اور وہ اللہ کی طرف کھچا چلا آتا ہے، لیکن اگر بندہ کو معرفتِ الٰہیہ کے بغیر ہی اللہ سے محبت ہو تو اس سے کچھ نہیں ہوتا۔

میں نے عرض کیا کہ لوگ کہتے ہیں کہ شیخ اپنے مرید کے ساتھ اس کی ذات کے اندر سکونت پذیر ہوتا ہے۔

فرمایا: یہ صحیح ہے مگر یہ محبت مرید کی طرف سے ہوتی ہے کہ جب محبّت قوی ہوتی ہے تو شیخ کو اس کی طرف اس قدر کشش ہوتی ہے کہ اس کی حالت وہی ہوجاتی ہے جس کا ہم نے ذکر کیا۔ اس طرح مرید کی ذات شیخ کا مسکن بن جاتی ہے اور ہر شخص اپنے مسکن کو خوبصورت بناتا ہے۔ ان الفاظ سے حضرت کا اشارہ مرید کی ذات میں شیخ کی تاثیر کی طرف تھا جب وہ اس میں متمکن ہوجاتے۔

حضرت کو میں نے یہ بھی فرماتے سنا کہ جب کسی مرید کو شیخ سے کامل محبت ہوجاتی ہے تو شیخ اس مرید کی ذات میں اس طرح سکونت پذیر ہوتا ہے جس طرح حاملہ کے پیٹ میں بچہ۔ چنانچہ کبھی حاملہ کا حمل پورے طور پر ٹھیک حالت پر رہتا ہے تا آنکہ وضع حمل ہوتا ہے اور کبھی اسقاط حمل ہوکر کچھ بھی نہیں رہتا، کبھی بچہ سوجاتا ہے اور پھر بیدار ہوتا ہے۔ افاقہ کی بھی مختلف حالتیں ہیں کہ کبھی ایک ماہ بعد افاقہ ہوتا ہے کبھی سال بعد اور کبھی اس سے بھی زیادہ عرصہ کے بعد۔ یہی حال مرید کا ہوتا ہے جب وہ شیخ کا حامل ہو،

چنانچہ کبھی اس کی محبت کامل اور دائمی ہوتی ہے جس سے شیخ کے کمالات متواتر اس میں ظاہر ہوتے رہتے ہیں۔ حتیٰ کہ اسے فتح نصیب ہو جاتی ہے اور کبھی مرید کی محبت صادق ہونے کے بعد کسی مانع کے پیش آنے کی وجہ سے منقطع ہو جاتی ہے جس سے شیخ کے بارے میں مرید کی نیت بدل جاتی ہے اور شیخ کے اسرار اپنی شعاعیں دینے کے بعد اس کی ذات سے منقطع ہو جاتے ہیں اور جب محبت لوٹ آتی ہے تو اسرار بھی لوٹ آتے ہیں۔ مرید کو چاہیئے کہ اپنی حالت کا امتحان کرے کہ وہ ان تینوں قسموں میں سے کس قسم کا مرید ہے۔ اللہ تعالیٰ سے عفو، عافیت اور توفیق ہدایت مانگنی چاہیئے۔ انہٗ سمیعٌ قریب۔

مولّف کہتا ہے کہ تینوں قسمیں مریدوں میں موجود ہیں۔ مریدوں کو یہ کلام یاد رکھنا چاہیئے۔ اس لیے کہ یہ بہت عمدہ بحث ہے۔ واللہ اعلم۔

نیز فرمایا: اگر مرید کو شیخ سے اس کی ولایت، سِر اور کرم وغیرہ کی وجہ سے محبت ہو تو اس کو اس محبت سے کچھ فائدہ نہیں پہنچتا جب تک کہ یہ محبت بغیر کسی غرض کے ذات شیخ سے نہ ہو جس طرح بچوں کو ایک دوسرے سے محبّت ہوتی ہے کہ اس میں کوئی غرض نہیں ہوتی بلکہ محض الفت ہوتی ہے۔ لہٰذا اسی قسم کی محبت مرید اور شیخ کے درمیان ہونی چاہیئے تاکہ یہ محبت مرید کو اغراض کی طرف نہ لے جائے کہ اغراض کے آنے سے شیطانی وساوس پیدا ہو جاتے ہیں جس سے کبھی تو محبت منقطع ہو جاتی ہے اور کبھی رک جاتی ہے جیسا مذکورہ بالا آخری دو قسموں میں ذکر ہو چکا۔ واللہ اعلم۔

شیخ کی ولایت اور سِرّ کی خاطر محبت کیوں فائدہ مند نہیں ہوتی؟

میں نے شیخ سے دریافت کیا کہ ولایت اور سِر کی خاطر مرید کو شیخ سے جو محبّت ہوتی ہے، اس سے مرید کو فائدہ کیوں نہیں پہنچتا؟

فرمایا: یہ محبت اس لیے فائدہ نہیں پہنچاتی کہ اسرار اور معارف وغیرہ سب اللہ کی طرف سے ہوتے ہیں اور اللہ سے ہر ایک کو محبت ہوتی ہے لہٰذا اس نے ابھی شیخ سے محبت نہیں کی۔ صحیح طور پر شیخ کی محبّت اسی صورت میں ہو سکتی ہے جب وہ محض اس کی ذات کی خاطر اس سے محبّت کرے نہ کہ اس کے اسرار کی خاطر۔

میں نے عرض کیا کہ شیخ کی ذات بھی تو اللہ ہی کی طرف سے ہوتی ہے اور ہر چیز اللہ ہی کی طرف سے ہے لہٰذا کیا وجہ ہے کہ ایک کی محبت تو مفید ہے اور دوسرے کی نہیں؟

فرمایا: تو ٹھیک کہتا ہے، لیکن ذات کی محبّت سے ہماری غرض یہ ہے کہ محبّت خالص اللہ کے لیے ہو، کیونکہ صرف ذات سے نہ نفع ہو سکتا ہے نہ نقصان۔ چنانچہ جب ذات کے ساتھ ہوگی تو یہ بات اس

کی علامت ہو گی کہ محبت آلائش سے پاک ہے۔

میں نے عرض کیا کہ انسان کے لیے اغراض کے بغیر چارہ ہی نہیں۔ لہٰذا جو شخص فصل حاصل کرنے کے ارادہ سے کھیتی باڑی کرے گا تو اسے کھیتی باڑی سے محبت فصل کی خاطر ہو گی نہ کہ کھیتی باڑی سے؟

فرمایا: ہاں! لیکن جب اس نے ابتدا ہی سے فصل کا ارادہ کیا، پھر اپنا خیال دوسری طرف ہٹا لیا کہ اسے فصل کا خیال ہی نہ رہا تو اس شخص کو بہت فصل حاصل ہو گی اور بہت کچھ پائے گا، لیکن اگر اس کا خیال دن رات فصل کی طرف لگا رہے گا اور دل میں سوچتا اور اندازہ لگاتا رہے کہ فصل کیسی ہو گی اور ہونے کے بعد وہ اسے کیا کرے گا تو اس شخص کو فصل حاصل نہ ہو گی بلکہ اس پر فصل حاصل ہونے سے پہلے ہی وسواس کا غلبہ ہو جائے گا اور ہر وقت دل میں کہتا رہے گا کیا فصل پک گئی ہے؟ کہیں اس پر فلاں آفت نہ آجائے یا فلاں لوگ اسے خراب نہ کر دیں اور اسی قسم کے اور وسوسے دل میں پیدا ہوتے رہیں گے برخلاف پہلے شخص کے اسے فصل اور وسوسوں کی طرف سے اطمینان ہو گا۔ یہی حال ہے اس شخص کا جسے شیخ کی ذات کی خاطر محبت ہے اور اس شخص کا جو شیخ سے کسی غرض کی وجہ سے محبت رکھے۔

محبت شریک نہیں چاہتی

ایک روز میں آپ سے شہر فاس میں ابن عامر کے محلہ میں گفتگو کر رہا تھا کہ حضرت نے فرمایا: اس وقت حضرت منصور راس الدرب میں ہیں کیا ان سے ملنا چاہتے ہو؟ میں نے عرض کیا بسر و چشم کیسے ہو سکتا ہے کہ میں قطب سے نہ ملوں؟

فرمایا: لیکن جہاں تک میرا تعلق ہے اگر فرض کر لیا جائے کہ تمہارے والدین کے ہاں تمہاری شکل تمہارے جیسی صفت، تمہارے جیسے علم اور تمہارے جیسے تمام ظاہری اور باطنی اوصاف والے سو اور بھی ہوں تو میں ان میں سے کسی ایک کی طرف بھی نہ دیکھوں گا۔ میرے لیے تم ہی ہو گے اور وہ میرے لیے عام لوگوں کی طرح ہونگے یہ الفاظ سن کر میں غفلت سے بیدار ہوا اور گویا میری آنکھ کھل گئی اور سمجھ گیا کہ میں نے ٹھیک بات نہیں کی اس لیے کہ محبت شریک کو قبول نہیں کرتی۔ واللہ اعلم۔

حضرت کو میں نے یہ بھی فرماتے ہوئے سنا کہ طالب اسرار مرید کی ذات ترابیہ ہوتی ہے اور اسرار دینے والی بھی شیخ کی ترابی ذات ہی ہوتی ہے۔ پس جب مرید کی ذات ترابی صرف شیخ کی ذات ترابیہ ہی سے محبت رکھتی ہے تو وہ ذات اپنے اسرار و معارف سے اسے نوازتی ہے، لیکن اگر مرید کی ذات شیخ کی ذات کے اسرار سے محبت رکھتی ہو اور یہ محبت ذات کو چھوڑ کر اس کے اسرار و معارف کے ساتھ ہو جائے تب ذات ترابیہ اپنے اسرار و معارف کو روک لیتی ہے۔ پھر نہ روح اور نہ کوئی اور چیز ان اسرار کو جاری رکھنے کی طاقت رکھتی ہے، لہٰذا مرید کو چاہیئے کہ ہر قسم کے منافع سے قطع نظر کرتے ہوئے اپنی

پوری کوشش شیخ کی محبّت میں صرف کردے۔ وَلَا حَوْلَ وَلَا قُوَّةَ اِلَّا بِاللّٰهِ الْعَلِیِّ الْعَظِیْمِ۔ وَاللّٰہ اعلم۔

کیا محبت کی کوئی علامت ہوسکتی ہے؟

میں نے حضرت سے سوال کیا: کیا محبّت کی کوئی علامت ونشانی ہوتی ہے۔

فرمایا: محبّت کی دو علامتیں ہیں: ایک یہ کہ مرید کی راحت ذاتِ شیخ میں ہو کہ اسی کی فکر ہو۔ اسی کے لیے زندہ ہو، اسی پر فریفتہ ہو، اسی سے خوش ہو اور اسی کا غم ہو حتیٰ کہ ظاہر و باطن میں موجودگی اور عدم موجودگی میں اس کے تمام حرکات وسکنات ذات شیخ اور اس کے متعلقات کی خاطر ہوں اور وہ اپنی ذات اور اس کی بہبود کی پروا نہ کرے۔

دوسری علامت شیخ کا ادب وتعظیم کرنا ہے یہاں تک کہ اگر فرض کر لیا جائے کہ شیخ کوئیں میں ہے اور مرید پہاڑ کی چوٹی پر تو اس کے دل پر شیخ کی تعظیم کے کثرتِ غلبہ کی وجہ سے اسے یوں معلوم ہو کہ وہ خود کنوئیں میں ہے اور شیخ پہاڑ کی چوٹی پر۔

فرمایا: لوگوں کا خیال ہے کہ شیخ کا مرید پر احسان ہوتا ہے حالانکہ درحقیقت شیخ پر مرید کا احسان ہوتا ہے اس لیے کہ پہلے بیان ہو چکا ہے کہ بڑے کی محبت سود مند نہیں ہوتی، کشش مرید کی محبت میں ہی ہوتی ہے لہٰذا اگر مرید کی ذات طاہر اور اس کی عقل صاف اور اس کے نفس میں بھلائی کی اہلیت اور جاذبِ محبت نہ ہو تو شیخ کچھ بھی نہ کر سکے اور اگر شیخ کی محبت ہی نفع رساں ہوتی تو ان کا ہر مرید واصل باللہ اور کامل بن جایا کرتا۔

شیخ سے سچّی محبّت کی علامات

فرمایا: اس بات کی علامت کہ مرید کو شیخ سے سچی اور سود مند محبت ہے یہ ہے کہ فرض کر لیا جائے کہ وہ تمام اسرار اور خوبیاں جو ذاتِ شیخ میں پائی جاتی تھیں زائل ہو گئی ہیں اور شیخ کی ذات ان سے کلیتہً خالی ہو کر عامۃ الناس کی طرح ہو گئی ہے پس اگر اب بھی مرید کو شیخ سے وہی پہلی سی محبّت ہو تو یہ سچی محبّت ہے، لیکن اگر یہ محبّت ان اسرار کے زائل ہو جانے سے دور اور زائل ہو جاتے تو یہ محبّت جھوٹی محبت ہو گی۔ واللہ اعلم۔

یہ بھی فرمایا کہ پاک اور خاص محبّت کی علامت یہ ہے کہ مرید شیخ کو تولنا چھوڑ دے تاکہ مرید کی نگاہ میں شیخ کے تمام افعال واقوال اور احوال درست اور ٹھیک ہوں۔ اگر اسے ان افعال واقوال کی وجہ سمجھ میں آجائے فبہا ورنہ اگر اسے ان کا کوئی راز سمجھ میں نہ آئے تو اسے اللہ کے سپرد کر دے، لیکن ساتھ ہی اسے یقین ہو کہ شیخ جو کچھ کر رہا ہے، ٹھیک ہے اور اگر ان اعمال میں جو بظاہر ٹھیک نظر آرہے

ہیں، یہ سمجھ لے کہ ہو سکتا ہے کہ شیخ غلطی پر ہو تو وہ سر کے بل گرا اور اس کا شمار کاذبین میں سے ہو گا۔

فرمایا: شیخ مرید سے نہ کوئی ظاہری خدمت چاہتا ہے اور نہ روپیہ پیسہ کہ مرید اس پر خرچ کرے اور نہ ہی کوئی بدنی عبادت چاہتا ہے۔ اگر چاہتا ہے تو صرف اتنا کہ وہ یہ عقیدہ رکھے کہ اس کا شیخ کامل اور مُوافق من اللہ ہے۔ اسے معرفت بصیرت اور اللہ کا قرب حاصل ہے اور اس اعتقاد پر خواہ دن گزریں، مہینے گزریں، سال پر سال گزریں، قائم رہے، اگر اس میں یہ اعتقاد پایا گیا تو مرید کو اس سے اور ہر قسم کی خدمت سے فائدہ ہو گا اور اگر اس میں یہ اعتقاد نہ ہو گا یا اگر ہو بھی تو پائیدار نہ ہو پس اگر اس میں وسوسے پیدا ہونے لگیں تو مرید کچھ بھی نہیں۔

ایک روز میں آپ کے ساتھ باب الجدید کے پاس جو فاس کے دروازوں میں سے ایک دروازہ ہے بیٹھا ہوا تھا اور ہمارے ساتھ ایک ایسا آدمی تھا جو حضرت کی بہت خدمت کیا کرتا تھا اور ہر بات میں آپ کا حکم مانتا تھا یہاں تک کہ کوئی اور مرید اس حد تک آپ کی خدمت نہ کرتا تھا۔ حضرت نے اس سے پوچھا کیا تو مجھ سے خالص اللہ کے لیے محبت رکھتا ہے؟ اس نے جواب دیا "جی ہاں" ایسی محبت رکھتا ہوں کہ خالص اللہ کے لیے ہے جس میں نہ ریا ہے نہ شہرت طلبی۔ اس کے یہ الفاظ سن کر مجھے غیرت آگئی۔ حضرت نے کہا: اچھا اگر تو یہ سنے کہ مجھ سے سب کچھ سلب ہو گیا اور میری ذات کے تمام اسرار زائل ہو گئے ہیں کیا تو پھر بھی اس محبت پر قائم رہے گا؟ جواب دیا ہاں۔ پھر حضرت نے کہا کہ اگر لوگ کہیں کہ میں بھنگی یا اسی طرح کا کچھ اور بن گیا ہوں تو کیا تو پھر بھی اپنی محبت پر قائم رہے گا۔ جواب دیا: ہاں۔ پھر فرمایا: اگر لوگ کہیں کہ میں خدا کا نافرمان اور بدکار ہو گیا ہوں پھر بھی تو مجھ سے محبت کرے گا۔ کہنے لگا: ہاں۔ فرمایا: خواہ مجھے اسی حالت پر سال دو سال اور بیس سال تک کیوں نہ گزر جائیں۔ تب بھی؟ کہا: جی ہاں مجھے کسی قسم کا شک و شبہ نہ ہو گا۔

مؤلف کہتا ہے کہ میں نے اسے کہا: بھائی تو یہ نہ کر سکے گا۔

اس پر حضرت نے فرمایا: میں تمہارا امتحان کروں گا۔

(مؤلف کہتا ہے) میں نے اسے کہا: مجھے تو تمہارے حق میں ڈر لگنے لگا ہے۔ ایک اندھا ایک عقلمند و بصیر کے امتحان پر کیسے پورا اتر سکتا ہے۔ لہٰذا تو حضرت سے معافی مانگ اور اپنے عجز و کوتاہی کا اعتراف کرے اور میں تمہارا ساتھ دوں گا۔ چنانچہ ہم نے عجز و انکساری کے ساتھ معافی کی درخواست کی، لیکن جو بات ہونی تھی، وہ ہو چکی تھی اس لیے حضرت نے اسے کام کہا جس میں اس کی

بہتری تھی، لیکن اسے اس کی ظاہری وجہ سمجھ میں نہ آئی اور وہ کام نہ کیا اور حضرت کے متعلق اس کی نیت بدل گئی۔

مولف کہتا ہے کہ اسرارِ خداوندی کا وہی شخص متحمل ہو سکتا ہے جس کی مٹی صحیح ہو، پختہ عقیدے اور نافذ عزم کا مالک ہو۔ شیخ کے سوا کسی کی بات پر کان نہ لگائے اور شیخ کے سوا سب کو مردہ و کالعدم سمجھے۔

اب میں یہاں اس کے متعلق چند حکایات نقل کروں گا تاکہ جو لوگ نفس کی بہتری چاہتے ہیں ان سے عبرت حاصل کریں۔ حکایات بیان کرنے سے پہلے تمہید کے طور پر حضرت کے چند فرمودے نقل کرتا ہوں۔

حضرت نے فرمایا: فتح حاصل ہونے سے پہلے مجھے اونٹ کی شکل کی ایک سیاہ لمبی اور ڈراؤنی صورت دکھائی دیا کرتی تھی۔ صرف ایک بار ایسا ہوا، لیکن جب حق تعالیٰ نے مجھے فتح نصیب کی اور جس قدر عوالم میری قسمت میں تھے میں نے دیکھ لیے تو میں نے اس خوفناک صورت کی تلاش کی کہ کیا اور کس دنیا کی ہے، لیکن مجھے اس کا پتہ نہ چل سکا۔ اس پر میں نے اس کا تذکرہ حضرت محمد بن عبدالکریم رحمہ اللہ سے کیا تو فرمایا: اس صورت کی جنس کا کہیں وجود نہیں ہے۔ میں نے پوچھا پھر میں نے کونسی چیز دیکھی ہے؟ فرمایا: یہ صرف تمہاری روح کا فعل تھا۔ میں نے پھر پوچھا: وہ کیسے؟ فرمایا: جب ذات کسی چیز کو اپنی آنکھوں کے سامنے لاتی ہے اور اسے اس کا یقین ہو جاتا ہے تو روح اس قسم کی صورت موجود کرنے میں اس کی مدد کرتی ہے خواہ اس میں ذات کا نقصان ہی کیوں نہ ہو۔ ذات کے یقین کے سامنے کوئی چیز نہیں ٹھہر سکتی نہ خیر کی جانب میں، نہ شر کی جانب میں۔

حضرت محمد بن عبدالکریم کا پانی پر چلنا

حضرت محمد بن عبدالکریم فرماتے ہیں کہ فتح سے پہلے ایک جگہ سے گزرا تو راستہ میں سمندر آ گیا جسے کشتی کے بغیر عبور نہیں کیا جا سکتا تھا اور یہ سمندر اسی دنیا کا سمندر تھا۔ میرے دل میں پختہ یقین ہو گیا کہ میں اس سمندر پر ڈوبنے اور کپڑے بھیگنے کے بغیر ہی چل سکوں گا۔ اس پر میں نے پانی کی سطح پر پاؤں رکھ کر چلنا شروع کیا اور میرا جزم بڑھتا گیا حتیٰ کہ میں اسے عبور کر کے دوسرے کنارے پر جا پہنچا۔ جب میں پھر اسی طرف آیا، لیکن وہ جزم جاتا رہا تھا، مجھے پانی پر چلنے میں شک ہونے لگا لہٰذا میں نے آزمانے کے لیے پاؤں ڈالا تو وہ ڈوب گیا لہٰذا میں نے پاؤں نکال لیا اور سمجھ گیا کہ میں اس پر چل نہیں سکوں گا۔

حضرت نے فرمایا: جب تک ذات کو کسی بات کا جزم حاصل ہوتا ہے تو شیطان اس کے قریب

نہیں آسکتا شیطان اسی وقت قریب آتا ہے جب جزم جاتا رہتا ہے اور شیطان کو اس کے جانے کا علم ہوتا ہے اس لیے کہ شیطان خون کی طرح انسان کی رگوں میں پھرتا ہے چنانچہ جب وہ دیکھتا ہے کہ جزم جاتا رہا تو وہ اگر وسوسے ڈالنا شروع کر دیتا ہے حتیٰ کہ اس کے ہاتھ سے نیکی نکل جاتی ہے فرمایا: جزم کی مثال شہر کی مضبوط فصیل کی ہے۔ چنانچہ جب تک شہر کی فصیل موجود ہوتی ہے دشمن کو اس کے اندر داخل ہونے کی امید نہیں ہوتی، لیکن جب اس میں رخنے پڑ جائیں اور دروازے اور کشادہ جگہیں ظاہر ہو جائیں تو دشمن فوراً اندر آجاتا ہے اسی لیے شیطان کا عیب اور وسوسہ ذات کی فصیل یعنی جزم کے عیب کا تابع ہے لہٰذا ہر عقلمند کو چاہیئے کہ وہ اپنی ذات کی فصیل کی اصلاح کرنے میں جلدی کرے تاکہ نہ شیطان قریب آسکے اور نہ کوئی انسان بہکا سکے۔

اس قسم کی بات میں نے ایک اور بار حضرت سے سُنی کہ کوئی سچا آدمی کسی سے دنیا یا آخرت کی کسی بات کا وعدہ کرے تو اگر اس شخص کو وعدہ سننے کے وقت وعدہ کے سچّا ہونے کے متعلق اطمینان اور پختہ یقین ہوگا تو یہ اس بات کی علامت ہے کہ یہ چیز اسے یقیناً مل جاتے گی، لیکن اگر وعدہ سنتے وقت وعدہ کی سچائی کے متعلق اسے شک وشبہ ہوگا تو یہ اس بات کی علامت ہے کہ وہ اسے حاصل نہیں کر سکے گا لہٰذا جزم اہل صدق وتحقیق کی نشانی ہے۔ خدا ہمیں اپنے فضل وکرم سے جزم کی حلاوت اور اسرار عطا کرے۔

شیخ عبد العلی کا قصہ

فرمایا: گزشتہ لوگوں میں سے ایک شخص کو جس پر اللہ نے اپنا کرم کرنا چاہا، صالحین سے محبت تھی۔ اللہ نے اس کے دل میں کچھ ایسا خیال ڈال دیا کہ اس نے اپنا مال بیچا اور روپیے کر ایک ایسے شخص کے پاس گیا جو لوگوں میں بزرگ مشہور تھا۔ اطراف واکناف سے لوگ اس کے پاس آتے۔ یہ اللہ کی رحمت پانے والا شخص بھی اپنا سارا مال لے کر اس کی طرف چلا اور اس کے شہر میں آپہنچا۔ اس کے گھر کا پتہ لگا کر آیا۔ دروازہ پر دستک دی تو نوکر نکلا۔ اس نے نام پوچھا تو اس نے اپنا نام عبد العلی بتایا۔ یہ بزرگ جو لوگوں میں ولی مشہور تھے دراصل بہت ہی فاسق وفاجر تھا اس کا ایک ہم پیالہ وہم نوالہ تھا جس کا نام بھی عبد العلی تھا۔ نوکر نے جا کر نام بتلایا تو اس نے اسے اپنا ہم پیالہ وہم نوالہ سمجھا اور نوکر کو کہا کہ اسے آنے دو۔ جب یہ اندر گیا تو سامنے شراب دیکھی اور پاس ایک بدکار عورت بھی تھی۔ اللہ تعالیٰ نے اسے ان سب باتوں سے غفلت عطا فرمائی اور اس نے ان کی طرف توجہ کرنے کی بجائے، آگے بڑھکر عرض کی کہ حضرت میں اپنے وطن سے آپ کی شہرت سنکر حاضر ہوا ہوں کہ آپ مجھے اللہ کی راہ بتائیں اور یہ میرا مال ہے جو خالصۃً لِلّٰہ آپ کو نذر کرنے کے لیے لایا ہوں، شیخ

نے وہ مال لے لیا اور کہا خدا تمہاری خدمت قبول کرے۔ پھر خادمہ کو کہا کہ اسے ایک روٹی دیدو۔ اس نے لی، اور ایک کلہاڑی دے کر حکم دیا کہ فلاں باغ میں جاکر کام کرتے رہو۔ یہ شخص اسی وقت گیا۔ اس کا دل مطمئن اور خوش تھا کہ شیخ نے خدمت میں قبول فرمالیا۔ چنانچہ وہ خوشی خوشی کام کرنے کے لیے روانہ ہوگیا حالانکہ اس سفر سے وہ چور ہو چکا تھا۔ اس کے باوجود اس نے باغ میں پہنچ کر ہی دم لیا اور وہاں بڑی خوشی اور چستی سے کام کرنے لگا۔ اللہ کی تقدیر اور احسان اس شخص پر ایسا ہوا کہ عین اس وقت جب یہ اس مکار و بدکار بزرگ کے پاس پہنچا، اہلِ دیوان میں سے ایک بڑے عارف کے انتقال کا وقت آگیا اور اس وقت اس کے پاس غوث اور باقی ساتوں قطب موجود تھے۔ انھوں نے کہا کہ ہم نے کئی بار تم سے کہا ہے کہ کسی اسلامی شہر میں جاکر اپنا وارث تلاش کرو، لیکن تم نے ہماری بات نہیں مانی۔ اب تمہاری وفات کا وقت آگیا ہے اور تمہارے اسرار ضائع چلے جائیں گے اور تمہارا کوئی وارث نہ ہوگا کہنے لگا۔ بزرگو! اللہ نے میرا وارث یہیں بھیج دیا ہے۔ انھوں نے دریافت کیا کہ وہ کون شخص ہے؟ کہا وہ شخص عبدالعلی جو فلاں بد دین کے پاس آیا ہے۔ ذرا اللہ کے ساتھ حسنِ باطن، کمالِ صدق، راسخ خیال، پختہ ارادہ اور ٹھوس یقین کو تو دیکھو کہ اس نے سب کچھ دیکھا مگر اس کا ارادہ متزلزل نہیں ہوا اور نہ ہی اسے کوئی وسوسہ پیش آیا۔ کیا تم نے اس قسم کی صفائی کبھی سنی بھی ہے؟ کیا تمہیں اتفاق ہے کہ اسے وارث بنا دیا جائے۔ سب نے اس پر اتفاق کیا۔ اس کے بعد ولی کی روح نکل گئی اور حضرت عبدالعلی کو سرِ الٰہی حاصل ہوگیا۔ اللہ تعالیٰ نے اسے اس کی نیک نیتی کی وجہ سے بڑے انعامات سے نوازا اور اسے فتح عطا کی۔ اسے یہ بھی معلوم ہوگیا کہ یہ اللہ کی رحمت کدھر سے آئی اور یہ کہ جس بزرگ کے پاس وہ گیا تھا وہ مکار و بدکار تھا۔ اللہ تعالیٰ نے محض اس کی نیک نیت کی وجہ سے اس پر رحم فرمایا۔ واللہ الموفق۔

ایک اور مرید کا امتحان

فرمایا: ایک بزرگ کا ایک سچا مرید تھا۔ بزرگ نے ایک دن اس کے صدق کا امتحان کرنا چاہا، پوچھا: کیا تمہیں مجھ سے محبت ہے؟ اس نے عرض کیا ہاں ہے۔ پھر پوچھا: تمہیں کس سے زیادہ محبت ہے۔ مجھ سے یا اپنے باپ سے؟ عرض کیا کہ آپ سے زیادہ محبت ہے۔ بزرگ نے پھر کہا بھلا بتاؤ کہ اگر میں تمہیں کہوں اپنے باپ کا سر لاؤ تو کیا تعمیل کروگے عرض کیا کہ کیسے ہو سکتا ہے کہ آپ کا حکم نہ مانوں۔ اسی وقت دیکھ لیں چنانچہ وہ اسی وقت گیا۔ اس وقت لوگ سو چکے تھے۔ وہ گھر کی دیوار پھاند کر چھت پر چڑھا۔ پھر نیچے اتر کر اس کمرے میں آیا جہاں اس کے والدین رہا کرتے تھے۔ دیکھا کہ باپ اس کی ماں سے ہمبستری کر رہا ہے اس نے اتنی مہلت بھی نہ دی کہ وہ

فارغ ہو جائے، لیکن اسی حالت میں اس نے اس کے اوپر گھٹنا رکھ کر اس کا سر کاٹ لیا اور لاکر شیخ کے آگے پھینک دیا۔ شیخ نے کہا: ارے! اپنے باپ کا سر لے آیا ہے؟ عرض کیا: ہاں کیا یہ اسی کا سر نہیں ہے؟ شیخ نے کہا: میں تو ہنسی کر رہا تھا۔ مرید نے عرض کیا، لیکن میرے نزدیک تو آپ کی کسی بات میں ہنسی نہیں ہے۔ اس پر شیخ نے فرمایا: ذرا دیکھو تو سہی کیا یہ تمہارے والد کا سر ہے؟ مرید نے جو دیکھا تو یہ اس کا سر نہ تھا۔ شیخ نے پوچھا تو پھر یہ کس کا سر ہے؟ عرض کیا: فلاں عجمی کا سر ہے۔ حضرت نے فرمایا کہ اس شہر کے لوگ بالعموم سوڈانی غلاموں کی بجائے عجمی کافروں کو گھروں میں خدمت کے لیے رکھتے تھے اور اس مرید کا باپ اس رات گھر میں نہ تھا اور اس کی بیوی نے خاوند سے خیانت کرتے ہوئے اس کافر سے وعدہ کیا تھا اور اپنا نفس اس کے حوالہ کر دیا تھا۔ شیخ کو کشف کے ذریعہ سے معلوم ہو گیا تو اس نے مرید کا امتحان کرنے کی غرض سے اسے اسی حالت میں قتل کرنے کو بھیجا تو اسے چٹان کی طرح راسخ قدم پایا چنانچہ یہی مرید اس شیخ کے سِر کا وارث بنا اور ان کے بعد فتح پر قابض ہوا۔ واللہ الموفق۔

ایک اور سچے مرید کا واقعہ

فرمایا: ایک مرید ایک شیخ عارف کے پاس آیا اور عرض کیا: حضرت مجھے اپنی خدمت میں اللہ واسطے قبول فرمایئے۔ فرمایا: اچھا پھر اسے اپنے پاس رہنے اور خدمت کرنے کو کہا۔ پھر اسے ایک کدال دیا جس کے سرے پر ایک فالتو لوہے کا خول لگا ہوا تھا جس کا کوئی فائدہ نہ تھا۔ یہی مرید شیخ کا وارث بننے والا تھا بشرطیکہ مذکورہ بالا خول کا اسے خیال نہ آتے۔ اگر خیال آ جاتے اور کہنے لگے کہ اس کا کیا فائدہ ہے اور یہ کس کام کے لیے ہے اور سوائے بوجھ کے اس کی کیا غرض ہے؟ تو یہ شیخ کا وارث نہ بنے گا۔ حضرت فرماتے ہیں: یہ مرید سات سال تک اس کدال سے شیخ کی خدمت کرتا رہا، لیکن نہ تو اس کی وسواس کی رگ حرکت میں آئی اور نہ ہی شیطانوں کی تیز ہواؤں نے اسے حرکت دی اور اس کے نزدیک وہ خول بمنزلہ قیام کے تھا کہ نہ اس کی طرف وہ دیکھتا نہ کسی کی بات سنتا۔ یہ ان سچے لوگوں کی حالت ہوتی ہے۔ توفیقِ الٰہی جن کا ہاتھ پکڑتی ہے۔ واللہ الموفق۔

فرمایا: ایک عارف کا ایک سچا مرید تھا اور وہی اس کے سِر کا وارث بننے والا تھا۔ اللہ تعالیٰ نے اُس کے شیخ کی کئی ایک باتیں اسے دکھائیں مگر اس کے باوجود اس کے دل میں کوئی وسوسہ پیدا نہ ہوا جب شیخ کی وفات ہوئی اور اللہ تعالیٰ نے اسے فتح نصیب کی تو اس نے انہی امور کا مشاہدہ کیا اور اسے معلوم ہو گیا کہ شیخ نے جو کچھ کیا تھا درست تھا اور ان میں کوئی غیر شرعی بات نہ تھی۔ اسے صرف شبہ ہوا تھا ان امور میں ایک یہ بات تھی کہ شیخ کے پڑوس میں ایک بدکار عورت رہتی تھی۔ مرید اس عورت کو جانتا

تھا۔ شیخ کی بیوی کی بھی وہی شکل تھی مگر مرید اسے نہیں جانتا تھا۔ شیخ کی ایک خلوت گاہ تھی جو گھر کے دروازہ اور کمروں کے درمیان تھی۔ مرید وہاں تک نہ جایا کرتا تھا۔ صرف دروازے پر کھڑا رہتا۔ اتفاق ایسا ہوا کہ بدکار عورت جبکہ مرید دروازہ پر تھا، مرید کے پاس سے ہوتی ہوئی شیخ کے گھر سے گزر گئی۔ اسی وقت اتفاق ایسا ہوا کہ شیخ کی بیوی اپنے کمرہ سے نکل کر شیخ کے پاس اس کی خلوت گاہ میں چلی گئی۔ شیخ نے اسے ہمبستری کے لیے بلایا تھا۔ شیخ اس کے پاس گئے مرید نے جو خلوت میں نظر ڈالی تو شیخ کو اس سے ہمبستر پایا۔ اسے یقین تھا کہ یہ عورت وہی بدکار عورت ہے مگر اللہ تعالیٰ نے اس کے دل کو مضبوط رکھا اور وہ شیطان کے نرغے میں نہ آیا۔ اس کے بعد عورت نکل کر چلی گئی۔ جب نماز کا وقت آگیا اور شیخ نے نکل کر تیمم کیا کیونکہ وہ بیماری کی وجہ سے غسل نہ کرسکتے تھے تو مرید کو یقین ہوگیا کہ شیخ نے کسی شرعی عذر کے بغیر تیمم کیا ہے مگر پھر بھی اللہ نے مرید کے دل کو مضبوط رکھا۔ پھر ایک مرتبہ شیخ کو سوءِ ہضم کا مرض ہوگیا تو آپ کے لیے فلنیص[1] کا پانی نچوڑ کر لایا گیا۔ عین اس وقت وہی مرید آگیا اور آپ کو وہ پانی پیتا دیکھا اور سمجھا کہ شراب کا پانی پی رہے ہیں مگر اس پر بھی اللہ نے اس کے دل کو مضبوط رکھا اور اسے کوئی وسوسہ پیدا نہ ہوا، مگر بعد میں جب اللہ تعالیٰ نے اسے فتح نصیب کی تو معلوم ہوا کہ شیخ بدکار عورت سے ہمبستر نہیں ہوئے تھے بلکہ اپنی بیوی سے ہوتے تھے اور یہ بھی معلوم ہوا کہ شیخ نے جو تیمم کیا تھا وہ کسی جسمانی بیماری کی وجہ سے کیا تھا۔ نیز یہ کہ جو پانی شیخ نے پیا تھا وہ شراب کا پانی نہ تھا بلکہ فلنیص کا پانی تھا۔ واللہ الموفق۔

فرمایا: ایک مرید کا پیر بھائی تھا۔ اس کا انتقال ہوگیا اور مرید اکیلا رہ گیا اس کا دستور تھا کہ جو کچھ کماتا اس کے دو حصے کرتا۔ ایک حصہ اپنی اولاد کے لیے رکھتا اور دوسرا پیر بھائی کی اولاد کے لیے اس مرید کی اپنے بھائیوں کے ساتھ مشترکہ زمین تھی جسے حکومت نے ظلماً فروخت کر ڈالا۔ جب انہیں اس کی قیمت ادا کی گئی تو مرید کے حصے میں چالیس مثقال آئے۔ بھائیوں نے کہا تو ان پیسوں کو کیا کریگا اس نے جواب دیا کہ میں انہیں اپنے اور اپنے پیر بھائی کی اولاد کے درمیان تقسیم کروں گا۔ انھوں نے اسے احمق کہا کہ تیرے جیسا ناقص العقل شخص ہم نہیں دیکھا۔ ان درہموں سے کوئی ذریعۂ معاش بناؤ۔ فلاں چیز خرید لو یا فلاں فلاں کام کرلو۔ اور اس حماقت کو جس میں تو لگا ہوا ہے چھوڑ دے اس کے نفس نے ان کی باتوں کی طرف مائل ہونا چاہا تو اس نے نفس سے کہا کل قیامت کو جب تو اللہ عزوجل کے سامنے کھڑا

---

[1] مجھے اس کے معنی معلوم ہوسکے۔

ہوگا تو کیا کہے گا۔ اللہ تجھے کہے گا میں نے تجھے چالیس مثقال عطا کئے مگر تو نے اپنے آپ کو ترجیح دیتے ہوئے حق اخوت کو کھو دیا لہٰذا جیسا تو نے حق اخوت کو ضائع کیا تھا، میں تجھے ضائع کروں گا۔ اس پر اللہ نے اسے توفیق دی تو اس نے ان پیسوں کو اپنی اور اپنے پیر بھائی کی اولاد میں تقسیم کر دیا۔ یہ مرید جب اپنے بھائیوں کے پاس سے چلا آیا تو اللہ تعالیٰ نے اسے فتح نصیب کی اور اسے وہ چیزیں عطا کیں جنہیں نہ کسی کی آنکھوں نے دیکھا۔ نہ کانوں نے سنا اور نہ کسی کے دل پر ان کا خیال آیا اور اس کی سچی نیت پکے عزم اور نافذ جزم کی بدولت اسے عارفین میں سے بنایا۔ واللہ الموفق۔

(مؤلف کہتا ہے کہ) میں نے کسی اور سے سنا کہ ایک بزرگ کے چند مرید تھے اور وہ ان میں سے صرف ایک میں شرافت کے آثار پاتا تھا ایک دن اس بزرگ نے ان کا امتحان کرنا چاہا۔ امتحان کرنے پر اسی ایک کے سوا باقی سب بھاگ گئے۔ امتحان یہ تھا کہ مرید آتے گئے یہاں تک کہ وہ اس کے خلوت خانہ کے دروازہ پر سب اکٹھے ہو گئے۔ پھر اس نے ان کو ایک اور عورت کی صورت دکھائی جو آکر شیخ کے خلوت خانہ میں داخل ہو گئی۔ شیخ اُٹھ کر اس عورت کے پاس چلا گیا۔ سب کو یہی خیال ہوا کہ شیخ نے اس سے بدکاری کی ہے۔ اس لیے اس ایک کے سوا باقی سب بھاگ گئے اور ان کی نیت بدل گئی۔ وہ مرید گیا۔ پانی لایا اور اس خیال سے کہ شیخ غسل کریں گے، پانی کو گرم کرنے لگا۔ شیخ نے باہر آکر پوچھا: یہ کیا کر رہے ہو؟ عرض کیا: میں نے عورت کو اندر جاتے دیکھا تھا اس لیے خیال آیا کہ شاید آپ کو غسل کرنے کی ضرورت ہو اس لیے آپ کے لیے پانی گرم کر رہا ہوں۔ شیخ نے کہا: مجھے بدکاری کرتے ہوئے دیکھنے کے باوجود تو میری تابعداری کر رہا ہے؟ عرض کیا: کیسے تابعداری نہ کروں گا جبکہ آپ سے گناہ کا ارتکاب ناممکن نہیں ہے گناہ کا ارتکاب نبیوں سے ناممکن ہے اور میں نے آپ کی تابعداری اس لیے تو نہ کی تھی کہ آپ نبی ہیں جس سے گناہ کا ارتکاب نہ ہوگا۔ آپ سے ملاپ تو میں نے اسی خیال سے کیا تھا کہ آپ بشر ہیں اور طریقِ حق کو مجھ سے بہتر جانتے ہیں۔ طریقِ حق کی معرفت تو اب بھی آپ میں پائی جاتی ہے اور وہ وصف جس سے میں نے آپ کو پہچانا تھا۔ آپ میں بدستور موجود ہے اس لیے میری نیت کیوں بدلے گی اور دل میں وسوسہ کیوں پیدا ہوگا۔ شیخ نے کہا: بیٹا یہ دُنیا تھی جو عورت کی شکل میں آئی تھی اور میں نے عمداً ایسا کیا تھا تاکہ یہ لوگ مجھے چھوڑ کر چلے جائیں۔ بیٹا اب میرے ساتھ خلوت خانہ میں چلو اور دیکھو کوئی عورت نظر آتی ہے۔ چنانچہ اس نے اندر جا کر دیکھا تو کوئی عورت نہ تھی۔ اس کی محبت میں اور اضافہ ہو گیا۔ واللہ الموفق۔

(مولف کہتا ہے کہ) میں نے تاج الدین[1] ذاکر مصری کے شاگرد محی الدین کی کتاب میں پڑھا ہے
کہ ایک شخص ایک بزرگ کے پاس آیا اور کہا کہ میں چاہتا ہوں کہ آپ مجھے وہ سِرّ عطا کریں جس کے ساتھ اللہ
نے آپ کو نوازا ہے۔ شیخ نے کہا: تجھ میں اس کی طاقت نہیں۔ مرید نے کہا: مجھ میں طاقت اور قدرت ہے
شیخ نے ایسا امتحان کیا کہ سر کے بل گرا۔ خدا ہمیں بچائے۔ امتحان یہ تھا کہ مرید کے پاس ایک نوجوان
لڑکا تھا جس کا باپ اکابر شیوخ میں سے تھا۔ جب اس مرید نے دعویٰ کیا کہ میں سِرّ کا متحمل ہونے
کی قدرت رکھتا ہوں تو شیخ نے کہا: اگر اللہ نے چاہا تو تجھے سِرّ عطا کروں گا۔ اس پر اسے اپنے پاس
ٹھہرنے کا حکم دیا اور نوجوان کو ایسی جگہ چھپ جانے کو کہا جہاں سے کسی کو دکھائی نہ دے سکے۔ اس کے
بعد اس نے اپنی خلوت گاہ میں ایک مینڈھا لا کر ذبح کیا اور اس کا خون اپنے کپڑوں پر لگا لیا۔ اس
حالت میں کہ چھری اس کے ہاتھ میں تھی اور خون ہاتھوں پر بہ رہا تھا وہ نکل کر مرید کے پاس آیا۔
اس کے چہرہ سے معلوم ہو رہا تھا کہ وہ غصہ میں ہے۔ مرید نے پوچھا: حضرت کیا بات ہے؟ شیخ نے کہا:
اس نوجوان نے مجھے غصہ دلایا جس سے میں آپے سے باہر ہو گیا اور اس کو ذبح کر ڈالا اور اپنی خلوت گاہ
کی طرف جہاں مینڈھا ذبح کیا تھا، اشارہ کر کے کہا کہ وہ یہاں ذبح کیا ہوا پڑا ہے بیٹا اگر تم سِرّ چاہتے ہو
اسے چھپائے رکھنا اور کسی سے اس کا ذکر نہ کرنا۔ اگر اس کا باپ مجھ سے پوچھے گا تو میں اسے کہہ دونگا
کہ تمہارا بیٹا بیمار ہو کر مر گیا اور وہ میری بات پر یقین کرے گا۔ بیٹا اس معاملہ میں میری مدد کرنا اور
اس پر پردہ ڈالنا۔ اگر تو نے ایسا ہی کیا تو میں تجھے انشاءاللہ سِرّ دوں گا۔ مرید جس کا رنگ اڑ گیا تھا
اور اس نے خیال کیا کہ اب شیخ اس کے قبضے میں ہے اس لیے اظہار غصہ کرتے ہوئے کہا کہ میں کروں گا
اور اس کے طرز گفتگو سے اس کا جھوٹ ظاہر ہو رہا تھا۔ شیخ سے الگ ہوتے ہی وہ شخص سیدھا نوجوان
کے باپ کے پاس گیا اور سارا قصہ سنایا اور کہا کہ وہ جھوٹا شیخ جسے آپ نیک سمجھتے ہیں اس نے آپ کے
بیٹے کو ابھی قتل کیا ہے اور اس نے مجھے اس پر پردہ ڈالنے کو کہا ہے۔ اگر آپ کو اس میں شک ہو تو ابھی

---

[1] تاج الدینؒ ذاکر: ان کا چہرہ نورِ قلب سے روشن تھا۔ ان کے ہر رگ وپے سے معلوم ہوتا تھا کہ یہ
ولی ہیں۔ ان کے شاگرد بھی بہت صاحب جمال و کمال ہوتے ہیں۔ انھوں نے پچیس سال تک زمین سے اپنی
پیٹھ نہیں لگائی۔ وفات کے وقت دس شاگردوں کا نام دیا جنھیں خلافت دی گئی۔ شعرانی نے ان میں سے صرف
تین کے نام دیے ہیں، شہاب الدین وفائی، شیخ ابراہیم اور شیخ عبدالباسط۔ ہو سکتا ہے کہ محی الدین جن کا ذکر
کتاب میں کیا گیا ہے بھی خلفاء میں سے ہوں، ان کی وفات ۹۲۰ھ سے کچھ سال بعد ہوئی۔

میرے ساتھ چلو۔ آپ کا بیٹا خون میں تڑپتا ہوا ملے گا۔ لوگوں نے کہا، تمہارا بُرا ہو۔ حضرت سے ایسا فعل سرزد نہیں ہو سکتا، شاید تمہیں غلطی لگی ہے اس نے کہا: ابھی میرے ساتھ چلو تمہیں میرا جھوٹ اور سچ ظاہر ہو جائے گا۔ لوگوں میں یہ بات پھیل گئی اور ارباب حکومت نے بھی یہ قصّہ سنا، اس پر لوگ دوڑتے ہوئے شیخ کی طرف آئے۔ وہ مرید ان کے آگے آگے آ رہا تھا حتیٰ کہ وہ آکر شیخ کی خلوت گاہ کے پاس کھڑے ہو گئے انھوں نے دستک دی تو شیخ نکل آئے۔ پوچھنے لگے کہ کیا بات ہے؟ تم لوگ کس لیے آئے ہو۔ انھوں نے مرید کی طرف اشارہ کرکے کہا جو کچھ یہ کہہ رہا ہے کیا آپ سُن نہیں رہے ہیں؟ شیخ نے مرید سے کہا: کیا بات ہوئی ہے؟ مرید نے جواب دیا: وہی بات ہوئی ہے جس کے چھپانے کو آپ مجھے کہہ رہے تھے اور جس کا لالچ مجھے دے رہے تھے۔ شیخ نے کہا: میرے تمہارے درمیان تو کوئی بات نہیں ہوئی۔ اور میں نے تو تم سے کوئی بات ہی نہیں کی۔ پھر مرید نے کہا: جھوٹ بولنے سے تو بچ نہیں سکتا۔ تو نے لوگوں کا بچہ قتل کیا ہے، اب ہم تجھے قتل کر ڈالیں گے۔ اے دشمن خدا تو لوگوں کو اپنی عبادت اور خلوت کیساتھ فریب دیتا ہے؟ شیخ نے کہا: آپ اس سے پوچھیں کہ اسے کیسے معلوم ہوا کہ میں نے بچہ کو قتل کر دیا ہے؟ مرید نے کہا: جب آپ باہر نکلے تھے تو کیا خون کے نشان آپ کے ہاتھوں اور کپڑوں پر نہ تھے شیخ نے کہا: تھے مگر میں نے تو بکری ذبح کی تھی۔ مرید نے کہا اگر آپ سچے ہیں تو ہمیں خلوت گاہ میں جانے دیں۔ چنانچہ جب وہ داخل ہوئے تو ایک بکری کو ذبح کیا ہوا پایا۔ مرید نے کہا: آپ نے مقتول کو چھپا کر اس کی جگہ بکری رکھ دی ہے تاکہ اس کے قصاص میں آپ کو نہ قتل کر دیا جائے، شیخ نے کہا: اگر نوجوان صحیح وسلامت نکل آئے تو پھر تو اقرار کرے گا کہ تو ان جھوٹوں میں سے ہے جنھیں نجات حاصل نہ ہوگی۔ مرید نے کہا: اگر آپ سچے ہیں تو اسے نکالیں۔ شیخ نے نوجوان کو بلا بھیجا۔ وہ آیا اور اسے واقعہ کے متعلق کچھ علم نہ تھا۔ جب لوگوں نے نوجوان کو دیکھا تو انھوں نے شیخ کے سامنے عاجزی کی اور اس جھوٹے مرید کو بُرا کہنے لگے۔ اس وقت شیخ نے اسے کہا: اے جھوٹے کیا تجھے اس بات کا دعویٰ نہ تھا کہ تو بھیدوں کے متحمل ہونے کی قابلیت رکھتا ہے۔ جاؤ جو تیر تمہارے جیسے لوگوں کے مناسب ہے وہ ہم نے تمہیں دے دیا۔ اس دن سے جو مرید کی حالت ہوئی وہ عبرتناک تھی اور مدعی کاذب کے لیے ایک عذاب تھی۔ نَسْئَلُ اللّٰہُ بِمَنِّهِ التَّوْفِیْقَ۔

ایک اور شخص سے عجیب واقعہ پیش آیا۔ یہ شخص حاجیوں کے قافلہ کا سردار اور بلادِ عرب کا باشندہ تھا اور صالحین سے ملنے کی کوشش میں لگا رہتا اور اس کوشش میں رہتا کہ کوئی شخص مل جائے جس کے ہاتھوں پر بیعت کرنے سے فائدہ ہو چنانچہ اس کا مشرقی ممالک میں آنا جانا رہتا۔ وہ اسی طلب

جستجو میں رہتا۔ آخر مصر میں اس کی ایک بزرگ سے ملاقات ہوئی اور انھوں نے ایک امانت دے کر فرمایا کہ جو شخص تم سے یہ امانت مانگے بس اسی شخص سے تمہارا مطلب حاصل ہوگا۔ چنانچہ جتنے صالحین کو وہ جانتا تھا ایک ایک کر کے وہ ان کے پاس گیا۔ بالآخر اپنے شہر میں آکر گھر پہنچ گیا۔ کچھ دن گزرنے کے بعد اس کا پڑوسی اسے ملا اور کہا فلاں شخص نے مصر میں جو امانت تجھے دی تھی وہ کہاں ہے؛ اس وقت اس شخص کو علم ہوا کہ ہمسایہ ہی صاحبِ وقت ہے اس لیے ان کے پاؤں پر گر پڑا اور چومنے لگا اور کہا حضرت آپ نے اپنے آپ کو کتنا چھپائے رکھا، میں نے تو مشرق و مغرب کا کوئی بزرگ نہیں چھوڑا جس کے پاس میں نہیں پہنچا اور آپ میرے پڑوسی اور سب سے قریب ہیں (مگر مجھے پتہ نہ چلا) اس کے بعد ان سے سِرِّ الٰہی طلب کیا۔ شیخ نے کہا: اس کی تم میں طاقت نہیں ہے۔ اس نے کہا: حضرت میں اس کی طاقت رکھتا ہوں۔ پڑوسی نے کہا: اگر تم اس کی طاقت رکھتے ہو تو ایک شرط ہے اور وہ بھی معمولی سی کہ اس میں تمہارا کوئی زیادہ نقصان بھی نہیں ہے۔ وہ یہ کہ اپنی اس لمبی داڑھی کو منڈوا ڈالو۔ اس نے کہا: حضرت بھلا یہ کیسے ہو سکتا ہے اسی کی وجہ سے تو لوگ بلادِ مشرق میں مجھ سے ڈرتے اور میری تعظیم کرتے ہیں۔ شیخ نے کہا: اگر سِر چاہتا ہے تو تجھے جو میں کہتا ہوں کرنا پڑے گا۔ کہنے لگا حضرت میں یہ نہیں کر سکتا۔ حضرت نے کہا: اب میرا کوئی قصور نہیں ہے کیونکہ تو میری شرط قبول ہی نہیں کرتا اور وہ اسے چھوڑ کر چلے گئے۔ شیخ کے مرنے پر جب اس نے دیکھا کہ میں کس قدر بڑی چیز کھو بیٹھا ہوں تو اسے ندامت ہوئی اور کہنے لگا اگر جیسے مجھے آج عقل آئی ہے اسی طرح شیخ کی زندگی میں آتی تو جو کچھ انھوں نے کہا تھا اس پر عمل کرتا بلکہ اس سے بھی زیادہ کرتا۔

میں نے ایک معتبر آدمی سے سنا جو آنحضرت صلّی اللہ علیہ وسلم کا دیدار بیداری میں کیا کرتا تھا اور فاس میں بیٹھے ہوئے مدینہ منورہ کی خوشبو سونگھا کرتا تھا کہ انھوں نے شہر فاس میں جامع اندلس میں ایک ولی کے ساتھ رات گزاری۔ جب وہ جمعہ کی نماز پڑھ چکے اور مسجد سے باہر آئے تو دیکھا کہ ایک شخص ولی کے ہاتھ چوم رہا ہے اور کہہ رہا ہے کہ حضرت مجھے آپ سے اللہ واسطے کی محبت ہے اس ولی نے اسے بُری طرح سے دیکھا اور کہا کیا تجھے معلوم نہیں کہ اللہ تعالیٰ راز بلکہ اس سے بھی زیادہ چھپی ہوئی باتیں جانتا ہے ان کا مطلب یہ تھا کہ تو نے اللہ کے علم اور اس کے حسنِ جزا پر اس معاملہ کو کیوں نہ چھوڑا۔ اس کے بعد ولی چلا گیا اور اس شخص نے ولی کے الفاظ سنکر رونا شروع کر دیا۔ انھوں نے آگے بڑھکر اسے کہا تو نے تو ایک بہت بڑی چیز کا دعویٰ کیا ہے اب شیخ ضرور تمہارا امتحان کریں گے لہٰذا مرد بننا ورنہ ہمیشہ کے لیے جدائی ہو جائیگی فرمانے لگے کہ وہ شخص ولی کے باغ کے پاس ہی رہتا تھا شیخ کے باغ کی حد کے اندر ایک انجیر کا درخت

تھا جس کا پھل ہر سال یہ شخص توڑ لیا کرتا تھا مگر شیخ پڑوس کا لحاظ رکھتے ہوئے صبر کرتے اور اس سے درگزر کرتے، لیکن جب اس نے محبت کا دعوےٰ کیا تو شیخ نے صبر و تحمل کو ترک کر کے کہا کہ یہ درخت تو میرا ہے اس میں تمہارا کوئی حق نہیں ہے۔ مدعیٔ محبت نے انکار کیا اور کہا کہ درخت تو میرا ہے۔ اس پر شیخ نے سنجیدگی سے اس سے جھگڑنا شروع کر دیا یہاں تک کہ اس مدعی نے انکو گالیاں بھی دیں۔

اسی بزرگ کو میں نے یہ کہتے سنا کہ ہم حج کے لیے گئے اور زیارتِ قبرِ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے پہنچے تو مجھ پر ایک حالت طاری ہوگئی اور میں نے کہا: یارسول اللہ میرا گمان نہ تھا کہ آپ کے شہر میں پہنچ کر پھر فاس واپس چلا جاؤں گا۔ اس پر قبرِ شریف سے آواز آئی کہ اگر میں قبر کے اندر بند ہوں تب تو جو آئے وہ یہیں رہ پڑے اور اگر میں اپنی امت کے ساتھ ہوں جہاں کہیں بھی وہ ہو تو تمہیں اپنے وطن واپس چلا جانا چاہیئے یہ سنکر میں اپنے وطن کو لوٹ آیا۔ واللہ تعالیٰ الموفق۔

ایک مجذوب کا قصہ

حضرت کو میں نے کہتے سنا کہ ایک مجذوب تھے جو قصداً مخالفِ شرع کام کیا کرتے تاکہ لوگ ان سے بھاگ جائیں، چنانچہ انھوں نے ایک دن اپنے کپڑوں پر شراب ڈال لی۔ لوگ شراب کی بو سونگھ کر ان سے بھاگ جاتے اور سوائے ایک شخص کے جو ان کے تخم کا وارث بنا سب بھاگ گئے۔ مجذوب نے کہا: میں نے قصداً ایسا کیا تھا تاکہ یہ چیونٹیاں بھاگ جائیں۔ چیونٹیوں سے آپ کی مراد وہی لوگ تھے جو آپ کے پیچھے پیچھے آیا کرتے تھے مجھے ان لوگوں کی ضرورت نہیں ہے، مجھے تو صرف تمہاری ضرورت ہے واللہ الموفق۔

حضرت نے فرمایا: ایک شخص ایک ولی کے پاس آیا اور اس نے انہیں سر سے پاؤں تک خوب غور سے دیکھنا شروع کیا۔ ولی نے کہا تمہارا اس سے کیا مطلب ہے؟ عرض کیا: حضرت مجھے بس یہی غنیمت ہے۔ میرا مطلب یہ تھا کہ آپ کو اچھی طرح سے دیکھ لوں تاکہ کل کو اللہ کے دربار میں آپ میری سفارش فرمائیں پھر حضرت نے فرمایا کہ اس شخص کو اس سے بہت بڑا فائدہ ہوا۔ حضرت جب کبھی اس حکایت کا ذکر فرماتے تو کہا کرتے بحمد اللہ ابھی اس امت میں لوگ باقی ہیں۔ واللہ الموفق۔

فرمایا: ایک سچا طالب، ایک بزرگ کے پاس آیا اور کہا مجھے آپ سے للہ محبت ہے اس وقت صبح کی نماز کا وقت تھا۔ بزرگ نے کہا: اگر تو کچھ حاصل کرنا چاہتا ہے تو گھر واپس نہ جاؤ۔ مشرقی ممالک کو چلے جاؤ۔ اس شخص نے بزرگ کے کہنے پر عمل کیا اور دنیا و آخرت کا نفع پایا۔ واللہ الموفق۔

اولیاء اللہ کے سوانح نگاروں نے بہت نقصان پہنچایا ہے

حضرت نے فرمایا کہ جن لوگوں نے کراماتِ اولیاء کے متعلق کتابیں تالیف کی ہیں اگرچہ انھوں نے لوگوں کو اولیاء کی پہچان بتا دینے سے ان کو فائدہ پہنچایا ہے مگر انھوں نے بہت سا نقصان بھی پہنچایا ہے اس لیے کہ انھوں نے ان کی صرف کرامات ہی کا ذکر کیا ہے اور ان امور فانیہ کا ذکر نہیں کیا جو ان سے واقع ہوتے ہیں چنانچہ ان کی کتابوں کا مطالعہ کرنے والا جب کرامات در کرامات، تصرف در تصرف اور کشف دیکھتا ہے تو خیال کر لیتا ہے کہ ولی جس چیز کا بھی اس سے مطالبہ کیا جائے اسے پورا کرنے سے عاجز نہیں ہوتا اور اس سے کوئی بھی مخالفِ شرع بات خواہ بظاہر ہی کیوں نہ ہو واقع نہیں ہوتی۔ اس لیے وہ بڑی جہالت میں پڑ جاتا ہے اس لیے وہ یہ گمان کرنے لگ جاتا ہے کہ ولی میں ایک خداوندی وصف پایا جاتا ہے کہ وہ کسی چیز کے کرنے سے عاجز نہیں جو چاہے کرتا ہے اور ایک وصف نبوت کا پایا جاتا ہے یعنی معصوم ہونے کا۔ حالانکہ پہلا وصف محض خدا کا وصف ہے جو اولیاء کا تو ذکر ہی کیا بڑے بڑے نبیوں کو بھی عطا نہیں کیا گیا چنانچہ اللہ نے اپنے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے فرمایا: لَيْسَ لَكَ مِنَ الْأَمْرِ شَيْءٌ أَوْ يَتُوبَ عَلَيْهِمْ أَوْ يُعَذِّبَهُمْ فَإِنَّهُمْ ظَالِمُونَ ۝ (سورہ آل عمران آیت: ۱۲۸) اے محمد تمہارا اس میں کچھ اختیار نہیں، یا خدا انہیں معاف کر دے یا عذاب دے اس لیے کہ وہ ظالم ہیں (سورۂ آل عمران: رکوع ۱۳) پھر فرمایا: إِنَّكَ لَا تَهْدِي مَنْ أَحْبَبْتَ وَلَٰكِنَّ اللَّهَ يَهْدِي مَنْ يَشَاءُ (آپ جسے چاہیں ہدایت نہیں کر سکتے مگر اللہ جسے چاہے ہدایت کرے) سورۂ قصص آیت: ۵۶) مزید برآں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں: میں نے اللہ تعالیٰ سے دو چیزیں مانگیں جو مجھے عطا کر دی گئیں دو اور مانگیں مگر نہ دی گئیں۔ اس طرح کہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: قُلْ هُوَ الْقَادِرُ عَلَىٰ أَنْ يَبْعَثَ عَلَيْكُمْ عَذَابًا مِنْ فَوْقِكُمْ (سورہ انعام آیت ۶۵) اے نبی انہیں کہہ دے کہ اللہ تمہارے اوپر سے تم پر عذاب بھیجنے پر قادر ہے) میں نے کہا: اے اللہ میں تمہاری ذات کریمی سے پناہ کا طالب ہوں۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: میں نے پناہ دے دی۔ پھر فرمایا: أَوْ مِنْ تَحْتِ أَرْجُلِكُمْ (یا تمہارے پاؤں کے نیچے سے) میں نے پھر کہا: اللہ میں تمہاری ذات کے ساتھ پناہ لیتا ہوں۔ اللہ نے فرمایا: میں نے دیدی پھر ارشاد ہوا: أَوْ يَلْبِسَكُمْ شِيَعًا (یا تمہیں فرقہ فرقہ کر دے) میں نے عرض کیا: خدایا تمہاری ذات کی پناہ چاہتا ہوں۔ فرمایا: پہلے مقدر ہو چکا اور فرمایا وَيُذِيقَ بَعْضَكُمْ بَأْسَ بَعْضٍ (تم کو ایک دوسرے کی لڑائی کا مزہ چکھاتے) میں نے کہا: خدا تمہاری ذات کی پناہ چاہتا ہوں، فرمایا: پہلے مقدر ہو چکا۔

(حاشیہ اگلے صفحہ پر)

جب نوح علیہ السلام نے اپنے بیٹے کو بچانے کی دعا کی تو حق تعالیٰ نے فرمایا: یٰنُوْحُ اِنَّہٗ لَیْسَ مِنْ اَھْلِكَ اِنَّہٗ عَمَلٌ غَیْرُ صَالِحٍ فَلَا تَسْئَلْنِ مَا لَیْسَ لَكَ بِہٖ عِلْمٌ اِنِّیْٓ اَعِظُكَ اَنْ تَكُوْنَ مِنَ الْجٰھِلِیْنَ۔ (سورۂ ہود آیت: ۴۶) (اے نوح وہ تمہارے اہل میں شامل نہیں ہے اس لیے کہ اس کے اعمال اچھے نہیں ہیں لہٰذا جس بات کا تمہیں علم نہیں اس کے متعلق درخواست نہ کرو، میں نصیحت کرتا ہوں کہ تم جاہلوں میں سے نہ بنو) نیز فرمایا: وَضَرَبَ اللہُ مَثَلًا لِّلَّذِیْنَ كَفَرُوا امْرَاَتَ نُوْحٍ وَّامْرَاَتَ لُوْطٍ كَانَتَا تَحْتَ عَبْدَیْنِ مِنْ عِبَادِنَا صَالِحَیْنِ فَخَانَتٰھُمَا فَلَمْ یُغْنِیَا عَنْھُمَا مِنَ اللہِ شَیْئًا۔ (سورۂ تحریم آیت: ۱۰ تا ۱۲) اور اللہ تعالیٰ نے کافرین کے لیے نوح علیہ السلام اور لوط علیہ السلام کی بیویوں کی مثال بیان کی۔ یہ دونو ہمارے دو نیک بندوں کی بیویاں تھیں مگر انھوں نے ان سے خیانت کی اور وہ دونوں نبی ان بیویوں کو اللہ کے عذاب سے نہ بچا سکے، لیکن آج لوگوں کا یہ حال ہے کہ اگر دیکھیں کہ کسی ولی کی دعا قبول نہیں ہوئی یا دیکھیں کہ اس کا لڑکا کسی اور طریق پر ہے یا اس کی بیوی متقی نہیں ہے تو کہتے ہیں کہ یہ ولی نہیں ہے کیونکہ اگر ولی ہوتا تو اللہ اس کی دعا قبول کرتا یا یہ کہ اگر ولی ہوتا تو اپنے گھر والوں کی اصلاح کرتا۔ ان لوگوں کا خیال ہے کہ ولی اوروں کی اصلاح کر سکتا ہے حالانکہ وہ تو اپنی بھی اصلاح نہیں کر سکتا۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: وَلَوْلَا فَضْلُ اللہِ عَلَیْكُمْ وَرَحْمَتُہٗ مَا زَكٰی مِنْكُمْ مِّنْ اَحَدٍ وَّلٰكِنَّ اللہَ یُزَكِّیْ مَنْ یَّشَآءُ (اور اگر تم پر اللہ کا فضل و رحمت نہ ہو تو تم میں سے کوئی ایک بھی کبھی بھی پاک نہیں ہو سکتا، لیکن اللہ جس کو چاہے پاک بنا دے) (سورہ نور آیت: ۲۱)

ولی معصوم نہیں ہوتا دوسری[1] بات معصوم ہونا ہے اور یہ وصف انبیا کے ساتھ مخصوص ہے، ولایت کبھی نبوت کے برابر نہیں ہو سکتی۔ ولی کے ہاتھ پر جو خیر و برکت ظاہر ہوتی ہے وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی برکت ہی کی بدولت ہوتی ہے اس لیے کہ ایمان جو اس

(حاشیہ صفحہ سابقہ)

[1] سورہ انعام پارہ ۷، آیت ۶۵) نیز ملاحظہ ہو تفسیر معالم التنزیل اور خازن تحت آیت مذکورہ جلد ۲ صفحہ ۱۱۹ مگر وہاں یہ آیا ہے کہ دو چیزیں دیں اور ایک نہ دی ۱۲ ۔

---

[1] امام عبدالکریم قشیری نے اپنے رسالہ (الرسالۃ القشیریہ: ۱۷۵) میں لکھا ہے۔ اگر کوئی یہ سوال کرے کہ آیا ولی معصوم ہوتا ہے تو اس کا جواب یہ ہے کہ اگر ان کا معصوم ہونا اسی طرح کا ہو جس طرح انبیاء کا معصوم ہونا تو اس صورت میں ولی معصوم نہیں، ہاں یہ ہو سکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ ولی کو محفوظ رکھے تاکہ وہ گناہ پر مُصر نہ رہے۔

خیر و برکت کا سبب ہے وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے واسطہ سے ہی اس تک پہنچا ہے ولی کی ذات تو عام لوگوں کی طرح ہوتی ہے برخلاف انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام کی ذات کے کہ وہ پیدائشی معصوم اور معرفتِ الٰہیہ اور تقویٰ پر پیدا کئے گئے ہوتے ہیں چنانچہ وہ نہ تو کسی شریعت اور نہ ہی کسی استاد کے محتاج ہوتے ہیں کہ اس سے استفادہ کریں۔ جو حق ان کی ذات میں سرایت کر چکا ہوتا ہے یعنی حرفِ نبوت جس پر ان کی تخلیق ہوئی ہوتی ہے انہیں سیدھے راستہ پر چلائے رکھتا ہے اور اگر جن لوگوں نے کرامات اولیاء میں کتابیں تالیف کی ہیں۔ اس ولی کی حالت کی بھی تشریح کر دیتے جن کے متعلق وہ کتاب لکھی گئی ہے اور اس میں ان امور باقیہ صالحہ اور امورِ فانیہ کا بھی ذکر کر دیتے جو انہیں فتح کے بعد پیش آئے تو لوگ ان اولیاء کی حقیقت سمجھ جاتے اور ان کو معلوم ہو جاتا کہ کبھی ولی کی دعا مستجاب ہوتی ہے اور کبھی مستجاب نہیں ہوتی کبھی کسی بات کا ارادہ کرتا ہے تو وہ پوری ہو جاتی ہے اور کبھی نہیں ہوتی جیسا کہ انبیاء کرام علیہم الصلوٰۃ والسلام کے ساتھ پیش آیا۔ ولی میں ایک اور بات بھی ہوتی ہے کہ کبھی اس کے ظاہری اعضاء سے اطاعت کا ظہور ہوتا ہے اور کبھی مخالفت کا جس طرح کہ عام لوگوں کا حال ہے۔ البتہ ولی عوام سے ایک بات میں ممتاز ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اسے معرفت عطا کی ہوتی ہے اور فتوحات نصیب فرماتے ہوتے ہیں۔ لہٰذا ان امور کے ہوتے ہوتے اگر اس سے مخالفت کا ظہور ہوتا ہے تو یہ محض ظاہری صورت میں ہوتا ہے۔ درحقیقت یہ مخالفت نہیں ہوتی اس لیے کہ جو مشاہدہ اسے حاصل ہوتا ہے وہ مخالفت نہیں ہونے دیتا اور گناہ سے ایک حد تک روکتا ہے کہ یہ ولی معصومیت کے درجہ تک نہیں پہنچ سکتا، ورنہ نبوت اور ولایت یکساں ہو جائیں۔ اس لیے کہ معصیت سے رکنا انبیاء کا ذاتی وصف ہے مگر اولیاء میں عارضی اور خارجی وصف ہے چنانچہ اولیاء میں اس کا زائل ہو جانا ممکن ہے اور انبیاء میں ممکن نہیں۔ اس کا راز وہی ہے جسے ہم بیان کر چکے کہ انبیاء کی خیر و خوبی ان کی اپنی ذات سے ہوتی ہے اور ولیوں کی خیر و خوبی ان کی اپنی ذات کی طرف سے نہیں ہوتی۔ اس لیے انبیاء کی عصمت ذاتی ہوئی اور اولیاء کی عصمت عرضی۔ لہٰذا اگر عارفِ کامل سے مخالفت ہو گی تو ظاہری صورت میں ہو گی۔ درحقیقت نہیں۔ اس کا مقصد مشاہدہ کرنے والوں کا امتحان ہو گا۔ ان ظاہری مخالفتوں میں بھی راز ہوتا ہے ہماری اللہ کی بارگاہ میں درخواست ہے کہ ہمیں اپنے ولیوں پر ایمان رکھنے کی توفیق دے جس طرح اپنے نبیوں پر ایمان رکھنے کی دی ہے۔

نیز فرمایا: جس شخص کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے کھانے پینے، سونے، بیدار ہونے اور گھر کے تمام

حالات کی خبر ہو اور اسے جنگوں اور غزوات میں آپ کی حالت کا بھی علم ہو کہ کبھی آپ کی فتح ہوتی تھی تو کبھی دوسرے فریق کی اور اسے یہ بھی معلوم ہو کہ کس طرح کافر لوگ آپ کے پاس یہ درخواست لیکر آئے کہ صحابہ کو ان کے ساتھ بھیجا جائے پھر کافر انہیں لے جاکر ان سے بدعہدی کرتے ہیں جیسے غزوہ ذات الرجیع اور غزوہ بئرِ معونہ میں واقع ہوا اور پھر اسے یہ بھی معلوم ہو کہ واقعہ حدیبیہ میں کیا پیش آیا وغیرہ وغیرہ۔ ان تمام امور میں خداوندی راز ہیں جن کی اطلاع اللہ تعالیٰ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو دے دی تھی تو اس کے لیے اولیاء اللہ کی معرفت آسان ہو جائے گی اور جو امورِ فانیہ اور بشری اوصاف ان سے صادر ہوتے ہیں انہیں دیکھ کر اسے تعجب نہ ہوگا لہٰذا جو عقلمند نیکی اور نیک لوگوں سے محبت رکھتا ہے اسے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سیرت کا مطالعہ کرنا چاہیئے کیونکہ اس سے اسے اولیاء کی معرفت حاصل ہوگی اور ان کی کسی بات کا سمجھنا اس کے لیے مشکل نہ ہوگا۔ قلم کی اسی قدر طاقت تھی کہ بیان کر سکے۔ اس سے زائد احاطہ تحریر سے باہر ہے۔ سمجھدار اور عقلمند کے لیے اشارہ ہی کافی ہے، واللہ الموفق۔

حضرت نے فرمایا: ایک شخص دور و دراز علاقہ میں کسی ولی کے متعلق سنتا ہے اور اپنے دل میں اس کی ایسی تصویر بنا لیتا ہے جو ان کرامات کے مطابق ہو جنہیں لوگ نقل کرتے ہیں، لیکن جب اسس ذہنی تصویر کے مطابق اسے نہیں پاتا تو اسے شک گزرتا ہے کہ آیا یہ وہی ولی ہے یا کوئی اور۔ اس کے بعد حضرت نے بیان کیا کہ الجزائر کے ایک شخص نے سنا کہ فاس میں ایک ولی ہے۔ لوگوں نے اس کی بہت سی کرامات بیان کیں۔ اس نے اپنے ذہن میں سمجھا کہ وہ ایک بڑا شیخ ہوگا جس کی بڑی ہیبت اور رُعب ہوگا۔ اس سے فیضان حاصل کرنے کی غرض سے وہ گھر سے نکلا۔ فاس پہنچ کر اس نے اس ولی کا گھر دریافت کیا۔ لوگوں نے بتا دیا، اس کا خیال تھا کہ ولی کے دروازے پر دربان کھڑے ہوں گے، اس نے دستک دی تو خود ولی نکل کر آیا۔ اس آنے والے نے یہ سمجھ کر کہ یہ دربان ہوگا اسے کہا کہ جناب میری التجا ہے کہ آپ حضرت سے میرے متعلق مشورہ کریں کہ میں حاضر ہو جاؤں، یا نہ۔
ولی نے کہا: میں ہی وہ شخص ہوں جس کے ارادے سے تو گھر سے نکلا ہے اور جس کے پاس تو ایک ماہ یا اس سے بھی زیادہ کی مسافت طے کر کے آیا ہے، لیکن جب اس نے ولی کو دیکھا اور اس میں ظاہری بزرگی کی کوئی علامت نہ پائی تو کہا: جناب میں ایک اجنبی شخص ہوں اور حضرت کے پاس بہت شوق لے کر آیا ہوں۔ آپ پر اللہ کی رحمت ہو مجھے حضرت تک پہنچا دو۔ اس پر ولی نے کہا: مَیں ہی تو ہوں جسے تو چاہتا ہے۔ طالب نے پھر کہا کہ میں آپ سے کہہ رہا ہوں کہ میں ایک اجنبی ہوں اور آپ سے

درخواست کی ہے کہ آپ مجھے حضرت تک پہنچا دیں مگر آپ مجھ سے مذاق کیے جاتے ہیں ولی نے کہا اگر میں تم سے مذاق کروں تو مجھ سے اللہ ہی سمجھے۔ طالب نے کہا اللہ تجھے سمجھے اور چونکہ اس نے اس شکل میں نہ پایا تھا جو اس کے ذہن میں تھی اس لیے وہ واپس چلا آیا۔

مولّف کہتا ہے: بہت سے لوگ اسی سبب سے گر گئے کیونکہ جب وہ ان کتابوں کا مطالعہ کرتے ہیں جو اولیاء کی کرامات کے متعلق لکھی گئیں تو اپنے ذہن میں ولی کی وہ تصویر بنا لیتے ہیں جو انھوں نے کتابوں میں پڑھی ہوتی ہے، مگر جب اس صورت کا اپنے زمانہ کے اولیاء کے ساتھ موازنہ کرتا ہے اور ان میں وہ اوصاف پاتا ہے جن کا ذکر کتابوں میں نہیں کیا جاتا تو اسے ان سب کے متعلق شک گزرتا ہے۔ جن اولیاء کے متعلق یہ کتابیں لکھی گئیں اگر یہ انہیں ان کتابوں کی تدوین سے پہلے دیکھ لیتا تو ان میں بھی وہی اوصاف پاتا جنہیں اس نے اپنے زمانہ کے اولیاء میں ناپسند کیا ہے۔ بعض لوگوں میں جہالت اس حد تک پہنچ جاتی ہے کہ وہ اس بات کا ہی انکار کر دیتے ہیں کہ اب کوئی ولی موجود ہی نہیں۔ اس لیے کہ وہ اپنے دل میں یہ بات بٹھائے ہوتے ہیں کہ ولایت کے لیے چند شرائط و ضوابط ہیں جس میں وہ نہ پائے جائیں وہ ولی ہی نہیں۔ لہٰذا جب وہ ان ضوابط کو اپنے زمانہ کے ولی پر منطبق کرتے ہیں تو اسے ان کے مطابق نہیں پاتے اور وہ اسے ولی نہیں سمجھتے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ ایک ایسے کلی ولی پر ایمان رکھتے ہیں جس کا خارج میں کوئی وجود نہیں ہوتا۔ حالانکہ انھیں معلوم ہونا چاہیئے کہ ولایت کا مطلب صرف یہ ہے کہ فلاں بندے کو اللہ تعالیٰ نے منتخب کر لیا اور اس انتخاب خداوندی کے لیے کوئی انسان ضابطہ مقرر نہیں کر سکتا (اسی لیے تو ولایت بھی کسبی نہیں۔ وہبی چیز ہے۔ اللہ نے جس پر چاہا اپنی عنایت کر دی)

مؤلّف کتاب کا ایک فقیہ کے ساتھ مناظرہ

مجھے اپنے ایک ہمعصر فقیہ کے ساتھ اسی قسم کا ایک واقعہ پیش آیا۔ اس طرح کہ وہ کسی کی ایک کتاب لے کر میرے پاس آیا جس میں مصنف نے ولایت کی شرائط اور ضوابط لکھے تھے اور یہ بھی لکھا تھا کہ جو ولی لوگوں کا پیر بنے اسے کیسے ہونا چاہیئے۔ اس فقیہ نے مجھ سے کہا میں چاہتا ہوں کہ جو کچھ اس کتاب میں ولایت اور ولی کی شرائط کے متعلق لکھا ہے آپ مجھ سے سنیں۔ میں اس کا اشارہ سمجھ گیا تھا کہ اس کا مقصد ان لوگوں کی ولایت سے انکار کرنا تھا جنہیں لوگ ولی کہتے ہیں۔ لہٰذا اس نے مجھے کتاب کا مضمون پڑھ کر سنانا چاہا اور اس کے دل میں یہ خیال تھا کہ اگر میں ان شرائط کو تسلیم کر لوں تب وہ مجھ سے بات منوائے کہ اب کوئی ولی نہیں رہا، میں نے اسے کہا کہ کتاب پڑھ کر سنانے سے پہلے

مجھے اس کا جواب دو۔ جواب دینے کے بعد جو تمہارا دل چاہے سنانا، کیا اس کتاب کے مؤلف نے تمام خزانوں، عنایات اور اللہ کے بڑے ملک کا احاطہ کرلیا ہے یا مؤلف کا یہی حال ہے جیسا کہ حضرت خضرؑ نے حضرت موسیٰ سے کہا تھا کہ میرے اور تمہارے علم نے اللہ کے علم میں سے صرف اتنا کم کیا ہے جسقدر چڑیا نے سمندر میں سے گھونٹ بھرنے سے۔ اگر آپ کہیں کہ مؤلف نے اللہ کے ملک اور خزانوں کا احاطہ کرلیا ہے تو پھر پڑھیں، میں سنوں گا۔

فقیہ نے کہا: معاذ اللہ میں یہ کیسے کہہ سکتا ہوں؟

اور اگر آپ کہیں کہ مؤلف کا علم اتنا ہی ہے جس کا ذکر خضرؑ نے موسیٰ علیہ السلام سے کیا تھا تو اسکے لیے خاموش رہنا ہی بہتر ہے کیونکہ اس کی مثال ایک چیونٹی کی ہے جو ایک چھوٹے سے غار میں رہتی ہو اور جب باہر نکلے تو اسے گندم کا ایک دانہ مل جائے جس سے اسے بہت خوشی ہو اور اسے اٹھا کر وہ اپنے گھر لے جائے پھر خوشی کے مارے وہ شور مچانا شروع کردے کہ پناہ ہے تو میرے پاس ہے اور میری حالت سے اچھی کوئی اور حالت نہیں ہو سکتی۔ پھر میں نے کہا: یہ چیونٹی تو اپنے حلق کو تھکائے گی اور اپنے دماغ کو بے فائدہ تکلیف دے گی۔ کیونکہ جس کا علم اللہ کے علم کے مقابلہ میں سمندر سے چیونٹی کے گھونٹ بھرنے جتنا ہو اس کے لیے کیونکر مناسب ہو سکتا ہے کہ مولیٰ کریم پر قطعی حکم لگا دے اور کہے کہ وہ فلاں پر رحم نہیں کرے گا اور فلاں کو فتح نصیب نہیں کرے گا اور فلاں ولی نہیں اور فلاں ولایت کے ضوابط پر پورا نہیں اترتا۔ جب اللہ تعالیٰ ایک کافر پر رحم فرما کر اسے ایمان عطا کرسکتے اور پھر ایک لحظہ میں فتح نصیب کرسکتے ہیں۔ پھر بتاؤ کہ ولایت کا کونسا ضابطہ رہ گیا؟ (کیونکہ اس کافر نے جو ابھی ایمان لایا ہو نہ ریاضت کی ہے اور نہ عبادت) اور کوئی شخص تجھے دنیوی بادشاہ کے کے متعلق جو لوگوں کا مولیٰ بنا ہوا ہے کہے کہ اس نے اپنے فلاں غلام کو مالا مال کر دیا اور فلاں شریف زادے کو کچھ نہیں دیا اور فلاں یہودی کو فلاں فلاں خلعت عطا کی تو تو اسے بعید از قیاس نہ سمجھے گا کیونکہ تو جانتا ہے کہ اس کے ملک میں اس پر کوئی اعتراض کرنے والا نہیں ہے۔ جب دنیاوی بادشاہ کے متعلق تمہارا یہ عقیدہ ہے تو پھر تو اپنے بنائے ہوئے قواعد وضوابط سے خدائے قدیم کو کیسے روک سکتا ہے جبکہ تمہارا یہ عقیدہ بھی ہے کہ وہ فَعَّالٌ لِّمَا يُرِيدُ (جو چاہتا ہے، کرتا ہے) وَإِنَّهُ غَالِبٌ عَلَىٰ أَمْرِهِ (اسے اپنے امور پر پوری قدرت ہے)

یہ سنکر فقیہ نے جواب دیا: جو کچھ آپ نے فرمایا درست ہے۔ خدا کی قسم یہ سچ ہے اور اپنی کتاب کو بند کر دیا اور کہا اگر ہم کہیں کہ ان مؤلفین کو اللہ کے علم پر پورا عبور ہے تو یہ ایک

بہت ہی بُرا عقیدہ ہوگا اور اگر کہیں کہ انہیں بہت ہی کم باتوں کا علم ہے تو ہمارے لیے مناسب نہیں کہ ان موتفین کے بنائے ہوئے قواعد کی رُو سے اللہ پر پابندی لگا دیں لہٰذا اگر یہ لوگ خاموش رہتے تو ان کے لیے بہتر تھا۔ ہدایت یافتہ وہی شخص ہے جسے خدا ہدایت کرے۔ ان قواعد وضوابط کے بننے سے پہلے بہت سے لوگ ہدایت پا چکے ہیں۔ واللہ الموفق۔

ایک اور درویش کے ساتھ جو اپنے آپ کو صالحین کا خادم کہا کرتا تھا میرا مناظرہ ہوا۔ ہم دونوں ایک ولی کے پاس اکثر آتے جاتے تھے ان کی وفات پر میں ایک دوسرے ولی کے پاس جانے لگ گیا مگر وہ پہلے ولی کی خانقاہ پر ہی رہا۔ ایک دن مجھے ملا اور کہنے لگا: میں تجھے ایک نصیحت کرنا چاہتا ہوں،

میں نے کہا بسر وچشم، اور میں اس کا مطلب سمجھ گیا۔ کہنے لگا: پہلے تو فلاں بزرگ کے پاس تھا جن کی ولایت میں کسی کو شک وشبہ نہیں اور اب تو کسی اور کے پاس چلا گیا ہے۔ تیری مثال تو ایسی ہے جیسے کوئی جواہر دلیواقیت چھوڑ کر ان کے بدلے پتھر لے لے۔

میں نے کہا کیا تم یہ بات بصیرت سے کہہ رہے ہو یا بغیر بصیرت کے؟ اگر تم یہ بات بصیرت سے کہہ رہے ہو تو بیان کرو تاکہ میں اپنی بصیرت دکھاؤں اور اگر تم بغیر بصیرت کے کہہ رہے ہو تو اس کی دلیل دو۔

اس نے جواب دیا: یہ بات تو سورج کی طرح روشن اور ظاہر ہے۔

میں نے کہا کہ اگر کوئی تجھے کہے کہ تمہاری باتیں تجھے اللہ سے دور اور شیطان سے قریب کر رہی ہیں اور تو اس سے دلیل مانگے اور وہ تجھے کہے کہ یہ تو اظہر من الشمس ہے تو تُو اسے کیا جواب دیگا۔ اس پر وہ خاموش ہوگیا اور اسے کوئی جواب بن نہ پڑا۔ اس کے بعد میں نے کہا: میں نے تمہاری دلیل میں غور کیا ہے اور تمہاری دلیل میں اپنا ذہن دوڑایا ہے تو مجھے صرف ایک دلیل ملی ہے اور وہ یہ کہ تمہارا خیال ہے کہ تو اللہ کا اس ملک میں شریک ہے اس لیے تمہاری اجازت کے بغیر وہ نہ مجھے کچھ عطا کرے گا اور نہ فتح نصیب کرے گا جس شخص کی ولایت کا تو انکار کر رہا ہے اسے تمہاری اجازت سے فتح نصیب نہیں ہوئی اور نہ ہی اللہ تمہاری اجازت کے بغیر اسے فتح عطا کر سکتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ تو اللہ کے نیک بندوں کا انکار کر رہا ہے اور اگر تمہارا یہ عقیدہ ہوتا کہ اللہ کی حکومت میں کوئی اس کا شریک نہیں اور اس کی عنایات پر کوئی اعتراض نہیں کر سکتا تو تو اللہ کے بندوں کی بزرگی کو تسلیم کر لیتا اور ان نوازشوں کو بھی تسلیم کر لیتا جو اللہ نے ان پر کی ہیں اس پر فقیہ نے کہا: میں توبہ کرتا ہوں، میں توبہ کرتا ہوں، میں توبہ

کرتا ہوں، حق بات وہی ہے جو تو کہتا ہے۔ واللہ ہم تو فضول ہیں اور ہمارا بزرگوں کی ولایت سے انکار غلط تھا۔ واللہ الموفق۔

صاحبِ فتح ولی حق بات کو جانتا ہے اور وہ مذاہبِ اربعہ میں سے کسی کا مقیّد نہیں ہوتا

یاد رکھیں کہ وہ ولی جسے خدا نے فتح عطا کی ہو حق وصواب کو جانتا ہوتا ہے اور اس کے لیے (مذاہب اربعہ) میں سے کسی ایک کا پابند رہنا ضروری نہیں[1] اور اگر تمام مذاہب معطل ہو جائیں تب بھی وہ شریعت کو زندہ کرنے کی قدرت رکھتا ہے۔ ایسا کیوں نہ ہو جب کہ آنحضرت صلّی اللہ علیہ وسلّم ہر وقت اس کی آنکھوں کے سامنے ہوتے ہیں اور وہ ایک لحظہ کے لیے بھی حق جلّ جلالہٗ کے مشاہدہ سے خالی نہیں ہوتا۔ یہی وجہ ہے کہ تمام احکام تکلیفیہ وغیرہ میں وہ نبی صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم اور اللہ تعالیٰ کی مراد سے واقف ہوتا ہے اسی وجہ سے وہ اوروں کے لیے حجت ہے اور دوسرے لوگ اس کے لیے حجت نہیں بن سکتے اس لیے کہ اس شخص کے مقابلہ میں جسے حق سبحانہٗ نے فتح نصیب نہیں کی وہ اللہ کے زیادہ قریب ہوتا ہے جس کی یہ صفت ہو اس کی بات کا انکار کیسے جائز ہو سکتا ہے۔ بعض اوقات لوگ کہتے ہیں کہ اس ولی نے فلاں بات فلاں مذہب کے خلاف کی ہے۔ جب

---

[1] امام شعرانیؒ نے الانوار القدسیہ میں بھی اسی خیال کا اظہار کیا ہے (الانوار القدسیہ: ۱: ۸۵) چنانچہ فرماتے ہیں:

وَاعلم ان جمیع مذاهب المجتهدین کلها عند اهل الحق مذهب واحد لایشهدون فیها تفرقة لاتساع نظرهم لانهم یشهدون العین التی استمد منها المجتهدون کانها داحدة فی شریعة واحدة فهم کلهم داخلون فی السیاج۔ وقد ذقنا ذلك والحمد لله۔ فلا یؤمر اهل الحق بالتقیید بمذهب معیّن من المذاهب المشهودة لان جمیع المذاهب من باطنهم وهذا امر یذوقه الفقراء فیصیر ذوقهم یعادل ذوق جمیع المجتهدین من غیر تحصیل الات الاجتهاد۔

(ترجمہ) یاد رہے کہ اہل حق کے نزدیک تمام مجتہدین کے مذاہب ایک جیسے ہیں اور وہ اپنی وسعت نظر کے باعث ان میں کوئی فرق نہیں پاتے اس لیے کہ وہ سرچشمہ ان کی نظر میں ہوتا ہے جس سے تمام مجتہدین نے فیض حاصل کیا ہے لہٰذا ان کے لیے ایک ہی چشمہ اور ایک ہی گھاٹ ہے لہٰذا وہ سب کے سب ایک باڑ کے اندر محفوظ ہیں الحمد اللہ ہم نے اس کا مزہ چکھا ہے لہٰذا کسی اہل حق کو ایک خاص مذہب کا مقید نہیں کیا جا سکتا کیونکہ تمام مذاہب تو ان کے باطن میں پائے جاتے ہیں اور اس کا مزہ صرف فقرا ہی چکھ سکتے ہیں اس طرح ان کا ذوق آلات تحصیل حاصل کیے بغیر تمام مجتہدین کے ذوق کے برابر ہوتا ہے۔

یہ بات سنو تو سمجھ لو کہ منتوح علیہ ولی کا منکر دو حالتوں سے باہر نہیں ہو سکتا یا تو وہ منکر شریعت سے ناواقف ہے جیسا کہ اکثر منکرین کا حال ہے حالانکہ ایسے آدمی کے لیے انکار کرنا مناسب ہی نہیں کیونکہ اندھا بینا کی باتوں کا کیسے انکار کر سکتا ہے اس لیے اس شخص کے لیے بہتر یہی ہے کہ اپنی جہالت کو دور کرنے کی طرف توجہ دے یا وہ مذاہب اربعہ میں سے کسی ایک مذہب سے واقف ہوگا اور دیگر مذاہب سے ناواقف۔ اس حالت میں بھی اسی وقت اس کے لیے انکار کرنا درست ہوگا جب وہ سمجھتا ہو کہ حق بات اس مذہب کے سوا دوسرے مذاہب میں پائی ہی نہیں جاتی حالانکہ یہ اعتقاد مُصَوِّبہ اور مُخَطِّئہ دونوں کے عقیدہ میں نہیں پایا جاتا۔ کیونکہ مصوبہ کا عقیدہ تو یہ ہے کہ (مذاہب اربعہ میں سے) ہر مذہب حق پر ہے اور ان کے نزدیک اللہ کا حکم مجتہد کے ظن کے مطابق متعدد ہوتا ہے چنانچہ کسی نازل شدہ حکم میں اگر کوئی مجتہد حرمت کا حکم سمجھے تو اس کے حق میں اللہ کے حکم سے حرمت ہی مراد ہوگی اور اگر کوئی حلت (حلال و جائز ہونے) کا حکم سمجھے تو اس کے حق میں یہی اللہ کا حکم ہوگا اور مخطئہ کے نزدیک اللہ کا مقصد (کسی حکم کے نازل کرنے سے) صرف ایک ہوتا ہے اور اس کو درست اور صحیح سمجھنے والا بھی ایک مذہب ہی ہو سکتا ہے، لیکن وہ بھی حق کو ایک مذہب کے اندر بند نہیں کر دیتے بلکہ ایک حکم شرعی میں ایک مذہب کا قول حق ہوگا اور دوسرے حکم میں دوسرے کا۔ لہٰذا اس منکر کے لیے بہتر ہے کہ وہ اس باطل اعتقاد کو دور کرنے میں مشغول ہو یا وہ منکر مذاہب اربعہ سے واقف ہو مگر ایسا شخص انکار نہیں کر سکتا۔ انکار تو اسی صورت میں ہو سکتا ہے جب وہ یہ عقیدہ رکھے کہ دیگر علماء کے مذاہب حق پر نہیں مثلاً ثوریؒ، اوزاعیؒ[1]، عطاؒ[2]، ابن جریجؒ[3]، عکرمہؒ، مجاہدؒ، معمرؒ، عبدالرزاقؒ، بخاریؒ، مسلمؒ، ابن جریرؒ، ابن خزیمہؒ، ابن المنذرؒ، طاؤسؒ، نخعیؒ اور قتادہؒ اور دیگر تابعین اور تبع تابعین، یہاں تک کہ صحابہؓ کے

---

[1] اوزاعی: عبدالرحمنؒ بن عمرو الاوزاعی۔ اوزاع یمنی قبیلہ ذی الکلاع کی ایک شاخ ہے بعلبک میں ۸۸ھ، ۷۰۶ء میں پیدا ہوئے، بڑے پایہ کے محدث تھے۔ عطا ابن ابیؒ رباح اور زہریؒ اور ان کے طبقہ کے لوگوں سے روایت کی ہے ۱۵۷ھ، ۷۷۳ء میں وفات پائی۔

[2] عطاؒ: عطاؒ بن ابی رباح مولی قریش: حضرت عثمانؓ کے عہد خلافت میں مکہ میں پیدا ہوئے۔ حضرت عائشہؓ، حضرت ابو ہریرہ اور حضرت ابن عباسؓ وغیرہ سے حدیث سنی، یہ حبشی غلام تھے مگر اپنے زمانہ کے بڑے بڑے لوگوں کو علم سکھایا، ایک سو سال کی عمر میں ۱۱۵ھ، ۷۳۳ء میں وفات پائی۔

[3] ابن جریج: عبدالملکؒ بن عبدالعزیز بن جریج المکی: کبار تابعین میں سے تھے۔ انھوں نے ابن ابی ملیکہ اور عطا سے

(بقیہ اگلے صفحہ پر)

مذاہب۔ یہ اعتقاد بھی باطل ہے۔ لہٰذا اس شخص کے لیے بھی مفتوح علیہ اولیاء اللہ کے منکر ہونے سے بہتر یہی ہے کہ وہ اپنا علاج کرنے میں دھیان دے۔ ان سب باتوں کو جاننے کے بعد تجھے معلوم ہو گیا ہو گا کہ صاحب فتح ولی کا وہی شخص انکار کر سکتا ہے جو تمام احکام شریعت سے واقف ہو اور تمام احکام شریعت سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور ہر زمانہ میں آپ کے وارثین میں سے کامل لوگوں مثلاً اغواث کے سوا کوئی شخص واقف نہیں ہو سکتا اوروں کے لیے اگر انہیں سمجھ ہو تو سکوت ہی بہتر ہے ولیوں سے انکار کے متعلق جو کچھ ہم نے کہا ہے وہ صرف اہل حق لوگوں میں سے صاحب فتح کے متعلق کہا ہے۔ البتہ ظلمت والے اور گمراہ لوگوں کے اقوال تجربہ کار لوگوں سے مخفی نہیں۔

(بقیہ حاشیہ صفحہ سابقہ)

روایت کی۔ ابن عیینہ کہتے ہیں کہ میں نے یہ کہتے ہوئے سنا کہ مجھ جیسی کسی نے علم کی تدوین نہیں کی۔ ۱۵۰ھ ؍ ۷۶۷ء میں وفات پائی۔

۴؎ عکرمہؒ: مولیٰ ابن عباسؓ۔ حضرت ابن عباسؓ سے فقہ کی تعلیم پائی۔ امام شعبیؒ فرماتے ہیں کہ عکرمہ سے زیادہ کتاب اللہ کا عالم کوئی نہیں رہا۔ ان پر یہ اعتراض کیا گیا ہے کہ وہ خارجیوں کے ہمراہ تھے یہی وجہ ہے کہ امام مالکؒ اور مسلمؒ نے ان سے روایتِ حدیث نہیں کی۔ ان کی وفات ۱۰۵ھ ؍ ۷۲۳ء میں ہوئی،

۵؎ مجاہدؒ: مجاہدؒ بن جبیر: حضرت ابن عباسؓ کی خدمت میں مدت تک رہے اور ان سے قرآن پڑھا۔ وہ علم کے ظروف میں سے ایک ظرف ہیں۔ خود ان کا قول ہے کہ میں نے ابن عباسؓ کو تین بار قرآن سنایا اور ان کے سامنے ہر آیت پر ٹھہرتا تھا اور پوچھتا تھا کہ وہ کس بارے میں نازل ہوئی اور اس کا کیا واقعہ ہے۔ قتادہؒ کا قول ہے کہ جو علماء رہ گئے ہیں ان میں تفسیر کے سب سے بڑے عالم مجاہد ہیں۔ ۱۰۳ھ ؍ ۷۲۰ء میں تراسی برس کی عمر میں وفات پائی

۶؎ معمرؒ: ابوعروۃ معمرؒ بن راشد الازدی: انہیں عالم یمن کہا جاتا ہے۔ انھوں نے زہری اور ہمامؒ سے روایت کی اور ثوری اور ابن عیینہؒ نے ان سے روایت کی۔ عبدالرزاق کہتے ہیں کہ میں نے ان سے دس ہزار حدیث سنی، اٹھاون برس کی عمر میں ۱۵۳ھ ؍ ۷۷۰ء میں وفات پائی۔

۷؎ عبدالرزاق بن ہمامؒ، ابوبکر کنیت: کبار تابعین میں سے ہیں۔ ابن جریجؒ اور معمرؒ وغیرہ سے روایت کی بچاسی برس کی عمر میں ۲۱۱ھ ؍ ۸۲۶ء میں وفات پائی۔

۸؎ ابن خزیمہ: محمد بن خزیمہ: شیخ الاسلام ابوبکر محمد بن اسحاق بن خزیمہ نیشاپوری ۲۲۳ھ ؍ ۸۳۷ء میں پیدا ہوئے حافظِ حدیث تھے۔ نہایت عابد و زاہد تھے ان کی وفات ۳۱۱ھ ؍ ۹۲۳ء میں ہوئی (مزید تفصیل کے لیے دیکھیں تذکرۃ الحفاظ ج ۲ ص ۲۵۹ تا ص ۲۶۸

(بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر)

ایک شخص نے اپنے پیر سے اہلِ حق میں سے صاحب فتح ولی کے اقوال کا انکار کرنے کی اجازت مانگی اور کہا حضرت میں شریعت کی ترازو سے پرکھ کر ہی ان کا انکار کروں گا۔ جسے درست پاؤں گا اسے تسلیم کروں گا اور جسے کجرو پاؤں اس کی بات رد کر دوں گا۔ اس کے پیر نے کہا: مجھے خدشہ ہے کہ وہ تمام اوزان جن سے وزن کیا جاتا ہے، تمہارے پاس نہ ہوں گے۔ لہٰذا جب بعض اوزان تمہارے پاس ہوئے اور بعض نہ ہوئے تو تم انہیں کیسے صحیح طور پر وزن کر سکتے ہو۔ آپ کی مراد وہی تھی جس کا ہم نے اوپر ذکر کر دیا کہ وہ باوجود جاہل ہونے کے منکر ہو رہا ہے۔

میں ایک سمجھدار اور عقلمند آدمی کے پاس تھا کہ اس نے ایک شخص کو ایک مفتوح علیہ ولی سے یہ سوال کرتے ہوئے سنا کہ اگر کوئی شخص نماز میں سورۃ فاتحہ کے بعد سورۃ پڑھنا بھول جائے اور اس پر سجدۂ سہو واجب ہو جائے مگر وہ سجدہ کرنا بھی بھول جائے یہاں تک کہ وہ سلام پھیر دے۔ اب سجدۂ سہو نہ کرنے کی وجہ سے اس کی نماز اس بناء پر کہ سورہ پڑھنے میں تین سنتیں ہیں، باطل ہوگی یا نہیں ہوگی۔ اس بناء پر کہ اس میں تین سنتیں نہیں ہیں؟ شیخ حطابؒ[۵] اور دیگر مجتہدین اس طرف گئے ہیں

(بقیہ حاشیہ صفحہ سابقہ در سابقہ)

۹ ابن المنذرؒ: حافظ ابوبکر محمد بن ابراہیم بن المنذر نیشاپوری۔ یہ کثیر التصانیف ہیں: مثلاً مبسوط، کتاب الاشراف وغیرہ یہ خود مجتہد تھے کسی کی تقلید نہ کرتے تھے۔ انہیں شیخ الحرم کہا جاتا ہے ۳۱۰ھ، ۹۲۲ء میں مکہ میں وفات پائی۔

۱۰ طاؤس: طاؤسؒ بن کیسان الیمانی: وہ جنگ میں گرفتار شدہ لوگوں کے لڑکے تھے۔ حضرت زیدؓ بن ثابت، حضرت عائشہؓ اور حضرت ابوہریرہؓ وغیرہ سے حدیث سنی۔ علم و عمل میں منتخب روزگار تھے۔ عمرو بن دینار کہتے ہیں کہ میں نے کسی کو طاؤس کے مثل نہیں دیکھا۔ انھوں نے چالیس حج کیے اور ۱۰۶ھ، ۷۲۳ء میں وفات پائی۔

۱۱ نخعی: ابراہیمؒ بن یزید النخعی۔ علقمہؒ، مسروقؒ وغیرہ سے روایت کی۔ مخلص علماء میں سے تھے شہرت سے بچتے تھے۔ حضرت سعیدؒ بن جبیر کے پاس کوئی شخص فتویٰ لینے آتا تو کہتے تم لوگ مجھ سے فتویٰ لیتے ہو حالانکہ تم میں نخعیؒ موجود ہیں۔ ۹۵ھ، ۷۱۳ء میں وفات پائی۔

۱۲ قتادہؒ: قتادہ بن دعامہ السدوسی: حضرت انسؓ اور حضرت سعیدؒ بن المسیب وغیرہ سے روایت کی وہ اندھے اور قوی الحافظہ تھے۔ ابن سیرین کہتے ہیں کہ قتادہ اپنے زمانہ کے بہت بڑے حافظ تھے اس حفظ کے ساتھ وہ عربیت، لغت ایام العرب اور انساب کے بھی بہت بڑے عالم تھے۔ ۱۱۸ھ، ۷۳۶ء میں وفات پائی۔

۵ شیخ حطابؒ: عارف باللہ محمد بن محمد الحطاب الرعینی مالکی جنہوں نے شیخ خلیل بن اسحٰق جندی مالکی متوفی ۷۶۷ھ کی کتاب مختصر کی شرح کی ہے مختصر مالکی فقہ کی کتاب ہے (کشف الظنون ۲: ۲۴۲)

کہ اس کی نماز باطل ہو جائے گی اور شارحینِ[1] رسالہ اس طرف گئے ہیں کہ یہ نماز باطل نہ ہوگی۔ اسی سائل نے صاحب فتح ولی سے درخواست کی کہ بتائیں کہ اللہ کے نزدیک حق بات کیا ہے؟

ولی نے فوراً جواب دیا کہ اللہ کے ہاں حق بات یہی ہے کہ بھول کر سورۃ کے نہ پڑھنے سے سجدۂ سہو ہرگز لازم نہیں آتا اور اگر کوئی اس صورت میں سجدہ کرے گا تو اس کی نماز باطل ہو جائے گی۔ سائل کو معلوم تھا کہ ولی ایک عامی اور اَن پڑھ شخص ہے اور ولایت میں اس کے بلند درجہ پہنچنے کا بھی اسے علم تھا۔ جواب سُنکر اسے یقین ہو گیا کہ یہی بات حق ہے جس میں کسی قسم کا شک نہیں ہونا چاہیئے مگر اس عقلمند آدمی کے دل میں شک و شبہہ پیدا ہو گیا اور اس نے وہاں سے اُٹھ جانے کے بعد سوال کرنے والے سے کہا کہ یہ ولی تو جاہل ہے۔ اسے کسی بات کا پتہ نہیں۔ دیکھو اس صاف مسئلہ کا بھی اسے پتہ نہیں اور کہتا ہے کہ سورۃ کے ترک کرنے والے پر سجدہ سہو کرنا لازم نہیں۔ حالانکہ ابن رشدؒ[2] نے سورہ پڑھنے کو جہر اور سِرّ کی طرح سنن مؤکدہ میں سے شمار کیا ہے۔

سائل نے جواب دیا: صاحب فتح کے لیے کسی مذہب کی قید نہیں ہوتی بلکہ وہ تو حق کے ساتھ ہوتا ہے جہاں کہیں وہ ہو۔

عقلمند نے کہا۔ اور وہ ایک طالب علم تھا۔ ہم تو اپنے امام مالک کے قول کے سوا کسی اور کا قول تسلیم نہیں کرتے۔

---

[1] شیخ نورالدین علی بن عبداللہ السمہودی المتوفی ۱۱ھ نے ایک رسالہ لکھا ہے جس کا نام مواھب الکریم للفتاح فی المسبوق المشتغل بالاستفتاح ہے۔ اس کے بعد خود انھوں نے ایک رسالہ لکھا ہے جس کا نام اکمال المواھب رکھا۔ اس میں انھوں نے صرف اسی مسئلہ پر بحث کی ہے۔ یہ رسالہ انھوں نے اس وقت لکھا جب ایک مرتبہ عشا کی نماز میں خود ان سے یہ واقعہ پیش آیا۔ (کشف الظنون: ۲: ۴۶۴-۴۶۵)

یہاں جس رسالہ کی طرف اشارہ کیا گیا ہے مجھے معلوم نہ ہو سکا کہ وہ کونسا رسالہ ہے۔ ابو محمد عبداللہ ابن ابی زید مالکی قیروانی متوفی ۳۸۶ھ نے فقہ مالکیہ میں ایک رسالہ لکھا جو مالکیہ میں بہت مشہور ہے۔ شاید یہی رسالہ مراد ہو (کشف: ۱: ۸۴۱) اس رسالہ پر بہت سی شرحیں بھی لکھی گیئں۔ ۱۲

[2] ابن رشدؒ: ابن الولید محمد بن احمد بن محمد بن رشد القرطبی۔ اندلس اور مغرب میں اپنے وقت کے فقہا کے سردار تھے اور صحت نظر جودت تالیف اور دقت فقہ میں ان کا اعتراف کیا جاتا تھا۔ ان پر روایت سے زیادہ درایت غالب تھی کِتَابُ الْبَیَانُ وَالتَّحْصِیْل لِمَا فِی الْمُسْتَخْرِجَۃِ مِنَ التَّوْجِیْہِ وَالتَّعْلِیْل اور کتاب المقدمات لاوائل کتب المدونہ لکھی۔ انھوں نے ۵۲۰ھ / ۱۱۲۶ء میں وفات پائی۔

سائل نے پھر جواب دیا: ولی نے جو بیان کیا ہے اسے امام مالکؒ سے اشعب[1] نے روایت کیا ہے جیسا کہ التوضیح[2] میں دیا ہے چنانچہ اس نے امام مالکؒ سے روایت کیا ہے کہ سورۃ کا پڑھنا مستحب ہے سنت نہیں، پھر امام شافعیؒ کا بھی یہی مذہب ہے، ان کے نزدیک سورت ایک ہیئۃ تحسینیہ ہے اور سنتوں میں سے نہیں ہے لہٰذا جو اس کے ترک کرنے کی وجہ سے سجدہ کرے گا اس کی نماز باطل ہو جائیگی۔

مزید برآں میں نے تو ولی سے صرف اتنا سوال کیا تھا کہ بغیر کسی قید کے وہ حق بات کو متعین کر دیں، ہمارا سوال بالخصوص امام مالکؒ کے مشہور مذہب کے متعلق نہ تھا۔ آپ نے ہمارے سوال کرنے پر اس کی تعیین کر دی ہے اور اتفاق سے یہ جواب امام مالکؒ کی ایک روایت سے مطابقت رکھتا ہے اور امام شافعیؒ کا بھی یہی مذہب تھا۔ اب ولی کے جواب میں کونسی بات قابلِ گرفت ہے جب سائل کا یہ جواب عقلمند نے سنا تو بند ہو گیا اور کچھ جواب نہ دے سکا۔

مؤلف کہتا ہے: منکرین کا یہی طریقہ اور یہی عادت چلی آتی ہے۔ ان کے پاس تو کمل کوتاہی لے گی اسی سلسلہ میں میرے ایک استاد نے جو بہت بڑے فقیہ ہیں مجھ سے بات کی اور ایک روز مجھے کہنے لگے کہ اس محبت کی بنا پر جو مجھے تم سے ہے میں تمہیں ایک نصیحت کرنا چاہتا ہوں، میں نے کہا: بسر و چشم انھوں نے فرمایا: ہو کیو ایک شخص کے بارے میں جسے تم ولی اور صاحب کشف جانتے ہو سب لوگ ایک طرف ہیں اور تم ایک طرف ہو۔ لوگ تو اس پر نکتہ چینی کرتے ہیں اور تمہیں ان میں اعتقاد ہے یہ تو ہو نہیں سکتا کہ تم اکیلے حق پر ہو۔ اسی قسم کی اور باتیں کہیں جن کا خلاصہ میں نے ذکر کر دیا ہے۔

میں نے عرض کیا: جناب آپ کی نصیحت تب مکمل ہوگی اگر میری بات کا جواب دیں۔ اگر آپ نے جواب دیدیا تو نصیحت مکمل ہو گئی اور خدا آپ کو اس کا اجر دیگا۔

فرمایا: پوچھو کیا پوچھتے ہو؟

میں نے عرض کیا: کیا آپ کی ان سے ملاقات ہوئی ہے اور آپ نے ان کی باتیں سنی ہیں؟ اور کیا آپ نے کبھی کسی بات میں بحث کی ہے کہ آپ کو لوگوں کی تنقید صحیح معلوم ہوتی ہے؟

فرمایا: میں نہ کبھی ان سے ملا ہوں نہ کبھی انہیں دیکھا ہے۔

---

[1] اشعب: ان کا حال نہ معلوم ہو سکا۔

[2] التوضیح: یہ کتاب تنقیح الاصول مصنفہ قاضی علامہ صدر الشریعۃ عبید اللہ بن مسعود المحبوبی البخاری حنفی متوفی ۷۴۷ھ ۱۳۴۶ء کی شرح ہے۔ شرح کا پورا نام التوضیح فی حل غوامض التنقیح ہے۔ متن اور شرح دونوں ایک ہی مصنف کی ہیں۔

میں نے حیا اور الفت و محبت کے احترام کو بالائے طاق رکھتے ہوئے کہا: مجھے تو یہی معلوم ہو رہا ہے کہ آپ نے معاملہ کو بالکل الٹ ہی دیا ہے اور ظن جس میں یقین کا ہونا ناممکن ہے اسی میں آپ یقین کو تلاش کر رہے ہیں اور جہاں یقین ہے وہاں آپ نے شک بلکہ بہتان و خرافات پر اکتفا کر لی ہے۔

اس پر انہوں نے کہا: آپ وضاحت سے بیان کریں کہ آپ کی کیا مراد ہے؟

میں نے عرض کیا: جب آپ فقہ کا درس دیتے ہیں اور کوئی شخص مدونہ[1] یا تبصرۂ لخمی یا ابن رشد[2] کی بیان یا ابن شاس[3] کی جواہر وغیرہ فقہ کی کتابوں کا حوالہ دے اور آپ ان کتابوں کی طرف مراجعت کر سکتے ہوں تو آپ نقل کرنے والے کی بات اس وقت تک نہ مانیں گے جب تک خود آپ نہ دیکھ لیں خواہ واسطہ ابن مرزوق[4]، حطاب اور توضیح[5] وغیرہ کا ہی کیوں نہ ہو۔ یہاں تک تو ظن ہوتا ہے اور آپ حد یقین تک پہنچنا چاہتے ہیں اسی لیے تو آپ عدول و ثقات لوگوں کی بھی نقل پر اکتفا نہیں کرتے جب تک کہ خود اس کی تحقیق نہ کر لیں۔ حالانکہ اس میں کبھی یقین حاصل نہیں ہو سکتا کیونکہ آپ نے ظنِ قوی کا مقابلہ اس سے بھی کمزور ظن کے ساتھ کیا ہے اس لیے کہ پہلے واسطہ کی روایت اقرب الی الصّواب ہے

---

[1] مدونہ: فقہ مالکی کی کتاب ہے، پورا نام مدونہ فی فروع المالکیہ ہے۔ ابو عبداللہ عبدالرحمٰن بن قاسم مالکی کی تصنیف ہے انہوں نے ۱۹۱ھ ۔ ۸۰۶ء میں وفات پائی۔

[2] ابن رشد: ابوالولید محمد بن محمد بن رشد قرطبی۔ اندلس اور مغرب کے فقہاء کے سردار تھے اور صحتِ نظر جودتِ تالیف اور دقّتِ فقہ میں ان کا اعتراف کیا جاتا تھا۔ ان پر روایت سے زیادہ درایت غالب تھی۔ ان کی کتاب کا پورا نام کتاب البیان والتحصیل لمانی المستخرجۃ من التوجیہ ہے۔

[3] ابن شاس: ابو محمد عبداللہ بن نجم بن شاس الجذامی السعدی۔ انھوں نے امام غزالی کی وجیز کی ترتیب پر امام مالک کے مذہب میں ایک عمدہ کتاب لکھی جس کا نام انہوں نے الجواہر الثمینۃ فی مذہب عالم المدینہ رکھا۔ اس کی خوبی اور کثرت فوائد کی بنا پر مصر میں تمام مالکی اس کی طرف سخت مائل تھے۔ انہوں نے ۶۱۰ھ ۔ ۱۲۱۳ء میں وفات پائی۔

[4] ابن مرزوق: حافظ ابوالحسین عبداللہ بن مرزوق ہروی مولیٰ شیخ الاسلام ابو اسمٰعیل انصاری۔ ان کی پیدائش ۴۴۱ھ ۔ ۱۰۴۹ء میں ہوئی۔ حافظ اور حسنِ سیرت کے لحاظ سے مشہور تھے۔ کچھ اونچا سنتے تھے اور آخر عمر میں بہرا پن زیادہ ہو گیا۔ ان کی وفات ۵۵۷ھ ۔ ۱۱۶۱ء میں ہوئی۔

[5] علامہ صدر الشریعہ عبیداللہ بن مسعود المحبوبی البخاری الحنفی المتوفیٰ ۷۴۷ھ کی کتاب کا نام ہے انھوں نے پہلے تنقیح الاصول پھر خود ہی اس کی شرح "توضیح" لکھی۔

اس لیے کہ ان کا زمانہ سابقہ کتب کے مؤلفین کے زیادہ قریب ہے کیونکہ وہ لوگ ہمارے مقابلہ میں بلاشبہ زیادہ قریب ہیں اور اس لحاظ سے بھی کہ ان کتابوں کے جو نسخے واسطہ کے پاس ہیں وہ کسی نہ کسی طریق روایت سے مروی ہیں اور ہم ہیں کہ ہمارے پاس ان کے متعلق نہ کوئی روایت ہے اور نہ کوئی صحیح نسخہ ہو سکتا ہے کہ جو نسخہ آپ کے پاس ہے اس میں کمی یا بیشی کی گئی ہو لہٰذا اس میں ان دونوں احتمالوں کے باوجود حطابؒ کی نقل کو کیسے وثوق سے رد کر سکتے ہیں۔ یا یہ ہو سکتا ہے کہ آپ اس بات کے متعلق جس کا یقینی ہونے کا احتمال ہے، ظن پر ہی اکتفا کر لیں اس لیے کہ یہ شخص جس کے متعلق جو کچھ لوگوں نے آپ کو کہا ہے، زندہ ہے اور آپ کے اسی شہر میں موجود ہے اور اس کے اور آپ کے درمیان کوئی مسافت بھی زیادہ نہیں ہے اگر اللہ ان کی محبت اور ان کی اطاعت کرنے کی توفیق دے تو ان کے ساتھ جان پہچان ہی سعادتمندی ہے۔ آپ ان تک پہنچ سکتے ہیں اور ان کی عقیدت حاصل کر کے سعادت مند ہو سکتے ہیں یا ان پر تنقید کر کے واپس آ سکتے ہیں۔ اس طرح آپ کو ایک بات کا تو یقین ہو سکتا ہے اور آپ کے دل سے شک کی ظلمت دور ہو سکتی ہے اس پر طرہ یہ آپ اس سود مند بات اور نیکی کے متعلق جس کا سود مند ایک امر مخفی ہے بدکاروں اور کذّاب لوگوں کی باتوں پر لگ گئے ہیں حالانکہ آپ کی عادت تو یہ تھی کہ غیر محقق امر کے متعلق آپ معتبر اور ثقہ لوگوں کی بات بھی اس وقت تک نہ مانتے تھے جب تک کہ خود اس کی تحقیق نہ کر لیتے۔ اس معاملہ میں بھی جو کہ ایک یقینی امر ہے اور جس کا نفع باعثِ سعادت ہے۔ آپ نے یہی طریقہ کیوں نہ اختیار کیا۔ جناب والا! یہ صحیح بات کے متعلق الٹی سمجھ نہیں ہے تو اور کیا ہے؟

انھوں نے فرمایا کہ تونے دلائل سے مجھے خاموش کر دیا ہے۔ خدا کی قسم میں ان کا ہرگز جواب نہیں دے سکتا تو گواہ رہنا کہ میں ان باتوں سے توبہ کرتا ہوں۔

اس کے بعد میں نے استاد سے عرض کیا کہ اگر آپ لوگوں کی تقلید ہی کرنا چاہتے ہیں تو دو باتوں کی وجہ سے میری تقلید کریں۔ ایک اس لیے کہ آپ جانتے ہیں کہ مجھے امورِ شریعت میں بصیرت حاصل ہے، دوسرے اس لیے کہ آپ کو معلوم ہے کہ کئی سالوں سے میرا ان کے پاس آنا جانا ہے اور جتنا ان کے متعلق مجھے علم ہے کسی اور کو نہیں۔ ان بدکار اور کذّاب لوگوں میں سے آپ کی طرح کسی ایک کی بھی حضرت سے ملاقات نہیں ہوئی۔ ان کی باتوں کا تمام تر مدار سنی سنائی باتیں ہیں جن کی کوئی حقیقت نہیں اور جو در حقیقت محرومیت اور رسوائی کا سبب ہیں۔ ہم اللہ کے فضل و کرم سے توفیق کے خواہاں ہیں۔

اس پر حضرت نے فرمایا: اب کوئی اور بات تو باقی نہیں رہی؟

اس کے بعد ایک اور فقیہ سے جو فقیہ مذکور کا استاد تھا میری ملاقات ہوئی۔ کہنے لگے: میرے

فلاں شاگرد نے مجھ سے آپ کے قاطع دلائل کا ذکر کیا تھا پھر پہلے فقیہ کی طرف متوجہ ہو کر کہا: تم ہی نے تو مجھ سے ذکر کیا تھا کہ اس نے یہ دلائل دیے ہیں۔ اس نے کہا: جی ہاں۔ اس پر دونوں نے یک زبان ہو کر کہا: تم نے ہماری کمر توڑ دی ہے۔

مؤلف کہتا ہے: یہ ان دونوں فقیہوں کا حال ہے جو اپنے زمانہ کے فقہاء کے سردار سمجھے جاتے ہیں اور جو اپنے وقت کے یکتا عالم شمار کیے جاتے ہیں۔ ان کے علاوہ جتنے بھی منکر ہیں ان میں سے اکثر لوگ جیسا کہ مذکور ہو چکا سنی سنائی باتوں پر جن کی کوئی حقیقت نہیں، لگ جاتے ہیں اور جو سمجھ دار ہیں انکے انکار کی یہ دلیل ہے کہ ہم فلاں بزرگ کو جانتے ہیں مگر وہ تو ایسے نہ تھے اس سے ان کی مراد یہ ہوتی ہے کہ حضرت ان بزرگ جیسے نہیں ہیں۔ حالانکہ انہیں معلوم ہونا چاہیئے کہ پھول مختلف رنگوں کے ہوتے ہیں اور کھجور کے درخت ایک ہی جڑ سے نکلے ہوتے ہیں اور بعض الگ جڑوں سے۔ یہ سیراب تو ایک ہی پانی سے ہوتے ہیں مگر ذائقہ میں ہم ایک کو دوسرے پر فضیلت دے دیتے ہیں۔ اس میں عقلمندوں کے لیے نشانیاں ہیں (سورۂ رعد آیت ۴)

میں ایک مرتبہ حضرت کے ساتھ بہار کے موسم میں ایک باغ میں گیا۔ آپ کچھ دیر تک ان پھولوں اور کلیوں کے مختلف رنگوں کو دیکھتے رہے پھر سر اٹھا کر میری طرف دیکھا اور کہا: جو شخص باوجود اس کے کہ اولیاء سب کے سب ہدایت اور حق پر ہوتے ہیں اور لوگوں کے دلوں میں ان کی محبت ہوتی ہے پھر بھی مقامات اور احوال میں ان کے اختلاف کو دیکھنا چاہے تو وہ ان کلیوں اور پھولوں کے مختلف رنگوں کو دیکھے کہ سب ہی لوگوں کے دل پسند ہیں۔

چنانچہ جو شخص یہ کہتا ہے کہ فلاں بزرگ جسے ہم جانتے ہیں، وہ تو ایسے نہ تھے اس کا مطلب یہ ہو گا کہ اس شخص نے اللہ کی رحمت کو اسی شخص تک محدود کر کے ایک وسیع چیز کو تنگ کر دیا ہے چنانچہ جب اس بدوی نے جس نے مسجد میں پیشاب کیا تھا، یہ الفاظ: اَللّٰهُمَّ ارْحَمْنِیْ وَارْحَمْ مُحَمَّدًا وَلَا تَرْحَمْ مَعَنَا اَحَدًا (یا اللہ صرف مجھ پر اور محمد ﷺ پر رحم کرنا۔ کسی اور پر نہ کرنا) تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: لَقَدْ حَجَّرْتَ وَاسِعًا یَا اَعْرَابِیُّ (اے بدوی تو نے ایک وسیع چیز کو تنگ کر دیا) اور اگر اس کا قول اس خیال سے ہو کہ صاحب فتح اسی ولی کا سا ہونا چاہیئے جسے یہ جانتا ہے تو اس کے متعلق ہم بیان کر چکے ہیں کہ ان کی مختلف قسمیں ہیں۔ مزید برآں اس پر بھی یہی اعتراض واقع ہے کیونکہ وہ بزرگ بھی تو اپنے سے پہلے بزرگ سا نہ ہو گا۔

میں نے یہ بحث اس لیے لمبی کر دی اور ان مناظروں کا ذکر جو فقہا سے ہوئے اس لیے کر دیا ہے کہ

یہ خیر فقہاء کی جماعت اور طالب علموں کو بھی حاصل ہو جائے یہ سب ان کی محبت اور خیر خواہی کی بنا پر کیا گیا ہے اس لیے کہ لوگ ہر وادی، ہر بستی اور شہر میں اور ہر زمانہ میں نیک لوگوں کے انکار کرنے میں مبتلا رہے ہیں، ان کے انکار کی وجہ صرف وہی ہوتی ہے جو ہم نے بیان کر دی۔ اگر یہ لوگ انصاف سے ہمارے بیان کا مطالعہ کریں تو یہ انکار سے باز آئیں اور ان پر حق بات واضح ہو جائے۔ اکثر ایسا ہوا کہ میں نے ان فقہاء سے اس خیال سے مناظرہ کیا کہ یہ لوگ محض ظن کی بنا پر انکار کر رہے تھے وَاللّٰهُ الْهَادِیْ اِلَی الصَّوَابِ لَا رَبَّ غَیْرُہٗ وَلَا خَیْرَ اِلَّا خَیْرُہٗ عَلَیْهِ تَوَکَّلْتُ وَ اِلَیْهِ اُنِیْبُ۔

حضرت نے فرمایا: ولی کے ظاہر کی طرف دیکھ کر اس کے مطابق اُس کا وزن نہیں کرنا چاہیئے ورنہ وزن کرنے والا دنیا اور آخرت کا خسارہ پانے والا ہوگا۔ کیونکہ ولی کے باطن میں عجائب وغرائب پائے جاتے ہیں۔ اس کی مثال ایسی ہوتی ہے جیسے گاڑھا کپڑا جس کے اندر ریشم لگا ہوا ہو جس کا ظہور آخرت ہی میں ہوگا اور جو ولی نہ ہو اس کا حال اس کے برعکس ہوتا ہے کہ ریشم کے کپڑے کے اندر گاڑھا کپڑا لگا ہوا ہو۔ والعیاذ باللہ۔

ولی سے ظاہر کی مخالفت کے اسباب

ولی سے ظاہر کی مخالفت کے بہت سے اسباب ہم یہاں بیان کرتے ہیں۔ ہم نے انہیں حضرت سے مختلف مواقع پر سنا تھا، لیکن ہم ان کو یہاں اکٹھا کر دیتے ہیں۔

فرمایا: ایک ولی صدّیق کا ایک سچا مرید تھا جسے اپنے پیر سے محبت تھی اور جب حق تعالےٰ نے اسے اس پیر کے اسرار پر مطلع فرمایا تب تو اس کی محبت حد سے بڑھ گئی اور قریب تھا کہ وہ اپنے پیر کو مقام نبوت سے بھی آگے بڑھا دے۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے مرید پر لطف وکرم کی غرض سے معصیت زنا کی صورت کا اظہار کیا۔ (یعنی درحقیقت وہ زنا نہ تھا مگر مرید کو یوں معلوم ہوا کہ پیر زنا کا مرتکب ہوا ہے) جب یہ دیکھا تو غلوّ عقیدت سے باز آگیا اور پیر کو اپنے مرتبہ پر لا اتارا۔ اسی وقت اللہ تعالیٰ نے اسے فتح نصیب کی۔ فرمایا: اگر وہ اپنے پہلے عقیدہ پر قائم رہتا تو کافر ہوتا۔ نسأل اللہ السلامۃ۔

تابیر نخل کا واقعہ

جو امور آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے دستِ مبارک پر ظاہر ہوا کرتے تھے، ان میں منجملہ اور اسرار کے ایک راز یہی ہے مثلاً کھجور کو پیوند لگانے کے قصہ میں آپ کا فرمانا: اگر تم ایسا نہ بھی کرو تب بھی اچھی کھجوریں لگیں۔ پھر جب صحابہؓ نے کھجور کو پیوند لگانا ترک کر دیا

تو ناقص کھجوریں آئیں۔

یا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ فرمانا کہ میں نے خواب میں دیکھا ہے کہ ہم مسجدِ حرام میں امن وامان سے داخل ہوئے اور پھر کوئی سر منڈا رہا ہے اور کوئی بال کتروا رہا ہے۔ اس کے بعد آپ اپنے صحابہ کے ساتھ نکلے تو مشرکوں نے انہیں روک دیا اور دوسرے سال جا کر مسجدِ حرام میں داخل ہوئے۔ اسی قسم کے اور واقعات، اللہ تعالےٰ نے یہ معاملہ اپنے نبیؐ سے اس لیے کیا کہ کہیں صحابہ آپ میں الوہیت کا اعتقاد نہ کر لیں۔ اسی لیے یہ بھی فرمایا: اِنَّكَ لَا تَهْدِىْ مَنْ اَحْبَبْتَ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ يَهْدِىْ مَنْ يَّشَآءُ (آپ جسے چاہیں ہدایت نہیں کر سکتے مگر اللہ جسے چاہے ہدایت کر دے) اور فرمایا: لَيْسَ لَكَ مِنَ الْاَمْرِ شَىْءٌ (آپ کو اس معاملہ میں کوئی اختیار نہیں) وغیرہ دوسری آیات۔ اس لیے کہ ان سب امور کا مقصد لوگوں کو توحید پر جمع کرنا تھا۔ واللہ اعلم۔

فرمایا: ولی کامل ان لوگوں کے لیے جو ان کے پاس آتے ہیں، ان کی نیتوں کے مطابق رنگ بدلتا رہتا ہے۔ چنانچہ جس طالب کی نیت صاف ہو گی وہ ولی کو عینِ کمال میں دیکھے گا اور اسے ولی سے خارقِ عادت اور ایسی باتیں ظہور میں آئیں گی جن سے اسے خوشی ہو گی اور جس کی نیت بد ہو گی اس کا حال اس کے برعکس ہو گا۔ درحقیقت ہر شخص کو وہی نظر آتا ہے جو اس کے اپنے باطن میں ہو اور ولی بمنزلہ ایک آئینہ کے ہے جس میں اچھی اور بری صورتیں سب دکھائی دیتی ہیں لہٰذا جس شخص کو ولی کا کمال اور اللہ کی طرف رہنمائی دکھائی دے اسے اللہ کا شکریہ ادا کرنا چاہیئے اور جسے کچھ اور دکھائی دے اسے اپنے نفس کا محاسبہ کرنا چاہیئے۔

فرمایا: جب اللہ تعالیٰ ارادہ فرماتے ہیں کہ فلاں لوگ بدبخت ہوں اور وہ ولی سے فائدہ حاصل نہ کر سکیں تو اللہ تعالیٰ ان کو جس برائی اور مخالفت میں وہ پڑے ہوتے ہیں پختہ کر دیتا ہے لہٰذا وہ سمجھنے لگ جاتے ہیں کہ ولی بھی انہی کی طرز کا آدمی ہے حالانکہ درحقیقت ایسا نہیں ہوتا۔ یہاں تک کہ وہ ولی کے متعلق اپنے تصور میں خیال کرتا ہے کہ ولی شرابیوں کے ساتھ بیٹھا شراب پی رہا ہے حالانکہ یہ اس کی اپنی روح ہوتی ہے جس نے یہ صورت اختیار کی ہوتی ہے اور حقیقت میں کچھ بھی نہیں تھا یہ اس کی اپنی ذات کا سایہ تھا جس نے اسی طرح کی حرکات کیں جس طرح کہ شرابیوں نے کیں۔ بعینہٖ اسی طرح جس طرح آئینہ میں اپنی ہی شکل دکھائی دیتی ہے چنانچہ آئینہ کے سامنے کھڑے ہو کر کلام کرو تو آئینہ کی صورت بھی کلام کرے گی، کھاؤ تو وہ بھی کھائے گی۔ پیو تو پیے گی، ہنسو تو ہنسے گی، حرکت کرو تو حرکت کرے گی الغرض جو کام بھی کرو وہ اسی طرح کرے گی حالانکہ اس میں نہ کھانا ہے نہ کچھ اور اس لیے کہ وہ تو تمہاری

ذات کا سایہ ہے اصل ذات نہیں ہے۔ لہٰذا جب اللہ تعالیٰ کسی کو بد بخت بنانے کا ارادہ کرتا ہے تو ولی کی ذات کا سایہ انکے ساتھ ظاہر ہوتا ہے اور وہ ظل ان ہی امور کا مرتکب ہوتا ہے جس کے وہ خود مرتکب ہوتے ہیں۔ واللہ الموفق۔

نیز فرمایا: جو لوگ ولی کے پاس آتے ہیں وہ صرف ان کے باطن کو دیکھتا ہے۔ اس کے نزدیک ان کے ظاہر کا کوئی اعتبار نہیں ہوتا۔ آنے والوں کی چار قسمیں ہیں۔ پہلی قسم تو وہ ہے جن کا ظاہر و باطن ولی میں اعتقاد رکھنے میں ایک جیسا ہوتا ہے۔ یہ سب سے زیادہ خوش بخت ہوتے ہیں۔ دوسری قسم ان لوگوں کی ہے جن کا ظاہر و باطن ولی پر تنقید کے لحاظ سے ایک جیسا ہوتا ہے۔ تیسری قسم وہ ہے جو ظاہر میں تو معتقد ہوتے ہیں مگر باطن میں معترض۔ چوتھی قسم یہ لوگ ولی کے لیے سب سے زیادہ نقصان دہ ہوتے ہیں۔ جس طرح آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے لیے منافق تھے اس لیے کہ جب ولی ان کے ظاہر کو دیکھکر انہیں فائدہ پہنچانا چاہتا ہے تو ان کا باطن اسے اس بات سے روک دیتا ہے اور اگر ان کے باطن کو دیکھ کر ان سے دور رہنا چاہے تو ظاہر ان کی طرف راغب کرتا ہے۔

پھر فرمایا کہ ولی جس طرح ظاہر کا کلام سنتا ہے اسی طرح باطن کا کلام بھی سنتا ہے چنانچہ اس کے نزدیک یہ شخص ایسا ہوتا ہے جیسے ولی کے پاس دو شخص اس طرح بیٹھے ہوں کہ ایک دوسرے کے پیٹ میں ہو۔ باہر والا آدمی تو یہ کہہ رہا ہو کہ آپ میرے آقا ہیں اور میں آپ کا مطیع و فرمانبردار ہوں، لیکن اندر والا شخص کہے تو ولی نہیں ہے اور لوگوں کا جو خیال تمہارے متعلق ہے غلط ہے اور مجھے آپ کے بارے میں اور جو کچھ لوگ کہتے ہیں اس میں بھی شک ہے۔ وغیرہ وغیرہ۔ لہٰذا جس شخص کو باطن کا علم نہیں وہ اس قسم کو اور پہلی قسم کو ایک جیسا سمجھے گا۔ لہٰذا جب وہ پہلی قسم کو دیکھتا ہے کہ اسے ولی سے بہت برکت حاصل ہوئی ہے اور اسے بہت فائدہ ہوا ہے تو اپنے دل میں کہتا ہے کہ تیسری قسم کو فائدہ کیوں نہیں ہوا حالانکہ وہ بھی تو پہلے کی طرح ولی کا بہت ادب کرتا ہے اس کی خدمت کرتا ہے اور ان کے حکم کو مانتا ہے لہٰذا دل میں سوچتا ہے کہ ہو سکتا ہے کہ کمی ولی کی طرف سے ہو جس سے ولیوں پر نکتہ چینی اور وسوسہ پیدا ہونے کا دروازہ کھل جاتا ہے۔ اب رہی چوتھی قسم جو باطن میں تو معتقد ہوتے ہیں مگر ظاہر میں معترض۔ اس کا سبب محض حسد ہوتا ہے۔ نَسْأَلُ اللهَ السَّلَامَةَ وَالْعَافِيَةَ بِمَنِّهٖ وَ كَرَمِهٖ۔ آمین۔

ایک روز میں نے حضرت سے عرض کیا کہ یہ معارف جن کا ظہور آپ سے ہوتا ہے اور جن کے متعلق آپ گفتگو فرماتے ہیں کیا اس میں آپ کو قصد و ارادہ سے کام لینا پڑتا ہے یا نہیں؟

فرمایا: ولیِ کامل ہر لحظہ مشاہدۂ حق سبحانہٗ میں مستغرق ہوتا ہے مگر اس کا ظاہر مخلوقات کے ساتھ ہوتا ہے اللہ تعالیٰ اس کے ظاہر کو آنے والے کی قسمت کے مطابق ان کی طرف لگا دیتا ہے چنانچہ جس کی قسمت میں رحمت لکھی ہو اللہ تعالیٰ ولی کے ظاہر کو اس کے لیے چھوڑ دیتا ہے اور اس کی زبان سے علوم نکلنے لگتے ہیں اور اس سے وہ نیکیاں ظہور میں آتی ہیں جن کی کیفیت بیان نہیں ہو سکتی اور جسکی قسمت میں اس کے ہاتھوں کچھ ملنا نہیں لکھا ہوتا تو خدا ولی کو روک لیتا ہے اور معارف بیان کرنے سے وہ حجاب میں ہو جاتا ہے۔

پھر فرمایا کہ ولی کی مثال آنے والوں کے لیے بنی اسرآئیل کے پتھر کی طرح ہے۔ جب وہ پتھر اولیاء اللہ کے سامنے ہوا تو اس سے بارہ چشمے پھوٹ پڑے اور دشمنوں کے سامنے آیا تو اس سے ایک قطرہ بھی نہ نکلا۔

مؤلف کتاب کہتا ہے کہ واقعی میں نے بارہا اس بات کا مشاہدہ کیا ہے کہ جب آپ کے سامنے غیر معتقد شخص ہوتا تو آپ سے ایک مفید بات بھی نہ نکلتی تھی اور نہ ہی آپ علومِ لدنیّہ اور معارفِ ربّانیہ کی کوئی بات منہ سے نکالتے یہاں تک کہ وہ شخص اُٹھ جاتا اور ہمیں نصیحت فرماتے کہ جب اس قسم کا آدمی آئے تو جب تک وہ موجود رہے مجھ سے کچھ نہ پوچھا کرو۔ اس حکم سے پہلے ہم اس بات سے ناواقف تھے اور حضرت سے سوال کیا کرتے تھے اور ہمارا مقصد یہ ہوتا کہ آپ کے ذہن سے نفائس اور اسرارِ ربّانیہ نکلیں تاکہ آنے والا ان کو سنکر تائب ہو جائے اور جب سوال کرتے تو آپ کو کوئی اور ہی شخص پاتے جسے نہ ہم جانتے ہیں اور نہ وہ ہمیں جانتے ہیں اور گویا وہ علوم جن کا ظہور آپ سے ہوا کرتا تھا آپ کو کبھی آتے ہی نہ تھے۔ یہاں تک کہ آپنے اس کا سبب بیان کیا اور ہم اس راز کو سمجھ گئے۔ وَالْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْن۔

نیز فرمایا کہ ولیِ کبیر ظاہر میں لوگوں کو معصیت کرتا ہوا دکھائی دیتا ہے مگر دراصل وہ عاصی نہیں ہوتا صرف اتنا ہوتا ہے کہ روح اس کی ذات کو محجوب کر دیتی ہے تو وہ اپنی اصل صورت میں ظاہر ہو جاتی ہے چنانچہ اگر وہ معصیت کا کام کرے تو وہ درحقیقت نہیں ہوتی مثلاً اگر وہ حرام چیز کو کھائے تو صرف اتنا ہوتا ہے کہ وہ اس نے مُنہ میں ڈال لی ہوتی ہے ورنہ وہ جہاں چاہے اسے پھینک دیتا ہے۔ اس ظاہری معصیت کا سبب حاضرین کی بدبختی ہوتی ہے۔ خدا اپنی پناہ میں رکھے اور جب تو دیکھے کہ ولیِ کبیر سے کرامت کا ظہور ہوا ہے تو سمجھ لو کہ اللہ تعالےٰ نے حاضرین کے لیے خیر کا ارادہ کیا ہے اور معصیت کا ظہور ہو تو بدبختی کا اور جیسے ان لوگوں کی ارواح کرامت کی والی ہوتی ہیں اسی طرح ان کے

ظاہری معاصی کی بھی والی ہوتی ہیں۔

حضرت نے فرمایا کہ کبھی ولی پر شہود کا غلبہ ہوتا ہے تو اسے خطرہ لاحق ہو جاتا ہے کہ کہیں اس کی ترابی ذات فنا نہ ہو جائے اس لیے وہ ایسے امور کو عمل میں لاتا ہے جو اسے حس و شعور کی طرف لوٹا دیں اگرچہ وہ کام معیوب ہی کیوں نہ ہوں۔ یہ اس اصول پر عمل کرتے ہوتے ہوگا کہ جب دو نقصان دہ امر پیش آجائیں تو ان میں سے کم نقصان دہ کو اختیار کر لو دیا بفحوای اذا بلیت بِبَلِیَّتَیْنِ فاختراھونہا (الحدیث) لہٰذا جب کوئی شخص اسے یہ کام کرتے دیکھتا ہے اور اسے اس کام کے مرتکب ہونے کی وجہ معلوم نہیں ہوتی تو وہ فوراً ولی پر اعتراض کرنے لگ جاتا ہے جس کی وجہ سے وہ اس ولی کی برکت سے محروم ہو جاتا ہے۔ حالانکہ شریعت میں یہ ایک مسلمہ امر ہے کہ جب کسی عضو کو مرضِ آکلہ لاحق ہو جائے جس سے ہلاکت کا خطرہ ہو تو ذات کو بچانے کی غرض سے اس عضو کو کاٹ دینا جائز ہے حالانکہ وہ عضو بے گناہ ہے۔ اسی طرح جب کسی شخص کو بھوک کی وجہ سے جان کا خطرہ ہو تو اسے مردار پیٹ بھر کر کھانا جائز ہے اسی طرح کے دیگر مسائل ہیں جو اسی قاعدہ کے ماتحت آتے ہیں۔ یہ امور جو ولی کو اپنے حس و شعور کی طرف واپس لے آتے ہیں وہی امور ہوتے ہیں جن کی فتح سے پہلے اسے عادت پڑی ہوتی ہے اور تمہیں معلوم ہے کہ لوگوں میں مشہور ہے العادۃ فی الموت۔ بس اتنے اشارہ کو سمجھ جاؤ۔ تفصیل اور تصریح میں خطرہ[1] ہے۔ واللہ اعلم۔

نیز فرمایا کہ جب غیر ولی کی شرمگاہ کھل جائے تو اس سے فرشتے بھاگ جاتے ہیں کیونکہ ملائکہ پر حیا کا غلبہ ہے۔ یہ حکم حسی شرمگاہ کا ہے، لیکن اگر ولی کی شرمگاہ کھل جائے تو اس سے فرشتے نہیں بھاگتے اس لیے کہ وہ اگر شرمگاہ کو کھولتا ہے تو کسی صحیح اور جائز مقصد کے لیے کھولتا ہے لہٰذا اس کو کشف عورت پر بھی ستر عورت کا ثواب ملتا ہے کیونکہ اس نے واجب پر عمل کیا ہے، اگر وہ اقوی مصلحت نہ ہوتی تو کبھی ستر نہ کھولتا۔

---

[1] امام شعرانی نے ابو المواہب شاذلی سے اسی قسم کی تشریح نقل کی ہے چنانچہ فرماتے ہیں کہ بعض بزرگوں کے متعلق جو یہ سننے میں آیا ہے کہ لوگوں سے چھپنے کی غرض سے وہ محرمات کے مرتکب ہوتے تو اس کا قیاس اس شخص سے کرنا چاہیئے جس کے حلق میں لقمہ اٹک گیا ہو اور شراب کے بغیر وہ اسے نگل نہ سکتا ہو۔ یہی امام غزالیؒ کا قول ہے۔ پھر فرمایا کہ جب دنیوی زندگی بچانے کی خاطر یہ جائز قرار دیا گیا تو اُخروی زندگی بچانے کی خاطر تو اور بھی بہتر ہوگا۔

(لواقح الانوار: ۲: ۶۴)

میں نے پوچھا: وہ اتوی مصلحت کیا ہے جس کی بنا پر اس نے ستر عورت چھوڑ دیا یا کوئی ناشائستہ لفظ زبان سے نکالا ہے؟

فرمایا: ہر وہ چیز جو ذات کو اس کے حسی عالم کی طرف لائے اور اس پر اس کے ہوش و حواس کو واپس کرے۔ پس اگر کسی ایک شخص کے لیے کشفِ عورت اس کو واپس لانے کا موجب ہوگا تو یہ اس کا ارتکاب کرے گا اور اگر کسی اور شخص کے لیے بیہودہ گوئی اس کی موجب ہوگی تو بھی اس کا ارتکاب کرے گا اور اگر کوئی امر دنیوی کسی تیسرے شخص کے لیے اس کا موجب ہو تو بھی اس کا مرتکب ہوگا۔ علیٰ ہذا القیاس۔

میں نے سوال کیا کہ ذات کو ان امور کی جو اسے عالم حواس کی طرف لے آئیں، کیوں ضرورت پڑتی ہے؟ اور کیا یہ ذات عالم حس سے غائب ہو جاتی ہے۔

حضرت نے فرمایا: ہاں غائب ہو جاتی ہے۔ پھر اس کی ایک مثال بیان فرمائی کہ جس طرح ایک آدمی کے پاس چھ سو قنطار ہوں (چھ لاکھ رطل) اور وہ بوڑھا ہو چکا ہو، اس کی بینائی جاتی رہی ہو اور اپنے مال کا قطعاً انتظام نہ کر سکتا ہو۔ اس پر طرہ یہ کہ اس کی بہت سی اولاد ہو اور ہوں بھی سب کے سب چھوٹی عمر کے کہ کوئی کام کرنے کے قابل نہ ہو۔ پھر اس شخص نے اپنا مال تجارت کی غرض سے ایسے لوگوں کو دیا ہو جو سمندر کے سفر پر ایسے وقت میں نکلیں کہ ہلاکت کا خطرہ اور بچاؤ کی امید کم ہو اور اس نے اپنے اور اپنی اولاد کے لیے ایک پیسہ بھی نہ رکھا۔ بس مت پوچھو کہ اس کی عقل کا کیا حال ہوگا اس لیے کہ اس کی عقل تو کشتی والوں کے ساتھ ہوگی اور ذات سے اس کا تعلق بالکل منقطع ہو جائے گا اس وقت اسے دو آفتوں کا سامنا ہوگا۔ ایک یہ کہ اس کی ان رگوں کا منہ بند ہو جائے گا جن سے جسم کو غذا پہنچتی ہے۔ اس لیے کہ جب فکر کی توجہ کشتی کی طرف ہوگی تو اس سے حرارت میں جو جوش پیدا ہوگا اس سے رگیں جل جائیں گی۔

(مؤلف کہتا ہے اکہ میں نے ایک حافظِ قرآن اور عالم کو دیکھا ہے کہ اس کی عقل میں فتور آگیا تھا۔ وہ تدبیر، کیمیا اور خزانوں کی تلاش میں تھا۔ یہی حال اس کی عقل و فکر میں گھر چکا تھا۔ اس نے لوگوں سے ملنا جلنا کم کر دیا اور اس کا رنگ زرد ہوتا جاتا تھا اور کھانا بھی بہت کم کھاتا تھا اس کی حالت دن بدن خراب ہوتی گئی اور بالآخر وہ مر گیا۔ نَسْأَلُ اللّٰہُ السَّلَامَۃَ۔ اس کی وجہ وہی ہے جس کا ذکر حضرت نے کیا ہے کہ جسم کی غذا والی رگوں کے منہ بند ہو جاتے ہیں جس سے جسم کو تکلیف پہنچتی ہے اور اس کی تر و تازگی اور نزاکت زائل ہو جاتی ہے جس سے رنگ زرد پڑ جاتا ہے اور چہرہ مرجھا جاتا ہے، حتیٰ کہ فنا و ہلاک

ہو جاتا ہے۔ دوسری آفت یہ ہوتی ہے کہ جب عقل کشتی والوں کے ساتھ چلی جاتی ہے اور ذات سے منقطع ہو جاتی ہے اور پھر دیر تک ذات سے غائب رہتی ہے تو روح بھی ذات سے نکل جاتی ہے اور واپس نہیں آتی کیونکہ ابتدا میں فتح کے وقت وہ اپنی مرضی سے نہیں بلکہ مجبور ہو کر داخل ہوئی تھی لہٰذا جب اسے نکلنے کا موقع ملا اور نکل گئی تو پھر ہرگز واپس نہیں آتی۔ پس اگر ذات سے اللہ تعالیٰ کا وعدہ اس کی مدت عمر ختم کرنے کا ہے تو یہ اس کے مرض کی اور بیماریوں کے ظاہر ہونے کی ابتدا ہو گی یہاں تک کہ اللہ کا وعدہ پورا ہو جائے گا اور اگر اللہ کا وعدہ یہ ہو کہ اسے کچھ مدت اور زندہ رہنے دیا جائے تو روح اس عقل کے ساتھ ہی نکل جائے گی جو ذات کا راز ہوتی ہے اور ذات کا انتظام کرتی ہے اور یہ پاگل پنے کی ابتدا ہوتی ہے اور اگر اس شخص کو کوئی ایسا سبب مل جائے جو اسے پہلی حالت پر لے آئے اور کشتی والوں کو اس کی عقل سے نکال دے (کہ ان کا خیال بالکل ذہن سے نکل جائے) تو وہ ان دونوں آفتوں سے سلامت رہ سکتا ہے۔ فرمایا: یہی اولیاء اللہ کا حال ہے کہ ان پر غیبوبت اور محویت کا عالم طاری ہوتا ہے لہٰذا اگر تم انہیں دیکھو کہ وہ ہنسی اور بیہودہ باتیں کر رہے ہیں جن سے ان کی عقل واپس آ جائے اور ان کی ذات بچ جائے تو ان پر اعتراض کرنے میں جلدی نہ کرنا اس لیے کہ وہ اس بیہودہ گوئی وغیرہ کو ایک صحیح غرض کے لیے اختیار کر رہے ہیں چنانچہ جب تک ان کی ذات کا بقاء ہوتا ہے، لوگ ان سے فیضان حاصل کرتے ہیں۔

مؤلف کہتا ہے کہ بسا اوقات ایسا ہوا کہ ہم حضرت کے پاس ہوتے تو فرماتے، خوب شور مچاؤ کیونکہ اس سے تمہیں بہت فائدہ ہو گا۔ حتیٰ کہ ایک مرتبہ فرمایا کہ صاحب مشاہدہ کی مثال ایک گدھ کی سی ہے جو ہوا میں اُڑ رہا ہو اور بہت اونچا چلا گیا ہو۔ فرض کر لو کہ اس وقت تمام فضا میں تیز ہوا چل رہی ہو اور ایک شخص کے ہاتھ میں پتلی سی ڈور ہو جس سے یہ گدھ بندھا ہوا ہو چنانچہ جب یہ شخص دیکھتا ہے کہ گدھ بہت اونچا چلا گیا ہے اور اسے ڈر ہو جائے کہ کہیں ہوا اسے اتنی دور نہ لے جائے کہ یہ واپس ہی نہ آ سکے تو یہ شخص ڈور کو آہستہ آہستہ کھینچے گا۔ مگر اس کے ساتھ ہی اسے ڈور کے ٹوٹنے کا بھی ڈر ہوتا ہے۔ گدھ بھی آہستہ آہستہ نیچے اترتا چلا آ رہا ہوتا ہے، یہاں تک کہ مالک کے ہاتھ میں واپس آ جاتا ہے۔ اسی طرح جن امورِ فانیہ کی ذات ترابی کو عادت ہوتی ہے۔ اسے عالم حواس کی طرف واپس لے آتے ہیں۔

(مؤلف کہتا ہے) اس قسم کے جو واقعات عارفین سے پیش آتے ہیں اگر ہم ان کا ذکر کرنے لگیں تو اصل مقصد سے نکل جائیں گے۔

ولی سے بیعت کا مقصد

حضرت نے فرمایا کہ ولی سے بیعت کرنے کا مقصد اللہ کی طرف رہنمائی، ماسوا سے رغبت ہٹا لینا ہے لہٰذا جب طالب ولی سے اس بات کا مطالبہ کرے گا تو اسے بہت فائدہ ہوگا، لیکن اگر دنیوی حاجات اور اغراض کو چاہے اور رب کے متعلق کوئی سوال ہی نہ کرے اور نہ یہ پوچھے کہ اللہ کی معرفت کیسے حاصل ہو تو ولی اس سے ناراض ہو جاتا ہے۔ ایسی صورت میں اگر کسی مصیبت کے نازل ہونے سے بچ جائے (تو غنیمت سمجھے) اس کی کئی وجوہ ہیں۔ اول: یہ کہ ولی سے اس کو محبت اللہ کے لیے نہیں ہوتی محض اوپر اوپر سے ہوتی ہے اور اوپر اوپر کی محبت واضح خسارہ کی بات ہے۔ ایسے شخص پر نورِ حق نازل نہیں ہو سکتا۔ دوسرے یہ کہ جب ولی اس کا تعلق ماسوا سے دیکھتا ہے تو اسے اللہ سے بے تعلق پاکر اس سے نجات دلانا چاہتا ہے مگر طالب اس کے برعکس یہی چاہتا ہے کہ اس بے تعلقی کو بڑھائے۔ ولی یہ دیکھ رہا ہوتا ہے کہ اس نے کھجور کو چھوڑ کر انگار کو منہ میں لے لیا ہے۔ کھجور کیا ہے۔ اللہ کی معرفت اور اسی کا ہو لینا اور اس سے بے تعلقی اور ماسوا سے تعلق، دُنیا کی رغبت اور اس کی زیب و زینت کی طرف میلان انگار ہے۔ تیسرے یہ ہے کہ جب ولی اس کی بعض حاجات کو پورا کرنے میں اس کی موافقت کرتا ہے اور کشف کا ظہور ہوتا ہے تو بالعموم ایسا ہوتا ہے کہ طالب یہ سمجھنے لگتا ہے کہ اسی کا نام معرفت ہے اور اسی کی لوگوں کو رغبت ہوا کرتی ہے۔ اس کے سوا ان کی کوئی اور غرض نہیں ہوتی۔ یہ تمام باتیں گمراہی اور ولی کی ناراضگی کا سبب ہوتی ہیں۔

(مؤلف کہتا ہے کہ) ناراضگی کا ایک طرز یہ ہوتا ہے کہ ولی اپنی ذات میں اسے کوئی معصیت کی بات دکھا دیتا ہے یا کسی بات کے متعلق کہہ دیتا ہے کہ یوں ہوگی حالانکہ وہ ہونے والی نہیں ہوتی تاکہ وہ شخص اس کے پاس سے چلا جائے۔ واللہ اعلم۔

نیز فرمایا کہ عارفوں کے سماع کی بنا مشاہدۂ حق پر ہوتی ہے اور جو بول وہ سنتے ہیں، وہ ان کے لیے بمنزلہ ایک کشتی کے ہوتے ہیں جس کے ذریعہ سے وہ مشاہدہ کے سمندروں کو عبور کرتے ہیں۔ لہٰذا وہ ان امور پر اعتماد کرکے اس قسم کا مشاہدہ حاصل کرتے ہیں جس کی کیفیت بیان نہیں ہو سکتی اور اس کی وجہ یہ ہے کہ جس کا مشاہدہ ہوتا ہے وہ ذات حی و قیوم ہے جس کی نہ کوئی مثال اور نہ نظیر۔ اس لیے اس کی ذات ترابی کے لیے بجز حادثِ الفاظ کے اور ہے کیا۔ جس کا سہارا پکڑے کہ ذاتِ ترابی اسی کی عادی ہے اور اسی پر پیدا کی گئی ہے پھر فرمایا: جب ان کا مشاہدہ وسیع ہو جاتا ہے اور وہ کبار اولیاء میں سے ہو جاتا تو ان کا عشق ظاہری صورت میں مجازی عشق کے قریب آجاتا ہے جس کی وجہ سرور اور طرب ہے جو انہیں

مخلوقات میں حق تعالیٰ کے فعل کے مشاہدہ کے وقت حاصل ہوتا ہے چنانچہ جب وہ مشاہدہ کرتے ہیں تو ان کی روح کو اس قدر سرور حاصل ہوتا ہے جس کی کیفیت بیان نہیں ہو سکتی۔ یہاں تک کہ ایک ولی نے بلّی کو دیکھا کہ اپنے پنجہ سے اپنی گردن کھجا رہی ہے تو ولی پر گریہ طاری ہو گیا اور آنسو بہنے لگے اور اس نے بلّی کے سامنے سجدہ کرنا شروع کر دیا حتیٰ کہ اس کے سامنے کی زمین تر ہو گئی۔

میں نے عرض کیا: اس میں کیا راز ہے؟

فرمایا: روح نے اس بات کا مشاہدہ کیا کہ حق سبحانہٗ اس حرکت کے فاعل ہیں۔ اس لیے اس نے اللہ کے سامنے سجدہ کرنا اور رونا شروع کر دیا اور ذات نے بھی روح کی موافقت کی اور اسی کی طرح تمام حرکات کرنے لگی۔ لوگوں کو تو یہی دکھائی دیتا ہے کہ وہ بلّی کو سجدہ کر رہا ہے حالانکہ ولی روتے اور سجدہ کرتے وقت سوائے حق سبحانہٗ کے کسی چیز کا مشاہدہ نہیں کر رہا ہوتا لہٰذا اس کا رونا گریہ وزاری اور انکساری حق سبحانہٗ کے لیے ہی ہوتی ہے۔

نیز فرمایا: کہ یہ کیفیت اولیاء کو حاصل تو ہر وقت ہوتی ہے مگر اتنا فرق ہے کہ ذات جب اپنی عقل سے غائب ہو تو وہ اپنی روح کی موافقت کرتی ہے اور جب عقل سے غائب نہیں ہوتی تو عقل اسے اس سے روکتی ہے تاکہ ظاہر محفوظ رہے۔ چنانچہ تو ولی کو دیکھے گا کہ وہ درخت کی ٹہنی کو جھومتے دیکھ کر خود بھی جھومنے لگ جاتا ہے۔ اسی لیے تو یہ لوگ کہتے ہیں کہ اگر مولیٰ پتھر بھی مارے تو وہ ہمارے لیے پھولوں سے بھی زیادہ عزیز ہیں اس لیے کہ انہیں اللہ عزّوجلّ کے فعل کے مشاہدہ سے سرور حاصل ہوتا ہے۔ واللہ اعلم۔

نیز فرمایا کہ جب اللہ تعالیٰ کسی بندہ کو فتح نصیب فرماتا ہے تو اس وقت جس حالت میں بھی وہ ہوتا ہے، اسی پر قائم رہتا ہے خواہ وہ کسی قسم کی حالت میں ہو۔ اچھی ہو یا بُری۔ مثلاً قصاب وغیرہ کا پیشہ ہو، وہ اسی پر قائم رہے گا اور اس سے منتقل نہ ہوگا۔ اس لیے کہ اس میں تصنع پایا جاتا ہے اور صاحبِ فتح آدمی کے نزدیک تصنع کرنا شراب پینے اور اسی قسم کے دیگر گناہوں سے بھی بدتر ہے۔

نیز فرمایا کہ شام کے علاقہ میں رملہ کے آدمی کو جانتا ہوں کہ جب اللہ تعالیٰ نے اسے فتح نصیب کی تو اس وقت لوگ اس کی ہنسی اڑا رہے تھے جس طرح کہ فاس میں مُعَیزُو نامی شخص کی اڑاتے ہیں اور فتح کے بعد بھی وہ اسی حالت میں رہا۔

(مولف کہتا ہے) مُعیزُو مذکور کا یہ حال تھا کہ بچے وغیرہ دن بھر اس کے پیچھے لگے رہتے اور اس کی ہنسی اُڑاتے تھے۔

نیز فرمایا: میں ایک ایسے شخص کو جانتا ہوں جسے خدا نے فتح نصیب کی ہے اور فتح نصیب ہونے سے پہلے ڈھول بجایا کرتا تھا۔ فتح کے بعد بھی اس نے یہ پیشہ نہیں چھوڑا۔

(مؤلف کہتا ہے کہ) اس باب میں مَیں نے حضرت سے بہت سے اسرار سنے جن کا کتاب میں درج کرنا مناسب نہیں۔ واللہ اعلم۔

چھٹا باب

شیخ تربیت کا بیان۔ اس میں ضمناً ان شیوخ کا بھی ذکر کیا گیا ہے جنکے حضرت وارث ہوئے۔ تلقینِ ذکر۔ اسماءِ حسنیٰ اور حلقۂ درویشاں

مولف کہتا ہے کہ قصیدہ رائیہ کے مصنف نے شیخِ تربیت کی بحث کی ہے اور حضرت نے ان کے کچھ کلام کی تشریح فرمائی ہے اور چونکہ کتاب کا موضوع حضرت کے کلام کو جمع کرنا ہے اس لیے میں نے چاہا کہ وہ شرح یہاں لکھ دوں۔ چنانچہ مصنف رائیہ[1] کہتا ہے۔

۱- وَلِلشَّیخِ اٰیاتٌ اِذَا لَمْ تَکُنْ لَہٗ   فَمَا ھُوَ اِلَّا فِیْ لَیَالِی الْھَوٰی یَسْرِیْ

(ترجمہ: شیخ کی چند علامات ہیں اگر وہ علامات اس میں پائی نہ جائیں تو (سمجھ لو کہ) وہ خواہشات نفسانی میں بھٹکے پھر رہا ہے۔)

حضرت نے فرمایا کہ شیخ تربیت کی علامات واضح ہیں اور وہ یہ ہیں کہ لوگوں کی طرف سے وہ سلیم الصدر ہو اور وہ سمجھتا ہو کہ امتِ محمدیہ میں کوئی بھی اس کا دشمن نہیں ہے۔ سخی ہو۔ اگر اس سے کوئی چیز مانگی جائے تو دینے میں بخل نہ کرے اور اگر اس سے کوئی برائی کرے تو یہ اس سے محبت کرے اور مریدوں کی غلطیوں سے تغافل برتے۔ جس میں یہ علامات نہ پائی جائیں، وہ شیخ تربیت نہیں ہو سکتا۔

۲- اِذَا لَمْ یَکُنْ عِلْمٌ لَدَیْہِ بِظَاھِرٍ   وَلَا بَاطِنٍ فَاضْرِبْ بِہٖ لُجَجَ الْبَحْرِ

(ترجمہ: اگر اسے ظاہری اور باطنی علم نہ ہو تو اسے سمندر کی موجوں میں پھینک دو۔)

حضرت نے فرمایا: علمِ ظاہر سے مراد علمِ فقہ اور علمِ توحید ہے یعنی اسے ان دونوں کا اس قدر علم ہو جس قدر کہ ایک مکلّف کو ہونا چاہیئے اور علمِ باطن سے مراد معرفتِ حق ہے۔

---

[1] مصنف رائیہ کا حال مؤلف کتاب نے خود قصیدہ کے اختتام پر دیدیا ہے۔

۳۔ وَاِنْ کَانَ اِلَّا اِنَّہٗ غَیْرُ جَامِعٍ ۔۔۔ بِوَصْفَیْہِمَا جَمْعًا عَلَی اَکْمَلِ الْاَمْرِ

۴۔ فَاَقْرَبُ اَحْوَالِ الْعَلِیْلِ اِلَی الرَّدٰی ۔۔۔ اِذَا لَمْ یَکُنْ مِنْہُ الطَّبِیْبُ عَلٰی خُبْرٍ

(ترجمہ: اور اگر شیخ کو ملے مگر وہ ان دونوں علموں کا بطریقِ کمال جامع نہ ہو تو اسے سمجھ لو کہ اس سے بجائے فائدہ کے نقصان ہوگا اس لیے کہ) جب طبیب کو مریض کے مرض کا علم نہ ہو تو مریض کی حالت ہلاکت کے زیادہ قریب ہوتی ہے۔)

حضرت نے فرمایا: اگر پیر تو ہو مگر اس میں کامل طور پر علمِ ظاہر اور علمِ باطن نہ ہو تو مرید کی حالت اس کے ساتھ ہوتے ہوئے بھی ہلاکت سے زیادہ قریب ہوگی۔ مطلب یہ ہے کہ یہ پیر جو اپنے علم کے ناقص ہونے کی وجہ سے یہ نہیں جانتا کہ مرید کے لیے کونسی بات نقصان دہ ہوگی تو اس بات کا زیادہ احتمال ہے کہ مرید ہلاکت سے زیادہ قریب ہو جائے۔

حضرت منصورؒ قطب فرمایا کرتے تھے جب تجھے پیرِ کامل کی صحبت نصیب ہو جائے تو تجھے اپنی مرضی کو اس کی مرضی میں فنا کر دینا چاہیے اور تمہاری یہی خواہش ہو کہ ان کی زندگی ہی میں مر جاؤں۔ دوسرے کے ساتھ تندرست رہنا ہی عجیب بات ہے اور تمہارا وصل سب سے زیادہ عجیب وغریب ہے۔

۵۔ وَمَنْ لَّمْ یَکُنْ اِلَّا الْوُجُوْدُ اَقَامَہٗ ۔۔۔ وَاَظْہَرَہٗ مَنْشُوْرُ اَلْوِیَةِ النَّصْرِ

۶۔ فَاَقْبَلَ اَرْبَابُ الْاِرَادَةِ نَحْوَہٗ ۔۔۔ بِصِدْقٍ یُحِلُّ الْعُسْرَ فِیْ جَلْمَدِ الصَّخْرِ

۷۔ وَاٰیَتُہٗ اَنْ لَا یَمِیْلَ اِلَی الْہَوٰی ۔۔۔ وَدُنْیَاہُ فِیْ طَیٍّ وَاُخْرَاہُ فِیْ نَشْرٍ

(ترجمہ: اور جسے صرف اس کے اپنے وجود نے منصبِ پیری پر کھڑا کر دیا ہو اور تائیدِ ایزدی کے پھیلے ہوئے جھنڈوں نے اسے ظاہر کر دیا ہو جس کی وجہ سے مرید بننے والے اس کے پاس ایسے صدقِ دل سے آتے جاویں کہ سخت سے سخت پتھر بھی پھٹ جائے اور اس کی علامت یہ ہے کہ وہ خواہشاتِ نفس کی طرف مائل نہ ہو اور دنیا کی بجائے اسے آخرت سے رغبت ہو)

حضرت نے فرمایا: جس شخص کو کسی پیر نے اجازت دے کر منصبِ پیری پر کھڑا نہ کیا ہو کیونکہ اس کے کمال کو پہنچنے سے پہلے ہی اس کی وفات ہوگئی ہو مگر لوگوں نے اسے لا کھڑا کیا ہو اور اسے اس طرح ظاہر کر دیا ہو جس طرح فتح ونصرت کی جھنڈیاں۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے مریدوں کے نفوس وخواہشات اور شیاطین کے خلاف فتح کی جھنڈیاں پھیلا دی ہوں جس کی وجہ سے وہ مرید جنہیں قربِ الٰہی کی خواہش ہوتی ہے ایسی صدقِ دلی سے اس کے پاس آنے لگیں کہ پتھر بھی پھٹ جائیں تو ایسا پیر بھی اللہ کے ہاں مقبول ہوگا انکا

مطلب یہ ہے کہ ہو سکتا ہے کہ اس نے رجال الغیب کے ہاتھوں تکمیل کرلی ہو یا یہ کہ حضرت احمد خضرؑ کے ہاتھوں پر بیعت ہوا ہو تو اس کی ظاہری علامت کہ وہ پیر ہونے کا اہل ہے یہ ہے کہ وہ تربیت کرنے میں خواہشات نفسانیہ کی طرف مائل نہ ہو۔ اسے دنیا سے اعراض ہو اور آخرت کی طرف توجہ۔

۸- وَاِنْ کَانَ ذَا جَمْعٍ لِاَکْلِ طَعَامِہٖ مُرِیْدُ فَلَا تَصْحَبْہُ یَوْمًا مِنَ الدَّھْرِ

(ترجمہ:۔ اے مرید اگر یہ لوگوں کو اپنے پاس کھانا کھلانے کی غرض سے جمع کرتا ہے تو ایک دن بھی اس کی صحبت اختیار نہ کرو۔

فرمایا: اگر شیخ تربیت لوگوں کو اپنے پاس کھانا کھلانے کی نیت سے جمع کرتا ہو تو تُو نہ اس کے پیچھے لگ اور نہ اس کی صحبت اختیار کر۔ مطلب یہ ہے کہ اگر وہ لوگوں کو اپنے کھانے پر جمع کرتا ہے مگر ان میں

لہ احمد خضرؑ: ان کے نام میں بہت اختلاف پایا جاتا ہے۔ صوفیاء میں ان کی کنیت ابوالعباس اور احمد نام مشہور ہے حضرت ابوہریرہؓ کی روایت سے ایک صحیح حدیث میں ہے کہ ان کو خضر اس لیے کہا گیا ہے کہ یہ بنجر زمین پر بیٹھے تو وہ ہری بھری ہو گئی اس لیے ان کا نام خضر پڑ گیا۔ علامہ ابن حجرؒ نے (فتح الباری ج ۶ ص ۳۳۵ تا ص ۳۳۸) ان کے نام اور زمانہ کے متعلق مختلف اقوال نقل کیے ہیں۔ پھر ان کے نبی یا ولی ہونے کے متعلق علماء کا اختلاف نقل کیا ہے اور فرمایا ہے کہ اکثر اہلِ علم کا یہی خیال ہے کہ وہ نبی تھے اور ایک ضعیف حدیث میں خضر کی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے ملاقات کا بھی ذکر ہے صوفیاء کے ہاں اولیاء اللہ کی خضر سے ملاقات کے بہت سے واقعات پائے جاتے ہیں۔ ابن حجرؒ فرماتے ہیں کہ مجھے اچھی سند کی ایک ہی اثر ملی ہے۔ جس کی روایت یعقوب بن سفیان نے اپنی تاریخ میں کی ہے کہ ریاح بن عبیدہ نے ایک شخص کو عمرؒ بن عبدالعزیز کے ساتھ ساتھ چلتے دیکھا جب عمرؒ واپس آئے تو لوگوں نے پوچھا یہ کون شخص تھا۔ حضرت عمرؒ نے کہا کیا تو نے اسے دیکھ لیا ہے، میں نے عرض کیا ہاں۔ فرمایا تو مجھے نیک آدمی معلوم ہوتا ہے (اس لیے میں تمہیں بتا دیتا ہوں کہ) یہ شخص خضر تھے اس نے مجھے اس بات کی خوشخبری دی ہے کہ میں عنقریب خلیفہ بنوں گا اور عدل کروں۔ شیخ کمال الدین محمد بن محمد المعروف بامام الکاملیہ متوفی ۸۷۴ھ ۱۴۶۹ء نے ایک رسالہ فی الخضر علیہ السلام وحیوتہ لکھا ہے (کشف الظنون ج ا ص ۴۲) ابوالفرج عبدالرحمن بن علی بن الجوزی متوفی ۵۹۷ھ نے عجالۃ المنتظر لشرح حال الخضر لکھی جس میں انھوں نے خضر کے زندہ ہونے کی تردید کی ہے (خفاجی: ۲: ۲۲۳) اور کشف الظنون: ۲: ۱۸) نیز امام محمد بن محمد بن الخضرمی متوفی ۸۹۴ھ نے "الروض النضر فی احوال الخضر" لکھی (خفاجی ۴: ۶۸ اور کشف الظنون ج ا: ۴۴۴) اس پر کسی یمنی کو غصہ آیا تو اس نے اس کے رد میں "الاعتراض فی دفع الاعتراض" لکھی (کشف الظنون ج ا: ۴۴۰) شعرانی (الانوار القدسیہ ج ا: ۴) کہتے ہیں خضر زندہ ہیں۔ مریدِ شیخ حسن عراقی کی ان سے ملاقات ہوئی۔

فتح کا کوئی اثر نہیں ہوتا تو لوگوں کا یہ اجتماع محض کھانے کے لیے ہوگا اللہ کے لیے نہیں۔ البتہ اگر وہ لوگوں کو اللہ کی طرف لانے کی غرض سے جمع کرتا ہے اور کھانا بھی کھلاتا ہے تو اس شخص کے پیر ہونے میں کوئی حرج نہیں۔

۹- وَلَا تَسْأَلَنْ عَنْهُ سِوٰى ذِىْ بَصِيْرَةٍ   خَلِىٍّ مِنَ الْاَهْوَاءِ لَيْسَ بِمُغْتَرٍ

(ترجمہ: شیخ کا اگر پتہ پوچھنا ہو (کہ کہاں ملے گا) تو صاحب بصیرت، تعصب سے پاک اور اس شخص کے سوا جو دھوکا نہ کھائے ہوئے ہو، کسی اور سے نہ پوچھو)

حضرت نے فرمایا کہ شیخ تربیت کی نسبت صرف اس شخص سے دریافت کرو جس میں تین شرطیں پائی جائیں۔ (اول یہ کہ) صاحب بصیرت ہو (دوسرے یہ کہ) خواہش نفس سے خالی ہو (اور تیسرے یہ کہ) دھوکے میں نہ ہو۔ صاحب بصیرت کی شرط اس لیے لگائی تاکہ پیر سالک محض نہ ہو کہ اسے دلوں کے معاملے کا پتہ نہیں ہوتا اس لیے اگر اس سے شیخ تربیت کے متعلق دریافت کیا جائے گا تو وہ ایسے شیخ کا پتہ بتائے گا جو اس سے زیادہ مجاہدہ کرنے والا، زیادہ اوراد پڑھنے والا اور جسے وظائف زیادہ یاد ہوں گے۔ اس لیے کہ اس کے نزدیک یہی سلوک کا انتہائی مقصد ہے اور سالکوں میں فرق کا مدار اوراد کی کمی اور بیشی پر ہے سالک محض پیر بننے کا اہل نہیں ہے اور نہ اس درجہ تک پہنچ سکتا ہے متعصب نہ ہونے کی شرط اس لیے لگائی کہ خواہ وہ صاحب بصیرت ہی کیوں نہ ہو، اگر اس میں کسی شیخ کی طرف میلان پایا جاتا ہے تو اسی کا پتہ دے گا اور دھوکہ میں پڑا نہ ہو اس لیے کہا کہ وہ ایسا شخص نہ ہو جسے شیخ تربیت کے اوصاف کا علم ہی نہ ہو لہٰذا اگر ایسے شخص سے شیخ تربیت کی نسبت پوچھا جائے تو وہ مجذوب محض کا پتہ دیگا اس لیے کہ اس کے نزدیک معرفت الٰہیہ میں قوت اور فنائیت اسی کو حاصل ہے اور درحقیقت مجذوب محض نہ پیر ہونے کا اہل ہے اور نہ اس درجہ تک پہنچ سکتا ہے۔

۱۰- فَمَنْ صَدِئَتْ مِرْاٰةُ فَهْمِهٖ (؎)   اَرَتْهُ بِوَجْهِ الشَّمْسِ مِن كَلَفِ الْبَدْرِ

۱۱- وَمَنْ لَّمْ يَكُنْ يَدْرِى الْعُرُوْضَ فَرُبَّمَا   يَرَى الْقَبْضَ فِى التَّطْوِيْلِ مِنْ اَقْبَحِ الْكَسْرِ (؎)

(ترجمہ: جس کی فہم کا آئینہ زنگ آلود ہو جائے تو اسے سورج کے چہرہ پر بھی چاند جیسی چھائیاں دکھائی دیں گی اور جسے علم عروض نہ آتا ہو وہ بحر طویل میں قبض پڑنے سے پانچویں حرف کے گرنے کو

؎ دسویں شعر کا پہلا مصرعہ وزن سے خارج ہے۔ میں نے ہر چند کوشش کی کہ اسے موزوں کر دیا جائے مگر نہ ہو سکا۔ ۱۲

؎ قبض پانچویں ساکن کو گرانے کو قبض کہتے ہیں۔ جیسے مفاعلن سے پانچواں حرف ی گرا کر مفاعلن رہ گیا اور یہ بحر طویل میں اکثر ہوتا ہے مگر جسے عروض کا علم نہ ہوگا وہ اسے بہت بڑا عیب سمجھے گا۔ ۱۲

بہت ہی قبیح سمجھے گا۔)

حضرت نے فرمایا: جس کی فہم کا آئینہ زنگ آلود ہو جائے تو اسے سورج کے چہرہ پر بھی اسی قسم کی سیاہی دکھائی دے گی جس قسم کی چاند کے چہرہ پر ہوتی ہے اس لیے کہ اس کو حقائق بالکل معکوس دکھائی دیں گے۔ ان کی مراد یہ ہے کہ جو شخص اہلِ بصیرت نہ ہوگا اسے شیخِ کامل میں بھی عیب نظر آئیں گے لہٰذا وہ اس سے دور بھاگے گا اور اسے سالکِ محض میں کمال دکھائی دے گا۔ اس لیے اس کا ہی پتہ دے گا اور جو اوزانِ شعر سے ناواقف ہوگا وہ یہی سمجھے گا کہ بحرِ طویل میں پانچویں حرف کا گرنا بہت ہی قبیح عیب ہے۔ اسی طرح جسے اوصافِ شیخ تربیت کے متعلق صوفیاء کی اصطلاح کا علم نہ ہو وہ شیخِ کامل کو بھی مبتدی سمجھے گا اس لیے اس سے بھاگ کر مجذوب کا پتہ دے گا حالانکہ وہ شیخ ہونے کا اہل ہی نہیں ہے (موتف کہتا ہے کہ) شاعر کا مقصد یہ ہے کہ جب شیخ علمِ ظاہر اور علمِ باطن سے عاری ہو یا اگر جانتا ہو مگر ان میں کامل نہ ہو تو اس کی صحبت اختیار کرنے میں کوئی فائدہ نہیں، لیکن اگر ان علوم کو بدرجہ کمال جانتا ہو اور اس میں مذکورہ بالا علامات بھی پائی جاتی ہوں تو وہ شیخ بن سکتا ہے۔ یہ اس صورت میں کہ اس کا پیر اُسے اپنی زندگی ہی میں اس کام کے لیے اجازت دے جائے، لیکن اگر پیر اس سے پہلے ہی وفات پا جائے اور وہ اپنے پیر کی زندگی ہی میں کامل نہ ہو تو پھر اگر اس پر فتح کی علامات اور لوگوں کو فیض رسانی کے آثار ظاہر ہوں۔ دنیا سے اسے نفرت اور آخرت کی طرف توجہ ہو اور اس کے ہاتھوں مریدوں کو بھی فتح نصیب ہو تو یہ شخص بھی شیخ بن سکتا ہے ورنہ اگر اس کے کھانے پر محض لوگوں کا اجتماع ہوتا ہو تو اس قسم کے شخص سے واقفیت سے کوئی فائدہ نہیں۔ اگر کوئی شخص شیخ تربیت کے متعلق دریافت کرنا چاہے تو اسے صرف انہی لوگوں سے دریافت کرنا چاہیئے۔ جن میں مذکورہ بالا تین صفات موجود ہوں۔ اس لیے کہ دوسرا شخص الٹ بات بتائے گا۔

اس کے بعد مصنفِ قصیدہ ان آداب کا ذکر کرتا ہے جن کا مرید کو پیر کی صحبت میں خیال رکھنا چاہیئے۔

۱۲۔ وَلَا تَقْدَمْ مِنْ قَبْلِ اِعْتِقَادِكَ اَنَّهُ — مُرَبٍّ وَلَا اَوْلٰى بِهَا مِنْهُ فِي الْعَصْرِ
فَاِنَّ رَقِيْبَ الْاِلْتِفَاتِ بِغَيْرِهِ — يَقُوْلُ لِمَحْبُوْبِ السِّرَايَةِ لَا تَسْرِ

(ترجمہ: جب تک تمہارا یہ اعتقاد نہ ہو کہ پیر مربّی ہے اور یہ کہ زمانہ بھر میں اس سے بہتر تربیت کرنے والا موجود نہیں۔ اس وقت تک تو پیر کی طرف قدم نہ بڑھا کیونکہ جب پیر اوروں کی طرف مرید کی توجہ دیکھتا ہے تو اس شخص کو جس کا (راہِ طریقت پر) چلنا اسے محبوب ہوتا ہے۔ اسے

بھی وہ یہی کہہ دیتا ہے کہ نہ چل)

حضرت نے فرمایا: شیخ کی صحبت میں آنے کی غرض سے اس وقت تک آگے نہ بڑھ جب تک تیرا یہ عقیدہ نہ ہو کہ وہ تربیت کرنے کا اہل ہے اور اس زمانہ میں اس سے بہتر تربیت کرنے والا نہیں پایا جاتا۔ اس لیے کہ اگر شیخ کو معلوم ہو جاتا ہے کہ مرید کی توجہ کسی اور کی طرف ہے تو وہ مادہ کو اس سے منقطع کر لیتا ہے اور وہ مرید جو شیخ کی صحبت میں داخل ہونے کے بعد بھی یہ خیال رکھے کہ دنیا میں کوئی ایسا اور پیر موجود ہے جو اس کے پیر سے زیادہ کامل ہے تو اس کی نگاہ اسی کی طرف لگی رہے گی جس کو وہ زیادہ کامل سمجھتا ہے لہٰذا اس کا پیر مادہ کو اس سے منقطع کر دے گا۔ اس طرح مرید نہ پہلے سے فیض یاب ہو سکے گا، نہ دوسرے سے۔ فرمایا: ہم نے اپنے زمانہ میں اکثر ایسا ہوتے دیکھا ہے۔ خدا ہمارا والی اور مددگار ہو۔

۱۴- وَمِنْ بَعْدِهِ الشَّيْخُ الَّذِي هُوَ قُدْوَةٌ ۔ يُلَقِّنُ مُرَادَ الْحَقِّ فِي السِّرِّ وَالْجَهْرِ

(ترجمہ: اس کے بعد وہ شیخ آتا ہے جو پیشوا ہے اور ظاہر اور باطن میں مراد حق کی تلقین کرتا ہے)

حضرت نے فرمایا: مقام تربیت حاصل کرنے کے بعد ایسے شیخ کی تلاش کر جو مربی ہو اس لیے کہ وہ طریق احوال میں نفس کی اصلاح کی طرف متوجہ ہوگا اور اس کا فائدہ یہ ہے کہ وہ ظاہر اور باطن میں بندے کو مراد حق بتائے گا۔ پھر فرمایا: ایسے شخص کا ہونا ضروری ہے جو تجھے شیخ کا پتہ دے گا اور تجھے بتائے گا کہ تو شیخ سے کس طرح ملے اور کس طرح اس کے پاس بیٹھے اور اگر وہ ایسا نہ ہوگا تو جان لو کہ تو ایسا مریض ہے جس کے لیے کوئی طبیب نہیں خواہ تو جو چاہے کرے۔

۱۵- فَقُمْ وَاجْتَنِبْ مَاذَمَّهُ الْعِلْمُ وَاجْتَلِبْ ۔ لِمَا خَصَّهُ بِالْمَدْحِ فَهُوَ جَنَى الدُّرِّ

(ترجمہ:- پس اٹھو اور ان امور سے پرہیز کرو جن کی علم مذمت کرے اور جس کی علم مدح کرے اسے طلب کرو کیونکہ یہی چننے کے قابل موتی ہے۔)

فرمایا: جب تجھے اللہ تعالیٰ ایسا شیخ عطا کر دے جو تمہاری تربیت کرے تو اس کی خدمت کے لیے اٹھ کھڑا ہو اور اس کی صحبت کا حق پہچان اور اسے اللہ کی معرفت حاصل کرنے کا وسیلہ بنا ہو سکتا ہے کہ تو بھی معرفت الٰہی حاصل کرے لیکن اس کے ساتھ ساتھ جن افعالِ مذمومہ کو شرع معیوب قرار دے انہیں چھوڑ دے اور جن کی شریعت نے تعریف کی انہیں حاصل کر اور یہی معنی موتی چننے کا ہے۔ مطلب یہ کہ شرعاً مذموم امور سے پرہیز کرنے اور ممدوح امور کو حاصل کرنے کا نام تقویٰ ہے اور اسی پر تمہارے تمام احوال و مقامات کی بنیاد رکھی جائے گی۔

۱۶- وَاِنْ تَسْمُ نَحْوَ الْفَقْرِ نَفْسُكَ فَاطَّرِحْ   هَوَاهَا دَجَانِبْهُ مُجَانَبَةَ الشَّرِّ

(ترجمہ: اگر فقر کی طرف تمہارا نفس اٹھے تو نفس کی خواہشات کو پھینک دے اور ان سے اس طرح پرہیز کر جس طرح شر سے پرہیز کیا جاتا ہے۔)

فرمایا: اگر تمہاری ہمت طریق فقر یعنی تصوف کی طرف بلند ہو تو ان عبادات اور قربت کے امور کو جنہیں نفس نے شیخ کے حکم کے بغیر اختیار کر رکھا ہے ترک کر دے اور اس بارے میں ہوائے نفس سے اس طرح دور رہ جس طرح شر سے رہا جاتا ہے (کیونکہ نفس تو اسے بظاہر عبادت سمجھتا ہے اور چھوڑنا نہیں چاہتا مگر چونکہ یہ شیخ کے حکم کے بغیر کی گئی ہے اس لیے اسے چھوڑ دینا چاہیئے) مقصد یہ ہے کہ مرید کی فلاح انہی اعمال میں ہے جنہیں شیخ کرنے کو کہے نہ کہ ان امور میں جنہیں وہ خود اپنے لیے اختیار کرے اور اگر اختیار کرے گا تو تباہ ہو جائے گا۔

(مؤلف کتاب کہتا ہے) کئی ایک مرید اسی وجہ سے تباہ ہو گئے۔ کیونکہ مرید نور بصیرت حاصل ہونے سے پہلے اگر خود بخود نوافل پڑھنے اور روزے رکھنے لگ جائے تو ایسا بھی ہوتا ہے کہ یہ شہرت اور ریا کی خاطر کیا گیا ہوتا ہے تو یہ عمل ماسوا کے لیے ہو جاتا ہے لیکن اگر مرید کو شیخ مربی مل جائے تو وہ پہچان جاتا ہے کہ یہی اس کا مرض ہے اس لیے وہ ان امور سے اسے ہٹانا چاہتا ہے اگر مرید مان جائے اور اللہ کی عنایت بھی شاملِ حال ہو تو پیر وہ اعمال کرنے کو کہتا ہے جو اس کے مناسب ہوتے ہیں اور اس کی ایسی حالت کر دیتا ہے جو اللہ کے ہاں پسندیدہ ہو، لیکن اگر مرید نہ مانے اور کہے دیکھو ہم تو شیخ کے پاس اس لیے آئے تھے کہ ہمیں شیخ اور عبادت کرنے کو کہیں گے اور یہ لگا کرنے کمی اور اس کی نیت شیخ مربی کے متعلق فاسد ہو جاتی ہے یہ وہ شخص ہے جس پر شیطان کا قبضہ ہو چکا ہوتا ہے اور ریا کی بیماری اس میں جڑ پکڑ چکی ہوتی ہے۔ نَسْأَلُ اللّٰہَ السَّلَامَةَ وَالْعَافِیَةَ بِمَنِّہٖ وَکَرَمِہٖ اَجْمَعِیْنَ۔

یہاں ہم صحابہ رضوان اللہ علیہم کی ایک جماعت کا قصہ نقل کرتے ہیں۔ یہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے گھر آتے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی عبادت، شب بیداری اور روزوں کے متعلق ازواج مطہرات سے دریافت کیا۔ انہوں نے آنحضرتؐ کی عبادت کا ذکر کیا تو انہوں نے اسے بہت کم خیال کیا اور کہنے لگے ہم نبی صلی اللہ علیہ وسلم جیسے نہیں ہیں کیونکہ اللہ تعالیٰ نے ان کے اگلے پچھلے تمام گناہ معاف کر دیے ہیں۔ پھر ایک نے کہا کہ میں تو ہمیشہ روزے رکھا کروں گا اور دوسرے نے کہا کہ میں تو رات بھر عبادت کرتا رہوں گا اور ہرگز نہ سوؤں گا اور تیسرے نے کہا میں عورت کے پاس نہ جاؤں گا۔ ان کے جانے کے بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لاتے تو حضرت عائشہؓ نے بتلا دیا جو کچھ ان تینوں نے کہا تھا۔ اس پر آنحضرت

صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں بلایا اور فرمایا کہ میں تم سب سے زیادہ خدا سے ڈرنے والا ہوں۔ زیادہ پرہیزگار ہوں اور تم سے زیادہ اللہ کو جانتا ہوں۔ میں روزہ رکھتا بھی ہوں اور نہیں بھی رکھتا۔ شب بیداری بھی کرتا ہوں اور سوتا بھی ہوں اور عورت کے پاس بھی جاتا ہوں۔ لہٰذا جس نے میری سنت سے اعراض کیا اس کا مجھ سے کوئی تعلق نہیں اور یہ آیت نازل ہوئی: یَا اَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تُحَرِّمُوْا طَیِّبَاتِ مَا اَحَلَّ اللہُ لَکُمْ وَلَا تَعْتَدُوْا اِنَّ اللہَ لَا یُحِبُّ الْمُعْتَدِیْنَ (مسلمانو! اللہ نے جو پاک چیزیں تمہارے لیے حلال قرار دی ہیں، انہیں حرام نہ بناؤ اور نہ ہی حد سے تجاوز کرو کیونکہ اللہ حد سے بڑھنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔ سورۂ مائدہ آیت: ۸۷)

راویوں میں اختلاف ہے کہ یہ لوگ کون تھے۔ بعض نے حضرت عثمان[۱] بن مظعون، عبداللہ بن مسعود[۲] اور ابوہریرہ رضی اللہ عنہم کو بتایا ہے۔ بعض نے سعد بن ابی وقاص[۳] کو ان میں شمار کیا ہے۔ بعض نے علی بن ابی طالب اور عبداللہ[۴] بن عمرو بن العاص کو اور بعض نے ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہم کو۔

خدا تجھے توفیق دے۔ دیکھو آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے انہیں نوافل زیادہ پڑھنے میں ہوائے نفس سے ہٹا کر کیسے اس عمل پر لوٹا دیا جو اللہ کے ہاں محبوب ہے اور متوسط طریقہ کو ان کے لیے کیسے اختیار کیا۔ شیوخ اپنے توفیق یافتہ مریدوں کے ساتھ جو کچھ کیا کرتے ہیں یہ اس کی بہت بڑی دلیل ہے۔ اوروں کے متعلق ہم بحث نہیں کر رہے۔

---

[۱] عثمانؓ بن مظعون: مشہور صحابی ہیں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لانے والوں میں یہ چودھویں ایمان لانے والے تھے۔ پہلے حبشہ کی طرف ہجرت کی پھر مدینہ کی طرف۔ انھوں نے جاہلیت میں ہی اپنے اوپر شراب حرام کر رکھی تھی۔ ہجرت کے بعد مسلمانوں میں یہ پہلے شخص ہیں جو فوت ہوئے اس وقت ہجرت کو اڑھائی سال گزر چکے تھے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے موت کے بعد ان کے چہرہ کو بوسہ دیا۔ ۱۲

[۲] عبداللہؓ بن مسعود: ابھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ارقم کے گھر نہیں گئے تھے کہ یہ ایمان لائے۔ بعض کا خیال ہے کہ ایمان لانے والوں میں یہ چھٹے تھے۔ یہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے خاص صحابہ میں سے تھے۔ حضرت کی نعلین، مسواک اور وضو کے پانی کا انتظام انہی کے سپرد تھا۔ ۳۲ھ ۶۵۲ء میں وفات پائی۔

[۳] سعدؓ بن ابی وقاص: ابواسحاق سعد بن ابی وقاص مشہور صحابی ہیں اور عشرۂ مبشرہ میں سے ہیں۔ پہلے شخص ہیں جنھوں نے اللہ کی راہ میں تیر چلایا۔ اصحاب شوریٰ کے چھ آدمیوں میں سے تھے نیز ان چھ صحابیوں میں سے تھے جن پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم وفات تک راضی رہے۔ ان کی دعا مقبول ہوتی تھی۔ مدینہ سے دس میل کے فاصلہ پر عقیق میں تراسی برس کی عمر میں ۵۵ھ ۶۷۵ء میں وفات پائی۔

[۴] عبداللہؓ بن عمرو بن العاص: ان کا ذکر پہلے آچکا ہے

میں نے ایک شخص کو دیکھا کہ ایک شیخ کے پاس بغرض بیعت آیا۔ یہ شخص بہت ہی عبادت کیا کرتا تھا، یہاں تک کہ ایک رات میں ایک قرآن ختم کیا کرتا اور دن میں کئی بار دلائل الخیرات کا ورد کرتا اور ہمیشہ روزے رکھتا چنانچہ اس کا رنگ زرد پڑ گیا اور اس کی حالت مردوں کی سی ہو گئی۔ شیخ نے اسے آہستہ آہستہ نیچے اتارنا اور ایک حالت سے دوسری حالت کی طرف منتقل کرنا شروع کیا، یہاں تک کہ وہ اسے اعتدال پر لے آئے اس کے بعد حضرت نے اسے ایک دن کہا ارے تجھے اللہ نے کس قدر تھکان سے آرام وراحت بخشا ہے۔ مرید کہنے لگا حضرت اللہ آپ کو جزاء خیر دے۔ ہمارے اعمال تو محض ریاء کی غرض سے تھے اور ہم غیر اللہ کے لیے عبادت کیا کرتے تھے اور اللہ تعالیٰ نے آپ کی برکت سے اس سے راحت بخش دی۔

ایک مرتبہ مجھ سے حضرت نے کہا: اگر کوئی انسان نوافل نہ پڑھے تو اللہ تعالیٰ اس پر آخرت میں گرفت نہ کرے گا، لیکن اگر اس نیت سے نوافل پڑھے کہ لوگ اسے دیکھکر اس کی تعریف کریں تو اس پر اسے قیامت میں سزا ملے گی کیونکہ ریا معصیت ہے۔

نیز فرمایا: جو شخص اللہ سے محجوب ہوتا ہے وہ ریاء اور شہرت طلبی سے خالی نہیں ہوتا۔ البتہ اگر ہر لحظہ اسے یہ نظر آ رہا ہو کہ اس کے تمام افعال کا خالق اللہ ہے اور یہ تصور ہر کام کے کرتے وقت اس کی آنکھوں کے سامنے ہو پھر کوئی حرج نہیں، لیکن جونہی کہ یہ صورت آنکھوں سے غائب ہوتی ہے خواہ ایک لمحہ کے لیے کیوں نہ ہو تو وہ ریاء، شہرت طلبی اور غرور میں مبتلا ہو جاتے گا۔

۱۷- وَضَعْهَا بِحِجْرِ الشَّيْخِ طِفْلًا فَمَا لَهَا ‎ ‎ خُرُوجٌ بِلَا فَطْمٍ عَنِ الْحِجْرِ وَالْحَجْرِ

(ترجمہ:- اس نفس کو شیخ کی گود میں بچہ کی طرح رکھ دے لہٰذا یہ نفس شیخ کی گود اور روک ٹوک سے دودھ چھڑانے کے بغیر نہیں نکل سکتا۔

حضرت نے فرمایا: اپنے نفس کو شیخ کی گود میں رکھ تاکہ وہ اس کی اس طرح تربیت کرے جس طرح بچہ اپنی ماں کی گود میں تربیت پاتا ہے چنانچہ جس طرح بچہ چھڑانے سے پہلے ماں کی گود سے نہیں نکلتا اسی طرح شیخ بھی اس کی تربیت مکمل ہونے سے پہلے اسے اپنی گود اور روک ٹوک سے الگ نہیں کرے گا یعنی شیخ ایک طرف تو اس کی پرورش کریگا اور دوسری طرف اسے نامناسب کاموں سے روکے گا۔

۱۸- وَمَنْ لَمْ يَكُنْ سَلْبُ الْإِرَادَةِ وَصْفَهُ ‎ ‎ فَلَا يَطْمَعَنْ فِي شَمِّ رَائِحَةِ الْفَقْرِ

(ترجمہ: جس مرید میں سلب ارادہ کا وصف نہ پایا جائے اسے فقر کی بو سونگھنے کی امید نہ رکھنی چاہیئے۔

حضرت نے فرمایا: جو مرید اپنے شیخ کے سامنے اس طرح رہے کہ اس نے اپنے ارادہ کو سلب کر دیا ہو تو اسے فقر کی بو سونگھنے کی خواہش رکھنی چاہیئے۔

۱۹- هٰذَا وَاِنْ كَانَ الْعَزِيْزُ وُجُوْدُهٗ وَلٰكِنَّهٗ فِي الْعَزْمِ خَالٍ مِنَ الْعُسْرِ

ترجمہ: اگرچہ یہ وصف کمیاب ہے لیکن پختہ ارادہ کے ہوتے ہوئے یہ کوئی مشکل بات نہیں ہوتی)

فرمایا: فقر کی بو سونگھنے کی شرط یہ ہے کہ مرید مسلوب الارادہ ہو اور یہ وصف بہت کم پایا جاتا ہے لیکن اگر کوئی اس پر عزم کرے تو پھر مشکل نہیں ہوتا۔

۲۰- وَلَا تَعْتَرِضْ يَوْمًا عَلَيْهِ فَاِنَّهٗ كَفِيْلٌ بِتَشْتِيْتِ الْمُرِيْدِ عَلٰى هَجْرٍ

(ترجمہ: اپنے شیخ پر کبھی بھی اعتراض نہ کر کیونکہ یہ مرید کی پریشانی کے علاوہ پیر سے جدائی کا سبب بنتا ہے)

حضرت نے فرمایا: کہ اپنے شیخ پر ہرگز اعتراض نہ کرنا کیونکہ شیخ پر اعتراض مرید کو اپنے رب سے الگ ہونے کے علاوہ پیر سے بھی جدا کرنے کا سبب بنتا ہے۔

مؤلف کہتا ہے کہ یہاں تک تو حضرت کے اپنے دستِ مبارک سے لکھی ہوئی تشریح نقل کی ہے میری خواہش تھی کہ تمام کا تمام قصیدہ حضرت سے پڑھتا تاکہ حضرت کی عادت کے مطابق ہم ان سے اسرار و معارف ربانیہ حاصل کرتے۔ بقیہ اشعار کی شرح حضرت نے نہیں فرمائی۔ پہلے خیال آیا کہ بغیر شرح کے ہی لکھ دوں مگر پھر خیال کیا کہ شرح کو زیادہ طول دینے کے بغیر اس کی شرح کر دوں۔

۲۱- وَمَنْ يَّعْتَرِضْ وَالْعِلْمُ عَنْهُ بِمَعْزِلٍ يَرَى النَّقْصَ فِيْ عَيْنِ الْكَمَالِ وَلَا يَدْرِيْ

(ترجمہ: اور جو شخص باوجود اس کے کہ اسے کوئی سروکار نہیں شیخ پر اعتراض کرتا ہے وہ کمال کو نقص سمجھتا ہے حالانکہ وہ خود کچھ نہیں جانتا)

یعنی جو شخص اپنے شیخ یا کسی اور اہلِ طریقت پر اعتراض کرے گا، حالانکہ وہ خود جاہل ہے تو وہ کمال کو نقص سمجھے گا اور معاملات کو نہ سمجھتے ہوئے الٹ دیگا۔ اس شعر کا مضمون دراصل شیخ شہاب الدین[1]

---

[1] شیخ شہاب الدین سہروردی:- شہاب الدین ابو حفص عمر السہروردی مشہور صوفی ہوتے ہیں، جن کی طرف سہروردیہ فرقہ کو نسبت ہے۔ یہ ابو النجیب عبد القادر سہروردی جن کی وفات ۵۶۳ھ ۱۱۶۷ء میں ہوئی۔ کے مرید تھے، ان کی بہت سی تصانیف ہیں جن میں سے عوارف المعارف زیادہ مشہور ہے یہاں پر اسی کتاب کا حوالہ دیا گیا ہے یاد رہے کہ

(بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر)

سہروردی کی کتاب عوارف المعارف سے لیا گیا ہے جہاں وہ فرماتے ہیں کہ جب مرید کو شیخ کی کوئی حالت سمجھ میں نہ آئے تو موسیٰ علیہ السلام اور خضرؑ کے قصّہ کو یاد کرے کہ خضرؑ کس طرح کوئی کام کرتے تھے اور موسیٰؑ اس پر اعتراض کرتے تھے اور جب خضرؑ اس کا راز بتا دیتے تھے تو موسیٰ علیہ السلام اپنے اعتراض کو واپس لے لیتے تھے۔ ان امور کی حقیقت کو جو شیخ سے سرزد ہوتے ہیں، نہ جانتے ہوئے مرید جب اعتراض کرتا ہے تو پیر کے علم و حکمت کی زبان اس کا عذر پیش کر دیتی ہے۔ یہ رائیہ نظم عوارف کا اختصار ہے۔ چنانچہ عوارف رائیہ کی اصل ہے۔

شیخ کی باتوں پر اعتراض نہیں کرنا چاہیئے

ابوالحسن ششتریؒ فرماتے ہیں مشائخ کی باتوں پر اعتراض نہیں کرنا چاہیئے اس لیے کہ وہ جو تصرف کرتے ہیں وہ بصیرت اور اللہ کے حکم سے کرتے ہیں اور وہ ان لوگوں میں سے نہیں ہیں جو عالم حجاب کے تحت میں ہیں اور جو عالم ملکوت کی طرف نگاہ لگائے رکھتے ہیں اور ان کی عقلیں صرف ظاہر پر فریفتہ ہوتی ہیں بلکہ وہ تو ان میں سے ہوتے ہوئے بھی ان سے الگ ہوتے ہیں۔ حرکات، سکنات، اجسام، اقوال، زبان اور جو حرف وہ بولتے ہیں وہ ان تمام امور میں عام لوگوں کے ہم جنس ہوتے ہیں۔ یہ لوگ ایک اور لحاظ سے بھی ان سے محجوب ہوتے ہیں اس لیے ان لوگوں کے سوا جو انہی میں سے ہوتے ہیں، کوئی شخص ان کی حالت کو معلوم نہیں کر سکتا۔ واللہ اعلم۔

۲۲۔ وَمَنْ لَّمْ يُوَافِقْ شَيْخَهٗ فِي اعْتِقَادِهٖ   يَظَلُّ مِنَ الْاِنْكَارِ فِي لَهَبِ الْجَمْرِ

(ترجمہ: جو شخص اپنے اعتقاد میں اپنے شیخ کی موافقت نہ کرے گا تو اپنے انکار کی وجہ سے وہ انگاروں کے شعلوں میں جھلسے گا)

مطلب یہ ہے کہ شیخ جو کام کرتا ہے درست کرتا ہے لہٰذا مرید کو بھی یہی اعتقاد رکھنا چاہیئے لہٰذا اگر مرید کا یہی اعتقاد ہوگا تو فائدہ اٹھائے گا، لیکن اگر اپنے شیخ کے اعتقاد کی مخالفت کرے گا اور یہ عقیدہ رکھے گا کہ شیخ نے فلاں کام کرنے میں غلطی کی تو شیخ اسے اپنے سے جدا کر دیگا اور یہ جدائی اس کے لیے انگاروں

(بقیہ حاشیہ صفحہ سابقہ)

ابو حفص شہاب الدین سہروردی ایک اور بزرگ بھی ہوتے ہیں وہ بھی صوفی تھے اور ان کی بھی بہت سی تصانیف ہیں۔ انہیں ۵۸۶ھ ۱۱۹۰ء میں قتل کر دیا گیا تھا اس لیے انہیں المقتول کے نام سے پکارا جاتا ہے مگر یہاں سہروردی سے مراد مصنف عوارف المعارف ہے جن کی وفات ۶۳۲ھ ۱۲۳۴ء میں ہوئی۔

ابوالحسن ششتری: ان کا حال معلوم نہ ہو سکا۔

کی طرح ہوگی۔

محی الدین[1] ابن العربی فرماتے ہیں کہ مرید بننے کی ایک شرط یہ ہے کہ اس کا یہ عقیدہ ہو کہ شیخ اپنے رب کی شریعت اور ہدایت پر چل رہا ہے اور وہ شیخ کے احوال کو اپنے ترازو میں نہ تولے کیونکہ کبھی ایسا ہوتا ہے کہ شیخ سے کوئی ایسا فعل سرزد ہوتا ہے جو بظاہر مذموم ہوتا ہے مگر درحقیقت محمود ہوتا ہے اس لیے مرید کے لیے تسلیم و رضا ہی ضروری ہے کئی ایک شیخ ہم نے دیکھے جن کے ہاتھ میں شراب تھی جسے انھوں نے منہ کی طرف اٹھایا مگر اللہ تعالیٰ نے اسے شہد میں بدل دیا اور دیکھنے والوں کو یہی خیال ہوتا ہے کہ اس نے شراب پی ہے حالانکہ اس نے شہد پیا ہوتا ہے۔ اسی قسم کے بہت سے واقعات ہیں۔ ہم نے ایسے لوگوں کو بھی دیکھا ہے جو اپنی روحانیت کو ایک صورت میں پاتے ہیں اور وہ اسی صورت میں اسے ایک کام پر لگاتے ہیں۔ حاضرین اسے وہ کام کرتے ہوئے دیکھتے ہیں اور کہتے ہیں ہم نے خود فلاں شیخ کو فلاں کام کرتے ہوئے دیکھا ہے حالانکہ ان کا اس کام میں کوئی دخل نہیں ہوتا۔ ابو عبداللہ[2] المصلی جو قضیب البان کے نام سے مشہور تھے۔ ان کا یہی حال تھا اور ہم نے خود یہ بات کئی ایک لوگوں میں مشاہدہ کی ہے۔

---

[1] محی الدین العربی: محی الدین محمد بن علی بن العربی مُرسِیہ میں ۵۶۰ھ / ۱۱۶۵ء میں پیدا ہوئے ۵۶۹ھ / ۱۱۷۳ء تا ۵۹۹ھ / ۱۲۰۲ء وہ اشبیلیہ میں رہے مگر پھر انھوں نے مصر، شام اور حجاز کا طویل سفر کیا اور بالآخر دمشق میں رہائش اختیار کر لی۔ اس کی وفات دمشق میں ۶۳۸ھ / ۱۲۴۰ء میں ہوئی۔ امام شعرانی نے ان کے حالات کے لیے ایک الگ کتاب لکھی ہے جس کا نام تنبیہ الاغبیاء عَلٰی قَطَرَۃٍ مِنْ بَحْرِ عُلُومِ الْاَوْلِیَاءِ ہے۔

[2] ابو عبداللہ قضیب البان: شیخ ابو عبداللہ عبدالقادر بن محمد المصلی المعروف بہ قضیب البان ۱۰۴۰ھ میں ان کی وفات ہوئی۔ انھوں نے اسماء اللہ الحسنیٰ کی شرح کی ہے۔ عبداللہ نے ۱۰۹۶ھ / ۱۶۸۴ء میں وفات پائی۔ اس نے مدح نبیؐ میں ایک قصیدہ لکھا جس کا مطلع یہ ہے۔

اھلاً بنشر من مھب، زرود أحْيٰ فؤاد العاشق المنجودِ

اس قصیدہ کی شرح شیخ عثمان العریانی الکلیبی بن عبداللہ نے کی جو مدینہ میں آباد ہو گئے تھے خود قضیب البان نے حدیث الاربعین کی بھی شرح کی ہے جس کا نام کواکب الصنوء رکھا ہے (کشف الظنون: ۱: ۴۹۲) قضیب البان نے سنہ ۱۰۱۹ھ میں الکواکب الضوئیۃ فی شرح "الاحادیث النبویہ" لکھی (کشف الظنون: ۲: ۱۹۴) مقاصد القصائد الباتیہ بھی انہی کی تالیف ہے (کشف الظنون: ۲: ۱۱: ۳)

۲۳۔ فَذُو الْعَقْلِ لَا يَرْضَىٰ سِوَاهُ وَإِنْ نَأَىٰ   عَنِ الْحَقِّ نَأْيَ اللَّيْلِ عَنْ وَاضِحِ الْفَجْرِ

(ترجمہ: عقلمند مرید اپنے شیخ کے سوا کسی پر راضی نہ ہوگا خواہ شیخ بظاہر حق سے اتنا ہی دور کیوں نہ ہو جائے جتنی کہ تاریک رات روز روشن سے)

یعنی جس شخص کی عقل سلیم اور طبع مستقیم ہوگی، اپنے شیخ کے سوا کسی اور سے خوش نہ ہوگا اور وہ اسی کے ساتھ رہے گا خواہ وہ حق سے بظاہر اس قدر دور کیوں نہ ہو جائے جس قدر رات اور دن کا بعد ہے۔ چنانچہ وہ دل میں کہے گا کہ ہو سکتا ہے کہ اس کی کوئی وجہ ہو جس کی اطلاع حضرت مجھے دے دیں گے۔

میں نے حضرت سے سنا کہ جب مرید کو شیخ کے کسی ایسے فعل کی اطلاع ہو جو اس سے سرزد ہوا ہو اور وہ فعل بظاہر شریعت کے مخالف ہو، لیکن وہ اپنے شیخ کے متعلق حسن ظن رکھتا ہے تو اللہ تعالیٰ جب اسے فتح نصیب کرے گا تو ان کے اسرار بھی بتا دے گا۔

۲۴۔ وَلَا تَعْرِفَنْ فِي حَضْرَةِ الشَّيْخِ غَيْرَهُ   وَلَا تَمْلَأَنْ عَيْنًا مِنَ النَّظَرِ الشَّزْرِ

(ترجمہ: شیخ کے آستانہ پر کسی اور سے جان پہچان نہ رکھ اور نہ ہی اپنے شیخ کی طرف ترچھی نگاہ سے دیکھ)

اس قسم کے ادب کا نتیجہ یہ ہوگا کہ مرید کو شیخ کے ساتھ استغراق حاصل ہو جائے گا اور مرید اسی کا ہو لے گا اور شیخ کے اسرار حاصل کرنے کے لیے وہ اپنی ذات سے غائب ہو جائے گا لہٰذا اس کے ادب بجا لانے کا نتیجہ یہ ہوگا کہ اللہ کے ہاں بھی اسے اس کا اچھا پھل ملے گا۔

یاد رکھیں کہ اس قسم کا ادب مرید اسی وقت کر سکتا ہے جب کہ شیخ کی طرف سے بھی باطنی کشش پائی جائے کیونکہ جب شیخ کی محبت کی شعاعیں مرید پر پڑتی ہیں تو اسے گھیر کر شیخ کی طرف لے آتی ہیں اور اسے ہر ایسی بات سے بچا لیتی ہیں جس سے قطع تعلق پیدا ہو جائے۔ لہٰذا جب یہ قائم رہیں گی، اتصال بھی قائم رہے گا اور اگر منقطع ہو گئیں تو تعلق بھی منقطع ہو جائے گا۔

ایک شیخ کا ایک مرید تھا۔ جو ہر وقت ان کے ساتھ رہتا تھا۔ پانچوں نمازیں ان کے ساتھ پڑھتا تھا اور کسی وقت بھی غائب نہ ہوتا تھا مگر ساتھ ہی اس کا خیال یہ تھا کہ یہ اس کی اپنی محبت کی وجہ سے ہے جو اسے شیخ سے ہے نہ کہ شیخ کی اس سے محبت کی وجہ سے۔ چنانچہ ایک مرتبہ شیخ نے کہا: کیا تجھے مجھ سے محبت ہے؟ مرید نے جواب دیا: حضرت میری محبت کی وجہ سے ہی تو یہ اتصال ہوا ہے۔ شیخ نے فرمایا: تجھے معلوم ہو جائے گا۔ اس دن سے وہ شیخ کے پاس نہ جا سکا، یہاں تک کہ پورا ایک سال گزر گیا اور شیخ کی

خدمت میں رہنا تو درکنار وہ ان کو دیکھ بھی نہ سکا۔ تاآنکہ شیخ نے اسے معاف کر دیا۔

ایک پیر نے اپنے مریدوں سے کہا: کیا تم کو مجھ سے محبّت ہے؟ تو انھوں نے جواب دیا: حضرت آپ سے بڑھکر ہمیں کون عزیز ہو سکتا ہے۔ پھر فرمایا: کیا میں تم سے محبت کرتا ہوں؟ مریدوں نے جواب دیا: ہمیں معلوم نہیں، فرمایا: تم نے کوئی کام کی بات نہیں کی۔ پہلے تو مجھے ہی تم سے محبّت ہوئی اور جب اس کے انوار کی روشنی تم پر پڑی تو تمہیں بھی مجھ سے محبت ہو گئی۔

حضرت عبدالعزیز دبّاغ کے مریدوں نے جب سے آپ کو دیکھا ہے، ان کے دل اوروں سے جان پہچان کرنے اور ان کی زیارت کرنے سے ٹھنڈے پڑ گئے اور بعض تو ایسا محسوس کرتے ہیں کہ انہیں اوروں کے پاس جانا منع ہے۔

ایک شخص نے بیان کیا کہ وہ حضرت کی زیارت کے لیے آرہا تھا کہ راستہ میں کچھ لوگ اسے مل گئے اور اسے ولی صالح حضرت قاسم ابوعبریہ جو ایک مشہور ولی گزرے ہیں کے مزار کی زیارت کے لیے جانے کو کہا، میں حیا کے سبب انہیں انکار نہ کر سکا اور ان کے ساتھ ہو لیا حالانکہ مجھے وہاں جانے کی خواہش نہ تھی، لیکن جب مزار پر پہنچا تو پیٹ میں درد ہونے لگا اور رات بھر ہوتا رہا یہاں تک کہ میں زیارت بھی نہ کر سکا۔ جب دن کے وقت وہاں سے باہر آتے تو درد جاتا رہا گویا کبھی تھا ہی نہیں۔ اسی شخص نے بتایا کہ مجھ سے بھی اسی قسم کا واقعہ پیش آیا، تو میں سمجھ گیا کہ یہ حضرت کی طرف سے توجہ کی وجہ سے ہے۔

(مولّف کہتا ہے کہ) حضرت کی عادت تھی کہ جب آپ کے مرید آپ کے پاس آتے تو جو کچھ بھی ان سے راستہ میں پیش آیا ہوتا تھا ان سے بیان کر دیتے یہاں تک وہ باتیں بھی بیان فرما دیتے جو ان کی آپس میں ہوئی ہوتیں اور جو کچھ ان کے دل میں ہوتا وہ بھی کہہ دیتے۔ ایک شخص سے تو اس سے بھی زیادہ عجیب واقعہ پیش آیا اس طرح کہ حضرت کے پاس آنے سے تقریباً سات سال پہلے سے اسے یوں محسوس ہو رہا تھا کہ اسے صالحین کی زیارت سے روک دیا گیا ہے۔ اس سے وہ بڑا مایوس ہو گیا اور سمجھنے لگا یہ بدبختی اور شقاوتِ قلبی کی علامت ہے چنانچہ وہ ایک شخص کے پاس گیا جسے وہ ایک سال کرتا تھا اور عرض کیا کہ صالحین کی زیارت مجھے بوجھل معلوم ہوتی ہے۔ اس شخص نے جواب دیا بلکہ تو انہیں بوجھل معلوم ہوتا ہے۔ یہ جواب سنکر وہ اور بھی مایوس ہوا پھر ایک اور نیک آدمی سے پاس گیا اور اپنی اس حالت کا تذکرہ کیا۔ انھوں نے جواب دیا: کبھی وہ روح بارگاہ خداوندی میں نہیں ہوتی تو اُس وقت قبر میں موجود ہوتی ہے، ہو سکتا ہے کہ جب تو مزار پہ جاتا ہو اس وقت اس کی روح بارگاہ ایزدی میں ہوتی ہو اور قبر میں نہ ہوتی ہو جس کی وجہ سے تجھے اُنس حاصل نہ ہوتا ہو اور وحشت سی ہو جاتی ہو، یہ کلام سنکر اسے قدرے تسلّی ہوئی مگر پھر بھی کہنے لگا کہ جب بھی

زیارت کے لیے آؤں ولی قبر میں نہ ہو تو یہ بھی تو ایک قسم کی بدبختی ہے، لیکن جب وہ حضرت کی خدمت میں آیا تو سب سے اہم وضروری سوال اس نے یہی کیا کہ حضرت صالحین کی زیارت مجھے بوجھل معلوم ہوتی ہے میں نے فلاں بزرگ سے بھی اس کی شکایت کی اور انھوں نے یہ جواب دیا۔ پھر فلاں سے شکایت کی تو انھوں نے یوں کہا۔ اب آپ کیا فرماتے ہیں؟ حضرت نے ایک دکان میں گلاب کا پھول لٹکتا ہوا دیکھ کر فرمایا: اگر یہ دکاندار ہر ایک کو اس پھول کو پکڑنے دے اور ہاتھ لگانے دے تو یہ کمہلا کر خشک ہو جائے لہٰذا مناسب یہی ہے کہ وہ اسے ہر ایک کے ہاتھوں سے بچائے۔ اس سے میں سمجھ گیا کہ حضرت سے ملاقات کرنے کی خاطر کئی سال پہلے سے ہی مجھے اوروں کی زیارت سے روک دیا گیا ہے۔

ایک اور مرید کا واقعہ

حضرت کے مریدوں میں سے ایک شخص کو ایک بزرگ میں بہت اعتقاد اور محبت تھی اور وہ اکثر ان کی زیارت کو جایا کرتا اس طرح ان کی صحبت میں اپنے سات سال گزر گئے یہاں تک کہ ان کی محبت اس کی رگ و پے میں سرایت کر گئی اور اس نے عہد کر رکھا تھا کہ ان کی وفات کے بعد وہ کسی اور سے ملاقات نہ کرے گا اس لیے کہ اس کا خیال یہی تھا کہ کوئی اور ان جیسا ہو ہی نہیں سکتا، لیکن جب وہ حضرت کی خدمت میں آیا اور ابھی تھوڑی دیر ہی آپ کے پاس بیٹھا تھا کہ وہ اس ولی کی زیارت کے لیے ہی نہ جا سکا۔ اس نے حضرت سے کہا میں نے عجیب بات دیکھی ہے۔ مجھے فلاں بزرگ سے بے حد محبت تھی اور مجھے یقین تھا کہ کوئی اور ان کی جگہ نہیں لے سکتا لیکن آپ کے پاس ابھی ایک گھڑی بیٹھا ہوں کہ یہ سب کچھ زائل ہو گیا حالانکہ نہ ان کا ذکر ہوا اور نہ کوئی ایسی بات ہوئی جس کی وجہ سے ان کی محبت جاتی رہے۔

حضرت نے فرمایا بزرگ ولی تھا اور تیری محبت بھی سچی تھی، لیکن اس محبت کی کوئی حقیقت نہ تھی۔ اس کے بعد حضرت نے داستان بیان فرمائی کہ ایک چھوٹا بچہ ہو جو اپنے باپ سے جدا ہو گیا ہو اسے ایک شخص نے اپنی تربیت میں لے لیا ہو چنانچہ یہ بچہ اسے بھی ابا کہہ کر پکارتا ہو اور اس سے اپنے باپ کی طرح محبت کرتا ہو تاآنکہ بچہ بڑا ہو جائے اور اس پر تقریباً سات سال کا عرصہ گزر جائے۔ اس کے بعد اس کا حقیقی باپ آجائے اور اپنے بیٹے کو اس پالنے والے باپ کے گھر کے صحن میں بیٹھا دیکھے اور کچھ دیر سامنے کھڑا رہنے کے بعد گزر جائے تو صرف اتنی بات سے ہی بچے کا تمام میلان اپنے حقیقی باپ کی طرف ہو جائے گا اور اپنے تربیت کرنے والے باپ سے اسے قطعاً محبت نہ رہے گی۔ لہٰذا کوئی شخص اس کے دل میں اس کے حقیقی باپ کی جگہ نہ لے سکے گا۔ حالانکہ اس سے پہلے اسے یہی خیال تھا کہ اس کی تربیت کرنے والا شخص ہی اس کا باپ ہے۔

وہ شخص کہتا ہے کہ حضرت کی اس مثال سے اس محبت میں سے جو کچھ تھوڑا سا بھی باقی رہا تھا، وہ بھی جاتا رہا۔

بزرگوں کا یہی حال ہے یہاں تک کہ کہتے ہیں کہ مرید تو حمام کے کوزوں کی طرح ہیں جن کے ہاتھ آگئے اسی کے ہو گئے۔ لہٰذا وہ شیخ جو اپنے مریدوں پر اس لیے ناراض ہوتا ہے کہ مرید اسے چھوڑ کر کسی اور کے پاس چلا گیا ہے، یا تو کمزور ہے یا بے فیض۔ اس کی کمزوری اور بے فیض ہونے کی وجہ سے تو مرید کسی اور کے پاس چلا گیا ہے۔

کئی بار ایسا ہوا کہ حضرت کسی بزرگ کے مزار پر زیارت کے لیے تشریف لے گئے اور آپ کے ساتھ آپ کے مریدوں کی ایک جماعت بھی ہوتی جو کہتی کہ حضرت ہم تو آپ ہی کی زیارت کے لیے آتے ہیں اور آپ ہی ہمارا مقصود ہیں خواہ آپ کہیں تشریف لے چلیں۔ چنانچہ جب آپ مزار پر پہنچتے تو آپ یا تو اکیلے اندر جاتے یا کسی ایک کو اپنے ساتھ لے لیتے اور باقی باہر رہتے اس اعتقاد پر کہ کوئی اور ان کے مرتبہ تک نہیں پہنچ سکتا نہ زندوں میں سے نہ مردوں میں سے۔ صرف صحابہ رضوان اللّٰہ علیہم کو ان پر فضیلت دیتے اس لیے حضرت کے سوا ان کی زندگی میں اور بعد بھی۔ ان کی موجودگی اور ان کی غیر حاضری میں کسی اور کو نہ جانتے۔

جب حضرت کی وفات ہو گئی تو میں اکثر ان کی زیارت کے لیے جاتا۔ ایک مرتبہ مجھے خواب میں آئے اور فرمایا کہ قبر میں بھی میری ذات حجاب میں نہیں ہے بلکہ تمام دنیا میں چلتی پھرتی رہتی ہے جس جگہ بھی تو مجھے تلاش کرے تو مجھے وہیں پالے گا، مگر خبردار کہیں یہ خیال تمہارے دل میں آجائے کہ میں تیرا رب ہوں۔ اس لیے کہ پروردگار دنیا کے اندر محصور نہیں ہے اور میں تو محصور ہوں۔ حضرت نے یہ الفاظ خواب میں فرمائے۔ اسی طرح زندگی میں بھی فرمایا کرتے تھے کہ بعض اوقات تمام جہاں میرے پیٹ کے اندر ہوتا ہے ایک اور مرتبہ فرمایا کہ مومن بندہ کی نگاہ میں ساتوں آسمان اور ساتوں زمینیں اس حلقہ کی مانند ہوتی ہیں جو جنگل میں پڑا ہو۔ لہٰذا اس شعر میں

لَا تَعْرِفَنْ فِیْ حَضْرَةِ الشَّیْخِ غَیْرَہٗ

"حضرت" سے مراد اپنے اپنے مراتب کے اعتبار سے مختلف ہوگی چنانچہ ہمارے پیر کی بارگاہ تمام جہان ہے۔ واللّٰہ اعلم۔

۲۵- وَلَا تَنْطِقَنْ یَوْمًا لَدَیْہِ فَاِنْ دَعَا اِلَیْہِ فَلَا تَعْدِلْ عَلٰی[1] الْکَلِمِ النَّزْرِ

---

[1] اصل کتاب میں اسی طرح "علی" ہی دیا ہے، مگر میرے خیال میں یہاں "علی" کے بجائے "عن" ہونا چاہیے تھا۔ ۱۲

(ترجمہ: شیخ کی موجودگی میں خاموش رہو اور اگر وہ کوئی بات پوچھیں تو مختصر جواب دو۔)

اپنے شیخ کے سامنے خاموش رہو اور اگر وہ کوئی بات پوچھیں تو زیادہ باتیں نہ کرو کیونکہ اس طرح پیر کے رعب میں فرق آتا ہے۔ ہاں البتہ خود شیخ بات لمبی کہنے کو فرمائیں تو ان کے حکم کی رعایت رکھتے ہوئے لمبی بات کر دی جائے مگر جب ان کی تسلی ہو جائے تو پھر اسی ادب کا لحاظ رکھتے ہوئے خاموشی اختیار کرنی چاہیئے۔ چنانچہ ہم پہلے لکھ چکے ہیں کہ جب حضرت مشاہدہ میں غائب ہوتے تھے تو فرمایا کرتے: خوب شور مچاؤ۔ اللہ تمہیں اس کا اجر دے گا۔ اس لیے کہ حضرت اس شور مچانے سے اپنے حواس کی طرف لوٹ آتے تھے۔

اس شعر کا مضمون عوارف المعارف (سہروردی کی کتاب) سے لیا گیا ہے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ کے فرمان لَا تُقَدِّمُوا بَیْنَ یَدَیِ اللّٰہِ وَرَسُوْلِہٖ کی تاویلات ذکر کرنے کے بعد فرماتے ہیں کہ بعض کا قول ہے کہ یہ آیت ان لوگوں کے بارے میں اتری جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی مجلس میں آیا کرتے تھے۔ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کوئی بات پوچھتے تو اس پر بحث کرنے لگ جاتے اور آپؐ کے فرمانے سے پہلے ہی اپنا فیصلہ دے دیتے اس لیے اس آیت میں انہیں اس بات سے منع کر دیا گیا شیخ کی مجلس میں مرید کی بھی یہی حالت ہونی چاہیئے۔ اسے خاموش رہنا چاہیئے اور اس کی موجودگی میں کوئی اچھی بات بھی نہیں کہنی چاہیئے۔ البتہ شیخ پوچھیں تو کہیں۔ شیخ کی حاضری میں مرید کی مثال ایسی ہے جیسے کوئی ساحل پر بیٹھا اس رزق کا منتظر ہو جو اس کی طرف لایا جا رہا ہے لہٰذا شوق سے شیخ کا کلام سننا اور شیخ کے کلام سے جو کچھ اسے فیضان حاصل ہوگا اس کے مقام ارادت، طلب اور اللہ کے فضل کا زیادہ ہونا اس کے لیے محقق ہو جائے گا مگر خود باتیں کرنا اسے مقام طلب سے لوٹا کر ایسے مقام پر لا کھڑا کرے گا جہاں وہ اپنے نفس کے لیے کسی بات کا ثبوت دے رہا ہو اور مرید کے لیے یہ گناہ کے برابر ہے۔

ایک سچے مرید کو شیخ کے دربار میں زبان سے سوال کرنے کی ضرورت نہیں ہوتی کیونکہ شیخ خود ہی اس کی خواہش کے مطابق بات شروع کریں گے اس لیے کہ شیخ خدا سے باتیں سنکر بات کرتا ہے اور وہ صدیقین کی موجودگی میں اپنے دل کو اللہ کی طرف بلند کرتا ہے اور ان کے لیے بارش و سیرابی کی درخواست کرتا ہے اس طرح اس کا دل و زبان قول و نطق میں ان طالبوں کے حالات کو سمجھنے میں لگا ہوتا ہے جو اس کی فتوح کے محتاج ہوتے ہیں۔ پھر فرماتے ہیں کہ ان باتوں میں جو حق سبحانہ اس کی ذات پر جاری کرتے ہیں وہ بھی اوروں کی طرح کا ایک سننے والا ہے۔

شیخ ابوالسعود[1] رحمۃ اللہ جو باتیں انہیں القا ہوتیں اپنے مریدوں سے ذکر کرتے اور فرماتے ایں بھی تمہاری طرح ان باتوں کا سننے والا ہوں۔ حاضرین میں سے ایک صاحب اس کا مطلب نہ سمجھ سکے اور کہنے لگے کہ جب کہنے والا جانتے ہوئے کوئی بات کر رہا ہو وہ سننے والے کی طرح کیسے ہو سکتا ہے۔ گھر پہنچے تو خواب میں دیکھا کہ کوئی اسے کہہ رہا ہے۔ غوطہ زن سمندر میں موتیوں کی تلاش میں غوطہ لگاتا ہے اور تھیلے میں سیپ بھر کر لاتا ہے اور موتی اس کے پاس ہوتے ہیں مگر ان موتیوں کو تب ہی دیکھ سکتا ہے جب سمندر سے نکلتا ہے اور ساحل کے لوگ ان موتیوں کو دیکھنے میں اس کے برابر کے شریک ہوتے ہیں اس طرح وہ خواب میں شیخ کا اشارہ سمجھا۔ لہٰذا شیخ کی موجودگی میں مرید کے لیے یہی بہتر ہے کہ جب تک شیخ خود نہ بات شروع کریں وہ خاموشی کرے۔

۲۶۔ وَلَا تَرْفَعُوْا اَصْوَاتَكُمْ فَوْقَ صَوْتِهٖ وَلَا تَجْهَرُوْا اَجْهَرَ الَّذِیْ هُوَ بِیْ تَفْرِ

(ترجمہ: شیخ کی آواز سے اپنی آواز کو زیادہ بلند نہ کرو اور نہ ہی اس طرح بات کرو جس طرح گنوار لوگ کیا کرتے ہیں۔)

فرمایا: مریدو! شیخ کی آواز سے اپنی آواز اونچی نہ ہونے دو کیونکہ یہ سوء ادب ہے اور نہ ہی اس طرح بات کرو جس طرح بادیہ نشین اور اُجڈ لوگ باتیں کرتے ہیں، لیکن ان کی تعظیم کیا کرو اور یا سیدی یا استاذی، یا ولی اللہ وغیرہ الفاظ استعمال کرو۔ اس شعر کا مضمون یٰاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَرْفَعُوْا اَصْوَاتَكُمْ فَوْقَ صَوْتِ النَّبِیِّ وَلَا تَجْهَرُوْا لَهٗ بِالْقَوْلِ كَجَهْرِ بَعْضِكُمْ لِبَعْضٍ اَنْ تَحْبَطَ اَعْمَالُكُمْ وَاَنْتُمْ لَا تَشْعُرُوْنَ۔ (سورۃ حجرات آیت ۲) (مسلمانو! اپنی آواز نبیؐ کی آواز سے بلند نہ کیا کرو اور نہ ہی انہیں اس طرح پکارا کرو جس طرح تم ایک دوسرے کو پکارتے ہو تا کہ کہیں تمہارے اعمال ضائع نہ ہو جائیں اور تمہیں محسوس ہی نہ ہو) سے لیا گیا ہے۔

حضرت ثابتؓ کا واقعہ

سہروردیؒ عوارف معارف میں فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے صحابہؓ کو یہ فرما کر کہ "اپنی آواز کو نبیؐ کی آواز سے زیادہ بلند نہ کیا کرو۔"

---

[1] ابوالسعودؒ جارحی: شیخ شہاب الدین المرحومی کے خلیفہ تھے۔ مصر میں ان کے بہت سے شاگرد اور بہت سی کرامات مشہور ہیں۔ انہوں نے اپنے مریدوں کی بہت سخت آزمائشیں کیں۔ اکثر گوشہ نشین رہتے اور مخلوقات سے بھاگتے تھے۔ اکثر کہتے کہ کسی کو نہ مرید بناؤ نہ کتاب لکھو۔ نہ کوئی تکیہ بلکہ لوگوں سے بھاگو کیونکہ یہ بھاگنے کا زمانہ ہے ان کی وفات ۹۳۰ھ۔ ۱۵۲۳ء کے کچھ سال بعد ہوئی۔

انہیں ادب سکھایا ہے۔ ثابت[1] بن قیس بن شماس اونچا سنتے تھے اور ان کی آواز بھی بلند تھی۔ جب بولتے تو بلند آواز سے۔ بعض اوقات آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے بات کرتے تو آپ کو اس سے تکلیف ہوتی۔ اس پر یہ آیت اتری اور انہیں اور دوسروں کو ادب سکھایا گیا۔ اس آیت کا شانِ نزول بیان کرنے کے بعد سہروردی فرماتے ہیں کہ یہ آیت اس جھگڑے کے بارے میں نازل ہوئی جو آنحضرت کی موجودگی میں ابوبکرؓ اور عمرؓ کے درمیان ہوا۔ چنانچہ اس آیت کے اترنے کے بعد حضرت عمرؓ جب بھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی موجودگی میں بات کرتے تو اس قدر آہستہ بولتے کہ بات سنی بھی نہ جاتی تھی، یہاں تک کہ دوبارہ پوچھنا پڑتا۔ کہتے ہیں کہ جب یہ آیت اتری تو ابوبکرؓ نے قسم کھائی کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی موجودگی میں نہایت ہی آہستہ بات کیا کریں گے۔ لہٰذا شیخ کی بارگاہ میں مرید کو بھی ایسا ہی ہونا چاہیئے کہ نہ آواز بلند کرے اور نہ زیادہ ہنسے نہ زیادہ باتیں کرے ہاں اگر شیخ اس سے کھل جائے تو آواز بلند کر سکتا ہے کیونکہ جب وقار دل میں گھر کر لیتا ہے تو زبان کو باندھ دیتا ہے۔ بعض اوقات مرید کے دل میں شیخ کا اس قدر احترام و وقار پیدا ہو جاتا ہے کہ وہ شیخ کی طرف آنکھ بھر کر نہیں دیکھ سکتا۔

ابن عطاؒ[2] کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کے فرمان لَا تَرْفَعُوْٓا اَصْوَاتَكُمْ میں تھوڑی بات پر ڈانٹ دی گئی ہے تاکہ کوئی اس سے آگے نہ جا سکے۔

سہلؒ[3] کہتے ہیں کہ اس کا مقصد یہ ہے کہ نبی سے خطاب صرف اس وقت کیا کرو جب تمہیں کوئی بات پوچھنی ہو۔

---

[1] ثابت بن قیس بن شماس انصاری خزرجی صحابی ہیں۔ انہیں خطیب انصار کہا جاتا تھا۔ اُحُد اور بعد کی جنگوں میں شریک ہوئے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے جنتی ہونے کی گواہی دی ہے۔ حضرت ابوبکر صدیقؓ کے عہدِ خلافت میں جنگ یمامہ میں سنہ ۱۲ھ / ۶۳۳ء میں شہید ہوئے۔

[2] ابن عطاؒ: ایک ابن عطا ابو العباس احمد بن محمد بن سہل بن عطا الآدمی ہوئے ہیں جنہیں فہم قرآن میں خاص مہارت تھی۔ علماء صوفیہ میں سے تھے۔ حضرت جنیدؒ بغدادی ان کے پیر تھے۔ ان کی وفات ۳۰۹ھ / ۹۲۱ء میں ہوئی یہاں غالباً یہی ابن عطاء مراد ہیں۔

دوسرے ابن عطاء ابو عبد اللہ احمد بن عطاء بن احمد الرودباری ہیں یہ ابو علی الرودباری کے بھانجے تھے اور اپنے وقت میں شام کے شیخ مانے جاتے تھے۔ یہ بھی علوم شریعت اور قرآن میں مشہور تھے۔ ان کی وفات ۳۶۹ھ / ۹۷۹ء میں ہوئی۔

[3] سہلؒ: شاید یہ سہل بن عبد اللہ تستری ہیں جن کا پہلے ذکر ہو چکا ہے۔

ابوبکرؒ بن طاہر کہتے ہیں کہ آپ سے خطاب کرنے میں پہل نہ کرو اور جواب دو تو احترام کا لحاظ رکھتے ہوئے اور ان سے اس طرح آواز بلند کر کے نہ بولو جس طرح تم ایک دوسرے سے کلام کیا کرتے ہو۔ یعنی ان سے سخت لہجہ میں بات نہ کرو اور نہ ہی ان کا نام لے کر پکارو جیسا کہ تم ایک دوسرے کو پکارتے ہو بلکہ ان کی تعظیم و تکریم کرو اور یا نبی اللہ اور یا رسول اللہ کہہ کر پکارا کرو۔

شیخ سے مرید کا طرزِ تخاطب بھی اسی طرح کا ہونا چاہیئے کیونکہ جب کسی کا وقار دل میں گھر کر جائے تو کیفیتِ خطاب زبان پر ظاہر ہو جاتی ہے۔ چنانچہ جب لوگوں کے دلوں میں اولاد اور ازواج کی محبت ہوتی ہے اور یہ نفس کی خواہشات اور طبیعت پر غالب آجاتی ہے تو زبان سے ایسے ایسے عجیب الفاظ نکلتے ہیں جنہیں محبت و کلفت اسی وقت گھڑ لیتی ہے۔ اسی طرح جب دل میں کسی کا وقار و احترام آجائے تو زبان اسی قسم کی عبارت سیکھ لیتی ہے۔

پھر ثابتؓ بن قیس کا فعل ذکر کرنے کے بعد لکھتے ہیں۔ جب اس کے اپنے آپ کو قید کرنے کے بارے میں آیت نازل ہوئی اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس کی سعادت مند زندگی، شہادت کی موت اور جنت میں جانے کی گواہی دی اور بالآخر اس کے بارے میں یہ آیت نازل ہوئی: اِنَّ الَّذِیْنَ یَغُضُّوْنَ اَصْوَاتَهُمْ عِنْدَ رَسُوْلِ اللّٰهِ اُولٰٓئِكَ الَّذِیْنَ امْتَحَنَ اللّٰهُ قُلُوْبَهُمْ لِلتَّقْوٰى لَهُمْ مَّغْفِرَةٌ وَّاَجْرٌ عَظِیْمٌ۔ (سورہ حجرات آیت ۳) (جو لوگ رسول اللہ کے سامنے آواز کو پست رکھتے ہیں یہ وہ لوگ ہیں جن کے دلوں کو اللہ نے تقویٰ کے لیے آزما لیا ہے ان کے لیے مغفرت اور اجر عظیم ہے) اور موت کے بعد وصیت کرنا اور حضرت ابوبکر صدیقؓ کا اسے جائز قرار دینا یہ سب حضرت ثابتؓ کی کرامات تھیں جو اُن کے تقویٰ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے احترام کرنے کی وجہ سے انہیں عطا ہوئیں۔ لہٰذا مرید کو ان سے عبرت حاصل کرنی چاہیئے اور اسے جاننا چاہیئے کہ شیخ اللہ اور اس کے رسولؐ کی یاد دلانے والا ہوتا ہے اور شیخ کے ساتھ جن امور کا اسے خیال رکھنا چاہیئے بعینہٖ وہی امور ہیں کہ اگر وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ہوتا تو اسے ان کا خیال رکھنا پڑتا لہٰذا جب لوگوں نے ادب کا حق ادا کر دیا تو اللہ تعالیٰ نے بھی ان کے حال کی خبر لوگوں کو دیدی۔ اور ان کی تعریف کی چنانچہ فرمایا: اُولٰٓئِكَ الَّذِیْنَ امْتَحَنَ اللّٰهُ قُلُوْبَهُمْ لِلتَّقْوٰى۔ یہ وہ لوگ ہیں جن کے دلوں کو اللہ تعالیٰ نے تقویٰ کے لیے خالص کر دیا ہے جس طرح سونا آگ میں ڈالنے سے خالص ہو جاتا

۱؎ ابوبکرؒ بن طاہر: ابوبکر عبداللہ بن طاہر الابہری کبار صوفیہ میں سے تھے اور شبلیؒ کے ساتھیوں میں سے تھے ان کی وفات ۳۳۰ھ / ۹۴۱ء میں ہوئی۔

ہے۔اب چونکہ زبان دل کی ترجمان ہوتی ہے اس لیے جب دل خالص ہو گیا تو الفاظ میں بھی شائستگی آگئی۔مرید کو شیخ کے سامنے ایسا ہی چاہیئے۔

ابو عثمان[1] کہتے ہیں بزرگوں سے ادب سے پیش آنا اور بڑے بڑے اولیاء کی مجلس میں ادب کا لحاظ رکھنا انسان کو بلند درجوں تک پہنچاتا اور دنیا اور آخرت میں بہت فائدہ پہنچاتا ہے چنانچہ آپ دیکھتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے پہلے فرمایا: لَوْ أَنَّهُمْ صَبَرُوا حَتَّىٰ تَخْرُجَ إِلَيْهِمْ لَكَانَ خَيْرًا لَّهُمْ (سورۂ حجرات: ۵) (اگر یہ لوگ آپ کے خود باہر آنے تک صبر کرتے تو ان کے لیے بہتر تھا) پھر اس کے بعد فرمایا: إِنَّ الَّذِينَ يُنَادُونَكَ مِن وَرَاءِ الْحُجُرَاتِ أَكْثَرُهُمْ لَا يَعْقِلُونَ (سورۂ حجرات آیت ۴) (جو لوگ آپ کو حجروں کے سامنے کھڑے ہو کر پکارتے ہیں ان میں سے اکثر بے عقل ہیں) اس آیت میں مرید کو شیخ کے پاس آنے اور شیخ کے خود بخود نکلنے تک مرید کے صبر کرنے کا ادب سکھایا گیا ہے۔

۲۷۔ وَلَا تَرْفَعَنْ بِالضِّحْكِ صَوْتَكَ عِنْدَهُ   فَلَا قُبْحَ إِلَّا دُوْنَ ذٰلِكَ فَاسْتَقْرِ

ترجمہ: شیخ کے پاس بیٹھ کر قہقہہ لگا کر مت ہنسو۔ یہ تمام برائیوں سے بڑھ کر برائی ہے۔ تلاش کر کے دیکھ لو (کہ آیا یہ بہت بڑی برائی ہے یا نہیں)

کثرت سے ہنسنے سے دل مردہ ہو جاتا ہے اور شیخ کی موجودگی میں قہقہہ لگا کر ہنسنا بہت ہی سخت بے ادبی ہے اور بہت ہنسنا رعونت کی علامت سمجھا گیا ہے جبھی تو امام ابو حنیفہؒ نے قہقہہ کو گناہ شمار کیا ہے اور اس سے وضو ٹوٹ جانے کا حکم لگایا ہے۔

۲۸۔ وَلَا تَقْعُدُوا قُدَّامَهُ مُتَرَبِّعًا   وَلَا بَادِيًا رِجْلًا فَبَادِرْ إِلَى السِّتْرِ

ترجمہ: شیخ کے سامنے پالتی مار کر یا پاؤں پھیلا کر مت بیٹھ (اگر پاؤں پھیل جائے تو) فوراً اسے سمیٹ لو۔

ابو طالب[2] مکی فرماتے ہیں علماء کے بیٹھنے کا طریقہ یہ ہے کہ دونوں گھٹنوں کو کھڑے کر کے بیٹھے اور

---

[1] ابو عثمان: ابو عثمانؒ الحیری: یہ دراصل ری کے رہنے والے تھے۔ پہلے یحییٰ بن معاذ رازی اور شاہ بن شجاع کرمانی کی صحبت میں رہے پھر کوچ کر کے نیشاپور چلے گئے اور ابو حفص بن حدرد کی صحبت اختیار کی۔ یہیں انکی شادی ابو حفص کی بیٹی سے ہوئی۔ ان کی وفات ۲۹۸ھ، ۹۱۰ء میں ہوئی۔

[2] ابو طالبؒ مکی: محمد بن علی بن عطیہ العجمی ثم المکی مشہور صوفی ہوتے ہیں۔ ان کی کتاب قوت القلوب صوفیہ کے ہاں بڑی مقبول ہے انکی وفات ۳۸۶ھ، ۹۹۶ء میں ہوئی

بعض پاؤں کے بل بیٹھتے ہیں۔ آنحضرتؐ صلی اللہ علیہ وسلم گوٹھ مار کر بیٹھا کرتے تھے۔

۲۹۔ وَلَا بَاسِطًا سَجَّادَۃً بِحَضُوْرِہٖ　　فَلَا قَصْدَ اِلَّا السَّعْیُ لِلْخَادِمِ الْبَرِّ

۳۰۔ وَسَجَّادَۃُ الصُّوْفِیْ بِبَیْتِ سُکُوْنِہٖ　　وَلَا وَکْرَ اِلَّا اَنْ تَطِیْرَ عَنِ الْوَکْرِ

ترجمہ: شیخ کی موجودگی میں سجادہ بچھا کر نہ بیٹھ اس لیے کہ نیک خادم کا کام خدمت گزاری میں دوڑ دھوپ کرنا ہی ہے اور صوفی کا سجادہ تو اپنی رہائش کی جگہ میں ہونا چاہیئے تمہارا اپنا گھونسلا تو اسی وقت بنے گا جب تو اس شیخ کے گھونسلے سے اُڑ کر چلا جائے گا۔

فرماتے ہیں کہ اپنے شیخ کی موجودگی میں سجادہ پھیلا کر اس پر نہ بیٹھ اس لیے کہ یہ اصل مقصد کے منافی ہے۔ اصل مقصد شیخ کی خدمت، اس کے احکام کی پابندی اور ان کی ضروریات اور مہمات میں اپنی جان تک دے دینا ہے اور سجادہ پر بیٹھے رہنا آرام و راحت کا مقتضی ہونے کے علاوہ شیخ سے برابری کرنے کا شک گزرتا ہے حالانکہ صوفی کے سجادہ کی اصلی جگہ اس کا اپنا گھر ہے نہ کہ شیخ کی مجلس بلکہ شیخ کی مجلس میں تواضع، انکساری اور خدمت گزاری کرنی چاہیئے اس لیے کہ شیخ کی موجودگی اور اس کے آستانہ پر تمہارا اپنا آستانہ نہیں بن سکتا کہ لوگ تمہاری طرف رجوع کرنے لگیں اس لیے کہ یہ شیخ کا سوءِ ادب ہے البتہ جب تمہاری تربیت مکمل ہو چکی ہو تجھے شیخ کی طرف سے اوروں کی تربیت کرنے کی اجازت مل گئی ہو اور تم تربیت کرنے والے امام بن چکے ہو تو اس وقت تم اپنی مجلس قائم کر سکتے ہو اور وہ بھی شیخ کی مجلس سے الگ ہو کر۔

۳۱۔ وَمَا دُمْتَ لَمْ تُفْطَمْ فَلَا فَرْجِیَّۃٌ　　عَلَیْکَ وَلَا تُلْفٰی عَلَیْھَا بِمُسْتَجْرِ

ترجمہ: جب تک شیخ تمہارا دودھ نہیں چھڑا دیتا یعنی تمہاری تربیت مکمل نہیں ہو جاتی اس وقت تک نہ تمہیں فرجیہ پہننا چاہیئے اور نہ اس کی جرأت کرنی چاہیئے۔

ابو عبدالرحمٰنؒ محمد بن الحسن السلمی فرماتے ہیں کہ مشائخ کے سوا اوروں کے لیے فرجیہ کا پہننا مناسب نہیں

لے اس حدیث میں جس میں جبریل علیہ السلام نے آکر ایمان کے متعلق سوال کیا تھا، جبریل کے بیٹھنے کا طریقہ بھی بتایا گیا ہے۔ ایک سائل اور مرید کو شیخ کے سامنے یہی طریقہ اختیار کرنا چاہیئے چنانچہ بزرگوں کے سامنے دو زانو ہو کر بیٹھنا ہی با ادب سمجھا گیا ہے۔ ۱۲

ع اس جگہ سکتہ پڑتا ہے مگر میں اسے درست نہ کر سکا۔

کے ابو عبدالرحمٰن محمدؒ بن الحسن السلمی: ابو عبدالرحمٰن محمد بن الحسین بن موسیٰ الازدی النیشاپوری جنہوں نے تصوف پر بہت سی کتابیں لکھیں۔ ۳۳۰ھ، ۹۴۱ء میں پیدا ہوئے (بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر)

یعنی فرجیہ مشائخ کا لباس ہے۔ اسی قسم کا اور لباس جو شیخ سے مخصوص ہو، اس کا بھی یہی حکم ہے۔

۳۲- وَلَا تَرَیَنَّ فِی الْاَرْضِ دُوْنَکَ مُؤْمِنًا وَلَا کَافِرًا حَتّٰی تَغِیْبَ فِی الْقَبْرِ

ترجمہ: جب تک تو زندہ ہے دنیا میں کسی مومن یا کافر کو اپنے سے کم نہ سمجھ۔

فرماتے ہیں کہ اے مرید کسی مومن یا کافر کو اللہ کے نزدیک اپنے سے کم مرتبہ نہ سمجھو بلکہ اس کے برعکس سمجھ لو اور اپنے آپ کو ہر ایک سے کم درجہ سمجھو اور مرتے دم تک اس بات پر قائم رہ۔

ابو یزید بسطامیؒ[1] فرماتے ہیں: وہ شخص متکبر ہے جو کسی ایک شخص کو بھی اپنے سے بدتر سمجھتا ہو۔ کسی نے پوچھا کہ انسان متواضع کب ہوتا ہے۔ فرمایا: جب وہ اپنے آپ کو کسی مقام یا حال پر خیال نہ کرتا ہو اور جس قدر اسے اپنے رب اور اپنے نفس کی معرفت حاصل ہے۔ اسی قدر ہر کسی سے تواضع سے پیش آتا ہو۔

سہروردیؒ عوارف میں تحریر فرماتے ہیں: کسی نے یوسف بن اسباطؒ[2] سے پوچھا کہ تواضع کی غایت کیا ہے؟ فرمایا جب گھر سے نکلے تو جسے بھی دیکھو اسے اپنے سے بہتر سمجھو۔ اور میں نے اپنے شیخ ضیاء الدینؒ ابو النجیب[3] کو

(بقیہ حاشیہ صفحہ سابقہ)

انکے والد کا نام کتاب میں الحسن لکھا ہے مگر انسائیکلو پیڈیا آف اسلام میں الحسین دیا ہے، اپنے نانا ابن نجیدؒ سے تعلیم پائی اور ابو القاسم نصر آبادی سے خرقہ حاصل کیا۔ ان کی وفات ۴۱۲ھ ۱۰۲۱ء میں ہوئی۔ انہوں نے قرآن مجید کی ایک تفسیر بھی لکھی جس کا نام حقائق التفسیر رکھا۔ حاجی خلیفہ نے انہیں عبدالرحمٰن حسین بن محمد السلمی النیشاپوری لکھا ہے (کشف الظنون: ۱: ۵۶) ان کی دیگر تصانیف آداب الصوفیہ، آداب الصحبۃ، آداب التفاذی، اربعین، زلل الفقر، سنن الصوفیہ، کتاب الآداب، کتاب الفتوۃ، طبقات الصوفیہ اور مقامات الاولیاء ہیں۔

---

[1] ابو یزیدؒ بسطامی: ابو یزید طیفور بن عیسٰی البسطامی مشہور صوفی گزرے ہیں۔ ان کی وفات ۲۶۱ھ ۸۷۴ء میں ہوئی ان کا جو قول بیان دیا ہے وہ شعرانی کی طبقات کبریٰ ج ۱ صفحہ ۶۵ پر دیا ہے۔

[2] یوسفؒ بن اسباط: کبارِ صوفیہ میں سے تھے کسی نے حضرت عبداللہ بن مبارک کے پاس ان کی عبادت کا ذکر کیا تو کہنے لگے تم تو ایسے لوگوں کا ذکر کر رہے ہو جن کے ذکر سے لوگوں کو شفا حاصل ہوتی ہے۔ ان کا جو قول بیان نقل کیا گیا ہے وہ شعرانی نے اپنی طبقات کبریٰ میں دیا ہے۔ ان کی وفات ۱۹۰ھ ۸۰۵ء کے چند سال بعد ہوئی۔

[3] شیخ ضیاء الدینؒ ابو النجیب: ابو النجیب عبدالقادر بن عبداللہ سہروردی، ضیاء الدین اور نجیب الدین ان کے لقب تھے۔ یہ ابوبکر الصّدیق کی اولاد میں سے تھے اور شیخ شہاب الدینؒ سہروردی مصنف عوارف المعارف کے پیر تھے، ان کی وفات ۵۶۳ھ ۱۱۶۷ء میں بغداد میں ہوئی۔ آداب المریدین ان کی تصنیف ہے۔

دیکھا اور میں شام کے سفر میں ان کے ساتھ تھا کہ ایک دنیا دار نے فرنگی قیدیوں کے سروں پر خوان رکھکر آپ کے لیے کھانا بھیجا۔ قیدیوں کے پاؤں میں بیڑیاں پڑی ہوئی تھیں۔ جب دستر خوان بچھا دیا گیا اور قیدی برتنوں کے خالی ہونے کے منتظر تھے تو آپ نے خادم سے کہا کہ قیدیوں کو بلاؤ کہ وہ بھی ہم فقیروں کے ساتھ دستر خوان پر بیٹھ جائیں، ان کو لایا گیا اور دستر خوان پر ایک ہی صف میں ان کو بھی بٹھا دیا گیا۔ شیخ اپنے سجادہ سے اٹھے اور ان کے پاس جا کر ان کے درمیان بیٹھ گئے گویا کہ آپ بھی ان میں ایک ہیں اور سب نے مل کر کھانا کھایا۔ اس وقت آپ کے باطن سے جو تواضع آپ کے چہرہ پر ظاہر ہو رہی تھی وہ ہم محسوس کر رہے تھے۔

شیخ ابوالحسن علی بن عتیق بن مومن القرطبی رحمۃ اللہ فرماتے ہیں کہ میں نے شیخ ابو محمد عبداللہ بن عبدالرحمٰن بن مقید کو ایک روز جب کہ سخت سردی، بارش اور کیچڑ تھی۔ پیدل جاتے ہوئے دیکھا راستہ میں انہیں اسی سڑک پر ایک کتا جاتے ہوئے ملا۔ آپ خود دیوار کے ساتھ لگ گئے اور کتے کے لیے راستہ چھوڑ کر اس کے گزر جانے کے منتظر رہے۔ جب کتا قریب آیا تو جس جگہ پر آپ تھے اسے چھوڑ کر نچلی جگہ پر آ گئے اور کتے کے لیے اوپر والی جگہ چھوڑ دی۔ جب کتا گزر گیا تو میں نے دیکھا کہ آپ کے چہرہ پر غم کے آثار تھے۔ میں نے عرض کیا: میں نے ابھی ایک عجیب بات آپ سے دیکھی ہے کہ آپ نے خود تو کیچڑ میں چلنا شروع کر دیا اور کتے کے لیے صاف جگہ چھوڑ دی۔ فرمایا: جب میں نے اس کتے کے لیے نچلا حصہ چھوڑا تو میں نے دل میں سوچا کہ میں نے تو کتے سے اپنے نفس کو بڑا سمجھا ہے، اسی لیے تو میں نے کتے سے اونچی جگہ لے لی ہے بلکہ وہ مجھ سے بہتر و بلند ہے اور عزت کا حقدار ہے اس لیے کہ میں نے کئی بار اللہ کی نافرمانی کی اور مجھ میں بہت زیادہ گناہ ہیں اور کتے میں تو کوئی گناہ نہیں۔ اس لیے میں نے اپنی جگہ اس کے لیے چھوڑ دی۔ اب مجھے اللہ کی ناراضگی کا ڈر ہے ہاں اگر معاف کر دے تو بچ سکتا ہوں۔ اس لیے کہ میں نے اپنے سے بہتر چیز سے اپنے کو بلند رکھا ہے۔

ذوالنون[1] فرماتے ہیں: جو شخص تواضع کرنا چاہے اسے اللہ تعالیٰ کی عظمت کی طرف دھیان کرنا چاہیئے کیونکہ اس طرح اس کا اپنا نفس اسے حقیر دکھائی دے گا اور جو شخص اللہ کی عظمت و دبدبہ کی طرف دیکھے گا۔ اس کا اپنا دبدبہ مٹ جائے گا اس لیے کہ اللہ کی ہیبت کو دیکھ کر تمام نفوس حقیر و ذلیل ہو جاتے ہیں۔ لہٰذا جب کوئی انسان تواضع کے اس مفہوم کو سمجھ جاتے تو وہ مخلوقات کے سامنے یقیناً

---

[1] ذوالنون مصری: ابوالفیض ذوالنون مصری۔ ان کا اصلی نام ثوبان بن ابراہیم ہے۔ دراصل نوبی تھے ۲۴۵ھ، ۸۵۹ء میں ان کی وفات ہوئی۔

تواضع کریگا۔ کیونکہ وہ دیکھ رہا ہوتا ہے کہ مخلوقات کی اللہ تعالیٰ کے ساتھ کیا نسبت ہے اسی لیے تو سہروردی نے عوارف میں کہا ہے: جب تک صوفی بساطِ قرب پر بیٹھ کر خاص طور پر متواضع نہ ہوگا اس وقت تک وہ پورے طور پر مخلوقِ خدا کے سامنے تواضع نہیں کر سکتا۔

۳۳۔ فَاِنَّ خِتَامَ الْاَمْرِ عَنْکَ مُغَرَّبٌ وَمَنْ لَیْسَ ذَا خُسْرٍ یَخَافُ مِنَ الْمَکْرِ

ترجمہ: کیونکہ تمہیں اپنے خاتمہ کا علم نہیں۔ خوش بخت آدمی وہی ہے جو مکرِ خداوندی سے ہر وقت ڈرتا ہے۔

مطلب یہ ہے کہ جب خاتمہ کا علم نہیں ہے تو اس کا تقاضا یہی ہے کہ انسان کسی کو بھی اپنے سے کم درجہ کا خیال نہ کرے۔ اللہ کے مکر سے بے خوف ہونا بدبختوں کا کام ہے۔ نیک آدمی اللہ کے مکر سے بے خوف نہیں ہوتے۔

ابن العربیؒ حاتمی فرماتے ہیں کہ ایک صوفی کے لیے خدا کا ادب کرنے میں یہی حال ہونا چاہیئے البتہ اس قسم کا ادب کرنے والے بہت کم لوگ ہیں کہ انسان یہ عقیدہ رکھے کہ اللہ تعالیٰ ہر لحظہ اپنے بندوں کے دلوں پر نگاہ رکھتے ہیں اور انہیں جس قدر چاہیں اپنے معارف اور لطف عنایت فرماتے رہتے ہیں لہٰذا اگر کوئی شخص اگر صوفی کے پاس تھوڑا عرصہ بیٹھ کر اٹھ جائے اور پھر واپس آجائے تو صوفی اس کی خدمت اور تعظیم کے لیے تیار ہو جاتا ہے کیونکہ وہ سمجھ سکتا ہے کہ ہو سکتا ہے کہ اس شخص پر اللہ تعالیٰ کی نظرِ کرم ہوگئی ہو جس سے یہ مالا مال ہو گیا ہو چنانچہ اگر معاملہ ایسا ہی ہو تو اس صورت میں اس نے ادب کا حق ادا کر دیا۔ لیکن اگر اس پر نظرِ کرم نہ بھی ہوئی ہو تو اس صورت میں بھی اس نے درحقیقت اللہ تعالیٰ کا ادب کیا ہوگا کیونکہ اس نے اس سے مرتبہ الٰہیہ کے مطابق برتاؤ کیا ہے اور یہ بہت ہی کمیاب منزل ہے جس کے صاحبِ ذوق شاذو نادر ہی ملیں گے۔ اسی طرح جب صوفی لوگ کسی کو معصیت کرتے ہوئے دیکھ لیتے ہیں اور پھر وہ معصیت چھوڑ دیتا ہے تو وہ اسے معصیت پر اصرار نہیں خیال کرتے اور دل میں کہتے ہیں کہ ہو سکتا ہے کہ اس شخص نے پوشیدہ طور پر توبہ کر لی ہو یا یہ ہو سکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ انجام کار اس پر مہربانی فرمادیں اور اسے اس معصیت سے کوئی نقصان نہ پہنچے اور جو شخص اپنے آپ کو دوسرے سے بہتر سمجھے حالانکہ نہ اسے اپنا انجام معلوم ہے نہ اس کا تو یہ شخص خدا سے جاہل ہے۔ دھوکہ میں پڑا ہے اور وہ کچھ بھی نہیں ہے خواہ اسے کس قدر معارف ہی کیوں نہ حاصل ہوں۔

ابوطالبؒ[1] مکی فرماتے ہیں: عارفین کے خوف کی ایک وجہ یہ ہوتی ہے کہ انہیں علم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے

---

[1] ابوطالب محمد بن علی بن عطیہ العجمی ثم المکی المتوفی ۳۸۶ھ۔ ان کی کتاب کا نام قوت القلوب فی معاملۃ المحبوب وصف طریق المرید الی مقام التوحید

بندوں میں سے جسے چاہے ڈراتا رہتا ہے اس طرح کہ بڑے اہلِ مرتبہ لوگوں کو عذاب و سزا دیکر ادنیٰ مرتبہ کے لوگوں کے لیے باعثِ عبرت بنا دیتا ہے اور اپنے خاص بندوں کو کسی خاص حکمت کی بنا پر سزا دیکر عام مخلوق کو ڈراتا رہتا ہے لہٰذا ان ڈرنے والوں کو علم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے صالحین کی جماعت میں سے کچھ لوگوں کو سزا کے طور پر نکال دیا اور اس طرح مومنین کو خوف زدہ کر دیا اور بعض شہداء کو سزا دے کر صالحین کو خوف زدہ کر دیا۔ اسی طرح صدیقین کی ایک جماعت کو صدیقین میں سے نکال کر شہدا کو خوف زدہ کر دیا ہے۔ اللہ ہی جانتا ہے کہ اس کی تہ میں کیا راز ہوتا ہے۔ اسی طرح ہر مقام والے اپنے سے کم درجہ لوگوں کے لیے عبرت کا باعث بنتے ہیں اور اوپر والوں کے لیے نصیحت کا اور اپنے ساتھیوں کے لیے ڈر اور دھمکی کا۔ یہ اللہ تعالیٰ کا ایک وصف ہے کہ وہ لوگوں کے ظاہری علوم و اعمال کی پروا نہیں کرتا لہٰذا صاحب مقام لوگوں کو کسی ایک مقام پر سکون و اطمینان نہیں ہوتا اور نہ ہی کوئی صاحب حال اپنی حالت کی طرف دیکھتا ہے اور جن لوگوں کو اللہ کی معرفت حاصل ہے وہ کسی حالت میں بھی اللہ کے مکر سے بے خوف نہیں ہوتے۔

ابو حامدؒ غزالی فرماتے ہیں۔ اللہ کی مشیت کے ساتھ تمام امور کا تعلق اس حد تک ہے کہ کوئی بھی اس کو سمجھ نہیں سکتا اور یقینی اور تحقیقی طور پر اس کا جاننا تو درکنار قیاس اور گمان سے بھی اس کا علم نہیں ہو سکتا اسی بات سنے تو عارفین کے ٹکڑے کر دیے ہیں کیونکہ سب سے بڑی مصیبت تو یہی ہے کہ تمہارے معاملات اس ذات پاک کی مرضی پر منحصر ہیں جسے تمہاری قطعاً پروا نہیں ہے۔

پھر بڑی لمبی بحث کرنے کے بعد فرماتے ہیں کہ ایک عارف کا قول ہے کہ اگر کسی شخص کو میں پچاس سال سے جانتا ہوں کہ وہ توحید پر قائم ہے اور پھر میرے اور اس کے درمیان ایک ستون حائل ہو جائے اور اسی حالت میں اس کی موت واقع ہو جائے تو میں یقینی طور پر اس کی توحید کی شہادت نہیں دے سکتا اس لیے کہ مجھے معلوم ہی نہیں کہ اس میں کیا تغیر واقع ہوا۔

ایک اور عارف فرماتے ہیں کہ اگر درجہ شہادت میرے گھر کے دروازہ پر ہو اور اسلام پر مرنا میرے حجرہ کے در پر تو میں اسلام پر مرنا پسند کروں گا کیونکہ مجھے معلوم نہیں کہ حجرے کے دروازے سے لیکر گھر کے دروازے تک میرے دل کو کیا پیش آئے گا۔

حضرت سہلؒ[1] فرمایا کرتے تھے۔ صدیقین کو ہر خیال اور ہر حرکت پر سوءِ خاتمہ کا ڈر لگا رہتا ہے۔ ان ہی

---

[1] ابو محمد سہل بن عبداللہ تستری: جس سال حج کے لیے گئے، اسی سال ان کی ملاقات ذوالنون مصری سے مکہ میں ہوئی ۲۸۳ھ میں ان کی وفات ہوئی۔

لوگوں کے متعلق تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ وَقُلُوْبُھُمْ وَجِلَۃٌ ان کے دل خوفزدہ رہتے ہیں نیز فرمایا کرتے تھے کہ مرید کو معصیت کا ڈر ہوتا ہے مگر عارف کو تو اس بات کا ڈر ہوتا ہے کہ کہیں وہ کفر میں مبتلا نہ ہو جائے۔

ابو یزیدؒ فرمایا کرتے تھے: جب مسجد کی طرف جاتا ہوں تو میری کمر پر زنار ہوتا ہے اور مجھے ڈر ہوتا ہے کہ کہیں مجھے یہ گرجا یا آتش کدہ کو نہ لے جائے حتیٰ کہ جب مسجد میں پہنچ جاتا ہوں تو یہ زنّار ٹوٹ جاتا ہے۔ ہر روز پانچ مرتبہ میرا یہی حال ہوتا ہے۔

ابوالحسن ہندی کی حالت

اسی سلسلہ میں مَیں نے حضرت سے ایک عجیب حکایت سنی۔ فرماتے تھے کہ مکّہ میں میری ملاقات ابوالحسنؒ علی الصدغاء الھندی[1] سے ہوئی تو میں نے انہیں عجیب حالت میں پایا۔ اس طرح کہ وہ جب بھی چلنے کے لیے قدم اٹھاتے تو وہ لرزتا تھا پھر واپس لوٹاتے تو بھی لرزتا تھا۔ پھر قدم بڑھانے کے لیے اٹھاتے تو بھی لرزتا تھا۔ چنانچہ دیکھنے والا یہی خیال کرتا کہ یہ دیوانہ ہے۔ ہر قدم پر ان کا یہی حال ہوتا تھا کھانا کھاتے وقت بھی ان کا یہی حال تھا کہ لقمہ منہ کی طرف لے جاتے تو ہاتھ لرزتا تھا۔ لیٹنے لگتے تب بھی یہی حال ہوتا اور ان کی یہ حالت ہوگئی کہ ہر حرکتِ ارادیہ پر ان پر یہی کیفیّت طاری ہو جاتی یہاں تک کہ آنکھ کھولنے اور بند کرنے پر بھی یہی حال ہوتا تھا۔ میں نے جب ان کی یہ حالت دیکھی تو مجھے سخت رنج ہوا اور ان پر رحم آگیا۔ میں نے پوچھا: ابوالحسن یہ تمہاری کیا حالت ہے؟ حالانکہ تم تو اللہ کے خاص اور برگزیدہ اولیاء و عارفین اور اہلِ دیوان میں سے ہو اور تمہارا جسم بھی صحیح و سلامت ہے اور تمہیں کوئی بیماری نہیں۔ کہنے لگا آپ کے سوا میں نے اپنی اس حالت کا کسی سے ذکر نہیں کیا۔ آپ سے ذکر کرتا ہوں۔ الحمد للہ کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی مخلوقات میں مجھے اپنے افعال کا مشاہدہ عطا فرمایا ہے چنانچہ میں اللہ کے فضل کو تمام مخلوقات میں جاری و ساری دیکھتا ہوں، ایک چیز بھی مجھ پر پوشیدہ نہیں ہے۔ مزید براں بحمداللہ اللہ تعالیٰ نے مجھے اپنے فعل اور قضا و قدر کے اسرار پر بھی مطلع فرمایا ہے چنانچہ میں افعالِ الٰہیہ کا مشاہدہ کرتا ہوں، اور جانتا ہوں کہ یہ فعل کیوں ہوا اور اس کی تقدیر کے اسرار کو اس طرح سمجھتا ہوں کہ ان کا سر بھی مجھ سے مخفی نہیں رہتا۔ اس کے بعد میں نے اپنی ذات میں اللہ کے فعل کو دیکھا تو اپنے آپ کو ان افعال اور اسرار کے مشاہدہ سے محجوب پایا لہٰذا مجھے خیال ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے مجھے اپنے فعل کے مشاہدہ سے محروم کیا ہے، ہو سکتا ہے یہ مجھے سزا دینے کے لیے ہو کہ اللہ تعالیٰ مجھ سے ناراض ہو گئے ہوں اس لیے مجھے اس تمام مشاہدے

[1] ابوالحسنؒ علی الصدغاء الھندی: ان کے حالات معلوم نہ ہو سکے۔

سے محروم کردیا گیا ہے تاکہ میں جس کام میں میری ہلاکت مضمر ہے اسے دیکھ کر اس سے بچنے کی کوشش نہ کروں۔ یہی وجہ ہے کہ میں اپنے ہر اختیاری فعل سے ڈرتا ہوں اور اپنے ہر اختیاری فعل میں اپنی ہلاکت سمجھتا ہوں۔ لہٰذا میں اپنے ہر فعل سے خائف ہوں۔ اسی لیے تو میں ظاہر و باطن میں اللہ کی طرف عاجزی کرتا ہوں اور جس فعل کی طرف قدم اٹھاتا ہوں تو خوف کو سامنے لے آتا ہوں اور اللہ سے درخواست کرتا ہوں کہ یہ فعل میری ہلاکت کا سبب نہ بنے چونکہ قدم اٹھانا یہ بھی ایک فعل اختیاری ہے لہٰذا میں کانپ اٹھتا ہوں اور قدم واپس کرنا بھی ایک اختیاری فعل ہے اس لیے پھر لرز جاتا ہوں۔ اسی طرح ہر فعل میں ہوتا ہے۔

حضرت فرماتے ہیں کہ میں اس سے اللہ کی وسعت رحمت کا ذکر کرتا رہا اور اس حدیث قدسی کا بھی ذکر کیا۔ اَنَا عِنْدَ ظَنِّ عَبْدِیْ بِیْ فَلْیَظُنَّ بِیْ مَا شَاءَ فَاِنْ ظَنَّ بِیْ خَیْرًا اَعْطَیْتُهٗ خَیْرًا۔ میں ویسا ہی ہوں جیسا میرا بندہ میرے متعلق ظن رکھے۔ لہٰذا اب جیسا ظن چاہے رکھے اگر وہ خیر کا ظن رکھے گا تو میں اسے خیر ہی دوں گا۔ وہ میری باتوں کو سنتا رہا یہاں تک کہ مجھے خیال آیا کہ اب وہ اپنی اس حالت سے اصلی حالت کی طرف لوٹ آئے گا، لیکن اس کا ظن پھر لوٹ آیا اور وہ اپنی اسی حالت پر رہا جو شخص بھی اسے دیکھتا اس پر رحم کھاتا اور دعا کرتا کہ اللہ تعالیٰ اسے جلدی آرام دے اِدھر یا اُدھر۔ حضرت فرماتے ہیں کہ میری تمنا یہ تھی کہ اہلِ حجاب اسے دیکھ لیں اور اس کی حالت کے سر کو معلوم کر لیں کہ اسے کسقدر اللہ کا خوف ہے اور ہر حرکت و سکون میں اسے کس طرح اللہ کا دھیان رہتا ہے تاکہ انہیں اپنے شہواتِ نفسانی میں انہماک اور اللہ سے منقطع ہونے کا پتہ چل جائے۔ حضرت فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے فعل کو اس سے کسی رحمت کے ارادہ پر مخفی رکھا تھا۔ اگر وہ اس پر مطلع ہو جاتا اور اس فعل کا مشاہدہ کرنے لگ جاتا تو اس کی ذات پگھل کر فنا ہو جاتی اور چونکہ اللہ کا ارادہ اسے ابھی زندہ رکھنے اور ایک مدت مقررہ تک اس کو جاری رکھنے کا تھا اس لیے اپنے فعل کو پوشیدہ رکھا۔ رب سبحانہ کے افعال کا مشاہدہ جیسا اسے حاصل ہوا دیگر اولیاء کو بھی ہوا بلکہ تمام انبیاء کو حاصل ہوا اور حادث خواہ کوئی ہو، اپنی ذات کے متعلق فعل رب کے مشاہدہ کی طاقت نہیں رکھ سکتا ورنہ اگر مشاہدہ کرے تو پگھل جائے۔ حادث اور لوگوں میں فعل حق کا مشاہدہ کر سکتا ہے۔ واللہ اعلم۔

۴۴۔ وَلَا تَنْظُرَنْ یَوْمًا اِلَی الْخَلْقِ اِنَّهٗ ‏ ‏ یُخَلِّیْ طَلِیْقَ الصَّفْوِ فِیْ اَسْرِ الْکَدْرِ

ترجمہ: مخلوق کی طرف ہرگز نگاہ نہ کر کیونکہ یہ صاف اور آزاد کو مکدر و مقید بنا چھوڑے گی۔

---

[1] ملاحظہ ہو مشکوٰۃ ص۱۹۶ باب ذکر اللہ والتقرب الیہ۔

پہلے شعر میں مرید کو مخلوق سے تکبر سے پیش آنے اور ان کو حقارت سے دیکھنے سے منع کیا گیا تھا۔ اب انہیں اس کے دوسرے پہلو یعنی افراط کے پہلو سے اجتناب کرنے کو کہا گیا ہے تاکہ کہیں انہیں قبلہ نہ بنالے اور اپنے افعال احوال اور اقوال میں انہی کا خیال نہ رکھے اس لیے فرمایا لَا تَنظُرَنْ سِوٰهَا کہ ایک لحظہ کے لیے بھی ان کی طرف نہ دیکھ تاکہ تو اپنے احوال، اقوال اور افعال میں خواہ وہ عبادات ہوں یا عادات، ان کا خیال نہ رکھے اس لیے کہ ان کی طرف نگاہ رکھنے میں اپنے صاف اعمال کو مکدر کرنا ہے اس لیے کہ جب اپنے افعال واقوال میں تمہاری نگاہ ہر مخلوق پر پڑے گی تو تم میں ریاء وتصنع پیدا ہو جائے گا۔ اسی لیے شیخ ابوعبداللہ القرشی[1] فرماتے ہیں کہ جس شخص نے اپنے اقوال وافعال میں اللہ تعالیٰ کے سننے اور دیکھنے پر اکتفا نہ کی تو اس شخص میں لامحالہ ریا پایا جائے گا۔

بشر حافی[2] فرماتے ہیں: جس شخص نے یہ چاہا کہ وہ لوگوں میں مشہور ومعروف ہو جاتے وہ رسوا ہوا۔ نیز فرمایا: جس شخص نے یہ خواہش کی کہ وہ لوگوں میں معروف ہو وہ آخرت کی حلاوت نہ پا سکے گا۔

کسی عارف کا قول ہے اگر تم اللہ کے ہاں منزلت چاہتے ہو تو لوگوں میں منزلت کا خیال ترک کردو۔

مصنف عوارف فرماتے ہیں کہ یہ ایک ایسا اصول ہے کہ جس نے اسے ملحوظ نہ رکھا، اس کے اکثر اعمال فاسد ہوگئے اور جس نے اس کو ملحوظ رکھا اس کے بہت سے احوال کی اصلاح ہو جاتی ہے۔ صاحب قصیدہ کے اس شعر کا ماخذ سہروردیؒ کی یہی عبارت ہے۔

ایک روز میں حضرت کے ساتھ باب الحدید میں تھا کہ حضرتؒ نے میری طرف دیکھا اور فرمایا کہ جس شخص کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی معرفت حاصل نہ ہو وہ اللہ کی معرفت حاصل نہیں کر سکتا اور جسے اپنے شیخ کی معرفت حاصل نہ ہو وہ رسول اللہ کی معرفت حاصل نہیں کر سکتا اور جس شخص نے لوگوں پر نماز جنازہ نہ پڑھی ہو وہ شیخ کی معرفت حاصل نہیں کر سکتا۔ لہٰذا جب لوگ اس کی نظروں سے اتر جائیں اور وہ اپنے تمام

---

[1] ابوعبداللہ قرشیؒ: ابوعبداللہ محمد بن احمد بن ابراہیم قرشی، ابوعبداللہ قرشی جلیل القدر صوفیاء میں سے گزرے ہیں۔ خضر علیہ السلام سے ان کی اکثر ملاقات ہوتی رہتی تھی۔ یہ اندھے اور کوڑھی تھے، زخموں سے پیپ ہر وقت بہتی رہتی تھی۔ صاحب کرامات کثیرہ ہیں۔ (شعرانی ج ۱: ۱۴۸) ان کی وفات شام میں پچپن برس کی عمر میں ۵۹۹ھ میں ہوئی۔ ان کی نماز جنازہ مسجد اقصیٰ میں پڑھی گئی (ابن خلکان ج ۲: ۴۳۴)

[2] بشر حافیؒ: ابونصر بشر بن الحارث: اصل میں مرو کے تھے مگر بغداد میں رہائش اختیار کر لی تھی اور وہیں وفات پائی۔ علی بن خشرم کے بھانجے تھے ۲۲۷ھ، ۸۴۱ء میں ان کی وفات ہوئی۔

اقوال، افعال اور حالات میں ان کی پروا نہ کرتا ہو اسے اللہ کی رحمت ایسے آئے گی کہ اسے پتہ بھی نہ چلے کہ کہاں سے آئی ہے۔ شیخ کو بھی وہی شخص پسند ہے جو لوگوں کی نظروں کی پروا نہ کرے۔ اس سلسلہ میں بہت سے نفیس اسرار نقل کئے گئے ہیں۔ واللہ اعلم۔

۳۵۔ وَاِنْ نَظَمَ الْحَقُّ الْكَرَامَاتِ أَسْطُرًا ﴿﴾ فَلَا تُبْدِيَنْ حَرْفًا لِغَيْرِكَ مِنْ سَطْرِ

۳۶۔ سِوَى الشَّيْخِ لَا تَكْتُمُهُ سِرًّا فَإِنَّهُ ﴿﴾ بِسَاحَةِ كَشْفِ السِّرِّ يَجْرِي عَلَى بَحْرِ

ترجمہ: اگر حق تعالیٰ کرامات کی سطریں نظم کر دے تو اپنے شیخ کے سوا ان سطروں کا ایک حرف بھی غیر سے ذکر نہ کر بلکہ شیخ سے کوئی راز کی بات بھی چھپائے نہ رکھ اس لیے کہ وہ کشفِ سر کے میدان میں ایسا ہے جیسے وہ سمندر کے اوپر چل رہا ہے۔

پہلے بیان ہو چکا ہے کہ جب مرید لوگوں پر نماز جنازہ پڑھ چکے گا اور وہ اس کی نظروں سے نکل جائیں گے تو اللہ کی رحمت اس پر وہاں سے آئے گی جہاں سے اسے اس کے آنے کا گمان بھی نہ ہوگا۔ لہٰذا کہا "وَاِنْ نَظَمَ الْحَقُّ الْكَرَامَاتِ" یعنی جب تمہاری نگاہ خدا کے سوا کسی اور پر نہیں جاتی تو اگر اللہ تم پر رحم فرمائے اور تم سے کثرت سے کرامات ظاہر ہونے لگیں تو تمہیں ادب کا لحاظ رکھتے ہوئے اس کا شیخ کے سوا کسی سے اظہار نہیں کرنا چاہیئے اور شیخ سے کوئی بات پوشیدہ بھی نہیں رکھنی چاہیئے۔ کیونکہ وہ تمہارا طبیب ہے جسے ان بیماریوں کا علم ہے جو تجھے اللہ سے منقطع کر دیں لہٰذا جس شیخ کا یہ حال ہو اس سے اسرار کو کیوں چھپایا جائے۔

سہروردیؒ عوارف میں فرماتے ہیں: یہ بھی آداب میں شامل ہے کہ مرید شیخ سے اپنی حالت اور اللہ تعالیٰ کی عنایات کی کوئی بات نہ چھپائے رکھے اور نہ اپنی کرامات اور اجابتِ دعا کو چھپائے اور جن باتوں کے اظہار سے شرم آتی ہو انہیں اشاروں اور کنایوں میں کہہ دے کیونکہ اگر مرید کسی بات کو اپنے دل میں چھپائے رکھے گا اور شیخ سے تصریحاً یا تعریضاً اس کا ذکر نہیں کرے گا تو وہ اس کے باطن پر راہِ طریقت میں شکل بن جائے گی اور شیخ سے ذکر کر دینے سے گرہ حل اور زائل ہو جاتی ہے۔ اس کے بعد فرماتے ہیں ایک ضروری ادب یہ بھی ہے کہ شیخ مریدوں کے کشف اور اللہ کے انعامات جن کا ذکر وہ شیخ سے کرتے ہیں راز ہی میں رکھے اس لیے کہ مرید کے راز کا علم اللہ اور شیخ کے سوا کسی اور کو نہیں ہونا چاہیے۔ اس کے بعد شیخ ان تمام امور کو جنہیں مرید اپنی خلوت میں پاتا ہے مثلاً کشف، مخاطبہ اور کرامات حاضر کر کے اسے سمجھائے کہ یہ امور اللہ سے غافل کر دینے کا سبب ہوتے ہیں۔

(مؤلف کہتا ہے) ایک روز حضرت سے آیت اَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ قَالُوْا بَلٰى کا تذکرہ کر رہا تھا حضرت

نے بہت اچھی باتیں فرمائیں جن کی میں نے تاویل کر لی۔ اس کے بعد نماز میں آپ میرے سامنے حاضر ہو جاتے مجھے اس سے بڑی خوشی ہوئی۔ حضرت سے اس کا تذکرہ کیا تو شروع شروع تو آپ نے میری موافقت کی پھر چند دنوں کے بعد فرمایا اسے چھوڑ دو۔ میں اس کا راز نہ سمجھ سکا۔ آپ مجھے برابر زجر کرتے رہے تاآنکہ یہ بات مجھ پر واضح ہوگئی کہ اگر یہ بات دیر تک جاری رہتی تو مجھے برے امور کی طرف لے جاتی۔ اس پر میں نے اللہ کا شکر کیا اور سمجھ گیا کہ یہ آپ ہی کی بدولت ہے۔

ایک مرتبہ میں نے حضرت سے کسی بات کی شکایت کی تو فرمایا آئندہ کبھی ایسا نہ ہوگا چنانچہ ایسا ہی ہوا یوں معلوم ہوتا تھا کہ حضرت نے میرے اور اس کے درمیان ایک دیوار حائل کر دی ہے۔

ایک اور مرتبہ میں نے حضرت سے ایک ایسے معاملہ کی شکایت کی جو دین و دنیا دونوں کیلئے نقصان دہ تھا اور جس کی آفت سے بچنا مشکل تھا۔ فرمایا: دنیا میں تو اس سے ہرگز نہ ڈر۔ اس سے تجھے قطعاً کوئی ضرر نہ پہنچے گا اب رہا آخرت کا معاملہ تو میں اس بات کا ذمہ لیتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ تجھ سے اس کا نہ سوال کریں گے نہ حساب پوچھیں گے۔ چنانچہ دنیا میں تو جیسا حضرت نے فرمایا تھا، ویسا ہی ہوا اور امید ہے کہ آخرت میں بھی ویسا ہی ہوگا جیسا کہ حضرت نے فرمایا:

حضرت ہمیں فرمایا کرتے تھے۔ دنیا یا دین کا کوئی معاملہ بھی پیش آئے مجھ سے چھپایا نہ کرو بلکہ مجھ سے ذکر کر دیا کرو یہاں تک کہ جو گناہ بھی تم سے سرزد ہو جائے اس کا بھی ذکر کر دیا کرو اور اگر تم مجھ سے اس کا ذکر نہ کرو گے تو میں اس کا تم سے ذکر کر دوں گا اس لیے کہ ایسی مصاحبت کا کیا فائدہ جس میں مصاحبوں کی کوئی بات بھی پوشیدہ رہ جائے۔ نیز فرماتے تھے میں تو اپنی کوئی بات تم سے نہیں چھپاتا۔ پھر آپ نے اس وقت تک کے اپنے حالات بیان کئے اور اپنی عادتوں کا بھی ذکر فرما دیا، پھر کہا: اگر میں تمہیں اپنے حالات کی اطلاع نہ دوں تو اللہ مجھے سزا دیگا اس لیے کہ تم مجھ سے حسنِ ظن رکھتے ہو۔ ذرا ٹھہر و میں تمہیں باطن کا وہ حال بتاؤں جس کی تمہیں خبر نہیں۔ اس کے بعد جس کا دل چاہے میرے ساتھ رہے، وہ رہ جاتے تب جاکر میرے لیے اس کا کھانا اور اس کا ہدیہ قبول کرنا جائز ہوگا اور جو جانا چاہے چلا جائے کیونکہ ان امور سے میری خاموشی تم سے بے وفائی ہوگی۔ حالانکہ حضرت اپنے مریدوں کے لیے خاص رحمت تھے۔ ان کی لغزشوں پر سفارش کرتے اور مصیبت میں ان کے ضامن ہوتے اور جس چیز کا انہیں ڈر ہوتا اس کا خود ذمہ لیتے اور ان کے امور کا اس قدر اہتمام کرتے جتنا اپنے امور کا نہ کرتے تھے۔

ایک مرتبہ مجھے فرمایا: جو شخص برائیوں میں اپنے ساتھیوں کا شریک نہیں ہوتا وہ ساتھی نہیں کہلا سکتا

نیز فرمایا: اگر مصاحبت نیکیوں تک ہی محدود ہو تو وہ مصاحبت نہیں کہلا سکتی۔ حاصل یہ کہ آپ اپنے مریدوں کے لیے اللہ کی طرف سے بھیجی ہوئی رحمت تھے۔ ایسے ہی بزرگوں پر لوگ روتے ہیں اگر ہم ان تمام جزئیات کی تفصیل دینا چاہیں تو بات بہت لمبی ہو جائے۔

اس تمام بحث سے سہروردیؒ کے اس قول کا مطلب کہ "شیخ کی معیت میں عقدے حل ہو جاتے ہیں" واضح ہو گیا۔ واللہ اعلم۔

۳۷۔ وَفِی الْکَشْفِ اِنْ کُوْشِفْتَ وَاجْعَلْهُ اِنَّهٗ ‌ ‌ لِتَوْضِیْحِ مَا کُوْشِفْتَ مُبْتَسِمُ الثَّغْرِ

اور اگر تجھے کشف ہو تو اس میں بھی شیخ کی طرف رجوع کر اس لیے کہ وہ بخوشی تمہارے کشف کی وضاحت کر دے گا۔

سہروردیؒ فرماتے ہیں: ذاکر کے لیے بعض اوقات حقائق بغیر صور مثالیہ کے ظاہر ہو جاتے ہیں جسے کشف کہتے ہیں۔ کبھی یہ چیز آنکھوں سے دکھائی جاتی ہے اور کبھی سماع کے ذریعہ سے اور کبھی اپنے باطن سے سن لیتا ہے اور کبھی باطن سے نہیں بلکہ ہوا سے اسے آواز سنائی دیتی ہے جیسے ہواتف، جن سے وہ سمجھ جاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ اس سے یا کسی اور سے کیا معاملہ کرنے کا ارادہ رکھتا ہے۔ یہ اللہ کی طرف سے اطلاع ہوتی ہے تاکہ اس کا یقین پختہ ہو جائے۔ اس سے بھی بڑھکر وہ شخص ہے جسے خالص یقین کا مکاشفہ ہو برخلاف مذکورہ بالا کشف کے (کہ اس میں کشف یقین کا سبب ہوتا ہے) کیونکہ کشف تو برہمنوں، فلاسفہ اور دہریہ اور راہبوں وغیرہ کو بھی حاصل ہو سکتا ہے، حالانکہ یہ رسوائی اور ہلاکت کا طریقہ ہے۔ یہ کشف ان لوگوں کے لیے مکر و استدراج کا سبب ہوتا ہے تاکہ یہ لوگ اپنی حالت کو اچھا سمجھ کر گمراہی اور ہلاکت کی راہ پر ہی قائم رہیں اور سالک اس سے دھوکا نہیں کھاتا اور وہ جانتا ہے کہ خواہ وہ ہوا اور پانی پر بھی کیوں نہ چلنے لگ جائے تب بھی اسے یہ کچھ فائدہ نہیں دے سکتا جب تک کہ وہ زہد و تقویٰ کا حق ادا نہ کرے۔ اسی لیے کشف میں شیخ کی طرف رجوع کرنے کی ضرورت ہوئی کیونکہ اس کے خطرات سے بچنا مشکل ہے۔

۳۸۔ وَلَا تَنْفَرِدْ عَنْهُ بِوَاقِعَةٍ جَرَتْ ‌ ‌ فَفِیْ غِشَاءٍ عَیْنَاکَ وَالسَّمْعُ فِیْ وَقْرٍ

عہ اس قصیدہ میں ادبی لحاظ سے کئی ایک سقم پائے جاتے ہیں چنانچہ شعر نمبر ۱۰ خارج از وزن ہے۔ قصیدہ بحر طویل میں ہے مگر اس شعر کا پہلا مصرع غیر موزوں ہے۔ پھر پندرھویں شعر میں جَنَی النَّادِ کہا ہے حالانکہ جنی کا لفظ پھل یا شہد کے لیے استعمال ہوتا ہے جنی النّاد کی ترکیب شاعر کے اپنے ذہن کی اختراع ہے اس کے بعد اکتیسواں

(بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر)

سہروردیؒ فرماتے ہیں کہ صورت مثالی میں حقائق کے ظاہر ہونے کو "واقعہ" کہتے ہیں اور غیر صورت مثالی میں حقائق کے ظاہر ہونے کا نام "کشف" ہے۔ مثلاً یہ کہ کوئی خواب میں دیکھے کہ وہ دشمن پر غالب آگیا ہے پھر اس کے بعد اگر وہ دشمن پر غالب آگیا تو اس خواب کی تعبیر کی ضرورت نہیں اور کبھی دشمن پر غلبہ مثالی صورت میں دکھایا جاتا ہے مثلاً یہ خواب میں دیکھا کہ ایک سانپ کو مارا ہے پھر بیدار ہونے پر دشمن پر غلبہ پایا۔ اس صورت میں غلبہ کی حقیقت مثال کی صورت میں دکھائی گئی ہے اس لیے خواب کی تعبیر کرنے کی ضرورت ہوگی۔ پہلی قسم میں یہ حقیقت اسے صورت کے بغیر ظاہر ہوئی۔ لہٰذا انسان کو جو مکاشفہ بحالتِ بیداری غیر صورتِ مثالی میں ہو اسے "کشف" کہیں گے اور جو صورتِ مثالی میں ہوگا اسے "واقعہ" کہیں گے۔ بعض اوقات صورۃِ مثالی بھی فائدہ سے خالی ہوتی ہے۔ نہ اس کا کوئی مطلب ہوتا ہے اور نہ کوئی نتیجہ بعینہٖ اسی طرح جس طرح کہ پریشان خواب ہوتے ہیں اس لیے اسے "واقعہ" نہ کہیں گے کیونکہ "واقعہ" کے درست ہونے کی شرط یہ ہے کہ ذکر میں پہلے اخلاص پایا جائے پھر استغراق اور استغراق کی علامت دنیا سے بے رخی اور تقویٰ کی پابندی ہے لہٰذا اب شعر کے معنی یوں ہوئے کہ جو "واقعہ" تم سے پیش آئے اس میں شیخ سے علیحدہ مت رہو اس لیے کہ تمہارے کان اور آنکھیں کمزور ہیں اور شیخ ان کا پرکھنے والا اور نافذ کرنے والا ہے۔

سہروردیؒ عوارف میں فرماتے ہیں۔ آداب مرید میں سے یہ بھی ہے کہ شیخ سے رجوع کیے بغیر مرید کسی "واقعہ" یا "کشف" میں اپنے آپ کو مستقل نہ سمجھے۔ اس لیے کہ شیخ کا علم وسیع اور اس کا دروازہ جو اللہ کی طرف ہر وقت کھلا رہتا ہے بہت بڑا ہے۔ چنانچہ اگر "واقعہ" صحیح ہوگا تو شیخ اسے نافذ کردیگا اور اگر اس میں کوئی شبہ ہوگا تو شیخ اسے زائل کردیگا۔ اس کے بعد سہروردیؒ نے لمبی بحث کی ہے پھر فرماتے

(بقیہ حاشیہ صفحہ سابقہ)

شعر پھر خارج از وزن ہے۔ پہلے مصرع میں فَرْجیہ کی دا کو اگر مشدد پڑھا جائے تب جاکر وزن پورا ہوتا ہے حالانکہ فرجیہ کی داء مخفف ہے۔ غالباً شاعر نے یہ شعر سن رکھا ہے:

چو تشدید در شعر ضرورت افتد ۔۔۔ تشدید صحیح چرا نباشد !!

اور اس پر عمل کیا ہے۔ پھر اسی شعر میں مُستجرء کی ہمزہ کو وزن اور قافیہ کی خاطر حذف کیا ہے اور اس قسم کا حذف نہایت قبیح ہوتا ہے اسی طرح اس شعر کے دوسرے مصرع میں اصل لفظ غشاء ہے جو ممدود ہے شاعر کو وزن نے مجبور کیا اور بجائے غِشَاءٌ کے غِشًا پڑھا۔ ضرورت شعری کے لیے ممدود کو مقصور پڑھنا جائز ہے مگر یہاں تو شاعر نے مقصور نہیں کیا بلکہ ہمزہ کو جزو کلمہ سمجھ کر اسے مہموز بنا دیا ہے حالانکہ یہ لفظ ناقص ہے۔

ہیں، ان عجیب وغریب واقعات سے جو میں نے اپنے شیخ کے مریدوں سے سنے ہیں یہ بھی ہے کہ انھوں نے ایک دن اپنے مریدوں سے فرمایا۔ ہمیں کسی قدر علم کی ضرورت ہے لہٰذا تم اپنی اپنی خلوت گاہ میں چلے جاؤ اور جو فتح تمہیں نصیب ہو اسے میرے پاس لاؤ۔ انھوں نے ایسا کیا اس کے بعد ان میں سے ایک شخص جس کا نام اسمٰعیل بطائحی تھا، آیا اور اس کے ہاتھ میں ایک کاغذ تھا جس پر تیس دائرے کھینچے ہوتے تھے اس نے کہا حضرت مجھے تو "واقعہ" میں یہی چیز حاصل ہوتی ہے۔ شیخ نے کاغذ لیا اور ابھی ایک گھڑی نہ گزری تھی کہ ایک شخص آیا جس کے پاس سونا تھا اور اسے شیخ کے سامنے رکھ دیا۔ شیخ نے کاغذ کھولا تو ٹھیک تیس تھے اور ہر ایک اپنے اپنے دائرہ پر درست آیا۔ اس پر حضرت نے فرمایا کہ یہ شیخ اسمٰعیل کی فتوح ہے یا اسی قسم کے اور الفاظ کہے۔

نیز فرماتے ہیں (یعنی سہروردیؒ) کہ کبھی حقائق خیالی لباس میں یا مثالی صورت میں ظاہر ہوتے ہیں جس طرح سوئے ہوئے شخص کے لیے حقائق خیالی لباس میں آتے ہیں۔ مثلاً کوئی شخص خواب میں دیکھے کہ اس نے سانپ مارا تو تعبیر کنندہ کہے گا کہ تو دشمن پر غالب آئے گا۔ اس کے بعد طویل بحث کی ہے اور "واقعہ" اور "کشف" اور "واقعہ صحیحہ" اور "خیال محض" میں فرق بیان کیا ہے اور یہ بحث ایک بڑی تقطیع کے ورق پر آئی ہے۔ میں نے اس شعر اور پہلے شعر کی تشریح میں اس کا ماحصل بیان کر دیا ہے۔ واللہ اعلم۔

۳۹- وَفِرَّ اِلَيْهِ فِي الْمُهِمَّاتِ كُلِّهَا   فَاِنَّكَ تَلْقَى النَّصْرَ فِي ذٰلِكَ الْفِرّ

(ترجمہ: تمام مہمات میں اسی کی طرف بھاگ کر جا کیونکہ تجھے اسی بھاگنے میں کامیابی حاصل ہوگی)

سہروردیؒ فرماتے ہیں: مرید کو یہ عقیدہ رکھنا چاہیئے کہ شیخ ایک ایسا دروازہ ہے جسے اللہ تعالیٰ نے اپنی بارگاہِ کریمی کی طرف کھول رکھا ہے۔ اسی دروازہ سے اللہ کی بارگاہِ کریمی میں داخل ہو سکتے ہیں اسی سے نکل سکتے ہیں، اور اسی دروازہ کی طرف ہم رجوع کرتے ہیں اور مرید کو چاہیئے کہ اپنی دینی اور دنیاوی ضروریات شیخ کے سامنے پیش کرے۔ شیخ انہیں اللہ کے حضور میں پیش کرے گا اور جس طرح مرید شیخ کی طرف رجوع کرتا ہے اسی طرح مرید کی خاطر شیخ اللہ کی طرف رجوع کرے گا۔ شیخ کے لیے بیداری اور خواب میں مکالمہ اور محادثہ کا دروازہ کھلا رہتا ہے۔ اسی لیے شیخ مرید میں اپنی مرضی کے مطابق تصرف نہیں کرتا کیونکہ مرید اس کے پاس اللہ کی امانت ہے شیخ مرید کی حاجتوں کے لیے اللہ کی بارگاہ میں اسی طرح فریاد کرتا ہے جس طرح اپنی ذاتی ضروریات اور دنیاوی اور اخروی مہمات کے لیے کرتا ہے۔ اللہ تعالیٰ

فرماتے ہیں: وَمَا كَانَ لِبَشَرٍ اَنْ يُّكَلِّمَهُ اللّٰهُ اِلَّا وَحْيًا اَوْ مِنْ وَّرَاءِ حِجَابٍ اَوْ يُرْسِلَ رَسُوْلًا (سورۂ شوریٰ آیت ۵۱) کسی انسان کی طاقت نہیں کہ اللہ اس سے باتیں کرے مگر بذریعہ وحی یا پس پردہ یا اس طرح کہ اس کے پاس فرشتہ بھیج دے، چنانچہ فرشتہ کا آنا اور وحی تو انبیاء کے ساتھ مخصوص ہے اور پس پردہ کلام بذریعہ الہام یا بذریعہ ہواتف یا خواب وغیرہ میں یہ شیخ کے لیے ہے۔

سہروردی نیز فرماتے ہیں: شیخ کے آداب میں سے ایک بات یہ بھی ہے کہ جب مرید شیخ سے کوئی بات دنیا یا دین کے متعلق کرنا چاہے تو جب تک اسے معلوم نہ ہو جائے کہ شیخ اس کی بات سننے کے لیے آمادہ ہیں شیخ سے گفتگو کرنے میں جلدی نہ کرنا چاہیئے۔ چنانچہ جس طرح دعا کے آداب اور شرائط ہیں اس لیے کہ دعا میں اللہ سے ہم کلامی ہوتی ہے اسی طرح شیخ سے بات کرنے کے بھی آداب و شرائط ہیں اس لیے کہ یہ اللہ سے معاملہ کرنا ہوتا ہے مرید کو شیخ سے کلام کرنے سے پہلے اللہ سے دعا کرنی چاہیئے کہ اسے پیر کا مناسب ادب بجا لانے کی توفیق دے۔

میں نے حضرت سے سنا کہ شیخ کا مرید کے لیے وہی درجہ ہوتا ہے جو لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ کا ہے۔ چنانچہ مرید کے ایمان کا تعلق شیخ سے ہوتا ہے اسی طرح اس کے تمام دینی اور دنیوی امور کا بھی۔ ارباب بصیرت اپنی آنکھوں سے اس کا مشاہدہ کرتے ہیں۔

جب مجھے حضرت کے مرتبہ کا علم نہ تھا میں اکثر حضرت کے ساتھ باہر جاتا تھا تو اکثر فرماتے کہ تمہاری مثال ایسی ہے جیسے کوئی شہر کی بلند فصیل پر چل رہا ہو کہ چلنے کی جگہ تو بہت تنگ ہے اور گرے تو دور جا گرے۔ میں اس کلام کا مطلب کچھ مدت کے بعد سمجھا۔ لہٰذا اس کے بعد جب حضرت کے یہ الفاظ میرے ذہن میں آتے تو مجھ پر سخت خوف طاری ہو جاتا۔

ایک دن میں نے عرض کیا کہ مجھے اپنے چند اعمال کی وجہ سے اللہ سے ڈر لگتا ہے۔ آپ نے پوچھا وہ کیا ہیں؟ میں نے جتنے یاد آئے کہہ دیئے۔ فرمانے لگے: ان باتوں سے مت ڈرو، لیکن تمہارے لیے سب سے بڑا گناہ تو یہ ہے کہ ایک گھڑی گزر جائے اور میرا خیال تمہارے ذہن میں نہ آئے۔ یہی وہ معصیت ہے جو دین و دنیا میں نقصان دے گی۔

ایک مرتبہ میں نے عرض کیا کہ حضرت میں نیکی سے بہت دور ہوں۔ فرمایا: یہ خیال ذہن سے نکال دو۔ میرے نزدیک جو تمہاری قدر و منزلت ہے اسے دیکھو۔ اسی پر تمہیں محمول کیا جائے گا ہمارے حضرت سے ایسے مراسم تھے کہ شاذ و نادر ہی ایسے سننے میں آئیں گے جو معاملہ بھی ہمیں پیش آتا خواہ چھوٹا ہوتا خواہ بڑا، ہم اس کا ذکر آپ سے کر دیتے تھے۔ ہمارے دیکھتے دیکھتے آپ اس کا ذمہ لیتے اور محض ذکر کرنے سے ہی ہمیں اس

سے بے فکر کر دیتے۔ آپ ہم سے ہنسی و مزاح بھی کرتے تھے، حیا رکا پردہ اٹھا دیتے اور ہمارے سوال کرنے سے پیشتر ہی بات شروع کر دیتے۔ اور فرماتے مجھے شیخ کے مقام پر مت رکھا کرو۔ میں تو تمہارے بھائی کی طرح ہوں۔ تم میں مقامِ شیخ کے آداب بجالانے کی طاقت نہیں۔ لہٰذا میں تم سے مصالحت کرتا ہوں اور تمہیں اجازت دیتا ہوں کہ تم مجھے بمنزلہ بھائی کے سمجھو تاکہ ہماری اور تمہاری صحبت دائمی ہو۔ خدا حضرت کو جزاء خیر دے۔ واللہ اعلم۔

۴۰۔ وَلَا تَكُ مِمَّنْ يَحْسُنُ الْفِعْلُ عِنْدَهُ ۞ فَيَفْسُدُ إِلَّا أَنْ يَفِرَّ إِلَى الْكَسْرِ

ترجمہ: تو ان لوگوں میں سے نہ بن جنہیں اپنے اعمال اچھے معلوم دیتے ہیں تاکہ کہیں یہ اعمال فاسد نہ ہو جائیں ہاں البتہ اگر کسرِ نفسی کی طرف بھاگ کر پناہ لے تو عمل فاسد نہیں ہوتے۔

اس شعر میں اپنے اعمال پر گھمنڈ کرنے سے پرہیز کرنے کو کہا گیا ہے کیونکہ گھمنڈ سے اعمال کو نقصان پہنچتا ہے اور دوسرے مصرع کا مطلب یہ ہے کہ جب تو اس غرور سے بھاگ کر اللہ کی طرف رجوع کرے تو تمہارے اعمال فاسد نہ ہوں گے اس لیے کہ جب تو نے اللہ کی طرف رجوع کیا تو تُو اسی کو تصرف کرنے والا اور ان اعمال کا جاری کرنے والا پائے گا اور یہ سمجھے گا کہ تُو تو ایک ظرفِ عمل ہے تجھ میں اور دوسروں میں کوئی فرق نہیں اور جو نیک اعمال تجھ سے صادر ہوں گے ان میں اپنے آپ کو ایسا پائے گا جیسے کوئی دوسرے کے فعل پر فخر کر رہا ہو۔ اس طرح تیرا گھمنڈ اللہ سے حیا و شرم اس کی ناراضگی سے ڈر اور اس کے انعامات پر شکر کرنے میں تبدیل ہو جائے گا۔ گھمنڈ اس بات کی علامت ہے کہ تیرا عمل قبول نہیں ہوا چنانچہ ایک عارف کا قول ہے کہ تیرے عمل کی مقبولیت کی علامت یہ ہے کہ تو اسے بھول جائے اور تو اپنی نگاہ کو اس طرف سے کلی طور پر ہٹائے کیونکہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں وَالْعَمَلُ الصَّالِحُ يَرْفَعُهُ اللہ تعالیٰ عمل صالح کو اوپر اٹھا لیتا ہے چنانچہ اس بات کی علامت کہ حق تعالیٰ نے اس عمل کو اٹھا لیا ہے یہ ہے کہ اس میں کچھ بھی تمہارے پاس باقی نہ رہے لہٰذا اگر تمہاری نظر میں کچھ بھی باقی نہ رہے تو سمجھ لو کہ یہ عمل اللہ کی طرف نہیں اٹھا

زین العابدینؒ علی بن الحسین رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں اگر تمہارے کسی ایک فعل کی طرف نگاہ لگی

ل زین العابدین علی بن الحسینؓ رضی اللہ عنہ: علی اصغر یہی ہیں کیونکہ علی اکبر امام حسین علیہ السلام کے ساتھ شہید ہوئے تھے۔ تمام حسینی ان ہی کی اولاد میں سے ہیں۔ ان کی وفات اٹھاون برس کی عمر میں ۹۹ھ یا ۱۰۰ھ میں ہوئی۔

رہے تو یہ اس بات کی دلیل ہے کہ یہ مقبول نہیں ہوا کیونکہ جو عمل مقبول ہوتا ہے وہ اٹھا لیا جاتا ہے اور انسان سے غائب ہو جاتا ہے اور جس سے تمہاری نگاہ منقطع ہو گئی، وہی قبولیت کی دلیل ہے۔

۴۱۔ وَمَنْ حَلَّ مِنْ صِدْقِ الْاِنَابَةِ مَنْزِلاً یَرَی الْعَیْبَ فِیْ اَفْعَالِهٖ وَهُوَ مُسْتَبْرِیٔ

ترجمہ: جو شخص اللہ کی طرف صدق دل سے رجوع کرنے میں کسی مرتبہ کو پہنچ جائے وہ اپنے افعال میں عیب ہی عیب دیکھتا ہے حالانکہ وہ بے عیب و بے گناہ ہوتا ہے یعنی جو شخص اللہ کی طرف کلی طور پر رجوع کر چکا ہو تو باوجود اس کے کہ اس نے افعال ظاہر و باطن میں شریعت اور حقیقت کے مطابق ادا کیے ہوں پھر بھی وہ ان میں عیب ہی دیکھتا ہے اور ڈرتا رہتا ہے کہ کہیں کوئی بات اس سے مخفی نہ رہ گئی ہو۔

ابو یعقوب اسحٰق بن محمد نہر جوری[1] فرماتے ہیں: جس کے تمام احوال کا والی خدا ہو اس کی علامت یہ ہوتی ہے کہ وہ یہ سمجھتا ہے کہ میرے اخلاص میں کوتاہی، میرے افکار میں غفلت، میرے صدق میں کمی، میرے مشاہدہ میں سستی اور میرے فقر میں بد احتیاطی پائی جاتی ہے۔ چنانچہ وہ اپنے تمام احوال کو ناپسندیدہ خیال کرتا ہے اور اپنے ارادہ اور سیرت میں اللہ کی طرف اس کا احتیاج اور بڑھ جاتی ہے۔

ابو عمر اسمٰعیل بن نجید[2] فرماتے ہیں: عبودیت میں تم میں سے کسی کا قدم صاف و پاک نہیں ہو سکتا جب تک کہ اس کے نزدیک اس کے تمام افعال ریاکاری اور تمام احوال محض دعویٰ ہی دعویٰ نہ ہوں کیونکہ نفس تو خیر کی مخالفت پر ہی مجبول معلوم ہوتا ہے اگر اللہ کا فضل و رحمت نہ ہو چنانچہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے وَلَوْلَا فَضْلُ اللّٰهِ عَلَیْكُمْ وَرَحْمَتُهٗ مَا زَكٰى مِنْكُمْ مِّنْ اَحَدٍ اَبَدًا (سورۂ نور) اگر تم پر اللہ کا فضل و رحمت نہ ہو تو تم میں کوئی بھی کبھی پاک و صاف نہیں ہو سکتا۔ نیز فرمایا وَمَآ اُبَرِّئُ نَفْسِیْ اِنَّ النَّفْسَ لَاَمَّارَةٌ بِالسُّوْٓءِ اِلَّا مَا رَحِمَ رَبِّیْ۔ (سورۂ یوسف پارہ تیرہ کی ابتدا) میں اپنے نفس کو بری قرار نہیں دیتا۔ نفس تو برائی کا حکم دیتا ہے مگر اللہ رحم کر دے تو۔

ایک بزرگ کا قول ہے: وہاں تو اللہ کے فضل کے سوا کچھ نہیں ہے اور ہم تو اسی کی پردہ پوشی

---

[1] ابو یعقوب اسحٰق بن محمد نہر جوری: یہ ابو عمرو مکی، ابو یعقوب سوسی اور جنید رحمہم اللہ کی صحبت میں رہے ان کی وفات مکہ میں ۳۳۰ھ۔ ۹۴۱ء میں ہوئی۔

[2] ابو عمرو اسمٰعیل بن نجید: ابو عمرو اسمٰعیل بن نجید بن احمد بن یوسف السلمی: یہ ابو عثمان مکی کے مرید تھے۔ حضرت جنید بغدادی سے بھی ان کی ملاقات ہوئی اور اپنے وقت کے بڑے مشائخ میں تھے۔ ان کی وفات ۳۶۶ھ ۹۵۰ء میں ہوئی ان کا قول جو یہاں دیا ہے شعرانی کی طبقات الکبریٰ ج ۱ صفحہ ۱۰۳ پر دیا ہے۔

پر زندہ ہیں اور اگر پردہ اٹھ جائے تو ہماری نہایت بری حالت ظاہر ہو جائے۔ یہی وجہ ہے کہ بڑے بڑے بزرگ اپنے صحیح اعمال سے بیزاری کا اظہار کرتے ہیں، دوسرے اعمال کا کہنا ہی کیا۔ یہاں تک کہ ابویزید فرماتے ہیں: اگر ایک بار بھی کلمۂ طیبہ پاک و صاف طور پر ادا ہو جائے تو میں پھر کسی بات کی بھی پروا نہ کروں۔ ابوسلیمانؒ[1] دارانی فرماتے ہیں: میں نے اپنے کسی عمل کو بنظرِ استحسان نہیں دیکھا کہ میں اسکو اعمال میں شمار کر سکوں۔

ناظم قصیدہ اس قصیدہ کے ناظم امام ابوالعباس احمد بن محمدؒ بن احمد بن محمدؒ بن احمد بن خلف القرشی البکری الصدیقی ہیں۔ شہر سلا میں ۵۸۱ھ ، ۱۱۸۵ء میں پیدا ہوئے۔ مراکش میں نشو و نما پایا اور مصر میں الفیوم میں رہائش اختیار کی اور وہیں ۶۴۱ھ ، ۱۲۴۳ء میں وفات پائی۔ وہاں لوگ انہیں تاج الدین کہتے تھے۔ یہ علم ادب اور بیان کے عالم تھے، شاعر تھے اور علم فقہ کے ماہر تھے تصوف میں انکا بڑا پایہ ہے چنانچہ ان کی تصنیفات اور نظمیں تصوف کے متعلق ہیں چنانچہ جو نظم یہاں دی گئی ہے اس کا نام انوارُ السرائر و سرائر الانوار ہے اور چار دانگ عالم میں مشہور ہے مصنف اثمد العینین اسے اہل طریقت کے نزدیک حجت قرار دیتے ہیں۔ مشائخ اپنے مریدوں کو اس قصیدہ کے پڑھنے اور اس پر عمل کرنے کی ترغیب دیتے رہے ہیں۔ بیان کیا جاتا ہے کہ شیخ ابوعبداللہ محمد الحضرمی رضی اللہ عنہ اپنے مریدوں اور شاگردوں کو بالعموم اس کی ترغیب دلاتے رہتے اور فرماتے کہ جو شخص اسے ہمیشہ پڑھتا رہے اسے یقیناً فیض حاصل ہوگا اور اس کے بعض مقامات کی خود تشریح فرماتے تھے۔

ناظم نے پہلے مراکش میں تحصیلِ علم کی۔ پھر طلب علم میں نکلا اور فاس میں اپنے زمانہ کے امام، اصول عابد و زاہد ابوعبداللہ محمدؒ بن علی بن عبدالکریم جو ابن الکتانی العبدلاوی کے نام سے مشہور ہیں۔ شیخ امام نحوی ابوذر بن الامام النحوی ابی عبداللہ محمدؒ بن مسعود بن ابی رکب الخشنی الاشبیلی، ابوالعباس ابن ابوالقاسم بن القفال سے علم حاصل کیا الخشنی مذکور مشہور صحابی ابوثعلبہؓ[2] الخشنی رضی اللہ عنہ کی اولاد میں سے تھے۔ پھر اندلس گئے اور وہاں کے اہل علم سے تحقیق کی۔ اس کے بعد بلاد مشرق کو گئے اور حج کیا اور بغداد پہنچکر

---

[1] ابوسلیمانی دارانی۔ ابوسلیمان عبدالرحمن بن عطیہ دارانی۔ داران دمشق کی بستیوں میں سے ایک بستی ہے ان کی وفات ۲۱۵ھ ، ۸۳۰ء میں ہوئی۔

[2] ابوثعلبہ خشنی: ابوثعلبہ جرثوم بن ناشر الخشنی صحابی ہیں۔ یہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں اس وقت آئے جب آنحضرت غزوہ حنین کی تیاری میں لگے ہوئے تھے اور یہ اسلام لے آئے۔ آپ نے انہیں مال غنیمت میں سے حصہ دیا ۷۵ھ ، ۶۹۴ء میں وفات پائی۔

حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی کے بیٹے امام ابو محمد[1] عبدالرزاق، محدث ابوالحسن محمد بن احمد بن عمران القطیعی اور شیخ ابو محمد فمیض بن فیروز بن عبداللہ الحنبلی سے اخذِ علم کیا۔ امام تقی الدین ابوالعز مظفر بن عبداللہ بن علی بن الحسین الازدی الشافعی سے جو المنشرح کے نام سے مشہور ہیں علم پڑھا۔ علمِ فقہ اسکندریہ میں امام شمس الدین ابوالحسنؒ علی بن اسمٰعیل بن حسن بن عطیہ الابیاری المالکی سے پڑھا۔ علمِ تصوف شہاب الدینؒ سہروردی مصنفِ عوارف المعارف سے حاصل کیا۔ ناظم کے قصیدہ کی اصل بھی یہی عوارف المعارف ہی ہے۔ علمِ طب ابوبیان سے پڑھا ابو عبداللہ محمد بن ابراہیم السلاوی نے ان سے روایتِ علوم کی ہے۔

---

[1] ابو محمد عبدالرزاق: ۵۲۸ھ ؍ ۱۱۳۳ء میں پیدا ہوئے۔ اپنے باپ سے تلقین لی۔ محدث، حافظ، عابد، زاہد اور ثقہ تھے انہوں نے ۶۰۳ھ ؍ ۱۲۰۶ء میں وفات پائی (تذکرۃ الحفاظ ج ۴ : ۱۷۲)

حضرت عبدالعزیز دباغ کے مشائخ

حضرت فرمایا کرتے تھے کہ مجھے دس ولیوں کی وراثت ملی ہے جن کے نام یہ ہیں۔ عمر بن محمد الھواری جو علی بن حرزہم کے مزار کے متولی وسجادہ نشین تھے۔ عبداللہ برناوی جو اقطاب میں تھے۔ شیخ سے ان کی ملاقات کا ذکر پہلے ہو چکا ہے۔ حضرت کو میں نے یہ فرماتے سنا کہ حضرت عبداللہ برناوی اسمار حسنیٰ میں سے ستر سے زائد اسماء کے انوار سے سیراب کیے گئے تھے۔ حضرت یحییٰ صاحب الجریدہ۔ یہ بھی اقطاب میں سے تھے اور ظاہر وباطن میں شریعتِ محمدیہ کے بڑی سختی سے پابند تھے۔ جو لوگ صالحین کے مزاروں پر آتے ہیں، ان کی حاجات ان کے تصرف میں ہیں۔ یہ ان حاجتوں پر غور کرتے ہیں اور جن حاجتوں کا پورا ہونا تقدیر میں لکھا ہوتا ہے انہیں پورا کرتے ہیں۔ یہ حضرت نے اس وقت فرمایا جب میں نے ان سے ذکر کیا کہ لوگ اولیاء اموات کے مزاروں پر آتے ہیں اور ان کو فائدہ ہوتا ہے۔ نیز فرمایا کہ امت محمدیہ کے دلوں کی اللہ کے ہاں عجیب شان ہے۔ اگر لوگوں کا اجتماع کسی ایسی جگہ پر ہو جائے جہاں کوئی شخص بھی مدفون نہ ہو اور وہ یہ خیال کرنے لگ جائیں کہ یہاں کوئی ولی مدفون ہے پھر اس جگہ پر آکر اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کریں تو اللہ تعالیٰ فوراً ان کی دعا قبول کر لیتا ہے اور آج کل حضرت یحییٰ اس تصرف پر مامور ہیں۔ یہ قبولیت دعاء زندہ اولیاء کے بارے میں بھی ہو جاتی ہے۔ چنانچہ کبھی ایسا ہوتا ہے کہ ایک شخص لوگوں میں ولی مشہور ہوتا ہے اور اس کے توسل سے لوگوں کی حاجتیں پوری ہوتی ہیں۔ حالانکہ درحقیقت اس شخص کا ولایت سے کوئی تعلق نہیں ہوتا ہے اور متوسلین کی دعائیں تو دراصل اہلِ تصرف کے ہاتھوں پوری ہوتی ہیں اور انہی نے اس شخص کو ولی کی صورت میں لا کھڑا کیا ہوتا ہے تاکہ اس جیسے اہلِ ظلمت لوگ اس کے پاس آیا کریں۔ مگر اہلِ تصرف بھی تقدیر کے مطابق تصرف کرتے ہیں۔ ان کے نزدیک یہ ولی بمنزلہ اس ڈھانچے کے ہوتا ہے جسے کسان اپنے کھیت میں پرندوں کو دور رکھنے کی غرض سے کھڑا کر دیتا ہے۔ پرندے اس صورت کو انسان سمجھ کر اس سے بھاگ جاتے ہیں حالانکہ انہیں بھگانا درحقیقت کھیت کے مالک کا کام ہوتا ہے، ڈھانچے کا نہیں۔ اسی طرح اہلِ تصرف اس آدمی کو کھڑا کر کے اس جیسے اہلِ ظلمت لوگوں کو اسکے پاس جمع کر دیتے ہیں اور تصرف کرنے والا ان سے چھپا ہوتا ہے اس لیے کہ وہ اہلِ حق ہوتا ہے اور لوگوں میں اہلِ حق کے سمجھنے کی طاقت نہیں۔

حضرت نے فرمایا: ایک شخص کسی خطرناک راستہ پر مغرب کے بعد گیا جہاں دو آدمی اس کے لیے گھات میں بیٹھے ہوئے تھے۔ پہلا گھاٹی کے شروع میں اور دوسرا درمیان میں۔ جب وہ گھاٹی میں داخل ہونے لگا اور وہ ایک ایسے شخص کا مرید تھا جس کے پاس درحقیقت کچھ بھی نہ تھا۔ کہنے لگا اے میرے فلاں پیر میں حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی جاہ کا واسطہ دے کر درخواست کرتا ہوں کہ مجھے اس گھاٹی سے نجات دلائیں اور میں نذرانہ کا وعدہ کرتا ہوں۔ ایک اہلِ تصرف نے یہ دعا سن لی اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اسمِ مبارک کی تعظیم کی خاطر اس کی دعا کو پورا کرنا پڑا۔ لہٰذا وہ اس مسافر کے ساتھ ہو لیے۔ اس کے دل کو تسلی دی یہاں تک کہ اس نے گھاٹی کو عبور کر لیا۔ مگر مسافر اس صاحبِ تصرف کو دیکھ نہ سکتا تھا اور اللہ تعالیٰ نے ان ڈاکوؤں کی نگاہوں پر پردہ ڈال دیا اور وہ اسے کچھ بھی نہ کہہ سکے۔ اس مرید کو یقین ہو گیا کہ اس کے پیر نے اس کی حاجت پوری کی ہے چنانچہ وہ پیر کے پاس پہنچا تو اسے اپنے وعدہ کے مطابق چار مثقال دیئے۔ واللہ اعلم۔

۴۔ منصورؒ بن احمد

چوتھے حضرت منصورؒ بن احمد ہیں۔ یہ جبل جبیب کے رہنے والے تھے۔ یہ بھی قطب تھے امورِ بحران کے تصرف میں تھے۔ حضرت نے ایک بار فرمایا۔ تو نے دیکھا ہوگا کہ جب گوشت کو گوشت سے کاٹا جائے تو بعض اوقات گوشت پھڑکا کرتا ہے۔ میں نے عرض کیا: جی ہاں دیکھا ہے، فرمایا: جب حضرت منصور کو فتح نصیب ہوئی تو ان کا بھی یہی حال تھا۔ اللہ کے جلال و ہیبت کی وجہ سے ان کے تمام اعضاء لرزتے تھے اور ایک مدت تک ان کا یہی حال رہا۔ نیز فرمایا کہ میں نے حضرت ابراہیم خلیل اللہ علیہ السلام کو دیکھا کہ حضرت منصور سے دعاءِ خیر کے طلبگار تھے۔ حضرت نے ان دونوں قطبوں کے متعلق بہت سے علمی اور عرفانی فوائد بیان فرمائے۔

۵۔ محمد سراجؒ

پانچویں حضرت محمد سراج ہیں جو قفص کے ضلع میں انجرا کے رہنے والے تھے۔ یہ بھی قطب تھے۔ ان سے حضرت کی ملاقات کا واقعہ ہم پہلے بیان کر چکے ہیں۔ حضرت نے انکے زیادہ واقعات بیان نہیں فرمائے۔ صرف تین بتائے ہیں جن کا ذکر ہو چکا ہے۔

۶۔ احمدؒ بن عبداللہ مصری

چھٹے حضرت احمد بن عبداللہ مصری ہیں۔ یہ غوث وقت تھے ابتداءِ کتاب میں ان کی اس حکایت کا ذکر ہو چکا ہے جس میں انھوں نے حضرت کو نصیحت فرمائی تھی۔

۷۔ علیؒ بن عیسیٰ مغربی

ساتویں علی بن عیسیٰ مغربی ہیں۔ یہ بھی قطب تھے۔ ان کا مسکن شام کے علاقہ میں دروز کے پہاڑ میں تھا۔ حضرت نے ان کی لمبی کہانی بیان فرمائی جس میں بیان کیا

ہے کہ یہ کس طرح مغرب سے شام کی طرف چلے گئے۔

۸۔ محمدؒ بن علی الکیمونی۔ ۹۔ محمد مغربیؒ ۱۰۔ عبداللہؒ جراز

آٹھویںؒ محمدؒ بن علی الکیمونی۔ نویں محمدؒ مغربی اور دسویںؒ عبداللہ جراز ہیں۔ حضرت جراز دیر مراکش کے رہنے والے تھے۔

۱۱۲۸ھ کے آخر میں حضرت نے ابراہیم لمکز کی وراثت حاصل کرلی تھی۔ حضرت نے مجھ سے ان کا نام ذکر کیا تھا اور فرمایا: سمجھ لو۔ پھر تھوڑے عرصہ کے بعد مجھ سے پوچھا تو میں ان کا نام بھول گیا تھا۔ آپ نے پھر ذکر کیا اور پھر نصیحت کی مگر میں پھر بھول گیا۔ تیسری مرتبہ پھر ذکر کیا اور مجھے ڈانٹا تو میں نے یہ نام لکھ لیا اور یاد بھی رکھا۔ حضرت نے فرمایا: یہ الجزائر کے رہنے والے ہیں۔ اس کے بعد ہم نے ڈر کے مارے پوچھا ہی نہیں کہ ان کے علاوہ آپ نے کن کی وراثت حال کی۔

پھر میں نے حضرت سے عرض کیا کہ ان بزرگوں سے جو وراثت آپ نے حاصل کی ہے وہ مختلف قسم کی ہے؟

فرمایا: نو بزرگوں سے معرفت حق سبحانہ کی وراثت پائی اور پہلے سے بھی یہی معرفت حاصل کی، اسس کے بعد آپ نے ایک گھوڑ سوار کی مثال دی کہ کسی نے چاہا کہ اس سوار کی تعریف کی جائے تو ایک شخص نے گھوڑے کی ٹانگوں، رنگ، رفتار گردن کی لمبائی غرضیکہ گھوڑے کے تمام اوصاف بیان کر دیے اور یہ بھی بتایا کہ سوار اسے کیسے چلا رہا ہے مگر اس نے سوار کا قطعاً ذکر نہ کیا ہو۔ یہ بھی فرض کر لیا جائے کہ جو تعریف اس نے گھوڑے کی کی ہے، وہ محض تعریف ہی نہیں بلکہ بیان کرنے والے کی تعریف ایسی ہو کہ گویا کہ ہم اپنی آنکھوں سے گھوڑے کو دیکھتے اور مشاہدہ کر رہے ہیں۔ اس کے بعد کوئی اور شخص آئے اور وہ سوار کی ایسی تعریف کرے کہ وہ ہماری آنکھوں کے سامنے آجائے اور ہر قسم کا حجاب اُٹھ جائے۔

ایک اور بار حضرت نے اس طرح مثال دی اور فرمایا: جو کچھ مجھے حضرت عمرؓ سے حاصل ہوا اس کی مثال ایسی ہے جیسے کوئی شخص کسی کو کہے میرے ساتھ اس راستہ پر چلو تو تمہیں اس راستہ پر پانی مل جائے گا۔ لیکن یہ نہ بتائے کہ پانی کہاں ہے چنانچہ وہ شخص بغیر جانے کہ پانی کہاں ہے روانہ ہو جائے یہاں تک کہ کوئی شخص آکر انہیں پانی کی جگہ متعین کرکے بتادے کہ یہاں پانی ہے۔

ایک اور مرتبہ فرمایا کہ میرا اور حضرت عمرؓ کا معاملہ ایسا ہے جیسے کوئی شخص دوسرے کے لیے شکار کرکے اس کے سامنے شکار کو چھوڑ کر چلا جائے مگر اس شخص کو معلوم نہ ہو کہ اس شکار کو کس طرح استعمال میں لاؤں۔ پھر ایک اور شخص آکر آگ اور ایندھن لاکر جلائے۔ چھری لائے اور کہے یہ چھری لے اور اس سے جس قدر

چاہو گوشت کاٹو اور کھاؤ۔

میں نے پوچھا: کیا حضرت عمر دوسری قسم کے مفتوح علیہ تھے۔

فرمایا: ہاں۔ لیکن ان کی فتح کمزور تھی۔

میں نے پوچھا: کیا وہ دیوان میں بھی حاضر ہوتے ہیں؟

فرمایا: ہاں، مگر ہر شخص جو دیوان میں آتا ہے، اسے دیوان کی باتوں کا علم نہیں ہوتا کہ کیا داخل ہوا اور کیا نکلا اور کیا کم ہوا اور کیا زیادہ ہوا۔

میں نے کہا دیوان بھی مجالس علم کی طرح ہوا کہ ہر شخص جو اس مجلس میں آئے اسے مجلس کی باتوں کا علم ہونا ضروری نہیں۔

اس کے بعد میں نے حضرت سے پوچھا کہ آپ کی ملاقات حضرت عمر سے کیسے ہوئی؟

فرمایا کہ میں نے بہت سے ایسے لوگوں کو اپنا شیخ بنایا جن کے پاس کوئی سر نہ تھا۔ پھر اللہ تعالےٰ نے میرے دل کو حضرت عمرؓ کی طرف مائل کر دیا۔ ہم دونوں حضرت علی بن حرزہم کے مزار پر اکٹھے ہوتے تھے عمرؓ وہاں کے سجادہ نشین تھے اور ہم وہاں کا تبرک لیا کرتے تھے، میں نے غور سے انہیں دیکھا تو مجھے آپ کی حالت بہت پسند آئی۔ میں آپ کے ورد کے متعلق پوچھتا مگر آپ مجھ سے تغافل سے پیش آتے۔ اس سے میرا شوق اور بڑھ جاتا۔ بالآخر ہم ایک رات علی بن حرزہم کے روضہ پر سوئے تھے کہ تلقین ورد اور خضر سے ان کی ملاقات کا واقعہ جس کا پہلے ذکر ہو چکا ہے، پیش آیا۔

ایک مرتبہ میں آپ کے پاس بیٹھا تھا کہ کسی نے آپ سے اس ورد کے بارے میں سوال کیا جو شیخ مرید کو عطا کرتا ہے،

آپ نے فرمایا: صادقین کے متعلق دریافت کر رہے ہو یا کاذبین کے متعلق؟

سائل نے جواب دیا: صادقین کے متعلق؛

فرمایا: اللہ تعالیٰ اس امت کے دین کی حفاظت اسی پاک شریعت کے ذریعہ سے فرماتے ہیں کہ اگر اس پر ظاہر میں عمل کیا جائے تو یہ باطن میں ایمان کی حفاظت کرتی ہے اور صحیح شیخ کا باطن حق سبحانہٗ کے مشاہدہ سے معمور ہوتا ہے چنانچہ شیخ کامل کی ملاقات سے پہلے جب مرید لاالٰہ الا اللہ کہتا ہے تو صرف زبان سے کہتا ہے۔ اس کا دل اس سے غافل ہوتا ہے مگر شیخ اپنے مشاہدہ کی بدولت دل سے لا الٰہ الا اللہ کہتا ہے لہٰذا جب وہ مرید کو اس کی تلقین کرتا ہے تو اس کی حالت مرید میں بھی سرایت کر جاتی ہے اس کے بعد وہ ترقی کرتا رہتا ہے اور اگر اللہ تعالیٰ نے اس کی قسمت میں لکھا ہو تو شیخ کے مرتبہ تک بھی پہنچ جاتا ہے۔

اس کے بعد حضرت نے مثال کے طور پر ایک مشہور حکایت بیان کی کہ ایک بادشاہ کا ایک بیٹا تھا جس سے اسے بہت محبت تھی۔ بیٹا سخت بیمار ہو گیا۔ بادشاہ نے علاج کے لیے طبیبوں کو بلایا اور کہا کہ اگر یہ بچہ صحت یاب نہ ہوا تو تمہیں سخت سزا دی جائے گی۔ سب طبیب اس بات پر متفق تھے کہ اگر بچہ گوشت کھانا چھوڑ دے تو تندرست ہو جائے گا۔ بیٹے کو جب یہ کہا گیا تو اس نے نہ مانا اور کہا خواہ ابھی جان نکل جائے مگر گوشت کھانا نہ چھوڑوں گا۔ طبیبوں کو بڑی پریشانی ہوئی۔ اور سخت مصیبت میں مبتلا تھے کیونکہ بیٹے نے ان کی بات ماننے سے انکار کر دیا تھا۔ یہ جس قدر اسے کہتے اسی قدر اسے نفرت ہوتی۔ پھر ان میں سے ایک نے اُٹھ کر غسل کیا بارگاہِ خداوندی میں گریہ وزاری کی اور نیت کر لی کہ جب تک مریض گوشت نہ کھائے گا وہ بھی نہ کھائے گا۔ اس کے بعد مریض کے پاس آ کر کہا، گوشت نہ کھانا چنانچہ اس نے اس کی بات مان لی اور اسی وقت اسے آرام آ گیا۔ اس پر جب باقی تمام طبیبوں کو حیرت ہوئی تو اس نے اس کی وجہ بتا دی۔

نیز فرمایا کہ جن اولیاء اللہ کو معرفتِ خداوندی حاصل ہوتی ہے وہ جب مجوبین کو دیکھتے ہیں کہ ان میں ایک شخص کا وجود پاک ہے اور اس میں سر کے متحمل ہونے کی صلاحیت اور طاقت ہے تو وہ اس شخص کو تلقین ذکر وغیرہ کرتے رہتے ہیں۔ یہی شخص جسے سر کے برداشت کرنے کی طاقت ہوتی ہے، ان کا مقصود ہوتا ہے۔ اگر شیخ کے پاس دوسرے لوگ آئیں جو سر کو برداشت کرنے کے قابل نہیں ہوتے تو شیخ انہیں بھی ذکر کی تلقین کر دیتا ہے اس لیے کہ وہ تلقین ذکر سے کسی کو محروم کرنا نہیں چاہتا خواہ وہ اہل ہو یا نہ ہو۔ اس کا ایک اور فائدہ ہوتا ہے جو قیامت کے دن ظاہر ہو گا کیونکہ قیامت کے دن آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے ہاتھوں میں لواء حمد ہو گا اور یہ نور ایمان ہو گا۔ دیگر تمام مخلوقات خواہ آپ کی امت میں سے ہوں یا دیگر انبیاء کی مع اپنے انبیاء کے سب آپ کے پیچھے ہوں گے۔ ہر امت اپنے نبی کے جھنڈے تلے ہو گی اور انہیں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے جھنڈے سے امداد حاصل ہو گی۔ تمام انبیا مع اپنی امتوں کے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ایک کندھے کی امت مطہرہ ہو گی جس میں اولیاء کی تعداد انبیاء جتنی ہو گی اور وہ انبیاء کی طرح ہاتھوں میں جھنڈے لیے ہوں گے۔ انبیاء کی طرح ان کے متبعین ہوں گے۔ انبیاء کی طرح انھیں بھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے مدد پہنچے گی اور ان کے متبعین کو ان سے۔ لہٰذا جس مرید میں سر کے متحمل ہونے کی طاقت نہ ہو گی اسے اس شیخ سے جس نے اسے تلقین ذکر کی ہو گی، نفع ہو گا۔

حضرت نے فرمایا کہ محض تلقین اور ذکر کے کلمات منہ سے نکالنے سے کوئی فائدہ نہیں جب تک کہ اسے یہ تعلیم نہ دی جائے کہ اللہ، ملائکہ الہامی کتابوں اور رسولوں پر ایمان لانے کی کیا حقیقت ہے اور اسے کچھ نہ کچھ باطنی فائدہ بھی ہو۔

ہیں نے کسی اور سے طبیبوں کے قصہ کی طرح اور قصے بھی سنے ہیں۔ مثلاً یہ کہ ایک غلام نے ایک بزرگ سے درخواست کی کہ وہ اس کے آقا کے پاس اسے رہا کر دینے کی سفارش کریں۔ ایک سال تک اس بزرگ نے اس کی بات نہ مانی۔ پھر وہ اسے لے کر اس کے آقا کے پاس گئے اور اسے اس کو آزاد کرنے کو کہا۔ اس کے آقا نے بات مان لی اور اسے آزاد کر دیا۔ غلام اس سے بہت خوش ہوا اور بزرگ سے کہا اگر آپ پہلے دن ہی سفارش کر دیتے تو مجھے اتنی مدت غلامی میں نہ رہنا پڑتا اور اس مدت کا اجر بھی آپ کی نیکیوں میں لکھا جاتا۔ آپ نے اس قدر تاخیر کیوں کی۔ بزرگ نے جواب دیا میں کسی کو اس وقت تک کسی کام کے کرنے کا حکم نہیں کر دیتا جب تک کہ میں خود نہ کر لوں اور جب تو نے مجھے کہا تھا کہ میں تمہارے آقا کو تمہیں آزاد کرنے کو کہوں اس وقت میرے پاس کوئی غلام نہ تھا جسے میں آزاد کرتا اس لیے اس سال کے عرصہ میں میں روپیہ کماتا رہا یہاں تک کہ ایک غلام کی قیمت میرے پاس جمع ہو گئی۔ پھر جب میں نے اسے خرید کر آزاد کر دیا تب جاکر تمہارے آقا سے بات کی اور اس نے میری بات مان لی اور اگر میں غلام آزاد کرنے سے پہلے اس سے بات کرتا تو میرا خیال نہیں کہ میری بات مان لیتا۔ واللہ اعلم۔

اسمِ اعظم حضرت نے فرمایا کہ اسم اعظم ننانوے ناموں میں سے نہیں ہے بلکہ وہ سواں نام ہے مگر اسمِ اعظم کے بیشتر معانی ننانوے اسماءِ حسنیٰ میں پائے جاتے ہیں اور وہ ذات کا ذکر ہے زبان کا ذکر نہیں ہے لہٰذا جب یہ ذکر ذات سے نکلتا ہے تو اس سے اس طرح آواز نکلتی ہے جس طرح پیتل کی آواز ہوتی ہے۔ یہ ذکر ذات کے لیے بڑا ثقیل معلوم ہوتا ہے چنانچہ ذات دن بھر میں ایک یا دو بار سے زیادہ اس کا ذکر نہیں کر سکتی۔

میں نے عرض کیا: یہ کیوں؟

فرمایا: اس لیے کہ یہ ذکر بغیر مشاہدۂ تامہ کے نہیں ہو سکتا اور یہ اس ذات کے لیے ثقیل ہوتا ہے چنانچہ جب ذات اس کا ذکر کرتی ہے تو اس کے لیے ہیبت اور خوف کے مارے تمام عالم مفقود ہو جاتا ہے۔

نیز فرمایا: کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام میں اس اسمِ اعظم کا ورد کرنے کی طاقت تھی۔ چنانچہ وہ دن میں چودہ مرتبہ اس کا ذکر کیا کرتے تھے۔ واللہ اعلم۔

اسماءِ حسنیٰ حضرت نے فرمایا کہ انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام کو مشاہدات کے ذریعے اسماءِ حسنیٰ کے معانی حاصل ہوتے تھے۔ چنانچہ جس قسم کے معانی کا وہ مشاہدہ فرماتے اس کے مطابق ایک نام وضع کر لیتے لہٰذا اللہ تعالیٰ مشاہدات کے مطابق ان پر یہ معانی ظاہر کرتے تھے اور اسی کے مطابق ان سے اسماء کا ظہور ہوتا چنانچہ تمام اسماءِ حسنیٰ انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام کے وضع کیے ہوئے ہیں۔ حضرت

ادریس علیہ السلام پہلے نبی ہیں جنہوں نے علیم، قوی، عظیم اور منان کے اسماء وضع کیے۔ اسی طرح ہر نبی نے کوئی نہ کوئی نام وضع کیا ہے مگر انھوں نے یہ نام اپنی اپنی زبان میں وضع کئے تھے۔ قرآن کی خصوصیت ہے کہ اس نے ان تمام اسماء کو جمع کر دیا ہے اور انہیں انبیاء متقدمین کی زبان میں نہیں عربی زبان میں دیا ہے۔

نیز فرمایا کہ سب سے پہلے اسم جلالت (اللہ) حضرت آدم علیہ السلام نے خود وضع فرمایا: اس طرح کہ جب اللہ تعالیٰ نے ان میں روح پھونکی تو آپ فوراً اٹھ کر ایک ٹانگ پر کھڑے ہوتے اور دوسری ٹانگ کے گھٹنے کے بل بیٹھ گئے اسی حالت میں انہیں حق سبحانہٗ کا مشاہدہ عظیم ہوا چنانچہ ان کی زبان سے ایسا لفظ نکلا جو ان اسرار کا مفہوم ادا کر رہا تھا جن کا انھوں نے ذاتِ خداوندی سے مشاہدہ کیا چنانچہ کہا "اللہ" خدا کے علم ازلی میں یہ بات تھی کہ اس کے یہ نام رکھے جائیں گے اسی لیے اللہ تعالیٰ نے ان ناموں کو انبیاء واصفیاء کی زبان پر جاری کیا۔

حضرت نے فرمایا: اگر سید الوجود صلی اللہ علیہ وسلم ان معانی کے لیے اسماء وضع فرماتے جو آپ کو اس مشاہدہ میں حاصل ہوتے جس کے متحمل ہونے کی کسی میں طاقت نہیں تو تمام سننے والے فنا ہو جاتے مگر اللہ سبحانہ اپنے بندوں پر بہت لطف وکرم فرماتے ہیں۔ واللہ اعلم۔

ایک اعتراض اور اس کا جواب مؤلف کہتے ہیں کوئی یہ خیال نہ کر بیٹھے کہ مذکورہ بالا بیان اہلسنت کے عقیدے کے خلاف ہے اس لیے کہ ان کے ہاں تو اسماء حسنیٰ قدیم ہیں (اور مذکورہ بالا بیان سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ اسماء حادث ہیں) اس لیے کہ ان کے قدیم ہونے سے مراد ان کے معانی وصفات کا قدیم ہونا ہے نہ کہ الفاظ کا۔ کیونکہ ہر لفظ عَرَض ہے اور ہر عرض حادث ہوتی ہے خاص طور جب وہ الفاظ اور اصوات کی طرح سیال ہو۔ واللہ اعلم۔

فرمایا: اسم جلالت (اللہ) میں تین اسرار ہیں۔ اوّل یہ کہ اللہ تعالیٰ کی مخلوقات کی کوئی حد نہیں اور مخلوق تین قسموں پر منقسم ہے، اِنس، جنّ، حیوان وغیرہ جن کا علم اکثر لوگوں کو نہیں ہے۔ اس کثرت کے باوجود اللہ تعالیٰ اپنے ملک میں اکیلے ہیں نہ آپ کے ساتھ کوئی مدبر ہے نہ کوئی وزیر۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ تنہا ان تمام میں تصرف کرتے ہیں کوئی ایک چیز بھی اس تصرف سے باہر نہیں رہ سکتی۔ اللہ تعالیٰ سب پر غالب اور سب کو گھیرے ہوئے ہیں۔ جیسا کہ فرمایا وَاللّٰهُ مِنْ وَّرَائِهِمْ مُّحِيْطٌ۔

دوسرے یہ کہ اللہ تعالیٰ مخلوقات میں جیسے چاہتے ہیں تصرف فرماتے ہیں جسے چاہیں غنی کر دیں جسے چاہیں فقیر کر دیں۔ جسے چاہیں عزت دیں جسے چاہیں ذلت دیں۔ ایک کو سفید اور دوسرے کو کالا بنا دیتے

ہیں۔ایک کی دعا قبول فرماتے ہیں اور دوسرے کی ردّ فرماتے ہیں اور دونوں میں زمان اور مکان کا اختلاف پیدا کر دیتے ہیں۔ ہر روز اس کی نرالی شان ہوتی ہے اور ایک حالت دوسری سے مانع نہیں ہوسکتی، اختیار اسی ذات کا ہے نہ مخلوقات کا جیسا چاہتا ہے کرتا ہے۔ وہ پاک ہے اس کے سوا کوئی معبود نہیں۔

تیسرے یہ کہ اللہ تعالیٰ مقدّس و منزّہ ہیں۔ نہ اس کی کیفیت بیان کی جاسکتی ہے نہ کسی مخلوق سے تشبیہ دی جاسکتی ہے اس کے باوجود دبدبہ کا غلبہ اسی کا ہے حتیٰ کہ اگر مخلوقات اور اس کے درمیان حجاب حائل نہ ہوتا، تو اللہ تعالیٰ کی تجلّی سے سب ریزہ ریزہ ہو جاتے بلکہ ان کا کوئی نشان تک باقی نہ رہتا حتیٰ کہ کہا جاتا ہے کہ اس دنیا میں کبھی کسی مخلوق کا وجود ہی نہ تھا، لیکن اللہ تعالیٰ نے سابق قضا و قدر کی بنا پر محض اپنی رحمت و حکمت سے طے فرمایا تھا کہ دو مقام بنائے جائیں اور ہر ایک کے اہل کو اس کے مقام پر پہنچایا جائے۔ اس لیے جب کسی مخلوق کے پیدا کرنے کا ارادہ کیا تو اس کے پیدا کرنے سے پہلے پردہ و حجاب پیدا کر دیا۔

فرمایا: ارباب بصیرت بغیر اس کے کہ انہیں کسی مخلوق کے مشاہدہ کی ضرورت ہو محض اسم جلالت کے بولنے سے ہی ان اسرار کو جان لیتے ہیں۔

میں نے عرض کیا: یہ کیسے؟

اس پر حضرت نے ایک مثال بیان فرمائی جس کے مفہوم سے ہم سمجھ گئے کہ یہ لفظ جلالت (اللہ) کے تمام اسماء کو جامع ہونے کی وجہ سے ہے۔

نیز فرمایا کہ اللہ تعالیٰ مقدّس و منزّہ ہے کسی مخلوق سے اس کی مشابہت نہیں ہوسکتی۔ بہر صورت جس کا ہم تصور کریں۔ اللہ تعالیٰ کچھ اور ہی ہے اس لیے کہ ہر صورت جو ہمارے فکر میں آئے گی وہ اللہ سبحانہٗ کی مخلوقات میں موجود ہوگی کیونکہ فکر میں صرف مخلوق اشیاء ہی آسکتی ہیں لہٰذا ہر چیز جو فکر میں آئے گی اس کی مثال ہوگی اور اللہ کی کوئی مثال نہیں۔

میں نے عرض کیا کہ کیا انسانی فکر میں ایک ایسے انسان کا تصور آسکتا ہے جو سر کے بل چلتا ہے؟

حضرت نے فرمایا: قسم ہے خدا کی میں نے ایسے انسان کو اسی طرح چلتے دیکھا ہے جس طرح فکر نے اسکا تصور کیا۔ وہ ہاتھ سے اپنی شرمگاہ کو چھپا رہا تھا۔ یہ ہاتھ ہی پردہ کا کام دے رہا تھا۔ اسے صرف اسی وقت ہٹاتا تھا جب اسے قضاء حاجت یا جماع کی خواہش ہوتی۔

حضرت نے بتلایا کہ ایک مرتبہ وہ اپنے شیخ محمد بن عبدالکریم بصرادی کے ساتھ بیٹھے ہوئے تھے تو

انھوں نے فرمایا کہ آؤ ہم اپنے فکر و تخیل میں عجیب ترین صورت کا تصور کریں پھر دیکھیں کہ آیا یہ صورت اللہ کی مخلوقات میں موجود بھی ہے یا نہیں۔ میں نے کہا بہت اچھا جو صورت آپ کا دل چاہے وہ گھڑ لیجیے۔ فرمایا: اچھا ہم ایک چوپایہ کی صورت لیتے ہیں جس کی شکل اونٹ کی سی ہو، پیٹھ عکرشہ کی طرح تمام منہ ہی منہ ہوں۔ پیٹھ پر پہاڑ ہو جس کا رنگ اس کے اپنے رنگ سے مختلف ہو اور اوپر کو بلند ہو پھر اس کی چوٹی پر کنگرے بنے ہوئے ہوں جن میں سے ایک میں سے وہ پیشاب پاخانہ کرتا ہو، ایک سے پانی پیتا ہو ان کنگروں کے درمیان انسان کی سی شکل ہو جس کا سر چہرہ اور اعضا تمام انسان کے سے ہوں۔ ابھی آپ اپنے ذہن میں اس کا تصور ہی کر رہے تھے کہ ہم نے اس قسم کی کثیر التعداد مخلوق دیکھی۔ پھر دیکھا کہ اس کا نر مادہ سے جفتی کر رہا ہے اور وہ حاملہ ہو جاتی ہے، لیکن دوسرے سال مادہ نر بن جاتی ہے اور نر جو مادہ بن جاتا ہے اس سے جفتی کرتا ہے فرمایا: یہ عجیب ترین بات ہے جو ہم نے سنی۔ واللہ اعلم۔

حضرت ایک مرتبہ مشاہدہ کا ذکر فرما رہے تھے اور کہتے تھے کہ ایک بہت بڑی چیز ہے جسے اکثر مخلوق حاصل نہیں کر سکتی۔ آپ نے اس کا سبب بھی بیان فرماتے ہوئے اپنا قصہ بیان کیا کہ ۱۱۲۷ھ کے آخر میں میری ملاقات ایک ولی سے ہوئی جن سے میں نے درخواست کی کہ میرے لیے دعا کریں کہ خدا مجھے مشاہدہ عطا فرمائے۔ اس ولی نے فرمایا کہ اس کا خیال چھوڑ دو اور اللہ تعالیٰ سے اس کی درخواست نہ کرو حتیٰ کہ وہ خود تمہیں بغیر درخواست کے مشاہدہ عطا کرے کیونکہ جب تمہاری درخواست کے بغیر تمہیں مشاہدہ عطا کیا جائے گا تو تمہاری اللہ تعالیٰ مدد فرما کر اس کے تم پر نازل ہونے سے پہلے اس کے برداشت کی قوت بھی عطا فرمائیں گے، لیکن اگر تو اس کی درخواست کرتا رہے اور کثرت سے دعا کرتا رہے گا تو اللہ تعالیٰ تمہیں مایوس تو کرنے کے نہیں، مگر ڈر اس بات کا ہے کہ اللہ تمہیں تمہاری ذات پر نہ چھوڑ دیں اور تو اسے برداشت نہ کر سکے میں نے پھر کہا میرے لیے درخواست کریں کیونکہ میں اس کی طاقت رکھتا ہوں اس پر انھوں نے فرمایا: انسانی دنیا کی طرف دیکھو اور ان سب کو اپنی آنکھوں کے سامنے جمع کر دیہاں تک کہ وہ انگوٹھی کے حلقہ کی مانند ہو جائے۔ میں نے کہا میں نے کر لیا ہے۔ پھر فرمایا: جنوں کی دنیا کی طرف دیکھو اور ان سے بھی یہی کرو۔ میں نے کہا کہ میں نے کر لیا ہے اس طرح ایک ایک کر کے آپ نے کئی عالم گنا دیے چنانچہ جنتوں و مافیہا کی دنیا اور دوزخوں و مافیہا کی دنیا کا بھی ذکر کیا اور انہیں اپنی آنکھوں کے سامنے جمع کرنے کو کہتے گئے اور میں ایسا کرتا گیا اور کہتا گیا کہ میں نے کر لیا ہے پھر فرمایا ان تمام کے مجموعہ کی طرف ایک ہی نگاہ سے دیکھو اور کوشش کر کے دیکھو کہ آیا تم ان تمام کو اس ایک نظر میں آنکھوں کے سامنے حاضر کر سکتے ہو۔ میں نے کوشش کی مگر نہ کر سکا۔ اس پر فرمایا کہ تم اس مخلوقات کا مشاہدہ تو کر نہیں سکتے اور ان کو اپنی نظر میں حاضر

ف میں اس لفظ کے معنی نہ سمجھ سکا۔

کرنے سے عاجز ہو گئے پھر خالق سبحانہٗ کا مشاہدہ کیسے کر سکتے ہو۔ یہ سنکر میں حق بات کو سمجھ گیا اور دل کے آنسوؤں سے رویا کہ میں نے ایسی چیز کی خواہش کی جس کی مجھ میں طاقت نہیں۔

حضرت نے فرمایا: کہ تمام مخلوقات کو ایک نگاہ میں اپنی آنکھوں کے سامنے لانے کی کسی بشر میں طاقت نہیں۔

نیز فرمایا: یہی حال ان اولیاء اللہ کا ہے جو بیداری میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو دیکھتے ہیں کیونکہ جب تک وہ ان تمام عوالم کو نہ دیکھ لیں، آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو نہیں دیکھ سکتے۔ مگر پھر بھی ایک نظر میں نہیں دیکھ سکتے۔

روح کا احاطہ نہیں ہو سکتا

جب حضرت سے میری پہلی ملاقات ہوئی اور میں نے آپ سے روح کے متعلق گفتگو کی تو فرمایا کہ کوئی عاقل اس کا احاطہ نہیں کر سکتا اور اس کے جاننے سے پہلے جب تک اس پر تمام عوالم کا مکاشفہ نہ ہو جاتے وہ اس حقیقت کو نہیں سمجھ سکتا، لیکن اگر کچھ عوالم کا تو اس پر مکاشفہ ہو جاتے اور کچھ کا ابھی باقی رہتا ہو اور روح کا مکاشفہ ہو جاتے تو وہ شخص فتنہ میں مبتلا ہو جائے گا۔

روح کا سمجھنا مشکل امر ہے

نیز فرمایا کہ خواہ کس قدر بڑا عالم کیوں نہ ہو اور وہ مجھ سے روح کے متعلق گفتگو کرنے لگے اور میں جواب دیتا جاؤں تو چار سال تک بھی گزر جائیں پھر بھی اس کے اعتراضات ختم نہ ہوں گے اس لیے کہ اس کا سمجھنا بہت مشکل اور اس کا معاملہ بہت ہی پوشیدہ ہے۔ واللہ اعلم۔

انسان حق سبحانہٗ کی معرفت کی طاقت نہیں رکھتا!

اللہ تعالیٰ کی معرفت حاصل کرنا باہمہ کبریائی و عظمت کے کسی بندے کی طاقت میں نہیں ہے۔ اس کی مثال آپ نے یوں دی کہ فرض کرو کمہار کے کسی برتن کو اللہ تعالیٰ عقل عطا فرما دے اور کوئی شخص اس برتن سے اس کے بنانے والے کی کیفیت، لمبائی، رنگ، اس کی عقل، اس کی ادراک، اس کے کان اس کی آنکھوں، دنیا میں اس کی مدت حیات اور ان تمام برتنوں کے متعلق سوال کرے جو اس کے بنانے والے نے بنائے ہوں تو وہ برتن یہ تمام باتیں معلوم نہیں کر سکتا اور نہ ہی اس کی ذات ان معارف کے متحمل ہونے کی طاقت رکھتی ہے اور درحقیقت کوئی مصنوع چیز اپنے صانع کی حقیقت کو معلوم نہیں کر سکتی۔

پھر فرمایا کہ جب ایک حادث دوسرے حادث کی معرفت حاصل کرنے میں اس قدر عاجز ہو تو پھر

صانع قدیم سبحانہٗ وتعالیٰ کی معرفت کیسے حاصل ہو سکتی ہے[1] لہٰذا مخلوق خواہ وہ کوئی بھی ہو نہ اس دنیا میں اور نہ آخرت میں اس کی معرفت ہرگز حاصل نہیں کر سکتی۔

ذکر عبادت سے زیادہ بھاری ہے فرمایا کہ ذکر ذاتِ انسانی پر عبادت سے زیادہ بوجھل ہوتا ہے اور یہاں پر ذاتِ جبیثہ ہے جو ظلمت سے سیراب ہوتی ہے اور ذکر اسے نور سے سیراب کرنا چاہتا ہے مگر یہ ذات اپنی ظلمت کی وجہ سے اسے قبول نہیں کر سکتی۔ ذکر کرنے والا اس کی حقیقت بدلنا چاہتا ہے اس کی مثال ایسی ہے جیسے کوئی عورت میں مرد کی یا مرد میں عورت کی طبیعت ڈالنا چاہے۔ یا جیسے کوئی یہ چاہے کہ گندم کا ذائقہ اور مٹھاس دوسری قسم کے غلہ میں ڈال دے۔ بس سمجھ لو کہ اسے اس میں کس قدر حیرت و ناکامی ہوگی۔ برخلاف عبادت کے کہ یہ ظاہری جسم کا کام ہے اس کی مثال ایسی ہے جیسے کوئی کلہاڑی سے کام کرتا ہے تو اس کام کا بوجھ صرف اسی لیے ہوگا کہ اس میں بدنی تھکان پایا جاتا ہے۔ واللہ اعلم۔

قَرِیبٌ حضرت نے فرمایا کہ اسماءِ حسنیٰ میں ایک ایسا اسم ہے کہ اگر کوئی بندہ اس کے نور سے سیراب ہو جائے تو ہر وقت روتا رہے۔ میں نے دریافت کیا وہ کونسا اسم ہے فرمایا: قَرِیبٌ میں نے کہا شاید اس کا رونا اس لیے ہے کہ اس کا اپنے رب کی طرف اپنی غفلت سے رجوع کرنا ایسا ہے جیسے کوئی سفر سے اپنی والدہ کے پاس واپس آئے فرمایا: اپنی والدہ کے پاس پہنچ کر اس کا رونا محض خوشی کی وجہ سے ہوتا ہے مگر اپنے رب کے سرور کے ساتھ وہ شرم وحیا بھی پایا جاتا ہے جو اسے غفلت اور رب کے احکام کی مخالفت کے زمانہ کی یاد دلاتے ہیں۔

اَلْمُتَعَالِیْ فرمایا: اسماءِ حسنیٰ میں سے ایک اسم ایسا ہے کہ اگر کوئی بندہ اس کے نور سے سیراب ہو جائے تو ہمیشہ ہنستا رہے اس کی یوں مثال سمجھو کہ ایک شخص کے پاس ساٹھ آدمی آ کر اس کے کپڑے اتار دیں اور اسے اس کے جسم کے ایسے حصوں پر گدگدی کرنا شروع کر دیں جہاں گدگدی کرنے سے ہنسی آتی ہے اور ان سے خلاصی نہ پا سکتا ہو۔ میں نے دریافت کیا کہ وہ کونسا اسم ہے فرمایا: اَلْمُتَعَالِیْ۔ میرا ارادہ تو یہ تھا کہ حضرت سے تمام اسماءِ حسنیٰ کے انوار کے متعلق سوال کروں مگر مجھ پر ہیبت طاری ہو گئی جس کی وجہ سے میں رک گیا۔

---

[1] یہی وجہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں: سُبْحَانَكَ مَا عَبَدْنَاكَ حَقَّ عِبَادَتِكَ۔ سُبْحَانَكَ مَا عَرَفْنَاكَ حَقَّ مَعْرِفَتِكَ لَا نُحْصِی ثَنَاءً عَلَيْكَ اَنْتَ كَمَا اَثْنَيْتَ عَلٰى نَفْسِكَ ہم تیری ثنا نہیں کر سکتے تو تو ایسا ہی ہے جیسے تو نے خود اپنی ثنا کی ہے۔ [2] چنانچہ قرآن مجید میں ہے: وَلَذِكْرُ اللّٰهِ اَكْبَرُ

فرمایا: ولی کے لیے اس زمانے سے بڑھکر کوئی سخت زمانہ نہیں ہوتا جب کہ وہ اسمارِ حسنیٰ کے انوار سے سیراب ہو رہا ہو اور اس کی وجہ یہ ہے کہ اسمار کے مقتضیات مختلف ہیں کہ ایک کا اقتضا کچھ ہے اور دوسرے نام کا کچھ اور۔

فرمایا: بعض اولیار صرف ایک ہی نام سے سیراب ہوتے اور اسی کا اثر ان پر ہمیشہ رہتا ہے مثلاً یہ کہ وہ ہمیشہ ہنستا رہتا ہے یا ہمیشہ روتا رہتا ہے۔ بعض دو سے اور بعض زیادہ سے سیراب ہوتے ہیں۔

میں نے عرض کیا کہ حضرت آپ کتنے اسمار کے انوار سے سیراب ہیں؟

فرمایا: ستانوے اسمار کے انوار سے۔

میں نے عرض کیا کہ اسمار حسنیٰ تو ننانوے ہیں۔

فرمایا: سواں نام ان میں شمار نہیں کیا گیا اسی لیے کہ لوگوں میں اس کے برداشت کرنے کی طاقت نہیں ہے اور وہ سواں نام اسم اعظم ہے جس سے دعائیں قبول ہوتی ہیں۔

نیز فرمایا کہ اتنے اسمار کے انوار سے صرف ایک ولی سیراب ہوتا ہے اور آپ کی اس سے مراد غوث سے ہے۔ آپ کا یہ فرمان کہ آپ ستانوے اسمار کے انوار سے سیراب ہیں۔ یہ ابتدا میں تھا، لیکن آخرکار جیسا کہ آپ نے خود بتا دیا تھا آپ تمام اسمار حسنیٰ یعنی سَو کے سَو اسمار کے انوار سے سیراب ہو گئے تھے۔

پھر یہ سیرابی دو طرح سے ہوتی ہے۔ ایک سیرابی مرتبۂ روح میں ہوتی ہے چنانچہ کسی ولی کو ایک نام کی نصیب ہوتی ہے کسی کو دو کی اور کسی کو اس سے زیادہ کی اور پورے سَو اسمار کی سیرابی بجز غوث کے کسی کو نصیب نہیں ہوتی اور دوسری سیرابی ہے مقام سِرّ و باطن کی۔ چنانچہ اس سیرابی میں سوائے سید الوجود صلی اللہ علیہ وسلم کے کوئی بھی مکمل سو کی سیرابی حاصل نہیں کر سکتا اس کلام کے تحت بہت سے اسرار و انوار ہیں جنہیں اسرار والے لوگ ہی سمجھ سکتے ہیں خدا ہمیں ان کی خوشنودی عطا فرمائے۔ واللہ اعلم۔

اسمارِ حسنیٰ کے وِرد کے لیے کسی عارف سے تلقین لینا ضروری ہے

فرمایا جو لوگ اسمار حسنیٰ کا ورد کرتے ہیں، اگر انھوں نے کسی عارف سے لیا ہے تو کسی قسم کی معرفت نہ ہو گی اور اگر غیر عارف سے لیا ہو گا تو نقصان اٹھائیں گے۔

میں نے عرض کیا: اس کی کیا وجہ ہے؟

فرمایا: اسمار حسنیٰ میں حق سبحانہٗ کے انوار پائے جاتے ہیں لہٰذا جب تو کسی نام کا ذکر کرنے لگے اور اس کا نور اس کے ساتھ ہو تو تجھے کسی قسم کی مضرت نہ پہنچے گی اور اس کے ساتھ اس کا وہ نور نہ ہو گا جو بندے کو شیطان

سے بچائے رکھتا ہے تو شیطان حاضر ہو کر بندے کو ضرر پہنچانے کا سبب بنتا ہے، لیکن جب شیخ عارف ہوگا جو کہ ہر دم بارگاہِ رب العزت میں حاضر ہوتا ہے اور وہ اپنے مرید کو اسماء حسنیٰ میں سے کوئی نام دینا چاہے تو اسے وہ نام مع اس کے نور کے عطا کرے گا جو اسے شیطان سے بچائے رکھے گا لہٰذا جب مرید اس کا ورد کریگا تو اسے کوئی نقصان نہ پہنچے گا۔ پھر اس کا نفع اس نیت کے مطابق ہوگا جس نیت سے شیخ نے اسے دیا ہے اگر دنیا کے حصول کے لیے دیا ہوگا تو دنیا مل جائے گی اور اگر آخرت کے لیے دیا ہے تو آخرت مل جائے گی یا معرفت خداوندی کے لیے دیا ہوگا تو معرفتِ خداوندی مل جائے گی۔ لیکن اسم کی تلقین کرنے والا شیخ ہی اگر محجوب و غیر عارف ہے تو وہ مرید کو محض نام دیگا جس کے ساتھ حفاظت کرنے والا نور نہ ہوگا جس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ مرید ہلاک ہو جائے گا۔ نسأل اللّٰہ السلامۃ۔

میں نے دریافت کیا کہ قرآنِ عزیز میں اسماء حسنیٰ موجود ہیں اور حافظِ قرآن اسے پڑھتے ہیں اور اس کے ساتھ اسماء حسنیٰ کی بھی تلاوت کرتے رہتے ہیں، لیکن انہیں کوئی نقصان نہیں پہنچتا حالانکہ کسی عارف نے انہیں اس کی تلقین نہیں کی ہوتی۔ اس کا سبب کیا ہے؟

فرمایا: سیدنا و نبینا و مولانا محمد صلی اللّٰہ علیہ وسلم کو اللّٰہ تعالیٰ نے ان تمام لوگوں کے لیے جو آپ کے زمانہ سے لیکر قیامت تک ہوں گے قرآن دے کر بھیجا لہٰذا جو شخص بھی تلاوتِ قرآن مجید فرماتا ہے اس کا شیخ خود آنحضرت صلی اللّٰہ علیہ وسلم ہوتے ہیں۔ یہی سبب حاملین قرآن کے بچاؤ کا ہوتا ہے مزید برآں آنحضرت صلی اللّٰہ علیہ وسلم نے اپنی امت کو قرآن شریف کا اسی قدر حصہ عطا فرمایا ہے جس کی ان میں طاقت ہے یا جس قدر کہ وہ قرآن مجید کے ظاہری احکام کو سمجھ سکتے ہیں آپ نے قرآنِ مجید کو مع تمام اسرار و انوار کے نہیں دیا۔ اگر آپ امت کو مع انوار کے قرآن عطا فرماتے تو امت شریفہ میں سے کوئی شخص بھی نافرمان نہ ہوتا اور سب کے سب قطب ہوتے اور کسی کو اسماء حسنیٰ سے ضرر نہ پہنچتا۔

اَلَا یعلم من خلق وھو اللطیفُ الخبیر کا ورد، فقر و مصیبت کے لیے مفید ہے

فرمایا: سورۂ ملک میں اَلَا یَعْلَمُ مَنْ خَلَقَ وَھُوَ اللَّطِیْفُ الْخَبِیْرُ آیا ہے اور اس کا ورد ان لوگوں کے لیے مفید ہے جو محتاج ہوں یا مصیبت میں مبتلا ہوں۔ جو شخص اس کا کثرت سے ورد کرے تو اللّٰہ تعالیٰ اس کی مشکل حل کر دے گا۔

مؤلف کہتا ہے کہ ایک شخص کو بیش کے دانے نکل آئے اور یہ ایک لاعلاج مرض ہوتا ہے وہ حضرت کے پاس آیا اور آپ سے اس کی شکایت کی۔ وہ اس مرض سے ڈر رہا تھا۔ حضرت نے اسے یہ آیت پڑھنے کو کہا تو یہ بیماری اس طرح جاتی رہی کہ پتہ بھی نہ چلا۔

حضرت ایک مرتبہ بیان فرما رہے تھے کہ حضرۃ[1] کا رواج نہ قرن اول میں یعنی عہد صحابہ میں تھا، نہ قرن ثانی یعنی عہدِ تابعین میں اور نہ ہی تیسرے قرن یعنی عہد تبع تابعین میں۔ یہی تینوں عہد بہترین کہلاتے ہیں جس کی شہادت حدیث سے ملتی ہے آپ کے اس بیان کا سبب یہ تھا کہ ایک شخص نے آپ سے حضرۃ کے متعلق سوال کیا۔ حضرت فرماتے ہیں کہ میں نے صاف اور حق بات کہنا پسند نہ کیا اس خیال سے کہ میں ایک عامی ہوں اور وہ میری بات قبول نہ کرے گا اس لیے میں نے اسے کہا کہ اس مسئلہ کے متعلق تو علماء سے پوچھنا چاہیئے کہ آیا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسا کیا تھا یا نہیں۔ اگر وہ جواب دیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسا نہیں کیا تو یہ پوچھیں کیا حضرت ابوبکرؓ صدیق نے ایسا کیا تھا یا نہیں۔ اگر کہیں کہ ابوبکرؓ نے ایسا نہیں کیا تو پوچھیں کیا عمرؓ نے ایسا کیا تھا یا نہیں اگر کہیں کہ عمرؓ نے بھی نہیں کیا تو پوچھیں کیا عثمانؓ نے ایسا کیا تھا یا نہیں۔ اگر کہیں نہیں تو پوچھیں کیا علیؓ نے ایسا کیا تھا یا نہیں اگر کہیں کہ نہیں کیا تو پوچھیں کیا صحابہ میں سے کسی نے ایسا کیا تھا یا نہیں اگر کہیں نہیں تو پوچھیں کیا تابعین میں سے کسی نے ایسا کیا تھا یا نہیں۔ اگر کہیں نہیں تو پوچھیں کیا تابعین کے تابعین میں سے کسی نے ایسا کیا تھا یا نہیں۔ اگر کہیں نہیں تو معلوم ہو گیا کہ جس بات کو ان تینوں عہدوں کے بزرگوں نے نہیں کیا اس میں کوئی بھلائی نہیں ہے۔

حضرۃ کب سے شروع ہوا

پھر فرمایا کہ حضرۃ کا رواج چوتھی صدی میں ہوا۔ اس طرح کہ چار یا پانچ صاحب فتح اولیا تھے اور ان کے چند مرید تھے بعض اوقات یہ لوگ ملائکہ وغیرہ کو اللہ کا ذکر کرتے ہوئے مشاہدہ کرتے۔ حضرت نے فرمایا کہ بعض ملائکہ اللہ کا ذکر زبان سے کرتے ہیں اور بعض تمام جسم سے چنانچہ ان کے اجسام دائیں بائیں آگے اور پیچھے جھومتے ہوتے دکھائی دیں گے چنانچہ ان پانچوں میں سے جب کوئی ولی کسی فرشتہ کو اس حالت پر دیکھتا تو اسے یہ حالت بہت پسند آتی اور وہ اس سے اثر پذیر ہو کر اسی طرح جھومنے لگ جاتا اور مشاہدۂ حق میں غائب ہونے کی وجہ سے اسے پتہ ہی نہ ہوتا کہ وہ کیا کر رہا ہے اور جس شخص کی ایسی حالت ہو اس کے ضعف اور عدمِ قوت کے متعلق کوئی شک ہی نہیں ہو سکتا۔ لہٰذا جب اس کے مرید اسے اس طرح حرکت کرتے دیکھتے تو وہ بھی اسی طرح کرنے لگ جاتے۔ شیخ تو فرشتہ کی حرکت کی وجہ سے متحرک ہوتے اور مرید شیخ کی حرکت کی وجہ سے اور وہ اپنے شیخ کی سی ظاہری صورت بنا لیتے اس کے بعد وہ پانچوں شیخ جو اہل باطن اور اہلِ صدق تھے وفات پا گئے اور ان کے اہلِ ظاہر مرید حضرۃ میں مشغول ہو گئے اور انھوں نے دیگر حرکات کا اس میں اضافہ کر دیا اور اس کے لیے آلات بنا لیے اور پھر نسلوں تک یہ بات جاری رہی۔ حالانکہ اس کا سبب ان اشیاخ کی کمزوری

---

[1] حضرۃ یہ لفظ کتاب میں اسی طرح دیا ہے یوں معلوم ہوتا ہے کہ یہ سماع کی قسم کی کوئی چیز ہے۔ ۱۲

تھی جو اپنے وجودِ ظاہری پر قابو نہ پانے کی وجہ سے پیدا ہوئی اور یہ بات قرونِ ثلاثہ میں نہ تھی نہ کہیں سننے میں آئی ہے۔ واللہ اعلم۔

فرمایا کہ نظرِ بصیرت کے تین لاکھ چھیاسٹھ ہزار اجزاء ہیں۔ ان میں سے ایک جزو آنکھ کی نگاہ میں آیا ہے اور باقی تمام اجزاء وارث کامل عارف کی ذات میں ہیں چنانچہ وہ اپنی ذات سے اسی طرح دیکھتا ہے جس طرح ہم اپنی آنکھ سے دیکھتے ہیں مگر اس کی نظر تمام کے تمام اجزاء ہوتی ہے اور یہ مرتبہ صرف ایک شخص کو یعنی غوث کو حاصل ہوتا ہے جس کے ماتحت اقطاب سبعہ ہوتے ہیں۔

اس وقت ہم شہر قطاون میں حضرت کے گھر بیٹھے ہوئے تھے کہ حاضرین میں سے ایک شخص نے جسے آپ کے مرتبہ کا علم تھا کہا کہ امام عبدالوہابؒ شعرانی نے لکھا ہے کہ سید عبدالقادرؒ جیلانی اور حضرت احمد بن حسینؒ رفاعی[1]

---

[1] سید احمد کبیر نام ابوالعباس کنیت اور محی الدین لقب تھا آپ ۱۵ رجب المرجب ۵۱۲ھ / ۱۱۱۸ء کو مقام حسن میں پیدا ہوئے آپ نسباً حسینی سید ہیں۔ ابو محمد ضیاء الدین احمد وتری نے کتاب روضۃ الناظرین میں آپ کا سلسلۂ نسب دیا ہے۔ آپکی روحانی و جسمانی تربیت آپ کے ماموں منصور بطائحی نے کی اور اپنے انتقال سے ایک سال پہلے ۵۳۹ھ / ۱۱۴۴ء خلافت عطا کر کے خرقہ پہنایا۔ شیخ منصور کا انتقال ۵۴۰ھ / ۱۱۴۵ء میں ہوا۔ آپ کے مناقب و حالات میں بہت سی کتابیں تصنیف کی گئیں جیسے رہن العاشقین، تریاق المحبین، نفحۃ المسکیہ، ام البر، شفاء الاسقام اور روضۃ الناظرین وغیرہ۔ آپ کے ملفوظات اور مواعظ کو ان کے مریدوں نے جمع کیا ہے مثلاً مجالس الاحمدیہ، کتاب الحکم، آثار النافعہ، الحکم الساطعہ اور البرہان المؤید۔ آپ کی مشہور ترین کرامت یہ ہے کہ ۵۵۵ھ / ۱۱۶۰ء میں حج بیت اللہ سے فارغ ہو کر روضۂ مقدس کی زیارت کے لیے گئے۔ گنبدِ خضرا کے قریب پہنچ کر آپ نے بآوازِ بلند کہا اَلسَّلَامُ عَلَیْکَ یَا جَدِّیْ۔ نانا جان السلام علیکم۔ فوراً روضۂ اطہر سے ندا آئی وَعَلَیْکَ السَّلَامُ یَا وَلَدِیْ اس ندا کو سن کر آپ پر وجد طاری ہو گیا۔ آپ کے علاوہ جتنے آدمی وہاں موجود تھے سب نے آواز کو سنا۔ تھوڑی دیر کے بعد بحالت گریہ آپ نے یہ دو شعر پڑھے۔

فی حالۃ البُعدِ رُوحی کُنتُ اُرسِلُھا	تُقَبِّلُ الاَرضَ عَنِّیْ وَھِیَ نائبتی
وھذہ دولۃ الاشباح قد حَضَرَتْ	فَامْدُدْ یَمِیْنَکَ کَیْ تَحْظٰی بِھَا شَفَتِیْ

اسی وقت روضۂ مطہر سے دستِ مبارک نکلا اور آپ نے اس کو بوسہ دیا۔ اس وقت روضۂ مقدس پر تقریباً نوے ہزار عاشقانِ جمالِ نبوی کا مجمع تھا۔ انہیں میں حضرت محبوب سبحانی قطب ربانی شیخ عبدالقادر جیلانی، شیخ عدی بن مسافر اموی اور شیخ عبدالرزاق حسینی واسطی بھی تھے۔ آپ نے ۶۶ برس کی عمر میں ۵۷۸ھ / ۱۱۸۲ء میں وفات پائی۔ شعرانی نے ان کی تاریخ وفات ۵۷۰ھ دی ہے۔

اور حضرت ابراہیمؒ وسُوقی[1] کا عالم ملکوت میں اجتماع ہوا اور وہاں ان سے ایک عجیب وغریب واقعہ پیش آیا جس کا ذکر حضرت ابراہیم نے اپنے چند مریدوں سے کر دیا۔ مریدوں نے کہا: اس بات کا کون گواہ ہے۔ حضرت وسُوقی اس وقت اپنے مریدوں کے ساتھ مصر میں تھے اور دیگر دونوں بزرگ عراق میں تھے۔ ان دونوں بزرگوں کی طرف اشارہ کر کے کہنے لگے یہی لوگ گواہی دیں گے۔ چنانچہ وہ دونوں اسی وقت آموجود ہوتے اور انہوں نے گواہی دی۔ پھر اس شخص نے کہا کہ تینوں شخص ایک جیسے ہیں۔

حضرت نے فرمایا کہ اس قسم کی بات تو معمولی ولی بھی کر سکتا ہے۔ میں نے ایک ایسے ولی کو دیکھا جو بہت بڑے مرتبہ تک پہنچا ہوا تھا چنانچہ اسے تمام مخلوقات جاندار و بے جان، وحوش وحشرات، آسمان، ستارے، زمینیں اور جو کچھ زمینوں میں ہے۔ سب کا مشاہدہ حاصل تھا اور تمام کرۂ عالم اس سے مدد لیتا تھا اور وہ ایک ہی لحظہ میں تمام کرۂ عالم کی آواز اور کلام کو سن لیتا تھا اور ہر ایک کو اس کی ضرورت اور مصلحت کی چیز عطا کرتا بدون اس کے کہ کوئی ایک اسے دوسرے سے روک رکھے بلکہ جہان کا اوپر کا حصہ اور نچلا اس کے لیے ایک جیسے تھے۔ پھر اللہ تعالیٰ اس ولی پر رحم فرماتے اور جب وہ دیکھتے تو اسے معلوم ہوتا کہ یہ تمام مدد اسے کسی اور کی طرف سے حاصل ہوئی ہے یعنی اس کی اپنی ذاتی نہیں اور وہ غیر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ہیں اور وہ دیکھتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ مدد حق سبحانہٗ کی طرف سے آرہی ہے چنانچہ وہ دیکھتا کہ یہ سب کچھ اللہ ہی کی جانب سے ہے۔

پھر فرمایا کہ میں نے اس ولی کو یہ کہتے ہوئے سنا ہے کہ جب میں اس مدد کو کسی اور کی طرف سے دیکھتا ہوں تو میں اپنے آپ کو ایک مینڈک کی طرح پاتا ہوں اور یہ کہ تمام مخلوق مجھ سے زیادہ طاقت ور اور زیادہ قدرت والی ہے۔

مؤلف کہتا ہے کہ یہ صفات خود حضرت میں جو کہ غوثِ وقت تھے اور ان کے ماتحت ساتوں قطبوں میں پائی جاتی تھیں۔

ایک مرتبہ یوں فرمایا کہ میں ساتوں آسمانوں، ساتوں زمینوں اور عرش کو اپنی ذات میں دیکھتا ہوں ایسی طرح عرش کے اوپر جو ستر حجاب ہیں اور ہر حجاب میں ستر ہزار عالم ہے اور ہر دو حجابوں کے درمیان ساٹھ ہزار سال کا عرصہ ہے جو تمام کا تمام ملائکہ کرام سے معمور ہے اور اسی طرح ستر پردوں سے اوپر

---

[1] ابراہیم وسُوقی قرشی: بہت جلیل القدر صوفیہ میں سے تھے ان کی کرامات مشہور ہیں۔ تینتالیس برس کی عمر میں ۶۷۶ھ، ۱۲۷۷ء میں وفات پائی۔

جو عالم رتّقا ہے اس تمام مخلوقات کے ذہن میں جوارح کا تو ذکر ہی کیا ایک آدمی کی اجازت کے بغیر کوئی چیز نہیں آسکتی۔

مولف کہتا ہے کہ ان تمام باتوں کی تشریح اولیا۔ اللہ ہی سمجھ سکتے ہیں۔

حضرت کا یہ فرمانا کہ "ایک معمولی ولی بھی ایسا کر سکتا ہے" سچ ہے کیونکہ میں نے ایسے لوگوں کو اس طرح کرتا دیکھا جو ابھی ابتدا۔ فتح و کشف میں ہی تھے حالانکہ انہیں ابھی تک صوفیا۔ کا ایمان نصیب نہ ہوا تھا۔

میں نے ایک مرتبہ آپ سے دریافت کیا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی روحانی میراث ایک لاکھ چوبیس ہزار میں منقسم ہے پھر اس کی کیا وجہ ہے کہ یہ تمام ورثہ غوث کو نہیں ملا؟

فرمایا: کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم میں جتنی طاقت تھی وہ کسی شخص میں بھی نہیں ہے غوث کے وارث ہونے کا مطلب یہ ہے کہ کوئی شخص آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات سے غوث جتنا سیر نہیں ہوتا۔ واللہ اعلم۔

ساتواں باب

وہ تشریح جو حضرت نے اولیاء اللہ کے مشکل کلام کی فرمائی

۱- اَللّٰھُمَّ صَلِّ عَلٰی مَن مِنْہُ اِنْشَقَّتِ الْاَسْرَارِ کی تشریح

حضرت نے قطب کامل عبدالسلام بن مشیش کے درود شریف اَللّٰھُمَّ صَلِّ عَلٰی مَن مِنْہُ اِنْشَقَّتِ الْاَسْرَارِ کی تشریح محمد بن عبدالکریم بصراوی[1] سے نقل کرتے ہوئے یوں فرمائی کہ جب اللہ تعالیٰ نے زمین کی برکات واسرار کو ظاہر کرنے کا ارادہ فرمایا مثلاً چشمے، کنویں، دریا، درخت پھل اور پھول تو ستر ہزار فرشتے بھیجے۔ پھر ستر ہزار فرشتے بھیجے۔ پھر ستر ہزار فرشتے بھیجے۔ زمین پر اتر کر انھوں نے طواف کرنا شروع کیا۔ ستر ہزار کی پہلی جماعت نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے اسم مبارک کا ذکر کرنے لگی اور یہاں اسم سے مراد اسم عالی ہے جیساکہ وتنزلت علوم آدم کی شرح میں آئے گا۔ دوسری جماعت اللہ سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے قرب و مرتبہ کا ذکر کرنے لگی اور تیسری جماعت آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ناموں کے ذکر کی برکت ہے اور آپ کی ان کے درمیان موجودگی اور ملائکہ کے اس مشاہدہ کی برکت سے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اللہ سے کس قدر قرب حاصل ہے تمام کائنات وجود میں آئی۔ فرماتے ہیں: پھر فرشتوں نے آپ کے اسم مبارک کا ذکر زمین پر کیا اور زمین کو قرار آگیا۔ آسمانوں پر کیا تو وہ بلند ہوگئے۔ ابناءِ آدم کے جوڑوں پر کیا تو وہ اللہ کے حکم سے نرم ہوگئے۔ انسان کی آنکھوں کی جگہ پر کیا تو وہ مع اپنے انوار کے کھل گئیں۔ اِنْشَقَّتِ الْاَسْرَارُ کے یہی معنی ہیں۔

مؤلف کہتا ہے کہ کیا دلائل الخیرات[2] کی اس عبارت کا بھی یہی مطلب ہے؟

---

[1] محمد بن عبدالکریم بصراوی: ان کے حالات معلوم نہ ہوسکے۔ یہ حضرت دباغ کے شیوخ میں سے تھے۔

[2] دلائل الخیرات: کتاب کا پورا نام دلائل الخیرات وشوارق الانوار فی ذکر الصلوٰۃ علی النبی المختار علیہ الصلوٰۃ والسلام ہے۔ اس کا مصنف شیخ ابوعبداللہ محمد بن سلیمان بن ابی بکر الجزولی السملالی الشریف الحسنی متوفی ۸۵۴ھ؍۱۴۵۶ء ہے۔ صاحب کشف الظنون کہتے ہیں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر درود بھیجنے میں یہ کتاب معجزہ کا کام کرتی ہے اور اس کی برکت کو اکثر لوگوں نے مشرق و مغرب میں آزمایا ہے۔

وَبِالْاِسْمِ الَّذِیْ وَضَعْتَهٗ عَلَی اللَّیْلِ فَاَظْلَمَ وَعَلَی النَّهَارِ فَاسْتَنَارَ وَعَلَی السَّمٰوٰتِ فَاسْتَقَلَّتْ وَعَلَی الْاَرْضِ فَاسْتَقَرَّتْ وَعَلَی الْجِبَالِ فَرَسَتْ وَعَلَی الْبِحَارِ فَجَرَتْ وَعَلَی الْعُیُوْنِ فَنَبَعَتْ وَعَلَی السَّمٰوٰتِ فَاَمْطَرَتْ۔	اے خدا اس نام کا واسطہ جسے تم نے رات پر رکھا تو وہ تاریک ہو گئی۔ دن پر رکھا تو وہ روشن ہو گیا۔ زمین پر رکھا تو اسے قرار آ گیا پہاڑوں پر رکھا تو وہ گڑ گئے سمندروں پر ڈالا تو وہ بہنے لگے۔ چشموں پر ڈالا تو وہ پھوٹ پڑے اور آسمانوں پر ڈالا تو وہ برسنے لگے۔

حضرت نے فرمایا: ہاں اور یہ نام ہمارے نبی اور آقا محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا نام ہے۔ آپ ہی کی برکت سے تمام کائنات پیدا ہوئی۔ واللہ اعلم۔

مؤلف کہتا ہے کہ حضرت احمدؒ بن عبداللہ غوثِ وقت کا قول جو انھوں نے اپنے مرید کو کہا پہلے گزر چکا ہے جہاں وہ فرماتے ہیں: بیٹا اگر نور محمدی نہ ہوتا تو زمین کا کوئی راز ظاہر نہ ہوتا اور اگر آپ نہ ہوتے تو نہ کوئی چشمہ پھوٹتا اور نہ کوئی دریا چلتا۔ بیٹا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا نور مارچ کے مہینہ میں تین بار تمام بیجوں پر اپنی خوشبو چھوڑتا ہے تو آپ کی برکت سے ان میں پھل آتا ہے۔ اگر آپ کا نور نہ ہوتا تو ان میں پھل نہ آتا۔ بیٹا! سب سے کم ایمان والا شخص بھی اپنی ذات پر ایمان پہاڑ جتنا بلکہ اس سے بھی بڑا دیکھتا ہے۔ زیادہ ایمان والوں کی بات ہی چھوڑو۔ بعض اوقات ذات اس ایمان کے اٹھانے سے بوجھ محسوس کرتی ہے تو اسے پھینک دینے کا ارادہ کرتی ہے اس وقت نور محمدیؐ اس پر چمکتا ہے اور اسے ایمان کے اٹھانے میں مدد دیتا ہے تو وہ شخص ایمان کی حلاوت اور مزہ محسوس کرتا ہے۔ اس قول کو کتاب کی ابتدا میں دیکھ لیں۔

دوسری تشریح

حضرت نے ایک بار مَنْ مِنْهُ انْشَقَّتِ الْاَسْرَارُ کی تشریح یوں کی کہ اگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا وجود نہ ہوتا تو دوزخ و جنت میں لوگوں کا تفاوت معلوم ہی نہ ہوتا اور لوگ جنت و دوزخ میں ایک ہی مرتبہ کے ہوتے اس طرح کہ جب اللہ تعالیٰ نے آپ کا نور پیدا کیا اور تقدیرِ الٰہی میں یہ پہلے لکھا جا چکا تھا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو قبول کرنے اور ان کی طرف مائل ہونے اور نہ ہونے میں لوگوں کی حالت مختلف ہو گی لہٰذا جب آپ کا نور پیدا ہوا تو یہ تفاوت مخلوقات میں ظاہر ہو گیا لہٰذا وہاں سے معلوم ہو گیا کہ ان میں بعض لوگ اس درجہ تک خشوع کرنے والے ہوں گے اور بعض معرفت میں اس درجہ کے ہوں گے اور بعض خوف میں اور فلاں رنگ فلاں قسم کا ہے اور فلاں نے اس سے ایک قسم پی ہے۔ یہ سب کچھ ان کے ظاہر ہونے سے پہلے

ہوا جب کہ وہ ابھی عدم العدم میں ہی تھے ۔ فرمایا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے اسرار کے نکلنے سے مراد یہی مخلوق ہے مراتب کا اختلاف ہے ۔ واللہ اعلم ۔

تیسری تشریح

ایک اور مرتبہ حضرت نے اس کی تشریح یوں فرمائی کہ تمام انبیاء، اولیاء وغیرہ کے اسرار آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سِر سے لیے گئے ہیں ۔ اس لیے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے دو سِر ہیں ۔ ایک مشاہدہ میں جو وہبی چیز ہے اور دوسرا سِر اسی سِر سے حاصل ہوتا ہے اور وہ کسبی یا اکتسابی ہے ۔ فرض کرو مشاہدہ ایک کپڑا ہے ۔ ہر پیشہ ور نے اپنے پیشہ اور کاریگری کے مطابق اس میں اپنی صنعت دکھائی ہو ، اور صاحب مشاہدہ کو یوں فرض کر لیں کہ اس نے اس کپڑے کو تمام کا تمام پی لیا ہو لہٰذا جب وہ اس دھاگے کو پی لے گا جسے ریشم باف نے تیار کیا ہے تو اللہ تعالیٰ اسے ریشم کی صنعت اور ان تمام چیزوں کا علم حاصل ہو جائے گا جن کی اس صنعت میں ضرورت ہوتی ہے اور اگر بافندے کے ساختہ دھاگے کو پیئے گا تو اسے بافندگی کے تمام متعلقات کا علم حاصل ہو جائے گا ۔ اسی طرح ان تمام دیگر صنائع کو جان لے گا جن کا علم ہمیں ہے اور جن کا علم نہیں بھی ہے ۔ یہی حال آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے مشاہدہ کا ہے کہ ہم فرض کر لیتے ہیں کہ یہ مشاہدہ ان تمام معارف پر مشتمل ہے جو حق سبحانہ کے ارادہ میں پہلے سے ہیں

مؤلف کہتا ہے کہ مشاہدہ اور مذکورہ بالا کپڑے میں وجہ شبہ صرف اختلافِ امور ہے ۔ کپڑے میں صنائع اور پیشے مختلف تھے اور آنحضرت کے مشاہدہ میں مختلف قسم کے اسماءِ حسنیٰ ہیں اور اس اسماء کے انوار و اسرار بھی ہیں ۔ اس کی ایک وجہ شبہ یہ بھی ہے کہ مذکورہ بالا کپڑے میں مختلف صنائع اکٹھے ہو گئے ہیں اسی طرح آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے مشاہدہ میں تمام اسماء حسنیٰ کے انوار جمع ہو گئے ہیں تیسری وجہ شبہ یہ ہے کہ جس قدر ان مختلف صنائع کا علم ہوگا اسی قدر کپڑوں کی ساخت میں تصرف پایا جائے گا ۔ یہی حال اسماءِ حسنیٰ کا ہے کہ ان کے انوار سے سیراب ہو کر اس عالم میں تصرف ہوتا ہے لہٰذا وجہ شبہ ان تینوں چیزوں سے مرکب ہوئی یعنی کسی چیز میں امور کا تباین مع استیفاء کے اور اس کے ساتھ تصرف کا اضافہ بھی ہو ۔

اس کے بعد حضرت نے فرمایا : اس طرح آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات ان تمام امور پر مشتمل ہو جاتی ہے جو اس مشاہدہ کے لیے لازم ہیں اور آپ کی ذات کو اس کے تمام اسرار سے مدد حاصل ہوتی ہے جیسے رحمتِ خلق اور ان کی محبت ، انہیں معاف و درگزر کرنا ۔ ان سے حلم سے پیش آنا اور ان کے لیے نیک دعا کرنا تاکہ شاید اللہ تعالیٰ انہیں اللہ عزوجل پر ایمان رکھنے میں تقویت دے

پھر فرمایا: آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے لیے یہی دعا فرمایا کرتے تھے، مگر آج لوگوں کو اس دعا کی قدر معلوم نہیں۔

مؤلف کہتا ہے کہ جب ہم فرض کرلیں کہ مشاہدہ تمام اسماءِ حسنیٰ پر مشتمل ہے اور یہ بھی فرض کرلیں کہ یہ مشاہدہ کرنے والے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم مذکورہ بالا کپڑے کے پہننے والے ہیں تو اس سے یہ قطعی طور پر لازم آئے گا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ مطہرہ تمام اسماءِ حسنیٰ کے انوار سے سیراب ہو اور ان کے اسرار سے مستفیض ہو چکی ہو لہٰذا آپ کی ذات میں نورِ صبر، نورِ رحمت، نورِ حلم، نورِ عفو نورِ مغفرت، نورِ علم، نورِ قدرت، نورِ سمع، نورِ بصر، نورِ کلام الغرض تمام اسماءِ حسنیٰ کے انوار ہوں گے اور یہ انوار آپ کی ذات میں بدرجۂ کمال ہوں گے پھر فرمایا: اس کے بعد ہم دیگر انبیاء، ملائکہ اور اولیاء کی طرف دیکھتے ہیں تو باوجود اس کے کہ وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے انوار سے سیراب ہوتے ہیں پھر بھی آنحضرت کی ذات کے چند اسرار ہم ان سب میں پھیلے ہوئے پاتے ہیں۔ لہٰذا جو اسرار ان کی ذاتوں میں پائے جاتے ہیں وہ سب کے سب آنحضرتؐ کی ذات سے منشعب ہوئے ہیں یہاں تک کہ فرمایا: کہ اگر ذات کے اندر خون گوشت اور رگیں نہ ہوتیں جو حقائق امور کی معرفت سے مانع آتی ہیں تو تمام انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام اپنی پیدائش سے لیکر آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ظہور تک آنحضرتؐ کے حکم کے بغیر کلام تک نہ کرسکتے۔ چنانچہ ان انبیاء کا اشارہ اور لوگوں کی رہنمائی آنحضرت کی طرف ہی ہوتی یہاں تک کہ وہ اپنے امتیوں کو صراحتہً کہتے کہ انہیں جو مدد اور فیض بھی پہنچا ہے وہ آنحضرت کی ذات سے پہنچا ہے اور وہ درحقیقت مستقل نہیں بلکہ آنحضرت کے نائب ہیں۔ وہ بمنزلہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اولاد کے ہیں اور آپ ان کے باپ۔ چنانچہ تمام مخلوق اس میں برابر ہوتی اور سب کی دعوت متحدہ طور پر آپ کی طرف ہوتی۔ کیونکہ دراصل یہی واقع ہونے والا ہے اور گزشتہ امتیں جوں ہی کہ انہیں موت آتی ہے اور اس دنیا سے چلی جاتی ہیں اسے یقینی طور پہ جان لیتی ہیں اور آخرت میں تو وہ اسے آنکھوں سے دیکھ لیں گے اور جنت میں داخل ہونے کے وقت ان میں اور جنتیوں میں امتیاز پیدا ہو جائے گا گویا کہ وہ ان سے متنفر و منقبض ہو گی اور کہے گی میں تمہیں نہیں پہچانتی کیونکہ تم نورِ محمدیؐ میں سے نہیں ہو لہٰذا یہ امتیاز اس طرح ہو گا کہ اگرچہ یہ امتیں آپ سے پہلے گزر چکی ہوں گی، انہیں مدد اپنے انبیاء سے حاصل ہو گی اور ان کے انبیاء کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے اس طرح سب امتوں کو آنحضرت سے مدد ملی۔ فرمایا: اگر خون اور ارادۂ ازلی کا پہلے سے فیصلہ نہ ہو چکا ہوتا تو یہ دنیا میں ہی واقع ہو جاتا۔

میں نے عرض کیا کہ اس کی کیا وجہ ہے کہ خون معرفتِ حق سے مانع آتا ہے؟

فرمایا: اس لیے کہ خون ذات کو اپنی ترابی حقیقت کی کھینچتا ہے اور اسے فانی امور کی طرف مائل کرتا ہے چنانچہ ذات عمارتوں، باغات اور مال جمع کرنے کی طرف لگ جاتی ہے اور ہر لحظہ انہی کی طرف مائل رکھتی ہے حالانکہ درحقیقت یہ میلان غفلت اور اللہ تعالیٰ سے حجاب میں رہنے کا سبب ہے لیکن اگر خون نہ ہوتا تو ذات ان امورِ فانیہ میں سے کسی چیز کی طرف متوجہ نہ ہوتی۔

مؤلف کہتا ہے کہ یہ حجاب بھی مختلف قسم کا ہے عوام کے حق میں کثیف اور خواص کے حق میں کمزور ہے اور انبیاء کے حق میں تقریباً نفی کے برابر ہوتا ہے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے حق میں بالکل ہی نہیں ہوتا۔ واللہ اعلم۔

نورِ محمدی کی آفرینش

نیز فرمایا کہ سب سے پہلے اللہ تعالیٰ نے نورِ محمدیؐ کو پیدا کیا۔ پھر اس نور سے قلم، ستّر حجاب اور ان کے فرشتے پیدا کئے۔ پھر لوح کو پیدا کیا۔ پھر اس کے کمال اور انعقاد سے پہلے ہی عرش، ارواح، جنت اور برزخ کو پیدا کیا۔ عرش کو نور سے پیدا کیا اور اس نور کو نورِ مکرم یعنی نورِ محمدیؐ سے پیدا کیا۔ اس کی خلقت ایک نہایت ہی عظیم یاقوت کی شکل میں بنائی جس کے وسط میں ایک گوہر ہے چنانچہ یاقوت اور گوہر دونوں ملکر ایک انڈے کی مانند ہیں کہ جس کی سفیدی یاقوت ہے اور زردی گوہر کی۔ پھر اللہ تعالیٰ نے اس گوہر کو مدد دی تو اسے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلّم کے نور سے سیراب کیا۔ چنانچہ یہ نور یاقوت کو پھاڑ کر گوہر کو سیراب کرنے لگا یہاں تک کہ ایک مرتبہ نہیں بلکہ اسے سات مرتبہ سیراب کیا۔ جس سے گوہر سیال بن کر یاقوت کی تہ میں بیٹھ گیا اور یہی عرش ہے۔ پھر یہی نور جس نے گوہر کو پھاڑ کر اسے سیال بنادیا تھا۔ اس سے اللہ نے آٹھ فرشتے پیدا کیے جو حاملین عرش کہلاتے ہیں پھر اس کے پھوک سے ہوا پیدا کی گئی اور اسے بہت قوت و زور دیا گیا اور اسے پانی کے نیچے چلی جانے کا حکم دیا چنانچہ ہوا نے پانی کے نیچے جاکر اسے اٹھالیا اور اپنی خدمت بجالانی شروع کردی۔ سردی کے زور پکڑنے سے پانی اپنی اصلیت کی طرف لوٹ کر پھر جمنے لگا مگر ہواؤں نے اس کے جمے ہوئے ٹکڑوں کو توڑ کر اسے ایسا نہ ہونے دیا، ان ٹکڑوں میں تعفن و بدبو پیدا ہونے لگی اور ٹکڑے بڑھتے گئے۔ پھر بڑے ہو کر ساتوں جہتوں میں پھیل گئے اور ان سے اللہ تعالیٰ نے سات زمینوں کو پیدا کیا۔ ان زمینوں اور سمندروں کے درمیان پانی داخل ہو گیا اور ہوا کی شدت کی وجہ سے پانی دھند بن کر اٹھا اور تر بتر ہو گیا اس طرح ساتوں آسمان پیدا ہوئے اس کے بعد ہوا اپنی عادت کے مطابق بڑی خدمت کرنے لگی اور چونکہ

ہوا پانی اور فضا کو بڑی شدت سے پھاڑ رہی تھی اس لیے ہوا میں آگ بڑھتی گئی۔ جس قدر آگ بھڑکتی جاتی۔ فرشتے اسے لے جا کر وہاں رکھ دیتے جہاں اب دوزخ ہے۔ یہی دوزخ کی اصلیت ہے جن ٹکڑوں سے زمین بنی تھی انہیں اپنی حالت پر ہی چھوڑ دیا گیا اور جس کہر سے آسمان بنا تھا، اسے بھی ویسا ہی چھوڑ دیا گیا اور جو آگ رگڑ سے پیدا ہوئی تھی اسے منتقل کر کے کہیں اور لے جایا گیا اس لیے کہ اگر اسے وہیں چھوڑ دیا جاتا تو یہ ان ٹکڑوں کو جن سے ساتوں زمینیں بنی ہیں۔ نیز اس کہر کو جس سے ساتوں آسمان بنے ہیں۔ سب کو کھا جاتی بلکہ ہوا کی تیزی کی وجہ سے پانی کو بھی کلیتہً ہضم کر جاتی۔

اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے آنحضرت کے نور سے زمین کے فرشتے پیدا کئے اور انہیں زمین پر اللہ کی عبادت کرنے کو کہا۔ اس طرح آسمانوں کے فرشتوں کو بھی آنحضرتؐ کے نور سے پیدا کیا اور انہیں بھی آسمان پر اللہ کی عبادت کرنے کو کہا۔

ارواح اور جنت بھی ماسوا چند جگہوں کے نور سے پیدا ہوئے اور یہ نور نور محمدی سے پیدا ہوا برزخ کا نصف اوپر کا حصہ بھی آنحضرتؐ کے نور سے پیدا ہوا۔ یہاں سے معلوم ہو گیا کہ قلم، لوح، نصف برزخ، ستر حجاب اور ان کے فرشتے اور آسمانوں اور زمینوں کے تمام فرشتے سب آنحضرت کے نور سے بلاواسطہ پیدا ہوئے اور عرش، پانی، جنت اور ارواح اس نور سے پیدا ہوئے جو آنحضرت کے نور سے پیدا کیا گیا۔ یہ مخلوقات اس کے بعد بھی آنحضرت کے نور سے سیراب ہوئی۔ قلم سات بار اس نور سے خوب اچھی طرح سیراب ہوا اور یہ تمام مخلوقات سے بڑا ہے چنانچہ اگر نورِ کریم جرم زمین پر پڑے تو اسے ریزہ ریزہ کر دے۔ اسی طرح پانی بھی سات بار سیراب ہوا، لیکن قلم سے کم۔ حجاب تو ہر وقت سیراب ہوتے رہتے ہیں عرش دو بار سیراب ہوا۔ ایک ابتداء آفرینش کے وقت اور دوسرا تمام آفرینش کے وقت تاکہ اپنی ذات کو قابو میں رکھ سکے۔ اسی طرح جنت بھی دو مرتبہ سیراب ہوئی۔ ایک ابتدا میں اور دوسرے تکمیل خلقت کے وقت تاکہ اپنی ذات پر قابو رہے۔ انبیاء علیہم الصلوٰۃ اور تمام مومن خواہ وہ گزشتہ امتوں میں سے ہوں خواہ اس امت میں سے آٹھ بار سیراب ہوئے، پہلی بار عالم ارواح میں جب اللہ نے تمام ارواح کا نور پیدا کیا اور دوسری مرتبہ جب اس سے ارواح کو صورت و شکل دی گئی چنانچہ ہر روح کو صورت و شکل دیتے وقت اسے آنحضرت کے نور سے سیراب کیا گیا۔ تیسری بار اس دن جب اَلَستُ بِرَبِّکُم کہا گیا تھا کیونکہ مومنین اور انبیاء کی تمام وہ روحیں جنہوں نے اللہ کے اس سوال کا جواب دیا انہیں آنحضرتؐ کے نور سے سیراب کیا گیا، لیکن کسی کو زیادہ اور کسی کو کم۔ اسی لیے مومنین

تفاوت پیدا ہوا کہ کوئی عامی رہا اور کوئی ولی بن گیا۔

کفار کی روحوں نے اس نور سے سیراب نہ ہونا چاہا لہٰذا نہ ہوئے لیکن جب انھوں نے دیکھا کہ جو روحیں اس نور سے سیراب ہوئی ہیں، ان کو کیا کیا ابدی سعادتیں اور ارتقاء حاصل ہوا ہے تو انہیں ندامت ہوئی اور سیر ہونے کی درخواست کی مگر اب انہیں ظلمتوں سے سیراب کیا گیا۔ خدا محفوظ رکھے۔

چوتھی سیرابی اس وقت ہوتی ہے جب ماں کے پیٹ میں بچے کی شکل بنتی ہے۔ اس کے اعضاء کو ترکیب دی جاتی ہے اور آنکھیں کھولی جاتی ہیں۔ اس وقت بھی اس کی ذات کو آنحضرتؐ کے نور سے سیراب کیا جاتا ہے تاکہ اس کے جوڑ نرم اور کان اور آنکھیں کھل جائیں اور اگر انہیں اس نور سے سیراب نہ کیا جاتا تو ان کے جوڑ نرم نہ ہوتے۔ پانچواں جب ماں کے پیٹ سے نکلتا ہے اس وقت اسے نور کریم سے سیراب کیا جاتا ہے تاکہ منہ کے ذریعہ سے کھانا اس کے ذہن میں ڈال دیا جائے، اگر ایسا نہ ہوتا تو وہ منہ کے ذریعہ سے کبھی نہ کھاتا۔ چھٹا جب ماں کا دودھ پہلی بار پیتا ہے۔ ساتواں جب اس میں روح پھونکی جاتی ہے کیونکہ اگر نور کریم سے سیراب نہ ہوتا تو اس میں روح کبھی داخل نہ ہوتی مگر اس کے باوجود روح جسم کے اندر بہت مشقت اور تکلیف سے داخل ہوتی ہے اور اگر روح کو اللہ کا حکم نہ ہوتا تو فرشتہ اس کو جسم میں کبھی داخل نہ کر سکتا۔

ایک بار حضرت نے فرمایا کہ جو فرشتے روح کو جسم میں داخل کرنا چاہتے ہیں، ان کی مثال ایسی ہے جیسے کوئی بادشاہ اپنے ادنیٰ سے غلاموں کو ایک بہت بڑے عہدہ دار کو قید خانہ میں ڈالنے کا حکم دے۔ جب ہم ان ادنیٰ غلاموں اور اس بڑے عہدہ دار کی طرف دیکھتے ہیں تو خیال کرتے ہیں کہ وہ اس عہدہ دار سے نمٹ نہ سکیں گے، مگر جب ہم اس بادشاہ کی طرف نظر کرتے ہیں جس نے ان غلاموں کو بھیجا ہے اور خیال کرتے ہیں کہ بادشاہ کا حکم سب میں جاری وساری ہے تو ہم اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ وہ عہدہ دار ان کے سامنے عاجزی کرے گا اور جب وہ روح کو جسم میں داخل کرنے کا ارادہ کرتے ہیں تو روح سخت بے چین ہوتی ہے اور زور کی آواز نکالتی ہے اور جو اس پر گزرتی ہے اس کا علم اللہ کے سوا کسی کو نہیں ہو سکتا۔ واللہ اعلم۔

آٹھویں قیامت کے دن جب قبر سے اٹھا کر اس کو شکل دی جائے گی اس وقت بھی اسے آنحضرتؐ کے نور سے سیراب کیا جائے گا تاکہ اپنی ذات کو پکڑ سکے۔

فرمایا: اس آٹھ بار کی سیرابی میں انبیاء علیہم الصلوٰة اور مومنین خواہ پہلی امتوں کے ہوں خواہ اس اُمت کے سب شریک ہیں مگر ان میں فرق موجود ہے کیونکہ انبیاء علیہم الصلوٰة کو جس قدر سیرابی ہوئی

دوسرے لوگوں کو اس کی برداشت نہیں ہو سکتی یہی وجہ ہے کہ انہیں تو درجہ نبوّت و رسالت مل گیا اور دوسروں کو ان کی طاقت کے مطابق سیراب کیا گیا۔ امتِ محمدیہ اور دوسری امتوں کی اس نور سے سیرابی میں فرق یہ ہے کہ امتِ محمدیہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات میں اس نور کے داخل ہونے کے بعد اس سے سیراب ہوئی ہے اسی لیے تو اس نور کو اس قدر کمال حاصل ہوا جس کی نہ کسی میں طاقت ہے اور نہ اس کی کیفیت بیان کی جا سکتی ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ اس نور نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی روحِ پاک اور ذاتِ پاک دونوں کا اثر حاصل کیا ہے برخلاف دیگر امم کے کہ اس وقت وہ نور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی روحِ پاک کا اثر لیے ہوئے تھا۔ اسی وجہ سے تو اس امت کے مومنین کامل، عادل اور افضل ہیں اور یہ امت ان تمام امتوں سے افضل ہے جو لوگوں کے لیے بھیجی گئیں۔ الحمد والشکر۔

حضرت نے فرمایا: اس طرح باقی تمام مخلوق بھی آنحضرتؐ کے نور سے سیراب ہوئی اور اگر اس میں یہ نور نہ ہوتا تو کوئی شخص دنیا کی کسی چیز سے فائدہ نہ اٹھا سکتا۔

فرمایا: جب حضرت آدم علیہ السلام زمین پر اُترے اس وقت درختوں کے پھل شروع ہی میں گر جاتے تھے چنانچہ جب اللہ نے چاہا کہ انہیں پھل لگیں تو انہیں آنحضرتؐ کے نور سے سیراب کیا تب جا کر پھل لگنے لگے اور اگر کافروں میں آپ کا وہ نور جس سے انہیں ان کے پیٹ میں شکل بننے، پھر روح پھونکنے، پھر پیٹ سے نکلنے اور رضاع کے وقت سیراب کیا گیا تھا، نہ ہوتا تو دوزخ نکل کر ان کی طرف آتی اور انہیں کھا لیتی۔ آخرت میں جب تک یہ نور ان کی ذات سے نکال نہ لیا جائیگا اس وقت تک دوزخ انہیں نہ کھائے گی۔ واللہ اعلم۔

نیز فرمایا کہ جب اللہ تعالیٰ نے نورِ مکرم کو پیدا اور اس کے بعد قلم، عرش، لوح، برزخ، جنت اور عرش جنت اور حجب کے فرشتوں کو پیدا کیا تو عرش نے عرض کیا اے اللہ تو نے مجھے کیوں پیدا کیا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے جواب دیا کہ تجھے میں نے تمہارے اوپر کے جو سات حجاب ہیں ان کے نور سے اپنے محبوبوں کو حجاب میں رکھنے کیلئے پیدا کیا ہے کیونکہ وہ ان انوار کی طاقت نہیں رکھتے اس لیے کہ انہیں مٹی سے پیدا کیا جائے گا۔ اس وقت نہ اعداء تھے نہ اعدا کا گھر یعنی جہنم اس لیے ملائکہ کو خیال ہوا کہ اللہ کے وہ محبوب جنہیں مٹی سے پیدا کرے گا جنت میں پیدا کیے جائیں گے اور وہیں رہیں گے اور عرش کی وجہ سے وہ حجاب میں ہوں گے اس کے بعد اللہ نے تمام ارواح کا نور پیدا کیا اور اسے نورِ مکرم سے سیراب کیا اور پھر اس کے ایک ایک ٹکڑے میں امتیاز پیدا کیا اور

ہر کمرٹے سے ایک روح نکالی اور اس کو بھی شکل دیتے وقت نورِ مکرم سے سیراب کیا۔ اس کے بعد ارواح ایک مدت اسی حالت میں رہیں بعض کو اس سیرابی سے مزہ آیا اور بعض کو نہیں آیا۔ چنانچہ جب اللہ تعالیٰ نے دوست اور دشمن میں امتیاز کرنا چاہا اور دشمنوں کے لیے دوزخ بنانی چاہی تو تمام ارواح کو جمع کر کے کہا اَلَسْتُ بِرَبِّکُمْ (کیا میں تمہارا رب نہیں ہوں) تو جن روحوں نے اس نور سے مزہ حاصل کیا تھا انہیں اس نور کی طرف میل و محبت تھی، انھوں نے محبت و خوشی سے جواب دیا اور جنہوں نے اس سے کچھ مزہ حاصل نہ کیا تھا۔ انہوں نے بجبر و خوف جواب دیا۔ اس طرح وہ ظلمتیں جو جہنم کی اصل ہیں ظاہر ہوئیں۔ پھر ہر لحظہ ظلمتیں اور نور دونوں بڑھتے گئے۔ انہیں نورِ مکرم کی قدر اس وقت معلوم ہوئی۔ جب انھوں نے دیکھا کہ جنہوں نے نورِ مکرم سے مزہ حاصل نہ کیا تھا وہ غضبِ خداوندی کے مستوجب ہوئے اور ان کے لیے جہنم پیدا کی گئی۔ واللہ اعلم۔

ایک اور بار یوں فرمایا کہ انبیاء علیہم السلام اگرچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے نور سے سیراب کیے گئے ہیں مگر یہ پورے طور پر اس سے سیر نہیں ہوتے۔ ہر نبی اس نور سے اسی قدر مستفیض ہوا ہے جس قدر کہ اس کے لیے مناسب اور لکھا گیا تھا۔ اس لیے کہ نورِ مکرم کے مختلف رنگ اور احوال ہیں اور اس کی کئی ایک قسمیں ہیں۔ ہر نبی نے اس نور میں سے ایک خاص رنگ اور خاص قسم پی ہے۔

پھر فرمایا کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے اس نور میں سے کچھ حصہ پیا تو انہیں غریب الوطن ہونے کا مقام حاصل ہوا۔ یہ ایک ایسا مقام ہے جو صاحبِ مقام کو ایک جگہ پر قرار نہیں لینے دیتا اور اسے سیاحت پر مجبور کرتا ہے اور حضرت ابراہیم علیہ السلام نے بھی اس نورِ مکرم میں سے کچھ نور پیا تو آپ کو بمع مشاہدہ کاملہ کے مقامِ رحمت اور مقامِ تواضع ملا چنانچہ اگر آپ کو کسی سے نرمی اور تواضع سے باتیں کرتے دیکھیں تو متکلم یوں سمجھے گا کہ آپ اس سے تواضع کر رہے ہیں حالانکہ آپ اپنے قوتِ مشاہدہ کے سبب سے اللہ کے سامنے تواضع کر رہے ہوتے ہیں اور حضرت موسیٰ علیہ السلام نے بھی اسی نورِ مکرم میں سے کچھ نور پیا تو انہیں اپنی تمام نعمتوں، عطیوں اور نیکیوں کے ساتھ مقامِ مشاہدۂ حق حاصل ہوا۔ یہی حال باقی تمام انبیاء علیہم السلام اور ملائکہ کرام کا ہے۔ واللہ اعلم۔

حضرت نے فرمایا کہ اہلِ خیر میں خیر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی برکت سے ظاہر ہوئی اور اہلِ خیر ملائکہ، انبیاء، اولیاء اور عامۃ المومنین ہیں۔

میں نے عرض کیا کہ ان میں فرق کیسے معلوم ہو؟

فرمایا: فرشتوں کا وجود تو نور کی مٹی سے ہے اور ان کی ارواح نور سے ہیں اور انبیاء علیہم السلام کی ذات تو مٹی سے ہے اور روح نور سے اور روح اور ذات کے درمیان ایک اور نور ہے جس سے ان کی ذات سیراب ہوتی ہے۔ یہی حال اولیاء اللہ کا ہے مگر انبیاء درجۂ نبوت کی وجہ سے ان پر فوقیت رکھتے ہیں۔ اولیاء درجۂ نبوت کی طاقت نہیں رکھ سکتے۔ عام مومنین کی ذات تو مٹی سے بنی ہے اور ان کی ارواح نورانی ہیں اور ان کی ذات کو اس نور سے جو انبیاء اولیاء کو حاصل ہوا کچھ حصہ ملا ہے۔

میں نے عرض کیا کہ ان انوار کی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے نور سے کیا نسبت ہے اور یہ اس نور سے کیسے مستفیض ہوتے ہیں۔

اس پر حضرت نے ایک عام فہم مثال بیان کی اور فرمایا جیسے کوئی بہت سی بلیوں کو کچھ مدت تک بھوکا رکھے یہاں تک کہ انہیں کھانے کی سخت خواہش پیدا ہو جائے اس کے بعد وہ شخص ان کے سامنے ایک روٹی ڈال دے اور وہ اسے جلدی جلدی کھانے لگ جائیں اور روٹی میں سے ذرہ بھر بھی کمی واقع نہ ہو۔ یہی حال آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے نور کا ہے۔ تمام جہان اس سے مستفیض ہوتا ہے مگر اس میں کوئی کمی نہیں ہوتی۔ حق سبحانہ اسے ہر دم زیادہ کرتے رہتے ہیں۔ اس نور میں یہ زیادتی اس طرح نہیں ہوتی کہ یہ اور پھیل جائے بلکہ یہ زیادتی باطن ہی باطن میں ہوتی ہے ظاہر میں نہیں ہوتی جیسے کہ نقص بھی ظاہر نہیں ہوتا اسی نور سے ملائکہ انبیاء اولیاء اور عامۃ المومنین مستفیض ہوتے ہیں اور جیسا کہ بیان کیا گیا، ہر ایک کا فیضان مختلف ہوتا ہے۔

پھر فرمایا کہ سورج، چاند اور ستاروں کا نور نورِ برزخ سے لیا گیا ہے اور نور برزخ نورِ کرام اور ان ارواح کے نور سے لیا گیا جو اس میں ہیں اور نور ارواح آنحضرت ﷺ کے نور سے لیا گیا ہے۔

لیلۃ القدر کی اصل

فرمایا کہ ان میں نور کا ظہور حضرت آدمؑ کی پیدائش کے قریب اور زمینوں اور پہاڑوں کی پیدائش کے بعد ہوا چنانچہ فرشتے اور روحیں اللہ کی عبادت کیا کرتی تھیں کہ اچانک سورج، چاند اور ستاروں میں روشنی ظاہر ہو گئی تو زمین کے فرشتے سورج کی روشنی سے بھاگ کر رات کے سایہ میں چلے گئے۔ سورج رات کی تاریکی کو منسوخ کرتا گیا اور فرشتے سایہ کے ساتھ چلتے گئے یہاں تک کہ پھر اسی مقام پر آپہنچے جہاں سے چلے تھے۔ اس پر انہیں سخت خوف طاری ہوا اور انہیں خیال پیدا ہوا کہ یہ کسی بڑے معاملہ کے لیے واقع ہوا ہے۔ تب تمام

زمینوں کے فرشتے اکٹھے ہوئے اور انھوں نے پھر پہلے کی طرح کیا، لیکن آسمانوں کے فرشتوں اور برزخ کی روحوں نے جب زمین کے فرشتوں کو اس طرح کرتے دیکھا تو وہ بھی زمین پر اتر آئے مگر بنی آدم کی روحیں زمین کے فرشتوں کی پہلی جماعت کے ساتھ ٹھہری رہیں اور اس رات زمین اور آسمان کے تمام فرشتے اور روحیں سب کی سب اکٹھی ہوئیں، لیکن جب سورج اپنی اصلی جگہ کو لوٹ آیا اور کوئی حادثہ واقع نہ ہوا تو ان فرشتوں کو اطمینان ہوگیا اور اپنی اپنی جگہ پر واپس چلے گئے پھر ہر سال فرشتے اسی طرح کرنے لگ گئے۔ لیلۃ القدر کا یہی سبب ہے۔ واللہ اعلم۔

وَفِیْهِ ارْتَقَتِ الْحَقَائِقُ کی تشریح

حضرت نے شیخ عبدالسلام بن مشیش کے فرمان وَفِیْهِ ارْتَقَتِ الْحَقَائِقُ کی تشریح کرتے ہوئے فرمایا کہ یہاں حقائق سے مراد وہ اسرار حق ہیں جنھیں اللہ تعالیٰ نے اپنی مخلوقات میں پھیلائے رکھا ہے، ان اسرار کی تعداد ۳۶۶ ہے اور حیوانات و جمادات میں ان کا ظہور اللہ کی مرضی کے مطابق ہوتا ہے اور اسی طرح باقی مخلوقات میں بھی۔ مثال کے طور پر نباتات میں بھی سِر پایا جاتا ہے اور یہ نفع ہے جو ہم ان سے حاصل کرتے ہیں اور نفع بھی ایک حقیقت ہے جس کا تعلق حق سبحانہ کے ساتھ ہے اس لیے کہ ہر حقیقت کا تعلق اللہ کے ساتھ ہے جیسا کہ آگے چل کر بیان کیا جائے گا پھر یہ نفع رسانی کا مادہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم میں اس قدر بلند تھا کہ کوئی اور اس حد تک پہنچ ہی نہیں سکتا چنانچہ ہم دیکھ چکے ہیں کہ تمام کائنات آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے نور سے کس طرح فیضیاب ہوئی اور یہ مرتبہ کسی مخلوق کو حاصل نہیں ہوا۔

پھر فرمایا کہ زمین میں بھی سِر ہے اور وہ یہ ہے کہ زمین ان تمام چیزوں کو اٹھائے ہوئے ہے جو اس میں پائی جاتی ہیں اور یہ بھی حقائقِ الٰہیہ میں سے ایک حقیقت ہے۔ یہ بھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم میں حد سے زیادہ پائی جاتی تھی یہاں تک اگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اسرار و معارف تمام مخلوقات پر ڈال دیے جائیں تو اس کی طاقت نہ رکھتے ہوئے ایک دوسرے پر گر پڑیں۔ اہل مشاہدہ میں بھی ایک سِر پایا جاتا ہے یعنی یہ کہ وہ ایک لحظہ کے لیے بھی اللہ سے غافل نہیں رہتے۔ اس میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اس حد تک بلند تھے کہ کسی اور میں اس کی طاقتِ برداشت نہیں پائی جاتی جیسا کہ مشاہدۂ شریفہ میں اس کا بیان ہو چکا۔

صدیقین میں بھی اسرارِ حق میں سے صدق کا راز ہے، اس میں بھی آنحضرت حدِ کمال کو پہنچے ہوتے تھے، اہلِ کشف میں جو راز حق ہے وہ معرفتِ الٰہیہ ہے اور اس میں بھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم

کو اس قدر کمال حاصل تھا کہ کوئی اس کی تہ تک نہیں پہنچ سکتا۔ لہٰذا معلوم ہوا کہ حقائق کا ارتقا اسی حد تک ہوتا ہے جس حد تک کوئی نورِ حق سے فیض یاب ہو اور چونکہ آنحضرت میں حقائق کا ارتقا آپ کے نور کے مطابق ہوا اور آپ کے نور کی طاقت کسی میں نہیں لہٰذا جہاں تک حقائق کا ارتقا آپؐ میں ہوا کسی اور میں وہاں پہنچنے کی طاقت نہیں۔ واللہ اعلم

وَتَنَزَّلَتْ عُلُوْمُ اٰدَمَ کی تشریح

حضرت نے عبدالسلام بن مشیش کے فرمان وَتَنَزَّلَتْ عُلُوْمُ اٰدَمَ کی تشریح فرماتے ہوئے کہا کہ علوم آدم سے مراد ان اسماء کا علم ہے جو حضرت آدم علیہ السلام کو دیا گیا اور جن کی طرف آیۃ وَعَلَّمَ اٰدَمَ الْاَسْمَاءَ کُلَّهَا (سورۂ بقرہ آیت ۳۱) میں اشارہ کیا گیا ہے اور اسماء سے اسماءِ عالیہ مراد ہیں نہ کہ اسماءِ نازلہ کیونکہ ہر مخلوق کے دو نام ہیں۔ ایک اسم عالی اور ایک اسم نازل۔ اسمِ نازل تو مسمّٰی کا پتہ بتاتا ہے اور اسم عالی مسمّٰی کی اصل کا پتہ بتاتا ہے اور یہ کہ وہ کس چیز سے ہے اور اس کا کیا فائدہ ہے اور یہ کہ کلہاڑی کس کام آتی ہے۔ لوہار اسے کیسے بناتا ہے چنانچہ اس اسم عالی کے محض سننے سے وہ تمام علوم و معارف سمجھ میں آجاتے ہیں جن کا تعلق کلہاڑی سے ہے اسی طرح ہر مخلوق میں۔ اور اَلْاَسْمَاءَ کُلَّهَا سے مراد وہ اسماء ہیں جن کی حضرت آدمؑ میں طاقت تھی اور تمام انسانوں کو ان کی احتیاج ہے یا انہیں ان سے تعلق ہے اور یہ عرش کے نیچے سے لے کر زمین کے نیچے تک کی ہر مخلوق کے نام ہیں چنانچہ اس میں جنت، دوزخ، سات آسمان اور جو کچھ ان کے اندر یا ان کے درمیان ہے اور جو کچھ آسمان اور زمین کے درمیان ہے اور جو کچھ زمین کے اندر ہے مثلاً جنگل، چٹیل میدان، وادیاں، سمندر، درخت سب اس میں شامل ہیں۔ چنانچہ ہر مخلوق خواہ وہ ناطق ہو خواہ جامد حضرت آدم ان کے اسماء ہی سے ان کی اصل، ان کے فائدہ، ان کی کیفیت، ترتیب اور شکل کی وضع کو جان جاتے تھے۔ چنانچہ وہ جنت کا نام سن کر ہی معلوم کر لیتے کہ اس کی پیدائش کہاں سے ہوئی، کیوں ہوئی، اس کے مراتب کی ترتیب کیا تھی اور اس کے اندر کتنی حوریں ہیں اور حشر و نشر کے بعد اس میں کتنے لوگ بسیں گے۔ اسی طرح دوزخ کے لفظ سے بھی سمجھ جاتے اور اسی طرح آسمان کے لفظ سے۔ نیز یہ کہ پہلا آسمان اپنی جگہ پر کیوں ہے اسی طرح دوسرا اور باقی آسمان اپنی اپنی جگہ پر کیوں ہیں۔ فرشتوں کے لفظ سے بھی سمجھ جاتے کہ وہ کس چیز سے پیدا کئے گئے اور کیوں پیدا کئے گئے ہیں، ان کی پیدائش کی کیفیت کیا ہے ان کے مراتب کی ترتیب کیا ہے اور یہ کہ فلاں فرشتہ فلاں مقام کا کیوں مستحق ہوا اور دوسرے کا دوسرا مقام کیوں تھا۔ اسی طرح عرش سے لے کر زمین کے نیچے تک کے

ہر فرشتے کے مقام کا پتہ تھا۔ آدم علیہ السلام اور ان کی اولاد میں سے انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام اور کاملین اولیاء کے یہی علوم تھے۔ آدم علیہ السلام کا خاص طور پر اس لیے ذکر کیا گیا ہے کہ انہیں سب سے پہلے یہ علوم حاصل ہوئے اور ان کی اولاد میں سے جنہیں یہ علوم حاصل ہوتے ہیں وہ ان کے بعد ہوئے ہیں۔ علوم آدم سے یہ قطعاً مراد نہیں کہ آدم کے سوا ان علوم کا کسی کو علم نہ تھا اور ہم نے علوم آدمؑ کے ساتھ جو یہ تخصیص کر دی ہے کہ ان سے مراد صرف وہ علوم ہیں جن کی آدمؑ اور ان کی اولاد کو ضرورت تھی اور جن کے برداشت کرنے کی ان میں طاقت تھی وہ اس لیے ہے کہ کہیں کوئی یہ نہ سمجھ لے کہ اس سے مراد تمام معلومات خداوندی کا علم ہے اور تَنَزَّلَتْ کا لفظ اس لیے استعمال کیا تاکہ ان علوم کے متعلق آنحضرتؐ کے علم اور حضرت آدمؑ اور دیگر انبیاء کے علم میں فرق معلوم ہو جائے کیونکہ جب انبیاء علیہم السلام ان علوم کی طرف متوجہ ہوتے ہیں تو آپ کو مشاہدۂ تامہ حاصل ہوتا ہے مگر ساتھ ہی ان علوم وغیرہ کا بھی مشاہدہ ہوتا جن کی اوروں کو طاقت نہیں ہو سکتی اور جب ان علوم کی طرف توجہ فرماتے ہیں تو یہ علوم حق سبحانہ کے مشاہدہ کے ساتھ ساتھ حاصل ہوتے ہیں اس طرح نہ مشاہدۂ حق مشاہدۂ خلق سے مانع آتا ہے اور نہ مشاہدۂ خلق مشاہدۂ حق سے چنانچہ ان علوم کا نزول و رسوخ صرف آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم میں ہوا ہے اوروں میں نہیں اس لیے کہ دیگر انبیاء جب حق سبحانہ کی طرف متوجہ ہوتے ہیں تو یہ علوم زائل ہو جاتے ہیں۔ اسی لیے تو تمام مخلوقات آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے مرتبہ تک نہیں پہنچ سکتی اور ان کی عقلیں آپ کے مرتبہ کو سمجھنے سے قاصر ہیں چنانچہ نہ گزشتہ انبیاء میں سے کوئی آپ کی گرد تک پہنچ سکا ہے اور نہ آئندہ آنے والے اولیاء اللہ میں سے پہنچ سکے گا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ جس طرح آنحضرتؐ کی روحِ مطہر کمالاتِ باطنیہ میں کامل ہے اسی طرح آپ کی ذات بھی کمالات ذاتیہ میں کامل ہے کہ ملکوت کے باغات آپ ہی کے جمال کی بدولت خوشنما معلوم ہوتے ہیں اور عالم جبروت کے حوض آپ ہی کے نور کے فیض سے چھلک رہے ہیں۔

عالم ملکوت و جبروت

یاد رکھیں کہ عالم علوی کو مختلف اعتبار سے عالم الملک و عالم الملکوت و عالم جبروت کہا جاتا ہے اسے عالم الملکوت یہاں کے باشندگان خواہ ناطق ہوں، خواہ صامت، خواہ جامد ہوں خواہ عاقل، سب کے اتفاق کے اعتبار سے کہا جاتا ہے اس لیے کہ ان کا اتفاق ایک ہی نگاہ، ایک ہی توجہ اور ایک ہی معبود یعنی حق سبحانہ پر ہے چنانچہ وہ اللہ کی معرفت اور مشاہدہ پر متفق ہیں اور اس میں ان کا کوئی اختیار نہیں ہے

برخلاف عالمِ سفلی میں سے زمین کے باشندوں کے کہ ان میں سورج پرست، چاند پرست، کواکب پرست، صلیب پرست اور بت پرست وغیرہ سبھی قسم کے گمراہ لوگ پائے جاتے ہیں لہٰذا عالم علوی کے برعکس ان کی نگاہ میں اختلاف ہے۔ حاصل یہ کہ ہر وہ عالم جہاں کے لوگ حق بات پر متفق ہوں عالم الملک کہلاتا ہے اور اسی کو عالم علوی کہتے ہیں اور عالم ملکوت اسے یہاں کے باشندوں کے نور کے اختلافات اور ان کے مقامات اور احوال کے تباین کی وجہ سے کیا جاتا ہے اور اسے عالم جبروت ان انوار کے اعتبار سے کہا جاتا ہے جو ان پر اس طرح چلتے ہیں جس طرح ہم پر ہوا چلتی ہے لہٰذا ان کی ذات، ان کی ارواح اور معارف کو سیراب کرنے اور ان کے مقامات کو برقرار رکھنے کے لیے یہ نور ان پر چلتے ہیں چنانچہ یہ انوار ان کے مذکورہ بالا تمام حالات کے محافظ ہوتے ہیں۔

عالم الملک کی ایک اور تعریف

مؤلف کتاب کہتا ہے کہ حضرت نے بہت خوب بیان فرمایا ہے مگر بعض لوگوں کا خیال ہے کہ عالم الملک وہ عالم ہے جس کا ادراک حواس سے ہو سکے اور عالم ملکوت وہ ہے جس کا ادراک عقل سے ہو سکے اور عالم جبروت وہ ہے جس کا ادراک مواہب الٰہیہ سے ہو۔

دوسری تعریف

بعض کا قول ہے کہ عالم ظاہر اور محسوس کو عالم مُلک کہتے ہیں اور جو عالم باطن اور عقل میں رہے وہ عالم ملکوت ہے اور عالم جبروت ان دونوں کے درمیان ہے یعنی ہر دو عالموں میں سے کچھ کچھ لیے ہوئے ہے محسوس بھی اور معقول بھی۔

تیسری تعریف

ایک اور قول یہ ہے کہ عالم جبروت میں اسماء ہیں اور عالم ملکوت میں صفات کیونکہ صفات اسماء اور افعال میں تصرف کرنے کا ذریعہ ہیں جیسے لطف اور قہر جو لطیف اور ملطوف اور قہار اور مقہور کے درمیان واسطہ ہیں۔ واللہ اعلم۔

ایک اور تشریح

نیز فرمایا کہ "ریاض الملکوت" میں ریاض کا لفظ وہی معنی دیتا ہے جو محاسن کا لفظ محاسن الملکوت میں دیتا ہے اور ملکوت عالمِ عُلوی کو کہتے ہیں مگر یہاں اس سے مراد لوحِ محفوظ مع قلم، برزخ اور عرش کے لیے ہے اس لیے کہ لوحِ محفوظ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم، انبیاء، اولیاء، صلحاء اور تمام مومنین کے نام درج ہیں اور لوحِ محفوظ کے الفاظ سے نور چمکتا ہے یہ نور ان ناموں والوں کے اپنے اپنے مرتبہ کے مطابق نکلتا ہے۔ لوح محفوظ میں حروف اسماء سے متعلق جو انوار ہیں ان میں بہت ہی اختلاف پایا جاتا ہے اسی طرح ان انوار میں بھی بہت

سخت اختلاف پایا جاتا ہے جو قلم سے نکلتے ہیں۔ رہا برزخ سو جو انوار اس سے نکلتے ہیں۔ ان کے رنگوں کا کوئی شمار ہی نہیں کر سکتا۔ یہ انوار انبیاء، اولیاء، صلحاء اور مومنین کی روحوں کے انوار ہیں یہی حال عرش کے انوار کا ہے کہ اس میں سے بھی اہلِ جنّت کے اختلاف مراتب کے مطابق مختلف قسم کے نور نکلتے ہیں چنانچہ ہر منزل کا ایک خاص نور ہے۔ لہٰذا جب ان تمام اشیاء کے انوار مختلف ٹھہرے تو باغات کے ساتھ ان کو تشبیہ دینا جہاں مختلف قسم کے پھول ہوتے ہیں، ایک عمدہ تشبیہ ہے۔ اسی لیے "ریاض الملکوت" فرمایا ہے۔

مزید براں چونکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا نور مذکورہ بالا اشیاء میں پایا جاتا ہے اس لیے کہ آپ کا اسم مبارک لوحِ محفوظ میں لکھا ہوا ہے نیز آپ کے نور کی چمک اسرارِ قلم میں بھی پائی جاتی ہے اور برزخ میں آپ کی روحِ مطہرہ کا ایک خاص مقام ہے اور جنت میں آپ کے مقام سے بالا کوئی مقام نہیں ہے لہٰذا لازم آیا کہ آنحضرتؐ کا نور ان تمام مذکورہ بالا اشیاء میں موجود ہے اور آپ کے نور کی بدولت انہیں حسن و خوبی اور عجیب قسم کی رونق حاصل ہوئی ہے جس کی وجہ سے زُھرِ جماله (آپ کے جمال کے پھول) کا لفظ استعمال کیا۔

اَللّٰهُمَّ اَلْحِقْنِی بِنَسَبِهٖ وَ حَقِّقْنِی بِحَسَبِهٖ کی تشریح

حضرت عبدالسلام بن مشیش کے قول اَللّٰهُمَّ اَلْحِقْنِی بِنَسَبِهٖ وَحَقِّقْنِی بِحَسَبِهٖ کی تشریح فرماتے ہوئے حضرت نے فرمایا کہ نسب سے مراد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے باطن کا وہ مشاہدہ ہے جسے حاصل کرنے کی کسی اور میں طاقت نہیں ہے۔ حضرت عبدالسلام ایک جامع قطب تھے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے کامل وارث تھے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے مشاہدہ سے فیض یاب ہوتے تھے۔

نیز فرمایا کہ حَسَب سے مراد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی صفات ہیں مثلاً رحمت، علم، حلم اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے دیگر اخلاق پاک اور چونکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا مشاہدہ حاصل کرنے کی کسی میں طاقت نہیں اس لیے وہاں "اَلْحِقْنِی" کا لفظ کہا (یعنی مجھے اس کے قریب پہنچا دے) اور صفات کے لیے حَقِّقْنِی کہا کہ صفات کا حاصل کرنا کسی قدر ممکن ہے۔

اس کے بعد حضرت نے فرمایا: خبردار یہ ہرگز خیال نہ کرنا کہ پیر کی حریتِ نظر اس کا ارادہ اور انتہائی عزم آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ شریفہ کو چھوڑ کر کسی اور چیز کی طرف ہوتا ہے مثلاً کشف یا تصرف یا ولایت بلکہ شیخ کی توجہ محض ذاتِ نبوی کی طرف ہوتی ہے۔

دوسری تشریح

ایک اور بار فرمایا کہ نسب سے مراد جہد و قوت ہے اور حسب سے مراد وہ بارگراں ہے جس کے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم متحمل ہوئے۔ اس کی آپ نے یوں مثال دی کہ ایک شخص کے لاتعداد اونٹ ہوں اور کچھ مدت تک ان کی نسل بڑھتی رہے اور وہ شخص نہایت عمدہ اور خوبصورت لباس بناتا رہے پھر دیکھے کہ ان اونٹوں میں سے ان تمام کے اٹھانے کی کسی اونٹ میں طاقت ہے یا نہیں تو ان میں سے صرف ایک اونٹ ایسا نظر آیا جس پر وہ تمام بار لاد دیا جائے اور وہ اسے بغیر مشقت اٹھالے۔ واللہ اعلم۔

لَيْسَ مِنَ الْكَرَمِ اَنْ لَا تُحْسِنَ اِلَّا لِمَنْ اَحْسَنَ اِلَيْكَ

حضرت نے شیخ ابوالحسنؒ شاذلی کے قول لَيْسَ مِنَ الْكَرَمِ اَنْ لَا تُحْسِنَ اِلَّا لِمَنْ اَحْسَنَ اِلَيْكَ (یہ بھی کوئی کرم ہے کہ صرف احسان کرنے والوں سے احسان کیا جائے) کی تشریح یوں فرمائی کہ شیخ ابوالحسن شاذلی نے یہ الفاظ اس وقت فرمائے جب آپ نے اللہ تعالیٰ کی وسیع رحمت کا مشاہدہ کیا۔ لہٰذا جب روح نے یہ مشاہدہ کیا تو ذات کی کمزوری کی وجہ سے اس سے بے ساختہ یہ الفاظ نکل گئے اور اس نے جیسا کہ ادب ملحوظ رکھنا چاہیئے تھا، نہیں رکھا۔ اس کی مثال ایسی ہے جیسے کوئی جانتا ہو کہ نوحہ و واویلا کرنا منع ہے مگر پھر اس کی حرمت کو جانتے ہوئے اپنی کمزوری کی وجہ سے جب کوئی مصیبت نازل ہوجائے تو اس کا مرتکب ہو۔

شیخ شاذلیؒ کے یہ الفاظ حزب کبیر[1] میں پائے جاتے ہیں اور لوگوں کو ان کے سمجھنے میں مشکل پیش آتی ہے یہاں تک کہ شیخ ابنِ عبّادؒ[2] نے الفاظ کو ساقط کردینے کا حکم دیا ہے مگر شاذلیؒ کے الفاظ بدلنے کی کسی کو اجازت نہیں اس لیے کہ وہ تو نورِ ولایت سے ان امور کا مشاہدہ کرتے ہیں جن کا دوسرے مشاہدہ نہیں کرسکتے۔

---

[1] حزب کبیر: مختلف بزرگوں نے حزب لکھی ہے چنانچہ ابوالحسنؒ شاذلی کی ایک حزب کا نام حزب کبیر ہے جس میں مناجات دعا وغیرہ ہے ان کی ایک حزب حزب البحر کے نام سے مشہور ہے جسے حزب صغیر بھی کہتے ہیں اس کا اکثر لوگ ورد کرتے ہیں اور کہا جاتا ہے کہ اس میں اسم اعظم ہے (کشف الظنون ج ۱ ص ۲۲۳)

[2] ابن عبّاد: محمد بن ابراہیم بن عباد النفری الرمذی الشاذلی انہوں نے شیخ تاج الدین ابوالفضل احمد بن محمد بن عبدالکریم المعروف عطاءاللہ الاسکندرانی شاذلی متوفی ۹۰۱ھ کی الحکم العطائیہ کی شرح کی اور اس کا نام غیث المواہب العلیہ رکھا (کشف الظنون ج ۱ : ص ۲۲۳)

ابن فارض کے شعر کی تشریح

ہم نے حضرت سے ابن فارض[1] کے اس شعر کی تشریح پوچھی:

شَرِبْنَا عَلٰی ذِکْرِ الْحَبِیْبِ مُدَامَۃً سَکِرْنَا بِھَا مِنْ قَبْلِ اَنْ یُخْلَقَ الْکَرْمُ

ترجمہ: ہم نے محبوب کے ذکر کی شراب پی اور ہم اس وقت سے مست ہو چکے ہیں کہ ابھی انگور کی بیل پیدا ہی نہ ہوئی تھی۔

حضرت نے فرمایا یہ عالم ارواح کی طرف اشارہ ہے اور حبیب سے مراد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ہیں اس دنیا میں آپ کا ذکر مشاہدۂ تامہ حاصل کرنے کا سبب ہے لہٰذا روح اس مشاہدہ کی بدولت ایک حالت سے دوسری حالت میں منتقل ہو جاتی ہے اور ایسی حالت میں اس کی تمام عادات اور معارف میں تبدیلی واقع ہو جاتی ہے جس سے اسے انوار کے اندر گھس جانے اور اغیار سے منقطع ہو جانے کی بہت بڑی طاقت ہو جاتی ہے اور پہلی حالت سے اس کا تعلق اس طرح منقطع ہو جاتا ہے جیسے کہ وہ اسے کبھی جانتا بھی نہ تھا، اسی لیے اس مشاہدہ کی "مدامۃ" (شراب) سے تشبیہ تین وجہ سے اچھی معلوم ہوتی ہے اول اس لیے کہ شراب ایک حالت سے دوسری حالت کی طرف منتقل ہونے کا سبب بنتی ہے۔ یہی حال مشاہدہ کا ہے۔ دوسری یہ کہ شراب پہلی حالت سے منقطع ہونے کا سبب بنتی ہے اور مشاہدہ میں بھی یہی بات پائی جاتی ہے۔ تیسری یہ کہ شراب کی وجہ سے انسان شجاع اور دلیر بن جاتا ہے اس لیے کہ جب کسی کے سر میں شراب چڑھ جاتی ہے تو اس کی نگاہ میں ہر چیز حقیر معلوم ہونے لگ جاتی ہے اسی طرح مشاہدہ میں بھی صاحب مشاہدہ تمام انوار کی طرف قدم اٹھانے ان میں داخل ہونے اور اغیار کو ترک کرنے کی جرأت کرتا ہے۔

شَرِبْنَا عَلٰی ذِکْرِ الْحَبِیْبِ مُدَامَۃً

کا یہی مطلب ہے کہ حق سبحانہٗ کے مشاہدہ میں ہم نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ذکر کی جرأت کی اور سَکِرْنَا بِھَا کا مطلب یہ ہے کہ غیر اللہ سے منقطع ہو کر اللہ ہی کے ہو لیے ہیں اور مِنْ قَبْلِ اَنْ یُخْلَقَ الْکَرْمُ کا مطلب یہ ہے کہ یہ تو عالم ارواح کی بات ہے اور کرم عالم اشباح میں پیدا ہوئی۔ پھر مشاہدہ جس سے روح آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ذکر کی وجہ سے سیراب ہوتی ہے، قائم رہتا ہے یہاں تک کہ

---

[1] ابن الفارضؒ: شرف الدین عمر بن الفارض عربی زبان کے واحد صوفی شاعر ہیں۔ انکی پیدائش قاہرہ میں ۵۷۶ھ ۱۱۸۱ء میں ہوئی اور وہیں ۶۳۳ھ ۱۲۳۵ء میں وفات پائی۔ ان کے دیوان کو ان کے پوتے علی نے شائع کیا۔ ان کے اشعار ان کے صوفیانہ خیالات سے لبریز ہونے کی وجہ سے بہت دقیق ہیں۔

ذات کے اندر گھس جاتا ہے اور ذات کے مشبہات میں لگے رہنے کی وجہ سے اسے غفلت حاصل ہوتی ہے پس جب کوئی شخص حبیب کا ذکر کرنے لگتا ہے اور دوسروں کو بھی اس کا ذکر کرتے ہوئے سنتا ہے تو وہ مشاہدہ جو روح کے اندر ہوتا ہے ذات کے اندر آہستہ آہستہ گھسنا شروع ہو جاتا ہے یہاں تک کہ ذات کو وہی تین امور حاصل ہو جاتے ہیں جو روح کو حاصل ہوئے تھے اور وہ ایک حالت سے دوسری حالت میں منتقل ہو کر پہلی حالت سے منقطع ہو جاتی ہے۔ پھر اس کا غیر اللہ سے تعلق کٹ جاتا ہے اور حق سبحانہٗ سے تعلق ہو جاتا ہے۔ واللہ اعلم۔

حضرت نے فرمایا: مجھے اس ولی پر تعجب آتا ہے جو یہ کہتا ہے کہ میں کون و مکاں میں سمایا ہوں اس لیے کہ کون و مکاں میں دخول ایک دروازہ کے ذریعہ سے ہوتا ہے اور وہ دروازہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ہیں اور کسی مخلوق میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا نور برداشت کرنے کی طاقت نہیں اور جب باب ہی کی طاقت نہیں تو آگے کی بات ہی کیا۔ البتہ اگر دروازہ سے داخل نہ ہوا ہو یعنی اس کی فتح شیطانی ہو تو ایسا شخص تو ایک کمرہ کو پُر نہیں کر سکتا چہ جائے کہ گھر یا کسی اور چیز کو۔

یاد رکھیں کہ تمام کائنات کا نور مثلاً عرش، فرش، سمٰوٰت، ارضین، جنات، حجُب وغیرہ سب مل کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے نور کا ایک جزو حاصل کر سکے ہیں اور اگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا سارا نور عرش پر رکھا جائے تو وہ ریزہ ریزہ ہو جائیں اور اگر تمام مخلوقات بھی اکٹھی ہو جائے اور اس پر یہ نور رکھا جائے تو وہ بھی ریزہ ریزہ ہو جائے جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے نور کی یہ شان ٹھہری تو کوئی یہ کیسے کہہ سکتا ہے کہ وہ کون کو پُر کر سکتا ہے۔ مدینہ منورہ اور قبر شریف کے قریب پہنچ کر اس شخص کی ذات کہاں ہوگی یا برزخ کی طرف چڑھ کر جب اس جگہ کے قریب پہنچے گی جہاں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی روح کا نور ہے تو اس وقت اس کی کیا حالت ہو گی۔ کیا اس کی ذات اس نور کی حامل ہو گی حالانکہ تمام مخلوق اس کے حامل ہونے سے عاجز ہے یا اس جگہ کو چھوڑ کر آگے نکل جائیگی اور کون کو پر نہ کر سکے گی۔ ہو سکتا ہے کہ کون سے اس شخص کی مراد آسمان و زمین کے درمیان کی تمام فضا ہو ماسوا برزخ کی جگہ کے جہاں نورِ معظم ہے۔

میں نے عرض کیا کہ ہو سکتا ہے کہ وہ کون کو اپنی ذات سے نہیں بلکہ اپنے نور سے بھر سکتا ہو جیسے کہ سورج آسمان اور زمین پر اپنی روشنی پھیلاتا ہے۔

حضرت نے فرمایا: اس کی مراد تو یہی ہے کہ وہ اسے اپنے نور سے بھرتا ہے یہ نہیں کہ وہ اسے اپنی ذات سے بھرتا ہے مگر کجا اس کا نور اور کجا نورِ مصطفویؐ۔ اس لیے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے نور کے

مقابلہ میں اس کا نور ایسا ہے جیسے دوپہر کے وقت ایک بتی۔ کیا یہ کہنا درست ہوگا کہ اس بتی نے نورِ شمس کو ماند کر دیا ہے؟

میں نے عرض کیا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے نور کے مقابلہ میں نورِ شمس ایسا ہے جیسے ایک بتی مگر پھر بھی وہ دنیا پر پھیلا ہوتا ہے۔

حضرت نے فرمایا: سورج کے نور کا کون کو بھرنے سے یہ مراد نہیں کہ نورِ مکرم اس کی وجہ سے غایب یا ماند پڑ گیا ہے اور یہ ہو بھی کیسے سکتا ہے جبکہ نورِ شمس ارواحِ مومنین کے نور سے اخذ کیا گیا اور ارواحِ مومنین کا نور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے نور کے مقابلہ میں ایسا ہی ہوگا جیسے دوپہر کے وقت بتی اور سورج وغیرہ کا نور بھی اسی بتی کی طرح معلوم ہوگا جو دوپہر کو جل رہی ہو۔

حضرت نے فرمایا کہ میں نے صبح کی نماز سے لے کر چاشت تک انتہائی کوشش کی کہ دیکھوں کہ کیا "باب" کو برداشت کرنے کی طاقت رکھ سکتا ہوں مگر نہ رکھ سکا اور اسے اپنے لیے نہایت مشکل پایا۔ واللہ الموفق۔

میں نے حضرتؒ سے اس حکایت کے متعلق دریافت کیا کہ ایک شخص سمندر میں اترا اور پھر ایک گھنٹے کے بعد نکل آیا۔ اس کا ساتھی جو کنارے پر اس کا انتظار کر رہا تھا، اسے کہنے لگا تو نے اس قدر دیر کر دی کہ مجھے ڈر ہوا کہیں جمعہ کی نماز نہ جاتی رہے۔ غوطہ زن نے جواب دیا کہ میں تو مصر سے آیا ہوں اور وہاں اتنے مہینے رہا ہوں، میں نے وہاں شادی کی اور میرا بیٹا بھی وہاں ہے۔ میں نے عرض کیا کہ یہ کیسے ممکن ہو سکتا ہے کیونکہ ان دونوں پر درحقیقت ایک ہی وقت گزرا تھا لہٰذا یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ ایک کے لیے تو وہ ایک گھڑی ہو اور دوسرے کے لیے کئی مہینے۔ کیونکہ سورج سے تو گھنٹے اور مہینے ایک ہی طرح کے بنتے ہیں۔ اگر یہ غوطہ زن کے لیے کئی ماہ کا وقت ہو تو اہلِ مصر کے لیے کیسا ہوگا۔ اگر وہاں بھی کئی ماہ کا وقت ہو، یہاں تک کہ اس نے وہاں شادی بھی کی اور اس کے ہاں اولاد بھی ہوئی تو یہ ایک محال بات ہوگی کیونکہ اہلِ مصر اور دجلہ کے طلوع و غروب میں اس حد تک اختلاف نہیں ہو سکتا۔ لہٰذا جب یہ وقت اہلِ مصر کے لیے بھی ایک گھڑی ہو تو کیسے ممکن ہو سکتا ہے کہ اس نے اس قلیل مدت کے اندر شادی بھی کر لی ہو اور اس کے ہاں بچہ بھی پیدا ہو گیا ہو، اولیاء اللہ

ا؎ امام شعرانیؒ نے لواقح الانوار ج ۲ صفحہ ۷۷ پر ابراہیمؒ متبولی کے حالات میں جمال الدینؒ یوسف کا اسی قسم کا واقعہ دیا ہے۔ پھر لکھا ہے کہ قصہ ذوالنونؒ مصری کے مسائل میں ہیں اور یہ قصہ بعینہٖ اسی قسم کا ہے جو جوہری کے ساتھ پیش آیا تھا اور پھر مختصر طور پر یہی قصہ بیان کیا ہے جو کتاب میں دیا ہے۔

کی اس کرامت کا حل ہمیں سمجھ میں نہیں آتا۔ مزید براں طیِ زمان طیِ مکان کی طرح نہیں ہے۔ طی زمان میں تو مذکورہ بالا محال لازم آتا ہے مگر طی مکان کی کرامت میں کوئی محال بات نہیں ہوتی، حالانکہ اس حکایت کو کئی ایک لوگوں نے نقل کیا ہے۔ بعض لوگوں نے اس کا استدلال روزِ قیامت سے کیا ہے کہ اس کی مقدار ہزار سال ہوگی مگر مومنین کے لیے روزِ قیامت ایک گھڑی کے برابر ہوگا لیکن یہ استدلال درست نہیں۔ اس لیے کہ روزِ قیامت کی لمبائی کے متعلق کہا جاتا ہے کہ لمبائی اس روز کی سختی کی وجہ سے معلوم دے گی نہ کہ درحقیقت وہ دن اتنا لمبا ہوگا اور میرا غالب گمان ہے کہ ابنِ حجرؒ نے فتح الباری میں بھی اسی پر اکتفا کیا ہے۔ واللہ اعلم۔

حضرت نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کو کوئی چیز عاجز نہیں کر سکتی، اللہ تعالیٰ اس بات پر قادر ہے کہ وہ صاحبِ حکایت کے لیے جب کہ وہ سمندر میں ہو ایک اور زمانہ اور ایک قوم بنا دے اور وہ سمندر کو باوجود اس کے اندر ہونے کے نہ دیکھ سکے جیسے کہ اللہ تعالیٰ نے لوگوں کو باوجود اس کے کہ وہ ہمیشہ فرشتوں کے پاس ہوتے ہیں، ان کا مشاہدہ کرنے سے روک رکھا ہے لہٰذا جب وہ سمندر کے مشاہدہ سے حجاب میں آگیا تو اسے اس زمانہ اور اس قوم کا مشاہدہ ہو گیا پھر اس قوم کو اہلِ مصر وغیرہ کی صورت میں پیش کر دیا۔ تاکہ اس حکایت کا مقصد پورا ہو جائے اس کے بعد اللہ تعالیٰ اس قوم اور اس زمانہ دونوں کو فنا کر دیتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اس قسم کا واقعہ کسی حکمت کی بنا پر صاحبِ حکایت کے در پیش کیا ہے۔

میں نے عرض کیا: جناب نے سچ فرمایا: اس لیے کہ لوگ کہتے ہیں کہ یہ شخص باوجود اس کے کہ اس کی نشست و برخاست کثرت سے درویشوں کے ساتھ تھی، پھر بھی ان کی کرامات کا انکار کیا کرتا تھا۔

حضرت نے فرمایا: میں نے اس سے بھی عجیب تر واقعہ دیکھا ہے کہ میں نے ایک شخص دیکھا کہ چاشت کے وقت وہ ناکتخدا تھا، لیکن جب ظہر کے وقت واپس آیا تو دیکھا کہ وہ شخص مر چکا ہے اور اس کے بیٹے نے اس کے پیشہ میں اس کی جگہ لے لی ہے۔ مزید براں بیٹا بالغ بھی ہو چکا ہے حالانکہ چاشت کے وقت تک اس کے باپ کی شادی بھی نہ ہوئی تھی پھر شادی ہوئی، اولاد ہوئی اور ظہر سے پہلے پہلے بالغ بھی ہو گئی۔

میں نے دریافت کیا یہ لوگ جنوں میں سے ہیں یا انسانوں میں سے۔

فرمایا: نہ جنوں میں سے ہیں نہ انسانوں میں سے، اللہ کی مخلوق کا شمار نہیں ہو سکتا وَمَا یَعْلَمُ جُنُوْدَ رَبِّكَ اِلَّا هُوَ اور تیرے رب کی فوج کا سوائے خود اس کے کسی کو علم نہیں۔

پھر فرمایا کہ ۱۱۱۱ھ میں میری والدہ کی وفات کے بعد ایک عجیب واقعہ مجھ سے پیش آیا کہ میرے والد نے ایک اور عورت سے شادی کرلی اور ایک لونڈی بھی رکھ لی۔ اس لونڈی نے مجھے مارا۔ میں نے کہا کون کونسا غم برداشت کروں، لونڈی کا یا اس عورت کا۔ اس پر وہ اور بھی بگڑ گئی اس کے بعد ایک سال گزر گیا اور اللہ تعالیٰ نے مجھے میری وفات تک جو واقعات مجھ سے پیش آنے والے تھے سب دکھا دیے۔ چنانچہ میں نے ان اولیاء کو دیکھا جن سے میری ملاقات ہونے والی تھی۔ اس عورت کو دیکھا جس سے میری شادی ہونے والی تھی، پھر کچھ مدت گزرنے کے بعد بیٹے عمر کی ولادت کو دیکھا جس کا میں نے عقیقہ کیا۔ پھر عمر کی ولادت کے بعد بیٹے ادریس کی ولادت تک جو کچھ ہونے والا تھا۔ اس کا عقیقہ کرنا پھر وہ واقعات دیکھے جو بیٹی فاطمہ کی ولادت تک ہونے والے تھے۔ اس کے بعد وہ فتح بھی دیکھی جو مجھے فاطمہ کی ولادت کے بعد عطا ہوئی اسی طرح تمام وہ امور دیکھے جنہیں میں نے بعد میں حاصل کیا ان میں سے کوئی ایک چیز بھی مجھ سے غائب نہ تھی اور یہ سب کچھ ایک گھنٹہ کے اندر اندر ہوا اور میں سویا ہوا بھی نہ تھا کہ اسے خواب کہا جائے۔

مولف کہتا ہے کہ یہ مشاہدہ روح کو حاصل ہوا تھا جیسا کہ خود حضرت نے ایک مرتبہ فرمایا تھا کہ جب بچہ ماں کے پیٹ سے نکلتا ہے، عارفِ کامل اس وقت کی حالت سے لے کر اس کی آخری عمر تک کی حالت کے تمام واقعات کو دیکھ لیتا ہے چنانچہ اگر کوئی اس مشاہدہ کو تحریر میں لے آئے اور اس تحریر کو اپنے پاس رکھ چھوڑے، پھر جو کچھ اس کو پیش آتا جائے اس سے مقابلہ کرے تو اس میں قطعاً کوئی فرق نہ پائے گا۔ واللہ اعلم۔

اس قسم کی مخلوقات کی پیدائش کے متعلق حضرت نے فرمایا کہ ایک عارف ایک مقام سے گزرا، اس کے دل میں خواہش پیدا ہوئی کہ یہاں شہر ہو جس میں اللہ کی عبادت ہوتی ہو۔ اس پر اللہ تعالیٰ نے فرشتوں کو حکم دیا چنانچہ وہ انسانی صورت میں وہاں اترے۔ شہر کو حکم دیا تو وہ موجود ہوگیا۔ اس کے بعد عارف کا ادھر سے گزر ہوا تو اس نے شہر اور شہر والوں کو اللہ کی عبادت کرتے ہوئے پایا۔ عارف نے اللہ کی تعریف کی۔ اس عارف کی وفات تک وہ شہر قائم رہا اور وہاں کے باشندے اللہ کی عبادت کرتے رہے، مگر جب وہ مرگیا تو ہر چیز اپنی اصل کی طرف لوٹ گئی۔ فرشتے اپنے اپنے مرکز کو لوٹے اور شہر ایسا معدوم ہوا گویا کہ وہاں کبھی کوئی آباد نہ تھا۔

کسی شخص نے حضرت حاتمیؒ کا کلام حضرت سے ذکر کیا تو آپ نے اسی قسم کا جواب دیا کہ حاتمی نے اپنے کسی مشاہدہ کے متعلق فرمایا ہے کہ انھوں نے جنّت کو فلاں مقام میں دیکھا ہے یعنی جنت کی اپنی جگہ پر نہیں،

کسی اور جگہ پر۔

حضرت نے جواب دیا کہ عارف کے نزدیک جس مقام میں اسے مشاہدہ حاصل ہوتا ہے، اس سے اعلیٰ و افضل کوئی اور مکان یا زمان نہیں ہوتا۔ اللہ تعالیٰ اس مشاہدہ کو برقرار رکھنے کے لیے اس جہت میں جنت پیدا کر دیتے ہیں تو وہ یہ سمجھ لیتا ہے کہ اس نے جنت کو دیکھا ہے حالانکہ یہ کوئی اور ہی چیز ہوتی ہے جو اس کے ثواب کی خاطر پیدا کر دی گئی ہوتی ہے۔ جس شخص نے حضرت سے ابن عربی کا کلام بیان کیا تھا اس نے جب یہ جواب سنا تو خوشی سے اچھلنے لگا۔ واللہ اعلم۔

حضرت نے اس شخص کی نگاہ میں اس تمام مخلوق کی پیدائش کو یوں بیان فرماتے ہوئے کہا کہ یہ ہوا جو میرے اور تمہارے درمیان ہے، اسے دیکھو۔ میں نے عرض کیا کہ میں نے دیکھ لیا۔ پھر اس میں سے ایک انگلی کے برابر کی جگہ کی طرف اشارہ فرمایا اور کہا کہ اللہ تعالیٰ اس مقدار کو حکم کر کے اس قدر وسیع بنا سکتا ہے کہ یہ میرے اور تمہارے درمیان کی تمام ہوا کی برابر ہو جاتے پھر اللہ اس میں مختلف رنگ پیدا کر دے، مثلاً زرد، سرخ، سبز اور سیاہ اور پہلی ہوا کو اس دوسری ہوا سے حجاب میں ڈال دے پھر پہلی ہوا کا ایک جزو لے کر اسے بھی پہلی ہوا سے محجوب کر کے دوسری ہوا کے اندر داخل کر دے اور اسے اس کے تمام عجائب اور رنگ وغیرہ دکھائے۔ پھر اس جزو کو دوبارہ پہلی ہوا میں لوٹا کر پہلی ہوا کو ناپید کر دے

پھر فرمایا، کیا اللہ تعالیٰ اس پر بلکہ اس سے بھی زیادہ پر قادر نہیں ؟

میں نے عرض کیا کیوں نہیں وہ تو ہر شئ پر قادر ہے۔ واللہ اعلم۔

امام غزالی کے ایک قول پر بحث !

میں نے دریافت کیا کہ امام غزالی جو الاحیاء کے مصنف ہیں، کتاب التفکر میں تحریر فرماتے ہیں کہ حضرت جبرئیل آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے زیادہ عالم تھے۔

جبرئیل آنحضرت سے زیادہ عالم نہ تھے !

حضرت نے فرمایا کہ حضرت جبرئیل ایک لاکھ سال، پھر ایک لاکھ سال، یہاں تک کہ لاانتہا سال تک زندہ رہیں تب بھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی چوتھائی برابر معرفت نہیں حاصل کر سکتے اور نہ ہی اللہ تعالیٰ کے متعلق ان کے علم کے برابر ان کا علم ہو سکتا ہے۔ حضرت جبرئیل آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے زیادہ علم والے کیسے ہو سکتے ہیں جبکہ ان کی پیدائش ہی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے نور سے ہوئی ہے اور وہ اور تمام ملائکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے نور کا ایک جزو ہیں اور تمام ملائکہ اور مخلوقات کو معرفت کا فیضان آنحضرت سے حاصل ہوتا ہے۔ پھر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کے محبوب ہوتے ہوتے اپنے

حبیب اللہ تعالیٰ کے ساتھ اس مقام پر تھے جہاں نہ جبرئیل تھے۔ نہ کوئی اور اس وقت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے رب سے وہ انعامات حاصل کیے جو صاحب عظمت و جلال والے رب کی طرف سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جیسے حبیب کے لائق و مناسب ہو سکتے تھے اس کے بہت ہی عرصہ بعد اللہ تعالیٰ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے نور سے جبرئیل و دیگر ملائکہ کو پیدا کیا۔

حضرت نے فرمایا کہ خود جبرئیل تمام ملائکہ اور تمام صاحب فتح اولیاء اللہ یہاں تک کہ جنوں کو بھی معلوم ہے کہ جبرئیل علیہ السلام کو معرفت وغیرہ میں جو مقامات حاصل ہوتے وہ تمام آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی برکت سے حاصل ہوتے۔ چنانچہ جبرئیل آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت حاصل کیے بغیر اگر عمر بھر ان مقامات کو حاصل کرنے کی کوشش کرتے رہتے تو ان میں سے ایک مقام بھی حاصل نہ کر سکتے لہٰذا جو نفع جبرئیل کو پہنچا ہے اس کا علم یا خود جبرئیل کو ہے یا صاحب فتح اولیاء اللہ کو ہے۔

پھر فرمایا کہ حضرت جبرئیل تو صرف آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت کے لیے پیدا کئے گئے تھے تاکہ وہ آپ کی ذات کے محافظین میں سے ہوں اس لیے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم تمام موجودات میں سے سرّ اللہ ہیں اور تمام موجودات آپ کی ذات میں سے مستفیض ہوتی ہیں۔ اس لیے آپ کو ان کے مشاہدہ کی ضرورت پڑتی ہے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا جسم دیگر اجسام کی طرح مٹی سے پیدا ہوا ہے اور یہ اپنے ہم شکلوں کے سوا دوسروں سے مانوس نہیں ہوتا لہٰذا جب آنحضرت غیر جنس کی اشیاء کا مشاہدہ فرماتے ہیں تو جبرئیل آپ کو اس سے مانوس کر دیتے ہیں۔

پھر فرمایا کہ فرشتوں کی صورتوں کو دیکھ کر ان اجسام کو دہشت طاری ہو جاتی ہے کیونکہ ان کی شکل غیر معروف اور ان کے کئی ہاتھ کئی پاؤں اور کئی چہرے ہوتے ہیں۔ مزید برآں ان کا پھیلاؤ اسقدر ہوتا ہے کہ تمام دنیا کو پُر کئے ہوتا ہے۔

پھر فرمایا کہ اس کا علم صرف صاحب فتح کو ہوتا ہے اور جبرئیل بھی صرف آپ کی ذاتِ ترابیہ کے محافظ تھے، لیکن آپ کی روح کو چونکہ ان تمام صُوَر کا علم ہے اس لیے وہ کسی سے نہیں ڈرتی۔

میں نے عرض کیا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی روح مبارک محافظ کا کام کیوں نہیں کر لیتی؟

فرمایا: اس کی وجہ یہ ہے کہ ذات روح کو اپنے سے جدا نہیں سمجھتی اور وحدانیت اللہ کی ذات کے سوا کہیں بھی برقرار نہیں رہ سکتی۔ اللہ کے سوا ہر چیز کا جوڑا ہے اپنے جوڑے کو پسند کرتی ہے اور اسی کی طرف مائل ہوئی ہے۔

نیز فرمایا کہ جبرئیل آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے محافظ صرف انہی امور میں ہیں جو ان کی قدرت

کے اندر ہیں اور سدرۃ المنتہیٰ کے نیچے کے ان امور میں جن کا علم انہیں ہے مگر سدرۃ المنتہیٰ کے اوپر جو ستر حجاب اور ملائکہ ہیں، ان میں جبرئیل آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا انیس نہیں ہو سکتا اس لیے کہ سدرہ کے اوپر کے احوال کا مشاہدہ ان کے انوار کی قوت کے سبب جبرئیل کی طاقت سے باہر ہے یہی وجہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے (شب معراج) حجابوں کو اکیلے طے کیا اور جبرئیل ساتھ نہ گئے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جبرئیل کو ساتھ چلنے کو کہا بھی مگر جبرئیل نے کہا کہ مجھ میں طاقت نہیں۔ آپ کو چونکہ اللہ نے اس کی قوت عطا کی ہے اس لیے آپ یہ کر سکتے ہیں۔

اس کے بعد میں نے حضرت سے وحی کے بارے میں اور اس بات کے متعلق کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے وحی کیسے حاصل کی، سوال کیا، آپ نے جبرئیل کی وساطت سے وحی حاصل کی جیسا کہ بہت سی آیتوں سے ظاہر ہے، یا بغیر واسطہ کے، اس پر آپ نے ایسا جواب دیا جو احاطۂ عقل سے باہر ہے اس لیے اس کا تحریر کرنا مناسب نہیں۔ واللہ اعلم۔

نمازِ عید میں پہلی رکعت میں سات بار اور دوسری میں چھ بار کیوں تکبیر کہی جاتی ہے

میں نے حضرت سے دریافت کیا کہ نماز عید میں پہلی رکعت میں کیوں سات بار اور دوسری رکعت میں چھ بار تکبیر کہتے ہیں اور میں نے[1] اس کے متعلق فقہاء کے اقوال بھی بیان کئے۔

حضرت نے جواب دیا کہ تکبیر کہنے والا بالخصوص آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پہلی رکعت میں پہلی زمین پہلے آسمان کی تمام موجودات اور ان تمام کے پیدا کرنے والے کا مشاہدہ کر لیتا ہے اسی طرح ساتوں تکبیروں سے وہ ساتوں زمینوں اور ساتوں آسمانوں اور حق تعالیٰ جو ان کا پیدا کرنے والا ہے، کے افعال کا مشاہدہ کر لیتا ہے۔ اس کے بعد دوسری رکعت میں پہلی تکبیر میں پہلے دن یعنی اتوار کو جو مخلوق پیدا ہوئی اس کا اور اس کے پیدا کرنے والے کا مشاہدہ کرتا ہے، علیٰ ہذا القیاس باقی پانچ تکبیروں میں باقی پانچ دنوں کی مخلوقات اور ان کے خالق کا مشاہدہ ہوتا ہے۔

میں نے عرض کیا کہ یہ مخلوقات جو ان چھ دنوں میں پیدا ہوئی کیا وہی مخلوقات ہے جو سات آسمانوں اور سات زمینوں میں پائی جاتی ہے؟

---

[1] امام مالک رحمہ اللہ کے نزدیک عیدین کی نماز میں پہلی رکعت میں سات تکبیریں اور دوسری میں چھ تکبیریں کہی جاتی ہیں۔ امام شافعی کے نزدیک پہلی میں سات اور دوسری میں پانچ مگر احناف کے ہاں چھ تکبیریں زائد ہیں۔ تین پہلی رکعت میں اور تین دوسری رکعت میں۔

فرمایا کہ جب بندہ ایام کو دیکھتا ہے تو اسے وہ اصل مخلوقات دکھائی دیتی ہے جو ابتدائے آفرینش کے وقت پیدا ہوئی تھی، لیکن جب اس کی نظر آسمانوں اور زمینوں کی طرف جاتی ہے تو اسے وہ مخلوقات دکھائی دیتی ہے جو روئے زمین اور روئے آسمان پر پائی جاتی ہے۔

میں نے عرض کیا: یہ سات تکبیریں تو ہر مکلّف پر فرض ہیں مگر ہر مکلف کو یہ مشاہدہ کہاں نصیب ہو سکتا ہے؟

فرمایا: ارباب فتح کے مشاہدہ میں تو کلام نہیں، اوروں کو چاہیئے کہ وہ اسے اپنی آنکھوں کے سامنے حاضر کریں خواہ اجمالی طور پر ہی کیوں نہ ہو اور اللہ تعالیٰ تو سخی اور کریم ہے لہٰذا اگر کوئی بندہ اس عید میں اور اس سے اگلی عید میں، پھر اس سے اگلی میں ان امور کو مستحضر کرے اور اپنے رب سے خوش ہو اور اس پر قائم رہے تو اللہ تعالیٰ اسے کبھی ناکام نہ کرے گا اور جب تک اللہ تعالیٰ ان تمام امور کا اسے مشاہدہ نہ کرائے گا اس کی روح جسم سے نہ نکلے گی۔ اس لیے کہ اللہ ہر بات پر قادر ہے اور یہ انقطاع بندہ کی طرف سے ہوتا ہے اللہ سبحانہٗ کی طرف سے نہیں ہوتا چنانچہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں۔ وَالَّذِيْنَ جَاهَدُوْا فِيْنَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا وَإِنَّ اللّٰهَ لَمَعَ الْمُحْسِنِيْنَ۔ (سورہ عنکبوت آیت ۶۹) جو لوگ ہماری طرف (آنے کی) کوشش کرتے ہیں ہم انہیں ضرور اپنی راہ دکھا دینگے اور اللہ اچھے کام کرنے والوں کے ساتھ ہیں۔

میں نے عرض کیا حضرت یوم نحر (قربانی کے دن) سے لیکر چوتھے دن تک پندرہ فرائض کے بعد جو تین تکبیریں کہی جاتی ہیں، ان کی تشریح فرمائیے۔

فرمایا: پہلی تکبیر میں انسانی وجود کا مشاہدہ ہوتا ہے، پہلے نطفہ کی صورت میں پھر علقہ (جما ہوا خون) اور پھر مُضْغَہ (گوشت کا لوتھڑا) کی صورت میں۔ دوسری تکبیر میں انسانی شکل کی تکمیل، حسنِ خلق، اس میں روح کا پھونکا جانا اور اس کا ایک اور خلق بن جانا دکھایا جاتا ہے فَتَبَارَكَ اللّٰهُ أَحْسَنُ الْخَالِقِيْنَ۔ اور تیسری تکبیر میں صورت کا خراب ہونا اور قبر میں اس کا دوبارہ مٹی بن جانا دکھایا جاتا ہے یہ امور اس لیے دکھائے جاتے ہیں کہ یہ اللہ تعالیٰ کی عجیب قدرت کے نمونے ہیں۔ صوفیہ کے نزدیک یہ تکبیر محض انہی مواقع کے لیے مخصوص نہیں جیسا کہ فقہاء نے بیان کیا ہے بلکہ صوفیا ہر نماز کے بعد مگر سلام سے پہلے یہ تکبیریں استعمال کرتے ہیں۔

حضرت نے فرمایا کہ جسے اللہ نے فتح نصیب کی ہو وہ ان احوال کو اپنی آنکھوں سے دیکھ لیتا ہے چنانچہ وہ اللہ کی ظاہر قدرت کے وہ مناظر دیکھتا ہے جن کی کیفیت بیان نہیں کی جا سکتی۔ اللہ تعالیٰ کی

مخلوقات میں اللہ کی قدرت کے عجیب وغریب کرشمے پائے جاتے ہیں۔ جب کسی صاحب فتح انسان کو ایسے امور پیش آتے ہیں جن سے فتح میں تغیر یا قبض وغیرہ پیدا ہو جاتی ہے تو ان عجائب قدرت کو دیکھ کر اسے وہ عبرت حاصل ہوتی ہے جس کا بیان نہیں ہو سکتا۔

نیز فرمایا کہ روئے زمین پر اس قدر عجائبات پائے جاتے ہیں کہ اگر دلائل و براہین کے طالب انہیں دیکھ لیں تو انہیں دلائل کی ضرورت ہی نہ رہے۔ پھر ان عجائب میں بعض امور ایسے ہیں کہ اگر بندہ ان کا مشاہدہ کرے تو بغیر دلیل کے وہ اللہ تعالیٰ کی وحدانیت کو سمجھ جائے۔ اس کے لیے یہ مشاہدہ ہی کافی ہوگا اور بعض ایسے امور ہیں کہ ان کے مشاہدہ سے بغیر کسی دلیل پیش کرنے کے اسے ان کے وجود کا علم ہو جائے گا۔ اسی طرح بعض ایسے امور ہیں کہ ان کے مشاہدہ سے بندہ کو جہنم کے وجود کا علم ہو جائے گا اور کسی دلیل کی ضرورت نہ ہوگی۔ واللہ اعلم۔

خُضْنَا بُحُوْرًا وَقَفَتِ الْاَنْبِیَاءُ بِسَوَاحِلِهَا کی تشریح

میں نے حضرت سے بایزیدؒ بسطامی کے اس قول کی تشریح پوچھی خُضْنَا بُحُوْرًا وَقَفَتِ الْاَنْبِیَاءُ بِسَوَاحِلِهَا (ہم تو ایسے سمندروں میں گھسے کہ انبیاء ان کے ساحلوں پر ہی کھڑے رہے)

حضرت نے فرمایا کہ نبوت کا بڑا مرتبہ اور بڑی قدر و منزلت ہے اور صاحب نبوت کریم، بلند مرتبہ والا ہوتا ہے کوئی اور اس حد کو نہیں پہنچ سکتا۔ کسی ولی کے لیے وہاں تک پہنچنا ممکن نہیں مگر بایزیدؒ بسطامی کو معلوم تھا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سیدالانبیاء والمرسلین اور تمام مخلوقات میں سے برگزیدہ انسان ہیں اور کبھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اپنا لباس اپنی امت کے کسی کامل انسان کو بطور رعایت دے دیتے ہیں جسے پہن کر اس کی وہی کیفیت ہو جاتی ہے جیسا کہ بایزیدؒ بسطامی نے ذکر کیا ہے مگر درحقیقت یہ کیفیت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب ہے اور وہی ان بحور میں گھسنے والے اور تمام

ؒ بایزیدؒ کے اسی قول کے متعلق استاذ علی ولدہ (۷۶۱ھ تا ۸۰۱ھ) سے بھی سوال کیا گیا تو فرمایا: انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام مکلف ہونے کے سمندر کو عبور کر کے سلامتی کے ساحل پر جا چکے ہیں اور وہاں پہنچ کر اس لیے ٹھہر گئے" تاکہ جو کوئی بھی بچ کر وہاں پہنچ جائے اسے سنبھال لیں۔ انہیں اللہ کی طرف سے اسی بات کا حکم دیا گیا ہے اور اسی لیے بھیجا بھی گیا ہے کیونکہ کشتی تو اسی روز غرق ہو گئی تھی جب آدم علیہ السلام نے شجر ممنوعہ کا پھل کھایا تھا۔ (لواقح الانوار: ۲: ۳۶)

اس تشریح کے مطابق معنی یہ ہوتے کہ انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام ان بحور کو عبور کر چکے ہیں اور پار جا کر سمندر کے تیراکوں کو حوصلہ دینے اور انہیں اپنی طرف بلانے کے لیے ان کی آمد کے منتظر ہو کر ساحل پر کھڑے ہیں۔

انبیاء کے سردار ہیں۔

کوئی ولی مقامِ نبوّت تک نہیں پہنچ سکتا

فرمایا بعض اولیار غلطی سے یہ سمجھ بیٹھے ہیں کہ عارف کبیر ولی کبھی معرفت میں مقامِ نبوّت تک پہنچ جاتا ہے۔ اگرچہ مرتبہ کے لحاظ سے وہاں تک نہیں پہنچ سکتا۔ فرمایا ان کا یہ خیال بالکل غلط ہے اور نفس الامر کے مخالف ہے درست بات یہی ہے کہ ولی خواہ معرفت میں کسی درجہ تک کیوں نہ پہنچ جائے، مقامِ نبوّت تک پہنچنا تو درکنار، اس کے قریب بھی نہیں پہنچ سکتا۔

لَیْسَ فِی الْاِمْکَانِ اَبْدَعُ مِمَّا کَانَ

میں نے حضرت سے امام غزالیؒ کے قول لَیْسَ فِی الْاِمْکَانِ اَبْدَعُ مِمَّا کَانَ (جو کچھ ہو چکا ہے اس سے زیادہ عجیب و غریب امور کا ہونا ناممکن ہے) کے متعلق دریافت کیا۔

حضرت نے فرمایا: کوئی شخص قدرتِ الٰہی کو محصور نہیں کر سکتا اور نہ حق سبحانہٗ کسی کام کے کرنے سے عاجز ہیں۔

(مؤلف کہتا ہے کہ) حضرت کا کلام معرفت سے بھرا ہوا ہے۔ میں نے کئی بار استخارہ کیا ہے کہ اس مسئلہ میں کچھ لکھوں تاکہ اوروں کو نصیحت حاصل ہو اوّل تو اس لیے کہ یہ عقیدہ کی بات ہے اور اسکے علاوہ یہ ضروریاتِ دین میں سے ہے، لیکن چونکہ اس مسئلہ میں بہت بحث ہو چکی ہے اور لوگوں نے اس کے مختلف جواب دیے ہیں اس لیے یہ ایک بہت ہی ادق نظریہ سمجھا جانے لگا ہے۔

چنانچہ[1] میں اللہ کی مدد سے کہتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

---

[1] اس مسئلہ میں امام غزالی رحمہ اللہ نے ایسے الفاظ استعمال کیے ہیں جن سے شرعی گرفت ہوتی ہے اس لیے کہ اس طرح تو اللہ تعالیٰ کے قادرِ مطلق ہونے سے انکار لازم آتا ہے اسی لیے لوگوں نے اس پر گرفت کی ہے چنانچہ امام عبدالوہابؒ شعرانی کتاب الانوار القدسیہ فی بیان آداب العبودیہ ج ۲ صفحہ ۹۸ پر فرماتے ہیں۔ "یاد رکھو کہ اللہ تعالیٰ کی ذات میں غور کرنے سے کوئی بھی بچ نہیں سکا۔ چنانچہ اس بارے میں جو کچھ امام غزالیؒ نے کہا ہے لوگوں نے اسے غلط قرار دیا ہے لہٰذا امام غزالیؒ سے اس کی بازپرس ہوگی۔ اس لیے کہ انھوں نے اپنی عقل کو اپنے ایمان پر ترجیح دی ہے اور اپنی نظر کو اپنے رب کے علم پر حاکم بنایا ہے حالانکہ عارفین بھی ذاتِ باری تعالیٰ میں غور کرنے سے حیرت زدہ ہیں۔ اسی طرح علماء نے امام غزالیؒ کا یہ قول بھی غلط قرار دیا ہے اِنَّ اللّٰہَ یُعْرَفُ مِنْ غَیْرِ نَظْرٍ فِی الْعَالَمِ دنیا میں غور کرنے کے بغیر بھی اللہ کو پہچانا جا سکتا ہے۔

(بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر)

۱- عَسٰی رَبُّہٗٓ اِنْ طَلَّقَکُنَّ اَنْ یُّبْدِلَہٗٓ اَزْوَاجًا خَیْرًا مِّنْکُنَّ مُسْلِمٰتٍ مُّؤْمِنٰتٍ قٰنِتٰتٍ تٰٓئِبٰتٍ عٰبِدٰتٍ سٰٓئِحٰتٍ ثَیِّبٰتٍ وَّاَبْکَارًا۔

(سورہ تحریم آیت ۵)

ہو سکتا ہے کہ اگر نبی (صلی اللہ علیہ وسلم) تمہیں طلاق دے دیں تو آنحضرت کا رب تمہارے بدلے میں انہیں تم سے بہتر بیویاں دے دے جو مسلمان مومن، مطیع، توبہ کرنے والی، عبادت گزار، روزہ گذار خاوند دیکھی یا کنواریاں ہوں۔

۲- نیز فرمایا:

یٰٓاَیُّہَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اَطِیْعُوا اللّٰہَ وَاَطِیْعُوا الرَّسُوْلَ وَلَا تُبْطِلُوْٓا اَعْمَالَکُمْ۔

مسلمانو! اللہ اور رسول کی اطاعت کرو اور اپنے اعمال کو ضائع نہ کرو۔

پھر آخر میں فرمایا:

وَاِنْ تَتَوَلَّوْا یَسْتَبْدِلْ قَوْمًا غَیْرَکُمْ ثُمَّ لَا یَکُوْنُوْٓا اَمْثَالَکُمْ۔

(سورہ محمد آیت ۳۸)

اور اگر تم پیٹھ دے جاؤ۔ تو اللہ تمہاری بجائے اور لوگوں کو لے آئے گا۔ جو پھر تمہارے جیسے نہ ہوں گے۔

۳- فَلَآ اُقْسِمُ بِرَبِّ الْمَشٰرِقِ وَالْمَغٰرِبِ اِنَّا لَقٰدِرُوْنَ عَلٰٓی اَنْ نُّبَدِّلَ خَیْرًا مِّنْہُمْ وَمَا نَحْنُ بِمَسْبُوْقِیْنَ۔

(سورہ معارج آیت: ۴۱)

(ایسا ہرگز نہیں) قسم ہے مشرقوں اور مغربوں کے رب کی کہ ہم اس بات پر قادر ہیں کہ ان کے بدلے ان سے بہتر لوگوں کو لے آئیں اور ہم سے بچ کر کوئی نکل نہیں سکتا۔

۴- وَرَبُّکَ الْغَنِیُّ ذُو الرَّحْمَۃِ اِنْ یَّشَاْ یُذْہِبْکُمْ وَیَسْتَخْلِفْ مِنْ بَعْدِکُمْ مَّا یَشَآءُ کَمَآ اَنْشَاَکُمْ مِّنْ ذُرِّیَّۃِ قَوْمٍ اٰخَرِیْنَ۔

(سورۂ انعام آیت ۱۳۴)

اور تمہارا رب غنی اور رحمت والا ہے۔ اگر چاہے تو تمہیں فنا کر دے اور جس طرح تمہیں اور لوگوں کی اولاد میں سے پیدا کیا ہے۔ اسی طرح جنہیں چاہے تمہارے بعد تمہارا جانشین بنا دے

(بقیہ حاشیہ صفحہ سابقہ)

لہ مولف نے اب جو بحث چھیڑی ہے وہ نہایت بے ربط ہے۔ مولف اپنے مافی الضمیر کو وضاحت سے بیان نہیں کر سکا۔ جو آیات اس نے پیش کی ہیں ان کا اصل مسئلہ سے کوئی تعلق نہیں۔ اس طرح بحث کو اتنا طول دیا ہے کہ پڑھنے والا اُکتا جاتے۔ یہی بات چند صفحوں میں ادا ہو سکتی تھی۔ ۱۲

۵۔ لَوْشَاءَ اللّٰہُ لَجَمَعَهُمْ عَلَى الْهُدٰى

(سورۂ انعام آیت ۱۳۴)

اور اگر اللہ چاہتا تو ان سب کو ہدایت پر اکٹھا کر دیتا۔

۶۔ قُلْ فَلِلّٰهِ الْحُجَّةُ الْبَالِغَةُ فَلَوْشَاءَ لَهَدٰكُمْ اَجْمَعِيْنَ۔

(سورۂ انعام آیت ۱۰۵)

آپ کہہ دیں کہ اللہ کے پاس واضح دلائل ہیں، اگر چاہتا تو تم سب کو ہدایت کر دیتا۔

۷۔ وَلَوْشِئْنَا لَبَعَثْنَا فِيْ كُلِّ قَرْيَةٍ نَّذِيْرًا۔ (سورۂ فرقان آیت: ۵۱)

اگر ہم چاہیں تو ہر بستی میں نذیر بھیج دیں۔

۸۔ اِنْ نَّشَاْ نُنَزِّلْ عَلَيْهِمْ مِّنَ السَّمَاءِ اٰيَةً فَظَلَّتْ اَعْنَاقُهُمْ لَهَا خَاضِعِيْنَ

(سورہ شعراء آیت: ۴)

اگر چاہیں تو ہم ان پر آسمان سے ایک نشانی بھیج دیں جس کے سامنے ان کی گردنیں جھک جائیں۔

۹۔ وَلَوْشَاءَ رَبُّكَ لَاٰمَنَ مَنْ فِي الْاَرْضِ كُلُّهُمْ جَمِيْعًا۔

(سورۂ یونس آیت: ۹۹)

اور اگر تمہارا رب چاہتا تو روئے زمین کے سب لوگ ایمان لے آتے۔

۱۰۔ يَا اَيُّهَا النَّاسُ اَنْتُمُ الْفُقَرَاءُ اِلَى اللّٰهِ وَاللّٰهُ هُوَ الْغَنِيُّ الْحَمِيْدُ - اِنْ يَّشَاْ يُذْهِبْكُمْ وَيَاْتِ بِخَلْقٍ جَدِيْدٍ وَمَا ذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ بِعَزِيْزٍ -

(سورۂ محمد آیت)

لوگو تم اللہ کے محتاج ہو۔ اللہ تم سے مستغنی ہے اور قابل تعریف ہے۔ اگر چاہے تمہیں فنا کر دے اور ایک نئی مخلوق لے آئے اور یہ اللہ کے لیے مشکل کام نہیں ہے۔

۱۱۔ وَلَوْ شِئْنَا لَاٰتَيْنَا كُلَّ نَفْسٍ هُدٰهَا۔ (سورہ سجدہ آیت ۱۳)

اگر ہم چاہیں تو ہر نفس کو ہدایت دے دیں۔

۱۲۔ يَخْلُقُ اللّٰهُ مَا يَشَاءُ۔ اِنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ۔

(سورۂ نور آیت ۴۵)

اللہ جو چاہتا ہے، پیدا کرتا ہے اللہ ہر چیز پر قادر ہے۔

۱۳۔ يَخْلُقُ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ۔

(سورۂ نحل آیت ۴۵)

اللہ ایسی ایسی مخلوق کا خالق ہے جن کا تمہیں علم نہیں ہے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے صحیح حدیث میں روایت ہے کہ آپؐ نے مرض موت میں فرمایا آؤ میں تمہیں کچھ لکھ دوں جس کے لکھنے کے بعد تم گمراہ نہ ہوگے مگر حضرت عمرؓ نے کہا ہمیں کتاب اللہ کافی ہے۔

حضرت ابن عباس فرماتے ہیں کہ بڑی مصیبت تو یہ تھی کہ لوگ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے چٹھی لکھنے میں حائل ہوگئے ایک اور صحیح حدیث میں ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم صحابہؓ کو لیلۃ القدر کے متعلق بتانے کو نکلے مگر جب دو شخص آپس میں جھگڑ پڑے تو اس رات کا علم اٹھا لیا گیا۔ یہ دونوں حدیثیں صحیح بخاری میں ہیں۔

امام سیوطی اپنی کتاب الباھر فی حکم النبی صلی اللہ علیہ وسلم بالباطن والظاھر میں لکھتے ہیں چوتھی حدیث۔ ابوبکرؓ بن[1] ابی شیبہ نے اپنی مسند میں حضرت انسؓ سے روایت کی ہے کہ ہم میں ایک نوجوان بڑا عابد وزاہد تھا۔ ہم نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے اس کا ذکر کیا مگر آپؐ اسے نہ جانتے تھے۔ ہم نے اس کا حلیہ بیان کیا پھر بھی آپؐ اسے نہ پہچان سکے۔ ابھی ہم اس کا ذکر ہی کر رہے تھے کہ وہ آگیا اور ہم نے عرض کیا یا رسول اللہ یہی وہ نوجوان ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا مجھے تو اسکے چہرے پر شیطان کے سیاہ داغ دکھائی دیتے ہیں۔ چنانچہ وہ آیا اور اس نے سلام کیا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کیا تم دل میں یہ خیال جمائے ہوئے ہو کہ قوم میں تم سے بہتر کوئی شخص نہیں ہے۔ جواب دیا۔ ہاں۔ پھر وہ واپس چلا گیا اور مسجد میں داخل ہوا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اسے کون قتل کرے گا۔ ابوبکرؓ کہنے لگے میں قتل کروں گا۔ جب ابوبکرؓ مسجد میں داخل ہوئے تو دیکھا کہ وہ نماز پڑھ رہا ہے۔ کہا کسی شخص کو نماز پڑھتے ہوئے کیسے قتل کردوں اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی ہمیں نمازی کے قتل کرنے سے منع فرمایا ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے پھر فرمایا: اس شخص کو کون قتل کرے گا۔ عمرؓ نے کہا میں یا رسول اللہ! چنانچہ وہ جب مسجد میں گئے تو دیکھا کہ وہ سجدے میں پڑا ہے اور انھوں نے بھی وہی الفاظ کہے جو ابوبکرؓ نے کہے تھے۔ نیز کہا کہ میں واپس چلا جاتا ہوں کیونکہ مجھ سے بہتر شخص واپس جا چکا ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: عمرؓ کیا بات ہے۔ عمرؓ نے بات عرض کر دی۔ آنحضرتؐ نے پھر فرمایا: اسے کون قتل کریگا۔ حضرت علیؓ نے عرض کیا: میں۔ آنحضرت

---

[a] اس حدیث اور اس کے بعد کی دی ہوئی احادیث کا زیر بحث مسئلہ سے کوئی تعلق نہیں۔ میں نہیں سمجھ سکا کہ مولف ان سے کیا استدلال کرنا چاہتا ہے۔

[1] ابوبکرؓ بن ابی شیبہ: ابوبکر عبداللہ بن محمد بن القاضی ابی شیبہ۔ متوفی ۲۳۵ھ ۹۴۶ء۔ ان کی مسند مشہور ہے۔

نے فرمایا: اگر تجھے مل گیا تو تو اسے قتل کرے گا۔ حضرت علیؓ جب مسجد میں داخل ہوئے تو وہ جا چکا تھا آنحضرت نے فرمایا: اللہ کی قسم اگر تو اسے قتل کر دیتا تو یہ اس قسم کے لوگوں میں سے پہلا اور آخری شخص ہوتا اور (اگر یہ قتل ہو جاتا تو) میری امّت میں کبھی اختلاف پیدا نہ ہوتا۔

سیوطیؒ نے اس حدیث کی روایت چھ مختلف طریقوں سے پیش کرتے ہوئے کہا ہے کہ تعدّدِ طرق سے حدیث کا صحیح ہونا ثابت ہوتا ہے۔[1]

جو آیات و احادیث ہم نے پیش کی ہیں ان سے حق اور صحیح بات واضح ہو جاتی ہے۔ میں نے عام لوگوں سے جن کے دل شک و شبہ سے خالی ہوتے ہیں اور حق بات کو جلدی قبول کر لیتے ہیں، پوچھا کہ کیا اللہ تعالیٰ اس بات پر قادر ہے کہ اسی قسم کا ایک اور جہان پیدا کر دے تو کہنے لگے اس میں توقف کیسے ہو سکتا ہے جبکہ ہمارا رب ہر چیز پر قادر ہے اور اس کی قدرت ہر چیز میں جاری ہے کوئی چیز اسے عاجز نہیں کر سکتی میں نے ایک مرتبہ ایک شخص سے کہا کہ کیا اللہ تعالیٰ اس جہان سے بہتر جہان پیدا کر سکتا ہے تو اس نے جواب دیا کیا تو نے یہ آیت نہیں پڑھی اِنْ یَّشَاْ یُذْھِبْکُمْ وَیَاْتِ بِخَلْقٍ جَدِیْدٍ (اگر اللہ چاہے تو تمہیں فنا کر دے اور نئی مخلوق کو لے آوے) اللہ تعالیٰ نے لفظ "جدید" میں اس بات کی قید نہیں لگائی کہ وہ ہم سے کم درجہ کے ہوں گے ہو سکتا ہے کہ وہ ہم سے افضل یا ہمارے برابر ہوں۔ مجھے اس کی یہ بات بہت پسند آئی۔ اس کے برخلاف میں نے ایک فقیہ سے کہا کہ ابو حامدؒ غزالی کے اس قول کے متعلق کہ لَیْسَ فِی الْاِمْکَانِ اَبْدَعُ مِمَّا کَانَ تمہارا کیا خیال ہے۔ اس نے جواب دیا کہ شیخ شعرانیؒ اور دوسرے لوگوں نے اس پر بحث کی ہے۔ میں نے کہا میں تو تمہاری رائے پوچھ رہا ہوں۔ جواب دیا کہ میری رائے کیا ہو سکتی ہے؟ میں نے کہا بہت افسوس ہے یہ تو عقیدہ کی بات ہے۔ بھلا اگر کوئی شخص تجھ سے یہ پوچھے کہ آیا ہمارا پروردگار اس جہان سے بہتر جہان پیدا کر سکتا ہے تو کیا کہو گے۔ کہنے لگا میں کہوں گا کہ اللہ کی قدرت کا کوئی شمار نہیں لہٰذا وہ اس جہان سے ہزار درجہ بہتر بلکہ اس سے بھی زیادہ بہتر جہان پیدا کر سکتا ہے۔ اس پر میں نے کہا امام غزالیؒ کا قول کہ لَیْسَ فِی الْاِمْکَانِ اَبْدَعُ مِمَّا کَانَ اس کے منافی ہے تب جا کر وہ ابو حامدؒ کے قول کا مطلب سمجھا۔ اس طرح کئی اور فقہاء سے مجھے واسطہ پڑا۔ جب ان سے ابو حامدؒ کی عبارت کے متعلق سوال کرتا تو امام کی قدر و منزلت کو مدِ نظر رکھتے ہوئے توقف کرتے، لیکن جب میں عبارت بدل کر سوال کرتا تو وہ اللہ کی قدرت کا اقرار کرتے اور کہتے کہ اللہ کی قدرت کا کوئی شمار نہیں۔ واللہ اعلم۔

---

[1] چونکہ موٴلف نے اسی ایک حدیث کو بار بار مختلف راویوں سے نقل کیا ہے اس لیے میں نے صرف ایک ہی روایت کو کتاب میں رہنے دیا ہے باقیوں کا ذکر نہیں کیا۔ ۱۲

فصل

میں مسئلہ امکان کے متعلق جو کچھ امام غزالی نے لکھا ہے اسے پہلے بیان درج کرتا ہوں اس کے بعد جو کچھ اور لوگوں نے اس بارے میں لکھا ہے، اُسے لکھوں گا تاکہ لوگ اس سے مستفید ہوں۔ چنانچہ الغزالیؒ احیاء میں ان امور کی طرف اشارہ کرتے ہوئے جن سے توکل پیدا ہو لکھتے ہیں:

توکل یہ ہے کہ انسان ایسے یقین کے ساتھ تصدیق کرے کہ اس میں کسی قسم کی کمزوری نہ پائی جائے اور اس میں کوئی شک نہیں کہ اگر اللہ تعالیٰ تمام مخلوقات کو عقلمند ترین انسان کی سی عقل اور بہترین عالم کا سا علم دیدے اور انہیں اس قدر علم عطا کر دے کہ ان کے نفس اسے برداشت نہ کر سکیں اور انہیں اتنی حکمت عطا کرے کہ خارج از بیان ہو۔ اس کے بعد تمام امور کے انجام ان پر کھول دے اور انہیں اسرارِ ملکوت پر مطلع کر دے اور انہیں بہت دقیق باتیں اور چھپے ہوتے انجام کا علم دے چنانچہ انہیں ہر قسم کی خیر اور شر کا، نفع اور نقصان کا علم ہو جائے۔ اس کے بعد اللہ تعالیٰ انہیں حکم دے کہ اللہ کے عطا کئے ہوئے علم اور حکمت سے دنیا کی حکومت چلائیں تو باوجود ان کے باہمی تعاون کے جو کچھ اللہ تعالیٰ نے دنیا و آخرت میں تدبیر کر رکھی ہے، اس میں نہ مچھر کے پَر کے برابر اضافہ کر سکیں گے اور نہ کم کر سکیں گے اور نہ ہی کسی مرض یا عیب یا نقص یا کسی کے دُکھ کو دور کر سکیں گے اور نہ صاحب صحت کی صحت میں۔ نہ صاحب مال کے مال میں اور نہ صاحب کمال کے کمال میں اضافہ کر سکیں گے بلکہ اگر وہ ہر اس چیز میں غور کریں جسے اللہ تعالیٰ نے پیدا کیا ہے مثلاً آسمان و زمین، تو اس میں نہ انہیں کوئی فرق اور نہ کوئی رخنہ دکھائی دے گا اور تمام وہ امور جنہیں اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں میں تقسیم کر رکھا ہے مثلاً رزق، موت، خوشی و غمی، کمزوری و طاقت، ایمان و کفر اور اطاعت و نافرمانی تمام کے تمام عدل ہیں۔ ان میں کوئی راہِ حق سے عدول نہیں پایا جاتا اور خالص حق ہیں جن میں ظلم نہیں پایا جاتا بلکہ یہ سب حق و واجبی ترتیب پر جیسا کہ انہیں ہونا چاہیئے تھا اور جس اندازے سے ہونا چاہیے تھا، ہیں۔ ان سے زیادہ تام کے زیادہ بہتر اور زیادہ کامل ہونے کا امکان ہی نہیں۔ اگر ایسا ممکن ہوتا اور قدرت رکھنے کے باوجود اللہ تعالیٰ ایسا نہ کرتا تو یہ بخل ہوتا جو سخاوت کے منافی ہے اور ظلم ہوتا جو عدل کے خلاف ہے اور اگر ایسا کرنے پر قادر نہ ہوتا تو عاجز ہوتا اور

عجز الٰہیت کے منافی ہے بلکہ دنیا کی ہر محتاجی اور دکھ دنیا میں نقص کا باعث ہے مگر آخرت میں زیادتی کا اور آخرت کا ہر نقص جو ایک شخص کے متعلق ہو کسی دوسرے شخص کے لیے نعمت ہو گا کیونکہ اگر رات نہ ہوتی تو دن کی قدر معلوم نہ ہوتی اور اگر مرض نہ ہوتا تو تندرست لوگ تندرستی سے بہرہ اندوز نہ ہو سکتے اگر دوزخ نہ ہوتی تو اہل جنت کو اللہ کی نعمتوں کی قدر معلوم نہ ہوتی۔ جیسا کہ چوپاؤں کی روحوں کو انسانی پر فدا کر دیا جاتا ہے اور انسانوں کو انہیں ذبح کرنے پر مسلط کر دیا جاتا ہے مگر اسے ظلم نہیں کہا جاتا بلکہ کامل کو ناقص پر مقدم رکھنا عینِ عدل ہے۔ اسی طرح دوزخیوں کو زیادہ سزا دے کر اہلِ جنت کی نعمت میں اضافہ ہوتا ہے لہٰذا اگر ناقص نہ ہوتا تو کامل کی پہچان نہ ہو سکتی اور اگر حیوان نہ پیدا ہوتے تو انسان کا شرف ظاہر نہ ہوتا اس لیے کہ کمال اور نقص مقابلہ سے ہی ظاہر ہوتے ہیں لہٰذا جود و حکمت کا یہی تقاضا ہے کہ کامل اور ناقص دونوں کو پیدا کیا جائے چنانچہ جب ہاتھ میں ناسور ہو جانے سے انسان کو بچانے کی غرض سے ہاتھ کاٹ دینا عین عدل ہے کیونکہ اس میں ناقص کو کامل پر فدا کر دینے کا اصول پایا جاتا ہے۔ یہی حال اس تفاوت کا ہے جو دنیا و آخرت میں مخلوقات کے درمیان تقسیم میں پایا جاتا ہے۔ یہ سب کچھ عدل ہے جس میں کوئی ظلم و جور نہیں۔ حق ہے جس میں کوئی لہو و لعب نہیں اور اب یہ مسئلہ بہت مشکل مسئلہ بن چکا ہے جسے اکثر لوگ نہیں سمجھ سکتے۔ اس میں تقدیر کا وہ راز ہے جس میں اکثر لوگ متحیر ہو چکے ہیں اور جنہیں اس کا علم ہے وہ اس کا افشاء نہیں کرنے دیتے۔ مختصر یہ کہ خیر ہو یا شر، سب کا فیصلہ ہو چکا ہے۔ مشیّتِ ایزدی کا حکم چل جانے کے بعد جس چیز کا بھی فیصلہ ہو گیا، وہ پہنچ کر رہے گی، نہ تو کوئی اس کے فیصلہ پر اعتراض کر سکتا ہے بلکہ ہر چھوٹی بڑی چیز تحریر میں آچکی ہے اور تقدیرِ الٰہی سے اس کے حصول کا انتظار ہے۔ جو چیز پہنچنے والی ہے وہ پہنچ کر رہے گی اور جو نہیں پہنچنے کی، اسے تو کسی صورت میں حاصل نہیں کر سکتا۔

مذکورہ بالا عبارت احیاء کی عبارت ہے جسے سمہودیؒ[1] نے اسی مسئلہ کے بارے میں اپنی تالیف اِیْضَاحُ الْبَیَانِ لِمَنْ اَرَادَ الْحُجَّةَ مِنْ لَیْسَ فِی الْاِمْکَانِ اَبْدَعَ مِمَّا کَانَ میں نقل کیا ہے۔ برہان الدینؒ[2] بقاعی نے بھی اسی مسئلہ کے متعلق اپنی تالیف دَلَالَةُ الْبُرْهَانِ عَلٰی

---

[1] سید سمہودیؒ: نور الدین علی بن احمد السمہودی متوفی ۹۱۱ھ ان کی متعدد تالیفات ہیں۔ مثلاً کتاب المنقار تاریخ المدینۃ الکبیر مسمّٰی بالوفاء ... المر المصطفیٰ۔ الوفاء بما یجب بحضرۃ المصطفیٰ (کشف الظنون: ج ۲: ۴۱۹) اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر سلام بھیجنے کے متعلق ایک تالیف ہے۔ (خفاجی: ۲: ۴۹۴)

[2] برہان الدینؒ بقاعی: برہان الدین ابراہیم بن عمر البقاعی متوفی ۸۸۵ھ / ۱۴۸۰ء (بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر)

اَنْ لَیْسَ فِی الْاِمْکَانِ اَبْدَعَ مِمَّا کَانَ میں اسی طرح نقل کیا ہے۔ سمہودی کہتے ہیں کہ ابو حامدؒ نے اسی قسم کی عبارت جواہر القرآن اور اَلْاَجْوِبَۃ المسکتۃ[1] میں دی ہے الغزالی نے الاجوبۃ المسکتۃ ان اعتراضات کے جوابات میں لکھی جو ان کی حیات میں الاحیاء پر کئے گئے۔ مؤلف کہتا ہے کہ الغزالیؒ نے اسی قسم کی عبارت مقاصد الفلاسفہ میں بھی لکھی ہے۔

اس مسئلہ کے بارے میں جو امام غزالیؒ کی طرف منسوب کیا جاتا ہے علماء تین گروہوں میں منقسم ہو گئے ہیں۔ چنانچہ پہلے گروہ نے اس مسئلہ کو قبول نہ کرتے ہوئے اس کا رد کیا ہے۔ دوسرے گروہ نے اس کی تاویل کرنے کی کوشش کی ہے اور تیسرے نے اس مسئلہ کو الغزالیؒ کی طرف منسوب کرنے سے انکار کر دیا ہے اور الغزالی کو اس قسم کے اعتقاد سے بری قرار دیا ہے۔

پہلا گروہ۔ معترضین

پہلا گروہ ان لوگوں کا ہے جنہوں نے الغزالی کا رد کیا ہے یہ وہ لوگ ہیں جو امام غزالی کے یا تو ہمعصر تھے یا ان کے بعد آنے والے محققین تھے۔ امام ابو بکرؒ ابن العربی کہتے ہیں جیسا کہ ابو عبداللہؒ قرطبی[2] نے شرح اسماء اللہ الحسنیٰ میں نقل کیا ہے کہ ابو حامدؒ الغزالی نے ایک بہت بڑی بات کہہ دی ہے جس پر اہلِ عراق نے خوب جرح کی ہے اور اللہ گواہ ہے کہ یہ بات جرح ہی کے قابل تھی۔ کیونکہ الغزالیؒ کہتے ہیں کہ "اللہ کی قدرت میں یہ بات نہیں کہ مضبوطی اور حکمت کے لحاظ سے اس سے بہتر جہان پیدا کر سکے اور اگر اس سے بہتر جہان ممکن ہوتا اور پھر اللہ نے اسے نہ بنایا ہوتا تو یہ جودؔ کے منافی ہے۔" اس کے بعد ابن عربیؒ نے اس کا رد کرنا شروع کیا ہے چنانچہ کہتے ہیں کہ ہم اگرچہ الغزالیؒ کے مقابلہ میں ایسے ہیں جیسے سمندر کے مقابلہ میں قطرہ پھر بھی ہم خود الغزالیؒ کے اقوال سے ہی اس کا رد کریں گے۔ تعجب اس بات پر ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انہیں اس قدر بلند صفات عطا کئے پھر وہ کس طرح اس قدر واضح مسئلہ میں راہ راست سے بھٹک گئے۔ ابو العباس ناصر الدینؒ

(بقیہ حاشیہ صفحہ سابقہ)

انھوں نے یہ رسالہ دمشق میں سنہ ۸۸۴ھ میں لکھا تھا۔ اس مسئلہ میں ان کا ایک اور رسالہ ہے جس کا نام تہدیم الارکان من لیس فی الامکان ابدع مما کان۔ انھوں نے یہ رسالہ سنہ ۸۸۳ھ میں لکھا ہے قرآن مجید کی آیات کے تناسب کے بارے میں بھی ایک کتاب لکھی ہے جس کا نام انھوں نے نظم الدرر فی تناسب الآی والسُّوَر رکھا ہے۔

---

[1] اس کتاب کا پورا نام الاجوبۃ المسکتۃ عن الاسئلۃ المبُہمۃ ہے اسی کتاب کا دوسرا نام الاملاء علی مشکل الاحیاء بھی ہے۔

[2] ابو عبداللہ قرطبی: ابو عبداللہ محمدؐ بن احمد الانصاری القرطبی الاندلسی متوفی سنہ ۶۷۱ھ ۱۲۷۲ء اس کتاب کا نام الاسنیٰ فی شرح اسماء اللہ الحسنیٰ ہے یہ ایک ضخیم کتاب ہے جسمیں مجسمہ اور اصحاب تشبیہ کا رد کیا ہے (کشف الظنون ج ا صفحہ ۸۶)

بن المنیر الاسکندری المالکی نے بھی یہی طریقہ اختیار کیا ہے چنانچہ اس نے ایک رسالہ لکھا ہے جس کا نام الضیاء المتلألی فی تعقب الاحیاء للغزالیؒ نے مذکورہ بالا رسالہ اسی رسالہ کے رد میں لکھا ہے جس میں الغزالیؒ کی حمایت اور ابن المنیر پر اعتراض کیا ہے۔ آگے چل کر ہم اس کے متعلق اور لکھیں گے

کمال الدینؒ[1] بن ابی الشریف شرح مسایرہ میں یہ لکھنے کے بعد کہ اللہ کو قدرت ہے کہ وہ اس جہان سے بھی بہتر جہان پیدا کر دے لکھتے ہیں کہ الاحیاء کے ایک باب میں مثلاً کتاب التوکل میں اس کے خلاف لکھا ہے اور یہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ امام غزالیؒ سے غفلت ہو گئی اور فلاسفہ کے طرز میں یہ بات کہہ گئے امام غزالی کے زمانہ اور بعد میں بھی علماء نے اس کا رد کیا ہے۔ حافظ ذہبیؒ[2] نے بھی تاریخ الاسلام میں علماء کے اس رد کا ذکر کیا ہے۔

بدر الدینؒ[3] الزرکشی کہتے ہیں کہ "اس جہان کی صورت سے بہتر جہان نہیں ہو سکتا اور اگر ممکن ہوتا اور اللہ نے نہ بنایا ہوتا تو یہ بخل ہے جو جود کے منافی ہے یا عجز ہے جو قدرت کے منافی ہے"۔ بدر الدین کہتے ہیں کہ یہ وہ مہمل الفاظ ہیں جن کا حق تعالیٰ کے لیے استعمال کرنا مناسب نہیں ہو سکتا ہے کہ غزالی کی مراد اللہ تعالیٰ کی صنعت کی عظمت بیان کرنا ہو۔ اس لیے کہ حق تعالیٰ سبحانہٗ قادرِ مطلق ہیں جن کے حق میں ظلم یا بخل یا عجز کا اطلاق نہیں ہو سکتا لہٰذا امام غزالیؒ کا یہ کہنا کہ اگر اس عالم سے بہتر عالم ممکن ہوتا، پھر اللہ نے باوجود قدرت کے اسے عدم میں رکھ چھوڑا ہوتا تو یہ بخل ہے اور ظلم ہے

---

[1] کمال الدینؒ بن ابی الشریف: کمال الدین محمد بن محمد المعروف بابن ابی الشریف القدسی الشافعی۔ شرح کا نام المسامرۃ فی شرح المسایرۃ ہے۔ ان کی وفات ۹۰۵ھ ۱۴۹۹ء میں ہوئی۔ انھوں نے تاج الدین سبکی کی جمع الجوامع کی شرح بھی لکھی ہے جس کا نام الدرر اللوامع فی تحریر جمع الجوامع ہے۔

مسایرۃ: اس کتاب کا پورا نام مسایرۃ فی العقائد المنجیۃ فی الآخرۃ ہے۔ کمال الدین محمد بن عبدالواحد المعروف بابن الہمام کی تصنیف ہے۔

[2] حافظ ذہبیؒ: شمس الدین ابو عبداللہ ذہبی۔ حافظ حدیث۔ ان کی متعدد تصانیف ہیں مثلاً تاریخ الاسلام تذکرۃ الحفاظ وغیرہ۔ ان کی وفات ۷۴۸ھ ۱۳۴۷ء میں ہوئی۔

[3] بدر الدینؒ زرکشی: بدر الدین محمد بن بہادر بن عبداللہ الزرکشی شافعی متوفیٰ ۷۹۴ھ ۱۳۹۱ء۔ انھوں نے متعدد کتابیں لکھیں مثلاً التنقیح فی شرح الجامع الصحیح للبخاری اور شرح جمع الجوامع جس کا نام انھوں نے تشنیف المسامع رکھا۔ ان کی ایک اور کتاب فتاویٰ زرکشی بھی ہے ملاحظہ ہو کشف الظنون: ج: ا ص ۲۰۵، ۲۸۱ و ج ۲ ص ۲ القواعد فی الفروع (کشف ج ۲: ۱۲۲)

قدرتِ مطلقہ کے مخالف ہے چنانچہ امام غزالیؒ نے خود اپنی کتاب الاقتصاد فی الاعتقاد میں بیان کیا ہے کہ حق تعالیٰ کے بارے میں ایسے حقائق محال ہیں۔ لہٰذا اگر اس عالم سے بھی بہتر کوئی عالم ہوتا مگر اللہ نے اسے پیدا نہیں کیا تو یہ اللہ کے کمالِ اختیار اور اللہ تعالیٰ کی عظمت و سطوت کی دلیل ہے، نہ اس بات کی جیسا کہ امام غزالی نے وہاں لکھا ہے کہ یہ بخل، عجز اور ظلم کی دلیل ہے خدا اس قسم کی باتوں سے بلند و بالا ہے۔

خدا ابن عربیؒ پر رحمت کرے، وہ کہتے ہیں کہ ہم اگرچہ ان کے سمندر کے مقابلہ میں ایک قطرہ ہیں مگر ہم ان کے قول کی تردید انہی کے قول سے کرتے ہیں، لہٰذا اگر تو خود غزالیؒ کے قول سے اس کی تردید چاہتا ہے تو کتاب الاقتصاد جس کا ذکر ہو چکا دیکھیں، نیز دیکھیں اسی کی کتاب القسطاس المستقیم اور الاحیاء کے بہت سے مقامات جہاں اس نے صراحتہً بیان کیا ہے کہ حق تعالیٰ کے متعلق کیا عقیدہ رکھنا چاہیئے۔

دوسرا گروہ

دوسرا گروہ ان لوگوں کا ہے جو ابو حامد الغزالی کی حمایت کرتے ہیں اور اس کے کلام کی صحیح تاویل کرتے ہیں، ان میں سے پہلا شخص خود الغزالیؒ ہے کیونکہ انہیں ان کے زمانہ میں ہی اس کے متعلق سوال کیا گیا تو انہوں نے اس کا جواب الاجوبۃ المسکتہ میں دیا چنانچہ وہاں پہلے مذکورہ بالا قابلِ اعتراض عبارت کو نقل کیا ہے پھر خود ہی سوال کیا ہے کہ اس عبارت کا کیا مطلب ہے پھر اس کا جواب دیتے ہیں کہ دنیا کو عدم سے وجود میں لانے میں جو تاخیر ہوئی وہ سب اختیارِ کلی کے تحت میں آتی ہے اس لیے کہ اللہ مختارِ کل ہوتے ہوئے چاہے کسی بات کو کریں چاہے نہ کریں اور جب نہ کریں گے تو ممکن نہیں کہ ایسا کریں جو حکمت کے انتہائی تقاضا کے مطابق نہ ہو، وغیرہ۔ مگر یہ جواب قطعاً غیر تسلی بخش ہے۔

مؤلف کتاب کہتا ہے کہ جب یہ ثابت ہو چکا کہ اللہ تعالیٰ فعل سے پہلے، فعل کے دوران میں اور فعل کے بعد مختارِ کل ہیں لہٰذا ہم پوچھتے ہیں کہ کیا یہی اختیار وجودِ عالم کی تاخیر کا باعث بنا۔ اگر ایسا ہے تو اس سے بہتر جہان کے وجود کی تاخیر کا سبب بھی یہی اختیار ہوگا لہٰذا یہ کہنا کہ جب اللہ کریگا تو ممکن نہیں کہ وہ فعل حکمت کے انتہائی تقاضا کے مطابق نہ ہو" اس بات کا مقتضی ہے کہ فعل کے وقت اسے اختیار نہ تھا۔ حالانکہ اللہ اس سے بالا و بلند ہے۔

شعرانی کا بیان

شعرانی اپنی کتاب الاجوبۃ المرضیۃ عن سادا تنا الفقہاء والصوفیہ میں کہتے ہیں علماء نے غزالیؒ کے اس قول کو کہ "جو جہان وجود میں آچکا ہے اس سے بہتر کا

ہونا ممکن نہیں" برا مانا ہے۔ ان کا اعتراض یہ ہے کہ اس سے جناب باری تعالیٰ کا عجز ظاہر ہوتا ہے اس کا جواب یہ ہے جیسا کہ محی الدینؒ ابن العربی نے فتوحات میں دیا ہے کہ غزالیؒ کا کلام نہایت محققانہ کلام ہے جسے بُرا ماننا درست نہیں کیونکہ مرتبے صرف دو ہیں۔ مرتبہ قِدَم اور مرتبہ حدوث پہلا مرتبہ صرف اللہ کے لیے ہے اور دوسرا مخلوق کے لیے۔ چنانچہ جو کچھ اللہ تعالیٰ نے پیدا کیا ہے اگر اسے (روزِ اوّل) سے ہی پیدا کر دیا ہوتا پھر بھی یہ جہان حادث کا حادث ہی رہتا، (اسے قدیم نہ کہا جاسکتا) لہٰذا یہ کہنا کہ "کیا" حق سبحانہ ایسا قدیم پیدا کرنے کی قدرت رکھتے ہیں جو قدیم ہونے میں اللہ کے مساوی ہو" درست نہ ہوگا کیونکہ یہ تو انتہائی مہمل سوال ہے۔

مؤلف کہتا ہے کہ یہ جواب بھی کچھ نہیں اور مسئلہ سے اسے کوئی تعلق ہی نہیں۔ یہ جواب تو اس وقت صحیح ہو سکتا تھا اگر غزالیؒ نے یہ کہا ہوتا کہ "قدیم سے بہتر کا امکان نہیں" اور معترضین کا یہ دعویٰ ہوتا کہ "قدیم سے بہتر کا امکان ہے۔" اس صورت میں جواب میں ہم کہہ سکتے تھے کہ حادث قدیم کے مرتبہ تک نہیں پہنچ سکتا مگر چونکہ غزالیؒ کا دعویٰ مرتبہ حدوث میں ہے کہ موجودہ حادث اشیاء سے بہتر حادث چیز نہیں ہو سکتی اور معترضین کا دعویٰ یہ ہے کہ اس سے بہتر چیز ہو سکتی ہے ورنہ یہ لازم آئے گا کہ اللہ تعالیٰ کی قدرت محدود ہے اور قدرت کا محدود ہونا عجز کو ثابت کرتا ہے لہٰذا ان کا یہ جواب درست نہیں ہے۔

اس کے بعد شعرانیؒ[1] نے عبدالکریمؒ[2] جیلی کا ایک اور جواب نقل کیا ہے کہ ہر موجود چیز پہلے سے ہی

---

[1] ابن الوہاب شعرانی متوفی ۹۶۰ھ۔

[2] عبدالکریمؒ جیلی: قطب الدین عبدالکریم بن ابراہیم سبط الشیخ عبدالقادر جیلانی یہ شیخ شرف الدین اسمٰعیل بن ابراہیم الجبرتی کے مرید تھے ان سے ان کی ملاقات ان کی مسجد میں ۷۹۹ھ میں ہوئی اور اپنے پیر بھائی عماد الدین یحییٰ بن ابی القاسم التونسی المغربی سبط الحسین بن علی کی درخواست پر الکہف والرقیم فی شرح بسم اللہ الرحمٰن الرحیم لکھی (کشف الظنون: ۲: ۱۹۵) انہوں نے الدرۃ العینیۃ فی الشواہد الغیبۃ بھی لکھی ہے (کشف الظنون: ۱: ۷۱۳) ان کا بیٹا صاین الدین عبدالعزیز المعروف بالمعیہ ہے جنہوں نے شیخ ابو اسحاق ابراہیم بن علی الفقیہ الشیرازی الشافعی متوفی ۴۷۶ھ کی تنبیہ فی فروع الشافعیہ کی شرح لکھی ہے (کشف الظنون ۱: ۴۵۵) ایک اور کتاب لوامع البرق الموہمؒ فی معنی ما وسعنی ارضی ولا سمائی ووسعنی قلب عبدی المؤمن (کشف الظنون: ۲: ۲۱۵) عبدالکریم نے الناموس الاعظم والقاموس الاقدم چالیس جلدوں میں لکھی (کشف الظنون ۲: ۳۷۷)

اللہ تعالیٰ کے علم میں تھی لہٰذا یہ نہیں ہو سکتا کہ موجودات اس درجہ سے جو علم قدیم میں تھا، زیادہ یا کم ہو جائے۔ لہٰذا امام غزالی کا قول درست ہوا۔

مولف کہتا ہے یہ جواب بھی درست نہیں اس لیے کہ ہم یہ تسلیم ہی نہیں کرتے کہ ہر وجود میں آنے والی چیز علم الٰہی کے مرتبہ سے نہ کم ہو سکتی ہے نہ زیادہ اور اس سے یہ بھی لازم نہیں آتا کہ اس سے بہتر ممکن ہی نہ ہو یہ جواب اس صورت میں درست ہو سکتا ہے کہ اگر امام غزالیؒ نے یوں کہا ہو کہ یہ ممکن نہیں کہ حادث علم الٰہی کے مرتبہ سے زیادہ یا کم ہو۔

اس کے بعد شعرانی ایک اور جواب نقل کرتے ہوئے کہتے ہیں جلال الدین سیوطی کے پیر طریقت شیخ محمد مغربی[1] شاذلی نے اس کا جواب اس طرح دیا ہے کہ غزالی کے کلام کا مفہوم یہ ہے کہ جہاں تک ہماری عقل کام کر سکتی ہے، اس جہان سے بہتر جہان نہیں ہو سکتا ہاں البتہ اللہ کے علم اور ادراک میں اس سے بہتر جہان ہو سکتا ہے۔ کیونکہ اگر اس جہان میں نقص ہوتا تو اس سے خالق کا ناقص ہونا لازم آتا حالانکہ تمام مذاہب اس پر متفق ہیں کہ کامل جو بات کرتا ہے، کامل ہی ہوتی ہے چنانچہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: وَالسَّمَاءَ بَنَيْنَاهَا بِأَيْدٍ وَإِنَّا لَمُوسِعُونَ وَالْأَرْضَ فَرَشْنَاهَا فَنِعْمَ الْمَاهِدُونَ (سورہ ذاریات آیت ۴۷، ۴۸) ہم نے آسمان کو قوت سے بنایا اور ہم ہی اسے وسیع کرنے والے ہیں اور زمین کو بچھایا اور اچھے بچھانے والے ہیں اور یہ بات سب کو معلوم ہے کہ احسان جتانا اور اپنی تعریف کرنا اسی بات میں ہو سکتا ہے جس کے اوصاف کمال تک پہنچ چکے ہوں لہٰذا یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ احسان جتاتے اور مخلوق کے سامنے ایسی بات کی تعریف کرے جس سے بہتر اور چیز ہو۔ الخ

مولف کہتا ہے اس جواب میں تصحیف نہیں تو یہ کوئی جواب نہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اس میں تناقض پایا ہے کیونکہ اس کا پہلا حصہ تو اس بات کا مقتضی ہے کہ صرف ہماری عقل کے مطابق اس جہان سے بہتر جہان کا کوئی امکان نہیں مگر اللہ کے علم کے مطابق امکان ہو سکتا ہے اور جواب کا آخری

---

[1] شیخ مغربی شاذلی: یہ راسخین فی العلم میں سے تھے۔ محمد الحنفی کے شاگرد اور شیخ ابو العباس المرسی سے تلقین طریقت لی۔ اصل میں ترکی تھے لیکن چونکہ ان کی والدہ کی شادی ایک مغربی سے ہوئی اس لیے مغربی کہلاتے۔ ان کی وفات قرافہ میں ۹۱۰ھ ۱۵۰۴ء کے چند سال بعد ہوئی، امام شعرانی نے بھی ان کی تادیل لواقح الانوار فی طبقات الاخیار میں جو طبقاتِ کبریٰ کے نام سے مشہور ہے درج کی ہے (ج ۲ صفحہ ۶۰۵)

حصہ مطلق امکان کی نفی کرتا ہے کیونکہ اگر بہتر جہان کا امکان ثابت ہو جائے تو موجودہ جہان اس کے مقابلہ میں ناقص قرار پائے گا اور مخلوق کے نقص سے خالق کا ناقص ہونا لازم آتا ہے اس صورت میں جواب کے پہلے حصہ کے مقتضا کو اختیار کرلیں گے اور آخری حصہ کے مقتضا کو قبول نہ کرتے ہوئے یہ تسلیم نہ کریں گے کہ اس سے حق سبحانہٗ کا ناقص ہونا لازم آتا ہے اس لیے کہ مفعول کے نقص سے فاعل کا ناقص ہونا لازم نہیں آتا جیسا کہ واضح ہے ورنہ ہم دیکھتے ہیں کہ ہر حادث چونکہ اپنے خالق کا محتاج ہے اس لیے ناقص ہے لہٰذا اگر فعل کا نقص فاعل تک سرایت کرتا ہو تو بہتر جہان کا وجود بھی محال ہوتا اس لیے کہ حادث ہونے کی وجہ سے وہ بھی ناقص ہوتا۔

دوسرے یہ کہ جس اجماع کا اس نے سہارا لیا ہے ان مسائل میں اس کا کوئی اعتبار نہیں کیونکہ یہاں پر مسئلہ کا تعلق اس قدرت الٰہیہ کے ساتھ ہے جو مُصححاتِ فعل میں سے ہونے کی وجہ سے اجماع سے ثابت نہیں کی جا سکتی۔

تیسری وجہ یہ ہے کہ جس اجماع کو حجت مانا جاتا ہے اور جس کا سہارا لیا جاتا ہے وہ خاص طور پر اس امت کریمہ کا اجماع ہے، دیگر امتوں کے اجماع کا اعتبار نہیں۔ اسی امت نے اپنے رب کے لیے اختیار کو ثابت کیا ہے کہ اپنے ملک میں جو چاہے کرے۔ سُبۡحَانَہٗ لَا اِلٰہَ اِلَّا ھُوَ۔

(مولّف کہتا ہے) خدا جانتا ہے کہ میرا یہ مقصد نہیں کہ علماء پر اعتراض کروں۔ میری غرض صرف اظہارِ حق ہے۔ واللہ تعالیٰ اعلم۔

امام ابوالبقا[1] محمد البکری الشافعی نے اس کا یوں جواب دیا ہے کہ اس جہان سے بہتر جہان کا وجود ناممکن ہے اس لیے کہ نہ تو اس کا ذکر کتاب اللہ میں ہے اور نہ سنت میں۔ اگر جائز ہوتا تو اس کا ذکر قرآن میں ہوتا کیونکہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں مَا فَرَّطۡنَا فِی الۡکِتَابِ مِنۡ شَیۡءٍ (ہم نے قرآن میں کسی چیز کی کمی نہیں رکھی) اور نہ ہی سنت میں اس کا ذکر ہے کیونکہ ذکر آیا ہوتا تو علماء نے اس کا ذکر کیا ہوتا لہٰذا معلوم ہو گیا کہ یہ ناممکن ہے اور قدرتِ الٰہیہ میں کوئی نقص بھی لازم نہیں آتا۔

مولّف کہتا ہے کہ اس میں کئی اعتراض وارد ہوتے ہیں ایک یہ کتاب وسنت میں اس کا ذکر آچکا

---

[1] ابوالبقاء محمد البکریؒ الشافعی: شیخ محمد البکری کی وفات ۹۹۳ھ میں ہوئی، ان کی ایک تالیف تنبیہ الأوّاہ بفضل لاالٰہ الا اللہ ہے (کشف الظنون: ۱: ۴۹۵) کشف الظنون میں ایک اور ابوالبقاء محمد بن احمد الضیاء المکی متوفی ۸۵۴ھ کا ذکر کیا ہے اور ان کی ایک تالیف سائی فی اختیار المکانی بتائی ہے مجھے معلوم نہیں ہو سکا کہ یہاں کون سے ابوالبقاء مراد ہیں۔

ہے جیسا کہ ہم شروع میں بیان کر چکے ہیں، دوسرے یہ کہ کتاب و سنت سے صرف ان امور نقلیہ کے بارے میں استدلال کیا جا سکتا ہے جن میں عقل کا کوئی دخل نہیں۔ رہے خالص عقل کے احکام جنہیں نفس عقل کہا جاتا ہے اور جو واجب امور کے وجوب، جائز امور کے جواز اور ناممکن امور کے عدم امکان کا علم ہے۔ سو یہ وہ ضروری امور ہیں جن کے لیے نقلی دلیل کی کوئی ضرورت نہیں۔ تیسرے یہ کہ ہم اس کا رد ہر علم بدیہی سے کر سکتے ہیں مثلاً یہ کہ چار جفت عدد ہے اور آٹھ کا نصف ہے اور یہ کہ ایک دو کا نصف ہے چنانچہ ہم کہہ سکتے ہیں کہ ان کا ذکر قرآن و حدیث میں نہیں آیا لہٰذا یہ بھی ناممکن ہونا چاہیئے اس لیے کہ آپ کے اصول کے مطابق تو ہر وہ بات جو کتاب و سنت میں نہیں ناممکن ہے۔ واللہ اعلم۔

زرکشی کا جواب

بدرالدین زرکشی کہتے ہیں کہ غزالی کا یہ کہنا کہ "موجودہ عالم سے بہتر عالم کا امکان نہیں" یہ صرف ہماری روشن عقلوں کے اعتبار سے کہا ہے نہ کہ اس پوشیدہ اور کامل عالم کے اعتبار سے جس کے نہ تو احکام کی کوئی انتہا ہے اور نہ عجائب و غرائب کا کوئی شمار لہٰذا غزالی کے قول کا یہ مطلب ہوا کہ بہتر عالم کا وجود ہماری عقلوں کے اعتبار سے ممکن نہیں نہ کہ اللہ کے علم غیب کے اعتبار سے۔ اسی لیے اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں وَیَخْلُقُ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ۔ خدا وہ چیزیں پیدا کرتا ہے جن کا تمہیں علم نہیں۔ لہٰذا عارف کا کسی بات کے متعلق حکم لگانا اس کے اپنے ادراک کے مطابق ہوتا ہے نہ کہ حق سبحانہٗ کے احکام کے مطابق کیونکہ اللہ تعالیٰ تو ہر چیز سے باخبر ہیں اور کسی کو بھی کسی ایک کے نوع کے متعلق پورا علم نہیں۔ اس لیے کہ ہر نوع کے بے شمار احکام ہیں جن میں سے بعض کی اطلاع تو اپنے بعض بندوں کو کر دی ہے اور بعض کا علم خاص اپنے لیے رکھا۔

مؤلف کہتا ہے کہ اس پر بھی اعتراض وارد ہوتا ہے کیونکہ عقول نیرہ ابتداء نظر ہی میں بہتر جہان کے وجود کے جواز کو سمجھ جاتی ہیں اور اس کے لیے فکر یا سوچ بچار کی ضرورت نہیں ہوتی اور ہم یہ بیان کر چکے ہیں کہ اس کا تعلق امور ضروریہ کے ساتھ ہے۔

ان کا یہ کہنا کہ "عارف کا حکم اپنے ادراک کے مطابق ہوتا ہے" میں کہتا ہوں کہ یہ صرف ان امور میں ہو سکتا ہے جو دقیق اور عام لوگوں کی عقل سے مخفی ہوں مگر جہاں تک ظاہر اور ضروری امور کا تعلق ہے اس میں عارف اور غیر عارف میں کوئی فرق نہیں۔ چنانچہ میں نے ایک عامی شخص سے اسی مسئلہ کے متعلق پوچھا تو اس نے کہا کیا قدرت الٰہی ہر ممکن چیز کو کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتی، میں نے کہا کیوں نہیں؟ اس نے پھر کہا اگر یوں کہا جائے کہ قدرتِ خداوندی بعض ممکنات کو کر سکتی ہے اور بعض کو نہیں

تو کیا بہ خدا میں نقص اور عجز کا اقرار نہ ہوگا؟ میں نے کہا کیوں نہیں؟ اس کے بعد کہا کیا اللہ تعالیٰ کے لیے عاجز ہونا محال ہے؟ میں نے کہا: کیوں نہیں۔ پھر کہنے لگا اب مسئلہ ظاہر ہے۔ کون سی بات مخفی رہ گئی۔

احمد زروقؒ کا جواب

احمد زروقؒ[1] امام غزالی کی کتاب قواعد العقائد کی شرح میں غزالی کا یہ قول نقل کر کے کہ "اللہ کے سوا جو کچھ بھی موجود ہے وہ اللہ کے فعل سے پیدا ہوا ہے اور اس کا فیضان اللہ کے عدل سے خوبصورت اور کامل ترین طریقے پر ہوا ہے" کہتے ہیں کہ ہر وہ چیز جس کا ظہور قدرتِ الٰہیہ سے ہوا ہو اور علم الٰہی کے مطابق اسے عمدگی سے بنایا گیا ہو۔ اس کا وجود ناقص نہیں ہو سکتا ہے اس لیے کہ جن اوصاف سے وہ چیز وجود میں آئی ہے وہ کامل ہیں اور یہ چیز انہی اوصاف کا نتیجہ ہے لہٰذا اس چیز کو ناقص کہنے سے لازم آئے گا کہ جن اوصاف نے اسے پیدا کیا ہے وہ بھی ناقص ہوں۔ مزید برآں کسی چیز کو عقلی طور پر یا عادۃً یا شرعی طور پر اچھا یا برا کہنا ہر ایک اپنی اپنی جگہ پر ہے اس لیے کہ جو کچھ ذکر کیا گیا وہ حکمت کے اعتبار سے ہے اور نسبت کا ظہور ہمارے اعتبار سے ہے اور امام غزالی نے لَیْسَ فِی الْاِمْکَانِ اَبْدَعَ مِمَّا کَانَ (موجودہ جہان سے بہتر جہان کا امکان نہیں) جو کہا ہے وہ اللہ کے اعتبار سے کہا ہے امام غزالی کی مراد یہ ہے کہ جو کچھ بھی موجود یا ابد تک موجود ہونے والا ہے جب وہ وجود میں آگیا تو پھر اس سے بہتر کوئی اور چیز نہیں ہو سکتی اس لیے کہ اسے علم، ارادہ اور قدرتِ الٰہیہ نے عمدگی سے بنایا ہے جن میں کوئی نقص نہیں ہو سکتا لہٰذا اس کا ظہور بہترین اور کامل ترین صورت میں ہوا۔ غزالی کے اس قول کا یہی مطلب سمجھنا چاہیئے۔ اگر یہ مفہوم نہ لیا گیا تو اس سے اللہ کی قدرت کو ناقص ماننا پڑے گا جو باطل ہے۔ عقلمند تو عقلمند رہے احمق کا بھی یہ اعتقاد نہیں ہو سکتا۔ وباللہ التوفیق۔

مؤلف کہتا ہے کہ اس جواب کی خامی بھی واضح ہے کیونکہ اگر اثر کے ناقص ہونے سے مؤثر اور اس کے اوصاف کا ناقص ہونا لازم ہے تو "غیر ابدع" کا وجود محال ہوگا اور ابدع کا وجود ضروری ہوگا جس سے اللہ تعالیٰ کے اختیار کی نفی ہو جاتی ہے لہٰذا صحیح بات یہی ہے کہ یہ لزوم ممنوع ہے اور

---

[1] احمد زروقؒ: شیخ شہاب الدین ابی الفضل احمد بن محمد البرنسی الفاسی المالکی الشہیر بالشیخ زروق متوفی ۸۹۹ھ = ۱۴۹۳ء۔ انھوں نے شاذلی کی حزب البحر جسے حزب صغیر بھی کہتے ہیں کی شرح بھی کی ہے (کشف الظنون ج ۱: ۴۳۳) ان کی ایک اور کتاب قواعد الطریقۃ فی الجمع بین الشریعۃ والحقیقۃ ہے اور تاج الدین ابن عطاء اللہ اسکندرانی الشاذلی کی الحکم العطائیۃ کی شرح بھی کی ہے۔

"ابدع" اور "غیر ابدع" کا وجود جائز ہے جو اللہ کے اختیار اور قدرت کے اندر ہے۔ واللہ اعلم۔

برہان الدین بن ابی الشریف کا بیان

کمال الدین جن کا ذکر پہلے گروہ میں کیا جا چکا ہے ان کے چھوٹے بھائی برہان الدین[1] بن ابی الشریف جو کمال الدین کی وفات کے بعد مدت تک زندہ رہے، کہتے ہیں "امام غزالی کے بیان میں نہ کسی بات کا ثبوت ہے نہ اللہ کی قدرت کو محدود کیا ہے اور نہ ہی خدا کے اس جہان سے بہتر جہان بنانے پر قادر ہونے کی نفی ہے بلکہ اللہ تو لاتعداد جہانوں کو پیدا کرنے پر قادر ہے لیکن چونکہ علم قدیم کا تعلق اور اس جہان کو پیدا کرنے کے لیے اللہ کا اختیار اور ارادہ واقع ہوا ہے لہٰذا اسے "ابدع" کے نام سے موصوف کیا گیا اس لیے کہ یہ جہان ان اوصاف پر دلالت کرتا ہے جو صفات حق سبحانہٗ کے مقتضا کے مطابق تھیں۔ لہٰذا امام غزالی کا کہنا کہ "موجودہ جہان سے بہتر جہان ممکن نہیں۔ اس سے یہی مراد ہے کہ جہاں تک قدرت الٰہیہ کا تعلق ہے اور جن ممکنات کے متعلق علم و ارادہ الٰہی پہلے ہو چکا ہے، ان میں سے کوئی بھی موجودہ چیزوں سے بہتر نہیں ہو سکتی۔ الخ

مؤلف کہتا ہے کہ اس پر بھی دو اعتراض وارد ہوتے ہیں۔ ایک یہ کہ یہاں اللہ کے علم و ارادۂ سابق کو اس بات کی دلیل قرار دیا ہے کہ جو کچھ دنیا میں موجود ہے یہی بہتر ہے حالانکہ یہ اس بات کی دلیل نہیں۔ اس سے تو صرف اس قدر معلوم ہوتا ہے کہ جو کچھ بھی وجود میں آیا ہے اللہ کے علم اور ارادہ سے آیا ہے۔ بہتر ہونے یا نہ ہونے کا کوئی ثبوت نہیں۔ دوسرے یہ کہ تجھے معلوم ہے کہ بہتر اشیاء کے افراد لاتعداد ہیں اس لیے کہ یہ مقدورِ الٰہی کے تحت آتا ہے اور مقدورِ الٰہی کی کوئی انتہا نہیں لہٰذا جب "ابدع" کی کوئی انتہا نہ رہی تو یہ جان کر کہ اللہ تعالیٰ کے اوصافِ قدیمہ کا تعلق اس کے ایک فرد کے وجود کے ساتھ ہے، اس کے لاانتہا افراد دائرۂ امکان میں رہ جاتے ہیں مگر جواب دینے والے کا خیال ہے کہ "ابدع" ایک شخص جزئی ہے جو فرد واحد میں منحصر ہوتی ہے لہٰذا اگر فرض کریں کہ علم و مشیت کا تعلق اسی فرد کے ساتھ ہے تو کسی اور کا وجود محال ہوگا ورنہ علم جہل ہوگا اور اگر "ابدع" ایسی کلی فرض کریں گے جس کے لاتعداد افراد ہوں تو اس کے ایک فرد کے وجود سے دوسروں کا دائرۂ امکان سے خارج ہونا لازم نہ آئے گا۔ واللہ اعلم۔

---

[1] برہان الدین ابراہیم بن ابی الشریف القدسی المتوفی ۹۲۳ھ۔ انھوں نے عقیدہ ابن دقیق العید کی شرح لکھی ہے جس کا نام العقد النضید رکھا ہے۔

ابوالمواہبؒ تونسی کا جواب

ابوالمواہب[1] تونسی نے اس کا جواب یوں دیا ہے کہ یہاں امکان سے مراد حکمتِ الٰہیہ کا امکان ہے۔ قدرتِ الٰہیہ کا امکان مراد نہیں۔ حجۃ الاسلام کے کلام کا یہی منہوم لینا مناسب ہے۔ الخ

مؤلف کہتا ہے کہ ہم یہ تسلیم ہی نہیں کرتے کہ حکمتِ الٰہیہ میں اس جہان سے بہتر جہان کا ہونا ممکن نہیں کیونکہ جن امور سے قدرتِ الٰہیہ کا تعلق ہے ان کی انتہا نہیں تو حکمتِ الٰہیہ کی بھی انتہا نہیں اس لیے کہ حکمت متعلقاتِ علم کے تابع ہے اور متعلقاتِ علم لانہایت ہیں لہٰذا حکمتِ الٰہیہ کا قطعی طور پر لا انتہا ہونا لازم آیا۔ کس کو جرأت ہو سکتی ہے کہ کہے کہ حکمتِ الٰہیہ محدود و محصور ہے آگے چلکر ہم بیان کریں گے کہ خود غزالی کے نزدیک حکمت کا اطلاق کس پر ہوتا ہے۔ واللہ اعلم۔

شیخ الاسلام زکریا الانصاری الشافعی کا جواب

شیخ الاسلام زکریا[2] انصاری شافعی اس کے جواب میں یہ فرماتے ہیں کہ کسی کے لیے روا نہیں کہ وہ امام غزالی کی طرف یہ بات منسوب کرے کہ اللہ تعالیٰ اس جہان سے بہتر جہان پیدا کرنے سے عاجز ہیں کیونکہ یہ مفہوم صرف اسی صورت میں نکلتا ہے اگر ہم غزالی کی عبارت میں امکان سے قدرت مراد لیں اور معنی یہ ہو جائیں کہ اللہ کی قدرت میں نہیں کہ اس سے بہتر جہان پیدا کر سکیں حالانکہ یہ معنی مراد نہیں ہیں بلکہ وہاں امکان اپنے مشہور معنوں میں استعمال ہوا ہے جو محال اور ضروری کے مقابلہ میں آتا ہے، لیکن حذفِ مضاف کے ساتھ یا ہم امکان کو ممکن کے معنوں میں لیں۔ اس طرح غزالی کی عبارت کا مفہوم یہ ہوگا کہ جن امور سے اللہ کی قدرت کا تعلق ہے ان سے بہتر کا ہونا جانبِ امکان میں نہیں یا یہ کہ ممکن نہیں ہے اور یہ مفہوم ٹھیک ہے اس لیے کہ وجود عدم سے بہتر ہوتا ہے اور معتزلہ کی عبارت کا مفہوم جیسے انھوں نے صراحۃً بیان کیا ہے یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے افعال سے بہتر کو پیدا کرنے پر قادر نہیں ہیں اور یہ مفہوم جیسا کہ تمام اہلِ سنت کے نزدیک باطل ہے۔ غزالی کے نزدیک بھی باطل ہے اس لیے کہ یہ مفہوم اس بنا پر لیا جاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ پر بہتر کام کا کرنا واجب ہے جو ایک باطل اصل ہے لہٰذا

---

[1] محمد ابوالمواہب: علماءِ راسخین اور ابرار میں سے تھے۔ انہیں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا بکثرت مشاہدہ ہوتا تھا۔ نعتیہ موشحات لکھ کر پڑھتے رہتے اور یہ موشحات لوگوں میں خوب مقبول ہوئے ان کی کتاب القانون تصوف میں بڑے پایہ کی کتاب سمجھی جاتی ہے۔

[2] شیخ الاسلام زکریا الانصاری: کبارِ صوفیہ اور فقہاء میں سے تھے۔ ان کی بہت سی تصانیف ہیں، انکی وفات ۹۲۶ھ ۱۵۱۹ء میں ہوئی اور امام شافعی کے پڑوس میں دفن کیے گئے۔

معلوم ہو گیا کہ غزالیؒ نے امکان سے قدرت مراد نہیں لی اس لیے کہ اس صورت میں اس کا مفہوم وہی ہو جاتا ہے جو معتزلہ کا عقیدہ ہے لہٰذا معلوم ہو گیا کہ اس لفظ کو کسی اور معنوں پر محمول نہیں کر سکتے اور نہ ہی اسے غزالی کی لغزش قرار دے سکتے ہیں۔ الخ

مؤلف کہتا ہے کہ اس پر جو اشکال وارد ہوتا ہے وہ بھی مخفی نہیں۔ اس نے امکان سے وجوب اور امتناع کا بالمقابل مراد لے کر غزالیؒ پر اعتراض دور کرنے کی بے سود کوشش کی ہے اس لیے کہ اعتراض تو اب بھی اسی طرح قائم ہے کیونکہ اس صورت میں معنی ہوں گے کہ جو کچھ وجود میں آ چکا۔ اس سے بہتر جانب امکان میں نہیں پایا کہ ممکن نہیں۔ اس سے یہ لازم آتا ہے کہ جس "ابدع" کو ہم نے فرض کیا ہے وہ جانب امتناع میں ہو اور یہ باطل ہے کیوں کہ ممکن چیز محال نہیں ہو سکتی اور جب محال ہو گی تو اس پر قدرت نہیں ہو سکتی لہٰذا یہی مطلب نکلا کہ اللہ "ابدع" کے پیدا کرنے پر قادر نہیں اور اعتراض قائم رہا۔ واللہ اعلم۔

سیوطی کا جواب

حافظ جلال الدین سیوطیؒ[1] غزالیؒ کے حامیوں میں سے ہیں انھوں نے اسی مسئلہ پر ایک کتاب لکھی ہے جس کا نام تَشْیِیْدُ الْاَرْکَانِ لِمَسْئَلَةِ لَیْسَ فِی الْاِمْکَانِ اَبْدَعَ مِمَّا کَانَ[2] رکھا ہے۔ اس میں وہ لکھتے ہیں کہ لوگوں نے اس بارے میں توقف اختیار کیا ہے اور کہا ہے کہ یہ الفاظ اہل سنت کے اصول کے مناسب نہیں ہیں۔ یہ تو معتزلہ کے اصول کے مطابق ہے اہل سنت کے نزدیک یہ عدل کے کیسے منافی ہو سکتا ہے حالانکہ ان کے ہاں اللہ کی طرف سے بہتر کام کا کرنا اللہ کے فضل میں سے ہے اور معتزلہ اللہ پر یہ واجب قرار دیتے ہیں کہ وہ بہتر کام کرے اور انکی بنا حسن و قبح عقلی ہے۔ پھر سیوطی فرماتے ہیں کہ بیشک اس معاملہ میں اشکال پایا جاتا ہے۔ میں خود کچھ دنوں تک اس میں توقف کرتا رہا تا آنکہ اللہ تعالیٰ نے اپنی مہربانی سے مجھے یہ بات سمجھا دی کہ اس قول میں امام غزالیؒ نے اپنے دعوے کے ثبوت میں اہل سنت اور معتزلہ دونوں مذہبوں کے مطابق دلیل پیش کرنا چاہی ہے بالفاظِ دیگر انھوں نے یوں کہا ہے کہ دونوں مذہبوں کے نزدیک یہ محال ہے اہلسنت

---

[1] جلال الدین سیوطی: مصر میں ۸۴۹ھ ۱۴۴۵ء میں پیدا ہوئے۔ آٹھ برس کی عمر میں قرآن مجید حفظ کیا۔ ۹۱۱ھ ۱۵۰۵ء میں روضہ میں جو نیل میں ایک جزیرہ ہے۔ ان کی وفات ہوئی۔ انھیں خاتمۃ الحفاظ کہا جاتا ہے۔ انھوں نے پانچ سو کے قریب کتابیں اور رسالے لکھے۔

[2] کتاب میں اسی طرح دیا ہے مگر کشف الظنون (ج: ۱ ص ۲۱۹) میں ایک جگہ تشیید اور دوسری جگہ تشدید دیا ہے اور میرے خیال میں کتاب میں دیا ہوا نام بہتر معلوم ہوتا ہے۔

کے ہاں تو اس لیے کہ بہتر جہان کا نہ پیدا کرنا فضل اور مہربانی کے منافی ہے جسے جود خداوندی سے تعبیر کیا ہے اور معتزلہ کے نزدیک اس لیے کہ یہ ظلم ہے جو عدل کے منافی ہے

مؤلف کہتا ہے کہ اگر امام غزالیؒ نے اسی طرح عبارت کو ادا کیا ہوتا تو بات آسان ہو جاتی۔ مگر غزالی تو کہتے ہیں کہ اگر اللہ تعالیٰ نے باوجود قدرت کے بہتر جہان پیدا نہ کیا ہوتا تو یہ بخل ہوتا جو سخاوت کے منافی ہے اور اہل سنت اللہ تعالیٰ کو بخل کے وصف سے منزہ سمجھتے ہیں۔ لہٰذا پہلی عبارت اہلسنت کے مذہب پر پوری نہیں اترتی۔

شرف الدینؒ تلمسانی کا بیان

شرف الدینؒ[1] بن تلمسانی شرح اللمعؒ[2] میں رعایت اصلح کے واجب ہونے کے متعلق بغداد کے معتزلہ کا ذکر کرنے کے بعد لکھتے ہیں کہ ان لوگوں کے مذہب کا ماخذ فلاسفہ ہیں جن کا عقیدہ ہے کہ اللہ تعالیٰ سخی ہے اور جو چیز وجود میں آئی ہے وہ انتہائی ممکن چیز ہے اور اگر ایسا نہ ہوتا تو خدا سخی نہ کہلاتا۔

ابن ہمامؒ کا بیان

مسایرہ[3] میں لکھتے ہیں کہ معتزلہ کا عقیدہ ہے کہ اصلح کی رعایت نہ کرنا بخل ہے جس سے اللہ کو منزہ سمجھنا چاہیئے لہٰذا غیر اصلح کے وجود کا محال ہونا واجب آیا لہٰذا جیسے دوسری شق معتزلہ کے اصول پر ہے۔ اسی طرح شق اول بھی۔ واللہ اعلم۔

سید سمہودیؒ کا جواب

محدث اعظم شریف سید سمہودیؒ نے بھی مذکورہ بالا رسالہ میں اس کا جواب دیا ہے انھوں نے تینتیس ورقوں میں بہت طویل بحث کرتے ہوئے غزالی کی حمایت کی ہے اور ناصر الدین بن المنیر کے مذکورہ بالا رسالہ کی تردید کی ہے۔ سید سمہودی کا بیان تین باتوں پر مبنی ہے پہلا یہ کہ اس نے اصل موضوع سے گریز کیا ہے، دوسرے یہ کہ اسے قبح عقلی اور حسن عقلی کے سمجھنے میں غلطی لگی ہے اور تیسرے یہ کہ اس نے ابن منیر کے کلام کو صحیح طور پر سمجھا ہی نہیں۔

---

[1] شرف الدینؒ بن تلمسانی : شرف الدین عبداللہ بن محمد الفہری التلمسانی۔ انھوں نے مختصر سی شرح لکھائی تھی۔ انھوں نے تنبیہ فی فروع الشافعیۃ کی بھی شرح لکھی ہے (کشف الظنون : ۱ : ۲۵۵)

[2] اللمع : اللمع کا پورا نام لمع الادلۃ ہے جو امام عبدالملکؒ بن عبداللہ جوینی المعروف امام الحرمین کی تالیف ہے۔ امام الحرمین نے ۴۷۸ھ میں وفات پائی۔

[3] ابن ہمامؒ : کمال الدین محمد بن ہمام الدین عبدالواحد المعروف بابن الہمام۔ کتاب کا پورا نام مسایرۃ فی العقاید المنجیۃ فی الآخرۃ پہلے انھوں نے امام غزالی کے رسالہ قدسیہ کی شرح کی مگر بعد میں دل میں اس اضافہ کرنے کا خیال پیدا ہو گیا اور اضافہ کرتے کرتے یہ ایک مستقل کتاب بن گئی۔

تیسرا گروہ

تیسرا گروہ ان لوگوں کا ہے جو یہ کہتے ہیں کہ الغزالی نے یہ بات کہی ہی نہیں۔ ان کی دلیل یہ ہے کہ ہم نے اس کلام کا مقابلہ الغزالی کی دوسری کتابوں کے بیانات سے کیا اور اس کلام کو ان کے بالکل مخالف پایا ہے اور متضاد باتوں پر کوئی عقلمند انسان اعتقاد نہیں رکھ سکتا چہ جائے کہ غزالی۔ اسی لیے ہم کہتے ہیں کہ یہ ہو نہیں سکتا کہ غزالی نے ایسے الفاظ کہے ہوں چنانچہ غزالی نے کئی ایک مقام پر اس کے خلاف لکھا ہے۔

پہلی عبارت

پہلی عبارت مستصفیٰ کی عبارت ہے جہاں غزالی کہتے ہیں کہ "فلاسفہ کا یہ کہنا کہ اللہ نے انہیں چھوڑ رکھا ہے تاکہ وہ خود بخود باز آجائیں اور ثواب کے مستحق ہوں محض خام خیالی ہے اس لیے کہ اللہ کو معلوم ہے کہ یہ لوگ خود باز نہ آئیں گے لہٰذا انہیں جبراً روکنا چاہیئے۔ چنانچہ بہت سے لوگ اپنے عجز کے سبب فواحش سے باز رہتے ہیں اور یہ بہتر ہے بہ نسبت اس کے کہ انہیں فواحش کے کرنے کی قدرت دی جائے، باوجود اس کے کہ اللہ کو علم ہے کہ یہ باز نہ آئیں گے۔" یہاں پر غزالی نے "احسن" کا لفظ استعمال کیا جو "ابدع" کا مترادف ہے لہٰذا اس بیان کے مطابق موجود جہان سے بہتر جہان ممکن ہوا۔ یہ مستصفیٰ کی عبارت ہے جو غزالی نے سیاحت و گوشہ نشینی کے بعد آخر عمر میں لکھی اور احیاء اس سے پہلے لکھی گئی تھی جیسا کہ مستصفیٰ کے خطبہ میں خود غزالی نے لکھا ہے۔ امام غزالی نے درس و تدریس شروع کر دیا تھا۔ ان کی گوشہ نشینی گیارہ سال تک رہی۔ غزالی نے خود اپنی گوشہ نشینی کا سبب اور علم کی طرف رجوع وغیرہ تمام پر طویل بحث کی ہے اور اس کا ذکر اَلْمُنْقِذُ مِنَ الضَّلَالِ میں کیا ہے۔ واللہ اعلم۔

دوسری عبارت

امام غزالی الاقتصاد میں فرماتے ہیں۔ جہاں تک موجودہ مخلوق کا تعلق ہے تمام عقلمندوں نے اس کے عدم کی تمنا کی ہے چنانچہ کسی نے کہا "یَالَیْتَنِیْ کُنْتُ نَسْیًا مَّنْسِیًّا" (کاش میں ایک بھولی ہوئی چیز ہوتا) دوسرے نے کہا "یَا لَیْتَنِیْ لَمْ اَکُ شَیْئًا" (کاش میں کچھ بھی نہ ہوتا) اور تیسرے نے کہا "یَا لَیْتَنِیْ کُنْتُ تِبْنَۃً رُفِعَتْ مِنَ الْاَرْضِ" (کاش کہ میں زمین سے اٹھایا ہوا تنکا ہوتا) یہ تو انبیاء و اولیاء کے اقوال ہیں جو عقلمند ہوتے ہیں چنانچہ ایک کی یہ تمنا تھی کہ وہ پیدا ہی نہ ہوتا اور دوسرے کی یہ تمنا تھی کہ وہ جمادات ہوتا اور مکلّف نہ قرار دیا جاتا مجھے تو یہ بات سمجھ میں نہیں آتی کہ عقلمند یہ کہنا کیسے روا سمجھ سکتا ہے کہ مخلوقات کو مکلّف ہونے میں فائدہ ہے،

---

[1] یہ حضرت مریمؑ کا قول ہے۔ قرآن مجید۔ سورۂ مریم آیت ۲۳

[2] یہ قول حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا ہے۔ ملاحظہ ہو لواقح الانوار فی طبقات الاخیار ج ۱ : ۱۷

حالانکہ فائدہ تو کلفت کی نفی میں ہے اور اگر ثواب جو اس کلفت کا فائدہ ہے کی طرف دیکھا جائے تو اللہ تعالیٰ تو بغیر تکلیف کے ہی مخلوق کو ثواب پہنچانے پر قادر ہے۔

اگر کوئی کہے کہ ثواب اگر استحقاق سے حاصل کیا جائے تو اس میں زیادہ لذت اور بلندی پائی جاتی ہے۔ بہ نسبت اس کے کہ یہ بطور احسان حاصل ہو۔

اس کا جواب یہ ہے کہ جو شخص اللہ کے ساتھ تکبر کرتا ہو اور اللہ کے احسانات اٹھانے سے اپنے آپ کو بلند سمجھتا ہو اور جو اللہ کے احسان سے باہر رہنے کو لذت سمجھتا ہو اس کی عقل سے اللہ کے ساتھ پناہ لینا، شیطان سے پناہ مانگنے سے بدرجہا بہتر ہے۔ یہ بات ہماری سمجھ میں نہیں آتی کہ وہ شخص کیسے عقلمند سمجھا جا سکتا ہے جس کے دل میں اس قسم کے وسوسے پیدا ہوتے ہوں اور جو شخص تھکان اور تکلیف برداشت کیے بغیر جنت میں ابد الاباد رہنے کو بارِ خاطر سمجھتا ہو، اس سے کلام بھی کیا جاتے۔

تیسری عبارت

غزالیؒ احیاء کے باب قواعد العقائد میں کہتے ہیں۔ "اللہ تعالیٰ نے مخلوق اور ان کے اعمال کو پیدا کیا۔ ان کے رزق اور عمر کو مقرر کیا۔ اس کی قدرت سے کوئی چیز بھی باہر نہیں رہ سکتی اور نہ ہی اس کے علم سے امور کا تصرف مخفی رہ سکتا ہے نہ اللہ کے مقدورات کا کچھ شمار ہے، نہ اس کے معلومات کی انتہا۔" اس کے بعد فرماتے ہیں۔ "اسی کا فضل و احسان ہے اور اسی کی نعمتیں اور انعامات ہیں وہ مخلوق پر مختلف قسم کے عذاب نازل کرنے پر انہیں قسم قسم کے آلام و امراض میں مبتلا کرنے پر قادر ہے چنانچہ جب اللہ تعالیٰ ایسا کرتے ہیں تو یہ ان کی طرف سے عدل ہے۔ نہ اس میں کسی قسم کی قباحت ہے نہ ظلم۔ اس لیے کہ اللہ پر کوئی فعل واجب نہیں نہ اس سے ظلم کا تصور بھی ہو سکتا ہے اور نہ اس پر کسی کا حق لازم آتا ہے۔

اس کے بعد فرماتے ہیں کہ اگر کوئی کہے کہ جب اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کی اصلاح کرنے پر قادر ہے مگر اس نے پھر بھی ان پر عذاب کے اسباب مسلّط کر رکھے ہیں تو یہ ایک قبیح بات ٹھہری جو حکمت کے شایان نہیں ہے۔

اس کے جواب کے دوران میں غزالیؒ فرماتے ہیں: جیسے اللہ سے ظلم کا تصور نہیں ہو سکتا کیونکہ وہاں تو ملکِ غیر میں تصرف کا تصور ہی نہیں آ سکتا۔ پھر آگے چل کر فرماتے ہیں کہ حکیم کا مطلب یہ ہے کہ وہ حقائقِ اشیاء سے واقف اور اپنے ارادہ کے مطابق انہیں اچھی طرح سے کر سکتا ہو۔ اس عبارت سے "رعایت اصلح" کے معنی کہاں سے نکلتے ہیں۔ یا یہ معنی کیسے نکلتے ہیں کہ حکیم وہ ہے جو

اپنی ذات کو مدنظر رکھتے ہوئے اصلح کا خیال رکھے تاکہ اس سے دنیا میں تعریف اور آخرت میں ثواب حاصل کر سکے یا اپنے نفس سے ضرر یا عذاب کو دور رکھ سکے حالانکہ یہ تمام چیزیں اللہ پر محال ہیں۔ اسی قسم کی کئی ایک اور عبارتیں احیاء میں موجود ہیں جن کا مطالعہ احیاء سے کر لینا چاہیئے۔ برہان الدین بقاعی نے ان تمام عبارتوں کو اپنے مذکورہ بالا رسالہ میں جمع کر دیا ہے۔ ان عبارتوں کا باہم مقابلہ کرنے سے معلوم ہو جائے گا کہ دونوں عبارتوں میں تضاد پایا جاتا ہے اس لیے یہ عبارت غزالیؒ کی نہیں ہو سکتی۔

اگر کہیں کہ یہ غزالیؒ پر اتہام کیسے ہو سکتا ہے کہ اس نے ایسی بات کہی ہے حالانکہ اس کی متعدد کتابوں میں یہ عبارت موجود ہے بالخصوص الاجوبۃ المسکتہ میں جس کا ہم اوپر ذکر کر چکے ہیں کیونکہ صاف معلوم ہوتا ہے کہ غزالیؒ کو جب اس عبارت کا اشکال معلوم ہوا تو اس کے جواب کی طرف توجہ کی اور اگر یہ محض اتہام ہوتا تو غزالیؒ فوراً اس کا انکار کر دیتے اور اس قسم کے قول سے بیزاری کا اظہار کرتے۔

اس کے جواب میں ہم کہتے ہیں کہ ہو سکتا ہے کہ غزالی پر دوبارہ اتہام لگایا گیا ہو، ایک بار اس مسئلہ کو اس کی طرف منسوب کرنے میں اور دوسری بار جواب کو اس کی طرف منسوب کرنے میں چنانچہ قاضی ابوبکرؒ الباقلانی کتاب الانتصار میں کہتے ہیں کہ کسی مسئلہ کا ایک ہزار ایسی کتابوں میں جو کسی امام کی طرف منسوب ہوں پایا جانا اس بات کی دلیل نہیں ہو سکتی کہ اس نے وہ بات کہی ہے جب تک کہ وہ مسئلہ تواتر سے اس سے منقول نہ ہو اور جس کے طرفین اور واسطہ دونوں ایک جیسے نہ ہوں اور یہ بات اس مسئلہ میں مفقود ہے اسی لیے ہم نے فیصلہ دیدیا ہے کہ غزالیؒ نے یہ بات کہی ہی نہیں ہے کیونکہ ہم اسے اہلسنت کے عقیدہ اور خود دیگر کتابوں میں غزالیؒ کے عقیدہ کے مخالف پاتے ہیں۔ واللہ اعلم۔

مؤلف کہتا ہے کہ میں نے اس بحث کو اس قدر لمبا اس لیے کر دیا اور اس کے رد کرنے کی طرف اسلیئے توجہ دی ہے کہ میں نے اکثر لوگوں کو اس سے جاہل پایا اور وہ اس عقیدہ کو اس لیے صحیح سمجھتے ہیں کہ اسکا قائل غزالی ہے چنانچہ غزالی خود المنقذ من الضلال میں کہتے ہیں کہ بیوقوف لوگوں کا یہی حال ہوتا ہے۔ وہ لوگوں کے اعتبار سے حق بات کی شناخت کرتے ہیں اور بات سے حق لوگوں کو نہیں پہچانتے مگر عقلمند امیر المومنین علیؓ بن ابی طالب کے فرمان کی پیروی کرتا ہے چنانچہ وہ فرماتے ہیں: لوگوں کے اعتبار سے حق بات کی شناخت نہ کرو بلکہ حق بات کو پہچانو، اہلِ حق تمہیں خود بخود معلوم ہو جائیں گے۔" لہٰذا عقلمند پہلے حق کی شناخت کرتا ہے۔ پھر نفسِ قول میں غور کرتا ہے، اگر حق ہو تو قبول کر لیتا ہے، خواہ کہنے والا اہل حق میں سے ہو خواہ اہلِ باطل میں سے۔ چنانچہ آگے چل کر فرماتے ہیں: اکثر لوگوں کی یہی حالت ہے کہ اگر تو کسی کلام کو

کسی ایسے شخص سے منسوب کرے جس کے متعلق ان کا اعتقاد اچھا ہو تو وہ اس کلام کو قبول کر لیتے ہیں خواہ وہ باطل ہی کیوں نہ ہو اور اگر تو کسی کلام کو ایسے شخص سے منسوب کرے جس میں ان کا اعتقاد اچھا نہ ہو تو وہ اسے رد کر دیں گے خواہ وہ بات حق ہی کیوں نہ ہو، وہ ہمیشہ حق بات کو آدمیوں کے ذریعہ سے پہچانتے ہیں اور یہ انتہا درجہ کی گمراہی ہے۔

اللہ تعالیٰ نے مجھے ابوحامد الغزالیؒ کے بارے میں گستاخی کرنے سے بچا لیا۔ اس طرح کہ جب میں نے اس مسئلہ کا رد کرنا چاہا تو حضرت کو اس بات کی اطلاع ہو گئی چنانچہ انھوں نے میرے دل میں الغزالیؒ کی تعظیم ڈال دی۔ چنانچہ میرے رد کی تمام تر توجہ مسئلہ کی طرف رہی اور الغزالیؒ کے متعلق میں نے ایک کلمہ تک بھی نہ کہا بلکہ سوائے ان کی تعظیم کے ان کا ذکر تک نہیں کیا۔ یہ سب حضرت کی برکت تھی۔

حضرت کی توجہ وفات کے بعد بھی ہماری طرف رہی چنانچہ وفات کے بعد نیم خوابی کے عالم میں تھا کہ میں نے انہیں دیکھا اور حضرت مجھ سے دیر تک باتیں کرتے رہے یہاں تک کہ آپ مجھے لے کر الغزالیؒ کے پاس پہنچے اور فرمایا یہ قطب ہیں، ان کی بہت تعظیم کرو۔ نیز فرمایا: اللہ تعالیٰ نے انہیں ایسا لباس پہنایا ہے کہ میں اسے دیکھ کر اپنے آپ کو حقیر سمجھنے لگ جاتا ہوں حالانکہ میں اولیاءِ کبار میں سے ہوں۔ پھر اپنی انگلیوں کو ایک دوسرے میں داخل کر کے فرمایا کہ یہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا عہد ہے۔ یاد رکھو کہ غزالیؒ ولی کبیر ہیں اور وہ میرے ساتھ ہوتے ہیں اور مجھ سے اکثر علوم کے متعلق جن کی انہیں آخرت میں ضرورت ہے دریافت کرتے رہتے ہیں۔"

یہ سب کچھ خواب میں تھا۔ جب اٹھا تو میرے دل میں غزالیؒ کی محبت گھر کر چکی تھی اسی وجہ سے میں نے ان کے حق میں کوئی کرخت عبارت استعمال نہیں کی بلکہ حضرت کی برکت سے میں نے ان کا ادب ملحوظ رکھا ہے۔ خدا کرے کہ میرے یہ کلمات خاص اللہ کی رضامندی کے لیے ہوں۔ وَلَا حَوْلَ وَلَا قُوَّةَ اِلَّا بِاللّٰہِ الْعَلِیِّ الْعَظِیْمِ۔ وَالْحَمْدُ لِلّٰہِ الَّذِیْ هَدَانَا لِهٰذَا وَمَا كُنَّا لِنَهْتَدِیَ لَوْلَا اَنْ هَدَانَا اللّٰہُ وَصَلَّی اللّٰہُ عَلٰی سَیِّدِنَا مُحَمَّدِ النَّبِیِّ الْاُمِّیِّ وَعَلٰی اٰلِهٖ وَصَحْبِهٖ وَسَلَّمَ تَسْلِیْمًا كَثِیْرًا۔ وَالْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ۔

آٹھواں باب

حضرت آدم علیہ السلام کی پیدائش اور ان کا مختلف مدارج میں سے گزرنا اور اس بات کا بیان کہ انسانی شکل وصورت افضل ترین شکل وصورت ہے

حضرت نے فرمایا کہ جب اللہ تعالیٰ نے آدم علیہ السلام کو پیدا کرنا چاہا تو دس دن میں ان کی مٹی کو جمع کیا اور بیس دن تک اسے پانی میں چھوڑے رکھا۔ چالیس دن میں ان کی صورت بنائی اور اس کے بعد بیس دن تک اسے چھوڑے رکھا یہاں تک کہ وہ مٹی سے منتقل ہو کر جسمیّت کی طرف آگئے یہ تمام تین ماہ ہوتے ہیں۔ یعنی رجب، شعبان ورمضان اس کے بعد اللہ نے انہیں جنّت کی طرف اٹھا لیا اور جنت ہی میں ان کی روح پھونکی گئی اور جنت ہی میں مائی حوّا ان سے پیدا کی گئیں۔ جب مائی حوّا کی عمر دو ماہ کی ہوئی تو دونوں میں شہوانی مادہ پیدا کیا گیا چنانچہ آدم علیہ السلام نے مجامعت کی اور وہ حاملہ ہو گئیں اور حمل کے تین ماہ بعد زمین پر اتر کر ان کا وضع حمل ہوا پھر اس دنیا میں جو حمل ہوا اس سے نو ماہ بعد وضع حمل ہوا اور یہی عادت آج تک قائم رہی۔

میں نے دریافت کیا کہ وہ کونسی مٹی تھی جس سے آدمؑ کی پیدائش ہوئی؟

فرمایا یہ تمام کانوں کی مٹی تھی، سونے کی کان کی، چاندی کی کان کی، تانبے کی کان کی اور دیگر معدنیات کی چنانچہ ان سب میں سے آپ کی مٹی لی گئی اور اسے ایک جگہ اکٹھا کر کے آدمؑ کو پیدا کیا گیا۔

میں نے دریافت کیا کہ اس مٹی کو کس نے جمع کیا؟

فرمایا: فرشتوں نے اور جن سے اکٹھا کرانا اللہ نے چاہا مگر سب سے زیادہ مٹی جبرئیل علیہ السلام نے اٹھائی اس لیے کہ اللہ تعالیٰ نے ان سے وعدہ فرمایا تھا کہ مٹی کی ایک مخلوق ہوگی جس سے بڑھ کر اللہ کے ہاں کوئی مخلوق نہ ہوگی اور جبرئیل اس کے ساتھی اور رفیق ہوں گے اور اس سے جبرئیل کو

بہت برکت ہوگی اور وہ مخلوق سید الوجود محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔ لہٰذا جبریل اس امید پر کہ یہ مٹی اس مخلوق کے لیے جمع کی جارہی ہے جس کا انہیں وعدہ دیا گیا ہے، مٹی جمع کرتے تھے۔

میں نے دریافت کیا: اس مٹی کی مقدار کتنی تھی؟

فرمایا: اتنی تھی کہ ایک میل یا کچھ کم زمین آباد ہو جائے۔ یعنی اس قدر کثیر مقدار میں مٹی جمع کی گئی۔

میں نے عرض کیا کہ اسے جمع کرنے میں دس دن کی کیوں ضرورت ہوئی حالانکہ اللہ تعالیٰ اسے ایک لحظہ میں جمع کر سکتے ہیں؟

فرمایا: اللہ تعالیٰ آسمان اور زمین کو بھی تو ایک لحظہ میں پیدا کر سکتے تھے، انہیں پیدا کرنے میں چھ دن کیوں لگائے اور آدمؑ کو مٹی کے سوا بھی پیدا کر سکتے تھے۔ مٹی سے کیوں بنایا، لیکن بات یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ بعض اشیاء کو پیدا کرتے ہیں۔ اور ان کی پیدائش کو چند دنوں میں ترتیب دیتے ہیں اور اسے تھوڑا تھوڑا کر کے چلاتے ہیں جس سے ملأ اعلیٰ کو توحید عظیم حاصل ہوتی ہے اس لیے کہ اس مخلوق کے ایک حالت سے دوسری حالت میں منتقل ہونے اور اس کے آہستہ آہستہ ظاہر ہونے میں ملاء اعلیٰ کی توجہ اس حادث مخلوق میں امرِ الٰہی پر تعجب کے ساتھ پڑتی رہتی ہے اور اس بارہ میں غور و فکر رہتا ہے کہ اللہ تعالیٰ اسے کیسے پیدا کر رہا ہے اور اس سے کیا نتیجہ برآمد ہوگا اور اس کا انجام کیا ہوگا لہٰذا جس حالت پر اس مخلوق کا خروج ہونا ہے اسے ملاء اعلیٰ دیکھتے رہتے ہیں اور اس سے انہیں بیحد توحید حاصل ہوتی ہے لہٰذا اس زمانہ میں جبکہ وہ اس کی پیدائش کو دیکھتے رہتے ہیں انہیں اللہ تعالیٰ کی بہت بڑی معرفت اور اس کی قدرت کاملہ کا علم اور اشیاء مخلوقہ میں اس کے سریان و جریان کا بہت بڑا علم حاصل ہو جاتا ہے اس لیے اس مخلوق کے پیدا کرنے کا کوئی راز ان سے مخفی نہیں رہتا اور انہیں مکمل فہم حاصل ہو جاتی ہے لہٰذا یہ تدریجی تخلیق اسی حکمت کے لیے ہے۔ اس تدریجی تخلیق میں ایک اور حکمت بھی ہے اور وہ یہ ہے کہ اس تدریجی اور حادث کے نکلنے کے انتظار اور شوق میں دیگر مخلوقات وجود میں آتی ہیں جو اسی مرتبہ کی یا اس سے بھی بڑھ کر ہوتی ہے لہٰذا اللہ تعالیٰ کی ہر چیز میں اسرار و حکمتیں پائی جاتی ہیں۔

میں نے دریافت کیا کہ وہ پانی کونسا پانی تھا جس میں یہ مٹی ڈالی گئی اور بیس دن اسی میں پڑی رہی؟

فرمایا: یہ ایک خاص پانی تھا جس میں آدم اور اس کی ذریت کا نفع تھا کیونکہ یہ پانی اسی زمین کا پانی تھا جس کی طرف درحقیقت آدم کو نسبت دی جاتی تھی لہٰذا یہ ذات آدم کے مناسب و موافق تھا۔

میں نے دریافت کیا: کیا یہ پانی زمین کی جڑ سے تھا یا کوئی اور؟

فرمایا: یہ زمین کی جڑ میں سے تھا مگر اس کا گزر اکثر اجزاء ارض پر ہو چکا تھا اس کی صورت یوں ہے کہ زمین پر سے گزرنے والے بعض پانی زمین کے کچھ حصّہ پر سے گزرتے ہیں لہٰذا وہ اتنے ہی حصّہ کا اثر حاصل کر سکتے ہیں اور بعض اکثر یا کل اجزاء سے گزرتے ہیں لہٰذا وہ اتنے ہی حصّہ کا اثر حاصل کر سکتے ہیں اور بعض اکثر یا کل اجزاء سے گزرتے ہیں اور ان کا اثر حاصل کر لیتے ہیں اور یہ پانی ان چشموں میں سے ایک چشمے کا پانی ہے جو شام کی زمین میں سے نکلتا ہے اور وہیں حضرت آدمؑ کی مٹی ایک پست زمین میں جمع کی گئی جس کی مسافت کا ذکر ہو چکا ہے اور اس پانی سے اس مٹی کو تر کیا گیا کیونکہ اسے اطرافِ زمین کے پانیوں سے مدد پہنچتی ہے چنانچہ یہ پانی تہ زمین کے اجزاء کو پھاڑتا ہوا نکل جاتا ہے یہاں تک کہ اس چشمہ تک پہنچ جاتا ہے اور یہ چشمہ اب تک موجود ہے جس کا پانی روئے زمین کے دیگر پانیوں کے مقابلہ میں ذاتِ انسانی کے زیادہ موافق ہے یہ مٹی پانی میں بیس دن تک پڑی رہی تب جا کر آدمؑ کی شکل بننے لگی جبکہ ابھی تک وہ مٹی میں تھے۔ ان کی یہ شکل آہستہ آہستہ بنتی رہی تاآنکہ چالیس دن میں مٹی کے اندر ہی شکل مکمل ہو گئی مگر کوئی چیز نظر نہیں آتی تھی۔ اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے اسے مٹی سے جسم کی طرف منتقل کرنے کا ارادہ کیا تو آدم کی انگلیوں میں پھنسی سی ظاہر ہوئی جو بھر کر پھٹ گئی اور اس کا مادہ انگلی پر جم کر ایسا سفید ہو گیا جیسے درخت کھجور کی چھال اتارنے کے بعد اندر کا گودا ہوتا ہے جسے شحم النخلہ کہتے ہیں۔ اس کے بعد ایک ایک عضو اور ہر ہر جزو میں سرایت کرتا رہا حتیٰ کہ تمام کا تمام صفائی اور رطوبت کے اعتبار سے شحم النخلہ بن گیا۔ یا ایسا جیسے خالص گیہوں کے آٹے کا گندھا ہوا صاف پیڑا ہوتا ہے پس اس سے آدمؑ کی شکل بنی پھر اس میں تھوڑا تھوڑا خونی مادہ پیدا ہوا۔ گارہ پھٹ کر جدا ہو گیا اور اس میں خشکی نمودار ہو گئی۔ اس کے بعد اس پر ہوائیں چلتی رہیں اور اجزا خشک ہوتے رہے اور اللہ کے حکم سے ہڈیاں بن گئیں۔ جب بیس دن میں آدم کی تخلیق مکمل ہو گئی اور اللہ نے اس میں رُوح پھونکنے کا ارادہ کیا تو انہیں اٹھا کر جنت میں منتقل کر دیا۔

میں نے پوچھا کہ یہ جنت کون سی تھی؟

فرمایا: پہلی جنت۔ جب وہاں آگئے تو اس میں روح داخل ہوئی اور ساتھ ہی ساتھ عقل و علم کا دخول ہوا اور ان کو خدا کی معرفت حاصل ہوئی۔ اس وقت حضرت آدمؑ نے کھڑا ہونا چاہا مگر انہیں لرزہ آیا اور گر پڑے۔ پھر کھڑا ہونا چاہا مگر پھر گر پڑے جس طرح کہ بچے اُٹھنے لگتے ہیں تو گر پڑتے ہیں۔ اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے انہیں وہ مشاہدہ عطا کیا جس کا ذکر اسماء حسنیٰ میں کیا جا چکا ہے۔ یہ مشاہدہ انہیں اس حالت میں نصیب ہوا جبکہ آپ ایک پاؤں زمین پر رکھے اور دوسرے پاؤں کا گھٹنا زمین پر ٹیکے ہوتے تھے۔

جب آپ کو یہ مشاہدہ حاصل ہوا تو آپ کی زبان سے اَللّٰہُ اَللّٰہُ اَللّٰہُ لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ مُحَمَّدٌ رَّسُولُ اللّٰہِ نکلا۔ اس پر اللہ تعالیٰ نے آپ کو قوت عطا فرمائی جس سے آپ سیدھے کھڑے ہو کر جنت میں چلنے لگے، جہاں چاہتے جاتے۔ اس کے بعد آپ کی پسلی میں درد ہوا جس سے آدمی کے سر جتنا ایک بڑا پھوڑا بن گیا جس میں پھٹ کر ایک چھوٹا سا ڈھانچہ نکلا اور زمین پر گر گیا۔ حضرت آدمؑ نے اسے دیکھا تو اسے اپنی شکل کا پایا اور اسے ویسا ہی چھوڑ دیا۔ جنت کی ہوا اور جھونکے اس ڈھانچے کو لگتے رہے جس سے اس میں بہت جلد نشوونما ہوا۔ حضرت آدمؑ بھی اس کی دیکھ بھال کرتے رہتے اور دیکھتے کہ یہ ڈھانچہ بہت جلد بڑا ہو رہا ہے لہٰذا آپ اس سے مانوس ہونے لگ گئے اور اس کے پاس بیٹھتے۔ اللہ نے اس ڈھانچے میں عقل ڈال دی اور اس نے حضرت آدمؑ سے کلام کرنا شروع کر دیا۔ ابھی دونوں کو جنت میں دو ماہ ہی گزرے تھے کہ ان میں مادۂ شہوت ڈالا گیا۔ حضرت آدمؑ نے اس ڈھانچے (حوا) سے مباشرت کی چنانچہ وہ حاملہ ہو گئیں اور مذکورہ بالا مدت میں وضع حمل ہوا۔

فرمایا کہ حضرت آدمؑ کو جنت کے انوار سے سیراب کرنے کی غرض سے جنت کی طرف اٹھایا گیا تھا تاکہ آپ کی اولاد روزِ اَلَسْتُ کے عہد کو بھول نہ جائے۔ نیز محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی تعظیم کی خاطر۔ اور اس کو اہلِ بصیرت خوب جانتے ہیں۔

میں نے عرض کیا جس درخت کے کھانے سے حضرت آدمؑ کو منع کیا گیا تھا وہ کونسا درخت تھا؟

فرمایا: بلا شک وشبہ وہ انجیر کا درخت تھا اور اس کے کھانے کی ممانعت صرف اس لیے فرمائی تھی کہ یہ درخت اور اس کے علاوہ دیگر انواع اشجار جنت اسہال لاتی ہیں لہٰذا اس کے کھانے سے ممانعت فرما دی کہ دست آنے لگیں گے تو پھر جنت میں نہ رہ سکیں گے۔

میں نے عرض کیا کہ جنت کا کھانا جنت کے پھل اور نعمتیں اگرچہ ان کا جسم ہے مگر خالص انوار ہیں جن میں ثقل نام کو بھی نہیں۔ جیسا کہ بہت سی حدیثوں میں آیا ہے اور جس میں ثقل نہ ہو گا۔ اس کے کھانے سے دست نہ آئیں گے؟

حضرت نے فرمایا: تم صحیح کہہ رہے ہو۔ مگر اہلِ جنت جب قیامت کے دن جنت میں جائیں گے تو ان کی بنیاد درست ہو گی اور ان میں اس قدر قدرت ہو گی کہ کسی پر مخفی نہیں مگر جب حضرت آدمؑ جنت میں داخل ہوتے تھے تو ان کی ذات ایسی نہ تھی چنانچہ جب اہلِ جنت کے پیٹ میں نعمتیں اتریں گی تو وہ اپنی ذات کی قوت کے سبب انہیں برداشت کر لیں گے۔ نیز اس لیے بھی کہ ان کی ذوات اس وقت نعمتوں کی طرح انوار ہی انوار ہوں گی اور انوار انوار میں مل جائیں گے۔ برخلاف اس وقت کے

جب آدمؑ جنت میں داخل ہوئے تھے اس وقت ان کی ذات ترابی اور کمزور تھی اس لیے اس درخت کے کھانے کو برداشت نہ کر سکی۔

میں نے عرض کیا کہ اس کا مطلب تو یہ ہے کہ اس وقت آدمؑ کی ذات نہ اس درخت اور نہ کسی اور درخت کے کھانے کی طاقت رکھتی تھی (پھر کھاتے کیا تھے؟)

فرمایا: جنت کے درخت اور جنّت کی نعمتیں دو قسم کی ہیں۔ ایک تو وہ قسم ہے جو خالص انوار ہیں اور دنیا کی کسی نعمت کے مشابہ نہیں اور نہ ان میں ثقل ہے اور اسی کی وہاں کثرت ہے۔ حضرت آدمؑ کی ذات اس کے کھانے کی طاقت رکھتی تھی اور اسی کے کھانے کا اللہ نے حکم بھی فرمایا تھا اور دوسری قسم جو کم ہے وہ ہے جو دنیاوی نعمتوں کی ہم شکل ہے اور ان میں ثقل بھی پایا جاتا ہے۔ حضرت آدمؑ جب جنت میں تھے تو اس کے کھانے کی طاقت نہ رکھتے تھے اسی لیے اللہ نے اس کے کھانے سے ممانعت کر دی تاکہ انہیں جنت سے نکلنا نہ پڑے اور جنت کی نعمتوں کے دو قسم ہونے کی وجہ یہ ہے کہ حق تعالیٰ کے علم قدیم میں یہ بات تھی کہ اہل جنت کی دو حالتیں ہوں گی۔ ایک حالت جو کہ غالب اور کثیر ہوگی وہ یہ ہوگی کہ جنت میں دنیائے فانی کا خیال تک اہل جنت کو نہ آئے گا لہٰذا دنیا، امور دنیا اور دنیا کی تمام نعمتیں ان کے ذہن وعقل سے غائب ہوں گی۔ اس حالت میں حق تعالیٰ انہیں پہلی قسم کی نعمتیں عطا فرمائے گا اور وہ انہیں کھائیں گے اور دوسری حالت جو شاذ و نادر اور کبھی کبھی ہوگی وہ یہ ہوگی کہ دنیائے فانی کا ان کو خیال آئے گا اور جن حالات میں یہاں تھے وہ ان کے سامنے آجائیں گے لہٰذا ان کی تمنا کریں گے اور اسی وقت انہیں موجود پائیں گے۔ یہ دوسری قسم کی اشیاء ہوں گی۔ پہلی حالت بلحاظ فکر کے ہر صورت اکمل ہے کیونکہ اس حالت میں جنتیوں کی مثال ایسی ہوگی جیسے کوئی اپنے رب کے ساتھ ہو اور غیر کا اسے احساس بھی نہ ہو اور بلحاظ نعمتوں کے بھی اکمل ہیں کیونکہ دراصل یہی نعمتیں ان کے لیے مخصوص کی گئی ہیں اور یہ اہل جنت کے تقاضا کے مطابق بھی ہیں اور بلحاظ دوام کے بھی اکمل ہیں کیونکہ اہلِ جنت کی اکثر اور غالب حالت یہی ہوگی اور دوسری حالت ان تمام اعتبارات سے اس سے کمتر ہے فکر کے اعتبار سے تو اس لیے کہ یہ ان لوگوں کی طرح ہیں جو مشاہدۂ حق سے غائب ہیں اسی لیے انہیں اپنی ذات کا احساس پیدا ہوا اور اسی احساس کی وجہ سے انہیں امورِ دنیا کی فکر ہوئی اور انھوں نے اس کی نعمتوں کی خواہش کی۔

فرمایا: چونکہ اللہ تعالیٰ کو علم تھا کہ بعض اوقات اہل جنت کی توجہ دار دنیا کی طرف ہوگی اس لیے بعض چیزوں کو تو اہل جنت کی طبیعت کے مطابق پیدا کیا ان میں قطعاً کوئی ثقل نہیں اور اسی توجہ کی خاطر کچھ نعمتیں ایسی پیدا کیں کہ اہل جنت کی طبیعت کے مطابق نہیں ہیں اور ان میں ثقل اور اہلِ دنیا کی نعمتوں سے

مشابہت پائی جاتی ہے، لیکن چونکہ جنت میں ان کی ذات وطبائع جسم اور انوار قوی ترین ہونگے اس لیے انہیں ثقل معلوم نہ ہوگا مگر جب حضرت آدمؑ کی ذات جنت میں گئی تھی تو چونکہ اہلِ جنت کی ذات کے مقابلہ میں کمزور تھی اس لیے ان ثقیل نعمتوں میں انہیں ثقل محسوس ہوا۔ اسی لیے قسم ثانی کا ثقل صرف کمزور اجسام میں ظاہر ہوتا ہے اور اس وقت یہ کمزور جسم حضرت آدمؑ کے سوا کوئی اور نہ تھا۔

فرمایا: کہ اس درخت کو کھانے سے پہلے حضرت آدمؑ کی عقل کا تعلق اپنے رب کے ساتھ تھا اور وہ اپنے ذاتی مصالح سے بالکل غافل تھے، لیکن اس درخت کا پھل کھانے کے بعد معاملہ برعکس ہوگیا اور ان کی عقل اپنے ذاتی مصالح کی طرف لگ گئی۔ اس کی حقیقت یہ ہے کہ اس درخت کا پھل کھانے سے پہلے ان کا کھانا پینا محض تنعم وتفکہ کے درجہ میں تھا۔ انہیں اس سے نہ بھوک لگتی تھی نہ پیاس۔ اس لیے انہیں بھوک اور تدبیرِ معاش کی فکر ہی نہ تھی اور ان کی عقل اپنے رب کی طرف لگی رہتی تھی، مگر جب انہوں نے درخت کا پھل کھایا اور اس کے بعد اسہال ہوا اور بھوک لگی تو عقل ذات کی طرف لگ گئی اور خیال کرنے لگے کہ جب پیٹ خالی ہو تو اسے کس چیز سے بھرا جائے اور انہیں تدبیر معاش کی فکر ہوئی۔ اسی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے انہیں مشقت ومعصیت کے گھر میں اتار دیا اور چونکہ یہ بات پہلے ہی سے علم الٰہی میں تھی کہ آدم کا نزول زمین کی طرف ہوگا اس لیے حق سبحانہٗ نے ان کے لیے اسباب معاش مرتب کر دیے اور جنت سے اترنے سے پہلے ہی ذرائع معاش مہیا فرما دیے تھے۔ اس کی تفصیل یہ ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے مٹی سے آدم کی صورت بنائی۔ اور پہلے بیان ہو چکا ہے کہ یہ مٹی بہت مقدار میں تھی اس لیے اس مٹی سے حق تعالیٰ نے وہ حیوانات پیدا فرما دیے جن کی حضرت آدمؑ کو اپنی معاش کے لیے ضرورت پیش آنے والی تھی۔ ان تمام کی پیدائش بھی اسی مذکورہ بالا مٹی سے ہوئی۔ چنانچہ جب اللہ تعالیٰ نے آدم علیہ السلام کو جنت کی طرف اٹھا لیا تو عام حیوانات اس مٹی میں کیڑوں کی شکل میں ظاہر ہوئے اور ہر نوع میں سے دس دس یعنی پانچ نر اور پانچ مادہ پیدا کئے۔ شیر، چیتا، تیندوا وغیرہ ایک قسم ہوئی۔ حضرت آدم کے جنت میں اٹھائے جانے کے بعد اللہ تعالیٰ نے اس قدر زور کی بارش برسائی جس کی مثال کبھی سننے میں نہ آئی ہو چنانچہ ہر جانب سے سیلاب آیا جو اپنے ساتھ بہت سا دلدل بہا لایا جو اس مٹی کے ساتھ آ کر مل گیا۔ اس سے حیوانات کو بہت مدد و تقویت حاصل ہوئی جیسے کسی کو فارغ البالی اور سرسبزی حاصل ہو جائے اور اس کو اس سے بہت نفع حاصل ہو۔ جب نو ماہ کے بعد آدم علیہ السلام زمین پر اترے تو حیوانوں کی زمین پر چلتے پھرتے پایا اور وہ بتدریج بڑھ رہے تھے۔

آدم ان سے مانوس ہو گئے اور اللہ نے انہیں بتا دیا کہ یہ قیامت تک آپ کی اور آپ کی اولاد کی معاش کا ذریعہ[1] ہے۔

حضرت نے فرمایا: جس جگہ مٹی میں حضرت آدم کا سر تھا وہاں اللہ تعالیٰ نے نخلستان، انگور، انجیر اور زیتون اُگا دیئے۔ جب حضرت آدم نو ماہ بعد جنت سے اترے اور اُن کا پیٹ خالی ہوا تو انھوں نے کھانے کی ضرورت محسوس کی۔ اللہ تعالیٰ نے ان درختوں اور نخلستان میں ذائقہ پیدا کر دیا چنانچہ حضرت آدمؑ کا یہ پہلا رزق تھا جو انھوں نے کھایا اور ان درختوں میں اللہ کے حکم سے اس قدر کم مدت کے اندر پھل لگ گیا۔

اکرموا عمتکم النخلۃ حدیث نہیں ہے

اس پر میں نے سوال کیا کہ یہ جو لوگوں میں مشہور ہے کہ اَکْرِمُوا عَمَّتَکُمُ النخلۃ فانھا خُلِقَتْ مِنْ طِینِ آدَمَ۔ (اپنی پھوپھی کھجور کی عزت کیا کرو کیونکہ اسے آدم کی مٹی سے پیدا کیا گیا ہے) کیا یہ حدیث صحیح ہے یا نہیں۔

فرمایا: یہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلّم کا فرمودہ نہیں ہے۔

مولّف کہتا ہے کہ حُفّاظ حدیث مثلاً ابن حجر، زرکشی اور سیوطی وغیرہ نے یہی کہا ہے۔

میں نے پوچھا: کیا اللہ تعالیٰ نے ان چار درختوں کے علاوہ حضرت آدم کے لیے اور درخت بھی پیدا کئے۔

فرمایا: اللہ تعالیٰ نے اس مٹی سے ہر وہ درخت پیدا کیا جس کا ذکر قرآن میں آیا ہے مثلاً کھجور، انگور، انجیر، زیتون اور انار۔ واللہ اعلم۔

حضرت کو میں نے یہ بھی فرماتے ہوئے سنا کہ بنی آدم سے زیادہ خوبصورت کوئی مخلوق نہیں۔ لہذا ان کے اجسام تمام مخلوقات کے اجسام سے زیادہ خوبصورت، افضل، ارفع اور اقوم ہیں۔ اگر عقلمند انسان آدمی کی ذات کی تفصیل اس کے اجزاء کی ترکیب، اس کے جوڑوں اور رگوں کی ترتیب اور ان ظاہری اور باطنی خوبیوں میں غور کرے جن پر اس کی ساخت مشتمل ہے تو حیران ہو جائے اور اسے حق سبحانہ، جو اس کا خالق و مصوّر ہے، کی عظمت معلوم ہو جائے۔

ذاتِ آدم ذاتِ ملائکہ سے افضل ہے

میں نے دریافت کیا کہ ذاتِ آدم کو ذاتِ ملائکہ پر کس وجہ سے فضیلت ہے؟

[1] ارشادِ باری تعالیٰ ہے کہ خَلَقَ لَکُمْ مَّا فِی الْاَرْضِ جَمِیْعًا نے زمین کی تمام اشیاء تمہارے ہی لیے پیدا کیں۔

فرمایا: اس لیے کہ جس قدر اشیاء اللہ تعالیٰ نے آدم میں پیدا کی ہیں اس قدر ملائکہ میں پیدا نہیں کی گئیں۔ اس کے برعکس جو کچھ بھی فرشتہ کی ذات میں ہے وہ سب کچھ آدمی کی ذات میں موجود ہے مع زیادتی کے فرشتہ کی ذات نور سے ہے اور اس نور میں عقل رکھ دی گئی۔ بس اسی قدر فرشتہ کی ذات میں ہے مگر آدمی کی ذات میں یہ نور بھی ہے اور اس میں عقل بھی ہے اور روح بھی ہے اور اس میں مختلف قسم کی مٹی بھی ہے، آگ بھی ہے، ہوا بھی ہے، پانی بھی ہے اور ان میں سے ہر چیز کے اندر قوتِ الٰہیہ کے اسرار پائے جاتے ہیں۔ لہٰذا ایک ذات میں ان سب چیزوں کا جمع ہو جانا ان اسرار کو اس ذات میں قوی کر دیتا ہے۔ الحاصل ذات آدمی مختلف مخلوقات کا مجموعہ ہے اور دوسری کوئی ذات اس جیسی نہیں لہٰذا آدمی کی ذات تمامی ذوات میں قوی تر ہوئی۔ اسی لیے جس قدر اسرار کی یہ متحمل ہو سکتی ہے فرشتہ کی ذات نہیں ہو سکتی۔ یہی وجہ ہے کہ سیدنا و مولانا محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو یہی صورت و شکل عطا فرمائی گئی کہ آپ کی ذاتِ مبارکہ اسرارِ ربانی کی متحمل ہونے میں تمام مخلوقات سے قوی ترین تھی اگر آدمی کی ذات سے بڑھ کر کوئی اور صورت زیادہ قوی ہوتی تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اسی شکل و صورت میں پیدا کیا جاتا ہے۔

مؤلف کہتا ہے کہ حضرت نے جو یہ فرمایا ہے کہ آدمی کی ذات تمامی ذوات سے قوی تر اور خوبصورت تر ہے اس کی طرف امام قشیری[1] نے اسماءِ حسنیٰ کی شرح تحبیر میں اشارہ کیا ہے وہاں دیکھ لیں۔ مگر حضرت نے زیادہ تفصیل سے بیان فرمایا تھا اور میں اس میں سے بہت کم تحریر کر سکا ہوں اور بہت سی باتیں تو حضرت کی زبان پر ہی رہیں۔

پھر فرمایا: باوجود اس کے کہ آدمی کی ذات تمامی ذوات سے زیادہ خوبصورت ہے اللہ کے علم میں یہ بات تھی کہ ایک گروہ جنت میں جائے گا اور ایک دوزخ میں۔ جس کی وجہ یہ ہے کہ ان کی بصیرت اللہ تعالیٰ سے محجوب ہو گی اس لیے کہ اللہ نے پہلے تو اس ذات میں روح اور عقل ڈالی جو اس کا سِر ہے اور اس معرفتِ الٰہی اور نورِ ایمان مع مشاہدہ کے اسی عقل کے ذریعہ سے حاصل ہوتا ہے اور اللہ تعالیٰ نے اپنے اور اس ذات کے درمیان سے حجاب اٹھا لیا تو اسے کامل طور پر اپنے خالق کی معرفت حاصل ہو گی

[1] امام قشیریؒ: ابو القاسم عبد الکریم بن ہوازن بن عبد الملک بن طلحہ القشیری النیشاپوری الشافعی مشہور شافعی عالم اور زاہد گزرے ہیں۔ ان کی کتاب الرسالۃ القشیریہؒ صوفیہ کے حالات اور مقامات و مقالات میں بڑی پایہ کی کتاب سمجھی جاتی ہے اگرچہ شعرانی نے ان پر اعتراضات کیے ہیں۔ یہ ۳۷۶ھ ۹۸۶ء میں پیدا ہوئے اور ۴۶۵ھ ۱۰۷۳ء میں وفات پائی۔

مگر جب اللہ نے اپنے وعید کو نافذ کرنا چاہا تو اس ذات پر پردہ ڈال دیا جس سے وہ مشاہدہ جو اسے حاصل ہوتا تھا، جاتا رہا اور اس کا تعلق اللہ سے منقطع ہوگیا۔ کاش کہ جب اللہ تعالیٰ سے یہ بے تعلقی ہوئی تھی کسی اور سے اس کا تعلق قائم نہ ہوتا۔ یہ اس کے لیے اس حالت سے بدرجہا بہتر ہوتا جس میں وہ پڑ گیا مگر اس نے اس نورِ عقل کے تار کی طرف نگاہ لگادی جو اس میں باقی تھا اور اس سے تعلق جوڑ لیا اور اسی کو ہر بات میں اپنا تکیہ اور سہارا بنایا جس کی وجہ سے اللہ سے اس کی بے تعلقی اور بڑھ گئی کیونکہ اس نے عقل کو اس نگاہ سے دیکھا کہ یہ میری ہے اور مجھ ہی سے ہے اور ہر بات میں ذات ہی کی طرف رجوع کرتی ہے اس سے اپنے نفس کیساتھ استقلال اور اللہ تعالیٰ سے انقطاع اور بڑھ گیا۔ اگر ذات اس نگاہ سے دیکھتی کہ یہ اللہ کی طرف سے ہے اور ہر لحظہ اللہ ہی اس کا محرک ہے تو یہ اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کر لیتی اور زائل شدہ مشاہدہ دوبارہ حاصل ہوجاتا۔ الحاصل یہ کہ ذات نے ذاتِ قدیم سے تعلق قطع کیا اور حادث سے تعلق قائم کیا۔ بہتر ہوتا اگر یہ کسی چیز سے بھی تعلق قائم نہ کرتی۔

حضرت نے فرمایا: جب ذات نے تدبیرِ امور میں اپنا تعلق عقل سے قائم کر لیا اور اپنے معاش اور لوگوں سے میل جول رکھنے میں اسی پر سہارا کر لیا اور اللہ کو معلوم تھا کہ ذات راہِ راست سے یقیناً بھٹک جائے گی اس لیے اللہ نے رسول بھیجے تاکہ اسے معرفتِ الٰہی کی طرف لوٹا دیں۔ چنانچہ جیسا ازل میں فیصلہ ہوچکا تھا، ویسا ہی ظاہر ہوا اور کچھ لوگوں نے رسولوں کی بات مان لی اور کچھ نے نہ مانی۔ پہلا گروہ کسی حد تک عقل کے پیچھے لگنے سے باز آگیا مگر دوسرا گروہ پورے طور پر عقل سے چمٹا رہا اور اس کی پوری پوری تابعداری کرتا رہا۔

میں نے سوال کیا: وہ کونسا حجاب ڈالا جاتا ہے جس سے مشاہدہ زائل ہوجاتا ہے؟ کیا یہ خون ہے جو غفلت کا سبب ہے یا کوئی اور چیز ہے۔

فرمایا: اور چیز ہے۔ یہ جہنم کی تاریکی ہے جو ذات کو ڈھانپ لیتی ہے اور اسے حق سبحانہٗ اور اس کی معرفت سے روک دیتی ہے۔

میں نے عرض کیا: اس تاریکی اور خون میں کیا نسبت ہے؟

فرمایا: نسبت تو کوئی نہیں مگر خون اللہ سے دوری بڑھاتا ہے اور تاریکی اللہ سے حجاب زیادہ کرتی ہے اس کے بعد آپ نے ایک مثال بیان فرمائی کہ مثلاً ایک شخص کا صغیر سن بیٹا ہو جو اسے بہت عزیز ہو اور محبت و پیار میں آنکھوں کا تارا بنا ہوا ہو، اسے چیچک نکل آئے۔ یہاں تک کہ اس کے چہرے اور تمام بدن پر چھا جائے تو باپ کو اس پر ترس آئے گا۔ اس کا اہتمام کریگا اور بیٹے کی مصیبت اس پر شاق گزرے گی۔ مگر بھاگے گا نہیں بلکہ بیٹے کی محبت اس پر غالب رہے گی چنانچہ وہ اس مرض سے نفرت نہ کریگا اور اس

مرض کے باوجود اسے چومے گا اور سونگھے گا۔ باپ یہ سب کچھ اس لیے کرتا ہے کہ اس کے اور بیٹے کے درمیان تعلق قائم ہوتا ہے۔ اگر فرض کرلیں کہ بچہ اور کا اور اجنبی ہو اور ان کے درمیان کوئی تعلق نہ ہو تو وہ شخص اس سے نفرت کریگا اور اس سے دور بھاگے گا اور اس سے پرہیز کریگا۔ فرمایا: مومن اور کافر کے خون کی یہی مثال ہے۔

اس کے بعد حضرت نے ان لوگوں کے متعلق فرمایا جنہوں نے رسولوں کی دعوت کو قبول کیا کہ ان کے بھی دو گروہ ہیں ایک گروہ تو دعوت قبول کرکے ایمان بالغیب پر ٹھہر گئے اور فتح حاصل نہ کی۔ یہ عامۃ المسلمین ہیں اور ایک گروہ نے دعوت قبول کی اور ترقی کرکے فتح تک جا پہنچے۔ چنانچہ ان میں سے بعض لوگ فتح پر برقرار رہے اور بعض فتح پر آکر ٹھہر گئے۔ جنہیں فتح دائمی رہی وہ ہر دم ترقی پر ہیں اور جو فتح پر ٹھہر گئے وہ ہر دم تنزّل میں ہیں پھر آپ نے اس کی مثال بیان فرمائی کہ مثلاً دو فقیر ایک مالدار کے پاس بھیک مانگنے کو آئیں جب مانگنے کو ہاتھ بڑھائیں اور ہر ایک ایک درہم مانگے۔ ایک تو ایک درہم لیکر اسی پر قانع رہے اور دوسرا ایک درہم لے کر اور مانگے اور مالدار اسے اور دیدے۔ جب ہم اس مالدار کو سخی فرض کرلیں اور یہ بھی مان لیں کہ اس کے خزانے نہ کم ہونے والے ہیں نہ ختم اور پھر فرض کرلیں کہ یہ سائل ہمیشہ اور مانگتا رہے تو مالدار کے عطیے کبھی بند نہ ہوں گے۔ یہی حال ان اولیاء کا ہے جنہیں دائمی فتح نصیب ہوتی ہے کہ یہ ہمیشہ اور ہر لحظ ترقی پر ہیں یہاں تک کہ موت کے نازل ہونے کے وقت بھی وہ ترقی پر ہوتے ہیں کیونکہ انہیں موت محسوس ہی نہیں ہوتی۔ اس لیے کہ ان کی عقلیں، ان کی روحیں اور ان کی ذوات غیر اللہ سے قطع تعلق کرچکی ہوتی ہیں اور موت بھی غیر اللہ ہے اس لیے انہیں قطعاً موت کا احساس نہیں ہوتا۔

مؤلّف کہتا ہے کہ یہ کلام اس کے قریب قریب ہے جو پہلے مذکور ہو چکا۔ کیونکہ ذاتِ باقی کے لیے جس کی روح قبض ہوگی اس کو یہ عرفی موت نہیں آتی اور یہی موت کی دوا ہے۔ واللہ اعلم۔

نواں باب

فتح ظلمانی اور فتح نورانی میں فرق۔ فتح نورانی کی قسمیں۔ مجذوب اور احمق میں فرق۔ باوجودیکہ دونوں عقل کو کھو بیٹھے ہوتے ہیں۔ وغیرہ!!

اس کتاب میں متفرق طور پر فتح کے متعلق بہت سی باتیں بیان ہو چکی ہیں۔ اس لیے یہاں انکے دوہرانے کی ضرورت نہیں۔ ان مقامات سے دیکھ لیں بالخصوص آیت وَاِذْ قَالَتِ الْمَلٰئِکَةُ یٰمَرْیَمُ اِنَّ اللّٰہَ اصْطَفٰکِ وَطَھَّرَکِ عَلٰی نِسَاءِ الْعٰلَمِیْنَ کے تحت میں امور باطلہ و فانیہ و ظلمانیہ کا مشاہدہ اور امور ثابتہ و باقیہ و نورانیہ کا مشاہدہ تفصیل کے ساتھ مذکور ہو چکا۔ وہاں سے دیکھ لیں۔ اسی طرح جو شخص بیداری میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے دیدار کا دعوے کرے اس مسئلہ کے ضمن میں بھی جو کچھ ہم پانچویں باب کے شروع میں سوالِ ثانی کے تحت لکھ آئے ہیں اسے بھی پڑھ لیا جائے۔ نیز جو کچھ اِنَّ ھٰذَا الْقُرْاٰنَ اُنْزِلَ عَلٰی سَبْعَةِ اَحْرُفٍ کے تحت لکھ آئے ہیں اس پر بھی غور کر لیا جائے کیونکہ اس کا تعلق اہل کمال کی فتح سے ہے۔ یہاں صرف وہ باتیں بیان کی جائیں گی جن کا پہلے ذکر نہیں آیا اور اس کا تعلق اس باب سے ہے۔

حکماء و منجمین کو یہ علم کہاں سے حاصل ہوا

میں نے حضرت سے دریافت کیا کہ سقراط و بقراط و افلاطون و جالینوس وغیرہ حکماء اور فلاسفہ کفر نے عالمِ عُلوی کے متعلق جو کچھ بیان کیا ہے نجوم اور ستاروں کی گردش اور ان کے افلاک کی جگہ کہ قمر فلک اول میں ہے عطارد فلک دوم میں زہرہ فلکِ سوم میں، شمس فلکِ چہارم میں اور مریخ فلکِ پنجم میں، اور مشتری فلکِ ششم میں اور زحل فلکِ ہفتم میں وغیرہ۔ نیز ان کا یہ کہنا کہ قرآن سے یہ احکام نکلتے ہیں یا تعدیل فلک کے امور۔ یہ علم ان کو کہاں سے حاصل ہوا حالانکہ یہ محض غیب ہے۔ اس لیے کہ ان باتوں کا ادراک نہ حواسِ خمسہ کے ذریعہ سے ہو سکتا ہے اور نہ عقلی دلائل سے اور وہ اس بارے میں یہ سند پیش کرتے ہیں کہ اللہ نے یہ علم بذریعہ وحی اپنے کسی نبی کو عطا کیا اور اس سلسلہ میں جو کچھ سیدنا ادریس کی طرف منسوب کیا جاتا ہے اس تفصیل کے لیے کافی نہیں۔

علاوہ ازیں سیدنا ادریسؑ کا زمانہ بہت بعید ہو چکا ہے اور اس علم کی سند کا تواتر یقیناً منتفی ہے اور خبرِ واحد اس جگہ مفید و کافی نہیں اس لیے کہ یہ خبر دہندہ اگر فلاسفہ میں سے ہے تو وہ اہلِ کفر میں سے ہے۔ حالانکہ خبرِ واحد صرف ثقہ راوی سے قبول کی جاتی ہے اور اگر مخبر فلسفی نہیں کوئی اور ہے تو اس کے مسلمان یا غیر مسلم ہونے کا پتہ نہیں۔

فرمایا حق تعالیٰ نے حق اور نور پیدا کیا اور اہلِ حق اور اہلِ نور بھی پیدا کیے۔ اسی طرح ظلمت اور باطل کو پیدا کیا اور ان کے لیے بھی اہلِ ظلمت اور اہلِ باطل کو پیدا کیا چنانچہ اہل ظلام کو ظلمتوں، ظلمتوں کی معرفت اور ان تمام امور کی جن سے ظلمتوں کا تعلق ہے فتح عطا کی جاتی ہے اور اہلِ حق کو حق کی فتح اور اس کے متعلقہ امور کی معرفت عطا کی جاتی ہے۔ حق بات یہ ہے: اللہ پر ایمان لانا، اس کی ربوبیت کا اقرار کرنا، اس بات کی تصدیق کرنا کہ اللہ جو چاہتا ہے پیدا کرتا ہے اور جسے چاہتا ہے منتخب کر لیتا ہے نیز ایمان لانا انبیاء و رسل پر اور اللہ کے فرشتوں پر اور ان تمام اشیاء پر جن کو اللہ کی رضا و خوشنودی سے تعلق ہے اور ظلام نام ہے کفر کا اور ہر اس چیز کا جو اللہ سے قطع تعلق کرنے والی ہے اور منجملہ ان کے خود دنیا اور فانی اُمور اور دُنیوی حوادث اور واقعات ہیں۔ اس کے لیے یہی کافی دلیل ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس پر لعنت کی ہے چنانچہ آنحضرتؐ فرماتے ہیں: اَلدُّنْیَا مَلْعُوْنَۃٌ مَلْعُوْنٌ مَا فِیْہَا اِلَّا ذِکْرُ اللّٰہِ وَمَا وَالَاہُ (دنیا ملعون ہے اور جو کچھ دنیا میں ہے وہ بھی ملعون ہے سوائے ذکر اللہ کے اور ان چیزوں کے جو ذکر کے تحت میں آتی ہیں) اور حق اللہ سبحانہ کے انوار میں سے ایک نور ہے جس سے اہلِ حق کی ذوات کو سیراب ہوتی ہیں جس سے معارف کے انوار ان کی ذوات میں چمک اٹھتے ہیں اور باطل ظلمت ہے جس سے اہل باطل کی ذوات سیراب ہوتی ہیں جس سے ان کی عقلیں سیاہ، حق کے دیکھنے سے ان کی آنکھیں اندھی اور حق کے سننے سے ان کے کان بہرے ہو جاتے ہیں، بلکہ حق کا خیال نہ ان کی عقلوں میں اور نہ ذہنوں میں آتا ہے۔ ان کے نزدیک تو حق ایک معدوم شئی کا نام ہے جو کبھی سننے میں نہ آئی ہو لہٰذا حق سے ان کی غفلت ایسی ہوتی ہے جیسے ذوی العقول معدوم اشیاء سے غافل ہوتے ہیں یہی وجہ ہے کہ اہل باطل کو اس دنیا کے آسمان اور زمین کے مشاہدہ کی فتح نصیب ہوتی ہے مگر انہیں صرف ان امور فانیہ کا مشاہدہ ہوتا ہے جو اجرام حادثہ اور ان کی ہیئت سے تعلق رکھتے ہیں جیسے کہ احکام نجوم میں ذکر کیے جاتے ہیں مثلاً فلاں ستارہ کا مقام فلاں فلک میں ہے اور یہ کہ جب اس کا قِران فلاں ستارہ سے ہوتا ہے تو ایسا ہوتا ہے یا مثلاً یہ کہ عربی زبان برجِ عقرب کی طرف منسوب ہے اور فارسی زبان مریخ کی طرف وغیرہ وغیرہ۔

لیکن انہیں قبرِ نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور وہ نور جو وہاں سے پھیل کر قبۂ برزخ تک جا پہنچتا ہے یا مثلاً اولیا۔ عارفین کی ذواتِ مبارکہ یا ارواحِ مومنین جو صحنہائے قبور میں ہیں یا مثلاً ملائکہ۔ محافظین کرام کاتبین اور وہ فرشتے جو اپنی باری پر آتے رہتے ہیں اور اس کے علاوہ وہ اسرارِ حق جو وصول الی اللہ کا سبب و ذریعہ ہیں اور ان کو اللہ تعالیٰ نے دنیا میں رکھ دیا ہے۔ یہ تمام چیزیں ان پر نہیں کھلتیں اور نہ یہ چیزیں کبھی ان کی عقل میں آتی ہیں۔ اس کا سبب یہی ہے کہ حق تعالیٰ نے انہیں ظلمتوں سے سیراب کیا ہے اور حق کی معرفت سے انہیں بالکل بے تعلق بنا رکھا ہے یہاں تک کہ اگر کوئی اہلِ باطل کسی تختی کو دیکھے جس میں کلام اللہ لکھی ہوئی ہو ایسی کلام جو نور اور سینوں کے امراض کی شفا ہے تو یہ شخص اپنی تاریک بصیرت سے صرف تختی کا جرم ہی دیکھ سکے گا۔ کلام پاک کے لکھے ہوئے حروف اسے دکھائی نہ دیں گے اسی طرح اہلِ ظلام کو حق سبحانہ کے وہ اسرار دکھائی نہ دیں گے جو اللہ تعالیٰ نے آسمان میں وضع کر رکھے ہیں اور نہ ہی کسی فرشتہ کو دیکھ سکیں گے اور نہ ہی ان کی تسبیح کو سن سکیں گے اور نہ ہی جنت، قلم، لوح اور نہ ان انوار کا مشاہدہ کر سکیں گے جو قلم سے خارج ہوتے ہیں اور نہ ہی حق سبحانہ کو پہچان سکیں گے جو ان کے خالق ہیں۔ مختصر یہ کہ حق سبحانہ نے انہیں اپنی ذات اور ہر چیز سے محجوب کر رکھا ہے جو اللہ تک پہنچانے کا سبب ہو اور ان پر وہ تمام امور کھول دیے جاتے ہیں جو ان کے لیے مُضر اور غیر مفید ہوں۔ لہٰذا عالمِ علوی کے متعلق فلاسفہ کی اطلاع اسی قسم کی ہے اور اس سلسلہ میں وہ جو کچھ بھی حکم لگاتے ہیں سب خطا ہے اس لیے کہ وہ ان احکام کو نجوم کی طرف منسوب کرتے ہیں حالانکہ ان کا فاعل اللہ تعالیٰ ہے جو نجوم کا خالق ہے اسی لیے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اپنے رب کی طرف سے فرماتے ہیں بعض میرے بندے مجھ پر ایمان رکھتے ہیں اور بعض کافر ہیں۔ چنانچہ جو یہ کہتا ہے کہ ہم پر اللہ کے فضل و رحمت سے بارش نازل ہوئی تو یہ شخص مجھ پر ایمان رکھنے والا اور کواکب پر ایمان لانے سے انکار کرنے والا ہے مگر جو یہ کہے کہ ہمیں فلاں ستارہ کے گرنے کی وجہ سے بارش ہوئی تو یہ شخص مجھ سے کفر کرنے والا اور ستاروں پر ایمان رکھنے والا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فلاسفہ کو اپنی معرفت سے حجاب میں ڈال رکھا ہے اور ان کی عقلوں کو کواکب کی طرف لگا رکھا ہے تاکہ اسی میں لگے رہیں۔ تاکہ اللہ تعالیٰ کا وعید ازلی ان پر جاری ہو۔ علاوہ ازیں احکامِ نجوم کا جو ربط یہ لوگ بیان کرتے ہیں، اگرچہ یہ درحقیقت اللہ کے فعل سے ہی ہوتا ہے پھر بھی اس کا صرف ایک حصّہ درست نکلتا ہے اور اکثر و بیشتر حصّہ غلط نکلتا ہے۔

مگر اہلِ حق کو دونوں طرح کی فتح نصیب ہوتی ہے۔ پہلی قسم کی فتح تو ان تمام امور کی فتح ہے جو اہلِ ظلام کو اس دنیا کے آسمان و زمین کے متعلق حاصل ہوتی ہے چنانچہ ولی کو اس فتح سے ساتوں آسمان اور ساتوں زمینوں

کا اور ان تمام چیزوں کا مشاہدہ نصیب ہوتا ہے جو آسمانوں اور زمینوں میں پائی جاتی ہیں اور وہ ان تمام افعال کا بھی مشاہدہ کرتا ہے جو لوگ اپنے گھروں اور محلوں میں کرتے ہیں۔ صاحب فتح ان کو اپنی آنکھوں سے نہیں دیکھتا بلکہ اپنی چشم بصیرت سے دیکھتا ہے جس کے سامنے نہ کوئی پردہ حائل ہو سکتا ہے اور نہ کوئی دیوار اسے روک سکتی ہے۔ اسی طرح صاحب فتح آئندہ آنے والے واقعات کو دیکھ لیتا ہے مثلاً یہ کہ فلاں ماہ یا فلاں سال میں یوں واقع ہوگا۔ اسی قسم کی فتح میں اہلِ ظلام کسی حد تک برابر ہوتے ہیں اسی لیے کہتے ہیں کہ کشف ولایت کا کمزور ترین مرتبہ ہے، کیونکہ کشف اہلِ حق اور اہلِ ظلمت دونوں کے ہاں پایا جاتا ہے اور اس قسم کی فتح والے کے لیے جب تک کہ وہ اس مرحلہ سے نکل کر اگلے مرتبہ اور مقام تک نہ پہنچ جائے ہر وقت خطرہ رہتا ہے کہ کہیں حق سبحانہ سے تعلق منقطع ہو کر وہ اہل ظلمت سے نہ جا ملے۔

دوسری قسم کی فتح یہ ہے کہ اسے اسرارِ حق کا مشاہدہ حاصل ہو جن سے اہل ظلمت کو حجاب میں رکھا گیا ہے چنانچہ صاحب فتح اولیا۔ عارفین کا مشاہدہ کرتا ہے اُن سے باوجود بُعدِ مسافت کے اس طرح باتیں کرتا ہے جس طرح ایک ہمنشین دوسرے ہمنشین سے۔ اسی طرح وہ قبروں کے اوپر ارواح مومنین کا مشاہدہ کرتا ہے۔ نیز کرام کاتبین، ملائکہ، برزخ اور برزخ کی میت ارواح کا مشاہدہ کرتا ہے اور اسے قبر نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور نور کے اس عمود کا مشاہدہ حاصل ہوتا ہے جو مزار مبارک سے نکل کر قبۂ برزخ تک جاتا ہے چنانچہ جب اسے بیداری[1] میں ذات نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا مشاہدہ حاصل ہو جاتا تو شیطان کے تلاعب سے محفوظ ہو جاتا ہے کیونکہ اسے رحمتِ الٰہی میں اجتماع حاصل ہو گیا ہے یعنی سیدنا و نبینا و مولانا محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے پھر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ اس کا اجتماع حق سبحانہ کی معرفت اور اس کی ذات ازلی کے مشاہدہ کا سبب بنتا ہے

---

[1] امام شعرانی رح نے کئی ایک اولیاء کا ذکر کیا ہے جنہیں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا مشاہدہ بیداری کے عالم میں ہوتا تھا اور انھوں نے خود اس کا ذکر بھی کیا مثلاً شیخ محمد بن ابی جمرہ (ج ۱: صفحہ ۱۳۸) شیخ عبداللہ بن ابی جمرۃ (ج ۱: صفحہ ۱۷۶) شیخ ابو العباس المرسی (ج ۲: صفحہ ۱۴) اور شیخ ابو المواہبؒ شاذلی (ج ۲ صفحہ ۶۲ تا ۷۴) بزرگوں نے اس کے متعلق کتابیں بھی لکھی ہیں چنانچہ محمد بن ابراہیم المعروف بجبلی زادہ الحنفی متوفی ۹۷۱ھ نے حور الخیام دعذراء ذوی الهیام فی رویة خیر الانام فی الیقظة کما فی المنام لکھی ہے (کشف الظنون ج ۱: ۶۴۹) اور شیخ یوسف بن یعقوب الخلوتی شیخ الحرم النبوی نے ترکی زبان میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو خواب میں دیکھنے کے متعلق تنبیہ الغبی فی رویة النبی صلی اللہ علیہ وسلم لکھی (کشف الظنون ۱: ۲۵۵) اور شیخ عبدالرحمٰن بن محمد بسطامی نے درۃ النقاد فی رویۃ النبی صلی اللہ علیہ وسلم فی خیال الرقاد لکھی ہے (کشف الظنون ۱: ۷۴۳)

اس لیے کہ ولی دیکھتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ شریف حق سبحانہ میں مستغرق اور اس کے مشاہدہ کے لیے فریفتہ ہے۔ چنانچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ شریف کی برکت سے ولی کا تعلق ہمیشہ حق سبحانہٗ سے رہتا ہے اور وہ بتدریج ترقی کرتا رہتا ہے یہاں تک کہ اسے مشاہدۂ حق، اسرارِ معرفت اور انوارِ محبت حاصل ہو جاتے ہیں۔ یہی دوسری قسم کی فتح اہلِ حق اور اہلِ باطل کے درمیان امتیازی علامت ہے کیونکہ پہلی قسم کی فتح تو جس طرح اہلِ حق کو حاصل ہوتی ہے، اہلِ باطل کو بھی حاصل ہوتی ہے چنانچہ اہلِ باطل کو امورِ فانیہ کا مشاہدہ حاصل ہوتا ہے اور وہ ان میں تصرف کرنے پر قادر ہو جاتے ہیں لہٰذا ہم دیکھتے ہیں کہ وہ پانی پر چل سکتا ہے اور ہوا میں اڑ سکتا ہے اور غیب سے اسے رزق بھی آتا ہے حالانکہ وہ اللہ کا منکر ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے نور کو پیدا کیا ہے اور نور سے فرشتوں کو پیدا کیا اور اہلِ نور کے لیے کچھ مددگار و معاون بھی مقرر کر دیے جو توفیق، سیدھی راہ چلنے اور کرامات کرنے میں ان کی مدد کرتے ہیں۔ اسی طرح اللہ نے ظلمتیں پیدا کیں اور ان سے شیاطین کو پیدا کیا اور شیاطین کو اہلِ باطل کا مددگار بنا دیا تاکہ وہ ان کے لیے استدراج اور مزید خسارہ کے باعث بنیں اور خوارقِ عادت کرنے میں ان کی مدد کریں۔

ابراہیم خواص م ۲۹۱ھ[1] اور یہودی کا قصہ

حضرت نے فرمایا کہ اس یہودی کی حکایت جو ابراہیمؒ خواصؒ کے ساتھ تھا، اسی پر متفرع ہوتی ہے۔ اس طرح کہ ان کا کشتی میں ساتھ ہو گیا اور ایک دوسرے سے تعارف ہونے کے بعد وہ ایک دوسرے کے رفیق بن گئے چنانچہ یہودی نے کہا اگر تیرا دین سچا ہے تو سمندر پر چل کر دکھا اور میں بھی چل کر دکھاتا ہوں چنانچہ یہودی نے پانی پر چلنا شروع کر دیا۔ ابراہیمؒ خواص نے دل میں کہا اگر مجھ پر یہودی غالب آگیا تو آج ذلت ہو گئی۔ یہ کہہ کر سمندر میں کود پڑا اور یہودی کی طرح پانی پر چلنے لگا۔ اس کے بعد وہ سمندر سے نکل آئے تو یہودی نے ابراہیم خواص سے کہا میں اس سفر میں آپ کے ساتھ رہنا چاہتا ہوں۔ ابراہیم نے کہا تمہاری مرضی۔ یہودی نے کہا اس شرط پر کہ نہ تو ہم مسجد میں داخل ہوں کیونکہ مجھے مسجد پسند نہیں اور نہ گرجے میں اس لیے کہ وہ تجھے پسند نہیں اور نہ شہر میں جائیں تاکہ لوگ یہ نہ کہیں دیکھو ایک مسلمان اور ایک یہودی کا باہم ساتھ ہے۔ لیکن ہم جنگلوں اور چٹیل میدانوں میں سفر کریں گے اور اپنے ساتھ کوئی زادِ راہ بھی نہ لیں گے۔ ابراہیمؒ نے کہا: ایسا ہی کر لو۔

---

[1] ابواسحٰق ابراہیم بن اسماعیل الخواص: اولیاء کبار میں سے تھے اور جنید اور ثوری کے پایہ کے آدمی تھے۔ توکل ان کا خاص وصف تھا چنانچہ فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ خضر علیہ السلام ملے اور مجھے ساتھ رہنے کو کہا مگر میں ڈر سے ان کے ساتھ نہ رہا کہ کہیں ان سے مانوس ہو کر میں توکل ہی نہ چھوڑ بیٹھوں۔ ان کی وفات ۲۹۱ھ - ۹۰۳ء میں ہوئی۔

چنانچہ دونوں جنگلوں میں نکل گئے اور تین دن تک انھوں نے کچھ نہ کھایا۔ چنانچہ وہ بیٹھے ہوئے تھے کہ ایک کتا چل کر یہودی کی طرف آیا اور اس کے منہ میں تین روٹیاں تھیں جو اس نے یہودی کے سامنے ڈال دیں اور چلا گیا۔ ابراہیمؒ کہتے ہیں کہ اس یہودی نے مجھے کھانا پیش کیا، مگر میں نے نہ کھایا اور میں بھوکا رہا۔ اس کے بعد میرے پاس ایک نہایت ہی خوبصورت اور خوشبو سے مہکتا ہوا نوجوان آیا جس کے پاس اس قسم کا کھانا تھا کہ کبھی دیکھنے میں نہ آیا ہوگا۔ اس نے وہ کھانا میرے سامنے رکھدیا اور چلا گیا۔ میں نے یہودی کو کھانے کی دعوت دی مگر اس نے انکار کر دیا۔ میں نے کھانا کھالیا۔ یہودی نے کہا میرا اور تیرا دین دونوں حق ہیں۔ دونوں اللہ تک پہنچاتے ہیں اور دونوں کا ثمر بھی ہے مگر تمہارا دین زیادہ رقیق ہے، زیادہ لطیف اور خوشنما ہے لہٰذا مجھے اجازت ہو تو میں اس میں داخل ہو جاؤں چنانچہ وہ یہودی مسلمان ہوگیا اور محققین صوفیہ میں سے ہوا۔ ابونعیمؒ[1] نے حلیہ میں یہ حکایت ابراہیم خواص کے تذکرہ میں اسی طرح دی ہے۔

میں نے حضرت سے اس یہودی کے بارے میں دریافت کیا تو فرمایا کہ ان کے پاس کچھ بھی نہیں۔ ان سے تو شیاطین کھیل کرتے ہیں اور وہ سمجھتے ہیں کہ ان کی عبادت کا ثمرہ ہے۔ اس کے بعد حضرت نے وہی پہلی بات دہرائی کہ اہل حق کا کیا حال ہے اور اہل باطل کا کیا۔ واللہ اعلم۔

فلسفہ اور نجوم کی اصل

حضرت نے فرمایا کہ فلسفہ اور عالِم علوی کے احکام کی اصل یہ ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے زمانہ میں ایک آدمی ان پر ایمان لایا اور آپ کو جو مشاہدے ملکوتِ سمٰوٰت وارض کے ہوا کرتے اور ان کے متعلق جو باتیں آپ ذکر فرمایا کرتے، ان کو وہ سنا کرتا تھا چنانچہ ہوتے ہوتے اسے بھی فتح نصیب ہوگئی اور جو کچھ اس نے دنیا کا مشاہدہ کیا وہیں ٹھہر گیا اور حق سبحانہ سے تعلق منقطع کر لیا اور خَسِرَ الدُّنْيَا وَالْآخِرَةَ کا مصداق بن گیا۔ عالمِ علوی کا مشاہدہ کر کے وہ اس پر بہت اتراتا۔ ستاروں کے منازل کا ذکر کر کے ان پر احکام کا ربط قائم کرتا اور وہ دینِ ابراہیم سے پھر گیا جن لوگوں کو اللہ نے رسوا کرنا چاہا انھوں نے یہ علم اس شخص سے سیکھ لیا اور ہوتے ہوتے فلاسفہ ملعون تک پہنچا حضرت نے فرمایا کہ وہ شخص سخت عذاب میں مبتلا ہوا اس لیے کہ اس نے لوگوں کو غیر اللہ کی راہ دکھائی اور

---

[1] ابونعیم: ابونعیمؒ اصفہانی۔ ان کا تذکرۂ اولیا جس کا نام حلیۃ الاولیا ہے صوفیہ میں بہت مقبول ہے ۳۳۶ھ ۹۴۷ء میں پیدا ہوتے اور ان کی وفات ۴۳۰ھ ۱۰۳۸ء میں ہوئی۔ اصفہان کے لوگوں نے انہیں اصفہان سے نکال دیا اور جامع مسجد میں بھی بیٹھنے سے روک دیا تھا۔ انھوں نے حلیۃ تمام کی تمام زبانی لکھائی جبکہ ان کی عمر اسی برس سے متجاوز ہو چکی تھی۔ یہ دراصل حدیث کی کتاب ہے۔

جو غیر اللہ کی راہ دکھائے گا وہ لوگوں کا تعلق اللہ سے توڑ دے گا۔

حضرت نے فرمایا: کہ رسالت اور نبوت کا ایک ہی خاصہ وفائدہ ہے اور وہ اللہ کی راہ بتانا اور لوگوں کو اللہ پر جمع کرنا ہے۔ فرض کرو کسی کو نبوت و رسالت دی جائے اور وہ بفرضِ محال غیر اللہ کا راستہ دکھانے یا لوگوں کو اپنا گرویدہ بنانے اور اللہ سے لوگوں کا تعلق توڑنے لگے تو اس کا حکم بھی اسی مذکورہ شخص کا سا ہوگا۔ حالانکہ نبی سے ایسا ہونا قطعاً ناممکن اور محال ہے مگر ہم نے اس امرِ محال کو فرض کے درجہ میں محض غیر اللہ کی طرف راہ دکھانے سے نفرت دلانے کے لیے اس قدر مبالغہ سے بیان کیا ہے۔

اس کے بعد ہم فاس کے دروازے باب الحدید کے پل پر چل رہے تھے کہ حضرت نے فرمایا: اس پل کا کیا فائدہ ہے؛ میں نے عرض کیا: تاکہ اس پر چل کر دریا کی گہرائیوں سے نجات پائیں اور چلنے والے دوسری طرف کی زمین تک جا پہنچیں۔

پھر فرمایا: فرض کر لو اگر پل کا یہ فائدہ نہ رہے تو پھر یہ پل محض نقصان دہ ہوگا۔ میں نے عرض کیا: جی ہاں۔

حضرت نے فرمایا: انبیا و مرسلین، ملائکہ مقربین اور عباد اللہ الصالحین کا بھی یہی حال ہے کہ ان سے فائدہ اللہ کی طرف راہبری کرنا اور لوگوں کو اللہ پر لا جمع کرنا ہے اور اگر یہ فائدہ اٹھ جائے تو ان کا حال بھی پُل کا سا ہوگا۔ واللہ اعلم۔

ولی آئندہ آنے والے واقعات کے متعلق بہت کم بات کرتے ہیں

حضرت نے فرمایا کہ کاملین اہلِ حق سے اگر آئندہ آنے والے حوادث کے متعلق سوال کیا جائے تو اس کے متعلق بہت کم بات کریں گے اس لیے کہ یہ ان کا پہلا مشاہدہ ہوتا ہے اور حق سبحانہٗ کا مشاہدہ اس کے بعد انہیں حاصل ہوتا ہے لہٰذا پہلے مشاہدہ کو وہ باطل سمجھتے ہیں اس لیے وہ نہ اسے پسند کرتے ہیں اور نہ اس کے متعلق گفتگو کرنا پسند کرتے ہیں۔ نیز اس لیے بھی کہ دنیا اور دُنیوی واقعات اللہ کے ہاں ناپسند کئے جاتے ہیں۔ لہٰذا جسے اللہ ناپسند کرے اسے یہ لوگ بھی ناپسند کرتے ہیں اور جب ان واقعات کے متعلق زبان کھولتے ہیں تو اپنے مقام سے نیچے اتر کر کھولتے ہیں۔ ایسے سمجھ لو جیسے کوئی ثریا سے اتر کر ثریٰ میں آ پہنچا ہو کہ حوادثِ دنیا کا درجہ تو اہلِ ظلام کا درجہ ہے۔

نیز اس لیے کہ کاملین کو مشاہدہ حق سبحانہٗ کے انوار کے ذریعہ سے حاصل ہوتا ہے اور نورِ حق میں زمان و مکاں اُٹھ جاتا ہے اسی لیے وہاں نہ ماضی ہوتا ہے نہ حال اور نہ مستقبل۔ لہٰذا ولی کو نورِ حق

انہیں زیادہ سے زیادہ اتنا معلوم ہوتا ہے کہ فلاں حادثہ یقیناً واقع ہوگا۔ اس بات کی فتح کہ حادثہ فلاں دن واقع ہوگا، انہیں اسی صورت میں حاصل ہوتی ہے جب وہ اتر کر اس مقام تک پہنچ جائیں جہاں زمانہ اور زمانہ کی ترتیب کا اعتبار کیا جائے اور یہ نورِ حق کے مقابلہ میں ان کے نزدیک حکمت ہے۔ ایسا کرنے والے کی مثال سورج کی سی ہے جب وہ اپنے آسمان سے اتر کر زمین پر آجائے اور اپنی آنکھوں کے سامنے آئینہ کو رکھکر اس میں دیکھنے لگے۔

میں نے عرض کیا حق سبحانہٗ کو آئندہ آنے والے واقعات اور ان کی ترتیب کا علم ہے اسے ماضی حال اور آئندہ جو کچھ ہونے والا ہے سب کا علم ہے اور ولی چونکہ نورِ حق سے دیکھتا ہے اس لیے اسے بھی درجۂ ظلمت تک اترنے کے بغیر ان امور کا علم ہونا چاہیئے۔

حضرت نے فرمایا چونکہ حق سبحانہٗ کا علم ہر چیز پر محیط ہے اس لیے انہیں ان تمام امور کا علم ہوتا ہے اور حق تعالیٰ قوی ہیں اور بندہ ضعیف ہے۔ مختصر یہ کہ اللہ پر بندہ کا قیاس نہیں ہوسکتا اسی لیے حضرت خضرؑ نے موسیٰ علیہ السلام سے کہا تھا "میرے اور تمہارے علم کی وجہ سے اللہ کے علم میں اسی قدر کمی واقع ہوئی ہے جس قدر کہ سمندر میں سے چڑیا کے چونچ بھرنے سے واقع ہو۔

فرمایا: بعض اوقات ولی آئندہ آنے والے حوادث کا ذکر کرتا ہے تو اپنے درجہ سے اتر کر ان کا ذکر کرتا ہے، لیکن یہ معصیت نہیں البتہ اس میں کم ہمتی اور بلند مقام سے تنزل ضرور پایا جاتا ہے اور اگر آنحضرتؐ کی خدمت میں ہوتے ہوئے حوادثِ دہر کی خبر دینا شروع کردے تو بے ادبی بھی ہے اس لیے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ دستور نہ تھا (کہ واقعات و حوادث کے متعلق پیش گوئی کرتے ہیں) اس کے باوجود بہت سے اولیاء کامل جب ان امور کا ذکر کرتے ہیں تو اس لیے کرتے ہیں کہ تقدیر کے حکم کا ان پر غلبہ ہوتا ہے اور یہ کہ حق تعالیٰ جو کام کرنا چاہتے ہیں اس میں انہیں تصرف عطا کرتے ہیں کیونکہ اولیاء اللہ حق کے مظاہر ہیں۔

مؤلف کہتا ہے کہ یہی وجہ ہے کہ اکثر لوگوں کو اولیاء کی معرفت اور صحبت سے ضرر پہنچتا ہے معرفت سے تو اس لیے کہ اکثر لوگ فتح رحمانی اور فتح شیطانی میں فرق نہیں کرتے اور خیال کرتے ہیں کہ ہر وہ کشف جو ان کے علم سے باہر ہو اور وہ خارقِ عادت جو ان کی طاقت سے باہر ہو وہ اس شخص کے کامل، اہلِ حق اور ولی ہونے پر دلالت کرتا ہے جس کے ہاتھوں وہ خارقِ عادت ظاہر ہو چنانچہ ایک فریق صاحبِ کشف لوگوں کی ولایت کا معتقد ہے اور اسی کو انتہا سمجھتا ہے جو بظاہر

نماز روزہ کے پابند ہوں خواہ ان کا باطن حق سے خالی اور غیر اللہ کی طرف ہی لگا ہو۔
ولی کی صحبت سے ضرر اس لیے ہوتا ہے کہ بعد ازاں کہ اللہ تعالیٰ نے ایک انسان کو ایک ولی کامل کی صحبت عطا کی ہے وہ اس ولی سے اصل مطلب کو برعکس کر دینا چاہتا ہے کیونکہ ولی کی صحبت کا اصل مقصد تو معرفتِ الٰہی ہے اور یہ کہ ولی اسے ان تمام امور سے بچائے جو اللہ سے قطع تعلق کرا دیتے ہیں اور حب دنیا اور اس کی زیب و زینت کی طرف میلان اللہ سے قطع تعلق کرنے کا سب سے بڑا سبب ہے لہٰذا جب کوئی انسان ولی سے حاجات کے پورا کرنے کا مطالبہ کرے اور دنوں تک بلکہ سالہا سال تک ایسا کرتا رہے اور اللہ تعالیٰ اور اس کی معرفت کے متعلق قطعاً سوال نہ کرے تو وہ ولی اس سے ناراض ہو جاتا ہے لہٰذا اگر یہ شخص کسی مصیبت کے نازل ہونے سے بچ جائے تو غنیمت سمجھو۔ اس کی کئی وجوہ ہیں۔ پہلے تو یہ کہ ولی کے ساتھ اس کی محبت اللہ کے لیے نہیں بلکہ اوپری سی محبت ہے جو خسران مبین کا سبب ہے جس کے ساتھ ساتھ وسوسے ہوتے ہیں اور شیاطین حاضر ہوتے ہیں اور اس محبت پر نورِ حق کبھی نازل نہیں ہوتا۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ دنیا سے اس کے تعلق کی وجہ سے ولی دیکھتا ہے کہ اس کا تعلق اللہ سے کٹ چکا ہے لہٰذا وہ اسے اس بے تعلقی سے نجات دلانا چاہتا ہے مگر انسان اس بے تعلقی کو بڑھانا چاہتا ہے۔ تیسرے یہ کہ جب ولی اس کی حاجت براری میں اس کی موافقت کرتا ہے اور اس کے لیے کچھ کشف کی باتیں بیان کرتا ہے تو انسان کو دھوکا لگ جاتا ہے اور وہ سمجھتا ہے کہ ولی سے یہی مانگنا چاہیئے۔ حالانکہ یہ تمام گمراہی اور وبال کی باتیں ہیں۔

حضرت نے فرمایا: ولی کی مثال ایسی ہے جیسے کوئی کمہار ہو اور وہ برتن بنانے میں ہاتھوں اور اعضاء کو حرکت دیتا رہے اور اس کے باوجود اس کے پاس وہ خزانے ہوں جن کی لوگوں کو ضرورت ہے مثلاً رزق وغیرہ اور ان خزانوں کے ہونے کے باوجود اس کا دل ان سے متنفر ہے نہ اسے کبھی ان کا خیال آتا ہے اور نہ انہیں کوڑی کے برابر بھی سمجھتا ہے۔ اس کی یہی خواہش ہو کہ وہ اپنے ظروف اور ظروف سازی کے متعلق باتیں کرتا رہے اور جو شخص اس سے کسی اور بات کے متعلق گفتگو کرے وہ اس سے بہت ہی نفرت بلکہ بغض رکھے یہاں تک کہ خطرہ ہو کہ کہیں اس متکلم کو اس شخص سے نقصان نہ ہو جائے پس اگر اس کے پاس دو شخص آئیں جنہیں اس کی حالت کا علم ہو اور یہ بھی معلوم ہو کہ وہ ظروف سازی کے سوا کسی اور بات میں گفتگو کرنے کو ناپسند سمجھتا ہے اور دونوں اس سے کچھ خزانہ حاصل کرنا چاہیں تو دونوں میں سے عقلمند وہ ہوگا جو اس سے ظروف سازی

کے متعلق گفتگو کرے گا کہ برتن کیسے بنائے جاتے ہیں حتیٰ کہ وہ شخص اس سے محبت کرنے لگ جائے۔ اب اس کے بعد اگر یہ شخص اس سے کچھ خزانہ مانگے تو وہ آسانی سے اسے دے دیگا اور اسے کوئی ضرر نہ پہنچے گا اور غیر موفّق وہ شخص ہوگا جو آتے ہی اس سے خزانے مانگنے لگ جائے اور انہی کے متعلق باتیں کرے تو یہ شخص اپنے آپ کو خوش قسمت سمجھے گا اگر وہ شخص برتن مار کر اس کا سر نہیں پھوڑ دیتا۔ اسے جان بچانے کو ہی غنیمت سمجھنا چاہیئے۔

یہی حال ولی کا ہے۔ اللہ کی معرفت اور ان چیزوں کی معرفت کے سوا جو اللہ تک پہنچائیں نہ کوئی اس کا پیشہ ہے اور نہ کوئی صنعت۔ وہ کسی اور بات میں نہ کلام کرنا چاہتا ہے نہ کوئی اور صحبت اور مجلس اس کو بھاتی ہے، خدا تک پہنچنے کے سوا کوئی اور اس کا مقصد نہیں اور نہ کسی اور کا قرب حاصل کرنا اس کی خواہش ہے لہٰذا جس شخص نے ان باتوں کے لیے ولی سے معرفت حاصل کی اس نے دنیا و آخرت کا فائدہ حاصل کر لیا اور جس نے کسی اور غرض سے ولی سے معرفت حاصل کی وہ اس کے برعکس ہوگا۔

حوادثِ دنیا کیوں باطل ہیں؟

میں نے حضرت سے دریافت کیا کہ حوادث دنیا کیوں باطل قرار دیئے گئے ہیں حالانکہ یہ امورِ واقعی ہیں جن کا ہم مشاہدہ کرتے ہیں اور حواس کے ذریعہ سے ان کا ادراک بھی ہوتا ہے اور باطل تو وہ ہے جس کی اصل و حقیقت نہ ہو۔

حضرت نے دیوار کی طرف اشارہ کر کے فرمایا کیا ہم اس دیوار کا مشاہدہ نہیں کر رہے حالانکہ یہ دیوار فانی ہے اور زائل ہونے والی ہے اور ہم اس کے رب کو نہیں دیکھ سکتے جو اس کا پیدا کرنے والا اور اسے اپنی قدرت سے کھڑا رکھنے والا ہے، حالانکہ وہ دائمی زندہ اور اسے نہ فنا ہے اور نہ موت اور وہ ہم سے شہ رگ سے بھی زیادہ قریب ہے اور وہ ہمارا خالق بھی ہے اور جیسا چاہے ہم میں تصرف بھی کر سکتا ہے لہٰذا اسی قسم کی دیوار کا مشاہدہ جو نہ سودمند ہے نہ ضرر رساں حق سبحانہٗ کے عدم مشاہدہ کے مقابلہ میں ایک باطل مشاہدہ ہے اور یہ بطلان اضافی امر ہے یعنی جس چیز کا ہم مشاہدہ کر رہے ہیں وہ اس چیز کے مقابلہ میں جس کا ہم مشاہدہ نہیں کر رہے کالعدم ہے۔ ہم پہلے بیان کر چکے ہیں کہ حروف دیکھنے کے بغیر لوح کا مشاہدہ باطل مشاہدہ ہے لہٰذا جس پر اللہ کی رحمت ہو جائے اسے اللہ تعالیٰ اپنی ذاتِ بلند اور صفات و افعال پاک کا مشاہدہ کرا دیتے ہیں اور اس کا تعلق اللہ سے ہو جاتا ہے اور اسے ایسی زندگی عطا ہو جاتی ہے جس کے بعد نہ کوئی بدبختی ہے اور نہ کوئی موت

اس لیے کہ جب فانی کا باقی سے تعلق ہو جاتا ہے تو اس کی بقا کی وجہ سے اسے بھی بقا نصیب ہو جاتی ہے۔ حضرت نے اسی قسم کی اور باتیں بیان فرمائیں جن کی طرف پہلے اشارہ ہو چکا ہے واللہ اعلم

فتح اول میں اہلِ حق اور اہلِ باطل میں فرق

حضرت نے فرمایا کہ اگرچہ پہلی قسم کی فتح میں اہلِ باطل اور اہلِ حق مشترک ہوتے ہیں مگر ان کا مقصد الگ الگ ہوتا ہے کیونکہ اہلِ باطل کو فتح عطا کرنے کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ انہیں اللہ تعالیٰ کے دروازے سے دھکیل دیا جائے اور اس کے دروازہ سے روک دیا جائے کیونکہ ان پر اللہ کا غضب ہے اور اللہ نے انہیں اپنے سے کاٹ کر غیر سے تعلق قائم کر دیا ہے اور ڈھیل دینے اور استدراج کی غرض سے اللہ تعالیٰ خوارقِ عادت سے ان کی مدد فرماتے ہیں تاکہ وہ سمجھیں کہ وہ بھی کچھ ہیں۔

اور اہلِ حق کو یہ فتح عطا کرنے کا مقصد یہ ہے کہ انہیں اللہ سے اور محبت ہو اور انہیں ایک مرتبہ سے دوسرے مرتبہ تک ترقی دے۔ اس طرح کہ اللہ نے ان کے لیے دروازہ کھول دیا ہوتا ہے حجاب کو دور کر دیا ہوتا ہے اور ان کے دلوں کو اپنی ذات کی طرف لگا رکھا ہوتا ہے لہٰذا اللہ تعالیٰ ان کی ان خوارق سے مدد فرماتے ہیں تاکہ ان کی بصیرت قوی اور معرفت مضبوط ہو جائے چنانچہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: فَاَمَّا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا فَزَادَتْهُمْ اِیْمَانًا وَّهُمْ یَسْتَبْشِرُوْنَ وَاَمَّا الَّذِیْنَ فِیْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ فَزَادَتْهُمْ رِجْسًا اِلٰى رِجْسِهِمْ وَمَاتُوْا وَهُمْ كٰفِرُوْنَ۔ پس جو لوگ ایمان لاتے ہیں آیاتِ قرآنیہ نے ان کا ایمان بڑھا دیا اور وہ خوش ہیں مگر جن کے دلوں میں شکوک کا مرض ہے تو آیتوں نے ان کی پلیدی پر پلیدی بڑھا دی (اور وہ اسی پر جمے رہے) تاآنکہ کفر کی حالت میں مرے۔

بعض اوقات چھوٹے ولی کو بڑے ولی سے زیادہ مکاشفہ ہوتا ہے

حضرت نے فرمایا کہ بعض اوقات چھوٹے ولی کو حوادث کا مکاشفہ بہ نسبت بڑے ولی کے زیادہ ہوتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہوتی ہے کہ بڑا ولی ان حوادث سے غافل ہو کر اس سے زیادہ قوی چیز یعنی مشاہدۂ حق میں مشغول ہوتا ہے برخلاف چھوٹے ولی کے کہ اس کا ارادہ ہی انہی کا ہوتا ہے کیونکہ اس کے مشاہدہ کا محل وہی ہے۔ اور اگرچہ اسے بھی مشاہدۂ حق میں حاصل ہوتا ہے مگر وہ بڑے ولی جیسا نہیں ہوتا۔ حاصل یہ کہ بڑے ولی کا مشاہدۂ حق زیادہ قوی اور مشاہدۂ خلق کمزور ہوتا ہے برعکس چھوٹے ولی کے کہ اس کا مشاہدۂ خلق قوی اور مشاہدۂ حق کمزور ہوتا ہے۔ سیدنا موسیٰ علیہ السلام کے قصے کی یہی توجیہ ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید

میں فرمایا ہے اور وہاں کشتی، بچے، اور دیوار کا ذکر کیا ہے کیونکہ ان امور کا علم حضرت موسیٰ علیہ السلام کو اس لیے نہ تھا کہ وہ اس سے زیادہ قوی یعنی حق سبحانہ کے مشاہدہ میں مشغول تھے لہٰذا موسیٰ علیہ السلام کو ان امور کا علم نہ ہونا بھی انتہا درجہ کا کمال ہے۔ پھر فرمایا کہ خضر کے ساتھ اس کی مثال ایسی ہے جیسے کسی بادشاہ کے دو غلام ہوں ایک کو بادشاہ نے اپنے پاس رکھا ہو اور اسے اپنا ہمنشین بنا لیا ہو اور اس کا یہی کام ہو کہ وہ بادشاہ کے سامنے کھڑا رہے اور اس کے چہرے کی طرف دیکھتا رہے جب بادشاہ نکلے یہ بھی ساتھ نکلے اور جب داخل ہو تو یہ بھی داخل ہو کھائے تو اس کے ساتھ اور پیئے تو اس کے ساتھ اور اسی کے ساتھ باتیں کرے اور دوسرے غلام کو بادشاہ نے اپنی رعیت کے معاملات میں تصرف کرنے کا اختیار دے رکھا ہو چنانچہ وہ رعیت کے پاس جاکر بادشاہ کے احکامات جاری کر دے گا اور ان کے ساتھ ان کے معاملات اور ان کی مصلحتوں کے متعلق گفتگو کرے گا اور بعض احکام جاری کرنے کی غرض سے وہ مدت تک بادشاہ سے غائب بھی رہے گا۔ اب اس بات میں شک نہیں کہ پہلا غلام دوسرے غلام کے مقابلہ میں بادشاہ کا زیادہ مقرب اور اس کی ذات کے اسرار سے زیادہ واقف ہوگا مگر اس کے باوجود اگر اس سے رعیت کے کسی معاملہ کے متعلق دریافت کیا جائے کہ آمد و خرچ کیا ہے بالخصوص جب کہ رعایا پایۂ تخت سے دور ہو تو اسے ان کے متعلق پہلے کے مقابلہ میں کچھ علم نہ ہوگا۔ اللہ تعالیٰ کے ساتھ موسیٰ علیہ السلام کا یہی حال تھا کہ موسیٰ علیہ السلام پہلے غلام کی طرح ہیں اور سیدنا خضرؑ دوسرے غلام کی طرح اس لیے کہ اس پر سب کا اتفاق ہے کہ موسیٰ علیہ السلام کا مرتبہ خضر سے بڑا ہے اس لیے کہ وہ اللہ کے رسول، کلیم اور صفیؑ ہیں۔

خضر علیہ السّلام نبی نہ تھے

میں نے سوال کیا: کیا خضر علیہ السّلام نبی تھے؟ جیسا کہ بعض علماء کا خیال ہے، یہاں تک کہ حافظ ابن حجرؒ نے بخاری کی شرح میں فرمایا ہے ہمیں یہی اعتقاد رکھنا چاہیئے کہ خضر نبی[1] تھے تاکہ غیر نبی کا نبی سے زیادہ عالم ہونا لازم نہ آئے۔

---

[1] امام شعرانیؒ نے (لواقح الانوار ج ۱: ۸۴) ابو اسحٰق ابراہیم بن اسمٰعیل خواص کی خضر علیہ السلام سے ملاقات کا واقعہ نقل کیا ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ حجاز کے راستہ میں ایک جنگل میں مجھے پیاس لگی تو ایک خوبصورت انسان بھورے رنگ کے جانور پر سوار نے آکر مجھے پانی بھی پلایا اور پیچھے سوار بھی کر لیا۔ پھر کہا یہ دیکھو یہ مدینہ کا نخلستان ہے۔ اب اتر جاؤ اور صاحب مدینہ یعنی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو میرا اسلام دینا اور کہنا

(بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر)

حضرت نے فرمایا: خضرؑ نبی نہ تھے وہ تو ایک بندہ تھے جسے اللہ تعالیٰ نے اپنی معرفت سے سرفراز کیا تھا اور مخلوق میں تصرف کرنے کا اختیار دیا تھا اور اسے اللہ تعالیٰ نے تمام وہ تصرف اور کمال عطا کیا تھا، جو امتِ محمدیہ میں غوث کو عطا ہوتا ہے۔ خضرؑ کو یہ بات بغیر کسی پیر اور بغیر راہِ طریقت پر چلنے کے حاصل ہوئی۔ اللہ تعالیٰ نے انہیں براہِ راست سب کچھ عطا کیا تھا۔ یہی ان کا مرتبہ تھا جو نبوت اور رسالت کے مرتبہ تک نہیں پہنچ سکتا اور مذکورہ بالا قصے میں خضرؑ کا واقف اور موسیٰ کا ناواقف ہونا اس شبہ کا موجب نہیں ہو سکتا کہ غیر نبی کا علم نبی کے علم سے زیادہ تھا۔ اس لیے کہ ہم بیان کر چکے ہیں کہ موسیٰ علیہ السلام مشاہدہ حق میں مشغول تھے اور مشاہدہ حق کا نہ کوئی بدل ہو سکتا ہے اور نہ کوئی مثال، اس لیے خضرؑ کو نبی ماننے کی ضرورت نہیں۔

میں نے عرض کیا جو علماء ان کی نبوت کے قائل ہیں انھوں نے اس آیت سے استدلال کیا ہے وَمَا فَعَلْتُهُ عَنْ اَمْرِي ذَالِكَ تَاوِيلُ مَالَمْ تَسْتَطِعْ عَلَيْهِ صَبْرًا (میں نے یہ کام اپنی مرضی سے نہیں کیا (بلکہ بحکمِ خدا کیا ہے) جن امور پر تو صبر نہیں کر سکا ان کی یہی تاویل ہے) (قرآن مجید: سورہ کہف آیت ۸۲)

فرمایا: ہر غوث و قطب وغیرہ جو اصحابِ تصرف ہیں جو کام یا تصرف بھی کرتے ہیں وہ اللہ ہی کے حکم سے کرتے ہیں مگر پھر بھی اسے رسالت یا نبوت نہیں کہا جاتا، مگر اکثر لوگ یہ بات نہیں سمجھتے۔

اس کے بعد حضرت نے بہت ہی نفیس بحث کی اور چونکہ یہ اسرارِ مکنونہ میں ہے اس لیے میں نے

(بقیہ حاشیہ صفحہ سابقہ)

اُخُوكَ الْخِضْرُ يَقْرَأُ عَلَيْكَ السَّلَامَ (کہ آپ کا بھائی خضر سلام عرض کرتا ہے) یہاں پر خود خضرؑ نے "بھائی" کا لفظ استعمال کیا ہے جو انبیاء انبیاء کے لیے استعمال کرتے ہیں۔ چنانچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں (بروایت ابی ہریرہؓ مشکوٰۃ باب بدء الخلق وذکر الانبیاء ص ۵۰۹ طبع مجتبائی) اَلْاَنْبِيَاءُ اِخْوَةٌ مِنْ عَلَّاتٍ وَ اُمَّهَاتُهُمْ شَتّٰى وَدِيْنُهُمْ وَاحِدٌ۔

امام عبدالکریم قشیری نے بھی حضرت خضرؑ کو ولی قرار دیا ہے نبی نہیں کہا (رسالہ قشیریہ ص ۱۷۶) شیخ عبدالحق محدث دہلوی لمعات میں فرماتے ہیں کہ وہ معمر نبی محجوب ہیں۔ کمال الدین محمد بن محمد المعروف بامام الکاملیۃ متوفیٰ ۸۶۳ھ نے خضرؑ اور ان کے زندہ ہونے کے متعلق ایک رسالہ لکھا ہے (کشف الظنون: ج ۱: ۴۲) اور خاتم الحفاظ جلال الدین سیوطی نے خضر کے نبی ہونے کے متعلق رسالہ لکھا ہے جس کا نام وجہ النظرنی ترجیح نبوۃ الخضر رکھا ہے (کشف الظنون ج ۲: ۱۲۱۴) (نیز ملاحظہ ہو ص ۴۶۵)

اسے تحریر نہیں کیا۔ خدا حضرت سے راضی ہوا نہیں اللہ کی کس قدر معرفت حاصل تھی۔

مؤلف کہتا ہے کہ حضرت نے جو یہ جواب دیا ہے کہ موسیٰ علیہ السلام کو ان امور کا علم نہ تھا اور جو راز اس کا بیان کیا ہے، یہ ان اسرار الٰہیہ میں سے ہے جن کی معرفت پر لوگ شک کرتے ہیں وہ حکایات جو بعض پیروں کو اپنے مریدوں سے پیش آتی ہیں، ان کا بھی یہی حال ہے کیونکہ بعض اوقات پیر کامل اپنے مرید سے دنیا کے واقعات کا استفادہ کرتا ہے چنانچہ ایک شخص نے اپنے مرید کے متعلق کہا کہ جب سے فلاں شخص فوت ہو گیا ہے آسمان کی خبریں ہم سے جاتی رہیں یہاں تک کہ دوسرے مرید نے اس کی جگہ لے لی اور وہ بھی پہلے کی طرح خبریں دینے لگا تو پیر نے کہا جو بات گم ہو گئی تھی پھر آ گئی ہے۔ میں نے اس کامل اور اس کے دونوں مریدوں کا نام اس لیے نہیں لیا کہ اصل غرض کا اس سے کوئی تعلق نہیں۔ واللہ اعلم۔

مشاہدۂ نبوی کی علامت

حضرت نے فرمایا: ہر چیز کی علامت ہوتی ہے اور اس بات کی علامت کہ کسی انسان کو بیداری میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا مشاہدہ حاصل ہوا ہے یہ ہے کہ اس کی فکر ہر لحظہ اور ہر وقت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف لگی ہوئی ہو چنانچہ اس کی فکر نہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے کبھی غایب ہو اور نہ کوئی امر اس کی توجہ کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے ہٹا سکے اور نہ کسی اور بات میں وہ مشغول ہو چنانچہ کھائے تو اس کی فکر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے لگی ہو۔ پیئے تو یہی حال ہو۔ جاگے تو بھی یہی حال ہو اور سوتے بھی تو یہی حال ہو۔

میں نے عرض کیا کیا انسان کو حیلہ اور کسب سے یہ بات حاصل ہو سکتی ہے؟

حضرت نے فرمایا: نہیں۔ کیونکہ اگر یہ انسان کے حیلہ اور کسب سے ہوتی تو جب کوئی امر صارف یا کوئی اور کام پیش آ جاتا تو اس پر آنحضرتؐ سے غفلت طاری ہو جاتی، لیکن یہ امر اللہ کی طرف سے ہوتا ہے جس پر اللہ تعالےٰ اپنے بندے کو لگائے رکھتا ہے اور اس کام میں اسے استعمال کرتا ہے اور بندے کو اس میں کوئی اختیار حاصل نہیں حتّٰی کہ اگر بندہ اس مشاہدہ کو دور کرنا چاہے تو نہیں کر سکتا۔ اسی لیے کوئی امر یا صارف اسے آپ سے نہیں ہٹا سکتے چنانچہ انسان کا باطن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ہوتا ہے اور ظاہر لوگوں کے ساتھ۔ ان کے ساتھ باتیں کرتا ہے تو بغیر ارادہ کے اور

---

[۱] چنانچہ امام احمدؒ ابوالعباس المرسی فرماتے ہیں کہ مجھے چالیس سال گزر گئے ہیں کہ اس عرصہ میں کبھی بھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے حجاب میں نہیں رہا اور اگر ایک لحظہ کے لیے بھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے حجاب میں ہو جاؤں تو میں اپنے آپ کو مسلمان شمار نہ کروں (لواقح الانوار فی طبقات الاخیار ج ۲: ۱۴)

کھاتا ہے تو بغیر قصد کے اور ظاہر میں جن امور کا مشاہدہ کرتا ہے انہیں بھی بلا قصد کرتا ہے اس لیے کہ اعتبار تو دل پر ہے جو ان چیزوں کے ساتھ نہیں ہوتا پس اگر کسی انسان کی مدت تک یہی حالت رہے تو اللہ تعالیٰ اسے بیداری میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا مشاہدہ عطا کرتے ہیں۔ مختلف لوگوں میں یہ مدت مگر مختلف ہوتی ہے۔ بعض لوگوں کو ایک ماہ لگتا ہے اور بعضوں کو کم اور بعض کو زیادہ۔

حضرت نے فرمایا: مشاہدۂ نبی صلی اللہ علیہ وسلم ایک بہت بڑی بات ہے اور اس کا بہت بڑا مرتبہ ہے۔ اگر اللہ تعالیٰ مدد نہ فرمائیں تو انسان اسے برداشت نہ کر سکے۔ اگر ہم فرض کر لیں کہ ایک شخص بہت طاقتور ہے کہ اس میں ایسے چالیس آدمیوں کی طاقت جمع ہو جو اپنی بہادری اور شجاعت کی وجہ سے شیر کو کان سے پکڑ سکتے ہوں پھر ہم فرض کریں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اس شخص کی طرف نکل آئیں تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے دبدبہ اور رعب کی وجہ سے اس شخص کا جگر پھٹ جائے، اس کی ذات پگھل جائے اور روح نکل جائے اس قدر دبدبے اور رعب کے باوجود اس مشاہدہ میں وہ لذت پائی جاتی ہے کہ اس کی نہ کیفیت بیان ہو سکتی ہے اور نہ اس کا احاطہ ہو سکتا ہے حتیٰ کہ اہل مشاہدہ کے نزدیک یہ جنت میں جانے سے بھی افضل ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ جو لوگ جنت میں جائیں گے انہیں جنت کی تمام نعمتیں عطا نہ ہوں گی بلکہ ہر شخص کے لیے مخصوص نعمتیں ہوں گی، برخلاف مشاہدۂ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے کہ جب انسان کو مشاہدۂ نبی حاصل ہو جاتا ہے تو اس کی ذات کو جنت کی تمام نعمتوں سے سیراب کیا جاتا ہے چنانچہ بعینہٖ اسی طرح جس طرح جنت میں اہلِ جنت کو حاصل ہو گی اسے بھی ہر قسم اور ہر رنگ کی چیزوں کی لذت حاصل ہو گی اور جس ذات کے نور سے جنت ہی کی تخلیق ہوئی ہو اس کے حق میں تو یہ لذت ہیچ ہے۔

پھر فرمایا: ہر مشاہدہ میں صاحب مشاہدہ کو سیرابی حاصل ہوتی ہے اور جسے ہر دم و لحظہ یہ مشاہدہ حاصل رہے اس کے لیے سیرابی بھی دائمی ہوتی ہے۔

مؤلف کہتا ہے کہ میں شمائل ترمذی اور اس کی شروح کا مطالعہ کیا کرتا تھا۔ چنانچہ جب میں شارحین آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے رنگ، طولِ ذات، طولِ شعر، آپ کی چال اور آپ کے دیگر احوال کے متعلق اختلاف پاتا تو حضرت کی خدمت میں حاضر ہوتا اور ان سے حقیقت دریافت کرتا تو آپ اس طرح جواب دیتے جس طرح کوئی آنکھوں سے دیکھ رہا ہو اور مشاہدہ کر رہا ہو۔ اس قسم کی چند باتیں ہم باب اوّل کے آخر میں بیان کر آئے ہیں۔

حضرت کا ایک عجیب واقعہ یہ ہے کہ میں آپ سے اس قسم کے سوالات کر رہا تھا اور آپ درختوں کی صفائی کرنے اور ان چیزوں کو دور کرنے میں لگے تھے جن کا رہنا درختوں میں مناسب نہیں اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ میرے سوال کی طرف دھیان نہیں دے رہے تھے ابھی میں نے سوال ختم نہیں کیا ہوتا تھا کہ آپ فوراً اور بغیر سوچے جواب دیتے۔ اس میں حضرت کے مذکورہ بالا فرمان کی تائید ہوتی ہے کہ اعتبار باطن کا ہے اور ظاہراً جو کچھ بھی ہو وہ بلا قصد وارادہ ہے لہٰذا درختوں کا صاف کرنا بھی آپ کے قصد وارادہ سے نہ تھا اور آپ کا باطن اللہ سبحانہٗ کی طرف لگا ہوا تھا یہی وجہ ہے کہ آپ کو جواب سوچنے کی ضرورت نہ پڑتی تھی۔ واللہ اعلم۔

مشاہدۂ الٰہی حاصل ہونے کی علامت

حضرت نے فرمایا کہ اس بات کی علامت کہ بندہ کو اللہ عزوجل کا مشاہدہ حاصل ہو چکا ہے، یہ ہے کہ مشاہدۂ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد اس کے دل میں اللہ سے تعلق کا خیال پیدا ہو اس طرح اس کے تمام خیالات اس میں اس طرح لگ جائیں جس طرح کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم میں لگے تھے پھر اس کی یہ حالت جاری رہے تاآنکہ اسے مشاہدۂ حق کی فتح حاصل ہو اور اسے مقصود حقیقی اور نتیجہ اصلی نصیب ہو جب صاحب فتح مشاہدۂ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے وقت اہل جنت کی تمام نعمتوں سے سیراب ہوتا ہو تو اللہ تعالیٰ کے مشاہدہ کے وقت جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم، جنت اور ہر چیز کا خالق ہے اس کی کیا حالت ہوگی۔

فرمایا: مشاہدۂ حق میں فتح حاصل کرنے کے بعد اہل فتح کی دو قسمیں ہو جاتی ہیں ایک قسم تو ایسی ہے جو ہر چیز کو چھوڑ کر مشاہدۂ حق میں غائب ہو جاتے ہیں اور دوسری قسم اور یہ لوگ زیادہ کامل ہوتے ہیں، ان لوگوں کی ہے جن کی روحیں تو مشاہدۂ حق میں مستغرق ہوتی ہیں مگر ان کی ذات مشاہدۂ نبی صلی اللہ علیہ وسلم میں لگی رہتی ہے چنانچہ نہ تو روح کا مشاہدہ ذات کے مشاہدہ پر غالب آتا ہے اور نہ ذات کا مشاہدہ روح کے مشاہدہ پر۔

پھر فرمایا: یہ قسم زیادہ کامل اس لیے ہوتی ہے کہ حق سبحانہٗ کا مشاہدہ جو انہیں حاصل ہوتا ہے وہ پہلی قسم والوں کے مشاہدہ سے زیادہ کامل ہے اور ان کا مشاہدہ اکمل اس لیے ہوتا ہے کہ وہ مشاہدۂ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے جو مشاہدۂ حق تک ترقی کرنے کا سبب ہے منقطع نہیں ہوتے۔ لہٰذا جسے جس قدر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا مشاہدہ زیادہ ہوگا، اسی قدر اسے حق سبحانہ کا مشاہدہ زیادہ ہوگا اور جس کا کم ہوگا اسے مشاہدۂ حق بھی کم ہوگا۔ اگر بندے کو اختیار حاصل ہوتا اور اسے نوّے سال کی عمر ملتی تو اس مدت میں سوائے مشاہدہ نبی صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے کسی چیز کو اختیار نہ کرتا اور موت

سے ایک دن پہلے اسے مشاہدۂ حق کی فتح نصیب ہوتی کیونکہ مشاہدۂ نبی صلی اللہ علیہ وسلم میں راسخ قدم ہونے کی وجہ سے اسے اس دن مشاہدہ حق کی فتح اس شخص سے بھی زیادہ حاصل ہو گی جسے اس تمام مدت میں اوّل سے آخر تک دونوں فتح حاصل رہی ہوں۔

اس کے بعد آپ نے آنکھوں پر عینک لگائی اور حروف کو دیکھنا شروع کیا اور فرمایا کیا ان حروف کا دیکھنا عینک کے شیشوں کی صفائی و رونق کے تابع نہیں ہے؟

میں نے عرض کیا: ضرور ہے۔

حضرت نے فرمایا: مشاہدۂ نبی صلی اللہ علیہ وسلم بھی بمنزلہ عینک کے ہے اور مشاہدۂ حق بمنزلہ حروف کے ہے۔ لہٰذا مشاہدۂ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی صفائی کے مطابق ہی حق سبحانہٗ کے مشاہدہ میں صفائی حاصل ہو گی اور بادل دور ہوں گے یہ بات آپ نے اس وقت فرمائی جب ایک فقیہ نے آپ سے یہ سوال کیا کہ کیا ولی کے لیے ممکن ہے کہ وہ نماز ترک کر دے تو حضرت نے فرمایا:

کیا ولی کے لیے ترک نماز ممکن ہے؟

ولی کے لیے نماز کا ترک کرنا ممکن نہیں اور یہ کیسے ممکن ہو سکتا ہے جبکہ اسے ہر وقت دو شعلوں سے داغ دیا جا رہا ہے چنانچہ اس کی ذات کو مشاہدۂ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے داغ دیا جاتا ہے اور اس کی روح مشاہدۂ حق سے اور یہ دونوں مشاہدے اسے نماز پڑھنے اور دیگر اسرار شریعت کا حکم دیتے ہیں۔

ایک اور بار حضرت نے فرمایا: ولی کیسے نماز ترک کر سکتا ہے جبکہ دونوں مشاہدوں میں جو

ے سیّد عبدالقادر جیلانی رحمۃ اللہ فرماتے ہیں ایک بار مجھے بہت بڑا نور دکھائی دیا جس سے تمام فضا روشن ہو گئی پھر اس میں ایک صورت اتری جس نے مجھے پکار کر کہا اے عبدالقادر میں تمہارا رب ہوں اور تمہارے لیے میں نے تمام محرمات کو حلال کر دیا ہے اس پر میں نے کہا: "اے لعین دور ہو جا" تو فوراً تمام نور اندھیرے میں بدل گیا اور وہ صورت دھواں بن گئی۔ پھر اس نے مجھے مخاطب کر کے کہا: "اے عبدالقادر چونکہ تجھے اپنے رب کے معاملات کا پتہ تھا اور تجھے اپنی منزلوں کے احوال کی خبر تھی اس لیے تو مجھ سے بچ نکلا۔ میں تو اس طریقہ سے ستّر اہل طریقت کو گمراہ کر چکا ہوں"۔ میں نے جواب دیا یہ اللہ کی عنایت ہے۔ حضرت سے کسی نے دریافت کیا کہ آپ کو کیسے معلوم ہوا کہ یہ شیطان ہے۔ فرمایا: اس کے ان الفاظ سے کہ میں نے تمہارے لیے محرمات حلال کر دیئے (لواقح الانوار ج ۱ ص ۱۹)

کسی نے محمد ابوالمواہب شاذلی سے سوال کیا کہ یہ جو کسی صوفی کا قول ہے کہ ایک مقام پر پہنچ کر ولی سے تکلیف ساقط ہو جاتی ہے اس سے کیا مراد ہے۔ شاذلی نے فرمایا کہ یہ اسی قسم کا قول ہے جس طرح آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا۔ "اَرِحْنَا یَا بِلَالُ" (لواقح الانوار ج ۲ ص ۹۲)

بھلائی بھی اسے حاصل ہوتی ہے وہ اس وقت حاصل ہوتی ہے جبکہ اس کی ذات اسرارِ ذات نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے سیراب ہو چکی ہوتی ہے اور یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ ایک ذات آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات کے اسرار سے سیراب ہو بھی اور پھر وہ کام نہ کرے جسے آنحضرت کی ذات کرتی ہے۔ یہ ہرگز نہیں ہو سکتا۔

اس کے بعد حضرت نے مشاہدۂ حق، اللہ کے نور سے دیکھنے اور اس کی نظر میں زمان کے اُٹھ جانے کہ نہ ماضی ہو نہ حال اور نہ مستقبل، کا ذکر کیا اور فرمایا کہ حق سبحانہ کی ذات بلند کا مشاہدہ کیسا ہے اور یہ کہ اسمارِ الٰہیہ کے انوار سے کوئی ذات کس طرح سیراب ہوتی ہے۔ اسمار کی تعداد کے مطابق مراتب کی تقسیم روح کی فتح وغیرہ دیگر اسرار کا ذکر کیا جن کا نہ عبارت احاطہ کر سکتی ہے اور نہ اشارے اس میں مفید ثابت ہو سکتے ہیں۔ واللہ اعلم۔

فرمایا: جب اللہ تعالیٰ کسی بندے پر رحم فرمانا چاہتے ہیں اور اسے حجاب کی حالت سے منتقل کر کے فتح و مشاہدہ کی حالت میں لے جاتے ہیں تو اولیاء اللہ کو اس کے متعلق ڈر لگنے لگتا ہے اس لیے کہ معلوم نہیں کہ اس فتح کو برداشت نہ کرنے کی وجہ سے وہ مر جائے گا یا زندہ رہے گا اور اگر نہیں مرے گا تو کیا اس کی عقل سلب ہو جائے گی یا نہیں بلکہ قائم رہے گی اور یہاں پر سلب عقل سے مراد یہ ہے کہ اس کی عقل ان بڑے بڑے امور کے ساتھ رہے گی جن کا وہ مشاہدہ کرتا ہے اور ذات سے بالکل منقطع ہو جائے گی کہ اس کی طرف پھر لوٹ نہ سکے گی اور عدمِ سلب سے مراد یہ ہے کہ اس کی عقل کا نور تو اس کے مشاہدہ کے ساتھ ہو اور کچھ حصہ ذات کے ساتھ رہے تاکہ اس کے کھانے اور پینے کا انتظام کر سکے اور جان سکے کہ کس طرح کپڑا پہنے اور اپنی مصلحتوں میں کس طرح غور کر سکے۔

حضرت نے فرمایا: یہ شخص جس پر اللہ نے رحمت کرنا چاہی ہے۔ سو اس کے پیر کے کوئی شخص نہیں جان سکتا کہ اس کا کیا انجام ہو گا۔

مؤلف کہتا ہے کہ جو صاحبِ فتح اپنے مرکز سے نکلتا ہے وہ یا تو مر جاتا ہے یا اس کی عقل جاتی رہتی ہے۔

حضرت نے فرمایا: جب اللہ تعالیٰ کسی بندے کو فتح نصیب کرتے ہیں تو وہ عالمِ ملائکہ، عالمِ جن اور عالمِ شیاطین کی ان باتوں کا مشاہدہ کرتا ہے جس کی اس میں طاقت نہیں ہوتی اور اسے بہت سی ڈراؤنی صورتیں دکھائی دیتی ہیں اور اس قدر خوفناک آوازیں سنائی دیتی ہیں جن سے جگر پھٹ جائیں۔ پھر فرمایا کہ بعض اوقات ایک آدمی دوکان پر بیٹھا سودا بیچ رہا ہوتا ہے کہ اسے فتح نصیب

ہو جاتی ہے اور وہ ایسی باتوں کا مشاہدہ کرتا ہے جن کو وہ برداشت نہیں کر سکتا لہٰذا وہ اسی وقت
مرجاتا ہے لوگ سمجھتے ہیں کہ اس کی بغیر سبب کے اچانک موت واقع ہوئی حالانکہ اس کی موت اسں
فتح کی وجہ سے واقع ہوئی ہوتی ہے۔

ایک بار حضرت نے ذکر فرمایا کہ ایک مرتبہ وہ فاس میں عطاروں کے بازار میں سے گزر رہے تھے
تو دیکھا کہ ایک شخص دکان پر بیٹھا مہندی بیچ رہا ہے۔ یکایک اسے فتح نصیب ہوئی اور وہ غش
کھا کر گرا اور مر گیا، لوگوں نے سمجھا کہ وہ اچانک مر گیا حالانکہ وہ ولایت پر مرا تھا۔

میں نے پوچھا: جس شخص کی عقل فتح کی وجہ سے سلب ہو جائے اور جس کی عقل کسی اور وجہ سے
سلب ہو دونوں میں کیسے فرق ہوگا؟

فرمایا: جس شخص کی عقل فتح کی وجہ سے سلب ہوئی ہو دراصل اس کی عقل سلب نہیں ہوتی وہ
تو حق سبحانہٗ کے مشاہدہ میں غایب ہوا ہے لہٰذا وہ ہر وقت اسی مشاہدہ کے سمندر میں تیر رہا ہوتا ہے
مگر اللہ کسی حکمت کی بنا پر اس کی عقل کو اس کی ذات سے علیحدہ کر دیتا ہے مگر جس کی عقل کسی اور
سبب سے زائل ہوتی ہو تو اس کا سبب یہ ہوتا ہے کہ جب اللہ تعالیٰ کسی کو ہلاک کرنا اور اس کی
عقل کو زائل کرنا چاہتے ہیں۔ خدا ہمیں اس سے بچائے، تو اس کی روح کو اپنی ذات علیہ کے مشاہدہ
سے ایک یا دو گھڑی کے لیے منقطع کر دیتا ہے اور روح جس ذات کے اندر ہوتی ہے اسی کے افعال
کا مشاہدہ کرنے لگ جاتی ہے اور روح کو اس گنہگار بندے کے قبیح افعال کے مشاہدہ میں
ابھی پوری ایک گھڑی گزری ہوتی ہے کہ اسے قبض لاحق ہو جاتی ہے جس کی وجہ سے عقل زائل ہو جاتی
ہے۔ خدا اس سے بچائے۔ لہٰذا جب قبض متواتر رہے تو عقل بھی بدستور زائل رہتی ہے اور
اگر قبض متواتر نہ رہے اور روح کو بسط و جمال حاصل ہو جائے تو اسے پہلے کی طرح پھر سے ذات علیہ کا
مشاہدہ حاصل ہو جاتا ہے اور عقل بھی لوٹ آتی ہے۔

میں نے عرض کیا: بعض اوقات تو چھوٹے بچے کی بھی عقل زائل ہو جاتی ہے، اس کے افعال کیسے
قبیح ہو سکتے ہیں یا وہ کیسے گنہگار ہو سکتا ہے؟

فرمایا: روح کے نزدیک بندے کے تمام احوال گناہ ہیں اس لیے کہ اس کا مشاہدہ اور حق
بات کی معرفت اس بات کے مقتضی ہیں کہ وہ ہر وقت سجدے میں رہے اور کبھی بھی سجدہ سے سر نہ
اٹھائے اس میں اس کے نزدیک چھوٹے اور بڑے سب برابر ہیں۔

حضرت نے فرمایا: جب مفتوح کے پاس دو ایسے شخص آ کر بیٹھ جائیں جن کی عقل زائل ہو چکی ہو

اور ان میں سے ایک ولی ہو اور دوسرا غیر ولی اور وہ دونوں گفتگو شروع کر دیں تو مفتوح ولی کو اس کے کلام سے ہی پہچان لے گا اس لیے کہ اگرچہ اسے معلوم نہیں کہ وہ کیا کہہ رہا ہے پھر بھی اس سے کچھ نہ کچھ اسرار الٰہیہ ظاہر ہو جاتے ہیں جنہیں سنکر اصحاب اسرار سمجھ جاتے ہیں۔ برخلاف غیر ولی کے کہ اس سے اسرار الٰہیہ قطعاً ظاہر نہیں ہوتے۔ ولی کی ایک اور پہچان بھی ہے اور وہ یہ ہے کہ اس کی روح ہمیشہ خوش خوش دکھائی دیتی ہے اور غیر ولی کی روح ایسی معلوم ہوتی ہے جیسے کوئی شخص سر جھکائے مغموم بیٹھا ہو اور اپنے غموں کے متعلق سوچ رہا ہو۔

فرمایا: جن لوگوں کی عقل فتح کے بغیر زائل ہو جاتی ہے وہ چوپایوں کی مانند ہیں مگر اللہ تعالیٰ ان پر رحم فرمائیں گے اور انہیں جنت میں داخل فرمائیں گے اس لیے کہ ان کی انسانی شکل ان کی شفیع ہوگی۔ یوں سمجھو کہ یہ ہیں تو چوپائے مگر انسانی شکل میں اس لیے اللہ تعالیٰ ان کی قابلِ احترام صورت کی وجہ سے جس پر اللہ تعالیٰ نے اپنے انبیاء اور رسولوں کو پیدا کیا ہے ان پر رحم فرمائیں گے تاکہ وہ چوپایوں کی طرح مٹی نہ بن جائیں۔

مجذوب صاحب تصرف نہیں ہوتا

پھر فرمایا: جن لوگوں کی عقل فتح کی وجہ سے زائل ہوتی ہے وہ قابلِ احترام ولی ہوتے ہیں مگر انہیں اولیاء کے ساتھ تصرف کا اختیار نہیں دیا جاتا اور نہ ہی یہ غوث یا قطب بن سکتے ہیں تا آنکہ اللہ تعالیٰ دجال کو نکالنے کا ارادہ فرمائیں۔ اس وقت ان لوگوں کے ہاتھوں میں تصرف دیا جائے گا اور پھر ان میں سے غوث بھی ہوں گے جس سے حالات میں فساد اور نظام میں خلل پیدا ہو جائے گا۔ انہی لوگوں کے تصرف کے زمانہ میں دجال کا خروج ہوگا جب دجال کا معاملہ ختم ہو جائے گا تو ان لوگوں کی حکومت بھی ختم ہو جائے گی اور پھر دوبارہ نہیں ملیگی۔ واللہ اعلم۔

حضرت نے فرمایا کہ مجھے حضرت عبداللہؒ برناوی نے پوچھا کیا تو دنیا میں کسی ایسی چیز کو جانتا ہے جو جنّت میں جانے سے بھی بہتر ہو اور دوسری ایسی چیز کو جو جہنّم میں جانے سے بھی بدتر ہو؟

مَیں نے عرض کیا ہاں جانتا ہوں۔ جو چیز جنّت میں داخل ہونے سے بھی بہتر ہے وہ بیداری میں سیّد الوجود صلّی اللہ علیہ وسلّم کا دیدار ہے چنانچہ آج بھی ولی آنحضرت صلّی اللہ علیہ وسلّم کو اس طرح دیکھ سکتا ہے جس طرح صحابہ رضوان اللہ علیہم آپ کو دیکھا کرتے تھے اور یہ دیدار جنت سے بھی افضل ہے۔

اور جو چیز[1] جہنم سے بھی بدتر ہے وہ فتح حاصل ہونے کے بعد اس کا سلب ہو جانا ہے۔

حضرت فرماتے ہیں: یہ سنکر شیخ عبداللہ میرے پاؤں پر گر پڑے اور انہیں بار بار بوسہ دیتے گئے میں نے عرض کیا جناب آپ کیوں بوسہ دے رہے ہیں؟ تو فرمایا: میں نے تقریباً اسی بزرگوں سے یہی سوال کیا تو ان میں سے کسی ایک نے بھی تمہاری طرح کا جواب نہیں دیا۔

(مؤلف کہتا ہے) میں نے پوچھا تو پھر سید عبداللہ کو اصلی جواب معلوم تھا اور وہ آپ کی عقل کا امتحان کرنا چاہتے تھے؟

فرمایا: ہاں جانتے تھے اور وہ مجھے آزمانا چاہتے تھے جیسا کہ تو نے بیان کیا۔

مؤلف کہتا ہے کہ سید الوجود صلی اللہ علیہ وسلم کے دیدار کے جنت سے افضل ہونے کی وجہ بیان کی جا چکی ہے۔

پھر میں نے دریافت کیا کہ سلب جہنم سے بدتر کیوں ہے؟

فرمایا: اس کا مقابلہ اس شخص سے کرو جسے ہمیشہ فتح حاصل ہو جس کا مطلب یہ ہے کہ وہ اس سلب کو جو اس کی فتح کو زائل کر رہی ہے جہنم سے بدتر سمجھتا ہے۔ یہ حکم سلب ہونے کے بعد مسلوب شدہ امر کے اعتبار سے نہیں ہے خدا اپنی پناہ میں رکھے اس لیے کہ سلب کے بعد تو اس کا دل پتھر کی مانند ہو جاتا ہے کہ پہلی فتح میں سے اسے اب نہ کوئی چیز دکھائی دیتی ہے اور نہ کچھ سمجھتا ہے جیسے اس نے کبھی بھی کسی چیز کا مشاہدہ کیا ہی نہیں اور اس کی ذات خبثیہ فتح کے بوجھ سے اپنے آپ کو ہلکی سمجھتی ہے اور اس میں راحت پاتی ہے۔

فرمایا: دنیا کے امراء کی اگر امارت سلب ہو جائے تو ان کی حالت اس شخص سے بہت بہتر ہوتی ہے۔ خدا اپنی پناہ میں رکھے۔ اس لیے کہ امیر کے خیال میں اپنی تمام نعمتیں اور لذتیں جو اس نے دنیا میں حاصل کی ہوتی ہیں، آتی ہیں اور وہ ان کے ذکر سے ہی کچھ لذت حاصل کر لیتا ہے برخلاف اس شخص کے جس سے فتح سلب کر لی گئی ہو کیونکہ اس کا دل مٹ چکا اور اس کی بصیرت کا سورج سیاہ پڑ چکا ہوتا ہے۔ واللہ اعلم۔

حضرت نے فرمایا: حضرت محمد بناطرابلسی[2] چودہ سال تک اس تلاش میں رہے کہ کوئی انہیں اللہ کی راہ

---

[1] حضرت جنیدؒ فرماتے ہیں: الغفلة عن الله اشد من دخول النار۔ اللہ سے غفلت دوزخ سے بھی زیادہ سخت ہے (لواقح الانوار ج ۲ ص ۲)

[2] محمد بناطرابلسی: شیخ علاء الدولہ احمد بن محمد بن احمد البنا المالکی (کشف الظنون ۱: ۴۹۳)

پر لگا دیئے اور اس تلاش میں وہ ہر جگہ پھرے چنانچہ مصر، شام، عراق، قسطنطنیہ اور ہندوستان تک پھر آئے۔ جس ولی کے متعلق سنتے اس کے پاس جاتے چنانچہ ان لوگوں کے پاس بھی گئے جو ولایت کی وجہ سے لوگوں میں مشہور تھے مگر انہیں کہیں کوئی چیز نظر نہ آتی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ ان کے والد عارفین میں سے تھے اور انہوں نے اپنے والد سے امرِ حق سنا تھا مگر جب ان کے ہاتھوں اسے فتح نصیب نہ ہوئی تو پھر کسی عارف کو ڈھونڈنے لگے جو انہیں اللہ تک پہنچا دے۔ آپ کی تلاش نگاہِ باطن سے تھی اس لیے آپ کسی کی شہرت وغیرہ کی پروا نہ کرتے تھے۔ بیان کیا جاتا ہے کہ آپ کی ملاقات عراق میں ایک شخص سے ہوئی جس کے پاس لاتعداد لوگ جمع تھے اور اس نے آنے جانے والوں کے لیے مہمان خانہ تیار کر رکھا تھا جہاں ہر روز تقریباً چار من کھانا پکتا تھا۔ اور اس نے مہمان خانہ کے اندر عبادت کے لیے ایک خلوت گاہ بنا رکھی تھی جہاں سے وہ صرف مہینے کے آخری تین دنوں کے لیے نکلتا۔ باقی تمام ستائیس دن وہ رکوع و سجود میں لگا رہتا۔ خلوت گاہ میں ایک طاق تھی جس میں سے خادم شیخ کا کھانا دے دیا کرتا۔ قضاء حاجت اور طہارت کے لیے بھی اسی خلوت گاہ کے اندر ایک الگ جگہ بنا رکھی تھی۔ چنانچہ خادموں نے ان کی خلوت کے لیے ہر طرح کا انتظام کر رکھا تھا تاکہ انہیں باہر نکلنے کی زحمت نہ ہو۔ لہٰذا وہ ستائیس دن خلوت میں رہتا اور جب یہ دن گزر جاتے تو تین دن کے لیے نکلتا اور آنے والوں کے ساتھ باری باری ان کی حاجتوں کے متعلق بات کرتا یہاں تک کہ سب بات کر چکتے۔ جب تین دن گزر جاتے اور نیا مہینہ شروع ہو جاتا وہ پھر خلوت میں چلا جاتا اور پھر وہیں ستائیس دن رہتا۔ عمر بھر سے اس کی یہی عادت تھی۔ جب میں نے اس شخص کے متعلق سنا تو وہاں پہنچا اور انتظار میں رہا۔ یہاں تک کہ وہ خلوت گاہ سے نکل کر آیا اور لوگوں سے بات شروع کی جو مجھ سے پہلے آئے ہوئے تھے۔ جب میری باری آئی تو مجھ سے پوچھا: کیا چاہتے ہو؟ میں نے عرض کیا میں دو باتیں پوچھنا چاہتا ہوں۔ ایک آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق اور دوسری اللہ تعالیٰ کے متعلق کہنے لگا: پوچھو۔ میں نے کہا اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: اِنَّا فَتَحْنَا لَکَ فَتْحًا مُّبِیْنًا لِیَغْفِرَ اللّٰہُ لَکَ مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْۢبِکَ وَمَا تَاَخَّرَ (سورۂ فتح آیت ۱) (ہم نے آپ کو فتح مبین عطا کی تاکہ آپ کے اگلے اور پچھلے گناہ معاف کر دیے جائیں) لہٰذا آیت میں تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اگلے اور پچھلے گناہ ثابت کر دیے گئے اور یہ تصریح کر دی گئی کہ مغفرت دونوں پر مشتمل ہے حالانکہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نبوت سے پہلے اور نبوت کے بعد بھی معصوم تھے۔ آپ کا قطعاً کوئی گناہ نہ تھا۔ لہٰذا اس آیت شریف کے ہوتے ہوئے کیا مفہوم سمجھا جائے؟

اس نے جواب دیا گناہ کی دو قسمیں ہیں۔ ثقیل اور خفیف۔ ثقیل جیسے زنا اور شراب پینا اور اس قسم کے گناہ نبیؑ سے صادر نہیں ہوتے اور خفیف جیسے اپنی بیویوں میں سے کسی ایک کی طرف رغبت اور تقسیم ایام میں کسی کو فضیلت دینا وغیرہ خفیف گناہ اور اس قسم کے گناہ نبی سے صادر ہو سکتے ہیں۔ آیت میں اگلے اور پچھلے گناہوں سے یہی مراد ہے اور یہی معاف کیے گئے ہیں۔

یہ جواب سُنکر میں سمجھ گیا کہ یہ شخص آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے مقام سے بے خبر ہے اور عارف آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے مرتبہ اور صغائر اور کبائر سے آپؐ کے معصوم ہونے سے بے خبر نہیں ہو سکتا۔ اس لیے کہ گناہ تو صرف ان لوگوں سے صادر ہوتے ہیں جو اللہ سے حجاب میں ہوتے ہیں جو غفلت اور ظلمت والے لوگ ہوتے ہیں اور یہ گناہ تو ان عارفین سے بھی صادر نہیں ہوتے جو اہلِ قرب اور اہلِ مشاہدہ ہوتے ہیں چہ جائیکہ انبیاء علیہم الصلوات سے پھر سید الوجود صلی اللہ علیہ وسلم کا تو کیا ہی کہنا۔

پھر کہا دوسرا مسئلہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: وَهُوَ مَعَكُمْ أَيْنَمَا كُنْتُمْ (جہاں کہیں بھی تم ہو وہ تمہارے ساتھ ہے) اس معیّت کا کیا مطلب ہے؟

جواب دیا اس سے مراد مومنین ہیں اللہ تعالیٰ مومنوں کے دلوں میں ہوتے ہیں جو ہمیشہ اس کا ذکر کرتے ہیں اور اس کی طرف گڑگڑاتے ہیں۔

اس پر میں سمجھ گیا کہ وہ اللہ سے بھی ناواقف ہے اور اہل باطل میں سے ہے۔

حضرت نے فرمایا: مجھے بتایا گیا کہ ہندوستان میں ایک شخص ہے جو حد سے زیادہ عبادت گزار ہے۔ میں اس کے پاس گیا۔ جب اس کے پاس پہنچا تو عبادت اور زہد میں جیسا لوگ بیان کرتے تھے۔ میں نے اسے ویسا ہی پایا۔ اس کے زہد کا یہ حال تھا کہ ان کے ہاں ہمارے ہاں کے بلوط کی طرح ایک کھانا ہوتا ہے وہ دن اور رات بھر میں صرف ایک بلوط کھا لیتا تھا اور بس۔ میں نے اسے اللہ عزّوجلّ کے متعلق پوچھا تو اسے انتہا درجہ کا جاہل پایا اور میں سمجھ گیا کہ اس کی عبادت کی کوئی بنیاد نہیں ہے۔

پھر فرمایا: ایک دن میں کسی سمندر کے ساحل پر تھا اور یہ سمندر ایک شہر کے قریب تھا کشتیاں سامان لے کر آئیں اور مزدور سامان اپنی پیٹھوں پر اٹھا کر شہر میں لے جاتے اور اجرت لینے کے لیے آ گئے۔ میں ان کو دیکھ رہا تھا کہ وہ معمول سے بہت زیادہ بوجھ کمر پر اٹھا لیتے تھے جیسے مصر میں کسانوں کی اور فاس میں زرزایہ لوگوں کی حالت ہے اور مجھے انہیں دیکھ کر بہت تعجب ہوا۔ اچانک ایک شخص میرے پاس آیا اور وہ عارفین میں سے تھا مگر مجھے اس کا پتہ نہ تھا۔ اس نے کشف کے ذریعہ میرے مافی الضمیر کو معلوم کر کے کہا۔ اس پر تعجب نہ کرو۔ اللہ کی اس قدرت پر تعجب کرو جو ابھی ظاہر ہو گی۔

چنانچہ وہ اپنا بوجھ لے کر گیا اور تھوڑی دیر بعد واپس آگیا پھر ہاتھ اور پاؤں پھیلا کر لیٹ گیا اور اس کی روح نکل گئی۔ اللہ اس سے راضی ہو۔ اس کا اس سے اشارہ اس طرف تھا کہ درحقیقت قوی تو خدا ہے جو مالکِ قویٰ اور قدرت ہے جسے چاہے قدرت دے اور جس سے چاہے چھین لے۔ لہٰذا تعجب اس کی قدرت پر ہونا چاہیئے اور اسی کے رعب و دبدبے کو بڑا سمجھنا چاہیئے۔ فَتَبَارَكَ اللّٰهُ اَحْسَنُ الْخَالِقِيْنَ۔

فرمایا: مجھے عارفین کی ایک جماعت ملی۔ ان میں سے ہر ایک مجھے یہی کہتا کہ میں اپنے ملک کو واپس چلا جاؤں کہ میرا مقصد وہیں حل ہوگا۔ چنانچہ میں اپنے ملک کو واپس چلا آیا اور وہاں مجھے ایک شخص ملا جس نے بتلایا کہ تمہاری آرزو فاس میں پوری ہوگی۔ چنانچہ میں سفر کر کے وہاں آگیا اور وہاں مجھے وہ شخص مل گیا جس کے ہاتھوں اللہ نے مجھے فتح نصیب کی اور میں فاس میں چھ ماہ تک رہا اور عارفین اور اہلِ دیوان میں سے ہو گیا۔

میں نے حضرت سے عرض کیا: کیا آپ کی زندگی ہی میں اسے فتح نصیب ہو گئی تھی حالانکہ ولی کو اس کے (روحانی) باپ کی زندگی میں فتح نصیب نہیں ہوتی اس لیے کہ فتح تو سرِّ ذات پر ہی نازل ہوتی ہے اور جب ذات کا سِرّ اولاد کی طرف منتقل ہو جاتا ہے تو فتح واقع ہوتی ہے اور جب تک شیخ زندہ ہو اس کی ذات کا سِرّ کسی کی طرف منتقل نہیں ہوتا۔ لہٰذا فتح بھی اسے نصیب نہیں ہوتی اور اگر بالفرض فتح ہو بھی جائے تو قائم و دائم نہیں رہتی بلکہ بہت جلد زائل ہو جاتی ہے اور اس شخص کو آپ کی زندگی میں ہی فتح نصیب ہو گئی اور فتح قائم بھی ہو رہی؟

حضرت نے فرمایا: وہ میرا (روحانی) بیٹا نہیں ہے وہ تو لوگوں کا مال تھا۔

میں نے دریافت کیا وہ کن لوگوں کا مال تھا؟

حضرت نے فرمایا: جس شخص کے پاس اللہ تعالیٰ نے پہلی ذات کا سِرّ بطور امانت رکھا تھا وہ میرے پاس پڑا رہا اور جب یہ شخص آیا تو میں نے اپنی قمیض اتار کر اسے دے دی اور یہ راز بھی اسے دے دیا۔

میں نے عرض کیا کہ سرِّ مذکور تو اس شخص کے لیے اس وقت تک قائم نہیں رہ سکتا جب تک پہلے شخص کی ذات کا سِرّ اس کی طرف منتقل نہ ہو اور اس شخص نے اسے دیکھا بھی نہیں لہٰذا اس کی فتح کیسے قائم رہی؟

حضرت نے فرمایا: جس شخص کے پاس اللہ تعالیٰ نے پہلی ذات کا سِرّ بطور امانت رکھا ہوا تھا

اس نے اس بات کی قدرت دی تھی کہ وہ دوسرے کو دیدے اور پھر سِر اور فتح بھی عطا کرے مگر اس کے باوجود وہ شخص میرا (روحانی) بیٹا نہیں کہلا سکتا۔ وہ تو اسی کا بیٹا کہلائے گا جس کے مرنے کے بعد اس نے اس کی ذات کا سِر لیا۔

میں نے عرض کیا کہ موروث تو مراکش کا ہے اور وارث طرابلس کا رہنے والا۔ کیا اہلِ مغرب میں سے خیر منقطع ہوگئی ہے کہ یہ شخص آکر راز لے جائے۔

حضرت نے فرمایا: جب تک ایک ذات دوسری ذات کی عقل، طبع اور خون میں ایک جیسی نہ ہو اس کی وارث نہیں بن سکتی میرے حضرت فلاں فرمایا کرتے تھے اگر وراثت قرب کے اعتبار سے ملتی تو میرے بیٹے کو ملتی اور اگر قوت سے ملتی تو سلطان کو ملتی اور اگر خدمت کی وجہ سے ملتی تو میرے فلاں خادم کو ملتی، مگر یہ تو عقل کی عقل سے، طبع کی طبع سے اور خون کی خون سے موافقت کی وجہ سے حاصل ہوتی ہے کسب اور عمل سے حاصل نہیں ہوتی اور یہ شخص ان تمام باتوں میں اس کا ہم شکل تھا۔ واللہ اعلم۔

ولی کے وارث کا کسی کو علم نہیں ہوتا

حضرت نے فرمایا: کہ جب تم کسی عارف کو سنو کہ اکثر کہتا ہے کہ فلاں شخص میرا وارث ہے اور وہی میرے سِر کا مالک ہے۔ میرے بعد اسے پکڑے رہنا تو اکثر ایسا ہوتا ہے کہ ایسا نہیں ہوتا۔ اس لیے کہ یہ اسرار الٰہیہ تو وہاں سے آتے ہیں جہاں سے کسی کو وہم و گمان بھی نہیں ہوتا۔ اس لیے کہ بزرگوں نے اسے پایا حالانکہ لوگ انہیں اس کا اہل ہی نہ سمجھتے تھے اور اسی طرح ان سے نکل کر جائے گا۔

اس کے بعد حضرت نے ان آٹھ آدمیوں کا قصہ بیان فرمایا جو اپنے شیخ کی خدمت کیا کرتے تھے۔ ان میں سے سات تو خدمت پر قائم رہے اور آٹھواں تھک کر رہ گیا اور اس کی یہ حالت ہوگئی کہ وہ کوئی بات نہ کر سکتا اور جہاں بھیجو بےکار ثابت ہوتا پھر ان میں سے تین خدمت پر برقرار رہے اور باقی چار دوں کے مقابلہ میں انھوں نے مزید بات یہ کی کہ ہر ایک نے اپنی بیٹی شیخ کو دیدی اور ان میں سے ایک بیٹی حسن و جمال میں سب پر فائق تھی اور شیخ اسے ہر بات میں سب پر مقدم رکھتے، اسی سے باتیں کرتے جس سے لوگوں کو یقین ہوگیا کہ وہی شیخ کا وارث ہوگا، لیکن جب شیخ کی وفات کا وقت قریب آیا اور ان کے

لے امام عبدالوہاب شعرانی نے علی الخواصؒ برلسی کا اسی قسم کا ایک قول نقل کیا (لواقح الانوار ج ۲ : ۱۴۸) فرماتے ہیں کہ جب عارف اپنے کسی مرید کی تربیت کرتا ہے تو ضروری نہیں کہ وہی اس عارف کا وارث بھی بنے اس لیے کہ حقیقی تربیت تو اللہ کی طرف سے ہوتی ہے۔ جسے چاہتا ہے وارث بنا دیتا ہے۔

مرید آ موجود ہوئے تو شیخ کے تمام منسوبین نے اس عاجز شخص کو بلایا اور کہا تم ہی صاحب سر ہو اور شیخ کی روح پرواز کر گئی اور وہ دنیا سے رخصت ہو گئے۔

حضرت نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ اس شخص پر جسے لوگ بنظرِ حقارت دیکھتے ہیں، بہ نسبت اس شخص کے جسے لوگ بنظرِ تعظیم دیکھتے ہیں، زیادہ رحم و کرم کی نظر رکھتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اہلِ احتقار لوگ اسرارِ ربانیہ کے زیادہ مستحق ہوتے ہیں۔ واللہ اعلم۔

نیز فرمایا کہ کسی ولی کے دو مرید تھے ایک عامی تھا اور دوسرا سیّد، مگر دونوں کو فتح نصیب نہ ہوئی تھی ولی نے عامی کو کہا: جا اس سیّد کو جا کر کہہ کہ تمہارے پاس سر اور فتح کو بیچ دے چنانچہ عامی نے اسکے پاس جا کر کہا کہ ایک سو دینار کے بدلے سر اور فتح اس کے پاس بیچ دے۔ سیّد نے کہا میں نہیں بیچتا۔ عامی نے کہا ایک سو دینار اور لے لو۔ مگر سیّد نے پھر کہا نہیں۔ عامی نے کہا: اپنی نوکرانی بھی تمہیں دیتا ہوں۔ سیّد اب بھی نہ مانا۔ عامی نے کہا: میں اپنی بیٹی بھی تمہارے نکاح میں دے دوں گا مگر سیّد اس پر بھی راضی نہ ہوا۔ عامی نے کہا: میرا گھر بھی لے لو۔ اس پر سیّد راضی ہو گیا اور کہا مجھے منظور ہے اور عامی نے بھی کہا کہ مجھے منظور ہے حالانکہ دونوں محجوب تھے۔ انہیں اسرارِ فتح کا علم بھی نہ تھا۔ عامی نے تو صرف شیخ کی بات پر یقین کر کے یہ کام کیا تھا۔ اس کے بعد عامی نے سیّد سے کہا اب ہم گواہ لے آتے ہیں۔ سیّد نے کہا: ٹھیک ہے۔ چنانچہ عامی گواہ لے آیا اور ان سے تمام بات کہہ دی کہ میں نے یہ چیزیں سیّد کو دیدی ہیں اب تم گواہ رہنا اور سیّد نے بھی کہا کہ تم گواہ رہنا کہ میں نے اسے سر اور فتح دیدی ہے چنانچہ بیٹی سیّد کے پاس چلی گئی وہ گھر اور خادمہ کا بھی مالک بن گیا اور اس نے دو سو دینار بھی لے لیے اس پر تو رات ایسی پُر لطف اور مزہ کی گزری کہ عمر بھر کوئی رات ایسی مزہ دار نہ گزری اور عامی بے چارے پر ایسی پریشانی کی رات گزری کہ ساری عمر ایسی تاریک و تنگ کوئی رات بھی نہ گزری تھی کہ تمام شب شیخ کی طرف سے بدگمان بنانیوالے قسم قسم کے وسوسے آتے رہے اور یہ ان کو دفع کرتا رہا۔ جب پو پھٹی تو پہلے فتح اور سر سیّد کے پاس آیا اور اس نے مشاہدہ کر لیا اور اس نے اس میں وہ کیفیت دیکھی جو نہ کبھی آنکھوں نے دیکھی نہ کانوں نے سنی اور نہ کسی کے خیال میں بھی گزری ہو۔ جب اس نے اسے نظر بھر کر دیکھ لیا اور خوب اچھی طرح سے غور کر لیا تو یہ سب کچھ سلب ہو گیا، خدا اپنی پناہ میں رکھے۔ اس کے بعد فتح اس عامی کے پاس گئی اور وہ اولیاء اللہ میں سے ہو گیا، جب سیّد نے فتح بیچی تھی اس نے ان چیزوں سے جو اس نے لی تھیں کوئی فائدہ نہ اٹھایا اس لیے کہ جونہی اس سے فتح سلب ہوئی تو اس کی عقل بھی جاتی رہی اور اب اس کی زبان پر ہر وقت یہی الفاظ تھے تو کہاں ہے، اپنا گھر لے لے۔ غلام لے لے۔ دینار لے لے۔ اپنی بیٹی لے لے بلکہ میری والدہ بھی لے لے گویا کہ وہ

اس عامی کو مخاطب کر کے کہہ رہا ہے کہ تو کہاں چلا گیا ہے میں نے جو کچھ تم سے لیا ہے تمہیں واپس کرتا ہوں بلکہ اپنی والدہ بھی ساتھ دیتا ہوں۔ اس واقعہ کے بعد وہ ساٹھ سال تک زندہ رہا اور اس کی عقل اسی طرح مسلوب رہی۔ ہم اللہ سے سلامتی چاہتے ہیں۔

حضرت نے فرمایا: اس میں کسی کا کیا بس۔ اس سے تو سِر اور ایک اور چیز جاتی رہی جسے میں کہنا نہیں چاہتا۔

نیز فرمایا کہ میں ایک شخص کو جانتا ہوں جس کی عقل سلب ہو چکی تھی اور اب اس کا ہر وقت یہی کام تھا کہ وہ ہوا میں پتھر پھینکتا اور پھر اپنا سر آگے کر دیتا اور اس کا سر کچلا جاتا۔ میں نے ایک عرصہ تک اسے اسی حالت میں دیکھا ہے اور مجھے معلوم نہیں کہ وہ اس طرح کیوں کرتا ہے۔ یہاں تک کہ مجھے اس کا سبب معلوم ہو گیا کہ یہ شخص پرانے جوتے مرمت کیا کرتا تھا اور اس کی دکان رصیف کی گھاٹی پر تھی کہ اس کی ملاقات ایک ولی سے ہوئی۔ ولی نے اسے کہا بیٹا میرے لیے ایک نئی ٹوپی خرید لا، یہ درہم لے جا کر خرید لا۔ ان کی آپس میں کوئی جان پہچان نہ تھی۔ چنانچہ وہ درہم لے کر گیا اور ولی اس کا انتظار کرتا رہا، اس آدمی نے ٹوپی خرید لی اور لے کر ولی کی طرف آ رہا تھا کہ راستہ میں اس کا دل بے ایمان ہو گیا اور کہنے لگا یہ شخص جس نے تجھے ٹوپی خریدنے کے لیے درہم دیے ہیں، احمق ہے۔ اس نے تجھے جاننے کے بغیر تجھ پر اعتماد کر لیا۔ چنانچہ یہ ٹوپی تو خود ہی پہن لے، اور اس کے پاس نہ جا چنانچہ وہ ٹوپی اس نے خود پہن لی اور پرانی ٹوپی اتار کر دو موزدوں سے بیچ ڈالی اور پھر اپنی دکان پر کام کرنے کے لیے چلا گیا۔ جب ولی کو معلوم ہوا کہ اس نے خیانت اور بے ایمانی کی ہے وہ اس دن تو خاموش رہا مگر دوسرے دن اس کی دکان پر آ کر ایکا ایک ٹوپی اس کے سر سے اتار لی اور کہا ذرا دیکھو کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے کونسی عنایت تم کھو بیٹھے ہو۔ یہ کہہ کر وہ ولی بھاگ گیا۔ اس شخص نے اِدھر اُدھر دیکھا تو اسے فتح حاصل ہوئی اور اس نے ایسی باتوں کا مشاہدہ کیا جو نہ کبھی کسی آنکھ نے دیکھیں نہ کسی کان نے سنیں اور نہ کسی کے خیال پر گزریں مگر جب اپنی نگاہ دکان کی طرف لوٹائی تو فتح سلب ہو گئی۔ خدا اپنی پناہ میں رکھے۔ اس پر وہ سمجھ گیا کہ یہ آفت اسے سر کی وجہ سے آئی ہے اس لیے اس نے یہ عمل اپنے سر سے کرنا شروع کیا اور اس کی عقل جاتی رہی ہے اور آج تک وہ یہ عمل کر رہا ہے یعنی وہ اب بھی زندہ ہے حضرت نے مجھے ایک بار اسے دکھایا بھی ہے کہ یہ شخص ہے جس کا قصہ میں نے تمہیں سنایا تھا۔ میں نے اسے ویسا ہی پایا۔ واللہ اعلم۔

میں نے حضرت سے اس سِر کے متعلق پوچھا جس کی طرف صوفیا اشارہ کیا کرتے ہیں۔

حضرت نے ایک مثال دیکر بیان فرمایا کہ فرض کرو کہ بادشاہ کے پاس سونا ہے اور وہ اسے ہر شخص کو نہیں دے گا۔ صرف اپنی رعایا کے خاص لوگوں کو دیگا۔ یہی حال سِر کا ہے۔ اللہ تعالیٰ اپنی مخلوق میں سے صرف چند منتخب لوگوں کو عطا فرماتے ہیں۔

میں نے عرض کیا کیا فتح اور سِر ایک ہی بات ہے؟

فرمایا: فتح اس سے بڑھ کر ہے مگر سِر فتح کے ہوتے ہوئے قوی ہو جاتا ہے اس لیے کہ مفتوح علیہ کی بینائی کھول دی جاتی ہے جس سے وہ آسمانوں اور زمینوں کو دیکھ سکتا ہے اور اس کے کان کھول دیئے جاتے ہیں اور آسمانی فضا میں پرندے کے پَر ہلانے کی آواز سن لیتا ہے اور ایک سال کی مسافت پر چیونٹی کے چلنے کی آواز سن سکتا ہے۔ اس کی قوتِ شامّہ کو کھول دیا جاتا ہے چنانچہ وہ مٹی کی بو سونگھ لیتا ہے اور ہر مٹی کی خاص بُو ہوتی ہے، اسی طرح ذوات کی بُو، روحوں کی بو، زندہ ذاتوں کی بُو اور تمام اشیاء کی بُو سونگھ لیتا ہے، اسی طرح اس کی قوتِ ذائقہ کو کھول دیا جاتا ہے چنانچہ وہ بغیر چکھنے کے قدیم اشیاء کا ذائقہ چکھ لیتا ہے۔ اسی طرح اس کی قوتِ لامسہ کھول دی جاتی ہے اور اس کے کان بھی کھول دیئے جاتے ہیں جس سے اسے آوازوں میں اشتباہ نہیں پڑتا اور نہ ایک آواز اسے دوسری آواز سے روک سکتی ہے چنانچہ ایک لحظہ کے اندر وہ ہزاروں انسانوں کی باتیں سن اور سمجھ سکتا ہے۔ لہٰذا اگر سِر مذکور فتح کے ساتھ ہو تو دو قوتیں اکٹھی ہو جاتی ہیں، لیکن اگر صرف سِر ہی ہو اور اس کے ساتھ حجاب ہو تو سِر تو بہر حال سِر ہے مگر اس صاحب سِر کو مفتوح علیہ کی سی طاقت حاصل نہیں ہوتی۔

میں نے عرض کیا جب سِر ذات میں فتح کے بغیر داخل ہو تو کونسی چیز حاصل ہوتی ہے؟

فرمایا: ذات میں حق سبحانہ کے اوصاف کی سی چیزیں حاصل ہوتی ہیں جس سے حق ذات کی طبیعت بن جاتا ہے۔ حق کے سوا نہ کسی بات کا علم ہوتا ہے اور نہ حق کے سوا کوئی بات کرتا ہے اور اس کیساتھ بلند صفات اور مکارمِ اخلاق بھی اس میں پائے جاتے ہیں مثلاً عفو، حلم، تجاوز، حیا، کرم وغیرہ لیکن جب فتح کا اس پر اضافہ ہو جاتے تو جیسا کہ بیان ہو چکا دو قوتیں حاصل ہو جاتی ہیں۔ واللہ اعلم۔

فرمایا: جب نورِ قوت سے پہلے فتح کسی ذات پر نازل ہوتی ہے تو ذات میں خلل و ضعف پیدا ہو جاتا ہے جس سے یا تو موت واقع ہو جاتی ہے یا عقل زائل ہو جاتی ہے جیسا کہ بیان ہو چکا، لیکن جب پہلے نورِ قوت ذات پر نازل ہوا اور اس کے بعد نورِ فتح نازل ہو تو ذات کو فتح سے کوئی ضرر نہیں پہنچتا۔

میں نے عرض کیا: یہ قوت کیا چیز ہے؟

حضرت نے ایک کمزور تنکے کی طرف دیکھ کر فرمایا کہ جس قوت کا میں ذکر کر رہا ہوں اگر اس کمزور تنکے

کو عطا کر دی جائے، تو آپ نے سامنے کے ایک پہاڑ کی طرف اشارہ کر کے فرمایا کہ یہ اس پہاڑ کو اٹھانے کے قابل ہو جائے۔ لہٰذا توفیق ایزادی جس کے شاملِ حال ہوتی ہے وہ اللہ تعالیٰ سے فتح کے نازل ہونے سے پہلے نورِ قوت کی درخواست کرتا ہے۔ واللہ اعلم۔

نیز فرمایا: شروع شروع میں میں سیدی منصور کے پاس گیا اور آپ بافندہ تھے یعنی کتان کا کپڑا بنا کرتے تھے۔ میں نے آپ کو روتے ہوتے پایا۔ میں نے عرض کیا: آپ کیوں رو رہے ہیں؟ جواب دیا کہ ہم کس قابل ہیں؟ میں اس وقت کپڑا بنتے ہوئے اللہ کے فعل کا مشاہدہ کر رہا ہوں اور خیال کرتا تھا کہ میں کچھ کر رہا ہوں مگر درحقیقت کوئی اور اس کام کو کر رہا ہے۔

حضرت فرماتے ہیں کہ میں نہ سمجھ سکا کہ انہیں کیا کہوں۔ اگر آج یہ بات ہوتی تو اس کا جواب دے سکتا۔ میں نے عرض کیا: آپ کیا جواب دیتے؟

فرمایا: میں انہیں کہتا کہ آؤ اور مجھ سے اور طلب کرو اس لیے کہ ابھی تک آپ کو محض حوادث کا مشاہدہ نصیب ہوا ہے کیونکہ افعالِ خداوندی منجملہ مخلوقاتِ حادثہ کے ہیں۔

میں نے سوال کیا: کیا حضرت منصور نے اس حالت سے ترقی بھی کی یا نہیں؟

فرمایا: نہیں، اسی حالت پر وفات پائی۔ واللہ اعلم۔

نیز فرمایا: اگر لوگوں کو سیدی عمر یعنی حضرت کے شیخ کے اوصاف کا پتہ چل جائے تو پھر وہ زندوں میں سے کسی اور کی زیارت کے لیے کبھی نہ جائیں مثلاً فلاں یا فلاں کے پاس نہ جائیں کیونکہ سیدی عمر میں چار اوصاف ایسے پائے جاتے تھے جو کسی اور میں نہ تھے۔

پہلے یہ کہ وہ کسی کے بارے میں کچھ نہ کہتے تھے لہٰذا کسی کا ذکر برائی سے نہ کرتے تھے نہ چھپ کر نہ ظاہر میں۔

دوسرے: گوشہ نشینی۔ کیونکہ وہ عمر بھر علی بن حرزہم کے مزار پر گوشہ نشین رہے اور ہر وقت دلائل الخیرات اور تسبیح پڑھتے رہتے اور ایک لحظہ کے لیے بھی آرام نہ کرتے۔ صرف مغرب کے قریب گھر جاتے اور جب زائرین کا ہجوم ہو جاتا تو علی بن حرزہم کے روضہ سے نکل کر اس سدرۂ محرّزہ کے پاس آ بیٹھتے جو مزار کے سامنے ہے، اس کے بعد مخلوق سے الگ ہو کر اپنے کام میں لگ جاتے۔

سوم: بے کار باتوں کو ترک کرنا۔ اپنی طرف کسی بات کو بھی خواہ چھوٹی ہو یا بڑی منسوب نہ کرتے تھے یہاں تک کہ جو لوگ علی بن حرزہم کے مزار کی زیارت کو آتے بالخصوص وہ لوگ جو جمعہ کی رات وہاں گزارتے تھے۔ ان کا یہی خیال ہوتا کہ اس کے پاس ستر وغیرہ کچھ نہیں ہے لہٰذا جب وہ سیدی علی کی زیارت کو آتے

اور وہ خود موجود ہوتے اور وہ جب دعا کرتے تو سیدی سے کرتے اور سیدی عمر بھی انکی موافقت کرتے اس طرح لوگ ان سے کسی قسم کی دعا کی درخواست نہ کرتے۔

چہارم: دنیا سے زہد کیونکہ جب سے میرا ان سے میل جول ہوا ہے، میں نے انہیں دیکھا ہے کہ صبح کے وقت سیدی علی کے پاس آتے ہیں اور ساتھ کوئی چیز لے کر نہیں آتے یہاں تک کہ روٹی کا ٹکڑا بھی پاس نہیں ہوتا۔ اگر سیدی علی کے پاس کوئی چیز آگئی تو اس میں سے جتنا مل گیا، کھا لیا۔ ورنہ دن بھر بھوکے گزار دیا اور میں نے انہیں دیکھا ہے کہ جب انہیں روٹی کا ٹکڑا مل جاتا تو سیدی علی تھوڑا سا تیل لیکر اس پر قدرے نمک ڈال لیتے اور اگر تیل نہ ملتا تو نمک پانی میں گھول کر اسی سے روٹی کھا لیتے۔ واللہ اعلم۔

نیز فرمایا۔ اولیاء اللہ میں ایک خصلت پائی جاتی ہے۔ اگر لوگوں کو اس کا علم ہو جائے اور یہ بھی معلوم ہو جائے کہ اس میں کس قدر راحت ہے تو اپنا سب کچھ دے دیں اور وہ خصلت یہ ہے کہ جب تک ولی پر کوئی "مصیبت حقیقۃً" نہ اتر آئے، وہ اس کا غم ہی نہیں کرتا اور نہ ہی اس آنے والی مصیبت کی وجہ سے اپنے حال کو مکدر بناتا ہے اور اگر وہ خیال کرے یا اسے یقین بھی ہو جائے کہ ابھی ایک گھڑی کے اندر یا اس سے بھی کم وقت میں مصیبت اترنے والی ہے۔ اس وقت بھی وہ اس کی نگاہ میں کالعدم ہوگی اور وہ اس کا قطعاً احساس نہ کرے گا، چنانچہ تو دیکھے گا کہ آئندہ جو اس پر نازل ہونے والا ہے وہ اسے مشاہدہ کر رہا ہے مگر پھر بھی وہ کھاتا ہے پیتا ہے، ہنستا ہے اور بیوی کے پاس جاتا ہے ایسے جیسے کہ ایک جاہل ہو اور اسے کوئی خبر ہی نہ ہو اور آئندہ آنے والی مصیبت کا اسے قطعاً علم نہ ہو، اس کی وجہ یہ ہے کہ انہیں معلوم ہے کہ اللہ تعالیٰ کے تصرف کا کوئی شخص احاطہ نہیں کر سکتا، چنانچہ اللہ تعالیٰ اپنے تصرف میں وہ کام کر جاتا ہے جن کے متعلق ان کا خیال ہی نہیں ہوتا کہ وہ ہو بھی سکتا ہے اور جن امور کو لوگ واقع ہونے والا سمجھتے ہیں، وہ نہیں ہوتے لہٰذا ولی اللہ کے مطلق تصرف کا مشاہدہ کرتے ہوتے ہیں جسے کسی وجہ سے بھی مقید نہیں کیا جا سکتا اور اس خصلت میں اس قدر راحت ہے جس کی کیفیت بیان نہیں ہو سکتی۔ جب یہ اس ولی کا حال ہے جسے فتح نصیب ہے اور جو امور اور ان کے واقع ہونے کا مشاہدہ کر رہا ہوتا ہے تو خیال کرو محجوب کا کیا حال ہونا چاہیئے اس کے لیے ضروری ہے کہ وہ اپنے آپ کو ولی کی راہ پر چلائے اور اپنے غموں کو دور پھینک دے اور تدبیر کی فکر اور غلط اندازے سے باز رہے اس لئے کہ اس کی تدبیر میں کوئی فائدہ نہیں، وہ بچ جائے۔ واللہ اعلم۔

میں نے حضرت سے اس ولی کے متعلق دریافت کیا جس کی تین سو چھیاسٹھ ذاتیں ہوتی ہیں وہ کون ہے؟

فرمایا: وہ صرف وارثِ کامل یعنی غوث ہوتا ہے۔

میں نے عرض کیا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جن سے اسے یہ ورثہ ملا ہوتا ہے ان کی تو ایک لاکھ چوبیس ہزار ذات ہے کیا وجہ ہے کہ وہ ان تمام کا وارث نہیں بنا؟

فرمایا: جن امور کی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم میں قدرت ہے ان پر کوئی اور قدرت نہیں رکھ سکتا۔

پھر فرمایا کہ غوث کے وارث ہونے کا مطلب یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے فیضان سے کوئی اور شخص اس قدر فیضیاب نہیں ہوا جس قدر کہ غوث ہوا ہے۔ واللہ اعلم۔

صلوٰۃ العارفین

میں نے حضرت سے دریافت کیا کہ عارفین کی نماز کیسی ہوتی ہے؟

فرمایا: جب عارف اللہ اکبر کہتا ہے اور اپنی اس ظاہری ذات سے نماز پڑھتا ہے تو اس کی ذات کے اندر روح بھی نماز پڑھتی ہے، ذات کے ساتھ وہ بھی رکوع اور سجود کرتی ہے۔

حضرت نے فرمایا: یہ کہکر میں ذاتِ روح اور ظاہری ذات کو دیکھنے لگ گیا کہ ان میں سے کون زمین سے زیادہ قریب ہے۔ میں یہ تحقیق کرنا چاہتا تھا کہ ان دونوں میں سے کون زمین کے زیادہ قریب ہے مگر حافظ (فرشتے) نے مجھے روک دیا اور روح کی نماز تو ہر حالت میں مقبول ہوتی ہے۔

میں نے عرض کیا: شاید اس لیے کہ روح خفی ہے، حق کی طرف سے ہے اور حق کی طرف ہی اسکا رجوع ہے اور ظاہری نماز کا اس لیے حکم دیا گیا کہ اکثر لوگ روح کی نماز ادا کرنے سے قاصر ہیں اور عارفین اگرچہ اپنی روح سے نماز پڑھتے ہیں، وہ اپنے جسم سے بھی نماز پڑھتے ہیں اس لیے کہ دستور یہی چلا آرہا ہے اور اسی میں شریعت کے ظاہری احکام کی حفاظت ہے۔ اس کے بعد آپ نے اس کی مثال یوں بیان فرمائی کہ ایک شخص درزی کا پیشہ اس نیت سے اختیار کرتا ہے کہ اس کے ذریعہ سے اسے ریشم کی صنعت آجائے مگر اللہ تعالیٰ اسے استاد کی مدد کے بغیر ہی ریشم کی صنعت سکھا دے اور یہ بدستور درزیوں میں چھپا پڑا ہے۔ پھر فرض کرو کہ درزیوں کا خاص لباس، عادات، رسومات میں جو ان کا امتیازی نشان ہوں جو ان کے ظاہر وجود پر پائے جاتے ہوں اور یہ شخص پہلا لباس چھوڑ کر ریشم کا کام کرنے والوں کا لباس پہن لے اور لوگ اس سے اس کا سبب

پوچھیں اور یہ کہے کہ میں اب ریشم کی صنعت کا کاریگر بن گیا ہوں حالانکہ علم الٰہی میں پہلے پا چکا تھا کہ درزی کے پیشہ ہی میں اسے ریشم کی صنعت نصیب کی جائے اور اس کی شناخت کا ظہور صرف قیامت کے دن ہو۔ لہٰذا اس کو یہی زیبا ہے کہ یہ بدستور درزیوں کی عادت پر چلے اور ان کا ہی لباس پہنے اور اپنی پہلی عادت پر رہے۔ واللہ اعلم۔

میں نے حضرت سے دسویں صدی کے کسی مشہور شخص کے متعلق دریافت کیا۔

فرمایا: اس کو فتح نصیب ہوئی تھی مگر اس کی وہیں حالت رک گئی اور وہ جادوگر بن گیا۔

میں نے عرض کیا: یہ کیسے؟

فرمایا: سب سے پہلے بندہ کو جو فتح حاصل ہوتی ہے تو وہ لوگوں کے گناہ اور ان کے اسباب کو دیکھتا ہے اور یہ کہ وہ کس طرح ان گناہوں میں پڑتے ہیں اور اسے ظلمانی کہر دکھائی دیتی ہے جس سے اہلِ ظلام مدد حاصل کرتے ہیں خدا پناہ میں رکھے اور اسی قسم کے اور امور ظاہر ہوتے ہیں۔ لہٰذا جب اللہ تعالیٰ صاحب فتح سے شر کا ارادہ فرماتے ہیں تو اس کی عقل ان کی طرف مائل ہو جاتی ہے اور اسی میں اپنی فکر لگا لیتا ہے لہٰذا اگر اس کی فکر ایک گھڑی کے لیے بھی ان میں ٹھہر جاتے تو وہ اللہ سے منقطع ہو جاتا ہے خدا اپنی پناہ میں رکھے۔ اس لیے اس کی نگاہ میں وہی امور رہتے ہیں جن کا ذکر فتح میں ہو چکا ہے اور یہ شیطان کی خیمہ گاہ اور بنی آدم کو فتنہ میں مبتلا کرنے کا مقام ہے لہٰذا جو چیزیں اس کو دکھائی دیتی ہیں وہی شیاطین کو دکھائی دیتی ہیں اور وہ اس کے ساتھ ہاتھ میں ہاتھ ڈالے چلتے ہیں۔ چنانچہ جادو اس کی تسخیر میں آ جاتا ہے اور وہ جادوگر بن جاتا ہے مگر جب اللہ تعالیٰ صاحب فتح انسان سے بھلائی کا ارادہ فرماتے ہیں تو اس پر وہ امور کھول دیئے جاتے ہیں جن سے گزشتہ امور سے اس کا خیال پھر جاتا ہے اور پھر اللہ تعالیٰ اسے ہر لحظہ ترقی دیتے ہیں۔ واللہ اعلم۔

نیز فرمایا: فتح کی عجیب شان ہے اور اس کی ہر بات نرالی ہے۔ بہت سے محبوب بندے ایسے ہیں جنہیں فتح سے روک دیا جاتا ہے اور اسی میں اللہ کی رحمت پوشیدہ ہوتی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ فتح میں ایسے امور ہوتے ہیں جن کا صاحب فتح ذات کے پاک ہونے میں اور واصل ہونے سے پہلے جب مشاہدہ کرتا ہے تو وہ خدا محفوظ رکھے، فوراً عیسائی ہو جاتا ہے اور فتح میں بعض ایسے امور ہیں کہ ان کے مشاہدہ سے صاحب فتح یہودی ہو جاتا ہے۔ بہت سے لوگوں کو فتح اس وقت نصیب ہوتی ہے جب ان کی روح کے نکلنے کا وقت آ جاتا ہے۔ اور بہت سے لوگ بغیر فتح حاصل کئے مر جاتے ہیں مگر اللہ تعالیٰ انہیں قیامت کے دن صاحب فتح لوگوں سے زیادہ اکمل اور بہتر حالت میں اٹھائیں گے۔

ایک مرتبہ آپ نے ایک مرید سے کہا کہ یہی وہ بہت بڑا بوجھ ہے جسے صوفیاء نے اس تابوت کے اندر جمع کر رکھا ہے۔

میں نے حضرت کو اس حبیب کو کہتے سنا کہ تم میں بہت سی نیکیاں ہیں۔ جب میں انہیں دیکھتا ہوں تو مجھے تم پر رشک آتا ہے۔ ایک اور بار اسے کہا گیا تو اپنی نیکیاں میرے ساتھ بانٹ لے گا کیونکہ مجھے ان سے اور ان کی عظمت سے تعجب آتا رہتا ہے۔

حضرت فرمایا کرتے تھے کہ فتح کے وقت مفتوح علیہ سے ایک قسم کی سیاہ کھال کو جو دراصل وہ ظلمت ہے، جو تمام ذات کو گھیرے ہوتی ہے دور کیا جاتا ہے چنانچہ جب یہ کھال دور ہو جاتی ہے تو اس کی ذات پر نور فتح ڈالا جاتا ہے اور یہ بہت بڑا ہجوم ہوتا ہے جنہیں فرشتے اور دوسرے لوگ لے کر آتے ہیں اور وہ کھال کو دور کرنے لگ جاتے ہیں اور فرشتے ستر کو اٹھائے ہوتے ہیں اور جونہی کہ کھال دور ہو جاتی ہے ملائکہ نور کو اس کی ذات میں رکھ دیتے ہیں اور جس وقت یہ کھال دور ہو جاتی ہے مخلوقات کو اس مفتوح کے متعلق خطرہ ہوتا ہے اس لیے کہ انہیں اس کے انجام کا پتہ نہیں ہوتا کہ آیا وہ اس فتح سے مرجائے گا یا اس کی عقل زائل ہو جائے گی یا سلامت رہے گی اور وہ متواتر اللہ سے عاجزی سے دعا کرتے رہتے ہیں جو ستر اس کے اوپر ڈالا گیا ہے، خدا اسے اس کے برداشت کرنے کی توفیق و طاقت دے۔

حضرت فرمایا کرتے تھے کہ نورِ فتح ذاتِ شیخ میں رہتا ہے چنانچہ جب اس کا وارث شیخ کی زندگی کے آخری ایام میں اس پر قدرت رکھتا ہے تو شیخ کے وصال کے بعد نورِ فتح لے لیتا ہے اور اگر اسے اس کی قدرت نہ ہو تو وہ نور جبرئیل علیہ السلام کے پاس بطور امانت پڑا رہتا ہے تا آنکہ مرید کو اس کی طاقت حاصل ہو جاتی ہے تو وہ کھال اس سے دور کی جاتی ہے اور وہ ستر لے لیتا ہے۔

حضرت یہ بھی فرمایا کرتے تھے کہ حضرت جبرئیل علیہ السلام فتح سے پہلے تین دن مفتوح علیہ سے دوستی کرتے ہیں اور اسے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت سے مانوس کرتے ہیں اور اسے سیدھی راہ پر لے آتے ہیں اور فتح کے بارے میں اس قسم کے دیگر اسرار کا حضرت نے ذکر فرمایا۔ خبردار! یہ نہ سمجھ لینا کہ یہاں جبرئیل علیہ السلام کے ذکر سے وحشت پیدا ہوتی ہے جیسا کہ فقہا فرماتے ہیں اور جو شخص یہ کہے کہ وہ فرشتوں کو دیکھتا ہے، سختی سے انکار کرتے ہیں اس لیے کہ فقہاء کی دوسری جماعت نے ان کا رد کیا ہے اور کہا ہے کہ اس میں کونسی محال بات پائی جاتی ہے نیز اس میں کوئی ایسی بات نہیں جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ علیہ کے مزاحم ہو اور اس کی تائید میں فقہاء نے ایک جلیل القدر اور مشہور صحابی عمران بن

حصین[1] الخزاعی رضی اللہ عنہ کی حکایت بیان کی ہے کہ وہ فرمایا کرتے تھے کہ وہ فرشتوں کو دیکھا کرتے تھے اور وہ انہیں سلام کیا کرتے تھے مگر جب انھوں نے (کسی بیماری کی وجہ سے) بدن کو داغ دیا تو پھر ان کا دکھائی دینا بند ہو گیا اور امام شعرانی نے تو اپنی کتاب[2] المنن میں اسے ایک بہت بڑا احسان شمار کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اسے ایسے لوگوں سے ملایا جو جبرئیل کا مشاہدہ کرتے اور اس سے ہمکلام ہوتے ہیں اگر وہ لوگ جنہیں کلام کرنے کا سلیقہ نہیں خاموش رہتے تو لوگوں کے لیے بہت علم ظاہر ہوتا اور انہیں بہت بڑی بھلائی حاصل ہوتی۔ جو لوگ ان باتوں سے انکار کرتے ہیں وہ ان صحیح احادیث کے متعلق کیا کہیں گے جن پر محدثینؒ کا اتفاق ہے اور جن کی روایت بخاری وغیرہ نے کی ہے جن میں صراحتہً بیان کیا گیا کہ یہ بات دوسری امتوں میں واقع ہوئی تو پھر اس امت میں اس کے واقع ہونے سے کیسے انکار کیا جا سکتا ہے صحیح بخاری وغیرہ میں بنی اسرائیل کے متعلق احادیث کو دیکھ لیں۔ واللہ اعلم۔

اب ہم نورانی امور جو باقی رہ گئے ہیں اور جن کا مشاہدہ صاحبِ فتح کبیر کو ہوتا ہے مثلاً برزخ جنت، دوزخ، صراط، حوض، ارواح، ملائکہ حَفَظَہ اولیاء وغیرہ کا ذکر کرتے ہیں۔

---

[1] عمرانؓ بن حصین خزاعی: ابو نجید کنیت غزوۂ خیبر کے سال میں ایمان لائے انھوں نے بصرہ میں رہائش اختیار کر لی تھی اور وہیں ۵۲ھ / ۶۷۲ء میں وفات پائی۔ فضلا و فقہاء صحابہ میں سے تھے۔ یہ اور ان کے والد دونوں اکٹھے ایمان لائے تھے۔ ابن سیرین کہتے ہیں کہ بصرہ میں عمرانؓ سے زیادہ قدیم اور افضل کوئی صحابی نہیں آئے۔ انہیں ملائکہ سلام کیا کرتے تھے۔

[2] کتاب کا پورا نام لطائف المنن والاخلاق فی بیان وجوب التحدث بنعمۃ اللہ سبحانہ وتعالیٰ علی الاطلاق ہے یہ امام شعرانیؒ متوفی ۹۷۳ھ کی تالیف ہے (کشف الظنون ۲: ۲۰۹)

دسواں باب

برزخ اور اسمیں روحوں کے اُترنے کی کیفیت

حضرت نے فرمایا کہ برزخ کی صورت ایسی ہے جیسے کوئی مقام نیچے سے تنگ اور جس قدر اوپر کو جائیں تو وسیع ہوتا جائے حتیٰ کہ منتہیٰ پر پہنچ کر اس کے سر پر ایک گنبد بنا دیا جائے جیسا کہ منارہ کا گنبد ہوتا ہے۔ پس اسے لکڑی کی ایک بہت بڑی اوکھلی کی طرح سمجھو جس کا نچلا حصہ تنگ ہوتا ہے پھر اوپر تک بتدریج فراخ ہوتا جاتا ہے اور جب منارہ کا گنبد اس کے سر پر رکھ دیا جائے تو اس کی شکل برزخ کی سی ہو جائے گی، لیکن وسعت اور عظمت کے لحاظ سے برزخ کی جڑ تو دنیا کے آسمان میں ہے اور ہماری جانب میں اس سے باہر نہیں نکلا۔ پھر اوپر کو چڑھتا گیا یہاں تک کہ دوسرے آسمان کو پھاڑا۔ پھر چڑھا یہاں تک کہ تیسرے آسمان کو پھاڑا۔ پھر چڑھا یہاں تک کہ چوتھے آسمان کو پھاڑا۔ پھر چڑھا یہاں تک کہ پانچویں آسمان کو پھاڑا۔ پھر چڑھا یہاں تک کہ چھٹے آسمان کو پھاڑا، پھر چڑھا یہاں تک کہ ساتویں آسمان کو پھاڑا۔ پھر اتنا چڑھا کہ اس کا اندازہ نہیں کیا اور اس کے اوپر گنبد بنایا گیا۔ یہ اس کا طول ہے۔

بیتِ معمور | فرمایا: یہی بیتِ معمور ہے۔

میں نے عرض کیا کہ بیتِ معمور تو ساتویں آسمان میں ہے اور برزخ کی ابتدا پہلے آسمان سے لیکر ساتویں آسمان سے بھی اوپر تک ہے کہ اس کا اندازہ نہیں۔ لہٰذا یہ ہر آسمان میں ہے۔

حضرت نے فرمایا: ساتویں آسمان سے اوپر اس لیے اکتفا کی گئی کہ اسی میں گنبدِ مذکور رہے اور یہ مقام برزخ کا اشرف ترین مقام ہے کیونکہ اس میں سید الاولین والآخرین علیہ افضل الصلاۃ و ازکی التسلیم کی روح اور ان لوگوں کی روحیں جنہیں اللہ تعالیٰ نے آنحضرتؐ کی برکت سے عزت بخشی ہے مثلاً ازواجِ مطہرات، اور آپ کی بیٹیاںؓ اور آپ کی ذریت جو آپ کے زمانہ میں تھی اور وہ ذریت بھی جنہوں نے آپؐ کے بعد قیامت تک حق پر عمل کیا ہے اور اسی میں خلفاءؓ اربعہ کی ارواح بھی ہیں اور ان شہدا کی بھی، وہیں ہیں جو آپ کے سامنے فوت ہوئے اور جنہوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم

کی خاطر اپنی جانیں دیں اور ان کے حسنِ عمل کے صلہ میں اللہ نے ان ارواح کو وہ طاقت اور قوت دی ہے جو دوسروں میں نہیں پائی جاتی۔ اسی گنبد میں ان اولیاء اللہ کی روحیں بھی ہیں جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے وارثِ کامل ہیں مثلاً اغواث اور اقطاب لہٰذا یہی گنبد برزخ کا اشرف ترین حصہ ہے اسی لیے جنھوں نے ساتویں آسمان سے اوپر بیتِ معمور کو قرار دیا ہے انھوں نے اسی پر اکتفا کی ہے۔

پھر میں نے دیکھا ہے کہ حافظ ابنِ حجر نے بخاری میں لکھا ہے کہ ہر آسمان میں بیتِ معمور ہے کتاب الصلوٰۃ میں معراج والی حدیث کی شرح میں دیکھ لیں وہاں انھوں نے بعض محدثین سے یہ بات نقل کی ہے مگر یہ فتح الباری کے تمام نسخوں میں موجود نہیں بعض میں ہے اور بعض میں نہیں۔ اس طرح کوئی اشکال نہیں رہتا۔

اب رہا برزخ کا عرض تو اتنا سمجھ لینا کافی ہے کہ سورج جو چوتھے آسمان میں ہے، اسی کے گرد چکر لگاتا ہے جیسے کہ کوئی طواف کر رہا ہو اور اس کا یہ چکر ایک سال میں مکمل ہوتا ہے اور تمام برزخ میں سوراخ ہیں جیسا کہ جنت کے بیان میں آئے گا۔ انہی سوراخوں میں روحیں ہیں۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی روحِ مبارک اور ان لوگوں کی روحیں بھی جنھیں اللہ تعالیٰ نے آنحضرتؐ کی بدولت عزت بخشی ہے، گنبد میں ہیں۔

فرمایا: اس گنبد کے سات حصے ہیں جنّت کی تعداد کے مطابق۔ ہر حصہ ساتویں جنتوں میں سے ایک جنت کے مشابہ ہے۔

فرمایا: اگرچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی روح کا مقام گنبد میں ہے مگر یہ یہاں ہمیشہ نہیں رہتی اس لیے کہ یہ گنبد یا کوئی اور مخلوق آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی روح کے کثرتِ اسرار کی وجہ سے متحمل نہیں ہو سکتی ہاں متحمل تو صرف آپ کی ذاتِ شریف ہی ہو سکتی ہے یہی وجہ ہے کہ برزخ میں آپ کی روحِ مبارک ایک معین جگہ پر مقیم نہیں رہتی اس لیے کہ کسی چیز میں اس کے برداشت کی قدرت نہیں۔

وہ روحیں جو برزخ میں چوتھے آسمان اور اس کے اوپر کے آسمانوں میں ہیں ان کے نور بہت روشن ہیں اور جو روحیں تیسرے آسمان اور اس سے نیچے ہیں ان میں سے اکثر تاریک اور بے نور ہیں اور یہ سوراخ جو برزخ میں ہیں، حضرت آدمؑ کی پیدائش سے پہلے سے ارواح سے معمور تھے اور ان ارواح میں نور تھا مگر یہ نور وجود سے جدا ہونے کے بعد کے نور سے کم تھا۔

فرمایا: جب آدم علیہ السلام کی روح ان کی ذات میں جا اتری تو اس کی جگہ خالی رہ گئی اسی طرح ہر روح کے اترنے سے اس کا سوراخ خالی رہتا گیا۔ موت کے بعد جب روح اٹھتی ہے تو اس مقام پر

نہیں لوٹتی جہاں وہ پہلے تھی بلکہ وہ کسی اور مقام کی مستحق ہوتی ہے۔

مؤلف کہتا ہے کہ حضرت کی مراد یہ ہے کہ اگر وہ روح مومن ہو تو پہلے سے زیادہ بلند مقام کی مستحق ہوتی ہے اور اگر کافر ہو تو پہلے سے کم تر مقام کی مستحق ہوگی۔

پھر فرمایا کہ خالی سوراخوں کو اللہ تعالیٰ کی مخلوقات سے آباد کیا جاتا ہے اور وعدہ اَلستُ سے پہلے ارواح کو انجام کا علم نہ تھا اور نہ ہی یہ معلوم تھا کہ ان کے متعلق اللہ تعالیٰ کا کیا ارادہ ہے جب اللہ تعالیٰ نے اپنی قضاءِ ازلی کو ظاہر کرنا چاہا تو اسرافیل کو صور پھونکنے کا حکم دیا چنانچہ انھوں نے پھونکا اور تمام روحیں جمع ہوگئیں اور ان پر وہ کیفیت پیدا ہوگئی جو قیامت کے دن مردوں کو اٹھانے کے لیے صور پھونکنے سے پیدا ہوگی بلکہ اس سے بھی بڑھکر جب روحیں جمع ہوچکیں تو اللہ تعالیٰ نے اپنا بلا کیف خطاب سنایا اور کہا اَلَسْتُ بِرَبِّکُم (کیا میں تمہارا رب نہیں ہوں) اہلِ سعادت نے تو خوشی خوشی اپنے رب کے حکم کا جواب دیا (کہ ہاں تو ہمارا رب ہے) اس وقت سے جواب دینے میں ان کا فرق ظاہر ہوگیا اور مشاہدہ میں ان کے مراتب کا فرق معلوم ہوگیا اور شیخ و مرید میں امتیاز ہوگیا اور یہ بھی معلوم ہوگیا کہ فلاں کا تعلق فلاں سے ہوگا اور فلاں کا تعلق فلاں سے کٹ جائے گا اور انبیاء اور ان کی امتوں کا فرق بھی ظاہر ہوگیا۔

بدبخت لوگوں نے جب اللہ کا خطاب سنا تو وہ کبیدہ خاطر ہوئے اور بادلِ ناخواستہ جواب دیا اور پھر اس طرح بھاگ گئے جس طرح شہد کی مکھی کو دھونی دی جائے تو بھاگتی ہے اس لیے انہیں ذلت و خواری حاصل ہوئی اور ان کے نور تاریک ہوگئے اسی وقت سے مومن اور کافر میں امتیاز ہوگیا۔ تب جاکر برزخ میں ہر جگہ روح کی جگہ مقرر کردی گئی۔ اس سے پہلے روحیں جہاں چاہتی تھیں قیام کرلیتی تھیں پھر اگر اللہ کا ارادہ ہوتا تو وہ وہاں سے منتقل ہوکر کہیں چلی جاتیں۔

حضرت نے فرمایا: اگر کوئی اہلِ مشاہدہ اب برزخ کی طرف دیکھتا ہے تو اسے وہ روحیں الگ دکھائی دیتی ہیں جو اپنے انوار کی قوت کے ساتھ اجسام سے جدا ہوکر آئی ہیں اور وہ بھی جو کثرتِ ظلمت کے ساتھ آئی ہیں اور وہ روحیں بھی نظر آئیں گی جو اپنے نور یا ظلمت کی کمی کے باعث نکل کر نہیں گئیں۔

نیز فرمایا: جو روحیں نکل کر دنیا میں نہیں گئیں جب تک وہ تمام کی تمام نکل کر نہ چلی جائیں یہاں تک کہ ایک روح بھی باقی نہ رہے اس وقت تک قیامت واقع نہ ہوگی۔

میں نے عرض کیا۔ اس سے تو یہ لازم آتا ہے کہ اربابِ کشف کو قیامت اور اس کے واقع ہونے کے

وقت کا علم ہے۔ حالانکہ اللہ فرماتے ہیں: اِنَّ اللّٰهَ عِنْدَهٗ عِلْمُ السَّاعَةِ وَيُنَزِّلُ الْغَيْثَ الآیۃ
قیامت کا علم اللہ کے پاس ہے اور وہی بارش برساتا ہے۔ نیز نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے
فِیْ خَمْسٍ لَا يَعْلَمُوْنَ اِلَّا اللّٰهُ۔ پانچ چیزوں میں جن کا علم اللہ کے سوا کسی کو نہیں۔

اصحاب فتح کبیر کو قیامت کا علم ہوتا ہے

حضرت نے جواب دیا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے کسی مصلحتِ وقت کی بنا پر فرمایا تھا ورنہ آیت میں ذکر کی گئی ان پانچوں چیزوں سے کوئی چیز بھی آپؐ سے مخفی نہ تھی اور آپ پر کیسی مخفی رہ سکتی ہے جبکہ اس امت کے ساتوں قطبوں کو ان کا علم ہے حالانکہ وہ غوث سے کم مرتبہ ہیں تو پھر غوث کو کیونکر ان کا علم نہ ہوگا اور پھر سید الاولین والآخرین کو ان کا کیونکر علم نہ ہوگا جو کہ ہر چیز کے وجود کا سبب ہیں اور انہی سے ہر چیز کا وجود ہے۔

پھر فرمایا: بیشتر اس کے کہ جسموں سے روحیں لوٹ کر برزخ میں آئیں اس میں کم نور تھا اور یہ آدم علیہ السلام کی پیدائش سے پہلے کی بات ہے اور آدم کے زمانہ میں بھی اس کا نور کم تھا مگر جب آدم علیہ السلام اور ان کی اولاد سے دیگر انبیاء۔ اور اولیاء کی روحیں یہاں چڑھ کر گئیں تو برزخ کا نور بتدریج بڑھتا گیا اس لیے کہ ارواح کا صعود بھی بتدریج ہوا تھا۔

مَیں نے سوال کیا کہ کفار کی روحیں جسم سے نکلنے کے بعد برزخ میں کہاں ہوتی ہیں؟

فرمایا: برزخ کی تہ میں اگر برزخ میں ان روحوں کے مقام کو تو دیکھے تو تجھے یہ کوئلے کی طرح سیاہ دکھائی دے اسے اس کے کافر ساکنین کے حال نے سیاہ کر رکھا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے آخرت کا معاملہ دنیا سے بالکل برعکس ہے کیونکہ دنیا میں اگر کوئی شخص سفید فاخرہ لباس پہنے تو جب تک اسے کسی خارجی امر کے سبب میل کچیل نہ لگ جائے اس وقت تک وہ لباس اپنی حالت پر رہے گا، لیکن آخرت میں کپڑوں کی گندگی کا دار و مدار ذات پر ہے لہٰذا اگر ہم فرض کرلیں کہ کافر نہایت سفید اور خوبصورت کپڑے پہنے ہوئے ہے تو ایک لحظہ کے اندر یہ کپڑے کوئلے سے بھی زیادہ سیاہ ہو جائیں گے۔

پھر فرمایا: یہ ہوا جو ہمیں گھیرے ہوئے ہے اس کا معاملہ بھی دونوں جہانوں میں ایک دوسرے کے برعکس ہے چنانچہ دنیا میں اگر محیط ہوا روشن ہو گی تو یہ ان اجسام کو بھی روشن کرے گی جو اس کے اندر ہیں خواہ وہ مومنین کے ہوں خواہ کفار کے لیکن آخرت میں ذات ماحول پر غالب ہے چنانچہ مومنین کی ذات

---

[۱] اس مقام پر مولوی عاشق الٰہی نے بڑا لمبا چوڑا نوٹ لکھا ہے مگر افسوس کہ تمام کتاب پڑھ جانے کے بعد بھی انہیں کشف اور مشاہدہ کاملہ میں فرق سمجھ میں نہ آیا۔ مشاہدہ کاملہ تو تواتر سے کہیں بڑھکر ہوتا ہے۔

ماحول کو روشن کردے گی اور اس پر مومنین کا اس قدر نور چھائے گا کہ عقل دنگ رہ جائے گی اس کے برعکس کفار کی ذوات اسے کوئلے کی طرح سیاہ کردیں گی۔ حاصل یہ کہ آخرت میں امورِ باطنہ کے احکام جاری ہوتے ہیں کیونکہ اصل وہی ہے اور آخرت حقیقت کا گھر ہے۔

حضرت نے مجھے آخرت کے پسینہ کے متعلق بھی اسی قسم کا جواب دیا جو بعض کے منہ تک پہنچ کر بطور لگام بنا ہوگا بعض کی کمر تک ہوگا اور بعض کے گھٹنوں تک حالانکہ وہ زمین جہاں یہ لوگ ہوں گے ہموار ہوگی۔ چنانچہ اگر دنیا میں تین آدمی ہموار زمین کے پانی میں کھڑے ہوں تو وہاں یہ اختلافات ممکن نہیں۔ فرمایا: چونکہ دنیا میں ان لوگوں کے باطن میں اختلاف تھا اس لیے آخرت میں اس کا معاملہ ظاہر ہوگیا کہ حقیقت کا گھر یہی ہے۔

پھر فرمایا کہ برزخ کے اس حصہ میں جہاں کافر ہیں باہر کو نکلے ہوئے ٹھنٹھے ہیں جس طرح ایک مستطیل عمود ہوتا ہے، پھر یہ ٹھنٹھے جہنم کی جہت میں پھیلے ہوئے ہیں اور دوزخ کا عذاب اور لُو ان ٹھنٹھوں والوں کو اس حد تک پہنچتی ہے کہ گویا وہ جہنم ہی میں ہیں۔ ان ٹھنٹھوں پر منافق اور وہ کافر رہتے ہیں جن پر اللہ کا غضب نازل ہوچکا ہے یہ ٹھنٹھے اس برزخ میں بھی پائے جاتے ہیں جہاں سعادتمند لوگوں کی روحیں ہیں اور وہاں سے باہر کو جھک کر جنت کی جانب پھیلی ہوئی ہیں۔ چنانچہ یہاں کے رہنے والوں کو جنت کی نعمتیں بھلائی اور اس قدر خوشبو حاصل ہوتی ہے جس سے ان کی کیفیت ایسی ہو جاتی ہے کہ گویا وہ درحقیقت جنت میں ہی ہیں یہاں شہدا اور ان لوگوں کا مسکن ہے جن پر اللہ کی رحمت ہو اور یہ ٹھنٹھے جن کا ذکر مذکورہ بالا دونوں فریقوں کے برزخ میں آیا ہے۔ یہ برزخ ہی کا حصہ ہیں مگر ان کی شکل ایسی ہے جیسے کوئی زائد اور باہر کو نکلی ہوئی چیز برزخ کی جہت کے سوا کسی اور جہت میں جارہی ہو۔

میں نے عرض کیا کہ برزخ کا نچلا حصہ تو آسمانِ دنیا میں ہے اور جب کافروں کی روحیں اس میں ٹھہریں تو یہ برزخ میں اسی صورت میں ہوسکتا ہے جب اس کے لیے آسمان کے دروازے کھول دیئے جائیں حالانکہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: لَا تُفَتَّحُ لَهُمْ اَبْوَابُ السَّمَاءِ (سورۂ اعراف آیت: ۴۰) ان کے لیے آسمان کے دروازے کھولے نہ جائیں گے۔ مزید برآں علماء نے بیان کیا ہے کہ مومنین کے لیے برزخ قبر سے لے کر اعلیٰ علیین تک ہے اور کافرین کے لیے قبر سے لے کر سجین تک اسفل سافلین میں ہے۔

حضرت نے ایک بار تو اس کا جواب یہ دیا کہ کافر کی روح جب برزخ کے بائیں حصہ میں کے

آسمان میں ہے اور اسے حجاب میں ڈال دیا گیا ہے گویا کہ اس کی آنکھیں، کان اور دل اور تمام حواس سی دیئے گئے ہیں۔ بطور مثال کے ہے لہٰذا ایسا ہوا جیسا کہ کسی کے لیے آسمان کے دروازے نہ کھولے گئے ہوں۔

دوسری بار یوں فرمایا کہ برزخ میں کافروں کی روحوں کی دو قسمیں ہیں۔ ایک قسم تو ظلمت اور بدحالی کے غلبہ کی وجہ سے محجوب ہے یہاں تک کہ اسے نہ روح دکھائی دیتی ہے نہ کوئی اور چھوٹی یا بڑی چیز اور یہ خدا کی ناراضگی کا حجاب ہے۔ خدا اپنی پناہ میں رکھے اور دوسری قسم ان روحوں کی ہے جو محجوب نہیں ہیں بلکہ انھیں مشاہدہ ہوتا ہے اور یہ مشاہدہ صرف اسی عذاب کا ہوتا ہے جو ان کے لیے تیار کر رکھا ہے لہٰذا ہر دو قسمیں اللہ کی ناراضگی میں ہیں لہٰذا ان کی یہی حالت ہوئی جیسے کسی کے لیے آسمان کے دروازے نہ کھولے جائیں۔

مؤلف کہتا ہے کہ حضرت کے اس بیان کی تائید اس اختلاف سے ہوتی ہے جو علماء میں لَا تُفَتَّحُ لَهُمْ اَبْوَابُ السَّمَآءِ کی تفسیر میں پایا جاتا ہے۔ چنانچہ بعض کہتے ہیں کہ اس کا مطلب یہ ہے کہ آسمان کے دروازے ان کی دعاؤں کے لیے نہیں کھولے جائیں گے یعنی ان کی دعائیں مقبول نہ ہوں گی۔ بعض کہتے ہیں کہ ان کی روحوں کے لیے نہیں کھولے جائیں گے یعنی جس طرح مومنوں کی روحوں کے لیے آسمان کے دروازے کھولے جاتے ہیں۔ ان کی روحوں کے لیے نہیں کھولے جائیں گے چنانچہ ملاحظہ ہو بیضاوی۔ اسی طرح کا اختلاف علماء میں اس حدیث کے متعلق پایا جاتا ہے جس میں آسمان میں حضرت آدمؑ کے بائیں طرف کی اشباح کا ذکر آتا ہے اور حدیث میں آنحضرت کا یہ فرمانا کہ یہ حضرت آدمؑ کی اولاد میں سے کفار کی روحیں ہیں چنانچہ بعض علماء نے اسے ظاہر پر محمول کیا ہے اور دوسروں نے اس کی تاویل کی ہے۔

ایک اور بار حضرت نے فرمایا کہ برزخ کے متعلق میں نے ذکر کیا ہے کہ اس کی ابتداء مذکورہ بالا صفت پر آسمان دنیا سے ہے تو اس سے ہماری مراد یہ نہیں کہ یہ لازمی طور پر ہمارے سر کی جانب ہے بلکہ ہو سکتا ہے کہ ہمارے پاؤں کے نیچے ہو اس لیے کہ آسمان زمین کو گھیرے ہوتے ہے جو اس کے اندر ہیں اور عرش ان تمام کو گھیرے ہوئے ہے اور برزخ ایک بہت بڑی مخلوق ہے اور اس کی تہ کی چوڑائی جہاں سے تنگ تر ہے سات زمینوں کے برابر ہے لہٰذا جب ہم یہ کہتے ہیں یہ ہمارے سر کے اوپر ہے تو اس کا ایک حصہ تو ہمارے پاؤں کے نیچے ہوگا۔ لہٰذا جن علماء نے کہا ہے کہ ان کی روحیں اسفل سافلین میں ہوں گی تو ان کی مراد ہمارے نیچے کی جانب برزخ کا پائیں حصہ ہے۔

مؤلف کہتا ہے کہ شاید حضرت یہ فرمانا چاہتے ہیں کہ (اوپر کی جانب) برزخ ساتوں آسمانوں کو چیر کر اعلیٰ علیین تک چلا گیا ہے اور (نیچے کی طرف) ساتوں زمینوں کو پھاڑ کر اسفل سافلین تک چلا گیا ہے لہٰذا اس کا پائیں حصہ ساتویں زمین میں سجین میں ہے اور بالائی حصہ ساتوں آسمانوں سے اوپر علیین میں ہے۔ حضرت نے یہی بات کئی بار صراحتہً فرمائی اور اسی طرح اس قول کی موافقت ہوتی ہے کہ جنت آسمانوں کے اوپر ہے اور جہنم زمینوں کے نیچے۔ لہٰذا (برزخ کا) پائیں حصہ جہنم کی جہت میں ہے اور یہیں کفار اشقیاء اور فاجروں کی روحیں ہیں اور بالائی حصہ جنت کی جہت میں ہے اور یہیں مومنین، سعادتمند اور نیک لوگوں کی روحیں ہیں۔ اس قول سے آسمان کے دروازوں کے کھلنے کے بارے میں گزشتہ اختلاف کی مخالفت نہیں ہوتی کیونکہ اگر برزخ اس طرح ہو تو اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ کفار کی ارواح کے لیے آسمان کے دروازے نہ کھلیں۔

ایک اور بار فرمایا: بعض کفار ایسے ہیں کہ جن کے مرنے کے بعد ان کی روح کو برزخ کی طرف چڑھنے سے روک دیا جاتا ہے اور اس پر شیطانوں اور ابلیسوں کو جو اس دنیا میں اس کی ذات میں داخل ہو کر اسے وسوسے ڈالتے تھے۔

مسلط کر دیا جاتا ہے لہٰذا جونہی کہ روح ذات سے نکلتی ہے یہ شیاطین فوراً اسے لے لیتے اور اس سے اس طرح کھیلتے ہیں جس طرح بچے گیند سے کھیلتے ہیں۔ خدا اپنی پناہ میں رکھے۔ چنانچہ ایک شیطان اسے دوسرے شیطان کی طرف پھینکتا ہے اور اسے وہ پتھر پر مارتا ہے اور اسے ناقابل برداشت عذاب الٰہی میں مبتلا کرتے ہیں۔ تا آنکہ اس کی ذات قبر میں فنا ہو جاتی ہے اور مٹی بن جاتی ہے تب جا کر یہ روح پائیں برزخ میں اپنے مقام پر چلی جاتی ہے۔ لہٰذا جنہوں نے آسمانوں کے دروازوں کے کھلنے کو اس پر محمول کیا ہے تو ان کا کہنا صحیح ہے۔

مؤلف کہتا ہے حضرت کی ان تمام تقاریر میں کوئی منافات نہیں پائی جاتی بلکہ ان کا مفہوم ایک ہی ہے لہٰذا ایک کا دوسرے سے ربط پایا جاتا ہے۔ میں نے انہیں الگ الگ اس لیے بیان کیا ہے کہ میں نے حضرت سے اسی طرح سنا تھا۔

اگر کوئی یہ سوال کرے کہ ان تمام تقاریر کا مفہوم یہ نکلتا ہے کہ برزخ کا پائیں حصہ آسمانِ دنیا میں ہے اور یہاں صراحتہً بیان کیا گیا ہے کہ برزخ کا پائیں حصہ اسفل سافلین میں ہے لہٰذا یہ تو یقیناً پہلی تقریر کے منافی ہوا۔ اس لیے کہ اس سے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ برزخ کا پائیں حصہ ساتویں زمین کے نیچے ہے اور پہلی تقریر اس بات کی مقتضی ہے کہ یہ آسمانِ دنیا میں ہے۔

اس کے جواب میں مؤلف کہتا ہے کہ اگر پہلی تقریر میں پائیں حصہ سے مراد وہ نچلا حصہ لیا جائے جو سعادتمندوں کے اعتبار سے ہے اور یہاں اشقیاء کے اعتبار سے نچلا حصہ مراد لیا جائے تو پھر دونوں تقریروں میں کوئی اختلاف نہیں پایا جاتا جیسا کہ ظاہر ہے۔

اگر اس پر پھر اعتراض کیا جائے کہ یہ صحیح ہے، لیکن پہلی تقریر کا تقاضا ہے کہ کفار کی ارواح اس میں پائیں حصہ میں ہوں جو آسمان دنیا میں ہے اور اس تقریر کا تقاضا یہ ہے کہ یہ روحیں اس پائیں حصہ میں نہیں ہیں بلکہ اس سے بھی نچلے حصہ میں ہیں لہٰذا دونوں تقریروں میں منافات ہے۔

مؤلف کہتا ہے کہ کفار کی روحیں مختلف ہیں جیسا کہ بیان ہو چکا۔ لہٰذا بعض اس پائیں حصہ میں ہیں اور بعض ان ٹھنٹھوں میں اور بعض دونوں حصوں کے درمیانی حصہ میں اور بعض تیسری زمین میں چنانچہ حضرت نے فرمایا کہ انہوں نے تیسری زمین میں کچھ لوگوں کو دیکھا ہے جو تنگ گھروں میں جھلسنے والی آگ میں، گہرے کنووں میں اور دائمی عذاب میں ہیں۔ ان میں جو کلام کرنا چاہتا ہے تو اسے جہنم نیچے دھکیل دیتا ہے چنانچہ وہ ہر وقت اوپر چڑھتا ہے اور نیچے اترتا رہتا ہے۔

حضرت نے فرمایا: ایک بار میں انہیں دیکھ رہا تھا کہ مجھے ایک شخص دکھائی دیا۔ جس کے نام اور شکل سے مجھے عالم دنیا سے واقفیت تھی۔ میں نے اس کا نام لے کر اسے پکارا اور کہا وائے تو یہاں کس یاداش میں آپڑا ہے، ابھی وہ جواب دینا ہی چاہتا تھا کہ وہ نیچے چلا گیا۔

جامع کتاب کہتا ہے کہ میرا غالب گمان ہے کہ میں نے حضرت سے عرض کیا کہ یہ جگہ بھی برزخ ہی کی جگہ ہوگی۔ اس لیے کہ برزخ ساتوں زمینوں کو چیرتا ہوا اسفل سافلین تک چلا گیا ہے۔

حضرت نے فرمایا: تم سچ کہتے ہو۔ واللہ اعلم۔

اس کتاب میں جو کچھ میں نے لکھا ہے اس میں سوائے ان الفاظ کے مجھے کہیں بھی شک نہیں ہوا۔ (کہ آیا حضرت نے یہی فرمایا تھا یا کچھ اور) اس لیے میں نے "گمان غالب" کا لفظ کہہ کر اس پر تنبیہ کر دی ہے واللہ اعلم۔

اور یہ شخص جسے حضرت نے اس مقام میں دیکھا تھا دنیا میں منجملہ مومنین میں سے تھا۔

پھر فرمایا: مشیّتِ خداوندی کی عجیب بات یہ ہے کہ کفار کی ارواح کو مومنین کی ارواح سے نفع حاصل کرنے سے روک رکھا ہے حالانکہ وہاں کوئی حجاب د پردہ نہیں۔ یہ انوار اس قدر تیزی سے چمکتے ہیں کہ چاند اور سورج بھی ان کی روشنی تک نہیں پہنچ سکتے بلکہ چاند اور سورج کا نور بھی انہی انوار سے لیا گیا ہے جیسا کہ آئندہ بیان ہوگا۔ اس کے باوجود کافر کی روح اس نور سے نہ فائدہ حاصل کر سکے گی

اور نہ روشنی حاصل کرے گی نہ تھوڑی نہ زیادہ بلکہ یہ اپنی اس ظلمت میں ہی ہوگی جس کی کیفیت بیان نہیں ہو سکتی لہٰذا یہ ان انوار کی نسبت حجاب میں ہیں اس کی مثال اس طرح سمجھو جیسے ان روحوں کو ڈبہ میں رکھا ہو جس کے اوپر رانگ کا قفل لگا دیا گیا ہو حالانکہ وہاں نہ ڈبہ ہے نہ رانگ صرف مشیئت ایزدی ہے جو کافر کی روح تک نفع پہنچنے سے مانع ہے۔

فرمایا: مومنین کی ارواح ایک دوسرے سے مستفید ہوں گی اور ایک دوسرے کو سیراب کریں گی اور ایک دوسرے کی سفارش کریں گی یہاں تک کہ تجھے بعض ارواح میں ان گناہوں کے آثار دکھائی دیں گے جو ذات نے کیے ہوں گے اور یہ آثار روح پر نمایاں ہوں گے مگر اس کے بعد یہ آثار کسی ایسی روح کی بدولت جو اللہ کے ہاں عزیز ہوگی اور ان گناہوں والی روح کے قریب ہوگی، زائل ہو جائیں گے۔

فرمایا: برزخ کے مکانات اور جنت کے درمیان نور کے ڈورے ہیں جو روحوں کے اجسام سے جدا ہو کر برزخ میں جانے کے بعد پیدا ہوتے ہیں اور یہ نور نورِ ایمان ہے چنانچہ یہ نور مثلاً زید کی روح سے نکل کر برزخ کو قطع کرتا ہوا جنت تک چلا گیا ہے اور اس نور کے ذریعہ سے اس کو جنت سے فائدہ حاصل ہوتا ہے۔ اسی طرح کفار کے برزخی مکانات اور دوزخ کے درمیان ڈورے ہیں جو ان ارواح کے اجسام سے جدا ہونے کے بعد ہی پیدا ہوتے ہیں اور یہ ظلمت، ظلمتِ کفر ہے۔ خدا اس سے بچائے چنانچہ یہ ظلمت کا ڈورا کافر کی روح سے نکل کر جہنم تک چلا جاتا ہے جس کی وجہ سے کافر کی روح کو جہنم کی لُو اور عذاب پہنچتا ہے۔

نیز فرمایا: اسی طرح برزخ اور دنیا میں اجسامِ مومنین کے درمیان بھی ان کے نورِ ایمان کے ڈورے ہیں چنانچہ صاحب بصیرت کو یہ ایمان کا ڈورا بالکل صاف اور سفید نظر آتا ہے جیسے دھوپ کسی بند دروازہ پر پڑ رہی ہو اور سورج کی شعاعیں باریک سوراخ کے ذریعہ سے اندر آ رہی ہوں کہ اس طرح سورج کی شعاعیں دروازہ سے گزر کر تاروں اور ڈوروں کی طرح دکھائی دیں گی۔ اسی طرح صاحبِ بصیرت کو بھی زندہ مومنین میں ہر ایک کے سر سے نکلتا ہوا ڈورا دکھائی دیتا ہے۔ یہ ڈورا جب تک اس کے سر سے ایک بالشت اونچا نہ ہوئے دکھائی نہیں دیتا اور اس کے بعد یہ لمبا ہو کر برزخ میں اپنے مقام تک چلا جاتا ہے۔ یہ ڈورا بھی ہر ایک کی قسمتِ ازلی کے مطابق مختلف ہوتا ہے چنانچہ بعض میں یہ ایک ڈورے کی شکل میں دکھائی دیتا ہے جیسا کہ بیان ہو چکا اور بعض میں یہ ڈورا اس سے زیادہ موٹا ہوتا ہے اتنا موٹا جتنا کہ نَے ہوتی ہے اور بعض میں اس سے بھی موٹا کھجور کی مانند دکھائی دیتا ہے اور یہ لوگ اکابرِ اولیا میں سے ہوتے ہیں۔

یہ ڈورے اسی طرح کفار کے اجسام اور ان کے برزخی مقر کے درمیان دکھائی دیتے ہیں مگر کفار کے ڈوروں کا رنگ نیلا سیاہی مائل ہوتا ہے جس طرح گو گندھک کی آگ ہوتی ہے۔ جس کسی میں اس قسم کے ڈورے دکھائی دیں یہ اس کی بدبختی کی علامت ہے۔ خدا بچائے۔ یہ ڈورے بھی مختلف ہوتے ہیں۔ کفر میں ان کے اختلاف کے مطابق بعض کے باریک اور بعض کے کھجور جتنے موٹے ہوتے ہیں۔ نَسْئَالُ اللّٰہَ السَّلَامَۃَ۔

حضرت نے فرمایا: ایک بار میں نے یہودی ملاحوں کی طرف نگاہ کی تو ان کے سروں سے ڈورے نکلتے ہوتے دیکھے جو عین افق میں جا کر آپس میں مل جاتے ہیں اور ایک سیاہ کہر کی مانند ہوجاتے اور مجھے ان میں کچھ صاف سفید اور چمکتے ہوتے ڈورے بھی دکھائی دیتے تو میں سمجھ جاتا کہ یہ ڈوروں والے عنقریب مسلمان ہوجائیں گے۔ اسی طرح میں مسلمانوں کی بستی کو دیکھتا تو اُن کے سروں سے صاف چمکدار ڈورے برزخ کی طرف چڑھتے ہوئے دیکھتا۔ ان میں بعض نیلے ڈورے بھی دکھائی دیتے جو ان ڈوروں والوں کی بدبختی کی علامت ہے۔

مؤلف کہتا ہے: اس حدیث میں: اِنَّ[1] الرَّجُلَ لَیَعْمَلُ بِعَمَلِ اَھْلِ الْجَنَّۃِ فِیْمَا یَظْھَرُ لِلنَّاسِ ثُمَّ یَسْبِقُ عَلَیْہِ الْکِتَابُ فَیَعْمَلُ بِعَمَلِ اَھْلِ النَّارِ (ایک آدمی بظاہر اہل جنت کے سے عمل کرتا ہے مگر پھر ازلی لکھت اس پر غالب آجاتی ہے تو وہ دوزخیوں کے سے کام کرنے لگ جاتا ہے) انہی لوگوں کی طرف اشارہ ہے۔ اسی طرح وہ جو یہودیوں میں دکھائی دیتے ہیں مگر ان میں سفید ڈورے پائے جاتے ہیں وہ مسلمانوں میں شامل ہوجاتے ہیں انہی لوگوں کی طرف اشارہ ہے فرمان نبوی میں کہ اِنَّ[2] الرَّجُلَ لَیَعْمَلُ بِعَمَلِ اَھْلِ النَّارِ حَتّٰی مَا یَبْقٰی بَیْنَہٗ وَبَیْنَھَا اِلَّا شِبْرًا ثُمَّ یَسْبِقُ عَلَیْہِ الْکِتَابُ فَیَعْمَلُ اَھْلِ الْجَنَّۃِ فَیَدْخُلُھَا۔ ایک آدمی دوزخیوں کے سے کام کرتا رہتا ہے یہاں تک کہ جب دوزخ اور اس کے درمیان صرف ایک بالشت کا فاصلہ رہ جاتا ہے تو ازلی لکھت غالب آجاتی ہے اور وہ اہل جنت کے سے کام کرنے لگ جاتا ہے اور جنت میں داخل ہوجاتا ہے۔

نیز فرمایا: جو ازلی لکھت کا مشاہدہ کرنا چاہتا ہے اور (حدیث قدسی میں) اللہ تعالیٰ کے اس فرمان کا نظارہ کرنا چاہے کہ[3] ھٰؤُلَاءِ اِلَی الْجَنَّۃِ وَلَا اُبَالِیْ وَھٰؤُلَاءِ اِلَی النَّارِ وَلَا اُبَالِیْ (یہ لوگ جنت

---

[1] ملاحظہ ہو مشکوٰۃ باب الایمان بالقدر صفحہ ۲

[2] مشکوٰۃ باب الایمان بالقدر صفحہ ۲ یہ حدیث متفق علیہ ہے اور ابن مسعود کی روایت ہے۔

[3] 〃 〃 〃 〃 صفحہ ۲۳-۲۴ امام احمد کی حدیث جسے انہوں نے ابو الدرداءؓ سے روایت کیا ہے۔

یں جائیں گے اور مجھے ان کی پروا نہیں اور یہ دوزخ کو جائیں گے مجھے ان کی پروا نہیں)
تو اسے چاہیئے کہ وہ بچوں کو دیکھے۔ آپ کا مطلب یہ ہے کہ جو لوگ اصحابِ کشف ہیں وہ ان بچوں
میں چمکدار ڈوروں والوں اور نیلے ڈوروں والوں کو دیکھ لیتے ہیں حالانکہ یہ بچے ابھی مکلّف نہیں بنے
(یعنی ابھی ان پر احکام شرعی جاری نہیں ہوتے) لیکن ازلی لکھت ہی ہے۔

ایک بار ہم دو چھوٹے بچوں کے پاس سے گزرے جو کھیل رہے تھے تو حضرت نے فرمایا: جو اس
زمانہ کے بچوں کو دیکھے گا انہیں آئندہ آنے والے زمانہ کے بچوں کے مقابلہ میں زیادہ حسین پائے گا اس لیے کہ
اس زمانہ کے اکثر بچوں کا نور بڑا حسین اور ملیح ہے۔

ایک بار ہم ایک جگہ سے گزرے۔ وہاں سے ایک بچہ نکلا۔ آپ نے فرمایا: تمہارا کیا نام ہے؟ بچہ
نے جواب دیا۔ مقدار۔ حضرت نے فرمایا: اس میں سے ایک ولی کبیر نکلے گا جو اللہ کو بہت عزیز ہوگا۔

ایک اور بار حضرت نے ایک اور بچہ کو دیکھا تو مجھے کہا: نورِ ولایت کی طرف دیکھو۔ اس کے
چہرے پر ولایت کی حلاوت کو دیکھو۔ خود ولایت کی طرف دیکھو کہ وہ کسی پر مخفی نہیں رہتی۔ اس کے بعد
مجھے فرمایا: تمہیں نصیحت کرتا ہوں کہ اس کے ساتھ اچھا برتاؤ کرنا۔

مؤلف کہتا ہے کہ اب وہ بچہ بڑا ہو چکا ہے اور آج وہ ایک بہت بڑی شخصیت ہے۔ الحمد للہ
اس نے حج بھی کر لیا ہے۔ اسے بڑے بڑے مناظر نظر آتے ہیں، عملی حالت بھی اچھی ہے۔ اللہ نے اسے استقامت
بخشی ہے اور اس کے چہرہ پر ملاحت کی شعاعیں دمک رہی ہیں۔

پھر فرمایا کہ بچہ کے ماں کے پیٹ سے نکلتے ہی اور زمین پر آتے ہی صاحبِ کشف کو معلوم ہو جاتا ہے
کہ اس کا انجام کیا ہوگا۔ ایک جوہڑ کی طرح کہ نباتات کے اُگنے سے پہلے کچھ پتہ نہیں چلتا کہ اس میں
کچھ اُگے گا بھی یا نہیں، لیکن جب اس میں بیل جم کر اوپر نظروں کے سامنے آجاتی ہے تو معلوم ہو جاتا ہے
کہ یہ تربوز کا پتہ ہے اور یہ دوسرا پتّہ یا جیسے غنچہ کہ اگر زرد رنگ کا ہے تو سبز نہیں بن سکتا اور جو سرخ
ہے وہ زرد نہیں بن سکتا۔

اس کے بعد میں نے عرض کیا: منافقوں کو بدترین کفار کیوں سمجھا گیا اور انہیں جہنّم کے سب سے
نچلے درجہ میں کیوں رکھا گیا، حالانکہ ظاہری طور پر یہ نماز بھی پڑھتے، روزے رکھتے، حج کرتے اور جہاد کرتے
تھے۔ اگر یہ سب کچھ نہ بھی ہو تو کم از کم انہوں نے مسلمانوں کو اذیت تو نہیں پہنچائی۔

اس پر حضرت نے فرمایا: سبحان اللہ! ارے کفر اور اس کی خباثت و شدت کا امتداد ازلی لکھت کے
اعتبار سے ہوتا ہے نہ کہ اعمال کی طرف سے۔ بارہا ایسا ہوا کہ ہم نے برزخ کی طرف دیکھا تو ایک ظلمانی ستون

نیلا، خبیث، دراز ہوتا ہوا وہاں سے اترتا ہوا کافروں کے کسی شہر کی طرف جاتا ہوا دیکھا۔ میں نے دل میں خیال کیا کہ ضرور یہ ان کے حاکم پر نازل ہوگا یا کسی سرکش انسان پر گرے گا۔ چنانچہ میں اپنی نگاہ اس کے پیچھے لگا تو کیا دیکھتا کہ وہ ایک ضعیف پھوہڑ شخص پر آکر گرتا جو اپنی دکان پر بیٹھا ہوا چندھی آنکھوں سے تک رہا ہوتا۔ یہ دیکھکر میں کلمۂ طیبہ پڑھتا اور اللہ کی نعمتوں پر اس کا شکریہ ادا کرتا۔

ایک بار حضرت نے مجھے فرمایا کہ نیلا ڈورا اگرچہ بدبختی کی علامت ہے مگر اللہ کے حکم سے کبھی یہ تبدیل بھی ہو جاتا ہے۔ اگر اس ڈورے والے کا میل جول اہل سعادت لوگوں سے ہو جائے اور ان سے اس کی دوستی ہو جائے تو یہ ڈورا بتدریج صاف ہوتا جاتا ہے یہاں تک کہ یہ اہلِ سعادت لوگوں کے ڈوروں کی طرح ہو جاتا ہے۔ والحمد للہ۔

ایک اور بار فرمایا: نیلا ڈورا اگرچہ نیلا ہوتا ہے اور اس میں چمک نہیں ہوتی مگر ہم نے اسے تبدیل ہوتے دیکھا ہے اور اگر نیلے پن کے ساتھ یہ چمک دار بھی ہو تو ہم نے اسے تبدیل ہوتے نہیں دیکھا۔

ایک مرتبہ فرمایا: حضرات انبیاء علیہم السلام کے مبعوث ہونے میں ایک حکمت یہ بھی ہے کہ وہ لوگوں کو ایک کلمۂ توحید پر جمع کرتے ہیں تاکہ وہ سب ایک ملت پر آجائیں اور ایک دوسرے کو نصیحت اور ایک دوسرے کی مدد کریں۔ اور ظاہر ہے کہ ان میں بعض اہلِ سعادت ہوں گے اور بعض وہ ہوں گے جن کا ڈورا نیلا ہوگا۔ لہٰذا اگر نیلے ڈورے والے کو کچھ مدت تک اہلِ سعادت کی صحبت نصیب رہی ہو تو اہلِ سعادت سے اجتماع کی بدولت وہ بھی سعادت مند ہو جائے گا پس بعثتِ انبیاء کی بدولت اجتماع نصیب ہوا اور اجتماع سے حالت پلٹی۔ بعثت کا یہی فائدہ ہے۔

مؤلف کہتا ہے کہ یہی راز ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جماعت کا ساتھ دینے کا حکم فرمایا ہے کہ بالشت برابر بھی جماعت سے باہر نہ نکلا جاے۔ چنانچہ اگر کسی نے جماعت کو چھوڑا تو جاہلیت کی موت مرا۔

ایک بار میں حضرت کے ساتھ کسی بازار میں جا رہا تھا اور آپ کا دستِ مبارک میرے ہاتھ میں تھا اور ہم ساتھ ساتھ چل رہے تھے اور میں حضرت سے ان علوم کشفیہ کے متعلق سوال کرنے میں محو تھا کہ ایک شخص ہمیں ملا جو لوگوں میں صالح مشہور تھا اور پیر بنا ہوا تھا۔ اس نے ہم سے ایک بات کہی جس میں بظاہر تو نصیحت تھی مگر قرائن سے ظاہر ہو رہا تھا کہ اس کا مقصد کچھ اور ہے۔ اس لیے ہم خاموش رہے مگر بعد میں حضرت نے مجھے بتایا کہ اس کا ڈورا نیلا ہے۔ اللہ پناہ میں رکھے اور بارہا اس پر قسم کھائی اور فرمایا مجھے معلوم نہیں کہ اس کا ڈورا بدلے گا یا نہیں۔

نیز فرمایا: جب آدمی مرجاتا ہے (اور ذات فنا ہوجاتی ہے) تو روح برزخ میں چلی جاتی ہے اور جب ذات پھولنے اور سڑنے لگتی ہے تو اس کا سِرّ ذات سے منقطع ہو جاتا ہے۔ ہاں بعض اولیاء میں روح کے سِرّ کا تعلق قبر سے قائم رہتا ہے جس کی وجہ سے اس کے نورِ ایمان کا عمود قبر پہ قائم رہتا ہے اور وہاں سے اوپر کو چڑھتا ہوا برزخ میں روح سے جا ملتا ہے، بعینہٖ اسی طرح جس طرح کہ اس ولی کی زندگی میں وہ نور ذات کے ساتھ قائم تھا۔

فرمایا: کئی بار میں فاس کی قبروں اور گورستانوں کی طرف نگاہ کرتا ہوں تو کیا دیکھتا ہوں کہ زمین سے نور نکل کر برزخ کی طرف اس طرح جاتے ہیں جس طرح سرکنڈے زمین سے نکل کر برزخ تک چلے گئے ہوں یاد رکھو کہ ان انوار کے مالک نیک اولیاء ہیں۔ کئی بار یوں فرماتے کہ یہاں ایک ولیِ کبیر (مدفون) ہے یہ دیکھو اس کا نور برزخ تک چلا گیا ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی قبر کا بھی یہی حال ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے نورِ ایمان کا عمود قبر شریف سے ممتد ہو کر اس قبۂ برزخ تک چلا گیا ہے۔ وہاں آپ کی روح مطہرہ ہے فرشتے گروہ در گروہ آکر اس نور شریف کا طواف کرتے ہیں وہ تبرکاً نورِ شریف کو مَس کرتے ہیں اور اس پر اس طرح گرتے ہیں جس طرح شہد کی مکھیاں اپنے یعسوب (مکھیوں کے بادشاہ) پر گرا کرتی ہیں۔ چنانچہ اگر کوئی فرشتہ سِرّ الٰہی یا کسی امر کی برداشت سے عاجز آتا یا اس کو کسی قسم کی تھکان محسوس ہوتی یا کسی مقام پر وہ ٹھہر جاتا تو وہ فوراً نور شریف کی طرف آکر اس کا طواف کرتا ہے اور ایسا کرنے سے اسے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے نور سے قوت کاملہ اور بہت بڑی ہمت حاصل ہو جاتی ہے اور وہ پہلے سے زیادہ قوی ہو کر اپنی جگہ پر چلا جاتا ہے۔ ابھی[1] ایک گروہ طواف سے فارغ نہیں ہوتا کہ دوسرا گروہ آجاتا

---

[1] اس مقام پر پھر مولوی عاشق الٰہی صاحب نے پورا ایک صفحہ سیاہ کر ڈالا ہے۔ بھائی! صاحب نظر لوگ جانیں کہ حقیقت کیا ہے۔ آپ خواہ مخواہ ناراض ہو رہے ہیں اگر آپ میں دیدۂ بینا نہیں تو یہ کس کا قصور ہے۔ عاشقان آستانۂ محمدی اور والہان ذات مصطفویؐ سے پوچھو کہ فرشتوں سے بھی زیادہ جوش و محبت کے ساتھ روضۂ اطہر اور نورِ مطہر کے طواف کرنے کے لیے بیتاب ہیں۔ وَهَل يستوى الاعمٰى والبصير۔ ابن المبارکؒ اور ابن ابیؒ نے کعبؓ الاحبار سے روایت کی ہے کہ ہر روز ستر ہزار فرشتے اترتے ہیں اور اپنے پروں سے قبرِ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا مس کرتے ہیں، اس کے گرد پھرتے ہیں۔ آنحضرتؐ کے لیے استغفار کرتے اور آپ پر درود و سلام بھیجتے ہیں۔ رات ہونے پر یہ فرشتے چلے جاتے ہیں اور دوسرے ستر ہزار اترتے ہیں۔ ہر روز یہی سلسلہ جاری رہتا ہے یہاں تک کہ قیامت ہوگی تو قیامت کے دن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ستر ہزار فرشتوں کے درمیان قبر سے نکلیں گے۔

(البدور السافرہ فی امور الآخرہ طبع لاہور صفحہ ۲۷)

ہے اور ہر ایک طواف میں عجلت کرتا ہے۔

مجھے ایک بار فرمایا: جب اللہ تعالیٰ نے مجھے فتح عطا کرنی چاہی اور چاہا کہ مجھے اپنی رحمت میں لے لے تو میں فاس میں تھا۔ کیا دیکھتا ہوں کہ قبر شریف میرے سامنے ہے۔ پھر میں نے نور شریف کو دیکھا جو میرے دیکھتے میرے قریب آتا گیا۔ جب بالکل قریب آگیا تو اس میں سے ایک آدمی نکلا۔ دیکھا تو وہ خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم تھے۔ تب مجھے حضرت عبداللہؒ برناوی نے کہا: اے عبدالعزیز اللہ تعالیٰ تجھے اپنی رحمت کے ساتھ جمع کر دیا ہے اور یہ رحمت سیدالوجود صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔ اب مجھے اس بات کا ڈر نہیں رہا کہ شیطان تجھ سے کھیل سکے گا۔

نیز فرمایا کہ برزخ کی شان عجیب ہے اور وہ مومنین کا اس قدر نور اپنے اوپر لے لیتا ہے کہ عقل دنگ رہ جاتی ہے یہاں تک کہ نور شمس بھی ان مومنین کی ارواح کے نور سے ہے، لیکن ستاروں کا اور چاند کا نور شمس سے لیا گیا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ برزخ کا نچلا حصہ جیسا کہ بیان ہو چکا سیاہ اور تاریک ہے لہٰذا جو نیرات اس کے بالمقابل ہیں انہیں نور نہیں پہنچ سکتا لہٰذا جس نور سے سورج منور ہوا ہے اس سے روشنی حاصل کرنے میں یہی چیز حائل ہے کیونکہ اگر اس سے روشنی حاصل ہوتی تو برزخ کا نچلا حصہ بھی روشن ہوتا اور کفار کی ارواح اس سے فائدہ اٹھا سکتیں مگر اللہ کا یہ ارادہ نہ تھا۔ یہ نیرات (یعنی چاند اور ستارے) سورج سے روشنی حاصل کرتے ہیں اس لیے کہ سورج برزخ سے باہر ہے اور یہ نیرات اس کے بالمقابل واقع ہیں لہٰذا انہیں سورج کی روشنی پہنچتی ہے اور چاند اس جہت میں جو ہمارے قریب ہے دنیا کے آسمان پر ہے۔

میں نے عرض کیا: منجمین کا خیال ہے کہ ستارے فلک الثوابت میں ہیں جو کہ آٹھواں آسمان ہے۔

حضرت نے فرمایا: انہیں یہ کہاں سے معلوم ہوا؟

میں نے عرض کیا: ان کا یہ خیال اس لیے ہے کہ ان کی رفتار اور سبع سیاروں کی رفتار میں بہت فرق ہے

فرمایا: جیسا ان کا خیال ہے ایسا نہیں ہے۔ ستارے تمام کے تمام دنیا کے آسمان پر ہیں۔ اس کے بعد آپ نے ہر آسمان کی کیفیت بیان کی اور ان چیزوں اور لوگوں کا ذکر کیا جو اس میں ہیں مگر اس کا لکھنا مناسب نہیں۔ اس کتاب کا مطالعہ کرنے والے یہ خیال نہ کریں کہ میں نے جو کچھ حضرت سے سنا وہ تمام کا تمام اس کتاب میں لکھ دیا ہے۔ میں نے تو بہت تھوڑا حصہ لکھا ہے۔ برزخ کے متعلق جو کچھ میں نے حضرت سے سنا اسی قدر ہے خدا ہمیں اس سے مستفید ہونے کی توفیق دے۔ آمین۔

گیارھواں باب

جنّت، اس کی ترتیب، تعداد اور ان چیزوں کا ذکر جن کا تعلّق جنّت سے ہے۔

میں نے حضرت کو فرماتے سُنا کہ دنیا میں جو نعمتیں سننے میں آتی ہیں اور جو سننے میں نہیں آتیں سب کی سب جنت الفردوس میں موجود ہیں اور اسی میں جنّت کی نہریں جاری ہوتی ہیں۔

مؤلف کہتا ہے کہ بخاری وغیرہ کی حدیث میں بھی اسی طرح آیا ہے۔

فرمایا: نہروں کے جاری ہونے کی کیفیت یہ ہے کہ ایک ہی نہر کے اندر چار قسم کی پینے کی چیزیں بہ رہی ہوں گی۔ یعنی پانی، شہد، دودھ اور شراب یہ سب بہ رہی ہوں گی مگر ایک ہی نہر کے اندر نہ ملیں گی بعینہٖ جس طرح کہ کہکشاں کے رنگ کہ اس میں مختلف رنگ سرخ، زرد، نیلا اور سبز سب الگ الگ دکھائی دیتے ہیں۔ اسی طرح یہ پینے کی چیزیں ایک نہر میں ساتھ ساتھ چلتی دکھائی دیں گی مگر ایک دوسرے میں نہ ملینگی پھر یہ مومن کی خواہش کے مطابق جاری ہوں گی۔ اگر چاروں کی خواہش کرے گا تو چاروں بہتی ہوں گی اور اگر ساتھ والا انسان صرف دو کی خواہش کرے گا تو دو ہی بہتی ہوں گی اور دو اللہ کے حکم سے بند ہو جائیں گی۔ پھر ان کا تیسرا ساتھی اگر ایک ہی چاہے گا تو تین بند ہو جائیں گی اور ایک بہے گی اور اگر کوئی اور چار سے بھی زیادہ کی خواہش کرے گا تو اللہ کے حکم سے اسی قدر جاری ہو جائیں گی لہٰذا اگر تو ابتدا سے انتہا تک ان کے جاری ہونے کو دیکھے گا تو تجھے اس میں چاروں قسمیں بہتی ہوئی دکھائی دیں گی۔ ایک جگہ پر چاروں، دوسری جگہ صرف دو۔ تیسری جگہ صرف ایک اور کسی جگہ پہ پانچ نہ ان کے درمیان کوئی حاجز اور نہ کوئی فاصلہ ہوگا۔ فَسُبْحَانَ الْمَلِكِ الْخَلَّاقِ۔

پھر فرمایا: یہ نہریں کھُدی ہوئی زمین میں نہ بہ رہی ہوں گی۔

مؤلف کہتا ہے کہ حدیث میں بھی اسی طرح آیا ہے کہ یہ نہریں کھدی ہوئی زمین میں نہ بہتی ہونگی۔ ایک بار میں حضرت کے ساتھ باب الفتوح میں تھا کہ میں نے عرض کیا کہ میں نے فلاں بزرگ سے سنا ہے کہ جنّت کے انگور کی لمبائی ایک ہاتھ برابر ہے۔ حضرت نے فرمایا: میں نے اسے دیوار کے برابر دیکھا

یعنی اس دیوار کے برابر جو باب الفتوح کی مسجد میں قبلہ کی جانب ہے۔

ایک اور بار فرمایا کہ اس کی لمبائی اس دیوار کے برابر یا کم یا زیادہ ہے۔

پھر فرمایا: لوگوں کا خیال ہے کہ جنت الفردوس تمام جنتوں سے افضل اور اعلیٰ ہے اور کوئی جنت اس کے برابر نہیں حالانکہ حقیقت میں ایسا نہیں ہے۔ بلکہ ایک اور جنت ہے جو جنت الفردوس سے بھی اعلیٰ و افضل ہے اور اس میں کسی قسم کی نعمت نہیں پائی جاتی اور یہاں صرف وہ انبیاء اور اولیاء رہیں گے جنہیں اللہ تعالیٰ کا مشاہدہ حاصل ہے۔

فرمایا: ان لوگوں کے نزدیک مشاہدۂ الٰہی ہر اس نعمت سے زیادہ عزیز، زیادہ خوش نما، زیادہ میٹھا اور اعلیٰ و افضل ہے جو تصور میں آسکے اور اس جنت میں رہنے والے جنت سے نکل کر کسی اور جنت میں جانا پسند نہ کریں گے جس طرح کہ اہلِ جنت، جنت سے نکل کر دنیا میں جانا پسند نہ کریں گے۔

فرمایا: جو لوگ جنت الفردوس میں رہیں گے ان میں اکثریت امتِ محمدیہ کی ہوگی اور امتِ محمدیہ میں سے صرف بیس کے قریب اہلِ ظلم و اہلِ کبائر اور وہ لوگ جنہیں اللہ تعالیٰ جنت الفردوس میں بسانا پسند نہ کریں گے اس میں سے نکال دیے جائیں گے ہم اللہ سے اس کی عفو اور فضل چاہتے ہیں

فرمایا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنی امت سے بہت الفت ہے لہٰذا آپ چاہتے ہیں ان کا دیدار کریں اور ان سے اس طرح اچھا برتاؤ کریں جس طرح ایک رشتہ دار دوسرے رشتہ دار سے کرتا ہے۔ اس لیے حق تعالیٰ نے مشاہدہ والی جنتِ عالیہ اور ہر قسم کی نعمتوں والی جنت الفردوس دونوں کو آپ کے لیے جمع فرمایا اور دونوں کے وسط کا مجموعہ آپ کا مسکن تجویز کیا۔ یہ بات کسی اور کو حاصل نہیں لہٰذا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم تمام امت کو خواہ وہ اہلِ مشاہدہ میں سے ہوں یا نہ ہوں، اپنا فیضان پہنچائیں گے۔ خدا ہمیں آپ کی امت میں رکھے اور ہمیں آپ کی سنت اور طریقہ سے منحرف نہ کرے۔

جنتِ عالیہ

مؤلف کہتا ہے کہ یہ جنتِ عالیہ جس کی طرف حضرت نے اشارہ کیا ہے، جنت علیین ہے۔ واللہ اعلم۔ چنانچہ ابن عساکرؒ[1] نے ابو سعید خدری رضؓ[2] سے روایت کی ہے کہ علیین کے

---

[1] ابن عساکر: حافظ کبیر محدث شام فخر الائمۃ ثقۃ الدین ابو القاسم علی بن الحسن دمشقی شافعی معروف بابن عساکر۔ انکی بہت سی تصانیف ہیں۔ ۴۹۹ھ ۔ ۱۱۰۵ء میں پیدا ہوئے اور ۵۷۱ھ ۔ ۱۱۷۵ء میں وفات پائی۔ ذہبی نے ان کی تصانیف کی طویل فہرست دی ہے۔ تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو تذکرۃ الحفاظ ج ۴ صـ ۱۱۴

[2] ابو سعید خدری رضؓ: سعید بن مالک الانصاری۔ ان کا شمار علماء صحابہ میں ہے سب سے پہلی جنگ جس میں انہوں نے شرکت

(بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر)

لوگ جنت والوں پر اوپر سے جھانکیں گے تو ان کا چہرہ اہلِ جنت کے لیے اس طرح چمکتا ہوگا جس طرح چودھویں رات کا چاند دنیا والوں پر چمکتا ہے اور ابوبکرؓ اور عمرؓ انہی میں سے ہیں۔ نیز احمدؒ[1]، ترمذیؒ[2] اور ابن حبانؒ[3] نے ابوسعیدؓ سے اور طبرانیؒ[4] نے جابرؓ[5] بن سمرہ اور ابن عساکر نے ابن عمرؓ اور ابوہریرہؓ سے روایت کی ہے کہ بلند روحوں والوں کی طرف نچلے درجہ کے لوگ اس طرح دیکھیں گے جس طرح تم آسمان کے افق میں ستاروں کو دیکھتے ہو اور ابوبکرؓ و عمرؓ انہی لوگوں میں سے ہیں۔ ملاحظہ ہو الجامع الصغیر، البدور السافرہ میں احادیث الرویت کے باب کے مطالعہ سے بھی اس کی صحت کا علم ہوتا ہے اور احادیث رویت پر ہی (سیوطیؒ نے) کتاب کو ختم کیا ہے اور (سیوطیؒ نے) جنت عالیہ کے نام بھی نکالے ہیں مثلاً دار المزید۔ جیسا کہ حذیفہؓ[6] وغیرہ کی حدیث میں ہے اور ابونعیمؒ نے ابویزید البسطامی سے روایت کی ہے کہ

(بقیہ حاشیہ صفحہ سابقہ)

کی غزوۂ خندق ہے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ بارہ جنگوں میں شریک ہوئے۔ انہوں نے آنحضرت صلعم سے بہت سی احادیث اور بہت سا علم حاصل کیا تھا انکی وفات ۷۴ھ ۶۹۳ء میں ہوئی اور ستر سال سے اوپر عمر پائی۔

۱؎ احمدؒ: چوتھے امام احمد بن حنبل بن ہلال الذہلی الشیبانی ۱۶۴ھ ۷۸۰ء میں پیدا ہوئے اور ہشیمؒ اور سفیان بن عیینہ کے طبقہ میں اکابر محدثین سے حدیث سنی۔ امام شافعیؒ جب بغداد میں آئے تو امام احمدؒ نے ان سے فقہ کی تعلیم حاصل کی اور وہ ان کے بغدادی شاگردوں میں سب سے بڑے ہیں اس کے بعد خود اجتہاد کیا۔ ان کی وفات ۲۴۱ھ ۸۵۵ء میں ہوئی۔

۲؎ ترمذی: ابوعیسیٰ محمدؒ الترمذی ان کی "جامع ترمذی" کا شمار صحاح ستہ میں ہوتا ہے مشہور محدث ہیں۔ انکی وفات ۲۷۹ھ ۸۹۲ء میں ہوئی۔

۳؎ ابن حبانؒ: ابوحاتم محمد بن حبان البستی متوفی ۳۵۴ھ ۹۶۵ء۔

۴؎ طبرانیؒ: ابوالقاسم سلیمان بن احمد بن ایوب الشامی اللخمی الطبرانی۔ حجت حدیث ہیں۔ ۲۶۰ھ ۸۷۳ء میں پیدا ہوئے اور ۳۶۰ھ ۹۷۰ء میں وفات پائی۔ ان کا ذکر پہلے آچکا ہے۔

۵؎ ابوعبداللہ جابر بن سمرہ العامری: صحابی ہیں۔ حضرت سعد بن ابی وقاص کے بھانجے تھے انہوں نے کوفہ میں سکونت اختیار کرلی تھی اور وہیں ۷۴ھ ۶۹۳ء میں وفات پائی۔

۶؎ حذیفہ: غالباً یہاں مراد حذیفہ بن یمان صحابی سے ہے انکی وفات ۳۶ھ ۶۵۶ء میں ہوئی۔ یہ باپ بیٹے دونوں مسلمان ہوئے اور بدر کی جنگ کے لیے آرہے تھے کہ مشرکوں نے انہیں پکڑ لیا اور اس وعدہ پر چھوڑا کہ یہ جنگ بدر میں حصہ نہ لیں گے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس عہد کی وجہ سے انہیں جنگ بدر میں شریک نہیں کیا۔

اللہ کے خاص بندے ہیں جنہیں اگر جنت میں اللہ کے دیدار سے روک دیا جائے تو وہ اسی طرح فریاد کریں گے جس طرح دوزخی فریاد کریں گے۔ واللہ اعلم۔

میں نے حضرت سے جنتِ عالیہ جس کا ذکر ہو چکا ہے، کے نام کے متعلق دریافت کیا کہ آیا یہی جنت علیین ہے؟ فرمایا کہ وہ دوسری جنت ہے۔ مَیں نے عرض کیا کہ حدیث میں تو اسی طرح آیا ہے اور میں نے ابوسعید خدری کی مذکورہ بالا حدیث کا حوالہ دیا تو فرمایا: ہاں، میں سمجھ گیا کہ حضرت میری دلجوئی کرنا چاہتے ہیں۔ اس لیے میں نے عرض کیا کہ جو آپ کے نزدیک صحیح ہو بیان فرمائیں۔

حضرت نے فرمایا: جنت علیین جنت الفردوس سے اوپر اور اس کی جہت سے خارج ہے اور اس کی ہی سمت میں نہیں ہے اور یہ جنتِ عالیہ ایک دوسری جنت ہے۔

میں نے عرض کیا کیا اسی کو دارالمزید کہتے ہیں؟

فرمایا: ہاں یہی اس کا نام ہے مگر اس میں حق سبحانہ کے مشاہدہ کے سوا کوئی نعمت نہیں ہے اور اوپر بیان کیا جا چکا ہے کہ یہاں کے لوگوں کے لیے مشاہدۂ الٰہی ہر قسم کی نعمتوں سے زیادہ عزیز ہے اس لیے کہ مشاہدۂ الٰہی میں جنت کی تمام نعمتوں کی لذت پائی جاتی ہے اس میں تمام وہ نعمتیں پائی جاتی ہیں جو جنت میں ہیں اور اس کے علاوہ اور چیز بھی ہے اور یہاں کے لوگوں کی لذّت روحانی لذت ہوگی۔ برخلاف اور جنت والوں کے کہ ان کی لذت ان کے باقی اجسام کی لذت ہوگی۔

فرمایا: جسے ان دونوں قسموں میں سے ایک قسم کی لذت حاصل ہوگی وہ دوسری قسم کی لذت کی طاقت نہ رکھ سکے گا اور ان دونوں قسم کی لذتوں کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے کوئی شخص جمع نہیں کر سکتا، چنانچہ آپ کو لذّتِ مشاہدہ اور اس کے اسرار کی اس قدر قوت حاصل ہوگی کہ کسی اور کو نہ ہوگی اور آپ اپنے جسم کے ذریعہ سے جنت کی نعمتوں سے اس قدر لذت حاصل کریں گے کہ کوئی اور نہ کر سکے اور ان میں سے کوئی ایک لذّت دوسری لذت سے آپ کو مانع نہ آسکے گی۔ پاک ہے وہ خدا جس نے آپ کو اس کی قوت دی اور اس پر قادر کیا۔

نیز فرمایا کہ یہ جنّت، جنّت الفردوس سے اوپر ہے اور اسی کی جہت میں ہے مگر یہاں کے ساکنین کی تعداد بمقابلہ دیگر جنتوں کے ساکنین کے کم ہوگی۔ جنّتِ علیین میں لاتعداد نعمتیں ہوں گی اور جنت الفردوس میں نعمتوں کی انواع اس سے بھی زیادہ ہوں گی مگر جنت کی نعمتیں زیادہ لطیف اور دقیق ہیں۔ آپ یہ کہنا چاہتے تھے کہ دارالمزید کے قرب کی وجہ سے جہاں کی نعمتیں حسی نہیں بلکہ معنوی ہیں۔ یہاں کی نعمتیں بھی معنوی

ہوں گی۔ لہٰذا جنت علیّین زیادہ بلند اور زیادہ حلاوت والی ہے اور جنت الفردوس کی نعمتیں تعداد میں زیادہ ہوں گی اور جنت علیین میں انبیاء کی جماعت سکونت پذیر ہو گی۔ انہی میں حضرت ابراہیم اور حضرت اسمٰعیل علیہما السلام ہیں۔

میں نے عرض کیا کہ ان احادیث کا کیا جواب ہو گا جن میں آیا ہے کہ سب میں اعلیٰ جنت جنت الفردوس ہے، چنانچہ بخاری میں ہے کہ جب تم دعا مانگو تو اللہ سے جنت الفردوس مانگا کرو کہ وہ وسط جنت ہے اور اعلیٰ جنت ہے۔ بعض علماء نے وسط سے مراد عمدہ اور جیّد لیا ہے اور اعلیٰ سے مراد حقیقی مفہوم بلند تر اور افضل ترین اور بعض علماء مثلاً حافظ سیوطی نے بدور سافرہ میں کہا ہے وسطِ شئی اس چیز کا اعلیٰ و بلند ترین حصّہ ہوتا ہے جیسے ٹیلے کا درمیانی حصّہ کہ اس کا بلند ترین حصّہ ہے اس کے علاوہ اور احادیث بھی ہیں۔

فرمایا: اگر کوئی ان تینوں جنتوں کا ایک ہی نام رکھنا چاہے تو رکھ سکتا ہے اور سب کا نام جنت الفردوس رکھ سکتا ہے۔ اس اعتبار سے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا قبّہ دارالمزید، جنت العلّیین اور جنت الفردوس تینوں سے لیا گیا ہے لہٰذا جو جنت الفردوس میں ہو گا وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ہو گا اور جو جنت العلیین میں ہو گا وہ بھی آپ کے ساتھ ہو گا۔ علیٰ ہٰذا القیاس جو دارالمزید میں ہو گا وہ بھی آپ کے ساتھ ہو گا۔ لہٰذا جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے مقام کی طرف نظر کر کے کہہ دے کہ تینوں جنت ایک ہی ہیں تو اس میں کوئی مضائقہ نہیں۔

پھر فرمایا: قبۂ مطہرہ نے جنت الفردوس کے وسط کو اپنے اندر لے لیا ہے اور پھر علیّین کی طرف ہوتے ہوئے دارالمزید تک جا پہنچا ہے اور اس کے وسط کو اپنے اندر لے لیا ہے۔

مؤلف کہتا ہے کہ اس قول سے تمام احادیث کا اختلاف اُٹھ جاتا ہے۔ واللہ اعلم۔

میں نے سوال کیا: کیا باقی جنتوں میں بھی نعمتیں ہیں؟

فرمایا: ہاں۔ وہاں کے لوگوں کے اعمال کے مطابق لیکن جنت الفردوس اس اُمّتِ محمدیہ اور ان لوگوں کے لیے جنہوں نے بغیر بعثت نبی کے خدا کی طرف سے ہدایت پا کر خدا کو ایک جانا۔

مؤلف کہتا ہے۔ جیسے قس[1] بن ساعدہ اور زید[2] بن عمرو بن نفیل۔

---

[1] قس بن ساعدہ ایادی: یہ زمانہ جاہلیت میں نجران کا پادری اور عربوں کا خطیب تھا۔ اس کا اللہ پر ایمان تھا اور لوگوں کو حکمت اور مواعظ حسنہ سے اللہ پر ایمان لانے کی دعوت دیا کرتا تھا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ م

(بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر)

حضرت نے فرمایا: کیا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے لیے اس بات کی گواہی دی ہے؟

اس وقت تو مجھے اس کا جواب یاد نہ آیا مگر اس کے بعد میں نے ابن خلیل السبکی[1] کی منظومۃ القبور کی شرح میں دیکھا کہ اس نے صراحۃً بیان کیا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان دونوں کے لیے شہادت دی ہے کہ یہ دونوں قیامت کے دن ایک الگ امت کے طور پر اٹھائے جائیں گے۔ شرح کی عبارت یہ ہے کہ بعض علماء کا قول ہے کہ اہلِ فترۃ تین قسم کے ہیں۔ اوّل وہ لوگ جنہوں نے اپنی بصیرت سے توحید کو پا لیا۔ پھر ان میں سے کچھ لوگ ایسے ہیں جو کسی شریعت میں داخل نہیں ہوئے جیسے قُس بن ساعدہ اور زید بن عمرو بن نفیل۔ ان دونوں قسموں کے ذکر کرنے کے بعد کہتے ہیں: پہلی قسم میں سے قُس بن ساعدہ اور زید بن عمرو بن نفیل ہر ایک کے لیے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ وہ قیامت کے دن ایک اُمّت کے طور پر اٹھیں گے۔

مؤلف کہتا ہے کہ ابن خلیل السبکی کی بعض علماء سے مراد اُبَی[2] ہے جس طرح مسلم کی شرح میں ہے حافظ سیوطی نے مسالک[3] الحنفا ء میں شارح منظومہ سے زیادہ تفصیل سے اُبَی کا یہ قول نقل کیا ہے۔

(بقیہ حاشیہ صفحہ سابقہ) نے اسے بعثت سے پہلے سوق عکاظ میں خطبہ دیتے ہوئے سنا۔ اس کی بڑی لمبی عمر ہوئی اور ۶۰۰ء میں وفات پائی۔ ابو محمد عبداللہ بن جعفر بن درستویہ نحوی متوفی ۳۴۷ھ نے اس کے حالات میں ایک کتاب لکھی ہے جس کا نام خبر قس بن ساعدہ ایادی رکھا (کشف الظنون ۱: ۲۵۲)

[2] زید بن عمرو بن نفیل: قبیلہ قریش میں سے تھے۔ انھوں نے جاہلیت میں بتوں کی پرستش کرنا، مردار کھانا، لڑکیوں کو زندہ دفن کرنا۔ بتوں کے لیے قربانی کرنا وغیرہ ترک کر رکھا تھا اور کہا کرتے تھے کہ میں ابراہیمؑ کے خدا کی پرستش کرتا ہوں اور حضرت اسمٰعیلؑ کی اولاد میں سے ایک نبی کی آمد کا منتظر ہوں مگر خیال نہیں کہ انہیں پا سکوں۔ ابن حجر (فتح الباری ج ۷: ۱۱۲) فرماتے ہیں کہ انھوں نے عدی بن کعب کو کہا کہ اگر تو آنیوالے نبی کا زمانہ پائے تو انہیں میرا اسلام عرض کرنا چنانچہ عدی نے ان کا سلام آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو پہنچایا اور آنحضرت نے سلام کا جواب دیا اور فرمایا کہ میں نے اسے جنت میں دامن گھسیٹ کر چلتے دیکھا ہے۔

---

[1] ابن خلیل السبکی: ان کے حالات معلوم نہ ہو سکے۔

[2] اُبَی ابن کعب: سید القراء صحابی ہیں۔ ان سے حضرت عمرؓ نے روایت کی ہے۔ عقبہ ثانیہ اور بدر میں شرکت کی انھوں نے ۱۹ھ و ۶۴۰ء میں وفات پائی۔

[3] پورا نام مسالک الحنفاء والدی المصطفیٰ ہے۔ اس رسالہ کو سیوطی نے اپنی کتاب الحاوی للفتاوی میں نقل کیا ہے حاوی میں سیوطی نے اپنے بیاسی رسالے جمع کر دیے ہیں جو انھوں نے اہم مسائل پر لکھے۔ (کشف الظنون ج ۱: ۳۲۱)

اس کے بعد حضرت سے میری ملاقات ہوئی تو میں نے یہ مذکورہ کلام پیش کیا تو فرمایا: میں بھی یہی کہنا چاہتا تھا مگر مجھے اس بات کا ڈر ہوا کہ کہیں لوگ میری طرف سے یہ نقل نہ کرنے لگ جائیں کہ میں کہتا ہوں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اہلِ جاہلیت کے بارے میں جنت میں جانے کی گواہی دی ہے لہٰذا میں دیکھنا چاہتا تھا کہ کیا اس بارے میں علماء نے کچھ لکھا ہے۔ سو خدا کا شکر ہے کہ ان کا کلام اس کے مطابق ہے۔

پھر فرمایا: کہ یہ اور اس قسم کے لوگ اس لیے جنت الفردوس میں جائیں گے کہ کفار کے درمیان رہ کر ان کا اللہ پر ایمان تھا اور یہ اللہ کی طرف سے ان پر بہت بڑی عنایت تھی جس کی وجہ سے ضروری تھا کہ ان کا بہت بڑا نور ہو جو کفر کی ظلمتوں کو پھاڑ ڈالے اور اپنی جنس کے ہادی کے بغیر ہی وہ توحید کو پالیں۔

جنّتوں کی تعداد میں نے سوال کیا کہ جنتیں کتنی ہیں۔

حضرت نے فرمایا: آٹھ ہیں۔

میں نے سوال کیا: پہلی جنت کونسی ہے؟

فرمایا: پہلی جنت دارالسّلام ہے۔ پھر جنت النعیم پھر جنت الماویٰ، پھر دارالخلد، پھر جنت عدن پھر جنت الفردوس، پھر جنت علیین، پھر دارالمزید۔

مؤلف کہتا ہے کہ علماء کی کسی تحریر میں جنتوں کی تحقیقی تعداد نہیں دی گئی جیسا کہ سیوطیؒ کی البدور السافرہ سے معلوم ہوتا ہے کیونکہ سیوطی نے بعض علماء کا قول نقل کیا ہے کہ جنتوں کی تعداد چار ہے اور بعض نے سات کہا ہے اور بعض نے ایک ہی کہا ہے اور ان کا آٹھ ہونا جنت کے آٹھ دروازوں کے عین مطابق ہے جیسا کہ بہت سی حدیثوں میں آیا ہے کہ ان کے لیے جنت کے آٹھوں دروازے کھول دیے جائیں گے۔ ملاحظہ ہو البدور السافرہ۔

جنّتوں کی ترتیب پھر فرمایا کہ جنتوں کی ترتیب ایسی نہیں جیسا کہ لوگوں کا خیال ہے کہ یہ ایک دوسرے کے اوپر کو ہی ہو سکتی ہیں بلکہ ایسا نہیں ہے ہر چھ جانب سے آٹھ ہی نظر آتی ہیں۔ لہٰذا جو بائیں جانب آئے گا تو اتنی ہی جنتیں پائے گا۔ دائیں طرف سے آئے گا تب بھی اتنی ہی ہوں گی یہی حال باقی جہتوں کا ہے اور آخرت کی بات دنیا کی سی نہیں۔ واللہ اعلم۔

ؑ مکمل نام البدور السافرہ فی امور الآخرہ ہے۔

جنّتوں کی کیفیت و وضع

پھر ایک بار میں نے حضرت سے جنتوں کی ترتیب اور کیفیت وضع کے متعلق سوال کیا۔

فرمایا: نہ روئے زمین پر اور نہ ہی اللہ کی مخلوقات میں کوئی ایسی چیز پائی جاتی ہے جس میں جنّت سے مشابہت پائی جاتی ہو۔ ہاں البتہ برزخ اور جنت میں کچھ مشابہت ہے مگر برزخ کو تو لوگوں نے دیکھا نہیں اس لیے اس کی مثال دینا کیسے صحیح ہوگا۔

میں نے عرض کیا: اس بنا پر کہ برزخ سنکھ ہے، ہم نے حدیثوں میں سنا ہے کہ یہ ایک سینگ کی شکل کی بہت بڑی مخلوق ہے جس کا ایک حلقہ آسمان اور زمین کے درمیانی فاصلہ کے برابر ہے۔

حضرت نے فرمایا: ہاں اور اس میں اسفنج کی طرح سوراخ ہوتے ہیں اور انہی سوراخوں میں روحیں ہوتی ہیں۔ پھر یہ سوراخ صرف بالائی سطح تک نہیں ہوتے بلکہ بہت گہرے چلے گئے ہیں۔ فرض کرلو کہ یہ سوراخ شہد کے چھتے کی طرح ہیں۔ پھر مثال کو اور آسان کرنے کی خاطر ہم اور چھتوں کو اس سے ملاتے جائیں یہاں تک کہ ان کی تعداد بیس ہو جائے اور ان کو ایک دوسرے سے اس طرح ملایا جائے کہ سب ایک بن جائیں چنانچہ مجموعہ کا بیرونی اور اندرونی حصّہ تمام کا تمام سوراخ ہی سوراخ ہوں اور پھر فرض کرلیں کہ چھتہ ایک پردہ سے ڈھنکا ہوا ہے کہ سوراخوں کے اندر کا شہد بالکل دکھائی نہیں دیتا۔ پس یہی مثال سمجھ لو۔

فرمایا: فرض کرو کہ جنت اس تمام مجموعہ کے برابر ہے۔ یہ محض سمجھانے کی غرض سے ہے ورنہ حقیقت میں اللہ کی رحمت اس قدر وسیع ہے کہ اس کی کوئی انتہا نہیں۔ پھر اس مجموعہ کے سات حصّے کئے جائیں تو پہلے حصّے کا ایک ٹکڑا دنیا بلکہ اس جیسی دس دنیا کے برابر ہوگا اور دوسرا حصّہ اس سے کئی گنا زیادہ ہوگا۔ تیسرا حصّہ اس سے بھی اس قدر زیادہ ہوگا کہ کوئی اس کا اندازہ نہیں کرسکتا۔ اور چوتھے حصّہ کے متعلق کسی کو علم نہیں کہ یہاں کے لوگوں کے لیے کس قدر فرحت و خوشی مخفی کر رکھی ہے چنانچہ یہاں ایسی چیزیں ہوں گی جو نہ کسی کے دیکھنے اور سننے میں کبھی آئیں اور نہ کسی کے خیال میں آئیں۔ پانچواں حصّہ تیسرے حصّہ جتنا ہے، چھٹا دوسرے جتنا اور ساتواں پہلے جتنا۔

پھر فرمایا: کہیں یہ خیال نہ کرنا کہ پہلے حصّہ کے رہنے والے دوسرے حصہ کے رہنے والوں سے کم درجہ کے ہیں، یا دوسرے حصّہ والے تیسرے حصّہ والوں سے کم درجہ ہیں وغیرہ وغیرہ۔ بلکہ پہلے حصہ کے بعض لوگ دوسرے حصہ والوں سے افضل ہیں۔

ایک بار یوں فرمایا کہ اللہ تعالیٰ مومن کو جنت کا اس قدر حصّہ عطا فرمائیں گے جتنا دنیا میں اوپر کے رُخ اس کے سر سے لے کر عرش تک ہے اور نیچے کے رُخ پاؤں سے لے کر عرش تک ہے اور

بسمت راست تا عرش اور بسمت چپ تا عرش اور یہ شخص رجسے اس قدر حصہ ملے گا) جنت میں سب سے ادنیٰ مرتبہ کا ہوگا۔

پھر فرمایا: کہیں یہ نہ خیال کر لینا کہ مذکورہ بالا مثال میں جنت کی صحیح اور پوری وضع بیان کی گئی ہے یا یہ کہ یہ مثال کسی حد تک اس کے قریب ہے بلکہ ان دونوں کے درمیان قطعاً کوئی مناسبت نہیں۔ میں نے تو یہ مثال اس لیے بیان کی ہے کہ لوگ اس سے مانوس ہو جائیں اس لیے کہ خاموش رہنے سے اسقدر بیان کر دینا بہتر تھا۔

پھر فرمایا کہ جنت میں ایک ہی تحت مختلف رنگوں کا دکھائی دیگا۔ چنانچہ کچھ رنگ چاندی کا سا ہوگا۔ کچھ سونے کا سا، کچھ سبز زمرد کا، کچھ مخمل کا سا، کچھ یاقوتِ احمر کا سا وغیرہ، دیگر رنگ جن کی کیفیت بیان نہیں ہو سکتی، مگر سب کی اصل ایک ہوگی نہ متعدد ہوگی اور نہ مختلف، چنانچہ تخت پر بیٹھا ہوا انسان اگر سیر کرنا یا ایک جگہ سے دوسری جگہ جانا چاہے گا تو اگر اس کی خواہش ہوگی تو تخت اسے لے جائیگا یا وہ خود جہات ستہ میں سے جس جہت میں چاہے گا چلا جائے گا۔ دنیا کے برخلاف کہ یہاں تو ہم صرف سامنے کی جہت میں چل سکتے ہیں مگر جنت میں اوپر، نیچے، دائیں، بائیں، پیچھے اور آگے جدھر چاہے گا چل سکے گا اور ہر شش جہات میں اس کے ہمسائے ہوں گے برخلاف دنیا کے کہ یہاں نہ ہمارے اوپر کی جانب کوئی گھر ہے اور نہ نیچے کی جانب۔

پھر فرمایا: جنت میں جسقدر نعمتیں اور پھل اور میوے ہیں۔ دنیا میں کوئی چیز بھی ان کے مشابہ نہیں پائی جاتی اور اگر جنت کی نعمتوں، وہاں کے میووں اور پھلوں کے نام ان کے انوار اور حقیقت کے مطابق رکھے جائیں تو لوگ ان کا مفہوم قطعاً نہ سمجھ سکیں۔ مگر اللہ تعالیٰ کا فضل و کرم ہے کہ اصل حقیقت سے نیچے اتر کر ان چیزوں کے وہ نام رکھے ہیں جن سے لوگ دنیا میں مانوس اور اپنی گفتگو میں ان سے واقف تھے لہٰذا جنت کے میوہ جات اور پھلوں کے متعلق انہی ناموں سے انہیں مخاطب کیا گیا تاکہ وہ انہیں کسی حد تک سمجھ سکیں اگرچہ ان کی حقیقت مختلف ہے۔ اس کی مثال ایسی ہے جیسے ہم اپنے بچوں سے انکی عقل و فہم اور ان کی صغرسنی و کمسنی کا لحاظ رکھکر ان سے باتیں کیا کرتے اور روٹی کو "ب" اور گوشت کو "شی" کہا کرتے ہیں لہٰذا جب ہم سنتے ہیں کہ جنت میں انگور ہوں گے تو ہم سمجھتے ہیں کہ وہ دنیا کے انگور کی طرح ہونگے اگر جنت الفردوس کے انگور کا ایک دانہ نکل کر ساتھ والی جنت میں آ جائے تو اس کا نور اس قدر ہو کہ اس جنت والے اپنی جنت کی اشیاء سے غافل ہو جائیں اور اسی طرح اگر ساتھ والی جنت کا ایک انگور کا دانہ نکلکر تیسری جنت میں آ جائے تو وہاں کے لوگوں کی بھی یہی حالت ہو۔ علیٰ ہذا القیاس۔ یہاں تک کہ

اگر آخری جنت کا ایک انگور کا دانہ نکال کر اہلِ دنیا یعنی ساتوں آسمان اور ساتوں زمینوں میں لایا جائے تو اس کے نور سے سورج، چاند اور تمام ستاروں کا نور ماند پڑ جائے گا اور صرف اسی کا نور اور روشنی باقی رہے گی۔ واللہ اعلم۔

نیز فرمایا کہ جنت کے دروازے بھی جنت کی تعداد کی طرح آٹھ ہیں اور یہ دروازے لوگوں کے جنت میں داخل ہونے سے پہلے موجود ہوں گے اور بعد میں معدوم ہو جائیں گے۔

میں نے عرض کیا شاید اس لیے کہ دروازے کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ لوگ اس سے اندر آ سکیں اور باہر نکل سکیں، لیکن وہاں سے نکلنا ہی نہ ہوگا جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے وَمَا هُم عَنْهَا بِمُخْرَجِينَ (جنتی جنت سے نکالیں نہ جائیں گے) سورۂ حجر آیت: ۴۸) تو پھر دروازے کا کوئی فائدہ نہ رہا۔ مگر آپ نے کچھ جواب نہ دیا۔ اس سے میں سمجھ گیا کہ اس میں کوئی اور راز ہے جسے آپ ذکر کرنا نہیں چاہتے۔

پھر فرمایا: جنت کے ہر دروازہ کے بالمقابل حاملینِ عرش کے آٹھ فرشتوں میں سے ایک فرشتہ کھڑا ہے۔

میں نے سوال کیا: اس میں کیا راز ہے؟

فرمایا: اس کا راز یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے نور سے ان آٹھوں فرشتوں اور آٹھوں جنتوں کو پیدا کیا ہے۔ پھر آٹھ قسموں میں تقسیم ہونے اور ہر قسم کو خاص اسرار سے مخصوص کرنے کے بعد ہر قسم میں سے ایک فرشتہ اور ایک جنت بنائی گئی۔ اس طرح اصل اور سر کے اعتبار سے دونوں میں مناسبت پائی گئی۔ اسی طرح دوسری قسم سے بھی ایک فرشتہ اور ایک جنت بنائی گئی اور ان میں بھی اصل اور سر کے اعتبار سے دونوں میں مناسبت پائی گئی۔ اسی طرح باقی چھ قسموں کا حال ہے یہی وجہ ہے کہ جنت کے ہر دروازہ کے سامنے ایک فرشتہ ہے جسے اس کے ساتھ مناسبت ہے۔ چنانچہ اس فرشتہ کو اس جنت کے نور سے سیراب کیا جاتا ہے۔

توبہ کا دروازہ

میں نے دریافت کیا: کیا توبہ کا وہ دروازہ جو سورج کے مغرب سے طلوع ہونے تک کھلا ہے جنت کے دروازوں میں سے ایک دروازہ ہے جیسا کہ بعض احادیث کے ظاہری الفاظ سے معلوم ہوتا ہے چنانچہ ابو یعلیٰ[1]، طبرانی، ابن ابی الدنیا[2] نے ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت کی ہے کہ جنت

---

[1] ابو یعلیٰؒ: احمد بن علی الموصلی مصنف مسند انہوں نے ۳۰۷ھ ۹۱۹ء میں وفات پائی۔

[2] ابن ابی الدنیا: محدث عالم صدوق ابوبکر عبداللہ بن عبید بن سفیان (بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر)

کے آٹھ دروازے ہیں، ان میں سے سات بند ہیں مگر ایک دروازہ توبہ کے لیے کھلا ہے حتیٰ کہ سورج اسی سے طلوع کریگا۔ البدور السافرہ میں سیوطی نے یہ حدیث دی ہے۔

حضرت نے اس کی تاویل کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا، نورِ ایمان بھی جنتوں میں سے ایک جنت ہے بلکہ یہ جنت میں ہر قسم کی نعمتوں کا سبب ہے بلکہ خود جنت کا سبب بھی ہے لہٰذا یہ نورِ ایمان ہر قسم کی خیر و سعادت کا سبب ہوا۔ اور چونکہ توبہ بھی ایمان میں (داخل ہونے) کا دروازہ ہے تو اس اعتبار سے توبہ بھی جنت کے دروازوں کا ایک دروازہ ہوئی۔ نیز یہ کہ جو شخص جنت میں جائے گا وہ ادنیٰ حالت سے اعلیٰ حالت کی طرف منتقل ہوگا اسی طرح توبہ میں داخل ہونیوالا بھی ادنیٰ حالت یعنی معاصی کی ظلمت سے منتقل ہوکر بلند حالت یعنی نورِ توبہ اور اطاعت کی بلند حالت میں منتقل ہوتا ہے لہٰذا اس اعتبار سے توبہ کو جنت کا ایک دروازہ کہا گیا۔

توبہ کے دروازے کے بند ہونے سے کیا مراد ہے

فرمایا: مغرب سے سورج طلوع ہونے کے وقت اس دروازے کے بند ہونے سے مراد دنیا اور دنیا کی مخلوق سے نورِ حق کا اُٹھ جانا ہے حدیث میں جو اَمْرُاللہ کا لفظ آیا ہے اس سے مراد بھی اسی نورِ حق کا اُٹھ جانا ہے چنانچہ ارشاد ہوتا ہے لَا تَزَالُ طَائِفَةٌ مِنْ اُمَّتِیْ ظَاهِرِیْنَ عَلَی الْحَقِّ حَتّٰی یَاْتِیَ اَمْرُاللّٰہِ (میری اُمّت کی ایک جماعت حق پر غالب رہے گی یہاں تک کہ امرِ الٰہی آئیگا) اور یہ جماعت اہلِ دائرہ اور تعداد والوں کی ہے اور ہر وہ شخص جس نے اس نور سے اپنا حصّہ لیا وہ اس کا حامل ہے اور انہی کی بدولت یہ نور روئے زمین پر قائم ہے۔ جب اللہ تعالیٰ اس کو زمین سے اُٹھانا چاہیں گے تو ان میں سے ایک شخص بھی باقی نہ رہے گا۔ اس لیے جب نور کا اٹھانے والا کوئی نہ ہوگا تو نور بھی اُٹھ جائے گا۔ حضرت نے اس کے علاوہ اور بھی فرمایا مگر (چونکہ) وہ اسرارِ الٰہیہ میں سے ہے (اسلیے اسے نہیں لکھا جاتا)

مؤلف کہتا ہے کہ حضرت نے اس حدیث کی تاویل میں جو کچھ فرمایا ہے اسی قسم کی تاویل شیخ عبدالرؤفؒ مناوی نے

(بقیہ حاشیہ صفحہ سابق) بن ابی الدنیا القرشی الاموی صاحب تصانیف ہیں۔ ۲۰۸ھ ۸۲۳ء میں پیدا ہوئے۔ خلفاء کی اولاد کو ادب سکھایا: انھوں نے ۲۸۱ھ ۸۹۴ء میں وفات پائی۔

---

[1] عبدالروفؒ مناوی: شیخ شمس الدین محمد معروف بعبدالرؤف مناوی الشافعی المتوفی ۱۰۳۱ھ ۱۶۲۱ء انھوں نے سیوطی کی الجامع الصغیر کی شرح کی ہے۔ پھر انہوں نے جامع الصغیر کی ایک اور ضخیم شرح لکھی جس کا نام فیض القدیر رکھا۔ ادغام اولیاء الشیطان بذکر اولیاء الرحمٰن بھی انہی کی تصنیف ہے۔

جامع الصغیر کی شرح میں ناصر الدینؒ بیضاوی سے نقل کی ہے اور اسی کو اس نے پسند کیا ہے۔ اگر اس تاویل کا حضرت کی تاویل سے موازنہ کیا جائے تو حضرت کی تاویل زیادہ صحیح اور زیادہ واضح معلوم دے گی۔ واللہ تعالیٰ اعلم۔

درود شریف کے پڑھنے سے جنّت میں وسعت پیدا ہوتی ہے

میں نے حضرت سے سوال کیا کہ کیا وجہ ہے کہ درود شریف کے پڑھنے سے تو جنت میں وسعت پیدا ہوتی ہے مگر تسبیح وغیرہ اذکار سے ایسا نہیں ہوتا۔

حضرت نے فرمایا: اس کی وجہ یہ ہے کہ جنت کی اصل نورِ محمدی ہے لہٰذا یہ اس نور کی اسی قدر مشتاق ہے جس قدر کہ بچہ کو باپ کی طرف اشتیاق ہوتا ہے۔ اسی لیے جب جنت آپکا ذکر سنتی ہے تو خوش ہو کر اس کی طرف لپکتی ہے اس لیے کہ جنّت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ہی سے سیراب ہوتی ہے۔ اس کے بعد آپ نے مثال دی کہ ایک جانور ہو جسے خوراک چارے اور جَو کی خواہش ہو اور اس کے پاس اس وقت جَو لائے جائیں جب اسے سخت بھوک لگی ہو لہٰذا جونہی کہ وہ جانور جَو کی بُو سونگھے گا تو اس کے قریب آئے گا اور اگر اس سے دور ہو گا تو اس کا پیچھا کرے گا تاآنکہ اسے حاصل کرے گا۔ یہی حال ان فرشتوں کا ہے جو جنت کے اطراف اور اس کے دروازوں پر مقرر ہیں۔ وہ ہر وقت نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ذکر اور آپ پر درود بھیجنے میں مشغول رہتے ہیں۔ اس سے جنت ان کی مشتاق ہو کر ان کی طرف جاتی ہے اور فرشتے تمام جنت کے اطراف میں ہوتے ہیں اس طرح جنت تمام جہات میں پھیل جاتی ہے۔

فرمایا: اگر اللہ تعالیٰ کا ارادہ نہ ہوتا اور اس نے جنت کو روکے نہ رکھا ہوتا تو جنت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی دُنیوی زندگی میں نکل کر آجاتی۔ آپ جہاں جاتے وہاں وہ بھی جاتی اور جہاں آپ رات گزارتے وہاں وہ بھی رات گزارتی مگر اللہ تعالیٰ نے اسے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف نکل کر جانے سے روک دیا تاکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان بالغیب حاصل ہو۔

فرمایا: جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کی اُمّت جنت میں چلی جائے گی تو جنت کو اس سے بہت خوشی حاصل ہو گی اور یہ ان کے لیے وسیع ہو جائے گی اور اسے انتہائی خوشی حاصل ہو گی، لیکن جب دیگر انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام اور ان کی اُمتیں جنّت میں داخل ہوں گی تو جنّت سکڑ جائیگی

---

[1] ناصر الدینؒ بیضاوی: مشہور مفسر قرآن جن کی تفسیر بیضاوی اب تک عربی مدارس میں پڑھائی جاتی ہے ان کی وفات ۶۸۵ھ = ۱۲۸۶ء میں ہوئی۔

اور اسے انقباض لاحق ہوگا چنانچہ وہ اس سے اس کا سبب پوچھیں گے تو جنت کہے گی میرا تم سے کوئی سروکار نہیں۔ آخر کار فیصلہ اس پر ہوگا کہ ان کے انبیاء آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے مدد طلب کریں گے تب جا کر جنت ان کے لیے بھی وسیع ہوگی۔

کیا ہر درود پڑھنے والے کا درود مقبول ہوتا ہے

علماء کے اس قول کے بارے میں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر درود یقیناً مقبول ہے۔ حضرت نے فرمایا کہ بیشک آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر درود بھیجنا سب سے افضل عمل ہے اور یہی ان فرشتوں کا ذکر ہے جو جنت کے اطراف میں ہیں اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر درود بھیجنے کی برکت یہ ہے کہ جس قدر درود کا ذکر کرتے ہیں اسی قدر جنت بھی وسیع ہوتی جاتی ہے اور فرشتے اس ذکر سے کبھی دم نہیں لیتے اس لیے جنت بھی وسیع ہوتی چلی جاتی ہے۔ فرشتے چلتے ہیں تو جنت بھی انکے پیچھے چلتی ہے اور جنت اس وقت وسیع ہونے سے رک جاتی ہے۔ جب مذکورہ فرشتے تسبیح پڑھنا شروع کرتے ہیں اور تسبیح پڑھنا بھی اسی وقت شروع کرتے ہیں جب جنت میں حق سبحانہٗ اہلِ جنت کو اپنی تجلی دکھائیں گے چنانچہ جب تجلی ہوگی اور مذکورہ فرشتے اس کا مشاہدہ کریں گے تو وہ تسبیح پڑھنا شروع کرتے ہی جنت وسیع ہونے سے رک جائے گی۔ اور ہر شخص اپنی اپنی جگہ پر بیٹھ جائیگا اگر فرشتے پیدا ہوتے ہی تسبیح میں لگ جاتے تو جنت بھی قطعاً وسیع نہ ہوتی۔ یہ محض آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر درود بھیجنے کی برکت ہے لیکن درود کا مقبول ہونا صرف ان لوگوں کے لیے یقینی ہے جن کی ذات طاہر اور دل پاک ہو۔ اس لیے کہ جب درود پاک ذات سے نکلتا ہے تو ہر قسم کے نقائص سے پاک نکلتا ہے مثلاً ریا، غرور اور نقائص بہت ہیں اور پاک ذات اور پاک دل کے اندر یہ عیوب و نقائص نہیں پائے جاتے، دیگر احادیث میں جو آیا ہے کہ مَنْ قَالَ لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ دَخَلَ الْجَنَّةَ (جس نے لا الہ الا اللہ کہا جنت میں گیا) اس کا مطلب بھی یہی ہے کہ جب پاک ذات اور پاک دل یہ کلمہ پڑھے گا تو خالص اللہ کے لیے پڑھے گا۔

پھر فرمایا کہ اس کے باوجود جب اللہ تعالیٰ کے سطوت اور غلبۂ قہر پر نظر جاتی ہے تو اس بات کی طرف نظر جاتی ہے کہ بندے کا دل اللہ کی دو انگلیوں کے درمیان ہے اسے جیسا چاہتا ہے پلٹ دیتا ہے اور جس جہت میں اللہ اسے پلٹتا ہے تو اس کے اعمالِ بد کو اس کے لیے مزین کر دیتا ہے یہاں تک کہ وہ یہ سمجھتا ہے کہ وہ پہلی حالت سے بہتر حال میں ہے۔ والعیاذ باللہ تو سمجھ جاتا ہوں کہ اللہ کے مکر سے صرف وہی لوگ بے خوف ہوتے ہیں جن کی دنیا اور آخرت دونوں خسارہ میں

ہوتی ہیں۔ واللہ تعالیٰ اعلم۔

مؤلف کہتا ہے کہ حضرت نے مقبولیتِ درود کے متعلق جو کچھ کہا ہے یہی یقینی امر ہے۔ یہی سوال ولی صالح محمدؒ بن یوسف السنوسی[1] سے بھی کیا گیا تھا اور سائل نے کہا تھا کہ اس نے ایک فقیہ کو یہ کہتے ہوئے سنا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر درود ہر حالت میں مقبول ہے اس پر شیخ محمد بن یوسف السنوسی نے جواب دیا تھا کہ یہی واقعہ ابواسحٰق شاطبی[2] شارح شاطبیہ[3] کو بھی پیش آیا۔ شیخ سنوسی کو اس میں شک گزرا کہ اگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر درود بھیجنے والے کے متعلق یہ قطعی طور پر کہہ دیا جائے کہ اس کا درود مقبول ہے تو پھر یہ بھی یقینی طور پر کہنا پڑے گا کہ اس کا خاتمہ اچھا ہوگا حالانکہ اس پر سب کا اتفاق ہے کہ کسی کے خاتمہ کا حال کسی کو معلوم نہیں۔ اس کے بعد شیخ سنوسی نے اس شبہ کے دو جواب دیئے ہیں جو دراصل دونوں عقلی احتمال ہیں ان پر کوئی شرعی دلیل نہیں

---

[1] محمد بن یوسفؒ السنوسی: ابوعبداللہ محمد بن یوسف بن عمر بن شعیب تلمسان کے رہنے والے ایک اشعری فقیہ ہیں۔ ان کی وفات تریسٹھ برس کی عمر میں ۸۹۵ھ ۱۴۹۰ء میں تلمسان میں واقع ہوئی۔ ان کی تصانیف میں العقیدہ الکبریٰ السنوسیۃ جسے عقیدہ اہل التوحید بھی کہتے ہیں اور ام البراہین میں انہوں نے خود عقیدۃ اہل التوحید کی شرح لکھی جس کا نام عمدۃ اہل التوفیق والتسدید فی شرح عقیدۃ اہل التوحید رکھا۔ انھوں نے ابوالعباس احمد بن عبداللہ الجزائری متوفی ۸۹۹ھ کی کفایۃ المرید کی بھی شرح لکھی ہے جس کا نام المنہاج السدید رکھا ہے۔ پھر لامیۃ فی الکلام کی شرح کی (کشف الظنون: ۲: ۲۰۳)

[2] ابواسحاقؒ شاطبی: مجھے کشف الظنون میں جہاں شاطبیہ کے شارحین کے نام دیئے ہیں، ابواسحٰق شاطبی کا نام نہیں ملا۔ شاطبیہ کی بہترین شرح برہان الدین ابراہیم بن عمر جعفری متوفی ۷۳۲ھ کی ہے (کشف الظنون ۱: ۳۲۸)

[3] شاطبیہ کا اصلی نام حرز الامانی ووجہ التہانی ہے۔ یہ سات قراءتوں کے متعلق ایک نظم ہے جو شاطبیہ کے نام سے مشہور ہے۔ اس کے ناظم ابومحمد قاسم بن فیرہ شاطبی ہیں۔ شاطبی نابینا تھے۔ انھوں نے قاہرہ میں ۵۹۰ھ ۱۱۹۳ء میں وفات پائی۔ دراصل یہ تیسیر فی القراآت السبع ہی ہے جسے شاطبی نے نظم کر دیا ہے۔ تیسیر کے مصنف امام ابوعمرو عثمان بن سعید بن عثمان الدانی متوفی ۴۴۴ھ ۱۰۵۲ء ہیں اور بعد میں امام شمس الدین محمد بن محمد بن الجزاری شافعی متوفی ۸۳۳ھ ۱۴۲۹ء نے اس میں تین اور قراءتوں کا اضافہ کر کے اس کا نام تحبیر التیسیر رکھا۔ (کشف الظنون: ج ۱: ۲۷۱) شاطبی مذکور نے قرآن مجید کے رسم الخط کے بارے میں ابوعمرو الدانی کی المقنع کو بھی نظم کیا ہے اور اس کا نام عقیلۃ اتراب القصائد فی اسنی المقاصد رکھا ہے۔

پیش کی جا سکتی اور کسی بات کا مقبول ہونا صرف شرع ہی سے معلوم ہو سکتا ہے، لہٰذا یہ دونوں جواب مقبول نہیں ہو سکتے۔

پہلا جواب: درود کا یقینی طور پر مقبول ہونے کا مطلب یہ ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے درود بھیجنے کے متعلق فیصلہ کر دیا کہ اس کا خاتمہ اچھا ہوگا تو وہ اللہ کے فضل سے یقینی طور پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر درود بھیجنے کی نیکی کو مقبول پائے گا۔ برخلاف اور نیکیوں کے کہ ان کے مقبول ہونے پر کوئی اعتماد نہیں کیا جا سکتا خواہ ان کے کرنے والے کا خاتمہ ایمان پر ہی کیوں نہ ہو۔

اس جواب پر یہ اعتراض وارد ہوتا ہے کہ یہ امتیاز ایک امر توقیفی ہے جس کا علم شریعت کے بغیر نہیں ہو سکتا لہٰذا ضروری تھا کہ اس بات کی کوشش کی جائے کہ صاحب شریعت کی طرف سے اس امتیاز کے لیے نص شرعی متعین کر دی جائے۔ اگر نص شرعی پائی جاتی تو بہتر ورنہ شریعت کے معاملات میں عقلیات کا کوئی دخل نہیں۔

دوسرا جواب: درود کے قطعی طور پر مقبول ہونے کا مطلب یہ ہے کہ جب کوئی مومن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے محبت رکھتے ہوئے درود بھیجے تو یہ درود یقیناً مقبول ہوگا اور درود بھیجنے والے کو آخرت میں اس سے فائدہ ہوگا۔ خواہ عذاب میں تخفیف کی صورت میں ہی کیوں نہ ہو۔ خواہ اللہ نے اسے ہمیشہ کے لیے عذاب دینے کا فیصلہ ہی کیوں نہ کیا ہو، اس کے بعد اس نے اس کا قیاس اس بات سے کیا ہے کہ ابولہب[1] کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت سے فائدہ ہوتا ہے اس طرح کہ ان کو انگوٹھے کے گڑھے سے پانی پلایا جاتا ہے اور پیر وار کے دن ان کے عذاب میں تخفیف ہوتی ہے اس لیے کہ اس نے اس لونڈی کو آزاد کر دیا تھا جس نے اس کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بشارت دی تھی۔ نیز اس بات پر بھی قیاس کیا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے محبت رکھنے کی وجہ سے ابوطالب[2] کو فائدہ ہوگا چنانچہ آخرت میں انہیں سب سے کم عذاب ہوگا اور اگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات نہ ہوتی تو وہ دوزخ کے بائیں حصہ میں ہوتے لہٰذا جب طبعی محبت کی وجہ سے جو کہ اللہ کی خاطر نہ تھی فائدہ ہوتا ہے تو پھر الحـ

---

[1] ابولہب: آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ایک چچا تھے انھوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت پر اس لونڈی کو جو آپ کی ولادت کی بشارت لے کر آئی تھی، آزاد کر دیا تھا۔ یہ تخفیف عذاب اسی وجہ سے ہے یہ ایمان لائے تھے بلکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو ایذا دیا کرتے۔

[2] ابی طالب: یہ بھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے چچا تھے

صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ایک مومن کی محبت اور درود کا کیا حال ہوگا۔ اس پر قیاس یہی تقاضا کرتا ہے کہ فائدہ ہو۔

اس میں بھی غور کا مقام ہے اس لیے کہ کتاب اور سنّت میں بہت سی نصوص پائی جاتی ہیں کہ کافر کے اعمال ضائع جائیں گے کیونکہ قبولیت کے لیے ایمان کا ہونا شرط ہے۔ لہٰذا اس نص سے ابوطالب اور ابولہب دونوں خارج ہوگئے لہٰذا ان دونوں پر قیاس نہیں ہو سکتا۔ اس لیے کہ مقیس علیہ کی شرط یہ ہے کہ قیاس کے طریقہ سے عدول نہ کیا جائے۔ جیسا کہ اصول کی کتابوں میں طے پا چکا ہے۔ چنانچہ حافظ سیوطی الدُّرَرُ الْمُنْتَثِرَۃُ فِی الْاَحَادِیْثِ الْمُنْتَشِرَہ میں حدیث عُرِضَتْ عَلَیَّ اَعْمَالُ اُمَّتِی فَوَجَدْتُ مِنْھَا الْمَقْبُوْلَ وَالْمَرْدُوْدَ اِلَّا الصَّلٰوۃَ عَلَیَّ فَاِنَّھَا مَقْبُوْلَۃٌ غَیْرُ مَرْدُوْدَۃٍ (مجھ پر میری امت کے اعمال پیش کئے گئے تو میں نے ان میں بعض اعمال کو مقبول پایا اور بعض کو نامقبول بجز مجھ پر درود پڑھنے کے کہ وہ مقبول ہی رہے، نامقبول نہیں۔ تَمْیِیْزُ الطَّیِّبِ مِنَ الْخَبِیْثِ فِیْمَا یَدُوْرُ عَلَی الْاَلْسِنَۃِ مِنَ الْحَدِیْثِ[1] کے مصنف کہتے ہیں کہ حدیث کُلُّ الْاَعْمَالِ فِیْمَا الْمَقْبُوْلُ وَالْمَرْدُوْدُ اِلَّا الصَّلٰوۃَ عَلَیَّ فَاِنَّھَا مَقْبُوْلَۃٌ غَیْرُ مَرْدُوْدَۃٍ کے متعلق ابن حجر فرماتے ہیں کہ یہ ضعیف حدیث ہے۔ سید سمہودی[2] اپنی کتاب اَلْغَمَّازُ عَلَی اللَّمَّاز میں اس حدیث پر بحث کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ حدیث کُلُّ الْاَعْمَالِ فِیْھَا الْمَقْبُوْلُ وَالْمَرْدُوْدُ اِلَّا الصَّلٰوۃُ عَلَیَّ فَاِنَّھَا مَقْبُوْلَۃٌ غَیْرُ مَرْدُوْدَۃٍ کے متعلق ابن حجر کہتے ہیں کہ یہ ضعیف حدیث ہے۔ تمییز کے مصنف بھی یہی کہتے ہیں کہ الصلوٰۃ علی النبی صلی اللہ علیہ وسلم لَا تُرَدُّ (آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر جو درود بھیجا جائے وہ ردّ نہیں ہوتا) یہ دراصل ابوسلیمان دارانی[3] کا کلام ہے۔ غزالی نے احیاء میں اسے مرفوع حدیث کے طور پر بیان کیا ہے مگر ہمارے شیخ فرماتے ہیں کہ مجھے اس حدیث کا پتہ نہیں چلا۔ یہ صرف ابوالدرداءؓ[4] کا قول ہے چنانچہ

---

[1] اس کتاب کے مصنف شیخ عبدالرحمٰن بن علی شیبانی شافعی ہیں جو ربیع زبیدی کے نام سے مشہور ہیں انھوں نے ۹۴۴ھ؍۱۵۳۷ء میں وفات پائی۔ یہ کتاب دراصل مقاصد حسنہ مؤلفہ سخاوی کی تحریر ہے جس کا ذکر آگے آتا ہے (کشف الظنون ۲: ۳۰۱)

[2] سید سمہودیؒ: نورالدین علی بن عبداللہ سمہودی متوفی ۹۱۱ھ۔ ان کی کتاب الغماز علی اللماز موضوع حدیثوں کے متعلق ہے اور دیگر تصانیف بھی ہیں۔

[3] ابوسلیمانؒ دارانی: ابوسلیمان عبدالرحمٰن بن عطیہ دارانی متوفی ۲۱۶ھ۔ ان کا ذکر پہلے آچکا ہے۔

[4] ابوالدرداءؓ: عویمر بن زید اصلی نام تھا۔ مشہور صحابی ہیں۔ درداء ان کی بیٹی کا نام تھا یہ کچھ دیر میں ایمان لائے اور اپنے کنبہ میں آخری ایمان لانیوالے ہیں لیکن انکا اسلام اچھا تھا۔ دمشق میں ۳۲ھ؍۶۵۲ء میں وفات پائی۔

وہ کہتے ہیں جب تم اللہ سے کوئی دعا مانگو تو پہلے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر درود بھیجو اس لیے کہ اللہ تعالیٰ اس سے زیادہ کریم ہے کہ اس سے دو حاجتیں طلب کی جائیں تو ایک کو تو پورا کر دے اور دوسری کو رد کر دے۔ الخ۔ انھوں نے اپنے جس شیخ کی طرف اشارہ کیا ہے وہ ابوالخیر شمس الدین محمد بن عبدالرحمٰن بن محمد السخاویؒ ہیں جو اَلْمَقَاصِدُ الْحَسَنَةُ فِی بَیَانِ کَثِیْرٍ مِنَ الْاَحَادِیْثِ الدَّائِرَةِ عَلَی الْاَلْسِنَةِ کے مصنف ہیں۔

جب تو یہ بات سمجھ جائے تو تجھے معلوم ہو جائے گا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر درود پڑھے جانے کے قطعی طور پر مقبول ہونے کی کوئی دلیل نہیں ہاں البتہ اس کے مقبول ہونے کی زیادہ امید کی جا سکتی ہے اور جن اعمال کی قبولیت پر ظن غالب کیا جا سکتا ہے ان میں درود شریف سب سے پہلے آتا ہے۔ واللہ تعالیٰ اعلم۔

اہلِ جنّت کا لباس

میں نے حضرت کو اہلِ جنّت کے لباس کے متعلق فرماتے سنا کہ یہ نہ تو فنا ہوگا اور نہ اسے اتار کر پھینکا جائے گا اور ایک ہی گھڑی کے اندر ایک شخص ستر ہزار لباس پہن لے گا۔ میں نے سوال کیا کہ جب انہیں پھینکے گا نہیں تو پھر وہ اپنے لباسوں کا بوجھ کیسے برداشت کرے گا۔ فرمایا کہ یہ لباس نور کے لباس ہوں گے لہٰذا نور ہی آئیں گے اور نور ہی جائیں گے فرمایا: ذات کی نظر جنت میں محدود نہ ہوگی اس لیے کہ جنت میں اللہ کی نعمتیں غیر محدود ہوں گی لہٰذا جب ذات ایک نعمت کی طرف دیکھے گی تو محض اس کے دیکھنے سے دوسری پھر تیسری پھر چوتھی وغیرہ نعمتیں حاصل ہو جائیں گی اور ذات ہر نگاہ سے حظ حاصل کرے گی اس لیے کہ نعمتیں مختلف ہیں۔ پھر آپ نے ایک بہت بڑے آئینہ کی مثال دی کہ فرض کرو کہ ہمارے سامنے ایک بڑا آئینہ پڑا ہو اور ہم اس میں دیکھیں تو ہمیں تعجب ہوگا اس لیے کہ وہ بہت بڑا ہے کہ انسان کھڑا ہو جائے تو اس کا تمام جسم دکھائی دے۔ اسی لیے ہمیں زیادہ تعجب ہوگا۔ پھر اگر اسی قسم کا دوسرا آئینہ دیکھیں تو تعجب نہ ہوگا مگر کوئی اور آئینہ پہلے سے مختلف دیکھیں تو اس پر بھی ہمیں تعجب ہوگا جس طرح کہ پہلے کو دیکھ کر تعجب ہوا تھا اور جنت میں ہر چیز ایک دوسرے سے مختلف دکھائی دے گی۔

مگر اولیاء اللہ کا اس میں اختلاف ہے کہ اگر ہم پہلی نعمت کی طرف دوبارہ دیکھیں گے تو کیا وہ پہلی ہی حالت پر دکھائی دیگی یا نہیں۔

۱؎ ابوالخیر شمس الدین بن محمد بن عبدالرحمن بن محمد السخاوی: مصنف کشف الظنون نے انہیں ابو عبداللہ محمد بن عبدالرحمٰن سخاوی لکھا ہے انہوں نے ۹۰۲ھ ۱۴۹۶ء میں وفات پائی۔

ایک مرتبہ حضرت نے گفتگو فرماتے ہوئے کہا کہ جنت میں بعض اہل جنت کو حزن و غم اور افسوس بھی لاحق ہوگا۔ اس وقت ایک عالم بھی وہاں بیٹھے تھے اور انہوں نے اس کا انکار کرتے ہوئے کہا کہ جنت میں افسوس و حسرت نہ ہوگی اس پر میں نے اس عالم سے کہا کہ آپ انکار نہ کریں کیونکہ حضرت نے جب کبھی بھی کوئی بات کہی ہے تو میں نے اس کے متعلق نص شرعی ضرور پالی ہے خواہ خاص اسی بات کے متعلق ہو خواہ عام یا اس کی نظیر اور میں حضرت کو پانچ سال آزما چکا ہوں۔ پھر میں نے اس عالم سے کہا کہ جس بات کا آپ انکار کر رہے ہیں اس کے متعلق نص شرعی موجود ہے اور الحمد للہ مجھے وہ نص بھی یاد آگئی۔ حالانکہ ہم سفر کر رہے تھے لہٰذا میں پہلے جو کچھ حضرت نے فرمایا وہ بیان کرتا ہوں پھر اس کی شرعی دلیل پیش کروں گا۔ حضرت نے فرمایا: یہ فقیہ صاحب کیوں انکار کر رہے ہیں۔ اہلِ جنت جب جنت میں جائیں گے تو حمد و ثنا کا نور ان کی زبانوں پر چمکتا ہوگا اور یہ نور اسی قدر ہوگا جس قدر دنیا میں انہیں اپنے رب کی معرفت حاصل ہوگی لہٰذا جب وہ جنت میں داخل ہوں گے اور انہیں جس قدر دنیا میں اللہ کی معرفت حاصل تھی اس سے بدرجہا زیادہ اللہ کی معرفت حاصل ہوگی تو سب کے سب اس بات پر نادم ہوں گے کہ انہوں نے اللہ تعالیٰ کی خدمت اور عبادت میں کوتاہی کی۔ حضرت نے فرمایا: یہ بات قیامت میں ہوگی اور سچ ہے اس میں کسی قسم کا شک و شبہ نہیں۔

پھر فرمایا: بالخصوص زانیوں کے ساتھ ایک اور بات پیش آئے گی کہ جب وہ جنت میں جائیں گے اور حق سبحانہ اپنی تجلّی دکھائیں گے اس وقت جب ان کو علم ہوگا کہ ہم کس رذیل حالت میں اللہ سے ناواقف تھے اور ذات حق کس درجہ جلالت و عظمت و کبریائی و سطوت والی ہے تو نادم ہوں گے اور شرمسار ہوں گے یہاں تک کہ مدت تک وہ بیہوش رہیں گے۔ اس وقت جن کو اللہ تعالیٰ نے معصیتِ زنا سے محفوظ رکھا تھا وہ ایک دوسرے سے کہیں گے کہ اس وقت اللہ تعالیٰ نے ہمیں اپنی تمام نعمتوں سے نوازا ہے۔ پھر جب بیہوش ہوش میں آئیں گے تو حق تعالیٰ کی طرف سے ان کو ایسی قوت اور کمال معرفت عطا کی جائے گی جس کی کیفیت بیان نہیں کی جا سکتی۔ اس سے حضرت نے جنّت میں حسرت کے پائے جانے پر استدلال فرمایا:

مولّف کہتا ہے کہ اس کی نص شرعی بھی پائی جاتی ہے چنانچہ حافظ سیوطی نے البدور السافرہ باب تَحَسُّرُ اَهْلِ الْجَنَّةِ عَلٰى تَرْكِ الذِّكْرِ (ترکِ ذکر پر اہلِ جنت کا حسرت کرنا)

کا الگ باب باندھ کر لکھا ہے کہ طبرانی اور بیہقی[1] نے عمدہ اسناد سے معاذ[2] بن جبل سے روایت کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اہلِ جنت کو اگر افسوس ہوگا تو صرف اس گھڑی پر ہوگا جو دنیا میں بغیر ذکر الٰہی کے گزری ہوگی۔ احمد، ترمذی، ابن حبان اور حاکم نے ابوہریرہؓ سے روایت کی ہے اور اسے صحیح قرار دیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جس مجلس میں نہ اللہ کا ذکر ہو اور نہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر درود پڑھا جائے وہ مجلس قیامت کے دن ان لوگوں کے لیے حسرت کا سبب ہوگی۔ اگرچہ وہ اپنے اعمال کے ثواب میں جنت میں داخل ہوں گے نیز بیہقی اور ابن ابی الدنیا نے حضرت عائشہؓ سے روایت کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ہر وہ گھڑی جس میں انسان اللہ کا ذکر نہیں کرتا وہ گھڑی اس کے لیے قیامت کے دن حسرت کا سبب بنے گی۔ ان تمام احادیث کا ذکر حافظ سیوطی نے اس باب میں کیا ہے۔

نیز سیوطی نے اہلِ جنت کے لباس کے باب میں ذکر کیا ہے کہ طیالسی نے صحیح اسناد سے اور نسائی، ابن حبان اور حاکم نے ابوسعیدؓ خدری سے روایت کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جس شخص نے دنیا میں ریشم پہنا آخرت میں اسے نہ پہنے گا اور اگر وہ جنت میں داخل ہوگا تو دوسرے اہلِ جنت ریشم پہنے ہوں گے مگر یہ اس کے بغیر ہوگا۔ ایک اور جگہ سیوطی نے کہا ہے کہ شیخین نے ابن عمرؓ سے روایت کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جس نے دنیا میں شراب پی اور اس کے بعد اس سے توبہ نہ کی تو قیامت میں اسے اس سے محروم کر دیا جائے گا اس باب میں احادیث بہت ہیں ہم اتنے پر ہی اکتفا کرتے ہیں اس لیے کہ اصل غرض تو حضرت کا کلام جمع کرنا ہے۔ خدا اس سے راضی ہو اور ہمیں ان سے فیضیاب کرے۔

حضرت نے فرمایا کہ مومن اپنے ذہنوں میں نعمتوں کا خیال کریں گے اور ان کے دلوں پر ان کا ذکر جاری ہوگا تو جنت سے خوش ہوں گے مگر دلی کے خیالات غیر اللہ سے منقطع ہوں گے۔ اس سے یہ

---

[1] بیہقی: ابوبکر احمد بن الحسین البیہقی علم حدیث میں یکتائے روزگار تھے اور ابو عبداللہ حاکم کے بڑے شاگردوں میں تھے نیشاپور میں ۳۸۴ھ / ۹۹۳ء میں پیدا ہوئے اور ۴۵۸ھ / ۱۰۶۴ء میں چھہتر برس کی عمر میں وفات پائی۔

[2] معاذؓ بن جبل: ابوعبداللہ معاذ بن جبل انصاری صحابی ہیں۔ عقبہ ثانیہ میں موجود تھے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں قاضی اور معلم بنا کر یمن بھیجا تھا۔ ایک قول کے مطابق یہ اٹھارہ برس کی عمر میں ایمان لائے تھے ابو عبیدہؓ بن الجراح کے بعد حضرت عمرؓ نے انہیں شام کا حاکم مقرر کیا تھا اور اسی سال عمواس کی طاعون میں ۱۸ھ / ۶۳۹ء میں ان کی وفات ہوئی۔

مراد نہیں کہ اس کا ذہن غیر اللہ کی طرف جائے گا مگر وہ اسے ادھر سے ہٹائے گا بلکہ مراد یہ ہے اللہ تعالیٰ نے ان کی عقلوں میں غیر اللہ کا خیال نہ پیدا کیا ہے اور نہ پیدا کرے گا اسی وجہ سے تو انہیں اللہ کا ولی کہا جاتا ہے کہ وہ غیر اللہ سے تعلقات منقطع کر چکے ہوتے ہیں۔ حضرت کے ان الفاظ کا مقصد لوگوں کو اللہ پر جمع کرنا اور اللہ کی طرف راہنمائی کرنا ہے اور بندے کی ہمت کو بلند کرنا ہے تاکہ وہ نعمتوں میں مشغول ہو کر انعام کرنے والے کو نہ بھول جائے بلکہ بندے کے لیے ضروری ہے کہ وہ اپنے مُنعم کی طرف دھیان دے اور اس کے سامنے گریہ وزاری اور عاجزی کرے۔ مومن بندہ کا یہی حال ہونا چاہیئے اور اگر اس کی نظر نعمت کی طرف جائے تو اس غرض سے جائے کہ یہ اس کی اللہ سے محبت پیدا کر دے گی اور وہ اقرار کرے گا کہ یہ اللہ کی طرف سے ہے لہٰذا وہ اس نعمت کو اسی نظر سے دیکھے اور اس سے قبل وہ اپنے اپنے آقا اور خالق کے ساتھ رہے گا۔ حتی کہ فرض کرو کہ یہ نعمت مفقود ہو جائے یا اس کا اصلا وجود ہی نہ ہوتا تو پھر بھی دل کی توجہ اپنے آقا ہی کی طرف لگی رہتی اور وہ اس کی توحید کے سمندروں اور الوہیّت کے اسرار میں مستغرق رہتا لہٰذا نعمت کا وجود اور عدم وجود خالق سے اس کی توجہ کو نہ ہٹا سکتا۔ اسی لیے حضرت فرمایا کرتے تھے جب ولی کو اپنے مولیٰ سے مراد مل جاتی ہے تو پھر اسے پروا نہیں ہوتی کہ اللہ تعالیٰ اسے کہاں رکھتا ہے اس کے بعد مثال بیان فرمائی کہ جیسے شہد کا کیڑا جو اپنے تمام اجزاء اور رگوں سے شہد کھانے کی طرف لگا ہوا ہو اگر اسے شہد کے مٹکے میں ڈال دیا جائے کہ اس کو اپنے مطلوب سے اتصال نصیب ہو جائے اور وہ دن رات اسے کھانے میں لگا رہے تو پھر اس شہد کے مٹکے کو جس میں کیڑا پڑا ہے چاہے اس سے بڑے مٹکے میں بھی ڈال دو جو رال سے بھرا ہوا ہو تو اس کیڑے کو اس کی کچھ پروا نہ ہوگی اور اس کے دل پر شہد کے سوا نہ کوئی خیال گزرے گا اور نہ رال کی بو یا کسی اور چیز سے اس کا شہد مکدر ہوگا کیونکہ اس کی ذات ہمہ تن شہد کی طرف لگی ہوئی ہوگی اور تمام دیگر اشیاء سے بے تعلق ہوگی۔ اس لیے رال کی طرف اس کا دھیان بھی نہ جائے گا چہ جائیکہ اس سے تکدّر پیش آئے۔ واللہ اعلم۔

بارھواں باب!

جہنّم کا بیان

فرمایا: دوزخیوں کو وہ درخت اور نہریں جو ان کے قریب ہوں گی دکھائی نہ دیں گی بلکہ ان کو صرف وہی درخت اور نہریں دکھائی دیں گی جو ان سے اس قدر بعید مسافت پر ہوں گی جس قدر ساتوں زمینوں کی مسافت ہے تاکہ ان کے لیے عذاب پر عذاب ہو۔ لہٰذا جہنّم میں اس قدر بعید مسافت کے باوجود انہیں درختوں کی سی صورت دکھائی دیگی جن کو ہرے بھرے پتے اور پھل لگے ہوں گے لہٰذا وہ ان کی طرف دوڑ کر جائیں گے تاکہ ان کا پھل کھا کر اور ان سے قریب ہو کر عذاب کو دور کر سکیں چنانچہ وہ اس قدر مسافت کو جلدی سے تین قدموں میں طے کر لیں گے اور اس درخت کے پھل اور پتوں کو لیکر منہ میں ڈالیں گے

فرمایا: جنّت یا جہنم میں جو چیز منہ میں ڈالی جائے گی بندہ اسے منہ سے نہ نکال سکے گا جیسا کہ ہم دنیا میں کر سکتے ہیں۔ لہٰذا جب پھل یا پتا ان کے منہ میں جائے گا تو یہ ان کے لیے پہلے عذاب سے بھی زیادہ سخت ہو گا اور یہ پچھلے پاؤں واپس لوٹیں گے اور مذکورہ بالا مسافت کو ڈیڑھ قدم میں طے کر لیں گے اس جلن کی وجہ سے جو وہ محسوس کر رہے ہوں گے، واللہ اعلم۔

نیز فرمایا کہ جہنم کی آگ دنیا کی آگ کی طرح شعلوں والی نہ ہو گی اس لیے کہ کچھ مدت کے بعد جسم شعلہ زن آگ سے مانوس ہو جاتا ہے اور وہ آگ سے تکلیف محسوس نہیں کرتا اس لیے وہ اس کے لیے عذاب نہیں رہتا مگر جہنّم کی حالت ہمہ تن ظلمت ہے اور اگر جہنّم میں سے ایک کھجور کے تنکے کے برابر تاریکی نکال لی جائے اور اسے ہوا میں پھیلا دیا جائے یہاں تک کہ اس طرح پھیلنے سے دھوئیں کی طرح ہو جائے تو اس میں سے روشنی اور شعلے ظاہر ہو جائیں گے۔

پھر فرمایا: اگر ہم دنیا کو آگ سے بھر دیں پھر یہ فرض کر لیں کہ اسے بھینچ دیا جائے اور اسقدر بھینچا جائے کہ صندوق جتنی رہ جائے تو اس وقت یہ خالص سیاہی اور تاریکی بن جائے گی۔

پھر فرمایا کہ جہنّم میں کئی وادیاں ہوں گی۔ ایک جہنمی عورت شدت پیاس کی وجہ سے اپنے بیٹے

کو میٹھ پر اٹھائے اس وادی کی طرف جائے گی جس کی مسافت کا ذکر ہو چکا ہے، لیکن جب وادی میں پہنچکر اس کا گھونٹ پئے گی تو وہ اسے اس کے بچے سمیت جھلس ڈالیگا۔

مؤلف کہتا ہے کہ حضرت نے اس بچے کے متعلق یہی فرمایا تھا مگر میں نے ان سے بچہ کے متعلق دریافت نہیں کیا کہ آیا اس کی ولادت جہنم میں ہوگی۔ کیا وہاں بھی تناسل کا سلسلہ جاری ہوگا یا وہ دنیا کی اولادیں سے ہوگا۔ اگر یہ بچہ دنیا کی اولادیں سے ہوگا تو آپ جانتے ہیں کہ کفار کی اولاد کے بارے میں علماء میں اختلاف پایا جاتا ہے چنانچہ حدیث میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے وارد ہوا ہے کہ آپ نے ایک سوال کے جواب میں فرمایا: اللہ بہتر جانتا ہے کہ (اگر یہ زندہ رہتے تو) کیا کرتے۔ اور امام مالک رحمہ اللہ نے بھی اسی قول کو اختیار کیا ہے اس بنا پر جس بچہ کے متعلق اللہ کو علم ہوگا کہ اگر بڑا ہوتا تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لاتا وہ جنت میں جائے گا اور اسی پر حضرت جابرؓ بن سمرہ کی وہ حدیث محمول کی جائیگی جس میں آیا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے خواب میں بعض کافروں کے بچوں کو جنت میں دیکھا۔ اور جس بچہ کے متعلق علم الٰہی میں یہ ہوگا کہ اگر بڑا ہوتا تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کا انکار کرتا تو وہ دوزخ میں جائے گا۔ اس حدیث کو اسی پر محمول کیا جائے گا۔ خضرؑ نے جس بچہ کو صغرسنی میں قتل کیا تھا اس قصّہ کو بھی اسی پر مرتب کیا جائے گا۔ اسی لیے علماء نے کہا ہے کہ باوجود بچہ ہونے کے اس کی سرشت ہی کفر پر واقع ہوئی تھی۔ خدا اپنی پناہ میں رکھے۔

میں نے حضرت سے اس مسئلہ کے متعلق سوال کیا تو فرمایا کہ صحیح بات تو وہی ہے جس پر یہ حدیث دلالت کرتی ہے اور پھر کہا کہ بہت سے بچے کم سنی میں مرجاتے ہیں مگر قیامت کے دن ان کا حشر قرآن کے حافظوں میں ہوگا اس لیے کہ اللہ تعالیٰ کو معلوم تھا کہ اگر یہ بچہ زندہ رہتا تو کتاب اللہ کا قاری ہوتا اس لیے قاریوں میں اسے اٹھایا جائیگا اور بہت سے بچے کم سنی میں مرجاتے ہیں اور ان کو علماء اور اولیاء کے زمرہ میں اٹھایا جائے گا۔ اس لیے کہ اللہ تعالیٰ کو معلوم ہے کہ اگر یہ بچہ بڑا ہوتا تو انہی میں سے ہوتا۔

مؤلف کہتا ہے کہ ہمارے ایک ساتھی سے قصّہ پیش آیا۔ وہ سن بلوغ کے قریب پہنچ چکا تھا اور قالونؒ[1] یا ابن کثیرؒ[2] کی روایت کے مطابق قرآن مجید پڑھا کرتا تھا۔ پھر وہ ولی صالح الویعزیؒ[3] کے پاس اس نیت سے گیا

---

[1] قالونؒ: ان سے نافع نے قراءت کی روایت کی ہے ان کا طریق روایت ابی نشیط ہے۔

[2] ابن کثیر: ان کا ذکر شروع کتاب میں آچکا ہے۔

[3] الویعزی: یہاں پر مصنف کے کوئی ہمعصر بزرگ مراد ہیں۔ قدماء میں ایک بزرگ الویعزی مغربی چھٹی صدی ہجری کے بڑے ولی ہوئے ہیں۔

کہ قرآن مجید ساتوں قراءتوں سے پڑھنا سیکھے اور اس میں اس کی نیت نیک اور پختہ ارادہ تھا۔ چنانچہ اس نے حضرت ابو یعزی سے بڑے الحاح کے ساتھ درخواست کی اور عرض کیا حضرت میں تین دن کی مسافت طے کرکے آیا ہوں اور میری صرف یہی ایک درخواست ہے لہٰذا آپ مجھے مایوس نہ کریں۔ ابھی وہ بات کر ہی رہا تھا کہ اس کی آنکھ لگ گئی اور کیا دیکھتا ہے کہ ابو یعزی پاس کھڑے ہیں اور ان کے ہاتھ میں ایک اجازت نامہ کی تحریر ہے جیسی سات قراءتوں کے پڑھنے پڑھانے والے بلادِ مغرب میں لکھا کرتے ہیں اور اس پر دیگر علماء اور قراء کی شہادت بھی تھی کہ یہ زیارت کنندہ سات قراءتوں سے قرآن پڑھنے والوں میں سے ہے اور سات قراءتوں کا حافظ ہے۔ پھر شیخ ابو یعزی نے کہا یہ لے اجازت نامہ اور اب تو سات قراءتوں کے حافظوں میں سے ہے ابھی زیارت کرکے واپس ہی آیا تھا کہ بیمار ہوا اور مر گیا اور اپنی قراءت میں کچھ اضافہ نہ کر سکا۔ اس کے باپ نے مجھ سے خواب کی تعبیر پوچھی تو میں نے جواب دیا کہ قیامت کے دن سات قراءتوں کے حُفاظ کے زمرہ میں اٹھایا جائے گا۔ یہ سنکر اس کا باپ بہت خوش ہوا اور اس کا غم جاتا رہا۔ واللہ اعلم۔

ملاحظہ ہو حافظ ابن حجر کی فتح الباری کی کتاب الجنائز اور حافظ سیوطی البدور السافرہ تاکہ تجھے کافروں کی اولاد کے متعلق محدثین اور علماء کی رائے معلوم ہو جائے۔ واللہ اعلم۔

پھر فرمایا: ہر شخص جو دوزخ کے پاس سے گزرے گا خواہ مومن ہو خواہ کافر، دوزخ کے داروغہ مالک کو دیکھ سکے گا مگر مومن جب اسے دیکھے گا تو اسے علم ہو گا کہ وہ مومنین کے سِرِّ ایمان سے پیدا کیا گیا ہے اس لیے اس سے نہیں ڈرے گا، لیکن کافر رعب سے ہی مرے گا، واللہ اعلم۔

نیز فرمایا: کہ ادنیٰ ترین کافر کے لیے بھی جہنّم اس قدر وسیع ہو گا جس قدر تمام دنیا اور اس جیسی دس اور دنیائیں۔

میں نے عرض کیا: پھر اس کی تنگی کیسے ہو گی؟

فرمایا: انہیں تنگی اس عذاب کی وجہ سے ہو گی جو انہیں گھیرے میں لیے ہو گا۔

میں نے عرض کیا، کسی شخص کو اپنے گھر میں دن رات پیٹا جائے پھر بھی اس کو وسعت کا علم ہو کر ایک گونہ راحت ملے گی اور اس کا قلق و اضطراب اس شخص جیسا نہ ہو گا جسے نیزے کی نوک جتنے مکان میں دن رات زدوکوب کیا جائے۔

فرمایا یہ اس لیے ہے کہ یہ ہوا اس کے لیے عذاب ہی نہیں ہے۔ برعکس اس کے جہنّم کی آگ خالص آگ ہے جس سے وہ ظاہر میں بھی عذاب میں مبتلا ہو گا اور باطن سے بھی۔ اس میں اس کے تڑپنے کی یہ

حالت ہوگی جیسے مرغی کو ذبح کرکے چھوڑ دیا جائے اور تڑپتی پھرے۔ غرض وہ کبھی فریاد کرینگے اور چیخیں گے اور اگر کوئی مومن اس حالت میں ان کے پاس سے گزر جائے اور جب وہ فریاد کر رہے اور چلاّ رہے ہوں، ان کی آواز سن لے تو اس کے تمام حواس معطّل ہو جائیں مگر انہیں اس سے دوری اور عذاب میں اضافہ ہی ہوگا اس لیے کہ آگ کی قوت اور شعلوں میں اضافہ ہوگا بعینہٖ اس طرح جس طرح کوئی انگیٹھی میں سے جلتی ہوئی لکڑی لیکر اس کے انگاروں اور راکھ کو جھاڑ دے تو اس میں ان لکڑیوں کی آگ اور شعلہ زن ہوگی۔ واللہ اعلم۔

پھر فرمایا کہ جہنّم میں بھی مکانات، محلاّت، دروازے، درخت، باغات اور وادیاں ہوں گی جس طرح کہ دنیا کے شہروں میں ہوتا ہے۔ صرف اتنا فرق ہے کہ جہنّم کا کوئی ٹکڑا یا اس کے گھروں اور محلّوں وغیرہ کا کوئی جزو بھی لیا جائے تو یہ خالص آگ اور عذاب ہوگا چنانچہ یہ گھر محل، درخت اور وادیاں تمام کی تمام خالص آگ کی ہیں۔ اگر ان کا ایک جزو بھی دنیا میں آجائے تو تمام دنیا کو جلا دے۔

پھر فرمایا: دنیا میں کوئی انسان اعمال (بد) کرتا ہے جن کی وجہ سے اس کے لیے جہنّم میں محل بنا دیے جاتے ہیں مگر جب ان اعمال سے دل سے توبہ کرتا ہے اور اللہ اسے قبول کر لیتا ہے تو یہ محل جو اس کے لیے جہنّم میں بنائے گئے تھے مٹا دیے جاتے ہیں اور ان کے عوض جنّت میں محل بنا دیے جاتے ہیں۔

حکایت

حضرت نے ایک حکایت بیان فرمائی کہ ایک مومن عورت حاملہ تھی اور اس کے پیٹ میں جو بچہ تھا وہ غوثِ زمان ہونے والا تھا اور اس کے پڑوس میں شادی کی تقریب تھی اور وہ عورت تفریح کے طور پر ان کے ہاں چلی گئی۔ اتفاق سے دلہن کا کوئی قیمتی کپڑا کسی نے چرا لیا اور اس مومنہ پر اس کے چرانے کی تہمت لگا دی گئی اور گھر والوں نے اسے گھر واپس جانے سے روک دیا اس عورت کا خاوند سیّد زادہ تھا۔ وہ اتنا بھی پسند نہ کرتا تھا کہ وہ گھر کے دروازہ سے باہر قدم رکھے۔ چہ جائیکہ پڑوسیوں کے ہاں جائے۔ پھر وہ شخص غیرت مند بھی تھا۔ اس لیے عورت کو ڈر ہوا کہ جب خاوند کو خبر ہوگی کہ میں گھر سے باہر نکلی تھی تو میری کیا شامت آئے گی چہ جائیکہ میری طرف چوری کو منسوب کیا جائے۔ پھر اس پر مزید یہ کہ اسے گھر میں قید بھی کر دیا گیا ہو۔ اس سے اسے اس قدر خوف لاحق ہوا کہ اس کا علم خدا کے سوا کسی کو نہیں۔ جس کی وجہ سے حمل کو بھی نقصان پہنچا۔ اس لیے اس جھوٹا الزام لگانے والی عورت کے لیے جہنّم میں محل تعمیر کر دیئے گئے اور وہ ایک عرصہ تک قائم رہے حتیٰ کہ وضع حمل ہوا اور بچہ بڑا ہو گیا اور بچہ کے ماں باپ کا انتقال ہو گیا۔ اب (چونکہ بچہ بڑا ہو چکا تھا اس لیے)

اس نے شادی کا ارادہ کیا، مگر پاس کچھ نہ تھا، چنانچہ اسی عورت نے اسے اتنی رقم دی جو اس نے اپنی بیوی کو بطور مہر کے ادا کی۔ اس وقت حق تعالیٰ نے ان محلوں کو جو جہنم میں اس کے لیے تعمیر کیے گئے تھے معدوم کر دیئے اور جو مروّت اس نے اس بچے سے کی تھی اسے اللہ نے اپنے فضل اور رحمت سے قبول فرما لیا۔ پاک ہے وہ خدا جس کی یہ تمام حکومت ہے۔

حضرت نے فرمایا: ہر حرکت جو بندہ اپنے پاؤں کو دیتا ہے خواہ اسے آگے بڑھائے خواہ پیچھے ہٹائے اس کی جزاء و ثواب میں یا تو جہنم میں اس کے لیے محل بن جاتا ہے یا جنت میں۔ نیز نیند کی حالت میں بھی جب کبھی اس کے باطن کی رگ پھڑکتی ہے تو اس وقت بھی اس کے لیے جہنم یا جنت میں محل بن جاتا ہے لہٰذا جب یہ ان افعال کا حال ہے تو جو بندہ قصد و ارادہ سے کرتا ہے اور شریعت نے یا تو اس سے منع کیا ہو یا اس کے کرنے کا حکم دیا ہو۔ ان کا کیا پوچھنا!

میں نے سوال کیا کہ جن افعال میں قصد و اختیار نہیں پایا جاتا ان کی جزا میں محل کیسے تعمیر کیے جاتے ہیں بالخصوص ایک خوابیدہ انسان کے افعال (کہ ان میں تو قصد کا قطعاً دخل نہیں ہوتا)۔

فرمایا: ان محلوں کی تعمیر کا دار و مدار اس حالت پر ہے جس کی طرف انسان قصد کے وقت رجوع کرتا ہے۔ لہٰذا محلوں کی تعمیر کا سبب یہی ہے خواہ اس میں قصد پایا جائے یا نہ پایا جائے۔ لہٰذا ظاہر ہے کہ کافر قصد کی حالت میں جس حالت کی طرف رجوع کرے گا وہ اس کے کفر اور سرکشی کی حالت ہی ہوگی لہٰذا جہنم میں اس کے لیے محل تعمیر کرنے میں اسی حالت کا اعتبار کیا جائے گا خواہ یہ افعال کسی بھی حالت میں اس سے صادر ہوئے ہوں خواہ قصد و اختیار سے ہوتے ہوں، خواہ غفلت و نیند کی حالت میں۔ اور مومن قصد و ارادہ کے وقت جس حالت کی طرف رجوع کریگا وہ اس کے ایمان اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے محبت کی حالت ہوگی اور یہی حالت جنت میں اس کے محل بنانے کا سبب ہے خواہ اس سے اس کے افعال قصداً صادر ہوئے ہوں خواہ غفلت اور نیند کی حالت میں۔ خدا ہمیں مومن رکھے اور ہمیں ان کے زمرے سے خارج نہ کرے۔

مؤلف کہتا ہے کہ یہ ایک بڑا بھاری مسئلہ ہے جس میں مدت سے علماء امّت میں اختلاف پایا جاتا ہے چنانچہ وہ فرماتے ہیں کہ فروغ شریعت میں بھی کفار مخاطب ہیں۔ پھر اختلاف اس بات میں پیدا ہوا کہ آیا کفار کے مباح افعال مثلاً کھانا پینا وغیرہ ان کے لیے بھی مباح قرار دیے جائیں گے یا نہیں چنانچہ ایک گروہ کا قول ہے کہ کفار کے لیے کوئی چیز بھی مباح نہیں اس لیے کہ کسی چیز کا مباح قرار دینا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے ایک شرعی حکم ہے اس لیے کہ آپ کی شرع سے دیگر

شریعتیں تو منسوخ ہو چکیں اور کفار آپ پر ایمان بھی نہیں لائے اور وہ کہتے ہیں کہ وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی شرع میں داخل نہیں ہیں لہٰذا وہ شرعی اباحت میں بھی داخل نہیں ہو سکتے۔ مثلاً تقی الدین سبکی[1] کا یہی خیال ہے اور ہمیں بھی یہی صحیح معلوم ہوتا ہے۔ لہٰذا کفار کے تمام اعمال معاصی اور گناہ ٹھہرے۔ حضرت نے بھی یہی فرمایا ہے۔

نیز فرمایا: جب تو جنت یا جہنم کی طرف دیکھے اور وہاں کے محلوں اور باغوں کو دیکھے تو تجھے بندوں کے اعمال کا آخرت کی ان نعمتوں یا کلفتوں سے ربط دکھائی دیگا۔ اس کے بعد حضرت نے ایک حکایت بیان فرمائی کہ کسی ولی نے جنت میں کسی ایسے مومن کے محل کو دیکھا جو ابھی بقیدِ حیات تھا۔ پھر اس محل میں نعمتوں کو دیکھا کہ ان میں بڑھوتری کے لیے حرکت پیدا ہو رہی تھی اور ایک حالت سے دوسری حالت میں منتقل ہونے کا ارادہ کر رہی تھی جیسے کہ انگور کا دانہ جب اس حالت میں آتا ہے کہ اس میں رس اور مٹھاس پیدا ہو۔ پھر اس ولی نے اس مومن کی طرف دیکھا جس کے لیے یہ محل تیار ہوا تھا کہ وہ اپنی دوکان پر بیٹھا کپڑے بیچ رہا تھا۔ پھر یکایک اس کی طبیعت میں حرکت پیدا ہوئی اور وہ گھبرا کر فوراً اُٹھ کھڑا ہوا اور دوکان بند کر کے گھر چلا گیا اور گھر والوں سے کہنے لگا کہ آج کھانے پینے کا دن ہے اور ہمارے پڑوسیوں کے پاس کھانے کو نہیں۔ فرمایا: اس کے پڑوس میں ایک محتاج عورت رہتی تھی جس کی بیٹیاں تھیں۔ ماں نے بیٹیوں کو کہا خوب محنت سے سوت کاتو۔ تاکہ سویرے ہی کام ختم کرلیں اور اسے بیچ کر خوراک خرید سکیں تاکہ ان کی نظر لوگوں کے کھانے کی طرف نہ جائے چنانچہ اس شخص نے اپنی بیوی سے کہا کہ ہمارے اور ہمارے پڑوسیوں کے لیے کھانا تیار کرو۔ بیوی نے خاوند کی رائے کو پسند کیا۔ خاوند اس کو یہ کہہ کر کہ جلد پکاؤ اور خوب اچھا کھانا پکاؤ اور زیادہ پکاؤ خود دو پیالے لے کر بازار گیا اور ان کو دودھ سے بھر لایا۔ جب

حکایت

---

[1] تقی الدین سبکی: علامہ فخر الحفاظ تقی الدین علی بن عبدالکافی سبکی شافعی۔ صاحب تصانیف کثیرہ انکی ولادت ۶۸۳ھ ۱۲۸۰ء میں ہوئی اور ۷۵۶ھ ۱۳۵۵ء میں وفات پائی۔ یہ ذہبی کے استاد تھے اور بہت سے فضائل کے حامل تھے۔ بڑے ذکی اور تیز حافظ تھے۔ تقی الدین نے نووی کی منہاج الدین کی شرح لکھی ہے۔ یہ کتاب شافعی فقہ کی کتاب ہے مگر تقی الدین اسے مکمل نہیں کر سکے ابھی باب الطلاق تک پہنچے تھے کہ ان کی وفات ہوگئی۔ اس شرح کا نام انھوں نے الابتہاج رکھا اس کے بعد ان کے بیٹے بہاء الدین احمد نے اس شرح کو مکمل کیا۔ بہاؤ الدین نے ۷۷۳ھ ۱۳۷۱ء میں وفات پائی۔

بیوی نے کھانا تیار کر دیا تو شوہر نے اس کے دو برابر حصے کئے۔ ایک حصہ اپنے لیے رکھا اور دوسرا حصہ ایک برتن میں رکھ کر خود اٹھایا اور ساتھ ہی دودھ کا ایک پیالہ لے کر پڑوسن کے گھر آیا۔ لڑکیاں بڑی محنت سے سوت کاتنے میں لگی ہوئی تھیں اور سب بھوکی تھیں۔ اچانک اس پڑوسی نے جو کھانا لے کر آیا تھا ان کے دروازے پر دستک دی اور کہا مجھے معلوم ہے کہ آج کھانے پینے کا دن ہے، اور تمہارا کوئی رشتہ دار نہیں، جو تمہارے ہاں آتا جاتا ہو۔ یہ کھانا تمہارے لیے کافی ہوگا لہٰذا یہ لے لو اور یہ دودھ بھی لے لو۔ لڑکیاں اس سے بہت خوش ہوئیں اور وہ شخص چلا آیا۔ لڑکیوں نے وہ کھانا کھایا اور خدا سے دعا کی کہ اس کے صدقہ کو قبول فرمائے۔ پھر اس ولی نے اس نعمت کی طرف نظر کی جو بڑھوتری کے لیے حرکت میں آئی تھی تو دیکھا کہ وہ بڑھ چکی تھی اور اس کی حالت ایسی ہو گئی ہے کہ اس کی کیفیت بیان نہیں ہو سکتی اور اس تمام قصہ کا صاحب طعام کو کچھ علم نہیں اللہ سبحانہٗ اپنے بندوں کو اس ثواب کے لیے حرکت میں لے آتا ہے جو انہیں آخرت میں حاصل ہوگا۔ واللہ اعلم۔

میں نے ایک دن حضرت سے ایک ظالم شخص کی نسبت سوال کیا جس کی سرکشی حد سے بڑھ چکی تھی اور سب لوگ اسے برا سمجھتے تھے اور اس سے سخت بیزار تھے۔ میں نے عرض کیا کہ اس کے لیے بد دعا کیجیے۔ فرمایا کہ جتنے محل اس کے لیے جہنم میں بننے والے ہیں، وہ ابھی تک مکمل نہیں ہو چکے اور ابھی بہت سے محل بننے باقی ہیں۔ جب تک وہ مکمل نہ ہو جائیں گے یہ شخص نہیں مریگا۔ حضرت تو وفات پا چکے ہیں مگر یہ شخص ابھی زندہ ہے۔ خدا سے ہم سلامتی چاہتے ہیں۔ واللہ اعلم۔

میں نے حضرت سے ایک ظالم اور سرکش آدمی کے متعلق دریافت کیا جسے اپنے منصب سے معزول کر دیا گیا تھا اور لوگوں کو اس سے بڑی خوشی ہوئی تھی۔

فرمایا: واہ میاں ابھی اس کا نصاب کہاں پورا ہوا ہے چنانچہ اسے اپنے منصب پر بحال کر دیا گیا اور اس نے پہلے کی طرح ظلم کرنا شروع کر دیا اور آج رمضان ۱۱۳۶ھ کی آخری تاریخ ہے مگر وہ ابھی زندہ ہے۔

حضرت نے ان حیوانات کی ارواح کے بارے میں جنہیں نہ ثواب ہوگا نہ عذاب فرمایا کہ ان میں سے بعض ایسے ہونگے جو جہنم میں اہلِ جہنم کے لیے عذاب کا باعث بنیں گے اور بعض جنت میں جنتیوں کے لیے نعمت بنیں گے۔ چنانچہ کتوں، درندوں، بھیڑیوں اور جن جانوروں کو قبیح سمجھا جاتا ہے اگر یہ دنیا میں کافروں کے ساتھ رہتے ہونگے تو جہنم میں جائینگے ورنہ نہیں۔ واللہ اعلم۔

ایک مرتبہ بڑی عید کا دن تھا کہ حضرت نے فرمایا کہ آج قربانی کے جانوروں کی روح قبض کرنے کے لیے فرشتے نازل ہوں گے چنانچہ ہر شہر اور گاؤں یا ہر جگہ جہاں عید کے دن قربانی دی جائے گی فرشتے گھومتے ہوئے دکھائی دینگے۔ یہ فرشتے اس دن کے سوا زمین پر نہیں اترتے لہٰذا جب جانور ذبح کیا جاتا ہے تو یہ اس کی روح کو لیکر یا تو جنّت کو لے جاتے ہیں یا دوزخ کو۔ اگر قربانی کرنے والے کی نیت اس کے ذبح کرنے میں نیک ہو اور اس نے اسے محض اللہ کی خوشنودی کے لیے ذبح کیا ہو فخر یا دکھاوے کی نیّت نہ ہو تو وہ جانور کی روح کو جنت میں اس کے محلوں میں لے جاتے ہیں اور یہی جانور اس کے لیے منجملہ جنت کی نعمتوں کے ایک نعمت بن جاتا ہے لیکن اگر ذبح کرنے والے کی نیت اس کے برعکس ہو، یعنی اس کی نیت فاسد اور اس کا عمل غیر اللہ کے لیے ہو تو وہ اس کی روح کو جہنّم میں لے جاتے ہیں اور وہ جانور اس کے لیے جہنم میں منجملہ دیگر کلفتوں کے ایک کلفت بن جاتا ہے لہٰذا اگر تو اس روح کی طرف دیکھے تو تجھے بالکل ایک مینڈھا اپنی صورت، اپنے سینگ اور پشم کے ساتھ دکھائی دیگا مگر یہ سب کچھ جلتی آگ ہوگی چنانچہ اس کی پشم کے بال اور سینگ سب آگ ہوں گے۔ نَسْأَلُ اللہَ السَّلَامَۃَ۔

نیز فرمایا: یہ بات لوگوں سے کہہ دو کیونکہ اس بات کی اطلاع دینا اشد ضروری ہے۔ چنانچہ کچھ لوگوں سے میں نے اس کا ذکر کر دیا۔ خدا مجھے، انہیں اور تمام مسلمانوں کو نیک نیّت بننے کی توفیق دے۔ واللہ اعلم۔

فرمایا: جہنم میں جنّات کو آگ کا عذاب نہ دیا جائے گا اس لیے کہ یہی تو اس کی طبع اور سرشت ہے لہٰذا اس سے اسے کوئی دکھ نہ پہنچے گا۔ انہیں زمہریر اور سردی سے عذاب دیا جائے گا دنیا کے اندر بھی جنّات سردی سے سخت ڈرتے ہیں۔ چنانچہ موسم گرما میں بھی وہ ٹھنڈی ہوا کے چلنے سے ڈرتے رہتے ہیں اور اگر ٹھنڈی ہوا چلے تو یہ جنگلی گدھوں کی طرح بھاگتے ہیں۔ جن اور شیاطین پانی میں کبھی داخل نہیں ہوتے۔ اگر کسی کو پانی میں ڈال دیا جائے تو وہ پانی کی سطح پر آجائے گا اور اس طرح فنا ہو جائے گا جیسے ہم میں سے کوئی آگ میں پڑنے سے فنا ہو جاتا ہے۔ واللہ اعلم۔

فرمایا: اگر تو یہ معلوم کرنا چاہے کہ جنوں کا جسم کیسا ہوتا ہے تو نہایت تاریک آگ کو دیکھے جس کے ساتھ بہت سخت دھواں بھی ہو جیسا کہ کمہاروں کے آوہ کا ہوتا ہے۔ اور اس دھوئیں میں اپنے ذہن میں ان کی صورت کو لا لہٰذا اس قسم کے دھوئیں میں لپٹی ہوئی جو صورت بنے گی وہ جن کی صورت ہوگی۔ واللہ اعلم۔

فرمایا: قاتلین کا عذاب دوسرے دوزخیوں جیسا نہ ہوگا۔

میں نے عرض کیا: یہ کیسے؟

اس پر حضرت نے مثال دیکر بیان فرمایا کہ فرض کرو ایک بادشاہ جس کی حکومت میں یہودی بھی ہوں اور مسلمان بھی اور اس نے دو دیواریں بنا رکھی ہوں ایک پر تو یہودیوں کو سولی دیا جاتا ہو اور دوسری پر مسلمانوں کو۔ پھر اگر کوئی مسلمان نافرمانی کرے اور وہ اسے یہودیوں کی دیوار پر لٹکا دے تو اس سے یہ معلوم ہوگا کہ بادشاہ نے اسے یہودیوں کے ساتھ ملا کر اس کی سخت تذلیل کی ہے۔

میں نے عرض کیا اسے ذرا واضح کر دیں۔

تو فرمایا: جہنم میں ایک گرم آگ ہوگی جس سے بنی آدم کو عذاب دیا جائے گا اور دوسری ٹھنڈی آگ ہوگی جس سے جیسا کہ بیان کیا جا چکا، شیاطین کو عذاب دیا جائے گا اور قاتلین کو اسی آگ سے شیاطین کے ساتھ عذاب دیا جائے گا۔

پھر فرمایا: یہ عذاب قاتلین کے ساتھ خاص نہیں بلکہ بعض نافرمانوں کو بھی یہی عذاب ہوگا۔ اس کے بعد آپ ان نافرمانوں کو متعین کرنا چاہتے تھے اور اس کی حکمت بیان کرنا چاہتے تھے کہ انہیں سرد آگ سے کیوں عذاب دیا جائیگا کہ کسی نے آکر کلام قطع کر دیا۔ واللہ اعلم۔

ایک بار مجھ سے فرمایا کہ کیا جانتے ہو قیامت کے دن سخت عذاب کسے ہوگا؟

میں نے عرض کیا: وہ کون شخص ہوگا؟ (جسے سخت ترین عذاب ہوگا)۔

فرمایا: وہ بندہ جسے اللہ تعالیٰ نے جسمِ کامل، عقلِ کامل اور صحتِ کاملہ عطا کی ہو اور اس کے لیے ہر طرح آرام و عیش اور اسباب رزق مہیا کیئے ہوں پھر اس شخص پر ایک یا دو یا اس سے بھی زیادہ دن گزر جائیں اور اس کے دل میں اپنے پیدا کرنیوالے کا خیال بھی نہ گزرے (اور اس کے برخلاف) جب معصیت پر اسے قدرت ہو تو اس کی طرف تمام جسم اور تمام عقل کے ساتھ متوجہ ہو، اسے سمجھے اور لذّت اٹھائے مگر اللہ کی طرف ذرہ برابر بھی خیال نہ آئے جو اسے تشویش میں ڈال دے۔ چنانچہ تو دیکھے گا کہ معصیت سے تو اس کا پورا اتصال ہو چکا ہے اور اللہ سے پورا تعلق کٹ چکا ہے۔ وہ ہمہ تن معصیت میں مبتلا ہے اور اس میں خوب مزہ لیتا ہے۔ لہٰذا قیامت کے دن اس کی سزا بھی یہی ہوگی کہ اس کے تمام اجزاء کو جہنم میں جھونک دیا جائے اور اسے ایک ہی بار اس میں ڈال دیا جائے۔

فرمایا: حق سبحانہٗ کی طرف سے غفلت بالخصوص معصیت کی حالت میں بہت بڑی چیز ہے اور اس کا معاملہ سخت ہوگا لہٰذا مومن کو چاہیئے کہ کوئی گناہ کرے تو خیال رکھے کہ اس کا ایک رب ہے

جواس پر قادر ہے۔ اس سے اسے خوف اور ڈر پیدا ہوگا اور اگر یہ فرض کر لو بالکل ہی معاف نہ بھی ہوگا تو اس کی شدت میں کمی ضرور پیدا ہوگی۔

یہ آخری الفاظ ہیں جو فقیہ اور علامہ شیخ احمد بن مبارک سلجماسی نے اپنے شیخ اور غوث زماں حضرت عبدالعزیز بن مولانا مسعود دباغ الادریسی الحسینی سے سنکر لکھے۔ وَصَلَّى اللّٰهُ عَلٰى سَيِّدِنَا مُحَمَّدٍ وَّعَلٰى اٰلِهٖ وَصَحْبِهٖ وَسَلَّمَ۔

وَحَسْبُنَا اللّٰهُ وَنِعْمَ الْوَكِيْلُ۔ وَلَا حَوْلَ وَلَا قُوَّةَ اِلَّا بِاللّٰهِ الْعَلِيِّ الْعَظِيْمِ۔

تمت